نجوم الفرقان

من تفسیر آیات القرآن

از رشحات قلم

حضرت علامہ مولانا

عبدالرزاق بھترالوی حطاروی

ناشر

ضیاء العلوم پبلی کیشنز راولپنڈی پاکستان

نجوم الفرقان فی تفسیر القرآن

کتاب لاریب کی توضیحات وتشریحات، علوم عقلیہ ونقلیہ کی روشنی میں
علمی وتحقیقی ذوق رکھنے والوں کے لئے قدیم وجدید احکامات ومسائل پر ابحاث کا حسین مرقع
تفسیر القرآن بالقرآن، ارشادات نبویہ، اقوال صحابہ، تحقیقات اسلاف اور روایات صحیحہ پر مشتمل تفسیر

مسمّٰی بہ

نجوم الفرقان

من تفسیر آیات القرآن

جلد سوم

سورۃ البقرہ آیات 47 تا 141

از رشحات قلم

محقق اہلسنت
استاذ العلماء حضرت علامہ مولانا
عبد الرزاق بھترالوی طاروی
مدظلہ العالی

ناشر ضیاء العلوم پبلی کیشنز راولپنڈی پاکستان

اشاعتی ضابطہ

نام کتاب: نجوم الفرقان من تفسیر آیات القرآن

تصنیف: علامہ مولانا عبد الرزاق چشتی بھترالوی

کمپوزنگ: ضیاء العلوم کمپوزنگ سنٹر سیٹلائیٹ ٹاؤن راولپنڈی

کمپیوٹر گرافکس: قاضی محمد یعقوب چشتی، اظہر اقبال اعوان

ضخامت: 20 x 30 / 8 — 936 صفحات

بار طبع: اوّل — دسمبر 2004ء

قیمت: ...... روپے

ناشر: سید شہاب الدین شاہ
ضیاء العلوم پبلی کیشنز راولپنڈی پاکستان

رابطہ: 0333- 5166587 - Fax 051-4580404
Email:ziauloom@isb.paknet.com.pk

عنوان	صفحہ
یٰبَنِیۤ اِسۡرَآئِیۡلَ اذۡکُرُوۡا ......الخ	25
بنی اسرائیل کو فضیلت کیا دی گئی؟	26
وَاَنِّیۡ فَضَّلۡتُکُمۡ عَلَی الۡعٰلَمِیۡنَ	27
تنبیہ	28
وَاتَّقُوۡا یَوۡمًا لَّا تَجۡزِیۡ ......الخ	29
سزا سے چھڑانے کے چار طریقوں کی نفی	29
دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے	30
لاتجزی نفس عن نفس شیأ	30
فائدہ:	30
تنبیہ	31
مقام توجہ	32
ولا یقبل منھا شفاعة	33
ولا یؤخذ منھا عدل	33
ولاھم ینصرون	34
نصرت اور معونت میں فرق	34
شفاعت کی بحث	34
تنبیہ	35
تراجم کو دیکھئے	36
شفاعت کا ثبوت قرآن پاک سے	36
شفاعت کا ثبوت احادیث مبارکہ سے	39
وضاحت حدیث	40
اعتراض ، جواب	42
جواب دوم، وضاحت حدیث	43
شفاعت کی پانچ قسمیں	44
فائدہ	45
تنبیہ	46
وضاحت حدیث	46
فائدہ	47
فَرَط	49
شفاعت عامہ	49
نکتہ	50
شفاعت سے کسی کو کم اور کسی کو زیادہ	
فائدہ کیوں؟	51
تنبیہ	51
شفاعت میں معتزلہ کا مذہب	52
معتزلہ کی دلیل نمبر 1	53
الزامی، تحقیقی جواب	53
نتیجہ یہی نکلا	53
معتزلہ کی دلیل نمبر 2	54
جواب نمبر ۱،۲	54
تیسرا جواب	55
معتزلہ کی دلیل نمبر 2	55
دینی طلباء کی دلچسپی کیلئے	56

عنوان	صفحہ	عنوان	صفحہ
معتزلہ کا استدلال احادیث سے	58	بنی اسرائیل کے بیٹوں کو ذبح کیوں کرایا گیا؟	72
جواب نمبر 1	59	بیٹوں کو ذبح کرنے اور بیٹیوں کو زندہ	
تحقیقی جواب نمبر 2	59	چھوڑنے کی وجہ کیا تھی؟	73
الزامی جواب	60	تنبیہ	75
تحقیقی جواب نمبر 2	60	وفی ذٰلکم بلآ من ربکم عظیم	75
مشکل الفاظ کے معانی	61	رب تعالیٰ کی عظمت	76
اس حدیث سے معتزلہ کا استدلال	62	تنبیہ	76
اس حدیث سے معتزلہ کا استدلال	63	وَاِذْ فَرَقْنَا بِکُمُ الْبَحْرَ...... الخ الآیۃ	77
معتزلہ کی اور دلیل	64	فرعون اور اسکی قوم کی ہلاکت کی طرف روانگی	79
وَاِذْ نَجَّیْنٰکُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ الخ	65	موسیٰ علیہ السلام کو دریا میں عصا مارنے کا حکم	79
قاعدہ اکثریہ	66	واذ فرقنا بکم	80
آل فرعون سے مراد	66	البحر	81
فائدہ	67	فانجینکم ، تنبیہ	82
قرطبی رحمہ اللہ نے فرمایا	67	واغرقنا ال فرعون	83
تمام اقوال میں حقیقتاً کوئی اختلاف نہیں	68	وانتم تنظرون	84
فرعون	69	یہ دریا کون سا تھا؟	84
دینی طلباء کرام کے لئے	69	یہ واقعہ دینی اور دنیاوی نعمتوں کا پتہ دیتا ہے	84
فرعون کا غربت سے بادشاہت تک پہنچنا	69	امت مصطفیٰ ﷺ کو حاصل ہونے والے فوائد	87
یسومونکم ، سوء العذاب	70	مومن کی کیا خوب شان	88
کیا بنی اسرائیل کو سخت عذاب دیا گیا؟	70	موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کی نجات کا دن	88
نکتہ	71	اعتراض	89

عنوان	صفحہ
جواب، ایک غلط فہمی کا ازالہ	90
نبی کریم ﷺ کا اپنی ولادت کے دن اظہار تشکر	92
وَاِذْ وٰعَدْنَا مُوْسٰی اَرْبَعِیْنَ لَیْلَةً الخ	93
بچھڑے کے ذکار نے کی وجہ	94
اعتراض، جواب	96
راتوں کا ذکر کیوں؟	96
فائدہ	97
دینی طلباء کیلئے	97
ثم اتخذتم العجل	98
من بعده ، وانتم ظلمون	99
اس آیت سے بھی امت مصطفیٰ ﷺ کو یہ فائدے حاصل ہوئے	100
ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْکُمْ ......الخ الآیة	101
مختصر مطلب	101
تفصیلی وضاحت	101
اعتراض ، جواب	102
لعلکم تشکرون	102
فائدہ	103
شکر کیا ہے؟	103
شکر کی تین قسمیں ہیں	104
وَاِذْ اٰتَیْنَا مُوْسٰی الْکِتٰبَ الخ الآیة	106
موسیٰ علیہ السلام	106
پہلا احتمال	107
دوسرا احتمال	107
تیسرا احتمال	108
تنبیه	108
وَاِذْ قَالَ مُوْسٰی لِقَوْمِهٖ یٰقَوْمِ الخ	109
عجیب نکته	110
نبی کریم ﷺ کی امت پر عظیم احسان	110
اس واقعہ سے نبی کریم ﷺ کی امت کو توبہ کی رغبت دلائی گئی	111
یقوم انکم ظلمتم انفسکم	111
اعتراض ، جواب	112
ایک دوسرے کو قتل کرنے سے کیا مراد ہے؟	113
ان کیلئے قتل کرنا کیسے ممکن ہوا؟	113
ذلکم خیر لکم عند بارئکم	114
تنبیہ	114
وَاِذْ قُلْتُمْ یٰمُوْسٰی لَنْ نُّؤْمِنَ لَکَ	115
قدرے مزید تفصیل	116
اعتراض ، جواب	116
حتی نری الله جهرة	119
ثم بعثنکم من بعد موتکم	120
تنبیه	120

عنوان	صفحہ
قابل توجہ	120
وَظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ الخ	121
بنی اسرائیل سرکشی کے باوجود انعامات	122
سلویٰ کیا ہے؟	124
ایک حدیث کا مطلب	124
کمأۃ کو من کہنے کی وجہ	124
بنی اسرائیل کی ذخیرہ اندوزی	125
ذخیرہ اندوزی کی مذمت احادیث سے	126
تنبیہ	126
تنبیہ	129
کلو من طیبت ما رزقنکم	130
نبی کریم ﷺ کے معجزات کی ایک جھلک	130
حدیث پاک کی وضاحت	133
تنبیہ	135
وَاِذْ قُلْنَا ادْخُلُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ الخ	136
وہ بستی کون سی تھی؟	136
وقولوا حطۃ	138
فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا قَوْلاً غَيْرَ الَّذِىْ الخ	139
رجز سے مراد کون سا عذاب ہے؟	140
الفاظ کے تبدیل کرنے کے متعلق مسئلہ عظیمہ	145
اعتراض ، جواب	149
حضرت محی الدین ابن عربیؒ فرماتے ہیں	150
وَاِذِ اسْتَسْقٰى مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ الخ	151
مختصر وضاحت	151
قدرے تفصیل	152
فقلنا اضرب بعصاک الحجر	153
قد علم کل اناس	155
کلوا واشربوا من رزق اللہ	155
ولا تعثوا فی الارض مفسدین	155
معجزات کا انکار جہالت ہے	156
تنبیہ	156
دھریون	157
طبیعون	157
الاھیون	158
سید الانبیاء کی انگلیوں سے نکلا ہوا پانی زمزم اور کوثر سے افضل ہے	158
وضاحت حدیث	159
زمزم سے بھی افضل پانی	159
تنبیہ ، فائدہ	160
مسئلہ استسقاء	161
استسقا کے تین طریقے	162

عنوان	صفحہ
بارش طلب کرنے کے تین طریقے ہیں	162
دوران خطبہ نبی کریم ﷺ کا دعاء کرنا	163
توضیح	164
نماز استقاء	166
ایک غلط فہمی کا ازالہ	166
نماز استقاء کے بعد دعا	167
غلط فہمی کا ازالہ	167
بادلوں کو دیکھ کر دعا کرنا	169
وَاِذْ قُلْتُمْ یٰمُوْسٰی لَنْ نَّصْبِرَ الخ	171
مختصر مطلب، تفصیلی وضاحت	172
علی طعام واحد	173
فائدہ	173
فادع لنا ربک	174
عظیم ہستی کا دعاء کی درخواست کرنا	175
ایک عجیب حکمت	175
گذشتہ سے پیوستہ	176
وضاحت حدیث	177
یخرج لنا مما تنبت الارض	178
من بقلها	179
وفومها ، وعدسها ، وبصلها	180
فوائد	180

عنوان	صفحہ
مسئلہ ، اعتراض ، جواب	181
پیاز لہسن کھا کر مسجد میں آنے کی ممانعت	182
نبی کریم ﷺ کا کچے لہسن سے پرہیز کرنا	183
وضاحت حدیث	184
مسور کا ذکر	186
وفومها	186
قال اتستبدلون الذی هو ادنی	187
من اور سلوی کی فوقیت	188
مسئلہ ،	189
اهبطوا مصراً فان لکم ما سألتم	189
ذلت سے مراد	190
مسکنت سے مراد	191
فائدہ جلیلہ	191
یہود کی ذلت پر علامہ کاظمی کا شاندار بیان	192
وَبَاءُ وْا بِغَضَبٍ مِّنَ اللهِ	194
تنبیہ	194
ذلک بانهم کانوا یکفرون بایت الله	195
انبیاء کرام کو شہید کرنے کی وجہ	196
اعتراض، جواب	197
انبیاء کرام کو شہید کرنا یہود کی زبانی	198
انبیاء کرام کو جیل میں بھیجنا یہود کی زبانی	199

عنوان	صفحہ
لفظ نبی کے متعلق	199
اعتراض	199
جواب	200
اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَالَّذِیۡنَ هَادُوۡا الخ	201
شان نزول	201
حضرت سلمان فارسی	202
قرآن تیری عظمت پر قربان	205
فائدہ	207
یہود کو یہود کہنے کی وجہ	208
نصاریٰ کو نصاریٰ کہنے کی وجہ	208
تنبیہ	209
والصابئین	209
صائبین کی قسمیں	210
آیۃ کریمہ میں صائبین کی کون سی قسم معتبر ہے؟	212
راقم کا موقف	213
من آمن باللہ والیوم الآخر	213
اعتراض	213
جواب، تنبیہ	214
وعمل صالحاً فلهم اجرهم	215
تنبیہ	216
ولاخوف علیهم ولا هم یحزنون	217
مقام توجہ	217
گذشتہ سے پیوستہ	217
حکمت	218
جواب	218
وَاِذۡ اَخَذۡنَا مِیۡثَاقَکُمۡ وَرَفَعۡنَا فَوۡقَکُمُ الطُّوۡر	219
مختصر وضاحت	219
تنبیه	220
قدرے تفصیلی وضاحت	220
ورفعنا فوقکم الطور	221
تنبیه	222
علامہ رازی نے کیا خوب بیان کیا	222
طور کو اٹھانے کا انکار کرنے والے کون؟	223
اعتراض ، جواب	223
خذوا ما اتیناکم بقوة	224
لعلکم تتقون	227
ثُمَّ تَوَلَّیۡتُمۡ مِّنۡ بَعۡدِ ذٰلِکَ الخ الآیۃ	228
مختصر وضاحت	228
قدرے تفصیلی وضاحت	228
فلو لا فضل اللہ علیکم	229
وَلَقَدۡ عَلِمۡتُمُ الَّذِیۡنَ اعۡتَدَوۡا مِنۡکُمۡ الخ	231
نیک لوگوں نے مجرمین سے کنارہ کشی کر لی	233

عنوان	صفحہ
مختصر لفظی بحث	233
یہود نے ہر موقع پر نبی کی مخالفت کی	234
ہفتہ کے دن مچھلیوں کے زیادہ آنے کی وجہ	235
فائدہ عظیمہ	235
حدیث پاک سے حاصل ہوا	236
اس واقعہ کے ذکر کرنے کا مقصد	237
اعتراض، جواب	238
کیا وہ حقیقی بندر بن گئے تھے یا تشبیہ ہے؟	238
جن کو بندر بنایا گیا کیا ان کی نسل چلی؟	239
مسئلہ کی تفصیل ملاحظہ ہو	239
جمہور کے نزدیک نسل نہیں چلی	240
پہلے قول والوں کے دلائل کے جوابات	240
تیسری حدیث کا جواب	242
دوسرا جواب	242
تیسرا جواب	242
چوتھا جواب	243
پانچواں جواب	243
حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی گریہ وزاری	
اور حضرت عکرمہ کا استدلال	243
تنبیہ	244
گنہگاروں کے ساتھ نیک لوگ بھی	
تباہ ہو جاتے ہیں	245
ناجائز کاموں کے لئے حیلہ کرنا حرام ہے	245
جائز کاموں کے لئے حیلہ جائز	246
تنبیہ	246
فَجَعَلْنٰهَا نَكَالًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهَا الخ	247
تنبیہ	248
لما بین یدیها وما خلفها	248
دینی مدارس کے طلباء کے لئے	249
وموعظة للمتقین	250
نکال اور موعظة میں فرق	250
فائدہ عظیمہ	251
وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖۤ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ الخ	253
مزاح اور استہزاء میں فرق	254
کیا بنی اسرائیل کافر ہوئے	255
دینی طلباء کرام کے لئے	256
قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِيَ الخ	257
سوال	257
پہلا جواب	257
دوسرا جواب	258
تیسرا جواب اجمالی	258
تنبیہ	258

عنوان	صفحہ
تیسرا جواب تفصیلی	258
چوتھا جواب	260
قال انه یقول انها بقرة لا فارض	260
فافعلوا ما تؤمرون	261
سوال ان کیلئے مشکل کا سبب بن گئے	262
مسئله	262
قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّکَ یُبَیِّنْ لَّنَا مَالَوْنُهَا الخ	263
تنبیه	264
فائده عظیمه	265
قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّکَ یُبَیِّنْ لَّنَا الخ	266
وانا ان شاء الله لمهتدون	267
قَالَ اِنَّهٗ یَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ الخ	268
وہ ذبح کیوں نہیں کرنا چاہتے تھے؟	269
بہت بھاری قیمت سے گائے حاصل کرنے کی وجہ	270
گائے ذبح کرنے میں حکمت	271
فائده	271
وَاِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادّٰرَءْتُمْ الخ	272
والله مخرج ما کنتم تکتمون	273
فائده	274
قابل توجہ	274
فَقُلْنَا اضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا الخ	275
فائدہ جلیلہ	276
طلباء کرام کی توجہ کے لئے	278
نیک باپ کا بچہ بھی نیک تھا	278
اعتراض، جواب	279
مسئله	280
مسئله قسامت	280
ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُکُمْ مِّنْ بَعْدِ ذٰلِکَ الخ	282
قساوۃ کا ذکر کب ہوتا ہے؟	283
او اشد قسوة	284
احمقوں کی جنت میں بسنے والے	285
آیئے چند مثالوں کی طرف توجہ فرمائیں	287
فائدہ	291
قرآن پاک کی فصاحت کیا خوب ہے	292
تعظیم باری تعالیٰ کا پاس	293
اَفَتَطْمَعُوْنَ اَنْ یُّؤْمِنُوْا لَکُمْ الخ	294
مختصر مطلب	294
شانِ نزول	294
افتطمعون	295
ان یؤمنوا لکم	295
وقد کان فریق منهم یسمعون	296

عنوان	صفحہ
فائدہ	297
اعتراض ، جواب ،	298
تنبیہ	298
وَاِذَا لَقُوا الَّذِیْنَ آمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّاالخ	299
مختصر مطلب	299
شانِ نزول	300
و اذا خلا بعضھم الی بعض	301
لیحاجو کم بہ	302
افلا تعقلون	305
اَوَلَا یَعْلَمُوْنَ اَنَّ اللّٰہَ یَعْلَمُ	306
وَمِنْھُمْ اُمِّیُّوْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ الْکِتَابَ الخ	307
تنبیہ	308
ومنھم امیون	309
لایعلمون الکتاب	309
تنبیہ	310
تنبیہ	311
وان ھم الا یظنون	312
فائدہ	312
فَوَیْلٌ لِّلَّذِیْنَ یَکْتُبُوْنَ الْکِتَابَ الخ	313
ایک لفظ کثیر معانی پر مشتمل ہے	314
تمام معانی کا مطلب ایک ہے	315
انہوں نے تبدیل کیا	316
وللآخرۃ خیر لک من الاولی	316
نکتہ	317
فائدہ جلیلہ	318
قرآن پاک کا نسخہ بیچنے کے جواز	
پر اجماع امت ہے	319
تنبیہ	319
وَقَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّار الخ	321
شانِ نزول	321
دینی طلباء کرام کے لئے	326
تنبیہ ، اعتراض ، جواب	327
جواب دوم، جواب سوم، جواب چہارم	328
بَلٰی مَنْ کَسَبَ سَیِّئَةً وَّاَحَاطَتْ بِہ الخ	329
یہود دو وجہ سے مذمت کے مستحق ہوئے	330
فصاحت قرآن	330
وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوْا الصَّالِحَات الخ	332
نکتہ	333
فائدہ جلیلہ	334
تنبیہ	335
وَاِذْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَ بَنِیْٓ اِسْرَآئِیْلَ الخ	336
اللہ تعالیٰ کی عبادت کے بعد والدین	

عنوان	صفحہ	عنوان	صفحہ
سے بھلائی کے ذکر کی وجوہ	338	ماں باپ کی وفات کے بعد ان سے	
مسئلہ	340	حسن سلوک کا حکم	351
والدین سے احسان کا مطلب	341	خدارا انصاف کریں	352
ماں باپ کی فرمانبرداری	342	نبی کریم ﷺ کا دودھ پلانے والی	
ماں کا حق سب سے زیادہ کیوں؟	342	ماؤں کا احترام	353
ماں، باپ سے محبت خیر و برکت		نبی کریم ﷺ کا اپنی پرورش کرنیوالی	
کا ذریعہ ہے	343	کی زیارت کرنا	353
ماں باپ انسان کیلئے جنت و دوزخ ہیں	344	کسی کے ماں باپ کو گالیاں دینے سے	
ماں باپ کو رحمت سے دیکھنا حج		منع کرنے میں حکمت	354
کا ثواب ہے	344	فائدہ عظیمہ	354
وضاحت حدیث	245	نکتہ عظیمہ ، فائدہ جلیلہ	356
ماں باپ کی نافرمانی ناقابل معافی جرم ہے	345	اہل قرابت کی دو قسمیں	357
ماں باپ کی خدمت جہاد اور ہجرت		نکتہ، دیگر	358
سے پہلے	346	مسئلہ	359
ماں باپ سے احسان کی تین قسمیں	346	یتیم کی پرورش مستحسن کام	360
مسئلہ	348	والمساکین	361
ماں باپ کے ساتھ احسان کرنے		مساکین پر رحم کرنا	362
کے آداب	349	تنبیہ	363
بڑھاپے میں ماں باپ سے زیادہ		ایک اور قول	364
شفقت و محبت کا حکم دیا گیا	350	محاکمہ	366
وضاحت حدیث	350	تنبیہ	368

عنوان	صفحہ	عنوان	صفحہ
اعتراض، جواب	369	تاریخ واقعات کو دہرا رہی ہے	404
گذشتہ سے پیوستہ	370	وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا غُلْف الخ	405
وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ الخ	371	قدرے تفصیل	406
تنبیه	377	تین معانی واضح ہیں	406
ثُمَّ اَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ تَقْتُلُوْنَ اَنْفُسَكُم الخ	381	وضاحت حدیث	409
نکته	383	وضاحت حدیث	410
اعتراض، جواب	385	یزید پر لعنت کا حکم	411
حضرت عبداللہ بن سلام کا قول	386	قول فیصل	411
قیدیوں کو چھڑانے کا حکم شریعت		وَلَمَّا جَاءَهُمْ كِتَابٌ مِّنْ عِنْدِ اللهِ الخ	413
مصطفوی میں	388	وسیلہ کے متعلق ارشادات مصطفوی	417
یادرفتگان	289	دوسری وجہ شان نزول کی	418
ضمیر شان اور ضمیر مبہم میں فرق	389	تمام معانی ایک جگہ جمع کریں	419
فما جزاء من يفعل ذٰلک منكم	390	اعتراض، جواب	420
دنیا میں ان کی ذلت ایسے کو تیسا	391	ضیاء النبی سے اقتباسات	421
ایک غلط فہمی کا ازالہ	392	حضور ﷺ کا ذکر خیر توراۃ وانجیل میں	421
اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا الخ	395	نبی کریم ﷺ کو پہچاننے کے باوجود	
وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتَابَ وَقَفَّيْنَا الخ	396	انکار کی ایک مثال	422
تنبیہ۔ فائدہ	400	بِئْسَمَا اشْتَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُم الخ الآية	423
فائدہ جلیلہ	401	غضب علی غضب کے معانی میں وسعت	428
کفار کا مطالبہ	403	وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللهُ الخ	430
یہود و ہنود کا اشتراک	403	طلباء کرام توجہ فرمائیں	433

عنوان	صفحہ	عنوان	صفحہ
نکتہ	436	تنبیہ	470
وَلَقَدْ جَآءَ کُمْ مُّوْسٰی بِالْبَیِّنٰتِ الخ	437	مَنْ کَانَ عَدُوًّا لِّلّٰہِ وَمَلٰٓئِکَتِہٖ وَرُسُلِہٖ الخ	474
عجیب نکتہ	440	جبرائیل ومیکائیل کو علیحدہ ذکر کرنے کی وجہ	475
وَاِذْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَکُمْ وَرَفَعْنَا الخ	441	وجہ تسمیہ	477
تنبیہ	442	لفظ جبریل کے متعلق	478
فائدہ عظیمہ	443	لفظ میکائیل کے متعلق	478
قُلْ اِنْ کَانَتْ لَکُمُ الدَّارُ الْاٰخِرَۃُ الخ	447	جبریل کی افضلیت	478
شان نزول میں چند وجوہ	447	وَلَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَیْکَ اٰیٰتٍۭ بَیِّنٰتٍ الخ	479
بہت خوبصورت عبارت	449	وہ آیات کیا ہیں؟	480
موت اور شیر خدا	450	آیات کی وجہ تسمیہ	481
حضرت عمارؓ اور موت	451	اعتراض جواب	482
حضرت حذیفہؓ اور موت	451	فسق کا لغوی معنی	483
یہودا گر موت کی تمنا کر لیتے	452	فسق کے قریب فجور	483
موت کی تمنا اور دعا کا حکم	453	اَوَ کُلَّمَا عٰھَدُوْا عَھْدًا الخ	485
رب کی ملاقات کا شوق	455	شان نزول میں چند وجوہ	485
وَلَنْ یَّتَمَنَّوْہُ اَبَدًا الخ	458	وَلَمَّا جَآءَ ھُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰہِ الخ	488
تنبیہ	459	وَاتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّیٰطِیْنُ الخ	493
نکتہ	461	فَیَتَعَلَّمُوْنَ مِنْھُمَا مَا یُفَرِّقُوْنَ بِہٖ الخ	493
وَلَتَجِدَنَّھُمْ اَحْرَصَ النَّاسِ عَلٰی حَیٰوۃٍ الخ	462	سحر کا اصطلاح شرح میں معنی	495
قُلْ مَنْ کَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِیْلَ ......الخ	466	سحر قولی	495
شان نزول	466	سحر عملی، سحر اعتقادی	495

عنوان	صفحہ	عنوان	صفحہ
سحراور معجزہ اور کرامت میں فرق	496	ضابطہ	511
سحر کے اثرات	498	سلیمان علیہ السلام کوانہوں نے	
ساحر کا حکم	499	جادوگر کیوں کہا؟	512
جادو کی اقسام	500	ہاروت وماروت کی وجہ تسمیہ	515
نمرودی جادو کی مثالیں	501	فائدہ	516
دوسری قسم	503	ہاروت اور ماروت کے متعلق	
تیسری قسم	503	اسرائیلی روایات	522
چوتھی قسم	504	اسرائیلی روایات کون سی ہیں؟	524
پانچویں قسم	504	اسرائیلی روایات کا مفسرین کرام نے رد کیا	524
چھٹی قسم	505	تنبیہ	525
ساتویں قسم	505	ہاروت اور ماروت کے آنے کی فقط یہ وجہ	527
آٹھویں قسم	506	ایک سوال اوراس کا حل	527
آخری تین قسموں کا حکم	506	نبی کریم ﷺ پر جادو	528
جادو کی پہلی قسم کا دفاع	506	وضاحت	529
دوسری قسم کا دفاع	506	وَلَوْ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَمَثُوْبَة الخ	531
تیسری قسم کا دفاع	507	يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَاتَقُوْلُوْا رَاعِنَا الخ	532
چوتھی قسم کا دفاع	507	شان نزول	532
پانچویں قسم کا دفاع	508	ایک عظیم نکتہ	534
تعویذات کا حکم	508	مقام توجہ	537
فائدہ جلیلہ	509	گناہوں کے اسباب سے بچنا بھی	
مسئلہ	510	ضروری ہے	538

عنوان	صفحہ
مَایَوَدُّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْ اَھْلِ الْکِتٰبِ	541
شان نزول	541
شان نزول کی ایک اور وجہ	542
مقام توجہ	543
ایک عظیم نکتہ	545
مقام توجہ	546
مَاننْسَخْ مِنْ اٰیَۃٍ اَوْ نُنْسِھَا الخ	547
شان نزول	547
نسخ کے معانی	547
نسخ اور متقدمین ومتاخرین علماء کرام	548
اس پر مفتی محمد شفیع صاحب نے یوں تبصرہ کیا	548
نسخ کا علم عظیم ہے	550
نسخ کی حقیقت کو سمجھیں	551
نسخ حکمت باری تعالیٰ کا ایک کرشمہ ہے	552
قرآن پاک میں کوئی اختلاف نہیں	552
نسخ کی بحیثیت حکم وتلاوت تین قسمیں	553
نسخ بحیثیت ناسخ کے چار قسم ہے	556
وضاحت حدیث	557
تنبیہ	558
نسخ الکتاب بالسنۃ میں امام شافعیؒ کا موقف	561
بحیثیت نفع مند ہونے کے نسخ کی تین قسمیں	565
منکرین نسخ کے دلائل	568
نسخ کے جواز پر دلائل	570
اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰہَ لَہٗ مُلْکُ السَّمٰوٰتِ	572
ولی اور نصیر میں فرق	574
اَمْ تُرِیْدُوْنَ اَنْ تَسْئَلُوْا رَسُوْلَکُمْ الخ	575
پہلا احتمال	575
تنبیہ	577
دوسرا احتمال	580
تیسرا احتمال	581
تمام احتمالات اجتماعی طور پر مراد ہیں	581
وَدَّ کَثِیْرٌ مِّنْ اَھْلِ الْکِتَابِ الخ	583
شان نزول	583
شان نزول کی اور وجہ	584
عبداللہ بن ابی کا حسد کرنا اور نبی کریم ﷺ کا معاف کرنا	587
حسد کے متعلق علامہ رازیؒ کا تفصیلی بیان	589
حسد کی مذمت میں احادیث	590
حسد کی مذمت میں آثار	592
حسد کیا ہے؟	593
منافسہ اور غبطہ کا حکم	595

عنوان	صفحہ
حاصل کلام	595
منافسہ کے جواز پر دلائل	595
منافسہ محضہ	596
منافسہ مستلزم حسد یہ ہے	597
حسد سے نکلنا قوت ارادیہ پر مبنی ہے	597
حسد کے مراتب	597
حسد کے اسباب	598
حسد کے اسباب سے سمجھ آیا	602
حسد سے بچنے کا ذریعہ	603
جس سے حسد کیا جائے اسکا دین اور دنیا میں کوئی نقصان نہیں	604
عمل سے حسد کا زوال	606
آیۃ کریمہ سے حاصل ہونیوالے مسائل	606
اعتراض، جواب	607
وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ الخ	608
تنبیہ ، حکمت	610
وَقَالُوْا لَنْ یَّدْخُلَ الْجَنَّۃَ الخ	613
شان نزول	613
اعتراض، جواب	617
بَلٰی مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ الخ	619
فائدہ جلیلہ، مسئلہ	624
دوسرا مسئلہ	625
تیسرا، چوتھا مسئلہ	626
معاصی	626
طاعات	627
مباحات	628
وَقَالَتِ الْیَهُوْدُ لَیْسَتِ النَّصٰرٰی الخ	630
مختصر مطلب	630
کچھ تفصیل	631
وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ الخ	634
شان نزول	634
تنبیہ	635
اعتراض، جواب	637
عمارۃ المسجد؟	643
مسجد کے فضائل وآداب	645
تعمیر مسجد ذریعہ جنت	646
مساجد اللہ کی پسندیدہ جگہیں ہیں	646
اللہ تعالیٰ کو بازار کیوں ناپسند ہیں؟	647
مسجد میں آمد و رفت سے جنت میں مہمان نوازی	648
مسجد میں دور سے چل کر آنا زیادہ ثواب کا سبب ہے	649
مسجد سے دل لگانے والا اللہ کی	

عنوان	صفحہ	عنوان	صفحہ
رحمت کے سایہ میں	650	ایک غلط فہمی کا ازالہ	664
تحیۃ المسجد	651	راقم کا مؤقف	666
تحیۃ المسجد کا بدل	651	مساجد میں شوروغوغا، قیامت کی نشانی	666
مسجد میں داخل ہونے کی دعا	653	مسجد تاقیامت مسجد ہے	667
مسجد سے باہر نکلنے کی دعاء	653	وقف کرنے کیساتھ ہی مالک کی ملکیت ختم	669
دونوں دعاؤں میں وجہ فرق	653	مسجد کو شہید کر کے نئی مسجد بنانے کا حکم	670
فائدہ جلیلہ	654	کشادگئی مسجد	670
مسجد سے نکلتے ہوئے یہ بھی پڑھے	654	الٹی چال	671
مسجد میں سوال کرنا اور سائل کو عطا کرنے کا حکم	655	مسجد کی توسیع کیلئے ساتھ والی زمین قاضی جبراً لے لے	671
محاکمہ	655	مسجد تعمیر ہو جانے کے بعد نیچے یا اوپر دکانیں بنانا منع ہے	672
بدبودار چیز کھا کر مسجد میں نہ جائے	657	عارضی مسجد حکم مسجد میں نہیں	673
مسجد میں خوشبو لگانا مستحب ہے	657	مرض موت میں اپنے مکان کو مسجد بنانے کا حکم	673
مسجد میں سونے کا حکم	659	مسجد کی جگہ کو بیچنا جائز نہیں	674
مسجد میں سونے کی دوسری خرابی	661	امام اور مؤذن کی رہائش کا حکم	674
مسجد میں خرید وفروخت اور گم شدہ چیز کا اعلان منع ہے	661	مسجد سے گذرنے کا حکم	675
فائدہ عظیمہ	663	مسجد کی زمین کو فروخت کرنا جائز نہیں	675
حضرت عمرؓ کا محبت بھرا ارشاد	663	مسجد کی زمین کو کسی اور تصرف میں لانا منع ہے	676
نبی کریم ﷺ کے قرب کی وجہ سے افضلیت کیوں؟	664	بوقت مشکل مسجد کا مال بطور قرض لینا	676

عنوان	صفحہ	عنوان	صفحہ
مسجد کے مال کو کیسے خرچ کیا جائے؟	676	ممکن لذاتہ کیوں؟	695
مساجد کو برباد کرنے والے ظالم ہیں	677	رب تعالیٰ کی اولاد ماننا اسے گالی دینا ہے	696
مسجد کو برباد کرنے کی دو قسمیں ہیں	678	سوال، جواب	698
مقام حیرت!	679	رب تعالیٰ کی اولاد ماننے کا وبال دنیا میں	699
اعتراض	679	اعتراض، جواب	700
مغصوبہ زمین پر بنائی گئی مسجد میں اعتکاف	680	نکتہ، مقام توجہ	700
وَ لِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ الخ الآیة	681	خلاصہ کلام	701
شان نزول	681	بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الخ	702
نجاشی کا جنازہ پڑھانے کی حکمت	683	مختصر مطلب	702
فائدہ	684	قدرے تفصیل	702
دلیل، اعتراض، جواب	685	ان اصطلاحات میں فرق	703
قبلہ کے متعلق مسائل	687	طلباء کرام توجہ فرمائیں	704
مسئلہ	689	علامہ قرطبیؒ کی وضاحت	705
سمت قبلہ کے معلوم کرنے کا طریقہ	690	بدعت قبیحہ کیا ہے؟	706
فائدہ جلیلہ	691	بدعت کی دو قسموں کا ثبوت حدیث پاک سے	706
مسئلہ	692	اقسام بدعات	707
وَقَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ الخ	693	واجب، حرام، مستحب	707
شان نزول	693	مکروہ، مباح۔	707
ان کا قول اولاد کے متعلق کیسے تھا؟	694	قضاء کے مختلف معانی استعمال ہیں	708
اولاد کے تقاضا کرنے والے اسباب	694	قرآن پاک میں ''امر'' کئی معانی میں استعمال ہوا ہے	709
مخلوق اولاد نہیں ہوسکتی	695	عقیدہ، اعتراض، جواب	710
واجب لذاتہ کے بغیر تمام چیزیں			

عنوان	صفحہ
ایک اشکال کا حل	711
وَقَالَ الَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ الخ	713
مختصر مطلب	713
ماقبل سے تعلق	713
شان نزول	714
ان کی نادانی پر تعجب	717
نکتہ	717
روشن نشانیوں کا انکار	718
اِنَّآ اَرْسَلْنٰکَ بِالْحَقِّ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا الخ	720
شان نزول	720
حق سے مراد	722
تنبیہ	722
شان نزول میں ایک ضعیف روایت	723
افضل الانبیاء بزبان افضل الانبیاء	726
تنبیہ	727
قول صحابی	278
مقام یوسف بزبان سید الانبیاء	728
خاندانی عیب (گھٹیا کفو)	729
ایمان والدین کریمین کے متعلق مسالک	730
اہل علم کا پہلا مسلک	730
دوسرا مسلک	730
تیسرا، چوتھا مسلک	731

عنوان	صفحہ
مسلک اوّل کے شواہد	731
اس پر اہل علم کے بہت دلائل ہیں	734
''آزر'' حضرت ابراہیم کا چچا تھا!	735
تیسرا، چوتھا مسلک	740
اعتراض، جواب	741
آیت کریمہ کا شانِ نزول، (سند صحیح سے)	742
اعتراض، جواب	743
معمر کی روایت کی مؤید روایات	744
نکتہ	746
مسلم کی روایت میں غلطی کی وجوہ!	747
پہلی وجہ، دوسری وجہ	747
حدیث بالمعنی کی اور مثال	747
تیسری وجہ	748
چوتھی وجہ	749
پانچویں وجہ	751
متناً مضطرب کی ایک مثال	752
فقہ اکبر میں راقم کا موقف	753
معاملہ قسمت کا	754
میت کو تکلیف دینا ایسا ہی ہے جیسے زندہ کو تکلیف دینا!	755
رسول اللہ ﷺ کو ایذاء پہنچانا	756
اولیاء اللہ کو ایذاء پہنچانا	756

عنوان	صفحہ	عنوان	صفحہ
رسول اللہ ﷺ کو ایذاء دینا باعث کفر ہے	757	حضرت ابراہیمؑ کا نسب	779
مومنوں کو ایذاء دینا	757	امتحان مطابق شان	780
نتیجہ	758	کلمات سے مراد ستارے، چانداور سورج	780
قبور کو مسمار کرنے سے مسلمانوں کی		کلمات سے مراد ذبح ولد	782
دل آزاری ہوتی ہے!	758	کلمات سے مراد آگ	782
وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ الخ	759	کلمات سے مراد ہجرت	783
شان نزول	759	کلمات سے مراد شرائع اسلام	784
فائدہ، اعتراض، جواب	760	ان میں سے دس کا ذکر سورۂ براءۃ میں ہے	784
ملت کیا ہے؟	761	اور دس کا ذکر احزاب میں ہے	784
انتباہ	763	اور دس کا ذکر سورۂ مومنون اور	
یوں بھی کہا جا سکتا ہے	764	معارج میں ہے	785
اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَتْلُوْنَهٗ الخ	765	کلمات سے مراد مناسک حج	785
فائدہ	766	کلمات سے مراد دس سنن	786
ومن یکفر به فاولٓئک هم الخاسرون	768	تنبیہ	786
تنبیہ	769	شاندار تحقیق	787
يٰبَنِىْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا الخ	770	تنبیہ ضروری	787
وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِىْ الخ	770	ابراہیمؑ سے تمام امتحان لئے گئے	788
مکرر ذکر کیوں؟	771	ابراہیمؑ کے امتحانات قبل از نبوت ہوئے	
چند الفاظ مبارکہ میں فرق	771	یا بعد از نبوت؟	788
خلاصہ کلام	773	شاندار محاکمہ	789
وَاِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ الخ	774	راقم کا موقف	789
تنبیہ	777	امام لغوی معنی کے لحاظ سے عام ہے	790

عنوان	صفحہ	عنوان	صفحہ
زیر بحث آیت میں امام سے مراد کیا؟	792	دونوں حدیثوں میں تطبیق	808
ابراہیمؑ کی امامت عامہ کا تقاضہ نبوت	792	بغلوں کے بال دور کرنا	809
نبی کا معصوم ہونا ضروری ہے	793	استنجاء کرنا	809
نکتہ، فائدہ جلیلہ	794	ناخن کاٹنا	809
شیعہ اور امامت	795	حل اللغات، براجم، لثالثة، تسننوا	810
شیعہ حضرات کی طرف سے اعتراض	795	کلی کرنا	811
جواب	796	ناک میں پانی ڈالنا	811
امام ابوحنیفہؒ کا مسلک	797	مسواک کرنا	811
اس مسئلہ پر ائمہ اور علماء کا اتفاق ہے	798	مسواک کے اوقات مستحبہ	811
آیۃ کریمہ سے عصمت انبیاء ثابت ہے	798	مسواک کیسی ہو	812
فائدہ عظیمہ	799	مونچھوں کا کاٹنا	812
ایک اور وجہ دیکھیں	800	فائدہ	812
اسی مسئلہ پر اور دلیل	801	مقام توجہ	813
اسی مسئلہ کو اسطرح سمجھیں	801	مونچھیں کٹائیں، منڈائیں نہیں	814
اسی مسئلہ پر توجہ فرمائیں	802	ناخن اور بال وغیرہ کتنی مدت	
اے اللہ تو کریم ہے ہم عاجز بندے	803	میں کاٹے جائیں؟	815
سنن ابراہیمی پر قدرے تفصیل	804	راقم کا موقف	816
مسئلہ	804	مانگ نکالنا	817
فائدہ جلیلہ	805	ابراہیمؑ کے بالوں کا سفید ہونا	817
اعتراض، جواب	806	مسئلہ	818
بالغ ہونے کے بعد اسلام قبول کرنے کیلئے	807	مسئلہ خضاب	819
زیرناف بال مونڈنا	808	سیاہ خضاب کے متعلق	820

عنوان	صفحہ
راقم کا موقف	822
وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَاَمْنًا الخ	823
اعتراض، جواب	826
مسئلہ	827
کیا خواب امن	827
مسئلہ	828
مقام ابراہیم کیا ہے؟	830
حجر اسود اور مقام ابراہیم جنتی یاقوت ہیں	838
تعمیر کعبہ	838
آدم علیہ السلام کی تعمیر	838
ابراہیم علیہ السلام کی تعمیر	840
ابراہیم علیہ السلام کی تعمیر کے بعد	841
قریش کی تعمیر	841
حضرت عبداللہ بن زبیر کی تعمیر	842
کعبہ کی موجودہ تعمیر	842
تنبیہ	843
اعتراض، جواب،	845
مسئلہ	846
فائدہ	847
طواف کی اقسام	848
مسئلہ	849
رمل کے سنت ہونے کی وجہ	850
وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا الخ	850
تنبیہ	852
اعتراض، جواب	854
نبوت اور رزق دنیا میں فرق	856
قلیل نفع کا مطلب	857
فائدہ جلیلہ	861
وَاِذْ يَرْفَعُ اِبْرَاهِيْمُ الْقَوَاعِدَ الخ	962
علمی نکتہ	863
کعبہ شریف کی تعمیر	864
فائدہ جلیلہ	865
غزالی دوراں علامہ کاظمی کی تفسیر سے اقتباس	865
آپ کی عمر کتنی تھی؟	866
راقم کا موقف	867
اس دعا میں ایک لطیف اشارہ	869
اعتراض، جواب	870
رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ الخ	871
بعض اولاد کیلئے دعاء کیوں؟	872
اسی بحث سے گمراہوں کا رد ہو گیا	876
رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلاً مِّنْهُمْ الخ	877
حدیث اور اس کی وضاحت	879
ایک شبہ کا ازالہ	880
عجیب حکمت	881

عنوان	صفحہ	عنوان	صفحہ
تلاوت چند وجہ سے مطلوب ہے	883	شانِ نزول	910
حکمت کیا ہے؟	885	عقیدہ	911
پاکیزہ کرنے کی دعاء میں حکمت	888	وضاحت حدیث	914
نبی کریم ﷺ کا پاکیزہ کرنا	888	تراجم کا فرق	915
فائدہ	889	فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ ...... الخ	916
وَمَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرَاهِيْمَ الخ	890	مختصر مفہوم	916
شانِ نزول	890	اعتراض، جواب	917
تراجم کا تقابلی جائزہ	893	تسکین الجنان سے اقتباس	920
تنبیہ	894	وھو السمیع العلیم	921
اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗٓ اَسْلِمْ ......الخ	895	حضرت عثمان غنیؓ کے خون کا پہلا قطرہ	922
وَوَصّٰى بِهَآ اِبْرٰهٖمُ بَنِيْهِ وَيَعْقُوْبُ الخ	896	حق گوئی کی درخشاں مثال	922
تنبیہ ، فائدہ	898	صِبْغَةَ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً الخ	923
اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ حَضَرَ الخ	900	شانِ نزول	923
شانِ نزول	900	فائدہ جلیلہ	924
اعتراض، جواب	803	قُلْ اَتُحَآجُّوْنَنَا فِى اللّٰهِ ...... الخ	926
آیۂ کریمہ سے حاصل ہونیوالے مسائل	903	شانِ نزول	926
تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ...... الخ	904	عظمت قرآن	930
شانِ نزول	905	اَمْ تَقُوْلُوْنَ اِنَّ اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ الخ	931
وَقَالُوْا كُوْنُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى الخ	907	شانِ نزول	931
شانِ نزول	907	استفہام انکاری سے غرض زجر و توبیخ ہے	932
تنبیہ ،فائدہ	909	تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ...... الخ	934
قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ الخ	910	تنبیہ	936

﴿ یٰبَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ اذۡکُرُوۡا نِعۡمَتِیَ الَّتِیۡۤ اَنۡعَمۡتُ عَلَیۡکُمۡ وَاَنِّیۡ فَضَّلۡتُکُمۡ عَلَی الۡعٰلَمِیۡنَ ﴾

☆ ''اے اولاد یعقوب یاد کرو میرا وہ احسان جو میں نے تم پر کیا اور یہ کہ اس سارے زمانہ پر تمہیں بڑائی دی''۔

☆ ''اے اولاد یعقوب یاد کرو میری نعمتوں کو جو میں نے انعام کی ہیں تم پر۔ اور بیشک میں نے تمہیں فضیلت دی اس زمانے والوں پر''۔

یٰبَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ اذۡکُرُوۡا نِعۡمَتِیَ الَّتِیۡۤ اَنۡعَمۡتُ عَلَیۡکُمۡ:

اس کا پہلے ذکر ہو چکا ہے۔ پھر دوبارہ ذکر کیا گیا ہے اس کی وجہ کیا ہے؟ اس کی ایک وجہ یہ ہے:

" انما اعاد هذا الكلام مرة اخرى توكيدا للحجة عليهم وتحذيرا من ترك اتباع محمد ﷺ" (خازن)

اس کلام کو دوبارہ اس لئے ذکر کیا گیا تا کہ ان پر حجت قائم کرنے میں دوبارہ تاکید قائم کی جا سکے اور ان کو نبی کریم ﷺ کی اتباع کے چھوڑنے سے ڈرایا جا سکے۔

اور وجہ یہ تھی کہ بنی اسرائیل کو دوبارہ نعمتیں یاد دلانے میں جہاں ایک حکم کو زیادہ تاکید سے ذکر کرنا مقصود تھا۔ وہاں یہ بتانا بھی ضروری سمجھا گیا کہ یہ لوگ اتنے غافل ہیں کہ ایک مرتبہ ان کو یاد دلایا جائے تو یہ یاد نہیں کر سکتے اس لئے ان کو بار بار یاد دلا کر ان کی غفلت کو واضح کر دیا گیا۔

پہلے صرف نعمتوں کا ذکر کیا گیا۔ اب نعمتوں کے ذکر کے ساتھ ساتھ رب تعالیٰ کے عذاب اور اس کی گرفت کا ذکر بھی کیا جا رہا ہے تا کہ ترغیب اور ترہیب دونوں کا ذکر ہو جائے، گویا کہ ان کو یوں کہا گیا ہے۔

اے بنی اسرائیل " ان لم تطيعو في لاجل سوابق نعمتي فاطيعوني للخوف من لواحق عقابي"

اگر تم میری اطاعت میری نعمتوں کی وجہ سے نہیں کرتے جن نعمتوں کا پہلے ذکر کیا جا چکا ہے تو میرا عذاب جو تمہیں لاحق ہونے والا ہے اس کے خوف سے میری اطاعت کرو۔ (روح المعانی)

یا یوں کہا جائے کہ گویا رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿ ان لم تطيعوني لاجل سوالف نعمتي

علیکم فاطیعونی للخوف من عقابی فی المستقبل ﴾

اگر تم ماضی کی میری نعمتوں کو یاد کر کے میری اطاعت نہیں کرتے تو مستقبل کے میرے عذاب سے ڈر کر میری اطاعت کرو۔

(کبیر)

﴿ وَاَنِّیْ فَضَّلْتُکُمْ ﴾ : ''اور بیشک میں نے تمہیں فضیلت دی'' فضیلت بھی نعمت ہے جب پہلے تمام نعمتوں کا ذکر کر دیا گیا تو فضیلت کو علیحدہ ذکر کیوں کیا؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں قاعدہ ''تخصیص بعد از تعمیم'' پایا گیا ہے کیونکہ ''التفضیل ھو اجل النعم'' بنی اسرائیل کو فضیلت دیا جانا تمام نعمتوں سے عظیم نعمت تھی، اس لئے عام نعمتوں کے بعد اس کی خصوصیت کے پیش نظر اسے علیحدہ ذکر کر دیا گیا۔

(از روح المعانی)

بنی اسرائیل کو فضیلت کیا دی گئی؟

یہاں بھی خطاب اگرچہ نبی کریم ﷺ کے زمانہ کے بنی اسرائیل کو ہے، لیکن انہیں وہ نعمتیں اور وہ فضیلت یاد دلائی جا رہی جو ان کے آباؤ اجداد کو حاصل تھیں۔

اور یہ بھی خیال رہے کہ اس فضیلت سے مراد ان اسلاف یعنی آباؤ اجداد کی وہ فضیلت معتبر ہے جو موسیٰ علیہ السلام اور ان کے بعد انہوں نے جب تک دین کو نہیں بدلا تھا۔ جب انہوں نے دین کو بدل دیا تو وہ رب تعالیٰ کی رحمت سے دور ہو گئے، اور اس کے غضب کے مستحق ہو گئے۔ ان کی فضیلت کو علامہ مظہری رحمہ اللہ نے ان الفاظ سے ذکر فرمایا:

" فضلھم اللہ بما منح علیھم من النبوۃ والکتاب والایمان والعلم والاعمال الصالحۃ والملک والعدالۃ ومناصرۃ الانبیاء " (مظھری)

اللہ تعالیٰ نے ان کو نبوت عطا کر کے فضیلت دی۔ یعنی حضرت یعقوب علیہ السلام کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک آنے والے تمام انبیاء کرام بنی اسرائیل سے ہی ہوئے اور کتاب (توراۃ، زبور، انجیل) ان کو عطاء ہوئی، ایمان ان کو نصیب ہوا، علم ان کو دیا گیا۔ نیک اعمال کی توفیق ان کو بخشی گئی، بادشاہت ان کو حاصل رہی، عدالت ان کو حاصل ہوئی، اور انبیاء کرام کی امداد کی توفیق انہیں عطاء ہوئی۔

جب ان کے آباؤ اجداد کو ان چیزوں سے فضیلت دی گئی تو یقیناً ان کے لئے بھی وہ نعمت اور فضیلت پائی گئی، اس لئے کہ " فضل الآباء یوجب شرفا فی الابناء " آباء کی فضیلت کا شرف ان کی اولاد کو بھی حاصل ہوتا ہے۔ مقصد نعمتوں اور فضیلت کے ذکر کا یہ تھا کہ جب تمہیں معلوم ہے کہ انبیاء کرام کو وحی اور کتاب کے ذریعے رب تعالیٰ نے فضیلت سے نوازا اور تمہارے آباء پر نازل ہونے والی الہامی کتب میں نبی کریم ﷺ کے اوصاف کا ذکر ہے تو جب تک تم نبی کریم ﷺ اپر ایمان نہیں لاؤ گے تمہارا اپنی کتابوں پر ایمان ہو ہی نہیں سکتا۔ (از مظہری)

وَاَنِّیْ فَضَّلْتُکُمْ عَلَی الْعٰلَمِیْنَ : یہاں بظاہر یہ سمجھ آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو تمام جہان والوں پر فضیلت دی۔ اس پر یہ اعتراض ہوتا ہے:

" وھو انہ یلزم ان یکونوا افضل من محمد ﷺ وذلک باطل بالاتفاق "

کہ اس سے تو یہ لازم آئے گا کہ وہ نبی کریم ﷺ سے بھی افضل ہوں، حالانکہ یہ تو بالاتفاق باطل ہے، کیونکہ نبی کریم ﷺ تمام مخلوق سے افضل ہیں۔

بلکہ بنی اسرائیل تو نبی کریم ﷺ کی امت سے بھی افضل نہیں ہو سکتے۔ اسلئے کہ نبی کریم ﷺ کی امت کا تمام امتوں سے افضل ہونا رب تعالیٰ نے بیان فرمایا ﴿ کنتم خیر امۃ اخرجت للناس ﴾ اس کا جواب یہ دیا گیا " (علی العالمین) ای عالمی زمانھم " بنی اسرائیل کو انکے زمانے میں دوسرے لوگوں پر فضیلت دی گئی اس سے مراد ان کے آباء ہیں جب تک انہوں نے دین کو نہیں بدلا تھا۔
(از کبیر، بیضاوی، شیخ زادہ)

جلالین اور مظہری میں بھی یہی الفاظ ہیں " ای عالم زمانھم " ان کو اپنے زمانہ کے لوگوں پر فضیلت دی گئی تھی۔ صاوی میں " عالمی زمانھم " سے تفسیر جلالین میں مذکور ہونے کی وجہ بیان کی گئی ہے:

" (عالمی زمانھم) دفع بذلک ما یقال ان المراد بالعالمین ما سوی اللہ فیقتضی ان بنی اسرائیل افضل مما سواھم من الاولین والآخرین فاجاب بان المراد بالعالمین عالمو زمانھم " (صاوی)

" علی العالمین " سے بظاہر یہ پتہ چلتا تھا کہ 'عالم' تو اللہ تعالیٰ کے ماسوا تمام مخلوق کو کہا جاتا ہے۔ اس سے تو یہ لازم آئے گا کہ بنی اسرائیل کو تمام پہلے اور بعد میں آنے والے لوگوں پر فضیلت دی

گئی تھی حالانکہ یہ تو درست نہیں کہ ان کو نبی کریم ﷺ اور آپ کی امت پر فضیلت حاصل ہو۔ تو اس کا جواب یہ دیا گیا کہ "علی العلمین" سے مراد "علی عالمی زمانهم" ہے یعنی ان کو اپنے زمانہ میں دوسرے لوگوں پر فضیلت حاصل تھی۔ کمالین میں اس طرح ذکر کیا گیا:

"یعنی لیس المراد بالعالم جمیع ما سوی الله لیلزم تفضیلهم علی هذه الامة امة محمد ﷺ بل المراد بالعالم کل موجود سواه فی ذلک الوقت"

یعنی عالم سے مراد اللہ تعالیٰ کے بغیر جمیع اشیا نہیں تاکہ بنی اسرائیل کی فضیلت نبی کریم ﷺ کی امت پر لازم نہ آئے، بلکہ عالم سے مراد اس وقت ان کے بغیر جو بھی تھے ان پر انہیں فضیلت دی گئی۔

تفاسیر سے جو وضاحت ذکر کی گئی ہے اس کو بھی سامنے رکھیں اور تراجم کو بھی دیکھیں تو انشاء اللہ اعلیٰ حضرت کا ترجمہ بہت ہی خوب نظر آئے گا:

﴿ وَاَنِّیْ فَضَّلْتُکُمْ عَلَی الْعٰلَمِیْنَ ﴾

"اور اس کو کہ میں نے تم کو بڑائی دی تمام عالم پر" (محمود الحسن صاحب)

"تمہیں دنیا کی ساری قوموں پر فضیلت دی تھی" (مودودی صاحب)

"اور یہ کہ میں نے تم کو جہان کے لوگوں پر فضیلت بخشی تھی" (فتح محمد صاحب)

"اور وہ جو میں نے تم کو بڑا کیا جہان کے لوگوں سے" (شاہ عبد القادر صاحب)

"اور تحقیق میں نے بزرگی دی تم کو اوپر عالموں کے" (شاہ رفیع الدین صاحب)

"کہ میں نے تم کو تمام دنیا جہان والوں پر فوقیت دی تھی" (اشرف علی صاحب)

"اور یہ کہ اس سارے زمانہ میں تمہیں بڑائی دی" (اعلیٰ حضرت مولنا احمد رضا خان بریلویؒ)

تنبیہ: اسی آیۃ سے بعض لوگوں نے مطلقاً فرشتوں پر انسانوں کی فضیلت ثابت کی کہ ﴿عَلَی الْعٰلَمِیْنَ﴾ میں فرشتے بھی آتے ہیں۔ جب بنی اسرائیل کو تمام جہان والوں پر فضیلت حاصل ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر انسان کو ہر فرشتے پر فضیلت حاصل ہے۔ یہ قول ان لوگوں کا باطل ہے اس لئے کہ ﴿ عَلَی الْعٰلَمِیْنَ ﴾ سے مراد تمام جہان والے ہیں ہی نہیں، بلکہ صرف

بنی اسرئیل کے زمانہ کے لوگ ہیں اسی لئے علامہ بیضاوی نے فرمایا " واستدل به على تفضيل البشر على الملک وهو ضعيف " اس آیۃ سے یہ دلیل پکڑنا کہ ہرانسان ہرفرشتے سے افضل ہے درست نہیں۔ یہ دلیل کمزور ہے وجہ وہی ہے جس کا تفصیلی طور پر بیان کیا جاچکا ہے۔

﴿ وَاتَّقُوا يَوْمًا لَّا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْأً وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴾

۱) "اور ڈرو اس دن سے جس دن کوئی جان دوسرے کا بدلہ نہ ہو سکے گی، اور نہ کافر کے لئے کوئی سفارش مانی جائے اور نہ کچھ لے کر اس کی جان چھوڑی جائے اور نہ ان کی مدد ہو۔

۲) "اور ڈرو اس دن سے جس دن نہیں بدلہ دے گا کوئی نفس کسی نفس کی طرف سے کچھ (بھی)۔ اور نہیں قبول کی جائے کسی کافر کے لئے کوئی شفاعت۔ اور نہیں لیا جائے گا اس سے کوئی فدیہ اور نہ ہی ان کی مدد کی جائے گی"

بنی اسرائیل کو نعمتیں یاد دلانے کا اصل مقصد یہی تھا کہ وہ نبی کریم ﷺ پر ایمان لائیں پہلے نعمتوں کا ذکر کر کے ان کو ایمان لانے کا حکم دیا گیا۔ اب وعید ذکر کر کے یعنی ڈرا کر ان کو ایمان لانے کے متعلق کہا جارہا ہے کہ اگر تم نے نبی کریم ﷺ پر ایمان نہ لایا تو رب تعالیٰ کی گرفت میں آجاؤ گے، پھر تمہیں اس سے چھڑانے والا کوئی نہیں ہوگا۔

سزا سے چھڑانے کے چار طریقوں کی نفی:

کوئی شخص کسی دوسرے کو عذاب سے یا تو قہر و دبدبہ سے چھڑاتا ہے یا اس کے بغیر۔ پہلی صورت یعنی کسی کو زبردستی چھڑا لینا نصرت ہے، اس کی نفی بھی کر دی۔ دوسری صورت یعنی زبردستی کسی کو نہ چھڑایا جائے بلکہ سفارش کے ذریعے مفت ہی چھڑا لیا جائے اس کی نفی بھی کر دی۔ دوسری صورت یعنی زبردستی کسی کو نہ چھڑایا جائے۔ بلکہ سفارش کے ذریعے مفت ہی چھڑا لیا جائے اس کی نفی بھی کر دی۔ تیسری صورت یہ ہے کہ کسی کو چھڑایا جائے لیکن اس کے ذمہ جو حقوق ہین وہ ادا کر دیئے جائیں اس کی بھی نفی کر

دی چوتھی صورت یہ ہے کہ مال بطور فدیہ دے کر کسی کو چھڑا لیا جائے، اس کی بھی نفی کر دی۔ (بیضاوی)

﴿ وَاتَّقُوْا ﴾: وقی سے ماخوذ ہے جس کا معنی بچنا۔ اصل مطلب ہے بچ جاؤ پھر تقریباً مراد یہی ہے کہ ڈر جاؤ۔

﴿ یَوْمًا ﴾: "ای ما فیه من الحساب و العذاب" یعنی اس دن سے ڈرو جس دن حساب و کتاب ہونا ہے۔ اور اس دن سے ڈرو جس دن کفار کے لئے عذاب ہوتا ہے۔

دینی طلباء کرام کی توجہ کے لئے:

"یوما" کو "اتقوا" کی طرف ظرف نہیں بنایا جا سکتا۔ کیونکہ ڈرنا تو دنیا میں ہے قیامت میں ڈرنا کوئی نفع نہیں دے گا۔ اور "یوما" کو مفعول بہ بھی نہیں بنایا جا سکتا کیونکہ دن سے ڈرنا مقصود نہیں، بلکہ مقصود اس دن کے عذاب اور حساب سے ہے۔ اس لئے حذف مضاف ہے یعنی مقصد اس طرح مکمل ہوگا جب کہ عبارت یوں ہوگی:

﴿ وَاتَّقُوْا عَذَابَ یَوْمَ وَحِسَابِ یَوْمَ ﴾ اس دن کے حساب اور عذاب سے ڈرو۔

(از شیخ زادہ)

لَّا تَجْزِیْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَیْئًا:

"ای لا تقضی عن غیرها و لا تؤدی شیأ من الحقوق الفائتة علی ذلک الغیر"

کوئی نفس کسی دوسرے نفس کے فوت ہونے والے حقوق کو اس کی طرف سے ادا نہیں کر سکے گا۔

فائدہ: جزی عنه کا معنی ہے "قضی عنه" اس کی طرف سے ادا کر دیا۔ جیسا کہ حضرت ابو بردہ بن نیار کی حدیث میں مذکور ہے "تجزی عنک و لا تجزی عن احد بعدک" یہ چھ ماہ کا بکری کا بچہ تمہاری قربانی کو ادا کر دے گا، لیکن تمہارے بعد کسی اور کی قربانی کو ادا نہیں کرے گا۔

بخاری میں حدیث مذکور ہے:

"ان ابا بردة قال یا رسول الله انی نسکت شاتی قبل الصلوة و عرفت

ان الیوم یوم اکل وشرب واحببت ان تکون شاتی اول ما یذبح فی بیتی فذبحتها وتغدیت بها قبل ان آتی الصلوۃ فقال رسول اللہ ﷺ "شاتک شاۃ لحم، قال یا رسول اللہ فان عندنا عناقا جزعۃ ھی احب الی من شاتین افتجزی عنی قال نعم ولا تجزی عن احد بعدک"

حضرت ابو بردہ نے کہا یا رسول اللہ بیشک میں نے نماز سے پہلے اپنی بکری کو بطور قربانی ذبح کر دیا، کیونکہ میں نے یہی سمجھا کہ یہ کھانے پینے کا دن ہے، اس لئے میں نے یہ پسند کیا کہ میرے گھر میں سب سے پہلے بکری ذبح ہو۔ میں نے بکری کو ذبح کر لیا اور نماز میں آنے سے پہلے صبح صبح کھانا بھی کھا آیا، نبی کریم ﷺ نے فرمایا تمہاری یہ بکری تو گوشت ہی بنی (قربانی تو نماز سے پہلے ادا نہیں ہوتی) انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ میرے پاس چھ ماہ کا ایک بکری کا بچہ ہے جو مجھے دو بکریوں سے بھی زیادہ پسند ہے، کیا وہ میری قربانی ادا کر دے گا۔ آپ نے فرمایا ہاں (تمہاری قربانی تو ادا کر دے گا) لیکن تمہارے بعد کسی ایک کی قربانی ادا نہیں کرے گا۔

اس حدیث پاک کو بیان کرنے سے صرف لفظی تحقیق مراد ہے کہ "لا تجزی" کا معنی "لاتقضی" ہے۔ (از شیخ زادہ)

ہاں البتہ یہ خیال رہے کہ نبی کریم ﷺ کو رب تعالیٰ نے امور شرعیہ میں مختار بنایا۔ اسی لئے ایک حکم کو ایک صحابی کے لئے جائز رکھا، لیکن دوسروں کے لئے جائز نہیں۔ "لا تجزی" اگر جزاء سے ہو" یا" صرف رسم الخط کے طور پر ہو اصل میں ہمزہ ہو (چونکہ بعض قراءتوں میں ہمزہ سے بھی استعمال ہے) تو معنی یہ ہو گا:

"لو تؤاخذ نفس بذنب اخری ولا تدفع عنها شیأ"

"کسی نفس کو دوسرے نفس کے بدلے میں پکڑا نہیں جائے گا کہ ایک نفس دوسرے نفس کی جگہ عذاب میں مبتلاء ہو کر اسے عذاب سے چھڑا لے ایسا نہیں ہو سکے گا۔

تنبیہ: ایسا تو نہیں ہو سکے گا کہ بندہ خود کہے کہ میں کسی کے حقوق ادا کر دیتا ہوں یا یہ کہے کہ مجھے اس کی جگہ پکڑ لیا جائے اور اسے چھوڑ دیا جائے۔ لیکن یہ ہو سکے گا کہ اللہ تعالیٰ خود کسی کی گرفت کرے اور بطور سزا اس کے اعمال لے کر دوسرے کے دے دیئے جائیں جیسا کہ حدیث شریف میں ہے:

☆ " عن ابی هریرة ان رسول الله ﷺ قال من كانت عنده مظلمة لأخيه من عرضه اوشئی فليتحلله منه اليوم قبل الا يكون دينار ولادرهم ان كان له عمل صالح اخذ منه بقدر مظلمته وان لم يكن له حسنات اخذ من سيات صاحبه فحمل عليه "......خرجه البخاری .

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کسی شخص پر اپنے دوسرے (مومن) بھائی کے حقوق ہوں۔ اس نے کچھ مظالم کیے ہوئے ہوں تو ان حقوق کو ادا کردے ان مظالم کو معاف کرالے اس دن سے پہلے جس دن کوئی دینار اور کوئی درھم اس کے پاس نہیں ہوں گے، اس لئے جتنے حقوق اس کے ذمہ ہوں گے ان کے بدلے اس کے نیک اعمال لے کر اس دوسرے شخص کو دے دیئے جائیں گے۔ اگر اس کے نیک اعمال نہ ہوئے تو دوسرے شخص کے گناہ اس کے کھاتہ میں ڈال دیئے جائیں گے۔ (از قرطبی)

☆ " عن ابی هریرة ان رسول الله ﷺ قال اتدرون ما المفلس قالوا المفلس فينا من لادرهم له ولا متاع فقال ان المفلس من امتی من یاتی یوم القيامة بصلوة وصيام وزكوة ویاتی قد شتم هذا وقذف هذا واكل مال هذا وسفک دم هذا وضرب هذا فيعطی هذا من حسناته وهذا من حسناته فان فنيت حسناته قبل ان يقضی ما عليه اخذ من خطاياهم فطرحت عليه ثم طرح فی النار " (مسلم ج ۲ باب تحريم الظلم ص ۳۲۸)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں بیشک نبی کریم ﷺ نے فرمایا کیا تم جانتے ہو غریب کون ہے؟ صحابہ کرام نے عرض کیا ہم میں غریب وہ ہوتا ہے جس کے پاس مال ومتاع نہ ہو، تو آپ نے فرمایا میری امت میں سے غریب وہ ہوگا جس شخص کے پاس قیامت کے دن نمازیں، روزے اور زکوۃ (جیسے نیک اعمال) ہوں گے، لیکن اس نے کسی کو گالی دی ہوں گی، کسی کو تہمت لگائی ہوگی کسی کا مال کھایا ہوگا، کسی کا خون بہایا ہوگا، کسی کو مارا ہوگا، تو اس کی نیکیاں ایک کو دی جائیں گی اور دوسرے کو دی جائیں گی اگر اس کے ذمہ جو حقوق تھے وہ ان نیکیوں سے ادا نہ ہوئے تو ان لوگوں کے گناہ اس پر ڈال دیئے جائیں گے اور اسے آگ میں ڈال دیا جائے گا۔

مقام توجہ: علامہ نووی رحمہ اللہ نے اسی حدیث کی شرح میں بیان فرمایا ہے کہ بعض مبتدعہ فرقہ نے یہ کہا ہے کہ یہ حدیث اللہ تعالی کے ارشاد گرامی:

﴿ وَلا تَـزِرُ وَازِرَةٌ اُخْرٰی ﴾ ''کوئی نفس کسی نفس کا بوجھ نہیں اٹھائے گا'' کے منافی ہے لیکن ان کا یہ کہنا غلط اور باطل ہے کیونکہ آیۃ کریمہ اور حدیث پاک میں وجوہ مختلف ہیں۔

حدیث شریف میں ذکر ہے کہ لوگوں کے حقوق اپنے ذمہ لے کر مرنے والے کو اس کے فعل، اس کے اپنے بوجھ، اس کے ظلم کی وجہ سے عذاب دیا جائے گا، اسی عذاب کا یہ حصہ بھی ہوگا کہ لوگوں کے حقوق اس کی طرف متوجہ ہوں گے، اس کی نیکیاں ان کو دے دی جائیں گی۔ جب اس کی نیکیاں ختم ہوجائیں گی اور ابھی لوگوں کے حقوق ختم نہیں ہوں گے تو اللہ تعالیٰ اپنے حکمت کے تقاضا کے پیش نظر اور اپنی مخلوق میں عدل کرنے کی وجہ سے ان کے گناہ اس کے ذمہ لگادے گا، اور اسے آگ کا عذاب دیا جائیگا۔

" فحقيقة العقوبة انما هي بسبب ظلمه ولم يعاقب بغير جناية و ظلم منه وهذا كله مذهب اهل السنة "

اس کو عذاب اس کے ظلم کی وجہ سے ہوگا ایسا نہیں کہ اس کو بغیر کسی جرم اور بغیر کسی ظلم کے عذاب دے دیا جائے یہ سب اہل سنت و جماعت کا مذہب ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

اب واضح ہو گیا کہ آیت کریمہ کا مطلب یہ ہے کہ بغیر جنابت اور بغیر ظلم کے کسی کا بوجھ کسی دوسرے کے سر نہیں ڈالا جائے گا، اور نہ ہی اپنی خوشی سے کسی کا بوجھ کوئی دوسرا اٹھائے گا۔

﴿ وَلا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ ﴾: ''اور کسی کافر کی شفارش قبول نہیں کی جائے گی''۔

"الشفاعة ماخوذة من الشفع وهما الاثنان " شفاعت ماخوذ ہے شفع سے جس کا معنی ہے دو اس کا مقابل لفظ وتر ہے جب کسی کی سفارش کی جاتی ہے تو یقینی بات ہے کہ وہ پہلے ایک ہوتا ہے، اور پھر وہ دو ہوجاتے ہیں۔

زمین پر شفعہ کرنے کا بھی یہی مطلب ہے کہ وہ شفعہ کے ذریعے اپنی زمین سے دوسرے کی زمین کو ملا لیتا ہے یہاں مطلقاً شفاعت کے نہ قبول کا ذکر نہیں بلکہ اس سے مراد کفار ہیں کہ ان کے لئے شفاعت قبول نہیں۔ (از قرطبی)

شفاعت کا تفصیلی ذکر انشاء اللہ آیۃ کریمہ کی لفظی بحث کے بعد کیا جارہا ہے۔

﴿ وَلا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ ﴾: اور کسی نفس کا فدیہ نہیں لیا جائے گا۔ العدل (بفتح العين)

فداء ، وبکسرها المثل ۔عدل کو جب عین کے فتحہ سے پڑھا جائے تو اس کا معنی فدیہ، اور جب عین کے کسرہ سے پڑھا جائے تو اس کا معنی ہے مثل ، یہاں پہلا معنی ہی معتبر ہے۔

﴿وَلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ﴾: ای یعانون ، والنصر ، العون ، والانصار ، الاعوان

اوران کی مدد نہیں کی جائے گی ،نصر کا معنی ہے مدد کرنا، اور انصار کا معنی مددگار۔ (از قرطبی)

نصرت اور معونت میں فرق:

" والنصر اخص من المعونة لا ختصاصه بدفع الضر والشدائد بخلاف المعونة فانها قد تکون لاقامة الصنائع والاعمال "

(بیضاوی مع شیخ زاده)

نصرت بنسبت معونت کے خاص ہے کیونکہ نصرت اسی امداد سے خاص ہے جس کی وجہ سے مشکلات کو دور کیا جائے۔لیکن معونت عام ہے اس لئے کہ معونت میں وہ معنی بھی پایا جاتا ہے جو نصرت میں پایا جاتا ہے لیکن اس میں یہ معنی بھی پایا جاتا ہے کہ کسی کی صنعت اور عمل میں امداد کی جائے۔

لیکن یہ بھی خیال رہے کہ یہ فرق تو حقیقی معنی کے لحاظ پر ہے مجازی معنی کے لحاظ پر نصرت بھی عام معنی میں استعمال ہوتا رہتا ہے، یعنی مطلقاً امداد کرنا نصرت کہلاتا ہے خواہ مشکلات کے دور کرنے میں امداد کی جائے ،خواہ کسی کے کام میں اس کی امداد کی جائے۔

شفاعت کی بحث: شفاعت کا لغوی معنی پہلے عرض کر دیا گیا ہے شفاعت کا اصطلاحی معنی یہ ہے:

" الشفاعة ان یستوهب احد لا حد شیأ ویطلب له حاجة "

شفاعت کا مطلب یہ ہے کوئی شخص دوسرے کے لئے بخشش کا مطالبہ کرے اور اس کے لئے حاجت طلب کرے۔

اس آیۃ کریمہ میں شفاعت کی نفی کفار کے لئے ہے:

"﴿وَلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ﴾ ای النفس المؤمنة لا تقبل شفاعتها فی النفس الکافرة "

یعنی کسی مومن کی طرف سے کافر کے حق میں کوئی شفاعت قبول نہیں کی جائے گی۔

اسی سے یہ واضح ہو گیا کہ کافر کے لئے جب مومن شفاعت نہیں کر سکے گا تو کافر کے لئے کافر کی

شفاعت کرنا تو عقلاً محال ہے۔

تنبیہ: " لم یؤذن لها فی اصل الشفاعة حتی یتسبب عنها القبول ولیس المرادانها تشفع ولکن لا یقبل منها تلک الشفاعة لقوله تعالیٰ فما لنا من شافعین "

مومنوں کو یہ حق ہی نہیں دیا جائے گا کہ وہ کافروں کے لئے شفاعت کریں۔ جب ان کو یہ حق ہی حاصل نہیں ہوگا تو یقیناً قبول کرنے کی کوئی صورت ہی نہیں ہوگی۔ آیۃ کریمہ کا یہ مطلب نہیں کہ مومن حضرات کافروں کے لئے شفاعت کریں گے اور ان کی شفاعت کو قبول نہیں کیا جائے گا، بلکہ انہوں نے شفاعت کرنی ہی نہیں۔ (از صاوی)

﴿ وَلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ ﴾ یعنی من الکافرین کما قال فما تنفعهم شفاعة الشافعین "

اس آیۃ کریمہ اور دوسری آیۃ کریمہ ﴿ فَمَا تَنفَعُهُمْ شَفَاعَةُ الشَّافِعِينَ ﴾ کا مفہوم ایک ہی ہے کہ کافروں کے لئے کوئی شفاعت نفع مند نہیں ہوگی۔ (از ابن کثیر)

" ارید بالآیة نفی ان یدفع العذاب عن احد من الکفار احد بوجه من الوجود فانه اما ان یکون قهرا فهو النصرة او بلاقهر مجانا وهو الشفاعة او باداء ما کان علیه وهو ان یجزی عنه او بغیره وهو ان یعطی عنه عدلا " (مظهری)

آیۃ کریمہ میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ کافروں سے عذاب کو کسی طرح بھی دور نہیں کیا جاسکے گا، نہ قہر سے کسی کی نصرت (امداد) ہوگی۔ اور نہ ہی بغیر قہر کے مفت کسی کی شفاعت کو قبول کیا جاسکے گا اور نہ ہی کوئی کسی کے حقوق ادا کر سکے گا اور نہ ہی کوئی کسی کے بدلے میں اپنے آپ کو عذاب میں گرفتار کرے گا اور نہ ہی کوئی کسی کا فدیہ دے سکے گا۔

اس سے واضح ہوا کہ اس آیۃ میں ذکر ہی کفار کا ہے اور کفار کے لئے ہی شفاعت کے نہ قبول کرنے کا ذکر ہے:

" والمعنی لا تقبل الشفاعة اذا کانت النفس کافرة "

مطلب یہی ہے کہ کافر کے لئے شفاعت قبول نہیں کی جائیگی۔ (خازن)

" ای لا تقبل الشفاعة اذا کانت النفس کافرة "

مطلب یہی ہے کہ کافر کے لئے شفاعت قبول نہیں کی جائیگی۔ (مدارک)

تقریباً جمیع مفسرین کا اس پر اتفاق ہے کہ آیۂ کریمہ میں شفاعت کی نفی کافروں کے لئے یہ مطلب ہی نہیں کہ کسی کی شفاعت کسی کے لئے بھی قبول نہیں۔

تراجم کو دیکھئے: ابھی تک جو مختصر بحث کی ہے اس سے تراجم میں فرق سمجھنا آسان ہو گیا، اگرچہ تفصیلی بحث ابھی ان شاء اللہ متصل ہی بیان ہو رہی ہے۔

﴿ وَلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ ﴾

''اور قبول نہ اس کی طرف سے سفارش'' (محمود الحسن صاحب، شاہ عبدالقادر صاحب)

''نہ کسی کی طرف سے سفارش قبول ہو گی'' (مودودی صاحب)

''اور نہ کسی کی سفارش منظور کی جائے گی'' (فتح محمد صاحب)

''اور ان قبول کی جائے اس سے سفارش'' (شاہ رفیع الدین صاحب)

''اور نہ کسی شخص کی طرف سے کوئی سفارش قبول ہو سکتی ہے'' (اشرف علی صاحب)

''اور نہ کسی کے حق میں سفارش قبول ہو گی'' (عبدالماجد صاحب)

''اور نہ کافر کے لئے کوئی سفارش مانی جائے'' (اعلیٰ حضرت مولنا احمد رضا خان بریلویؒ)

تراجم سے دیکھنے سے واضح ہوا کہ اعلیٰ حضرت مولنا احمد رضا خان بریلوی رحمہ اللہ کا ترجمہ مفسرین کرام کی طویل بحثوں کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔ اور دوسرے تراجم شکوک وشبہات تو پیدا کر رہے ہیں لیکن اصل مسئلہ سمجھانے سے قاصر ہیں کیونکہ دوسرے تراجم سے یہ پتہ چلتا ہے کہ کسی کی سفارش کسی کے لئے قبول نہیں۔ حالانکہ یہ غلط ہے کیونکہ انبیاء کرام اور صلحاء کی شفاعت قبول ہو گی۔ لیکن اعلیٰ حضرت کے ترجمہ سے واضح ہو رہا ہے کہ یہاں شفاعت کی نفی کافروں کے حق میں ہے کہ کافر کے لئے سفارش قبول نہیں ہو گی۔

شفاعت کا ثبوت قرآن پاک سے:

﴿ وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْا اَنْفُسَهُمْ جَاءُوْكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا ﴾ (پ ۵ ع ٦)

''اور اگر وہ اپنی جانوں پر ظلم کریں تو اے محبوب تمہارے حضور حاضر ہوں اور پھر اللہ سے معافی چاہیں

اور رسول ان کی شفاعت فرمائے تو ضرور اللہ کو بہت توبہ قبول کرنے والا مہربان پائیں"

اس آیۂ کریمہ میں رسول اللہ ﷺ کو گناہگار لوگوں کی شفاعت کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ آپ کی شفاعت کو رب تعالیٰ قبول فرما کر ان کی توبہ قبول کرے گا اور ان پر رحم فرمائے گا۔

﴿ عَسٰی اَنْ یَّبْعَثَکَ رَبُّکَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا ﴾ (پ ۱۵)

"قریب ہے کہ تمہیں تمہارا رب ایسی جگہ کھڑا کرے جہاں سب تمہاری حمد کریں"

مقام محمود مقام شفاعت ہے کہ اس میں اولین و آخرین حضور کی حمد کریں گے، اسی پر جمہور ہیں۔

(خزائن العرفان)

﴿ وَلَسَوْفَ یُعْطِیْکَ رَبُّکَ فَتَرْضٰی ﴾ (پ ۳۰)

"اور بیشک قریب ہے کہ تمہارا رب تمہیں اتنا دے گا کہ تم راضی ہو جاؤ گے"

اور یہ آیت آخرت کی عزت و تکریم کو بھی شامل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو شفاعت عامہ وخاصہ اور مقام محمود وغیرہ جلیل نعمتیں عطا فرمائیں۔ مسلم شریف کی حدیث شریف میں ہے نبی کریم ﷺ نے دونوں ہاتھ مبارک اٹھا کر امت کے حق میں رو کر دعا فرمائی اور عرض کیا "اللھم امتی امتی" اللہ تعالیٰ نے جبرائیل کو حکم دیا کہ محمد مصطفیٰ ﷺ کی خدمت میں جا کر دریافت کرو رونے کا کیا سبب ہے باوجودیکہ اللہ تعالیٰ جاننے والا ہے، جبرائیل نے اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق آ کر دریافت کیا، نبی کریم ﷺ نے انہیں تمام حال بیان کیا اور امت کے غم کے متعلق بیان فرمایا، جبرائیل امین نے رب کے حضور عرض کیا کہ تیرے محبوب یہ بتاتے ہیں۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ خوب جاننے والا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جبرائیل کو حکم دیا کہ جاؤ اور میرے حبیب ﷺ سے کہو کہ ہم آپ کو آپ کی امت کے بارے میں عنقریب راضی کریں گے۔ اور آپ کو گراں خاطر (بوجھل دل) نہ ہونے دیں گے۔

حدیث شریف میں ہے جب یہ آیت نازل ہوئی تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ جب تک میرا ایک امتی بھی دوزخ میں رہے میں راضی نہیں ہوں گا۔ آیت کریمہ کی وضاحت حدیث پاک سے جو بیان کی گئی اس سے واضح ہو گیا کہ حضور ﷺ کو اپنی امت کی شفاعت کا حق دیا گیا۔ (از خزائن)

﴿ وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِکَ وَلِلْمُؤْمِنِیْنَ وَلِلْمُؤْمِنٰتِ ﴾ (پ ۲۶)

"اور اے محبوب اپنے خاصوں اور عام مسلمانوں مردوں اور عورتوں کے گناہوں کی معافی ما -

اس آیۃ کریمہ میں بھی واضح طور پر رب تعالیٰ نے اپنے حبیب پاک علیہ الصلوۃ والسلام کو اپنی امت کے خاص اور عام مردوں اور عورتوں کے لئے شفاعت کا حکم دیا۔

﴿ مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَہٗ اِلَّا بِاِذْنِہٖ ﴾ (پ ۳)

''وہ کون ہے جو اس کے ہاں سفارش کرے بغیر اس کی اجازت کے''

اس آیۃ میں کفار کا رد ہے کیونکہ وہ کہتے تھے کہ ہمارے بت ہماری شفاعت کریں گے لیکن رب تعالیٰ نے ان کا رد فرماتے ہوئے یہ ارشاد فرمایا ﴿ مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَہٗ اِلَّا بِاِذْنِہٖ ﴾ جس سے واضح ہو رہا ہے کہ رب تعالیٰ کے ہاں اس کی اجازت کے بغیر کسی کو شفاعت کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں ہوگا ہاں البتہ انبیاء کرام، ملائکہ، شہداء، علماء کو رب تعالیٰ کی طرف سے شفاعت کرنے کا اذن حاصل ہوگا۔

﴿ لَا یَمْلِکُوْنَ الشَّفَاعَۃَ اِلَّا مَنِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَھْدًا ﴾ (پ ۱۶)

''لوگ شفاعت کے مالک نہیں مگر وہی جنھوں نے رحمٰن کے پاس قرار رکھا ہے

یعنی رب تعالیٰ کے ہاں شفاعت کرنے کا کسی کو حق حاصل نہیں ہوگا، سوائے ان کے جن کا رب کے پاس عہد ہے مراد یہی ہے کہ جن کو رب تعالیٰ کی طرف سے اجازت ہوگی وہی شفاعت کے مالک ہوں گے۔

﴿ یَوْمَ لَا یَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ ☆ اِلَّا مَنْ اَتَی اللّٰہَ بِقَلْبٍ سَلِیْمٍ ﴾

''جس دن نہ مال کام آئے گا نہ بیٹے مگر وہ جو اللہ کے حضور حاضر ہوا سلامت دل لے کر''

سلامت دل لے کر کا یہ مطلب ہے کہ شرک اور کفر سے پاک ہو کر رب تعالیٰ کے ہاں جو حاضر ہوں گے ان کو مال بھی نفع دے گا جو راہ خدا میں خرچ کیا ہو، اور اولاد بھی صالح ہو جیسا کہ حدیث شریف میں ہے کہ جب آدمی مرتا ہے اس کے عمل منقطع ہو جاتے ہیں سوا تین کے ایک صدقہ جاریہ، دوسرا وہ مال جس سے وہ لوگ نفع اٹھائیں تیسری نیک اولاد جو اس کے لئے دعا کرے۔

﴿ خُذْ مِنْ اَمْوَالِھِمْ صَدَقَۃً تُطَھِّرُھُمْ وَتُزَکِّیْھِمْ بِھَا وَصَلِّ عَلَیْھِمْ اِنَّ صَلٰوتَکَ سَکَنٌ لَّھُمْ وَاللّٰہُ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ ﴾ (پ ۱۱)

''اے محبوب ان کے مال میں سے زکواۃ حاصل کرو، جس سے تم انہیں ستھرا اور پاکیزہ کر دو اور ان کے حق

میں دعاءِ خیر کرو، بیشک تمہاری دعا ان کے دلوں کا چین ہے اور اللہ سننے والا، جاننے والا ہے"۔

اس آیۂ کریمہ میں بھی رب تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو ان لوگوں کے لئے دعاء کرنے کا حکم دیا جن سے آپ زکواۃ حاصل کریں اور ساتھ یہ بھی بتا دیا کہ آپ کی دعا ان کے دلوں کا چین ہے۔ سبحان اللہ اگر شفاعت قبول ہی نہ ہوتو آپ کو دعاء کرنے اور شفاعت کرنے کا حکم دینے کا کیا فائدہ ہے۔

جن آیات کریمہ کا ذکر کیا گیا ہے ان تمام سے واضح طور پر سمجھ آ رہا ہے کہ شفاعت کرنے کا ان بزرگ ہستیوں کو حق حاصل ہے جن کو رب تعالیٰ نے اجازت دے رکھی ہے۔

شفاعت کا ثبوت احادیث مبارکہ سے:

" عن ابی هریرة عن النبی ﷺ قال اسعد الناس بشفاعتی یوم القیامة من قال لا اله الا الله خالصا من قلبه او نفسه " (رواه البخاری ، مشکوة باب الشفاعة)

حضرت ابو ہریرہ ؓ فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ نے فرمایا قیامت کے دن لوگوں میں سے وہ شخص نیک بخت ہوگا جس کو میری شفاعت حاصل ہوگی، میری شفاعت اسے ہی حاصل ہوگی جس نے خلوص قلب رخلوص نفس سے لا اله الا الله کہا۔

اس حدیث پاک سے پتہ چلا کہ جو شخص مومن ہوا یعنی اس نے " لا الـه الا الله " پڑھا لیکن اس میں کوئی منافقت نہیں تھی اور شرک اور شک اور ریاء اور لوگوں کو سنانا، اپنا چرچا کرنا مقصود نہیں تھا تو اسے نبی کریم ﷺ کی شفاعت حاصل ہوگی۔ اور آپ کی شفاعت سے اسے سعادت حاصل ہوگی۔

☆ " وعن عبد الله بن عمرو بن العاص ان النبی ﷺ تلا قول الله تعالٰی فی ابراهیم رب انهن اضللن کثیرا من الناس فمن تبعنی فانه منی وقال عیسی ان تعذبهم فانهم عبادک فرفع یدیه فقال اللهم امتی امتی وبکی فقال الله تعالٰی یا جبریل اذهب الی محمد وربک اعلم فسله ما یبکیک فاتاه جبریل فسأله فاخبره رسول الله ﷺ بما قال فقال الله تعالٰی لجبریل اذهب الی محمد فقل انا سنرضیک فی امتک ولا نسؤک "

(رواه مسلم مشکوة باب الشفاعة)

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کا ارشاد جو ابراہیم علیہ السلام کے حق میں نازل ہوا ﴿ رَبِّ اِنَّهُنَّ اَضْلَلْنَ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ فَمَنْ تَبِعَنِىْ فَاِنَّهٗ مِنِّىْ ﴾

تلاوت فرمایا۔

اور عیسیٰ علیہ السلام کے قول کی جو رب تعالیٰ نے حکایت بیان فرمائی ﴿ اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ ﴾ اسے تلاوت فرمایا پھر آپ نے اپنے دونوں ہاتھوں کو اٹھایا تو کہا" اللھم امتی امتی" اور آپ رونے لگ گئے۔ رب تعالیٰ نے فرمایا اے جبریل جاؤ محمد ﷺ کے پاس حالانکہ آپ کا رب خوب جانتا ہے پھر بھی ان سے سوال کرو تمہیں کس چیز نے رلایا۔ آپ کے پاس جبریل آئے انہوں نے آپ سے پوچھا رسول اللہ ﷺ نے اسے خبر دی۔ جبریل نے رب تعالیٰ کو بتایا جو نبی کریم ﷺ نے بتایا رب تعالیٰ نے جبریل کو کہا جاؤ محمد (ﷺ) کے پاس ان کو کہو ہم تمہیں تمہاری امت کے بارے میں راضی کریں گے پریشان نہیں کریں گے۔

وضاحت حدیث:

رسول اللہ ﷺ نے جب اس آیۃ کریمہ کا یہ حصہ تلاوت فرمایا ﴿ رَبِّ اِنَّهُنَّ اَضْلَلْنَ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ فَمَنْ تَبِعَنِيْ فَاِنَّهٗ مِنِّيْ ﴾ جس کا بعد والا حصہ یہ ہے ﴿ وَمَنْ عَصَانِيْ فَاِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴾ مکمل آیۃ کا ترجمہ اور مقصد یہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے رب تعالیٰ کے حضور عرض کیا اے میرے رب بیشک ان بتوں نے بہت سے لوگوں کو گمراہ کر دیا۔ یعنی یہ لوگوں کی گمراہی کا سبب ہیں۔ پس جس شخص نے میری تابعداری کی توحید اور اخلاص اور توکل میں بیشک وہ میرے متبعین ہیں اور میرا گروہ ہیں اور جس نے میری نافرمانی کی بیشک تو بخشنے والا، رحم کرنے والا ہے۔

عیسیٰ علیہ السلام نے رب کے حضور جو عرض کیا اسے قرآن پاک نے پیش کیا، نبی کریم ﷺ نے اس کی تلاوت فرمائی ﴿ اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ ﴾ اور اس سے آگے ہے ﴿ وَاِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴾ ان تمام الفاظ مبارکہ کا ترجمہ اور مطلب یہ ہے کہ اے اللہ تو ان کو عذاب دے تو بیشک وہ تیرے بندے ہیں اور اگر تو ان کی مغفرت کر دے تو بیشک تو غالب اور حکمت والا ہے یعنی تجھ پر کوئی غالب نہیں آ سکتا بیشک تو قوی اور قادر ہے اور تو جو چاہے حکم فرمائے، تو ایسا حاکم ہے کہ تیرے حکم کی مخالفت کی کسی کو طاقت نہیں تیرا ہر کام حکمت کے مطابق ہے۔

☆ وعن عمران بن حصین قال قال رسول اللہ ﷺ یخرج قوم من النار بشفاعة

محمد یدخلون الجنة یسمون الجهمیین ..... رواه البخاری ، وفی روایة یخرج قوم من امتی من النار بشفاعتی یسمون الجهنمیین "

عمران بن حصین کہتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا محمد کی شفاعت سے ایک قوم کو آگ سے نکالا جائے گا اور جنت میں داخل کر دیا جائے گا، ان کا نام ہی جہنمی لوگ ہوگا۔

خیال رہے ایک روایت میں "یخرج اقوم" کئی قوموں کو جہنم کی آگ سے نکال کر جنت میں داخل کر دیا جائے گا۔ اور ایک روایت میں ہے کہ حضور نے فرمایا میری امت میں سے ایک قوم کو میری شفاعت کی وجہ سے جہنم کی آگ سے نکالا جائے گا اور ان کا نام ہی جہنمی ہوگا۔

" قال الطیبی رحمه الله لیست التسمیة بها تنقیصا لهم بل استذ کارا لیزدادوا فرحا الی فرح وابتهاجا الی ابتهاج ولیکون ذلک علما لکونهم عتقاء الله تعالیٰ " (مرقاة ج ۱۰ ص ۳۰۱)

علامہ طیبی رحمہ اللہ نے فرمایا ان کا نام جہنمی ان کی توہین، ان کی حقارت کیلئے نہیں رکھا جائے گا بلکہ ان کو یہ یاد دلانے کیلئے کہ وہ جہنم سے نکالے گئے ہیں تا کہ وہ اسے یاد کر کے زیادہ سے زیادہ خوش ہوں، اور زیادہ سے زیادہ ان کے چہروں پر مسرت کے آثار ظاہر ہوں۔ اور سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ان کو یاد رہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی مہربانی اور نبی کریم ﷺ کی شفاعت سے ان کو جہنم سے نکالا ہے۔

☆ " وعن انس قال سألت النبی ﷺ ان یشفع لی یوم القیامة فقال انا فاعل قلت یا رسول الله فاین اطلبک قال اطلبنی اول ما تطلبنی علی الصراط قلت فان لم القک علی الصراط قال فاطلبنی عند المیزان قلت فان لم القک عند المیزان قال فاطلبنی عند الحوض فانی لا اخطیٔ هذه الثلاث المواطن رواه الترمذی وقال هذا حدیث غریب "
(مشکوٰۃ ص ۴۸۹)

حضرت انس کہتے ہیں میں نے نبی کریم ﷺ سے پوچھا کیا آپ قیامت کے دن میری شفاعت فرمائیں گے؟ آپ نے فرمایا ہاں میں شفاعت کروں گا یہ کہتے ہیں میں نے پوچھا یا رسول اللہ میں آپ کو کہاں تلاش کروں؟ آپ نے فرمایا مجھے سب سے پہلے پل صراط پر تلاش کرنا۔ میں نے کہا یا رسول اللہ اگر میں پل صراط پر آپ کو نہ پا سکوں تو؟ آپ نے فرمایا پھر مجھے میزان پر تلاش کرنا۔ میں نے کہا یا رسول اللہ

اگر میری ملاقات میزان پر آپ سے نہ ہو سکے تو؟ آپ نے فرمایا پھر مجھے حوض کے پاس تلاش کرنا، میں ان تین جگہ سے ہٹ کر کہیں اور نہیں ہوں گا۔

خیال رہے حضرت انس رضی اللہ عنہ نے جس شفاعت کے متعلق سوال کیا تھا وہ " الشفاعة الخاصة من بين هذه الامة دون الشفاعة العامة " شفاعت خاصہ مراد ہے جو نبی کریم ﷺ کی امت کو حاصل ہوئی۔ اس سے مراد شفاعت عامہ نہیں جو تمام امتوں کو حساب کے شروع کرنے کے لئے حاصل ہوئی ہے۔

اعتراض : اس حدیث سے سمجھ آ رہا ہے کہ نبی کریم ﷺ ان تینوں مقامات میں شفاعت کریں گے، کیونکہ نبی کریم ﷺ سے حضرت انس رضی اللہ عنہ نے پوچھا ہی اس لئے تھا کہ میں آپ کو کہاں تلاش کروں تا کہ آپ کی خدمت میں شفاعت کرنے کی درخواست کروں۔ لیکن مشکوۃ باب الحساب فصل ثانی میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا'' تین مقامات میں کوئی ایک دوسرے کو یاد نہیں کرے گا'' وہ تین مقام آپ نے میزان، کتاب اور صراط ذکر فرمائے ہیں۔

اس حدیث سے پتہ چلتا ہے کہ آپ ان مقامات میں کسی کو یاد نہیں فرمائیں گے اور نہ ہی کسی کی شفاعت فرمائیں گے ان دونوں احادیث میں کس طرح تطبیق دی جا سکتی ہے؟

جواب اول:

" جوابه لعائشة بذلك لئلا تتكل على كونها حرم رسول الله ﷺ وجوابه لانس كيلا ييأس " (مرقاۃ ج ۱۰ ص ۳۰۶)

نبی کریم ﷺ ہر شخص سے اس کے حال کے مطابق کلام فرماتے تھے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو فرمایا تین وقتوں میں کوئی کسی کو یاد نہیں کرے گا اس کا مطلب یہ تھا کہ صرف یہ ہی خیال نہ کرنا کہ میں اللہ کے رسول ﷺ کی زوجہ ہوں آپ میری شفاعت کریں گے۔ اسی پر توکل نہ کر لینا بلکہ عمل بھی کرنا۔ اور حضرت انس رضی اللہ عنہ کو جواب دیا (کہ آپ مجھے تین مقامات میں تلاش کرنا، میں ان مقامات میں سے ہی کسی ایک مقام میں ہوں گا اور تمہاری شفاعت کروں گا) تا کہ آپ مایوس نہ ہوں۔

جواب دوم:

"ان الحديث الاول (حديث عائشة) محمول على الغائبين فلا احد يذكر احدا من اهله الغيب والحديث الثانی (حديث انس) محمول على من حضره من امته" (مرقاة ج ۱۰ ص ۳۰۶)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث کا تعلق ان مقامات میں موجود نہ ہونے والے لوگوں سے ہے یعنی آپ نے فرمایا جب کسی کے اہل وعیال ان مقامات میں موجود نہیں ہوں گے ان کو کوئی یاد نہیں کرے گا۔

اور حضرت انس ﷺ کی حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جولوگ ان تین مقامات میں آجائیں گے ان کی میں شفاعت کروں گا۔ گویا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو یہ فرمایا کہ صرف یہ ہی خیال نہ کرتے رہنا کہ میں نبی کریم ﷺ کی زوجہ ہوں آپ خود ہی میری شفاعت فرمائیں گے نہیں ایسا نہیں ہوگا بلکہ مجھے تلاش کرنا، مجھے ان مقامات میں طلب کرنا، پھر میری شفاعت حاصل ہوگی۔

حضرت انس ﷺ کی حدیث کا یہ مطلب واضح ہے پتہ چلا دونوں حدیثوں کا مفہوم ایک ہی ہے۔

☆ "عن انس ان النبی ﷺ قال شفاعتی لاهل الكبائر من امتی"

(رواه الترمذی وابوداؤد رواه ابن ماجه عن جابر مشكوة باب الشفاعة)

حضرت انس رضی اللہ عنہ نے فرمایا بیشک نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی یہ ہے کہ میری امت کے کبیرہ گناہ کرنے والوں کو میری شفاعت حاصل ہوگی۔

وضاحت حدیث:

"يعنی شفاعی فی العفو عن الكبائر من امتی خاصة دون غيرهم من الامم"

یعنی کبیرہ گناہوں کی معافی کا فائدہ میری شفاعت سے میری امت کو ہی خاص کر کے ہوگا دوسری امتوں کو فائدہ حاصل نہیں ہوگا۔

"وقال الطيبی رحمه الله ای شفاعتی التی تنجی الهالكين مختصه باهل الكبائر"

علامہ طیبی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ نبی کریم ﷺ کے ارشاد گرامی کا مطلب یہ ہے کہ میری وہ شفاعت جو ہلاک ہونے والوں کو ہلاکت سے نجات دے گی وہ کبیرہ گناہوں والوں کے ساتھ خاص ہوگی۔

شرح مسلم علامہ نووی رحمہ اللہ نے بیان فرمایا کہ قاضی عیاض رحمہ اللہ فرماتے ہیں اہل سنت کا مذہب یہ ہے کہ شفاعت کا جواز عقلاً بھی ثابت ہے اور قرآن واحادیث سے بھی اس کا ثبوت بہت واضح ہے۔ قرآن پاک کی یہ آیۃ اس مضمون کو بہت واضح طور پر ثابت کر رہی ہے:

﴿ یَوْمَئِذٍ لَّا تَنفَعُ الشَّفَاعَةُ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَرَضِیَ لَهٗ قَوْلًا ﴾

یعنی قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کی اجازت کے بغیر تو کسی کو شفاعت نفع نہیں دے گی۔ لیکن رب تعالیٰ جسے شفاعت کی اجازت دے گا اور اس کی بات کو پسند کرے گا یقینی طور پر اس کی شفاعت نفع مند ہوگی۔

" وقد جاء ت الآثار الذی بلغت بمجموعها التواتر لصحة الشفاعة فی الآخرة واجمع السلف الصالحون ومن بعدهم من اهل السنة علیها "

شفاعت کے موضوع پر احادیث مجموعی طور پر تواتر کے درجہ تک پہنچی ہوئی ہیں۔ جن سے انکار ممکن نہیں۔ اسی مسئلہ میں اہل سنت کے تمام علماء کا اجماع ہے خواہ وہ پہلے گزرے ہوئے نیک حضرات ہوں، یا ان کے بعد والے ارباب علم ہوں۔

اسی مسئلہ میں اختلاف معتزلہ اور خوارج کا ہے جس کا انشاءاللہ تفصیلی طور پر ذکر کیا جائے گا۔

(مرقاۃ ج ۱۰ ص ۳۰۹)

شفاعت کی پانچ قسمیں:

(۱) " اولها مختصة بنبینا ﷺ وهی الا راحة من هول الموقف وتعجیل الحساب "

ان میں پہلی قسم وہ ہے جسے شفاعت عامہ کہا جاتا ہے وہ ہمارے نبی کریم ﷺ کے ساتھ ہی خاص ہے وہ شفاعت ہولناک مقام میں ٹھہرنے سے آرام پہنچانے اور جلدی حساب شروع کرنے کیلئے ہوگی۔

(۲) " الثانیة فی ادخال قوم الجنة بغیر حساب وهذه ایضا وردت فی نبینا ﷺ "

شفاعت کی دوسری قسم یہ ہے کہ شفاعت کے ذریعے کئی لوگ بغیر حساب کے جنت میں چلے جائیں گے یہ شفاعت بھی صرف ہمارے نبی کریم ﷺ ہی فرمائیں گے۔

(۳) " الثالثة الشفاعة لقوم استوجبوا النار فیشفع فیهم نبینا ﷺ ومن شاء الله تعالیٰ "

شفاعت کی تیسری قسم ان لوگوں کے لئے ہوگی جو جہنم کی آگ میں داخل ہونے کے مستحق تو ہو جائیں گے لیکن شفاعت کی وجہ سے ان کو جہنم میں داخل ہونے سے بچا لیا جائے گا۔ یہ شفاعت بھی نبی کریم ﷺ بھی فرمائیں گے اور بھی وہ لوگ یہ شفاعت فرمائیں گے جن کو رب تعالیٰ کی طرف سے اجازت دی جائے گی۔

(۴) " الرابعة فيمن دخل النار من المذنبين فقد جاء ت الاحاديث باخراجهم من النار بشفاعة نبينا والملائكة واخوانهم من المؤمنين ثم يخرج الله تعالى كل من قال لا اله الا الله "

شفاعت کی چوتھی قسم یہ ہے کہ جب گنہگار لوگوں کو جہنم کی آگ میں داخل کر دیا جائے گا۔ تو ان کو شفاعت کی وجہ سے آگ سے نکال لیا جائے گا۔ اس مسئلہ میں کئی احادیث وارد ہیں۔ یہ شفاعت نبی کریم ﷺ کریں گے اور فرشتے اور ان گنہگار لوگوں کے دوسرے نیک مومن بھائی ان کے لئے شفاعت کریں گی آخر میں ان لوگوں کو آگ سے نکال لیا جائے گا جنہوں نے "لا اله الا الله" پڑھا۔

(۵) " الخامسة الشفاعة في زيادة الدرجات في الجنة لاهلها وهذه لا ننكرها ايضا "

پانچویں قسم شفاعت کی یہ ہے کہ جنت میں جو لوگ ہوں گے شفاعت کے ذریعے ان کے درجات کو بلند کر دیا جائے گا۔ اس شفاعت کا انکار کسی نے بھی نہیں کیا۔ یعنی اس شفاعت کو معتزلہ بھی جانتے ہیں۔ (مرقاۃ ج ۱۰ ص ۳۰۹)

☆ " عن عثمان بن عفان قال قال رسول الله ﷺ يشفع يوم القيامة ثلاثة الانبياء ثم العلماء ثم الشهداء " (رواه ابن ماجه، مشكوة باب الشفاعة)

حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ نے فرمایا قیامت کے دن تین قسم کے حضرات شفاعت فرمائیں گے۔ پہلے انبیاء کرام پھر علماء، پھر شہداء۔

فائدہ: علماء سے مراد عاملین ہیں یعنی جو علم کے مطابق عمل بھی کرتے ہیں۔ اور شہداء سے مراد مخلصین ہیں " وفي العطف بثم دلالة صريحة على تفضيل العلماء على الشهداء " نبی کریم ﷺ نے انبیاء کرام کے بعد علماء کا ذکر کیا پھر لفظ " ثم " ذکر فرمایا جو تراخی پر دلالت کرتا ہے۔ اس سے واضح ہوا کہ علماء عاملین کو شہداء مخلصین پر فضیلت حاصل ہے۔

اس مسئلہ پر ایک حدیث شریف واضح طور پر دلالت کر رہی ہے جو شیرازی نے حضرت انس سے اور ابن عبدالبر نے ابوالدرداء سے اور ابن جوزی نے علل میں نعمان بن بشیر سے مرفوع حدیث بیان کی ہے:

" یوزن یوم القیامة مداد العلماء ودم الشهید فیرجح مداد العلماء علی دم الشهید "

قیامت کے دن علماء کی سیاہی اور شہید کے خون کا وزن کیا جائے گا تو علماء کی سیاہی کو شہید کے خون پر ترجیح حاصل ہوگی۔ (مرقاۃ ج ۱۰ ص ۳۱۱)

تنبیہ: حدیث شریف میں تین قسم کے حضرات کا ذکر کیا تو ان کے درمیان ترتیب کو ذکر کرنا مقصود ہے یا یہ قید اتفاقی ہے ورنہ ملائکہ، صلحاء چھوٹے بچوں کی شفاعت کا واضح طور پر ذکر موجود ہے۔

☆ " وعن انس قال قال رسول الله ﷺ یصف اهل النار فیمربهم الرجل من اهل الجنة فیقول الرجل منهم یا فلان اما تعرفنی انا الذی سقیتک شربة وقال بعضهم انا الذی وهبت لک وضوأ فیشفع له فیدخله الجنة " (رواه ابن ماجه مشکوة باب الشفاعة)

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جہنم والے لوگ صف بنائے ہوں گے ان کے قریب سے جنت والے شخص کا گزر ہوگا، ایک شخص اس سے کہے گا کیا تو مجھے پہچانتا نہیں میں نے تمہیں پلایا تھا، دوسرا کہے گا کیا تمہیں معلوم نہیں میں نے تمہیں وضوء کے لئے پانی دیا تھا، وہ ان کے لئے شفاعت کرے گا تو اللہ تعالیٰ ان کو جنت میں داخل کر دے گا۔

وضاحت حدیث:

یصف (بضم وفتح وتشدید) صف بنانا۔

" (یصف اهل النار) من عصاة المؤمنین والفجار فی طریق اهل الجنة من العلماء الاخیار والصلحاء الابرار علی هیئة المساکین السائلین فی طریق الاغنیاء فی هذه الدار "

یعنی گنہگار مومنین، فساق وفجار جنت والے نیک علماء اور دوسرے نیک صالحین حضرات کے راستے میں اس طرح کھڑے ہوں گے جس طرح دنیا میں غنی لوگوں کے راستہ میں سوال کرنے والے فقیر لوگ کھڑے ہوتے ہیں۔

جب کسی نیک شخص کا وہاں سے گزر ہوگا تو گنہگاروں میں سے کوئی کہے گا۔ اے شخص کیا تو مجھے

نہیں پہچانتا میں نے تمہیں فلاں وقت میں پینے کے لئے پانی یا دودھ وغیرہ دیا تھا، آج تم میری شفاعت ہی کردو کہ اللہ تعالیٰ مجھے بخش دے۔ اسی طرح ایک اور شخص شفاعت کی درخواست کرتے ہوئے کہے گا اے فلاں شخص کیا تم مجھے نہیں پہچانتے میں نے فلاں وقت تمہیں وضوء کے لئے پانی عطاء کیا تھا، وہ نیک بزرگ عالم شخص ان کے حق میں شفاعت کریں گے تو ان گنہگاروں کو جنت میں داخل کردیا جائے گا۔

فائدہ: " قال المظهر فيه تحريض على الاحسان الى المسلمين لاسيما مع الصلحاء والمجالسة معهم ومحبتهم فان محبتهم زين في الدنيا ونور في العقبى "
(مرقاۃ ج ۱۰ ص ۳۱۴)

اس حدیث پاک سے یہ واضح ہوا کہ مسلمانوں کو اپنے دوسرے مسلمان بھائیوں پر رحم کرنے پر برانگیختہ کیا گیا ہے خصوصاً نیک لوگوں پر احسان کرنا، ان کی محافل میں بیٹھنا اور ان سے محبت کرنے کی رغبت دلائی گئی ہے کیونکہ نیک لوگوں سے محبت دنیا میں زینت اور آخرت میں نور ہوگا۔

☆ " وعن عوف بن مالك قال قال رسول الله ﷺ اتاني آت من عند ربي فخيرني بين ان يدخل نصف امتي الجنة وبين الشفاعة واخترت الشفاعة وهي لمن مات لا يشرك بالله شيأ "
(رواه الترمذی وابن ماجه مشكوة باب الشفاعة)

عوف بن مالک کہتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میرے رب کی طرف سے آنے والا میرے پاس آیا مجھے اختیار دیا کہ میں نصف امت کو جنت میں داخل کیا جانا پسند کرلوں یا شفاعت کو پسند کرلوں۔ میں نے شفاعت کو اختیار کیا ہے۔ اور یہ شفاعت ہر اس شخص کیلئے ہوگی جسکی موت حالت شرک پر نہ آئے

حدیث کا مطلب بہت واضح ہے کہ نبی کریم ﷺ نے شفاعت کو ترجیح دی کیونکہ آپ یہی چاہتے تھے کہ شفاعت کے ذریعے میری امت کے ایماندار لوگ تمام ہی نفع حاصل کریں۔ اس میں گنہگار بھی آگئے اور نیک کار بھی البتہ مشرک نہ ہوں کیونکہ مشرکوں کو شفاعتِ خاصہ سے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوتا۔

☆ " وعن عبد الله بن ابي الجدعاء قال سمعت رسول الله ﷺ يقول يدخل الجنة بشفاعة رجل من امتي اكثر من بن تميم " (رواه الترمذی والدارمی وابن ماجه، مشكوة باب الشفاعة)

عبداللہ بن ابی جدعاء فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ میری امت کے ایک عظیم شخص کی شفاعت سے بنو تمیم سے بھی زیادہ لوگ جنت میں داخل ہوں گے۔

" رجل " پرتنوین تعظیم کی ہے مراد اس سے " رجل جلیل " ہے یعنی عظیم کی شفاعت سے۔ وہ عظیم اور جلیل القدر شخص کون ہوگا بعض حضرات نے کہا حضرت عثمان بن عفان ﷛ ہوں گے اور بعض حضرات نے کہا ہے کہ وہ حضرت اویس قرنی ہوں گے وغیرہ۔

" وعن ابی سعید ان رسول اللہ ﷺ قال ان من امتی من یشفع للفئام ومنھم من یشفع للقبیلة ومنھم من یشفع للعصبة ومنھم من یشفع للرجل حتی یدخلوا الجنة "

(رواہ الترمذی مشکوۃ باب الجماعة)

حضرت ابو سعید خدری ﷛ فرماتے ہیں بیشک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ بیشک میری امت سے بعض لوگ ایک جماعت کی شفاعت کریں گے۔ اور بعض لوگ ایک قبیلہ کی شفاعت کریں گے اور بعض لوگ ایک خاندان (دس سے لے کر چالیس تک تعداد) کی شفاعت کریں گے۔ اور بعض ایک شخص کی شفاعت کریں گے وہ اس شفاعت کی وجہ سے جنت میں داخل ہوں گے۔

اس حدیث پاک سے بھی نبی کریم ﷺ کی امت کے نیک لوگوں کا شفاعت کرنا ثابت ہے۔

☆ " عن عبد اللہ بن مسعود قال قال رسول اللہ ﷺ من قدم ثلاثة لم یبلغوا الحنث کانوا له حصنا حصینا قال ابو ذر قدمت اثنین قال واثنین فقال ابی بن کعب سید القراء قدمت واحدا قال واحدا ولکن انما ذلک عند الصدمة الاولی " (ترمذی ابواب الجنائز)

حضرت عبد اللہ بن مسعود ﷛ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس شخص نے تین نابالغ بچے آگے بھیجے (یعنی جس شخص کی اولاد سے تین نابالغ بچے فوت ہوگئے) تو وہ اس کو آگ سے بچانے کے لئے مضبوط قلعہ ہوں گے۔ حضرت ابو ذر نے کہا میں نے دو آگے بھیجے، آپ نے فرمایا دو ہی (قلعہ کی حیثیت ہوں گے) سید القراء حضرت ابی بن کعب نے عرض کیا میں نے ایک آگے بھیجا ہے آپ نے فرمایا ایک ہی (کافی ہوگا) البتہ جب اس شخص نے ابتدائی صدمہ کے وقت صبر کیا ہوگا۔

☆ " عن ابن عباس انه سمع رسول اللہ ﷺ یقول من کان له فرطان من امتی ادخله اللہ بھما الجنة فقالت له عائشة فمن کان له فرط من امتک قال ومن کان له فرط یا موفقة قالت فمن لم یکن له فرط من امتک قال فانا فرط من امتی لن یصابوا بمثلی "

(ترمذی ابواب الجنائز)

حضرت ابن عباس فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ جس شخص کے میری امت میں سے دو بچے فوت ہو گئے اللہ تعالیٰ اسے جنت میں داخل کریگا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا آپ کی امت میں سے جس کا ایک بچہ فوت ہوا؟ آپ نے فرمایا جس کا ایک بچہ فوت ہوا وہ بھی جنت میں داخل ہوگا اے توفیق دی ہوئی، پھر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا جس کا ایک بچہ بھی نہ فوت ہوا؟ آپ نے فرمایا ان کا میں آگے جا کر انتظام کروں، میرا جیسا کسی کو نہیں ملے گا۔

خیال رہے حدیث شریف میں استعمال ہے "یا موفقۃ" اس کا یہ معنی بیان کیا گیا ہے:

"یا موفقة بالخیرات والا سوة الواقعة موقعها شفقة علی الامة" (مرقاة)

اے بھلائی کی توفیق دی گئے کیونکہ تمہارے سوالات موقع کے مطابق ہوتے ہیں جن سوالات اور جوابات سے امت کے لئے شفقت کا دروازہ کھل جاتا ہے۔

﴿فَرَط﴾: (بالتحریک) قافلے سے آگے جا کر قافلہ والوں کی ضروریات کا انتظام کرنے والوں کو "فرط" کہا جاتا ہے چھوٹا نابالغ بچہ جو فوت ہو جائے وہ بھی آگی جا کر والدین کے لئے جنت میں مکان تیار کرتا ہے۔ یعنی اس کی وفات پر والدین کو صبر کرنے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ جنت میں داخل کرتا ہے اس لئے اسے بھی فرط کہا گیا ہے۔

حدیث پاک سے اور فائدہ یہ حاصل ہوا کہ جس کا اور کوئی نہیں، اس کے میرے پیارے مصطفیٰ ﷺ ہیں۔ مسئلہ بہت واضح ہو گیا کہ نبی کریم ﷺ کی امت کے مومن لوگوں کے بچے فوت ہونے والے بھی اپنے والدین کے لئے شفاعت کریں گے۔

شفاعت عامہ: جب تک حساب وکتاب شروع نہیں ہوگا، لوگ بہت پریشان ہوں گے کیونکہ حبس شدید ہوگا، سخت گرمی کی وجہ سے لوگ کسی شفیع کو تلاش کریں گے کہ کسی کی شفاعت سے اس حال سے نجات مل جائے اسی حال میں حضرت آدم علیہ السلام، حضرت نوح علیہ السلام، حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پاس شفاعت کی درخواست کریں گے، سب کی طرف سے یہ جواب حاصل ہوگا "لست لها" میں شفاعت نہیں کر سکتا۔ لیکن جب مصطفیٰ کریم ﷺ کے پاس آئیں گے تو آپ "انا لها" فرمائیں گے ہاں شفاعت کا حق مجھے ہی دیا گیا ہے۔ آپ

شفاعت فرمائیں گے تو آپ کی شفاعت کو شرف قبولیت عطاء کیا جائے گا۔

نکتہ : شیخ محی الدین رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ لوگوں کے دلوں میں ڈالے گا کہ پہلے آدم علیہ السلام کے پاس جاؤ وہاں سے مایوس ہونے پر ان کے دل میں یہ آئے گا کہ اب نوح علیہ السلام کے پاس جانا چاہئے۔اس طرح دوسرے انبیاء کرام کے پاس جائیں گے سب سے پہلے ان کے دل میں یہ کیوں نہیں ڈال دیا جائے گا کہ نبی کریم ﷺ کے پاس چلے جاؤ اس کی وجہ یہ ہے " **فانهم لو سألوا ابتداء لكان يحتمل ان غيره يقدر** " کہ اگر وہ پہلے نبی کریم ﷺ کے پاس آ جائیں تو ان کے دل میں یہ خیال آئے گا کہ اگر کسی اور کے پاس جاتے تو وہ بھی شفاعت فرماتے۔لیکن جب سب سے مایوس ہوں گے تو پتہ چلے گا کہ یہ منصب کسی اور کو حاصل نہیں۔

اعلیٰ حضرت بریلوی فرماتے ہیں۔

خلیل ونجی کلیم ومسیح سبھی سے کہی کہیں نہ بنی
یہ بے خبری کہ خلق پھری کہاں سے کہاں تمہارے لئے

مولنا حسن رضا بریلوی فرماتے ہیں:

فقط اتنا سبب ہے انعقاد بزم محشر میں
کہ ان کی شان محبوبی دکھائی جانے والی ہے

حاجی امداد اللہ مہاجر مکی فرماتے ہیں:

جہاز امت کا حق نے کر دیا ہے آپ کے ہاتھوں
تم اب چاہو ڈباؤ یا تراؤ یا رسول اللہ
شفیع عاصیاں ہو تم ، وسیلہ بیکساں ہو تم
تمہیں چھوڑ اب کہاں جاؤں بتاؤ یا رسول اللہ

شفاعت سے کسی کو کم اور کسی کو زیادہ فائدہ کیوں؟

اس پر ایک حدیث پاک کو دیکھئے اسی سے مسئلہ شفاعت کو بھی سمجھنے کی کوشش کریں تو سمجھنا کوئی مشکل نہیں رہے گا:

" عن ابی موسی عبد اللہ بن قیس الاشعری ﷜ قال قال رسول اللہ ﷺ ان مثل ما بعثنی اللہ بہ من الھدی والعلم کمثل غیث اصاب ارضا فکانت منھا طائفۃ طیبۃ قبلت الماء فانبتت الکلاء والعشب الکثیر ، وکان منھا اجادب امسکت الماء فنفع اللہ تعالٰی بھا الناس فشربوا منھا وسقوا وزرعوا واصاب طائفۃ منھا اخری انما ھی قیعان لا تمسک ماء ولا تنبت کلأ فذلک مثل من فقہ فی دین اللہ ونفعہ ما بعثنی اللہ تعالٰی بہ فعلم وعلم ومثل من لم یرفع بذلک رأسا ولم یقبل ھدی اللہ الذی ارسلت بہ "

(جواھر طنطاوی ج ۱ ص ۶۵)(مسلم ج ۲ ص ۲۵۵)

حضرت ابوموسی اشعری ﷜ فرماتے ہیں ، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ بیشک مجھے اللہ تعالیٰ نے ہدایت اور علم عطا کر کے مبعوث فرمایا اس کی مثال بارش کی ہے ۔ جب بارش اچھی زرخیز زمین پر برستی ہے تو اس زمین میں گھاس اور کثیر مقدار نباتات پیدا ہوتے ہیں ۔ وہی بارش جب خشک قدرے سخت زمین پر برستی ہے جو پانی کو روک لیتی ہے (یعنی وہ پانی جلدی اس میں جذب نہیں ہو جاتا) اور وہ زمین حوض نما ہوتی ہے تو اس سے بھی لوگوں کو نفع حاصل ہوتا ہے کہ وہ پانی پیتے ہیں ، اور اسی پانی سے اپنی کھیتی باڑی کو سیراب بھی کر لیتے ہیں ، اور وہی بارش کبھی چٹیل میدان اور لڑھکنے والے مقام پر برستی ہے تو وہ نہ ہی پانی کو اپنے اوپر روک کر رکھتی ہے (کہ لوگ اس سے فائدہ حاصل کریں) اور نہ ہی اس میں گھاس وغیرہ پیدا ہوتے ہیں ۔ یہی مثال جو شخص دین کا علم حاصل کرتا ہے اسے میرے مبعوث ہونے کا نفع حاصل ہوتا ہے وہ علم حاصل کرتا ہے اور پڑھاتا بھی ہے اور جو شخص اس کی طرف (جو مجھے دے کر مبعوث کیا گیا ہے) سر نہیں اٹھاتا وہ اللہ تعالیٰ کی ہدایت قبول نہیں کرتا جو ہدایت دے کر مجھے بھیجا گیا ہے ۔

تنبیہ : خط کشیدہ لفظ جواہر طنطاوی اور بخاری میں " وزرعوا " ہے جس کا معنی ہے کھیتی

باڑی کرنا۔اور مسلم شریف میں " ورعوا " جو " الرعی " سے لیا گیا ہے جس کا معنی ہے چرانا۔تقریبا مفہوم ایک ہی ہے کہ اس پانی کے ذریعے اگنے والا گھاس وغیرہ جانوروں کو چراتے ہیں۔ (از نووی)

اب اسی حدیث سے مسئلہ شفاعت کو سمجھئے کہ بارش کا نفع ایک جیسا ہے لیکن زمین کے مختلف حصے علیحدہ علیحدہ حیثیت رکھتے ہیں انکے مطابق ہی زمین میں مختلف قسم کے منافع ہیں۔اسی طرح نبی کریم ﷺ کی شفاعت تو نفع مند ہی نفع مند ہے لیکن لوگ مختلف قسم کے ہوں گے۔کسی کو نفع صرف یہ ہوگا کہ حساب وکتاب شروع ہو جائے گا۔اور کوئی جہنم کا مستحق ہونے کے باوجود جہنم سے بچ جائے گا اور کوئی جہنم میں داخل ہو چکا ہوگا اسے جہنم سے نکال لیا جائے گا اور کوئی پہلے سے جنت میں ہوگا لیکن اس کے مدارج کو بلند کر دیا جائے گا۔

شفاعت میں معتزلہ کا مذہب:

" فذهبت المعتزلة على انها للمستحقين للثواب وتاثير الشفاعة فى ان تحصل زيادة من المنافع على قدر ما استحقوه "

معتزلہ کا مذہب یہ ہے کہ شفاعت صرف ان لوگوں کو فائدہ دے گی جو ثواب کے مستحق ہوں گے، جنت میں داخل ہونے کے قابل ہوں گے اور شفاعت کا ان کو فائدہ ہوگا کہ وہ جس سے ثواب کے مستحق تھے اس سے بڑھ کر ان کو ثواب دے دیا جائے گا اور جنت میں بلند درجہ دے دیا جائے حالانکہ وہ اپنے اعمال کے لحاظ پر اس کے مستحق نہیں تھے۔

" وقال اصحابنا تاثيرها فى اسقاط العذاب عن المستحقين للعقاب اما بان يشفع لهم فى عرصة القيامة حتى لا يدخلوا النار وان دخلوا النار فيشفع لهم حتى يخرجوا منها ويدخلوا الجنة واتفقوا على انها ليست لكفار "

اہل سنت کا مذہب یہ ہے کہ شفاعت کا فائدہ ان لوگوں کو بھی ہوگا جو عذاب کے مستحق ہوں گے شفاعت کے ذریعے ان سے عذاب ساقط ہوگا۔نبی کریم ﷺ میدان قیامت میں شفاعت فرمائیں گے تو وہ مستحقین عذاب جہنم میں داخل ہونے سے بچ جائیں گے۔کئی لوگ جہنم میں داخل ہو چکے ہوں گے ان کو آپ کی شفاعت سے جہنم سے نکال کر داخل کر دیا جائے گا۔ہاں البتہ اس پر اہل سنت کا اتفاق ہے کہ نبی کریم ﷺ کافر کے عذاب کی تخفیف کے لئے شفاعت نہیں فرمائیں گے۔

معتزلہ کی دلیل نمبر 1: آیۃ کریمہ میں ﴿ وَلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ ﴾ کہا گیا ہے شفاعۃ نکرہ ہے قانون یہ ہے کہ نکرہ جب نفی کے تحت آجائے تو عموم کا فائدہ دیتا ہے۔ اس سے پتہ چلا کہ شفاعت کی مطلقاً نفی کر دی گئی ہے، کہ کسی کو کسی شخص کی شفاعت کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں ہوگا۔ تو کبیرہ گناہوں والوں کے لئے شفاعت ثابت کرنا اس آیۃ کے مخالف ہے۔

الزامی جواب: یہ تمہارا اعتراض تو تمہارے مذہب کے مخالف ہے۔ کیونکہ اعتراض میں تم یہ ثابت کر رہے ہو کہ ہر قسم کی کوئی شفاعت بھی قبول نہیں ہوگی۔ اور تمہارا مذہب یہ ہے کہ شفاعت عظمیٰ (شفاعت عامہ) ہوگی۔ اور جو لوگ ثواب کے مستحق ہوں گے ان کیلئے بھی شفاعت ہوگی کہ ان کا ثواب بڑھا دیا جائے گا۔ اس شفاعت کو ثابت کرنے کے لئے اپنے ہی اعتراض سے جو جواب تم دو گے وہی جواب ہماری طرف سے بھی سمجھ لینا۔

تحقیقی جواب: شفاعت کی دو قسمیں ہیں ایک یہ ہے کہ جس کی وجہ سے زیادہ منافع حاصل ہوتے ہیں۔ اور دوسری قسم یہ ہے جو لوگ ہمیشہ کے لئے عذاب سے مستحق ہیں۔ ان سے عذاب کو ہٹا دیا جائے۔ آیۃ کریمہ میں نفی دوسری قسم کی شفاعت کی ہے جس میں ہمیشہ کے لئے عذاب کے مستحق کافر لوگوں سے شفاعت کی نفی کی گئی۔

مسلمانوں کے لئے جو بھی شفاعت ہوگی وہ درحقیقت ان کو نفع پہنچانے کے لئے ہوگی۔ جب تک یہ فرق نہ کیا جائے اس وقت تک ان آیات اور احادیث کا کوئی مطلب نہیں ثابت کیا جا سکتا جن کو بیان کیا جا چکا ہے۔

نتیجہ یہی نکلا:

" ان المقصود من الآیة نفی تاثیر الشفاعة فی اسقاط العقاب لانفی تاثیرها فی زیادة المنافع "

کہ مقصد آیۃ کریمہ میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ کافروں سے عذاب کو ختم کرنے کے لئے کوئی شفاعت کام نہیں آئے گی لیکن منافع کی زیادتی کے لئے شفاعت کام آئے گی۔

خیال رہے کہ عقاب کہتے ہی اسے ہیں جو کافروں کو عذاب ہوگا اسی لئے راقم نے " اسقاط العقاب " کا ترجمہ کیا ہے" کافروں سے عذاب کو ساقط کرنا"

معتزلہ کی دلیل نمبر 2: اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿ مَا لِلظَّالِمِيْنَ مِنْ حَمِيْمٍ وَّلَا شَفِيْعٍ يُّطَاعُ ﴾

''اور ظالموں کا نہ کوئی دوست ہوگا اور نہ کوئی سفارشی جس کا کہا مانا جائیگا''

اس آیۃ کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے ظالموں کا ذکر فرمایا ہے ظالم عام ہیں خواہ کافر ہوں یا مسلمان ہوں لہٰذا معلوم ہوا کہ کسی ظالم کے لئے کسی کی شفاعت قبول نہیں کی جائے گی۔ ظالم وہی ہوگا جو گہنگار ہوگا۔

جواب نمبر 1: اس آیۃ کریمہ میں نفی شفاعت کی نہیں بلکہ " یطاع " کی ہے:

" لانه لا یکون فی الآخرة شفیع یطاع لان المطاع یکون فوق المطیع ولیس فوقه تعالیٰ احد یطیعه الله تعالیٰ "

یعنی کوئی یہ سمجھے کہ رب تعالیٰ میری اطاعت کرے گا تو اس کا یہ خیال باطل ہے کیونکہ جس کی اطاعت کی جائے وہ بلند شان والا ہوتا ہے، اور جو اطاعت کرے وہ اس سے کم شان رکھتا ہے، جب اللہ تعالیٰ سے کوئی بلند شان والا نہیں تو یہ گمان بھی باطل ہوگا کہ میری بات کو ضرور مانا جائے گا کیونکہ رب تعالیٰ مطیع ہے اور میں مطاع ہوں۔ (معاذ اللہ)

دوسرا جواب: جب یہ تسلیم کرلیا جائے کہ یہاں نفی شفاعت کی ہے تو پھر بھی مطلقاً شفاعت کی نفی نہیں بلکہ اس شفاعت کی نفی ہے جو اطاعت سے مقید ہے۔

" انه تعالیٰ نفی شفیعا یطاع والشفیع لا یکون الا دون المشفوع الیه لان من فوقه یکون آمرا له وحاکما علیه ومثله لا یسمی شفیعا "

بیشک اللہ تعالیٰ نے اس سفارشی کی نفی کی جس کی اطاعت کی جائے، اصل میں حقیقت یہ ہے کہ سفارش کرنے والا کم درجہ رکھتا ہے اس سے جس سے سفارش کر رہا ہے، کیونکہ اگر اوپر درجہ رکھے تو آمر اور حاکم کہلائے گا اس قسم کے شخص کو شفاعت کرنے والا نہیں کہا جاتا۔

حاصل کلام یہ ہے کہ اگر شفاعت کرنے والا یہ سمجھے کہ میری اطاعت کی جائے گی میری شفاعت

ضرور تسلیم ہوگی تو وہ اپنے آپ کو حاکم سمجھ رہا ہے اس کی شفاعت قبول نہیں ہوگی۔

اگر شفاعت کرنے والا اس خیال سے شفاعت کرے کہ وہ اللہ تعالیٰ حاکم مطلق، بے نیاز ہے میں اس کے حضور شفاعت کر دیتا ہوں آگے قبول کرنا اس کی مرضی ہے، اس عاجزی کی وجہ سے رب تعالیٰ اپنے وعدہ کے مطابق شفاعت کو قبول فرمائے گا مطلب یہ ہے کہ رب تعالیٰ کو بندے کا عجز پسند ہے تکبر اور بڑائی پسند نہیں۔

تیسرا جواب: دوسری آیات اور احادیث جن میں شفاعت کے قبول ہونے کا ذکر ہے ان میں اور اس میں تطبیق دینے کے لئے کئی مفسرین کرام نے ''ظالمین'' کا معنیٰ ''کافرین'' کیا ہے کیونکہ رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿ اِنَّ الشِّرْکَ لَظُلْمٌ عَظِیْمٌ ﴾ ''بیشک شرک ظلم عظیم ہے''

واضح ہوا کہ اس آیۃ کا معنیٰ بھی یہ ثابت ہے کہ کافروں کے لئے شفاعت نہیں مانی جائے گی۔

معتزلہ کی دلیل نمبر 2: اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی:

﴿ مِنْ قَبْلِ اَنْ یَّاْتِیَ یَوْمٌ لَّا بَیْعٌ فِیْهِ وَلَا خُلَّةٌ وَّلَا شَفَاعَةٌ ﴾

اس آیۃ کریمہ میں شفاعت کی مطلقاً نفی ہو رہی ہے:

﴿ وَمَا لِلظّٰلِمِیْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ﴾ ظالموں کا کوئی مددگار نہیں ہوگا

اس آیۃ سے بھی شفاعت کی نفی ہو رہی ہے:

﴿ فَمَا تَنْفَعُهُمْ شَفَاعَةُ الشّٰفِعِیْنَ ﴾ شفاعت کرنے والوں کی شفاعت ان کو نفع نہیں دے گی۔
اس آیۃ سے بھی پتہ چلتا ہے کہ شفاعت کا نفع نہیں ہوگا۔

جواب: ان تمام آیات میں کافروں کے لئے شفاعت کی نفی ہو رہی ہے اور اللہ تعالیٰ کی اجازت کے بغیر شفاعت کی نفی ہو رہی ہے، کیونکہ دوسری آیات سے واضح ہو رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اجازت سے شفاعت نفع مند ہوگی۔ رب تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ مَا مِنْ شَفِیْعٍ اِلَّا مِنْ بَعْدِ اِذْنِهٖ ﴾ اس کی اجازت کے بغیر کوئی شفاعت نہیں کر سکے گا۔

﴿ مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَہٗ اِلَّا بِاِذْنِہٖ ﴾

اس کی اجازت کے بغیر اس کے پاس کون شفاعت کرے گا

﴿ لَا یَتَکَلَّمُوْنَ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَہُ الرَّحْمٰنُ وَقَالَ صَوَابًا ﴾

کوئی اس سے کلام نہیں کر سکیں گے سوائے ان کے جن کو رحمٰن نے اجازت دی اور درست بات کہی۔

ان تمام آیات سے واضح ہوا کہ رب تعالیٰ کی اجازت کے بغیر شفاعت نہیں ہوگی رب تعالیٰ کی اجازت سے شفاعت ہو سکے گی۔ اور نبی کریم ﷺ کا یہ ارشاد اس مسئلہ کو اور زیادہ واضح کر دیتا ہے۔ آپ فرماتے ہیں:

" (عن ابی هريرة قال قال رسول الله ﷺ) لكل نبی دعوة مستجابة فتعجل كل نبی دعوته و انی اختبأت دعوتی شفاعة لامتی يوم القيامة فهی نائلة ان شاء الله من مات من امتی لا يشرك بالله شيئا "

(رواه مسلم ، کبیر ج ۲ ص ۲۳)

ہر نبی کو ایک دعاء حاصل ہوئی جس کی قبولیت یقینی تھی۔ لیکن ہر نبی نے وہ دعاء (دنیا میں ہی) جلدی استعمال کر لی۔ میں نے اپنی دعاء کو محفوظ کر کے رکھ لیا ہے وہ قیامت کے دن میری ہر امت کو انشاء اللہ پہنچے گی جس کو موت شرک کے بغیر آئی۔

دینی طلباء کی دلچسپی کے لئے:

" (ولا يقبل منها شفاعة) ان تخصيص مثل هذا العام بذلك السبب المخصوص يكفی فيه ادنی دليل ، فاذا قامت الدلائل الدالة علی وجود الشفاعة وجب المصير الی تخصيصها "

" ولا يقبل منها شفاعة " میں نکرہ تحت النفی ہونے کی وجہ سے عموم پایا گیا ہے لیکن عام کو مخصوص البعض بنانے کے لئے ادنیٰ دلیل کافی ہے جب شفاعت کے ثبوت پر کثیر دلائل موجود ہیں تو خود بخود سمجھ آ گیا کہ یہاں عام مخصوص البعض ہے کہ کفار کے لئے شفاعت قبول نہیں ہوگی۔

☆ ﴿ مَا لِلظّٰلِمِیْنَ مِنْ حَمِیْمٍ وَّلَا شَفِیْعٍ یُّطَاعُ ﴾ یہ الفاظ گرامیہ نقیض ہیں " للظالمین حميم وشفيع " اور یہ الفاظ قضیہ موجبہ کلیہ ہیں۔ اور قانون یہ ہے کہ موجبہ کلیہ کی نقیض سالبہ جزیہ ہوتی ہے

سالبہ جزیہ کے سچے آنے کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ بعض افراد سے نفی پائے جائے۔ جمیع افراد کی نفی سالبہ جزیہ میں نہیں ہوتی۔ اب واضح ہوا کہ اگر ''ظالمین'' سے مراد عام ظالم لوگ لئے جائیں جو مومنوں اور کافروں کو شامل ہو تو پھر بھی جب نفی کا معنی بحیثیت سالبہ جزیہ کیا جائے گا تو اس وقت معنی یہ ہوگا ''کہ بعض ظالم کا کوئی دوست نہیں ہوگا اور نہ کسی کی سفارش مانی جائے گی''

اس معنی کے لحاظ پر خود واضح ہو جاتا ہے کہ بعض ظالموں سے مراد ہیں ہی کفار، مومن اس نفی کے معنی میں آتے ہی نہیں۔

☆ ﴿ وَمَا لِلظَّالِمِينَ مِنْ أَنصَارٍ ﴾ یہ نقیض ہے '' للظالمین انصار '' کی یہ موجبہ کلیہ ہے۔ اس کی نقیض سالبہ جزیہ ہے اور سالبہ جزیہ کا مدلول سلب العموم ہے اور سلب العموم سے عموم السلب حاصل نہیں۔ سلب العموم یعنی مجموع من حیث المجموع کی نفی جو بعض کی نفی کو مستلزم ہوتا ہے اور عموم السلب کا مطلب ہے ہر ہر فرد کی نفی کرنا، وہ اس میں پایا نہیں گیا۔

ان دونوں آیتوں پر علامہ رازی رحمہ اللہ کی عبارات کو بھی طلباء نگاہ میں رکھیں وہ عبارات یہ ہیں:

'' ان قوله (ما للظالمين من حميم ولا شفيع) نقيض لقولنا للظالمين حميم وشفيع ، لكن قولنا للظالمين حميم وشفيع موجبة كلية ونقيض الموجبة الكلية سالبة جزئية والسالبه الجزئية يكفى فى صدقها تحقق ذلك السلب فى بعض الصور ، ولا يحتاج فيه الى تحقق ذلك السلب فى جميع الصور وعلى هذا فنحن نقول بموجبه لان عندنا انه ليس بعض الظالمين حميم ولا شفيع يجاب وهم الكفار فاما ان يحكم على كل واحد منهم بسلب الحيم والشفيع فلا ''

'' وقوله (وما للظالمين من انصار) فالجواب عنه انه نقيض لقولنا '' للظالمين انصار '' وهذه موجبة كلية فقوله '' وما للظالمين من انصار '' سالبة جزئية فيكون مدلوله سلب العموم وسلب العموم لا يفيد عموم السلب ''

(كبير ج ٢ ص ٦٥)

معتزلہ کا استدلال احادیث سے:

" عن ابی هریرة انه علیها لصلوة والسلام دخل المقبرة فقال السلام علیکم دار قوم مؤمنین وانا ان شاء الله بکم لا حقون ، وددت انی قد رأیت اخواننا ، قالوا یا رسول الله السنا اخوانک قال بل انتم اصحابی ، واخواننا الذین لم یأتوا بعد قالوا یا رسول الله کیف تعرف من یاتی بعدک من امتک ؟ قال ارأیت ان کان لرجل خیل غرمحجلة فی خیل دهم فهل لا یعرف خیله ؟ قالوا بلی یا رسول الله قال فانهم یأتون یوم القیامة غرا محجلین من الوضوء وانا فرطهم علی الحوض ، الا فلیذادن رجال عن حوضی کما یزاد البعیر الضال اناديهم الاهلم الاهلم فیقال انهم قد بدلوا بعدک فاقول فسحقا فسحقا "

حضرت ابو ہریرہ ﷺ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ قبرستان میں داخل ہوئے تو آپ نے کہا" السلام علیکم قوم مؤمنین وانا ان شاء الله بکم لا حقون " میں پسند کرتا ہوں کہ بیشک میں اپنے بھائیوں کو دیکھ لوں۔صحابہ کرام نے عرض کیا یا رسول اللہ کیا ہم آپ کے بھائی نہیں، کہا بلکہ تم تو میرے صحابہ ہو ہمارے بھائی تو ابھی نہیں آئے۔صحابہ کرام نے عرض کیا یا رسول اللہ آپ کی امت کے جو لوگ ابھی تک نہیں آئے آپ ان کو کیسے پہچانیں گے؟ آپ نے فرمایا تمہارا اس میں کیا خیال ہے کہ اگر کسی شخص کا سفید پیشانی والا گھوڑا سیاہ گھوڑوں میں ہو تو کیا وہ شخص اسے نہیں پہچانے گا؟ صحابہ کرام نے عرض کیا کیوں نہیں (یعنی وہ یقینا پہچان لے گا) آپ نے فرمایا وہ لوگ وضوء کرنے کی وجہ سے چمکدار چہروں والے ہوں گے۔اور میں حوض پر آگے جا کر ان کا منتظم ہوں گا۔خبر دار کچھ لوگوں کو میرے حوض سے اس طرح ہٹا دیا جائے گا جس طرح اجنبی اونٹ کو ہٹا دیا جاتا ہے، میں ان کو ندا دوں گا خبر دار ادھر آ جاؤ خبر دار ادھر آ جاؤ۔تو کہا جائے گا انہوں نے تمہارے بعد (دین کو) تبدیل کر دیا تھا۔تو اس وقت میں کہوں گا پھر تو ٹھیک ہے انہوں نے رب کی رحمت سے دور ہونا ہی ہے ہاں انہوں نے دور ہی ہونا ہے۔

اس حدیث پاک سے معتزلہ نے دلیل یہ پکڑی کی جب نبی کریم ﷺ ان کو حوض سے نہیں پلا سکیں

گے توان کی شفاعت کر کے عذاب سے کیسے بچا سکیں گے۔

جواب نمبر 1: اگران کی دین میں تبدیلی حالت ارتداد تک پہنچی ہوئی ہو۔تو واضح بات ہے کہ مرتد کافر ہوتا ہے کافر کو نہ حوض سے پانی پلایا جائیگا اور نہ ہی اسکی شفاعت کی جائیگی کہ وہ عذاب سے بچ جائیگا۔

" لان ظاهر هذا الحديث ان جميع الامة يشرب الا من ارتد و صار كافرا "
(نووی شرح مسلم ج ۲ ص ۲۵۷)

تحقیقی جواب نمبر 2: دین میں ان کی تبدیلیاں حالت ارتداد تک تو نہیں پہنچی ہوں گی لیکن ان کی رخنہ اندازی کی وجہ سے رب تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ سے ناراض ہوں گے جب حضور ناراض ہوئے تو حوض سے پانی پلانے کا مقصد ہی ختم ہو جائے گا۔علامہ نووی رحمہ اللہ کے ان الفاظ کو پڑھ کر سمجھئے:

" وقيل لا يشرب منه الا من قد له السلامة من النار " (نووی شرح مسلم ج ۲ ص ۲۵۷)

بیان کیا گیا ہے کہ حوض سے پانی ان کو ہی پینا نصیب ہوگا جن کی قسمت میں آگ سے سلامتی مقدر ہوگی۔

اب مسئلہ کو سمجھئے کہ ان لوگوں کو حوض کا پانی نہیں پلایا جائے گا کیونکہ انہوں نے آگ میں داخل ہونا ہے۔لیکن یہ کیسے ثابت ہو سکتا ہے کہ جو آگ میں داخل ہوں گے ان کی شفاعت نہیں ہوگی۔جبکہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ شفاعت کی ایک قسم یہ بھی ہے کہ جو لوگ جہنم کی آگ میں گناہوں کی وجہ سے داخل کر دیئے جائیں گے ان کو شفاعت کی وجہ سے آگ سے نکال دیا جائے گا۔یعنی حوض کا پانی تو نہیں پلایا جائے گا لیکن جہنم میں داخل کرنے کے بعد شفاعت کی وجہ سے ان کو جہنم سے نکال دیا جائیگا۔

معتزلہ کا یہ کہنا کہ " جسے حوض سے پانی نہیں پلایا جائے گا اس کی شفاعت بھی نہیں ہوگی " باطل اور لغو قول ہے۔

☆ " عن جابر بن عبد الله ان النبي ﷺ قال لكعب بن عجرة يا كعب بن عجرة اعيذك بالله من امارة السفهاء انه سيكون امراء من دخل عليهم فاعانهم على ظلمهم وصدقهم بكذبهم فليس مني ولست منه ولن يرد على الحوض ومن لم يدخل عليهم ولا يعنهم على ظلمهم ولم يصدقهم بكذبهم فهو مني وانا منه وسيرد على الحوض يا كعب بن عجرة لا يدخل الجنة لحم نبت من سحت "

حضرت جابر بن عبد اللہ کہتے ہیں بیشک نبی کریم ﷺ نے کعب بن عجرۃ کو کہا اے کعب میں تمہارے لئے بے وقوفوں کے حاکمیت سے اللہ کی پناہ مانگتا ہوں بیشک ایسے امراء ہوں گے کہ جو ان کے پاس گیا اور ان کے ظلم پر ان کی امداد کی اور ان کے جھوٹ کو سچا کہا اس شخص کا تعلق مجھ سے نہیں اور میر تعلق اس سے نہیں اور جو ان کے پاس نہ گیا اور کے ظلم پر ان کی امداد نہ کی، اور ان کے جھوٹ کو سچ نہ کہا اس کا تعلق مجھ سے ہوگا اور میرا تعلق اس سے ہوگا۔ اور وہ حوض پر وارد ہوگا (اسے حوض کوثر کا پانی ملے گا) اے کعب بن عجرہ نماز رب تعالیٰ کی قربت کا ذریعہ ہے، روزہ (گناہوں اور شہوات سے بچانے کے لئے) ڈھال ہے اور صدقہ گناہوں کو ایسے مٹا دیتا ہے جیسے پانی آگ کو، اے کعب بن عجرہ وہ شخص جنت میں نہیں داخل ہوگا جس کی پرورش حرام مال سے ہوگی۔

اس حدیث پر معتزلہ نے کہا:

"ان قوله لا يدخل الجنة لحم نبت سحت ، صريح فی انه لا اثر الشفاعة فی حق صاحب الكبيرة"

بیشک نبی کریم ﷺ کا یہ ارشاد کہ جس شخص کی پرورش حرام مال سے ہوئی وہ جنت میں داخل نہیں ہوگا واضح طور پر دلالت کر رہا ہے کہ گناہ کبیرہ کے حق میں شفاعت کا اثر نہیں ہوگا۔

الزامی جواب: "لا يدخل الجنة" میں کسی زمانہ کی کوئی قید نہیں اگر اس کو مطلق رکھا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ وہ کبھی بھی جنت میں داخل نہیں ہوگا حالانکہ ہمیشہ جہنم میں رہنا اور جنت میں کبھی نہ داخل ہونا صرف کافر کے لئے ہوگا۔ مومن نے آخر کار جنت میں داخل ہونا ہی ہے۔

تحقیقی جواب: حدیث شریف میں "لا يدخل الجنة" کا مطلب یہ ہے کہ اگر اس شخص پر اللہ تعالیٰ نے مہربانی نہ فرمائی تو وہ ابتدائی طور پر جنت میں نہیں داخل ہوگا، بلکہ اس کو ابتدائی طور پر جہنم میں بھیج دیا جائیگا۔ اسکے بعد وہ سزا ختم کر لے تو اسے جہنم سے نکال کر جنت میں داخل کر دیا جائے۔ یا اسکے حق میں شفاعت کر دی جائے اور اسکے حق میں شفاعت کو قبول کر کے اسے جنت میں داخل کر دیا جائے۔

خیال رہے کہ "اول مرتبہ جنت میں داخل نہ ہونے کی قید بہت جگہ پر لگانے کی ضرورت درپیش آتی ہے" جیسا کہ: "من قال لا اله الا الله دخل الجنة" (جس نے لا الہ الا اللہ کہا وہ جنت میں

داخل ہوگا) میں یہ قید لگانے کی ضرورت ہوتی ہے کہ آخر کار وہ جنت میں داخل ہوگا۔

☆ "عن ابی هریرة قال قام فینا رسول الله ﷺ ذات یوم فذکر الغلول فعظمه وعظم امره ثم قال لا الفین احدکم یجئی یوم القیامة علی رقبته بعیرله رغاء یقول یا رسول الله اغثنی فاقول لا املک لک شیأ قد ابلغتک لا الفین احدکم یجئی یوم القیامة علی رقبته فرس له حمحمة فیقول یا رسول الله اغثنی فاقول لا املک لک شیأ قد ابلغتک، لاالفین احدکم یجئی یوم القیامة علی رقبته شاة لها ثغاء یقول یا رسول الله اغثنی فاقول لااملک لک شیأ قد ابلغتک، لا الفین احدکم یجئی یوم القیامة علی رقبته نفس لها صیاح فیقول یا رسول اغثنی فاقول لا املک لک شیأ قد ابلغتک لا الفین احدکم یجئی یوم القیامة علی رقبته رقاع تخفق فیقول یا رسول الله اغثنی فاقول لا ملک لک شیأ قد ابلغتک، لا الفین احدکم یجئی یوم القیامة علی رقبته صامت فیقول یا رسول الله اغثنی فاقول لا املک لک شیأ قد ابلغتک" (رواه مسلم باب غلظ تحریم الغلول)

مشکل الفاظ کے معانی: غلول، امانت میں خیانت کرنا۔ الفین، ہمزہ پر ضمہ، فاء کے نیچے کسرہ لا الفین ای لا اجدن احدکم علی هذه الصفة، میں نہ پاؤں تم میں سی کسی ایک کو اس صفت پر رغاء، اونٹ کی آواز۔ حمحمة، گھوڑے کی آواز۔ ثغاء، بکری کی آواز۔ صیاح، چلانا، زور زور سے آواز دینا۔ رقاع، کپڑوں کے ٹکڑے۔ تخفق، حرکت کرنا۔ صامت، خاموش رہنا، لیکن یہاں مراد سونا اور چاندی ہے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ ہمارے درمیان تشریف فرما تھے آپ نے مال غنیمت میں خیانت کا ذکر فرمایا اس کے عظیم جرم ہونے اور اس پر عظیم سزا کے مستحق ہونے کا ذکر فرمایا پھر آپ نے فرمایا میں تم میں سے کسی ایک کو ہرگز نہ پاؤں ایسے حال میں کہ وہ قیامت کے دن آئے اس کی گردن پر (غنیمت میں خیانت کردہ) اونٹ ہو جو آواز دے رہا ہو۔ وہ شخص کہے گا یارسول اللہ میری فریاد کو پہنچیں میں کہوں گا میں تمہارے لئے کسی چیز کی ملکیت نہیں رکھتا، میں نے تمہیں (اللہ کے احکام) پہنچا دیے تھے۔

میں تم میں سے کسی ایک کو ایسے حال میں ہرگز نہ پاؤں کہ وہ قیامت کے دن آئے اس کی گردن پر گھوڑا ہو جو اپنی آواز دے رہا ہو، وہ شخص کہے گا یارسول اللہ میری فریاد کو پہنچو میں کہوں گا میں تمہارے

لئے کسی چیز کا مالک نہیں میں نے تمہیں احکام پہنچا دیئے تھے۔

میں تم میں سے کسی ایک کو ایسے حال میں ہرگز نہ پاؤں کہ وہ قیامت کے دن آئے اس کی گردن پر بکری ہو جو آواز دے رہی ہو، وہ شخص کہے گا یارسول اللہ میری فریاد کو پہنچو، میں کہوں گا میں تمہارے لئے کسی چیز کا مالک نہیں میں نے احکام پہنچا دیئے تھے۔

میں تم میں سے کسی ایک کو ایسے حال میں ہرگز نہ پاؤں کہ وہ قیامت کے دن آئے اس کی گردن پر کوئی انسان چلا رہا ہو (یعنی جس انسان کا حق اس نے دبایا ہوا تھا) وہ کہے گا یارسول اللہ میری فریاد کو پہنچو میں کہوں گا میں تمہارے لئے کسی چیز کا مالک نہیں میں نے تمہیں احکام پہنچا دیئے تھے۔

میں تم میں سے کسی شخص کو ہرگز ایسے حال میں نہ پاؤں کہ وہ قیامت کے دن آئے اس کی گردن پر کپڑے حرکت کر رہے ہوں، وہ کہے گا یارسول اللہ میری فریاد کو پہنچو میں کہوں گا میں تمہارے لئے کسی چیز کا مالک نہیں میں نے تمہیں احکام پہنچا دیئے تھے۔

میں تم میں سے کسی کو ہرگز اس حال میں نہ پاؤں کہ وہ قیامت کے دن آئے تو اس کی گردن پر سونا اور چاندی ہو وہ کہے گا یارسول اللہ میری فریاد کو پہنچو میں کہوں گا میں تمہارے لئے کسی چیز کا مالک نہیں میں نے تمہیں احکام پہنچا دیئے تھے۔

نبی کریم ﷺ کی اس حدیث پاک سے واضح ہوا کہ خیانت کرنا عظیم جرم ہے۔ جس چیز کی خیانت کرے گا اسی کا بوجھ قیامت کے دن اس کی گردن پر ہوگا۔ جس سے نجات حاصل کرنے کے لئے نبی کریم ﷺ سے فریاد طلب کر رہا ہوگا لیکن آپ امداد کرنے سے انکار فرما دیں گے۔

اس حدیث سے معتزلہ کا استدلال:

" هذا صريح فى المطلوب لانه اذا لم يملك له من الله شيأ فليس له فى الشفاعة نصيب "

معتزلہ کہتے ہیں کہ اس حدیث سے ہمارا موقف بہت واضح طور پر ثابت ہے کہ جب نبی کریم ﷺ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی چیز کے مالک نہیں ہوں گے تو آپ کو شفاعت کا بھی کوئی حق حاصل نہیں ہوگا۔

جواب: " قال القاضى معناه من المغفرة والشفاعة الا باذن الله تعالىٰ قال ويكون ذلك اولا غضبا عليه لمخالفته ثم يشفع فى جميع الموحدين بعد ذلك " (نووی شرح مسلم ج ۲ ص ۱۳۱)

قاضی عیاض رحمہ اللہ نے فرمایا کہ نبی کریم ﷺ کے ارشاد کا مطلب (کہ میں تمہارے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی چیز کا مالک نہیں) یہ ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کی اجازت سے شفاعت کرتا ہوں ابھی تمہارے لئے مجھے اللہ تعالیٰ کی طرف سے اجازت حاصل نہیں۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ آپ ان لوگوں پر ناراضگی کا اظہار فرمائیں گے جنہوں نے مال غنیمت میں خیانت کی ہوگی کیونکہ آپ نے اللہ تعالیٰ کے احکام پہنچا دیے تھے تو ان پر عمل کرنا چاہئے تھا ان پر عمل کو چھوڑ کر انہوں نے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کو ناراض کیا۔

ہاں البتہ پھر جب آپ تمام کلمہ توحید پر ایمان لانے والوں کی شفاعت کریں گے تو ان کی بھی شفاعت کریں گے۔ گویا کہ یہاں بھی ان کے جہنم میں داخل ہونے کے بعد ان کو شفاعت کے ذریعے نکال کر جنت میں داخل کیا جائے گا۔

راقم کے خیال میں یہاں ایک اور بھی احتمال ہے کہ اگر مال غنیمت کی تقسیم کے بعد کسی کا حق دبا لیا، تو اس صورت میں نبی کریم ﷺ نے شفاعت کرنی ہی نہیں کیونکہ حقوق العباد ادائیگی حقوق کے بغیر معاف نہیں ہوں گے۔ ان کی ادائیگی کا ذکر پچھلے اوراق میں کیا جا چکا ہے۔

☆ " قال علیه الصلوة والسلام ثلاثة انا خصیمهم یوم القیامة ومن کنت خصیمه خصمته ، رجل اعطی بی ثم غدر ، ورجل باع حرا فاکل ثمنه ، ورجل استأجر اجیرا فاستوفی منه ولم یوفه اجرته "

نبی کریم ﷺ نے فرمایا تین شخصوں سے قیامت کے دن میرا جھگڑا ہوگا، جس سے میرا جھگڑا ہوگا اسی سے میری ناراضگی ہوگی۔ ایک وہ شخص ہے، جس نے میرے ساتھ معاہدہ کیا پھر اس میں دھوکہ بازی کی، دوسرا وہ شخص ہے، جس نے آزاد شخص کو بیچ کر اس کا بدل مال کھالیا۔ تیسرا وہ شخص ہے، جس نے کسی شخص کو اجرت پر کام میں لگایا، اس سے کام پورا لیا، لیکن اسے اجرت مکمل نہ دی۔

اس حدیث سے معتزلہ کا استدلال:

" انه علیه الصلوة والسلام لما کان خصیما لهؤلاء فاستحال ان یکون شفیعالهم "

بیشک نبی کریم ﷺ جب ان لوگوں سے جھگڑا کرنے والے ہوں گے کہ تم نے یہ جرم کیوں کئے تو محال ہے کہ آپ ان کی شفاعت فرمائیں۔ اس سے واضح ہوا کہ آپ کبیرہ گناہ کرنے والوں کی

شفاعت نہیں فرمائیں گے۔

جواب: اس حدیث پاک کا بھی وہی مطلب ہے جو پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ پہلے آپ ناراضگی کا اظہار فرمائیں گے یعنی ان کو ڈانٹ دیں گے۔ اس طرح ان لوگوں کو جہنم میں داخل کر دیا جائے گا۔ پھر آپ شفاعت فرمائیں گے تو آپ کی شفاعت سے ان کو جہنم میں نکال کر جنت میں داخل کر دیا جائے گا۔

معتزلہ کی اور دلیل: اللہ تعالیٰ نے فرمایا ﴿ وَلَا يَشْفَعُوْنَ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى ﴾ فاسق تو مرتضی (پسندیدہ) نہیں لہٰذا فاسق کی جب فرشتے شفاعت نہیں کریں گے تو یقیناً نبی کریم ﷺ بھی شفاعت نہیں فرمائیں گے۔

جواب: آیۃ کریمہ کا مطلب یہ نہیں جو تم نے بیان کیا ہے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ شفاعت کرنے کا حق ان کو ہوگا جن کو اللہ تعالیٰ نے پسند کیا ہوگا، یعنی جن کو اللہ تعالیٰ نے اجازت دی ہوگی اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ آیت کریمہ کا مطلب یہ ہے:

﴿ وَلَا يَشْفَعُوْنَ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضَاهُ اللّٰهُ ﴾

کہ شفاعت نہیں کریں گے سوائے اس شخص کے جس کے لئے شفاعت کو رب تعالیٰ نے پسند کیا ہوگا۔

تو اس سے بھی اتنا ہی ثابت ہوگا کہ جب تک اللہ تعالیٰ کی طرف اجازت نہیں دی جائے گی تو اس شخص کے لئے کوئی شفاعت نہیں کرے گا اور اگر اجازت ہوئی تو شفاعت کی جائے گی۔

معتزلہ اصل میں شفاعت کی پانچ قسموں کو سمجھنے سے قاصر رہے، انہیں یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ ابتدائی طور پر شفاعت نہ کرنا اور جہنم میں جانے کے بعد شفاعت کرنا بھی شفاعت ہی ہے۔ بلکہ ساتھ تنبیہ بھی ہوگی اور ان پر مہربانی بھی ہوگی۔ پھر شفاعت نہ کرنا اور چیز ہے، شفاعت کا مستحق نہ ہونا اور چیز ہے معتزلہ یہ فرق نہ سمجھ سکے۔

(شفاعت میں معتزلہ کے دلائل کی بحث ماخوذ از کبیر بتصرف)

☆☆☆☆☆

﴿ وَاِذۡ نَجَّیۡنٰکُمۡ مِّنۡ اٰلِ فِرۡعَوۡنَ یَسُوۡمُوۡنَکُمۡ سُوۡٓءَ الۡعَذَابِ یُذَبِّحُوۡنَ اَبۡنَآءَکُمۡ وَیَسۡتَحۡیُوۡنَ نِسَآءَکُمۡ وَفِیۡ ذٰلِکُمۡ بَلَآءٌ مِّنۡ رَّبِّکُمۡ عَظِیۡمٌ ﴾

۱) ''(اور یاد کرو) جب ہم نے تم کو فرعون والوں سے نجات بخشی کہ تم پر برا عذاب کرتے تھے تمہارے بیٹوں کو ذبح کرتے اور تمہاری بیٹیوں کو زندہ رکھتے اور اس میں تمہارے رب کی طرف سے بڑی بلا تھی یا بڑا انعام''۔

۲) ''اور یاد کرو جب ہم نے نجات دی تمہیں فرعون والوں سے، پہنچاتے تھے تمہیں بدترین تکلیفیں، ذبح کرتے تمہارے بیٹوں کو، اور زندہ چھوڑتے تمہاری بیٹیوں کو، اور اس میں تمہارے لئے آزمائش تھی تمہارے رب کی طرف سے بہت بڑی''۔

بنی اسرائیل کو رب تعالیٰ نے پہلے حکم دیا کہ میری نعمتوں کو یاد کرو، اب انہیں اپنی نعمتوں کی تفصیل بتائی جا رہی ہے۔ کہ تم یاد کرو اس نعمت کو کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں فرعون والوں سے نجات دی کیونکہ وہ تمہیں طرح طرح کی شدید تکلیفیں پہنچاتے تھے اور سب سے بہت بڑا اور بہت برا عذاب انہوں نے تمہیں یہ دیا کہ تمہارے بیٹوں کو قتل کرا دیا اور تمہاری بیٹیوں کو زندہ چھوڑا، یہ تمہارے لئے بہت بڑی آزمائش تھی۔

خیال رہے کہ یہ خطاب بھی نبی کریم ﷺ کے زمانہ کے یہود کو ہے لیکن چونکہ یہ انعام ان کے آباؤ اجداد پر تھا اس لئے گویا کہ ان پر بھی یہ انعام تھا۔

﴿ وَاِذۡ نَجَّیۡنٰکُمۡ مِّنۡ اٰلِ فِرۡعَوۡنَ ﴾ : ''اور جب ہم نے تمہیں نجات دی فرعون والوں سے''

" اذ فی موضع النصب عطف علی (اذکروا نعمتی) وھذا وما بعده تذکیر ببعض التی کانت علیھم "

لفظ " اذ " محل نصب میں ہے اس کا عطف " اذکروا " پر ہے اس آیۃ کریمہ اور بعد میں آنے والی آیات میں بعض نعمتوں کی یاد دلائی جا رہی ہے۔ جو نعمتیں ان پر تھیں ان میں سے ہی یہ نعمت بھی

ہے کہ ان کو فرعون والوں سے نجات دی۔

❀ الِ ❀ : اصل میں اھل ہے کیونکہ اس کی تصغیر " اھیـل " آتی ہے بعض حضرات نے کہا یہ اصل میں ''اول'' (واؤ کے سکون سے) ہے۔

قاعدہ اکثریہ: آل او اھل کا اگر چہ ایک معنی ہے لیکن ان کے استعمال میں فرق کیا جاتا ہے آل اور اھل میں دلالت کرنے والا قاعدہ اکثر یہ یہ پایا گیا ہے کہ ''آل'' کا مصاف الیہ ذو خطر (سردار شخص) ہو۔ چاہئے خواہ اسے وہ منصب دینی طور پر حاصل ہو یا دنیاوی طور۔ آل رسول اور آل فرعون تو کہا جا سکتا ہے کیونکہ اللہ کے رسول کو ایک دینی منصب یعنی منصب نبوت حاصل ہے۔ اور فرعون کو دنیاوی طور پر بادشاہت کی وجہ سے ایک منصب حاصل تھا۔

اسی وجہ سے ''آل حجام'' نہیں کہہ سکتے کیونکہ حجام (خون نکالنے والے) کا پیشہ گھٹیا سمجھا جاتا ہے اور " اھل حجام " کہا جا سکتا ہے۔ اور فرق یہ ہے کہ آل کا مضاف الیہ ذوی العقول سے ہونا چاہئے لہٰذا آل کوفہ نہیں کہا جا سکتا البتہ اھل کوفہ کہا جا سکتا ہے۔ اور فرق یہ کہ آل کا مضاف الیہ مذکر ہونا چاہئے اسی لئے آل فاطمہ نہیں کہا جاتا بلکہ اھل فاطمہ کہا جاتا ہے۔

لیکن یہ خیال رہے کہ یہ قاعدہ اکثر یہ ہے کلیہ نہیں یہی وجہ ہے کہ اس قاعدہ کے خلاف بھی استعمال ہے جیسا کہ کہا جاتا ہے، آل عوج (عوج گھوڑے کا نام) اور کہا جاتا ہے، آل مدینہ، اور کہا جاتا ہے، آل نعم اور کہا جاتا ہے، آل صلیب، اور کہا جاتا ہے، آلک، اور کبھی آل بغیر مصاف الیہ کے بھی استعمال ہوتا ہے جیسا کہ کہا جاتا ہے " ھم خیر آل " (روح المعانی)

آل فرعون سے مراد:

" آل فرعون ای قومه واتباعه واھل دینه "

آل فرعون سے مراد فرعون کی قوم اور اس کی تابعداری کرنے والے، اور اس کے دین پر چلنے والے۔

" اذلم یکن له ابن ولا بنت ولا اب ولا عم ولا اخ ولا عصبة "

فرعون کی آل سے مراد اس کے دین کے پیروکار ہی لینا بہتر ہے کیونکہ " اغـرقـنـا آل فرعون" میں آل سے مراد فرعون کی قوم بھی نہیں ہوسکتی کیونکہ اس وقت فرعون کا نہ کوئی بیٹا تھا اور نہ بیٹی،

اور نہ باپ تھا اور نہ چچا، اور نہ بھائی تھا اور نہ ہی خاندان کا کوئی اور فرد تھا۔ (از قرطبی)

" والآل خاصة الرجل من جهة قرابة او صحبة وحكى عن ابى عبيدة انه سمع فصيحا يقول اهل مكة آل الله "

کسی شخص کے قرابت یا صحبت کے لحاظ پر خاص حضرات کو آل کہا جاتا ہے ابوعبیدہ نے فصیح شخص کو کہتے ہوئے سنا " اهل مكة آل الله " مکہ والے اللہ تعالیٰ کی آل ہیں، یعنی اللہ تعالیٰ سے مکہ والے قرب رکھنے والے ہیں اس لحاظ سے "آل اللہ" کہنا صحیح ہوا۔ (از کبیر)

فائدہ: نبی کریم ﷺ کی آل سے مراد کون حضرات ہیں؟ علامہ نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" واختلف العلماء فى آل النبى ﷺ على اقوال اظهرها وهو اختيار الازهرى وغيره من المحققين انهم جميع الامة والثانى بنو هاشم وبنو المطلب والثالث اهل بيته ﷺ وذريته والله اعلم "

(مسلم باب الصلوة على النبی ج ۱ ص ۱۹۶)

نبی کریم ﷺ کی آل میں علماء کا اختلاف ہے اس میں مختلف قول ہیں ان میں ظاہر قول یہ ہے جو علامہ ازہری رحمہ اللہ اور دوسرے محققین حضرات کا ہے کہ بیشک اس سے مراد آپ کی تمام امت ہے لیکن خیال رہے کہ امت میں نیک اور متقی حضرات مراد ہیں فساق و فجار مراد نہیں، اس لئے کئی مصنفین حضرات نے اس مسئلہ کے اوپر بطور دلیل ایک حدیث پیش فرمائی کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا" كل نقى تقى فهو آلى (او كما قال ﷺ) " کہ ہر پاک وصاف میری امت کا شخص میری آل ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ آپ کی آل سے مراد بنی ہاشم اور بنی مطلب میں سے ایمان لانے والے حضرات ہیں۔ تیسرا قول یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کی آل کا اطلاق آپ کی ازواج مطہرات پر اور آپ کی اولاد پر ہوتا ہے۔

قرطبی رحمہ اللہ نے فرمایا:

" آل الرسول من هو على دينه وملته فى عصره وسائر الاعصار سواء كان نسبيا له او لم يكن "

رسول اللہ ﷺ کے آل وہ ہے جو آپ کے دین اور آپ کی ملت پر ہے خواہ وہ آپ کے زمانہ میں تھے یا بعد میں کسی زمانہ میں بھی ہوں خواہ آپ کے نسب سے ہوں یا نہ ہوں۔

" ومن لم یکن علی دینه وملته فلیس من آله ولا اهله وان کان نسبه او قریبه "
جو شخص نبی کریم ﷺ کے دین اور ملت پر نہیں وہ آپ کی اہل سے نہیں اگر چہ آپ کے نسب سے اس کا تعلق ہو، یا آپ کا قریبی رشتہ دار ہو۔

یہی وجہ ہے کہ ابولہب اور ابوجہل آپ کے خاندان سے متعلق ہونے کے باوجود آپ کی اہل سے نہیں۔ اسی سے پتہ چل گیا کہ صرف یہ کہنا کہ ہم سادات ہیں کافی نہیں ایمان پہلے ہے سید ہونے کا نفع بعد میں ہے نبی کریم ﷺ کا گستاخ یا صحابہ کرام سے بغض رکھنے والا اپنے آپ کو حضور کی آل کہے یہ اس کی جہالت ہے۔

بعض حضرات نے کہا کہ آل نبی صرف آپ کی ازواج اور آپ کی اولاد ہے کیونکہ حضرت ابو حمید ساعدی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ صحابہ کرام نے عرض کیا یا رسول اللہ ہم آپ پر کیسے درود بھیجیں تو آپ نے فرمایا تم کہو۔

" اللهم صل علی محمد وعلی ازواجه وذریته کما صلیت علی آل ابراهیم وبارک علی محمد وعلی ازواجه وذریته کما بارکت علی آل ابراهیم انک حمید مجید "
(رواہ مسلم)

یعنی اس حدیث میں نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ تم یہ کہو "اے اللہ تو درود بھیج محمد (ﷺ) پر، اور آپ کی ازواج پر اور آپ کی اولاد پر۔

اس سے واضح ہوا کہ آپ کی آل آپ کی ازواج مطہرات ہیں اور آپ کی اولاد ہے۔

تمام اقوال میں حقیقتاً کوئی اختلاف نہیں:

راقم کے نزدیک تین اقوال جو ذکر کیے ہیں اور چوتھا قول جو درسیات کے حواشی پر ملتا ہے کہ آپ کی آل کا اطلاق آپ کے صحابہ کرام پر ہے سب ہی درست ہیں عبارت کے ماقبل اور مابعد کو دیکھا جائے کہ یہاں آل کا معنی ازواج مطہرات لینا صحیح ہے تو اس وقت اس سے مراد ازواج مطہرات ہی ہوں گی۔ اسی طرح اگر اولاد مراد لینا مناسب تو وہ معنی مراد لیا جائے، اگر صحابہ کرام معنی لینا زیادہ مناسب نظر آئے تو وہ معنی کیا جائے۔ اگر بنو ہاشم یا بنو عبد المطلب مراد لینا بہتر ہو تو وہی مراد لی جائے،

اور اگر آپ کی امت کے تمام نیک متقی حضرات مراد لینا بہتر سمجھ آئے تو وہی مراد ہوگا۔

فرعون: مصر کے بادشاہوں کا لقب فرعون ہوا کرتا تھا۔ روم کے بادشاہوں کا قیصر، فارس کے بادشاہوں کا کسریٰ، یمن کے بادشاہوں کا تبع، ترک بادشاہوں کا خاقان، اور حبشہ کے بادشاہوں کا لقب نجاشی تھا۔

" ولم یکن من الفراعنة احد اشد غلظة و لا اقسی قلبا منه "

مصر کے جتنے بادشاہ بھی گزرے ہیں کوئی بھی موسیٰ علیہ السلام کے زمانے کے فرعون سے زیادہ بد خلق، سخت دل اور ظالم نہیں تھا۔

یوسف علیہ السلام کے زمانے کا فرعون کا نام ریان بن ولید تھا جس نے ایمان قبول کر لیا تھا موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں پائے جانے والے فرعون کا نام ''ولید ابن مصعب'' یا مصعب ریان تھا بعض نے اس کا نام قابوس بھی تحریر کیا ہے، قبیلہ قبط سے تھا۔ یوسف علیہ السلام اور موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں پائے جانے والے فرعونوں کے درمیان چار سو سال سے زائد عرصہ تھا۔

دینی طلباء کرام کے لئے: فرعون غیر منصرف ہے کیونکہ اس میں ایک سبب علمیت ہے اور دوسرا سبب عجمہ ہے اگرچہ فرعون عجمی لفظ ہے عربی نہیں، لیکن فرعون کے ظالمانہ طریقہ کو دیکھ کر اور اس کی سرکشی کو دیکھ کر اس کو عربی حضرات نے استعمال کیا ہے:

" فقیل تفرعن الرجل اذا تجبر وعتا " جب کوئی شخص ظلم اور سرکشی کرے تو کہا جاتا ہے " تفرعن الرجل "

(ماخوذ از کبیر)

فرعون کا غربت سے بادشاہت تک پہنچنا:

فرعون بہت غریب شخص تھا اس پر بہت زیادہ قرض ہو گیا تھا یہ مصر میں آیا اس نے دیکھا کہ دیہات سے خربوزوں کی گٹھڑی ایک درھم کی ملتی ہے اور شہر میں ایک خربوزہ ایک درھم کا فروخت ہوتا ہے اس نے سوچا یہ بڑی کامیاب تجارت ہے اس سے قرضہ اتارنا آسان ہوگا۔ اس نے ایک درھم سے خربوزوں کی ایک گٹھڑی خرید لی، شہر میں لایا تو اس سے ٹیکس وصول کرنے والے بدمعاشوں نے مختلف جگہ پر بطور ٹیکس خربوزے بٹورنے شروع کر دیئے۔ سب خربوزے جگا ٹیکس کی نظر ہو گئے صرف ایک خربوزہ باقی بچا جو اس نے شہر میں ایک درھم سے بیچ کر اپنا مول کھرا کیا۔

اس نے سوچا اس ملک میں کوئی قانون نہیں جس کی لاٹھی اس کی بھینس والا ضابطہ ہے یہاں بدمعاش ہوکر مال بٹورنا آسان ہے قانون پر عمل کرنا جرم ہے۔

شہر میں وباء پڑ گئی لوگ بہت تعداد میں مرنے لگے، یہ قبرستان میں جا کر بیٹھ گیا کہ جو پانچ درھم دے گا اس کے مردہ کو یہاں دفن کرنے دیا جائے گا میں یہاں کا منتظم ہوں جو بھی آتے اسے پانچ درھم دیئے جاتے کسی نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔ البتہ ایک خاندان والوں نے اسے پانچ درھم دینے سے انکار کر دیا اسے پکڑ کر حاکم وقت کے پاس لے گئے۔

اس نے پوچھا تمہیں کس نے قبرستان میں منتظم بنایا، تم کیوں ٹیکس لے رہے ہو اس نے بتایا مجھے کسی نے مقرر تو نہیں کیا تھا البتہ میں نے یہ حیلہ اس لئے کیا تھا کہ تمہارے پاس کسی طرح پہنچا دیا جاؤں میں نے تمہیں بتانا یہ تھا کہ تمہارے ملک میں کوئی قانون نہیں ہر شخص ٹیکس وصول کر رہا ہے ان کو کوئی پوچھنے والا نہیں۔ اسلئے کچھ کام میرے سپرد کرو تا کہ میں درست انتظام کرلوں بادشاہ نے اسے اپنی حکومت میں انتظامی امور سپرد کر دیئے اس نے مناسب تدبیر سے لوگوں میں اپنا مقام بنا لیا آخر کار بادشاہ بن گیا۔ (ابوالسعود)

﴿ یَسُوْمُوْنَکُمْ ﴾: "یذیقونکم ویلزمونکم ایاہ" وہ تمہیں چکھاتے تھے، تم پر لازم کرتے، "وقیل یدیمون تعذیبکم" بعض حضرات نے کہا اس کا معنی ہے ہمیشہ تمہیں عذاب پہنچاتے تھے۔

﴿ سُوْٓءَ الْعَذَابِ ﴾: "معناہ اشد العذاب" اس کا معنی ہے سخت عذاب، یعنی وہ فرعون والے تمہیں سخت عذاب پہنچاتے، تاہم اگر ظاہری معنی مراد لیا جائے کہ وہ "برا عذاب تمہیں پہنچاتے تھے" تو پھر بھی ٹھیک ہے۔ (از قرطبی)

کیسا بنی اسرائیل کو سخت عذاب دیا گیا؟

بنی اسرائیل کی حالت موسیٰ علیہ السلام کی پیدائش سے پہلے یہ تھی کہ فرعونیوں کے یہ لوگ خادم تھے ان کو مختلف قسم کے کاموں پر مقرر کیا ہوا تھا۔ کچھ لوگوں کو تعمیر کے کاموں پر لگایا ہوا تھا، اور کچھ لوگوں سے

ہل چلانے کا کام لیا جاتا، اور کچھ لوگوں سے کھیتی باڑی کے مختلف کام لئے جاتے، فصل کی کاشت اور کٹائی وغیرہ کے کاموں پر مقرر تھے، گندے کاموں پر بھی انہیں ہی لگایا جاتا، بیت الخلاء کی صفائی ان لوگوں کے ذمہ ہی تھی، کیچڑ وغیرہ کے کاموں پر ان کو ہی مقرر کیا جاتا. پتھر تراشنا اور پتھروں کو اٹھا کر لانا ان کے ذمہ ہی تھا۔ اینٹیں بنانا اور پھر ان کو پکوانے کا کام ان سے ہی لیا جاتا تھا۔ جو لوگ یہ کام نہیں کرسکتے تھے ان پر ٹیکس مقرر کر دیا جاتا تھا۔ اور جو شخص سورج کے غروب ہونے سے پہلے ٹیکس ادا نہ کرتا اس کے ہاتھ اس کی گردن سے باندھ دیئے جاتے اور ایک مہینہ تک اس کے ہاتھ اسی طرح بندھے رہتے۔

اور بنی اسرائیل کی عورتوں سے بھی اسی طرح کام لئے جاتے جیسے لونڈیوں سے کام لئے جاتے یعنی گھریلو تمام کام ان کے سپرد ہوتے، اور سوت کاتنا اور سلائی، بنائی وغیرہ کے کام ان کی عورتوں سے ہی لئے جاتے تھے۔ (ماخوذ از کبیر، روح المعانی، خازن)

﴿يُذَبِّحُونَ اَبْنَآءَ كُمْ وَيَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَ كُمْ﴾:

ابناء کم تمہارے بیٹے۔ نساء کم تمہاری بیٹیاں۔ یذبحون تشدید سے مبالغہ کے معنی میں استعمال ہے، یعنی تمہارے بیٹوں کو کثیر تعداد میں انہوں نے ذبح کیا تھا۔ یہ معنی اس وقت ہوگا جب کہ کمیت (تعداد) میں مبالغہ ثابت کیا جائے، لیکن مبالغہ اگر کیفیت میں ثابت کیا جائے تو معنی یہ ہوگا کہ وہ تمہارے بیٹوں کو بے دردی سے ذبح کرتے تھے۔

نکتہ: اس آیۃ میں یذبحون بغیر واؤ کے استعمال ہے، اور سورۃ ابراہیم میں " ویذبحون " واؤ کے ساتھ استعمال ہوا ہے وجہ فرق کیا ہے؟ وجہ فرق یہ ہے کہ یہاں بغیر واؤ کے استعمال ہوا ہے، اس لئے کہ یہ ﴿يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ﴾ کا بیان ہے کہ وہ تمہیں برا عذاب پہنچاتے، وہ برا عذاب کیا تھا؟ وہ برا عذاب یہ بھی تھا کہ فرعون والے بنی اسرائیل کے بیٹوں کو ذبح کرتے اور بیٹیوں کو زندہ رہنے دیتے۔

اور سورۃ ابراہیم میں "واؤ" سے ذکر کر کے مغائرت ثابت کی گئی کہ وہ برا عذاب پہنچاتے تھے اور اس سے بڑھ کر ان کے بیٹوں کو ذبح کرتے اور ان کی بیٹیوں کو زندہ رہنے دیتے۔ سبحان اللہ قرآن پاک کی کیا عظمت ہے کہ ایک ہی مسئلہ کو دو مختلف انداز سے بیان کر کے اس طرح ثابت کر دیا کہ فرعونیوں کا بنی اسرائیل کو برا عذاب پہنچانا یہ بھی تھا کہ ان کے بیٹوں کو ذبح کرتے اور بیٹیوں کو

زندہ چھوڑتے۔ اور وہ مختلف طریقوں سے بنی اسرائیل کو برا عذاب پہنچاتے اور صرف اسی پر اکتفاء نہیں کرتے تھے بلکہ اس سے بڑھ کر ان کے بیٹوں کو ذبح کرتے اور ان کی بیٹیوں کو زندہ چھوڑتے۔ یہ عظمت صرف قرآن پاک کو ہی حاصل ہے۔

بنی اسرائیل کے بیٹوں کو ذبح کیوں کرایا گیا؟

فرعون نے ایک خواب دیکھا کہ بیت المقدس کی جانب سے ایک آگ نکلی ہے جس نے مصر کا احاطہ کرلیا اور تمام قبطیوں کو جلا دیا، لیکن بنی اسرائیل کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا اس خواب سے فرعون بہت پریشان تھا، اس نے خواب کی تعبیر بیان کرنے کے ماہرین سے پوچھا کہ اس خواب کی تعبیر کیا ہو سکتی ہے؟ انہوں نے بتایا کہ اس خواب سے تو یہی سمجھ آتا ہے کہ بنی اسرائیل میں ایک بچہ پیدا ہوگا جو تمہاری بادشاہی کے زوال کا سبب بنے گا۔ یہ سن کر فرعون نے حکم دیا کہ بنی اسرائیل میں جو بچہ بھی پیدا ہوا سے ذبح کردیا جائے اس طرح اس کے حکم سے ہزاروں کی تعداد میں ان کے بچے ذبح کردیئے گئے، وہ جو ذبح کیے گئے ان کی تعداد بارہ ہزار تھی یا ستر ہزار تھی، اتنی بات واضح ہے کہ ہزاروں کی تعداد میں تھے۔

(جلالین، جمل)

فرعون کے اسی خواب کو مختصر الفاظ میں پیر محمد کرم شاہ رحمہ اللہ نے ذکر کرنے کے بعد فرمایا اس وقت کی توہم پرست مصری ذہنیت سے یہ کچھ بعید بھی نہ تھا۔ لیکن شیخ محمد عبدہ نے ایک اور وجہ بیان کی ہے وہ کہتے ہیں کہ بنی اسرائیل کی نسل اس تیزی اور کثرت سے بڑھنے لگی تھی کہ فرعون کو یہ اندیشہ لاحق ہوگیا کہ اگر ان کی پیدائش کی رفتار یہی رہی تو بنی اسرائیل کی اقلیت اکثریت میں تبدیل ہو جائے گی اور اپنی غالب اکثریت کی بناء پر یہ کوئی انقلاب برپا کردیں گے، اس خدشہ کے پیش نظر اس نے بنی اسرائیل کی نسل کشی کا یہ ظالمانہ حکم دیا۔ (ضیاء القرآن)

علامہ رازی رحمہ اللہ نے فرعون کے خواب دیکھنے کا واقعہ بھی بیان کیا لیکن اس سے پہلے ایک اور وجہ کو ذکر کیا وہ یہ ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ فرعون اور اس کے متبعین (تابعداری کرنے والوں) کو جب یہ علم حاصل ہوا: "کان اللہ وعد ابراھیم ان یجعل فی ذریتہ انبیاء وملوکا فخافوا ذلک" کہ اللہ تعالیٰ کا ابراہیم علیہ السلام سے وعدہ ہے کہ تمہاری اولاد سے انبیاء

اور بادشاہ بناؤں گا تو اس سے فرعون اور فرعون والے لوگ ڈرے کہ یہ کہیں بادشاہ بن کر ہماری بادشاہت کو ختم نہ کردیں تو انہوں نے سوچا کہ بڑی عمر کے لوگ خود مر جائیں گے، بچوں کو قتل کرانا شروع کردو تاکہ بنی اسرائیل نہ بڑھیں اور نہ ہی ہمارے ساتھ مقابلہ کرنے کی ان کو طاقت ہو۔

ایک اور وجہ بھی بیان کی جاتی ہے کہ ہوسکتا ہے کہ فرعون کو خواب تو نہ آیا ہو البتہ نجومیوں نے اسے بتایا ہو کہ بنی اسرائیل میں ایک بچہ پیدا ہوگا جو تمہاری بادشاہت کے زوال کا سبب بنے گا، تو اس نے بچوں کو ذبح کرانا شروع کردیا ہو۔

علامہ رازی رحمہ اللہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے قول کو ترجیح دیتے ہوئے کہا:

" والاقرب هو الاول لان الذی یستفاد من علم التعبیر وعلم النجوم لا یکون امرا مفصلا "

زیادہ مناسب پہلا قول ہی ہے کیونکہ خواب کی تعبیر یا نجومیوں کی بات پر اعتبار کرلینا غیر یقینی ہے اس پر علامہ رازی اعتراض کرتے ہیں کہ اگر کوئی یہ کہے کہ فرعون تو اللہ تعالیٰ اور اس کے انبیاء کرام پر ایمان ہی نہیں رکھتا تھا تو اس نے کیسے اعتبار کرلیا کہ اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام سے یہ وعدہ کیا ہے۔

اس کا جواب دیتے ہوئے بیان فرماتے ہیں:

" قلنا لعل فرعون کان عارفا باللہ ویصدق الانبیاء الا انه کان کافرا کفر الجحود والعناد "

کہ ہوسکتا ہے فرعون رب تعالیٰ کو پہچانتا ہو، اور انبیاء کرام کی صداقت کا بھی اسے پتہ ہو لیکن ضد اور سرکشی کی وجہ سے انکار کرتا ہو، تقریباً تمام مشرکین کا یہی حال تھا وہ رب تعالیٰ اور اس کے انبیاء کو جانتے تھے مانتے نہیں تھے۔ (از کبیر)

بیٹوں کو ذبح کرنے اور بیٹیوں کو زندہ چھوڑنے کی وجہ کیا تھی؟

اس میں چند وجوہ بہت واضح طور پر نظر آتی ہیں:

(۱) بیٹوں کو ذبح کرنے سے مردوں کو فنا کرنا مقصود تھا، تاکہ اس کے ذریعے نسل ختم ہوجائے، کیونکہ وہ یہ سمجھتے تھے کہ جب عورتیں اکیلی رہ جائیں گے تو ان سے نسل کا سلسلہ آگے نہیں چلے گا، اس طرح خود ہی مرد اور عورتیں سب تباہ ہوجائیں گے۔

(۲) مردوں کوختم ہو جانے سے عورتوں کی زندگی برباد ہو کر رہ جاتی ہے ان کو ذریعہ معاش کا حصول اور معیشت کو سہارا دینا مشکل ہوتا ہے۔اس طرح کی زندگی عورت کے لئے بہت بڑی محنت اور مشقت کا ذریعہ ہوتی ہے اس سے نجات دینا بھی اسی طرح عظیم نعمت ہوگی۔

(۳) بیٹوں کوقتل کرنے میں ان کے والدین پر کتنا غم آتا ہے یہ ان کو ہی پتہ ہوتا ہے خصوصا والدہ جب ایک طویل وقت تک حمل کی مشکلات کو برداشت کرتی ہے، اور بچے کی پیدائش پر عظیم مسرت اور عظیم نفع کی انتظار میں ہوتی ہے، جب پیدائش کے ساتھ ہی بچے کو بے دردی سے قتل کر دیا جائے اور وہ بھی ماں کے سامنے تو اس کی حالت زار اس سے پوچھئے کہ اس کے لئے یہ کتنا عظیم عذاب ہے۔

اور یہ بھی واضح ہے کہ اگر بچہ بڑا ہو جائے ،طبعی زندگی گزار کر فوت ہو تو اس پر اتنا افسوس نہیں ہوتا جتنا کہ پیدا ہوتے ہی اسے قتل کر دیا جائے پھر موت پر بھی افسوس اتنا نہیں جتنا قتل پر ہوتا ہے۔

(۴) بیٹوں کو والدین پسند کرتے تھے بنسبت بیٹیوں کے۔اسی وجہ سے اکثر لوگ بیٹیوں کو بوجھ سمجھتے تھے اور ان کو ناپسند کرتے تھے خواہ ان کے بیٹے زیادہ تعداد میں بھی ہوتے ،اللہ تعالیٰ نے ان کے متعلق یہ ارشاد فرمایا:

﴿ واذا بُشر احدھم بالاُنثی ظل وجھه مسودا وھو کظیم ☆
یتوارٰی من القوم من سوٓء مابشر به ﴾ (پ ۱۴)

اور جب ان میں سے کسی کو بیٹی ہونے کی خوشخبری دی جاتی ہے تو دن بھر اس کا منہ کالا رہتا ہے اور وہ غصہ میں ہو جاتا ہے لوگوں سے چھپتا پھرتا ہے اس بشارت کی برائی کی وجہ سے۔

اسی وجہ سے کئی لوگ اپنی بیٹیوں کو زندہ دفن کر دیتے تھے رب تعالیٰ نے ان کو اس سے منع فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا:

﴿ وَلَا تَقْتُلُوْا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ ﴾ اور تم اپنی اولاد کو بھوک کے ڈر کی وجہ سے قتل نہ کرو۔

اولاد سے مراد بیٹیاں ہی ہیں کیونکہ یہ بات واضح ہے کہ وہ بیٹیوں کو ہی زندہ دفن کرتے تھے بیٹوں کو نہیں۔

(۵) مرد جب نہ رہیں صرف عورتیں رہ جائیں تو بعض اوقات وہ دشمنوں کے قبضہ میں آجاتی ہیں اور وہ ان کو اپنے نکاح میں لے آتے جو بہت زیادہ ذلت کا سبب بنتا ہے۔

یہی وجوہ تھیں جن کو مدنظر رکھتے ہوئے ان لوگوں نے بنی اسرائیل کے بیٹوں کو ذبح کرنے کا پروگرام بنایا۔ (از کبیر)

تنبیہ : بعض حضرات نے " ویستحیون نساء کم " کا معنی یہ بیان کیا ہے:

" یفتشون فی حیائهن ینظرون هل بهن حمل و الحیاء فرج "

کہ وہ عورتوں کی فرجوں کو دیکھتے اور تفتیش کرتے تھے کہ یہ حاملہ ہیں یا نہیں۔

لیکن اس معنی کو علامہ رازی رحمہ اللہ نے رد کیا ہے۔ (از روح المعانی و کبیر)

﴿ وَفِىْ ذٰلِكُمْ بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ ﴾

''اور اس میں تمہارے رب کی طرف سے آزمائش تھی بہت بڑی''

" بلاء " کا معنی ہے اختبار، آزمائش کرنا۔ پھر اس کی تین قسمیں ہیں " وهو تارة یکون بالمسار لیشکروا " ایک قسم یہ ہے کہ نعمتیں عطا کر کے آزمایا جائے کہ یہ اس آزمائش میں پورے اتر کر شکریہ ادا کریں۔" وتارة بالمضار لیصبروا " اور آزمائش کبھی تکلیف پہنچا کر کی جاتی ہے کہ یہ صبر کرتے ہیں یا نہیں یعنی مقصد یہ ہوتا ہے کہ آزمائش میں پورے اتر کر صبر کریں " وتارة بهما لیرغبوا ویرهبوا " اور کبھی دونوں چیزوں سے آزمایا جاتا ہے، یعنی نعمت عطاء کر کے اور ساتھ ہی مصیبت بھی پہنچا کر آزمایا جاتا ہے تاکہ یہ آزمائش میں پورے اتر کے رب تعالیٰ کی طرف رغبت بھی کریں اور رب تعالیٰ سے ڈریں بھی۔

اگر " ذلکم " کا اشارہ فرعون والے لوگوں کے عذاب پہنچانے اور انکے بیٹوں کو ذبح کرنے، اور ان کی بیٹیوں کو زندہ چھوڑنے کی طرف ہو تو " بلاء " کا معنی ہوگا کہ یہ مصیبتیں تمہارے لئے بہت بڑی آزمائش تھیں۔

اور اگر " ذلکم " کا اشارہ " انجاء " (اللہ تعالیٰ کے نجات دینے) کی طرف ہو تو " بلاء " کا معنی نعمت سے آزمانا ہوگا۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے تمہیں فرعونیوں کے طرح طرح کے عذاب سے نجات دے کر آزمایا، یہ آزمائش تمہارے لئے بہت بڑی تھی، کہ تم شکر کرتے ہو یا نہیں۔

اور اگر " ذلکم " کا اشارہ تمام چیزوں کی طرف بیک وقت کیا جائے تو اب " بلاء " کا معنی

یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں مصیبتیں پہنچا کر اور نعمتیں عطاء کر کے آزمایا یہ آزمائش تمہارے لئے بہت بڑی آزمائش تھی " ویرجح الاول التبادر " پہلا معنی فوراً ذہن میں آنے کی وجہ سے راجح نظر آتا ہے کہ مصائب کے ذریعے آزمایا گیا۔

" والثانی انه فی معرض الامتنان " اور دوسرا معنی اس لئے زیادہ راجح نظر آتا ہے کہ یہاں نعمتوں کا ذکر ہو رہا ہے اور ان نعمتوں کی یاد ہی دلائی جا رہی ہے۔ اس لئے یہ معنی کرنا کہ رب تعالیٰ نے تمہیں نعمتوں سے آزمایا موقع ومحل کے زیادہ مناسب نظر آتا ہے۔

" والثالث لطف جمع الترغیب والترھیب " تیسرا معنی مراد لینا زیادہ پرلطف ہے کیونکہ اس میں مصائب کا ذکر بھی آجاتا ہے اور نعمتوں کا ذکر بھی اور اس پر رب تعالیٰ کی رغبت کا ذکر بھی آگیا اور رب تعالیٰ سے ڈرنے کا ذکر بھی آگیا۔ (از روح المعانی)

روح المعانی کی اس باکمال بحث کے بعد اعلیٰ حضرت کا باکمال ترجمہ دیکھیں " اور اس میں تمہارے رب کی طرف سے بڑی بلا تھی یا بڑا انعام "

تاہم راقم نے بھی ترجمہ وہی کیا ہے جو ان سب صورتوں کو شامل ہو جائے، لیکن اہل علم حضرات کو اس پر خود بھی سوچنا پڑے گا اور اعلیٰ حضرت کا ترجمہ بہت بڑی تفسیر کو دو لفظوں سے حاوی ہو گیا۔

رب تعالیٰ کی عظمت:

" والعظم بالنسبة للمخاطب والسامع لا بالنسبة الیه تعالیٰ لانه العظیم الذی لا یستعظم شیأ "

یہاں آزمائش کو جو عظیم کہا گیا ہے وہ بنسبت مخاطبین کے اور سننے والے حضرات کے، یعنی اے بنی اسرائیل تم اس آزمائش کو عظیم سمجھتے ہو اور سننے والو تم بھی عظیم سمجھتے ہو۔

لیکن اللہ تعالیٰ خود بھی عظیم ہے اس لئے وہ کسی اور چیز کو عظیم نہیں سمجھتا۔ لہذا رب تعالیٰ کی بنسبت عظیم کا ذکر نہیں کیا گیا۔

تنبیہ : " عظیم صفة بلاء وتنکیرھما للتفخیم " عظیم بلاء کی صفت ہے دونوں کو نکرہ ذکر کیا گیا ہے جن کی تنوین عظمت پر دلالت کر رہی ہے اسی لئے ترجمہ میں " بہت بڑی آزمائش " ذکر کیا گیا ہے۔ (از روح المعانی)

﴿ وَاِذۡ فَرَقۡنَا بِكُمُ الۡبَحۡرَ فَاَنۡجَيۡنٰكُمۡ وَاَغۡرَقۡنَآ اٰلَ فِرۡعَوۡنَ وَاَنۡتُمۡ تَنۡظُرُوۡنَ ﴾

۱) ''اور جب ہم نے تمہارے لئے دریا پھاڑ دیا تو تمہیں بچالیا اور فرعون والوں کو تمہاری آنکھوں کے سامنے ڈبو دیا۔''

۲) ''اور یاد کرو اس وقت کو جب ہم نے پھاڑ دیا تمہارے لئے دریا کو تو ہم نے نجات دی تمہیں، اور غرق کیا ہم نے فرعون والوں کو، ایسے حال میں کہ تم دیکھ رہے تھے۔''

اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو ایک اور نعمت یاد دلائی کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں نجات دی، اور فرعون کو تمہارے سامنے غرق کیا موسیٰ علیہ السلام کو رب تعالیٰ نے حکم دیا کہ بنی اسرائیل کو رات میں مصر سے نکال کر لے جاؤ۔ یعنی اب بنی اسرائیل کی نجات اور فرعون اور اس کی قوم کی تباہی کا وقت آچکا ہے۔

رات کو نکالنے کا حکم دیا تا کہ بنی اسرائیل کا اجتماع دشمن کے سامنے نہ ہو اور وہ ان کی مراد کی تکمیل میں مانع نہ بنے اور رات کو نکالنے کی وجہ یہ بھی تھی کہ فرعون اور اس کا لشکر ان کا پیچھا کر کے ان کو روک نہ سکے اور فرعون کے عظیم لشکر کو دیکھ کر بنی اسرائیل خوف نہ کریں۔

چاندنی رات میں موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کو ساتھ لے کر چلے، بنی اسرائیل کے پاس کافی مقدار میں سونے اور چاندی کے زیورات بھی تھے، جو انہوں نے قبطیوں (فرعونیوں) سے مانگ کر لئے ہوئے تھے کہ ہم انہیں اپنی عید میں استعمال کریں گی وہ پہلے بھی ان سے زیورات لیتے رہتے تھے۔

یوسف علیہ السلام نے وصیت فرمائی تھی کہ جب تم مصر سے نکلو تو میرا تابوت بھی ساتھ لے کر جانا تو موسیٰ علیہ السلام نے آپ کی وصیت کے مطابق ایک بوڑھی عورت کی نشاندہی پر وہ تابوت نکال کر خود بنفس نفیس اٹھایا۔

ابن ابی حاتم حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے ایک روایت میں نقل فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ایک

دیہاتی کے پاس ایک مرتبہ ٹھہرے۔ اس نے حضور کی مہمان نوازی کی اور بہت تعظیم وتکریم کی۔

آپ نے فرمایا کہ تم کبھی ہمارے پاس بھی آنا، تو وہ دیہاتی ایک مرتبہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نے فرمایا: بتاؤ تمہیں کس چیز کی ضرورت ہے کہ میں تمہیں عطا کروں اس نے کہا ایک اونٹنی جس پر کجاوہ پڑا ہوا ہو، اور ایک دودھ دینے والی بکری جس کا دودھ میرے گھر والے پئیں۔

حضور ﷺ نے فرمایا تو تو بنی اسرائیل کی بوڑھی عورت سے بھی گیا گزرا ہوا ہے (اس نے تو جنت طلب کی تھی) صحابہ کرام نے پوچھا یارسول اللہ بنی اسرائیل کی بوڑھی عورت کا کیا واقعہ ہے؟

آپ نے فرمایا جب موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کو ساتھ لے کر چلے تو راستہ بھول گئے اس پر حیرانگی سے ایک دوسرے سے پوچھنے لگے یہ کیا ہوا؟ کچھ لوگوں کو حضرت یوسف علیہ السلام کی وصیت کا علم تھا تو انہوں نے کہا کہ یوسف علیہ السلام نے اپنی وفات کے وقت ہمارے آباء واجداد سے پختہ وعدہ لیا تھا کہ مصر سے نکلتے وقت میرا تابوت ضرور ساتھ لے جانا، ہمارے بھولنے کی یہی وجہ ہو سکتی ہے۔
موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا تم میں سے کون ہے جو یوسف علیہ السلام کی قبر کو جانتا ہے؟ انہوں نے بتایا کہ ہم میں سے ایک بوڑھی عورت کے بغیر کوئی بھی نہیں جانتا کہ یوسف علیہ السلام کی قبر کس جگہ واقع ہے، تو موسیٰ علیہ السلام نے اس عورت کو بلا کر کہا کہ تم بتاؤ کہ یوسف علیہ السلام کی قبر کہاں ہے؟ اس نے کہا میں اس وقت تک نہیں بتاؤں گی جب تک تم میری ایک شرط پوری نہ کرو آپ نے پوچھا وہ کیا ہے؟ اس نے کہا میری صرف یہ خواہش ہے کہ میں جنت میں آپ کے ساتھ رہوں۔
موسیٰ علیہ السلام کچھ سوچ میں پڑ گئے، تو اللہ تعالیٰ نے آپ کی طرف وحی نازل کی کہ اے موسیٰ اس سے وعدہ کرلو آپ نے کہا ٹھیک ہے تمہاری درخواست منظور ہے موسیٰ علیہ السلام جب اس عورت کے ساتھ چلے تو اس نے قبر کی نشاندہی کی۔ جب یوسف علیہ السلام کے تابوت کو نکالا گیا تو اندھیری رات روشن ہوگئی، اس طرح انہیں راستہ مل گیا، (یہ حدیث غریب ہے، قریب ہے کہ صحابی تک موقوف ہو) راقم کے نزدیک ظاہر طور پر مرفوع ہے، اگر موقوف بھی ہو تو قیاس کے مخالف ہے اس لئے حکم مرفوع میں ہے۔
(ماخوذ از کثیر وابن کثیر زیر آیۃ ولقد اوحینا موسی الخ پ ۱۶ ع ۱۳)

فرعون اور اس کی قوم کی ہلاکت کی طرف روانگی:

فرعون نے جب صبح دیکھا کہ بنی اسرائیل موجود نہیں ہیں تو بہت غصہ میں ہوا۔ اس نے ہر طرف کارندے دوڑا کر اپنی فوجوں، لشکروں اور اپنے تمام حامیوں کو جمع کر لیا اور کہنے لگا کہ بنی اسرائیل ہمارے مقابلہ میں ایک چھوٹی سی جماعت ہے وہ ہمیشہ ہمارے غیظ وغضب کو بھڑکاتے رہتے ہیں میں چاہتا ہوں ان کو مکمل تباہ و برباد کر دیا جائے۔

اللہ تعالیٰ نے فرعون اور اس کی قوم کو برباد کرنے کے لئے ان کے دلوں میں یہ بات ثابت کر دی کہ سب لوگ بنی اسرائیل کا پیچھا کر کے ان کا مکمل صفایا کر دو، اس طرح اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت کاملہ سے ان تمام فرعونیوں کو برباد کرتے اپنا وعدہ پورا فرما دیا۔

فرعون کو ماننے والے تمام اس کے کہنے پر اپنی نعمتوں، اپنے اعلیٰ قسم کے مکانات اور پھلدار درختوں کے باغات اور اپنے سامان تعیش یعنی اپنی عیش وعشرت کے سامان کو چھوڑ کر بظاہر بنی اسرائیل کو تباہ کرنے کے لئے چلے جو درحقیقت اپنی ہی بربادی کی طرف چل رہے تھے، فرعون کے کہنے پر سب لوگ جمع ہو کر بنی اسرائیل کے تعاقب میں چل پڑے، دریا کے کنارے پر ان کے سامنے پہنچ گئے۔

بنی اسرائیل نے جب دیکھا تو کہنے لگے کہ اب تو ہم پکڑ لئے جائیں گے، ان کے دلوں میں پہلے ہی فرعون کا رعب چھایا ہوا تھا اور وہ تعداد میں بھی فرعونیوں سے بہت کم تھے، اور کسی قسم کا ان کے پاس کوئی اسلحہ بھی نہیں تھا اس لئے ان پر بہت زیادہ خوف طاری ہوا۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ میرا رب میرے ساتھ ہے وہ ابھی میری راہنمائی فرمائے گا۔ (ماخوذ از کبیر پ ۱۹ ع ۸)

موسیٰ علیہ السلام کو دریا میں عصا مارنے کا حکم:

اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ آپ اپنا عصا دریا پر مارو، آپ نے جب اپنا عصا دریا پر مارا تو دریا پھٹ گیا، اس نے راستہ چھوڑ دیا، درمیان میں خشک راستہ اور ادھر ادھر پانی کی بلندی اتنی عظیم جیسے بڑے بڑے پہاڑ ہوں۔

بنی اسرائیل چونکہ بارہ قبائل تھے ایک ہی راستہ میں ایک دوسرے کے ساتھ چلنا مناسب نہیں سمجھتے تھے اس لئے ہر قبیلہ کے لئے علیحدہ علیحدہ راستہ بنایا گیا یعنی دریا میں بارہ راستے بنائے گئے، ہر راستہ کے دائیں بائیں پانی کی بلندی عظیم پہاڑوں جیسی تھی وہ کہنے لگے کہ ہمیں کیا معلوم ہے کہ ہمارے دوسرے بھائی زندہ ہیں یا پانی کی طغیانی میں غرق ہو چکے ہیں تو درمیان سے روشن دانوں کی طرح پانی کو ہٹا دیا گیا، وہ ایک دوسرے کو دیکھتے ہوئے دریا عبور کر گئے۔

فرعون اور اس کے لشکر نے بھی دریا میں راستہ دیکھ کر اپنے گھوڑے دوڑا دیئے، لیکن وہ بنی اسرائیل کو نہ پا سکے۔ حضرت سائب سے مروی ہے کہ فرعونیوں اور بنی اسرائیل کے درمیان جبرائیل تھے بنی اسرائیل کے پیچھے لوگوں کے دلوں میں یہ بات ڈال رہے تھے کہ جلدی چلو اگلے لوگوں سے مل جاؤ، اور فرعونیوں کے دلوں میں یہ بات ڈال رہے تھے کہ آہستہ چلو پچھلے لوگوں کو ساتھ ملنے دو، بنی اسرائیل جب دریا عبور کر چکے اور فرعونی ابھی درمیان میں ہی پہنچے تھے تو پانی آپس میں مل گیا اس طرح فرعون اور اس کی قوم کے تمام لوگ ایک روایت کے مطابق یہ چھ لاکھ کی تعداد میں تھے سب غرق ہو گئے بنی اسرائیل یہ تمام ماجرا آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ (ماخوذ از کبیر پ ۱۹ ع ۸)

﴿ وَاِذْ فَرَقْنَا ﴾ : "اذ فی موضع النصب، وفرقنا، فلقنا"

یعنی اذ مقام نصب میں ہے، اذکر و مقدر ہے مطلب یہ ہوا کہ یاد کرو اس وقت کو۔

"فرق" کا لغوی معنی ہے جدا کرنا۔ اسی لئے بالوں میں مانگ نکالنے کو بھی فرق کہا گیا ہے کہ بال ایک حصہ کے ایک طرف اور دوسرے حصہ کے دوسری طرف ایک دوسرے سے جدا ہیں۔

"فرقان" جو حق و باطل کے درمیان فرق کرے "فالفارقات فرقا" قسم ہے فرق کرنے والی جماعتوں کی، اس سے مراد فرشتے ہیں جو حق و باطل کے درمیان فرق کرنے کے لئے نازل ہوتے ہیں۔ "یوم الفرقان" بدر کے دن کو کہا جاتا ہے کیونکہ وہ بھی حق و باطل کے درمیان فرق کرنے کا دن تھا۔

﴿ بِكُمْ ﴾ : "ای بکم، فالباء بمعنی اللام۔ یعنی "بکم" میں باء بمعنی لام ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہم نے دریا تمہارے لئے پھاڑا۔ بعض حضرات نے کہا باء بمعنی سببیت کے ہے۔ تمہاری وجہ سے

دریا کو پھاڑا، یعنی اصل سبب تم ہی تھے کیونکہ تمہیں نجات دینا مقصود تھا اگرچہ ظاہری سبب موسیٰ علیہ السلام کا عصا مارنا تھا۔

﴿ **اَلْبَحْرُ** ﴾: اصل معنی اس کا ہے ''وسعت رکھنا'' دریا میں بھی چونکہ وسعت ہوتی ہے اس لئے اس کو بحر کہتے ہیں کہا جاتا ہے ''فرس بحر'' تیز چلنے والا گھوڑا۔ یعنی تیز چلنے والے گھوڑے کی چال میں بھی وسعت پائی جاتی ہے لہذا اسے بھی بحر کہہ لیا جاتا ہے۔ حدیث شریف میں بھی حضرت ابوطلحہ کے گھوڑے کے لئے الفاظ استعمال ہیں '' وان وجدناه البحر '' (از قرطبی)

فائدہ کے لئے حدیث پاک کو بھی دیکھتے چلیں تاکہ ذوق ایمان میں اضافہ ہو اور مقام مصطفیٰ ﷺ کی ایک جھلک نظر آئے:

'' عن انس بن مالک قال کان رسول الله ﷺ احسن الناس وکان اجود الناس وکان اشجع الناس ولقد فزع اهل المدينة ذات ليلة فانطلق ناس قبل الصوت فتلقاهم رسول الله ﷺ راجعا وقد سبقهم الى الصوت وهو على فرس لابي طلحة عرى في عنقه السيف وهو يقول لم تراعوا لم تراعوا قال وجدناه بحرا او انه لبحر قال وكان فرسا يبطأ ''

(مسلم ج ثانی ص ۲۲۰ باب شجاعته صلی الله علیه وسلم)

حضرت انس بن مالک فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ تمام لوگوں سے زیادہ حسین تھے تمام لوگوں سے زیادہ سخی تھے تمام لوگوں سے زیادہ بہادر تھے، ایک رات مدینہ طیبہ کے لوگ (کسی ہیبتناک آواز سے) گھبراہٹ میں مبتلا ہو گئے لوگ اس آواز کی طرف چلے، نبی کریم ﷺ ان کو ملے آپ لوٹ کر آرہے تھے، آپ ان لوگوں سے پہلے اس آواز کی طرف تشریف لے گئے تھے، آپ ابوطلحہ کے گھوڑے کی ننگی پیٹھ پر سوار تھے آپ کے گلے میں تلوار تھی، آپ فرما رہے تھے کوئی ڈر فکر کی ضرورت نہیں کوئی ڈر فکر کی ضرورت نہیں، حضرت انس فرماتے ہیں ہم نے اس گھوڑے کو تیز رفتار پایا حالانکہ وہی پہلے بہت سست رفتار تھا۔

'' وفيه بيان عظيم بركته ومعجزته في انقلاب الفرس سريعا بعد ان كان يبطأ ''

اس حدیث پاک سے نبی کریم ﷺ کی عظیم شان سمجھ آئی کہ آپ کی برکت اور آپ کے

معجزہ کی وجہ سے سست رفتار گھوڑا تیز رفتار ہو گیا۔

اور یہ بھی ثابت ہو گیا کہ نبی کریم ﷺ تمام سے زیادہ بہادر تھے سب سے پہلے اور اکیلے ہی رات کو دشمن کا پتہ چلانے تشریف لے گئے۔ اور یہ بھی خیال رہے کہ حضرت ابوطلحہ کے اس گھوڑے کا نام مندوب تھا۔ (نووی)

﴿ فَاَنْجَيْنٰكُمْ ﴾: ای من الغرق او من ادراک فرعون و آله لکم او مما تکرھو ن .

(تو ہم نے تمہیں نجات دی) قرآن پاک میں تھوڑے الفاظ کثیر معانی پر مشتمل ہیں، کیونکہ اس میں کئی احتمال ہیں بلکہ وہ تمام احوال مجموعی طور پر ان الفاظ مبارکہ سے سمجھ آ رہے ہیں۔ مطلب یوں ہوا۔ ہم نے تمہیں نجات دی غرق سے، یعنی فرعون اور اس کے لشکر کو غرق کر دیا تمہیں غرق سے بچا لیا۔

اور یہ بھی مطلب حاصل ہو سکتا ہے کہ ہم نے تمہیں فرعون اور اس کے لشکر کو پا لینے سے نجات دی حالانکہ انہوں نے تمہیں ہلاک کر دینے کی غرض سے تمہارا پیچھا کیا تھا لیکن رب تعالیٰ نے انہیں ہلاک کر دیا اور تمہیں ان لوگوں سے بچا لیا کہ وہ تمہیں پا ہی نہ سکے ہلاک کیسے کرتے۔

اور یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں فرعون اور اس کے متعلقین و متبعین کی طرف سے جو شدید تکالیف پہنچائی جاتی تھیں ان سے بچا لیا۔ بلکہ یہ تینوں معانی ایک ساتھ ہی لینے میں کمال ہے اور عظمت قرآن اس سے واضح ہے، یعنی مطلب یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں غرق ہونے، فرعون کو پا لینے اور فرعونیوں کی شدید تکالیف سے نجات دی۔ (از روح المعانی)

تنبیہ: اب اس تفصیل کے بعد دیکھیں تو مودودی صاحب کا ان الفاظ مبارکہ کا ترجمہ ادھورا نظر آئیگا:

مودودی صاحب کا ترجمہ یہ ہے:

''پھر اس میں سے تمہیں بخیریت گزروا دیا''

پھر اس ترجمہ پر اور تعجب یہ ہے کہ رب تعالیٰ نے کسی کی مدد سے ان کو گزروایا، خود گزارایا کسی اور نے؟ مودودی صاحب نے اس سے پہلے (رکوع کی پہلی آیت میں) ﴿ ولا ھم ینصرون ﴾ کا ترجمہ کیا ہے'' اور نہ مجرموں کو کہیں سے مدد مل سکے گی'' ذکر کافروں کا ہے نہ کہ صرف مجرموں

(گنہگاروں) کا۔ پھر اس کی تفسیر میں بھی کافروں کا ذکر نہ کرکے انبیاء، صلحاء، زہاد، اولیاء کی شفاعت کو قبول نہ کرنے کی ناکام کوشش کی گئی ہے، جناب کے تفسیری الفاظ کو دیکھئے اور راقم کی شفاعت کی بحث کو بھی دیکھئے تو فرق خود سمجھ آ جائے گا۔

مودودی صاحب کی تفسیر یہ ہے۔ بنی اسرائیل کی بگاڑ کی ایک بہت بڑی وجہ یہ تھی کہ آخرت کے متعلق ان کے عقیدے میں خرابی آ گئی تھی وہ اس قسم کی خیالات خام میں مبتلاء ہو گئے تھے کہ ہم جلیل القدر انبیاء کی اولاد ہیں بڑی بڑے اولیاء، صلحاء، اور زہاد سے نسبت رکھتے ہیں، ہماری بخشش تو انہیں بزرگوں کے صدقے میں ہو جائے گی، ان کا دامن گرفتہ ہو کر بھلا کوئی سزا کیسے پا سکتا ہے۔ انہیں جھوٹے بھروسوں نے ان کو دین سے غافل اور گناہوں کے چکر میں مبتلا کر دیا تھا، اس لئے نعمت یاد دلانے کے بعد فوراً ہی ان کی ان غلط فہمیوں کو دور کیا گیا ہے۔ (تفهيم القرآن)

﴿ وَاَغۡرَقۡنَاۤ اٰلَ فِرۡعَوۡنَ ﴾: اس مقام میں اگرچہ فرعون کا بظاہر ذکر نہیں لیکن اصل میں قرآن پاک کی فصاحت و بلاغت کا عظیم مقام ہے جو دوسری کسی کتاب کو حاصل نہیں۔ علامہ بیضاوی رحمہ اللہ نے کیا خوب بیان فرمایا:

" (واغرقنا آل فرعون) اراد به فرعون وقومه واقتصر علی ذکرهم بانه كان اولی به، وقيل شخصه كماروی ان الحسن ﷺ كان يقول اللهم صل علی آل محمد ای شخصه واستغنی بذكره عن ذكر اتباعه "

(بيضاوی)

یہاں سے مراد فرعون اور اس کے متعلقین تمام ہی ہیں۔ یعنی مطلب یہ ہے کہ "ہم نے غرق کیا فرعون اور فرعون والوں کو" کیونکہ جب اس کی قوم کا ذکر کر دیا گیا تو خود بخود معلوم ہو گیا کہ وہ بھی ساتھ تھا اس کا غرق ہونا تو بطریق اولیٰ (بہتر طریقہ سے) ثابت ہو جائے گا (پھر یہ بھی خیال رہے کہ فرعون کا واضح طور پر غرق ہونے کا ذکر نویں پارہ میں موجود ہے) اور یہ بھی مراد ہو سکتا ہے کہ "آل فرعون" سے مراد خود فرعون کی ذات ہو اور اس کی قوم اس کے تابع ہونے کی وجہ سے مراد ہو، اس پر دلیل یہ ہے کہ روایت ہے حضرت حسن بصری ﷺ درود پاک پڑھتے ہوئے یہ کہتے " اللهم صل آل محمد " وہ

آل محمد سے مراد نبی کریم ﷺ کی ذات لیتے۔

﴿ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ﴾: یہ جملہ حالیہ ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ "ایسے حال میں کہ تم دیکھ رہے تھے" یعنی پہلے تم نے دریا کو چلتے ہوئے دیکھا، پھر دریا کو پھٹتے ہوئے، کشک راستے بنے ہوئے بھی تم دیکھ رہے تھے۔ پھر فرعونیوں کو آتے ہوئے، دریا میں گھستے ہوئے، پھر ان پر دریا کو ملتے ہوئے، پھر ان کو غرق ہوتے ہوئے بھی تم دیکھ رہے تھے، پھر دریا نے ان کی لاشوں کو باہر پھینک دیا تو تم ان کو مردہ حال میں بھی دیکھ رہے تھے یہ سارا منظر تمہاری آنکھوں کے سامنے تھا۔ (از بیضاوی)

بنی اسرائیل اور فرعونیوں کی تعداد برابر تھی: عجیب اتفاق یہ تھا کہ بنی اسرائیل کے بارہ قبیلے تھے ہر قبیلہ میں پچاس، پچاس ہزار آدمی تھے اس طرح کل تعداد چھ لاکھ تھی، فرعون کی قوم کے لوگ بھی چھ لاکھ کی تعداد میں تھے۔ (از خازن)

یہ دریا کون سا تھا؟ اس دریا کو "بحر قلزم" کہا جاتا ہے جس کی چوڑائی چار فرسخ تھی، یہ بحر فارس کے ایک طرف واقع ہے، اور بعض حضرات نے کہا مصر کے پیچھے ایک دریا ہے جسے "اساف" کہا جاتا ہے یہ وہی ہے۔ (از خازن)

مفتی احمد یار خان اور حضرت پیر محمد کرم شاہ رحمہما اللہ نے بحر قلزم کا ذکر کیا ہے۔ تاہم روح المعانی میں علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے ایک قول بحر قلزم کے متعلق ذکر کیا اور دوسرا دریائے نیل کے متعلق:

"واختلفوا فی ھذا البحر فقیل القلزم و کان بین طرفیه اربعة فراسخ وقیل النیل" (روح المعانی)

یہ واقعہ دینی اور دنیاوی نعمتوں کا پتہ دیتا ہے:

اس واقعہ سے پتہ چلتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کو دنیاوی اور دینی کثیر نعمتیں حاصل ہوئیں۔ دنیاوی نعمتیں حاصل ہونے کی چند وجوہ:

(۱) جب موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل ایسے مقام پر پہنچ گئے جہاں آگے دریا اور پیچھے دشمن ہر قسم کے ہتھیار لے کر پہنچ گیا ہے، ذرا رکتے ہیں تو دشمن آ کر تباہ و برباد کر دے اور آگے چلتے ہیں تو دریا میں غرق

ہوتے ہیں یہ کتنا پرخوف اور ہولناک منظر ہے۔ جب دریا پھٹ گیا، دریا نے راستہ دے دیا اور ان کو نجات حاصل ہوگئی تو یہ کتنی بڑی خوشی کا مقام ہوگا، اس سے بڑھ کر دنیا میں اور کون سی عظیم نعمت ہوسکتی ہے۔

(۲) اس واقعہ سے موسیٰ علیہ السلام کا معجزہ ظاہر ہوا کہ آپ کے عصا مارنے کی وجہ سے دریا کو اللہ تعالیٰ نے پھاڑ دیا۔ اور اس سے بنی اسرائیل کا اس وقت رب تعالیٰ کا مکرم ہونا بھی ثابت ہوتا ہے اور ان پر عظیم نعمت بھی ثابت ہو رہی ہے۔ خیال رہے بنی اسرائیل جب تک ایماندار اور اللہ تعالیٰ کے نبی سے محبت کرنے والے، احکام شرع پر پابندی کرنے والے تھے مکرم تھے جب نبی کریم ﷺ پر ایمان لانے سے منہ موڑ دیا تو ذلیل وخوار ہوگئے۔ اب یہودیوں اور نصرانیوں سے محبت کرنے والے شریعت مصطفیٰ ﷺ کے باغی ہیں اور دین اسلام کے دشمن ہیں۔

(۳) جب انہوں نے مشاہدہ کرلیا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دشمن کو ہلاک کر دیا ہے تو انہیں معلوم ہوگیا کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں عظیم نعمت سے نوازا ہے کہ ہمیں بہت بڑی مصیبت سے نجات حاصل ہوگئی۔ خاص کر کے ان کو تکریم بھی حاصل ہوگئی اور دشمن کے ہلاک ہونے کا مشاہدہ بھی کرلیا۔ (یہ کبیر سے نقل کیا جا رہا ہے)

اس پر علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے کیا خوب الفاظ تحریر فرمائے:

"ان هلاک العد ونعمة و مشاهدته نعمة اخری"

بیشک دشمن کا ہلاک ہوجانا ایک نعمت ہے اور اس کی ہلاکت کا مشاہدہ کرنا دوسری نعمت ہے۔

خیال رہے کہ دین اسلام کے باغی دشمن خدا کی موت پر خوشی منانا سنت حبیب کبریا علیہ التحیۃ والثناء ہے:

"عن سعد ان النبی ﷺ جمع له ابویه یوم احد قال کان رجل من المشرکین قد احرق المسلمین فقاله له النبی ﷺ ارم فداک ابی وامی قال فنزعت له بسهم لیس فیه نصل فاصبت جنبه فسقط وانکشفت عورته فضحک رسول الله ﷺ حتی نظرت الی نواجذه"

(مسلم ج ۲ باب فضل سعد بن ابی وقاص)

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں بیشک نبی کریم ﷺ نے میرے لئے احد کے دن اپنے ماں باپ کو جمع کیا آپ فرماتے ہیں مشرکوں میں سے ایک شخص تھا جس نے

مسلمانوں کو بہت تنگ کیا ہوا تھا۔ مجھے نبی کریم ﷺ نے فرمایا میرے ماں باپ تم پر قربان اس کو تیر مار دوا، آپ فرماتے ہیں میں نے اسے تیر مار دیا حالانکہ اس میں لوہے کی نوک نہیں تھی وہ تیر میں نے اس کے پہلو پر گاڑ دیا، وہ گر گیا، اس کا ننگیز کھل گیا (ننگا ہو گیا) نبی کریم ﷺ ہنسے یہاں تک کہ میں نے آپ کی داڑھوں کو دیکھ لیا۔

اس حدیث کی شرح میں علامہ نووی رحمہ اللہ نے فرمایا" **فضحک فرحا بقتله عدوه لا نکشافه** " کہ کوئی شخص یہ گمان نہ کرے کہ نبی کریم ﷺ اس کے ننگے ہونے پر ہنسے، نہیں نہیں نبی کی شان کے یہ لائق ہی نہیں کہ کسی کے ننگیز کے کھل جانے پر ہنسیں۔ آپ کی ہنسنے کی وجہ صرف یہ تھی کہ حضرت سعد نے ایک دشمن کو قتل کر دیا تھا اس پر نبی کریم ﷺ نے خوشی کا اظہار فرمایا۔

حدیث شریف میں " **قد احرق المسلمین** " (تحقیق اس نے مسلمانوں کو جلایا ہوا تھا، یعنی مسلمانوں کو تنگ کر رکھا تھا) کے الفاظ واضح طور پر دلالت کر رہے ہیں کہ وہ مسلمانوں کا دشمن تھا، جس کی وجہ سے وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کا دشمن تھا۔ اس کی موت پر نبی کریم ﷺ نے خوشی کا اظہار فرما کر اس فعل کو سنت بنا دیا۔

(۴) اللہ تعالیٰ نے فرعونیوں کو غرق کر کے ان کی زمین، ان کے شہر اور گھر، اور ان کی نعمتیں اور ان کے مال بنی اسرائیل کو دے دیئے واضح ہوا کہ یہ واقعہ بنی اسرائیل کے لئے بہت بڑی نعمت کا سبب بنا۔

(۵) اللہ تعالیٰ نے فرعونیوں کو غرق کر کے بنی اسرائیل کو ان سے نجات دے کر انہیں عظیم نعمت سے نوازا، اور ان کے دلوں سے مکمل طور پر فرعون اور اس کی قوم کا خوف زائل کر دیا۔ اگر بنی اسرائیل کو دریا سے پار کر دیا جاتا لیکن فرعون اور اس کی قوم کو غرق نہ کیا جاتا تو بنی اسرائیل ان سے ڈرتے ہی رہتے کہ اگر انہوں نے ہم کو پکڑ لیا، یا کہیں ہمیں ایک جگہ جمع ہونا پڑا تو وہ ہمیں شدید عذاب دیں گے۔ فرعونیوں کا صفایا کر کے بنی اسرائیل کو اس شدید خوف سے نجات دے دی جو یقیناً ان کے لئے بہت بڑی نعمت تھی۔

(۶) بنی اسرائیل کے سامنے فرعون اور اس کی قوم کا ہلاک ہو جانا بھی عظیم نعمت تھا اس لئے کہ اگر ان کو ہلاک کر دیا جاتا لیکن ان کی ہلاکت کو بنی اسرائیل نے نہ دیکھا ہوتا تو ان پر ان کا خوف جاری رہتا، کیونکہ یہ

فرعون کی چاکری میں ایک عرصہ گزار چکے تھے، اس لیے ان کے دلوں پر ان کا رعب چھایا ہوا تھا۔

اس واقعہ سے موسیٰ علیہ السلام کو دینی فوائد حاصل میں چند وجوہ پائی جاتی ہیں:

(۱) جب موسیٰ علیہ السلام کی قوم نے آپ کے معجزہ کو واضح طور پر دیکھ لیا تو ان کے شکوک وشبہات زائل ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ جو صانع وحکیم ہے اس پر ان کا ایمان پختہ ہو گیا۔ اور موسیٰ علیہ السلام کی نبی ہونے کی تصدیق بھی ان کی زیادہ پختہ ہو گئی، اس طرح ان کو بدیہی علم حاصل ہو گیا، نظر دقیق کے بوجھ اٹھانے اور مشقت آمیز دلائل کے حصول کی محتاجی نہ رہی۔

(۲) جب ان لوگوں نے موسیٰ علیہ السلام کے اس معجزہ کو ظاہر طور پر دیکھ لیا تو جس طرح ان کے لئے سبب بنا کہ وہ موسیٰ علیہ السلام کی تصدیق کریں اسی طرح قبطی لوگ جنہوں نے موسیٰ علیہ السلام کا پیچھا نہیں کیا تھا ان کے لئے بھی سبب بنا کہ وہ موسیٰ علیہ السلام کو سچا نبی مانیں اور فرعون کو جھوٹا خدا سمجھیں۔

(۳) نبی اسرائیل کو یہ معلوم ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ سے بڑھ کر نہ کوئی عزیز ہے اور نہ ہی کوئی طاقت ور ہے:

"ثم ان اللہ تعالیٰ فی لحظة واحدة جعل العزیز ذلیلا الذلیل عزیزا"

پھر انہیں یہ بھی معلوم ہو گیا کہ بیشک اللہ تعالیٰ ایک لحظہ میں عزیز کو ذلیل بنا دیتا ہے اور ذلیل کو عزیز بنا دیتا ہے۔

فرعون جو اپنے آپ کو عزیز سمجھتا تھا اسے غرق کر کے ذلیل کر دیا۔ بنی اسرائیل کو فرعونیوں نے اپنا غلام بنا کر ذلیل سمجھا ہوا تھا رب تعالیٰ نے ان کو نجات دے کر عزت عطا فرما دی۔ اور اسی چیز کو سمجھتے ہوئے ان کا دل دنیا کی مشکلات سے چھٹکارا پا گیا اور رب تعالیٰ پر اس وقت ان کو توکل کا حصول ہوا۔

امت مصطفیٰ ﷺ کو حاصل ہونے والے فوائد:

اسی واقعہ سے نبی کریم ﷺ کی امت کو کثیر فوائد حاصل ہوئے:

(۱) اہل کتاب کو یہ معلوم تھا کہ نبی کریم ﷺ نے کسی استاذ سے پڑھا نہیں۔ کسی استاذ سے لکھنا نہیں سیکھا اور نہ ہی آپ کبھی اہل کتاب کی محفلوں میں بیٹھے۔ جب آپ نے موسیٰ علیہ السلام اور ان کی قوم کے واقعات کو تفصیلی طور پر بیان فرمایا۔ اتنا علم تو خود اہل کتاب کو بھی حاصل نہیں تھا، ہاں البتہ ان کے علماء اپنی

رب کا علم رکھتے تھے، تو اس سے نبی کریم ﷺ کی صداقت اور آپ پر وحی کا آنا ان لوگوں پر واضح ہو گیا یہ

علیحدہ بات ہے کہ سوائے چند حضرات کے ان کو ایمان لانا نصیب نہ ہوا۔

اس طرح یہ واقعہ نبی کریم ﷺ کا ان پر بیان کرنا ان کے خلاف دلیل بن گیا اور مومنوں کے حق

میں حجت بن گیا کہ وہ نبی کریم ﷺ کی تصدیق میں اور زیادہ ایمان کی پختگی ثابت کریں۔

(۲) نبی کریم ﷺ کی امت کے لوگ جب یہ تصور کریں کہ فرعون اور اس کی قوم غرق ہوئی، اور بنی اسرائیل نجات حاصل کر گئے، یعنی رب تعالیٰ کے منکر غرق ہو گئے اور رب کو ماننے والوں کو نجات حاصل ہو گئی، تو ان کو یہ پتہ چل جائے گا۔

"من خالف الله شقي في الدنيا والاخرة ومن اطاعه فقد سعد في الدنيا والآخرة"

جس شخص نے اللہ تعالیٰ کی مخالفت کی وہ دنیا اور آخرت میں بد بخت ہوا، اور جس نے اطاعت کی وہ دنیا اور آخرت میں نیک بخت ہوا۔

(۳) موسیٰ علیہ السلام کی امت ظاہر معجزات کو دیکھنے کے باوجود بچھڑے کی پجاری بن گئی۔ لیکن نبی کریم ﷺ کی امت نے ان کی طرح اس طرح کے ظاہر معجزات نہیں دیکھے لیکن پھر بھی نبی کریم ﷺ کے مطیع رہے اور آپ کی مخالفت نہیں کی اور نہ ہی معاذ اللہ گمراہ ہوئے۔

"وهذا يدل على ان امة محمد ﷺ افضل من امة موسى عليه السلام"

اس سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ نبی کریم ﷺ کی امت موسیٰ علیہ السلام کی امت سے افضل ہے۔ (ماخوذ از کبیر)

مومن کی کیا خوب شان:

دریا میں غرق ہونا فرعونیوں کے لئے عذاب ہے لیکن مومن کا غرق ہونا شہادت کا سبب ہے یعنی شہادت کا درجہ اور ثواب حاصل ہوتا ہے۔

موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کی نجات کا دن:

"روى مسلم عن ابن عباس ان رسول الله ﷺ قدم المدينة فوجد اليهود صياما يوم عاشوراء فقال لهم رسول الله ﷺ ما هذا اليوم الذى

تصومونه فقالوا هذا یوم عظیم انجی الله فیه موسی وقومه وغرق فرعون وقومه فصامه موسی شکرا فنحن نصومه فقال رسول الله ﷺ "فنحن احق واولی بموسی منکم" فصامه رسول الله ﷺ وامر بصیامه واخرجه البخاری ایضا عن ابن عباس وان النبی ﷺ قال لاصحابه انتم احق بموسی منهم فصوموا" (قرطبی)

مسلم شریف میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت مذکور ہے بیشک رسول اللہ ﷺ مدینہ طیبہ میں تشریف لائے تو آپ نے یہود کو عاشورا کے دن روزہ رکھتے ہوئے پایا تو رسول اللہ ﷺ نے انہیں کہا تم اس دن روزہ کیوں رکھتے ہو انہوں نے کہا یہ بڑا عظیم دن ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام اور ان کی قوم کو اس دن نجات دی اور فرعون اور اس کی قوم کو غرق کیا۔ تو موسیٰ علیہ السلام نے اس دن رب تعالیٰ کا شکر یہ ادا کرنے کے لئے روزہ رکھا اس لئے ہم بھی روزہ رکھتے ہیں نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہم بنسبت تمہارے موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ زیادہ حق رکھتے ہیں اور ہمیں زیادہ قرب حاصل ہے۔ تو نبی کریم ﷺ نے روزہ رکھا اور (اپنی امت کو بھی) روزہ رکھنے کا حکم فرمایا۔ بخاری نے بھی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس روایت کو نقل فرمایا کہ بیشک نبی کریم ﷺ نے اپنے صحابہ کو فرمایا تم یہودیوں سے زیادہ موسیٰ علیہ السلام سے حق رکھتے ہو، اس لئے تم روزہ رکھا کرو۔

اعتراض: اس روایت سے تو یہ پتہ چلتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے عاشورا کے دن روزہ رکھا اور روزہ رکھنے کا حکم دیا جب کہ یہود نے آپ کو خبر دی۔

حالانکہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت سے پتہ چلتا ہے کہ قریش زمانہ جاہلیت میں عاشورہ کے دن روزہ رکھتے تھے اور نبی کریم ﷺ بھی اعلان نبوت سے پہلے روزہ رکھتے تھے۔ آپ جب مدینہ طیبہ میں آئے تو آپ نے عاشورہ کا روزہ رکھا اور روزہ رکھنے کا حکم دیا (یہ حکم بطور فرض تھا) جب رمضان شریف کے روزے فرض ہوئے تو عاشورہ کے دن روزہ رکھنے کا اختیار دے دیا گیا جو چاہے روزہ رکھے اور جو چاہے روزہ نہ رکھے۔ (بخاری ومسلم)

ان دونوں حدیثوں میں کیسے تطبیق دی جائے کہ ان میں تعارض نہ آئے۔

جواب: قریش اس لئے روزہ رکھتے تھے کہ وہ یہود کو روزہ رکھتے ہوئے دیکھتے تھے چونکہ قریش کے نزدیک یہود اہل علم سمجھے جاتے تھے نبی کریم ﷺ بھی قریش کے ساتھ ہی روزہ رکھتے تھے۔ لیکن مدینہ طیبہ میں آ کر دوبارہ تاکیدی طور پر حکم دیا اور اپنے صحابہ کو کہا تم یہود کی بنسبت موسیٰ علیہ السلام کے زیادہ قریب ہو اس لئے تم بھی روزہ رکھو۔

ایک غلطی فہمی کا ازالہ: حکم بن اعرج کہتے ہیں میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے پاس پہنچا آپ زمزم کے پاس اپنی چادر کو تکیہ بنا کر تشریف فرما تھے میں نے ان کو کہا:

" اخبرنی عن صوم عاشوراء فقال اذا رأیت ھلال المحرم فاعدد واصبح یوم التاسع صائما ، قلت ھکذا کان محمد ﷺ یصومه قال نعم اخرجه مسلم "

مجھے یہ بتاؤ کہ عاشوراء کا روزہ کس دن رکھا جاتا ہے آپ نے فرمایا جب محرم کا چاند دیکھو تو شمار کرو جب نو تاریخ ہو تو روزہ رکھو میں نے کہا کیا اسی طرح (یعنی اسی دن) نبی کریم ﷺ روزہ رکھا کرتے تھے انہوں نے کہا ہاں۔

دوسری روایت میں حضرت حسن بصری حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا:

" امر رسول اللہ ﷺ بصوم یوم عاشوراء یوم العاشر "

نبی کریم ﷺ نے عاشوراء کا روزہ دس محرم کو رکھنے کا حکم فرمایا:

اس حدیث کو ترمذی نے حسن صحیح کہا، ان دونوں حدیثوں میں تعارض نظر آتا ہے اور غلط فہمی ہوتی ہے کہ روزہ نو محرم کو رکھا جائے یا دس محرم کو۔

صحیح یہ ہے کہ دونوں دن روزہ رکھا جائے تیسری حدیث سے دونوں دن روزہ رکھنے کا واضح ثبوت موجود ہے:

" قال الترمذی وروی عن ابن عباس انه قال صوموا التاسع والعاشر وخالفوا الیھود "

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ نو محرم اور دس محرم (دونوں دن) روزہ رکھو

یہود کی مخالفت کرو۔ کیونکہ یہود صرف دس محرم کو روزہ رکھتے تھے۔ (از قرطبی)

فائدہ: موسیٰ علیہ السلام نے عاشوراء کا روزہ رکھا اللہ تعالیٰ کی نعمت کا شکریہ ادا کرنے کے لئے نبی کریم ﷺ نے بھی اس نعمت کی یاد روزہ رکھ کر کی، بلکہ صحابہ کرام نے دو روزے رکھ کر موسیٰ علیہ السلام کی بنسبت عبادت میں زیادتی کی۔ اسی سے ایک تو واضح ہو گیا کہ عبادت میں زیادتی جائز ہے جب کہ نفلی درجہ کی ہو، البتہ فرائض میں زیادتی جائز نہیں۔

اور یہ واضح ہوا کہ نعمت کے حصول پر ہر سال اسے یاد کرنا اور اس پر اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنا سنت انبیاء ہے یہی وجہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے رب تعالیٰ کے انعام واکرام کو لوگوں کے سامنے ذکر فرمایا:

" عن ابی سعید قال قال رسول اللہ ﷺ انا سید ولد آدم یوم القیامۃ ولا فخر وبیدی لواء الحمد ولا فخر وما من نبی یومئذ آدم فمن سواہ الا تحت لوائی " (مشکوۃ باب فضائل سید المرسلین)

حضرت ابو سعید ؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا میں تمام انسانوں کا قیامت کے دن سردار ہوں گا اس پر کوئی فخر نہیں میرے ہاتھ میں لواء الحمد ہوگا اس پر کوئی فخر نہیں اس دن تمام بنی آدم علیہ السلام اور ان کے سوا میرے جھنڈے کے نیچے ہوں گے۔

" ولا فخر " کی وضاحت بیان کرتے ہوئے علامہ علی قاری رحمہ اللہ بیان فرماتے ہیں کہ آپ کا مقصد یہ تھا:

" ای ولا اقولہ تفاخرا بل اعتدادا بفضلہ وتحدثا بنعمتہ وتبلیغا لما امرت بہ "

یعنی میں یہ فخر کے طور پر نہیں بیان کر رہا بلکہ اللہ تعالیٰ کے فضل اور نعمت کو بیان کرنے کے لئے ذکر کر رہا ہوں اور جس چیز کا مجھے حکم دیا گیا ہے میں وہ امت کو پہنچانے کے لئے ذکر کر رہا ہوں۔

یعنی نبی کریم ﷺ نے اپنی سیادت کو دو وجہ کے پیش نظر بیان کیا ان میں سے پہلی وجہ یہ ہے کہ آپ پر اپنے مراتب بیان کرنے ضروری ہوتے ہیں تا کہ آپ کی امت آپ کو پہچان لے اور آپ پر اعتقاد رکھے اور آپ کی عزت وتکریم کرنے کا جس طرح اللہ تعالیٰ نے حکم فرمایا اسی طرح اس پر عمل کر سکے

اور دوسری وجہ بیان کرتے ہوئے علامہ نووی رحمہ اللہ نے فرمایا" امتثا لا لامر اللہ تعالیٰ واما بنعمة ربک فحدث " آپ نے اپنے مراتب اللہ تعالیٰ کے حکم کی تابعداری کرتے ہوئے بیان فرمائے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿ واما بنعمة ربک فحدث ﴾ اپنے رب کی نعمتوں کو خوب بیان کرو۔

نبی کریم ﷺ کا اپنی ولادت کے دن اظہار تشکر:

" وان کان النبی ﷺ لم یزد فیه علی غیره من الشهور شیأ من العبادات وما ذاک الا لرحمته ﷺ بامته ورفقه بهم لانه علیه الصلوٰة والسلام کان یترک العمل خشیة ان یفرض علی امته رحمة منه بهم لکن اشار علیه السلام الی فضیلة هذا الشهر العظیم بقوله للسائل الذی " (الحاوی للفتاوی ج ۱ ص ۱۹۴)

اگر چہ نبی کریم ﷺ نے اس ماہ میں نسبت اور مہینوں کے زیادہ عبادات نہیں کیں صرف اپنی امت پر رحمت اور مہربانی کرتے ہوئے کیونکہ نبی کریم ﷺ امت پر رحمت فرماتے ہوئے ان پر فرض ہو جانے کے ڈر سے کئی اعمال ترک فرما دیتے تھے لیکن آپ نے اس ماہ کی فضیلت کی طرف اشارہ فرمادیا جب آپ سے ایک شخص نے سوال کیا کہ آپ پیر کو روزہ کیوں رکھتے ہیں تو آپ نے فرمایا کہ یہ میری پیدائش کا دن ہے، یعنی آپ نے پیر کو اپنی پیدائش کا شکریہ ادا کرنے کے لئے روزہ رکھا اور اس طرح اظہار مسرت کیا۔

نبی کریم ﷺ کی ولادت باسعادت پر خوشی منانے کی تفصیلی بحث اگر کوئی دیکھنا چاہے تو راقم کی کتاب ''شمع ہدایت'' کا مطالعہ کرے۔

☆☆☆☆☆

﴿ وَاِذْ وٰعَدْنَا مُوْسٰى اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْ بَعْدِهٖ وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴾

۱) ''اور جب ہم نے موسیٰ سے چالیس رات کا وعدہ فرمایا پھر اس کے پیچھے تم نے بچھڑے کی پوجا شروع کردی اور تم ظالم تھے''

۲) ''اور یاد کرو اس وقت کو جب ہم نے وعدہ کیا موسیٰ سے چالیس راتوں کا پھر تم نے بنا لیا بچھڑے کو معبود اس کے بعد، اور تم ظلم کرنے والے ہوئے''

ابوبکر بن ابی شیبہ نے قیس بن عباد سے روایت کیا کہ فرعون کے غرق ہو جانے کے باوجود بنی اسرائیل کو یقین نہیں آرہا تھا کہ وہ مر چکا ہے، تو اللہ تعالیٰ نے اسے اور اس کی قوم کو باہر کنارے پر پھینک دیا تو ان کو یقین ہوا۔

بنی اسرائیل جب دریا سے نکل گئے، حق تو یہ تھا کہ ان کا ایمان اور پختہ ہوتا کیونکہ وہ اپنی آنکھوں سے دریا کو پھٹتے ہوئے دیکھ چکے تھے اور خود نجات حاصل کر چکے تھے، اور فرعون اور اس کی قوم کو غرق ہوتے ہوئے اور پھر دریا کا ان کو مردہ حالت میں کنارے پر پھینکنا دیکھ چکے تھے۔ لیکن بنی اسرائیل نے راستے میں جب بت پرست قوم کو دیکھا تو کہنے لگے:

﴿ يٰمُوْسَى اجْعَلْ لَّنَآ اِلٰهًا كَمَا لَهُمْ اٰلِهَةٌ ﴾

اے موسیٰ ہمارے لئے ایسا خدا بنادو جیسے ان لوگوں کے خدا ہیں۔

موسیٰ علیہ السلام نے ان کو زجر کرتے ہوئے کہا:

﴿ اَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْغِيْكُمْ اِلٰهًا وَّهُوَ فَضَّلَكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴾

کیا اللہ تعالیٰ کے بغیر تمہارے لئے میں اور خدا تلاش کروں حالانکہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں فضیلت دی ہے اپنے زمانے میں جہان والوں پر۔

پھر موسیٰ علیہ السلام نے ان کو ارض مقدسہ میں جانے کا حکم دیا کیونکہ وہ ان کے آباء واجداد کا مقام

تھا، مقصد یہ تھا کہ یہ لوگ فرعون کی زمین سے بھی نجات حاصل کر لیں۔ اس ارض مقدسہ میں جابر لوگوں کا قبضہ تھا، موسیٰ علیہ السلام نے ان کو کہا کہ تم ان سے جہاد کر کے اپنے آباءواجداد کی زمین کو ان سے آزاد کراؤ لیکن یہ کہنے لگے کہ اے موسیٰ تم چاہتے ہو کہ ہم کافروں کے لئے گوشت کا ٹکڑا بن جائیں اس سے تو بہتر تھا کہ تم ہمیں فرعون کے، پاس ہی رہنے دیتے۔

اس طرح یہ چالیس سال تک میدان تیہ میں رہے۔ وہاں ان پر منّ وسلویٰ نازل ہوا (جس کا ذکر انشاء اللہ آگے آ رہا ہے) پھر موسیٰ علیہ السلام طور سیناء پر تشریف لے گئے تا کہ تورات لائیں۔ لیکن انہوں نے موسیٰ علیہ السلام کے طور پر جانے کے بعد گائے کے بچھڑے کو اپنا معبود بنالیا۔ (از قرطبی)

موسیٰ علیہ السلام جب اپنی قوم کے ستر سرکردہ افراد کو ساتھ لے کر طور پر کتاب لینے کے لئے گئے قوم سے چالیس دنوں کا وعدہ کر کے گئے۔ آپ اپنی قوم کے ان افراد سے ذرا جلدی ہی آگے طور پر پہنچ گئے، رب تعالیٰ نے پوچھا تم اپنی قوم کے افراد سے پہلے کیوں آ گئے ہو، تو آپ نے عرض کیا اے مولائے کائنات وہ بھی میرے پیچھے آ ہی رہے ہیں، میں صرف تیری خوشنودی حاصل کرنے کے لئے جلدی آ گیا طور پر ہی اللہ تعالیٰ نے آپ کو یہ خبر دے دی تھی کہ تمہاری قوم گمراہ ہو چکی ہے۔

آپ کو گئے ہوئے جب بیس دن مکمل ہو گئے تو سامری نے کہا موسیٰ علیہ السلام کو گئے بیس دن اور بیس راتیں ہو چکی ہیں چالیس کی تکمیل ہو گئی ہے۔ آپ واپس نہیں لوٹے اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ تمہارے پاس فرعونیوں کے زیورات ہیں وہ تم پر حرام ہیں، اس لئے وہ زیورات تم لوگ مجھے دے دو کہ میں ایک خدا بنا دوں۔ کیونکہ یہ پہلے دیکھ چکا تھا کہ قوم ایسا خدا چاہتی ہے جو انہیں نظر آئے یہ خود بھی گائے کی پرستش کرتا تھا، اس لئے اس نے تمام زیورات جمع کر کے انہیں ایک بچھڑا بنا دیا۔

بچھڑے کے ڈکارنے کی وجہ:

چونکہ فرعون کے لشکر نے اپنے گھوڑوں کو دریا میں ڈالنے سے سوچ وبچار شروع کر دی تھی تو جبرائیل ایک گھوڑی پر سوار ہو کر آئے وہ جہاں قدم رکھتی تھی وہاں سبز گھاس پیدا ہو جاتی۔ سامری نے یہ ماجرا دیکھ لیا تھا اس لئے اس نے گھوڑی کے پاؤں کے نیچے سے مٹی اٹھا کر محفوظ کر لی تھی، وہی مٹی

بچھڑے کے ڈھانچے میں ڈال دی تھی جس کی وجہ سے اس میں اثر حیات پیدا ہو گیا اور وہ گائے کی طرح ڈکارنے لگا۔

سامری سے جب موسیٰ علیہ السلام نے پوچھا" فما خطبک یا سامری "

﴿ قَالَ بَصُرْتُ بِمَا لَمْ يَبْصُرُوْا بِهٖ فَقَبَضْتُ قَبْضَةً مِّنْ اَثَرِ الرَّسُوْلِ فَنَبَذْتُهَا وَكَذٰلِكَ سَوَّلَتْ لِيْ نَفْسِيْ ﴾ (پ ۱۶ ع ۱۴)

سامری تو نے ایسا کیوں کیا؟ اس نے کہا میں نے وہ دیکھا جو لوگوں نے نہ دیکھا۔ تو ایک مٹھی بھر لی فرشتے کے نشان سے پھر اسے ڈال دیا اور میرے جی کو یہی بھلا لگا۔

یہی آیت جس کا ابھی ترجمہ نقل کیا ہے اسی کی تفسیر میں علامہ قرطبی نے بھی یہی بیان کیا کہ سامری نے جبرائیل کی گھوڑی کے قدموں کے نشان کی جگہ سے ایک مٹھی بھر مٹی لے کر بچھڑے کے ڈھانچے میں ڈالی۔ (قرطبی)

جس آیت کی وضاحت کی جاری ہے اس کے تحت ہی مفتی محمد شفیع صاحب نے معارف القرآن میں بھی ذکر کیا۔ معتبر تفاسیر خازن وغیرہ میں بھی یہی ہے۔ غرضیکہ سلف صالحین کی تفاسیر میں بچھڑے کے ڈکارنے کی وجہ یہی تحریر ہے کہ جبرائیل کے گھوڑی کے پاؤں کے نیچے سے لی ہوئی مٹی کا اثر تھا۔

خیال رہے کہ سب سے پہلے اس قول (گھوڑی کے قدموں کے نشان سے مٹی لینا) کو ابو مسلم اصفہانی نے تسلیم نہیں کیا جو بہت بڑا معتزلی تھا، پھر اسی قول کا سہارا لیتے ہوئے مودودی صاحب نے تفہیم القرآن میں بھی یہی تحریر کر دیا کہ سامری نے موسیٰ علیہ السلام سے جھوٹ موٹ کہہ دیا تھا مودودی صاحب کی یہ سوچ غلط ہے قرآن پاک نے اگر چہ واضح طور پر اس قول کو نقل بھی نہیں کیا لیکن رد بھی نہیں کیا اسی لئے متقدمین حضرات کی تفاسیر کو چھوڑ کر ایک معتزلی کی بات کو تسلیم کرنا بھی کوئی عقل و دانش کا کام نہیں۔

﴿ وَاِذْ وٰعَدْنَا مُوْسٰى اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً ﴾: بعض قراءتوں میں " وعدنا " ہے۔ جب ہم نے وعدہ کیا، لیکن " واعدنا " باب مفاعلہ ہے جو شرکت جانبین کو چاہتا ہے۔ تو اس صورت میں یا تو یہ جواب دیا جائے گا کہ باب مفاعلہ میں بھی کبھی شرکت نہیں پائی جاتی لہٰذا اس مقام میں " وعدنا " اور " واعدنا " کا ایک ہی معنی ہے۔ اور یا یہ مراد ہے کہ رب تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے

توراۃ دینے کا وعدہ کیا اور موسیٰ علیہ السلام نے میقات پر آنے کا وعدہ کیا۔

اور یہ بھی ممکن ہے کہ جانبین سے یہ معنی مراد لیا جائے کہ رب تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے وعدہ کیا اور آپ نے وعدہ کو قبول کیا۔ چالیس راتوں سے مراد، ذی قعد کے تیس دن اور دس دن ذی الحج کے۔

اعتراض : سورۃ اعراف میں ذکر ہے ﴿وَوٰعَدْنَا مُوْسٰی ثَلٰثِیْنَ لَیْلَۃً وَّاَتْمَمْنٰھَا بِعَشْرٍ﴾ اب آیۃ سے پتہ چلتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام سے تیس راتوں کا وعدہ کیا گیا۔ ان دونوں آیتوں میں تطبیق کیسے؟

جواب : بعض حضرات نے تو سورۃ اعراف کے ظاہر کو دیکھ کر یہ جواب دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے موسیٰ علیہ السلام سے تیس راتوں کا وعدہ کیا پھر اسے بڑھا کر چالیس کر دیا۔ لیکن حضرت حسن بصری رحمہ اللہ نے فرمایا:

"لیس المراد ان وعدہ کان ثلاثین لیلۃ ثم بعد ذلک وعدہ بعشر لکنہ وعدہ اربعین لیلۃ جمیعا وھو کقولہ تعالیٰ ثلاثۃ ایام فی الحج وسبعۃ اذا رجعتم تلک عشرۃ کاملۃ"

کہ اس سے یہ مراد نہیں کہ پہلے تیس راتوں کا وعدہ کیا گیا پھر اس کے بعد آپ سے دس اور راتوں کا وعدہ کر کے چالیس کو مکمل کیا گیا بلکہ ابتدائی طور پر ہی چالیس کا وعدہ کیا گیا البتہ یہ بامحاورہ کلام ہے کہ ذی القعدہ کی تیس راتوں اور ذی الحج کی دس راتوں کا وعدہ کیا گیا۔ اسے تعبیر تیس اور دس سے کیا گیا۔ جس طرح قران یا تمتع کرنے والا اگر ھدی نہ دے سکے تو اسے دس روزے رکھنے کا حکم دیا گیا، لیکن تین دن ایام حج میں مکمل کرنے ہیں اور سات دن ان سے فارغ ہونے کے بعد، ان کو بھی تین اور سات سے تعبیر کیا گیا۔ (از کبیر)

اگر چہ راقم نے تذکرۃ الانبیاء میں پہلی وجہ کو مختصر طور پر ذکر کیا تھا لیکن حضرت حسن بصری رحمہ اللہ کی طرف سے دیا ہوا جواب بہت خوب نظر آیا۔

راتوں کا ذکر کیوں؟

"قرن التاریخ باللیل دون النھار لان الاشھر العربیۃ وضعت علی سیر

القمر وقیل لان الظلمة اقدم من الضوء " (خازن)

یہاں تاریخ کا ذکر کرتے ہوئے راتوں کا اس لئے ذکر کیا ہے کہ عربی مہینوں کا حساب چاند کے لحاظ پر ہوتا ہے اور چاند کی تاریخوں کی ابتداء رات سے ہوتی ہے۔

اور دوسری وجہ یہ ہے کہ تاریکی نورانیت سے پہلے ہوتی ہے یعنی کفر سے ایمان کی راہنمائی کی جاتی ہے۔ جب ایمان نصیب ہوا تو تاریکی ختم ہوگئی اور ایمان کی وجہ سے نورانیت حاصل ہوگئی۔

فائدہ: موسیٰ علیہ السلام کو چالیس دن، رات کے بعد توراۃ عطا کی گئی کہ آپ چالیس دن دنیا والوں سے الگ تھلگ ہو کر اللہ تعالیٰ کی یاد میں مشغول رہیں، اس طرح اس کے ذکر وفکر سے آپ کے قلب وروح کو ایک خاص قسم کی قوت حاصل ہو جائے جو اس عظیم بوجھ کو اٹھانے کے قابل ہو جائے۔

" ان للاربعین خصوصیة فی اختصاص الکلام للانبیاء کما ان لها اختصاصا فی ظهور ینابیع الحکمة من قلوب الاولیاء کقوله علیه السلام من اخلص لله اربعین صباحا ظهرت ینابیع الحکمة من قلبه من لسانه " (روح البیان)

بیشک چالیس کو ایک خصوصیت حاصل ہے اسی وجہ سے انبیاء کرام کو چالیس سال کی عمر میں نبوت کے اعلان کا حکم دیا جاتا رہا۔ ان سے رب تعالیٰ کا کلام بذریعہ وحی اسی عمر میں ہوا۔ پھر اولیاء عظام کا بھی یہی معمول ہے کہ وہ چلہ کشی کرتے ہیں۔ یعنی چالیس روز تک دنیا سے علیحدہ ہو کر فقط رب تعالیٰ کی یاد میں مشغول ہوتے ہیں تو ان کے دلوں پر حکمت کے چشمے پھوٹ پڑتے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے جو شخص چالیس صبح خلوص سے اللہ تعالیٰ کو یاد کرتا ہے اس کے دل سے اس کی زبان پر حکمت کے چشمے نمودار ہو جاتے ہیں۔

کاش کہ لوگوں کو یہ سمجھ آ جائے کہ چالیس دن تک فوت شدہ کے لئے قرآن خوانی کا اہتمام کرتے رہنا پھر چالیس پر اس کے لئے اجتماعی دعاء کتنی مقبولیت کا سبب ہوگی۔ خیر معاملہ قسمت کا ہے جس کی قسمت میں ہوا اس کے لئے قرآن پاک پڑھا جائے گا۔

دینی طلباء کے لئے: " اربعین لیلة " میں " اربعین " کی نصبی حالت ہے۔ جو مفعول واقع ہو رہا ہے اور اس میں " واسأل القریة " کی طرح حذف مضاف ہے۔ لہٰذا عبارت کا مطلب یہ ہے۔

﴿ وَاِذْ وٰعَدْنَا مُوْسٰی تَمَامَ اَرْبَعِیْنَ لَیْلَةً ﴾

اور جب ہم نے موسیٰ کے ساتھ چالیس راتیں مکمل کرنے کا وعدہ کیا۔

" والاربعون کلها داخلة فی المیعاد " اور چالیس تمام کے تمام ہی وعدہ میں داخل ہیں۔

﴿ ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ ﴾: الھا (خازن) پھر تم نے بچھڑے کو معبود بنالیا۔لفظ " الھا " مقدر نکال کر اشارہ دیا گیا کہ یہاں ایک مفعول حذف ہے۔آیئے اسی سے تراجم میں تقابلی جائزہ دیکھیں۔

﴿ ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْ بَعْدِهٖ ﴾

''پھر پکڑا تم نے گائے کا بچہ'' (شاہ رفیع الدین صاحب)

''پھر تم نے ان کو پیچھے گوسالہ کو اختیار کرلیا'' (عبدالماجد صاحب)

''پھر تم لوگوں نے تجویز کرلیا گوسالہ کو موسیٰ کے بعد'' (اشرف علی صاحب)

''پھر تم نے بنالیا بچھڑا اس کے پیچھے'' (شاہ عبدالقادر صاحب)

''پھر تم نے بنالیا بچھڑا موسیٰ کے بعد'' (محمود الحسن صاحب)

''پھر اس کے پیچھے تم نے بچھڑے کی پوجا شروع کردی'' (اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خانؒ)

اس مقام پر بعض تراجم میں ایک تو ''موسیٰ'' کسی لفظ کا ترجمہ نہیں بلکہ ضمیر کے مرجع سے سمجھ میں آتا ہے۔مخالفین کو یہ اعتراض تو کرنا آتا ہے کہ ضمیر کا مرجع، نبی کریم ﷺ ہوں تو ''محبوب'' ترجمہ میں کیوں آتا ہے تو ان کے اپنے ہی بعض تراجم میں ''موسیٰ'' کیوں آیا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ دیگر تراجم سے صرف اتنا پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے موسیٰ علیہ السلام کے طور پر جانے کے بعد ایک بچھڑا بنالیا، یا تجویز کرلیا۔کیا ان پر ایک دوسرے کو قتل کرنا فقط اس لئے واجب تھا کہ انہوں نے بچھڑا کیوں بنایا۔یا بچھڑے کو خدا کیوں مانا؟ اور اس کی پوجا کیوں کی؟ اگر صرف بنانا مقصود تھا تو یہ فعل صرف سامری کا تھا تمام نہیں پھر دوسروں کا مواخذہ کیسے؟ یہاں تو یہ ذکر ہے انہوں نے بچھڑے کو خدا مان کر اس کی پوجا شروع کردی تھی۔

اس پر اعلیٰ حضرت کا ترجمہ زیادہ واضح ہے باقی تراجم سے مقصد واضح نہیں،اس پر زیادہ تفاسیر کی عبارات نقل کرنے کی ضرورت اس لئے نہیں خود قرآن پاک کے دوسرے مقام پر واضح کیا گیا کہ

انہوں نے بچھڑے کو خدا مانا تھا۔ اس کی عبادت کرتے رہے

﴿ فَقَالُوا هٰذَا اِلٰهُكُمْ وَاِلٰهُ مُوْسٰى ﴾

''سامری اور اس کے متبعین نے دوسروں کو کہا یہ ہے تمہارا اور موسیٰ کا خدا''

اس سے آگے ان کا جواب حضرت ہارون علیہ السلام سے منع کرنے پر یہ تھا:

﴿ قَالُوْا لَنْ نَّبْرَحَ عَلَيْهِ عٰكِفِيْنَ حَتّٰى يَرْجِعَ اِلَيْنَا مُوْسٰى ﴾

انہوں نے کہا ہم تو موسیٰ (علیہ السلام) کے لوٹنے تک اسی پر (بچھڑے کی پوجا پر) قائم رہیں گے۔

تاہم صرف بیضاوی کی عبارت پر اکتفا کیا جاتا ہے: '' (ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْ بَعْدِهٖ) الها ومعبودا '' یعنی تم نے بچھڑے کو خدا، معبود بنالیا۔ (تسکین الجنان فی محاسن کنز الایمان ص ۴۳)

﴿ مِنْ بَعْدِهٖ ﴾: (اس کے بعد) اس میں کئی احتمال ہیں جو تقریبا تمام کے تمام مجتمع ہیں۔

(۱) موسیٰ علیہ السلام کے طور پر جانے کے بعد تم نے بچھڑے کو معبود بنالیا۔

(۲) موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ مواعدت کے بعد۔

(۳) جب تم نے دیکھ لیا کہ اللہ تعالیٰ وہ ذات ہے جو واحد ہے اس کا کوئی شریک نہیں، وہ شرک سے پاک ہے رب نے اپنی توحید پر قائم رہنے کا حکم دیا اور شرک سے روکا ان تمام چیزوں کے بعد تم نے بچھڑے کو معبود بنالیا۔

﴿ وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴾ ''اور تم ظلم کرنے والے ہوئے'' ظلم کا معنی شرک بھی ہے اس معنی کے لحاظ پر مطلب یہ ہوگا کہ تم مشرک ہوگئے۔ اور ظلم کا معنی یہاں یہ بھی ہے " وضع العبادة فی غير موضعها" عبادت کو غیر محل میں رکھنا، یعنی تم نے اللہ تعالیٰ کی عبادت چھوڑ کر بچھڑے کی عبادت شروع کر دی۔ (روح المعانی)

اور ﴿ وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴾ کا یہ مطلب بھی ہے:

" وانتم ضارون لانفسكم بالمعصية حيث وضعتم العبادة فی غير موضعها "

تم نے اللہ تعالیٰ کی عبادت کو چھوڑ کر بچھڑے کی عبادت کرکے عظیم گناہ میں مبتلا ہو کر اپنے آپ کو نقصان پہنچایا۔ (خازن)

اس آیۃ سے بھی امت مصطفیٰ ﷺ کو یہ فائدے حاصل ہوئے:

(۱) یہود نے واضح معجزات اور دلائل کو دیکھا لیکن معمولی شبہات ڈالنے سے وہ بھٹک گئے، لیکن نبی کریم ﷺ کی امت کو یہ سمجھنے کے لئے کہ قرآن پاک معجزہ ہے دقیق دلائل سے پتہ چلا لیکن پھر بھی وہ بڑے قوی شبہات سے ڈگمگائے نہیں دین حق سے بھٹکے نہیں۔

(۲) نبی کریم ﷺ نے یہ واقعہ ذکر کیا حالانکہ آپ نے کسی سے پڑھا نہیں "وذلک یدل علی انه علیه الصلوٰة والسلام استفادها من الوحی" اس سے پتہ چلا کہ آپ کو یہ وحی کے ذریعہ حاصل ہوا۔

(۳) عقائد میں تقلید نہیں ان لوگوں نے فقط سامری کی بات کو مان کر بچھڑے کی پوجا کر کے اپنا ایمان ضائع کر دیا:

"لو انهم عرفوا الله بالدلیل معرفة تامة لما وقعوا فی شبهة السامری"

اگر وہ اللہ تعالیٰ کو دلائل کے ذریعے پہچانتے تو ان کو معرفت تامہ حاصل ہوتی وہ سامری کے شبہ میں نہ پڑتے۔

(۴) اللہ تعالیٰ نے یہ واقعہ نبی کریم ﷺ پر بیان کر کے گویا کہ آپ کو صبر کرنے کا حکم دیا کیونکہ آپ کافروں کے شرک سے بہت پریشان ہوتے تھے، تو آپ کو گویا کہ اس واقعہ سے تسلی دی گئی کہ موسیٰ علیہ السلام نے بھی اپنی قوم کے شرک سے صبر کیا آپ بھی صبر کریں ان کا حساب رب کے پاس ہوگا۔

(۵) "ان اشد الناس مجادلة مع الرسول ﷺ وعداوة له هم الیهود فکانه تعالیٰ قال ان هؤلاء انما یفتخرون باسلافهم ثم ان اسلافهم کانوا فی البلادة والجهالة والعناد الی هذا الحد فیکف هؤلاء الاخلاف"

رسول اللہ ﷺ کے ساتھ سب لوگوں سے زیادہ جھگڑا کرنے والے اور سب سے زیادہ دشمنی کرنے والے یہود ہی تھے۔ گویا کہ رب تعالیٰ نے یہ بیان فرمایا کہ یہ لوگ اپنے اسلاف یعنی اپنے آباء واجداد پر فخر کرتے ہیں لیکن ان کے آباء واجداد بہت ہی زیادہ بے وقوف اور جاہل اور عناد کرنے والے تھے اس سے بڑھ کر ان کی جہالت کیا ہو سکتی ہے کہ ایک بچھڑا جو ان سے ہی زیور لے کر بنایا گیا اس کی انہوں نے پوجا شروع کر دی اور وہ نبی جس نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے ان کو فرعون اور اس کی قوم کے ظلم سے نجات دی اسی کے شریعت کے باغی ہو کر اس سے عناد کیا۔ جب ان کے اسلاف ایسے تھے تو

پیچھے آنیوالے اسی طرح کے ہی ہو سکتے تھے۔ (از کبیر)

﴿ ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُم مِّنۢ بَعْدِ ذٰلِكَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴾

۱) ''پھر اس کے بعد ہم نے تمہیں معافی دی کہ کہیں تم احسان مانو''

۲) ''پھر ہم نے معاف کر دیا تمہیں اس کے بعد، تا کہ تم شکریہ ادا کرو''

مختصر مطلب: اللہ تعالیٰ نے اور نعمت کی یاددلائی کی حق تو یہ تھا کہ تم موسیٰ علیہ السلام کے معجزات اور رب تعالیٰ کی مہربانیوں کو دیکھ کر ایمان میں اور زیادہ پختگی اختیار کرتے لیکن تم نے بچھڑے کی پوجا شروع کر دی تم بہت بڑے عذاب کے مستحق ہو چکے تھے لیکن اللہ تعالیٰ نے تمہیں تو یہ توفیق عطاء کر کے اس عظیم جرم کے بعد بھی معاف فرما دیا تا کہ تم شکر کرو۔

تفصیلی وضاحت:

﴿ ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ ﴾ ''عفو'' کا معنی ہے اللہ تعالیٰ کا مخلوق کو معاف کرنا " وقد یکون بعد العقوبة وقبلها " ''عفو'' عام ہے عذاب کے بعد معاف کرنے کو بھی کہا جاتا ہے اور عذاب کے مستحق کو عذاب سے پہلے معاف کر دینے کو بھی عفو کہا جاتا ہے۔

" بخلاف الغفران فانه لا يكون معه عقوبة البتة "

لیکن مغفرت کا تعلق عذاب سے ہی ہوتا ہے کہ عذاب دینے کے بعد معاف کر دیا جائے لیکن یہ خیال رہے کہ کبھی مغفرت بھی عفو کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ دعاؤں میں مغفرت عفو کے معنی میں ہی استعمال ہے۔ اس کا یہی مطلب ہوتا ہے کہ اللہ ہمیں عذاب سے پہلے ہی تو معاف فرمادے " كل من استحق عقوبة فتركت له فقد عفى عنه " ہر وہ شخص جو عقوبت کا مستحق ہوا سے سزا نہ دینے کو بھی " عفى عنه " سے تعبیر کیا جاتا ہے کہ اسے معاف کر دیا گیا۔

عفو کا معنی گناہ مٹا دینا یعنی " محونا ذنوبكم وتجاوزنا عنكم " اب مطلب واضح ہوا کہ ﴿ ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ پھر ہم نے تمہارے گناہوں کو مٹا دیا، اور تم سے درگزر کیا

''پھر ہم نے معاف کیا تمہیں'' ذرا مختصر الفاظ ہیں جو مکمل معنی کو حاوی ہیں اس لئے مترجمین نے یہی الفاظ اختیار کئے ہیں۔

''عفو'' کا لفظ لازم اور متعدی دونوں طرح استعمال ہے کہا جاتا ہے '' **عفت الدار** '' گھر مٹ گیا (برباد ہو گیا) اور کہا جاتا ہے '' **عفت الریح الاثر** '' ہوا نے نشان مٹا دیا ہے '' **عفا الشئ کثر فھو من الاضداد** '' کبھی عفو کا لفظ کثرت کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے جب کوئی چیز کثیر مقدار میں ہو جائے تو کہا جاتا '' **عفا الشئ** '' یعنی مٹا دینا اور بڑھا دینا یہ دونوں معانی ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ لیکن عفو میں دونوں پائے جاتے ہیں۔ ماقبل اور مابعد (آگے پیچھے) کو دیکھ کر سمجھ لیا جائے گا کہ یہاں کون سا معنی معتبر ہے۔ قرآن پاک میں '' **حتی عفوا** '' میں کثرت والا معنی ہی مراد ہے۔

(از قرطبی ہوبا...)

﴿ **مِّنْ بَعْدِ ذٰلِکَ** ﴾ '' **ای من بعد عبادتکم العجل** '' یعنی ہم نے تمہیں معاف کیا تمہارے بچھڑے کی پوجا کرنے کے بعد۔ (خازن)

اعتراض: '' **ثم** '' تراخی پر دلالت کرتا ہے اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ اس کے بعد اور '' **من بعد ذلک** '' کا مطلب بھی یہی ہے اس طرح تکرار لازم آئے گا جو فصاحت کے خلاف ہے۔

جواب: '' (ثم) لتفاوت ما بین فعلهم القبیح واللطف تعالیٰ فی شانهم فلا یکون (من بعد ذلک) تکرارا ''

اس مقام میں لفظ (ثم) تراخی رتبی کے لئے ہے۔ تراخی زمانی کے لئے نہیں۔ یعنی (ثم) کے ذریعے یہ بیان کیا گیا ہے کہ اے بنی اسرائیل اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو یاد کرو، ذرا ادھر توجہ کرو کہ کہاں تمہارا بچھڑے کی پوجا کرنے کا برا عمل اور کہاں رب تعالیٰ کا معاف کرنے کا عظیم کرم، ان کے مراتب میں کتنا عظیم تفاوت ہے۔

اب واضح ہوگا کہ '' **من بعد ذلک** '' میں تکرار نہیں بلکہ اس سے یہ ثابت ہو گیا کہ تم نے بچھڑے کی پوجا کی رب تعالیٰ نے تمہیں توبہ کرنے کا حکم دیا اور توجہ کرنے کی توفیق عطاء کی اس کے بعد تمہیں معاف کر دیا۔

﴿ **لَعَلَّکُمْ تَشْکُرُوْنَ** ﴾ '' **ای لکی تشکروا عفوی عنکم وحسن صنیعی الیکم** ''

تا کہ تم شکر کرو، یعنی اللہ تعالیٰ نے معاف کر کے ان پر احسان کیا۔ اس نعمت کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ ہم نے تمہیں اس کے بعد معاف کیا تا کہ میرے معاف کرنے اور میرے تم پر احسان کرنے کے برتاؤ کا تم شکر کرو۔ (خازن)

فائدہ : " فسر لعل بكي اخذا مما قيل ان لعل في القرآن بمعنى كي غير قوله تعالىٰ في الشعراء لعلكم تخلدون بمعنى كان (مشبه بالفعل) اى كانكم تخلدون "

خازن کی طرح علامہ بیضاوی رحمہ اللہ نے بھی "لعل" کی تفسیر " کی " سے کی ہے جس کا معنی ہے تا کہ اس کی وضاحت کرتے ہوئے شیخ زادہ رحمہ اللہ نے بیان فرمایا کہ قرآن پاک میں جہاں بھی "لعل" استعمال ہے اس کا معنی یہی ہے "تا کہ" البتہ سورۃ شعراء میں " لعلكم تخلدون " میں "لعل" کان حرف مشبہ بالفعل کے معنی میں استعمال ہے جس کا معنی ہوتا ہے "گویا کہ" (شیخ زادہ)

شکر کیا ہے؟ شکر کی مشہور تعریف یہ ہے کہ نعمت کے مقابل منعم کی تعریف کی جائے وہ تعریف عام ہے خواہ زبان سے ہو یا دل سے ہو یا ارکان سے ہو۔

تاہم شکر کی تعریف میں اور بھی مختلف اقوال ہیں۔ تمام کو جمع کر کے واضح ہوتا ہے کہ شکر ایک عظیم چیز کا نام ہے شکر کا جو مشہور معنی بیان کیا ہے اسی کے لحاظ سے شکر کی تین قسمیں بیان کی جاتی ہیں۔ شکر اور اس کی قسمیں خازن نے بیان کرتے ہوئے کہا:

" واصل الشكر هو تصور النعمة واظهارها ويضاده الكفر وهو نسيان النعمة وسترها "

شکر درحقیقت نعمت کا تصور کرنا اور اسے بیان کرنا، اور اس کی ضد کفران ہے یعنی نعمت کو بھول جانا اور اسے چھپانا۔

لیکن یہ خیال رہے کہ نعمت کو صرف اسلئے بیان کیا جائے کہ اللہ تعالیٰ کا اظہار ہو یہ انعام سے تکبر کے طور پر اور ریاء کاری کے طور پر چرچا کرنا رب تعالیٰ کی ناراضگی کا سبب ہے اس سے اجتناب ضروری ہے۔

" والشكر على ثلاثة اضرب شكر القلب وهو تصور النعمة وشكر اللسان وهو الثناء على النعمة وشكر سائر الجوارح وهو مكافاة النعمة بقدر استحقاقها " (خازن)

شکر کی تین قسمیں ہیں:

(۱) دل سے شکر کرنا یعنی نعمت کا دل میں تصور کرنا۔

(۲) زبان سے شکر کرنا یعنی نعمت پر زبان سے تعریف کرنا۔

(۳) ارکان سے شکر ادا کرنا یعنی ظاہری اعضاء کے ذریعے نعمت کے مقابل منعم کی تعریف کرنا۔ (خازن)

" وقال ذوالنون (الشکر) لمن فوقک بالطاعة ولنظیرک بالمکافات ولمن دونک بالاحسان " (روح المعانی)

ذوالنون مصری رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اپنے سے بلند مرتبہ کا شکریہ ادا کرنے کا یہ مطلب ہے کہ اس کی طاعت کی جائے اور اپنے برابر کو اس کے احسان کا اسی طرح کا بدلہ دے کر شکریہ ادا کیا جائے۔ اور اپنے سے کم درجہ کے احسان کا بدلہ زیادہ احسان کر کے شکریہ ادا کیا جائے۔

" قال سهل بن عبد الله الشکر الاجتهاد فی بذل الطاعة مع الاجتناب للمعصیة فی السرو العلانیة "

حضرت سہل بن عبداللہ رحمہ نے فرمایا کہ شکر یہ ہے کہ انسان طاعت کرنے میں بہت زیادہ کوشش کرے اور ظاہری طور پر اور باطنی طور پر معصیت سے اجتناب کرے۔

" وقالت فرقة اخرى الشکر هو الاعتراف فی تقصیر الشکر للمنعم "

بعض اور حضرات نے بیان کیا کہ شکر حقیقت میں اسے کہا جاتا ہے کہ انسان منعم (انعام کرنے والے) کا شکر ادا کرنے میں اپنی کوتاہی کا اعتراف کرے کہ میں نے شکر اس طرح نہیں کیا جیسا شکر کرنے کا حق تھا۔

جب رب تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام کو شکر کرنے کا حکم دیتے ہوئے فرمایا ﴿ اِعْمَلُوْا آلَ دَاوٗدَ شُكْرًا ﴾ تو حضرت داؤد علیہ السلام نے رب تعالیٰ کے حضور عرض کیا اے میرے رب میں تیرا شکر کس طرح کروں " والشکر نعمة منک " جب کہ شکر بھی تیری طرف سے ایک نعمت ہے پھر اس کا شکر ادا کروں گا تو وہ بھی تیری نعمت ہوگی یہ سلسلہ تو ختم ہونے میں نہیں آئے گا تو رب تعالیٰ نے فرمایا:

" الآن قد عرفتنی وشکرتنی اذ قد عرفت ان الشکر منی نعمة "

" اب تم نے مجھے پہچان لیا اور میرا شکریہ ادا کر دیا کیونکہ تمہارا یہ پہچان لینا کہ شکر بھی

میری نعمت ہے یہ تمہاری طرف سے شکر ہی ہے"

حضرت داؤد علیہ السلام نے عرض کیا اے میرے رب جو تیرے انعامات مجھ پر مخفی ہیں ان میں سے کسی ایک کا مجھے علم عطاء فرما۔ تو رب تعالیٰ نے کہا "سانس لیں" جب آپ نے سانس لیا تو رب تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ مَنْ یَّحْصِیْ هٰذِهِ النِّعْمَةَ اللَّیْلِ وَالنَّهَارِ ﴾

کون شخص اس نعمت کو شمار کر سکتا ہے جو اسے رات اور دن کو ہر لحظہ میں حاصل ہے۔

موسیٰ علیہ السلام نے رب تعالیٰ کے حضور عرض کیا اے میرے رب میں تیرا شکر کیسے ادا کروں جب کہ اے اللہ تو کسی نعمت کو چھوٹا سمجھ کر مجھے عطاء کرے گا " لا یجازی بها عملی کله " تو میری زندگی کے تمام اعمال بھی اس نعمت کا بدل نہیں بن سکتے۔ تو رب تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ یَا مُوْسٰی اَلْاٰنَ شَکَرْتَنِیْ ﴾ اے موسیٰ تم نے رب تیرا شکریہ ادا کر دیا۔

مطلب واضح ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی نعمت کو نعمت سمجھنا اور اسے عظیم نعمت سمجھنا ہی در حقیقت شکر ہے۔

(از قرطبی)

" وقال الفضیل شکر کل نعمة ان لا یعصی الله بعدها بتلک النعمة "

فضیل رحمہ اللہ کہتے ہیں ہر نعمت کا شکریہ ہے کہ اس نعمت کے حاصل ہونے کے بعد اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہ کی جائے۔

" قل شکر النعمة ان لا یراها البتة ویری المنعم " شکر کا اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ نعمت کو نہ دیکھے بلکہ منعم کو دیکھے اس لئے کہ بعض اوقات صرف نعمتوں کی طرف ہی توجہ کرتے رہنے سے انسان باغی ہو جاتا ہے، لیکن جب اسے یہ معلوم ہوگا کہ یہ نعمتیں اللہ تعالیٰ نے مجھے عطاء کی ہیں تو وہ سراپا عجز بن کر رہے گا۔ (از خازن)

" وقال الشبلی الشکر التواضع والمحافظة علی الحسنات الشهوات وبذل الطاعات "

شبلی رحمہ اللہ نے فرمایا شکر یہ ہے کہ عجز اختیار کیا جائے اور نیکی کے کام پابندی سے کئے جائیں اور خواہشات کی مخالفت کی جائے اور طاعات پر وقت صرف کیا جائے۔ (از قرطبی)

﴿وَاِذْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَالْفُرْقَانَ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ﴾

۱) ''اور جب ہم نے موسیٰ کو کتاب عطا کی اور حق و باطل میں تمیز کر دینا، کہ کہیں تم راہ پر آؤ''

۲) ''اور یاد کرو اس وقت کو جب ہم نے عطا کی موسیٰ کو کتاب (اور عطا کیا) حق و باطل میں تمیز کرنا، تاکہ تم ہدایت حاصل کرو''

یہاں سے اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو اور نعمت یاد دلائی کہ اللہ تعالیٰ نے تمہاری ہدایت کیلئے موسیٰ علیہ السلام کو کتاب عطاء کی اور حق و باطل میں فرق کرنے والی چیز عطا کی یہ درحقیقت تم پر بہت بڑا انعام تھا۔

﴿وَاِذْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ﴾: ''اذ اسم للوقت الماضی، واذ اسم للوقت المستقبل و آتینا، اعطینا'' (قرطبی)

''اذ'' ماضی کے لئے استعمال ہوتا ہے جبکہ ''اذا'' مستقبل کے لئے اور آتینا کا معنی ہے اعطینا ہم نے عطا کیا۔ (موسیٰ) عجمی نام ہے علمیت اور عجمہ کی وجہ سے غیر منصرف ہے۔ بعض حضرات نے کہا یہ مرکب ہے (مو) اور (شی) سے (مو) کا معنی پانی اور (شی) کا معنی ہے درخت۔ پھر (شی معجمہ) کو (سی مہملہ) سے بدلا گیا ہے۔ چونکہ آپ کا تابوت بھی پانی اور درختوں سے ملا تھا اس لئے آپ کو موسیٰ کہا گیا۔

بعض حضرات نے کہا ہے کہ یہ ''ماس یمیس'' سے لیا ہوا ہے طوبیٰ کا وزن ہے یا کو واؤ سے تبدیل کیا گیا۔ (از روح المعانی ج اول ص ۲۵۷)

موسیٰ علیہ السلام: حضرت موسیٰ علیہ السلام کے والد کا نام عمران ہے جو اپنے قبیلہ کے سردار تھے لاوی بن یعقوب علیہ السلام کی اولاد سے تھے۔ موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کے نام میں اختلاف ہے یارخا، ایارخت، نوحانذ، یوحانذ، لوحا، مریم، یہ تمام نام ذکر کرنے کے بعد حاشیہ جلالین میں ذکر کیا گیا ہے ''والاصح هو الاول کما فی روح البیان'' صحیح پہلا قول ہی ہے یعنی 'یارخا' جیسے روح البیان میں ہے۔

(حاشیہ جلالین ص ۳۲۹)

مفتی احمد یار خان رحمہ اللہ نے تفسیر نعیمی میں عائد لکھا ہے۔ (واللہ اعلم بالصواب)

سامری کا نام بھی موسیٰ تھا بظاہر ایمان لایا ہوا تھا لیکن حقیقت میں منافق تھا۔ سامری کا تفصیلی ذکر ان شاء اللہ پارہ سولہ میں آئے گا۔

﴿ الْكِتٰبَ ﴾ سے مراد توراۃ ہے۔ اس میں تمام مفسرین کا اتفاق ہے کیونکہ موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہونے والی کتاب توراۃ ہی ہے۔

﴿ وَالْفُرْقَانَ ﴾ کا معنی یہ ہے " الفارق بين الحق و الباطل " حق اور باطل کے درمیان فرق کرنے والی چیز۔

اس آیۃ کریمہ میں فرقان سے مراد کیا ہے اس میں تین احتمال پائے گئے ہیں جو تمام کے تمام جمع ہیں ان میں کوئی تعارض نہیں۔ وہ تین احتمال یہ ہیں کہ فرقان سے مراد توراۃ ہو، یا توراۃ کے اندر داخل چیز ہو، یا توراۃ سے خارج ہو۔

پہلا احتمال: فرقان سے مراد توراۃ ہو تو اس صورت میں عطف تفسیری ہوگا، یعنی مطلب یہ ہوگا کہ ہم نے موسیٰ کو کتاب دی جو حق اور باطل کے درمیان فرق کرنے والی ہے۔ تاکہ تم اس کتاب کے ذریعے ہدایت حاصل کرسکو۔ فرقان سے مراد توراۃ ہو تو اسے یوں بھی بیان کیا جاسکتا ہے۔

" ان التوراة لها صفتان كونها كتابا منزلا و كونها فرقانا تفرق بين الحق و الباطل "

بیشک توراۃ کے دو وصف ہیں ایک یہ کہ وہ کتاب ہے جو اللہ کی طرف سے نازل کی گئی ہے اور دوسرا وصف اس کا یہ ہے کہ وہ فرقان ہے یعنی حق و باطل میں فرق کرنے والی ہے۔

یہاں دونوں وصفوں کو اس طرح ذکر کیا گیا جیسا کسی شخص کی شجاعت اور سخاوت کو ذکر کرنا مقصود ہو تو یوں کہا جائے "رأيت الغيث و الليث " (میں نے بارش اور شیر کو دیکھا) یعنی میں نے ایسے شخص کو دیکھا جو سخاوت میں بارش کی طرح ہے اور بہادری میں شیر کی طرح ہے۔

دوسرا احتمال: فرقان سے مراد وہ مسائل جو توراۃ میں بیان کئے گئے ہیں یعنی موسیٰ علیہ السلام کو ہم نے کتاب دی اور اس میں اصول دین اور فروع دین کو ذکر کیا اور موسیٰ علیہ السلام کو ان کے بیان کرنے اور ظاہر کرنے کا حکم دیا تاکہ تم ان اصول دین اور فروع دین پر عمل کر کے ہدایت حاصل کرسکو۔

تیسرا احتمال: توراۃ سے خارج چیزیں مراد ہوں۔یعنی فرقان سے مراد موسیٰ علیہ السلام کے معجزات ہوں کہ آپ کو ید بیضاء اور عصاء عطا فرمایا اور بھی نشانیاں عطا فرمائیں (جن کا ذکر ہو چکا ہے اور آئندہ آئے گا ان شاء اللہ) وہ حق و باطل کے درمیان فرق کرنے والی ہیں۔توراۃ سے خارج ہی فرقان سے مراد نصرت ہے اور کشادگی جو بنی اسرائیل کو عطا کی گئی اسی نصرت والے معنی کے لحاظ سے یوم بدر کو یوم الفرقان کہا گیا ہے جیسے رب تعالیٰ نے ان الفاظ مبارکہ سے بیان فرمایا ہے:

﴿ وَمَا اَنزَلْنَا عَلٰی عَبْدِنَا یَوْمَ الْفُرْقَانِ یَوْمَ الْتَقَی الْجَمْعَانِ ﴾

تنبیہ: بعض حضرات نے یہ بھی بیان فرمایا کہ فرقان سے مراد قرآن پاک ہے اور مفعول حذف ہے یعنی اصل عبارت یہ ہے " واذ آتینا موسی الکتاب ومحمدا فرقانا " لیکن اس قول کو تقریباً تمام مفسرین نے ضعیف قرار دیا۔اس لئے پہلے ہی تمام احتمالات قوی ہیں اور راقم کے نزدیک تمام ہی بیک وقت مراد ہیں۔جس کا مجموعی مفہوم یہ ہے کہ یاد کرو اس وقت کو جب ہم نے موسیٰ کو کتاب عطا کی اور وہی کتاب کو حق و باطل کے درمیان فرق کرنے والی بنا کر عطا کی اور اصول دین اور فروع دین کو بیان کرنے کا حکم دیا تاکہ حق و باطل میں فرق ہو سکے اور آپ کو معجزات عطاء فرمائے تاکہ معجزات کو دیکھ کر حق و باطل میں فرق کیا جا سکے۔اور آپ کی امداد فرما کر حق و باطل میں فرق کیا گیا ان تمام چیزوں کے عطاء کرنے کی وجہ یہ ہے تاکہ تم ہدایت حاصل کرلو۔ (از کبیر بزیادۃ)

﴿ لَعَلَّکُمْ تَھْتَدُوْنَ ﴾ " لکی تھتدوا بالتدبر فیه والعمل بما یحویه " (تفسیر ابی السعود)

تاکہ تم کتاب میں تدبر کر کے اور جن مسائل پر وہ مشتمل ہے ان پر عمل کر کے ہدایت حاصل کرلو۔

" لکی تھتدوا بتدبر الکتاب وتفکر الآیات " (بیضاوی)

تاکہ تم کتاب میں تدبر کر کے اور آیات میں تفکر کر کے ہدایت حاصل کرلو۔

" (لعلکم تھتدون) لما ھو شکر المحق والمبطل " (تبصیر الرحمن)

تاکہ تمہیں اس ذات کا شکریہ ادا کرنے کی ہدایت حاصل ہو جو حق راہ اور باطل راہ کا پیدا کرنے والا ہے اور حق و باطل میں تمیز کرنے والا ہے۔

☆☆☆

﴿وَاِذْ قَالَ مُوْسٰی لِقَوْمِهٖ یٰقَوْمِ اِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَكُمْ بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجْلَ فَتُوْبُوْٓا اِلٰی بَارِئِكُمْ فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ذٰلِكُمْ خَیْرٌ لَّكُمْ عِنْدَ بَارِئِكُمْ فَتَابَ عَلَیْكُمْ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ﴾

۱) ''اور جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا اے میری قوم تم نے بچھڑا بنا کر اپنی جانوں پر ظلم کیا تو اپنے پیدا کرنے والے کی طرف رجوع لاؤ تو آپس میں ایک دوسرے کو قتل کرو تمہارے پیدا کرنے والے کے نزدیک تمہارے لئے بہتر ہے اس نے تمہاری توبہ قبول کی بیشک وہی ہے توبہ قبول کرنے والا مہربان''۔

۲) ''اور یاد کرو اس وقت کو جب کہا موسیٰ نے اپنی قوم کو، اے میری قوم بیشک تم نے ظلم کیا ہے اپنی جانوں پر بوجہ بنانے تمہارے بچھڑے کو معبود، تو توبہ کرو اپنے پیدا کرنے والے کی طرف، تو ایک دوسرے کو تم قتل کرو، یہ بہتر ہے تمہارے پیدا کرنے والے کے ہاں، تو اس نے توبہ قبول کی تمہاری بیشک وہ توبہ قبول کرنے والا، رحم کرنیوالا ہے''۔

یعنی موسیٰ علیہ السلام نے قوم کو حکم دیا کہ تم نے بچھڑے کی پوجا کر کے اپنی جانوں پر ظلم کیا اب تم اپنے رب کی طرف توبہ کرو اور تمہاری توبہ کی صورت یہ ہے کہ تم آپس میں ایک دوسرے کو قتل کرو، چنانچہ توبہ کرنے والوں نے اس طرح توبہ کی کہ ہر ایک کے ہاتھ میں ایک تلوار تھی بلا امتیاز ہر ایک نے دوسرے کو قتل کیا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول فرمائی ہر قتل ہونے والے نے درجہ شہادت پایا۔

﴿وَاِذْ قَالَ مُوْسٰی لِقَوْمِهٖ﴾ ''اور یاد کرو جب کہا موسیٰ نے اپنی قوم کو'' یہاں سے بنی اسرائیل کو ایک اور نعمت یاد دلائی جا رہی ہے۔ بظاہر یہ وہم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل کو حکم دیا گیا کہ ایک دوسرے کو قتل کریں تو اسے نعمت کیسے کہا جائے؟ علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے وضاحت فرمائی کہ یہ نعمت کیسے ہے۔

" نعمة اخروية فی حق المقتولين من بنی اسرائيل حيث نالوا درجة الشهداء كما ان العفو نعمة دنيوية فی حق الباقين "

وہ بنی اسرائیل جن کو توبہ کرتے ہوئے قتل کیا گیا ان کے لئے یہ اخروی نعمت ہے کیونکہ انہوں نے شہداء کا درجہ حاصل کرلیا۔ جو باقی بچ گئے جن کو موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام کی دعاء سے معاف کردیا گیا ان کے حق میں یہ دنیاوی نعمت تھی۔ کیونکہ اتنے عظیم جرم کو معاف کرنا عظیم نعمت ہے۔ (از روح المعانی)

اور اللہ تعالیٰ نے جب ان کو ان کے عظیم گناہ کی خبر دی کہ تمہارا بچھڑے کی عبادت کرنا بہت بڑا جرم ہے اور پھر ان کو اس جرم سے نکلنے کی راہ بتا کر ان پر بہت بڑا دینی انعام کیا۔ جب اللہ تعالیٰ نے ان پر دنیاوی نعمتوں کا ذکر کیا تو اس دینی نعمت کا ذکر کرنا بھی بہتر ہے۔ (از کبیر)

عجیب نکتہ:

" ثم ان هذه النعمة وهی كيفية هذه التوبة لما لم يكن وصفها الا بمقدمة ذكر المعصية كان ذكرها ايضا من تمام النعمة "

جب توبہ کو قبول کرنا نعمت ہوا تو معصیت کا ذکر بھی نعمت میں داخل ہے کیونکہ معصیت کے بعد ہی تو توبہ کرنے کی ضرورت در پیش آئی معصیت نہیں ہوتی تو توبہ کی ضرورت نہ ہوتی۔ (از کبیر)

جب اللہ تعالیٰ نے ان کو توبہ کرنے کے لئے قتل کرنے کا حکم دیا لیکن تمام کے فنا ہو جانے سے پہلے حکم کو اٹھا لیا تو یہ باقی بچ جانے والوں کے لئے بہت بڑی نعمت تھی۔ اور خصوصاً نبی کریم ﷺ کے زمانہ کے بنی اسرائیل کے حق میں نعمت تھی کیونکہ ان کے آباء کو معاف کر بچا نہ لیا جاتا بلکہ سب کو تباہ کر دیا جاتا تو یہ لوگ کس طرح موجود ہوتے۔ گویا کہ حاضرین کے لئے براہ راست بھی نعمت تھی صرف ان کے آباء پر نعمت کا ذکر نہیں۔ (از کبیر)

نبی کریم ﷺ کی امت پر عظیم احسان:

بنی اسرائیل کی توبہ کو قتل سے مکمل کیا گیا۔ لیکن نبی کریم ﷺ نے اپنی امت کو بتایا کہ تمہیں توبہ کرنے کے لئے ایک دوسرے کو قتل کرنے کی ضرورت نہیں۔ بلکہ گناہوں سے باز آنے کا عزم کرلو، اسی طرح کافر و تمہاری توبہ یہ ہے کہ تم کفر کو چھوڑ دو، ایمان لے آؤ تو اللہ تعالیٰ تم پر انعام عظیم فرماتے ہوئے

تمہاری توبہ کو قبول کرے گا۔ (از کبیر)

اس واقعہ سے نبی کریم ﷺ کی امت کو توبہ کی رغبت دلائی گئی:

" ان فیه ترغیبا شدیدا لامة محمد صلوات الله وسلامه علیه فی التوبة "

اس واقعہ سے بہت ہی زیادہ رغبت دلائی گئی ہے امت مصطفیٰ ﷺ کو، اس لئے کہ جب موسیٰ علیہ السلام کی امت نے اتنے مشکل طریقہ سے توبہ کی تو نبی کریم ﷺ کی امت میں ہر شخص کو چاہئے کہ وہ توبہ کرنے میں دیر نہ کرے کیونکہ کتنی آسان راہ ان کو بتائی، کہ گناہوں پر نادم ہو جاؤ، آئندہ گناہ نہ کرنے کا مصمم ارادہ کرلو، گناہ کو چھوڑ دو، نیکی کے کام کرو بس یہی تو کامل ترین توبہ ہے۔ اسی سے ایک اور بہت بڑا فائدہ حاصل ہوا:

" ان ترغیب الانسان فیما هو المصلحة المهمة من اعظم النعم "

کسی انسان کو اہم مصلحت کی رغبت دلانا بھی اس پر بہت بڑا انعام ہے۔ (از کبیر)

﴿ یٰقَوْمِ اِنَّکُمْ ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَکُمْ بِاتِّخَاذِکُمُ الْعِجْلَ ﴾ یاقوم میں میم کا کسرہ اس پر دلالت کر رہا ہے اس سے یائے متکلم محذوف ہے اصل میں " یا قومی " ہے (اے میری قوم) بیشک تم نے ظلم کیا اپنے نفسوں پر۔

﴿ بِاتِّخَاذِکُمُ الْعِجْلَ ﴾ سے اس ظلم کی وجہ بیان کی یہاں پر بھی ایک مفعول محذوف ہے "الٰها"، یعنی تم نے اپنے نفسوں پر ظلم کیا بسبب اس کے کہ تم نے بچھڑے کو معبود بنا لیا۔

﴿ فَتُوْبُوْٓا اِلٰی بَارِئِکُمْ ﴾ "تو تم توبہ کرو اپنے پیدا کرنے والے کی طرف" توبہ کا معنی ہے رجوع کرنا، یعنی تم اپنے باری تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے کا پختہ ارادہ کرلو، اس لئے کہ توبہ کی تکمیل تو ان کی قتل سے ہوتی ہے، صرف رجوع کرنے سے نہیں " باریٔ " کا معنی بری کرنے والے جس طرح کہا جاتا ہے " بریٔ المریض من مرضه " مریض اپنی مرض سے بری ہو گیا۔ اور کہا جاتا ہے " بریٔ المدیون من دینه " مقروض قرضے سے بری ہو گیا۔

اور " باریٔ " کا معنی پیدا کرنے والا جیسا کہ کہا جاتا ہے " برأ الله آدم من الطین " اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو کیچڑ سے پیدا کیا۔ اس مقام پر معنی یہ ہوگا۔

" فاعزموا علی التوبة والرجوع الی من خلقکم بریئا من التفاوت

وممیزا بعضکم عن بعض بصور وهیئات مختلفه "

تم توبہ کرنے کا پختہ ارادکرلو، اور رجوع کرو اس ذات کی طرف جس نے تمہیں تفاوت (ایک دوسرے سے مختلف نمونہ ہونا) سے بری پیدا فرمایا، اور جس نے تمہیں بعض کو بعض سے صورتوں اور مختلف شکلوں سے تمیز دی۔

یعنی وہ ذات باری ہے جس نے تمام انسانوں کو ایک نمونہ بنایا، البتہ مختلف نقوش وغیرہ کے لحاظ سے ایک دوسرے سے پہچاننے کے لحاظ پر ممتاز کردیا۔

﴿ فَتُوبُوٓا اِلٰى بَارِئِكُمْ ﴾ کہہ کر گویا کہ بنی اسرئیل کو یہ کہا گیا ہے کہ وہ ذات جو عالم وحکیم ہے جس نے اپنی مہربانی اور حکمت سے تمہیں پیدا فرمایا تم میں کوئی تفاوت نہیں رکھا کہ ایک ہاتھ لمبا بنایا ہو تو دوسرا چھوٹا، اس قسم کے تفاوت سے تمہیں بری بنایا حق تو یہ تھا کہ تمہیں یہ تصور بھی نہ آتا کہ اس ذات کو بھی ناراض کرنا ہے لیکن افسوس کہ تم نے بچھڑے کی پوجا کر کے اسے ناراض کردیا۔

پھر وہ ذات جس نے تمہیں مختلف شکلیں عطاء کر کے ایک دوسرے سے ممتاز کیا، حق تو یہ تھا کہ تم اس کے شکرگزار ہوتے لیکن تم نے رب تعالٰی کی عظیم نعمتوں کی ناشکری کی اور رب تعالٰی سے شریک ٹھہرا کر کفر کیا لیکن رب تعالٰی پھر بھی تمہیں موقع عطاء کر رہا ہے کہ تم اس کے حضور جھک جاؤ، رجوع کرو، اس کے حکم کے مطابق توبہ کرو تو وہ تمہاری توبہ قبول فرمائے گا۔ (از بیضاوی وشیخ زادہ)

اعتراض : توبہ جب ہوتی ہی رب تعالٰی کی طرف ہے تو صرف " فتوبوا " کیوں نہیں کہہ دیا گیا " الی بارئکم " کیوں کہا گیا ہے۔

جواب : " المراد عنه النهی عن الریاء فی التوبة کأنه قال لهم لو اظهر تم التوبة لاعن القلب فانتم ماتبتم "

مراد یہ ہے کہ ان کو توبہ میں ریاء سے منع کیا گیا ہے گویا کہ ان کو کہا گیا ہے کہ اگر تم نے دل سے توبہ نہ کی تو تمہاری توبہ حقیقت میں توبہ نہیں ہوگی۔

یعنی تم نے اس ذات کی طرف رجوع نہیں کیا جو تمہارے دلوں میں مخفی رازوں کو جانتا ہے، بلکہ تم نے لوگوں کے لئے توبہ کی جس کا کوئی فائدہ نہیں:

" فانکم اذا اذنبتم الی الله وجب ان تتوبوا الی الله "

" بیشک جب تم نے رب تعالٰی کے حکم کی خلاف ورزی کرتے ہوئے گناہ کیا تو توبہ بھی اسی ذات کی طرف کرو"

(از کبیر)

﴿ فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ﴾ ان الفاظ مبارکہ کا اگرچہ ظاہری معنی تو یہ ہے "پس قتل کروا پنی جانوں کو" لیکن یہ معنی بالاتفاق مراد نہیں کیونکہ ان کو یہ حکم نہیں دیا گیا کہ تم میں سے ہر شخص اپنے آپ کو قتل کرکے توبہ کرے، بلکہ اس کا معنی یہ معتبر ہے کہ تم میں سے بعض بعض کو قتل کریں، یعنی آپس میں ایک دوسرے کو قتل کرو۔

ایک دوسرے کو قتل کرنے سے کیا مراد ہے؟

" وقیل امروا ان یقتل بعضھم بعضا " اور بیان کیا گیا ہے کہ اس سے مراد مطلق ہے یعنی تمام ہی بچھڑے کی پوجا کرنے والے تھے، ان کو حکم دیا گیا کہ تم ایک جگہ جمع ہو کر ایک دوسرے کو قتل کرو جب تم نے ایسا کر لیا تو تمہاری توبہ قبول کر لی جائے گی۔ " وقیل امر من لم یعبد العجل ان یقتل العبدۃ " اور بعض حضرات نے کہا کہ جن لوگوں نے بچھڑے کی پوجا نہیں کی تھی ان کو حکم دیا گیا کہ تم ان لوگوں کو قتل کرو جنہوں نے بچھڑے کی پوجا کی۔

ان کے لئے قتل کرنا کیسے ممکن ہوا؟

بنی اسرائیل جب سب ہی حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد تھے ایک دوسرے کے قریبی رشتہ دار تھے تو ان کے لئے یہ بہت مشکل کام تھا کہ ایک دوسرے کو قتل کریں، وہ توبہ کرنے پر آمادہ بھی ہو گئے لیکن ان سے یہ کام کرنا جب مشکل ہوا تو ان کے لئے یہ آسانی پیدا کی گئی:

" فارسل اللہ ضبابۃ وسحابۃ سوداء لایتباصرون فاخذوا یقتلون من الغداۃ الی العشی حتی دعا موسی وھارون فکشفت السحابۃ ونزلت التوبۃ وکانت القتلی سبعین الفا "

کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ سے دھند اور سیاہ بادل چھا دیئے جن سے اندھیرا چھا گیا وہ ایک دوسرے کو نہیں پہچان سکے تھے اور نہ دیکھ سکتے تھے، انہوں نے صبح سے لے کر شام تک ایک دوسرے کو قتل کیا، موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام نے دعا کی اے اللہ اب ان کو معاف کر دے دعاء کرنے کی وجہ یہی تھی کہ اگر ان پر یہی سلسلہ جاری رہا تو بنی اسرائیل کا نام ونشان ہی دنیا سے ختم ہو جائے گا، اللہ تعالیٰ نے ان کی دعاء کو قبول کیا اور معاف فرما دیا لیکن اس وقت تک ستر ہزار کی تعداد میں یہ لوگ قتل ہو چکے تھے۔ (بیضاوی رشیخ زادہ)

﴿ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ عِنْدَ بَارِئِكُمْ ﴾ : یہاں سے بیان کرنا یہ مقصود ہے کہ اگر تم نے توبہ کر لی اور ایک دوسرے کو قتل کر دیا تو تمہارے گناہ کو معاف کر دیا جائے اخروی ضرر سے تم بچ جاؤ گے اگر چہ دنیاوی ضرر قتل کی وجہ سے تمہیں حاصل ہونا ہے۔ لیکن اگر تم نے توبہ نہ کی تو دنیاوی ضرر تمہیں نہیں پہنچے گا، لیکن اخروی ضرر میں تم نے مبتلاء ہونا ہے، اس لئے تمہارا توبہ کرنا تمہارے پیدا کرنے والے کے نزدیک تمہارے لئے بہتر ہے۔

" واما الخلاص من العقاب والفوز بالثواب فذاك هو الغرض الاعظم "

یعنی عذاب اخروی سے نجات حاصل کرنا اور ثواب میں کامیابی حاصل کرنا ہی بہت بڑا مقصد ہے۔ (از کبیر)

﴿ فَتَابَ عَلَيْكُمْ ﴾ : یہاں دو احتمال ہیں ایک یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کے کلام کی حکایت رب تعالیٰ نے بیان فرمائی اس صورت میں مطلب یہ ہوگا " فان فعلتم فقد تاب عليكم " اگر تم نے اللہ تعالیٰ کے ارشاد کے مطابق توبہ کر لی یعنی ایک دوسرے کو قتل کر دیا تو اللہ تعالیٰ تمہاری توبہ یقیناً قبول فرمائے گا۔

اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ نے خود ہی بنی اسرئیل کو التفات کے طور پر فرمایا ہو جس کا مطلب یہ ہو: ﴿ فَفَعَلْتُمْ مَا اَمَرَكُمْ بِهٖ مُوْسٰى فَتَابَ عَلَيْكُمْ بَارِئُكُمْ ﴾

" موسیٰ علیہ السلام نے تمہیں جو حکم دیا اس پر تم نے عمل کر لیا اس لئے اللہ تعالیٰ نے تمہاری توبہ کو قبول کر لیا "۔

اعلیٰ حضرت نے یہی ترجمہ کیا ہے اور راقم نے بھی اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کو ہی نقل کیا ہے۔ تاہم یہ ترجمہ بھی کیا جا سکتا ہے " وہ تمہاری توبہ قبول کرے گا "۔

تنبیہ : یہ موسیٰ علیہ السلام کی شریعت کا قانون تھا کہ ایک دوسرے کو قتل کرنے سے توبہ قبول ہوتی تھی صرف زبان سے توبہ نہیں کی جا سکتی تھی۔ اسلئے یہ اعتراض نہیں کیا جا سکے گا کہ مرتد کو توبہ کے بعد قتل کرنے کا کیا مطلب؟ مسئلہ یہ واضح ہے کہ ایک شریعت کے احکام کو دوسری شریعت پر قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ (ماخوذ از خازن)

﴿ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴾ : "ای الرجاع بالمغفرة القابل للتوبة الرحيم بخلقه"

یعنی بیشک وہ مغفرت سے رجوع کرنیوالا اور توبہ قبول کرنیوالا ہے اور اپنی مخلوق پر رحم کرنیوالا ہے۔ (خازن)

﴿ وَاِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً فَاَخَذَتْكُمُ الصّٰعِقَةُ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ☆ ثُمَّ بَعَثْنٰكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَوْتِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴾

۱) ''اور جب تم نے کہا اے موسیٰ ہم ہرگز تمہارا یقین نہیں لائیں گے جب تک علانیہ خدا کو نہ دیکھ لیں تو تمہیں کڑک نے آلیا اور تم دیکھ رہے تھے، پھر مرے پیچھے ہم نے تمہیں زندہ کیا کہ کہیں تم احسان مانو''

۲) ''اور یاد کرو اس وقت کو جب تم نے کہا اے موسیٰ ہم ہرگز یقین نہیں کریں گے تم پر یہاں تک کہ ہم دیکھ لیں اللہ کو ظاہر طور پر، تو پالیا تمہیں کڑک نے ایسے حال میں کہ تم دیکھ رہے تھے، پھر زندہ کیا ہم نے تمہیں تمہاری موت کے بعد تاکہ تم شکر کرو''

اس آیۃ کریمہ میں بنی اسرائیل کی پشیمانی کے بعد کج روی کا ذکر کیا گیا ہے کہ بچھڑے کی پوجا کرنے اور موسیٰ علیہ السلام کی سرزنش کے بعد وہ لوگ بہت پشیمان ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ آپ اپنی قوم کے بہترین ستر افراد کو ساتھ لے کر طور پہ آجائیں تاکہ وہ تمام قوم کی طرف سے بچھڑے کی پوجا کے جرم کی معافی طلب کریں، آپ ان کو جب ساتھ لے کر گئے تو انہوں نے کہا اے موسیٰ اپنے رب سے سوال کرو یہاں تک کہ ہم اس کے کلام کو سنیں۔ موسیٰ علیہ السلام نے رب کے حضور عرض کیا تو اسے قبول کرلیا گیا۔

جب آپ کے قریب پہنچے تو ستون کی شکل میں بادل نمودار ہوا جس نے تمام پہاڑ کو اپنی لپیٹ میں لے لیا، حضرت موسیٰ علیہ السلام اس بادل کے قریب ہوئے یہاں تک کہ اس میں داخل ہوگئے موسیٰ علیہ السلام نے جب اپنے رب تعالیٰ سے کلام فرمایا تو آپ کی پیشانی سے ایک نور چمکنے لگا، انسانوں میں سے کوئی اسے دیکھنے کی طاقت نہیں رکھتا تھا۔

قوم نے اللہ تعالیٰ کے کلام کو سنا جو اس نے موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا، جب کلام کا سلسلہ ختم ہوا تو بادل کو اٹھا لیا گیا، قوم نے کہا:

﴿ لن نؤمن لک حتی نری الله جهرة ﴾

ہم ہرگز تم پر ایمان نہیں لائیں گے یہاں تک کہ ہم اللہ کو ظاہر دیکھ لیں۔ تو ان کو بجلی کی کڑک نے اپنی گرفت میں لے لیا اور سب مر گئے۔

موسیٰ علیہ السلام کھڑے ہوئے اور آسمانوں کی طرف ہاتھ اٹھا کر دعاء کرنے لگے اور عرض کیا اے اللہ میں بنی اسرائیل کے ستر آدمیوں کو منتخب کر کے لایا تھا تا کہ ان کی توبہ کے قبول ہونے میں میرے گواہ بنیں۔ اب میں ان کی طرف واپس جاؤں گا تو میرے ساتھ جب کوئی ایک بھی نہیں ہوگا تو وہ میرے متعلق کیا خیال کریں گے۔ موسیٰ علیہ السلام دعاء فرماتے رہے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی روحوں کو لوٹا دیا۔

خیال رہے کہ موسیٰ علیہ السلام جب توراۃ لینے کے لئے طور پر گئے تو اس وقت ستر آدمیوں کو ساتھ لے کر گئے پھر واپس لوٹنے پر قوم کے بچھڑے کی پوجا کرنے کے بعد لے کر گئے۔

(از کبیر ب ا ج ۳ ص ۸۴)

رہا یہ امر کہ بعض آیات قرآنیہ کے ظاہر الفاظ سے مفہوم ہوتا ہے کہ موت کے بعد دنیوی حیات حاصل نہیں ہوتی، ان آیات میں اسی قانون عام اور قدرت الٰہیہ کا بیان ہے۔ لیکن خرق عادت بھی کتاب وسنت سے ثابت ہے اور بعض امور کا قانون خاص کے تحت ہونا قرآن وحدیث سے واضح ہے اس لئے یہاں کوئی اشکال پیدا نہیں ہوتا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جن لوگوں کی دنیوی مدت عمر، علم الٰہی میں باقی تھی اور بطور سزائے معصیت یا کسی دوسری حکمت کی وجہ سے ان پر موت طاری کی گئی، ان لوگوں کو مرنے کے بعد دنیا میں دوبارہ زندگی عطا کی جاتی ہے اور جن لوگوں کی دنیوی مدت عمر علم الٰہی میں پوری ہو چکی ان کو دنیا میں دوبارہ زندگی دی جاتی ہے۔ (از تبیان للکاظمیؒ)

قدرے مزید تفصیل: یہاں سے مراد اللہ تعالیٰ نے ان کو ایک اور نعمت کی یاد دلائی کہ اے بنی اسرائیل تم رب تعالیٰ کی اس نعمت کو یاد کرو جب تم نے موسیٰ علیہ السلام کو یہ کہا کہ ہم ہرگز تمہاری بات پر یقین نہیں کریں گے جب تک اللہ تعالیٰ کو ظاہر نہ دیکھ لیں تو اللہ تعالیٰ نے تمہیں ایک کڑک کے ذریعے مار کر پھر زندہ کیا:

" لتتوبوا عن بغیکم وتتخلصوا عن العقاب وتفوزوا بالثواب "

تاکہ تم اپنی سرکشی سے توبہ کرلو اور عذاب سے نجات حاصل کرلو، اور ثواب حاصل کر کے رب تعالیٰ کے حضور کامیابی حاصل کرلو۔

☆ اور ان دونوں آیتوں سے نبی کریم ﷺ کے زمانہ کے بنی اسرائیل کو ڈرایا بھی گیا کہ تمہارے آباء واجداد جس قسم کی کج رویوں (ٹیڑھی چالوں) کی وجہ سے ایک مرتبہ کڑک کی وجہ سے مار دیئے گئے اگر تم نے بھی وہی طریقہ اختیار کیا تو رب تعالیٰ کی قدرت سے بعید نہیں کہ تمہیں بھی ذلیل کردے۔

☆ نبی کریم ﷺ کے زمانہ کے یہود آپ کی نبوت کا انکار کرتے تھے تو ان کی آباؤاجداد کا ذکر کر کے بتایا کہ جب ان کے آباء واجداد موسیٰ علیہ السلام کے معجزات کو ظاہر طور پر دیکھ کر نہ مانے تو ان کی اولاد نے وہی کچھ کرنا ہے جو ان کے اسلاف نے کیا ہے جیسے وہ ذلیل ہوتے رہے ایسے ہی یہ بھی ذلیل ہوتے رہیں گے۔

☆ نبی کریم ﷺ پر یہ واقعہ بیان کر کے آپ کو تسلی دی گئی کہ آپ سے پہلے بھی انبیاء کرام کے معجزات کا انکار کر کے اور ان پر ایمان نہ لا کر ان کو اسی طرح ذہنی تکلیف دیتے رہے جیسے آپ کو دے رہے ہیں لیکن اس کے لئے یہی ضروری ہے:

﴿ فاصبر کما صبر اولوا العزم من الرسل ﴾

کہ اے محبوب آپ صبر کریں جیسا کہ دوسرے اصحاب عزم رسولوں نے صبر کیا۔

☆ اس واقعہ سے کفار کے اس اعتراض کو رد کیا جو وہ کرتے تھے کہ اگر محمد ﷺ کی نبوت سچی ہوتی تو اہل کتاب ایمان لے آتے کیونکہ وہ علم والے ہیں۔ ان کو یہ بتایا گیا کہ یہ لوگ نبی کریم ﷺ کی حقانیت کو جاننے کے باوجود انکار کر رہے کیونکہ ان کا خاندانی طریقہ ہی یہی ہے ان کے اسلاف بھی ایسا ہی کرتے رہے جیسا یہ کر رہے ہیں۔

☆ " لما اخبر محمد علیہ الصلوۃ والسلام عن ھذہ القصص مع انہ کان امیا لم یشتغل بالتعلم البتۃ وجب ان یکون ذلک عن الوحی "

جب نبی کریم ﷺ نے یہ واقعات بیان فرمائے باوجود اس کے کہ آپ نے کسی مدرسہ میں کسی

استاذ سے نہیں پڑھا تو اسی سے واضح ہو گیا کہ یہ وحی کے ذریعے ہی آپ کو علم حاصل ہوا ہے۔ (از کبیر)

﴿وَاِذْ قُلْتُمْ یٰمُوْسٰی لَنْ نُّؤْمِنَ لَکَ﴾ "فمعناه لا نصدقک ولا نعترف بنبوتک"

اس کا معنی یہ ہوا "اور جب تم نے کہا اے موسیٰ ہم ہرگز تمہاری تصدیق نہیں کریں گے۔ اور یا "لن نؤمن لک" کا یہ معنی ہو ہم ہرگز تمہاری نبوت کا اعتراف نہیں کریں گے۔ (از کبیر)

اعتراض: یہ کہنا کیسے صحیح ہے کہ انہوں نے کہا "ہم ہرگز تم پر ایمان نہیں لائیں گے"

"وقد کان هؤلاء مؤمنين من قبل بموسیٰ علیه السلام"

حالانکہ وہ تو موسیٰ علیہ السلام پر پہلے ہی ایمان رکھتے تھے۔

جواب: "الا انهم نفوا هذا الايمان المعين والاقرار الخاص ، وقيل اراد نفي الكمال ای لایکمل ایماننا لک ، کما قيل في قوله ﷺ ، لا يؤمن احدكم حتى يحب لاخيه المؤمن ما يحب لنفسه"

انہوں نے مطلقاً ایمان کی نفی نہیں کی تھی، بلکہ طور پر موسیٰ علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ نے جو کلام فرمایا تھا جسے یہ سن رہے تھے اس کی انہوں نے نفی کی تھی کہ ہم اس پر ایمان نہیں لائیں گے یہاں تک کہ اللہ کو ظاہر دیکھ لیں۔

اسی جواب کے مطابق اعلیٰ حضرت کا ترجمہ بہت خوب ہے جس پر اعتراض وارد ہی نہیں ہوتا "ہرگز تمہارا یقین نہیں لائیں گے" یعنی ہم تمہاری بات پر یقین نہیں کریں گے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے یہ کہا ہے۔ بلکہ ہم تو تمہاری بات پر اس وقت یقین کریں گے جب ہم اللہ تعالیٰ کو ظاہر دیکھ لیں۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ انہوں نے مطلقاً ایمان کی نفی نہیں کی تھی بلکہ کمال ایمان کی نفی کی تھی۔ یعنی ہم تم پر کامل طور پر ایمان نہیں لائیں گے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کو ظاہر دیکھ لیں۔

کبھی بظاہر ایک چیز کی نفی ہوتی ہے لیکن حقیقت میں اس کے کمال کی نفی ہوتی ہے۔ جیسا کہ نبی کریم ﷺ کے ارشاد گرامی "لا یؤمن" کے الفاظ استعمال ہیں، لیکن اس میں بھی کمال کی نفی پائی گئی ہے حدیث کا مطلب یہ ہے "تم میں سے کوئی ایک کامل مومن نہیں ہو سکتا یہاں تک کہ اپنے مومن بھائی کے لئے وہی چیز پسند کرے جو اپنے لئے پسند کرتا ہے" (از روح المعانی)

۞ حَتّٰی نَرَی اللّٰهَ جَهْرَةً ۞: اصل میں " جهـرة " کا معنی ہے بلند آواز سے پڑھنا جیسا کہ کہا جاتا ہے "جهـرت بالقراء ة " میں نے بلند آواز سے قراءت کی۔ جس چیز کا ظاہر طور پر کامل طریقہ سے معاینہ پایا جائے اس پر مجازی طور پر " جهر " کا لفظ بولتے ہیں۔

" قال الراغب " الجهر " يقال لظهور الشئى بافراط حاسة البصر او حاسة السمع "

" علامہ راغب اصفہانی فرماتے ہیں " جہر " کا لفظ مشترک ہے یعنی دونوں معنی ہی اس کے حقیقی ہیں۔ خواہ واضح طور پر کسی چیز کو دیکھا جائے، یا واضح طور پر کسی کلام کو سنا جائے "

ان لوگوں نے " نـرى " کے ساتھ " جهـرة " ذکر کر کے اپنی بات کو پختہ طور پر پیش کیا کیونکہ صرف رؤیۃ کا تعلق دل سے بھی ہے اور خواب سے بھی ہے ان کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ ہم تو اللہ تعالیٰ کو ظاہر آنکھوں سے دیکھنا چاہتے ہیں جب ظاہر آنکھوں سے دیکھ لیں گے تو تمہاری بات پر بھی یقین کر لیں گے۔ ہم دل سے دیکھنے یا خواب سے دیکھنے کا مطالبہ نہیں کر رہے۔ (از روح المعانی)

۞ فَاَخَذَتْكُمُ الصّٰعِقَةُ ۞: " تو پالیا تمہیں کڑک نے " اخذ کا اصل معنی ہے ہاتھ سے پکڑنا "یہاں معنی ہے "استولت عليكم واحاطت بكم" تم پر کڑک غالب آگئی کڑک نے تمہارا احاطہ کر لیا " صاعقه " کے تین معنی کئے گئے ہیں۔

(۱) آسمانوں سے آگ آئی جس نے ان کو جلا دیا۔ (۲) آسمانی لشکر آیا جس کی حرکت کو سن کر ہی یہ مر گئے۔ (۳) آسمانوں سے ایک کڑک آئی جس سے یہ مر گئے، اور ایک دن اور ایک رات تک مرے رہے۔ (از روح المعانی)

۞ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ۞: ایسے حال میں کہ تم دیکھ رہے تھے یا تو اس سے مراد یہ ہے کہ ان پر صاعقہ کی وجہ سے جو حالت واقع ہوئی اسے وہ دیکھ رہے تھے۔ اور یا یہ مراد ہے کہ وہ زندہ ہونے کے بعد اپنے جسموں پر آثار موت دیکھ رہے تھے، اور یا یہ مراد ہے کہ ان کو زندہ کرتے وقت ان کے اعضا کو علیحدہ علیحدہ حیات عطا کی تو وہ اپنے زندہ ہونے کو دیکھ رہے تھے۔ (از روح المعانی)

اسی سے یہ واضح ہو گیا کہ " صعق " کا معنی موت بھی آتا ہے لیکن یہاں یہ معنی نہیں بن سکتا کہ

تم کو موت نے گرفت میں لے لیا ایسے حال میں کہ تم دیکھ رہے تھے۔ (از کبیر)

﴿ ثُمَّ بَعَثْنٰكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَوْتِكُمْ ﴾ : "پھر ہم نے تمہیں زندہ کیا تمہاری موت کے بعد" یعنی اللہ تعالیٰ کو ظاہر دیکھنے کے تمہارے سوال پر اللہ تعالیٰ نے جو کڑک بھیجی اس کی وجہ سے تم پر موت واقع ہوئی اس موت کے بعد موسیٰ علیہ السلام کی دعاء سے تمہیں زندگی عطاء کی۔

خیال رہے " بعث " جب موت کے بعد ہو تو اس وقت اس کا معنی ہوتا ہے زندہ کرنا جیسا کہ یہاں واقع ہے اور اگر نیند کے ساتھ متعلق ہو تو اس کا معنی ہوتا ہے بیدار کرنا جیسا کہ اصحاب کہف کے واقعہ میں " ثم بعثناهم " مذکور ہے وہاں نیند سے بیدار کرنا معنی مراد لیا گیا ہے۔ اور "بعث" کا زیادہ استعمال بھیجنے کے معنی میں ہے جیسا کہ ﴿ ربنا وابعث فيهم رسولا ﴾ میں اسی معنی میں استعمال ہے۔
(از روح المعانی)

﴿ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴾ : " تاکہ تم شکر کرو" یعنی اللہ تعالیٰ نے تمہیں موت کے بعد زندگی عطاء کی تاکہ تم اس نعمت کا شکر کرو۔ اسی طرح کفر کے بعد تمہیں صرف کڑک کی وجہ سے موت عطا کی گئی، اخروی عذاب سے تمہیں نجات دی گئی، یہ اللہ تعالیٰ کا تم پر عظیم انعام ہے، یہ عظیم انعام اسی لئے کیا تاکہ تم اللہ تعالیٰ کا شکر و کرو۔ (از روح المعانی)

تنبیہ: اللہ تعالیٰ کو دیکھنے کی تفصیلی بحث تو انشاء اللہ سورۃ انعام میں آنی ہے تاہم مختصر مسئلہ سمجھ لیا جائے اس مسئلہ میں اختلاف ہے کہ اللہ تعالیٰ کو دیکھنا جائز ہے یا نہیں، اکثر مبتدعہ اور معتزلہ اس کے جواز کے قائل نہیں ان کے نزدیک اللہ تعالیٰ کو دنیا میں دیکھنا ناجائز ہے اور آخرت میں بھی اسے نہیں دیکھا جاسکے گا۔

" واهل السنة والسلف على جوازها فيهما ووقوعها فی الآخرة "

اہل سنت و جماعت اور سلف صالحین کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو دنیا میں اور آخرت میں دیکھنا جائز ہے۔ البتہ دنیا میں صرف ممکن کی حد تک ہے اور آخرت میں اس کا وقوع ہوگا یعنی حقیقت میں مومنوں کو رب تعالیٰ کا دیدار حاصل ہوگا۔ (از قرطبی)

قابل توجہ: نبی کریم ﷺ معراج کی رات اللہ تعالیٰ کے دیدار سے مشرف ہوئے اس کی تفصیلی

بحث روح المعانی میں سورۃ" والنجم " میں دیکھی جائے، راقم نے تو ہنوز آغاز سفر کیا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعاء کا اثر: اس سے واضح ہوا کہ موسیٰ علیہ السلام کی دعاء سے بنی اسرائیل کو حیات مل گئی۔ جب موسیٰ علیہ السلام کی دعاء سے مردوں کو زندگی مل گئی، تو یہ کیوں نہ ہوتا کہ نبی کریم ﷺ کی دعا اور نگاہ سے مردہ دلوں کو حیات جاودانی نہ ملتی کفروشرک سے نجات دے کرامت مصطفیٰ ﷺ کو حیات ابدیہ اور سرور سرمدیہ سے سرفراز کیا۔

﴿ وَظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ وَاَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ ؕ وَمَا ظَلَمُوْنَا وَلٰكِنْ كَانُوْا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴾

۱) "اور ہم نے ابر کو تمہارا سائبان کیا اور تم پر من اور سلوی اتارا، کھاؤ ہماری دی ہوئی ستھری چیزیں اور انہوں نے کچھ ہمارا نہ بگاڑا، ہاں اپنی جانوں کا بگاڑ کرتے تھے"۔

۲) "اور ہم نے سایہ کیا تم پر بادلوں کا اور نازل کیا ہم نے تم پر من اور سلوی، کھاؤ پاکیزہ چیزیں جو ہم نے تمہیں عطا کیں اور انہوں نے نہیں ظلم کیا ہم پر اور لیکن وہ اپنی جانوں پر ظلم کرتے تھے"۔

بنی اسرائیل کا اصل وطن ملک شام تھا، یوسف علیہ السلام کے دور میں یہ لوگ مصر آ کر آباد ہو گئے وہاں ان پر مختلف حالات گزرے، فرعون کی غلامی میں رہنا اور اس کے مظالم کو برداشت کرنے کا دور بھی مصر میں ہی ان پر آیا۔ آخر کار اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کے ذریعے ان کو نجات دی اور فرعون کو غرق کر دیا، اب بظاہر یہ لوگ پریشانیوں سے نکل کر اطمینان میں آ گئے۔ اس دوران ملک شام پر قوم عمالقہ قابض ہو چکی تھی اور انہوں نے وہاں اپنا تسلط قائم کر لیا تھا۔

فرعون کے غرق ہونے کے بعد اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو حکم دیا کہ تم اپنا وطن بنی عمالقہ سے آزاد کراؤ، اور وہاں جا کر مقیم ہو جاؤ، لیکن جب ان کو پتہ چلا کہ بنی عمالقہ تو بہت بڑے جسیم اور طاقتور لوگ ہیں تو انہوں نے ان سے جنگ کرنے اور اپنے وطن کو آزاد کرانے سے انکار کر دیا بلکہ موسیٰ علیہ السلام کو یہ لوگ کہنے لگے۔

﴿ فاذھب انت وربک فقاتلا انا ھھنا قاعدون ﴾

تم جاؤ اور تمہارا خدا جائے تم ان سے قتال کرو ہم تو یہاں ہی بیٹھتے ہیں۔

جب وہ عمالقہ قوم کی طاقت کا حال سن کر ڈر گئے اور جہاد سے منہ موڑ کر واپس لوٹ آئے تو اللہ تعالیٰ نے ان کو اس جرم کی سزا یوں دی کہ وہ اپنے گھروں تک واپس نہ پہنچ سکے اور چالیس برس تک وادی تیہ میں حیران و پریشان گھومتے رہے۔

تیہ مصر اور شام کے درمیان ایک وسیع اور کھلا میدان تھا تیہ کے معنی ہیں حیرانی و پریشانی کے ہیں بنی اسرائیل اس میدان میں چالیس سال تک انتہائی حیرانی اور پریشانی کے عالم میں سرگرداں رہے اسی لئے اسے وادی تیہ کہا جاتا ہے۔ بنی اسرائیل اپنے گھروں تک جانے کی فکر میں دن بھر سفر کرتے رات بسر کرنے کے بعد صبح اپنے آپ کو وہیں پاتے جہاں سے گزشتہ صبح انہوں نے سفر کو شروع کیا ہوتا۔

(از شیخ زادہ و قرطبی)

بنی اسرائیل سرکشی کے باوجود انعامات:

یہی آیت کریمہ جس کی وضاحت کی جارہی ہے اس میں ان نعمتوں کا ذکر ہے جن کا تعلق میدان تیہ سے ہے۔ حالانکہ میدان تیہ میں ان کو حیران و پریشان کرنے کی وجہ ان کی سرکشی تھی۔ اس وادی میں نہ کوئی سایہ دار درخت تھا اور نہ ہی کوئی مکان، نہ پینے کے لئے پانی تھا اور نہ کھانے کے لئے کوئی چیز وہاں موجود تھی، روشنی وہاں نہیں تھی، اور ضروریات زندگی وہاں حاصل نہیں تھے۔

اس بے سروسامانی اور غریب الوطنی کے حال میں موسیٰ علیہ السلام کی دعا سے ان کو سب سامان مہیا کر دیا گیا۔ اللہ تعالیٰ نے دھوپ سے بچاؤ اور سایہ کے حصول کیلئے بادل بطور سائبان نازل فرما دیا۔ کھانے کیلئے من اور سلوی بھیج دیا، تاریکی دور کرنے کے لئے عمودی شکل میں ایک روشنی ظاہر ہو جاتی تھی۔ لباس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کی اعجازی شان اس طرح ظاہر فرمائی کہ نہ ان لوگوں کے کپڑے میلے ہوتے اور نہ ہی پھٹتے اور انکے بچوں کے جسم کے ساتھ بچوں کا لباس بھی بڑھتا رہتا۔ موسیٰ علیہ السلام کا پتھر سے پانی نکالنے والا معجزہ بھی اسی میدان میں ظاہر ہوا۔ جس کا ذکر آگے آرہا ہے۔

(از شیخ زادہ و قرطبی)

﴿ **وَظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ** ﴾ : " سخر الله لهم السحاب يظلهم من الشمس حين كانوا في التية " (بیضاوی)

اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے بادل کو مسخر فرمایا جو ان کو سورج کی دھوپ سے بچانے کیلئے سایہ کرتا تھا۔ جب کہ وہ تیہ میں تھے راقم نے اسی کے مطابق ترجمہ کیا ہے " اور ہم نے سایہ کیا تم پر بادلوں کا " "ای جعلناه علیکم کالظلة " (قرطبی) اعلیٰ حضرت کا ترجمہ قرطبی کے ان الفاظ کا ہی بعینہ ہے " اور ہم نے ابر (بادل) کو تمہارا سائبان کیا "

(**الغمام**) جمع ہے غمامۃ کی۔ جس طرح سحابۃ کی جمع سحاب ہے ہر چیز جو ڈھانپ دینے والی ہو اس پر " غم " کا اطلاق ہوتا ہے بادلوں کو غمام کہا گیا ہے کہ وہ آسمانوں کو ڈھانپ لیتے ہیں۔ " **کل مغطی فهو مغموم** " ہر ڈھانپی ہوئی چیز کو " مغموم " کہا جاتا ہے پھر جو شخص غم اور پریشانی میں ہو اسے بھی مغموم کہا جاتا ہے کیونکہ اس کی عقل پر پردہ چھا جاتا ہے۔ " غم الھلال " کہا جاتا ہے کہ چاند کو بادل نے ڈھانپ لیا، خیال رہے کہ غین اور غیم دونوں کا معنی بادل اور گردو غبار آتا ہے۔

نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے " **انه لیغان قلبی** " میرے دل پر جب دنیاوی مشاغل کی وجہ سے رب تعالیٰ کی طرف اتنے لحات کے لئے توجہ میں کمی کی وجہ سے پردہ آ جاتا ہے تو میں رب تعالیٰ کی طرف رجوع کرتا ہوں۔

علامہ سعدی رحمہ اللہ نے بیان کیا کہ ان پر دن کو سفید ہلکے بادل چھا جاتے جو دھوپ سے ان کو بچاتے، لیکن رات کو بادل چھٹ جاتے، چاندنی روشنی سے کوئی رکاوٹ نہیں ہوتی تھی۔ (از قرطبی)

﴿ **وَاَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى** ﴾ : " اور نازل کیا (اتارا) ہم نے تم پر من اور سلوی "

من کیا چیز ہے؟ اگرچہ اس میں مختلف قول ہیں صحیح قول یہی ہے کہ من سے مراد ترنجبین ہے جو ایک نفیس شیریں ذائقہ دار مادہ تھا جو شبنم کی طرح صبح کے وقت آسمان سے اترتا اور کئی علاقوں میں چھوٹے چھوٹے درختوں پر منجمد ہو جاتا تھا:

" فلما اکثروا اکله سمنوا من اکله فقالوا لموسی علیه السلام قتلنا هذا المن بحلاوته "

جب وہ کثیر مقدار میں من کھا کھا کر موٹے ہو گئے تو کہنے لگے اے موسیٰ اس من کی مٹھاس نے تو ہمیں مار کر رکھ دیا ہے موسیٰ علیہ السلام نے رب کے حضور دعاء کی تو رب تعالیٰ نے ان پر سلویٰ نازل فرمایا۔

سلویٰ کیا ہے: سلویٰ کے بارے میں بھی متعدد اقوال ہیں۔صحیح یہی ہے کہ وہ بٹیر تھا،بعض نے کہا وہ بھنا ہوا اترتا تھا اور بعض کا قول ہے کہ بکثرت زندہ پرندے ان کے پاس جمع ہو جاتے تھے وہ انہیں زندہ پکڑ لیتے اور ذبح کرتے تھے۔الغرض من اور سلویٰ ان کی میٹھی اور نمکین غذائیں تھیں جنہیں وہ پیٹ بھر کر کھاتے تھے۔من کو روٹی کے طور پر کھاتے تھے اور سلویٰ کو سالن کے طور پر کھاتے تھے یہ ان پر کتنا بڑا انعام تھا کہ بغیر مشقت انہیں یہ انعامات میسر تھے۔

ایک حدیث کا مطلب: سعید بن زید بن عمرو و بن فضیل فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

الکمأة من المن الذی انزل اللہ علی بنی اسرائیل وماؤھا شفاء للعین ، وفی روایة من المن الذی انزل اللہ علی موسی .... رواہ مسلم "

کمأۃ اس من سے ہے جو اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل پر نازل فرمایا اس کا پانی آنکھوں کے لئے شفا ہے اور ایک روایت میں ہے کہ اس من سے ہے جو اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام پر نازل فرمایا (مطلب دونوں روایات کا ایک ہی ہے)

کمأۃ کیا ہے؟ یہ پودا بہار کے موسم میں زمین کے نیچے پایا جاتا ہے یہ اروی کی طرح گول جڑ ہوتی ہے جس کا نہ تنا ہوتا ہے نہ ریں اس کا رنگ مٹیالا ہوتا ہے (المنجد) تاہم بعض مترجمین نے اس کا معنی کھمبی بھی کیا ہے۔

کمأۃ کو من کہنے کی وجہ: اس میں دو قول پائے جاتے ہیں ایک ان میں سے یہ ہے:

" الکمأة مما انزل اللہ علی بنی اسرائیل ای مما خلقه اللہ لھم فی التیه "

کمأۃ کو اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے تیہ کے میدان میں پیدا کیا۔

دوسرا قول زیادہ معتبر ہے وہ یہ ہے:

" قال ابو عبید انما شبھھا بالمن لانه لا مؤنة فیھا ببذر ولا سقی ولا علاج "

ابوعبید رحمہ اللہ نے بیان فرمایا کہ کمأۃ کو من سے تشبیہ دی گئی ہے یعنی حقیقی طور پر اس کا من ہونا معتبر نہیں بلکہ مجازی طور پر من کے اس طرح مشابہ ہے کہ من بھی قدرتی طور پر بغیر محنت اور مشقت کے حاصل ہوا، اور کمأۃ بھی بغیر بیج اور بغیر پانی لگانے اور بغیر کاشت کرنے وغیرہ کی مشقت کے حاصل ہوتی ہے۔

کمأۃ کا پانی آنکھوں کے لئے شفاء ہے بعض اہل علم نے بیان فرمایا کہ اس کے پانی میں برودت (ٹھنڈک) کی تاثیر ہے۔ اس لئے اگر اسے استعمال کیا جائے جب کہ آنکھوں، حرارت (گرمی) کی وجہ سے خراب ہوں تو آنکھوں کو شفا حاصل ہوگی۔ البتہ مختلف اوقات میں دواؤں کے ساتھ استعمال آنکھوں کے لئے نفع مند ہے۔

" وذهب ابو هريرة ﷺ الی استعمالها بحتا فی جميع مرض العين "

اور حضرت ابو ہریرہ ﷺ کا یہ موقف تھا کہ کمأۃ کا پانی ہر حال میں بغیر کسی دواء کے ملانے کے آنکھ کی تمام مرضوں سے شفا دیتا ہے۔ (از قرطبی)

اصل میں یہ عشق ومحبت کی بات ہے کیونکہ حضرت ابو ہریرہ ﷺ نے سوچا کہ نبی کریم ﷺ نے تو مطلقاً " ماء ها " (اسی کا پانی) فرمایا ہے کہ اس کا پانی آنکھوں کے لئے شفاء ہے آپ نے تو یہ نہیں بیان فرمایا کہ اس کے پانی کے ساتھ دواء بھی ملانا آپ نے تو یہ نہیں بیان فرمایا کہ اس کا پانی بعض مرضوں کیلئے شفا ہے تو ہم کون ہوتے ہیں کہ اس کی قسمیں بناتے پھریں۔ راقم کا موقف بھی یہی ہے۔

بنی اسرائیل کی ذخیرہ اندوزی:

" روی انه كان ينزل عليهم من طلوع الفجر الی طلوع الشمس كالثلج ، فيأخذ الرجل ما يكفيه ليومه ، فان ادخر منه شيأ فسد عليه الا فی يوم الجمعة فانهم كانوا يدخرون ليوم السبت فلا يفسد عليهم لان يوم السبت يوم عبادة وما كان ينزل عليهم يوم السبت شئی "

روایت کیا گیا ہے کہ ان پر من طلوع فجر (صبح صادق) سے لے کر طلوع شمس (سورج نکلنے) تک برف کی طرح نازل ہوتا، ہر شخص کو اتنا حاصل ہو جاتا جو تمام دن کے لئے کافی ہوتا، ان کو جمع کرنے کی اجازت نہیں تھی، اگر کوئی جمع کر لیتا تو وہ من بدبودار ہو جاتا، ہاں البتہ ہفتہ کا دن ان کی عبادت کا دن تھا، اس دن من نہیں نازل ہوتا تھا البتہ

جمعہ کے دن زیادہ نازل ہو جاتا تھا، اوران کو اجازت تھی کہ وہ جمعہ کے دن اتنا جمع کرلیں جوان کو ہفتہ کے دن بھی کافی ہو سکے۔ (از قرطبی)

رب تعالیٰ کی طرف سے گویا کہ ان کو حکم تھا:

" ولا تدخروا الغد فخالفوا وادخروا فدود وفسد فقطع الله عنهم " (حازن)

کل کے لئے ذخیرہ بنا کر نہ رکھو، لیکن انہوں نے رب تعالیٰ کے اس حکم کی مخالفت کی اور دوسرے دن کے لئے ذخیرہ بنایا تو اس کھانے میں کیڑے پڑ گئے اور بدبودار ہو گیا اور ذخیرہ اندوزی کرنیوالوں سے وہ کھانا روک لیا گیا۔

☆ " عن ابی هریرة ﷺ قال قال رسول الله ﷺ لو لا بنی اسرائیل لم یخنت الطعام اللحم ولو لا حواء لم تخن انثی زوجها الدهر ...... روای البخاری ومسلم قوله لم نخنز اللحم ینتن ولم یتغیر " (خازن)

حضرت ابو ہریرہ ﷺ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر بنی اسرائیل طعام میں خیانت نہ کرتے تو گوشت کبھی بھی بدبودار نہ ہوتا، اور حضرت حواء اگر خیانت (حضرت آدم علیہ السلام کو دانہ کھلانے کی) نہ کرتیں تو کبھی بھی کوئی عورت اپنے خاوند کی خیانت نہ کرتی۔ بنی اسرائیل نے من اور سلویٰ کو جب سے جمع کرنا شروع کیا اور اللہ تعالیٰ کی حکم عدولی کی اس وقت سے گوشت خراب ہونا اور بدبودار ہونا شروع ہوا ورنہ پہلے گوشت کتنے دن بھی پڑا رہے کبھی خراب نہیں ہوتا تھا۔ (از خازن)

ذخیرہ اندوزی کی مذمت احادیث سے:

" عن معمر قال قال رسول الله ﷺ من احتكر فهو خاطئ "

(رواه مسلم . مشكوة باب الاحتكار)

حضرت معمر ﷺ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس شخص نے ذخیرہ اندوزی کی وہ گنہگار ہوا۔

تنبیہ : یہ سمجھنا ضروری ہے کہ ذخیرہ اندوزی کیا ہے اور کس چیز میں ہے اور کس حال میں منع ہے۔

" الاحتكار المحرم هو فی الاقوات خاصة بان یشتری الطعام فی

وقت الغلاء ولا یبیعه فی الحال بل یدخره لیغلوا فاما اذا جاء قریة او اشتراه فی وقت الرخص واذخره وباعه فی وقت الغلاء فلیس باحتکار ولا تحریم فیه واما غیر الاقوات فلا یحرم الاحتکار فیه بکل حال طیبی " (حاشیہ مشکوٰۃ)

ذخیرہ اندوزی کا تعلق صرف انسانوں کی روزی (اور جانوروں کے چارہ وغیرہ سے ہے) جب انسانوں کو طعام وغیرہ کی ضرورت ہو اور جانوروں کے چارہ کی ضرورت ہو طعام اور چارہ وغیرہ کم ہونے کے وجہ سے مہنگے ہو رہے ہوں اس وقت ان چیزوں کو خرید کر جمع کر لینا اور مہنگا ہونے کی انتظار کرنا، لوگ مصیبت میں اپنا وقت گزار رہے ہوں، یہ ذخیرہ اندوزی حرام ہے۔

اگر کسی آدمی نے دیہات سے ستا غلہ خرید لیا یا شہر سے ہی خرید لیا اس وقت اس کی قیمت کم تھی۔ اس نے وہ غلہ رکھ لیا کہ ابھی کچھ دنوں کے بعد ان چیزوں کی قیمتیں بڑھیں گی، لوگوں کو ان چیزوں کی کمی نہیں وافر مقدار میں مل رہی ہیں، یہ ذخیرہ اندوزی جائز ہے اس میں لوگوں کو مصیبت میں نہیں ڈالا گیا انسانوں یا جانوروں کی روزی کے بغیر باقی چیزوں کی ذخیرہ اندوزی ہر حال میں جائز ہے چونکہ ان چیزوں کے بغیر بھی انسان یا جانور زندہ رہ سکتے ہیں۔

اور یہ بھی خیال رہے کہ اپنی زمین کی پیداوار خواہ اپنی ضرورت سے وافر مقدار میں ہی کیوں نہ ہو اسے جمع کر کے رکھ لینا نہ بیچنا کوئی گناہ نہیں۔ ہاں ضرورت مندوں پر بیچنا، مہنگے ہونے کی انتظار نہ کرنا ثواب ہے لوگوں پر مہربانی ہے اصل میں کسی پر مہربانی کرنا ہی رب تعالیٰ کی مہربانی کا ذریعہ ہے۔

☆ " عن عمر النبی ﷺ قال الجالب مرزوق والمحتکر ملعون "

(رواہ ابن ماجہ والدارمی مشکوٰۃ باب الاحتکار)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ نے فرمایا طعام وغیرہ باہر سے لے کر مناسب قیمت سے بیچنے والے کو رزق دیا جاتا ہے اور ذخیرہ اندوز لعنت کا مستحق ہوتا ہے۔

جالب ضد ہے محتکر کی، یعنی لوگوں کو جب ضرورت ہو غلہ کی اور جانوروں کے چارہ کی تو وہ تاجر جو حاجت مندوں کی ضرورت کو دیکھ کر دیہاتوں اور دوسرے شہروں سے یہ اشیا خرید کر لائے بہت مناسب نفع لے، لوگوں کی ضرورت سے ناجائز فائدہ نہ اٹھائے بہت مہنگا سودا نہ بیچے بلکہ مناسب قیمت

لے تو اسکے رزق میں برکت ہوگی رب تعالیٰ کی اس پر رحمت ہوگی لوگوں کی دعائیں اسکے ساتھ ہوں گی۔
ذخیرہ اندوز لوگوں کو تکلیف پہنچانے والا، اپنے مال سے ناجائز فائدہ اٹھانے والا، لوگوں کی ضرورت کو دیکھ کر ان کو اور زیادہ ستانے والا لوگوں کو دعاء سے محروم ہو جاتا ہے رب کی رحمت سے دور ہوتا ہے اس کے رزق میں بے برکتی آ جاتی ہے۔

☆ " وعن انس قال غلا السعر علی عهد النبی ﷺ فقالوا یا رسول الله سعر لنا فقال النبی ﷺ ان الله هو المسعر القابض الباسط الرزاق وانی لارجو ان القی ربی ولیس احد منکم یطلبنی بمظلمة بدم ولا مال " (رواه الترمذی وابن ماجه وابو داؤد والدارمی، مشکوة باب الاحتکا)

حضرت انس ﷺ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں ایک مرتبہ چیزیں مہنگی ہو گئیں صحابہ کرام نے عرض کیا یا رسول اللہ ہمارے لئے چیزوں کا بھاؤ مقرر فرما دیں۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا بیشک اللہ تعالیٰ کے قبضہ قدرت میں ہے بھاؤ مقرر کرنا۔ رزق کو تنگ کرنے والا اور رزق کو کشادہ کرنے والا وہی ہے، رزق دینے والا وہی ہے، بیشک میں امید کرتا ہوں کہ میری ملاقات جب میرے رب سے ہو گی تو تم میں سے کوئی ایک بھی مجھ سے ظلم کا مطالبہ نہیں کرے گا کہ میں نے کسی کا ناحق خون بہا کر ظلم کیا ہو یا کسی کے مال کو نقصان پہنچا کر ظلم کیا ہوا، کہ قیامت کے دن لوگ رب تعالیٰ کو یہ کہہ رہے ہوں کہ ہمیں اس ظلم کا بدلہ دلایا جائے۔

" وجه النهی بالتسعیر لان التصرف فی اموال الناس بغیر اذنهم فیکون ظلما وربما یؤدی الی القحط والمراد انه لا یکلف الناس بالتسعیر ولکن یؤمرون بالانصاف والشفقة علی الخلق والنصیحة لهم " (لمعات)

گویا کہ بھاؤ مقرر کرنے سے نبی کریم ﷺ نے لوگوں کو منع کیا ہے خود بھی بھاؤ مقرر نہیں کیا۔ اسلئے کہ لوگوں کے مالوں میں ان کی اجازت کے بغیر تصرف کرنا ظلم ہے بسا اوقات یہ قحط تک پہنچاتا ہے۔ مراد اس سے یہی ہے کہ خود (حاکم) بھاؤ مقرر کر کے لوگوں پر ظلم نہ کریں کیونکہ ان کو بھاؤ مقرر کرنے کا مکلّف ہی نہیں بنایا گیا ہاں البتہ لوگوں کو انصاف کرنے کا حکم دیا جائے اور مخلوق پر شفقت کی جائے اور ان کو نصیحت کی جائے

" (قوله انی لارجو) فیه اشارة الی المانع من التسعیر مخافة ان یظلم فی اموالهم "

نبی کریم ﷺ نے خود بھاؤ اسی لئے مقرر نہیں فرمایا کہ کہیں لوگوں کے مالوں میں ناجائز

ظلم نہ ہو جائے۔

تنبیہ : پہلے یہ بحث تفصیلی طور پر بیان ہو چکی ہے کہ انبیاء کرام صغیرہ اور کبیرہ گناہوں سے پاک ہیں اسلئے نبی کریم ﷺ کا بھاؤ مقرر نہ کرنا تعلیم امت کے لئے تھا ورنہ آپ سے ظلم ہونا یہ ممکن ہی نہیں۔ بلکہ یوں سمجھیں کہ آپ کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ میں بھاؤ اس لئے مقرر نہیں کرتا کہ آج اگر میں نے بھاؤ مقرر کر دیا تو میری امت کے حکام بھی بھاؤ مقرر کریں گے، ان پر مجھے یہ خوف ہے کہ کہیں وہ لوگوں کے مالوں پر ظلم کر کے اپنی عاقبت برباد نہ کر دیں۔

ضمناً یہ بھی سمجھا دیا کہ اے میری امت لوگوں کے ناحق خون بہا کر اپنے آپ کو جہنم کے عذاب کا مستحق نہ بنانا۔

☆ "عن عمر بن الخطاب قال سمعت رسول الله ﷺ يقول من احتكر على المسلمين طعامهم ضربه الله بالجذام و الافلاس "

(رواه ابن ماجه والبيهقي في شعب الايمان ورزين في كتابه مشكوة باب الاحتكار)

حضرت عمر ابن خطاب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا "جو شخص مسلمانوں کے طعام کو ذخیرہ اندوزی کرے گا، اللہ تعالیٰ اس پر کوڑھ اور غربت کو مسلط کرے گا۔

یعنی مقصد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس شخص کو بدن اور مال کو آزمائش میں مبتلاء کرے گا برکت اور خیران سے اٹھ جائیگی۔

☆ " وعن ابن عمر قال قال رسول الله ﷺ من احتكر طعاما اربعين يوما يريد به الغلاء فقد برئ من الله وبرئ الله منه " (رواه رزين، مشكوة باب الاحتكار)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ جس شخص نے چالیس دن تک طعام کو روکے رکھا اور مہنگا ہونے کا ارادہ کرتا رہا تو وہ اللہ تعالیٰ سے دور ہو گیا۔ اور اللہ تعالیٰ اپنی رحمت کے لحاظ سے اس سے دور ہو گیا۔ یعنی اس شخص نے رب تعالیٰ کے حکم کی خلاف ورزی کر کے اس کے وعدہ کو توڑ دیا رب تعالیٰ نے بھی اسے جو اپنی امان اور حفاظت کا وعدہ کر رکھا تھا وہ بھی اس شخص نے ختم کرنے کا خود ہی سبب بنالیا۔

☆ "وعن ابى امامة ان رسول الله ﷺ قال من احتكر طعاما اربعين يوما " ثم تصدق به لم يكن له كفارة " (رواه رزين، مشكوة كتاب الاحتكار)

حضرت ابوامامہ ﷛ فرماتے ہیں بیشک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس شخص نے چالیس دنوں تک طعام کو روک کر رکھا پھر صدقہ (بھی) کرے تو اس کا کفارہ نہیں بن سکتا۔

☆ "وعن معاذ قال سمعت رسول الله ﷺ يقول بئس العبد المحتكر ان ارخص الله الاسعار حزن وان اغلاها فرح"

(رواه البيهقى فى شعب الايمان ورزين فى كتابه، مشكوة باب الاحتكار)

حضرت معاذ ﷛ فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ وہ شخص بہت برا ہے جو شخص طعام کو روک کر رکھے جب اللہ تعالیٰ بھاؤ سستے کر دے تو وہ غمناک ہو جائے اور اگر مہنگا کر دے تو وہ خوش ہو جائے۔

﴿ كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ ﴾: "کھاؤ پاکیزہ چیزیں جو ہم نے تمہیں عطا کیں" یعنی پاکیزہ اور لذت دار من اور سلوی کھاؤ، لیکن ذخیرہ نہ بنانا، اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی تبدیلی نہ طلب کرنا، کیونکہ یہ شکر کے مخالف ہے۔

﴿ وَمَا ظَلَمُوْنَا ﴾: انہوں نے ناشکری کی، ذخیرہ اندوزی کی، اور من وسلوی کے تبدیل کرنے کا مطالبہ کیا ان نافرمانیوں کی وجہ سے وہ اللہ تعالیٰ کے انعام سے محروم ہو گئے، حالانکہ ان پر جو فیضان تھا اس میں ان کو کوئی مشقت نہیں اٹھانی پڑتی تھی اور نہ ہی اس کھانے کا ان سے کوئی حساب لیا جاتا لیکن انہوں نے ناشکری سے اپنے آپ کو اس نعمت سے محروم کر دیا تو رب تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَمَا ظَلَمُوْنَا وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴾

اور انہوں نے نہیں ظلم کیا ہم پر، لیکن وہ اپنی جانوں پر ہی ظلم کرتے تھے۔ (از تبصیر الرحمن)

نبی کریم ﷺ کے معجزات کی ایک جھلک:

"عن جابر ان ام مالک كانت تهدى للنبى ﷺ فى عكة لها سمنا فياتيها بنوها فيسالون الادم وليس عندهم شئى فتعمد الى الذى كانت تهدى فيه للنبى ﷺ فتجد فيه سمنا فما زال يقيم لها ادم بيتها حتى عصرته فاتت النبى ﷺ فقال عصرتيها فقالت نعم قال لو تركتيها ما زال قائما"

(مسلم ج ۲ ص ۲۵۴ باب فى معجزات النبى ﷺ)

حضرت جابر ﷺ فرماتے ہیں کہ ام مالک رضی اللہ عنہا نبی کریم ﷺ کو چمڑے کے ایک برتن (کپے) میں گھی بطور ہدیہ دیا کرتی تھیں ان کے بیٹے جب ان کے پاس آ کر مطالبہ کرتے کہ کوئی چیز دیں جس سے روٹی کھائیں اور کوئی چیز نہیں ہوتی تھی تو وہ اس برتن کے پاس آتیں جس میں نبی کریم ﷺ کو گھی ہدیہ دیتی تھیں، اس برتن میں ان کو گھی میسر ہوتا تھا۔ وہی اپنے بچوں کو دیتی تھیں جس سے ملا کر وہ روٹی کھا لیتے تھے یہ سلسلہ کافی دیر تک رہا، ایک مرتبہ انہوں نے برتن کو نچوڑ لیا تو وہ گھی حاصل ہونا بھی ختم ہو گیا۔ وہ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں تو آپ نے فرمایا کیا تم نے اس برتن کو نچوڑ لیا تھا انہوں نے عرض کیا ہاں یا رسول اللہ تو آپ نے فرمایا اگر تم اسے اسی طرح چھوڑتی (یعنی نہ نچوڑتی) تو ہمیشہ (تمہیں گھی میسر ہونے کا سلسلہ) قائم رہتا۔

☆ "عن جابر ان رجلا اتی النبی ﷺ یستطعمه فاطعمه شطر وسق شعیر فما زال الرجل یاکل منه وامراته وضیفهما حتی کاله فاتی النبی ﷺ فقال لو لم تکله لاکلتم منه ولقام لکم" (مسلم شریف ج ۲ ص ۲۴۵ باب المعجزات)

حضرت جابر ﷺ فرماتے ہیں کہ ایک شخص نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے طعام طلب کیا تو نبی کریم ﷺ نے انہیں نصف وسق (ایک سو بیس کلو تقریباً) جو دیئے۔ وہ شخص اور ان کی زوجہ اور ان دونوں کے مہمان کھاتے رہے، یہاں تک کہ ایک دن انہوں نے ان کو کیل کر لیا (ماپ لیا) وہ صحابی نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے فرمایا اگر تم ان کا (جو کے دانوں کا) کیل نہ کرتے تو وہ ہمیشہ کے لئے قائم رہتے تم کھاتے رہتے (وہ کبھی ختم نہ ہوتے)۔

ان دونوں حدیثوں کے متعلق علامہ نووی رحمہ اللہ بیان فرماتے ہیں:

"ان عصرها وکیله مضاد للتسلیم والتوکل علی رزق الله تعالیٰ ویتضمن التدبیر والاخذ بالحول والقوة وتکلف الا حاطة باسرار حکم الله تعالیٰ وفضله فعوقب فاعله بزواله" (نووی)

اس عورت کے برتن کو نچوڑنے اور اس شخص کے کیل کرنے سے رب تعالیٰ کے رزق عطا کرنے پر توکل اور تسلیم اٹھ گئے، اپنی تدبیر کو درمیان میں دخل انداز کر دیا گیا تمام امور کو رب تعالیٰ کی طرف سپرد کرنا تھا کہ اسی کی عطا کردہ قوت سے کسی چیز کا حصول ہوتا ہے اور وہی کسی چیز کو دور کرے تو وہ چیز دور ہوتی ہے، لیکن انسان جب اپنے آپ

پر بھروسہ کرے اور یہ کوشش کرے کہ میں اللہ تعالیٰ کے فضل اور اس کے علم کے اسرار کا احاطہ کر سکتا ہوں تو اس شخص کو بطور سزا اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے محروم کر دیتا ہے۔

☆ "عن جابر قال انا یوم الخندق نحضر فعرضت کدیة شدیدة فجاؤا النبی ﷺ فقالوا هذه کدیة عرضت فی الخندق فقال انا نازل ثم قام وبطنه معصوب بحجر ولبثنا ثلاثة ایام لا نذوق ذواقا فاخذ النبی ﷺ المعول فضرب کثیبا اهیل فانکفأت الی امرأتی فقلت هل عندک شئی فانی رأیت بالنبی ﷺ خمصا شدیدا فاخرجت جرابا فیه صاع من شعیر ولنا بهمة داجن فذبحتها وطحنت الشعیر حتی جعلنا اللحم فی البرمة ثم جئت النبی ﷺ فساررته فقلت یا رسول الله ذبحنا بهیمة لنا وطحنت صاعا من شعیر فتعال انت ونفرمعک فصاح النبی ﷺ یا اهل الخندق ان جابرا صنع سورا فحی هلابکم فقال رسول الله ﷺ لا تنزلن برمتک ولا تخبزن عجینکم حتی اجئی وجاء فاخرجت له عجینا فبصق فیه وبارک ثم عمد الی برمتنا فبصق وبارک ثم قال ادعی خابزة فلتخبز معک واقدحی من برمتکم ولا تنزلوها وهم الف فاقسم بالله لا کلوا حتی ترکوه وانحرفوا وان برمتنا لتغلط کما هی وان عجیننا لیخبز کما هو" (بخاری، مسلم مشکوة باب فی المعجزات)

حضرت جابر ؓ فرماتے ہیں ہم غزوہ خندق کی کھدائی کر رہے تھے ایک شدید چٹان آ گئی (جس میں کوئی کدال وغیرہ اثر نہیں کر رہی تھیں) صحابہ کرام نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو خندق میں آنے والی چٹان کا ذکر فرمایا آپ نے فرمایا میں خود اس خندق میں اترتا ہوں۔ آپ جب خندق میں اتر کر کھڑے ہوئے تو آپ کے پیٹ پر پتھر باندھا ہوا تھا، (حضرت جابر کہتے ہیں) ہم نے بھی تین دنوں سے کچھ نہیں کھایا تھا، نبی کریم ﷺ نے کدال کو لیا اور اس چٹان پر مارا، ایک ہی ضرب سے وہ چٹان (سخت پتھر) ریت کی طرح ریزہ ریزہ ہو کر ٹوٹ گیا۔ میں اپنے گھر اپنی زوجہ کے پاس آیا، میں نے کہا تمہارے پاس کوئی چیز ہے؟ میں نے نبی کریم ﷺ کو بہت بھوک میں مبتلاء دیکھا۔ تو میری زوجہ نے ایک تھیلا نکالا جس میں ایک صاع (چار کلو) جو کے دانے تھے۔ اور ہمارا ایک بکری کا بچہ تھا (جو چھ ماہ سے کم عمر کا تھا) میں نے بکری کے بچے کو ذبح کیا اور میری زوجہ نے جو کا آٹا بنایا۔ یہاں تک کہ ہم نے گوشت کو ہنڈیا میں ڈالا، پھر میں نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا میں نے آپ سے آہستہ کان میں عرض کیا یا رسول اللہ ہم نے بکری کا ایک بچہ ذبح کیا اور ایک صاع جو کا آٹا تیار کیا آپ بھی آ جائیں اور آپ کے ساتھ کچھ اور حضرات بھی (جن کو یہ کھانا پورا ہو سکے) نبی کریم ﷺ نے بلند آواز سے اعلان

فرمایا، اے اہل خندق بیشک جابر نے دعوت کی ہے سب جلدی چلو۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا اپنی ہنڈیا کو چولہے سے نہ اتارنا اور اپنے آٹے سے روٹیاں نہ پکانا یہاں تک کہ میں آ جاؤں نبی کریم ﷺ تشریف لے آئے میں نے آپ کے پاس آٹا پیش کیا آپ نے اس میں لعاب ڈالا اور برکت کی دعا کی۔ پھر آپ ہنڈیا کے پاس آئے اس میں لعاب ڈالا اور برکت کی دعا کی۔ پھر آپ نے حضرت جابر کی زوجہ کو فرمایا روٹی پکانے والی کوئی اور بھی بلا لو جو تمہارے ساتھ مل کر روٹی پکائے اور ہنڈیا سے گوشت پیالوں میں ڈالو، لیکن ہنڈیا کو نہ اتارو۔ صحابہ کرام ایک ہزار کی تعداد میں تھے، قسم ہے اللہ تعالیٰ کی تمام سیر ہو کر کھا کر چلے گئے کھانا بقیہ چھوڑ کر چلے گئے بیشک ہماری ہنڈیا اسی طرح جوش مار رہی تھی بیشک ہمارے آٹے سے روٹیاں پک رہی تھیں آٹا اسی طرح موجود تھا۔

حدیث پاک کی وضاحت:

نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام نے بہت مشکلات برداشت کیں تین تین دن تک سیر ہو کر کھانا نہیں کھایا بلکہ مدینہ طیبہ میں تین دن تک دو وقت سیر ہو کر گندم کی روٹی کھانا نبی کریم ﷺ سے ثابت نہیں۔

آج بات بات پر جہلاء جب یہ پوچھتے ہیں کہ یہاں دعاء نبی کریم ﷺ نے کی تھی۔ یہ کام نبی کریم ﷺ نے کیا تھا؟ تو مجھے ان جہلا کی قسمت پر افسوس ہوتا ہے کہ کتنے بدقسمت ہیں کہ ان کو علم کی ہوا بھی نہیں لگی۔ یہ تو پوچھتے ہیں کہ جنازہ کے بعد نبی کریم ﷺ نے دعاء کی تھی؟ فرض نماز کے بعد دعاء کی تھی؟ تمام نماز کے مکمل ہونے کے بعد اجتماعی دعا کی تھی، لیکن یہ نہیں پوچھتے کہ نبی کریم نے ﷺ ایک دن میں تین تین وقت کھانا کھایا تھا؟ کیا آپ نے فاخرانہ لباس پہنا تھا، کیا آپ نے گاڑیوں پر سفر کیا تھا کیا آپ نے ہوائی جہاز پر سفر کیا تھا۔ اگر یہ کام نہیں کیے تھے تو نا جائز ہیں۔

یہ سوال نہیں کرتے، یہ کریں بھی تو کیوں کریں ان چیزوں کو تو وہ ختم نہیں کر سکتے، ان کو ختم کرنے سے ان کے نخرے ختم ہو جاتے ہیں، وہ اپنا فاخرانہ انداز ختم کر دیں یہ تو نہیں ہو سکتا۔ بھوکے رہ کر کمزور ہو جائیں، یہ تو نہیں ہو سکتا، سبحان اللہ صرف نیکی کے کاموں سے روکنا ان کا کام ہے سیدھے سادھے عوام کو دھوکا دینا ان کا وطیرہ ہے۔

☆ نبی کریم ﷺ کا عظیم معجزہ ظاہر ہوا کہ تمام صحابہ کرام جس پتھر کو توڑنے سے عاجز آ گئے جس پتھر کو

توڑنے میں کوئی آلہ کام نہیں کر رہا تھا، اس پتھر کو کدال کی ایک ضرب سے ریت کی طرح ریزہ ریزہ کر دینا نبی کریم ﷺ کا عظیم معجزہ ہی تو تھا۔

☆ حضرت جابر رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو کہتے ہیں " فساررتہ " میں نے آپ سے سرگوشی کی اس سے پتہ چلا کہ بوقت ضرورت جماعت میں سے کسی ایک سے علیحدگی میں گفتگو کرنا جائز ہے۔

☆ انہوں نے نبی کریم ﷺ کو بتایا کہ ہم نے ایک صاع جو کا آٹا تیار کیا ہے۔ مقصد اس بتانے میں یہ تھا " ان هذا قدر يسير واصحابک کسير " بیشک یہ تھوڑی مقدار میں کھانا ہے آپ کے اصحاب بہت تعداد میں ہیں۔ اس لئے آپ اتنے صحابہ کو ساتھ لے کر آئیں جن کو یہ کھانا کفایت کر جائے۔

☆ نبی کریم ﷺ نے جب ایک ہزار کی تعداد صحابہ کرام کو دعوت دے دی تو آپ کو یہ علم حاصل تھا کہ چار کلو جو کا آٹا اور ایک بکری کے بچے کا گوشت ان تمام کو کفایت کر جائے گا۔ کیونکہ اس میں برکت آجائے گی جو قلیل ہونے کے باوجود کثیر کو کفایت کرے گا۔

☆ نبی کریم ﷺ کے لعاب مبارک میں اتنی عظیم برکت تھی کہ تھوڑا آٹا بڑھ گیا اور تھوڑا گوشت بڑھ گیا۔ آج کل کے یہودیوں کے ایجنٹ جوایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں۔ اور یہ ثابت کرنے کی بھرپور کوشش کر رہے ہیں کہ نبی کریم ﷺ ایک عام انسان ہی تو تھے ...... معاذ اللہ۔

ان بیہودہ لوگوں سے میں پوچھتا ہوں تمہارے تھوک میں بھی یہ کمال ہے؟ ذرا کھانے میں تھوک کر تو دیکھو، اس کھانے کو کھانے والے تمہارے منہ پر تھپڑ لگائیں گے کہ تم نے سارا کھانا ہی برباد کر دیا ہے۔ حدیث شریف میں ذکر ہے "وبارک " اس کا معنی بیان کرتے ہوئے ملا علی قاری رحمہ اللہ بیان فرماتے ہیں:

" ای ودعا بالبركة فيه " آپ نے آٹے اور گوشت میں برکت کی دعا فرمائی۔

سبحان اللہ اسی سے ایک اور مسئلہ حل ہو گیا آج کل ایصال ثواب کے لئے کھانا سامنے رکھ کر دعاء کی جائے تو جہلاء کو یہی کہتے ہوئے سنتے ہیں نبی کریم ﷺ نے یہ نہیں کیا۔ کاش کہ وہ احادیث کا مطالعہ

کریں تو انہیں سمجھ آ جائے کہ نبی کریم ﷺ نے کھانا سامنے رکھ کر اس میں برکت کی دعاء کی اب آپ ہی بتائیں وہ کھانا حرام ہوا تھا یا کہ برکت والا ہوا تھا۔

اس پر جہلاء کی جانب سے ایک اور عجیب سوال ہوتا ہے جو ان کی حماقت پر دلالت کرنے کے ساتھ ساتھ نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام کی گستاخی پر دلالت کرتا ہے وہ سوال یہ کیا جاتا ہے کہ جس کھانے کو سامنے رکھ کر قرآن پاک پڑھا گیا اس کی ہڈیاں اور چھلکے بھی بابرکت ہو جائیں گے ان کو تم کھاتے کیوں نہیں، ان کو پھینکتے کیوں ہو؟

سبحان اللہ کیسا سوال؟ نبی کریم ﷺ نے کھانے کے پاس آ کر برکت کی دعا بھی کی لیکن ہڈیوں کو پھینکا بھی گیا۔ اگر یہ کہا جائے کہ نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام بمع ہڈیوں کے کھا گئے تھے تو یہ ان محترم حضرات کی شان میں درحقیقت گستاخی ہوگی۔

☆ صرف کھانے میں برکت نہیں ہوئی بلکہ پکانے والی دونوں عورتوں کو بھی برکت حاصل ہوئی کہ پکانے والی دو عورتیں، ادھر روٹی پکا رہی ہیں ادھر سالن برتنوں میں ڈال رہی ہیں، تھوڑے وقت میں ہزار آدمیوں کی روٹی تیار ہو جائے یہ معمولی کام نہیں۔ یہ صرف نبی کریم ﷺ کی دعاء کی برکت تھی۔

''لتغط'' کا معنی جو پیش کیا گیا ہے اس پر مرقاۃ کی عبادت مدنظر رہے:

(لتغط) بكسر الغين المعجمة وتشديد الطاء المهملة اى لتفور وتغلي ويسمع غليانها" (ماخوذ از مرقاۃ ج ۱۱ ص ۱۲۹ بزيادة)

تنبیہ: نبی کریم ﷺ کے کثیر معجزات میں سے دو تین مثالیں اس لئے پیش کیں تاکہ دینی مدارس کی چھوٹی کلاسوں کے طلباء کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزات کے ساتھ ساتھ نبی کریم ﷺ کے معجزات بھی ذہن نشین ہوتے چلے جائیں تاکہ عظمت مصطفیٰ ﷺ دلوں میں جاگزین ہو جائے۔

☆☆☆

﴿ وَاِذۡ قُلۡنَا ادۡخُلُوۡا هٰذِهِ الۡقَرۡيَةَ فَكُلُوۡا مِنۡهَا حَيۡثُ شِئۡتُمۡ رَغَدًا وَّادۡخُلُوا الۡبَابَ سُجَّدًا وَّقُوۡلُوۡا حِطَّةٌ نَّغۡفِرۡ لَكُمۡ خَطٰيٰكُمۡ وَسَنَزِيۡدُ الۡمُحۡسِنِيۡنَ ﴾

۱) ''اور جب ہم نے فرمایا اس بستی میں جاؤ پھر اس میں جہاں چاہو بے روک ٹوک کھاؤ، اور دروازے میں سجدہ کرتے داخل ہو اور کہو ہمارے گناہ معاف ہوں، ہم تمہاری خطائیں بخش دیں گے اور قریب ہے کہ نیکی والوں کو اور زیادہ دیں''۔

۲) ''اور جب ہم نے کہا داخل ہو جاؤ اس بستی میں، تو کھاؤ اس سے جہاں سے تم چاہو'' بغیر کسی رکاوٹ کے، اور داخل ہو تم دروازے میں سجدہ کرتے ہوئے، اور کہو ہمارے گناہ معاف فرما ہم بخش دیں گے تمہارے گناہ اور قریب ہے کہ ہم اور زیادہ دیں گے نیکی کرنے والوں کو''۔

اس آیۃ کریمہ اور آنے والی آیت کریمہ کا مختصر خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں میدان تیہ سے نکل کر ایک بستی میں داخل ہونے کا حکم دیا، اور ساتھ ہی یہ بھی حکم دیا کہ جب تم اس میں داخل ہو تو عجز وانکساری سے سجدہ کرتے ہوئے داخل ہونا اور زبان سے '' حطة '' (ہمارے گناہ معاف ہوں) کہنا لیکن قوم نے اپنی سابقہ روایات کو برقرار رکھتے ہوئے سرکشی سے سجدہ کرتے ہوئے داخل ہونے کے بجائے اپنی سرینوں کے بل گھسٹتے ہوئے داخل ہونا اختیار کیا اور '' حطة '' کہنے کی جگہ ''حنطة'' (ہمیں گندم چاہئے) کہا۔ ان کی سرکشی اور حدود سے تجاوز کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے طاعون کا عذاب بھیجا جس سے وہ چوبیس ہزار کی تعداد میں مر گئے۔ (از کبیر)

وہ بستی کون سی تھی؟ بعض حضرات نے کہا کہ وہ بستی بیت المقدس تھی۔ لیکن قاضی بیضاوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ بیت المقدس نہیں:

'' فانهم لم يدخلوا بيت المقدس في حياة موسى عليه السلام ''

کیونکہ بنی اسرائیل موسیٰ علیہ السلام کی زندگی میں بیت المقدس میں داخل نہیں ہوئے۔

اس لئے کہ میدان تیہ میں ہی حضرت ہارون علیہ السلام فوت ہوئے۔ اور ایک سال بعد میدان

تیہ میں ہی حضرت موسیٰ علیہ السلام فوت ہوئے۔ (بیضاوی، شیخ زادہ)

بیت المقدس کا قول کرنے والوں کو غلط فہمی اس لئے ہوئی کہ وہاں ایک دروازہ ہے جس میں سے لوگ داخل ہو کر اپنے گناہوں کی معافی طلب کرتے ہیں اس کا نام " حطة " ہے اسی وجہ سے یہ سمجھ لیا گیا کہ شائد بنی اسرائیل کو اسی دروازہ سے داخل ہونے کا حکم دیا گیا ہے، حالانکہ موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں بیت المقدس کی تعمیر یا دروازہ کا نام " حطة " تھا ہی نہیں۔ (از عزیزی)

راقم نے تذکرۃ الانبیاء میں تحریر کیا ہے جب موسیٰ علیہ السلام کی زندگی کا واقعہ مراد لیا جائے تو بستی سے مراد " اریحا " ہوگی کیونکہ موسیٰ علیہ السلام بیت المقدس میں داخل نہیں ہوئے اگر بیت المقدس مراد لیا جائے تو یہ واقعہ حضرت ہارون علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زندگی کے بعد حضرت یوشع کے زمانہ سے متعلق ہوگا۔

مختلف کتب کے مطالعہ سے خصوصاً شیخ زادہ سے شاندار محاکمہ سمجھ میں آتا ہے کہ " اریحا " بیت المقدس کے مضافات سے ہے لہٰذا یہاں جس بستی کا ذکر ہے وہ اور جس کا " یقوم ادخلوا الارض المقدسة " میں ذکر ہے ایک ہی ہے۔ اسی طرح اور بات یہ سمجھ آتی ہے کہ انہوں نے مطالبہ تو موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں کیا تھا کہ ہمیں اس میدان تیہ سے نکال کر ایسی بستی میں داخل کر دیا جائے جہاں ہم کھیتی باڑی کریں، ان سے وعدہ موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں کر دیا گیا تاہم ان کو اس بستی میں داخل ہونے کا حکم حضرت یوشع علیہ السلام کے زمانہ میں دیا گیا۔ (واللہ اعلم بالصواب)

حضرت پیر محمد کرم شاہ رحمہ اللہ نے بہت خوب بیان کیا کہ اس تاریخی پہلو میں الجھنے کی ضرورت ہی نہیں بلکہ قرآن پاک کے اصل مقصود کو دیکھا جائے آپ فرماتے ہیں:

> "ایک چیز قرآن کا مطالعہ کرتے وقت ہمیشہ پیش نظر رہنی چاہیے وہ یہ ہے کہ قرآن جن واقعات کا ذکر کرتا ہے اس سے مقصود صرف عبرت و موعظت ہوتی ہے، اس سے واقعہ کی تاریخی حیثیت کا بیان مطلوب نہیں ہوتا، اس لئے قرآن ان واقعات کے صرف ان پہلوؤں کو بیان کرتا ہے جن میں درس عبرت ہو۔ عموماً غیر ضروری تفصیلات کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے، جو لوگ قرآن حکیم کی اس خصوصیت کو ملحوظ نہیں رکھتے وہ قصص قرآنی میں تاریخی کتب کی طرح تفصیلات کا تسلسل اور زمان و مکان کا تعین نہیں پاتے تو وہ طرح طرح کے شکوک و شبہات میں مبتلا ہو جاتے ہیں" (ضیاء القرآن)

﴿ سُجَّدًا ﴾: بعض مفسرین نے یہاں لغوی معنی مرادلیا ہے کہ شہر میں داخل ہونا، جھکتے ہوئے، عاجزی کرتے ہوئے جس طرح رکوع کرنے والے جھکتے ہیں۔اور بعض حضرات نے سجدہ کا شرعی معنی مراد لیا ہے کہ تم شہر میں داخل ہوتے وقت (پہلے میدان تیہ سے نکلنے کی وجہ سے اور تمہاری دعا کے قبول ہونے کی وجہ سے (کہ ہمیں یہاں سے نکال) تمہیں چاہئے کہ) پہلے سجدہ شکر بجالاؤ پھر اس بستی میں داخل ہو۔

خیال رہے قریہ کو قریہ اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ لوگوں کے جمع ہونے کہ جگہ ہے جس طرح کہا جاتا "قریت الماء" میں نے پانی جمع کیا۔اس لئے قریہ زیادہ طور پر بستی، دیہات پر بولا جاتا ہے، لیکن کبھی صرف لغوی معنی کا اعتبار کرتے ہوئے شہر کو بھی قریۃ کہہ لیا جاتا ہے۔

﴿ وَّقُوْلُوْا حِطَّةٌ ﴾: "ای حط عنا خطایانا ، امروا بالاستغفار ، وقال ابن عباس قولوا لا اله الا الله لانها تحط الذنوب"

یعنی "حطة" کا مطلب یہ ہے کہ اے اللہ ہمارے گناہ معاف فرما، ان کو استغفار کا حکم دیا گیا حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں ان کو حکم دیا گیا کہ تم "لا الہ الا اللہ" کہتے ہوئے اس بستی میں داخل ہونا کیونکہ اس کلمہ کے پڑھنے سے گناہ معاف ہوتے ہیں۔ بظاہر وہم ہوتا ہے کہ "حطة" کا مطلب تو صرف معاف کرنا ہے۔گناہوں کا ذکر کیسے ہے تو اس کا جواب دیا گیا کہ ایک وجہ تو یہ ہے کہ جب ان کو حکم دیا گیا تم یہ کہو تو اس سے مطلب ان کی خطائیں اور گناہ ہی ہوسکتے ہیں۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ آگے آنے والے الفاظ گرامی اس پر قرینہ ہیں کہ مراد گناہ ہی ہیں کیونکہ اس کے بعد فرمایا:

> " (نغفرلكم خطايا كم) اى نسترها عليكم من الغفر وهو الستر لان المغفرة تستر الذنوب "
>
> ہم تمہارے گناہوں کی مغفرت کریں گے، یعنی ان کو چھپا کر ان پر قلم عفو پھیر دیں گے کیونکہ غفر کا معنی ہے ڈھانپنا۔

(وسنزيد المحسنين) نیکی کرنے والوں کو عنقریب اور زیادہ دیں گے اس سے مراد ثواب ہے۔ عنقریب سے مراد قیامت ہے، کیونکہ بنسبت اخروی زندگی کے قیامت قریب ہی ہے۔(از خازن بتغير)

﴿فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا قَوْلًا غَيْرَ الَّذِي قِيْلَ لَهُمْ فَانْزَلْنَا عَلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ﴾

۱) "تو ظالموں نے اور بات بدل دی جو فرمائی گئی تھی اس کے سوا تو ہم نے آسمان سے ان پر عذاب اتارا بدلہ ان کے بے حکمی"

۲) "تو تبدیل کر دیا ان لوگوں نے جنہوں نے ظلم کیا قول (بات) کو اس کے غیر سے جو ان کو کہا گیا تھا۔ تو نازل کیا ہم نے ان لوگوں پر جنہوں نے ظلم کیا عذاب آسمانوں سے۔ بوجہ اس کے کہ وہ فسق کرتے تھے"۔

یعنی بنی اسرائیل کو جب یہ کہا گیا کہ تم اس بستی میں سجدہ کرتے ہوئے داخل ہو جاؤ اور حطۃ (گناہ معاف فرما) کہو لیکن انہوں نے رب تعالیٰ کے ارشاد کو بدل دیا " حبة من شعيرة " کہا یا کہ "حنطة" یعنی انہوں نے گناہوں کی معافی طلب کرنے کے بجائے، گندم کا مطالبہ کیا کہ ہمیں تو دانے چاہیں۔ رب تعالیٰ نے انہیں سجدہ کرتے ہوئے بستی کے دروازے میں داخل ہونے کا حکم دیا، لیکن وہ سرین کے بل گھسٹتے ہوئے داخل ہوئے۔

تو ان کے فسق کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان ظالموں پر عذاب بھیج کر ان کو تباہ و برباد کر دیا۔

﴿فَانْزَلْنَا عَلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا رِجْزًا﴾: اس مقام پر ﴿فَانْزَلْنَا عَلَيْهِمْ﴾ نہیں کہا (کہ ان پر نازل کیا بلکہ ﴿فَانْزَلْنَا عَلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا﴾ کہا اس لئے کہ ان کے معاملات کی زیادہ قباحت بیان کرنا مقصود تھا۔ اور دوسری وجہ یہ ہے کہ یہ بتانا مقصود ہے " ان انزال الرجز عليهم لظلمهم " کہ بیشک ان پر عذاب کا نازل ہونا ان کے ظلم کی وجہ سے تھا۔

رجز سے مراد کیا ہے؟ " ان الرجز هو العذاب " رجز سے مراد عذاب ہے، اس پر دلیل اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے ﴿وَلَمَّا وَقَعَ عَلَيْهِمُ الرِّجْزُ﴾ ای العقوبة " جب ان پر عذاب واقع ہوا۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ کے ارشاد ﴿ لَئِنْ كَشَفْتَ عَنَّا الرِّجْزَ ﴾ میں بھی ''رجز'' عذاب کے معنی میں استعمال ہے:

" وذكر الزجاج ان الرجز والرجس معناهما واحد وهو العذاب "

زجاج نے یہ بیان کیا ہے کہ '' رجز'' اور'' رجس'' دونوں کا معنی ایک ہے اور وہ ہے ''عذاب'' اور اللہ تعالیٰ کے ارشاد گرامی ﴿ وَيُذْهِبَ عَنكُمْ رِجْزَ الشَّيْطَانِ ﴾ میں '' رجز'' کا معنی شیطان کا وسوسہ اور کفر کی طرف بلانا، وہ بھی عذاب کا ہی سبب ہے۔

رجز سے مراد کون سا عذاب ہے؟ " لا دلالة فی الآية عليه " آیت کریمہ میں تو یہ ذکر نہیں کیا گیا کہ وہ کون سا عذاب ہے البتہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا ارشاد یہ ہے۔

" مات منهم بالفجأة اربعة وعشرون الفا فی ساعة واحدة "

ان میں ایک ہی گھڑی میں اچانک چوبیس ہزار لوگ مر گئے۔

" وقال ابن زيد بعث الله عليهم الطاعون حتى مات من الغداة الى العشى خمس وعشرون الفاو لم يبق منهم احد "

ابن زید رحمہ اللہ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے ان پر طاعون کی مرض کو بھیجا، یہاں تک کہ صبح سے شام تک پچیس ہزار کی تعداد میں مر گئے، اور ان میں سے کوئی ایک بھی نہ بچ سکا۔

ابن زید رحمہ اللہ کے قول کے مطابق یہ بھی واضح ہو رہا ہے کہ " فبدل الذين ظلموا منهم " میں " من " تبعیضیہ ہے یعنی جن لوگوں نے اللہ تعالیٰ کے ارشاد کو بدلا وہ سب عذاب میں گرفتار ہو کر تباہ و برباد ہو گئے۔ البتہ جن لوگوں نے اللہ تعالیٰ کے حکم کو نہیں بدلا وہ عذاب سے محفوظ رہے۔

﴿ بِمَا كَانُوا يَفْسُقُونَ ﴾ ''بوجہ اس کے کہ وہ فسق کرتے تھے'' " فالفسق هو الخروج المضمر " پوشیدہ چیز کو نکالنا فسق ہے۔ اسی طرح پھل کے چھلکے سے نکلنے کیلئے بھی فسق کا لفظ استعمال کرتے ہیں جیسے کہا جاتا ہے "فسقت الرطبة " اور شرع میں فسق کا یہ معنی ہے

" الخروج من طاعة الله الى معصيته " اللہ تعالیٰ کی طاعت سے معصیت کی طرف نکلنا۔

اس آیہ کریمہ میں فسق سے مراد ان کا اپنی جانوں پر ظلم کرنا ہی مراد ہے۔

فائدہ : ابھی جن دو آیتوں کا ذکر ہوا۔ اسی مفہوم کو سورۃ اعراف میں بھی ذکر کیا گیا ہے کچھ

الفاظ میں فرق ہے۔سورۃ اعراف میں اس طرح ذکر کیا گیا ہے:

﴿ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اسْكُنُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ وَكُلُوْا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ وَقُوْلُوْا حِطَّةٌ وَّادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطِيْٓـٰٔتِكُمْ سَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ ﴾

سوال اول: سورۃ بقرۃ میں ذکر ہوا " واذ قلنا " اور سورۃ اعراف میں ذکر ہوا " واذ قیل لھم" وجہ فرق کیا ہے؟

جواب: اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک کے اول میں صراحۃً ذکر کیا کہ اس قول کا کہنے والا اللہ تعالیٰ ہے اب بات واضح ہوگئی اس میں کوئی ابہام (پوشیدگی) باقی نہ رہی۔ چونکہ اس سے پہلے رب تعالیٰ نے ذکر فرمایا:

﴿ اُذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ ﴾

جب رب تعالیٰ نعمتوں کو واضح طور پر اپنی طرف منسوب فرمایا کہ ''یاد کرو میری نعمتوں کو جو میں نے تم پر انعام فرمائی ہیں'' تو ان نعمتوں کی تفصیل ذکر کرتے ہوئے بھی اپنی طرف ہی مناسب تھا لیکن سورۃ اعراف میں کوئی ابہام باقی نہ رہا تھا اس لئے فرمایا " واذاقیل " (اور جب ان کو کہا گیا)۔

سوال دوم: سورۃ بقرہ میں ذکر ہوا " واذ قلنا ادخلوا " (اور جب ہم نے کہا داخل ہو جاؤ) اور سورہ اعراف میں ذکر ہوا " واذاقیل لھم اسکنوا " اور جب ان کو کہا گیا ٹھہرو، سکونت اختیار کرو۔ ایک جگہ داخل ہونے کا حکم دیا۔ اور دوسری جگہ رہنے کا حکم دیا ان دونوں میں وجہ فرق کیا ہے؟

جواب: مقصد دونوں چیزیوں کا حکم دینا تھا کیونکہ ان کے مطالبہ کو پورا کیا جار ہا تھا اس لئے حکم دیا گیا کہ اس بستی کے دروزہ سے سجدہ کرتے ہوئے داخل ہو جاؤ اور اسی میں سکونت اختیار کرلو۔ دخول چونکہ سکونت سے پہلے ہوتا ہے اس لئے پہلی سورۃ میں دخول کا حکم دیا، اور بعد میں آنے والی سورۃ میں سکونت کا حکم دیا گیا۔

سوال سوم: سورۃ بقرہ میں ذکر کیا گیا " فکلوا " اس میں " فاء " ہے اور سورۃ اعراف میں ذکر کیا گیا " وکلوا " اس میں " واؤ " ہے یہ فرق کیوں کیا گیا؟

جواب: ہر وہ فعل جس کا عطف کسی چیز پر ہو، وہ فعل شرط کے درجہ میں ہو اور وہ چیز جزاء کے درجہ میں ہو وہاں فاء کا ذکر ہوتا ہے لیکن معطوف اور معطوف علیہ میں اگر شرط اور جزا کا درجہ نہ پایا

جائے تو وہاں فاء کوذکر نہیں کیا جاتا بلکہ واؤ کوذکر کیا جاتا ہے۔

سورۃ بقرہ میں ہے:﴿ وَاِذْ قُلْنَا ادْخُلُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ فَكُلُوْا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ رَغَدًا﴾ اس کوشرط وجزاء کا درجہ حاصل ہے۔اصل مفہوم یہ ہوگیا" ان دخلتموها اكلتم منها " اگرتم اس بستی میں داخل ہو گئے تو اس سے کھانا جوتم چاہو بلا روک ٹوک کے۔

لیکن سورۃ اعراف میں ذکر کیا گیا:﴿ وَاِذْ قِيْلَ لَهُمُ اسْكُنُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ وَكُلُوْا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ ﴾ اس میں شرط وجزاء کی حیثیت نہیں۔یہ نہیں کہا گیا کہ تم اس بستی میں رہتے ہوئے ہی اس کے پھل کھا سکتے ہو۔ بلکہ حکم یہ تھا کہ اس بستی میں رہو، چاہو تو باغات میں جا کر وہاں ہی پھل کر پھر واپس بستی میں لوٹ آؤ، اور چاہو تو باغات سے پھل توڑ کر بستی میں لے آؤ اور بستی میں رہ کر کھاؤ۔اس لئے سورۃ اعراف میں " واؤ " سے عطف کیا گیا اور " فاء " سے عطف نہیں کیا گیا۔

سوال چہارم: سورۃ بقرۃ میں کہا گیا ﴿ نَغْفِرْ لَكُمْ خَطٰيٰكُمْ ﴾ اور سورۃ اعراف میں ذکر ہے ﴿ نَغْفِرْ لَكُمْ خَطِيْئٰتِكُمْ ﴾ اگر چہ دونوں جمع کے صیغے ہیں لیکن علیحدہ علیحدہ جمع کے صیغے ذکر کرنے کا کیا مطلب؟

جواب: خطایا جمع کثرت ہے اور خطیئات جمع سالم ہے جو بغیر الف لام کے جمع قلت ہے۔سورۃ بقرہ میں جب رب تعالیٰ نے صراحۃً اپنی طرف نسبت کی " واذ قلنا ادخلو " کہا تو یقیناً اپنے جود وکرم کے لائق لفظ کو ذکر کیا کہ تم کتنے بھی کثیر گناہ کرو مجھ سے معافی طلب کرو تو میں کثیر گناہوں کو بھی معاف کر دیتا ہوں اس لئے یہاں جمع کثرت کا صیغہ ذکر کیا گیا۔اور سورۃ اعراف میں صراحۃً اپنی طرف نسبت نہیں کی بلکہ کہا﴿ وَاِذْ قِيْلَ لَهُمْ ﴾ (اور جب ان کو کہا گیا) اس لئے جمع قلت کو ذکر کر دیا گیا۔

حاصل کلام یہ ہے کہ جب فاعل کا صراحۃً ذکر کیا گیا تو اس کے کرم کے مناسب کثیر خطاؤں کی مغفرت کا ذکر کر دیا گیا۔اور جب فاعل کا صراحۃً ذکر نہیں کیا گیا تو جمع قلت کو ذکر کر دیا گیا۔یا دوسرے لفظوں میں یوں کہہ دیا جائے کہ ایک جگہ جمع کثرت ذکر کر کے، دوسری جگہ جمع قلت ذکر کر کے یہ بتا دیا گیا کہ خواہ کثیر گناہ ہوں یا قلیل ہوں سب رب تعالیٰ ہی معاف کرتا ہے اسی کی طرف ہر حال میں رجوع کیا جائے۔

سوال پنجم: سورۃ بقرہ میں " رغدا " ذکر کیا اور سورۃ اعراف میں " رغدا " مذکور نہیں فرق کی وجہ کیا ہے؟

جواب: اس کا جواب بھی وہی ہے جو ابھی سوال چہارم کا ذکر کیا کہ رب تعالیٰ نے سورۃ بقرہ اپنی طرف صراحۃً نسبت کی تو عظیم انعام کا ذکر کیا۔ یعنی " رغدا " ذکر کر دیا گیا۔ اور سورۃ اعراف میں اپنی طرف صراحۃً نسبت نہیں کی تو " رغدا " ذکر نہیں کیا۔

" رغدا " کا معنی ہے بلا روک ٹوک، بافراغت، عیش وعشرت وغیرہ، یہ انعام کی عظمت پر دلالت کر رہا ہے۔

سوال ششم: سورۃ بقرہ میں ذکر کیا گیا ﴿ وَادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَقُوْلُوْا حِطَّةٌ ﴾ اور سورۃ اعراف میں ذکر کیا گیا ﴿ وَقُوْلُوْا حِطَّةٌ وَادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا ﴾ اس تقدیم وتاخیر کی وجہ کیا ہے؟

جواب: واؤ مطلقاً جمع کے لئے آتی ہے ترتیب پر دلالت نہیں کرتی، اس لئے دونوں کا مطلب ایک ہی ہے تاہم حکمت یہ ہوسکتی ہے کہ بنی اسرائیل میں بعض لوگ گنہگار تھے اور بعض لوگ گنہگار نہیں تھے۔ جو لوگ گنہگار نہیں تھے ان کو عبادت کرنے کا پہلے حکم دیا گیا اور فرمایا گیا:

﴿ وَادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا ﴾ "دروازے میں سجدہ کرتے ہوئے داخل ہو"۔

پھر ان کو کہا گیا:

﴿ وَقُوْلُوْا حِطَّةٌ ﴾ "اور تم کہو ہمارے گناہ معاف کر"۔

یہ توبہ کرنے کا ان کو حکم اس لئے دیا گیا کہ ان میں عجز پایا جائے اور اپنے عبادت پر ناز نہ کریں۔ اور جو لوگ گنہگار تھے ان کو توبہ کرنے کا پہلے حکم دیا گیا۔ اور کہا گیا ﴿ وَقُوْلُوْا حِطَّةٌ ﴾ اور پھر ان کو عبادت کرنے کا حکم دیتے ہوئے فرمایا گیا:

﴿ وَادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا ﴾

سوال ہفتم: سورۃ بقرۃ میں ﴿ وَسَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ ﴾ ذکر کیا گیا جس میں "واؤ" ہے اور سورۃ اعراف میں ﴿ سَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ ﴾ مذکور ہے جس میں "واؤ" نہیں وجہ فرق کیا ہے؟

جواب: دونوں سورتوں میں علیحدہ علیحدہ طریقہ اختیار کر کے دو ضابطوں کی طرف اشارہ کر دیا گیا کہ کبھی

دو یا دو سے زیادہ چیزوں کو ذکر کر کے ان کے اوپر اسی طرح دو یا دو سے زیادہ احکام مرتب کر کے مجموع پر مجموع حکم مرتب ہوتا ہے۔ اور کبھی علیحدہ علیحدہ اعتبار کر کے علیحدہ علیحدہ احکام کو مرتب کیا جاتا ہے سورۃ بقرہ میں دو چیزوں کا ذکر کیا گیا ہے، دروازے میں سجدہ کرتے ہوئے داخل ہونے کا حکم، اور گناہوں کی معافی طلب کرنا، ان دونوں چیزوں کے مجموعہ پر دو چیزوں کا مجموعی حکم مرتب کیا، یعنی ہم تمہارے گناہ معاف کریں گے اور نیکی کرنے والوں پر زیادہ احسان کریں گے۔

سورۃ اعراف میں دوسرے ضابطہ کی طرف اشارہ فرمایا، کہ جو توبہ کرے گا، گناہوں کی معافی طلب کرے گا، ہم اس کے گناہ معاف کر دیں گے اور جو سجدہ کرتے ہوئے دروازہ میں داخل ہوں گے ہم ان نیکی کا کام کرنے والوں پر زیادہ احسان کریں گے۔ یعنی سورۃ اعراف میں علیحدہ علیحدہ چیزوں پر علیحدہ علیحدہ احکام مرتب فرمائے حقیقت بات ہی یہ ہے کہ عربی کے تمام قواعد ہی قرآن پاک کو دیکھ کر مرتب ہوئے۔

سوال ہشتم: سورۃ بقرۃ میں ذکر کیا گیا ﴿ فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا قَوْلًا ﴾ اور سورۃ اعراف میں ذکر فرمایا ﴿ فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ قَوْلًا ﴾ یعنی سورۃ بقرۃ میں " منهم " نہیں اور سورۃ اعراف میں " منهم " ہے وجہ فرق کیا ہے؟

جواب: سورۃ اعراف میں اس واقعہ کی ابتداء لفظ " من " سے ہے رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿ وَمِنْ قَوْمِ مُوْسٰى اُمَّةٌ يَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَبِهٖ يَعْدِلُوْنَ ﴾

اور موسیٰ کی قوم سے ایک گروہ ہے کہ حق کی راہ بتاتا ہے اور اسی سے انصاف کرتا ہے۔

یعنی اس آیۃ میں ذکر کیا گیا کہ موسیٰ علیہ السلام کی امت میں سے بعض لوگ یہ کرتے ہیں۔ پھر ان پر انعامات کی مختلف قسموں کا ذکر فرمایا، پھر ان کو جو اوامر دیئے گئے ان کا ذکر کیا گیا۔ اس واقعہ کے آخر میں پھر " من " ذکر فرمایا اور ارشاد ہوا: ﴿ فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ قَوْلًا ﴾ اسی طرح ابتداء اور انتہاء میں مناسبت پائی گئی۔ اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ رب تعالیٰ کے قول کو تبدیل کرنے والے بعض تھے تمام کے تمام بدلنے والے نہیں تھے۔

سورۃ بقرۃ میں پہلے بعض کا ذکر نہیں کیا گیا تو ﴿ فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ﴾ میں بھی " منهم " کو

ذکر نہیں کیا گیا۔اب وجہ فرق واضح ہوگئی۔

سوال نہم: سورۃ بقرہ میں ذکر کیا گیا ﴿ فَاَنْزَلْنَا عَلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا رِجْزًا ﴾ اور سورۃ اعراف میں ذکر فرمایا گیا: " فارسلنا " یعنی سورۃ بقرۃ میں " فانزلنا " اور سورۃ اعراف میں " فارسلنا " ذکر کیا گیا وجہ فرق کیا ہے؟

جواب: انزال کا مطلب ہے ابتدائی طور پر نازل کرنا، اور ارسال کا مطلب ہے مسلط کرنا یہاں تک کہ ان کو مکمل طور پر تباہ کردینا۔گویا کہ دونوں آیتوں سے مسئلہ کو واضح طور پر بیان کردیا گیا کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے خلاف ورزی کرنے والے اور اس کے قول کو بدلنے والے بنی اسرائیل پر رب تعالیٰ نے عذاب نازل کیا۔اور اس عذاب کو ان پر مسلط کر کے ان کو مکمل طور پر تباہ و برباد کردیا گیا۔

سوال دہم: سورۃ بقرۃ میں ذکر فرمایا ﴿ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ﴾ اور سورۃ اعراف میں ذکر کیا گیا ﴿ بِمَا كَانُوْا يَظْلِمُوْنَ ﴾ ان میں وجہ فرق کیا ہے؟

جواب: سورۃ بقرۃ میں ﴿ فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ﴾ سے ان لوگوں کا ظالم ہونا ذکر کیا گیا پھر ان کے متعلق ہی کہا ﴿ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ﴾ یعنی ان کا ظلم فسق تھا۔جب سورۃ بقرہ میں ان کا ظالم ہونا اور فاسق ہونا ذکر کردیا گیا، تو سورۃ اعراف میں صرف ان کے ظلم کے ذکر پر اکتفاء کردیا گیا۔

(ماخوذ از کبیر)

الفاظ کے تبدیل کرنے کے متعلق مسئلہ عظیمہ:

علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے اسی آیۃ کریمہ کی تفسیر میں اس عظیم بحث کو ذکر فرمایا ہے جس کا ذکر کرنا طلباء اور عوام کے لئے یکساں مفید ہے۔علماء کرام یقیناً پہلے سے ہی جانتے ہیں۔

" فان كان التعبد وقع بلفظها فلا يجوز تبديلها "

اگر ایسے کلمات ہوں جن کے معانی اور الفاظ دونوں مقصود ہوں یعنی الفاظ کا ادا کرنا عبادت ہو تو ان کو تبدیل کرنا جائز نہیں، کیونکہ رب تعالیٰ کے ارشادات کو تبدیل کرنے کی مذمت بیان کی گئی ہے۔جیسا کہ قرآن پاک کے الفاظ کو تبدیل کرنا جائز نہیں باوجود اس کے کہ قرآن پاک کے الفاظ کا مفہوم ادا ہو رہا ہو۔ہاں البتہ اگر وہ قرآن پاک کا صرف ترجمہ پیش کر رہا ہو۔ تو اس کے متعلق بھی احتیاط یہ ہے کہ یوں

نہ کہے "اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا" بلکہ یہ کہے اللہ تعالیٰ کے ارشاد گرامی کا ترجمہ یہ ہے۔

اسی طرح اذان کے الفاظ خود اللہ تعالیٰ کی طرف سے بواسطہ فرشتہ خواب میں صحابہ کرام کو القاء کیئے گئے ان میں بھی کوئی تبدیلی نہیں ہوسکتی۔

ایسے ہی نماز میں ثناء کا ادا کرنا، تشہد کا پڑھنا، دعاء قنوت کا پڑھنا بھی صرف ان الفاظ سے ہی ہوسکتا ہے جن کا ذکر احادیث میں ہے، ان کو تبدیل کرنا جائز نہیں۔ تاہم یہ خیال رہے کہ تشہد میں حدیث پاک میں مختلف الفاظ ملتے ہیں جو بھی پڑھے جائز ہے۔ البتہ بہتر وہی ہے جو ہم پڑھتے ہیں۔ یہی حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

"وان وقع بمعناها جاز تبدیلها بما یؤدی الی ذلک المعنی، ولا یجوز تبدیلها بما یخرج عنه"

اگر ایسے کلمات ہوں جن میں مقصد معانی ہوں، ان کو ایسے الفاظ سے تبدیل کرنا جائز ہے جن سے معانی مکمل طور پر حاصل ہوں، معانی نہ بدلیں، اگر معنی بدل رہا ہو تو ان الفاظ سے تبدیل کرنا جائز نہیں۔

البتہ امام اعظم ابوحنیفہ، امام مالک اور امام شافعی رحمہم اللہ اور ان کے متبعین تمام حضرات نے یہ شرط لگائی ہے کہ تبدیلی کا حق صرف ایسے عالم کو ہوسکتا ہے جو عربی زبان اور اس کے قواعد سے اچھی طرح باخبر ہو۔ ہاں البتہ یہ بھی ذہن میں رہے کہ بعینہ وہی الفاظ ادا کرنا جو احادیث میں وارد ہوں، بہتر ہے۔

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

"من سمع حدیثا فحدث به کما سمع فقد سلم"

جس شخص نے حدیث کو سنا اور اسی طرح بیان کیا جیسا سنا تو وہ یقیناً سلامتی میں رہا۔

"والقول بالجواز هو الصحیح ان شاء اللہ تعالیٰ"

تبدیل کرنے کے جواز کا قول ہی صحیح ہے ان شاء اللہ تعالیٰ۔

کیونکہ صحابہ کرام سے ایک ہی واقعہ کو مختلف الفاظ سے بیان کرنا عام طور پر ثابت ہے۔

واثلہ بن اسقع رضی اللہ عنہ کا قول اس پر شاہد ہے آپ فرماتے ہیں:

"لیس کل ما اخبرنا به رسول اللہ ﷺ نقلناه الیکم حسبکم المعنی"

نبی کریم ﷺ کے ارشادات کو ہم نے تمہاری طرف اس طرح نقل نہیں کیا کہ وہ الفاظ مبارکہ آپ کے ہی ہیں البتہ تمہیں معنی کافی ہے۔

یعنی ہم نے بہت جگہ نبی کریم ﷺ کے ارشادات کے مطالب کو بیان کیا۔ الفاظ ہمارے اپنے بھی ہو سکتے ہیں۔ حضرت زرارہ بن اوفی کہتے ہیں:

" لقیت عدة من اصحابه النبی ﷺ فاختلفوا علی فی اللفظ واجتمعو فی المعنی "

میں کئی صحابہ کرام کو ملا انہوں نے نبی کریم ﷺ کے ارشادات جو بیان فرمائے ان میں الفاظ اگرچہ مختلف تھے لیکن معانی سب کے ایک تھے۔

" وکان النخعی والحسن رحمهم الله یأتون بالحدیث علی المعانی "

حضرت نخعی حسن بصری اور شعبی رحمہم اللہ حدیث بالمعنی ذکر فرماتے تھے یعنی الفاظ مختلف ہوتے لیکن معانی میں اتفاق ہوتا۔

"وقال الحسن اذ اصبت المعنی اجزآک " حضرت حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں جب تمہیں معنی صحیح نظر آئے تو تمہارے لئے کافی ہے۔ یعنی حدیث پاک کے معنی کو مدنظر رکھا جائے، الفاظ بدل جائیں تو کوئی حرج نہیں:

" وقال وکیع رحمه الله ان لم یکن المعنی واسعا فقد هلک الناس "

حضرت وکیع رحمہ اللہ فرماتے ہیں اگر معنی میں وسعت نہ دی جاتی یعنی حدیث بالمعنی کے جواز کا قول اگر نہ پایا جاتا تو لوگ ہلاک ہو جاتے۔

اس لئے کہ بعینہ الفاظ کا یاد رکھنا تو بہت مشکل کام ہے البتہ مفہوم کو نہ بدلنے دیا جائے یہی روایت میں کافی ہے:

" واتفق العلماء علی جواز نقل الشرع للعجم بلسانهم وترجمته لهم وذالک هو النقل بالمعنی "

علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ شرع کو لوگ اپنی اپنی عجمی زبانوں میں بیان کر سکتے ہیں، اور عربی کا ترجمہ کر کے لوگوں کو بیان کر سکتے ہیں۔ جب عربی زبان میں الفاظ ادا کرنے کے بغیر عجمی میں ترجمہ جائز ہے تو یہ نقل بالمعنی ہی تو ہے۔

قرآن پاک میں پہلے لوگوں کے واقعات مختلف الفاظ سے بیان ہیں مفہوم سب کا ایک ہے:

☆ کچھ حضرات نے بیان کیا ہے کہ حدیث کے لفظ کو بدلنا درست نہیں۔ ان حضرات نے اپنے موقف پر یہ دلائل قائم کیے ہیں۔ نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی یہ ہے:

''نضر الله امرأ سمع مقالتی فبلغها کما سمعها''

اللہ تعالیٰ اسے خوش رکھے جس نے میرا کلام سنا اور اسی طرح آگے پہنچایا جیسا سنا۔

اس حدیث پاک سے واضح ہوا کہ جو الفاظ حضور ﷺ سے سنے ان کو اسی طرح آگے دوسروں تک پہنچائے۔ الفاظ کو تبدیل کرنا جائز نہیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کے ارشاد " فادا ها کما سمعها " کا مطلب یہ ہے "حکمها لا لفظها" کہ جو بات مجھ سے سنے اس کے حکم کو ایسے ہی ادا کرے جیسا کہ مجھ سے سنے۔ اس میں یہ ذکر ہی نہیں کہ الفاظ کو جیسا سنا بعینہٖ ایسے ہی ادا کرے۔

☆ ان حضرات کی دوسری دلیل یہ ہے کہ حضرات براء بن عازب کہتے ہیں بیشک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''جب تم سونے لگو تو وضو کرلو، جس طرح نماز میں وضو کیا جاتا ہے پھر دائیں کروٹ پر لیٹ جاؤ، پھر یہ پڑھو''

" اللهم انی سلمت وجهی الیک وفوضت امری الیک ولجأت ظهری الیک رغبة ورهبة الیک لا ملجأ ولا منجا منک الا الیک امنت بکتابک الذی انزلت ونبیک الذی ارسلت "

تمہارے کلام کے سب سے آخر میں یہی دعا ہو (یعنی دعا کے بعد پھر کوئی اور کلام نہ کرنا) پھر اگر تمہاری موت اسی رات کو آ گئی تو تمہاری موت فطرت (اسلامیہ) پر آئے گی۔

راوی کہتے ہیں میں نے آپ کے دعائیہ کلمات کو لوٹایا تاکہ مجھے یاد ہو جائیں، تو میں نے دعاء میں یہ پڑھا:

''امنت برسولک الذی ارسلت''

تو آپ نے فرمایا یہ پڑھو '' آمنت بنبیک الذی ارسلت ''(مسلم ج ۲ ص ۳۵۶ باب الدعاء عند النوم)

اس حدیث پاک سے دلیل یہ پیش کی گئی کہ حدیث پاک کے الفاظ کو بدلنا جائز ہوتا تو نبی کریم ﷺ اپنے صحابی کو منع نہ فرماتے۔ جب آپ نے وہی الفاظ پڑھنے کا حکم دیا جو آپ نے پڑھائے تھے تو پتہ چلا کہ الفاظ کو تبدیل کرنا مطلقاً جائز نہیں۔

اس کا جواب علامہ نووی رحمہ اللہ کے قول سے ہی دینا زیادہ مناسب رہے گا، آپ فرماتے ہیں:
کہ اس میں علماء کے مختلف اقوال ہیں، علامہ مازری وغیرہ نے یہ قول پسند فرمایا ہے کہ نبی کریم ﷺ کے انکار کا یہ مطلب تھا کہ یہ ذکر اور دعا ہے اسلئے دعائیہ کلمات اور اذکار میں ان الفاظ کو ہی ذکر کیا جائے جو حقیقت میں مذکور ہیں اور خصوصاً دعا پر یا ذکر پر اگر خاص ثواب وغیرہ کا ذکر ہو تو اسکا تعلق ان خاص الفاظ سے ہی ہوتا ہے جن کو ذکر کیا گیا ہو، اگر وہ الفاظ بدل جائیں تو وہ خصوصی حکم انکے ساتھ متعلق نہیں رہتا۔ (نووی)

☆ نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی:

" فرب حامل فقه غير فقيه ورب حامل فقه الى من هو افقه منه "

کتنے ہی فقہی مسائل کو دوسروں تک پہنچانے والے خود فقیہ نہیں ہوتے۔ اور کتنے ہی فقہی مسائل کو ان تک پہنچاتے ہیں جو ان سے بھی زیادہ فقیہ ہوتے ہیں۔

" ثم ان هذا الحديث بعينه قد نقل بالفاظ مختلفة والمعنى واحد "

اس حدیث پاک کو مختلف الفاظ سے بیان کیا گیا ہے لیکن معنی سب کا ایک ہے " **وذلک ادل دليل على الجواز** " یہ بہت بڑی دلیل ہے جس سے واضح ہو رہا ہے کہ معنی نہ بدلنے پائے تو الفاظ مختلف پیش کئے جا سکتے ہیں۔

اعتراض: اگر ایک راوی کو الفاظ بدلنے کی اجازت ہو، تو دوسرے اور تیسرے کو بھی اجازت ہوگی اس طرح تو حدیث کا مفہوم ہی بدل جائے گی کیونکہ دقیق اور مخفی فرق کو سمجھنا دشوار ہوتا ہے۔

جواب: " الجواز مشروط بالمطابقة والمساواة " الفاظ کو تبدیل کرنے کا جواز اس بات سے مشروط ہے کہ اصل الفاظ اور ان کی جگہ استعمال ہونے والے الفاظ میں مطابقت اور

مساوات پائی جائے۔ اس طرح اگر ایک راوی اور دوسرا اور تیسرا بھی الفاظ بدل دیں تو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ اگر فرق کر دیا گیا تو یہ جائز ہی نہیں۔

حضرت محی الدین ابن عربی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" الخلاف فی هذه المسئلة انما يتصور بالنظر الی عصر الصحابة والتابعين للتساويهم فی معرفة اللغة الجبلية الذوقية ، واما من بعدهم فلا نشک فی ان ذلک لا يجوز "

اس مسئلہ میں کہ الفاظ کو بدلنا جائز ہے یا جائز نہیں یہ اختلاف صحابہ کرام اور تابعین کے زمانہ تک محدود ہے، کیونکہ وہ لغت جبلیہ (پیدائشی طور پر اپنی عربی زبان میں مہارت) اور ذوقیہ میں سب برابر تھے۔ لیکن بعد کے لوگوں کے لئے جائز نہیں کیونکہ ان کی طبائع مختلف ہیں اور سمجھیں ایک دوسرے سے جداگانہ ہیں۔

اس قول کے متعلق علامہ قرطبی رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں: " وهذا هو الحق " یہی حق ہے۔

تاہم بعض علماء نے ہر زمانے میں جواز کا قول کیا ہے کہ جب شرط پائی جائے کہ مفہوم نہ بدلنے پائے تو الفاظ کا بدلنا ہر زمانہ میں جائز ہے۔ ہاں البتہ یہ بھی خیال رہے کہ بہتر یہی ہے کہ اصلی الفاظ ہی بیان کئے جائیں۔ بعض روایات میں صحابہ کرام اسی احتیاط کے پیش نظر دو دو لفظ ذکر کئے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے یہ فرمایا یا دوسرے الفاظ ذکر فرمائے۔

(ماخوذ از قرطبی بزیادة)

☆☆☆☆☆

﴿ وَاِذِ اسْتَسْقٰى مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ فَقُلْنَا اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا قَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا مِنْ رِّزْقِ اللّٰهِ وَلَا تَعْثَوْا فِى الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ﴾

۱) ''اور جب موسیٰ نے اپنی قوم کے لئے پانی طلب کیا تو ہم نے فرمایا اس پتھر پر اپنا عصا مارو، فوراً اس میں سے بارہ چشمے نکلے، ہر گروہ نے اپنا گھاٹ پہچان لیا، کھاؤ اور پیو خدا کا دیا اور زمین میں فساد اٹھاتے نہ پھرو''

۲) ''اور جب پانی طلب کیا موسیٰ نے اپنی قوم کے لئے، تو ہم نے کہا مارو اپنا عصا پتھر پر، تو جاری ہو گئے اس سے بارہ چشمے، تحقیق جان لیا ہر قبیلہ نے اپنے پینے کی جگہ کو، کھاؤ اور پیو اللہ کے رزق سے اور نہ حد سے بڑھو زمین میں فساد پھیلاتے ہوئے''

مختصر وضاحت:

میدان تیہ میں چھ لاکھ کی تعداد میں بارہ میل پر پھیلے ہوئے لشکر کو جب پیاس کی شدت محسوس ہوئی تو انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سامنے اپنی بے بسی کا ذکر کیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے رب تعالیٰ سے دعاء کی تو اللہ تعالیٰ نے آپ کی دعاء کو قبول کیا اور حکم دیا کہ اے موسیٰ اپنا عصا پتھر پر مارو، پانی جاری ہو جائے گا۔

آپ نے اپنا عصا پتھر پر مارا تو بارہ چشمے جاری ہو گئے، ہر قبیلے نے ایک ایک چشمہ اپنے لئے مختص کر لیا، پتھر سے جاری ہونے والا پانی اتنی بڑی تعداد کے لوگوں کے لئے کافی تھا، پتھر مکعب شکل کا تھا، اور ہر طرف سے تین تین چشمے جاری ہوئے یہ پتھر کوئی خاص معین تھا، یا کہ عام پتھر تھا اگر چہ اس میں مختلف اقوال تو ہیں لیکن صحیح یہی ہے کہ قرآن پاک میں کسی پتھر کو مختص جب نہیں کیا گیا تو وہ پتھر عام ہی تھا۔ (ابو سعود)

قدرے تفصیل:

یہاں سے مراد بنی اسرائیل پر ایک اور نعمت کا ذکر کیا جا رہا ہے یہ دین اور دنیا کی نعمتوں کی جامع نعمت ہے۔لیکن دنیا میں اللہ تعالیٰ نے ان کی پانی کی شدید حاجت کو دور فرما کر ان پر انعام کیا " ولو لا لهلكوا في التيه " اور اگر ان کو پانی نہ دیا جاتا تو وہ میدان تیہ میں ہلاک ہو جاتے، جیسا کہ ان کو ''من اور سلوی'' عطا کر کے ہلاکت سے بچایا گیا۔کیونکہ انسان کھانے پینے سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی اس کی وضاحت کر رہا ہے:

﴿ وَمَا جَعَلْنَاهُمْ جَسَدًا لَّا يَأْكُلُونَ الطَّعَامَ ﴾

''اور ہم نے انہیں خالی بدن نہ بنایا کہ کھانا نہ کھائیں''

اور رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿ وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ ﴾ ''اور ہم نے ہر چیز کو پانی سے زندگی عطا فرمائی''

بلکہ میدان تیہ میں ان کو پانی عطاء کرنا، عام عادت کے مطابق پانی عطا کرنے سے عظیم نعمت تھی، اس لئے کہ جب انسان جنگل میں ہو اور اسے پانی کی شدید حاجت ہو اس پر امید کے دروازے بظاہر بند ہوں، کہ وہ ایسی جگہ ہے جہاں پانی اور نباتات جیسی کوئی چیز نہیں، ایسے لوگوں کو جب عصا کے ذریعے پتھر سے پانی عطاء کر دیا گیا:

" فعلم ان هذه النعمة لا يكاد يعدلها شئى من النعم "

تو معلوم ہوا کہ ان کو تمام نعمتوں سے بڑی نعمت یہی نظر آئے گی۔اور میدان تیہ میں ان کو پانی حاصل ہونا دینی نعمت بھی ہے۔

" فلانه من اظهر الدلائل على وجود الصانع وقدرته وعلمه ومن اصدق الدلائل على صدق موسى عليه السلام "

اس لئے کہ موسیٰ علیہ السلام کے اس معجزہ سے اللہ تعالیٰ جو صانع ذات ہے اس کی قدرت اور عظم پر ظاہر دلائل پائے گئے ہیں اور موسیٰ علیہ السلام کی صداقت پر بہت بڑے سچے دلائل پائے گئے ہیں۔ (از کبیر)

خاص کر کے ایک پتھر کی طرف سے نکلنے والا پانی پچاس ہزار افراد پر مشتمل آدمیوں کو پورا ہو

جائے ، اور بارہ طرفوں سے نکلنے والے بارہ چشمے چھ لاکھ لوگوں کو پورے ہو جائیں ۔ اس سے بڑھ کر رب تعالیٰ کی قدرت اور نبی کی صداقت پر کوئی اور دلیل طلب کرے تو اس کی حماقت ہوگی۔

﴿ وَاِذِ اسْتَسْقٰی مُوْسٰی لِقَوْمِهٖ ﴾ : استقاء کا معنی ہے:

" طلب السقيا من المطر على عادة الناس اذا اقحطوا "

بارش سے پانی طلب کرنا جب لوگ قحط سالی میں مبتلا ہوں۔

البتہ یہاں مطلقاً پانی طلب کرنے کی دعاء اور التجاء مراد ہے ۔ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو نادر طریقہ سے پانی عطاء کر کے اپنی قدرت کاملہ کا اظہار فرمایا ، اور اپنے نبی کے معجزہ کو ظاہر کیا۔

﴿ فَقُلْنَا اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ ﴾ : " تو ہم نے کہا مارو اپنا عصا پتھر پر "

موسیٰ علیہ السلام کا عصا کیسا تھا؟ اس میں حضرت حسن بصری رحمہ اللہ کا قول یہ ہے:

" كانت عصا اخذها من بعض الاشجار " آپ کا عصا کسی عام درخت کا تھا۔

وقيل كانت من آس الجنة طولها عشرة اذرع على طول موسى ولها شعبتان تتقدان في الظلمة "

اور بعض حضرات نے کہا آپ کا عصا جنت کے ساگوان کے درخت کا تھا ، اس کی لمبائی دس ذراع (پندرہ فٹ) تھی جو موسیٰ علیہ السلام کے قد کے برابر تھی ۔ اور اس عصا کے آگے سے دو حصے تھے جو اندھیرے میں روشن ہو جاتے تھے۔

علامہ رازی رحمہ نے یہ ذکر کرنے کے بعد فرمایا ، کہ قرآن پاک سے اتنا ثابت ہے کہ وہ عصا بڑا تھا ، کیونکہ موسیٰ علیہ السلام نے اس عصاء کے متعلق رب تعالیٰ کے حضور عرض کیا " اتوكا عليها " میں اس پر ٹیک لگا لیتا ہوں ۔ اور موسیٰ علیہ السلام کے معجزہ سے وہ عصا بہت بڑا اژدہا بن گیا ۔ یہ اسی وقت ہو سکتا ہے کہ وہ عصا لمبا ہو اور اس میں موٹائی پائی گئی ہو۔

" وما زاد على ذلك فلا دلالة "

اور اس سے زیادہ کسی چیز کے ثبوت پر قرآن پاک نہیں دلالت کر رہا ...... واللہ اعلم بالصواب۔ (از کبیر)

وہ پتھر جس سے پانی موسیٰ علیہ السلام کے عصا مارنے سے نکلا ، وہ پتھر معین تھا یا کہ کوئی عام پتھر تھا ،

صحیح قول وہی ہے جو تفسیر ابی السعود سے پہلے نقل کیا جا چکا ہے کہ وہ عام پتھر تھا، معین نہیں تھا۔

جو حضرات معین پتھر مانتے ہیں وہ کہتے ہیں یہ وہ پتھر تھا جو موسیٰ علیہ السلام کے کپڑے لے کر بھاگا تھا جب آپ نے غسل کرتے وقت اس پر رکھے تھے، یہ وہاں آ کر رکا تھا جہاں بنی اسرائیل کے کئی لوگ موجود تھے، دراصل موسیٰ علیہ السلام سے اس عیب کو دور کرنا مقصود تھا جو آپ کے علیحدہ غسل کرنے پر بنی اسرائیل آپ پر لگاتے تھے کہ ان کے خصیتین میں ہوا بھری ہوئی ہے اس لئے یہ علیحدہ نہاتے ہیں بنی اسرائیل خود ایک دوسرے کے ساتھ مل کر نہاتے تھے۔

جو لوگ معین پتھر کا قول کرتے ہیں ان کی اور دلیل یہ ہے کہ " **الحجر** " ذکر ہے جس پر الف لام عہد خارجی ہے جو تعیین پر دلالت کرتا ہے، لیکن یہ دلیل قوی نہیں کیونکہ " **الف لام** " جنسی بھی ہوسکتا ہے، جو تعیین پر دلالت نہیں کرتا۔ علامہ بیضاوی رحمہ اللہ نے فرمایا: " **او للجنس وهذا اظهر فی الحجة** " الف لام کا جنسی بنانا دلائل میں زیادہ ظاہر ہے۔

" وکان من الجنة حملهما آدم فتوار ثهما الانبياء عليهم السلام حتى وصلا الى شعيب فاعطاهما موسى عليه السلام " (تبصیر الرحمن)

موسیٰ علیہ السلام کا عصا اور پتھر دونوں ہی حضرت آدم علیہ السلام نے جنت سے لائے تھے اور انبیاء کرام کی طرف منتقل ہوتے رہے، یہاں تک کہ حضرت شعیب علیہ السلام کے پاس آ گئے اور آپ نے وہ دونوں چیزیں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دے دیں ....واللہ اعلم بالصواب۔

ایسے مسائل کی تحقیق اتنی ضروری نہیں اور قرآن پاک کا مقصود بھی نہیں، تاہم اقوال اس لئے نقل کر دیئے ہیں کہ اگر کوئی خطیب کسی ایک قول کو بیان کرے تو دوسرا شخص صرف دوسرے قول کو دیکھ کر اعتراض نہ کرے۔

﴿ **فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا** ﴾: " **عطف على مقدر اى فضرب فانفلق** "

فانفجرت کا عطف مقدر الفاظ پر ہے، حاصل کلام یہ ہے کہ آپ نے عصا کو پتھر پر مارا اور پتھر

پھٹا اور اس سے بارہ چشمے جاری ہوگئے۔ بارہ چشمے جاری کرنے کی وجہ یہ تھی:

" وكان هذا العدد دون غيره لكونهم كانوا اثنى عشر سبطا وكان بينهم تضاغن وتنافس فاجرى الله تعالىٰ لكل سبط عينا يردها لايشركه فيها احد من السبط الآخر دفعا لا تارة الشحناء ويشير اى حكمة الانقسام" (روح المعانی)

کہ وہ بارہ قبیلے تھے، ایک دوسرے سے عداوت رکھتے تھے، ایک ہی جگہ سے ان کا پانی پینا دشوار تھا، اس لئے رب تعالیٰ نے ان کو میدان تیہ میں پانی دے کر جو عظیم انعام فرمایا، اس سے بڑھ کر اور یہ انعام فرمایا، کہ ان کی عداوت کے پیش نظر ان کو لڑائی جھگڑے سے بچانے کے لئے ان کی تعداد کے مطابق چشمے جاری کر دیئے۔ اور اشارۃً یہ مسئلہ بھی سمجھا دیا کہ جب مشترک چیز میں فساد کا خطرہ ہو تو اسے تقسیم کر لینا، اور فساد سے بچ جانا حکمت کا تقاضا ہے۔

﴿ قَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ ﴾: كل سبط (مشربهم) عينهم التى يشربون منها ، یہاں " اناس " کا معنی قبیلہ ہے اور " مشربهم " کا معنی وہ چشمہ جس سے وہ پانی پینے لگے، یعنی مطلب یہ ہوا کہ ہر قبیلہ نے اپنے پانی کے پینے کی جگہ کو پہچان لیا کہ یہ ہمارا چشمہ ہے۔

﴿ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا مِنْ رِّزْقِ اللهِ ﴾: "کھاؤ اور پیو اللہ کے رزق سے" یہاں "قلنا" مقدر ہے یعنی مطلب یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ ہم نے کہا، جو اللہ تعالیٰ نے تمہیں رزق عطا فرمایا یعنی من اور سلوی اور چشموں کا پانی، ان کو کھاؤ اور پیو۔ بعض حضرات نے کہا یہاں مراد تو صرف پانی ہے، لیکن کھاؤ اور پیو کا مطلب یہ ہے کہ پانی پیو اور پانی سے پیدا ہونے والے پھل وغیرہ کھاؤ۔

لیکن پہلا قول زیادہ معتبر ہے کیونکہ یہ ارشاد ان کو میدان تیہ میں فرمایا وہاں نباتات، پھل وغیرہ نہیں تھے۔ (از بیضاوی و شیخ زادہ)

﴿ وَلَا تَعْثَوْا فِى الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ﴾:

" ولا تعتدوا حال افسادكم " اور تم زمین میں تجاوز نہ کرو فساد پھیلاتے ہوئے۔

بظاہر اس پر یہ وہی ہوتا ہے کہ تجاوز کرنا تو ہے ہی فساد، پھر دوبارہ فساد کے ذکر کرنے کا کیا فائدہ

ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ کبھی تجاوز کرنا فساد نہیں ہوتا۔ جیسا کہ کوئی دوسرا شخص زیادتی کرے، حد سے تجاوز کرے تو اس کے بدلہ میں اس طرح تجاوز کرنا جائز ہے یہ فساد نہیں بلکہ " ولمن انتصر بعد ظلمہ فاولئک ما علیھم من سبیل " (اور بیشک جس نے اپنی مظلومی پر بدلہ لیا اون پر کچھ مواخذہ کی راہ نہیں) کا مصداق ہے۔

اسی طرح حضرت خضر علیہ السلام کا کشتی کو توڑنا، اور ایک بچے کو قتل کرنا بظاہر حد سے تجاوز تھا، لیکن یہ فساد نہیں تھا بلکہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے اصلاح کی غرض تھی۔ (انشاء اللہ اپنے مقام پر اس کی تفصیل آئے گی)۔

﴿ وَلَا تَعْثَوْا ﴾ : میں دو لغتیں ہیں ایک باب علم سے ناقص یائی ، عثی یعثی عثیا ، اور دوسری لغت باب نصر سے ہے۔ ناقص واوی عثنا یعثو عثوا۔ معنٰی دونوں کا ایک ہی ہے فساد پھیلانا، فساد کی غرض سے حد سے تجاوز کرنا۔ (از بیضاوی وشیخ زادہ)

معجزات کا انکار جہالت ہے:

" ومن انکر امثال ھذہ المعجزات فلغایۃ جھلہ باللہ تعالیٰ وقلۃ تدبرہ فی عجائب صنعہ "

اس قسم کے (پتھر سے پانی کا نکالنا وغیرہ) معجزات کا انکار کرنا، اللہ تعالیٰ سے بہت ہی زیادہ جاہل ہونے کی وجہ سے ہے اور اللہ تعالیٰ کی قدرت اور اس کی صنعت کے عجائب میں تدبر کم کرنے کی وجہ سے ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بعض پتھروں میں یہ طاقت رکھ دی ہے کہ ان سے بال مونڈے جا سکتے ہیں۔ اور بعض وہ پتھر ہیں جن سے سرکہ کو متنفر بنا دیا، جب وہ پتھر سرکہ میں ڈالو تو سرکہ ٹپک کر برتن سے باہر آ جائے گا۔

اور بعض پتھروں کو مقناطیس بنایا جو لوہے کو اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں، جب اللہ تعالیٰ کی قدرت کے یہ ادنی کرشموں کی مثالیں ہم نے پیش کر دی ہیں، تو اسی سے واضح ہو گیا کہ موسیٰ علیہ السلام کے عصا مارنے سے پتھر سے پانی کا جاری ہونا اللہ تعالیٰ کی قدرت ہے اور موسیٰ علیہ السلام کا معجزہ ہے۔ (ماخوذ از بیضاوی)

تنبیہ : معجزات کا انکار کرنے والے وہ لوگ تھے جو خود یہ بحثیں کرنے والے تھے کہ پانی ہوا بن جاتا ہے ہوا پانی بن جاتی ہے، وغیرہ، یعنی فلاسفہ نے معجزات کا انکار کیا۔ البتہ یہ خیال رہے کہ فلاسفہ

کے زیادہ اختلافات کے قطع نظر فلاسفہ کی تین قسمیں ہیں۔

(۱) دھریون (۲) طبعیون (۳) الاھیون۔

دھریون: وہ لوگ تھے جن کا عقیدہ یہ تھا کہ کوئی ذات صانع اور مدبر اور عالم اور قادر نہیں۔ یعنی وہ اللہ تعالیٰ اور اس کی قدرت کو نہیں مانتے تھے بلکہ ان کا عقیدہ یہ تھا کہ جہان ہمیشہ سے موجود ہے کسی صانع اور پیدا کرنے والے کا کوئی دخل نہیں۔ بلکہ ایک حیوان کے نطفہ سے دوسرا اور دوسرے کے نطفہ سے تیسرا پیدا ہوا۔ ان کے نزدیک نہ کوئی زندہ کرنے والا ہے اور نہ کوئی مارنے والا یہ نظام عالم اسی طرح چل رہا ہے یہ لوگ زندیق ہیں، یعنی بے دین اور کافر ہیں۔

طبیعون: یہ وہ لوگ ہیں جو اکثر طور پر عالم طبیعیہ اور عجائب حیوانات اور نباتات سے بحث کرتے ہیں، حیوانات کے اعضاء کی تشریح میں زیادہ غور وخوض کرتے ہیں، جب یہ اللہ تعالیٰ کی صنعت کے عجائبات اور اس کی حکمت کے انوکھے انوکھے آثار دیکھتے ہیں تو مجبور ہو جاتے ہیں کہ یہ تسلیم کریں کہ حیوانات کا کوئی خالق ہے اور وہ حکیم ہے تمام امور اور مقاصد پر وہ مطلع ہے اس کی تخلیق عجیب نظام حکمت سے مربوط ہے۔

لیکن یہ تسلیم کرنے کے باوجود حیوانات کے اعضاء میں غور وخوض کرنے کے بعد وہ یہ کہتے ہیں کہ انسان کی قوت عاقلہ اس کے مزاج کے تابع ہے جب مزاج باطل ہو تو قوت عاقلہ بھی باطل ہو جاتی ہے۔ اور جب مزاج معدوم ہو تو قوت عاقلہ بھی معدوم ہو جاتی ہے۔

ان کی سوچ اور تفکر کی آخری حد یہ ہے کہ کوئی نفس جب مر جائے تو پھر وہ زندہ نہیں ہوگا آخرت کا یہ لوگ انکار کرتے ہیں۔ جنت و دوزخ اور قیامت و حساب کو یہ نہیں مانتے، ان کے نزدیک کسی نیکی پر کوئی ثواب مرتب نہیں ہوتا۔ اور نہ ہی کسی برائی پر کوئی عذاب ہوتا ہے۔

ان کے عقیدہ میں نہ کسی کام کا کرنا واجب ہے اور نہ کسی کام سے رکنا ضروری ہے۔ یہ لوگ بھی صرف خواہشات ہی رکھتے ہیں جیسے جانور خواہشات رکھتے ہیں یہ لوگ بھی زندیق یعنی بے دین اور کافر ہیں کیونکہ مومن تو وہ ہو سکتا ہے جو اللہ تعالیٰ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو اور اللہ تعالیٰ اور اس کی صفات پر ایمان رکھتا ہو جب وہ اس ایمان سے خالی ہیں تو یقیناً زندیق ہیں۔

الاھیون : یہ متأخرین فلاسفہ ہیں جیسے ارسطو اور اس کا استاد افلاطون اور اس کا استاد سقراط ان لوگوں نے اگرچہ دھریوں اور طبیعوں کا رد بھی کیا ہے لیکن یہ خود بھی کفریات سے نہیں نکل سکے اسی وجہ سے اسلامی فلاسفہ نے ان کا بھی رد کیا ہے اور ان کو کافر کہا ہے جیسا کہ ابن سینا اور فارابی نے اس تیسرے فرقہ کا بھی رد کیا ہے۔

واضح ہوا کہ فلاسفہ کے یہ تینوں فرقے کافر ہیں اور متأخرین حضرات ابن سینا اور فارابی وغیرہ مسلمان ہیں۔ پہلے تینوں قسم کے فلاسفہ نے معجزات کا انکار کر کے بزعم خویش علم کے دعویدار ہونے کے باوجود (بقول علامہ بیضاوی) اپنی جہالت کا ثبوت پیش کیا۔ (ماخوذ از شیخ زادہ)

سید الانبیاء کی انگلیوں سے نکلا ہوا پانی زمزم اور کوثر سے افضل ہے:

" عن جابر قال عطش الناس یوم الحدیبیة ورسول الله ﷺ بین یدیه رکوة فتوضأ منها ثم اقبل الناس نحوه قالوا لیس عندنا ماء نتوضأ به ونشرب الا ما فی رکوتک فوضع النبی ﷺ یده فی الرکوة فجعل الماء یفور من بین اصابعه کامثال العیون فشربنا وتوضأنا قیل لجابر کم کنتم قال لو کنا مائة الف لکفانا کنا خمس عشرة مائة "

(بخاری، مسلم، مشکوٰۃ باب المعجزات)

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حدیبیہ کے دن لوگ پیاسے ہو گئے اور رسول اللہ ﷺ کے پاس ایک برتن میں پانی تھا۔ جس سے آپ نے وضوء فرمایا، پھر لوگوں نے آپ کی طرف توجہ کی اور عرض کیا کہ ہمارے پاس پانی نہیں کہ ہم اس سے وضوء کریں یا پیئیں، سوائے اس کے جو آپ کے برتن میں پانی ہے، نبی کریم ﷺ نے اپنا ہاتھ مبارک اپنے برتن میں رکھا تو آپ کی انگلیوں سے پانی کے فوارے چل پڑے جس طرح چشموں سے پانی نکلتا ہے راوی کہتے ہیں اس سے پیا اور وضوء کیا حضرت جابر سے پوچھا گیا کہ اس وقت تمہاری تعداد کتنی تھی؟ آپ نے فرمایا اگر ہم ایک لاکھ کی تعداد میں ہوتے تو پھر بھی ہمیں کفایت کر جاتا البتہ ہم اس وقت پندرہ سو کی تعداد میں تھے۔

ایک دوسری حدیث دیکھیں جس کے وضاحت میں عنوان کے مطابق بحث کی گئی ہے۔

☆ " عن انس ان رسول الله ﷺ اتاه جبریل وهو یلعب مع الغلمان فاخذ فصرعه فشق

عن قلبه فاستخرج منه علقة فقال هذا حظ الشیطان منک ثم غسله فی طشت من ذهب بماء زمزم ثم لامه واعاده فی مکانه وجاء الغلمان یسعون الی امه یعنی ظئره فقالوا ان محمدا قد قتل فاستقبلوه وهو منتقع اللون قال انس فکنت اری اثر المخیط فی صدره"

(مسلم، مشکوۃ باب علامات النبوۃ)

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے بے شک رسول اللہ ﷺ کے پاس جبریل آئے جب کہ آپ بچوں کے ساتھ کھیل رہے تھے انہوں نے آپ کو پکڑ کر لٹایا پھر آپ کے دل کی جگہ (سے سینہ) کو چاک کیا اور اس سے ایک منجمد خون کا لوتھڑا نکالا اور کہا کہ یہ آپ کے جسم میں شیطان کا حصہ تھا پھر ایک سونے کے طشت میں دل کو رکھ کر زمزم کے پانی سے دھویا پھر سینے کو درست کیا (یعنی اسے ٹانکے لگائے) دل کو پانی جگہ پر لوٹا دیا (ساتھ کھیلنے والے) بچے دوڑتے ہوئے آپ کی رضاعی ماں (حلیمہ سعدیہ) کے پاس آئے تو کہنے لگے کہ محمد کو قتل کر دیا گیا۔ جب حلیمہ کے گھر کے افراد آئے تو دیکھا کہ حضور کا رنگ متغیر ہے۔ حضرت انس کہتے ہیں میں حضور کے سینہ مبارک پر سوئی سے لگے ہوئے ٹانکوں کے نشان دیکھتا تھا۔

وضاحت حدیث: سونے کے برتن استعمال کرنا نبی کریم ﷺ کی شریعت میں حرام ہے۔ لیکن جبریل نے سونے کے طشت کو استعمال کیا اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ ابھی آپ کو اعلان نبوت کا حکم نہیں دیا گیا تھا اور نہ ہی آپ کو شریعت عطاء ہوئی تھی۔ اور دوسری وجہ یہ تھی کہ یہ استعمال کرنے والے جبریل تھے اور فرشتے ہمارے افعال کے مکلف نہیں۔

آب زمزم سے دھونے کی وجہ: نبی کریم ﷺ کے دل مبارک کو آب زمزم سے دھویا گیا۔

" استدل به علی انه افضل میاه العالم حتی ماء الکوثر "

اس کو اس مسئلہ پر دلیل بنایا گیا ہے کہ آب زمزم جہان کے تمام پانیوں سے افضل ہے یہاں تک کہ حوض کوثر اور نہر کوثر کے پانی سے بھی افضل ہے کیونکہ آپ کے دل کو دھونے کے لئے جس پانی کا انتخاب کیا گیا وہ یقیناً تمام پانیوں سے افضل ہی ہونا چاہئے۔

زمزم سے بھی افضل پانی:

" لکن الماء الذی نبع من بین اصابعه ﷺ فلا شک انه افضل المیاه

علی الأطلاق "

لیکن وہ پانی جو حضور ﷺ کی انگلویں سے جاری ہوا تھا وہ بلا شک تمام پانیوں سے مطلقا افضل ہے۔

یعنی آب کوثر سے بھی اور آب زمزم سے بھی، چونکہ آب کوثر سے تو آب زمزم بھی اعلیٰ ہے اور آب زمزم سے وہ پانی افضل ہے جو میرے حبیب علیہ السلام کی انگلیوں سے جاری ہوا وہ کیوں افضل ہے؟

" لکونہ من اثر یدہ الشریفة وماء زمزم من اثر قدم اسمعیل المنیفة وبون بین بینھما ولان الاعجاز الکائن فی یدہ ﷺ ابلغ "

اس لئے کہ اس پانی کو تعلق ہے سید الانبیاء کے ہاتھ مبارک سے کہ آپ کی انگلیوں سے جاری ہوا۔ اور آب زمزم کو حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے قدموں سے تعلق ہے کہ وہ آپ کی ایڑی کی حرکت سے نکلا ہے، تو ان دونوں میں بہت بڑا فرق ہے کیونکہ جب نبی کریم ﷺ تمام نبیوں سے افضل ہیں تو آپ کے ہاتھ مبارک سے ظاہر ہونے والا معجزہ بھی افضل ہے اس کمال سے جو اسمٰعیل علیہ السلام کی ایڑی کی رگڑ سے ظاہر ہوا۔

نبی کریم ﷺ کے اس معجزہ کو اعلیٰ حضرت مولنا احمد رضا خان بریلوی رحمہ اللہ نے کیا خوبصورت انداز میں بیان کیا۔

انگلیاں ہیں فیض پر ٹوٹے ہیں پیاسے جھوم کر ندیاں پنجاب رحمت کی ہیں جاری واہ واہ

تنبیہ :

"وھذا الحدیث وامثالہ مما یجب فیہ التسلیم ولا یتعرض لہ بتاویل من طریق المجاز اذلا ضرورۃ فی ذلک "

یہ شق صدر (سینہ چاک کرنے) والی حدیث ہو یا اس قسم کی اور احادیث ہوں ان کو تسلیم کرنا واجب ہے۔ اور تاویل کر کے مجازی معنی نہ لیا جائے کیونکہ اس کی کوئی ضرورت نہیں، اس لئے کہ خبر دینے والے خود نبی کریم ﷺ ہیں، جن سے بڑھ کر کوئی سچا نہیں ہوسکتا، اس لئے خبر سچی ہے اور رب تعالیٰ کی قدرت سے بھی یہ کوئی بعید نہیں۔

فائدہ : نبی کریم ﷺ کے جسم اطہر سے وہ خون کا منجمد ٹکڑا کیوں نکالا گیا؟ اس لئے کہ اگر میں

یہ تاثیر رکھی ہوئی ہے کہ وہ شیطان کے اثر کو قبول کر لیتا ہے، اس کو نکال دیا گیا تا کہ اس کی وجہ سے دل مقدس اور منور ہو جائے اور وحی کو قبول کرنے کی کامل صلاحیت اس میں پیدا ہو جائے، اور نبی کریم ﷺ کو غافل کرنے کی تمام امیدیں منقطع ہو جائیں۔ وہ ٹکڑا آپ کے جسم میں رکھا ہی کیوں تھا، اس کے بغیر ہی آپ کو پیدا فرمالیا جاتا اس کی کیا وجہ ہے؟

اصل وجہ یہ ہے کہ ہر انسان کے جسم میں وہ ٹکڑا ہوتا ہے اگر آپ کے جسم میں وہ حصہ شروع ہی میں نہ رکھا جاتا تو جسم میں ایک حصہ کے نہ ہونے کی وجہ سے نقص پیدا ہوتا، آپ کو چونکہ ہر عیب سے پاک پیدا فرمانا تھا، اس لئے پہلے اس حصہ کو جسم میں رکھا گیا تا کہ جسمانی کوئی نقص نہ ہو، پھر اسے نکال دیا گیا، کیونکہ اب آپ کے جسم مبارک میں وہ رہنے کے قابل نہ تھا۔

میرے استاذ مکرم حضرت علامہ ابوالحسنات محمد اشرف سیالوی مدظلہ العالی نے یہی تقریر فرمائی تھی جب آپ یہ حدیث مبارک پڑھا رہے تھے، اس وقت میرے ساتھ پڑھنے والے اور حضرات کے علاوہ یہ چار حضرات قابل ذکر تھے، مولنا شاہ محمد قصوری، مولنا قاری محمد یوسف جہلمی، مولنا عبد اللطیف صاحب سرگودھوی اور مولنا ابوالفضل اللہ دتہ صاحب (بھابڑہ ضلع سرگودھا) جن کا ابھی تین ماہ پہلے وصال ہوا اللہ تعالیٰ آپ کے مدارج کو بلند فرمائے، جنت الفردوس عطا فرمائے۔

خیال رہے کہ نبی کریم ﷺ کا شق صدر (سینہ چاک کرنا) کئی مرتبہ ہوا۔ ایک مرتبہ بچپن میں جب آپ حضرت حلیمہ سعدیہ کے پاس تھے اور دوسری مرتبہ جب آپ سے جبریل امین کی غار حرا میں ملاقات ہوئی۔ اور تیسری مرتبہ معراج کی رات کو۔ (از مرقاۃ ج ۱۱ ص ۱۲۳)

مسئلہ استسقاء: اسی آیۂ کریمہ کی تفسیر میں علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے بیان فرمایا کہ جب پانی میسر نہ ہو اور بارش نہ ہو رہی ہو تو انسانوں کو چاہئے کہ وہ اپنی عبودیت کا اظہار کریں، اپنے فقر، مسکینی اور عجز کے ساتھ خلوص دل سے توبہ کرے اور رحمت کی بارش کی دعاء کرے۔

"وقد استسقى نبينا محمد ﷺ فخرج الى المصلى متواضعا متذللا متخشعا مترسلا متضرعا"

ہمارے نبی کریم محمد مصطفیٰ ﷺ نے عید گاہ کی طرف نکل کر (نماز استسقاء) ادا کر کے اپنے

رب تعالیٰ سے بڑی عاجزی اور انکساری سے دعاء فرمائی۔

" فکیف بنا ولا توبة معنا الا العناد ومخالفة رب العباد فانی نسقی "

جب ہمارے نبی کریم ﷺ نے عاجزی سے دعاء فرمائی تو ہم کیوں نہ دعاء کریں، اور ہم توبہ کیوں نہ کریں جب ہم میں عناد بھی پایا جاتا ہے اور رب تعالیٰ کے احکام کی مخالفت بھی، اگر ہم خلوص دل سے توبہ نہیں کریں گے تو ہمیں رب تعالیٰ کی طرف سے رحمت کی بارش کیسے حاصل ہوگی؟

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

" ولم یمنعوا زکوة اموالهم الا منعوا القطر من السماء ولو لا البهائم لم یمطروا "

جب لوگ اپنے مال کی زکواۃ ادا کرنا چھوڑ دیتے ہیں تو رب تعالیٰ کی طرف سے بارشوں کو روک لیا جاتا ہے اگر حیوانات نہ ہوتے تو بارش کبھی نہ ہوتی۔

یعنی اللہ تعالیٰ جانوروں پر رحم فرماتا ہے تو اس رحمت سے انسان بھی فائدہ حاصل کر لیتے ہیں۔ ورنہ انسانوں کی بداعمالیوں سے رحمت کے نزول کا کوئی حق نہیں ہوتا۔ (ماخوذ از قرطبی)

استسقاء کے تین طریقے:

☆ " الاستسقاء ثلاثة انواع ، احدها الاستسقاء بالدعاء من غیر صلوة "

<u>بارش طلب کرنے کے تین طریقے ہیں۔</u>

(۱) ایک ان میں سے یہ ہے کہ بارش کے لئے بغیر نماز ادا کرنے کے دعاء کرے، یعنی عام اوقات میں دعاء کرتا رہے یہ انتظار نہ کرے کہ جب نماز ادا کروں گا تو اس کے بعد دعا کروں گا۔

(۲) " الثانی الاستسقاء فی خطبة الجمعة او فی اثر صلوة مفروضة وهو افضل من النوع الذی قبله "

(۲) دوسرا طریقہ بارش طلب کرنے کا یہ ہے کہ جمعہ کے خطبہ کے دوران بارش کی دعاء کی جائے، یا فرض نماز کے ادا کرنے کے بعد دعا کی جائے، یہ طریقہ پہلے طریقہ سے افضل ہے۔

دوران خطبہ نبی کریم ﷺ کا دعاء کرنا:

" عن انس بن مالک ان رجلا دخل المسجد یوم جمعة من باب کان نحو دار القضاء ورسول الله ﷺ قائم یخطب فاستقبل رسول الله ﷺ قائما ثم قال یا رسول الله هلکت الاموال وانقطعت السبل فادع الله یغثنا قال فرفع رسول الله ﷺ یدیه ثم قال اللهم اغثنا اللهم اغثنا اللهم اغثنا قال انس ولا والله ما تری فی السماء من سحاب ولا قزعة وما بیننا وبین سلع من بیت ولا دار قال فطلعت من ورائه سحابة مثل الترس فلما توسطت السماء انتشرت ثم امطرت قال فلا والله ما رأینا الشمس ستا قال ثم دخل رجل من ذلک الباب فی الجمعة المقبلة ورسول الله ﷺ قائم یخطب فاستقبله قائما فقال یا رسول الله هلکت الاموال وانقطعت السبل فادع الله یمسکها عنا قال فرفع رسول الله ﷺ یدیه ثم قال اللهم حولنا ولا علینا اللهم علی الآکام والظراب وبطون الاودیة ومنابت الشجر فانقلعت وخرجنا نمشی فی الشمس ، قال شریک فسألت انس بن مالک اهو الرجل قال لا ادری "

حضرت انس بن مالک ؓ فرماتے ہیں بیشک جمعہ کے دن ایک شخص دار القضاء کے دروازہ کے جانب سے مسجد میں داخل ہوئے رسول اللہ ﷺ کھڑے ہو کر خطبہ دے رہے تھے وہ صحابی کھڑے ہو کر رسول اللہ ﷺ کی طرف توجہ کرتے ہوئے عرض کرنے لگے یا رسول اللہ مال ہلاک ہو رہے ہیں۔ راستے منقطع ہو چکے ہیں آپ اللہ تعالیٰ سے دعاء فرمائیں کہ ہمیں بارش عطا فرمائے۔ حضرت انس کہتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے اپنے ہاتھوں کو اٹھایا پھر تین مرتبہ کہا اے اللہ ہمیں بارش عطا فرما، حضرت انس کہتے ہیں قسم ہے اللہ تعالیٰ کی ہم آسمانوں میں کوئی بادل نہیں دیکھ رہے تھے، اور نہ ہی کوئی بادل کا ٹکڑا نظر آ رہا تھا۔ اور نہ ہی ہمارے درمیان اور سلع پہاڑ کے درمیان کوئی گھر ایسا تھا کہ وہاں بادل کے آثار نظر آ رہے ہوں۔ حضرت انس کہتے ہیں رسول اللہ ﷺ کے پیچھے کی جانب سے بادل نمودار ہوا جو ڈھال کی طرح تھا۔ جب آسمانوں کے درمیان پہنچا تو پھیل گیا، پھر بارش شروع ہو گئی۔ حضرت انس کہتے ہیں قسم ہے اللہ تعالیٰ کی ہمیں سورج کا ذرا بھر بھی کوئی حصہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ آنے والے جمعہ میں پھر ایک شخص

اسی دروازہ سے داخل ہوئے جب کہ رسول اللہ ﷺ کھڑے خطبہ دے رہے تھے وہ شخص کھڑے ہو کر رسول اللہ ﷺ کی طرف متوجہ ہو کر عرض کرنے لگے یا رسول اللہ مال ہلاک ہو رہے ہیں اور راستے منقطع ہو گئے۔ آپ اللہ تعالیٰ سے دعا کریں کہ ہم سے بارش کو روک لے۔ حضرت انس کہتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے اپنے ہاتھوں کو اٹھایا، پھر عرض کیا، اے اللہ ہمارے اردگرد بارش ہو، ہم پر نہ ہو، چھوٹے، بڑے ٹیلوں پر، وادیوں میں، درختوں کے پیدا ہونے کے مقامات پر بارش ہوتی رہے۔ حضرت انس کہتے ہیں (نبی کریم ﷺ کی دعا سے) بادل چھٹ گئے ہم دھوپ میں باہر نکلے۔ شریک کہتے ہیں میں نے حضرت انس سے پوچھا کیا دوسرے جمعہ پر عرض کرنے والے وہ پہلے شخص ہی تھے آپ نے فرمایا یہ مجھے معلوم نہیں۔

توضیح : دار القضاء سے مراد وہ دار ہے جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا دار تھا قرض کی ادائیگی میں بیچا گیا تھا۔ دونوں دفعہ دعاء میں " **ھلکت الاموال وانقطعت السبل** " کے الفاظ استعمال ہیں۔ پہلی مرتبہ عرض کرنے پر مقصد یہ تھا کہ قحط سالی کی وجہ سے مال ہلاک ہو رہے، پیداوار کے راستے بند ہو گئے ہیں۔

دوسری مرتبہ عرض کرنے کا مقصد یہ تھا کہ بارش بہت زیادہ ہوگئی، جس کی وجہ سے مال ہلاک ہو رہے ہیں اور ہر طرف پانی ہی پانی نظر آتا ہے جس کی وجہ سے آمدورفت کے راستے بند ہو گئے ہیں : " **اللھم اغثنا** " اگر لفظ " **اغثنا** " **غیث** سے لیا ہوا ہو تو معنی یہ ہوگا کہ اے اللہ ہمیں بارش عطا فرما، اور اگر "غوث" سے لیا ہوا ہو تو معنی یہ ہوگا "اے اللہ ہماری فریاد رسی فرما۔

اسی وجہ سے پہلے لفظ میں دو نسخے ہیں ایک میں ہے " **یغثنا** " اور دوسرے میں ہے " **یغیثنا** " نبی کریم ﷺ نے تین مرتبہ رب تعالیٰ کے حضور عرض کیا " **اللھم اغثنا** " **ففیه استحباب تکرار الدعاء ثلاثا** ، اس سے واضح یہ ہوا کہ دعاء میں تین مرتبہ تکرار مستحب ہے۔" **واللہ ما رأینا الشمس سبتا** " میں سبتا کا معنی ہے ٹکڑا" **اصل السبت القطع** "

" **وبھذا الاخبار عن معجزة رسول اللہ ﷺ وعظیم کرامته علی ربه سبحانه وتعالٰی بانزال المطر سبعة ایام متوالیة متصلا بسواله من غیر تقدیم سحاب ولا قزع ولا سبب آخر لا ظاھر ولا باطن** "

اس حدیث پاک سے رسول اللہ ﷺ کا معجزہ اور آپ کا رب تعالیٰ کے ہاں عظیم مکرم ہونا

واضح ہورہا ہے کہ آپ کی دعاء سے سات دن لگا تار بارش جاری رہی جب کہ اس سے پہلے نہ کوئی بادل تھے اور نہ ہی بارش کے کسی قسم کے کوئی آثار تھے۔

"اکام" بڑے ٹیلے، **"ظراب"** چھوٹے ٹیلے۔

حدیث پاک سے اور فائدہ یہ حاصل ہوا کہ بارش جب مقدار سے زیادہ نقصان دہ ہو جائے تو یہ دعا کرنا جائز ہے کہ اے اللہ تعالیٰ ہمیں اس بارش کے نقصان سے بچا۔ کیونکہ نبی کریم ﷺ نے بھی ان مقامات سے بارش کو روک دینے کی درخواست کی جہاں بارش کی وجہ سے نقصان ہورہا تھا۔ البتہ بارش کے رکنے کی دعاء کے لے میدان میں جمع ہونا اور نماز ادا کر کے دعاء کرنے کا کوئی ثبوت نہیں۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے جب یہ پوچھا گیا کہ دوسرے جمعہ دعا کرنے کی عرض کرنے والے پہلے جمعہ والے ہی صحابی تھے یا کوئی اور، تو آپ نے کہا" **لا ادری** " مجھے معلوم نہیں: " **وقد جاء فی البخاری وغیرہ انه الاول** " لیکن بخاری اور دوسری احادیث کی کتب میں یہ مذکور ہے کہ دوسرے جمعہ میں عرض کرنے والے وہی صحابی تھے جنہوں نے پہلے جمعہ میں عرض کیا تھا۔

اس حدیث پاک سے یہ واضح ہوا کہ بارش طلب کرنے کے لئے نبی کریم ﷺ نے بغیر نماز استسقاء ادا کرنے کے دوران خطبہ دعاء فرمائی:

☆ **" والثالث وهو اکملها ان یکون بصلوة رکعتین وخطبتین ویتأهب قبله بصدقة وصیام وتوبة واقبال علی الخیر ومجانبة الشر ونحو ذلک من طاعة الله تعالیٰ "**

☆ بارش طلب کرنے کا تیسرا طریقہ جو کہ زیادہ کامل ہے وہ یہ کہ نماز استسقاء ادا کرے اور نماز سے پہلے رب تعالیٰ کی راہ میں صدقہ کیا جائے روزے رکھے جائیں، توبہ کی جائے نیکیوں کی طرف توجہ کی جائے اور شر سے اجتناب کیا (بچا) جائے، اور ہر قسم کی اللہ تعالیٰ کی طاعت کی جائے (نماز کا طریقہ انشاء اللہ بعد میں بیان ہوگا۔ اسی میں خطبہ دینے کا حکم بیان ہو جائیگا)۔

☆ **" عن عباد بن تمیم عن عمة قال خرج النبی ﷺ الی المصلی فاستسقی واستقبل القبلة وقلب رداءه وصلی رکعتین "**

حضرت عباد بن تمیم اپنے چچا سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ عیدگاہ کے میدان کی طرف

تشریف لے گئے بارش طلب کرنے کی دعاء کی، قبلہ کی طرف متوجہ رہے، اور اپنی چادر کو پھیرا اور دو رکعتیں پڑھیں۔ (مسلم بمع نووی ج اول کتاب صلوۃ الاستسقاء)

نماز استسقاء: دو رکعت بنیت استسقاء جماعت سے ادا کی جائیں۔ امام ان میں قراءت بلند آواز سے کرے۔ اور بعد میں عید کی طرح دو خطبے دیئے جائیں۔ ایک خطبہ بھی ہو تو کافی ہے کیونکہ عید کے خطبہ کا یہی حکم ہے۔ (راقم کے اس بیان سے خطبہ کا مسئلہ اتفاقی ہو جائے گا)

نماز استسقاء کے بعد امام چادر پھیرے، لوگ اپنی چادروں کو نہ پھیریں، چادر پھیرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اس انداز پر چادر کو الٹا کرے کہ نیچے والے کونے اوپر چلے جائیں اور اوپر والے نیچے ہو جائیں۔ دائیاں کونہ بائیں طرف ہو جائے، اور بائیاں کونہ دائیں ہو جائے۔ اسی طرح کپڑے کی اوپر والی سطح نیچے ہو جائے اور نیچے والی سطح اوپر ہو جائے۔

چادر پھیرنے میں نیک تفاؤل (نیک شگونی) مقصود ہوتی ہے کہ اے اللہ تعالیٰ جس طرح میں چادر پھیرنے کی طاقت رکھتا ہوں تو چادر کو الٹا پھیر رہا ہوں۔ تو ہی قدرت وطاقت کا مالک ہے اس لئے تو ہمارے حالات پھیر دے، یعنی قحط سالی کو ختم کر کے بارش عطاء فرما کر خوشحالی پیدا فرما دے۔ (از ھدایۃ)

ایک غلط فہمی کا ازالہ: امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے فرمایا:

" لیس فی الاستسقاء صلوۃ مسنونۃ فی جماعۃ "

بارش طلب کرنے کے لئے جماعت سے نماز ادا کرنا سنت نہیں۔

اسی طرح فقہاء کرام نے یہ بیان کیا:" ولا خطبۃ عند ابی حنیفۃ لانھا تبع للجماعۃ ولا جماعۃ عندہ " اور امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک استسقاء کے لئے خطبہ بھی نہیں کیونکہ خطبہ جماعت کے تابع ہے جب ان کے نزدیک جماعت مسنون نہیں تو خطبہ بھی نہیں۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے اس قول پر عام طور پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ جب حدیث پاک سے ثابت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے استسقاء کی نماز جماعت سے پڑھائی اور خطبہ بھی دیا تو امام صاحب نے اس کا انکار کیوں کیا۔

اس پر فقہاء کرام نے مختلف بحثیں کی ہیں۔ فتح القدیر میں بسیط بحث ہے، لیکن راقم کا موقف اس میں بہت آسان ہے، حقیقت میں ہے بھی یہی، وہ یہ ہے کہ ہدایہ کی اس عبارت کو بڑے غور سے پڑھا جائے اور سمجھا جائے " قلنا فعله مرة وترکه اخری فلم یکن سنة " امام صاحب نے کہا کہ نبی کریم ﷺ نے کبھی بارش طلب کرنے کے لئے نماز پڑھائی اور کبھی نہیں پڑھائی، لہذا نماز باجماعت ادا کرنا سنت نہیں۔

اب ذرا بات کو سمجھیں کہ جب علامہ نووی رحمہ اللہ کی بحث سے یہ ثابت کیا جا چکا ہے کہ بارش طلب کرنے کے تین طریقے ہیں ان میں ایک نماز استقاء ہے تو اس سے واضح ہو گیا کہ امام صاحب نے نفی مطلقا سنت ہونے کی نہیں کی، بلکہ سنت مؤکدہ ہونے کی کی ہے، آپ کا یہ کہنا ہی واضح کر رہا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے کبھی نماز جماعت سے پڑھائی اور کبھی نماز نہیں پڑھائی۔ کہ آپ سنت غیر مؤکدہ ہونے کے قائل ہیں۔ جب نماز باجماعت ہوگی خطبہ ہوگا اور جب جماعت نہیں ہوگی تو خطبہ بھی نہیں ہو گا، لہذا خطبہ کی نفی بھی سنت مؤکدہ کی نفی ہے۔

نماز استسقاء کے بعد دعا:

" عن انس قال رأیت رسولﷺ یرفع یدیه فی الدعاء حتی یری بیاض ابطیه "

(مسلم)

حضرت انس ؓ فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا کہ آپ نے (بارش طلب کرنے کے لئے) دعا میں اتنے بلند ہاتھ اٹھائے کہ آپ کی بغلوں کی سفیدی کو دیکھا جا سکتا۔

☆ " عن انس ان نبی اللہ ﷺ کان لا یرفع یدیه فی شئی من دعائه الا فی الاستسقاء حتی یری بیاض ابطیه " (مسلم)

حضرت انس ؓ فرماتے ہیں بیشک نبی کریم ﷺ اپنی کسی دعا میں اتنے بلند ہاتھ نہیں اٹھاتے تھے جتنے بارش طلب کرنے کی دعا میں اٹھاتے یہاں تک کہ آپ کی بغلوں کی سفیدی کو دیکھا جا سکتا تھا۔

غلط فہمی کا ازالہ: عام لوگ جو علم سے کورے ہیں، اور ہاتھ اٹھا کر دعا کرنے کے قائل نہیں، وہ کہتے

ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے سوائے استسقاء کے ہاتھ اٹھائے ہی نہیں۔ یہ ان کی غلط فہمی ہے۔ اس پر علامہ نووی رحمہ اللہ کی بحث کو دیکھیں، اور خاص کر کے یہ سمجھیں کہ علامہ نووی رحمہ اللہ نے آجکل کے اختلافات کو پہلے سے ہی کیسے دور فرما دیا۔

" ھذا الحدیث یوھم ظاھرہ انہ لم یرفع ﷺ الا فی الاستسقاء ولیس الامر کذلک بل قد ثبت رفع یدیہ ﷺ فی الدعاء فی مواطن غیر الاستسقاء وھی اکثر من ان تحصر وقد جمعت منھا نحوا من ثلاثین حدیثا من الصحیحین او احدھما "

اس حدیث سے بظاہر یہ وہم ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے سوائے استسقاء کے ہاتھ اٹھائے ہی نہیں، حالانکہ اس طرح نہیں۔ بلکہ نبی کریم ﷺ کا استسقاء کے بغیر بیشمار مقامات میں ہاتھ اٹھانا ثابت ہے۔

میں نے صحیحین سے متفق علیہ احادیث یا ان دونوں میں سے کسی ایک یعنی بخاری یا مسلم سے تقریباً تیس احادیث کو جمع کیا ہے جن میں استسقاء کے بغیر ہاتھ اٹھا کر دعا کرنا ثابت ہے۔ یہ احادیث میں نے شرح مہذب کے باب صفۃ الصوۃ میں جمع کی ہیں۔

" ویتأول ھذا الحدیث علی انہ لم یرفع الرفع البلیغ بحیث یری بیاض ابطیہ الا فی الاستسقاء "

اس حدیث پاک کا مطلب یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے کسی دعا میں بھی ہاتھ بہت زیادہ بلند کر کے نہیں اٹھائے کہ جس سے بغلوں کی سفیدی نظر آ جائے سوائے استسقاء کی دعا کے۔

☆ " عن انس بن مالک ان النبی ﷺ استسقی فاشار بظھر کفیہ الی السماء " (مسلم)

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں بیشک نبی کریم ﷺ نے بارش طلب کرنے کے لئے دعا فرمائی اپنی ہتھیلیوں کی پیٹھ کو آسمانوں کی طرف کیا۔

" قال جماعۃ من اصحابنا وغیرھم السنۃ فی کل دعاء لرفع بلاء کا لقحط ونحوہ ان یرفع یدیہ ویجعل ظھر کفیہ الی السماء واذا دعا لسوال شئی وتحصیلہ جعل بطن کفیہ الی السماء واحتجوا بھذا

الحدیث " (نووی)

اہل علم حضرات نے اسی حدیث سے یہ دلیل قائم کی ہے کہ ہر وہ دعاء جو مصیبتوں کے رد کرنے کیلئے ہو جیسے قحط سالی کو دور کرنے کیلئے وغیرہ تو اس دعاء میں الٹے ہاتھوں سے دعاء کرے اور ہر وہ دعا جو کسی چیز کی طلب کی جائے وہ دعا سیدھے ہاتھوں سے کرے۔

(مسلم ج اول کتاب صلوۃ الاستسقاء مع نووی)

بادلوں کو دیکھ کر دعا کرنا:

" عن عائشة زوج النبی ﷺ انها قالت کان النبی ﷺ اذا عصفت الریح قال اللهم انی اسألک خیرها وخیر مافیها وخیر ما ارسلت به واعوذ بک من شرها وشرما فیها وشرما ارسلت به قالت واذا تخلیت السماء تغیر لونه وخرج ودخل واقبل وادبر فاذا مطرت سری عنه فعرفت ذلک عائشة فسالته فقال لعله یا عائشة کما قال قوم عاد فلما رأه عارضا مستقبل اودیتهم قالوا هذا عارض ممطرنا "

(مسلم ج اول کتاب صلوۃ الاستسقاء)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں جب تیز ہوا چلتی تو نبی کریم ﷺ کہتے اے اللہ میں تجھ سے اس کے خیر ہونے اور جو اس میں ہے اس کے خیر ہونے، اور اسے جو عطا کر کے بھیجا گیا ہے اس کے خیر ہونے کا تجھ سے سوال کرتا ہوں۔ اور اے اللہ تیری پناہ اس کے شر سے، اور جو اس میں ہے اس کے شر سے، اور جو اس میں بھیجا گیا ہے اس کے شر سے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں، جب حضور (کڑک، چمک والے) بادل دیکھتے تو آپ (کے چہرے) کا رنگ بدل جاتا، آپ کبھی داخل ہوتے کبھی آگے کی طرف متوجہ ہوتے اور کبھی پیچھے مڑتے (یعنی آپ پر بے قراری طاری رہتی) اور جب بارش ہو جاتی تو آپ کی وہ کیفیت جاتی رہتی (یعنی آپ کو خوشی ہوتی) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے آپ کی یہ کیفیت جب محسوس کی تو آپ سے اس کی وجہ پوچھی تو آپ نے فرمایا قوم عاد نے جب عذاب کو دیکھا بادل کی طرح آسمان کے کنارے میں پھیلا ہوا ان کی وادیوں کی طرف آتا بولے یہ بادل ہے کہ ہم پر برسے گا۔

﴿ بَلْ هُوَ مَا اسْتَعْجَلْتُم بِهِ رِيحٌ فِيهَا عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴾

بلکہ یہ تو وہ ہے جس کی تم جلدی مچاتے تھے ایک آندھی ہے جس میں [illegible] عذاب ہے۔ مسلم شریف

اسی باب میں دوسری حدیث میں یہ ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا یا رسول اللہ:

" اری الناس اذا رأوا الغیم فرحوا رجاء ان یکون فیه المطر واراک اذا رأیته عرفت فی وجهک الکراهیة قالت فقال یا عائشة ما یؤمننی ان یکون فیه عذاب قد عذب قوم بالریح وقد رأی قوم العذاب فقالوا هذا عارض ممطرنا "

میں لوگوں کو دیکھتی ہوں کہ وہ بادلوں کو دیکھ کر خوش ہوتے ہیں اس امید سے کہ بارش ہوگی، اور میں آپ کو دیکھتی ہوں کہ آپ بادل کو دیکھ کر پریشان ہوتے ہیں آپ نے فرمایا اے عائشہ میں عذاب سے بے خوف نہیں ہوتا ایک قوم کو ہوا کی وجہ سے عذاب دیا گیا (اوران کو تباہ و برباد کر دیا گیا) وہ قوم عذاب کو دیکھ کر یہی کہہ رہی تھی یہ بادل ہے ہم پر برسے گا۔

ان احادیث سے واضح ہوا کہ بارش اور ہوا اعتدال پر رہیں تو رحمت ہیں، خوشحالی کا ذریعہ ہیں اور اگر حد سے تجاوز کر جائیں تباہی کا سبب بن جائیں تو وہی رب تعالیٰ کا عذاب ہے اسلئے بادل کو دیکھ کر اس کے خیر کی دعا کرے۔

☆☆☆☆☆

﴿ وَاِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰى طَعَامٍ وَّاحِدٍ فَادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُخْرِجْ لَنَا مِمَّا تُنْبِتُ الْاَرْضُ مِنْ بَقْلِهَا وَقِثَّآئِهَا وَفُوْمِهَا وَعَدَسِهَا وَبَصَلِهَا قَالَ اَتَسْتَبْدِلُوْنَ الَّذِىْ هُوَ اَدْنٰى بِالَّذِىْ هُوَ خَيْرٌ ، اِهْبِطُوْا مِصْرًا فَاِنَّ لَكُمْ مَّا سَاَلْتُمْ ، وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ وَبَآءُوْا بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيَاتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ الْحَقِّ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ﴾

۱) ''اور جب تم نے کہا اے موسیٰ ہم سے تو ایک کھانے پر ہرگز صبر نہ ہوگا، تو آپ اپنے رب سے دعاء کیجئے کہ زمین کی اگائی ہوئی چیزیں ہمارے لئے نکالے، کچھ ساگ اور ککڑی اور گیہوں اور مسور اور پیاز فرمایا کیا ادنیٰ چیز کو بہتر کے بدلے مانگتے ہو۔ اچھا مصر یا کسی شہر میں اترو وہاں تمہیں ملے گا جو تم نے مانگا، اور ان پر مقرر کردی گئی خواری اور ناداری اور خدا کے غضب میں لوٹے یہ بدلا تھا اس کا کہ وہ اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے اور انبیاء کو ناحق شہید کرتے یہ بدلا تھا ان کی نافرمانیوں اور حد سے بڑھنے کا''۔

۲) ''اور جب تم نے کہا اے موسیٰ ہم ہرگز صبر نہیں کریں گے ایک کھانے پر، تو دعاء کریں ہمارے لئے اپنے رب سے وہ پیدا کرے ہمارے لئے وہ چیزیں جو زمین اگاتی ہے۔ یعنی سبزی اور ککڑی (تر، کھیرا) اور گندم اور مسور اور پیاز، فرمایا کیا تم تبدیل کرنا چاہتے ہو وہ چیز جو گھٹیا ہے اس کے بدلے جو بہتر ہے اتر جاؤ شہر میں، تو بیشک تمہارے لئے وہ ہے جو تم نے مانگا۔ اور ڈال دی گئی ان پر ذلت اور محتاجی، اور وہ لوٹے اللہ کے غضب سے، یہ اس وجہ سے کہ بیشک وہ کفر کرتے تھے اللہ تعالیٰ کی آیتوں سے، اور شہید کرتے تھے انبیاء کو ناحق (اور) یہ اس وجہ سے کہ انہوں نے نافرمانی کی اور حد سے تجاوز کرتے تھے''۔

مختصر مطلب:

بنی اسرائیل میدان تیہ میں من اور سلوی ہر روز کھانے سے اکتا گئے، تو موسیٰ علیہ السلام کو کہنے لگے کہ ایک ہی قسم کے کھانے پر اب ہم سے صبر نہیں ہوسکتا، آپ رب تعالیٰ سے ہمارے لئے دعاء کرو کہ وہ ہمیں زمین کی پیداوار چیزیں یعنی سبزیاں اور ککڑی، گیہوں، مسور اور پیاز عطا کرے۔

موسیٰ علیہ السلام نے انہیں سمجھایا کہ جو چیزیں تم طلب کر رہے ہو وہ گھٹیا ہیں۔ رب تعالیٰ نے جو کھانا تمہیں عطا کر رکھا ہے وہ بہتر ہے، تمہیں بغیر مشقت کے حاصل ہو رہا ہے، لیکن ان کو جب بات نہ سمجھ آئی، وہ زمین کی پیداوار کے حاصل کرنے پر اصرار کرتے رہے تو اللہ تعالیٰ نے ان کو قریبی شہر میں جانے کی اجازت دے دی کہ وہاں تمہیں تمہاری خواہش کے مطابق اشیاء حاصل ہوں گی۔

ان پر ذلت اور محتاجی کو مسلط کر دیا گیا اور وہ اللہ تعالیٰ کے غضب کے مستحق ہو گئے کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کی آیات سے کفر کرتے تھے اور انبیاء کرام کو ناحق شہید کرتے، اور اللہ تعالیٰ کے غضب کے مستحق ہونے کی وجہ یہ بھی تھی کہ وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے نبی موسیٰ علیہ السلام کے نافرمان تھے اور حد سے تجاوز کرنے والے تھے۔

تفصیلی وضاحت:

﴿ وَاِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰى طَعَامٍ وَّاحِدٍ ﴾ : ''اور جب تم نے کہا اے موسیٰ ہم ہرگز صبر نہیں کریں گے ایک کھانے پر'' نادوه باسمه من قلة ادبهم " (تیسیر الرحمٰن)
بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا نام لے کر پکارا جس سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے دلوں میں موسیٰ علیہ السلام کا ادب واحترام کم تھا، شاہ عبدالعزیز صاحب نے اس سے زیادہ واضح تحریر فرمایا:

''ودریں ندا کمال بے ادبی کردید کہ ہمچو پیغمبر اولو العزم را بنام او خواندید ویا رسول اللہ ویا نبی اللہ وامثال ذلک نگفتید''

یاد کرو تم اس وقت کو کہ تم نے کہا ''اے موسیٰ'' اور تم نے موسیٰ علیہ السلام کا نام لے کر جو

پکارا اس میں بہت بڑی بے ادبی تم نے کی، کیونکہ تم نے اللہ تعالیٰ کے ایک عظیم مرتبہ والے نبی کو نام لے کر پکارا، حق یہ تھا کہ تم "یارسول اللہ" "یا نبی اللہ" یا اور اس قسم کے ادب والے الفاظ سے پکارتے"

"ومضمون کلام شما نیز کمال بے ادبی بود زیرا که گفتید "لن نصبر" یعنی ماہرگز صبر نخواہیم کرد، وایں نوع کلام دلالت میکند برآنکه صبر متیوانم کرد ولیکن باختیار خود نمیکنیم"

"اور تمہارے کلام کا مضمون بھی کامل بے ادبی پر دلالت کر رہا ہے کہ تم نے کہا "لن نصبر" (ہم ہرگز صبر نہیں کریں گے) ان کے اس کلام سے یہ سمجھ آ رہا ہے کہ وہ صبر کر سکتے تھے لیکن انہوں نے اپنے اختیار سے صبر نہ کرنے کے متعلق کہا کہ ہم گز صبر نہیں کریں گے۔ (عزیزی)

ان کے "لن نصبر" کہنے سے یہ بھی سمجھ آیا کہ وہ میدان تیہ میں اترنے والے من اور سلوی کو ناپسند کرتے تھے "اذ الصبر حبس النفس فی المضیق" جب کہ صبر کا مطلب ہے مشکل اور تنگی میں اپنے آپ کو اس میں روکنا ان کا مطلب یہ تھا کہ اس مشکل میں ہم اپنے آپکو کبھی نہیں روکیں گے۔

(از روح المعانی)

﴿عَلٰی طَعَامٍ وَّاحِدٍ﴾: بظاہر وہم یہ ہے کہ میدان تیہ میں ان کو دو کھانے حاصل تھے، ایک طعام کا ذکر کیسے کیا گیا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ان کا مطلب یہ تھا "انه لا يختلف ولا يتبدل" کہ یہ کھانا جو ہمیں عطا کیا جاتا ہے یہ کبھی مختلف نہیں ہوتا، اس میں کبھی تبدیلی نہیں ہوتی، یعنی ایک حال پر رہنے کی وجہ سے انہوں نے ایک ہی طعام کہہ دیا۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے:

"طعام مائدة الا مير واحد يريدون انه لا تتغير الوانه"

امیر کے دستر خوان پر ہمیشہ ایک جیسا کھانا ہی رہتا ہے یعنی اس میں کبھی تبدیلی نہیں ہوتی، حالانکہ دستر خوان پر کھانے کئی ہوتے ہیں، لیکن ہر روز وہی ہوتے ہیں ان کو ایک طعام کہہ لیا جاتا ہے۔ (از بیضاوی)

فائدہ: طعم (بالفتح) کا معنی ہے "چکھنا" کہا جاتا ہے "طعمه مر" اس کا ذائقہ کڑوا ہے الطعم (بالضم) کا معنی ہے "طعام"

''طعام'' کھانے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ فَاِذَا طَعِمْتُمْ فَانْتَشِرُوْا ﴾ اس مقام پر طعام کا معنی ہے ''کھانا'' اور کبھی طعام ''پینے'' کے معنی میں استعمال ہوتا ہے ''ومن لم يطعمه فانه منی'' (جس نے اس نہر سے نہ پیا وہ میرے ساتھ متعلق ہوگا) یہاں پانی کے معنی میں استعمال ہے۔

اور کبھی ''طعام'' بمعنی غذائیت کے استعمال ہوتا ہے۔ جیسا کہ زمزم کے پانی کے متعلق رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

'' انها طعام طعم وشفاء سقم ''

زمزم کے پانی میں پینے والے کے لئے غذائیت ہے اور بیمار کے لئے شفا ہے۔

(از قرطبی)

﴿ فَادْعُ لَنَا رَبَّكَ ﴾ : ''دعاء کرو ہمارے لئے اپنے رب سے''

'' وانما سألوا من موسىٰ ان يدعولهم لان دعاء الانبياء عليهم الصلوة والسلام اقرب للاجابة من دعاء غيرهم ''

ان لوگوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کہا کہ تم ہمارے لئے دعاء کرو خود انہوں نے دعاء نہیں کی اس کی وجہ کیا تھی؟ اس کی وجہ یہ تھی کہ انبیاء کرام کو رب تعالیٰ کے حضور درجہ قبولیت حاصل ہوتا ہے اس لئے ان کی دعاء کو جو قبولیت کا مقام حاصل ہوتا ہے وہ دوسرے لوگوں کی دعائوں کو حاصل نہیں ہوتا۔

'' على ان دعاء الغير للغير مطلقا اقرب اليها فما ظنك بدعاء الانبياء لاممهم ''

عام طور پر جب کوئی انسان کسی دوسرے انسان کے لئے دعاء کرے تو رب تعالیٰ اسے شرف قبولیت عطا فرماتا ہے تو تمہارا کیا خیال ہے کہ انبیاء کرام جب اپنی امتوں کے حق میں دعاء کریں تو ان دعائوں کو کیا مقام حاصل ہوگا یقیناً ان میں عظیم درجہ کی قبولیت حاصل ہوگی۔ اس لئے کہ پاک ہستیوں کی پاک زبانوں سے نکلنے والے الفاظ کبھی رد نہیں ہوسکتے۔

'' عن ام الدرداء قالت حدثنی سیدی انه سمع رسول الله ﷺ یقول من دعاء لاخيه بظهر الغيب قال الملك الموكل به آمين ولك بمثل ''

(مسلم ج ۲ ص ۳۶۰)

حضرت ام الدرداء رضی اللہ عنہا سے مروی ہے میرے خاوند نے مجھے بتایا ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ نے فرماتے ہوئے سنا جو شخص اپنے (مومن) بھائی کی غیر موجودگی میں اس کے لئے دعاء کرتا ہے اس پر ایک فرشتہ آمین کہنے کے لئے مقرر ہوتا ہے وہ دعاء قبول ہوتی ہے۔ دعاء کرنے والے کو ایسا ہی اجر ملتا ہے۔

عظیم ہستی کا دعاء کی درخواست کرنا:

جب یہ واضح ہوا کہ کوئی دوسرا شخص کسی اور کے لئے دعاء کرے تو اس میں قبولیت پائی جاتی ہے اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو فرمایا " **اشرکنا فی دعائک** " اپنی دعاء میں ہمیں بھی شریک کرنا، نبی کریم ﷺ نے اپنے اس ارشاد سے اپنی امت کو تعلیم دی، کہ اے میری امت کے علماء اور صوفیاء حضرات تم اپنے آپ کو بے نیاز نہ سمجھنا، کسی کو اپنے سے کم سمجھ کر دعاء کی درخواست سے اجتناب نہ کرنا، بلکہ دعاء کی درخواست ہر شخص کو کرتے رہنے چاہئے۔

وفی الاثر " ادعونی بالسنة لم تعصونی فیھا " رب تعالیٰ کی طرف سے یوں کہا جاتا ہے کہ مجھ سے ان زبانوں سے دعاء کرنا جن زبانوں سے تم نے میری نافرمانی نہیں کی۔

یعنی کوئی شخص بھی رب تعالیٰ کی اپنی زبان سے نافرمانی کرتا ہے۔ تو وہ اپنے حق میں جب دعاء کرے گا تو وہ نافرمان زبان سے دعاء کر رہا ہے۔ لیکن جب دوسرے کے حق میں دعاء کرے گا تو اس کے حق میں اس کی زبان پاک ہوگی، پاک زبان سے جب یہ دعاء کرے گا تو اسے شرف قبولیت حاصل ہوگا۔

لہٰذا واضح ہوا کہ بنسبت اپنے لئے دعاء کرنے کے دوسروں کے لئے دعاء کرنا زیادہ قبولیت کا سبب ہے۔ لہٰذا دعاء کرتے وقت اپنی دعاء میں اور مومنوں کے لئے بھی دعاء کرے تا کہ ان کے طفیل اس کے اپنے حق میں بھی دعاء قبول ہو۔ (از روح المعانی)

ایک عجیب حکمت: انہوں نے کہا " **ربک** " یہ نہیں کہا " **ربنا** " یعنی انہوں نے موسیٰ علیہ السلام کو کہا تم اپنے رب سے ہمارے لئے دعاء کرو یہ نہیں کہا کہ " تم ہمارے رب سے ہمارے لئے دعاء کرو"۔

اس میں حکمت یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کو رب تعالیٰ نے خصوصی تقرب عطا فرمایا کہ آپ سے بلا

واسطہ جبرائیل کلام فرمایا، اور آپ کو توراۃ عطا فرمائی، بنی اسرائیل کو معلوم تھا کہ یہ منصب تو ہمیں حاصل نہیں۔تو گویا کہ انہوں نے کہا:

" ادع لنا المحسن الیک بما لم یحسن به الینا فکما احسن الیک من قبل نرجو ان یحسن الیکم فی اجاجة دعائک "

کہ آپ ہمارے لئے اس ذات سے دعاء کریں جس کا آپ پر بہت احسان ہے اس کے جتنے احسان آپ پر ہیں اتنے ہم پر نہیں۔اس لئے جب آپ اپنے رب سے ہمارے لئے دعاء کریں گے تو وہ آپ کی دعاء کو قبول کر کے آپ پر اور احسان فرمائے گا، کیونکہ اس کے احسان آپ پر پہلے ہی بہت عظیم ہیں۔ (روح المعانی)

گذشتہ سے پیوستہ:

حضرت ابو ہریرہ ﷜ کا نبی کریم ﷺ کی خدمت میں دعاء کی درخواست کرنا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ آپ کا بھی عقیدہ یہی تھا کہ بزرگ ہستیوں سے دعاء کرانا باعث قبولیت ہے۔

☆ " عن ابی هريرة قال اتيت النبی ﷺ بتمرات فقلت یا رسول الله ادع الله فیهن بالبركة فضمهن ثم دعاء لی فیهن بالبركة قال خذهن فاجعلهن فی مزودک كلما اردت ان تاخذ منه شيأ فادخل فيه یدک فخذه ولا تنثره نثرا فقد حملت من ذلک التمر كذا وكذا من وسق فی سبیل الله فكنا ناكل منه ونطعم وكان لا يفارق حقوی حتی كان يوم قتل عثمان فانه انقطع " (رواه الترمذی، مشکوة باب المعجزات)

حضرت ابو ہریرہ ﷜ فرماتے ہیں میں نبی کریم ﷺ کی خدمت میں چند کھجوریں لایا تو میں نے عرض کیا یا رسول اللہ آپ اللہ تعالیٰ سے ان میں برکت کی دعاء فرمادو، آپ نے وہ کھجوریں لیں پھر ان میں برکت کی دعاء کی آپ نے فرمایا یہ لے لو، ان کو اپنے توشہ دان میں ڈال لو، جب ان میں کھجوریں لینا چاہو، تو اپنا ہاتھ اس میں ڈال کر نکال لیا کرو، لیکن کھجوروں کو باہر نکال کر پھیلانا نہیں، حضرت ابو ہریرہ فرماتے ہیں ان کھجوروں میں سے ایک وسق تو میں نے اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کیں۔ہم خود کھاتے بھی رہے، کھلاتے بھی رہے، وہ کھجوریں میری کمر سے کبھی جدا نہیں ہوئیں (یعنی میں ان کو اپنی کمر سے باندھ کر رکھتا تھا) حضرت عثمان ﷜ جس دن شہید ہوئے اس دن وہ کمر سے کھل کر بکھر گئیں۔

وضاحت حدیث:

حضرت ابو ہریرہ ﷺ نے جو کھجوریں لائیں وہ کتنی مقدار میں تھیں؟

" قال الشیخ ابو نصر کانت التمرات احدی وعشرین "

شیخ ابو نصر رحمہ اللہ نے بیان فرمایا ہے کہ وہ کھجوریں صرف اکیس دانے تھے۔

نبی کریم ﷺ کی دعاء سے ان میں کتنی عظیم برکت ہوئی، کہ صرف اکیس کھجوریں اتنی زیادہ مقدار میں بڑھتی رہیں کہ ایک وسق تو حضرت ابو ہریرہ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کیں۔ وسق ساٹھ صاع کا ہوتا ہے، اور صاع تقریباً چار کلو کا ہوتا ہے۔ پھر وہ کھجوریں حضرت ابو ہریرہ ﷺ اور ان کے گھر والے خود بھی کھاتے رہے، اور دوسرے لوگوں کو بھی یعنی آنے والے مہمانوں کو بھی کھلاتے رہے۔

اگر حضرت ابو ہریرہ ﷺ سے وہ کھجوریں گر کر بکھر نہ جاتیں تو عمر بھر وہ ان سے نفع حاصل کرتے رہتے، بلکہ نسل بنسل وہ کھجوریں چلتی رہتیں۔ حضرت ابو ہریرہ ﷺ کا ایک قول یہ بھی ہے:

" وسقط منی وضاع فخزنت علیه حزنا شدیدا "

اور مجھ سے وہ کھجوریں گر گئیں اور ضائع ہو گئیں تو میں بہت زیادہ غمناک ہو گیا۔

" وفیه ایماء الی ان الفساد اذا شاع ارتفعت البرکة " یہاں سے ہی ایک اور بات واضح ہو گئی کہ فساد جب پھیل جاتا ہے تو اس کی نحوست سے برکت اٹھ جاتی ہے۔ حضرت ابو ہریرہ ﷺ افسردہ حال میں دکھ بھرے لہجہ میں فرماتے تھے۔

للناس هم ولی همان بینهم   هم الجراب وهم الشیخ عثمانا

لوگوں کا ایک غم حاصل تھا مجھے ان کے درمیان دو غم حاصل تھے ایک توشہ دان کا غم اور ایک بزرگ شخصیت حضرت عثمان کا

یعنی باقی صحابہ کرام کو ایک عظیم غم حاصل تھا، وہ حضرت عثمان ﷺ کا شہید کیا جانا، فتنہ وفساد کا نمودار ہونا، لیکن حضرت ابو ہریرہ ﷺ فرماتے ہیں مجھے دو غم لاحق تھے، ایک تو میرے توشہ دان کا میری کمر سے کھل جانا، اور کھجوروں کا بکھر جانا، کیونکہ وہی ان کھجوروں کی برکت کا آخری دن تھا۔ اور دوسرا حضرت عثمان ﷺ کی شہادت اور یہودیوں کی سازش اور باغیوں کی یلغار کی وجہ سے غم میں مبتلاء تھا۔

(از مرقاۃ ج ۱۱ ص ۳۱۷)

☆ "عن عمر بن الخطاب قال انی سمعت رسول اللہ ﷺ یقول ان خیر التابعین رجل یقال له اویس وله والدة وکان به بیاض فمروه فلیستغفرلکم"

(مسلم ج ۲ باب من فضائل اویس القرنی)

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا، بیشک تابعین میں سے بہتر وہ شخص ہے جسے اویس کہا جاتا ہے اس کی والدہ ہے (جس کی تیمارداری کی وجہ سے وہ میرے پاس نہ آسکا) اسے برص کی مرض تھی، جب اس پر تمہارا گزر ہو تو اپنے لئے اس سے مغفرت کی دعاء کرانا۔

"فیه استحباب طلب الدعاء والاستغفار من اهل الصلاح وان کان الطالب افضل منهم" (نووی)

اس حدیث سے یہ واضح ہوا کہ نیک لوگوں سے دعاء کرائی جائے، ان سے مغفرت طلب کرنے کی درخواست کی جائے، خواہ دعاء کرانے والا افضل ہی کیوں نہ ہو کیونکہ صحابہ کرام کو حضرت اویس قرنی رضی اللہ عنہ سے دعاء کرانے کو حکم دیا، جبکہ اویس تابعی تھے، صحابی تابعی سے افضل ہے۔

﴿ یُخرِجُ لَنَا مِمَّا تُنبِتُ الاَرضُ ﴾: "پیدا کرے ہمارے لئے وہ چیز جو زمین اگاتی ہے" طلباء حضرات خیال فرمائیں کہ اس مقام پر "یخرج" مجزوم ہے کہ "ادع" امر کے جواب میں واقع ہے۔

اگرچہ علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے دو قول اور بھی نقل کئے ہیں لیکن ان میں تکلفات ہیں آسان صورت یہی ہے جو بیان کر دی گئی۔ ﴿ یُخرِجُ لَنَا ﴾ کا اگرچہ حقیقی معنی ہے اظہار، یعنی ظاہر کرنا۔ لیکن یہاں مجازی معنی مراد ہے جو حقیقی معنی کو مستلزم ہے: "وهو الاظهار بطریق الایجاد" وہ ظاہر کرنا بطریق ایجاد، یعنی پیدا کرے ہمارے لئے وہ چیزیں جو زمین اگاتی ہے۔ (روح المعانی)

زمین کی طرف اگانے کی نسبت مجازی طور پر ہے، ظاہری طور پر سبب زمین ہے ورنہ حقیقت میں رب تعالیٰ کا فعل ہے۔ (بیضاوی)

بنی اسرائیل نے زمین کی پیداوار کا سوال کیوں کیا تھا؟ اسی کی وجہ یہ تھی "وهم کانوا فلاحة

فنزعوا الی عکرھم واشتھوا ما الفوہ " (بیضاوی) اس لئے کہ وہ کسان تھے، کھیتی باڑی کا کام کرنے والے تھے، لہذا وہ اپنے اصل کی طرف لوٹے، اور جس چیز کی خواہش رکھتے تھے اسی کی انہوں نے تمنا کی۔ کیونکہ انسان کی اصل تربیت میں جس کی طرف رغبت ہو، عادت کے مطابق اسی کی وہ خواہش رکھتا ہے، خواہ وہ گھٹیا ہی کیوں نہ ہو، اور اس کے مقابل دوسری چیز اعلی ہی کیوں نہ ہو۔

اور وجہ یہ تھی کہ وہ میدان تیہ میں چالیس سال سے من اور سلوی کھا رہے تھے، جس سے وہ اکتا گئے انہوں نے مطالبہ کیا کہ اب ہمارا کھانا بدل دیا جائے۔ اور وجہ یہ تھی کہ انہیں یہ معلوم تھا کہ زمین کی پیداوار میدان تیہ جیسے چٹیل مقام میں تو حاصل ہو نہیں سکتی، یقیناً کہیں زرخیز زمین سے حاصل ہو گی لہذا ان کی تمنا یہ تھی کہ ہمیں میدان تیہ سے نکال کر کسی شہر میں بھیج دیا جائے جہاں ہم آباد بھی ہو جائیں اور ہماری خواہش کے مطابق ہمیں غذا بھی حاصل ہو جائے۔

اور وجہ یہ تھی کہ انہوں نے طبیب حضرات کے اس قول کا خیال کیا کہ ایک ہی کھانا ہمیشہ کھانے سے شہوت میں نقصان ہوتا ہے، ہضم میں کمی ہو جاتی ہے، رغبت کم ہو جاتی ہے، لیکن مختلف قسم کے کھانے تناول کرنے سے شہوت میں قوت آ جاتی ہے، اور لذت بڑھ جاتی ہے تو انہوں نے اطباء کے ان اقوال کو دیکھتے ہوئے تمنا کی کہ ہمارا کھانا بدل جائے ہمیں زمین کی پیداوار حاصل ہو۔ (از کبیر)

﴿مِنْ بَقْلِهَا﴾ : من بیان کے لئے ہے جس کا معنی ہوتا ہے یعنی اور " بقل " سے مراد علامہ بیضاوی بیان کرتے ہیں:

" والبقل ما انبته الارض من الخضر والمراد به اطايبه التی تو كل "
حقیقت میں بقل کا معنی زمین کے اگانے والی ہر قسم کی سبزی، جو گھاس وغیرہ کو بھی شامل ہے لیکن یہاں مراد سبزی سے وہ ترکاری جو کھائی جاتی ہے۔

﴿وَقِثَّآئِهَا﴾ : فارسی زبان میں " قثــــاء " کا معنی خیار ہے۔ پھر اس کی دو قسمیں ہیں، ایک " خیار دراز " جسے ککڑی کہا جاتا ہے ہماری زبان میں " تر " کہتے ہیں اور دوسری قسم " خیار خرد " یعنی کھیرا۔ آیۃ کریمہ میں مراد عام ہے انہوں نے ککڑی اور کھیرے دونوں کا ہی مطالبہ کیا تھا۔

(از عزیزی)

﴿ وفومها ﴾: "اختلف فی الفوم فقیل هو الثوم لانه المشاکل للبصل، وقیل الفوم الحنطة روی عن ابن عباس ایضا واکثر المفسرین" (از قرطبی)

"فوم" کے معنی میں اختلاف ہے بعض نے کہا کہ یوں "فوم" سے مراد تھوم (لہسن) ہے کیونکہ یہ پیاز کا ہم شکل ہے اور احکام بھی دنوں کے ایک ہی ہیں، اور بعض حضرات نے کہا آیۃ کریمہ میں "فوم" سے مراد گندم ہے یہی قول حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا ہے۔ اور یہی قول اکثر مفسرین کرام کا ہے۔ اسی لئے مترجمین نے گندم ہی معنی کیا ہے۔

﴿ وعدسها ﴾: عدس کا معنی مشہور ہے "مسور" یعنی عدس سے مراد جب زمین کی پیداوار مراد لیں تو اس وقت معنی فقط "مسور" ہی ہوگا۔ تاہم "عدس" کے اور معانی بھی آتے ہیں۔ خچر کو زجر کنا، مشقت اٹھانا، شدید پائمال کرنا، چلنا۔ انسان کے جسم پر آبلے بن جائیں تو ان کو "عدسۃ" کہا جاتا ہے۔ (از قرطبی)

﴿ وبصلها ﴾: "بصل" کا معنی پیاز، ان چیزوں کا ذکر صرف مثال کے طور پر تھا، کہ ہمیں زمین کی پیداوار عطا ہو۔ یعنی مثال کے طور پر سبزی اور ککڑی اور گندم اور مسور اور پیاز۔ صرف ان چیزوں کا مطالبہ کرنا ان میں انحصار (بند) کرنا مقصود نہیں تھا۔ اگرچہ تفسیر عزیزی، روح المعانی اور شیخ زادہ نے ان چیزوں کے مطالبہ کی حکمتیں بھی بیان کی ہیں۔ لیکن راقم نے ان بحثوں کو غیر ضروری سمجھ کر صرف نظر کرلیا۔

فوائد: البتہ یہاں ایسی بحثوں کا ذکر کیا جارہا ہے جو قارئین کے لئے زیادہ مفید ہیں۔

☆ "عن عائشة قالت کانت امی تعالجنی للسمنة، ترید ان تدخلنی علی رسول الله ﷺ فما استقام لها ذلک حتی اکلت القثاء بالرطب فسمنت کا حسن سمنة" (رواه ابن ماجه وسناده صحیح، قرطبی)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں میری والدہ میرے موٹا ہونے کیلئے علاج کررہی تھیں۔ وہ چاہتی تھیں کہ مجھے رسول اللہ ﷺ کے پاس بھیجیں، لیکن ان کو اس پر کامیابی حاصل نہیں ہورہی تھی۔ یہاں تک کہ میں ککڑی یا کھیرا کھجور سے ملا کر کھانے لگی تو مجھ پر موٹاپا آ گیا۔

مسئلہ : پیاز اور لہسن پکا کر کھائے جائیں جب ان کی بو زائل ہو جائے تو جائز ہے اس میں کوئی کراہیت نہیں خواہ وہ نماز سے پہلے ہی کیوں نہ کھالے۔ کچے پیاز اور لہسن کو کھانا جب کہ ان میں بو پائی جائے عام اوقات میں جائز ہے البتہ نماز سے پہلے کھانا مکروہ ہے کیونکہ ان کی بو سے دوسرے نمازیوں کو تکلیف ہوتی ہے۔ اور نماز میں شریک فرشتوں کو بھی تکلیف ہوتی ہے۔

اعتراض : نبی کریم ﷺ کے ارشاد سے تو کچے پیاز اور لہسن کو کھانا مطلقاً منع نظر آتا ہے صرف نماز کے وقت کی قید لگانا تو درست نہیں: " واحتجوا بان رسول الله ﷺ سماها خبيثة " ان معترضین کی دلیل یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ان کو خبیث کہا۔ اور اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کا وصف بیان فرمایا:

" ويحرم عليهم الخبائث " کہ آپ خبیث چیزوں کو حرام کرنیوالے ہیں۔

تو اس سے پتہ چلا کہ جس چیز کو رسول اللہ ﷺ نے خبیث کہا ہے وہ مطلقاً حرام ہے۔

جواب : دوسری احادیث میں واضح طور پر ذکر ہے کہ ان کو پکا کر ان کی بو کو زائل کر دیا جائے تو ان کا کھانا جائز ہے۔ ان کو نہ پکایا جائے تو کھا کر مسجد میں آنا منع ہے۔ نبی کریم ﷺ نے خود صحابہ کرام کو کچے پیاز کھانے کے لئے دیئے۔ اگر مطلقاً حرام ہوتے تو آپ ان کو نہ دیتے۔ آپ کا ان کو خبیث کہنا بدبودار کے معنی میں ہے۔

یہ بھی خیال رہے کہ خود نبی کریم ﷺ نے احتیاط اور تقوی کے طور پر لہسن والا پکا ہوا سالن بھی استعمال نہیں فرمایا لیکن صحابہ کرام کو اس کی اجازت دی۔ آیئے ان مسائل پر احادیث مبارکہ کو دیکھیں۔

☆ " عن جابر ان النبی ﷺ اتی ببدر فيه خضرات من بقول فوجد لها ريحا ، قال فاخبر بما فيها من البقول قال قربوها ، الى بعض اصحابه كان معه فلما رآه كره اكلها ، قال كل فاني اناجي من لا تناجي " (اخرجہ مسلم وابوداؤد)

حضرت جابر ﷛ فرماتے ہیں بیشک نبی کریم ﷺ کی خدمت میں ایک طشت میں کچھ سبزیاں پیش کی گئیں۔ لیکن ان میں بو پائی گئی (جیسا کہ پیاز وغیرہ میں ہوتی ہے) جب آپ کو بتایا گیا تو آپ نے اپنے پاس بیٹھے ہوئے صحابی کے متعلق فرمایا کہ یہ ان کو دے دو، جب نبی کریم ﷺ نے ان کو دیکھا کہ وہ کھانے میں کراہیت محسوس کر رہے ہیں۔ تو آپ نے فرمایا تم کھالو، بیشک میں اس ذات سے مناجات

کرتا ہوں جس سے تم نہیں کرتے۔

" فهذا بين في الخصوص له والاباحة لغيره " اس سے واضح طور پر معلوم ہو گیا کہ تمام اوقات میں کچے پیاز اور لہسن کو نبی کریم ﷺ کا استعمال نہ کرنا آپ کی تخصیص تھی دوسرے لوگوں کے لئے جائز ہے۔

پیاز لہسن کھا کر مسجد میں آنے کی ممانعت:

حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت میں آتا ہے:

" من الكل البصل والثوم والكراث فلا يقربن مسجدنا فان الملائكة تتاذى مما يتأذى مه بنو آدم "

جس شخص نے پیاز اور لہسن اور کراث (ایک قسم کا ساگ جس میں پیاز اور لہسن کی طرح بو آتی ہے) کھایا وہ ہماری مسجدوں میں نہ آئے کیونکہ فرشتوں کو اس چیز سے تکلیف ہوتی ہے جس سے انسانوں کو تکلیف ہوتی ہے۔

☆ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی ایک طویل حدیث میں ذکر ہے:

" انكم ايها الناس تأكلون شجرتين لااراهما لا خبيثتين هذا البصل والثوم ولقد رأيت رسول الله ﷺ اذا وجد ريحهما من الرجل فى المسجد امر به فاخرج الى البقيع فمن اكلهما فليمتهما طبخا .... خرجه مسلم .

بیشک تم اے لوگو یہ دو سبزیاں کھاتے ہو، لیکن میں ان کو خبیث (ناپسند، بدبودار) سمجھتا ہوں۔ وہ پیاز اور لہسن ہیں۔ اور تحقیق میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا جب آپ ان دونوں میں سے کسی کی بو کسی شخص میں مسجد میں پاتے تو آپ اس کو بقیع کی طرف چلے جانے کا حکم عطا فرماتے، (اور فرماتے) جو شخص ان دونوں کو کھانا چاہے تو ان کو پکا کران کی بو کو زائل کرے۔

اس حدیث سے یہ بھی واضح طور پر معلوم ہو گیا کہ پیاز اور لہسن پکا کر کھانا، اور کھا کر مسجد میں آنا جائز ہے اور کچے پیاز اور لہسن کھا کر مسجد میں آنا منع ہے۔

نبی کریم ﷺ کا کچے لہسن سے پرہیز کرنا:

" عن ابی ایوب ان النبی ﷺ نزل علیه فنزل النبی ﷺ فی السفل وابو ایوب فی العلو فانتبه ابو ایوب لیلة فقال نمشی فوق رأس رسول الله ﷺ فتنحوا فباتوا فی جانب ثم قال للنبی ﷺ فقال النبی ﷺ السفل ارفق فقال لا اعلو سقیفة انت تحتها فتحول النبی ﷺ فی العلو وابو ایوب فی السفل فکان یصنع للنبی ﷺ طعاما فاذا جی به الیه سال عن موضع اصابعه فیتتبع موضع اصابعه فصنع له طعاما فیه ثوم فلمارد الیه سأل عن موضع اصابع النبی ﷺ فقیل له لم یاکل ففزع وصعد الیه فقال احرام هو قال النبی ﷺ لا ، ولکن اکرهه قال فانی اکره ماتکره اوما کرهت قال وکان النبی ﷺ یؤتی بالوحی "

(مسلم ج ۲ ص ۱۹۱ باب اباحة اکل الثوم)

حضرت ابوایوب انصاری ﷺ فرماتے ہیں بیشک نبی کریم ﷺ (جب ہجرت کر کے مدینہ طیبہ میں آئے) میرے گھر اترے، آپ نے مکان کے نیچے حصہ میں قیام کیا اور ابو ایوب نے اوپر والے حصہ میں۔ ایک رات حضرت ابوایوب (اچانک) جاگ پڑے (خیال آگیا) کہا ہم رسول اللہ ﷺ کے سر کے اوپر چل رہے ہیں۔ تمام گھر والوں نے رات مکان کے ایک کونہ میں گزار دی۔ پھر نبی کریم ﷺ کی خدمت میں عرض کیا (کہ آپ اوپر تشریف لے آئیں) آپ نے فرمایا میرے لئے نیچے والا حصے میں رہنا آسان ہے حضرت ابوایوب نے عرض کیا، یارسول اللہ میں بھی اس چھت پر نہیں رہ سکتا جس کے نیچے آپ تشریف فرما ہوں۔ نبی کریم ﷺ اوپر تشریف لے گئے اور حضرت ابو ایوب نیچے آ گئے۔ وہ نبی کریم ﷺ کے لئے کھانا تیار کرتے تھے۔ جب بچا ہوا کھانا واپس آتا، تو پوچھتے رسول اللہ ﷺ کی انگلیاں کہاں لگی ہیں۔ آپ کی انگلیوں والی جگہ سے حضرت ابوایوب تناول فرماتے۔ ایک دن انہوں نے کھانا تیار کیا اس میں لہسن ڈالا جب کھانا واپس آیا تو انہوں نے پوچھا رسول اللہ ﷺ کی انگلیاں کہاں لگی ہیں تو ان کو بتایا گیا کہ حضور نے کھانا تناول نہیں فرمایا۔ یہ گھبرا گئے، اوپر گئے، اور آپ سے پوچھا یا رسول اللہ کیا یہ حرام ہے؟ نبی کریم ﷺ نے فرمایا نہیں۔ لیکن میں اسے ناپسند سمجھتا ہوں۔ حضرت ابوایوب نے عرض کیا میں بھی اسے ناپسند کرتا ہوں جسے آپ ناپسند سمجھتے ہیں۔

حضرت ابوایوب کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کے پاس وحی آتی تھی۔

وضاحت حدیث:

نبی کریم ﷺ سے جب حضرت ابوایوب ؓ نے پوچھا" احرام ھو "کیا یہ حرام ہے؟ تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا" لا "نہیں (حرام تو نہیں)" ھذا تصریح باباحۃ الثوم وھو مجمع علیہ" یہ تصریح ہے کہ لہسن مباح ہے اسی پر امت کا اجماع ہے۔

" وکان ﷺ یترک الثوم دائما لانہ یتوقع مجئی الملائکۃ والوحی کل ساعۃ "

نبی کریم ﷺ ہمیشہ لہسن کے استعمال کو ترک فرماتے تھے کیونکہ آپ کو ہر وقت فرشتے کے آنے کی توقع رہتی کیونکہ آپ کے پاس وحی ہر وقت آتی رہتی تھی۔ یعنی وحی کا وقت مقرر نہیں تھا۔

حضرت ابوایوب ؓ نبی کریم ﷺ سے جو کھانا بچ کر آتا وہ تناول فرماتے، اس سے یہ پتہ چلا۔

" قال العلماء فی ھذا انہ یستحب للآکل والشارب ان یفضل مما یاکل ویشرب فضلہ لیواسی بھا من بعدہ لا سیما ان کان ممن یتبرک بفضلتہ "

علماء کرام نے فرمایا کہ کھانا کھانے والے شخص کو چاہئے کہ وہ اپنے کھانے اور پینے سے کچھ بچادے تا کہ اس کے کھانے اور پینے سے جو بچ رہے وہ بعد میں دوسروں کے بھی کام آسکے۔ خصوصاً وہ شخص جس کے بچے ہوئے کھانے پینے سے دوسرے حضرات تبرک حاصل کرتے ہوں۔ اسے اپنے طعام اور مشروب سے ضرور بچانا چاہئے۔

" وکذا اذا کان فی الطعام قلۃ ولھم الیہ حاجۃ "

جب کھانا کم ہو گھر والے لوگوں کو اس کی ضرورت ہو تو ایسی صورت میں کھانے کا بچانا ضروری ہے۔

" ویتاکد ھذا فی حق الضیف لاسیما ان کانت عادۃ اھل الطعام ان یخرجوا کل ما عندھم وتنظر عیالھم الفضلۃ کما یفعلہ کثیر من الناس "

مہمان کے لئے تو بہت ضروری ہے کہ وہ کھانا تھوڑا مناسب مقدار میں کھائے اور بچا کر

واپس دے کیونکہ اکثر لوگوں کی عادت یہ ہے کہ وہ طعام مہمانوں کے آگے رکھ دیتے ہیں، ان کے اہل وعیال اس انتظار میں ہوتے ہیں کہ کھانا بچ کر آئے گا تو کھائیں گے۔ اکثر لوگوں کی یہی عادت، اس لئے ایسے حال میں مہمانوں کا تمام کھانا ہڑپ کر جانا حماقت سے خالی نہیں۔

"ونقلوا ان السلف کانوا یستحبون افضال ھذہ الفضلة المذکورة وھذا الحدیث اصل ذلک کله"

سلف صالحین سے یہی منقول ہے کہ وہ نیک لوگوں کے بچے ہوئے کھانے، پینے کا استعمال مستحب سمجھتے، یہی حدیث ان کی دلیل ہے نبی کریم ﷺ کا پہلے نیچے والے حصہ میں قیام کرنا اپنی اور ملاقات کے لئے آنے والے صحابہ کرام کی آسانی کے لئے تھا۔

"واما کراھة ابی ایوب فمن الادب المحبوب الجمیل وفیه اجلال اھل الفضل والمبالغة فی الادب معھم"

حضرت ابوایوب رضی اللہ عنہ کا اوپر رہنے کو ناپسند کرنا، بہت ہی ادب کی وجہ سے تھا، اور اس میں اہل فضل کی بزرگی کا پاس کرنا، اور ان کے ساتھ بہت زیادہ ادب میں مبالغہ کرنے کا ثبوت ملتا ہے۔

اس حدیث پاک سے حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کی فضیلت کئی وجہ سے ثابت ہو رہی ہے:

(۱) "نزوله ﷺ" نبی کریم ﷺ کا ان کے گھر قیام کرنا وہ بھی اللہ تعالیٰ کے حکم سے۔

(۲) "ادبه معه" حضرت ابوایوب رضی اللہ عنہ کے دل میں نبی کریم ﷺ کا بہت زیادہ ادب واحترام پایا جانا۔

(۳) "موافقته فی ترک الثوم" نبی کریم ﷺ کے بتانے کے باوجود کہ لہسن (پکے ہوئے طعام میں کسی حال میں بھی) حرام نہیں، لیکن میں ناپسند کرتا ہوں، جیسا کہ دوسری روایت میں ہے کہ میں اس سے کلام کرتا ہوں جس سے تم کلام نہیں کرتے۔ لیکن حضرت ابوایوب رضی اللہ عنہ کا یہ کہنا "انی اکرہ ما ترکه" میں بھی اس چیز کو ناپسند کرتا ہوں جسے آپ ناپسند کرتے ہیں۔ یہ دلالت کرتا ہے کہ آپ کو نبی کریم ﷺ کے افعال کی تابعداری کامل طور پر حاصل تھی، اور آپ کو حضور سے بہت زیادہ محبت تھی۔

"ومن اوصاف المحب الصادق ان یحب ما احب محبوبه ویکرہ ما کرہ"

سچے محبت کے اوصاف ہی یہ ہیں کہ وہ محبوب کی پسندیدہ چیزوں سے محبت کرے اور جن چیزوں کو محبوب ناپسند سمجھے ان کو ناپسند سمجھے۔ (نووی) (ماخوذ از قرطبی)

مسور کا ذکر: حضرت علی رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ذیشان بیان فرماتے ہیں:

" علیکم بالعدس فانه مبارک مقدس وانه یرق القلب ویکثر الدمعة فانه بارک فیه سبعون نبیا آخرهم عیسی بن مریم "

تم مسور کا استعمال کرو، بیشک یہ مبارک اور مقدس ہے، اس سے دل میں نرمی آتی ہے، اور آنسو زیادہ آتے ہیں، اس میں ستر انبیاء کرام نے برکت بیان کی ہے، آخر میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اس میں برکت کا ذکر فرمایا۔ (قاله الجوهری)

" وکان عمر بن عبد العزیز یاکل یوما خبزا بزیت ویوما بلحم ویوما بعدس "

حضرت عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ ایک دن روٹی زیتون سے کھاتے، اور ایک دن گوشت سے اور ایک دن مسور سے۔ (ذکره الثعلبی وغیره)

" والعدس والزیت طعام الصالحین " مسور اور زیتون نیک لوگوں کا طعام ہے۔ (قاله الحلیمی)

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دستر خوان پر مسور ضرور ہوتے جب آپ کسی کی مہمان نوازی کرتے، مسور سے بدن میں خفت (ہلکا پن) آتی ہے، جس کی وجہ سے انسان عبادت میں سستی نہیں کرتا اور مسور سے شہوات میں زیادتی نہیں ہوتی جیسا کہ گوشت سے شہوات کی زیادتی ہوتی ہے، اور یہ بھی واضح ہے کہ شہوات کی زیادتی سے گناہوں میں مبتلاء ہونے کا خطرہ رہتا ہے۔ (ماخوذ از قرطبی)

﴿ وَفُومِهَا ﴾: " فوم " کا اگرچہ معنی لہسن بھی لیا گیا ہے، لیکن آیۃ کریمہ میں زیادہ مفسرین کرام نے گندم ہی معنی مراد لیا ہے:

" والشعیر قریب منها وکان طعام اهل المدینة "

اور جو بھی گندم کے کچھ قریب ہیں، اور مدینہ طیبہ والے حضرات کا زیادہ طور پر طعام جو کی روٹی ہی ہوا کرتی تھی۔

" کما کان العدس من طعام قریة ابراهیم علیه السلام فصار لکل واحد من الحبتین باحد النبیین علیهما السلام فضیلة "

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شہر میں مسور کے زیادہ پائے جانے کی وجہ سے، اور آپ کے دستر خوان میں مسور کے استعمال سے مسور کو فضیلت حاصل ہوگئی۔

اور نبی کریم ﷺ کے شہر میں جو کے زیادہ استعمال کی وجہ سے، اور خود نبی کریم ﷺ کے جو کی روٹی کے استعمال سے جو کو فضیلت حاصل ہوگئی۔

" وقدوری ان النبی ﷺ لم یشبع ھو واھلہ من خبز بر ثلاثۃ ایام متتابعۃ منذ قدم المدینۃ الی ان توفاہ اللہ عزوجل "

(حضرت عائشہ رضی اللہ عنہما سے) روایت بیان کی گئی ہے کہ بیشک نبی کریم ﷺ نے اور آپ کے گھر والوں نے تین دن لگاتار سیر ہو کر گندم کی روٹی نہیں کھائی، جب سے آپ مدینہ طیبہ میں تشریف لائے یہاں تک کہ نبی کریم ﷺ دنیا سے تشریف لے گئے۔

یعنی نبی کریم ﷺ مدینہ طیبہ میں زندگی بھر جو کی روٹی کھاتے رہے وہ بھی پیٹ بھر کر میسر نہیں تھی۔

(از قرطبی)

افسوس صد افسوس جہلاء کی عقل پر ہے جو بات بات پر یہ پوچھتے ہیں، نبی کریم ﷺ نے یہاں دعاء کی تھی یا نہیں۔ کیا یہاں ہاتھ اٹھا کر دعاء کی تھی؟ جن چیزوں کی نفی یا ثبوت کا ظاہر طور پر ذکر نہیں وہ پوچھا جاتا ہے اور جس کا واضح ذکر ہے اس کی طرف توجہ نہیں۔ نبی کریم ﷺ نے تین دن مسلسل گندم کی روٹی سیر ہو کر نہیں کھائی، لیکن لوگ ہر دن تین وقت گندم کی روٹی سیر ہو کر بھی کھا رہے ہیں، پھر دلیلیں بھی یہ دے رہے ہیں یہ کام نبی کریم ﷺ نے نہیں کیا۔

افسوس صرف اس پر ہے کہ پڑھے لکھے ہوئے لوگوں کی عقلوں پر پردہ چھا گیا۔ جس کی وجہ سے وہ احمق ہو گئے۔

﴿ قَالَ اَتَسْتَبْدِلُوْنَ الَّذِیْ هُوَ اَدْنٰی بِالَّذِیْ هُوَ خَیْرٌ ﴾ : "کہا کیا تم تبدیلی چاہتے ہو اس کی جو گھٹیا ہے اس کے بدلے جو بہتر ہے" "بنی اسرائیل کے اس مطالبہ پر کہ ہمیں زمین کی پیداوار حاصل ہو" کے جواب میں یہ کہا گیا کیا تم اعلیٰ چیز کے بدلے گھٹیا چیز حاصل کرنا چاہتے ہو؟ " الاستبدال وضع الشئی موضع آخر " ایک چیز کی جگہ دوسری کو رکھنا " استبدال " کہلاتا ہے اسی سے " بدل " کا بھی استعمال ہے۔

﴿ اَدْنٰی ﴾ : زجاج کے نزدیک " دنـو " سے ماخوذ ہے، یعنی قیمت میں قرب۔ اسی معنی کے اعتبار سے جس کپڑے کی قیمت کم ہو اسے " ثوب مقارب " کہا جاتا ہے۔

علی بن سلیمان کا قول یہ ہے کہ "ادنی" ماخوذ ہے " دنـــی " سے جس کا معنی ہے "گھٹیا ہونا" بلکہ "ادنی" اسے کہا جائے گا جس کا گھٹیا ہونا بہت زیادہ واضح ہو۔ اس قول کے مطابقہ ہمزہ میں تخفیف کی گئی ہے۔
بعض حضرات نے کہا ہے کہ یہ ماخوذ ہے " دون " سے جس کا معنی ہونا " احـــط " پست ہونا۔ اصل میں یہ "ادون" بروزن افعل ہوتا ہے۔ پھر قلب کیا گیا، افلع کا وزن بنایا گیا یعنی "ادنو" ہوا پھر واؤ برطرف ماقبل فتح الف سے بدلا تو "ادنی" ہوگیا۔
خیال رہے کہ اصل میں کیا ہے؟ اس میں اگرچہ تین قول ہیں، جن کو نقل کیا گیا ہے، لیکن تینوں کا معنی یہاں ایک ہی ہے یعنی "گھٹیا" چیز۔
ومعنی الایة: " اتستبدلون البقل والقثاء والفوم والعدس والبصل الذی هو ادنی بالمن والسلوی هو خیر "

من اور سلوی کی فوقیت:

من اور سلوی کے بدلے ان کا زمین کی پیداوار طلب کرنا، اعلی کے بدلے گھٹیا چیز کی طلب تھی، وہ اعلی من اور سلوی تھے، وہ اعلی کیوں تھے؟ اس کی چند وجہ ہیں:

۱) سبزیوں وغیرہ کو من اور سلوی سے کوئی نسبت ہی حاصل نہیں تھی تو یقیناً من اور سلوی افضل تھے، کہاں ان کی لذت، کہاں ان کے کمالات اور کہاں سبزیوں کی لذت اور ان کے مقابل نہ رکھنا۔

۲) من اور سلوی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان پر خصوصی انعام تھا، اور رب تعالیٰ کی طرف سے ہی ان کو کھانے کا حکم ہی تھا، یہ واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم پر قائم رہنا، اور اس کی نعمت کا شکر ادا کرنا ہی باعث اجر ہے اور یہی اجر وثواب آخرت کا ذخیرہ اور توشہ ہونا ہے۔ اور جو چیزیں وہ طلب کرر ہے تھے وہ اس عظمت سے خالی تھیں، اس لئے ان کو بنسبت من اور سلوی کے گھٹیا قرار دیا۔

(۳) جو چیزیں اللہ تعالیٰ نے ان کو بطور احسان عطا فرمائی تھیں، ان میں لذت اور غذائیت بھی زیادہ تھیں، کیونکہ وہ لوگ جن چیزوں کا مطالبہ کر رہے تھے وہ ان کی بنسبت کم درجہ تھیں۔

(۴) رب تعالیٰ کی طرف سے جو نعمت ان کو میسر تھی اس میں انہیں کوئی تکلیف نہیں اٹھانی پڑتی تھی۔ اور نہ ہی اس میں کوئی محنت، مشقت اور تھکاوٹ لازم آتی۔ اسی وجہ سے وہ نعمت فضیلت رکھتی تھی بنسبت اس کے جس کا وہ مطالبہ کر رہے تھے، کیونکہ اس میں ہل چلانا، فصل کاشت کرنا، فصل کاٹنا وغیرہ ہر طرح کی محنت ہی محنت تھی۔

(۵) جو نعمت ان کو رب تعالیٰ سے مل رہی تھی اس میں یہ کوئی شک نہیں پایا جاتا تھا کہ وہ نعمت حاصل ہوگی یا نہیں۔ کوئی چھین تو نہیں لے گا، اس پر کوئی زوال تو نہیں آئے گا۔

لیکن جو نعمت وہ حاصل کرنا چاہتے تھے اس پر ہر طرح کے خطرات تھے، کیونکہ کبھی زمین فروخت ہوگئی کبھی بیج میسر نہ ہوا، کبھی زمین پر غاصبانہ قبضہ ہوگیا۔ کبھی فصل کاشت کر دیا لیکن بارش نہ ہوئی، کبھی ژالہ باری سے تباہ ہوگیا وغیرہ، یقیناً اس طرح کے خطرات میں مبتلاء ہونے والی اشیاء گھٹیا تھیں۔

(ماخوذ از قرطبی)

مسئلہ : فی ھذہ الآیۃ دلیل علی جواز اکل الطیبات والمطاعم المستلذات، وکان النبی ﷺ یحب الحلوی والعسل ویشرب الماء البارد العذب "

اس آیۂ کریمہ سے یہ مسئلہ سمجھ آیا کہ پاکیزہ، حلال اور لذت والے طعام کھانے جائز ہیں۔ کیونکہ نبی کریم ﷺ حلوا اور شہد پسند فرماتے تھے (حلوا سے مراد ہر میٹھی چیز) اور آپ ٹھنڈا، میٹھا پانی پیتے تھے۔

(قرطبی)

﴿ اِهْبِطُوْا مِصْرًا فَاِنَّ لَكُمْ مَّا سَاَلْتُمْ ﴾ :

"اتر جاؤ شہر میں بیشک تمہارے لئے وہ ہے جو تم نے سوال کیا"

میدان تیہ بلندی پر تھا اور جس شہر میں ان کو اترنے کا حکم دیا وہ پستی پر تھا۔ اس معنی کے لحاظ سے " ہبوط " کا معنی حقیقی ہوگا جو " صعود " کی ضد ہے، یعنی اترنا۔ لیکن کبھی " ہبوط " کا مجازی معنی مراد لیا جاتا ہے، جس کا مطلب ہوتا ہے، آنا، یعنی شہر میں آجاؤ۔

﴿ مِصْرًا ﴾ : سے مراد خاص مشہور شہر مصر ہے، یا کہ مطلقاً اس کا معنی شہر ہے۔ اور پھر یہ منصرف ہے یا غیر منصرف ہے۔ اس میں مختلف قول ہیں۔ کسی ایک کو راجح نہ سمجھتے ہوئے اعلیٰ حضرت نے اپنے ترجمہ میں لکھا ''اچھا مصر میں یا کسی شہر میں اترو''

راقم نے مطلقاً ''شہر'' معنی کیا ہے چونکہ کئی مفسرین کرام نے اس معنی کو ترجیح دی ہے۔
''واللہ اعلم بالصواب''

﴿ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ ﴾ : ''اور ڈال دی گئی ان پر ذلت اور محتاجی''

'' احیطت بهم احاطة القبة بمن ضربت علیه ''خیمہ لگانے کے لئے '' ضرب '' لفظ استعمال ہوتا ہے، مطلب یہ ہوا کہ جس طرح خیمہ احاطہ کرتا ہے، اسی طرح ذلت اور محتاجی نے ان کا احاطہ کرلیا: '' او الصقت بهم من ضرب الطین علی الحائط '' یا معنی یہ ہے کہ ذلت اور محتاجی ان کے ساتھ متصل ہوگئی (چمٹ گئی) جس طرح کہا جاتا ہے '' ضرب الطین علی الحائط '' کیچڑ سے دیوار پر لپائی کر دی گئی۔ (بیضاوی)

اور کہا جاتا ہے '' ضرب الحاکم علی الید ، ای حمل والزم'' حاکم نے یہ کام لازم کر دیا ہے اور اس کو سر انجام دینے کے لئے رعایا کو اس پر برانگیختہ کیا ہے۔

اب مطلب یہ ہوگا '' الزموهما وقضی علیهم بهما '' کہ یہود نے ذلت اور محتاجی کو لازم پکڑا، تو رب تعالیٰ نے بھی ان کے حق میں فیصلہ دے دیا۔

ذلت سے مراد:

'' قال الحسن اذلهم الله فلا منعة لهم وجعلهم تحت اقدام المسلمین ولقد ادرکتهم هذه الامة ''

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ذلت سے یہی مراد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو ذلیل کر دیا، ان کو شوکت اور دبدبہ نہیں دیا، اور ان کو مسلمانوں کے قدموں کے نیچے کر دیا، اور ان کو نبی کریم ﷺ اور آپ کی امت نے ذلیل کر کے جلاوطن کر دیا۔

ایک قول یہ ہے کہ ''ذلت'' سے مراد جزیہ ہے ﴿ يُعْطُوْنَ الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ ﴾

میں ان کی ذلت جزیہ کو قرار دیا گیا۔ (از ابن کثیر)

لیکن اس قول کو علامہ رازی رحمہ اللہ نے رد کرتے ہوئے فرمایا:

" قول الجزیة بعید لان الجزیة ما کانت مضروبة علیهم من اول الامر "

جزیہ والا قول درست نہیں کیونکہ ابتدائی طور پر ہی ان پر جزیہ مقرر نہیں کیا گیا۔

علامہ رازی رحمہ اللہ کا مختار ہی عظیم ترین قول ہے آپ فرماتے ہیں:

" والاقرب فی الذلة ان یکون المراد منها ما یجری مجری الاستحقاق کقوله تعالیٰ فیمن یحارب ویفسد ﴿ ذٰلِکَ لَهُمْ خِزْیٌ فِی الدُّنْیَا ﴾

ذلت سے مراد، فہم کے زیادہ قریب معنی یہ ہے کہ ہر وہ کام جو ذلت کا سبب بنے، یعنی ان کو مستحق ذلت بنا دیا گیا ہے کہ وہ کام ہی ایسے کرتے رہیں گے کہ ان کی وجہ سے ذلیل ہوتے رہیں گے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے لڑائی اور فساد بھڑکانے والوں کے متعلق فرمایا "یہ ان کے لئے رسوائی ہے دنیا میں" یعنی ان کے کام ہی ان کے لئے دنیا میں رسوائی کا ذریعہ بن گئے۔ (از کبیر)

مسکنت سے مراد:

" فالمراد به الفقر والفاقة وتشدید المحنة فهذ الجنس یجوز ان یکون کالعقوبة "

اس سے مراد فقر، فاقہ، شدید محنت ہے، ہوسکتا ہے یہ جنس بھی عقوبت کی طرح ہی ہو، یعنی ہر قسم کی محتاجی اور سزا کے مستحق ہونے کے ذرائع ان پر مسلط کر دیئے گئے۔

فائدہ جلیلہ:

" ومن العلماء من عد هذا من باب المعجزات لانه علیه السلام اخبر عن ضرب الذلة والمسکنة علیهم ووقع الامر کذلک فکان هذا اخبارا عن الغیب فیکون معجزا " (کبیر)

نبی کریم ﷺ کا یہود کے متعلق خبر دینا کہ ان پر ذلت اور محتاجی ڈال دی گئی، یعنی ذلت محتاجی ان پر

چھا گئی، پھر جیسے نبی کریم ﷺ نے خبر دی، اس طرح واقع ہو جانا، یہ نبی کریم ﷺ کی غیب کی خبر ہے، اور آپ کا معجزہ ہے، سبحان اللہ علامہ رازی رحمہ اللہ نے کیا خوب بیان فرمایا کہ حضور کا علم غیب در حقیقت آپ کا معجزہ ہے، کسی کو سمجھ آ جائے تو بہتر، نہ سمجھ آئے تو اس کی قسمت۔

یہود کی ذلت پر علامہ کاظمی رحمہ اللہ کا شاندار بیان:

قوم یہود پر ذلت و مسکنت کا مسلط ہونا ایسی حقیقت ثابتہ ہے، جس کا انکار واقعات کی روشنی میں کوئی اہل انصاف نہیں کر سکتا۔ قرآن مجید بھی "علی روس الاشهاد" (واضح شہادت سے) فرما رہا ہے کہ ذلت و مسکنت اور دنیا و آخرت میں اللہ کا غضب ان کے حق میں مقدر ہو چکا ہے، دنیا جانتی ہے کہ یہود کی تاریخ مسلمانوں اور عیسائیوں دونوں سے بہت پرانی اور قدیم ہے، ابتداء سے لے کر آج تک ان کی تاریخ کو سامنے رکھ لیجئے کوئی دوران کا ذلت و مسکنت سے آپ کو خالی نظر نہیں آئے گا۔ حالانکہ ایک طبقہ ان کا بہت بڑا سرمایہ دار ہے، لیکن انتہائی بخیل (کنجوس) اور حریص۔

بخیل کتنا ہی مالدار ہو مگر بخل کی وجہ سے وہ ہمیشہ مسکینی کی ہیئت (شکل) پر رہتا ہے، اور حریص کمال حرص کے سبب ہر جائز و ناجائز طریقہ سے مال جمع کرنے کی فکر میں رنج و تعقب (مصیبت اور مشقت) میں مبتلاء رہتا ہے، پھر یہ کہ سب یہودی مال دار نہیں بلکہ بہت سے یہود فقر و مسکنت کا شکار ہیں۔

حیوانیت و بربریت، ظلم و جور، دکھی انسانیت پر لرزہ خیز مظالم ان کی طبائع میں مرکوز (پختہ موجود) ہیں۔ عہد شکنی، وعدہ خلافی ان کا طرۂ امتیاز ہے۔ ان کے ظلم و ستم کے باعث اقوام عالم کی نظروں میں وہ لائق گردن زنی (گردن اڑا دینے کے قابل) رہے ہیں۔ اسی لئے ان کی پوری تاریخ میں ایسا کوئی وقت نہیں آیا کہ ان کے جرائم کی پاداش میں لوگ انہیں قتل کرنے اور سخت تکلیفیں پہنچانے کے درپے نہ رہے ہوں۔ قرآن کے اعلان کے مطابق یہ سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا۔

جیسا کہ سورۃ الاعراف میں فرمایا:

﴿ وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّکَ لَیَبْعَثَنَّ عَلَیْهِمْ اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَةِ مَنْ یَّسُوْمُهُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ ﴾

"یعنی آپ کے رب نے بتا دیا تھا کہ وہ ان یہود پر قیامت تک ایسے لوگوں کو بھیجتا رہے گا، جو

انہیں بدترین عذاب دیں گے"

☆ اس زمانہ میں بھی جب کہ یہود کی نام نہاد حکومت فلسطین میں قائم ہے، مظلوم فلسطینی ہر وقت ان کی تاک میں رہتے ہیں۔ گویا کہ وہ یہودیوں پر مسلط رہتے ہیں۔ جب بھی انہیں موقع ملتا ہے وہ یہود کو تکلیفیں پہنچانے، قتل کرنے اور قیدی بنانے کا موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے، اور یقیناً یہ صورت حال قیامت تک جاری رہے گی۔

البتہ ان کے لئے جان و مال کی بے حرمتی سے بچنا اللہ کی رسی کے سہارے ہوسکتا ہے، یا اس کے علاوہ ذلت وخواری سے محض (فقط) بظاہر محفوظ رہنا لوگوں کی رسی کے ذریعے ممکن ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ اَيْنَمَا ثُقِفُوْا اِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللهِ وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ ﴾

"یعنی وہ جہاں بھی پائے جائیں ذلت ان پر مسلط کردی گئی بجز اللہ کی رسی اور لوگوں کی رس کے"

اللہ کی رسی سے مراد قرآن اور اسلام ہے (قرآنی اور اسلامی حکم ایک ہے):

﴿وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ ﴾

یعنی اگر کوئی مشرک تم سے پناہ مانگے تو اسے پناہ دے دو۔

اور ارشاد فرمایا ﴿ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ ﴾ یعنی (اگر وہ پناہ طلب نہ کریں تو) ان کا مال وجان محفوظ نہیں، یہاں تک کہ وہ ذلیل ہو کر اپنے ہاتھ سے جزیہ ادا کریں، اگرچہ پناہ مانگنا اور جزیہ ادا کرنا دونوں باتیں موجب ذلت ہیں، مگر اللہ کے دین میں مستامن (جس نے امن طلب کیا) اور ذمی کا جان و مال بے حرمتی سے محفوظ رہتا ہے۔ اور لوگوں کی رسی سے مراد یہ ہے کہ غیر مسلم لوگ ان سے معاہدہ کر کے ان کی حفاظت کا ذمہ اٹھالیں۔

جیسا کہ آج کل بعض غیر مسلم بڑی طاقتوں نے یہود سے معاہدہ کر کے ان کی حفاظت کا ذمہ اٹھایا ہوا ہے، جس کے بل بوتے پر فلسطین میں یہود کی بے بنیاد حکومت کا ڈھانچہ کھڑا ہے، اگر وہ لوگ آج اپنا معاہدہ ختم کردیں تو یہ نام نہاد حکومت باقی نہ رہے۔ بعض مفسرین نے لوگوں کی رسی کا مفہوم جزیہ بیان کیا ہے۔ اس صورت میں اللہ کی رسی اور لوگوں کی رسی ایک ہی قرار پائے گی۔ حالانکہ انسب یہ ہے

کہ یہ دونوں علیحدہ ہوں۔ (ملخصا البحر المحیط ج ۳ ص ۳۲، ابن کثیر ج ۱ ص ۳۹۶)

غالباً اسی لئے قرآن مجید میں ''وحبل من المسلمین'' کی بجائے ﴿ وَحَبۡلٍ مِّنَ النَّاسِ ﴾ فرمایا گیا ہے ایسی حکومت کا قیام قرآن کی پیشگوئی کے خلاف ہرگز نہیں۔ بلکہ ''حبل من الناس'' کے الفاظ اس مسئلہ میں قرآنی صداقت کا اعلان کر رہے ہیں اور دنیا دیکھ رہی ہے کہ قرآن کے مطابق محض لوگوں کے سہارے فلسطین میں بے بنیاد اسرائیلی حکومت قائم ہے، جو آج بھی حقیقی ذلت و مسکنت اور اللہ کے غضب میں مبتلاء ہیں اور یقیناً آخرت میں بھی اللہ کے غضب میں یہ لوگ مبتلاء ہوں گے۔

(تبیان للکاظمی)

﴿ وَبَاءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ﴾ : ''اور وہ لوٹے اللہ کے غضب سے'' ''وباء وا ای انقلبوا ورجعوا الی الزامھم ذلک'' اور وہ لوٹے اللہ کے غضب سے یعنی انہوں نے اپنے کرتوتوں سے اللہ کے غضب کو اپنے آپ پر لازم قرار دے دیا۔ نبی کریم ﷺ کی ایک دعاء میں بھی یہ لفظ اسی معنی میں استعمال ہے:

''ابوء بنعمتک علی، ای اقربھا والزمھا نفسی''

اے اللہ تیری نعمتیں جو مجھ پر ہیں میں ان کا اقرار کرتا ہوں، اور اپنے نفس پر ان کو لازم پکڑتا ہوں یعنی تو نے اپنے فضل و کرم سے مجھے ان کا مستحق ہونے کا شرف عطاء فرما دیا ہے۔

اصل لغت میں رجوع (لوٹنے) کے معنی میں ہی استعمال ہوتا ہے، جیسا کہ کہا جاتا ہے ''باء بکذا، ای رجع بہ'' ''فلاں شخص اس طرح کے حالات سے لوٹا'' اور کہا جاتا ہے ''وباء الی المباءۃ'' وہ اپنی منزل میں لوٹا ''مباءۃ'' کا معنی ہے لوٹنے کی جگہ۔ (قرطبی)

تنبیہ : ''ولا یقال باء الا بشر'' اگرچہ ''باء'' کا معنی مطلقاً لوٹنا بھی آتا ہے، لیکن استعمال میں زیادہ اس کا تعلق شر سے ہو گیا۔ یعنی خیر سے لوٹنے کے لئے ''باء'' کو استعمال نہیں کیا جاتا۔ بلکہ شر سے لوٹنے کے لئے ''باء'' کو استعمال کیا جاتا ہے۔ (کبیر) ''ولا یقال باء الا موصولا اما بخیر واما بشر'' (ابن کثیر) باء مطلقاً استعمال نہیں ہوتا بلکہ خیر یا شر کے ساتھ متصل استعمال ہوتا ہے کبیر اور ابن کثیر کے مجموعہ کلام سے یہ مطلب حاصل ہوا کہ ''باء'' کا استعمال شر میں زیادہ

ہے اور خیر میں کم ہے۔

" البوء التسوية ، باء يبوء بوء " برابری کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔اس معنی کے لحاظ سے آیۂ کریمہ میں معنی ہوگا " استوی علیهم غضب الله " ان پر اللہ کا غضب برابر ہوگیا (یہ قول زجاج کا ہے)" وباء وا ای استحقوا " اور " باء وا " کا معنی ہے مستحق ہونا۔یعنی وہ اللہ تعالیٰ کے غضب کے مستحق ہوگئے جیسا کہ اسی معنی میں اس آیۂ کریمہ میں استعمال " انی ارید ان تبوء باثمی واثمک " (ہابیل نے قابیل کو کہا)۔بیشک میں چاہتا ہوں کہ تو مستحق ہوجائے میرے گناہ کا اور اپنے گناہ کا یعنی دونوں گناہوں کا مستحق تو ہی ہو۔

﴿ بِغَضَبٍ ﴾: " واما غضب الله فهو ارادة الانتقام " (کبیر)

اللہ کے غضب سے مراد انتقام کا ارادہ رکھنا۔

خیال رہے ﴿ غیر المغضوب علیهم ﴾ میں تفصیلی طور پر "غضب" کے متعلق بحث گزر چکی ہے۔غضب سے مراد اس طرح بیان کی جائے، کہ وہ دنیا میں عذاب اور انتقام کے مستحق ہوئے، اور آخرت میں جس عذاب کے حقدار تھے اسکے مستحق ہوئے۔اسی طرح دنیاوی اور اخروی طور پر ہر ذلت اور غیظ وغضب کے مستحق ہوئے یہاں یہ معنی کرنا زیادہ بہتر ہے " صاروا احقاء به " وہ غضب کے مستحق ہوگئے۔کیونکہ رب تعالیٰ نے صراحۃً یہ نہیں ذکر فرمایا، وہ کہاں سے لوٹے اور کس طرف لوٹے۔

(از روح المعانی)

﴿ ذٰلِکَ بِاَنَّھُمۡ کَانُوۡا یَکۡفُرُوۡنَ بِاٰیٰتِ اللّٰہِ ﴾:

"یہ اس وجہ سے کہ بیشک وہ کفر کرتے تھے اللہ کی آیتوں سے"

یہاں سے ان لوگوں پر ذلت ومسکنت کے مسلط ہونے اور غضب کے مستحق ہونے کی وجہ بیان کی جارہی ہے کہ وہ اس کے مستحق کیوں ہوئے۔

﴿ ذٰلِکَ ﴾ کا مشارالیہ " ضرب الذلة والمسكنة والبوء بالغضب " ذلت ومسکنت کا مسلط ہونا اور غضب کا مستحق ہونا۔﴿ بِاَنَّھُمۡ ﴾ میں "با" سببیت کے لئے ہے۔اور اللہ تعالیٰ کی آیات سے مراد یا تو موسیٰ علیہ السلام کے معجزات ہیں۔اور یا توراۃ کی بعض آیات ہیں۔

اب مطلب یہ ہوگا کہ ان پر ذلت ومحتاجی کا مسلط ہونا اوران کا غضب کا مستحق ہونا اس وجہ سے تھا کہ انہوں نے موسیٰ علیہ السلام کے معجزات ظاہر دیکھ کر بھی کفر کیا۔ بنی اسرائیل کے لئے دریا کا پھٹ جانا اور فرعون کا غرق ہونا، میدان تیہ میں ان پر بادل کا سایہ کرنا، من اور سلویٰ کا ان پر اترنا، اور پتھر سے چشموں کا جاری ہونا۔ یہ تمام معجزات ان کے سامنے ثابت ہوئے لیکن انہوں نے کفر کیا۔

اور پہلی آسمانی کتابوں یعنی توراۃ، انجیل پر انہوں نے کما حقہ (جیسا کہ حق تھا) ایمان نہ لایا، بلکہ کفر کیا۔ آیۃ رجم کا انہوں نے انکار کیا۔ اور توراۃ میں نبی کریم ﷺ کے جو اوصاف تھے ان کو چھپانے کی مذموم کوشش انہوں نے کی اور ان سے کفر کیا۔ یہی کفران کی ذلت ورسوائی، ان کی محتاجی اور ان کے غضب کے مستحق ہونے کا سبب بنا۔ (بیضاوی)

﴿ وَيَقْتُلُونَ النَّبِيِّينَ بِغَيْرِ الْحَقِّ ﴾ : ''اور شہید کرتے تھے انبیاء کو ناحق'' ان پر ذلت اور محتاجی کے مسلط ہونے اور اللہ تعالیٰ کے غضب کے مستحق ہونے کی اور وجہ یہ بیان کی گئی کہ وہ انبیاء کرام کو ناحق شہید کرتے تھے۔

انبیاء کرام کو شہید کرنے کی وجہ:

" واھانتم حملة الشرع وھم الانبیاء واتباعھم فانتقصوھم الی ان افضی بھم الحال الی ان قتلوھم"

ان کی ذلت کی وجہ یہ تھی کہ انہوں نے حاملین شرع یعنی انبیاء کرام اوران کے متبعین کی توہین کی اوران کے نقص بیان کئے، اسی کی وجہ سے ان کو یہ نحوست حاصل ہوئی کہ وہ اس حال پر پہنچ گئے کہ انہوں نے انبیاء کرام کو شہید کرڈالا۔

اس سے بڑھ کر اور عظیم کفر کیا ہوسکتا ہے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی آیات سے کفر کیا اور انبیاء کرام کو ناحق شہید کیا۔ (واضح ہوا کہ انبیاء کرام کی توہین کرنا اور نقص بیان کرنا طریقہ یہود ہے)۔

☆ حدیث شریف جس کی صحت پر اتفاق ہے " ان رسول اللہ ﷺ قال الکبر بطر الحق وغمط الناس " بیشک نبی کریم ﷺ نے فرمایا، تکبر یہ ہے کہ حق سے اکڑ کر پھر جانا اور لوگوں کو گھٹیا سمجھنا۔

بنی اسرائیل کی گمراہی کا سبب بھی اسی قسم کا تکبر تھا۔

☆ حضرت ابن مسعودؓ فرماتے ہیں میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، آپ کے پاس مالک بن مرارہ رہاوی تھے، میں نے ان کو یہ کہتے ہوئے پایا:

" یا رسول اللہ قد قسم لی من الجمال ما تری فما احب ان احدا من الناس فضلنی بشراکین فما فوقھما الیس ذلک ھو البغی فقال لا لیس ذلک من البغی ولکن البغی من بطر اوقال سفه الحق وغمط الناس (یعنی رد الحق وانتقاص الناس والاز دراء بھم والتعاظم علیھم "

یارسول اللہ ﷺ اللہ تعالیٰ نے مجھے جمال (خوبصورتی) کا وہ حصہ عطا فرمایا جو آپ دیکھ رہے ہیں مجھے یہ پسند نہیں کہ لوگوں میں سے کوئی شخص مجھ پر (خوبصورتی میں) دو تسموں کے برابر یا ان سے کچھ زائد فضیلت رکھے۔ کیا یہ سرکشی تو نہیں؟ آپ نے فرمایا نہیں، یہ سرکشی نہیں۔ بلکہ سرکشی یہ ہے کہ حق کو رد کر دیا جائے، لوگوں کو گھٹیا سمجھا جائے (یعنی لوگوں پر عیب لگایا جائے اپنے آپ کو بڑا سمجھا جائے)۔ (ابن کثیر)

اعتراض: رب تعالیٰ نے ذکر فرمایا ﴿ بِغَيْرِ الْحَقِّ ﴾ "ناحق" انبیاء کرام کو شہید کرنا جب ہمیشہ ناحق ہی ہوتا ہے تو " بغیر الحق " کہنے کا کیا فائدہ ہے۔

جواب: بعض اوقات کام باطل ہوتا ہے، ناحق ہوتا ہے لیکن وہ کام کرنے والا شخص اس کام کو حق سمجھتا ہے، لیکن انبیاء کرام کو شہید کرنے والے خود بھی اپنے آپ کو باطل راہ پر سمجھتے تھے، اور اپنے اس فعل کو قبیح (برا) سمجھتے تھے۔ (از کبیر)

اعتراض: " کیف جاز ان یخلی بین الکافرین وقتل الانبیاء " کافروں کو انبیاء کرام کے شہید کرنے کی اجازت دینا کس طرح جائز ہے؟ (یہ تو انبیاء کرام کی توہین ہے)۔

جواب:

" ذلک کرامة لھم وزیادة فی منازلھم ، کمثل من یقتل فی سبیل اللہ من المؤمنین ولیس ذلک بخذ لان لھم "

انبیاء کرام کی شہادت ان کی کرامت کی زیادتی کا سبب تھی، اور ان کے مدارج اس سے بلند

ہوئے، جیسا کہ مومنین اللہ تعالیٰ کی راہ میں شہید ہونے والے شہادت سے بلند رتبہ حاصل کر لیتے ہیں یہ ان کی رسوائی نہیں ہوتی۔

" قال ابن عباس والحسن ، لم يقتل بنى قط من الانبياء الا من لم يؤمر بقتال و كل من امر بقتال نصر "

حضرت ابن عباس اور حسن بصری رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے انبیاء کرام میں کسی نبی کو شہید نہیں کیا گیا، سوائے اس کے کہ جن انبیاء کرام کو جہاد کی اجازت نہیں دی گئی، یعنی صرف وہی شہید ہوئے جن کو جہاد کی اجازت نہیں دی گئی۔ البتہ جن کو جہاد کی اجازت دی گئی وہ کامیاب ہوئے کیونکہ ان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے کافروں کے خلاف امداد دی گئی۔

یہود نے ایک دن میں ستر انبیاء کرام کو شہید کیا۔ جس پر ان کو کوئی غم لاحق نہ ہوا، نہ کوئی پریشانی ہوئی۔ (جمل) .... یہود نے جن انبیاء کرام کو شہید کیا ان میں جلیل القدر انبیاء کرام حضرت زکریا، حضرت یحیٰ، حضرت شعیب علیہم السلام تھے۔ (بیضاوی)

انبیاء کرام کو شہید کرنا یہود کی زبانی: تب خدا کی روح .... زکریا پر نازل ہوئی سو وہ لوگوں سے بلند جگہ پر کھڑا ہو کر کہنے لگا......... چونکہ تم نے خدا کو چھوڑا ہے اس نے بھی تم کو چھوڑ دیا۔ تب انہوں نے اس کے خلاف سازش کی اور بادشاہ کے حکم سے خداوند کے گھر کے صحن میں اسے سنگسار کر دیا۔

(۲ تواریخ ۲۴، ۲۰، ۲۱)

☆ اسی طرح مرقس کے باب ۶ کی آیات ۱۷ تا ۲۹ میں حضرت یوحنا (یحیٰ علیہم السلام) کے متعلق مذکور ہے۔ کہ جب آپ نے ہیرودیس بادشاہ کو اس پر ٹوکا کہ اس نے اپنے بھائی فلپس کی بیوی ہیرودیاس کو اپنے پاس کیوں رکھا ہوا ہے تو بادشاہ نے پہلے انہیں قید کر دیا، بعد میں اپنی داشتہ کی فرمائش پر آپ کا سر کاٹا اور ایک تھال میں رکھ کر اس کی خدمت میں پیش کیا۔ (ضیاء القرآن)

☆ پھر جب یہودیہ کی ریاست میں علانیہ بت پرستی اور بدکاری ہونے لگی اور زکریا نبی نے اس کے خلاف آواز بلند کی تو شاہ یہوداہ اس کے حکم سے انہیں عین ہیکل سلیمانی میں مقدس اور قربان گاہ کے درمیان سنگسار کر دیا۔

(۲ تورایخ باب ۲۴ آیت ۲۱)

انبیاء کرام کو جیل میں بھیجنا یہود کی زبانی:

ایک اور نبی حضرت میکایاہ کو اسی اخی اب نے حق گوئی کے جرم میں جیل بھیجا اور حکم دیا کہ اس شخص کو مصیبت کی روٹی کھلانا اور مصیبت کا پانی پلانا۔ (سلاطین باب ۲۲ آیت ۲۶، ۲۷)

☆ حضرت سلیمان کے بعد جب بنی اسرائیل کی سلطنت تقسیم ہو کر دو ریاستوں میں یعنی یروشلم کی دولت یہودیہ اور سامریہ کی دولت اسرائیل میں بٹ گئی تو ان میں باہم لڑائیوں کا سلسلہ شروع ہوا اور نوبت یہاں تک آئی کہ یہودیہ کی ریاست نے اپنے ہی بھائیوں کے خلاف دمشق کی ارامی سلطنت سے مدد مانگی۔اس پر خدا کے حکم سے حنانی نبی نے یہودیہ کے فرمانروا آسا کو سخت تنبیہ کی۔مگر آسا نے اس تنبیہ کو قبول کرنے کے بجائے خدا کے پیغمبر کو جیل بھیج دیا۔ (۲۔ تواریخ باب ۱۷۔ آیت ۷، ۱۰)

لفظ نبی کے متعلق: اگرچہ چوتھے رکوع میں عصمت انبیاء کے ذکر میں لفظ نبی کی کافی حد تک بحث ہو چکی ہے۔تاہم اس مقام پر علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے مزید بحث فرمائی، اس کا خلاصہ یہ ہے۔

" نبی "مشتق ہے " نبأ " سے جس کا معنی ہے خبر دینا۔نافع رحمہ اللہ نے تمام قرآن پاک میں جہاں بھی ذکر ہے ہمزہ سے پڑھا ہے یعنی " نبیئین " پڑھا ہے۔صرف دو مقام پر " باء " سے پڑھا ہے۔ایک " ان وھبت نفسھا للنبی ان اراد " میں اور دوسرا " ولا تدخلوا بیوت النبی " میں۔اور " نبی " ہمزہ کے بغیر " نبا ینبو نبوا " سے بھی لیا جاتا ہے جس کا معنی ظاہر ہونا۔اور " نبوۃ " سے مشتق کرتے ہیں جبکہ معنی ہوتا ہے " ارتفاع " بلند ہونا۔اس معنی کے لحاظ سے نبی کو نبی کہنے کی وجہ یہ ہوگی کہ وہ رفیع الشان، بلند مرتبہ ہوتے ہیں۔اور کبھی " نبی " کا معنی راستہ ہوتا ہے۔اللہ تعالیٰ کے پیغمبروں کو نبی اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ مخلوق کو ہدایت کرتے ہیں، جیسا کہ راستہ ہدایت کرتا ہے۔

اعتراض: تم نے بیان کیا ہے کہ " نبی " مشتق ہے " نبأ " سے، جس میں ہمزہ آتا ہے اور معنی ہوتا ہے " خبر دینا " حالانکہ ایک روایت میں آتا ہے کہ ایک شخص نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا " السلام علیک یا نبیء اللہ " یعنی ہمزہ سے " نبیء " ذکر کیا۔رسول اللہ ﷺ نے فرمایا " لست بنبیء اللہ " وھمز، ولکنی نبی اللہ " ولم یھمز۔میں نبیء اللہ (ہمزہ سے) نہیں۔لیکن میں تو " نبی اللہ "

(بغیر ہمزہ کے) ہوں۔ تو کس طرح یہ ثابت کرنا درست ہے کہ "نبی" مشتق ہے " نبأ " سے۔

جواب : " قال ابو علی ضعف سند هذا الحديث " ابوعلی رحمہ اللہ نے بیان فرمایا کہ اس حدیث کی سند کو ضعیف قرار دیا گیا ہے۔ بلکہ اس سے قوی سند والی حدیث سے ثابت ہے " قد انشده المادح ، يا خاتم النباء " کہ نبی کریم ﷺ کی مدح کرنے والے نے آپکے سامنے شعر پڑھا، جس میں "يا خاتم النبأ " ذکر فرمایا۔ " ولم يؤثر في ذلك انكار " لیکن آپ نے اس میں انکار نہیں فرمایا۔ گویا کہ حدیث تقریری جس کی سند قوی ہے اس پر دلالت کر رہی ہے کہ "نبی" مشتق ہے "نبأ" سے

(از قرطبی)

﴿ ذٰلِکَ بِمَا عَصَوا وَّ كَانُوا يَعْتَدُونَ ﴾ : "(اور) یہ اس وجہ سے کہ انہوں نے نافرمانی کی اور حد سے تجاوز کرتے تھے"۔ یعنی بنی اسرائیل نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کر کے، اور حد سے تجاوز کر کے اللہ تعالیٰ کی آیات سے کفر کیا اور انبیاء کرام کو شہید کیا، دراصل وجہ یہ ہے کہ:

" ان صغار الذنوب سبب يؤدي الى ارتكاب كبارها كما ان صغار الطاعات اسباب مؤدية الى تحري كبارها "

"بیشک چھوٹے چھوٹے گناہ انسان کو بڑے گناہوں کا مرتکب بنا دیتے ہیں۔ جیسا کہ چھوٹی چھوٹی نیکیاں کرنے والا انسان بڑے بڑے نیکی کے کام شروع کر دیتا ہے۔

اسی طرح بنی اسرائیل بھی اللہ تعالیٰ اور اس کے نبی کے احکام کے نافرمانی کرتے کرتے اتنے بڑے جرائم کے مرتکب ہو گئے کہ اللہ تعالیٰ کی آیات سے کفر کرنے لگے اور انبیاء کرام کو شہید کرنے لگے۔

(از بیضاوی)

☆☆☆

﴿ اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِیْنَ هَادُوْا وَالنَّصٰرٰی وَالصَّابِئِیْنَ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ ﴾

۱) ”بے شک ایمان والے نیز یہودیوں اور نصرانیوں اور ستارہ پرستوں میں سے وہ کہ سچے دل سے اللہ اور پچھلے دن پر ایمان لائیں اور نیک کام کریں۔ ان کا ثواب ان کے رب کے پاس ہے، اور نہ انہیں کچھ اندیشہ ہو اور نہ کچھ غم“

۲) ”بیشک وہ لوگ جنہوں نے ایمان لایا، اور وہ لوگ جو یہودی ہوئے، اور نصرانی اور صابئ (ان میں سے) جو شخص ایمان لایا اللہ پر اور آخرت کے دن پر اور نیک عمل کئے۔ تو ان کے لئے ان کا اجر ان کے رب کے ہاں ہے، اور ان پر کوئی خوف نہیں ہوگا اور نہ ان پر کوئی غم“

شان نزول:

۱) جب یہود اور نصاریٰ نے اپنے اپنے دعوے کئے کہ جنت میں صرف ہم ہی داخل ہوں گے، ہمارے بغیر جنت میں کوئی اور نہیں جائے گا، ان کے اس دعویٰ کو قرآن پاک میں ان الفاظ مبارکہ سے پیش کیا گیا:

﴿ وَقَالُوْا لَنْ یَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰی ﴾

”اور انہوں نے کہا جنت میں ہرگز کوئی نہیں داخل ہوگا، سوائے ان کے جو یہودی ہوئے یا نصرانی“

یعنی یہودیوں نے کہا جنت میں صرف یہودی جائیں گے، اور نصاریٰ نے کہا جنت میں صرف نصاریٰ جائیں گے۔ تو ان کے اس کہنے پر اس آیۃ کریمہ کا نزول ہوا کہ خواہ ایمان والے ہوں یا یہودی ہوں یا نصرانی ہوں یا ستارہ پرست ہوں جنت میں وہی جائیں گے۔ اچھے اجر کے مستحق وہی ہوں گے جن کا اللہ تعالیٰ پر اور آخرت پر ایمان ہوگا۔

یعنی جولوگ نبی کریم ﷺ اور آپ کی شریعت پر ایمان لائیں گے۔ان کا ایمان ہی معتبر ہوگا۔ جن لوگوں کا ایمان معتبر ہوگا، جنت کے وہی مستحق ہوں گے، جن کا ایمان ہی معتبر نہ ہوا وہ جنت کے حقدار کیسے بن بیٹھے۔ (ماخوذ از ضیاء القرآن وتبیان للکاظمی)

(۲) "نزلت فی اصحاب سلمان الفارسی بینا هو یحدث النبی ﷺ اذ ذکر اصحابه فاخبره خبرهم فقال کانوا یصلون ویصومون ویؤمنون بک ویشهدون انک ستبعث نبیا فلنا فرغ سلمان من ثنائه علیهم قال له نبی الله ﷺ یا سلمان هم من اهل النار فاشتد ذلک علی سلمان فانزل الله تعالیٰ هذه الایة" (ابن کثیر)

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت مین اپنے یہودی ساتھیوں کی تعریف کرنے لگے،اوران لوگوں کی خبر بیان کرتے ہوئے عرض کیا کہ وہ لوگ نماز پڑھتے تھے،روزے رکھتے تھے اور آپ پر ایمان رکھتے تھے اور یہ گواہی دیتے تھے کہ آپ ہی آخری نبی مبعوث ہوں گے۔ جب حضرت سلمان ان لوگوں کی تعریف کر کے فارغ ہوئے تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اے سلمان وہ جہنمی ہیں۔حضرت سلمان پر یہ ارشاد شاق (تکلیف دہ) گزرا،تو اللہ تعالیٰ نے اس آیہ کریمہ کو نازل کیا۔

یعنی مقصد بیان واضح ہے کہ نبی کریم ﷺ کی تشریف آوری سے پہلے ان لوگوں کا ایمان لانا کافی نہیں، بلکہ آپ کے تشریف لانے کے بعد جن لوگوں نے آپ پر ایمان لایا اور خلوص دل سے ایمان قبول کیا اور اس پر قائم رہے ان کا ہی ایمان معتبر ہے۔

ایک روایت میں ہے کہ جب نبی کریم ﷺ نے فرمایا "هم اصحاب النار" وہ لوگ جہنمی ہیں۔تو حضرت سلمان کہتے ہیں:

"فاظلمت علی الارض فنزلت ان الذین آمنوا والذین هادوا ......الخ

فکانما کشف عنی الجبل"

کہ مجھ پر زمین تاریک ہوگئی (اور آپ کا ارشاد پہاڑ بن کر گرا) جب یہ آیت نازل ہوئی تو گویا کہ وہ پہاڑ مجھ سے ہٹ گیا۔ (درمنشور)

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ: اسی مقام پر علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے بیان فرمایا ہے کہ حضرت سلمان رضی اللہ عنہ نیشا پور کے علاقہ کے رہنے والے تھے۔آپ اس علاقہ کے اشراف سے تھے۔بادشاہ کا بیٹا آپ کا

دوست تھا، یہ اکثر اوقات ایک ساتھ ہی رہتے تھے، ایک دن یہ دونوں شکار کرنے کے لئے گئے تو ان کو ایک خیمہ نظر آیا۔ وہاں یہ گئے تو دیکھا کہ ایک شخص خیمہ کے اندر ایک کتاب پڑھ رہا ہے۔ اور ساتھ ساتھ رو رہا ہے۔ انہوں نے اس سے پوچھا یہ کیسی کتاب ہے۔ اس شخص نے کہا خیمہ سے باہر کھڑے کھڑے سوال کا کیا مطلب ہے، اگر تم کچھ علم حاصل کرنا چاہتے ہو تو اندر آ جاؤ، یہ دونوں اندر چلے گئے۔

اس شخص نے ان کو بتایا یہ اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے اس میں رب تعالیٰ کی طاعت کا حکم دیا گیا ہے، اور اس کی معصیت سے منع کیا گیا ہے۔ یعنی چوری کرنے، زنا کرنے، لوگوں کا مال ناحق طور پر لینے سے منع کیا گیا ہے۔

اس کتاب کے اور بھی کئی احکام اس نے ان کو بتائے۔ وہ کتاب انجیل تھی جو اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ علیہ السلام پر نازل فرمائی تھی (خیال رہے آج کل انجیل اصلی حال میں نہیں ملتی، بلکہ عیسائیوں کی من گھڑت کتاب کا نام آج کل انجیل ہے) ان کے دلوں پر بہت اثر ہوا، انہوں نے توبہ کی، اور انجیل پر ایمان لایا۔ اس شخص (راہب) نے ان دونوں کو بتایا کہ تمہاری قوم کافر ہے ان کے ذبح کئے ہوئے جانوروں کا گوشت نہ کھانا۔

یہ دونوں حضرات اس راہب کے پاس زیادہ وقت گزارتے، اور اس سے انجیل کا علم حاصل کرتے، عید کے دن بادشاہ نے اپنے دسترخوان پر مختلف قسم کے کھانے تیار کرنے کا حکم دیا، اور بڑے بڑے سرکردہ لوگوں کو دعوت دی۔ اپنے بیٹے کو بھی اس دعوت میں شرکت کے لئے بلایا، لیکن اس نے انکار کر دیا کہ میں تمہاری دعوت میں شریک نہیں ہو سکتا، تم اور تمہارے احباب ہی وہ کھانا کھا لو۔

کئی آدمی بلانے کے لئے گئے، وہ ناکام ہو کر لوٹ آئے، آخرکار بادشاہ نے زبردستی اپنے بیٹے کو اپنے دربار میں حاضر کرا دیا۔ اور پوچھا کہ تم ہماری دعوت میں کیوں شریک نہیں ہو رہے؟ اس لڑکے نے بتایا کہ تم لوگ کافر ہو، تمہارے ہاتھوں سے ذبح کئے ہوئے جانور حرام ہیں۔ میں حرام گوشت نہیں کھاتا۔ بادشاہ نے اس سے پوچھا تمہیں کس نے بتایا ہے؟ لڑکے نے جواب دیا مجھے راہب نے بتایا ہے۔ راہب کو بلایا گیا اور بادشاہ نے پوچھا میرا بیٹا کیا کہتا ہے؟ اس نے کہا تمہارا بیٹا ٹھیک کہتا ہے۔ یعنی میں نے ہی اسے یہ تعلیم دی ہے۔ بادشاہ نے کہا اگر قتل کرنا ہمارے نزدیک عظیم جرم نہ ہوتا، تو میں تمہیں قتل کرا دیتا لیکن تم ہماری زمین سے نکل جاؤ تمہیں جلاوطن کیا جاتا ہے۔

سلمان کہتے ہیں ہم نے راہب کے اس حال پر رونا شروع کیا، اس نے کہا اگر تم سچے ہو تو موصل کے عبادت خانہ میں آ جانا وہاں ساٹھ حضرات ہیں جو اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مشغول ہیں۔ راہب چلا گیا سلمان اور بادشاہ کا بیٹا وہیں رہ گئے۔ سلمان بادشاہ کے بیٹے کو کہتے "چلو" ہمیں چلنا چاہئے وہ بھی کہتا ٹھیک ہے۔ لیکن اس کے سامان وغیرہ بیچنے اور تیاری کرنے میں دیر ہو گئی۔ سلمان اکیلے ہی چلے گئے، عبادت خانہ میں ان لوگوں کے پاس پہنچ گئے، اس عبادت خانہ کا منتظم راہب حضرات سے بھی بلند مرتبہ رکھتا تھا۔ سلمان بھی عبادت کرنے میں مکمل ریاضت اور مشقت اٹھاتے رہے۔

ایک دن سلمان نے اس شخص کو کہا تم مجھے کیا حکم کرتے ہو کہ میں کوئی افضل کام کروں، یعنی مجھے اس میں تم کوئی مشورہ دو۔ اس شخص نے کہا کہ میں اس عبادت خانہ کا منتظم ہوں۔ کسی کو نکالنا چاہوں تو نکال بھی سکتا ہوں، لیکن میں اپنی عبادت کو کم سمجھتے ہوئے یہاں سے ایک اور عبادت خانہ میں جا رہا ہوں۔ تم یہاں رہنا چاہو تو یہاں ہی رہو، اور میرے ساتھ دوسرے عبادت خانہ میں منتقل ہونا چاہو تو منتقل ہو جاؤ سلمان نے اس سے پوچھا کہ کس عبادت خانہ میں عبادت کرنے والے افضلیت رکھتے ہیں۔ اس نے کہا یہاں کے لوگ افضل ہیں۔ سلمان نے کہا میں پھر یہیں رہوں گا۔ سلمان وہاں ہی رہے، اسی عبادت خانہ میں لوگوں سے مل کر عبادت میں مشغول رہے۔

پھر وہ شیخ عالم بیت المقدس میں جانے لگے، تو انہوں نے سلمان کو کہا اگر تم میرے ساتھ بیت المقدس چلنا چاہتے ہو تو چلو، اور اگر تم یہاں رہنا چاہتے ہو تو یہاں ہی رہو۔

سلمانؓ نے ان سے پوچھا افضل کیا ہے، یہاں رہنا، یا بیت المقدس میں جانا؟ انہوں نے کہا بیت المقدس میں جانا بہتر ہے۔ پھر دونوں بیت المقدس آ گئے، ایک دن شیخ نے سلمان کو کہا اس مسجد میں بہت علماء حضرات تشریف لاتے ہیں تم ان کے پاس جا کر علم حاصل کرو۔ سلمان جاتے ان سے علم حاصل کرتے۔

ایک دن سلمان بڑے غمناک حال میں واپس لوٹے، شیخ نے پوچھا، غمزدہ ہونے کی کیا وجہ ہے؟ انہوں نے کہا خیر کا زمانہ تو ہم سے پہلے گزر گیا، کیونکہ انبیاء کرام اور ان کی زیارت کرنے والے ہم سے پہلے گزر گئے۔ شیخ نے کہا:

"لا تحزن فانه بقی نبی لیس من نبی بافضل منه"

غم نہ کرو ابھی ایک نبی تشریف لانے والے ہیں جن سے کوئی نبی افضل نہیں۔

یہی وہ زمانہ ہے جسمیں آپ نے تشریف لانا ہے میں تو ہوسکتا ہے ان کو نہ پاسکوں، لیکن تم جوان ہو، تم ان کو پالو گے، وہ عرب کی زمین میں تشریف لائیں گے " فان ادرکته فآمن به واتبعه" اگر تم ان کو پالو تو ان پر ایمان لانا اور ان کی تابعداری کرنا، سلمان نے کہا مجھے ان کی علامات بتائیں۔ انہوں نے فرمایا ان کی علامات یہ ہوں گی:

" وهو مختوم فی ظهره بخاتم النبوة وهو یاکل الهدیة ولا یاکل الصدقة "

ان کی پیٹھ پر مہر نبوت ہوگی وہ ہدیہ کھائیں گے، لیکن صدقہ نہیں کھائیں گے۔

سلمان کو بنی کلب کے دو آدمی ملے، انہوں نے ان سے پوچھا، انہوں نے بتایا کہ ہمارے علاقہ میں ایک شخص ہے جو نبوت کا دعویٰ کرتا ہے۔ سلمان آئے ان کی نبی کریم ﷺ سے ملاقات ہوئی انہوں نے آپ کی مہر نبوت دیکھ کر اور یہ دیکھ کر کہ واقعی آپ صدقہ نہیں کھاتے، بلکہ صرف ہدیہ کے طور پر دیا ہوا مال کھا لیتے ہیں تو انہوں نے ایمان قبول کرلیا۔ اسی دوران اپنے یہود ساتھیوں کی تعریف کی جس پر نبی کریم ﷺ نے ان کو جہنمی کہا، جوان پر شاق گزرا تو یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔ (مختصر از در منشور)

قرآن تیری عظمت پر قربان:

بظاہر تو یہ وہم ہوتا ہے کہ ﴿ اِنَّ الَّذِیْنَ آمَنُوْا ﴾ کے بعد ﴿ مَنْ آمَنَ مِنْهُمْ بِاللهِ وَالْیَوْمِ الْآخِرِ ﴾ کا کیا مطلب ہے؟ بیشک وہ لوگ جو ایمان لائے (ان میں سے) جنہوں نے اللہ تعالیٰ اور آخرت کے دن پر ایمان لایا، اس کا کیا مطلب ہوسکتا ہے، بظاہر تو تکرار نظر آتا ہے۔

لیکن مفسرین کرام کے وضاحتی بیان سے پتہ چلا کہ ایک چھوٹے سے جملہ میں کتنے معانی رکھ دیئے گئے، تو بے ساختہ ذہن وضمیر نے کہا "قرآن تیری عظمت پر قربان" آیئے اس کے مطالب دیکھئے:

(۱) ﴿ اِنَّ الَّذِیْنَ آمَنُوْ ﴾ سے مراد وہ لوگ ہیں جو نبی کریم ﷺ کی بعثت (اعلان نبوت) سے پہلے یہود کے باطل نظریات وعقائد کو چھوڑ کر عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لے آئے تھے، جیسے قیس بن ساعدہ اور بحیری راہب اور حبیب نجار اور زید بن عمرو بن نفیل اور ورقہ ابن نوفل اور سلمان فارسی اور ابوذر غفاری اور وفد نجاشی۔

گویا کہ رب تعالیٰ کے ارشادگرامی کا یہ مطلب ہوا:

" ان الذین آمنوا قبل مبعث محمد والذین کانوا علی الدین الباطل الذی للیھود والذین کانوا علی الدین الباطل الذی للنصاری کل من آمن منھم بعد مبعث محمد ﷺ باللہ والیوم الآخر وبمحمد فلھم اجرھم عند ربھم "

بیشک وہ لوگ جنہوں نے نبی کریم ﷺ کی بعثت سے پہلے ایمان لایا، خواہ وہ یہودیت کے باطل عقائد کو چھوڑ کر ایمان لائے تھے، یا نصرانیت کے باطل عقائد کو چھوڑ کر نصرانیت کے صحیح عقائد پر ایمان لائے تھے، اب نبی کریم ﷺ کی بعثت کے بعد اسی کا ایمان معتبر ہوگا جس نے اللہ تعالیٰ اور آخرت کے دن پر اور نبی کریم ﷺ پر ایمان لایا ان لوگوں کے لئے ہی ان کے رب کے ہاں اجر ہے۔

۲) رب تعالیٰ نے اس سورۃ کی ابتداء میں منافقین کا ذکر فرمایا پھر یہود کا ذکر کیا، اب اس آیت کریمہ میں ﴿ اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا ﴾ سے مراد منافقین بھی ہیں۔ مطلب یہ ہوا کہ بیشک وہ لوگ جو زبان سے ایمان لائے اور یہودی اور نصرانی اور صابی جو اللہ تعالیٰ اور آخرت پر ایمان لائے ان کا ہی ایمان معتبر ہے:

" فکانہ تعالیٰ قال ھؤلاء المبطلون کل من اتی منھم بالایمان الحقیقی صار من المؤمنین عند اللہ تعالیٰ "

گویا کہ رب تعالیٰ نے فرمایا اے باطل راہ پر چلنے والے منافقو، یہودیو، نصرانیو، صابیو، اگر تم رب تعالیٰ کے ہاں اجر چاہتے ہو تو دل سے اور حقیقی طور پر نبی کریم ﷺ پر ایمان لے آؤ۔

۳) ﴿ اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا ﴾ سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے ماضی میں نبی کریم ﷺ پر ایمان لایا اور " من آمن باللہ " کا تعلق مستقبل سے ہے۔

" فالمراد الذین آمنوا فی الماضی وثبتوا علی ذلک واستمروا علیہ فی المستقبل "

اس صورت میں مطلب یہ ہوا کہ بیشک وہ لوگ جو نبی کریم ﷺ پر حقیقی طور پر اور خلوص قلب سے ماضی میں ایمان لا چکے ہیں۔ ان کا ایمان اسی وقت معتبر ہوگا، اور وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں اجر کے مستحق اسی وقت ہونگے جب اس ایمان پر ثابت قدم رہے اور مستقبل میں بھی اس ایمان پر قائم رہے۔ (ماخوذ از کبیر)

یہ تینوں معانی بیک وقت مراد لیں تو واضح ہو جائے گا کہ قرآن پاک کے مختصر الفاظ مبارکہ کتنے بڑے معانی پر مشتمل ہیں۔ خود بخود عظمت قرآن سمجھ آئے گی۔

﴿وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالنَّصٰرٰى﴾: (اور جو لوگ یہودی ہوئے اور نصرانی ہوئے) جن لوگوں نے توراۃ پر عمل کیا موسیٰ علیہ السلام کی سنت پر عمل کیا۔ لیکن جب عیسیٰ علیہ السلام تشریف لے آئے۔ اس کے بعد بھی جو لوگ توراۃ پر عمل کرتے رہے اور موسیٰ علیہ السلام کی سنت پر عمل کرتے رہے انہوں نے اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال دیا، برباد کر دیا، کیونکہ عیسیٰ علیہ السلام کے آنے کے بعد موسیٰ علیہ السلام کی شریعت منسوخ ہو چکی تھی۔

اسی طرح جن لوگوں نے عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لایا، انجیل پر عمل کرتے رہے، نبی کریم ﷺ کی تشریف آوری کے بعد بھی وہ اس پر قائم رہے تو انہوں نے بھی اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال دیا۔ نبی کریم ﷺ کے تشریف لانے پر یعنی جب سے آپ نے اعلان نبوت فرمایا۔ اسی وقت سے پہلے تمام دین منسوخ ہو گئے، اس کے بعد پہلے کسی دین پر قائم رہنا ایمان نہیں تھا۔

اب آیۃ کریمہ کا مفہوم واضح ہو گیا کی بیشک وہ لوگ جو یہودی ہیں یا نصرانی ان کا اپنے اپنے دینوں پر قائم رہنا ایمان نہیں۔ بلکہ ان کے لئے ضروری ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ پر اور آخرت پر ایمان لائیں اور نبی کریم ﷺ کے دین پر ایمان لائیں تو ان کا ایمان معتبر ہوگا۔ اور اللہ تعالیٰ کے ہاں ان کیلئے اجر ہوگا۔

فائدہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ اس آیۃ کریمہ ﴿إِنَّ الَّذِيْنَ آمَنُوْا......الخ﴾ کے بعد یہ آیۃ نازل ہوئی:

﴿ وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي الْآخِرَةِ مِنَ الْخَاسِرِيْنَ ﴾

''اور جس نے اسلام کے بغیر اور دین تلاش کیا وہ اس سے ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا وہ آخرت میں نقصان اٹھانے والوں سے ہوگا''۔

اس سے یہ مسئلہ واضح ہو گیا:

'' لا يقبل من احد طريقة ولا عملا الا ما كان موافقا لشريعة محمد ﷺ بعد ان بعثه بما بعثه به فاما قبل ذلك فكل من اتبع الرسول في زمانه فهو على هدى وسبيل ونجاة '' (صابونی)

کسی ایک کا کوئی طریقہ اور کوئی عمل قابل قبول نہیں ہوگا جب تک کہ اس کا ایمان نبی کریم ﷺ اور آپ کی شریعت پر نہ ہوا، لیکن یہ آپ کی بعثت کے بعد کا مسئلہ ہے۔ البتہ آپ کی بعثت سے پہلے جن لوگوں نے اپنے اپنے رسولوں پر ان کے زمانہ میں ایمان لایا، اور ان کی تابعداری کی وہ ہدایت پر تھے، اور وہی راہ ان کیلئے نجات کا ذریعہ تھی۔

یہود کو یہود کہنے کی وجہ:

(۱) ایک وجہ یہ ہے کہ انہوں نے بچھڑے کی عبادت کرنے کے بعد توبہ کر لی تھی اس لئے ان کو یہود کہا گیا جیسا کہ رب تعالیٰ نے ان کے قبول کو ذکر فرمایا ﴿ **اِنَّا هُدْنَا اِلَیْکَ** ﴾ **ای تبنا ورجعنا** "بیشک ہم نے (اے اللہ) تیری طرف توبہ کی۔

(۲) حضرت یعقوب علیہ السلام کے بڑے بیٹے کا نام "یہوذا" (ذال معجمہ کے ساتھ) تھا، پھر جب عربی میں اس کا استعمال ہوا تو دال مہملہ کے ساتھ استعمال ہوا یعنی یہودا کہا گیا، اسی کی طرف منسوب ہونے کی وجہ سے اس کی اولاد کو بھی یہود کہا گیا۔

(۳) ان کو یہود اس لئے کہا گیا" **لانهم يتهودون اى يتحركون عند قراءة التوراة** " کہ وہ توراۃ پڑھتے ہوئے حرکت کرتے تھے، کیونکہ ایک معنی یہود کا حرکت کرنا ہے۔ (از کبیر)

(۴) " **وقرئ (هادوا) بفتح الدال اى مال بعضهم الى بعض** " ایک قراءت میں "**هادوا**" دال کے فتحہ (زبر) سے بھی پڑھا گیا ہے۔ اس معنی کے لحاظ پر ان کو "**هادوا**" اس لئے کہا گیا ہے کہ ان میں سے بعض بعض کی طرف مائل ہوئے۔ (روح المعانی)

(۵) " **واليهود من الهوادة وهى المودة فكانهم سموا بذلك لمودتهم** " یہود مشتق ہے " **هوادة** " سے جس کا معنی محبت کرنا، وہ آپس میں ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے اسلئے ان کو یہود کہا گیا۔ (از صابونی)

نصاریٰ کو نصاریٰ کہنے کی وجہ:

(۱) ایک بستی تھی جس کا نام ناصرہ تھا، اس میں عیسیٰ علیہ السلام تشریف لے جاتے تھے، وہاں کے لوگ اس بستی کی طرف منسوب ہونے کی وجہ سے "نصاریٰ" کہلائے۔

(۲) دوسری وجہ یہ ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کے متبعین ایک دوسرے کی امداد کرتے تھے، اسی وجہ سے ان کا نام نصاری رکھ لیا گیا۔

(۳) عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے حواریوں کو کہا " من انصاری الی اللہ " اللہ کے دین میں میرا مددگار کون ہے؟ تو انہوں نے جواب دیا ﴿نحن انصار اللہ﴾ اللہ کے دین کے ہم مددگار ہیں تو اسی وجہ سے ان کو نصاری کہا گیا۔

یہاں یہ بھی خیال رہے کہ صاحب کشاف نے کہا ہے " نصاری " جمع ہے " نصران " کی کہاجاتا ہے " رجل نصران " (مددگار) اور کہا جاتا ہے " امرأة نصرانة " (عورت مددگار) نصرانی میں یاء مبالغہ کے لئے ہے جیسا کہ " احمری " میں۔ ان کو عیسیٰ علیہ السلام کے مددگار ہونے کی وجہ سے نصاری کہا گیا۔ (از کبیر)

تنبیہ : کبیر سے جو وجوہ بیان کی گئی ہیں۔ ان میں سے پہلی وجہ کی علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے مزید وضاحت کی کہ عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت قدس کے مقام پر بیت اللحم میں ہوئی، پھر آپ کی والدہ آپ کو مصر میں لے آئیں۔ پھر آپ جب بارہ سال کے ہوئے تو آپ کی والدہ آپ کو ملک شام میں لے آئیں اور ناصرہ بستی میں مقیم ہوئیں۔ اس وجہ سے ان لوگوں کو نصاری کہا گیا۔ (روح المعانی)

تاہم علامہ رازی رحمہ اللہ نے ناصرہ بستی کے متعلق عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر کرتے ہوئے " وکان ینزلها " کے الفاظ ذکر فرمائے، میں نے اس کا ترجمہ آسان بامحاورہ لکھا تشریف لے جاتے تھے۔

﴿ وَالصَّابِئِيْنَ ﴾ : بعض حضرات کے قول کے مطابق یہ لفظ عجمی ہے۔ اور بعض حضرات نے کہا یہ عربی لفظ ہے زیادہ معتبر یہی قول ہے۔ جب لفظ عربی ہو تو اس کا اصل کیا ہے، ایک قول یہ ہے کہ یہ مہموز اللام ہے " صبأ بالهمز اذا خرج " صبأ کے آخر میں ہمزہ ہے، اس کا معنی ہے نکل جانا، اس معنی کے لحاظ پر ان کو صابئ کہنے کی وجہ یہ ہے " لخروجهم عن الدين الحق " وہ دین حق سے نکلے ہوئے تھے۔

ایک اور قول یہ ہے کہ یہ ناقص (معتل اللام) ہے یعنی " صبا یصبوا صبوا " سے لیا ہوا ہے " صبا بمعنی مال " صبا کا معنی ہے میلان کرنا۔ اس معنی کے لحاظ پر " صابی " یاء سے پڑھا جائے گا۔ اور انکو صابی کہنے کی وجہ یہ ہوگی " لميلهم الى الباطل " ان کا میلان باطل عقیدہ کی طرف تھا، اس

لئے ان کو صابی کہا گیا۔ (روح المعانی)

صابئین کی قسمیں:

مختلف فرقوں کو صابیٔ کہا گیا وجہ سب کی یہی تھی کہ وہ دین حق سے نکل کر باطل دین کی طرف مائل ہوئے لہٰذا ان کو صابی کہا گیا۔

(۱) صابی کی ایک قسم یہ ہے " قوم بین النصاری والمجوس " صابی وہ قوم تھی جو نصاری اور مجوس کے درمیان تھی، یعنی ان کے عقائد ان دونوں سے ملتے جلتے تھے۔ (بیضاوی)

(۲) "(والصابئین) ان عبدوا الکواکب"

صابئین سے مراد ستاروں کی عبادت کرنے والے ہیں۔ (تبصیر الرحمن)

علامہ رازی رحمہ اللہ کا مختار مذہب بھی یہی ہے:

" ان الصابئین قوم یعبدون الکواکب بمعنی ان اللہ جعلها قبلة للعباد والدعاء او بمعنی ان اللہ فوض تدبیر امر هذا العالم" (صابونی)

کہ بیشک صابئین وہ لوگ ہیں جو ستاروں کی عبادت کرتے تھے، اس لحاظ پر کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو دعاء کا قبلہ بنایا ہے، اور بندوں کی عبادت کا بھی یہی قبلہ ہیں۔ اور وہ ستاروں کی عبادت اس لئے بھی کرتے تھے کہ ان کا عقیدہ یہ تھا کہ ستاروں کو اللہ تعالیٰ نے تمام جہان کی تدبیر سپرد کر دی۔

تقریباً یہ وہی عقیدہ ہے جو فلاسفہ میں ان لوگوں کا ہے جو عقول عشرہ کے قائل ہیں۔ علامہ صابونی نے صابئین کا معنی ستارہ پرست کرنے کے متعلق فرمایا " واختار الرازی...... واظهر الاقوال"

(۳) " قوم بین المجوس والیهود والنصاری لیس لهم دین " صابی وہ لوگ تھے جن کا کوئی دین نہیں تھا بلکہ وہ یہود اور نصاری اور مجوسیوں کے درمیان درمیان تھے، یہ ان کا اپنا کوئی مستقل دین نہیں تھا جس کی وہ تابعداری کرتے بلکہ اپنی مرضی کے مطابق جو پسند آیا اسی پر عمل کر لیا، کوئی عقائد یہودیوں کے حاصل کر لئے اور کوئی نصرانیوں کے اور کوئی مجوسیوں کے۔ (از صابونی)

آجکل ہمارے ملک میں بھی نکھٹو، الو اور گدھوں کی جماعت ان ہی نظریات کی مالک ہے۔

اللہ تعالیٰ ان کے شر سے ملک کو محفوظ رکھے، یہ لوگ علماء کو فرقہ واریت کا ذمہ دار ٹھہرا کر خود ہی قتل کر رہے ہیں حالانکہ بعض کمینے لوگوں کو پیسے دے کر لڑانے والے بھی یہی ہیں انہوں نے ''مولوی مکاؤ'' پروگرام شروع کیا ہوا ہے۔

(۴) " قال قتادة هم قوم يعبدون الملائكة ويصلون الى الشمس كل يوم خمس صلوات"

قتادہ کہتے ہیں، صابئین وہ لوگ تھے جو فرشتوں کی عبادت کرتے تھے، البتہ سورج کی طرف منہ کر کے ہر روز پانچ نمازیں ادا کرتے تھے۔

" وقال ايضا الاديان خمسة منها للشيطان اربعة و واحد للرحمن ،
الصابئون وهم يعبدون الملائكة والمجوس وهم يعبدون النار ،
والذين اشركوا يعبدون الاوثان ، واليهود ، والنصارى "

اور قتادہ نے وضاحت کرتے ہوئے یہ بھی کہا کہ دین پانچ قسم ہیں۔ چار شیطانی ہیں، اور ایک رحمانی ہے نبی کریم ﷺ کی بعثت کے بعد رحمانی دین صرف ایک ہی ہے کہ نبی کریم ﷺ شریعت پر ایمان لائے۔ شیطانی دینوں میں ہی، صابی ہونا بھی ہے، صابی وہ ہیں جو فرشتوں کی عبادت کرتے ہیں۔ اور شیطانی دین والے مجوسی ہیں جو آگ کی پوجا کرتے ہیں، اور شیطانی دین والے مشرک ہیں جو بتوں کی عبادت کرتے ہیں، اور شیطانی دین والے یہود ونصاری بھی ہیں کیونکہ انہوں نے آسمانی کتب میں تحریف کر دی تھی، باطل نظریات اور باطل عقائد کو حاصل کر لیا، اور نبی کریم ﷺ پر ایمان بھی نہیں لائے۔
(از کبیر)

(۵) " هم قوم يشبه دينهم دين النصارى الا ان قبلتهم نحو مهب الجنوب يزعمون انهم على دين نوح عليه السلام " (صابونی)

صابئین وہ لوگ تھے جن کا دین نصاری کے دین کے مشابہ تھا، لیکن ان کا قبلہ جنوبی جانب سے چلنے والی ہوا کے رخ پر تھا، اور یہ اپنے گمان کے مطابق اپنے آپ کو نوح علیہ السلام کے دین پر سمجھتے تھے۔

(۶) " ان الصابئين قوم يعبدون الملائكة ويقرء ون الزبور ويصلون للقبلة " (صابونی)

بیشک صابئین اس قوم کو کہا جاتا ہے جو فرشتوں کی عبادت کرتے ہیں، اور زبور پڑھتے ہیں اور قبلہ کی طرف منہ کر کے نماز ادا کرتے ہیں۔

اس قول کے مطابق ان کا زبور پر ایمان ثابت نہیں۔ اگر ان کا زبور پر ایمان ہوتا تو وہ فرشتوں کی عبادت نہ کرتے۔

(۷) " سئل وهب بن منبه عن الصابئين فقال الذی يعرف الله وحده ليستله شريعة يعمل بها ، ولم يحدث كفرا" (صابونی)

وہب بن منبہ سے سوال کیا گیا صابئین کے متعلق کہ وہ کون لوگ ہیں؟ تو انہوں نے فرمایا، یہ وہ لوگ ہیں جو اللہ وحدہ کو پہچانتے ہیں، اور ان کی کوئی شریعت نہیں جس پر وہ عمل کریں اور کفر کو وہ اختیار نہیں کرتے۔

(۸) " قال عبد الرحمن بن زيد الصابئون اهل دين من الأديان كانوا بجزيرة الموصل يقولون لااله الا الله وليس لهم عمل ولا كتاب ولا نبی الا قول لا اله الا الله" (صابونی)

عبد الرحمٰن بن زید نے بیان کیا ہے کہ صابون اپنے آپ کو دیندار کہتے ہیں، موصل کے علاقہ کے ایک جزیرہ میں پائے جاتے ہیں۔ وہ لااله الا الله کہتے ہیں۔ لیکن نہ ہی ان کا کوئی عمل ہے اور نہ کتاب، اور نہ ہی کسی نبی پر وہ ایمان رکھتے ہیں سوائے "لا الـه الا الله" کے ان کے پاس کوئی عمل نہیں، جس کی وجہ سے ان کو مؤمن کہا جاسکے۔

(۹) " قال ابو العاليه والضحاک الصابئون فرقة من اهل الكتاب يقرأون الزبور ولهذا قال ابو حنفية واسحاق لاباس بذبائحهم ومنا كحتهم " (الصابونی)

ابو العالیہ اور ضحاک نے کہا صابئین اہل کتاب میں سے ایک فرقہ کو کہا جاتا ہے وہ زبور پڑھتے ہیں ان کا حکم وہی ہے جو اہل کتاب کا ہے۔ صابئین کی تمام قسموں میں سے صرف یہ قسم ہے جن سے نکاح کرنا جائز ہے اور ان کا ذبیحہ جائز ہے۔ حضرت امام ابو حنیفہ اور اسحاق رحمہما اللہ نے ان کے ساتھ ہی نکاح کرنا اور ان کے ذبیحہ کے جائز ہونے کا قول کیا ہے۔

آیۃ کریمہ میں صابئین کی کون سی قسم معتبر ہے؟

اگرچہ پہلے بیان کر دیا گیا ہے کہ علامہ رازی رحمہ اللہ نے ستارہ پرست ہونے کے قول کو ہی مختار کہا ہے اور یہ کہا ہے کہ یہ ظاہر قول ہے۔ اور بھی کئی مفسرین کرام نے اسی قول کو راجح قرار دیا، اعلیٰ حضرت مولنا احمد رضا خان رحمہ اللہ نے بھی اپنے ترجمہ میں "ستارہ پرست" ذکر فرمایا۔

راقم کا موقف: اس مقام پر راقم کا موقف وہی ہے جو تدریس کے بادشاہ راقم کے استاذ محترم نے جلالین پڑھاتے ہوئے بیان فرمایا تھا کہ یہاں صابئین کی تمام قسمیں ہی معتبر ہیں۔ اس طرح قرآن پاک کا وسیع بیان واضح ہوگا، اور عظمت قرآن کا پتہ چلے گا۔

یعنی مطلب یہ ہوا کہ صابئین کے تمام گروہ اللہ تعالیٰ کے ہاں اس وقت تک اجر حاصل نہیں کرسکیں گے جب تک ان کا اللہ تعالیٰ اور آخرت کے دن پر ایمان نہ ہوا۔

آیئے اسی موقف کو علامہ رازی رحمہ اللہ کی اس عبارت سے سمجھیں، پھر اندازہ کریں کہ راقم کے استاذ محترم کا علمی کمال کیا ہے یقیناً آپ عمدۃ الازکیاء اور رازی دوران ہیں۔ اس سے میری مراد حضرت علامہ مولنا محمد اشرف سیالوی ہیں۔

"ثم انہ سبحانہ بین فی ھذہ الفرق الاربعۃ انھم اذا آمنوا باللہ فلھم الثواب فی الآخرۃ لیعرف ان جمیع ارباب الضلال اذا رجعوا عن ضلالھم و آمنوا بالدین الحق فان اللہ سبحانہ وتعالیٰ یقبل ایمانھم طاعتھم ولا یردھم عن حضرتہ البتۃ" (کبیر)

اللہ تعالیٰ نے اگرچہ بظاہر چار فرقوں کا ذکر فرمایا کہ وہ جب اللہ تعالیٰ پر ایمان لائیں تو ان کو ثواب حاصل ہوگا آخرت میں، لیکن اسی سے یہ معلوم ہوگیا کہ بیشک تمام گمراہ لوگ جب اپنی گمراہی کو چھوڑ کر، دین حق پر ایمان لے آئیں تو اللہ تعالیٰ ان کے ایمان کو قبول کرتا ہے، اور ان کی طاعت کو قبول فرماتا، اور ان کو یقیناً اپنے حضور سے دور نہیں فرماتا۔

واضح ہوا کہ تمام باطل فرقے مراد ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ اور آخرت اور نبی کریم ﷺ پر ایمان لائیں تو ان کا اجر ان کے رب کے ہاں ہوگا۔

﴿مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ﴾: "جو شخص ایمان لایا اللہ پر اور آخرت کے دن پر"

اعتراض: آیۃ کریمہ میں صرف اللہ تعالیٰ پر اور آخرت کے دن پر ایمان لانے کا ذکر ہے حالانکہ آسمانی کتب اور اللہ تعالیٰ کے تمام انبیاء کرام اور فرشتوں پر ایمان لانا بھی ضروری ہے۔ انکا ذکر کیوں نہیں کیا؟

جواب : " (من آمن) منهم مخلصا (بالله والیوم الآخر) الذی لایتم الایمان بالله بدونه اذبه الایمان بدوام ربوبیته لهم وعموم قدرته وحکمته وعدله واما الایمان بالکتب والرسل والملائکة فلازم للایمانین اذ لا یعرفان الا بهذه الامور فلم یصرح به لقوة دلالة الایمانین علیه " (تبصیر الرحمن)

جس نے ان میں سے اللہ تعالیٰ اور آخرت کے دن پر خلوص سے ایمان لایا۔ آخرت کے دن پر ایمان لانے کا ذکر فرما کر واضح کر دیا کہ جب تک انسان کا آخرت پر ایمان نہیں ہوگا اس وقت تک اللہ تعالیٰ پر بھی ایمان نہیں ہوگا۔ کیونکہ آخرت کے دن پر ایمان کے بغیر اللہ تعالیٰ کی دائمی ربوبیت اور اس کی قدرت کے عموم، اور اسکی حکمت اور اس کے عدل پر ایمان نہیں ہوسکتا۔

آسمانی کتب اور رسولوں اور فرشتوں پر ایمان لانے کا اگرچہ بظاہر ذکر نہیں لیکن اللہ تعالیٰ اور آخرت پر ایمان ان تمام پر ایمان لانے کے بغیر ممکن نہیں۔ لہٰذا واضح ہوا کہ دو ایمانوں کا ذکر تمام ایمانوں کو مستلزم ہے۔

" (من آمن) منهم (بالله والیوم الآخر) مع محمد ﷺ بالقلب واللسان " (مظهری)

جو شخص ان میں سے اللہ تعالیٰ اور آخرت کے دن پر ایمان لایا، ساتھ ساتھ اور دل اور زبان سے محمد ﷺ پر بھی ایمان لایا۔ یعنی اللہ تعالیٰ اور آخرت کے دن پر ایمان اسی وقت معتبر ہوگا، جب کہ نبی کریم ﷺ پر زبان اور دل سے خلوص کے ساتھ ایمان لائے گا۔

تنبیه : ﴿ اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ﴾ سے مراد جب حقیقی طور پر نبی کریم ﷺ پر ایمان لانے والے مراد ہوں تو " مَنْ آمَنَ " سے مراد یہ بھی ہوسکتا ہے:

" ویمکن ان یکون من آمن اشارة الی الذین کمل ایمانهم بتصفیة القلب وتزکیة النفس والقالب "

کہ جو کامل طور پر صفائی قلب (خالص دل) اور پاکیزگی نفس اور پاکیزگی بدن سے ایمان لائیں، یعنی ظاہر و باطن سے کامل اور خالص ایمان لانیوالے ہی اللہ کے ہاں اجر پائیں گے۔

کمال ایمان کا ذکر نبی کریم ا کے اس ارشاد میں پایا گیا ہے:

" لا یؤمن احدکم حتی اکون احب الیه من والده وولد والناس

اجمعین " (بخاری، مسلم، مسند احمد، نسائی، ابن ماجہ انس مرفوعا)

تم میں سے کوئی ایک کامل مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ میں اسے اس کے والد (والدین) اور اولاد اور تمام لوگوں سے محبوب نہ ہوں۔

☆ اور نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی:

" لا یؤمن احدکم حتی یحب لاخیه ما یحب لنفسه "

(بخاری، مسلم، مسند احمد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ عن انس مرفوعا)

تم میں سے کوئی ایک کامل مومن نہیں ہو سکتا یہاں تک کہ اپنے بھائی کے لئے وہی پسند کرے جو اپنے لئے پسند کرتا ہے۔

☆ اور نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی:

" لا یبلغ العبدحقیقة الایمان حتی یحزن من لسانه " (رواه الطبرانی و اصححه)

بندہ اس وقت تک کامل ایمان نہیں حاصل کر سکتا جب تک اپنی زبان سے نہ غم کھائے۔ (ازمظہری)

یعنی ڈرتا رہے کہ زبان کہیں لغزش نہ کرلے، زبان کی لغزش پر بہت ہی فساد مرتب ہوتے ہیں۔

﴿ وَعَمِلَ صَالِحًا ﴾ (اور اچھے عمل کئے) (وعمل صالحا)علی حسب امر الله تعالیٰ (مظهری)

وہی اعمال صالحہ ہو سکتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے امر کے مطابق ہوں۔ اگر کوئی شخص اپنے خیال کے مطابق اچھے عمل کر رہا ہے لیکن وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق نہیں، تو وہ حقیقت میں اچھے عمل نہیں۔

" (وعمل صالحا)ولا بدفیه من الاخذ بالناسخ وترک المنسوخ " (تبصیر الرحمن)

جب تک انسان منسوخ کو چھوڑ کر ناسخ پر عمل نہیں کرے گا اسوقت تک اعمال صالحہ نہیں بن سکتے۔

اسی سے واضح ہو گیا کہ نبی کریم ﷺ کی بعثت کے بعد یہود و نصاری کے اعمال اسی وقت اچھے اور صالح ہو سکتے تھے جب وہ نبی کریم ﷺ کی شریعت پر عمل کرتے۔ واضح ہوا کہ یہود و نصاری کا اپنے اپنے حق دینوں میں قائم رہنا بھی باطل تھا، ان کا کوئی عمل بھی صالح نہیں کہلا سکتا تھا۔ باطل دینوں پر قائم رہ کر وہ کیسے اعمال صالحہ کر سکتے تھے۔

﴿ فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ﴾: "تو ان کے لئے ان کا اجر ان کے رب کے ہاں ہے" یعنی

اللہ تعالیٰ نے جو وعدہ فرمایا ہے مومنوں کے لئے جنت کا، وہ تمام مومنوں کو حاصل ہوگی، البتہ قرب کے مراتب اور ستھری شراب جس پر کستوری کی مہر لگی ہوگی اور خاص چشمے صرف مقربین کو حاصل ہوں گے، رب تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ عَيْنًا يَّشْرَبُ بِهَا الْمُقَرَّبُوْنَ ﴾ وہ ایسے چشمے ہوں گے جن سے مقربین پئیں گے۔

(از مظہری)

﴿ فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ ﴾ کا اور مطلب یہ ہے کہ اگر وہ ایمان پر ہمیشہ کے لئے قائم رہے اور نیک عمل کرتے رہے تو ان کے لئے کامل اجر ہے ﴿ عِنْدَ رَبِّهِمْ ﴾ کہہ کر اشارہ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ مربی ہے اس لئے یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت سے کوئی بعید نہیں کہ ان کے ایمان اور اعمال کو تھوڑے دنوں میں اتنا مال عطاء فرمادے جو ان کو مکمل عمر میں حاصل ہوتا۔

(از تبصیر الرحمن)

تنبیہ : ﴿ فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ﴾ کی تفسیر میں علامہ بیضاوی رحمہ اللہ نے ذکر فرمایا: " الذی وعدلهم علی ایمانهم وعملهم " ان کے لئے وہ اجر ان کے رب کے ہاں ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے ان سے ان کے ایمان لانے اور نیک عمل کرنے پر کیا ہوا ہے۔

علامہ بیضاوی کی اس عبارت سے شیخ زادہ نے یہ مسئلہ بیان فرمایا ہے:

" الذی وعدلهم الخ اشارة الی ان استحقاقهم للاجر بسبب الایمان والعمل انما هو بحسب التفضل والاحسان علی طریق وفاء الکریم بما وعده لاعلی طریق الوجوب العقلی کما زعمه المعتزلة فلذلک عدل من تعبیر صاحب الکشاف وهو قوله فلهم اجرهم الذی یستوجبونه بایمانهم وعملهم فانه مبنی علی مذهبه "

علامہ بیضاوی رحمہ اللہ نے " الذی وعدلهم " سے تفسیر فرما کر یہ مسئلہ واضح کیا ہے کہ ان کو اجر ان کے ایمان اور نیک اعمال کی وجہ سے صرف اس لئے حاصل ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ فضل واحسان ہے اور اس نے وعدہ فرمایا ہے کریم جب وعدہ فرماتا ہے اسے پورا کرتا ہے ان کو یہ اجر حاصل ہونا عقلاً واجب نہیں۔ کہ انہوں نے ایمان لایا اور نیک عمل کئے تو رب تعالیٰ پر واجب ہو جائے کہ ان کو اچھا اجر عطا فرمائے۔ اس نے تو پہلے ہی ان گنت نعمتیں عطا کر رکھی ہیں، انسان ان کا شکر یہ بھی ادا نہیں کر سکتا، تو اور اجر

کالزومی طور پر حقدار ہونے کا دعوی کیسے کرسکتا ہے۔

اسی سے یہ واضح ہوگیا کہ صاحب کشاف کی تفسیر اس کے مذہب کے مطابق ہے کیونکہ زمخشری معتزلی ہے لہذا اس کا یہ ذکر کرنا" الذی یستوجبونہ بایمانھم وعملھم" (وہ اجر جس کے وہ جوبی طور پر اپنے ایمان اور نیک اعمال کی وجہ سے مستحق ہیں) باطل ہے۔ (از بیضاوی وشیخ زادہ)

﴿ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴾ : ''اور ان پر کوئی خوف نہیں ہوگا اور نہ ان پر کوئی غم''یعنی جب کفار عذاب سے ڈر رہے ہوں گے تو ایمان والے اور نیک اعمال والے لوگوں کو کوئی خوف اور ڈر نہیں ہوگا۔ اسی طرح جب اپنے اعمال میں کوتاہی کرنے والے اپنی عمر کے ضائع ہونے اور ثواب کے فوت ہونے پر غم کر رہے ہوں گے، تو ایمان والے اور نیک اعمال والے لوگوں کو کوئی غم نہیں ہوگا۔

مقام توجہ : ﴿ عِنْدَ رَبِّهِمْ ﴾ کا یہ مفہوم نہیں کہ ان لوگوں کا اجر رب کے پاس کسی مکان میں ہے رب تعالیٰ مکان سے پاک ہے، اسلئے مکانیت کی نسبت رب تعالیٰ کی طرف محال ہے، اور یہ معنی لینا بھی ممکن نہیں کہ رب تعالیٰ انکے اجر کی ایسے حفاظت کر رہا ہے جیسے امانت کی حفاظت کی جاتی ہے۔ بلکہ یہاں یہ مطلب ہے کہ ان لوگوں کو اجر یقینی طور پر حاصل ہونا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان سے وعدہ فرمالیا رکھا ہے اس نے اپنے فضل وکرم سے اپنے وعدہ کو پورا کرنا ہی ہے، اور اجر عطا کرنا ہے تو گویا کہ اس اجر کو اللہ تعالیٰ کا تقرب حاصل ہوگا، اور جسے وہ اجر حاصل ہوگا وہ بھی اللہ تعالیٰ کا مقرب ہوگا۔ (از کبیر)

گزشتہ سے پیوستہ : صابی کا معنی بیان کیا جاچکا ہے کہ ایک دین سے دوسرے دین کی طرف میلان کرنا اور ایک دین کو چھوڑ کر دوسرے دین کو اختیار کر لینا:

"ولذلک کانت العرب یسمون رسول اللہ ﷺ صابیا لانہ علیہ السلام اظھر دینا خلاف ادیانھم ومال الیہ" (شیخ زادہ)

یہی وجہ ہے کہ مشرکین نبی کریم ﷺ کو صابی کہتے تھے کیونکہ آپ نے ان کے دینوں کے خلاف دین حق پیش فرمایا اور اسی کی طرف آپ کا میلان تھا۔

مسلم شریف جزء ثانی میں حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کے ایمان لانے کے متعلق ایک طویل حدیث میں یہ ذکر ہے کہ حضرت ابوذر جب مکہ مکرمہ میں پہنچے تو آپ نے نبی کریم ﷺ کے متعلق یہی پوچھا کہ صابی کہاں ہے۔ مقصد یہ تھا کہ وہ شخص جن کو تم صابی کہتے ہو وہ کہاں ہیں؟ اور ان لوگوں کو جب

یہ پتہ چلا کہ ابوذر ایمان لا چکے ہیں تو انہوں نے حضرت ابوذر کو بھی صابی کہا۔

حکمت : ابھی جس آیۃ کریمہ کی وضاحت کی جارہی ہے وہ یوں ہے:

﴿ اِنَّ الَّذِیْنَ آمَنُوْا وَالَّذِیْنَ هَادُوْا وَالنَّصَارٰی وَالصَّابِئِیْنَ مَنْ آمَنَ بِاللهِ وَالْیَوْمِ الْآخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ ﴾

سورۃ مائدہ میں ہے:

﴿ اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِیْنَ هَادُوْا وَالصَّابِئُوْنَ وَالنَّصَارٰی مَنْ اٰمَنَ بِاللهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ ﴾

اور سورۃ حج میں ہے:

﴿ اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِیْنَ هَادُوْا وَالصَّابِئِیْنَ وَالنَّصَارٰی وَالْمَجُوْسَ وَالَّذِیْنَ اَشْرَكُوْا اِنَّ اللهَ یَفْصِلُ بَیْنَهُمْ یَوْمَ الْقِیَامَةِ اِنَّ اللهَ عَلٰی كُلِّ شَیْئٍ شَهِیْدٌ ﴾

سورۃ بقرہ میں نصاریٰ کا ذکر پہلے ہے اور سورۃ مائدہ میں اور سورۃ حج میں صابئین کا ذکر پہلے کیا گیا ہے اس کی وجہ کیا ہے؟ اور سورۃ مائدہ میں الصابئون مرفوع ہے۔ باقی دونوں جگہ میں منصوب اس کی وجہ کیا ہے؟

جواب : علامہ رازی رحمہ اللہ نے دونوں مسئلوں پر سورۃ مائدہ اور حج میں فرق کی وجوہ کو ذکر کیا ہے یہاں مختصر اور عجیب حکمت پر مبنی ارشاد فرمایا:

" والجواب لما كان المتكلم احكم الحاكمين فلابد لهذه التغيرات من حكم وفوائد ، فان ادركنا تلك الحكم فقد فزنا بالكمال وان عجزنا احلنا القصور على عقولنا لا على كلام الحكيم والله اعلم " (کبیر)

جواب یہ ہے کہ جب کلام کرنے والا اللہ تعالیٰ احکم الحاکمین ہے تو ضروری طور پر ان تبدیلیوں میں حکمتیں اور فوائد پائے گئے ہیں۔ اگر ہم ان حکمتوں کو سمجھ سکیں تو ہماری بہت بڑی کامیابی ہے اور اگر ہم عاجز آجائیں تو یہ ہماری عقلوں کا قصور ہوگا، اللہ تعالیٰ کے کلام میں کوئی کمی نہیں ہوسکتی۔ (واللہ اعلم)

تاہم تفصیلی جواب انشاء اللہ سورۃ مائدہ میں ہی آئے گا۔

﴿ وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاذْكُرُوْا مَا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴾

۱) ''اور جب ہم نے تم سے عہد لیا اور تم پر طور کو اونچا کیا تو جو کچھ ہم تم کو دیتے ہیں زور سے، اور اس کے مضمون یاد کرو اس امید پر کہ تمہیں پرہیز گاری ملے''۔

۲) ''اور جب ہم نے لیا عہد تم سے اور اٹھایا اوپر تمہارے طور کو لے لو جو دیا ہم نے تمہیں، (وہ) مضبوطی سے، اور یاد کرو جو اس میں ہے، تا کہ تم پرہیز گار ہو جاؤ''

''اعلم ان هذا هو الانعام العاشر وذلک لانه تعالیٰ انما اخذ میثاقهم لمصلحتهم فصار ذلک من انعامه''

اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو اپنی نعمتوں کی یاد دلائی وہ نعمتیں جن کا اس مقام پر ذکر کیا جارہا ہے ان میں یہ دسویں نعمت ہے۔ کیونکہ ان سے وعدہ لینا کہ تورات پر عمل کرو گے یہ ان کی مصلحت کے لئے تھا یقینی بات ہے جو کام مصلحت کے لئے ہو وہ نعمت ہی ہوا کرتا ہے۔ (از کبیر)

تاہم بنی اسرائیل کی کجروی کا ذکر بھی واضح ہے جیسا کہ پہلی نعمتوں میں بھی ان کی کجرویوں کا (ٹیڑھی چال) ذکر کر دیا گیا ہے یہاں بھی اس کا ذکر موجود ہے۔

مختصر وضاحت:

موسیٰ علیہ السلام پر جب تورات کا نزول ہوا تو آپ نے بنی اسرائیل کو تورات کے احکام بتائے لیکن انہوں نے احکام کو مشکل سمجھ کر ماننے سے انکار کر دیا، تو اللہ تعالیٰ نے جبرائیل کو حکم دیا کہ انہوں نے طور پہاڑ کو اٹھا کر ان کے سروں پر کر دیا، انہوں نے اسے تسلیم کر لیا۔

رب تعالیٰ نے ان کو توراۃ کے مضامین یاد کرنے اور ان پر عمل کرنے کا حکم جو دیا اسمیں ان کا ہی فائدہ تھا رب تعالیٰ غنی ہے، اسے کوئی پرواہ نہیں، ان کا فائدہ یہی تھا کہ وہ نیک، پرہیز گار بن جائیں۔

قدرے تفصیلی وضاحت:

﴿ وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ ﴾ : "اور جب لیا ہم نے وعدہ تم سے"

" (مِیْثَاقَ کُمْ) ای عهدکم الوثیق " یعنی میثاق سے مراد پختہ وعدہ ہے مطلب یہ ہوا کہ ہم نے تم سے توراۃ کے مشکل احکام پر عمل کرنے اور ان کو تسلیم کرنے کا تم سے پختہ وعدہ لیا۔ (تبصیر الرحمن) ایسے امور جن کی اطاعت اور فرمانبرداری واجب ہوتی ہے ان کے کرنے کا حکم دینا اور ان کا وعدہ لینا میثاق کہلاتا ہے۔

وعدہ لینے سے مراد کیا ہے؟ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو عقلیں عطاء کیں، جن سے ان دلائل کو حاصل کیا جاتا جو صانع کے وجود اور اس کی حکمت پر دلالت کرتے، اور پھر ان کو وہ دلائل بھی عطاء کئے جو اللہ تعالیٰ کے انبیاء کرام اور اس کے رسولوں کی صداقت پر دلالت کرتے۔

یہ مواثیق (وعدوں) کی قسموں میں سے بہت قوی میثاق ہے اس میں کسی قسم کی تبدیلی ممکن نہیں۔ اور دوسری وجہ یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام جب اللہ تعالیٰ سے توراۃ کی الواح (تختیاں) لے کر آئے تو قوم کو بتایا کہ اسمیں توراۃ اللہ کی کتاب ہے۔ انہوں نے کہا ہم تمہارے قول کو اس وقت تک ہرگز تسلیم نہیں کریں گے جب تک کہ اللہ تعالیٰ کو ظاہر طور پر نہ دیکھ لیں۔

آپ ان کو فرما رہے تھے " هذا کتابی فخذوه " یہ میری کتاب ہے اس پر عمل کرو، لیکن وہ مسلسل انکار کئے جا رہے تھے " فاخذتهم الصاعقة فماتوا ثم احیاهم " تو ان کو بجلی کی کڑک نے اپنی گرفت میں لے لیا تو وہ مر گئے پھر ان کو زندہ کیا۔ پھر ان کو کہا اللہ کی کتاب کو تسلیم کرو، انہوں نے پھر انکار کیا۔

" فرفع فوقهم الطور " تو طور کو اٹھا کر ان کے سروں پر بلند کر دیا، پھر ان کو کہا گیا کتاب کو تسلیم کرو ورنہ طور کو تمہارے اوپر پھینک دیا جائے گا " فاخذوه فرفع الطور هو المیثاق " تو انہوں نے اسے تسلیم کر لیا طور کو ان کے سروں سے ہٹا لیا گیا یہی وہ میثاق ہے۔

تنبیہ : بظاہر عقل کا تقاضا یہ تھا کہ " مواثیقکم " کہا جاتا کہ تم میں سے ہر ایک سے وعدہ

لیا گیا تمام سے ایک میثاق لینے کا کیا مطلب۔ اس کی دو وجہ ہیں۔ ایک یہ ہے کہ اگرچہ ذکر واحد کا ہے لیکن مراد ہر ہر فرد سے وعدہ لینا ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے ﴿ ثُمَّ یُخْرِجُکُمْ طِفْلًا ﴾ پھر تم میں سے ہر ایک کو طفولیت کی حالت میں نکالا۔ دوسری وجہ یہ ہے " انہ کان شیًا واحدا اخذ من کل واحد منھم "ہر ایک سے ایک قسم کا ہی وعدہ لیا گیا" فلا جرم کان کلہ میثاقا واحدا " تو یقیناً ایک ہی میثاق مراد ہوا۔ اگر" مواثیق" کہا جاتا تو وہم ہوتا کہ شائد ان لوگوں سے علیحدہ علیحدہ وعدے لئے گئے۔ (از کبیر)

﴿ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ ﴾ : "اور اٹھایا ہم نے تمہارے اوپر طور"

" عن ابی حاتم عن ابن عباس ان موسٰی علیہ السلام لما جاء ھم بالتوراۃ وما فیھا من التکالیف الشاقۃ کبرت علیھم وابوا قبولھا فامر جبریل بقلع الطور فظلہ فوقھم حتی قبلوا " (روح المعانی)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ بیشک موسیٰ علیہ السلام جب ان کے پاس توراۃ کو لائے تو اس میں مشکل احکام تھے، انہوں نے ان کو قبول کرنے سے انکار کر دیا، تو اللہ تعالیٰ نے جبرائیل کو حکم دیا، انہوں طور کو اٹھا کر ان کے سروں پر سائبان کی طرح کر دیا، تو انہوں نے توراۃ کے احکام شاقہ کو قبول کر لیا۔

سورۃ اعراف میں فرمایا:

﴿ وَاِذْ نَتَقْنَا الْجَبَلَ فَوْقَهُمْ كَاَنَّهٗ ظُلَّةٌ وَّظَنُّوْٓا اَنَّهٗ وَاقِعٌۢ بِهِمْ خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاذْكُرُوْا مَا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴾

اور جب ہم نے پہاڑ کو اپنی جگہ سے ہٹا کر ان کے سروں پر سائبان کی طرح کر دیا۔ انہوں نے گمان کیا بیشک وہ ان پر گرنے والا ہے (ہم نے ان کو کہا) پکڑو (عمل کرو اس پر) جو ہم نے تمہیں عطا کیا مضبوطی سے (اس پر عمل کرو) اور یاد کرو اس میں جو ہے تا کہ تم پرہیزگار بن جاؤ۔

"﴿ وَاِذْ نَتَقْنَا ﴾، قلع من اصلہ " یعنی ﴿ نَتَقْنَا ﴾ کا معنی یہ ہے کہ ہم نے پہاڑ کو جڑوں سے اکھیڑ کر ان کے سروں پر سائبان کی طرح کر دیا" قال ابو عبیدہ، زعزعناہ فاستخرجنا من مکانہ" ابو عبیدہ نے کہا ﴿ نَتَقْنَا ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے اسے حرکت دی، جھنجوڑا اور اپنی جگہ سے ہٹا دیا۔

"وعلی معنی فلمہ فرمیت بہ فقد نتقتہ"

ہر وہ چیز جس کو اکھیڑ کر پھینک دیا جائے اس کے لئے لفظ "نتق" بولتے ہیں۔

"قال ابن الاعرابی ، الناتق الرافع" ابن اعرابی نے کہا ناتق کا معنی اٹھا کر بلند کرنا۔

(از قرطبی)

علامہ رازی رحمہ اللہ نے کیا خوب بیان کیا:

" ان رفع الطور آیة باھرة عجیبة تبھر العقول وترد المکذب الی التصدیق والشاک الی الیقین فلما رأو ذلک وعرفوا انه من قبله تعالیٰ علما لموسی علیه السلام علمامضافا الی سائر الآیات اقر واله بالصدق فیما جاء به واظھر وا التوبة واعطوا العھد والمیثاق ان لا یعودوا الی ما کان منھم من عبادة العجل وان یقوموا بالتوراة فکان ھذا عھدا موثقا جعلوه لله علی انفسھم "

پہاڑ کو اٹھا کر ان کے سروں پر کرنے میں بہت روشن دلیل ہے، اور عقلوں کو حیران کرنے والی ہے جھٹلانے والے کو تصدیق کی طرف لانے والی دلیل ہے، اور شک کرنے والے کو یقین دلانے والی ہے جب بنی اسرائیل نے طور کو اپنے سروں پر دیکھا تو وہ سمجھ گئے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور ان کو موسیٰ علیہ السلام کے سچے نبی ہونے کا علم حاصل ہو گیا بلکہ تمام معجزات تمام نشانیوں اور تمام دلائل پر وہ یقین کرنے لگے اور انہوں نے توبہ کی اور پختہ وعدہ کیا کہ آئندہ بچھڑے کی پوجا کرنے جیسے عمل کو نہیں دھرائیں گے۔ اور توراۃ پر عمل کریں گے گویا کہ یہ ان کی طرف سے جو پختہ وعدہ کیا گیا اسی کو اللہ تعالیٰ نے ان سے طلب کیا تھا۔ (کبیر)

تنبیہ: اللہ تعالیٰ کے حکم سے جبرائیل نے طور کو اٹھا کر بنی اسرائیل کے سروں پر سائبان کی طرح کیا اس میں تقریباً تمام سلف صالحین کا اتفاق ہے متقدمین کی تمام تفاسیر اس پر شاہد ہیں۔ لہذا مودودی صاحب کی یہ تفسیر بے حقیقت ہو کر رہ گئی اس کی تفصیلی کیفیت معلوم کرنا مشکل ہے، بس مجملا یوں سمجھنا چاہئے کہ پہاڑ کے دامن میں میثاق لیتے وقت ایسی خوفناک صورت حال پیدا کر دی گئی تھی کہ ان کو ایسا معلوم ہوتا تھا گویا پہاڑ ان پر آ پڑے گا، ایسا ہی کچھ نقشہ سورۃ اعراف آیۃ ۱۷۱ میں کھینچا گیا ہے۔

(تفہیم القرآن)

سورۃ اعراف کی وضاحت قرطبی کے حوالہ سے بیان کر دی گئی، جس میں مطلب ہی یہ ہے کہ پہاڑ کو اٹھا کر بلند کیا۔

طور کو اٹھانے کا انکار کرنے والے کون؟

" من الملاحدة من انكر امكان وقوف الثقيل فى الهواء بلاعماد واما الارض فقالوا انماوقفت لانها بطبعها طالبة للمركز فلاجرم وقفت فى المركز ودليلنا على فساد قولهم انه سبحانه قادر على كل الممكنات ووقوف الثقيل فى الهواء من الممكنات فوجب ان يكون الله قادرا عليه "

(کبیر)

بعض ملحدین (بے دینوں) نے انکار کیا ہے کہ طور کو اٹھا کر فضا میں روکے رکھنا ممکن نہیں۔ کیونکہ ثقیل (بھاری) چیز کا ہوا (فضاء) میں بغیر کسی ستون کے ٹھہرنا ممکن نہیں۔ لیکن زمین کے متعلق وہ کہتے ہیں کہ وہ طبعی طور پر مرکز کو طلب کرتی ہے اس لئے اس کا مرکز میں کھڑا ہونا ممکن ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ ان کا مذہب باطل ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ تمام ممکنات پر قادر ہے، اس لئے ثقیل چیز کو فضاء میں معلق رکھنا اللہ تعالیٰ کی قدرت سے کوئی بعید نہیں۔

اعتراض: " اظلال الجبل غير جائز لان ذلك لو وقع لكان يجرى مجرى الالجاء الى الايمان وهو ينافى التكليف "

طور کو اٹھا کر ان کے سروں پر سائبان کی طرح معلق رکھنا شرعاً بھی ناجائز ہے کیونکہ اس سے تو ایمان پر جبر (زبردستی حکم منوانا) ثابت ہوگا، یہ انسان کو مکلّف بنانے کے منافی ہے کیونکہ کسی کو حکم اسی وقت دیا جاسکتا ہے جب کہ اس کا اختیار باقی ہو، خصوصاً رب تعالیٰ کا ارشاد اس پر دلالت کر رہا ہے:

﴿ لَا اِكْرَاهَ فِى الدِّيْنِ ﴾ دین میں جبر نہیں۔

جواب: اجاب القاضى بانه لا يلجئ لان اكثر ما فيه خوف السقوط عليهم فاذا استمرفى مكانه مدة وقد شاهدوا السموات مرفوعة فوقهم بلا عماد جاز ههنا ان يزول عنهم الخوف فيزول الالجاء ويبقى التكليف "

قاضی عیاض رحمہ اللہ نے اس کا جواب یہ دیا کہ ان سے جبراً ایمان لانے کا مطالبہ نہیں تھا۔ جب

ان پر پہاڑ کو اٹھا کر بلند کیا تو ابتدائی طور پر انکو خوف ہوا، لیکن جب پہاڑ زیادہ دیر فضاء میں معلق رہا تو ان کو سمجھ آ گیا کہ پہاڑ ہم پر نہیں گرے گا، کیونکہ یہ تو آسمانوں کی طرح ہم پر بلند ہوا ہے جس طرح آسمان ہم پر نہیں گرتے ایسے ہی طور بھی نہیں گرے گا، البتہ ان کو اللہ تعالیٰ کی قدرت اور موسیٰ علیہ السلام کے معجزہ کا علم حاصل ہو گیا۔ ان سے خوف جاتا رہا انہوں نے ایمان اپنے اختیار سے قبول کیا۔ (از کبیر)

﴿ خُذُوا مَا اٰتَیۡنٰکُمۡ بِقُوَّةٍ ﴾: ''جو ہم نے تمہیں دیا اسے مضبوطی سے پکڑو''

﴿ بِقُوَّةٍ ﴾ ای بجد و عزیمة کاملة وعدول عن التغافل والتکاسل''
یعنی بڑی کوشش اور پختہ اور کامل ارادہ سے اس پر عمل کرو اسے تسلیم کرو جو ہم نے تمہیں عطا کیا ہے اس میں کسی قسم کی غفلت اور سستی کا مظاہرہ نہ کرو۔ (کبیر)

﴿ بِقُوَّةٍ ﴾ وقیل بنیة واخلاص '' جو ہم نے تمہیں عطا کیا ہے وہ خالص نیت سے حاصل کرلو۔

﴿ بِقُوَّةٍ ﴾ القوة العمل بما فیه '' جو ہم نے تمہیں عطا کیا ہے اس پر مضبوطی سے عمل کرو۔

'' وقیل بقوة بکثرة درس '' جو ہم نے تمہیں (کتاب) عطا کی ہے اسے زیادہ سے زیادہ پڑھو تاکہ زیادہ پڑھنے سے تمہارے دلوں پر زیادہ اثر انداز ہو۔ (از قرطبی)

﴿ وَاذۡکُرُوۡا مَا فِیۡهِ ﴾: (اور یاد کرو جو اس میں ہے) ای تدبروہ واحفظوا اوامره ووعیده ولا تنسوه ولا تضیعوه'' یعنی یاد کرنے کا مطلب یہ ہے کہ جو کتاب میں ہے اس میں تدبر کرو اس کے اوامر (احکام) اور وعید (یعنی عذاب کا خوف دلانا) کو یاد کرو، ان کو نہ بھولو، اور ان پر عمل کرو ان کو ضائع نہ کرو۔ (از قرطبی)

'' قلت هذا هو المقصود من الکتب العمل بمقتضاها لا تلاوتها باللسان وترتیلها''

کتب پر عمل کرنا ہی مقصد عظیم، صرف تلاوت کرنا، خوبصورت انداز پر ٹھہر ٹھہر اکر پڑھنا مقصود نہیں۔ اسی وجہ سے رب تعالیٰ نے یہود کی مذمت فرمائی جب انہوں نے کتب پر عمل چھوڑ دیا، رب تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ نَبَذَ فَرِیۡقٌ مِّنَ الَّذِیۡنَ اُوۡتُوا الۡکِتٰبَ ﴾

اہل کتاب میں سے ایک فریق نے کتاب کو پس پشت ڈال دیا۔

☆ نسائی نے حضرت ابوسعید خدری ﷺ سے روایت کی کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

" ان من شر الناس رجلا فاسقا یقرأ القرآن لا یرعوی الی شئی منه "

بیشک لوگوں میں سے شر وہ فاسق شخص ہے جو قرآن پڑھتا ہو لیکن اس پر عمل نہ کرتا ہو

﴿**لغوی ترجمہ**﴾ اس کی کسی چیز کی حفاظت نہ کرتا ہو)

" **فبین ان المقصود العمل کما بینا** " واضح ہوا کہ بیشک مقصد عمل کرنا ہی جیسا کہ ہم نے بیان کر دیا ہے۔

☆ " **وقال مالک قد یقرء القرآن من لا خیر فیه** " امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں بعض اوقات قرآن وہ شخص بھی پڑھتا ہے جس میں کوئی بھلائی کا کام نہیں ہوتا۔

عقل کا تقاضا بھی یہی ہے کہ جب ہم سے پہلے لوگوں یعنی یہود ونصاری کو حکم دیا گیا ہے کہ تم قرآن پاک پر عمل کرو تمہارے دین اب منسوخ ہو چکے ہیں لہذا اپنے اپنے دین چھوڑ دو تو یقیناً ہمارے لئے بھی ضروری ہے کہ ہم قرآن پاک کے مطابق عمل کریں۔

" قال اللہ تعالیٰ ﴿ وَاتَّبِعُوْا اَحْسَنَ مَا اُنْزِلَ اِلَیْکُمْ مِنْ رَبِّکُمْ ﴾ فامرنا باتباع کتابه ولاعمل بمقتضاه لکن ترکنا ذلک کما ترکت الیهود والنصاری "

رب تعالیٰ نے قرآن پاک کی تابعداری کا حکم دیا اور قرآن پاک کے تقاضا کے مطابق عمل کرنے کا حکم دیا۔ لیکن ہم نے اسے اس طرح چھوڑ دیا جیسا کہ یہود ونصاری نے چھوڑ دیا۔

اب کتب پڑھنے والے، قرآن پڑھنے والے بہت افراد ملیں گے لیکن اس کا کوئی فائدہ نہیں کیونکہ ان پر جہالت کا غلبہ ہے وہ ریاست کے طلبگار ہیں اور خواہشات کو چاہنے والے ہیں۔

☆ ترمذی نے جبیر بن نفیر سے روایت کیا اور انہوں نے ابوالدرداء ﷺ سے وہ فرماتے ہیں:

" کنا مع النبی ﷺ فشخص ببصره الی السماء ثم قال هذا اوان یختلس فیه العلم من الناس حتی لا یقدر وامنه علی شئی ، فقال زیاد بن لبید الانصاری ، کیف یختلس منا وقد قرأنا القرآن ، فواللہ لنقرأنه ولنقرانه نساء نا وابناء نا فقال ثقلتک امک یازیاد ان کنت لا

عدک من فقهاء المدینة هذه التوراة والانجیل عند الیهود والنصاری فما ذا تغنی عنهم"

ایک مرتبہ ہم نبی کریم ﷺ کے ساتھ تھے، آپ نے اپنی نظر کو آسمانوں پر ٹکایا، پھر فرمایا یہ وقت (جو میں دیکھ رہا ہوں، ایسا وقت ہوگا) جس میں لوگوں سے علم چھین لیا جائے گا یہاں تک کہ وہ اس پر قادر نہیں ہوں گے، تو زیاد بن لبید انصاری نے کہا، ہم سے کیسے علم کو چھین لیا جائے گا، حالانکہ ہم نے قرآن پڑھا ہے، قسم ہے اللہ تعالیٰ کی ہم ضرور بضرور قرآن پڑھتے رہیں گے۔ اور ضرور بضرور اپنی بیبیوں اور اپنی اولاد کو قرآن پڑھاتے رہیں گے، نبی کریم ﷺ نے فرمایا اے زیاد تمہاری ماں تمہیں پیٹے میں تو تمہیں مدینہ طیبہ کے فقہاء میں سے سمجھتا تھا، (کیا تمہیں معلوم نہیں) یہ توراۃ اور انجیل یہود و نصاری کے پاس ہیں (وہ پڑھ بھی رہے ہیں) لیکن انہیں ان سے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہو رہا۔

حدیث پاک کا مطلب واضح ہے کہ نبی کریم ﷺ کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ قرآن پاک پڑھنے والے لوگ تو ہوں گے اس پر عمل کرنے والے کم ہوں گے، گویا کہ علم اٹھ جائے گا، جس طرح یہود و نصاری میں توراۃ و انجیل پڑھنے والے تو بہت ہیں، لیکن اس پر عمل کرنے والے نہیں، تو وہ جاہل ہی ہیں ان کو اصحاب علم نہیں کہا جا سکتا، یقینی بات ہے کہ اگر وہ اپنی کتب پر عمل کرتے تو نبی کریم ﷺ پر ایمان بھی لاتے۔

☆ " وفی الموطأ عن عبد الله بن مسعود قال لانسان انک فی زمان کثیر فقهاؤه، قلیل قراؤه، تحفظ فیه حدود القرآن وتضیع حروفه، قلیل من یسأل، کثیر من یعطی، یطیلون الصلوة ویقصرون فیه الخطبة، یبدء ون فیه اعمالهم قبل اهوائهم، وسیأتی علی الناس زمان قلیل فقهاؤه، کثیر قراؤه، تحفظ فیه القرآن، وتضیع حدوده، کثیر من یسأل، قلیل من یعطی، یطیلون فیه الخطبة، ویقصرون الصلوة، یبدء ون فیه اهوائهم قبل اعمالهم"

مؤطا میں حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت مذکور ہے، آپ نے ایک شخص کو فرمایا بیشک تم ایسے زمانہ میں موجود ہو جس میں فقہاء کثیر تعداد میں ہیں۔ قراء (قرآن کو سنوار سنوار کر پڑھنے والے)

قلیل تعداد میں ہیں۔اس دور میں قرآن پاک کی حدود کی حفاظت کی جاتی ہے(یعنی قرآن پاک کے مطابق عمل ہو رہا ہے)اور حروف ضائع ہو رہے ہیں۔(یعنی قرآن پاک کم پڑھا جاتا ہے،اور تجوید کا لحاظ بھی کم کیا جاتا ہے)سوال کرنے والے قلیل ہیں اور دینے والے کثیر ہیں۔نمازیں لمبی پڑھنے والے موجود ہیں،اور تقریریں چھوٹی کرتے ہیں۔وہ اعمال کا لحاظ پہلے کرتے ہیں،خواہشات کا لحاظ بعد میں۔لوگوں پر ایک زمانہ آنے والا ہے،جس میں فقہاء(دین کو سمجھنے والے)کم ہو جائیں گے،اور قراء کثیر ہو جائیں گے(یعنی خوش آوازی سے طرز لگا کر قرآن پڑھنے والے بہت مل جائیں گے)قرآن کی حفاظت کی جائے گی(یعنی پڑھنے کی کثرت اور لفاظی کی طرف توجہ زیادہ ہوگی)لیکن قرآن پاک کی حدود کو ضائع کر دیا جائے گا(یعنی عمل اٹھ جائے گا)سوال کرنے والے کثیر ہوں گے،دینے والے کم ہونگے،تقریریں لمبی ہوں گی،نمازیں چھوٹی ہوں گے۔اپنی خواہشات کو وہ اپنے اعمال پر مقدم کریں گے۔

ایک روایت میں ہے:

"یبتغون اھوائھم ویترکون العمل بالذی افترض علیھم"

وہ اپنی خواہشات کی تابعداری کریں گے اور فرض اعمال کو چھوڑ دیں گے۔(قرطبی)

﴿ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ﴾ : (تاکہ تم پرہیزگار ہو جاؤ)تقریباً مفہوم واضح ہے،کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جو ہم نے تمہیں عطا کیا اسے مضبوطی سے پکڑو،یعنی اس پر کامل طور پر عمل کرو،اور جو اس میں ہے اسے یاد کرو،یعنی اسے پڑھو،اس میں تدبر کرو اور اس پر عمل کرو،ان تمام ہدایات کی اصل وجہ یہ ہے کہ اس میں تمہارا ہی بھلا ہے،یعنی وجہ یہ ہے کہ تم پرہیزگار ہو جاؤ۔

☆☆☆☆☆

﴿ ثُمَّ تَوَلَّیۡتُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ ذٰلِکَ فَلَوۡ لَا فَضۡلُ اللّٰہِ عَلَیۡکُمۡ وَرَحۡمَتُہٗ لَکُنۡتُمۡ مِّنَ الۡخٰسِرِیۡنَ ﴾

۱) ''پھر اس کے بعد تم پھر گئے، تو اگر اللہ کا فضل اور اسکی رحمت تم پر نہ ہوتی تو تم ٹوٹے والوں میں ہو جاتے''

۲) ''پھر تم پھر گئے اس کے بعد، تو اگر نہ ہوتا اللہ تعالیٰ کا فضل تم پر، اور اسی کی رحمت، تم ہو جاتے خسارہ پانے والوں میں سے''

مختصر وضاحت: بنی اسرائیل نے اس وعدہ کو بھی توڑ دیا تھا اسی لئے رب تعالیٰ نے فرمایا تم اسکے بعد پھر گئے لیکن اللہ تعالیٰ نے پھر ان کو اپنے فضل و کرم اور اپنی رحمت سے توبہ کی توفیق دی، اسی لئے رب تعالیٰ نے فرمایا، اگر تم پر اللہ تعالیٰ کا فضل اور رحمت نہ ہوتی تو تم نقصان اٹھانے والوں میں ہوتے۔

قدرے وضاحت:

﴿ ثُمَّ تَوَلَّیۡتُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ ذٰلِکَ ﴾ : اعرضتم عن الوفاء بالمیثاق بعد اخذہ ''(بیضاوی)

یعنی وعدہ کرنے کے بعد تم اس کی وفا نہ کر سکے، بلکہ تم نے اس سے اعراض کیا۔

﴿ تَوَلَّیۡتُمۡ ﴾ ماخوذ ہے '' التولی '' سے جس کا معنی ہے اجسام کا کسی چیز سے پیٹھ پھیرنا، پھر مجازی طور پر افعال اور اعتقادات سے اعراض کرنے پر بھی '' التولی '' کا اطلاق پایا جاتا ہے۔ بیشک ہم اجمالی طور پر جانتے ہیں کہ بنی اسرائیل نے توراۃ کو طور کے اٹھائے جانے کے بعد قبول کر کے اس پر عمل کرنے سے اعراض کر لیا۔ بلکہ توراۃ میں تحریف کر دی، انبیاء کرام کو شہید کیا، اور انبیاء کرام کا انکار کر کے کفر کیا، اور میدان تیہ میں موسیٰ علیہ السلام کے عجیب معجزات دیکھنے کے باوجود انکی مخالفت کرتے رہے۔ اور ہر اذیت والا کام کرتے رہے، اپنے لشکر میں کھلے اور واضح گناہ کرتے رہے۔ یہی وجہ ہے کہ:

'' حتی خسف ببعضهم واحرقت النار بعضهم وعوقبوا بالطاعون ''

بعض لوگوں کو ان میں سے زمین پر دھنسا دیا گیا اور بعض کو آگ نے جلا دیا، اور بعض کو

طاعون کی مرض سے عذاب دیا گیا۔

قرآن پاک میں ان کے اعراض کرنے کی اگرچہ تفصیل مذکور نہیں، لیکن جو وجوہ ہم نے ذکر کی ہیں وہ تواریخ میں موجود ہیں۔ (بلکہ زیادہ ان میں سے قرآن پاک میں مذکور ہیں اگرچہ واضح طور پر یہ نہیں بیان کیا گیا کہ یہ وجوہ ہیں ان کے اعراض کرنے کے)۔ (از شیخ زادہ)

﴿ فَلَوْ لَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ لَكُنْتُمْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴾:

" الفضل التوفيق للتوبة والرحمة قبولها "

فضل کا مطلب ہے توبہ کی توفیق دینا، اور رحمت کا مطلب ہے اس کی عطا کردہ توبہ کی توفیق کو قبول کرنا، اسی معنی کے لحاظ پر مطلب یہ ہو گیا کہ اگر اللہ تعالیٰ تمہیں توبہ کی توفیق نہ عطا کرتا اور اس توبہ کے قبول کرنے کی رحمت تم پر نہ فرماتا تو نقصان اٹھانے والوں میں ہوتے۔ لیکن اس نے اپنے فضل اور رحمت کے ذریعے تمہیں اس نقصان سے بچا لیا۔

" او الفضل والرحمة بعثة رسول الله ﷺ وادراكهم لمدته "

یا فضل اور رحمت سے مراد نبی کریم ﷺ کی بعثت اور بنی اسرائیل کا آپ کے زمانہ کو پالینا۔

یعنی خطاب نبی کریم ﷺ کے زمانہ کے لوگوں کو ہے اب مطلب یہ ہو گا کہ اگر اللہ تعالیٰ اپنے محبوب ﷺ کو نہ مبعوث کرنا اور تمہیں ان کا زمانہ عطا نہ فرماتا تو تم خسارہ اٹھانے والوں میں ہوتے۔ لیکن اس نے اپنے محبوب ﷺ کو تم میں مبعوث کر کے اور تمہیں ان کا زمانہ عطا کر کے نقصان سے بچا لیا۔

(روح المعانی)

نبی کریم ﷺ کی وجہ سے ان کو نقصان سے کیسے بچا لیا گیا؟

" ويمكن ان يراد ﴿ لَوْ لَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ ﴾ بعثة محمد ﷺ حيث جعله رحمة للعالمين فبوجوده ﷺ امهل الكفار واخر عنهم العذاب ورفع عنهم الخسف والمسخ "

یعنی اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو مبعوث فرمایا، آپ کو رحمۃ للعالمین بنایا، اور آپ کے وجود مسعود سے کفار کو مہلت دی، اور ان سے عذاب کو مؤخر کر دیا، اور ان کو زمین میں دھنسا دینے والے عذاب اور ان کی شکلیں بگاڑ دینے والے عذاب سے بچا لیا۔

اب مفہوم واضح ہو گیا کہ اگر اللہ تعالیٰ نبی کریم ﷺ کو سب جہانوں کے لئے رحمت بنا کر مبعوث نہ فرماتا، اور کفار میں ان کو موجود نہ فرماتا تو وہ بہت سخت عذاب میں مبتلا ہو کر تباہ و برباد ہو جاتے۔

(از مظہری)

﴿ خُسْرَانٌ ﴾ کا معنی رأس المال (اصل سرمایہ پونجی) کا ضائع ہو جانا یا اس میں کمی آ جانا۔

" والمراد لکنتم مغبونین ھالکین بالانھماک فی المعاصی "

مراد اس سے یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو تم گناہوں میں مکمل طور پر پھنس کر برباد ہو جاتے۔

" او بالخبط فی مھاوی الضلال عند الفترۃ " یا مراد یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کا فضل تم پر نہ ہوتا اور اس کی رحمت تم پر نہ ہوتی تو تم ابتدائی فترت میں ہی گمراہی کے گڑھے میں گر کر تباہ و برباد ہو جاتے۔

(از روح المعانی)

﴿ لَكُنْتُمْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴾ المغبونین المعذبین فی الحال کما کنتم معذبین الھالکین بوقوع الطور لو لم تقبلوا حکم اللہ حینئذ "

اگر تم پر اللہ تعالیٰ کا فضل اور رحمت نہ ہوتی تو تم عذاب میں ایسے مبتلاء ہوتے اور عذاب کی وجہ سے برباد ہو جاتے جیسا کہ تم طور پر جا کر ہلاک ہو گئے تھے، اگر اللہ تعالیٰ اس وقت تم پر رحم نہ فرماتا تو تم برباد ہی رہتے۔

(از مظہری)

☆☆☆☆☆

﴿وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِيْنَ اعْتَدَوْا مِنْكُمْ فِي السَّبْتِ فَقُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً خَاسِئِيْنَ﴾

۱) ''اور بے شک ضرور تمہیں معلوم ہے تم میں کے جنہوں نے ہفتہ میں سرکشی کی، تو ہم نے ان سے فرمایا ہو جاؤ بندر دھتکارے ہوئے''

۲) ''اور تحقیق تم جانتے ہو ان لوگوں کو جنہوں نے تجاوز کیا ہے تم میں سے ہفتہ کے دن میں تو ہم نے کہا انہیں ہو جاؤ بندر ذلیل وخوار''

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی کہ یہ واقعہ حضرت داؤد علیہ السلام کے زمانہ میں درپیش ہوا۔ یہ لوگ مدینہ طیبہ اور شام کے درمیان دریا کے کنارے پر واقع بستی ایلہ میں مقیم تھے۔ یہود کو ہفتہ کے دن شکار سے منع کیا گیا تھا، کیونکہ ہفتہ کا دن ان کے لئے معظم تھا۔ جیسا کہ عیسائیوں کے لئے اتوار کا دن اور مسلمانوں کے لئے جمعہ کا دن معظم ہے۔

سال کے ایک مہینہ میں اس دریا میں اتنی مچھلیاں ہوتیں کہ پانی کی اوپر کی سطح مچھلیوں سے ڈھانپ دی جاتی یہود کی آزمائش کے لئے ہفتہ کے دن بھی اتنی مچھلیاں ہی دریا میں جمع ہو جاتیں۔ لیکن آگے پیچھے اور دنوں میں مچھلیاں بہت ہی کم مقدار میں ہوتیں۔ زیادہ پانی کی گہرائی میں چلی جاتیں۔ سورۃ اعراف میں اسی واقعہ کو ان الفاظ مبارکہ سے ذکر فرمایا:

﴿وَاسْئَلْهُمْ عَنِ الْقَرْيَةِ الَّتِيْ كَانَتْ حَاضِرَةَ الْبَحْرِ اِذْ يَعْدُوْنَ فِي السَّبْتِ اِذْ تَاْتِيْهِمْ حِيْتَانُهُمْ يَوْمَ سَبْتِهِمْ شُرَّعًا وَّيَوْمَ لَا يَسْبِتُوْنَ لَا تَاْتِيْهِمْ كَذٰلِكَ نَبْلُوْهُمْ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ﴾

''اور ان سے حال پوچھو اس بستی کا کہ دریا کے کنارے تھے جب وہ ہفتہ کے دن کے بارے میں حد سے تجاوز کرنے لگے جب ہفتہ کے دن ان کے سامنے مچھلیاں پانی پر تیرتیں ان کے سامنے آتیں اور جو دن ہفتے کا نہ ہوتا نہ آتیں اس طرح ہم انہیں آزماتے تھے اس وجہ سے کہ وہ فسق کرتے تھے''

جب ہفتہ کے دن ان کے سامنے مچھلیاں آتیں اور اپنی اپنی دم کو پانی سے باہر نکالتیں تو ان کے دل للچانے لگے کہ ہم کس طرح شکار کریں ادھر ہفتہ کا دن، رب تعالیٰ کی طرف سے شکار کی ممانعت، اور

ادھر صرف ہفتہ کے دن ہی مچھلیوں کی کثرت اور ان کا پانی کی سطح پر آنا۔ ابھی یہ لوگ شکار کرنے کو للچا رہے تھے کہ شیطان نے ان کی راہنمائی کی:

" ثم ان الشیطان وسوس الیھم وقال انما نھتیم عن اخذھا یوم السبت ولم تنھوا عن اخذھا فی غیرہ "

یعنی شیطان نے ان کے دلوں میں وسوسہ ڈالا، اور کہا بیشک تمہیں مچھلیوں کے پکڑنے سے منع کیا گیا ہے، لیکن ان کو کسی حیلہ سے پھنسانے سے تو منع نہیں کیا گیا، تو انہوں نے دریا کے کنارے اردگرد بڑے بڑے حوض بنالئے اور نالیوں کے ذریعے ان میں ہفتہ کے دن مچھلیوں کو حوضوں میں بند کر لیتے اور اتوار کو اور اسی طرح بعد کے دنوں میں ضرورت کے مطابق پکڑتے رہتے۔

" وقیل انھم کانوا ینصبون الشخوص والحبائل یوم الجمعۃ ویخرجونھا یوم الاحد"

اور ایک قول یہ ہے (راقم کے نزدیک بعض لوگ یہ حیلہ کرتے تھے اور بعض پہلے والا) کہ وہ لوگ جمعہ کے دن اپنی کنڈیاں اور جال دریا میں ڈال دیتے اور ان کو باہر رسیوں، دھاگوں سے باندھ دیتے، ہفتہ کے دن مچھلیاں ان میں پھنس جاتیں اور اتوار کو وہ نکال لیتے۔

کچھ وقت تک تو یہی طریقہ اختیار کئے رہے، اور عذاب ان پر نازل نہ ہوا تو ان کو جرأت حاصل ہوگئی کہ وہ ہفتہ کے دن بھی شکار کرنے لگ گئے۔ مچھلیاں پکڑنا، اور بھوننا اور خرید وفروخت کرنا ان کا مشغلہ بن گیا۔ اب ان میں تین گروہ بن گئے اس بستی میں رہنے والے ستر ہزار کی تعداد میں تھے۔

" صنف امسک عن الصید ونھی عن الاصطیاد " ایک قسم کے وہ لوگ تھے جو خود بھی شکار نہیں کرتے تھے اور شکار کرنے والوں کو بھی منع کرتے تھے ان کی تعداد بارہ ہزار تھی۔

" وصنف امسک ولم ینہ " اور ایک قسم کے وہ لوگ تھے جو خود تو شکار نہیں کرتے تھے لیکن شکار کرنے والوں کو روکتے نہیں تھے کہ تمام شکار نہ کرو۔

" وصنف انھمکوا فی الذنب وھتکوا الحرمۃ " اور قسم کے لوگ وہ تھے جو گناہوں میں منہمک تھے اور انہوں نے حرمت کے قانون کو توڑ دیا تھا۔

نیک لوگوں نے مجرمین سے کنارہ کشی کر لی:

جو لوگ خود شکار نہیں کر رہے تھے اور شکار کرنے والوں کو منع کر رہے تھے مجرمین نے جب ان نیک لوگوں کی نصیحت کو قبول کرنے سے انکار کر دیا، تو انہوں نے کہا " واللہ لا نساکنکم فی قریة واحدة فقسموا القریة بینهم بجدار " قسم ہے اللہ تعالیٰ کی ہم تمہارے ساتھ ایک بستی میں نہیں ٹھہریں گے انہوں نے اپنے گھروں کو درمیان میں ایک دیوار بنا کر علیحدہ کر لیا۔

اس طرح گویا کہ دو بستیاں بن گئیں ایک مجرمین کی اور ایک نیک لوگوں کی اسی حال میں کچھ عرصہ گزر گیا:" ثم لعنهم داؤد وغضب الله علیهم لا صرارهم علی المعصیة " پھر ان پر داؤد علیہ السلام نے بھی لعنت بھیجی اور اللہ تعالیٰ کا بھی غضب ان پر آ گیا کیونکہ وہ اپنی معصیت پر مصر رہے یعنی اپنے گناہوں پر ڈٹے رہے۔ تو رب تعالیٰ کا عذاب ان پر مسلط ہو گیا۔

جو لوگ ان کو شکار کرنے سے منع کرتے تھے ایک دن جب انہوں نے دیکھا کہ شکار کرنے والے گھروں سے نہیں نکل رہے، اپنی بستی کی دیوار کا انہوں نے دروازہ نہیں کھولا۔ تو ان لوگوں نے دیوار کو پھاند کر جب دیکھا تو یہ بندر بنے ہوئے تھے اپنے دم ہلا رہے تھے۔ (از خازن)

" وقیل صار الشباب قردة والشیوخ خنازیر فمکثوا ثلاثة ایام ثم هلکوا "
بعض حضرات نے کہا ہے کہ وہ لوگ جنہوں نے رب تعالیٰ کے حکم کے خلاف ورزی کی ان میں جوانوں کو بندر بنا دیا گیا۔ اور بوڑھوں کو خنزیر، وہ تین دن تک اسی حال میں رہے پھر ہلاک ہو گئے۔ (خازن)

مختصر لفظی بحث: ﴿ اَلسَّبْتُ ﴾ معروف دن یعنی ہفتہ کا دن۔

" وهو ماخوذ من السبت الذی هو القطع لانه سبت فیه خلق کل شئی وعمله "

یہ ماخوذ ہے اس " سبت " سے جس کا معنی ہے قطع کرنا، چونکہ اس دن میں ہر چیز اور اس کے عمل کو پیدا کرنے سے منقطع کیا گیا ہے اس لئے اسے " اَلسَّبْتُ " کہا گیا ہے۔

" وقیل من السبوت وهو الراحة والدعة " اور بعض حضرات نے کہا کہ یہ سبوت سے

ماخوذ ہے جس کا معنی ہے آرام وسکون۔ جب " السبت " سے مراد ہفتہ کا دن ہوتو حذف مضاف ہوگا ،تقدیر عبارت کی یہ ہوگی " اعتدوا منکم فی حکم السبت " یعنی مراد ہفتہ کے دن کے حکم میں تجاوز کرنا ہے " لان الاعتداء والتجاوزلم یقع فی الیوم بل وقع فی حکمه " اس لئے کہ تجاوز دن میں ،زمان میں نہیں ہوتا بلکہ تجاوز دن کے احکام میں ہوتا۔ (از روح المعانی)

" والسبت مصدر قولک سبتت الیهود اذا عظمت یوم السبت "

ایک مطلب یہ ہے کہ " السبت " مصدر ہے اس میں مراد وہ معنی ہے جو " سبتت الیهود " سے لیا ہوا ہے یہ جملہ اس وقت استعمال ہوتا ہے جب یہود ہفتہ کے دن کی تعظیم کریں۔اب اسی معنی کے لحاظ پر معنی یہ ہوگا اور تحقیق تمہیں علم ہے ان لوگوں کا جنہوں نے ہفتہ کے دن کی تعظیم کرنے میں تجاوز کیا۔اس معنی کے لحاظ پر کوئی حذف مضاف نہیں۔

مطلب یہ ہے کہ ان پر ہفتہ کے دن کی تعظیم کو واجب قرار دیا گیا تھا کہ وہ اس دن میں اپنی عادات کو چھوڑ دیں۔اور عبادت میں مشغول رہیں،اور اس دن کی عظمت کا لحاظ رکھیں،جب اس دن کی تعظیم ان پر واجب ہے تو یقیناً اس دن میں تجاوز کرنا اور جرائم ان پر حرام ہیں۔(از بیضاوی وشیخ زادہ)

یہود نے ہر موقع پر نبی کی مخالفت کی: موسیٰ علیہ السلام کے دل میں خواہش تھی کہ عبادت کا دن جمعہ کا منتخب ہو لیکن یہود نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی مخالفت کی وہ کہنے لگے کہ نہیں ہفتہ کا دن ہونا چاہئے۔انہوں نے کہا:

" فانه تعالیٰ ابتدا خلق العالم فی یوم الاحد واتمه یوم الجمعة فلم یکن یوم السبت یوم العمل فتمحض فیه العبادة " (شیخ زادہ)

کہ اللہ تعالیٰ نے جہان کے پیدا کرنے کی ابتداء اتوار کے دن کی اور جمعہ کے دن اسے مکمل کر دیا ہفتہ کے دن کوئی عمل نہیں پایا گیا (عمل اور تخلیق سے منقطع ہونے کی وجہ سے ہی وہ سبت بنا) اسلئے وہ ہی عبادت کا دن ہونا چاہئے۔

موسیٰ علیہ السلام نے ان کی خواہش کے مطابق ہی دعا کر دی رب تعالیٰ نے ان کے لئے ہفتہ کا دن ہی معظم قرار دے دیا۔

راقم کے نزدیک ان کو اللہ کے نبی کی مخالفت کی وجہ سے شیطان کے جال میں پھنسنا پڑا، اسی کے وسوسہ سے انہوں نے شکار کرنے کے لئے مکروفریب کے حیلے تراشے، آخرکار بندر بنا دیئے گئے۔ سبحان اللہ نبی کی تعظیم کرنے والے بھی معظم بن گئے، قوم کے امام بن گئے، حیات جاودانی حاصل کر گئے لیکن نبی کے گستاخ بندر اور خنزیر بنا دیئے گئے۔

﴿ قِرَدَةً ﴾ : جمع قرد، جس کا معنی مشہور ومعروف ہے یعنی ''بندر''، خاسئین ، الخسو ، الصغار والذلة '' یعنی خاسئین کا معنی ذلیل وحقیر ہونا یہ لازم بھی استعمال ہوتا ہے اور متعدی بھی ''وبعضهم ذكر الطرد عند تفسير الخسو كالابعاد '' اور بعض حضرات نے اس کا معنی ہانکنا، دھتکارنا کیا ہے یعنی جس طرح کسی کو اپنے آپ سے دور کر دیا جائے۔

خیال رہے کہ '' خاسئی '' کا ظاہر طور پر معنی فاعل والا ہے، لیکن یہاں مراد مفعول والا معنی ہے، '' الخاسئی الصاغر المبعد المطرود '' اس لئے خاسئی کا معنی ذلیل، دور کیا ہوا اور دھتکارا ہوا۔ اعلیٰ حضرت اور علامہ کاظمی رحمہ اللہ نے ''دھتکارے ہوئے'' ترجمہ کیا ہے اور حضرت پیر محمد کرم شاہ رحمہ اللہ نے پھٹکارے ہوئے ترجمہ کیا ہے۔ راقم نے طلباء کے فائدہ کے لئے کہ ان کو دوسرا معنی بھی ذہن نشین ہو جائے ترجمہ کیا ہے ''ذلیل وخوار''

ہفتہ کے دن مچھلیوں کے زیادہ آنے کی وجہ:

یعنی اللہ تعالیٰ نے جب ان کو ہفتہ کی تعظیم کرنے کا حکم دیا اور شکار کرنے سے منع کیا تو ہفتہ کے دن مچھلیوں کے دریا میں زیادہ بھیجنے میں حکمت کیا تھی'' وهل هذا الا اثارة الفتنة وارادة الاضلال '' اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ ان کو آزمانا مقصود تھی کیونکہ سورۃ اعراف میں رب تعالیٰ نے واضح طور پر بیان فرمایا: ﴿ كَذٰلِكَ نَبْلُوْهُمْ ﴾ ہم اسی طرح ان کو آزماتے ہیں، جب وہ آزمائش میں ناکام ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے ان کو فتنہ میں مبتلا کر دیا اور گمراہ کر دیا۔

فائدہ عظیمہ : یہود امتحان میں ناکام ہو کر ذلیل وخوار ہوئے لیکن مصطفیٰ کریم ﷺ کے صحابہ کرام کی عظمت تو دیکھو کہ وہ آزمائش میں کس طرح کامیابی سے ہمکنار ہوتے ہیں۔

☆ " عن ابی قتادة انه خرج مع رسول الله ﷺ فتخلف مع بعض اصحابه وهم محرمون وهو غیر محرم فرأوا حمارا وحشیا قبل ان یراه فلما رأوه ترکوه حتی رأه ابوقتادة فرکب فرساله فسألهم ان یناولوه سوطه فابوا فتناوله فحمل علیه فعقره ثم اکل فاکلوا فندموا فلما ادرکو رسول الله ﷺ سألوه قال هل معکم منه شئی قالوا معنا رجله فاخذها النبی ﷺ فاکلها (متفق علیه) وفی روایة لهما فلما اتوا رسول الله ﷺ قال امنکم احد امره ان یحمل علیها او اشار الیها قالوا لا قال فکلوا ما بقی من لحمها "

(مشکوة باب المحرم یجتب الصید

حضرت ابوقتادہ ﷺ فرماتے ہیں وہ نبی کریم ﷺ کے ساتھ (سفر میں) نکلے کچھ ساتھیوں کے ساتھ آپ سے پیچھے رہ گئے دوسرے ساتھی ان کے محرم (احرام میں) تھے اوران کا احرام نہیں تھا۔ ان کے دیکھنے سے پہلے دوسرے احرام والے ساتھیوں نے حمار وحشی کو دیکھا۔ (لیکن وہ احرام میں تھے، ان پر خشکی کے جانوروں کا شکار منع قرار دیا گیا تھا اس لئے) انہوں نے شکار کو دیکھا (اس کے درپے نہ ہوئے) اسے چھوڑ دیا۔ ابوقتادہ (چونکہ احرام میں نہیں تھے) نے جب اسے دیکھا تو وہ اپنے گھوڑے پر سوار ہوئے دوسرے صحابہ کرام کو کہا کہ مجھے کوڑا پکڑا دیں لیکن انہوں نے ان کو کوڑا دینے سے انکار کر دیا۔ انہوں نے خود ہی کوڑا پکڑا اور حمار وحشی پر حملہ کیا اس کی کوچیں کاٹ دیں پھر انہوں نے (اس کا گوشت) کھایا اور دوسرے صحابہ کرام نے بھی کھایا (وہ کھانے پر) نادم ہوگئے۔ جب وہ نبی کریم ﷺ کو ملے، تو آپ سے صحابہ کرام نے پوچھا، آپ نے فرمایا کیا تمہارے پاس اس گوشت میں سے کچھ ہے؟ انہوں نے عرض کیا ہاں ٹانگ کا کچھ حصہ ہے نبی کریم ﷺ نے وہ گوشت لیا اور کھایا۔ (بخاری و مسلم)

بخاری اور مسلم کی ہی ایک روایت یہ ہے کہ جب صحابہ کرام نبی کریم ﷺ کے پاس آئے (ان کے پوچھنے پر) آپ نے فرمایا کیا تم میں سے کسی ایک نے ابوقتادہ کو حمار وحشی پر حملہ کرنے کا حکم دیا تھا یا اس کی طرف اشارہ کیا تھا؟ انہوں نے عرض کیا نہیں، تو آپ نے فرمایا جو گوشت تمہارے پاس بچا ہوا وہ بھی کھالو۔

حدیث پاک سے حاصل ہوا: صحابہ کرام کو احرام کی حالت میں خشکی کے جانوروں کو شکار کرنے سے منع کیا گیا تھا، یہ منع کرنا ان کی آزمائش تھی، لیکن وہ اس میں پورے اترے، شکار ان کے

سامنے تھا، وہ شکار کر سکتے تھے، لیکن انہوں نے نہ شکار کیا، نہ ہی ان کا دل للچایا، نہ ہی انہوں نے شکار کرنے کے لئے کوئی فریب اور دھوکا کا حیلہ کیا۔ بلکہ ابو قتادہ جو احرام میں نہیں تھے ان کو شکار کرنے کے لئے کوڑا بھی نہیں پکڑایا۔ وہ خود ہی سواری سے اترے اور انہوں نے کوڑا پکڑا اور شکار کیا۔

صحابہ کرام نے اپنے ذہنوں سے سوچتے ہوئے کہ یہ شکار اس شخص نے کیا ہے جس کا احرام نہیں۔ لہٰذا ہمیں گوشت کھالینا جائز ہے۔ لیکن گوشت کھانے کے بعد پھر پشیمانی ہوئی کہ ہمیں پہلے نبی کریم ﷺ سے پوچھنا چاہئے تھا۔ نبی کریم ﷺ نے بھی ان سے پوچھ لیا کیا تم نے شکار کرنے کو کہا تو نہیں تھا، کیا تم نے شکار کی طرف اشارہ تو نہیں کیا تھا؟ جب صحابہ کرام نے عرض کیا نہیں یا رسول اللہ، تو آپ نے ان کو بقیہ گوشت بھی کھانے کی اجازت دی، اور ساتھ ہی ان سے گوشت لے کر خود بھی کھایا۔ تا کہ صحابہ کرام کامل طور پر مطمئن ہو جائیں کہ انہوں نے گوشت کھا کر کوئی غلطی نہیں کی۔

سبحان اللہ کیا ہی خوب شان ہے نبی کریم ﷺ کے صحابہ کرام کی جو آزمائش میں پورے اترے، اور اپنے عمل سے امت مصطفیٰ ﷺ کی برتری پر روز روشن کی طرح دلیل قائم کر دی۔

اس واقعہ کے ذکر کرنے کا مقصد: بنی اسرائیل کا اللہ تعالیٰ کے حکم سے عدول کرنا اور بندر بننے کے واقعہ کو ذکر کرنے میں دو مقصد ہیں۔ ایک یہ کہ نبی کریم ﷺ کے معجزہ کو ظاہر کرنا مقصود تھا، کیونکہ جب آپ نے اپنے زمانہ کے یہود کو خطاب کرتے ہوئے رب تعالیٰ کا ارشاد سنایا:

﴿ وَلَقَدْ عَلِمْتُمْ ﴾ ''تحقیق تمہیں علم ہے''

اسی سے آپ کے سچے نبی ہونے کا پتہ چل گیا، کہ وحی کے بغیر آپ کو یہ کہنا ممکن ہی نہیں تھا کیونکہ اس وقت کے تمام یہود و نصاریٰ اور مشرکین جانتے تھے کہ آپ نے کسی استاذ سے کچھ نہیں پڑھا، آپ نے کبھی لکھنا سیکھا نہیں۔ آپ کبھی لوگوں کی مجلسوں میں شریک نہیں ہوئے، پھر بنی اسرائیل کے واقعات کو تفصیل سے بیان کرنا صرف اسی وقت ممکن تھا جب آپ کو نبوت حاصل ہو اور آپ کی طرف وحی آتی ہو۔

اس واقعہ کو بیان کرنے میں دوسرا مقصد یہ تھا کہ آپ نے اپنے زمانہ کے یہود کو اس پر متنبہ کیا کہ جب تمہارے آباء و اجداد کو ہفتہ کے دن کی بے حرمتی اور رب تعالیٰ کی حکم سے عدولی کی وجہ سے بندر

بنا کر ذلیل وخوار کر دیا گیا:

" اما تخافون ان ينزل عليكم بسبب تمردكم مانزل عليهم من العذاب فلا تغتروا بالامهال المدودلكم "

تو تم کیوں نہیں ڈرتے کہ تمہاری سرکشی کی وجہ سے تم پر بھی عذاب نازل ہو جائے، تمہیں جو زیادہ دیر کیلئے مہلت دی جاتی ہے اس سے تم اس دھوکہ میں مبتلاء نہ ہو کہ تمہیں عذاب دیا ہی نہیں جاتا۔

اسی پر رب تعالیٰ کا ایک اور ارشاد گرامی واضح طور پر دلالت کر رہا ہے:

﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اٰمِنُوْا بِمَا نَزَّلْنَا مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّطْمِسَ وُجُوْهًا فَنَرُدَّهَا عَلٰۤى اَدْبَارِهَاۤ اَوْ نَلْعَنَهُمْ كَمَا لَعَنَّاۤ اَصْحٰبَ السَّبْتِ وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُوْلًا ﴾

اے کتاب والو! ایمان لاؤ اس پر جو ہم نے اتارا تمہارے ساتھ والی کتاب کی تصدیق فرماتا قبل اس کے کہ ہم بگاڑیں کچھ چہروں کو تو انہیں پھیر دیں ان کی پیٹھ کی طرف یا انہیں لعنت کریں جیسی لعنت کی ہفتہ والوں پر، اور خدا کا حکم ہو کر رہے گا۔ (ماخوذ از کبیر)

اعتراض: ان کو بندر بن جانے کا حکم کیسے دیا گیا ﴿ كُوْنُوْا قِرَدَةً ﴾ "تم بندر بن جاؤ"، فانهم ما كانوا قادرين على ان يقبلوا انفسهم على صورة القردة " وہ تو اس پر قادر ہی نہیں تھے کہ اپنے آپکو بندر بنالیں۔

جواب: " ان المراد منه سرعة التكوين كقوله تعالىٰ (انماامرنالشئی اذا اردناه ان نقول له كن فيكون).

اس سے مراد امر دینا مقصود نہیں بلکہ ان کا جلدی ہی بندر بنا دینے کا ذکر ہے۔ جیسا کہ دوسرے مقام پر فرمایا جب ہم کسی چیز کا ارادہ کرتے ہیں کہتے ہیں ہو جا تو وہ ہو جاتی ہے۔ مقصد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جب کسی کو عذاب دینا چاہے تو کوئی اس کے عذاب کو روک نہیں سکتا۔ اور نہ ہی اسے کوئی عاجز کر سکتا ہے بلکہ جسے عذاب دینا مقصود ہوتا ہے وہ خود ہی عذاب کو قبول کر لیتا ہے۔ (از کبیر)

کیا وہ حقیقی بندر بن گئے تھے یا تشبیہ ہے؟ اگرچہ بعض حضرات نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ وہ حقیقی بندر نہیں بنائے گئے تھے بلکہ ان کے دلوں پر مہر لگا کر ان کو بندروں کی طرح کر دیا گیا تھا لیکن یہ

قول صحیح نہیں کیونکہ صرف مجاہد کی تفسیر ہے:

" مسخت قلوبهم فقط وردت افهامهم كافهام القردة ولم يقله غيره من المفسرين فيما اعلم والله اعلم " (قرطبی)

کہ ان کے دل مسخ کئے فقط اور ان کی سمجھیں بندروں کی سمجھوں کی طرح ہوگئیں۔ میرے علم کے مطابق اور کسی مفسر نے یہ نہیں کہا۔

" وظاهر القرآن انهم مسخوا قردة على الحقيقة وعلى ذلك جمهور المفسرين وهو الصحيح "

قرآن پاک سے ظاہر طور پر یہی ثابت ہے کہ وہ حقیقی طور پر بندر بنا دیئے گئے تھے اسی پر جمہور مفسرین کرام ہیں اور یہی صحیح قول ہے اور یہی معتبر ہے۔ (از روح المعانی)

جن کو بندر بنایا گیا کیا ان کی نسل چلی؟ اس میں ایک قول یہ ہے کہ ان کی نسل چلی، لہٰذا یہ بندر ان کی نسل سے ہی ہیں۔ اسی طرح مسخ ہونے والی قوموں نسل میں خنازیر، گوہ، چوہے وغیرہ آرہے ہیں۔ دوسرا قول یہ ہے کہ ان کی نسل نہیں چلی بلکہ وہ تین دنوں کے بعد مر گئے یہی قول صحیح ہے۔

مسئلہ کی تفصیل ملاحظہ ہو: جن حضرات نے یہ کہا کہ یہ بندر ان کی نسل سے ہیں، وہ دلیل کے طور پر تین حدیثوں کو پیش کرتے ہیں۔

(۱) " عن ابی هريرة قال النبی ﷺ فقدت امة من بنی اسرائيل لا يدری ما فعلت ولا اراها الا الفار الا ترونها اذا وضع لها البان الابل لم تشربه واذا وضع لها البان الشاء شربته "......اخرجه مسلم .

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بنی اسرائیل کی ایک جماعت گم ہوگئی ان کے متعلق معلوم نہیں کہ ان سے کیا کیا گیا میں نہیں خیال کرتا سوائے اس کے کہ چوہے وہی ہیں کیا تم دیکھتے نہیں کہ جب ان کے سامنے اونٹوں کا دودھ رکھا جائے تو وہ نہیں پیتے، اور جب ان کے سامنے بکریوں کا دودھ رکھا جائے تو وہ پی لیتے ہیں۔

(۲) " عن ابی سعيد وجابر قال جابر اتی النبی ﷺ بضب فابی ان ياكل منه وقال لا ادری لعله من القرون التی مسخت......اخرجه مسلم."

حضرت ابوسعید اور حضرت جابر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے حضرت جابر کہتے ہیں (الفاظ آپ کی روایت کے ہیں) نبی کریم ﷺ کے پاس گوہ لائے گئی، آپ نے اس کے کھانے سے انکار کر دیا اور فرمایا میں نہیں جانتا شائد یہ ان قوموں سے ہو جن کو مسخ کر دیا گیا۔

(۳) " قال عمرو بن میمون الاودی رأیت فی الجاهلية قردة قدزنت فرجموها فرجمتها معهم" (رواه البخاری)

حضرت عمرو بن میمون اودی رحمہ اللہ نے فرمایا، میں نے زمانہ جاہلیت میں دیکھا کہ ایک بندر اور بندریا نے زنا کیا تو دوسرے بندروں نے انہیں سنگسار کیا تو میں نے بھی ان کو سنگسار کیا۔

ان احادیث سے ان حضرات نے یہ دلیل پیش کی کہ جن قوموں کو مسخ کیا گیا ان کی نسل سے ہی چوہے اور گوہ اور بندر پائے جاتے ہیں۔

جمہور کے نزدیک نسل نہیں چلی:

" وقال الجمهور الممسوخ لا ینسل وان القردة والخنازير وغيرهما كانت قبل ذلک والذين مسخهم الله قد هلكوا ولم يبق لهم نسل لانه قد اصابهم السخط والعذاب فلم يكن لهم قرار فی الدنيا بعد ثلاثة ايام "

جمہور حضرات کا یہی قول ہے کہ جن قوموں کو مسخ کیا گیا ان کی نسل نہیں چلی، بیشک بندر اور خنزیر اور ان کے علاوہ دوسرے جانور پہلے سے چلے آرہے ہیں، جن کو مسخ کیا گیا وہ ہلاک کئے ان کی کوئی نسل باقی نہیں رہی، بیشک ان کو اللہ تعالیٰ کی ناراضگی اور عذاب حاصل ہوا ان کو تین دنوں سے زیادہ دنیا میں قرار حاصل نہیں ہوا۔

یہی قول معتبر اور صحیح ہے معتبر تفاسیر میں جمہور مفسرین کرام نے یہی قول کیا ہے اور اسی کو صحیح قرار دیا گیا ہے۔

پہلے قول والوں کے دلائل کے جوابات:

پہلی جو دو حدیثیں بیان کی گئی ہیں (کہ بنی اسرائیل کی ایک جماعت گم ہو گئی ان کے متعلق معلوم نہیں وہ کہاں ہیں میرا خیال ہے کہ یہ چوہے وہی ہیں۔ اور آپ نے فرمایا مجھے معلوم نہیں ہو سکتا ہے یہ

(گوہ) ان قوموں سے ہو جن کو مسخ کر دیا گیا)۔

" فانما کان ظنا وخوفا لان یکون الضب والفار وغیرهما مما مسخ وکان هذا حد سامنه قبل ان یوحی الیه ان الله لم یجعل للمسخ نسلا "

ان میں نبی کریم ﷺ نے خوف اور اندیشہ سے کلام فرمایا یعنی وہ کلام اس وحی سے پہلے فرمایا جس میں آپ کو اللہ تعالیٰ نے مطلع فرما دیا مسخ ہونے والے جانوروں کی نسل نہیں چلی۔

بات بہت واضح ہے کہ نبی کریم ﷺ نے شدید خوف الٰہی کے وقت اچانک کلام فرمایا جس میں توجہ صرف رب تعالیٰ کی طرف تھی، اسی لئے رب تعالیٰ نے آپ کو اس حقیقت حال کی طرف متوجہ فرمایا جس کا ذکر آپ نے فرمایا۔

☆ " قال رجل یا رسول الله القردة والخنازیر هی مما مسخ فقال النبی ﷺ ان الله عزوجل لم یهلک قوما او یعذب قوما فیجعل لهم نسلا وان القردة والخنازیر کانوا قبل ذلک...... رواه مسلم کتاب القدر "

ایک شخص نے نبی کریم ﷺ سے پوچھا یا رسول اللہ کیا یہ بندر اور خنزیر وہی ہیں جن قوموں کو مسخ کر کے بندر اور خنزیر بنائے گئے تھے؟ آپ نے فرمایا بیشک اللہ تعالیٰ نے کسی قوم کو اس لئے ہلاک نہیں کیا یا اس لئے عذاب نہیں دیا کہ ان کی نسل چلائی جائے بندر اور خنزیر پہلے بھی موجود تھے۔

☆ " قال ابن عباس لم یعش مسخ قط فوق ثلاثة ایام ولم یاکل ولم یشرب ولم ینسل "

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں جن قوموں کو مسخ کیا وہ تین دنوں سے زیادہ بالکل زندہ نہیں رہے اور نہ ہی انہوں نے کھایا اور نہ ہی پیا اور نہ ہی ان کی نسل چلی۔

☆ " قال ابن عطیة وروی عن النبی ﷺ وثبت ان الممسوخ لا ینسل ولا یاکل ولا یشرب ولا یعیش اکثر من ثلاثة ایام "

ابن عطیہ کہتے ہیں رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی یہ ہے کہ یہ ثابت شدہ بات ہے کہ جن قوموں کو مسخ کیا گیا ان کی نسل نہیں چلی، اور نہ انہوں نے کچھ کھایا اور نہ پیا اور نہ ہی تینوں دنوں سے وہ زیادہ زندہ رہے۔

تیسری حدیث کا جواب:

"کذا حکی ابو مسعود ولم یذکر فی ای موضع اخرجه البخاری من کتابه فبحثنا عن ذلک فوجدنا فی بعض النسخ لا فی کلها"

اسی طرح ابو مسعود نے حکایت بیان کی لیکن یہ نہیں ذکر کیا کہ بخاری نے کس مقام میں اپنی کتاب میں اس حدیث کو بیان کیا ہے جب ہم چھانٹ بینٹ کی تو بخاری کے بعض نسخوں میں یہ حدیث ملی، تمام نسخوں میں یہ حدیث نہ مل سکی۔

واضح ہوا کہ یہ حدیث قابل حجت نہیں، اس لئے کہ جب بخاری کے تمام نسخوں میں اتفاقی طور پر حدیث نہیں تو جن نسخوں میں ہے ان میں غلطی کا بھی احتمال ہوسکتا ہے۔

دوسرا جواب:

"فذکر فی کتاب ایام الجاهلیة یعنی ان عمرو بن میمون قد ادرک الجاهلیة ولم یبالی بظنه الذی ظنه فی الجاهلیة"

عمرو بن میمون نے زمانہ جاہلیت کا ذکر کیا اور انہوں نے زمانہ جاہلیت میں اپنے گمان کا ذکر کیا زمانہ جاہلیت میں گمان کا کوئی اعتبار نہیں کہ اس سے احکام ثابت کیے جائیں۔

بخاری کے بعض نسخوں میں بھی اسے نقل کیا گیا ہے اس سے احکام ثابت نہیں کیے۔ خیال رہے کہ زمانہ جاہلیت سے مراد نبی کریم ﷺ کی بعثت سے پہلے کا زمانہ اس حدیث میں مراد نہیں کیونکہ عمرو بن میمون تابعی ہیں اس سے مراد ان کے ایمان لانے سے پہلے کا وقت ہے۔

تیسرا جواب:

"والذی قال البخاری فی التاریخ الکبیر .... عن عمرو بن میمون قال رأیت فی الجاهلیة قردة اجتمع علیها قرود فرجموها فرجمتها معهم ولیس فیه، قدزنت"

بخاری نے تاریخ کبیر میں عمرو بن میمون کی حدیث میں "قدزنت" (زنا کرنے کا) ذکر نہیں کیا بلکہ صرف اتنا ہی ذکر ہے عمرو بن میمون کہتے ہیں میں نے جاہلیت میں دیکھا کہ

ایک بندر کو دوسرے بندر پتھر مار رہے ہیں میں نے بھی اسے پتھر مارے۔

چوتھا جواب:

" وجماعة اهل العلم منكر اضافة الزنى الى غير مكلف واقامة الحدود في البهائم "

اہل علم حضرات نے انکار کیا ہے کہ زنا کی نسبت غیر مکلّف جانوروں کی طرف کی جائے اور ان پر حد قائم کی جائے۔

پانچواں جواب:

" ولو صح لكانوا من الجن لان العبادات في الانس والجن دون غيرهما "

اگر یہ ثابت ہو جائے کہ حدیث میں " قد زنت " کے الفاظ بھی ہیں۔ اور حدیث بخاری کے صحیح نسخوں میں ہے اور بندر کو زنا کی وجہ سے ہی دوسرے بندر سنگسار کر رہے تھے، تو یہ کہنا پڑے گا کہ وہ جن تھے جو بندروں کی شکل میں تھے کیونکہ مختلف شکلیں بنا لیتے ہیں۔ چونکہ عبادت صرف انسانوں اور جنوں پر لازم ہے تو یقیناً حدود بھی انسانوں اور جنوں پر ہی نافذ ہو سکتی ہیں۔ (از قرطبی)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی گریہ وزاری اور حضرت عکرمہ کا استدلال:

ایک دن حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سورۃ اعراف میں اس واقعہ کو پڑھ کر رو رہے تھے لوگ آپ کے سامنے حیران ہو کر بیٹھے تھے، اور آپ کے رونے پر تعجب کر رہے تھے (آپ سے وجہ پوچھنے کی کوئی جرات نہیں کر رہا تھا) اتنے میں حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ آ گئے جو آپ کے خاص مقربین شاگردوں میں سے تھے۔ انہوں نے عرض کیا حضرت آپ کے رونے کی کیا وجہ ہے؟ آپ نے فرمایا کہ جن لوگوں کو بندر بنا دیا گیا ان کے واقعہ میں غور و فکر کر رہا تھا کہ وہ لوگ جنہوں نے شکار کیا تھا وہ عذاب الٰہی میں مبتلاء ہوئے اور بندر بن گئے۔ اور جن لوگوں نے شکار نہیں کیا اور ان کو منع کیا تھا کہ تم شکار نہ کرو وہ نجات حاصل کر گئے۔

لیکن تیسرا فرقہ جنہوں نے شکار تو اگرچہ نہیں کیا تھا لیکن شکار کرنے والوں کو منع نہیں کیا تھا، ان کا

حال معلوم نہیں ہو رہا، جب میں نے یہ خیال کیا کہ ہو سکتا ہے ان کو بھی ﴿ امر بالمعروف نھی عن المنکر ﴾ ''اچھے کام کا حکم دینا اور برے کام سے روکنا'' نہ کرنے کی وجہ سے عذاب میں مبتلاء کر دیا گیا ہو۔ یہ خیال کر کے مجھے شدید خوف لاحق ہوا کہ ﴿ امر بالمعروف نھی عن المنکر ﴾ کے معاملہ میں ہم میں سے بھی کئی لوگوں سے کوتاہی ہوتی رہتی ہے کہیں وہ بھی رب تعالیٰ کی گرفت میں نہ آ جائیں۔

حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا، خاموش رہنے والے، ان کو منع کرنے والے نجات حاصل کر گئے اور ان کو روکنے والوں کے ساتھ ان کو کر دیا گیا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا تم اپنے دعوی پر دلیل پیش کرو۔ انہوں نے عرض کیا ہم نے آپ سے ہی کئی بار سنا اور حقیقت میں مسئلہ بھی یہی ہے " امر بمعروف ونھی از منکر فرض کفایة است " کہ امر بالمعروف اور نھی عن المنکر فرض کفایہ ہے۔

فرض کفایہ کا حکم واضح ہے کہ اگر بعض لوگ اس پر عمل کر لیں تو گنہگار کوئی بھی نہیں ہوتا۔ اگرچہ ثواب عمل کرنے والوں کو ہی ملتا ہے۔ اسلئے ثواب اور بلند درجہ تو شکار کرنے والوں کو روکنے والوں کو ہی حاصل ہوا لیکن خاموش رہنے والے بھی رب تعالیٰ کے عذاب سے بچ گئے۔

" حضرت ابن عباس رابشنیدن این کلام نہایت بہجت وسرور ود واو برخساتذ وپیشانی عکرمہ رابوسہ دادندواورا دربر گرفتنذ "

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کو حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ کی دلیل کو سن کر بہت ہی زیادہ خوشی حاصل ہوئی اور آپ اٹھے حضرت عکرمہ کی پیشانی پر بوسہ دیا اور ان سے بغل گیر ہو گئے۔

(از عزیزی)

تنبیہ: جب لوگ بہت زیادہ جرائم میں مبتلاء ہو جائیں تو نیک لوگوں کو چاہئے کہ ان سے دور چلے جائیں جیسا کہ بنی اسرائیل کے نیک لوگ ان سے جدا ہو گئے تھے، ان کے درمیان اور اپنے درمیان دیوار حائل کر دی تھی جب مجرمین کے جرائم حد سے بڑھ جاتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان کو تباہ و برباد کر دیتا ہے۔ رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿ وَاِذَا اَرَدْنَا اَنْ نُّهْلِكَ قَرْيَةً اَمَرْنَا مُتْرَفِيْهَا فَفَسَقُوْا فِيْهَا فَحَقَّ عَلَيْهَا الْقَوْلُ فَدَمَّرْنٰهَا تَدْمِيْرًا ﴾

''اور جب ہم ارادہ کرتے ہیں کسی بستی کو ہلاک کرنے کا تو اس کے رئیسوں کو حکم کرتے ہیں وہ اس میں فسق کرتے ہیں اس پر قول (عذاب کا) ثابت ہو جاتا ہے ہم اس بستی کو تباہ و برباد کر دیتے ہیں''

یعنی اللہ تعالیٰ اپنے انبیاء کرام کے ذریعے اپنے احکام لوگوں تک پہنچاتا ہے جب خوشحال اور رئیس لوگ اللہ تعالیٰ کے حکم کی نافرمانی کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ اپنے وعدہ کے مطابق اس تمام بستی کو تباہ و برباد کر دیتا ہے۔ خیال رہے غریب لوگ اللہ تعالیٰ کے حکم کی نافرمانی بہت کم ہی کرتے ہیں۔ زیادہ طور پر امیر لوگ رب تعالیٰ کے نافرمان ہوتے ہیں۔

گنہگاروں کے ساتھ نیک لوگ بھی تباہ ہو جاتے ہیں:

"عن عبد الله بن عمر قال سمعت رسول الله ﷺ يقول اذا اراد الله بقوم عذابا اصاب العذاب من كان فيهم ثم بعثوا على اعمالهم"

(مسلم ج ۲ ص ۳۹۵ باب اثبات العذاب)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ وفرماتے ہوئے سنا کہ رب تعالیٰ جب کسی قوم کو عذاب دینا چاہے تو جتنے لوگ وہاں ہوتے ہیں سب کو عذاب پہنچتا ہے پھر اپنے اپنے اعمال کے مطابق اٹھائے جائیں گے۔

ایک روایت میں آتا ہے "يبعثهم الله على نياتهم" اللہ تعالیٰ ان کو انکی نیتوں کے مطابق اٹھائے گا۔ یعنی دنیا میں عذاب اگرچہ آنا تو مجرمین کی وجہ سے ہے لیکن اس تباہی میں نیک لوگ بھی مبتلاء ہو جاتے ہیں، البتہ جب ان کو قیامت میں اٹھایا جائے گا تو اپنے اپنے اعمال کے مطابق سب کو اٹھایا جائے گا مجرمین اللہ تعالیٰ کے احکام کے نافرمان اور باغی قیامت کے دن بھی عذاب کے مستحق ہوں گے۔ اور نیک لوگ اس آرام اور چین میں ہوں گے بلکہ دنیا میں ہلاکت کے باعث ان کے درجات اور زیادہ بلند ہوں گے۔

ناجائز کاموں کے لئے حیلہ کرنا حرام ہے:

﴿ واسْتُدِلَّ بِهٰذِهِ الْاٰيَةِ عَلٰى تَحْرِيْمِ الْحِيَلِ فِى الْاُمُوْرِ الَّتِىْ لَمْ تُشْرَعْ كَالرِّبَا ﴾

اسی آیۃ سے اس مسئلہ پر دلیل حاصل کی گئی کہ جو کام ناجائز ہیں ان کو جائز کرنے کے لئے حیلہ کرنا حرام ہے جیسا کہ سود حرام ہے اسے جائز کرنے کے لئے حیلہ کیا جائے۔ (روح المعانی)

ہاں البتہ سود سے بچنے کے لئے حیلہ خود نبی کریم ﷺ نے بیان فرمایا کہ ردی کھجوریں دو صاع فروخت کر کے ایک صاع عمدہ کھجوریں خرید لو۔ ایسے ہی ایک شخص صاحب نصاب ہو، سال مکمل ہونے کے قریب ہو، تو یہ اس مال سے گائے وغیرہ خرید لے جو نصاب تک نہ پہنچیں تو یہ زکواۃ دینے سے تو بچ گیا لیکن اس نے نیک کام سے دور رہنے کے لئے حیلہ کیا ہے جو ناپسندیدہ فعل ہے ایسے حیلے شریعت میں پسند نہیں کئے گئے۔

ایک شخص صاحب نصاب ہو قربانی اس پر واجب ہو وہ قربانی کے دنوں میں اپنے گھر سے ساڑھے بانوے کلومیٹر ارادۃً دور چلا جائے مسافر ہو گیا، قربانی واجب نہیں رہی، حیلہ تو کر لیا لیکن یہ حیلہ ایک نیک کام سے بچنے کے لئے کیا گیا ہے جو شریعت میں پسند نہیں۔

جائز کاموں کے لئے حیلہ جائز:

" قال الکواشی وجوزھا اکثرھم مالم یکن فیھا ابطال حق او احقاق باطل "

کواشی رحمہ اللہ نے بیان فرمایا کہ اکثر اہل علم نے فرمایا ہے کہ جس کام میں حق کو باطل کرنا لازم نہ آئے اور باطل کو حق کرنا لازم نہ آئے اس میں حیلہ کرنا جائز ہے۔

تنبیہ: حیلہ کی مکمل بحث اور حیلہ اسقاط پر بحث انشاء اللہ ﴿ وَخُذْ بِيَدِكَ ضِغْثًا ﴾ کے ضمن میں آئے گی۔

☆☆☆

﴿فَجَعَلْنَاهَا نَكَالًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهَا وَمَا خَلْفَهَا وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِينَ﴾ (آیت ٦٦)

١) ''تو ہم نے (اس بستی کا) یہ واقعہ اس کے آگے اور پیچھے والوں کے لئے عبرت کر دیا اور پرہیز گاروں کے لئے نصیحت بنا دیا''۔

٢) ''بنا دیا ہم نے اسے عبرت ان کے لئے جو اس وقت موجود تھے اور جو پیچھے آنیوالے تھے اور نصیحت بنا دیا پرہیز گاروں کے لئے''

﴿فَجَعَلْنَاهَا﴾ : '' ھا '' ضمیر جو مفعول واقع ہو رہی ہے اس کا مرجع یا تو '' عقوبة '' ہے یعنی مطلب یہ ہوا کہ گویا رب تعالیٰ نے فرمایا:

'' عاقبناھم بتحویل صورتھم الی صورة القردة ''

ہم نے ان کو سزا دی کہ ان کی صورتیں بدل کر بندر کی شکل میں بنا دیئے گئے۔

'' فانه عقوبة لھم علی اصرارھم علی المخالفة و العصیان '' یہ سزا ان کو اس لئے دی گئی کہ وہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی مخالفت اور نافرمانی میں لگاتار عمل کرتے رہے۔ اب مطلب یہ ہوا کہ ہم نے سزا کو عبرت بنایا۔ اور یا '' ھا '' کا ضمیر کا مرجع '' مسخة '' ہے:

'' قوله فقلنا لھم کونوا قردة خاسئین فی معنا مسخناھم ''

اب اس صورت میں مطلب یہ ہوگا گویا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہم نے ان کی شکلیں بدل کر بندر بنایا، اور ان کی شکلوں کو بدل کر عبرت کا ذریعہ بنایا۔

﴿نَكَالًا﴾ : اصل میں '' نکال '' اس سزا کو کہتے ہیں جو مجرم کو دی جائے کہ اسے دیکھ کر دوسرے لوگ ان جرائم سے باز آجائیں کہ کہیں ہمیں بھی وہی سزا نہ دی جائے جو فلاں مجرم کو دی گئی۔ علامہ راغب اصفہانی بیان کرتے ہیں:

'' المنکال العقوبة الرادعة للجانی عن المعاودة الی الجنایة ولغیر الجانی

عن اتیان مثلها"
نکال اس سزا کو کہتے ہیں جو مجرم کو آئندہ جرم سے روک دے اور جو مجرم نہیں اس کو ایسے جرم سے منع رکھے جو مجرمین کے جرائم ہیں۔
کہا جاتا ہے " نکل فلان عن العدد " فلاں شخص دشمن سے بزدلی کی وجہ سے رک گیا اسی طرح کہا جاتا ہے " نکل فلان عن الیمین " فلاں شخص قسم اٹھانے سے رک گیا۔ لباب (لغت کی کتاب) میں ذکر کیا گیا ہے "نکال" کا معنی منع کرنا۔ اور عذاب کو نکال اس لئے کہا جاتا ہے کہ جسے عذاب نہیں دیا جا رہا اس کو منع کرنے کا ذریعہ بنتا ہے کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ مجھے وہ کام نہیں کرنا چاہئے جو دوسرے کے لئے عذاب کا ذریعہ بنا ہے۔
" تنکیل " کا معنی ہے غیر کو عذاب دینا دوسروں کو روکنے کے لئے اسی طرح بیڑی لگانے کو "نکل" کہا جاتا ہے کیونکہ وہ چلنے سے روکتی ہے۔ (نکالا) عبرة تنکل المعتبر بها ای تمنعه " نکال کا مجازی طور پر معنی عبرت ہے، کیونکہ جو شخص عبرت حاصل کرنے کی کوشش کرے عذاب اسے برائیوں سے منع کر کے عبرت سکھاتا ہے، جب عذاب سبب ہے عبرت کا۔ تو ذکر سبب کا اور مراد مسبب ہے۔
(از بیضاوی و شیخ زادہ)

تنبیہ : کوئی شخص علامہ آلوسی رحمہ اللہ کی اس عبارت سے غلط فہمی میں مبتلاء نہ ہو " النکال بمعنی العقوبة لا العبرة " (روح المعانی) نکال کا معنی عقوبت ہے عبرت نہیں۔ علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے حقیقی معنی کے لحاظ پر کہا ہے کہ "نکال" کا معنی عبرت نہیں بلکہ عقوبت ہے۔ اور علامہ بیضاوی نے مجازی طور پر عبرت معنی بیان کیا ہے۔

﴿ لِمَا بَيْنَ يَدَيْهَا وَمَا خَلْفَهَا ﴾:
" لما قبلها وما بعدها من الامم اذ ذکرت حالهم فی زبر الاولین واشتهرت قصتهم فی الآخرین "
یعنی ایک مطلب یہ ہے کہ بنی اسرائیل کے نافرمان لوگوں کو سزا دینے اور ان کو مسخ کرنے میں پہلی اور بعد میں آنے والی امتوں کے لئے عبرت ہے کیونکہ ان کا حال پہلے صحیفوں میں ذکر ہو چکا تھا، اس لئے پہلی امتوں کو صحیفے پڑھنے سے عبرت حاصل ہوئی۔ اور ان کا واقعہ بعد میں آنیوالے پر مشہور

ہو گیا۔اس وجہ سے بعد میں آنیوالے لوگوں کے لئے عبرت کا ذریعہ بن گیا۔

" او لمعاصر بهم وما بعدهم " اوراس کا مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں کو عقوبت دے کر اور ان کی شکلوں کو بدل کر ان کے زمانے کے لوگوں اور بعد میں آنے والے کے لئے عبرت بنایا۔

" اولما بحضرتها من القرى وما تباعد عنها " اوراس کا مطلب یہ ہے کہ ان کو عقوبت دے کر اور مسخ کر کے اس بستی کے قریب دوسرے لوگوں کے لئے اور دور والی بستیوں کے لوگوں کے لئے عبرت بنایا۔

" اولا هل تلك القرية وما حواليها " اوراس کا مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں کی عقوبت اور مسخ کو اس بستی والوں اوراس کے اردگرد لوگوں کے لئے عبرت بنایا۔

" اولا جل ما تقدم عليها من ذنوبهم وما تأخر منها " اب مطلب یہ ہوگا کہ ان کو مسخ کر کے ان کو عذاب ان کے اگلے اور پچھلے گناہوں کی وجہ سے دے کر ان کے لئے عبرت بنایا۔

(از بیضاوی)

دینی مدارس کے طلباء کے لئے:

﴿وَمَا يَدَيْهَا وَمَا خَلْفَهَا﴾ میں " من " نہیں ذکر کیا جو ذوی العقول کے لئے آتا ہے "ما" کو ذکر کرنے کی کیا وجہ جو غیر ذوی العقول کے لئے آتا ہے۔اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ اس سے پہلے اس کی مراد میں کئی وجہ ذکر کی جا چکی ہیں آخری وجہ " ما تقدم من ذنوبهم وما تأخر " کے لحاظ سے تو ہونا ہی " ما " چاہئے۔

تاہم پہلی وجوہ کے لحاظ سے جب مراد لوگ لئے جائیں تو مجازی طور پر "ما" کو ذکر کیا گیا ہے۔کیونکہ مجازاً " من " غیر ذوی العقول کے لئے اور " ما " ذوی العقول کے لئے استعمال ہوتا رہتا ہے۔اور وجہ یہ بیان کی گئی:

" تحقيرا لشانهم فكانهم غير عقلاء بالنسبة الى المتكلم العلى شانه الباهر سلطانه " (شیخ زادہ)

کہ رب تعالیٰ جس طرح چاہے اپنی مخلوق کا ذکر اسی طرح فرما دے وہ قادر مختار ہے۔ چونکہ یہاں بنی اسرائیل کے مجرمین کا بھی ذکر ہے اور غیر مجرمین کا بھی، اس لئے رب تعالیٰ جو بلند شان کا مالک ہے، جسے غالب سلطنت حاصل ہے اس نے وہ لوگ جو عاصی تھے ان کی حقارت شان کے لحاظ سے "ما" ذکر کیا کہ یہ لوگ جانوروں سے بھی گھٹیا ہیں۔

☆ ﴿ کُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِئِیْنَ ﴾ میں بھی بظاہر اعتراض ہوتا ہے کہ "قردة" غیر ذوی العقول کی جمع ہے اسکی صفت "خاسئین" کیسے آ گئی؟ جمع مذکر سالم تو ذوی العقول کے لئے آتی ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اس مقام میں "خاسئین" صفت نہیں بلکہ حال ہے معنوی لحاظ پر تقدیر عبارت کی یوں ہوگی۔

"کونوا قردة حال کونکم خاسئین فی هذا المسخ والتبدیل" (از عزیزی)

﴿وَ مَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِیْنَ﴾: اور نصیحت بنایا پرہیز گاروں کے لئے، یعنی بنی اسرائیل کے نافرمان لوگوں کو عذاب دے کر اور ان کی شکلوں کو مسخ کر کے پرہیز گاروں کے لئے نصیحت بنایا کہ وہ اپنے نیک اعمال پر ثابت رہیں۔ اور ہمیشہ نیک عمل کرتے رہیں۔

(موعظة) وزنها مفعلة من الاتعاظ والانزجار والوعظ والتخویف" موعظۃ کا وزن مفعلۃ ہے اس کا معنی نصیحت قبول کرنا اور زجر حاصل ہونا اور نصیحت دینا اور خوف دلانا۔

"قال الخلیل الوعظ التذکیر بالخیر فیما یرق له القلب" خلیل نے کہا "وعظ" کا مطلب یہ ہے کہ کسی کو اچھے کاموں کی نصیحت کرنا جس سے اس کا دل نرم ہو جائے اور اچھے کام کرنا شروع کر دے۔

نکال اور موعظۃ میں فرق: نکال اصل میں عذاب ہے یعنی عذاب دے کر نصیحت کرنا اور باعث عبرت بنانا، یعنی عملی طور پر ڈنڈے سے نصیحت کرنا نکال ہے۔ جب نافرمان لوگوں کے عذاب اور ان کو نصیحت کرنے کا ذکر کیا تو "نکال" کہا کہ وہ اسی نصیحت کے قابل تھے۔ اور جب متقین کو نصیحت کرنے کا ذکر کیا تو "موعظة" ذکر فرمایا کیونکہ زبان سے نصیحت کرنا پیار و محبت سے نصیحت کرنا اور اچھے اعمال

کی نصیحت کرنا کہ ان کے دل نرم ہوں موعظۃ کہلاتا ہے۔

مومن اور پرہیزگاروں کی بلند شان کی طرف واضح طور پر اشارہ فرمادیا کہ وہ پیار سے نصیحت کرنے کے قابل ہیں۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے " العبد یقرع بالعصا والحر تکفیه الملامة " غلام پر ڈنڈا چلایا جاتا ہے اور آزاد کو ملامت کافی ہے یا یوں کہیں ذلیل کو ڈنڈے سے سمجھایا شریف کو زبان سے۔

(از عزیزی)

☆ متقین کا ذکر کیا حالانکہ نصیحت تو سب لوگوں کے لئے تھی اس کی وجہ یہ تھی " لتفردهم بها عن الکافرین المعاندین " کہ نیک لوگوں کی بلندیٔ شان کو ظاہر کرنے کے لئے متقین کی نصیحت کو علیحدہ ذکر کیا تاکہ ان کا ذکر بھی سرکش کفار سے علیحدہ ہو جائے۔

" قال ابن عطیة واللفظ یعم کل متق من کل امة "

ابن عطیہ نے کہا کہ یوں جن متقین کا ذکر کیا گیا ہے وہ عام ہیں۔ ہر امت کے متقین مراد ہیں یعنی تمام متقین کے لئے نصیحت ہے۔

" وقال الزجاج ﴿ وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴾ لامة محمد ﷺ ان ینتکهوا من حرم الله عزوجل ما نهاهم عنه "

زجاج نے بیان کیا ہے کہ اس آیۃ میں متقین سے مراد نبی کریم ﷺ کی امت مراد ہے کہ ان کو نصیحت دی گئی کہ وہ ان کاموں سے دور رہیں باز رہیں جن سے اللہ تعالیٰ نے منع کیا ہے۔

ایسا نہ ہو کہ اے میرے محبوب کی امت تم بھی نافرمانیوں کی وجہ سے ہفتہ کے دن والے لوگوں کی طرح رب تعالیٰ کی گرفت میں نہ آ جاؤ۔

(از قرطبی)

فائدہ عظیمہ : اسی واقعہ سے یہ فائدہ بھی حاصل ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو عبادت کے لئے پیدا کیا ہے اگر ان کو کھلی آزادی دے جاتی کہ وہ اپنی طبیعتوں کے مطابق جو چاہیں عمل کرتے رہیں تو یقیناً وہ لذات جسمانیہ میں مبتلا ہو جاتے۔ اور تاریکیوں کے پردے ان پر چھا جاتے ان کی عادات بچوں والی ہو جاتیں۔

والنفس کالطفل ان تهمله شب علی　　　حب الرضاع وان تفطمه ینفطم

نفس بچے کی طرح ہے اگر تم اس کو کھلی چھٹی دے دو تو وہ بڑھاپے تک ماں کے دودھ سے محبت رکھے اگر دودھ چھڑا دیں تو چھوڑ دیتا ہے۔

اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے بندوں پر عبادات کو مقرر فرمایا اور مقررہ اوقات میں عبادات کا تکرار ان پر مقرر فرمایا تا کہ ان کی طبیعتوں سے ان اوقات میں غفلت دور ہو سکے اور خواہشات میں مبتلاء ہونے کی وجہ سے ان کے دلوں پر جو تاریکیاں چھا جاتی ہیں ان سے انہیں نجات حاصل ہو سکے۔

اسی وجہ سے ہفتہ میں ایک دن کو اجتماعی عبادت کے لئے خاص کر دیا گیا اور اسے دوسرے دنوں پر فوقیت دے دی گئی تا کہ ان سے علیحدہ علیحدہ رہنے کی وجہ سے جو وحشت طاری ہوتی ہے اسے دور کیا جا سکے، اور امور دنیاویہ میں مشغولیت کی وجہ سے چھا جانے والی تاریکی کو دور کیا جا سکے، اور اس دن کی برکتوں کی وجہ سے ان کی دعائوں میں خصوصی قبولیت آ سکے۔

جن لوگوں نے اپنی ذاتی طبیعت کے مطابق، اپنی عادت کے مطابق کام کیے رب تعالیٰ کے احکام کی پرواہ نہ کی وہ برباد ہو گئے یوں سمجھیں کہ وہ ایسی مرض میں مبتلا ہو گئے جو متعدی تھی لیکن وہ اس کا علاج نہ کر سکے مرض بڑھتے بڑھتے لاعلاج ہو گئی اور تباہی کا سامنا کرنا پڑا۔

اور جن لوگوں نے اپنی انسانیت کو بچانے کی کوشش کی شریعت کے مطابق چلنے میں اپنی پوری طاقت کو صرف کیا یوں سمجھیں شرعی دواؤں سے اپنی صحت کی حفاظت کی تدبیر کی اور حکمت بھرے کلمات سے اپنا علاج کیا ایک دوسرے کو وعد و وعید سے نصیحت کی وہی کامیاب ہوئے۔

هي النفس ان تهمل تلازم خساسة　　وان تنبعث نحوا لفضائل تلهج

اس نفس کو اگر ہر کام کی کھلی اجازت دے دو تو یہ خسیس ہو جائیگا　　اور اگر اس کو فضائل پر لگاؤ تو اس میں کوشش کرے گا

☆☆☆☆☆

﴿ وَاِذْ قَالَ مُوسٰى لِقَوْمِهٖٓ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَةً قَالُوْٓا اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا قَالَ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ﴾

۱) ''اور جب موسیٰ نے اپنی قوم سے فرمایا خدا تمہیں حکم دیتا ہے کہ ایک گائے ذبح کرو بولے کہ آپ ہمیں مسخرہ بناتے ہیں فرمایا خدا کی پناہ میں جاہلوں سے ہوں'' (آیت نمبر ۶۷)

۲) ''اور جب کہا موسیٰ نے اپنی قوم کو بیشک اللہ حکم دیتا تمہیں کہ ذبح کرو ایک گائے، انہوں نے کہا کیا تم اڑاتے ہو ہمارا مزاح، آپ نے کہا اللہ کی پناہ کہ میں جاہلوں میں سے ہو جاؤں''

یہاں سے ایک اور نعمت کا ذکر ہے اور ساتھ ساتھ بنی اسرائیل کی کجروی (ٹیڑھی چال کا بھی ذکر ہے) ان کو گائے کے ذبح کرنے کا حکم دینا ان کے لئے دنیاوی نعمت بھی تھا کیونکہ اس سے ان کے درمیان واقع ہونے والے اختلاف کو اٹھانا مقصود تھا۔ اور اخروی نعمت بھی تھا کیونکہ اس میں موسیٰ علیہ السلام کا معجزہ پایا گیا اور بنی اسرائیل کا بار بار سوال کرنا (جس کا ذکر انشاء اللہ قریب ہی آ رہا ہے) ان کی پرانی روش (چال) پر دلالت کر رہا ہے۔ (روح المعانی)

بنی اسرائیل میں سے ایک شخص نے اپنے ایک رشتہ دار کو قتل کر دیا تا کہ اس کا وارث بن جائے قتل کر کے اس کی لاش کو چوراہے میں پھینک دیا پھر موسیٰ علیہ السلام کے پاس شکایت لے کر آ گیا۔ موسیٰ علیہ السلام نے کوشش کی قاتل کا پتہ لگانے کی لیکن پتہ نہ چل سکا۔ وہ لوگ کہنے لگے اپنے رب سے دعاء کیجئے تا کہ وہ بتائے کہ اس کا قاتل کون ہے؟ آپ نے اپنے رب سے دعاء کی تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو وحی کی۔

آپ نے اپنی قوم کو بتایا کہ اللہ تعالیٰ حکم دیتا ہے کہ گائے ذبح کر کے اس کا گوشت مردہ کو مارو وہ زندہ ہو کر بتائے گا کہ میرا قاتل کون ہے؟ انہوں نے تعجب کیا کہ ذبح شدہ جانور کا گوشت مردہ کو کیسے زندہ کرے گا یہ تو ایک مزاح نظر آ رہا ہے۔ آپ نے فرمایا اللہ کی پناہ میں جاہلوں سے ہو جاؤں۔

'' ان الاشتغال بالاستهزاء لا يكون الا بسبب الجهل ومنصب النبوة لا يحتمل الاقدام على الاستهزاء ''

یعنی کسی سے مزاح اڑانا کسی کو حقیر اور گھٹیا سمجھنا صرف جہالت کی وجہ سے ہوتا ہے منصب

نبوت کے یہ لائق ہی نہیں وہ حقارت آمیز توہین آمیز مزاح کسی سے اڑائے۔

خیال رہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے مزاح اڑانے سے پناہ نہیں مانگی بلکہ جہالت سے پناہ مانگی اس لئے کہ مزاح اڑانا جہالت کا سبب ہے، اور سبب کا ذکر کر کے مراد مسبب لینا مجاز میں زیادہ قوی ہے۔ اور موسیٰ علیہ السلام کا پناہ پکڑنا اس وجہ سے تھا کہ وہ لوگ آپ سے دین کے معاملہ میں راہنمائی حاصل کر رہے تھے اور دعاء کرا رہے تھے:

" والاستهزاء في امر الدين من العقاب الشديد والوعيد العظيم "

اور دین کے معاملہ میں مزاح اڑانا شدید عذاب کا ذریعہ ہے اور عظیم وعید کا ذریعہ ہے۔

" وقال بعضهم ان النفس الهزء قد يسمى جهلا وجهالة "

بعض لوگوں نے کہا کہ بیشک استہزاء یعنی مزاح اڑانا ہی جہالت ہے یعنی جہالت کا سبب نہیں بلکہ عین جہالت ہے۔ (از کبیر)

مزاح اور استہزاء میں فرق: استہزاء اللہ تعالیٰ کے دین سے مزاح اڑانا مسلمانوں سے حقارت آمیز مزاح اڑانا اور جن چیزوں کی تعظیم ضروری ہے ان کی توہین کرتے ہوئے مزاح اڑانا ہے یہ ناجائز اور حرام اور باعث کفر ہے۔ لیکن مزاح کرنا یعنی خوش طبعی کرنا اور کسی سے حقارت آمیز اور توہین آمیز سلوک نہ کرنا جائز ہے نبی کریم ﷺ اور ائمہ کرام نے مزاح کیا ہے جو یقیناً جائز ہے۔

ابن خویز منداد کہتے ہیں ہمیں یہ خبر ملی ہے کہ ایک شخص کوفہ کے قاضی عبید اللہ بن حسن کے پاس آیا انہوں نے مزاح کے طور پر اس شخص سے سوال کیا " جبتک هذه من صوف نعجة او صوف كبش " یہ تمہارا جبہ بھیڑ کی اون کا ہے یا کہ دنبے کی اون کا۔ وہ شخص کہنے لگا " لا تجهل ايها القاضي " اے قاضی جاہل نہ بنو۔ قاضی نے اس شخص سے سوال کیا کہ مزاح کرنا جہالت کیسے ہے تو اس نے یہی آیت بطور دلیل پیش کی۔ عبید اللہ نے اس سے اعراض کیا " لانه رآه جاهلا لا يعرف المزاح من الاستهزاء " کہ یہ شخص جاہل ہے اسے استہزاء اور مزاح میں فرق کا ہی پتہ نہیں حالانکہ استہزاء اور چیز ہے اور مزاح اور چیز ہے۔ (قرطبی)

کیا بنی اسرائیل کافر ہوئے: جن لوگوں نے موسیٰ علیہ السلام کو کہا ﴿ اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا ﴾ ''کیا تم ہمارے ساتھ مزاح اڑا رہے ہو'' کیا یہ کہنے سے وہ کافر ہو گئے تھے یا نہیں؟

اگر چہ بعض حضرات نے کہا ہے کہ وہ کافر ہو گئے تھے کیونکہ موسیٰ علیہ السلام نے جب یہ کہا کہ بیشک اللہ تعالیٰ تمہیں حکم دیتا ہے گائے ذبح کرنے کا، پھر ان کا یہ کہنا ﴿ اتتخذنا هزوا ﴾ یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت میں شک کرنا لازم آیا۔ اور اگر انہوں نے موسیٰ علیہ السلام کے متعلق یہ سوچا کہ پتہ نہیں یہ سچ ہے یا نہیں اس سے یہ لازم آیا کہ انہوں نے موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کے احکام بیان کرنے میں خیانت کرنے والا سمجھا یہ دونوں صورتیں کفر ہیں۔ اور جن اہل علم نے ان کو کافر نہیں کہا، انہوں نے یہ دلیلیں قائم کی ہیں۔

'' (الاول) ان اللاعبة على الانبياء جائزة فلعلهم ظنوا به عليهم السلام انه يلاعب ملاعبة حقة وذلك لا يوجب الكفر ''

ان میں سے پہلی دلیل یہ ہے کہ خوش طبعی کا کلام انبیاء کرام بھی فرماتے رہے اور ان کی امت کے لوگ بھی، یہ مزاح جائز ہے ان لوگوں نے بھی یہ سمجھا کہ موسیٰ علیہ السلام شائد ہمارے ساتھ خوش طبعی کر رہے ہیں۔ اس سے کفر لازم نہیں آتا۔ ہاں اس دلیل پر اس طرح اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ انہوں نے ''مزاح'' کیوں نہیں ذکر کیا ''هزوا'' کیوں کہا؟ اس کا جواب واضح ہے کہ بعض اوقات مجازی طور پر ایک لفظ دوسرے کی جگہ استعمال ہوتا رہتا ہے مناسبت بھی دونوں میں موجود ہے۔

'' (الثانی) ان معنى قوله تعالىٰ ﴿ اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا ﴾ اى ما اعجب هذا الجواب كانك تستهزئ بنا انهم حققوا على موسى الاستهزاء ''

دوسری دلیل یہ ہے کہ ان کا ﴿ اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا ﴾ کہنا تعجب کے طور پر تھا کہ یہ کیسے ہو گا کہ مردہ کو مردہ کا گوشت زندہ کر دے یہ تو گویا کہ موسیٰ علیہ السلام ہمارے ساتھ مزاح اڑا رہے ہیں۔ انہوں نے حقیقی طور پر موسیٰ علیہ السلام کو مزاح اڑانے والا نہیں کہا کہ کفر لازم آتا۔ (از کبیر)

راقم کو یہی دلائل قوی نظر آئے کیونکہ ان کا بار بار سوال کرنا کہ ''اللہ تعالیٰ سے دعاء کرو'' پھر ان کا

''ان شاء اللہ'' کہنا پھر ان کا اس پر عمل کرنا یہ تمام ان کے ایمان پر دلالت کرنے والی اشیاء ہیں۔

(واللہ اعلم بالصواب)

دینی طلباءکرام کے لئے:

" قوله تعالیٰ ﴿ هُزُوًا ﴾ مفعول ثان ويجوز تخفيف الهمزة تجعلها بين الواو والهمزة "

(تخذ) کا پہلا مفعول ضمیر منصوب متصل ہے اور دوسرا " هزوا " اور اس میں ہمزہ کی تخفیف یعنی واؤ اور ہمزہ کے درمیان پڑھنا بھی جائز ہے جسے علم صرف میں ''بین بین'' اور یا ''تخفیف'' کہتے ہیں۔

" وجعلها حفص واوا مفتوحة لانها همزة مفتوحة قبلها ضمة "

اور حفص نے ہمزہ مفتوحہ اور اس سے پہلے ضمہ ہونے کی وجہ سے واؤ مفتوحہ سے بدل کر پڑھا ہے۔

" هزوا " کی زاء کو ساکن پڑھنا بھی جائز ہے جیسا کہ ''عضد'' کے ضاد مضموم کو ساکن پڑھنا جائز ہے۔ یعنی اصل میں " هزوا " ہمزہ سے ہے جیسا کہ ﴿ ولم يكن له كفوا احد ﴾ میں "كفوا" اصل میں ہمزہ سے ہے پھر اسے واؤ مفتوحہ سے بدلا گیا۔ (از قرطبی)

(هزوا) مهزوابنا حيث تجيبنا بمثل ذلك "(جلالین) " هزوا " مصدر ہے مفعول والا معنی ہے اسی وجہ سے اعلیٰ حضرت نے اس کا ترجمہ ''مسخرہ'' کیا ہے یعنی مزاح اڑایا ہوا۔ مصدر کو مبالغہ کے طور پر اپنے معنی میں رکھنا بھی جائز ہے اور حذف مضاف ہو " ذوی هزء " ہو پھر بھی درست ہے۔

(حاشیہ جلالین)

☆☆☆☆☆

﴿ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِيَ قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا فَارِضٌ وَّلَا بِكْرٌ عَوَانٌ بَيْنَ ذٰلِكَ فَافْعَلُوْا مَا تُؤْمَرُوْنَ ﴾

۱) ''بولے اپنے رب سے دعا کیجئے کہ وہ ہمیں بتا دے گائے کیسی کہا وہ فرماتا ہے کہ وہ ایک گائے ہے نہ بوڑھی اور نہ اوسر بلکہ ان دونوں کے بیچ میں تو کرو جس کا تمہیں حکم ہوتا ہے''

۲) ''انہوں نے کہا دعاء کرو ہمارے لئے اپنے رب سے بیان کرے ہمارے لئے وہ گائے کیسی ہو کہا بیشک وہ فرماتا ہے کہ تحقیق وہ ایسی گائے ہو کہ نہ بوڑھی ہو اور نہ بچھڑی اس کے درمیان ہو تو کرو تم جس کا تمہیں حکم دیا جاتا ہے'' (آیت نمبر ۶۸)

﴿ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّن لَّنَا مَا هِيَ ﴾: ''انہوں نے کہا دعا کرو ہمارے لئے اپنے رب سے، بیان کرے ہمارے لئے وہ گائے کیسی ہو'' (ماھی) ای ماسنھا (خازن) ''ما ھی'' سے ان کے سوال کا مطلب یہ تھا کہ اس گائے کی عمر کیا ہو۔

سوال : ''ما'' استفہامیہ جو سوال کے لئے آتا ہے اور ''ھی'' اشارہ ہے حقیقت کی طرف لہٰذا ''ما ھی'' سے سوال حقیقت کے متعلق ہے یعنی ان کے پوچھنے کا مطلب یہ تھا کہ گائے کی حقیقت کیا ہے اس کی جنس کیا ہے یعنی گائے کسے کہا جاتا ہے۔

ان کے سوال کا جواب گائے کی عمر بیان کر کے کیسے دیا گیا حقیقت کے متعلق جب سوال کیا جائے تو اس کا جواب اس کے اجزاء اور مقدمات بیان کرنے سے آتا ہے نہ کہ صفات خارجیہ کو بیان کرنے سے، عمر کا بیان اسی کی صفات خارجیہ سے ہے۔

پہلا جواب : اگر چہ ہے تو اسی طرح جیسا کہ معترض نے اپنے اعتراض میں ذکر کیا ہے لیکن یہاں قرینہ حالیہ دلالت کر رہا ہے کہ ان کا مقصد حقیقت اور ماہیت کے متعلق پوچھنا نہیں تھا، کیونکہ یہ تو وہ جانتے ہی تھے۔

" بل کان مقصودھم طلب الصفات التی بسببھا یتمیز بعض البقر عن

بعض فلهذا حسن ذکر الصفات الخارجیة جوابا عن هذا السوال "

بلکہ ان کا مقصد ہی صفات کا سوال تھا کہ ایسی صفات کو بیان کیا جائے جن سے یہ گائے جس کے ذبح کا حکم دیا جارہا ہے وہ دوسری گائیوں سے ممتاز ہو جائے۔ اسلئے صفات خارجیہ کو بیان کر کے جواب دینا ہی اچھا تھا تاکہ جواب سوال کے مطابق ہو جائے۔ (از کبیر)

دوسرا جواب: ان کا سوال گائے کی حقیقت اور ماہیت کے متعلق ہی تھا، البتہ ان کو صفات بیان کر کے جواب دیا گیا کہ تمہیں یہ سوال کرنا چاہئے تھا۔ ان کے سوال کرنے کی وجہ یہ تھی کہ انہوں نے دیکھا کہ ایک گائے تو عام ہے جو پائی جاتی ہے۔ اور دوسری وحشی گائے ہے جسے نیل گائے کہا جاتا ہے اور تیسری پہاڑی گائے ہے جسے سور گائے کہا جاتا ہے اور چوتھی دریائی گائے ہے ان میں تو یہ تاثیر نہیں پائی جاتی کہ ان کے گوشت سے مردہ شخص زندہ ہو جائے۔ لہذا وہ گائے یقیناً کسی اور نسل سے ہوگی اس لئے ان کا سوال گائے کی حقیقت کے متعلق تھا۔ البتہ جواب ان کو گائے کی عمر بیان کر کے دیا گیا کہ گائے تو وہی ہے البتہ تمہارے سوال پر جواب صفات بیان کر کے دے دیا جاتا ہے۔ (از عزیزی)

تیسرا جواب اجمالی: " لما رأوا ظهور القتل بذبح ای فرد من جنس البقرة مستبعدا وزعموا انها بائنة عن سائر البقرات بونا بعیدا حتی یکون کانه جنس آخر اجروه مجری لا یعرفون حقیقته " (مظهری)

جن لوگوں نے دیکھا کہ گائے کے گوشت سے کسی مردہ شخص کو زندہ کرنا بہت بعید ہے تو انہوں نے گمان کیا گویا کہ وہ گائے دوسری عام گائے سے علیحدہ ہوگی ان کی ذاتیں مختلف ہوں گی اس لحاظ پر انہوں نے سوال کیا گویا کہ وہ حقیقت کو ہی نہیں جانتے۔

تنبیہ: دوسرے جواب میں یہ بتایا گیا کہ ان کا سوال واقعی گائے کی حقیقت کی متعلق تھا، اور تیسرے جواب میں ذکر کیا گیا ہے کہ گویا کہ ان کا سوال حقیقت کے متعلق تھا۔

تیسرا جواب تفصیلی (دینی طلباء کے لئے): اگرچہ مشہور قاعدہ یہ ہے کہ " ما استفهامیه " کے ذریعے جب سوال کسی چیز کی ماہت اور جنس کے لئے ہو اور وہ افراد خارجیہ پر منطبق ہو تو اس وقت " مااستفهامیه " کو " ما حقیقیه " کہا جاتا ہے اور اس کا درجہ " **هل بسیطه** " سے بعد ہوگا۔

" وهی التی یطلب بها وجود الشئی فی نفسه " کیونکہ جب کسی چیز کے "موجود فی نفسه " کے متعلق سوال کرنا مقصود ہوتو " هل بسیطه " کے ذریعے سوال کیا جاتا ہے۔

ماحقیقیہ کی مثال: ماالانسان ؟ اس مثال میں حقیقت انسان کے متعلق سوال کیا گیا جواب وہی دیا جائے گا جو انسان کے افراد خارجیہ پر منطبق ہوگا یعنی حیوان ناطق سے جواب دیا جائے گا اسی طرح "ما الحرکة " (حرکت کیا ہے؟) میں بھی ماحقیقیہ ہے۔اور " ما استفهامیه " کے ذریعے جب سوال کرنے کا مقصد یہ ہو کہ جواب میں اس چیز کی وضاحت اس طرح ہو کہ یہ پتہ چل جائے کہ اس کا نام کس پر دلالت کر رہا ہے۔یعنی اجمالی طور پر یہ ذکر ہوگا اسے " ما شارحة " کہا جاتا ہے۔

یہ ھل بسیطہ سے مقدم ہوتا ہے۔کیونکہ " هل بسیطه " کے ذریعے ایک چیز کے وجود فی نفسہ کے متعلق سوال ہوتا ہے اور " ما شارحة " کے ذریعے اس کے نام کی دلالت کی وضاحت طلب ہوتی ہے جس میں افراد خارجیہ پر منطبق ہونا ضروری نہیں ہوتا لہٰذا " ما شارحة " کے ذریعے موجود اور معدوم دونوں کے متعلق سوال ہوسکتا ہے۔جیسا کہ کہا جائے " ما العنقاء " تو اس سوال کا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ ماہیت موجودہ کے متعلق سوال کر رہا ہے،لیکن اسے اس کے وجود کا علم نہیں۔

اور یہی سوال "ما هیت معدومه " کے متعلق بھی ہوسکتا ہے۔اسی وجہ سے " هل بسیطه " مقدم ہوتا ہے " وکونها للسوال عن وصف المسمی نادر قلیل " " مااستفهامیه " کے ذریعے کسی چیز کے وصف کے متعلق سوال قلیل ہی پایا جاتا ہے لہٰذا " ما زید " کہہ کر زید کی صحت اور حالت کے متعلق سوال نہیں ہوتا۔ہاں اگر یہی سوال کرنا مقصود ہو تو " کیف زید " کہا جائے گا۔

اگرچہ بظاہر عقل کا تقاضا یہاں بھی یہ ہی تھا کہ " کیف هی " کہا جاتا، یا اور کوئی لفظ ذکر کیا جاتا جو کیفیت اور حالت پر دلالت کرتا: "الا انه قیمت کلمة ما مقام ما یسأل به عن تعیین الشخص " لیکن انہوں نے " مااستفهامیه " کے ذریعے سوال کیا جو شخص اور جنس کی تعیین پر دلالت کرتا ہے اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ یہ سمجھ رہے تھے کہ ذبح کی ہوئی گائے کے گوشت سے مردہ کو زندہ کرنا عقل سے دور ہے:

" فسالوا عنه بما یسأل به عن الحقیقة مع ان الظاهر ان یسألوا بما یسأل به عن الوصف فسالوا اولا عن سنها ثم لونها فاجیبو ببیانهما ثم طلبوا

تمام الکشف ببیان او صافها الزائدة علی ما ذکر"

تو انہوں نے "ما" سے سوال کیا جس سے حقیقت کے متعلق سوال کیا جاتا ہے یہ سوال صرف عقل سے بعید سمجھنے کی وجہ سے "ما" کے ذریعے کر دیا گیا ورنہ حقیقت میں ان کا پہلا سوال ہی عمر کے متعلق تھا اور جواب بھی عمر کے متعلق ہی دیا گیا اور دوسرا سوال ہی رنگ کے متعلق جواب رنگ کے متعلق ہے اور تیسرا سوال ہی اس کے اور مزید اوصاف کے متعلق تھا جس سے زیادہ وضاحت ہو جائے اور جواب بھی اسی سوال کے مطابق ہی دیا گیا۔

حاصل کلام یہ ہے کہ انہوں نے جب تعجب کیا کہ ذبح کی ہوئی گائے سے مردہ کیسے زندہ ہوگا تو انہوں نے یہ سمجھا کہ گویا کہ وہ گائے کوئی خاص صفات ہی رکھتی ہوگی سوال صفات کے متعلق ہی تھا لیکن خصوصی صفات رکھنے کی وجہ سے گویا کہ انہوں نے اس کی حقیقت کو ہی مختلف سمجھ لیا اور سوال "ماھی" کیا سے جو جنس اور حقیقت و ماہیت کے متعلق سوال کے لئے آتا ہے۔ (ماخوذ از شیخ زادہ)

چوتھا جواب: یہ قاعدہ اکثریہ ہے کلیہ نہیں کہ "ما" سے سوال حقیقت و جنس کے متعلق ہوتا ہے لیکن صفات کے متعلق سوال نہیں ہوتا۔ ان لوگوں نے سوال ہی صفات کے متعلق کیا تھا کیونکہ وہ حقیقت کو تو جانتے تھے کہ گائے کون سی جنس ہے۔

" لان ما وان کانت سؤ الاعن الجنس و کیف عن الوصف ولکن قد تقع ما موقع کیف"

" ما " سے انہوں نے صفات کا سوال کیا کیونکہ " ما " اگر چہ جنس کے متعلق سوال کے لئے آتا ہے اور " کیف " صفات کے متعلق آتا ہے لیکن " ما " کبھی " کیف " کی جگہ بھی استعمال ہوتا رہتا ہے۔ البتہ صفات کے متعلق ان کا سوال تعجب کی وجہ سے ہی تھا کہ وہ گائے خاص صفات والی ہی ہونی چاہئے جس کے گوشت سے مردہ زندہ ہوگا۔ (از مدارک)

﴿ قَالَ اِنَّهٗ یَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا فَارِضٌ وَّلَا بِكْرٌ عَوَانٌ بَیْنَ ذٰلِكَ ﴾

''موسیٰ علیہ السلام نے کہا بیشک وہ رب تعالیٰ کہتا ہے کہ تحقیق وہ گائے نہ بوڑھی ہو نہ بچھڑی، اس کے درمیان ہو''

﴿ لا فارض ﴾ اسم للمسنة التی انقطعت ولادتها من الکبر "

وہ مؤنث جس کی ولادت بڑی عمر ہو جانے کی وجہ سے منقطع ہو جائے اسے فارض کہتے ہیں۔

و کأن المسنة سمیت فارضا لانها فرضت سنها او قطعتها و بلغت آخرها"

بوڑھی گائے وغیرہ کو اس لئے بھی فارض کہا جاتا ہے کہ اس کے دانت قطع ہو جاتے (گر جاتے ہیں) یعنی فرض کا معنی منقطع ہونا، گرنا۔

﴿ وَالْبِكْرُ ﴾ اسم للصغیرة، چھوٹی عمر ہو تو اسے بکر (باء کے کسرہ سے) کہا جاتا ہے۔ گائے کی چھوٹی بچھڑی کو بکر کہا جاتا ہے۔ (یہاں یہی معنی مراد ہے) اگر چہ صغر کی وجہ سے جس کی اولاد نہ ہو اسے بھی بکر کہا جاتا ہے یہ معنی پہلے معنی کے قریب ہی ہے۔ اور اولاد میں سے پہلے ولد کو بھی بکر کہا جاتا ہے۔ (یہاں یہ مراد نہیں) خیال رہے پہلی حاجت کو بھی بکر کہا جاتا ہے۔

جوان اونٹ کو بکر (باء کے فتحہ سے) کہا جاتا ہے اور جوان اونٹنی کو بکرۃ کہا جاتا ہے صبح کے وقت کو بکرۃ (باء کے ضمہ سے) کہا جاتا ہے اور پہلے پہلے پھل کو باکورہ کہا جاتا ہے۔

﴿ عَوَانٌ ﴾ متوسط السن، درمیانی عمر والی گائے ہو نہ بوڑھی اور نہ بچھڑی۔ (از روح المعانی)

﴿ بَيْنَ ذٰلِكَ ﴾ پر بظاہر دو وجہ سے اعتراض ہوتا ہے کہ "بین" کی اضافت متعدد کی طرف ہوتی ہے یہاں "ذلک" کی طرف کیسے درست ہے؟ پھر دوسرا اعتراض یہ ہے کہ "ذلک" کا اشارہ "فارض" اور "بکر" کی طرف ہے وہ دونوں مؤنث ہیں تو "ذلک" مذکر واحد کا اشارہ کیسے صحیح ہے؟

ان دونوں کا جواب یہ ہے کہ یہ "ما ذکر" کی تاویل میں ہے مذکور دو چیزیں ہیں فارض اور بکر۔ پہلے سوال کا جواب آ گیا اور مذکور مذکر ہے اس لئے دوسرے سوال کا جواب آ گیا۔ (از کبیر)

﴿ فَافْعَلُوْا مَا تُؤْمَرُوْنَ ﴾: "تو کرو جس چیز کا تمہیں حکم دیا جاتا ہے"۔

"ای من ذبح البقرة ولا تکرروا السوال ولا تغتوا"

یعنی گائے ذبح کرنے کا تمہیں حکم دیا گیا ہے تم اس پر عمل کرو بار بار سوال نہ کرو اور سرکشی نہ کرو۔

اس جملہ میں دو احتمال ہیں ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا ہو اور موسیٰ علیہ السلام کے ذریعے اعلان کرایا ہو۔ اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کو نصیحت کے طور پر فرمایا ہو۔ اور رب تعالیٰ نے ان کے کلام کی حکایت بیان فرمائی ہو۔

سوال ان کے لئے مشکل کا سبب بن گئے: ابن جریری نے صحیح سند سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے موقوف روایت بیان کی:

" لو ذبحوا ای بقرة اراد والأ جزأتهم ولكن شد دوا على انفسهم فشدد الله تعالىٰ عليهم "

وہ کوئی گائے بھی ذبح کر لیتے جو چاہتے، تو ان کو کفایت کر جاتی، لیکن انہوں نے اپنے نفسوں پر شدت کی تو اللہ تعالیٰ نے بھی ان پر شدت کر دی۔

☆ سعید ابن منصور نے اپنی سنن میں حضرت عکرمہ سے مرفوع اور مرسل یہی حدیث بیان کی ہے جو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ابن جریر نے بیان کی ہے۔

" وبانه لو كانت معينة لما عنفهم على التمادى وزجرهم عن المراجعة الى السؤال "

اور عقل سے بھی یہ بات واضح طور پر ثابت ہے کہ اگر گائے معین ہوتی جس کے ذبح کرنے کا حکم دیا گیا ہے تو ان کو دیر کرنے پر اور بار بار سوال کرنے پر زجر (ڈانٹ ڈپٹ) نہ کی جاتی۔

(از روح المعانی)

مسئلہ: بعض محققین نے اس مقام پر ایک مسئلہ کی تحقیق کی ہے کہ جب ان کو مطلق گائے کے ذبح کرنے کا حکم دیا گیا تھا لیکن انہوں نے خود اپنے آپ پر سوال کر کے حکم کو سخت کر دیا وہی حکم جو پہلے مطلق تھا اب مقید ہو گیا۔ اسی سے یہ مسئلہ ثابت ہو گیا۔

" النسخ جائز قبل وقت الفعل لانه لما امر ببقرة اقتضى اى بقرة كانت فلما زاد فى الصفة نسخ الحكم الاول بغيره لان شرط النسخ التمكن من الاعتقاد وهو حاصل بلاريب " (قرطبی، روح المعانی)

فعل کے وقت سے پہلے نسخ جائز ہے اس لئے کہ جب ان کو حکم دیا گیا کہ کوئی گائے ذبح کر دو انہوں نے جب بار بار سوال کئے تو صفات زائد کر کے حکم کو مقید کر کے پہلے مطلق حکم کو منسوخ کر دیا گیا نسخ کے لئے اعتقاد رکھنا ضروری ہے وہ ان کو حاصل تھا نسخ کے لئے یہ ضروری ہی نہیں کہ ایک مرتبہ عمل کر لیا جائے تو پھر منسوخ ہو۔ اس پر واضح دلیل یہ ہے کہ معراج کی رات کو پچاس نمازیں فرض کر دی گئیں لیکن ان پر عمل سے پہلے ہی ان کو منسوخ کر دیا گیا۔

﴿ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّکَ یُبَیِّنْ لَّنَا مَالَوْنُهَا قَالَ اِنَّهٗ یَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ صَفْرَاءُ فَاقِعٌ لَّوْنُهَا تَسُرُّ النّٰظِرِیْنَ ﴾ (آیت ۶۹)

۱) ''بولے اپنے رب سے دعا کیجئے ہمیں بتا دے اس کا رنگ کیا ہے کہا وہ فرماتا ہے وہ ایک پیلی گائے ہے جس کی رنگت ڈہڈہاتی دیکھنے والوں کو خوشی دیتی''۔

۲) ''انہوں نے کہا دعاء کرو ہمارے لئے اپنے رب سے بیان کرے ہمارے لئے اس کا رنگ کیسا ہو، کہا بیشک وہ کہتا ہے تحقیق وہ گائے زرد (رنگ کی) ہو خالص شوخ زرد رنگ ہو اس کا خوش کرے دیکھنے والوں کو''۔

﴿ مَالَوْنُهَا ﴾ ما استفہامیہ ہے مبتداء واقع ہے اور لونھا خبر ہے (رنگ کیسا ہو) '' لون '' واحد ہے اور جمع اس کی '' الوان '' ہے '' اللون ''، وھو ھیئۃ کالسواد والبیاض والحمرۃ '' سیاہ ہونا، سفید ہونا اور سرخ ہونا وغیرہ سے جو کیفیت، ھیئت حاصل ہوتی ہے اسے '' لون '' کہا جاتا ہے۔ یعنی '' لون '' نوع ہے اور سواد و بیاض وغیرہ اس کے افراد ہیں۔ اور کہا جاتا ہے '' فلان متلون '' (فلاں رنگ بدلتا رہتا ہے) اس کا مطلب یہ ہوتا '' لا یثبت علی خلق واحد وحال واحد '' کہ وہ ایک عادت اور ایک حال پر قائم نہیں رہتا۔

﴿ صَفْرَاءُ ﴾: زرد رنگ کی ہو۔ صفراء مؤنث ہے اور اصفر مذکر ہے اور جمع دونوں کی صفر (صاد کے ضمہ سے) ہے '' قال مکی عن بعضھم حتی القرن والظلف '' مکی نے بعض حضرات سے نقل کیا ہے کہ زرد رنگ کا جو حکم دیا گیا تھا اس سے مراد یہ تھا کہ اس گائے کے سینگ اور پاؤں کی ہڈی (کھر) بھی زرد رنگ کے ہوں۔ (قرطبی)

﴿ فَاقِعٌ لَّوْنُهَا ﴾ الفقوع اشد ما یکون من لاصفرۃ وانصعہ '' زرد رنگ جب بہت شدید زرد رنگ ہو اور اس میں چمک پائی جائے تو اس وقت فاقع کہا جاتا ہے۔

'' یرید خالصا لونھا لالونھا فیھا سوی لون جلدھا '' اس وقت '' فاقع لونھا '' کہا

جاتا ہے جب کہ اس کا زرد رنگ خالص ہو اور دوسرا رنگ اس میں نہ ہو صرف اس کے چمڑے کا ایک ہی رنگ زرد ہو۔

تنبیہ: مجازی طور پر اصفر کا معنی سیاہ بھی آتا رہتا ہے، جیسا کہ رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے: ﴿کَأَنَّهُ جِمَالَةٌ صُفْرٌ﴾ اس مقام پر بعض مفسرین کرام نے بیان فرمایا کہ جہنم کی چنگاریوں کو سیاہ اونٹوں سے تشبیہ دی گئی ہے یعنی "صفر" کا معنی مجازی طور پر "سیاہ" لیا گیا ہے۔ لیکن جب "فاقع" ساتھ ذکر ہو تو حقیقی معنی "زرد" لینا ضروری ہو جاتا ہے مجازی معنی لینا درست نہیں ہوتا۔

مقام توجہ: جب بہت سیاہ، خالص سیاہ کہنا مقصود ہو تو کہا جائے گا "اسود حالک وحلکوک" (حاء اور لام پر فتحہ) وحلکوک (حاء پر ضمہ اور لام ساکن) ودجوجی وغربیب (غین کے نیچے کسرہ) سخت سرخ، خالص سرخ کو "احمر قانی" اور خالص سفید کو کہا جاتا ہے "ابیض ناصع، ولھق (لام پر فتحہ اور ہاء کے نیچے کسرہ) ولھاق (لام کے نیچے کسرہ) ویقق (یاء پر فتحہ اور قاف کے نیچے کسرہ) اور خالص سبز کہنا ہو تو کہا جائے گا" اخضر ناضر " اور خالص زرد کہنا ہو تو کہا جائے گا" اصفر فاقع"

خیال رہے: چند اور معانی کی طرف بھی توجہ کی ضرورت ہے، الافقاع، سوء الحال، یعنی افقاع بدحالی کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ فواقع الدھر، بوائقه، زمانے کے مصائب کو فواقع الدھر کہتے ہیں۔ فقع باصابعه، اذا صوت، انگلیوں سے پٹاخے نکالنے کے لئے "فقع باصابعه" بولتے ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث میں آتا ہے "نھی عن التفقیع فی الصلوۃ" نماز میں انگلیوں سے پٹاخے نکالنے سے منع کیا گیا ہے۔ (از قرطبی)

﴿تَسُرُّ النَّاظِرِينَ﴾: تسر مؤنث کا صیغہ ہے ضمیر بقرۃ کی طرف لوٹ رہی ہے۔ یعنی وہ گائے خوش کرے دیکھنے والوں کو:

"السرور اصله لذة فی القلب عند حصول نفع او توقعه او رؤية امر معجب رائق"

سرور کا معنی یہ ہے کہ دل کو لذت حاصل ہو نفع کے حاصل ہونے کی وجہ سے یا نفع کی توقع کی وجہ سے یا عجیب اور عمدہ چیز کو دیکھنے کی وجہ سے۔ اسی طرح باطنی طور پر انشراح صدر (خوشی سے سینہ کا کھل

جانا) کو بھی سرور کہا جاتا ہے۔

خیال رہے "سرور" اور "حبور" اور "فرح" معنوی لحاظ پر قریب قریب ہیں: "سرور" خالص پوشیدہ طور پر حاصل ہونے والی خوشی کو کہا جاتا ہے اس کا نام اسرار کی مناسبت سے رکھا گیا ہے اور "حبور" اس خوشی کو کہتے ہیں جس کے اثرات چمڑے وغیرہ پر ظاہر ہوں سرور اور حبور دونوں مقام مدح میں استعمال ہوتے ہیں۔ لیکن "فرح" کا استعمال اس خوشی کے لئے ہوتا ہے جس پر اترایا جائے اکثر پائی جائے اسی وجہ سے اس کا استعمال اکثر طور پر مقام مذمت میں ہوتا ہے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ اِنَّ اللهَ لَا يُحِبُّ الْفَرِحِيْنَ ﴾

بیشک اللہ تعالیٰ خوش ہونیوالوں (خوشی پر اترانے والوں) کو پسند نہیں فرماتا۔

(از روح المعانی)

﴿ تَسُرُّ النّٰظِرِيْنَ ﴾ قال وهب كأن شعاع الشمس يخرج من جلدها "

وہب نے بیان کیا ہے کہ اس گائے کا رنگ گویا کہ یہ بتایا گیا ہے کہ وہ خالص شوخ زرد رنگ ایسے جیسے کہ سورج کی شعائیں اس کے چمڑے سے نکل رہی ہوں یعنی بہت چمکدار ہو، ایسے رنگ والی گائے دیکھنے والوں کو خوش کرے۔ (قرطبی)

فائدہ عظیمہ: "قال ابن عباس الصفرة تسر النفس وحض على لباس النعال الصفر"

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ زرد رنگ سے نفس کو سرور حاصل ہوتا ہے اسی لئے آپ زرد رنگ کے جوتے پہننا پسند فرماتے ہوئے دوسروں کو بھی اسی پر برانگیختہ فرماتے تھے یہ نقاش نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے۔

" وقال علی بن ابی طالب ﷺ من لبس نعلی جلد اصفر قل همه لان الله تعالیٰ یقول ﴿ صَفْرَآءُ فَاقِعٌ لَّوْنُهَا تَسُرُّ النّٰظِرِيْنَ ﴾

ثعلبی نے حضرت علی ﷺ سے نقل کیا کہ آپ فرماتے ہیں جس شخص نے زرد رنگ کے چمڑے کے جوتے پہنے اسے غم کم لاحق ہوں گے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے گائے کا زرد رنگ ذکر فرمایا کہ وہ دیکھنے واں کو خوش کرے۔

☆ " ونهى ابن الزبير ومحمد ابن كثير عن عباس النعال السود لانها تهم "

ابن زبیر اور محمد بن کثیر سیاہ جوتے پہننے سے منع فرماتے تھے کہ سیاہ جوتے پہننے سے غم لاحق ہوتا ہے۔

(قرطبی وهكذا فی روح المعانی)

﴿ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِيَ إِنَّ الْبَقَرَ تَشَابَهَ عَلَيْنَا وَإِنَّا إِنْ شَاءَ اللّٰهُ لَمُهْتَدُوْنَ ﴾ (آیت ۷۰)

۱) ''بولے اپنے رب سے دعا کیجئے کہ ہمارے لئے صاف بیان کر دے وہ گائے کیسی ہے بیشک گائیوں میں ہم کوشبہ پڑ گیا اور اللہ چاہے تو ہم راہ پا جائیں گے''۔

۲) انہوں نے کہا دعا کریں ہمارے لئے اپنے رب سے کہ واضح طور پر بیان کرے ہمارے لئے کیسی ہو وہ گائے؟ بیشک گائے مشتبہ ہوگئی ہم پر، اور بیشک ہم ''اگر اللہ نے چاہا'' تو ہدایت پا جائیں گے''

سب سے پہلا سوال بھی ان کا '' ما ھی '' سے جس سے مراد ان کی گائے کے حال اور وصف کے متعلق سوال تھا اب پھر '' ما ھی '' سے سوال کیا جا رہا ہے کیا انہوں نے پہلے جواب کو رد کر دیا اور دوبارہ سوال کیا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ انہوں نے سوال کو لوٹایا حال اور وصف کے متعلق سوال کیا پہلے جواب کو رد نہیں کیا۔

'' بل لطلب الكشف الزائد على ما حصل واظهار انه لم يحصل البيان التام ''

بلکہ انہوں نے پہلے جواب سے جو مطلب حاصل ہوا تھا اس کی مزید وضاحت طلب کی اور ظاہر کیا کہ ابھی تک ہمیں ہماری منشاء کے مطابق کامل جواب حاصل نہیں ہوا۔ (روح المعانی)

علامہ آلوسی کی وضاحت کے بعد اعلیٰ حضرت کا ترجمہ خوب سمجھ آیا ''ہمارے لئے صاف بیان کردے'' '' قال قطرب جمع البقرة باقر وباقور وبقر '' قطرب نے بیان کیا ہے کہ بقرۃ کی جمع باقر اور باقور اور بقر ہے یعنی '' ان البقر '' میں بقر جمع ہے۔ اعلیٰ حضرت کا ترجمہ اسی قول کے مطابق ہے ''بیشک گائیوں میں ہم کو شبہ پڑ گیا''. '' قال الزجاج ، المعنى ان جنس البقر '' زجاج نے کہا ہے یہ جنس ہے، اس قول کے مطابق یہ ترجمہ بھی درست ہے ''بیشک گائے ہم پر مشتبہ ہوگئی''۔ (از قرطبی)

﴿ إِنَّ الْبَقَرَ تَشَابَهَ عَلَيْنَا ﴾: اعتذار عنه اى ان البقر الموصوف بالتعوين والصفرة كثير فاشتبه علينا '' (بیضاوی)

انہوں نے عذر پیش کرتے ہوئے سوال کیا کہ بیشک گائے جس کے اوصاف بیان کردیئے گئے کہ وہ ادھیڑ عمر ہو اور زرد رنگ کی ہو، اس قسم کی گائے بھی کثیر ہیں، اس لئے گائے ہم پر مشتبہ ہوگئی۔

﴿ وَاِنَّا اِنْ شَاءَ اللّٰهُ لَمُهْتَدُوْنَ ﴾: جب انہوں نے " ان شاء الله " کہا تو اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے ان کو توفیق حاصل ہوگئی کہ انہوں نے عمل کرلیا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

" لو لم یستثنوا لما تبینت لهم آخر الابد "

اگر وہ ان شاء اللہ نہ کہتے تو ہمیشہ کے لئے ان پر واضح نہ ہوتا۔ (از روح المعانی)

یعنی وہ سوال کرتے رہتے ان کو جواب دیئے جاتے رہتے، مسئلہ نہ ان پر واضح ہوتا اور نہ ہی وہ عمل کرتے۔

" وفیه استعانة بالله وتفویض الأمر الیه والاعتراف بقدرته ونفاذ مشیئته "

ان شاء اللہ کہنے میں اللہ تعالیٰ کی امداد حاصل ہوتی ہے، اور تمام امور اللہ تعالیٰ کی طرف سپرد کردیئے جاتے ہیں۔

اور رب تعالیٰ کی قدرت کا اعتراف پایا جاتا ہے اور اس کی مشیت کو جاری کیا جاتا ہے۔ (کبیر)

﴿ اِنْ شَاءَ اللّٰهُ الْمُهْتَدُوْنَ ﴾ میں چند احتمال ہیں:

(۱) بیشک ہم اللہ تعالیٰ کی مشیت سے ہدایت پاجائیں گے یعنی ہمیں تمام اوصاف والی گائے مل جائے گی جو دوسری گائیوں سے ممتاز ہے تو ہم ذبح کرلیں گے۔

(۲) ہم بار بار جو سوال کررہے ہیں ان شاء اللہ ہم اس پر ہدایت حاصل کریں گے ہمارا بار بار سوال کرنا کوئی گمراہی کے لئے نہیں۔

(۳) ان شاء اللہ گائے کے اوصاف بیان کرنے سے ہمیں قاتل کی راہنمائی مل جائے گی کیونکہ وہ گائے حاصل کرکے ذبح کرلیں گے۔

(اس تمام وضاحت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ ایمان پر قائم تھے کافر نہیں ہوئے تھے)۔

(ماخوذ از کبیر)

☆☆☆☆☆

﴿ قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا ذَلُوْلٌ تُثِيْرُ الْاَرْضَ وَلَا تَسْقِى الْحَرْثَ مُسَلَّمَةٌ لَّا شِيَةَ فِيْهَا قَالُوا الْئٰنَ جِئْتَ بِالْحَقِّ فَذَبَحُوْهَا وَمَا كَادُوْا يَفْعَلُوْنَ ﴾ (آیت ۷۱)

۱) ''کہا وہ فرماتا ہے کہ وہ ایک گائے ہے جس سے خدمت نہیں لی جاتی کہ زمین جوتے اور نہ کھیتی کو پانی دے بے عیب ہے جس میں کوئی داغ نہیں۔ بولے اب آپ ٹھیک بات لائے تو اسے ذبح کیا اور ذبح کرتے معلوم نہ ہوتے تھے''۔

۲) ''کہا بیشک وہ فرماتا ہے تحقیق وہ گائے ہے، نہیں اس سے کام لیا گیا کہ وہ ہل چلاتی ہے زمین میں۔ اور نہ ہی سیراب کرتی ہے کھیتی کو، سلامتی میں ہے۔ نہیں کوئی داغ اس میں انہوں نے کہا اب لائے ہو تم واضح بیان۔ تو ذبح کیا انہوں نے اسے اور وہ قریب نہیں تھے کرنے کے''۔

﴿لَا ذَلُوْلٌ﴾: '' ومعنى لا ذلول لم يذللها العمل '' مطلب یہ ہے کہ وہ گائے ایسی ہو کہ اس سے کام لے کر اسے ذلیل نہ کیا گیا ہو مختصر مفہوم یہ ہے کہ اس سے کام نہ لیا گیا ہو۔ (قرطبی)

﴿تُثِيْرُ الْاَرْضَ﴾: یہ جملہ صفت ہے '' ذلول '' کی '' تثير الارض اى تقلبها للزراعة '' زمین میں ہل چلانے کے لئے گائے کو جوتنا زمین کی مٹی کو ہل چلا کر الٹ پلٹ کرنا '' اثارة الارض '' کہا جاتا ہے۔ جب '' لا ذلول '' کی صفت ہوا تو معنی ہو گیا۔ اس گائے سے کوئی کام بھی نہ لیا گیا اور نہ ہی اسے ہل جوتا گیا ہو۔

﴿وَلَا تَسْقِى الْحَرْثَ﴾: اور کھیتی کو پانی نہ دیا ہوا، مطلب یہ ہے کہ وہ گائے کنواں نہ چلی ہو۔

﴿مُسَلَّمَةٌ﴾: '' سلمها الله تعالىٰ من العيوب او اهلها من العمل او اخلص لونها من سلم له كذا اذا خلص ''

اللہ تعالیٰ نے اسے عیوب سے سلامتی میں رکھا ہو۔ اور اسی طرح اس کے مالکوں نے اسے کام

سے سلامتی میں رکھا ہو، یعنی اس سے کام نہ لیا ہو۔ اور اس کا ایک معنی یہ بھی ہے کہ اس کا رنگ خالص ہو وہ رنگ عیب سے سلامتی ہو۔ اس لئے کہ ''مسلم لہ کذا، خلص لہ'' (خالص ہونے) کے معنی میں بھی استعمال ہوتا رہتا ہے۔ (از بیضاوی)

﴿ لَا شِيَةَ فِيهَا ﴾: یہ مصدر ہے یعنی " وشی یشی وشیا شیة " استعمال ہوتا ہے۔ اس کا اصل لغوی معنی " اذا خلط بلونه لونا آخر " جب ایک رنگ سے دوسرا رنگ ملا دیا جائے۔ اس لحاظ پر لغوی معنی یہ ہوگا کہ اس کے زرد رنگ میں کوئی اور رنگ نہ ملا ہوا ہو۔ مراد یہی ہے کہ اس میں کوئی داغ دھبہ نہ ہو۔

﴿ قَالُوا الْآنَ جِئْتَ بِالْحَقِّ ﴾: انہوں نے کہا اب تم لائے ہو واضح بیان (بالحق) ای بالبیان التام الذی لا اشکال (خازن) یعنی اب تم نے بہت مکمل اور واضح بیان لایا ہے جس کی وجہ سے ہمیں سمجھنا مشکل نہیں رہا۔ خیال رہے حق یہاں باطل کا مقابل نہیں ورنہ ان کا یہ کہنا کفر ہوتا کہ پہلے تم باطل لاتے رہے اب حق لائے۔

﴿ فَذَبَحُوهَا وَمَا كَادُوا يَفْعَلُونَ ﴾: تو انہوں نے اسے ذبح کیا وہ قریب نہیں تھے کرنے کے

خیال رہے کہ نحویوں کا لفظ " کاد " میں کلام ہے لیکن مشہور قول یہ ہے کہ یہ عام فعلوں کی طرح ہی مثبت ہوتا ہے جب اس پر حرف نفی نہ ہو۔ اور اگر اس پر حرف نفی ہو تو منفی ہوگا خواہ ماضی ہو یا مضارع۔ اسی مشہور قول کے مطابق ترجمہ کیا گیا ہے اور یہی صحیح بھی ہے۔

وہ ذبح کیوں نہیں کرنا چاہتے تھے؟

اس کی چند وجوہ تھیں جن کے پیش نظر وہ ذبح کرنا تو نہیں چاہتے تھے لیکن اب ان کو اس کام کے نہ کرنے کا کوئی راستہ نظر نہیں آ رہا تھا لہٰذا انہیں ذبح کرنا پڑا۔

(۱) " لخوف الفضیحة " ایک وجہ یہ تھی کہ ان کو خوف لاحق تھا کہ اگر ہم نے ذبح کر دیا اور اس کا گوشت مقتول شخص کو مار دیا تو وہ زندہ ہو جائے گا اور پتہ چل جائے گا کہ قاتل کون ہے قاتل تو وہ خود ہی تھے اس لئے وہ رسوائی کے ڈر سے ذبح نہیں کرنا چاہتے تھے۔

(۲) "لعزة وجودها بهذه الاوصاف جميعا" اور وجہ یہ تھی کہ وہ اس لئے ذبح نہیں کرنا چاہتے تھے کہ وہ سمجھ رہے تھے کہ ان تمام اوصاف والی گائے کا ملنا تو مشکل ہے۔

(۳) "لغلاء ثمنها" اور وجہ یہ تھی کہ وہ اس لئے ذبح نہیں کرنا چاہتے تھے کہ وہ کہہ رہے تھے کہ اس کی بہت قیمت ہے کیونکہ اس وقت عام گائے کی قیمت تین دینار تھی لیکن یہ گائے ان کو گائے کا چمڑا بھر کر اس کے برابر سونا وغیرہ ادا کرنے کی قیمت سے مل رہی تھی۔ (از خازن)

بہت بھاری قیمت سے گائے حاصل کرنے کی وجہ:

اس وقت عام طور پر گائے کی قیمت تین دینار تک ہوتی تھی لیکن انہوں نے سوال کر کے اپنے لئے مشکل پیدا کر لی۔ تمام اوصاف کسی گائے میں بیک وقت پائے جانے دشوار نظر آئے۔ آخر کار تلاش کرتے کرتے انہیں ایک بیوہ اور اس کے یتیم بچے کے پاس ایسی گائے نظر آئی جس میں بیان کردہ جمیع اوصاف موجود تھے بوڑھی نہیں تھی اور بچھڑی نہیں تھی بلکہ درمیانی عمر کی تھی۔ زرد تیز رنگ تھا دیکھنے والوں کو خوش کرتا تھا۔ زمین میں اس نے ہل نہیں چلایا تھا اور نہ ہی کھیتی کو سیراب کیا تھا اور اس میں کوئی عیب اور داغ دھبہ نہیں تھا کیونکہ اس یتیم کے بوڑھے نیک پرہیز گار باپ نے اپنی ایک بچھڑی کو جنگل میں چھوڑ کر اللہ تعالیٰ کی حفاظت میں دے دیا تھا کہ میرا بچہ کچھ بڑا اور سمجھدار ہو کر اسے لے جائے گا وہ بچہ بھی والدین کا فرمانبردار تھا اپنے باپ کی وفات کے کچھ عرصہ بعد وہ اپنی گائے جنگل سے لے آیا تھا، اسی گائے میں تمام اوصاف موجود تھے موٹی تازی تھی خوبصورت تھی۔

بنی اسرائیل کو اس کے چمڑے میں جتنی مقدار میں سونا آسکے اتنی مقدار سونا بطور قیمت ادا کرنا پڑا سبحان اللہ مالک الملک نے اپنے نیک بندے کی گائے کی جنگل میں حفاظت کی۔ اور اس نیک بندے کی بیوہ اور اس کے یتیم بچے کو کثیر مقدار میں مال و دولت عطا فرمایا۔

بنی اسرائیل اگرچہ گائے کی بھاری قیمت ادا کرنے پر بخوشی رضامند نہیں تھے اور یہ بھی جانتے تھے کہ اگر ہمارا مقتول زندہ ہو گیا تو ہمارا اپنا ہی عیب ظاہر ہو گا لیکن انہیں پھر بھی گائے مجبوراً ذبح کرنی پڑی کیونکہ اب ان کے پاس کوئی عذر باقی نہیں رہ گیا تھا اگرچہ وہ ذبح کرنا نہیں چاہتے تھے۔ (ماخوذ از کبیر)

گائے ذبح کرنے میں حکمت:

ایک وجہ تو یہی تھی کہ نیک آدمی کے یتیم بچے اور اس شخص کی بیوہ کو کثیر مال عطا کرنا تھا اس لئے گائے ذبح کرنے کا حکم دیا اور بنی اسرائیل کے ذہنوں میں یہ بات ڈال دی کہ وہ سوال کرتے رہیں اس طرح وہ گائے کہیں اور نہ مل سکی۔

دوسری وجہ یہ تھی کہ گائے کی قربانی کا طریقہ پہلے سے چلا آرہا تھا اور وہ لوگ گائے کی قربانی کو عظیم سمجھتے تھے اس لئے انہیں گائے ذبح کرنے کا حکم دیا تا کہ ان کے ذہن اسے قبول کرلیں کہ گائے کی قربانی میں یہ اثر ہوگا۔

تیسری وجہ یہ تھی کہ مقتول کو اس عجیب انداز سے زندہ کر کے بتادیا کہ اللہ تعالیٰ جس طرح چاہے اسی طرح مردوں کو زندہ فرمالیتا ہے۔

چوتھی وجہ یہ تھی کہ موسیٰ علیہ السلام کی برتری ان پر واضح ہوجائے اور آپ کا معجزہ ظاہر ہوجائے۔

پانچویں وجہ یہ تھی کہ گاؤ پرستی ان کے آباء واجداد نے دیکھ کر بچھڑے کی پوجا شروع کرلی تھی ان کو گائے کے ذبح کرنے کا حکم دے کر تنبیہ کی کہ گائے خدا نہیں ہوسکتی۔ جو خود ذبح ہوجائے وہ خدا کیسے۔

فائدہ : اس واقعہ سے یہ فائدہ حاصل ہوا کہ کسی چیز کے جب اوصاف بیان کردیئے جائیں تو ایسے پتہ چلتا ہے گویا کہ وہ چیز سامنے آ گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

" لا تصف المرأة المرأة لزوجها حتى كأنه ينظر اليها " (رواه مسلم)

کوئی عورت اپنے خاوند کے سامنے دوسری عورت کے اوصاف نہ بیان کرے یہ ایسا ہی جیسا کہ وہ شخص اس عورت کو دیکھ رہا ہے۔

" فجعل النبي ﷺ الصفة تقوم مقام الرؤية "

نبی کریم ﷺ نے اوصاف بیان کرنے کو دیکھنے کے قائم مقام قرار دیا۔

(از قرطبی)

جب صرف اوصاف بیان کرنے سے منع کیا تو عورتوں کا بے حجاب ہو کر، سر سے ننگے، اور بازو ننگے، گریبان کھول کر سڑکوں اور بازاروں میں گھومنا کہاں جائز ہوگیا۔

﴿ وَاِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادّٰرَءْتُمْ فِيْهَا وَاللّٰهُ مُخْرِجٌ مَّا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ﴾ (آیت ۷۲)

۱) ''اور جب تم نے ایک خون کیا تو ایک دوسرے پر اس کی تہمت ڈالنے لگے اور اللہ کو ظاہر کرنا جو تم چھپاتے تھے''

۲) ''اور جب تم نے قتل کیا ایک شخص کو، تو تم نے جھگڑا کیا اس میں، اور اللہ ظاہر کرنے والا ہے جو تم چھپاتے تھے۔

اس آیۂ کریمہ میں واقعہ کی ابتداء ہے قرآن پاک میں درحقیقت واقعات کو صرف بطور واقعات بیان کرنا مقصود نہیں ہوتا، بلکہ ان واقعات سے تدبر حاصل کرنا، نصیحت پکڑنا، اور قرآن پاک کی فصاحت و بلاغت میں غور و فکر مقصود ہوتا ہے۔ معنوی طور پر یہ آیت ﴿ وَاِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادّٰرَءْتُمْ ﴾ ......الخ پہلے ہے اور ﴿ وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖٓ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ ﴾ بعد میں ہے۔

اسی طرح ﴿ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلٰى عَبْدِهِ الْكِتٰبَ وَلَمْ يَجْعَلْ لَّهٗ عِوَجًا قَيِّمًا ﴾ میں معنوی لحاظ پر " الکتاب " کے بعد " قیما " کا درجہ ہے اور ﴿ وَلَمْ يَجْعَلْ لَّهٗ عِوَجًا ﴾ کا بعد میں۔ قرآن پاک میں کئی مقامات میں یہی صورت ہے وجہ یہی ہے کہ لوگ قرآن پاک کی فصاحت و بلاغت میں غور و فکر کریں۔ (از قرطبی)

﴿ وَاِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا ﴾ : لفظ " نفس " مؤنث سماعی ہے۔ اسی وجہ سے " فیھا " میں ضمیر مؤنث ہے جو لفظ نفس کی طرف لوٹ رہی ہے۔ اگرچہ معنی یہاں مذکر والا لیا ہوا ہے، یعنی جب تم نے قتل کیا ایک شخص کو۔ خیال رہے معنوی طور پر " نفس " مذکر اور مؤنث دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

﴿ فَادّٰرَءْتُمْ ﴾ : اصل میں " تدارأتم " ہے باب تفاعل کے فاء کلمہ میں دال واقع ہوا، تاء کا دال سے تبدیل کرنا جائز ہے۔ پھر واجب ہے کہ دال کو دال میں ادغام کیا جائے۔ ادغام کرنے کی صورت میں ابتداء ساکن لفظ سے لازم آرہی تھی۔ اس لئے ہمزہ کو شروع میں بڑھا دیا " ادارأتم " ہو گیا۔

(فادارأتم فیها) اختصتم فی شانها اذ المتخاصان یدفع بعضها بعضا "
تم نے اس میں جھگڑا کیا جھگڑا کرنے والے بعض، بعض سے مدافعت کرتے ہیں ۔

یعنی اصل میں " تدارئی " کامعنی ہے " تدافع " ہے۔تدافع کا کنایۃ کے طور پر معنی "اختصام " (جھگڑا کرنا) ہے اختصام ملزوم ہے تدافع کا یعنی ذکر لازم مراد ملزوم ہے۔ یا حقیقی معنی ہی مراد لے لیا جائے:

" فادارأتم فیھا ای تدافعتم بان طرح قتلھا کل من نفسه الی صاحبه "
جب تم نے ایک شخص کو قتل کیا تو ہر ایک تم میں سے ایک دوسرے پر قتل کی تہمت لگا رہا تھا۔

اعلیٰ حضرت نے حقیقی معنی کے مطابق ہی ترجمہ کیا (تو ایک دوسرے پر اس کی تہمت ڈالنے لگے) لیکن راقم نے مجازی معنی کے مطابق ترجمہ کیا (تو تم نے جھگڑا کیا اس میں) ۔اگر چہ قاضی بیضاوی رحمہ اللہ نے پہلے مجازی معنی بیان کیا پھر حقیقی معنی بیان کیا۔اس پر شیخ زادہ رحمہ اللہ نے تحریر فرمایا:

" وقدم الوجه الاول لان الکنایة ابلغ "
(وجہ اول کو مقدم ذکر کیا کہ کنایہ ابلغ ہے)

لیکن راقم نے مجازی معنی صرف اس لئے تحریر کیا ہے کہ طلباء کرام کے ذہنوں میں مختلف بحثیں آتی ہیں۔

﴿ وَاللّٰهُ مُخْرِجٌ مَّا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ﴾ : مظهره لا محاله ، اللہ تعالیٰ ظاہر کرنے والا ہے یقیناً۔ " اخراج " کا حقیقی معنی ہے " نکالنا " لیکن یہاں معنی ہے " ظاہر کرنا " کیونکہ یہ " کتمان " (چھپانے) کے مقابل ذکر ہے البتہ علامہ بیضاوی رحمہ اللہ نے " لا محاله " سے تفسیر کی۔جس کا معنی ہے " یقیناً " ۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ اسم فاعل جب ضمیر سے خالی نہ ہو اور مبتداء کی خبر واقع ہو تو اس میں تقویت کا معنی پایا جاتا ہے۔ ﴿ مَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ﴾ " جو تم چھپاتے تھے " یعنی قاتل اپنے آپ کو ظاہر نہیں کر رہا تھا اور ایک دوسرے پر الزام لگا رہے تھے۔

خیال رہے " مخرج " مستقبل کی حکایت ہے (اللہ ظاہر کرنے والا ہے) یعنی اگر چہ نبی کریم ﷺ پر جب آیۃ کریمہ کا نزول ہوا تو اس لحاظ پر واقعہ ماضی کا ہے۔ جب بنی اسرائیل سے ارشاد فرمایا گیا اس

وقت کے لحاظ پر مستقبل کر ذکر تھا، اس لئے ترجمہ بھی مستقبل کا کرلیا جاتا ہے۔ (از بیضاوی و شیخ زادہ)

فائدہ : " تدل الآیة علی ان ما یسره العبد من خیر او شر دام ذلک منه فان الله سیظهره قال علیه الصلوة والسلام ان عبدا لو اطاع الله من وراء سبعین حجابا لأظهر ذلک علی السنة الناس وکذلک المعصیة وروی ان الله تعالیٰ اوحی الی موسیٰ علیه السلام قل لنبی اسرائیل یخفون لی اعمالهم وعلی ان اظهرها لهم" (کبیر)

آیۂ کریمہ سے یہ مسئلہ ثابت ہو رہا ہے کہ جب کوئی انسان بھی نیکی یا برائی چھپ کر کرے اسی طریقہ پر ہمیشہ سے اس کا عمل ہو، تو اللہ تعالیٰ اسے ظاہر فرما دیتا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: بیشک بندہ اگر اللہ تعالیٰ کی اطاعت ستر پردوں کے پیچھے سے کرے اللہ تعالیٰ اسے لوگوں کی زبانوں پر ظاہر فرما دیتا ہے۔ (یعنی لوگ اس نیک آدمی کی نیکیوں کا چرچا کرتے رہتے ہیں کہ فلاں جگہ ایک بزرگ ہستی ہے جو بہت نیک کار ہیں)

اور اسی طرح معصیت کو بھی ظاہر فرماتا ہے روایت میں آتا ہے "بیشک اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کی طرف وحی کی" اے موسیٰ بنی اسرائیل کو کہہ دو وہ جو عمل (معصیت کے) مخفی طور پر کرتے ہیں میں ان کو ظاہر کر دیتا ہوں۔

قابل توجہ: قرآن پاک کے اکثر مقامات پر ذکر خاص اور مراد عام ہوتا ہے۔ لیکن اس مقام پر ذکر عام ہے جو عام کو بھی اگرچہ شامل ہے ﴿ مَا كُنتُمْ تَكْتُمُونَ ﴾ یتناول کل المکتومات ثم ان الله تعالیٰ اراد هذه الواقعة" یعنی ﴿ مَا كُنتُمْ تَكْتُمُونَ ﴾ میں ہر چھپی ہوئی چیز کا ذکر ہے کہ "اللہ تعالیٰ ظاہر فرمانے والا جو کچھ بھی تم چھپاتے ہو۔ لیکن پھر اس سے مراد خاص ان کے قتل کا واقعہ لے لیا۔

(از کبیر)

☆☆☆☆☆

﴿ فَقُلْنَا اضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا كَذَالِكَ يُحْيِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى وَيُرِيْكُمْ آيَاتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴾ (آیت ۷۳)

۱) ''تو ہم نے فرمایا اس مقتول کو اس گائے کا ایک ٹکڑا مارو اللہ یوں ہی مردے جلائے گا اور تمہیں اپنی نشانیاں دکھاتا ہے کہ کہیں تمہیں عقل ہو''

۲) ''تو ہم نے کہا مارو اس کو (مقتول کو) اس کا (گائے کا) بعض حصہ۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ مردوں کو زندہ کرے گا اور دکھاتا ہے تمہیں اپنی نشانیاں تاکہ تمہیں عقل آجائے۔

﴿ فَقُلْنَا اضْرِبُوْهُ ﴾ : کا عطف ہے '' واذ قتلتم نفسا فادارأتم '' پر اور درمیان میں جملہ معترضہ ہے۔

﴿ بِبَعْضِهَا ﴾ : سے مراد گائے کا کون سا حصہ ہے؟ اگرچہ اس میں کئی اقوال ہیں لیکن صحیح یہی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے مطلق ذکر کیا ہے تو اس کو اپنے اطلاق پر رہنے دیا جائے۔

مطلب یہ ہوا کہ جب تم نے ایک مقتول کے متعلق جھگڑا کیا کہ اس کا قاتل کون ہے اور ہر ایک دوسرے پر الزام لگانے لگا تو ہم نے کہا اس مقتول کو گائے ذبح کر کے اس کے گوشت کا کوئی ٹکڑا لے کر مقتول کے جسم کے کسی حصہ پر مار دو تو وہ زندہ ہو جائے گا۔

﴿ كَذٰلِكَ يُحْيِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى ﴾ : ''اسی طرح اللہ مردوں کو زندہ کرے گا'' رب تعالیٰ کے حکم کے مطابق جب انہوں نے عمل کر لیا '' فضربوه فحيي '' کہ انہوں نے گائے ذبح کر کے اس کا گوشت مقتول کو مارا تو وہ زندہ ہو گیا اس نے بتایا مجھے کس نے قتل کیا ہے پھر وہ مردہ حالت میں ہو گیا۔ اس عجیب اور انوکھے انداز سے رب تعالیٰ نے ان کے سامنے اور ان کے فعل سے مردہ کو زندہ کیا جس میں ان کو یہ کہنے کی جرات بھی نہ ہو سکی کہ یہ موسیٰ علیہ السلام کا جادو ہے۔

تو رب تعالیٰ نے اس واقعہ سے ان لوگوں کو اور قیامت تک آنیوالے لوگوں کو اپنی قدرت اور قیامت قائم ہونے کے متعلق بتا دیا ﴿ كَذٰلِكَ يُحْيِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى ﴾ ای جميعا يوم القيامة '' کہ

قیامت کے دن اللہ تعالیٰ تمام مردوں کو اسی طرح زندہ فرمادے گا جس طرح اس مردہ کو تمہارے سامنے (اے بنی اسرائیل) زندہ کر دیا، اور بعد میں آنے والو جب تمہیں قطعی اور یقینی خبروں سے معلوم ہو جائے گا تو تم بھی سمجھ لو کہ قیامت ضرور آنی ہے۔ اور رب تعالیٰ کی قدرت سے بعید نہیں کہ وہ تمام مردوں کو زندہ کر دے۔ (از شیخ زادہ)

﴿لَعَلَّکُمْ تَعْقِلُوْنَ﴾: لکی یکمل عقلکم، تاکہ تمہیں کامل عقل حاصل ہو جائے اس واقعہ کا بھی تمہیں یقین ہو جائے اور قیامت کے قائم ہونے اور تمام مردوں کے زندہ ہونے کا بھی تمہیں پتہ چل جائے۔ (از بیضاوی)

فائدہ جلیلہ : اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کے دلوں میں ڈال دیا کہ وہ سوال کرتے رہیں اور ان کو جواب دیئے جاتے رہیں اس طرح ان کے لئے اس قسم کی گائے عام لوگوں سے حاصل ہونی اور عام قیمت پر مشکل ہوگئی۔

☆ اللہ تعالیٰ نے ابتدائی طور پر ہی اسے زندہ نہیں فرمایا تاکہ بہت سے فوائد حاصل ہو جائیں۔

☆ اس واقعہ سے ایک تو یہ حاصل ہوا کہ رب تعالیٰ کی راہ میں قربانی کرنا اللہ تعالیٰ کے تقرب کا ذریعہ ہے اور اس کی خوشنودی حاصل ہوتی ہے۔

☆ اور واجب کے ادا کرنے کی ترغیب دلائی گئی کہ ان لوگوں کو جو حکم دیا گیا تھا وہ اس پر عمل کریں۔ اگرچہ انہوں نے عمل کرنے میں کچھ دیر کی لیکن آخر کار عمل کر لیا۔

☆ اور اس میں یتیم کا نفع بھی تھا کہ ان لوگوں نے سوال کر کے اپنے لئے مشکل پیدا کر لی۔ بہت بھاری قیمت ادا کر کے وہ گائے حاصل کی، کیونکہ وہ گائے نیک شخص کے یتیم بچے سے ملی اور وہ سارا مالی فائدہ اسے حاصل ہوا۔

☆ اور اس واقعہ سے یہ فائدہ بھی حاصل ہوا کہ اللہ تعالیٰ پر توکل رکھنے میں برکت ہوتی ہے لوگ عام طور پر جانوروں کو اکیلے جنگل میں نہیں چھوڑتے کیونکہ درندوں کا خطرہ ہوتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ کے نیک بندے نے اسی کی ذات پر بھروسہ کرتے ہوئے اپنی بچھڑی کو جنگل میں چھوڑ دیا رب تعالیٰ نے بھی اسے اپنی حفاظت میں رکھا۔

☆ اور پتہ چلا کہ بزرگوں کا طریقہ چلا آرہا ہے کہ وہ اپنی اولاد سے شفقت کرتے تھے اپنے بچے پر شفقت کرتے ہوئے تو اس نیک بندے نے اپنی بچھڑی کو رب تعالیٰ کی حفاظت میں دے دیا تھا۔

☆ جو شخص اللہ تعالیٰ سے کسی چیز کو طلب کرنا چاہتا ہے تو اسے چاہئے کہ وہ اس واقعہ سے سبق حاصل کرتے ہوئے پہلے قربانی کرے، اور جس جانور کو قربانی کرے وہ اچھا خوبصورت اور قیمتی ہو، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بہت خوبصورت، موٹی تازی اونٹنی تین سو دینار سے خریدی اور قربانی کی۔

☆ اسی واقعہ سے یہ فائدہ حاصل ہوا کہ مؤثر حقیقی ممکنات میں صرف اللہ تعالیٰ ہے ظاہری اسباب صرف علامات ہیں ان میں ذاتی طور پر کوئی اثر نہیں۔ ہاں رب تعالیٰ جس چیز میں جو تاثیر رکھ دے وہی اس میں پائی جائے گی۔ بھلا یہ بات کس کے عقل میں آسکتی ہے کہ مردہ جانور کے گوشت سے مردہ زندہ ہو جائے؟ صرف اور صرف رب تعالیٰ کی قدرت سے اس میں یہ تاثیر پیدا ہوئی۔

☆ اس واقعہ سے اس بات پر متنبہ کیا گیا ہے کہ جو شخص یہ چاہے کہ اسے اپنے سب سے بڑے دشمن یعنی اس کو حقیقی موت دینے والے کا پتہ چل جائے، وہ اس کا دشمن جو اس کے دل کو مردہ کر کے ایمان سے دور کرنے والا اور حق اعتقاد سے دور کرنے والا ہے تو اسے چاہئے کہ وہ اپنے حیوانی نفس جو گائے کی طرح ہے جس کی زندگی خواہشات پر مبنی ہے اسے ریاضت کی چھری سے ذبح کرے۔

وہ نفس حیوانی بچپن کی حرص وخواہشات نہ رکھتا ہو، کیونکہ ان پر مؤاخذہ نہیں اور اس نفس حیوانی میں بڑھاپا بھی نہ ہو کیونکہ بڑھاپے میں خود بخود سستی آجاتی ہے خواہشات کی شدت ختم ہو جاتی ہے۔ اسے ذبح کرنے کی بھی ضرورت نہیں رہتی، اس لئے ضروری ہے کہ نفس حیوانی کی جوان گائے جس میں ہر طرح کی شوخی پائی جاتی ہے ہر طرح کی خواہشات پائی جاتی ہیں اسے ریاضت کی چھری سے ذبح کر دے۔ اور اس کا اثر جب دل کو پہنچے گا تو وہ زندہ ہو جائے گا خود بتادے گا میرا قاتل شیطان ہے۔ میرا قاتل اسلام سے دور ہے۔ میرا قاتل محبت مصطفیٰ کریم ﷺ سے دور ہوتا ہے۔

(ماخوذ از بیضاوی وشیخ زادہ بتصرف)

تنبیہ: ایک روایت میں ذکر ہے کہ اس آدمی کے قتل اور گائے کے ملنے اور ذبح کرنے اور مردہ کو زندہ کرنے میں چالیس سال گزر گئے لیکن علامہ رازی رحمہ اللہ نے اسے رد فرمایا:

" ان ھذہ الروایة علی خلاف ظاھر القرآن ، لان الفاء فی قوله تعالٰی ۞ فقلنا اضربوه ببعضها ۞ للتعقیب "

کہ یہ روایت قرآن پاک کے ظاہر کے خلاف ہے کیونکہ اسمیں " فاء " جو " فقلنا " میں آرہی ہے وہ تعقیب کے لئے جو زیادہ وقفہ کا تقاضا نہیں کرتی۔ اس لئے ان کے سوالات اور رب تعالٰی کی طرف سے جوابات اور گائے کو حاصل کر لینے میں زیادہ وقت نہیں گزرا۔ البتہ تین دونوں کا ذکر خازن وغیرہ میں ملتا ہے کہ بچہ گائے کو جنگل سے لا رہا تھا تو راستے میں ایک فرشتہ انسانی شکل میں خریدار کی حیثیت سے ملا تو بچے نے کہا میں والدہ کی اجازت کے بغیر نہیں فروخت کر سکتا۔ تین دن تک جنگل میں چرانے کے لئے لے جانے اور واپس لانے کے دوران وہ ملتا رہا، اسی نے بچے کو بتایا کہ اس کی اتنی قیمت وصول کرنا۔ (واللہ اعلم بالصواب)

طلباء کرام کی توجہ کے لئے: " اضربوه " میں منصوب متصل کی ضمیر نفس کی طرف لوٹ رہی ہے۔ اگر چہ وہ مؤنث ہے لیکن وہ " شخص " کا معنی دے رہا ہے جو مذکر ہے لہذا مذکر کی ضمیر کا لوٹانا درست ہے۔ ہر وہ لفظ جس میں دو حیثیتیں ہوں اس کا یہی قانون ہے کہ اس پر تذکیر والے احکام جاری کریں یا تانیث والے دونوں ہی جائز ہیں۔ (از کبیر)

نیک باپ کا بچہ بھی نیک تھا: وہ بچہ اپنی ماں کا بڑا فرمانبردار تھا، جب اسے گائے کے بدلہ میں بہت مال و دولت حاصل ہوا تو اس کے باوجود اس کے نیک ہونے میں کوئی فرق نہیں آیا۔ وہ رات کا تہائی حصہ نماز اور عبادت میں گزارتا اور رات کا تہائی حصہ سونے میں گزارتا، اور رات کا تہائی حصہ اپنی والدہ کی خدمت گزاری میں رہتا۔

گائے کے فروخت کرنے سے پہلے وہ چھوٹا بچہ ہونے کے باوجود جنگل سے لکڑیاں لا کر بازار میں بیچتا جس کی آمدنی کا تہائی حصہ اللہ تعالٰی کی راہ میں خرچ کرتا۔ اور تہائی حصہ اپنی والدہ کو عطا کرتا اور

تہائی حصہ اپنے خرچ کے لئے رکھ لیتا۔

ایک دن اس کی والدہ نے اسے بتایا کہ تمہارا باپ جنگل میں ایک بچھڑی چھوڑ آیا تھا اب تو وہ گائے بن ہوگی اسے تلاش کرو اگر مل جائے تو لے آؤ (باقی واقعہ پہلے گزر گیا)۔ (از صیح زادہ)

اعتراض : اس واقعہ میں ایک نشانی پائی گئی ہے کہ مردہ کو زندہ کر دیا گیا۔لیکن ﴿ ویریکم آیاتہ ﴾ میں ''آیات'' کو جمع ذکر کیا گیا ہے یہ کیسے درست ہے؟

جواب : بظاہر یہ ایک نشانی ہے لیکن حقیقت میں کئی نشانیوں کو مستلزم ہے اس لئے کہ اس واقعہ سے یہ سمجھ آیا کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت میں تمام چیزیں ہیں۔جس نے اپنی قدرت کاملہ سے مردہ جانور کے گوشت سے مقتول کو زندہ کیا۔اور یہ ثابت ہوا کہ تمام معلومات اللہ تعالیٰ کے علم میں ہیں،کہ اس نے گائے میں جتنی علامات بیان فرمائیں ان علامات والی گائے مل گئی اور جیسا بتایا کہ اس کے گوشت سے مقتول زندہ ہوگا ایسا ہی ہوا۔اور پتہ چلا کہ اللہ تعالیٰ کسی چیز کو موجود کرنے اور پیدا کرنے میں مختار ہے۔

اور اسی واقعہ سے موسیٰ علیہ السلام کی صداقت کا پتہ چلا کہ آپ نے اللہ تعالیٰ کے احکام جو پہنچائے وہ اسی طرح ثابت ہوئے ان میں ذرا بھر بھی فرق نہیں آیا۔اور جو لوگ قاتل نہیں تھے لیکن ان پر قتل کی تہمت لگائی جا رہی تھی اللہ تعالیٰ نے ان کو بری الذمہ قرار دیا۔ (از کبیر)

اعتراض : وہ لوگ تو پہلے سے ہی عقل مند تھے اسی لئے تو بار بار سوال کر رہے تھے ان کے سوالات ان کی عقل مندی پر دلالت کر رہے ہیں وہ دیوانے پاگل نہیں تھے کسی عاقل کو تو یہ نہیں کہا جا سکتا:

''انی عرضت علیک الآیۃ الفلانیۃ لکی تصیر عاقلا''

بیشک میں تم پر یہ نشانی پیش کر رہا ہوں تا کہ تم عاقل ہو جاؤ۔

﴿ وَيُرِيكُمْ آيَاتِهِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ ﴾

''وہ تمہیں دکھاتا ہے اپنی نشانیاں تا کہ تم عقل حاصل کرو'' کا کیا مطلب ہے؟

جواب: یہ الفاظ ظاہر پر مبنی نہیں بلکہ ان کی تاویل کی گئی ہے ایک یہ ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے

" لعلکم تعملون علی قضیة عقولکم " تاکہ تمہیں تمہاری عقلوں کے فیصلہ کے مطابق علم حاصل ہو جائے کہ وہ ذات جسے ایک مردہ کو زندہ کرنے کی قدرت حاصل ہے اسے تمام مردوں کو زندہ کرنے کی قدرت حاصل ہے جب تمہیں یہ علم حاصل ہوگا تو تمہیں قیامت کا یقین بھی حاصل ہوگا۔ (کبیر)

علامہ بیضاوی رحمہ اللہ نے کمال عقل سے تفسیر کی۔ اسکی وجہ بھی اس اعتراض کو دور کرنا مقصود تھا کہ ان کو اگر چہ عقل حاصل تھی لیکن کامل عقل حاصل نہیں تھی۔ راقم کے نزدیک یہ الفاظ اپنے ظاہر پر ہیں گویا کہ بنی اسرائیل کو ان کی کجرویوں (ٹیڑھی چالوں) کی وجہ سے جانوروں کی طرح بے عقل کہا گیا کہ تم ہو تو بے عقل لیکن اللہ تعالیٰ تمہیں اپنی نشانیاں دکھاتا ہے تاکہ تمہیں عقل آ جائے۔

مسئلہ: ہماری شریعت میں جب کوئی شخص اپنے موروث لہ (جس کا اس نے وارث بننا ہے) کو قتل کردے تو وہ اس کا وارث نہیں بن سکتا۔ بنی اسرائیل میں جس شخص نے قتل کیا تھا کیا وہ وراثت کا حقدار تھا یا نہیں؟ اور اس قاتل کو وراثت دی گئی یا نہیں۔

صحیح یہ ہے کہ وہ وراثت کا حقدار تو تھا اسی لئے اس نے اپنے موروث لہ کو قتل کیا تھا۔ لیکن اس کا وراثت سے محروم ہونا صراحۃً کہیں ذکر نہیں۔ اور یہ بھی واضح ہے کہ ایک شریعت کا مسئلہ دوسری شریعت میں ثابت کرنا مشکل کام ہے۔ (از کبیر)

مسئلہ قسامت: ہماری شریعت میں قانون یہ ہے کہ اگر کوئی شخص مقتول کسی محلہ کی گلی وغیرہ مین پایا جائے لاش اس کی کسی گھر میں نہ ہو اس کے قاتل کا پتہ نہ چل رہا ہو۔ تو محلہ کے پچاس آدمیوں سے قسم لی جائے۔ ان پچاس آدمیوں سے قسم لی جائے گی جن کو مقتول کا ولی منتخب کرے گا۔ وہ قسم اٹھائیں:

" باللہ ما قتلناہ ولا علمنالہ قاتلا "

قسم ہے اللہ تعالیٰ کی نہ ہم نے اس شخص کو قتل کیا اور نہ ہی ہمیں علم ہے کہ اکا قاتل کون ہے

جب پچاس آدمی قسم اٹھالیں تو تمام اہل محلہ کے عاقلہ (ان کے پدری رشتہ دار اور ان کے ہر شعبہ کے ساتھی) پر دیت لازم آ جائے گی۔

سعید ابن مسیب ؓ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے یہود کے پچاس آدمیوں سے قسم لی تھی جب

مقتول ان کے محلّہ میں پایا گیا تھا ان کے قسم اٹھالینے کے بعد ان تمام پر دیت مقرر فرمادی۔

(روہ مسند بزار)

خیال رہے کہ مقتول کے ولی سے قسم طلب نہیں کی جائے گی، کیونکہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے جو آپ نے دوران خطبہ فرمایا:

" البینة علی المدعی والیمین علی المدعی علیه " (رواه الترمذی)

مدعی پر گواہ لازم ہیں اور مدعی علیہ پر قسم۔

اور یہ بھی خیال رہے کہ جن پچاس آدمیوں کو قسم کے لئے ولی نے منتخب کیا تھا۔ اگر ان میں سے کوئی ایک قسم اٹھانے سے انکار کردے تو اسے قید کرلیا جائے جب تک وہ قسم نہ اٹھائے اسے نہ چھوڑا جائے۔ اور یہ بھی خیال رکھیں کہ اگر محلّہ کی آبادی کم ہو۔ پچاس مرد پورے نہیں ہو رہے، بلکہ تھوڑے ہیں تو ان سے قسم اتنی مرتبہ لیں کہ اس سے قسم کی تعداد پچاس مرتبہ مکمل کرلی جائے۔ کیونکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ قسم لی لیکن آدمی انچاس تھے، تو آپ نے ایک شخص سے دو مرتبہ قسم لے لی تھی، اس طرح تعداد پچاس ہوگئی تھی۔

اور یہ بھی خیال رہے قسم صرف عقل مند مردوں سے لی جائے گی، مجنونوں (پاگلوں) سے نہیں لی جائے گی اور عورتوں اور بچوں سے بھی قسم نہیں لی جائے گی۔ (از هدایة)

مختصر اور ضرورت کے مطابق مسئلہ بیان کردیا ہے زیادہ تفصیل فقہ کی کتب میں دیکھی جائے۔

☆☆☆☆☆

﴿ ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُکُمْ مِنْ بَعْدِ ذٰلِکَ فَهِیَ کَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً وَاِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا یَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْاَنْهٰرُ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا یَشَّقَّقُ فَیَخْرُجُ مِنْهُ الْمَاءُ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا یَهْبِطُ مِنْ خَشْیَةِ اللّٰهِ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴾ (آیت ۷۴)

۱) ’’پھر اس کے بعد تمہارے دل سخت ہو گئے تو وہ پتھروں کی مثل ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ کرے۔ اور پتھروں میں تو کچھ وہ ہیں جن سے ندیاں بہہ نکلتی ہیں۔ اور کچھ وہ ہیں جو پھٹ جاتے ہیں تو ان سے پانی نکلتا ہے اور کچھ وہ ہیں جو اللہ کے ڈر سے گر پڑتے ہیں اور اللہ تمہارے کوتکوں سے بے خبر نہیں‘‘۔

۲) ’’پھر سخت ہو گئے دل تمہارے، اس کے بعد، تو وہ پتھروں کی طرح ہیں بلکہ (ان سے) زیادہ سخت۔ اور بیشک بعض پتھر وہ ہیں کہ جاری ہوتی ہیں ان سی نہریں۔ اور بیشک ان سے بعض وہ ہیں جو پھٹ پڑتے ہیں تو نکلتا ہے ان سے پانی۔ اور بیشک بعض ان سے وہ ہیں جو گر پڑتے ہیں اللہ کے ڈر سے، اور نہیں ہے اللہ غافل اس سے جو تم عمل کرتے ہو‘‘۔

﴿ ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُکُمْ ﴾ : القسوۃ کا معنی صلابت (سختی) شدت، خشک ہونا۔ یہاں مراد یہ ہے کہ تمہارے دل اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے اور اللہ تعالیٰ کی آیات پر یقین رکھنے سے خالی ہو گئے۔ ﴿ قُلُوْبُکُمْ ﴾ میں خطاب کسے ہے؟ ابوالعالیہ اور قتادہ وغیرہ نے بیان کیا ہے کہ یہ خطاب تمام بنی اسرائیل کو ہے کیونکہ سب کا طریقہ یہی تھا آج توبہ کرنا، کل پھر جانا۔

" وقال ابن عباس المراد قلوب ورثة القتيل لانهم حين حيي واخبر بقاتله وعاد الى موته انكروا قتله وقالوا كذب "

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ یہ خطاب مقتول کے ورثاء کو ہے۔ کیونکہ جب وہ زندہ ہوا اور اس نے اپنے قاتل بتائے، پھر وہ فوت ہو گیا، تو وہ کہنے

لئے کہ ہم نے قتل نہیں کیا ہے اس نے جھوٹ بولا ہے۔

﴿ مِنۡ بَعۡدِ ذٰلِکَ ﴾: یہ واقعہ دیکھنے کے بعد جو اللہ تعالیٰ کی قدرت کی عظیم نشانی تھی پھر ان کا انکار کرنا یقینا سخت دلی کی وجہ سے تھا، رب تعالیٰ نے فرمایا کہ تمہارے دل تو پتھر کی طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ سخت ہو گئے۔ یقیناً ان سے بڑھ کر کوئی دل کا اندھا نہیں ہو سکتا۔ ان سے بڑھ کر اپنے برے اعمال کی وجہ نبی کی تکذیب کرنے والا کوئی نہیں ہو سکتا۔

فائدہ:

☆ "عن عبد الله بن عمر قال قال رسول الله ﷺ لا تكثروا الكلام بغير ذكر الله فان كثرة الكلام بغير ذكر الله قسوة للقلب و ان ابعد الناس من الله القلب القاسي" (رواہ الترمذی)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ کے ذکر کے بغیر زیادہ کلام نہ کرو، کیونکہ اللہ کے ذکر کے بغیر زیادہ کلام کرنا دل کو سخت کرتا ہے اور سب لوگوں سے اللہ تعالیٰ سے دور ہونے والا وہی شخص ہے جس کا دل سخت ہو۔

☆ "عن انس قال قال رسول الله ﷺ اربعة من الشقاء جمود العين و قساء القلب وطول الأمل والحرص على الدنيا" (مسند بزار)

حضرت انس رضی اللہ عنہ نے فرمایا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا چار چیزیں بدبختی کا ذریعہ ہیں آنکھوں کا خشک ہو جانا (اللہ کے ڈر سے کبھی آنسو نہ آئیں) اور دل کا سخت ہونا اور لمبی امیدیں رکھنا، اور دنیا پر حرص رکھنا۔ (از قرطبی)

﴿ فَهِیَ کَالۡحِجَارَةِ ﴾: "تو وہ پتھروں کی طرح ہیں" ان کے دلوں کو پتھروں سے تشبیہ دی گئی ہے لوہے سے تشبیہ نہیں دی اس لئے کہ لوہا پگھل جاتا ہے اس میں کچھ نرمی ہوتی ہے۔ لیکن ان کے دل تو مکمل طور پر نرمی سے خالی تھے۔ (تیسیر الرحمن)

قساوۃ کا ذکر کب ہوتا ہے؟ ہر وہ چیز جو اصل کے لحاظ سے کسی چیز کے اثر کو قبول کرے اسے "قابل" کہا جاتا ہے کہ یہ اثر کو قبول کرنے والی چیز ہے۔ جب کوئی چیز اسے عارض ہو جائے، جس

کی وجہ سے اس میں اثر کے قبول کرنے کی صلاحیت ختم ہو جائے تو اس کو ''قاسی'' کہا جاتا ہے: ''انــه صــار صـلبـا غليظا قـاسيـا'' کہ بیشک یہ بہت سخت ہو گیا۔ اب یہ ''قابل'' نہیں رہا بلکہ اس میں صلابت اور غلظۃ اور قساوۃ آ گئی۔

جسم بحیثیت جسم غیر کے اثر کو قبول کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے لیکن جب اس کو صفت حجریۃ (پتھر ہونے کی صفت) عارض آ جائے۔ تو حجر کا جسم قابل نہیں رہتا قاسی (سخت) ہو جاتا ہے۔

اسی طرح دل کی شان یہ ہے کہ وہ دلائل اور آیات اور عبرت آموز نصائح کے اثر کو قبول کرتا ہے جس کی وجہ سے وہ سرکشی، نافرمانی، تکبر کو چھوڑ دیتا ہے اور طاعت کو ظاہر کرتا ہے، اور اللہ تعالیٰ کے حضور جھک جاتا ہے اور اللہ کا خوف اسے لاحق ہوتا ہے۔

'' فاذا عرض للقلب عارض اخرجه عن هذه الصفة صارفی عدم التاثر شبيها بالحجر فيقال قسا القلب و غلظ ''

لیکن دل کو بھی جو عوارضات لاحق ہو جاتے ہیں تو اسے اپنی اصلی صفات سے نکال دیتے ہیں تو وہ دل تاثیر کو نہ قبول کرنے کی وجہ سے ''قساوۃ اور غلظۃ'' سے متصف ہو جاتا ہے یعنی اس وقت کہا جاتا ہے کہ فلاں کا دل بہت سخت ہو گیا۔

'' قساوة '' کا مقابل ''رقة ''(نرم ہونا) ہے۔ اسی لئے رب تعالیٰ نے مومنوں کی شان بیان کرتے ہوئے فرمایا:

﴿ اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِيْثِ كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِيَ تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُوْدُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ ثُمَّ تَلِيْنُ جُلُوْدُهُمْ وَقُلُوْبُهُمْ اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ ﴾ (پ ۲۳ ع ۱۶)

''اللہ نے اتاری سب سے اچھی کتاب کہ اول سے آخر تک ایک سی ہے دوہرے بیان والی اس سے بال کھڑے ہوتے ہیں ان کے بدن پر جو اپنے رب سے ڈرتے ہیں پھر ان کی کھالیں اور دل نرم پڑتے ہیں یاد خدا کی طرف رغبت کرتے ہیں''۔ (ماخوذ از کبیر)

﴿ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً ﴾: ''بلکہ ان سے زیادہ سخت) یعنی تمہارے دل پتھروں کی طرح سخت ہو گئے بلکہ پتھروں سے بھی زیادہ سخت ہو گئے کیونکہ پتھروں سے تو نہریں جاری ہوتی ہیں پتھروں سے تو چشمے جاری

ہوتی ہیں۔ پتھر تو اللہ تعالیٰ کی خشیت سے نیچے گر پڑتے ہیں لیکن تمہارے دلوں پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔

﴿اَوْ﴾: عام طور پر شک کے لئے آتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ کا کلام شک سے پاک ہے اس لئے یہاں شک کا معنی نہیں۔ اس لئے یہاں کئی احتمال ہیں کہ ''او'' کا معنی کون سا لیا جائے۔

(۱) اس میں ایک وجہ یہ ہے کہ (او) بمعنی (واو) کے عام طور پر آتا رہتا ہے۔ قرآن پاک میں کئی جگہ یہی معنی مراد لیا گیا ہے: ﴿ الی مِائَةَ اَلْفٍ اَوْ یَزِیْدُوْنَ ﴾ میں اور ﴿ وَلَا یُبْدِیْنَ زِیْنَتَهُنَّ اِلَّا لِبُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ آبَائِهِنَّ ﴾ میں اور ﴿ اَنْ تَاْكُلُوْا مِنْ بُیُوْتِكُمْ اَوْ بُیُوْتِ آبَائِكُمْ ﴾ میں اور ﴿لَعَلَّهٗ یَتَذَكَّرُ اَوْ یَخْشٰی ﴾ میں اور ﴿ فَالْمُلْقِیَاتِ ذِكْرًا عُذْرًا اَوْ نُذْرًا ﴾ میں "او "واو'' کے معنی میں استعمال ہے۔ اس لحاظ پر معنی یہ ہوگا پھر سخت ہو گئے تمہارے دل اس کے بعد، تو وہ پتھر کی طرح ہیں اور اس سے بھی سخت۔

احمقوں کی جنت میں بسنے والے: راقم نے اپنے ایک رسالہ (ایصال ثواب مستحب ہے) میں مستحب کی تعریف میں ایک جگہ درمختار اور شامی کی عبارت میں ''او'' کا معنی اور کیا ہے، تو ایک سر پھرا شخص مجھے کہنا لگا تم نے ''او'' کا معنی ''یا'' نہیں کیا ''اور'' کیا ہے جو غلط ہے غلط معنی کر کے تم نے اپنا مطلب نکال لیا ہے۔ میں نے کہا جس کو پتہ ہی نہ ہو ''واو'' کے کون کون سے معانی ہیں اور اسے یہ پتہ نہ ہو کہ ''او'' کے کون کون سے معانی ہیں اسے دین کا کیا پتہ ''واو'' کا معنی صرف ''اور'' اور ''او'' کا معنی صرف ''یا'' یاد کرنے سے علامہ بن بیٹھے۔

(۲) کبھی کسی چیز کو معین کرنا مقصود نہ ہو بلکہ مقصد فعل کا بیان ہو تو وہاں ''او'' ذکر کرتے ہیں۔ جیسے کوئی کہے " اکلت خبزا او تمرا " میں نے روٹی کھائی یا کھجور۔ مقصد یہ ہے کہ میں نے کچھ نہ کچھ کھایا ہوا ہے مجھے کھانے کی حاجت نہیں یہ بیان کرنا مقصود نہیں کہ میں نے کیا کھایا ہے۔ اس صورت میں ''او'' کا معنی ''یا'' ہوگا لیکن وہ شک پر دلالت نہیں کرے گا۔

(۳) تیسرا احتمال یہ ہے کہ ''او'' تنویع پر دلالت کر رہا ہے۔ مطلب اس کا یہ ہے تمہارے دل پتھر کی طرح ہیں بعض ان میں سے اور ہی زیادہ سخت ہیں۔ یہاں ''او'' کا معنی ''یا'' نہیں کیا جائے گا بلکہ معنی

ہوگا اور ''ان سے بعض''۔

(۴) اس کلام کی نسبت بندوں کی طرف ہے یعنی جب وہ ان کے دلوں کے حال کی طرف توجہ کریں گے اور اس پر مطلع ہوں گے تو کہیں گے ''تمہارے دل تو پتھروں کی طرح ہیں یا اس سے بھی سخت'' یہاں ''او'' کا معنی ''یا'' ہوگا شک والا معنی بھی ممکن ہوگا۔ کیونکہ لوگوں کا شک کرنا منع نہیں۔

(۵) جس طرح کہا جاتا ہے " لا آکل الا حلوا او حامضا " میں نہیں کھاتا سوائے میٹھے یا ترش کے مطلب اس کا یہ ہوتا ہے کہ میرا طعام صرف دو ہی قسم کا ہے میٹھا یا ترش۔ اسی طرح یہاں مطلب یہ ہوگا کہ تمہارے دل کی قساوت (سختی) ان دو قسموں سے باہر نہیں وہ یہ کہ تمہارے دلوں کی سختی پتھروں کی طرح ہے یا اس سے بھی زیادہ۔ اگرچہ یہاں ''او'' کا معنی ''یا'' کرنا صحیح ہے لیکن شک والا معنی نہیں۔

(۶) کبھی ''او'' اباحت کے لئے آتا ہے جیسا کہ کہا جائے " جالس الحسن او ابن سیرین " حسن کے ساتھ بیٹھو یا ابن سیرین کے ساتھ بیٹھو۔ یا دونوں کے ساتھ بیٹھو درست ہے تمہیں اجازت ہے۔ اس صورت کے لحاظ پر مطلب یہ ہوگا کہ تمہارے دل پتھروں کی طرح سخت ہیں۔ یا ان سے بھی زیادہ سخت مطلب یہ ہے کہ تشبیہ دینے والے کو اختیار ہے چاہے تو تمہارے دلوں کو پتھروں سے تشبیہ دے چاہے تو اس سے زیادہ سخت چیز سے تشبیہ دے چاہے تو دونوں سے تشبیہ دے۔

(۷) ان کـلـمـة " او " بمعنی بل۔ اور اس میں یہ صورت پائی جاتی ہے کہ ''او'' بل کے معنی میں استعمال ہوتا ہے جس کا معنی ہوتا ہے ''بلکہ'' (ماخوذ از کبیر)

اعلیٰ حضرت نے یہی معنی کیا ہے یہی سب سے زیادہ آسان اور معتبر ہے راقم نے بھی وہی نقل کیا ہے۔

﴿ وَاِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا یَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْاَنْهٰرُ ﴾ : اور بیشک بعض پتھر وہ ہیں جن سے نہریں جاری ہوتی ہیں " التفجر التفتح بالسعة والکثرة " کسی چیز کا وسعت اور کثرت سے کھل جانا " تـفـجـر " کہلاتا ہے۔ یعنی بعض پتھر کثیر مقدار میں پھٹ جاتے ہیں ان سے کثیر پانی نہروں کی صورت میں نکلتا ہے۔

﴿ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا یَشَّقَّقُ فَیَخْرُجُ مِنْهُ الْمَآءُ ﴾ : ''اور بیشک بعض ان سے پھٹ

جاتے ہیں تو ان سے پانی نکلتا ہے"۔ مراد اس سے یہ ہے " فیخرج منه الماء فیکون عینا لا نهرا جاریا " کہ بعض پتھر پھٹ جاتے ہیں ان سے پانی اگر چہ نہر کی صورت میں تو نہیں نکلتا لیکن چشمہ کی صورت میں نکلتا ہے۔

﴿ وَاِنَّ مِنۡهَا لَمَا یَهۡبِطُ مِنۡ خَشۡیَةِ اللّٰهِ ﴾ : "اور بیشک بعض ان سے وہ ہیں جو گر پڑتے ہیں اللہ تعالیٰ کے ڈر کی وجہ سے"۔

پتھر کیسے ڈرتے ہیں؟ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ پتھروں میں نہ حیات ہے نہ ادراک ہے اور نہ ہی عقل ہے تو ان کا ڈرنا کیسے ثابت ہے معتزلہ کا مذہب بھی یہی ہے۔ تو اس کا جواب یہ ہے۔

" ان الله تعالیٰ خلق فیه الحیاۃ و العقل و الادراک وهذا غیر مستبعد فی قدرۃ الله "

بیشک پتھروں میں، اسی طرح اور کئی چیزوں میں حیات اور عقل بظاہر نہیں ہوتی، لیکن اللہ تعالیٰ ان میں حیات اور ادراک اور عقل پیدا کر دیتا ہے اللہ تعالیٰ کی قدرت سے کوئی چیز بعید نہیں۔

آیئے چند مثالوں کی طرف توجہ فرمائیں: اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿ وَقَالُوۡا لِجُلُوۡدِهِمۡ لِمَ شَهِدۡتُّمۡ عَلَیۡنَا قَالُوۡۤا اَنۡطَقَنَا اللّٰهُ الَّذِیۡۤ اَنۡطَقَ كُلَّ شَیۡءٍ ﴾

"اور وہ اپنے چمڑوں سے کہیں گے تم نے ہم پر کیوں گواہی دی وہ کہیں گے ہمیں اللہ نے بلوایا جس نے ہر چیز کو بولنے کی قوت عطاء کی"۔

قیامت کے دن انسانوں کے چمڑے ان کے خلاف گواہی دیں گے۔ گواہی تب ہی دیں گے جب ان کو عقل اور بولنے کی طاقت حاصل ہوگی۔ اور وہ کلام کو سن کر جواب دیں گے۔ یہ سب طاقتیں ان کو رب تعالیٰ کی طرف سے حاصل ہوں گی۔

☆ اور ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ لَوۡ اَنۡزَلۡنَا هٰذَا الۡقُرۡاٰنَ عَلٰی جَبَلٍ لَّرَاَیۡتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنۡ خَشۡیَةِ اللّٰهِ ﴾

"اگر ہم یہ قرآن کسی پہاڑ پر اتارتے تو ضرور اسے جھکا ہوا دیکھتا، پاش پاش ہوتا اللہ کے خوف سے"۔

مراد یہ ہے کہ اگر قرآن پاک پہاڑ پر اتارا جاتا تو اسے عقل، فہم اور شعور بھی دیا جاتا وہ عظمت قران کے سامنے جھک جاتا، خشوع کرتا اور خوف الٰہی سے پھٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا۔

☆ " وروی عن النبی ﷺ انه لما اتاه الوحی فی اول المبعث وانصرف النبی ﷺ الی منزله سلمت علیه الاحجار والاشجار فکلها کانت تقول ...... السلام علیک یا رسول الله "

نبی کریم ﷺ سے مروی ہے کہ جب سب سے پہلے بعثت (نبوت کے اعلان کے ارشاد) کے وقت وحی آئی تو آپ جب اپنے گھر تشریف لا رہے تھے تو آپ کو پتھر اور درخت سلام کر رہے تھے اور کہہ رہے تھے " السلام علیک یا رسول الله "

اے انسان ذرا غور تو کر، کیا تجھے پتھروں جیسا عقل و شعور بھی حاصل نہیں، وہ تو اپنے پیارے نبی کریم ﷺ پر سلام بھیجیں اور " السلام علیک یا رسول الله " کہیں اور تو محروم ہی رہے تو بدقسمت ہی رہے اور دوسروں کو بدقسمت بنانے میں ایڑی چوٹی کا زور لگائے۔

" قالوا فغیر ممتنع ان یخلق فی بعض الاحجار عقل وفهم حتی تحصل الخشیة فیه وانکرت المعتزلة "

جو علماء اہل سنت جو محققین اور راسخین فی العلم (علم میں پختگی رکھنے والے) ہیں وہ فرماتے ہیں کہ اس میں کوئی ممانعت نہیں کہ اللہ تعالیٰ بعض پتھروں میں عقل اور فہم پیدا فرما دے اور ان کو رب تعالیٰ کی خشیت حاصل ہو جائے البتہ معتزلہ کا انکار کرتے ہیں۔

(ماخوذ از کبیر)

خیال رہے بدیہی اور قطعی چیزوں کا انکار کرنا معتزلہ اور ان کے یاروں کا کام ہے بہت سے مسائل میں معتزلہ کے ساتھ ملنے والے آج کل بھی ان کے یار موجود ہیں۔

☆ "وفی صحیح مسلم انی لا عرف حجرا بمکة یسلم علی قبل ان ابعث انی لاعرفه الآن "

مسلم شریف میں ہے بیشک میں پہچانتا ہوں اس پتھر کو جو مکہ میں مجھے سلام کرتا تھا میری بعثت سے پہلے بیشک میں اب بھی اسے پہچانتا ہوں۔ (ابن کثیر)

☆ " قال البغوی روی ان النبی ﷺ کان علی ثبیر والکفار یطلبونه فقال الجبل انزل عنی فانی اخاف ان تؤخذ علی فیعاقبنی الله تعالیٰ بذلک وقال له جبل حراء الی یارسول الله "

علامہ بغوی رحمہ اللہ نے بیان فرمایا بیشک نبی کریم ﷺ ثبیر پہاڑ پر تھے، کافر آپ کو تلاش کر رہے تھے، تو پہاڑ نے عرض کیا آپ مجھ سے اتر جائیں، بیشک میں ڈرتا ہوں کہیں میرا مؤاخذہ (پکڑ) نہ ہو جائے مجھے اللہ تعالیٰ اس کی سزا نہ دے حراء پہاڑ نے عرض کیا یا رسول اللہ میری طرف تشریف لے آئیں یا رسول اللہ میری طرف تشریف لے آئیں۔

☆ " وصح عن انس ان رسول اللہ ﷺ طلع لہ احد فقال ھذا جبل یحبنا ونحبہ "

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے صحیح حدیث مروی ہے بیشک رسول اللہ ﷺ نے احد پہاڑ کو دیکھ کر فرمایا یہ پہاڑ ہمارے ساتھ محبت کرتا ہے ہم اس سے محبت کرتے ہیں۔

☆ " وصح عن ابی ھریرۃ قال کان رسول اللہ ﷺ علی حراء وابوبکر وعمر وعثمان وعلی وطلحۃ والزبیر فتحرکت الصخرۃ فقال النبی ﷺ اھدأ فما علیک الا نبی او صدیق او شھید ...... اخرجہ مسلم "

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے صحیح حدیث مروی ہے بیشک رسول اللہ ﷺ اور ابوبکر اور عمر اور عثمان اور علی اور طلحہ اور زبیر حراء پہاڑ پر تھے پہاڑ نے (خوشی سے) حرکت کی تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا ٹھہر جا تجھ پر نہیں سوائے نبی اور صدیق اور شہید کے۔

سبحان اللہ اس حدیث پاک سے جہاں یہ ثابت ہو رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حراء پہاڑ کو عقل وشعور عطا کیا وہاں یہ ثابت ہو رہا ہے کہ علم غیب نبی کریم ﷺ کا معجزہ ہے کیونکہ آپ نے حضرت عمر، اور حضرت عثمان اور حضرت علی اور حضرت طلحہ اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہم کے متعلق فرمایا کہ یہ شہید ہیں تو جیسا آپ نے فرمایا ایسا ہی سب کو شہادت نصیب ہوئی۔

معلوم ہوا کہ نبی کریم ﷺ کو اپنی امت کی وفات کا علم دیا گیا اور آپ کو ان کے اس دنیا سے رخصت ہونے کی وجوہ کا علم بھی دیا گیا کہ کسی نے دنیا سے کیسے جانا ہے۔

☆ " وروی بسندہ عن علی قال کنا مع رسول اللہ ﷺ بمکۃ فرحنا فی نواحیھا خارجا من مکۃ بین الجبال والشجر فلم نمر بشجرۃ ولا جبل الا قال السلام علیک یا رسول اللہ "

حضرت علی ﷺ سے سند صحیح سے مروی ہے کہ ہم ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ مکہ شریف کے اطراف میں درختوں اور پہاڑوں میں سیر کی غرض سے نکلے، ہم کسی درخت اور پہاڑ سے بھی نہیں گزرتے تھے مگر یہ کہ وہ درخت اور پہاڑ حضور کی خدمت میں عرض کرتے...... السلام علیک یا رسول"

انسان کو جھنجوڑتے ہوئے اگر یوں کہا جائے کہ "پتھروں نے تو رسول اللہ ﷺ کو کہا "السلام علیک یا رسول اللہ" اے پتھرا تو بھی عرض کر "السلام علیک یا رسول اللہ" "اے پتھرا" کو ذرا سمجھنا) تو راقم کے خیال میں یہ جملہ بہت خوب رہے گا اگر پتھر سے گھٹیا انسان نہ سمجھے تو اس کی اپنی بدقسمتی۔

☆ "روی بسنده عن جابر بن عبد الله یقول کان النبی ﷺ استند الی جذع نخلة من سواری المسجد فلما صنع له المنبر فاستوی علیه اضطربت تلک الساریة تحن کحنین الناقة حتی سمعها اهل المسجد حتی نزل رسول الله ﷺ فاعتنقها فسکنت"

حضرت جابر بن عبد اللہ ﷺ سے مروی ہے نبی کریم ﷺ مسجد کے ستونوں میں سے ایک ستون سے سہارا لگاتے تھے (جب آپ خطبہ دیتے) جو کہ کھجور کے تنے کا تھا۔ جب نبی کریم ﷺ نے منبر بنوالیا اور آپ نے اس پر (خطبہ کے لئے) بیٹھنا شروع فرمالیا تو وہ ستون بہت پریشان ہوگیا تو اس نے ایسا رونا شروع کر دیا جیسا کہ اونٹنی کی آواز ہوتی ہے۔ تمام مسجد والوں نے اس کی آواز کو سنا۔ نبی کریم ﷺ نے منبر سے اتر کر اسے گلے لگایا تو اسے سکون حاصل ہوا۔

☆ "عن ابی هریرة قال صلی بنا رسول الله ﷺ الصبح ثم اقبل علی الناس بوجهه فقال بینا رجل یسوق بقرة اذ عیی فرکبها فضربها فقالت انا لم نخلق لهذا انما خلقنا لحراثة الارض فقال الناس سبحان الله بقرة تتکلم فقال رسول الله ﷺ فانی او من به وابوبکر وعمر وما هما ثم"

حضرت ابو ہریرہ ﷺ فرماتے ہیں ہمیں رسول اللہ ﷺ نے صبح کی نماز پڑھائی۔ پھر آپ لوگوں کی طرف متوجہ ہوئے آپ نے فرمایا ایک وقت میں ایک شخص گائے کو چلا رہا تھا جب وہ شخص تھک گیا تو گائے پر سوار ہوگیا جب اس نے گائے کو (چلانے کے لئے) مارا تو گائے نے کہا ہمیں اس کے لئے نہیں پیدا کیا گیا ہمیں تو ہل چلانے کے لئے پیدا کیا گیا ہے لوگوں نے (تعجب کرتے ہوئے) کہا "سبحان اللہ" گائے بھی کلام کرتی ہے تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ بیشک میں اور ابوبکر اور عمر اس پر

ایمان رکھتے ہیں حالانکہ وہ دونوں حضرات وہاں موجود نہیں تھے۔ (ماخوذ از مظہری)

اس حدیث پاک سے جہاں گائے کا کلام کرنا، شعور رکھنا ثابت ہو رہا ہے وہاں حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کی فضیلت بھی ثابت ہو رہی ہے کہ ان کی غیر موجودگی میں نبی کریم ﷺ نے ان پر کامل اعتماد کرتے ہوئے فرمایا کہ میں اس پر ایمان رکھتا ہوں تو یہ ہو نہیں سکتا جس کو میں تسلیم کروں اس کو میرے دونوں یار تسلیم نہ کریں "سبحان اللہ" کیا ہی دونوں کا عظیم مقام ہے۔

"قال مجاهد لا ينزل الحجر من اعلى الى اسفل الا من خشية الله تعالىٰ" (مظہری)

حضرت مجاہد فرماتے ہیں کہ جو پتھر بھی اوپر سے نیچے گرتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے خوف سے ہی نیچے گرتا ہے۔

راقم کو بھی یہی قول پسند ہے کہ جو پتھر بھی اوپر سے نیچے گرے اس میں ظاہری سبب کوئی بھی ہو لیکن حقیقی سبب اس میں اللہ تعالیٰ کے خشیت ہی پائی جاتی ہے۔ اسلئے موجودہ زمانہ کے بعض مفسرین کے اس قول سے اتفاق نہیں کہ بعض پتھر تو رب تعالیٰ کی خشیت سے گرتے ہیں۔ اور بعض کے گرنے کی اور وجوہ ہوتی ہیں۔

فائدہ : آیۃ کریمہ میں پتھر کی چار قسموں کا ذکر کیا ایک وہ جو سخت ہوتے ہیں جو بظاہر کوئی اثر قبول نہیں کرتے۔ دوسرے وہ جن سے نہریں جاری ہوتی ہیں۔ تیسرے وہ جن سے چشمے جاری ہوتے ہیں۔ اور چوتھے وہ جو اللہ تعالیٰ کی خشیت سے گر پڑتے ہیں۔

انسانوں کے دل کی بھی چار قسمیں ہیں۔ ایک قسم کے وہ دل ہیں جو نور الٰہی میں مستغرق ہو کر فنا کے درجہ میں پہنچ جاتے ہیں۔ وہ علم کے سمندر میں غرق ہو جاتے ہیں اور فانی ہو جاتے ہیں۔ جب وہ نور الٰہی اور علم میں مستغرق ہو کر فنا ہوتے ہیں تو ان سے معرفت کی نہریں جاری ہوتی ہیں اور سیدھی راہ کے طلب کرنے والے اور فیضان حاصل کرنے کی تمنا کرنے والوں کے قلوب کے لئے حیات کا ذریعہ بنتے ہیں۔ یہ قلوب اہل اللہ اور سابقین کے ہوتے ہیں۔ ان کے مناسب یہ ارشاد ہے ﴿ وَاِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْاَنْهٰرُ ﴾ تقریباً ان میں مشابہت آ گئی۔

دوسرا درجہ قلوب کا یہ ہے کہ وہ علم کے دریا سے سیر ہوتے ہیں اور مخلوق کے نفع کا سبب بنتے ہیں یہ علماء راسخین کے قلوب ہیں۔ ان کو وہ درجہ حاصل ہے کہ ان کے قلوب سے پانی کے چشمے پھوٹ پڑتے ہیں۔ ان کے قلوب کے مناسب رب تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے ﴿ وَاِنَّ مِنۡهَا لَمَا يَشَّقَّقُ فَيَخۡرُجُ مِنۡهُ الۡمَآءُ ﴾.

تیسرا درجہ قلوب کا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کریں اس کے احکام کو تسلیم کریں اور رب تعالیٰ کا خوف ان میں پایا جائے اس خوف سے رب کے حضور وہ سجدہ ریز ہو جائیں۔ اس کے مناسب رب تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے ﴿ وَاِنَّ مِنۡهَا لَمَا يَهۡبِطُ مِنۡ خَشۡيَةِ اللّٰهِ ﴾.

چوتھا درجہ قلوب کا یہ ہے کہ سرکش اور متکبر لوگوں کے قلوب پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ وہ منکر ہی رہتے ہیں ان میں کسی قسم کا خوف نہیں پایا جاتا۔ ان کے قلوب کے مناسب رب تعالیٰ کا یہ ارشاد گرامی ہے: ﴿ ثُمَّ قَسَتۡ قُلُوۡبُكُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ ذٰلِكَ فَهِىَ كَالۡحِجَارَةِ ﴾ بہت ہی خوب مناسبت اور مشابہت پائی گئی۔

(ماخوذ از عزیزی)

قرآن پاک کی فصاحت کیا خوب ہے: اقسیٰ ''(اسم تفضیل) کا معنی بہت سخت ہے اور ﴿اَشَدُّ قَسۡوَة ﴾. کا معنی بھی بہت سخت ہے لیکن ان میں فرق یہ ہے کہ ﴿ اَقۡسیٰ ﴾ عام ہے مقدار اور کیفیت کے لحاظ پر سختی پر بولا جاتا ہے لیکن ﴿ اَشَدُّ قَسۡوَة ﴾ کیفیت کے لحاظ پر سختی پر بولا جاتا ہے یہاں یہ ہی مراد ہے اسی لئے اسے ذکر کیا۔ (از عزیزی)

﴿ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعۡمَلُوۡنَ ﴾ : ''اور نہ ہی اللہ غافل ہے اس چیز سے جو تم عمل کرتے ہو'' یہاں سے ان لوگوں کو ہی خطاب ہے جن کا پہلے ذکر آ رہا ہے اور ان کو ہی دھمکی دی جا رہی ہے کہ تمہارے دل پتھروں سے بھی زیادہ سخت ہو گئے رب تعالیٰ کے احکام سے عدولی کئے جا رہے ہو یہ جان لو کہ اللہ تعالیٰ تمہارے عملوں سے غافل نہیں۔

علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے ان الفاظ سے تفسیر فرمائی:

"وعید علی ما ذکر کانہ قیل ان اللہ تعالیٰ لبالمرصاد ھؤلاء القاسیۃ قلوبھم حافظ لاعمالھم محص لھا، فھو مجازیھم فی الدنیا والآخرۃ"

ان کی بداعمالیوں کا جو ذکر کیا گیا اس پر یہ ان کو وعید کی جا رہی ہے ان کو بتایا گیا کہ

بیشک اللہ تعالیٰ سے یہ سخت دل والے لوگ چھپ کر نہیں رہ سکتے، اللہ تعالیٰ ان کے اعمال کو نگاہ میں رکھے ہوئے ہے اور ان کے اعمال اس کے شمار میں ہیں وہ ان کو دنیا اور آخرت میں اس کا بدلہ دے گا۔

رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی یہی مضمون وضاحت سے ثابت کر رہا ہے:

﴿ وَمَا كَانَ رَبُّكَ نَسِيًّا ﴾ اور آپ کا رب بھولنے والا نہیں۔ (روح المعانی و کبیر)

تعظیم باری تعالیٰ کا پاس: قاضی عیاض رحمہ اللہ فرماتے ہیں ﴿ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴾ میں تاویل کی ضرورت ہے " لا يصح لانه يوهم جواز الغفلة عليه " اس لئے کہ بغیر تاویل کے اللہ تعالیٰ کے متعلق یہ کہنا کہ وہ غافل نہیں۔ اس سے وہم پڑتا ہے کہ شائد اس میں غفلت آسکتی ہے اور اس کی نفی کی گئی ہے۔ اگرچہ اس قول کو علامہ رازی رحمہ اللہ نے رد کیا ہے۔ تاہم اس قول سے اتنی بات سمجھ میں آسکتی ہے کہ علماء صالحین نے رب تعالیٰ کی تعظیم کا کتنا لحاظ کیا ہے کہ جہاں ذرا بھر بھی اشتباہ ہوا وہاں کچھ نہ کچھ سوچنے کی کوشش کی کہ رب تعالیٰ کی شان کے لائق یہ الفاظ ظاہری طور پر مراد لئے جاسکتے ہیں یا ان کی تاویل کر کے وہ معنی مراد لیا جائے جو اس کی عظمت کے لائق ہو۔

تاہم علامہ رازی رحمہ اللہ نے بہت خوب بیان فرمایا:

" وليس الامر كذلك لان نفي الصفة عن الشئي لايستلزم ثبوت صحتها عليه ، بدليل قوله تعالىٰ ﴿ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ ، وَهُوَ يُطْعِمُ وَلَايُطْعَمُ ﴾ والله اعلم "

اس طرح مسئلہ نہیں جس طرح قاضی رحمہ اللہ نے بیان فرمایا کیونکہ کسی چیز کی نفی سے یہ لازم نہیں آتا کہ پہلے اس کا ثبوت ہو۔ اس پر واضح دلیل ہے کہ رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ ﴾ یہاں اونگھ اور نیند کی نفی کی گئی ہے۔ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ پہلے اس کے لئے اونگھ اور نیند کا ثبوت بھی ہو۔ اسی طرح رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿ وَهُوَ يُطْعِمُ وَلَا يُطْعَمُ ﴾ وہ کھلاتا ہے اسے کھلایا نہیں جاتا۔ اس میں نفی تو پائی گئی ہے کہ وہ کھانے سے بے نیاز ہے اسے کوئی کھلاتا نہیں۔ لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس کے لئے کھلانے کے ثبوت کا وہم آسکے۔ (از کبیر)

﴿ اَفَتَطۡمَعُوۡنَ اَنۡ یُّؤۡمِنُوۡا لَکُمۡ وَقَدۡ کَانَ فَرِیۡقٌ مِّنۡهُمۡ یَسۡمَعُوۡنَ کَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ یُحَرِّفُوۡنَهٗ مِنۡۢ بَعۡدِ مَا عَقَلُوۡهُ وَهُمۡ یَعۡلَمُوۡنَ ﴾

۱) ''تو اے مسلمانو کیا تمہیں یہ طمع ہے کہ یہودی تمہارا یقین لائیں گے اور ان میں کا تو ایک گروہ وہ تھا کہ اللہ کا کلام سنتے پھر سمجھنے کے بعد اسے دانستہ بدل دیتے''۔

۲) ''کیا تم طمع رکھتے ہو (اے مسلمانو) کہ وہ ایمان لے آئیں گے تمہاری وجہ سے۔ حالانکہ ان میں سے تو ایک گروہ وہ ہے جو سنتے ہیں اللہ کے کلام کو پھر اسمیں تبدیلی کر دیتے ہیں سمجھنے کے بعد، حالانکہ وہ جانتے ہیں (کہ ہم غلط کر رہے ہیں)''۔ (آیت نمبر ۷۵)

مختصر مطلب: اللہ تعالیٰ نے ایمان والوں کو خطاب کیا کہ تم تو طمع رکھتے ہو کہ یہود ایمان لے آئیں۔ لیکن تمہیں ان کے ایمان پر طمع نہیں رکھنا چاہیے کیونکہ ان میں سے ایک فریق وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کے کلام کو سنتا ہے اسمیں نبی کریم ﷺ کے اوصاف کو جاننے اور سمجھنے کے باوجود پھر اس میں تحریف کر دیتے ہیں، حالانکہ وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ ہم باطل کر رہے ہیں لیکن حق سے پھر بھی روگردانی کرتے ہیں۔

اس آیۃ کریمہ کا ماقبل سے تعلق واضح ہے کہ پہلی آیات میں گزرے ہوئے یہود کے قبیح افعال کا ذکر کیا گیا۔ اور اس آیۃ کریمہ میں نبی کریم ﷺ کے زمانہ کے یہود کے قبیح افعال کا ذکر کیا جا رہا ہے جو توراۃ کی تحریف کر کے نبی کریم ﷺ کے اوصاف کو چھپاتے تھے۔ (از کبیر)

اس مقام پر پیر صاحب نے کیا خوب بیان فرمایا:

> ''اس سے معلوم ہوا کہ حق پوشی اور سید عالم ﷺ کے اوصاف کو چھپانا اور آپ کے کلمات کا انکار کرنا یہود کا شیوہ تھا۔ اسلام کا دعویٰ کرنے والوں کو زیب نہیں دیتا کہ اپنے محبوب اور کریم رسول کے کمالات کو بیان کرنے سے ان کی زبان میں لکنت ہو اور فضائل سننے سے دل میں گھٹن ہو۔ رفعت شان مصطفیٰ حبیب خدا علیہ وعلیٰ آلہ اطیب التحیۃ واحسن الثناء کسی کے گھٹانے سے نہ گھٹے گی''۔ (ضیاء القرآن)

شان نزول: انصار صحابہ کرام کے یہود حلیف بھی تھے اور پڑوسی بھی اس لئے ان کی بہت تمنا ہوتی

کہ یہود اسلام لے آئیں تو گویا کہ رب تعالیٰ نے فرمایا تم تو تمنا کرتے ہو لیکن وہ ایمان لانے والے نہیں۔اس لحاظ پر واضح ہوا کہ ﴿ اَفَتَطۡمَعُوۡنَ ﴾ میں خطاب صحابہ کرام کو ہے۔

ایک احتمال یہ بھی ہے کہ خطاب نبی کریم ﷺ کو ہو البتہ جمع کا صیغہ تعظیم کے لئے ذکر کیا گیا ہو۔
حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے:

"لا تحزن علی تکذیبهم ایاک واخبر انهم من اهل السوء الذین آمنو"

کہ نبی کریم ﷺ کو فرمایا "یہود جو آپ کی تکذیب کرتے ہیں اس پر غم نہ کریں۔اور ساتھ ہی خبر دے دی گئی کہ یہ لوگ اپنے آباء واجداد سے ہی بدعقیدہ اور بداعمال چلے آ رہے ہیں۔لہذا انہوں نے بھی ایسا ہی ہونا ہے۔ (از قرطبی بتصرف ، روح المعانی)

﴿ اَفَتَطۡمَعُوۡنَ ﴾ : طمع (سمع پر زیادہ آتا ہے،البتہ فتح پر بھی آتا رہتا ہے) یہ تعجب کے وقت استعمال ہوتا ہے اور اس کا معنی تمنا کرنا،حرص کرنا،طمع کرنا۔اور باب کرم پر جب آئے تو مبالغہ کا معنی پایا جاتا ہے یعنی بہت زیادہ طمع کرنے والا۔اور طمع لشکر کے رزق کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے جیسا کہ کہا جاتا ہے "امر لهم الأمیر باطماعهم "امیر نے لشکر والوں کے لئے رزق دینے کا حکم دیا۔

خیال رہے کہ ﴿ اَفَتَطۡمَعُوۡنَ ﴾ میں ہمزہ استفہام انکاری کے لئے ہے:

"کانه ایاسهم من ایمان هذه الفرقة من الیهود"

گویا کہ یہود کے اس فرقہ سے ایمان کے طمع کرنے سے مکمل طور پر ناامید کیا گیا ہے
کہ ان کے ایمان کے لئے رزق کی طمع نہ کی جائے۔ (از قرطبی)

﴿ اَنۡ یُّؤۡمِنُوۡا لَکُمۡ ﴾:" ای یصدقوا مستجیبین لکم فالایمان بالمعنی اللغوی والتعدیة باللام للتضمین کما فی قوله تعالیٰ فآمن له لوط "

﴿ اَنۡ یُّؤۡمِنُوۡا لَکُمۡ ﴾ کا ایک معنی یہ ہے (کیا تم طمع کرتے ہو) کہ وہ تمہاری بات کو قبول کرتے ہوئے اس کی تصدیق کریں گے اس صورت میں ایمان کا لغوی معنی ہوگا" مان لینا" اور لام سے متعدی کیا گیا ہے اس میں تضمین کا قاعدہ جاری ہے ﴿ فَاٰمَنَ لَهٗ لُوۡطٌ ﴾ میں بھی ایمان کا لغوی معنی ہی معتبر ہے۔خیال رہے اعلیٰ حضرت کا ترجمہ اسی تفسیر کے مطابق ہے (تو اے مسلمانو کیا تمہیں یہ

طمع ہے کہ یہودی تمہارا یقین لائیں گے۔اور دوسرا معنی یہ کیا گیا ہے۔

" ﴿ اَنْ یُّؤْمِنُوْا لَکُمْ ﴾ ای ان یؤمنوا لا جل دعوتکم لهم ، فالفعل منزل منزلة اللازم والمراد بالایمان المعنی الشرعی واللام لام الاجل "

یعنی لام سببیہ ہے۔اور فعل بمنزل لازم کے ہے،اور ایمان کا معنی شرعی ہے اور معنی یہ ہوگا (کیا تم طمع کرتے ہو) کہ وہ تمہاری دعوت پر ایمان لے آئیں گے۔

راقم نے اس تفسیر کے مطابق ترجمہ کیا ہے" کیا تم طمع رکھتے ہو (اے مسلمانو) کہ وہ ایمان لے آئیں گے تمہاری وجہ سے۔ (از روح المعانی)

﴿ وَقَدْ كَانَ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَسْمَعُوْنَ كَلَامَ اللّٰهِ ثُمَّ يُحَرِّفُوْنَهٗ ﴾

" فریق سے مراد ان یہود کے گزرے ہوئے علماء اور پادریوں کی ایک جماعت ہے"

﴿ يَسْمَعُوْنَ كَلَامَ اللّٰهِ ثُمَّ يُحَرِّفُوْنَهٗ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ وہ توراۃ کو سنتے اور اس میں اپنی اغراض (غرضوں) کے مطابق تبدیلی کر لیتے تھے یہی قول حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا ہے۔

اور جمہور کا قول بھی اسی کے قریب ہے کہ وہ اپنی طرف سے اللہ کی کتاب توراۃ میں تبدیلی کر لیتے تھے نبی کریم ﷺ کے اوصاف کو انہوں نے تبدیل کر کے پیش کیا آپ کے درمیانہ قد کو لمبے قد سے تبدیل کر دیا۔اور آپ کے رنگ سفید گندم گوں کو کہیں خالص سفید، کہیں سیاہی مائل کہہ دیا۔اور ایۃ رجم کو (یعنی جس میں زنا کی سزا سنگسار کرنے کا ذکر تھا) انہوں نے تبدیل کر دیا۔اور اس میں تحریر کر دیا کہ اس کے چہرہ پر خاکستر لگا کر سیاہ کر دیا جائے۔

اسی طرح موسیٰ علیہ السلام ستر آدمیوں کو کوہ طور پر لے گئے تھے وہ کہنے لگے ہم بھی اللہ تعالیٰ کا کلام سنیں گے آپ نے ان کو فرمایا کہ غسل کر لو صاف لباس پہن لو ۔ جب انہوں نے ایسا کر لیا۔ ﴿ فَاَسْمَعَهُمُ اللّٰهُ كَلَامَهٗ ﴾ تو اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنا کلام سنایا ﴿ ثُمَّ قَالُوْا سَمِعْنَا ﴾ پھر انہوں نے کہا ہم نے سنا پہلے یہ کہا لیکن پھر اسے بدل کر کہنے لگے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں یہ حکم دیا ہے۔

﴿ اِنِ اسْتَطَعْتُمْ اَنْ تَفْعَلُوْا هٰذِهِ الْاَشْيَاءَ فَافْعَلُوْ وَاِنْ شِئْتُمْ فَلَا تَفْعَلُوْا ﴾

کہ توراۃ میں جتنے بھی احکام ہیں ان پر اگر تم عمل کر سکتے ہو تو کر لو اگر تم ان پر عمل نہیں کرنا چاہتے تو نہ کرو۔

فائدہ: ان سے ایمان لانا بعید قرار دیا ان کے ایمان پر طمع کرنے سے نفی کر دی گئی تو اسی سے پتہ چلا:

" افتطمعون ان یؤمنوا لکم ویظھروا التصدیق ومن علم منھم الحق لم یعترف بذلک بل غیرہ وبدلہ "

کیا تم ان پر طمع رکھتے ہو کہ وہ تمہاری دعوت پر تمہاری وجہ سے ایمان لے آئیں گے تمہاری تصدیق کریں گے ایسا نہیں ہو سکتا، ان پر طمع کا کیا فائدہ جنہوں نے حق کو پہچان کر، جاننے کے باوجود اس پر ایمان نہیں لایا بلکہ اس میں تغیر وتبدل کر دیا۔

ان کے ایمان پر طمع نہ کرنے کی ایک اور عجیب وجہ بھی علامہ رازی رحمہ اللہ نے بیان فرمائی:

" افتطمعون ان یؤمنوا لکم مع انھم ما آمنوا بموسیٰ علیہ السلام وکان ھو السبب فی ان اللہ خلصھم من الذل وفضلھم علی الکل ومع ظھور المعجزات المتوالیۃ علی یدہ وظھور انواع العذاب علی المتمردین "

کیا تم طمع رکھتے ہو کہ وہ تمہاری وجہ سے ایمان لے آئیں گے یہ تو اس نسل سے ہیں ان لوگوں کی اولاد ہیں جنہوں نے موسیٰ علیہ السلام کے ارشادات کو تسلیم نہیں کیا حالانکہ انہوں نے ان کو ذلت سے نکالا یعنی فرعون اور اس کی قوم سے تمہیں چھڑایا جو تم سے ذلت آمیز کام لیتے تھے اور تمہیں ان کے دردناک عذاب سے نجات دلائی جو تمہیں طرح طرح کی تکالیف پہنچاتے تھے۔ وہ موسیٰ علیہ السلام جنہوں نے ان لوگوں کو اللہ تعالیٰ سے اس وقت کے تمام لوگوں پر فضیلت دلائی ان کے فرمان کو یہ لوگ ٹھکراتے رہے۔

پھر عجیب بات یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کے کثیر معجزات کو انہوں نے دیکھا اور موسیٰ علیہ السلام کا ہی یہ معجزہ تھا کہ فرعون اور اس کی قوم کے لوگ جو بہت بڑے سرکش تھے ان کو بنی اسرائیل کے سامنے ہلاک کیا اور ان کو نجات دی لیکن یہ پھر بھی بار بار موسیٰ علیہ السلام کے حکم کو ٹالتے رہے تو ان سے ایمان کی توقع کیسے کی جا سکتی ہے لہٰذا ان سے ایمان کی طمع کا کوئی فائدہ نہیں۔

اور اے مومنو تم تو ان کو عقل مند سمجھ رہے ہو لیکن یہ تو عقل سے بہت دور ہیں۔

" افتطمعون ان یؤمنوا لکم ھؤلاء من طریق النظر والاستدلال وکیف وقد کان فریق من اسلافھم یسمعون کلام اللہ ویعلمون انہ حق ثم یعاندوہ "

کیا تم توقع رکھتے ہو کہ یہ لوگ نظر وفکر کریں گے دلائل کے ذریعے تمہاری باتوں کو سمجھ لیں گے ایمان لے آئیں گے حالانکہ ان کے آباء واجداد میں سے ایک فریق ایسا تھا جو اللہ کا کلام سنتے اور جانتے کہ یہ حق ہے لیکن پھر بھی اس سے عناد کرتے اور ایمان نہ لاتے۔ (از کبیر)

اعتراض: جب تحریف کرنے والا ایک فریق تھا تو یہ کیسے لازم آیا کہ تمام لوگ ہی ایمان نہیں لائیں گے:" فان عناد البعض لا ینافی اقرار الباقین " بیشک بعض لوگوں کا عناد باقی لوگوں کے اقرار کے مخالف نہیں۔

جواب: تحریف کرنے والے وہ لوگ تھے جن پر یہود کے علم کی دارومدار تھی وہ ان کے علماء تھے جو کتاب کا علم رکھتے تھے عوام تو علم سے ہی خالی تھے " العوام کالانعام " (عوام چوپایوں کی طرح ہیں) جملہ شائد ان کے لئے ہی وضع کیا گیا تھا۔

اسلئے تمام یہود ہی اپنے راہنماؤں کے جال میں پھنسے ہوئے تھے جو حسد اور عناد کی وجہ سے تحریف کررہے تھے یا اپنے تحائف وغیرہ آمدنی کے ذرائع کے بند ہونے کے خطرہ سے تحریف کررہے تھے اور ان کے متبعین ان کی تحریف شدہ عبارات کو صحیح تسلیم کررہے تھے اس پر ان کا ایمان تھا اور اسی پر ان کا عمل تھا۔ اس لئے گویا کہ ان میں سے اکثر ہی تحریف کے مرتکب ہورہے تھے۔ تو ذکر مطلق فرمادیا آیۃ کریمہ کے شان نزول سے بھی واضح ہورہا ہے کہ مراد وہ لوگ ہیں جو انصار صحابہ کرام کے حلیف اور ان کے قرب وجوار میں رہنے والے تھے۔ یہاں ان لوگوں سے ایمان لانے کے طمع کی نفی کی گئی۔ ورنہ حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں نے ایمان قبول کیا۔ (ماخوذ از کبیر بتصرف)

تنبیہ: اللہ تعالیٰ کے کلام کو سننے کا مطلب یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ پر جو وحی نازل ہوتی تھی وہ جب ان تک پہنچتی اور وہ سنتے تو اس میں تحریف کردیتے تھے۔ علامہ آلوسی رحمہ اللہ کا مختار تو یہ ہے کہ ستر آدمی جو موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ کوہ طور پر گئے تھے انہوں نے بھی رب تعالیٰ کا کلام براہ راست نہیں سنا، بلکہ موسیٰ علیہ السلام کے واسطہ سے سنا...... واللہ اعلم" (روح المعانی)

﴿ مِنۢ بَعۡدِ مَا عَقَلُوهُ ﴾ : " ای فهموه بعقولهم ولم یبق لهم فیه ریبة " یعنی انہوں نے تحریف کی جب کہ انہوں نے اپنی عقلوں سے بھی سمجھ لیا تھا کہ یہ اللہ کا کلام ہے کسی بندے کا کلام نہیں

انکواس میں ذرا بھی شک نہیں تھا۔

﴿ وَهُمْ يَعْلَمُونَ ﴾ : " انهم مفترون مبطلون " وہ یہ جانتے ہوئے تحریف کرتے تھے کہ ہمارا تحریف کرنا باطل ہے۔ اور رب تعالیٰ پر افتراء ہے کہ ہم اپنے کلام کو رب تعالیٰ کی طرف منسوب کررہے ہیں۔ (از بیضاوی)

علامہ بیضاوی رحمہ اللہ کی تفسیر کے بعد اعلیٰ حضرت کا ترجمہ مختصر اور تمام تفسیر کو حاوی نظر آئے گا۔

" اللہ کا کلام سنتے پھر سمجھنے کے بعد اسے دانستہ بدل دیتے "

البتہ راقم نے لفظی ترجمہ پیش کرنے کی کوشش کی تا کہ دونوں ترجمے ملا کر طلباء کرام زیادہ فائدہ حاصل کرلیں۔

جو سنتے ہیں اللہ کے کلام کو پھر اس میں تبدیلی کردیتے ہیں سمجھے کے بعد، حالانکہ وہ جانتے ہیں (کہ ہم غلط کررہے ہیں)۔

﴿ وَاِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ آمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا وَاِذَا خَلَا بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ قَالُوْٓا اَتُحَدِّثُوْنَهُمْ بِمَا فَتَحَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ لِيُحَآجُّوْكُمْ بِهٖ عِنْدَ رَبِّكُمْ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴾ (آیت ۷۶)

۱) " اور جب مسلمانوں سے ملیں تو کہیں گے ہم ایمان لائے اور جب آپس میں اکیلے ہوں تو کہیں وہ علم جو اللہ نے تم پر کھول رکھا مسلمانوں سے بیان کئے دیتے ہو کہ اس سے تمہارے رب کے یہاں تمہیں پر حجت لائیں گے تمہیں عقل نہیں "۔

۲) " اور جب وہ ملتے ہیں ایمان والوں سے کہتے ہیں ہم ایمان لائے اور جب آپس میں اکیلے ہوں تو کہیں وہ علم جو اللہ نے تم پر کھول رکھا مسلمانوں سے بیان کئے دیتے ہو کہ اس سے تمہارے رب کے یہاں تمہیں پر حجت لائیں گے کیا تمہیں عقل نہیں "۔

مختصر مطلب: منافقین جب ایمان والوں سے ملتے تھے تو ان کو یہ کہتے تھے کہ ہم ایمان لائے ہیں

اور تمہیں حق سمجھتے ہیں اور جب علیحد گی میں وہ اپنے ہی دوسرے لوگوں کو ملتے تھے تو وہ ان کو کہتے کہ تورات میں جو اس نبی کے اوصاف بیان کئے گئے ہیں۔تم وہ اوصاف مومنوں کو کیوں بتاتے ہو وہ تو اللہ کے ہاں وہی حجت تم پر پیش کریں گے کہ یہ لوگ تو خود ہمیں ہمارے نبی کریم ﷺ کے اوصاف بتاتے تھے لیکن انہوں نے خلوص سے ایمان نہیں لایا۔اس طرح تو تمہیں رب کے ہاں بہت بڑی ناکامی کا سامنا کرنا پڑے،تم عقل کیوں نہیں رکھتے ،ایسا کیوں کرتے ہو،عقل مندی تو یہ ہے کہ ان کے اوصاف کو چھپا کر رکھو۔

نبی کریم ﷺ کے یہود کی ایک قباحت کو پہلے ذکر کیا کہ ان پر ایمان لانے کی طمع نہ کرو وہ ایمان لانے والے نہیں اب ان کی دوسری قباحت کو ذکر کیا جارہا ہے کہ وہ منافق ہیں۔

۱) شان نزول: چند واقعات کے درپیش آنے کے بعد اس آیۃ کریمہ کا نزول ہوا۔ان میں سے ایک یہ ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ بیشک اہل کتاب میں سے منافقین جب نبی کریم ﷺ کے اصحاب کو ملتے تھے:

﴿ قَالُوٓا اٰمَنَّا بِالَّذِیْ اٰمَنْتُمْ بِهٖ وَنَشْهَدُ اَنَّ صَاحِبَكُمْ صَادِقٌ وَاَنَّ قَوْلَهٗ حَقٌّ وَنَجِدُهٗ وَصِفَتَهٗ فِیْ كِتَابِنَا ﴾

”تو کہتے تھے کہ ہم بھی اس ذات پر ایمان لائے ہیں جس پر تم نے ایمان لایا ہے۔اور ہم گواہی دیتے ہیں کہ تمہارے صاحب (تمہارے نبی) سچے ہیں۔اور بیشک ان کے ارشادات حق ہیں اور ہم ان کی نعتوں اور صفات کو اپنی کتاب میں پاتے ہیں“۔

اور وہ جب اپنے رئیسوں اور اپنے علماء کو علیحد گی میں ملتے تھے تو وہ ان کو نصیحت کرتے تھے کہ رب تعالیٰ نے تورات میں محمد (ﷺ) کی جو صفات واضح طور پر بیان کردی ہیں تم ان صفات کا ذکر مومنوں سے کیوں کرتے ہو وہ تمہاری گواہی کو تمہارے ہی خلاف بطور حجت پیش کریں گے۔تو ان کو بتا کر بے عقلی کا کام کر رہے ہو۔

" فان المخالف اذا اعترف بصحة التوراة واعترف بشهادة التوراة على نبوة محمد ﷺ فلا حجة اقوى من ذلك "

اس لئے کہ جب مخالفین نے یہ اعتراف کیا کہ توراۃ اللہ کی سچی کتاب ہے اور انہوں نے یہ بھی اعتراف کیا کہ توراۃ محمد ﷺ کی نبوت کی شہادت دے رہی ہے تو اس سے بڑھ کر نبی کریم ﷺ کی حقانیت پر کیا دلیل ہو سکتی۔

یہ دیکھ کر ان کوان کے رئیسوں نے منع کیا، تو اس آیۃ کریمہ کا نزول ہوا۔ (از کبیر)

۲) اور شان نزول کی یہ وجہ ذکر کی گئی ہے: ابن جریج مجاہد سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے حضرت علی ؓ کو بنی قریظہ کی طرف بھیجا انہوں نے نبی کریم ﷺ کو گالیاں دیں۔ آپ کی شان میں اذیت پہنچانے والے نازیبا الفاظ استعمال کئے۔ حالانکہ ان لوگوں کا نبی کریم ﷺ سے معاہدہ بھی تھا، حضرت علی ؓ نے جب نبی کریم ﷺ کو بتایا تو آپ نے فرمایا اگر میں ان کی طرف گیا تو وہ خاموش ہو جائیں گے آپ ان کی طرف گئے اور ارشاد فرمایا:

"انقضّم العهد يا اخوان القردة والخنازير يا عبد الطاغوت اخزاكمالله وانزل بكم نقمته"

اے بندرو اور خنزیر کے بھائیو! اے شیطان کے عبادت گزارو کیا تم نے وعدہ توڑ دیا اللہ تعالیٰ تمہیں رسوا کرے گا اور تمہیں عذاب دے گا۔

چونکہ وہ جانتے تھے کہ نبی کریم ﷺ نے کسی مدرسہ میں نہیں پڑھا پھر ان کے آباء و اجداد کا بندر اور خنزیر بن جانا انہیں کیسے پتہ چلا۔

"فقالوا من اخبر بهذا الامر محمدا ما خرج بهذا القول الامنكم"

وہ کہنے لگے محمد کو یہ کس نے بتایا؟ پھر خود ہی اپنے منافق ساتھیوں کو کہنے لگے یہ تم نے ہی بتایا ہے تم کیوں بتاتے ہو وہ مسلمان تمہاری شہادت اور تمہارے بتانے کو ہی تمہارے خلاف بطور حجت پیش کریں گے۔ (ماخوذ از قرطبی و ابن کثیر)

﴿ وَاِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ آمَنُوْا قَالُوْا آمَنَّا ﴾: ﴿ لَقُوْا ﴾ اصل میں "لقیوا" ہے اس میں ضمیر یہود کی طرف لوٹ رہی ہے یعنی یہود جب ایمان والوں سے ملتے تھے تو کہتے ہم ایمان لائے ہیں اس پر کہ بیشک تم حق پر ہو بیشک تمہارے رسول (ﷺ) کی بشارت توراۃ میں دی گئی ہے۔ (بیضاوی)

﴿ وَاِذَا خَلَا بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ ﴾: "اى اذا انفرد بعض المذكورين" یعنی

جب بعض خلوت (علیحدگی) میں اپنے بعض رئیسوں کو ملتے یعنی کعب بن اشرف اور وہب بن یہودا اور دوسرے سرکردہ رئیس علم والوں کو ملتے۔ (روح المعانی ، مظہری)

﴿ قَالُوْا اَتُحَدِّثُوْنَهُمْ بِمَا فَتَحَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ ﴾ : ﴿ قَالُوْا ﴾ کی ضمیر ان یہود کی طرف لوٹ رہی ہے جو منافق نہیں تھے بلکہ خالص یہود تھے منافقین جب ان کے پاس جاتے تھے اور اپنے کارنامے بتاتے تو وہ ان کو بڑے پیارے اور میٹھے انداز پر ڈانٹتے تھے۔

﴿ فتح ﴾ کا معنی ہے " ایذان بانه سر مکتوم وباب مغلق " پوشیدہ راز کو ظاہر کرنا اور بند دروازہ کو کھولنا "فتح" کا معنی ہے یہاں مراد ہے واضح طور پر کھول کر بیان کرنا۔

﴿ تُحَدِّثُوْنَهُمْ بِمَا فَتَحَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ ﴾ کا مطلب علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے ان الفاظ سے بیان کیا:

" تخبرون المؤمنين بما بينه الله تعالىٰ لكم خاصة من نعت نبيه محمد ﷺ او من اخذ العهود على انبياء كم بتصديقه ﷺ ونصرته "

کیا تم مومنوں کو خبر دیتے ہو جو اللہ تعالیٰ نے خاص کر کے تمہیں بتایا کہ یہ اوصاف ہیں اس کے نبی محمد ﷺ کے اور اللہ تعالیٰ نے تمہیں یہ بتایا کہ انبیاء کرام سے اس نے وعدہ لیا ہے کہ جب میرے آخر الزمان نبی محمد ﷺ تشریف لائیں تو تم ان پر ایمان لانا اور ان کی امداد کرنا۔

" والاستفهام انكار " ہمزہ برائے استفہام انکاری کے استعمال ہے یعنی تمہیں نہیں بتانا چاہئے۔

﴿ لِيُحَاجُّوْكُمْ بِهٖ ﴾ : " والمراد ليحتجوا به عليكم " مراد اس کی یہ ہے کہ وہ تم پر تمہاری شہادت اور تمہارے اقوال کو حجت کے طور پر پیش کریں گے یعنی ان کے لئے یہ پختہ دلیل ہوگی۔ (از روح المعانی)

﴿ عِنْدَ رَبِّكُمْ ﴾ : "تمہارے رب کے ہاں" یہ مختصر الفاظ گرامی کثیر معانی پر مشتمل ہیں:

ا) " انهم جعلوا محاجتهم به وقوله هو فى كتابكم " وہ تمہارے اقوال کو حجت بنائیں گے کہ یہ ارشادات تو تمہاری کتاب میں موجود ہیں۔

یعنی یہ کہنا " هو فى كتاب الله هكذا " یہ مسئلہ اللہ تعالیٰ کی کتاب میں اس طرح ہے یا یوں

کہا جائے " وهو عند الله كذا بمعنى واحد " یہ مسئلہ اللہ تعالیٰ کے ہاں اس طرح ہے ان دونوں قولوں کا مطلب ایک ہی ہے۔ لہٰذا ﴿ عِنْدَ رَبِّكُمْ ﴾ کہنے کا ان کا مطلب بھی یہی ہے کہ مسلمان حجت پیش کریں گے کہ یہ تو تمہاری کتاب میں موجود ہے جو اللہ کی کتاب ہے۔

(۲) رب تعالیٰ نے جن چیزوں کو لازم کیا کہ تم رسولوں کی اتباع کرو، ان میں حجت پیش کرنے کے متعلق " تصح ان توصف بانها محاجة فيه لانها محاجة في دينه " یہ کہنا صحیح ہے کہ وہ رب تعالیٰ میں حجت پیش کر رہے ہیں۔ کیونکہ یہ حجت رب تعالیٰ کے دین میں ہے۔ اب ﴿ عِنْدَ رَبِّكُمْ ﴾ کا مطلب " في ربكم " ہو گیا کہ وہ تمہارے رب کے بارے میں یعنی اس کے دین میں حجت پیش کریں گے۔

(۳) " المراد يحاجوكم يوم القيامة " یعنی اور مطلب ﴿ عِنْدَ رَبِّكُمْ ﴾ کا یہ ہے کہ وہ قیامت کے دن تم پر رب تعالیٰ کے ہاں حجت پیش کریں گے اس لئے کہ جب سوال کیا جائے گا کہ تم ایمان کیوں نہیں لائے تو تم نے اگر یہ کہا کہ ہمیں تو علم نہیں تھا تو یہ مسلمان کہیں گے کہ یہ تو ہمیں بھی بتاتے تھے کہ وہ سچے نبی ہیں۔ تو اس پر تمہیں زیادہ توبیخ (ڈانٹ ڈپٹ) کی جائے گی اور مخلوق کے سامنے تمہاری بہت زیادہ رسوائی ہو گی۔ حق کا اعتراف کر کے اسے چھپانا تو ایسا ہی ہے جیسا کہ انکار پر قائم رہنا ہے اس طرح تمام لوگ تمہاری منافقت کو اس وقت جان لیں گے جو تمہاری ذلت کا سبب بنے گا۔

اس تیسری صورت کے متعلق اگرچہ علامہ بیضاوی رحمہ اللہ نے یہ بیان کیا " وفيه نظر اذ الاخفاء لا يدفعها " شیخ زادہ نے اس کی وضاحت کی ہے۔ جس کا مختصر خلاصہ یہ ہے کہ منافقین کو ان کے رئیس لوگ منع کرتے تھے کہ تم مسلمانوں کو اپنی کتاب کے بیانات سے مطلع نہ کیا کرو کہ وہ تم پر حجت پیش کریں گے اس حجت سے مراد دنیا کی حجت ہی ہو سکتی ہے کیونکہ وہ نصیحت کرنے والے علم والے حضرات تھے۔ ان کو یہ معلوم تھا کہ قیامت کے دن تو مسلمانوں نے ہمارے خلاف حجت پیش کرنی ہی کرنی ہے اس لئے مسائل کو چھپانے کا قیامت میں فائدہ نہیں ہو گا۔ لہذا اس سے مراد دنیا میں فائدہ ہی لیا جا سکتا ہے، اس لئے یہ وجہ ضعیف ہے۔

لیکن اس پر قاضی مظہری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ بات قابل تسلیم ہے کہ وہ علم والے لوگ تھے

وہ یہ کیسے ان کو نصیحت کر سکتے تھے کہ مسلمانوں سے مخفی رکھو تا کہ قیامت کے دن رب کے حضور وہ تم پر حجت نہ پیش کریں جب ان کا مخفی رکھنا قیامت میں نفع مند نہیں ہوسکتا تھا تو ان کے رئیسوں نے ان کو یہ نصیحت بھی نہیں دی۔

اگر چہ بظاہر تو یہ سمجھ میں آتا ہے لیکن جب ان کی حماقت کو دیکھتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ ضد اور حسد ان کو جہالت کے درجہ میں پہنچا دیتے تھے۔

"قالوا ما انزل الله علی بشر من شئی"

انہوں نے کہا اللہ تعالیٰ نے بشر پر کسی چیز کو نازل نہیں کیا۔

"مع ادعائهم بانزال التوراة علی موسی"

باوجود اس کے کہ ان کا یہ بھی دعویٰ تھا تورات موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی۔

اس سے ہر شخص خود اندازہ کرسکتا ہے کہ وہ کتنے احمق تھے۔ اور غور کیا جائے تو واضح ہو جائے گا کہ انہوں نے موسیٰ علیہ السلام کے واضح معجزات کو دیکھنے کے بعد ایسے کام کئے اور ایسی باتیں کیں "ما لا یقولها الا مجنون" جو سوائے پاگل کے کوئی نہیں کرسکتا۔

اسلئے واضح ہوا کہ وہ اگر چہ اصحاب علم تھے لیکن نبی کریم ﷺ کی مخالفت ضد اور آپ کے ساتھ حسد کرنے میں درجہ حماقت میں پہنچے ہوئے تھے یہی وجہ تھی کہ ان کا کلام ان کی جہالت پر دلالت کر رہا تھا۔

(از مظہری)

۴) حجت پیش کرنے والے مختلف قسم کے ہوتے ہیں، بعض لوگوں کی غرض حجت پیش کرنے سے یہ ہوتی ہے کہ وہ مقابل شخص پر غلبہ حاصل کریں اور اس سے انہیں سرور حاصل ہو۔ اور بعض لوگوں کا حجت پیش کرنے کا مقصد دینی خدمت اور اچھی نصیحت کرنا ہوتا ہے۔ ان کا نقطہ نظر یہ ہوتا ہے کہ مقابل شخص کا عذر ختم ہو جائے اور اللہ تعالیٰ کی حجت (دلیل) کو ہی وہ غالب سمجھے۔

یہود کے منافقین کو ان کے اصحاب علم علیحدگی میں کہتے کہ تم تورات کے مسائل مسلمانوں کو بتا دیتے ہو تو مسلمان ان کو ہی بطور دلیل تم پر پیش کریں گے اور تمہیں نصیحت کریں گے کہ تم تو ہمیں خود بتاتے تھے لہٰذا تمہیں ایمان لانا چاہیے۔ نصیحت کے طور پر حجت پیش کرنے والا یہ کہتا ہے۔

"قد اوجبت علیک عند الله واقمت علیک الحجة بین وبین ربی

فان قبلت احسنت الی نفسک وان جحدت کنت الخاسر الخائب "
تحقیق میں نے تم پر اللہ کے ہاں حکم ثابت کر دیا ہے۔ میں نے اپنے اور اپنے رب کے
درمیان (جو معاہدہ تھا نصیحت کرنے اور حجت پیش کرنے کا وہ) حجت تم پر پیش کر دی
اگر تم نے قبول کر لیا تو تمہارا اپنا بھلا اور اگر تم نے انکار دیا تو تمہارا اپنا نقصان۔

۵) ﴿عِنْدَ رَبِّكُمْ﴾ کا مطلب ہے "عند حکم ربکم وقضائکم" وہ تم پر رب تعالیٰ کے حکم اور قضاء (فیصلہ) کے مطابق حجت پیش کریں گے۔ جیسا کہ رب تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ فَاِذْ لَمْ يَأْتُوْا بِالشُّهَدَاءِ فَاُولٰئِكَ عِنْدَ اللّٰهِ هُمُ الْكٰذِبُوْنَ ﴾

"(اس پر چار گواہ کیوں نہیں لائے) تو جب گواہ نہ لائے تو وہی اللہ کے نزدیک جھوٹے ہیں"

یہاں بھی یہ بیان کیا گیا ہے:

"فی حکم اللہ وقضائه لان القاذف اذا لم یات بالشهود لزمه حکم الکاذبین وان کان فی نفسه صادقا"

یعنی "عند اللہ" کا مطلب یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے حکم اور اس کے فیصلہ کے مطابق جھوٹے ہیں کیونکہ تہمت لگانے والا شخص جب چار گواہ نہ پیش کر سکے تو اس پر جھوٹا ہونے کا حکم لگا دیا جاتا ہے ہو سکتا ہے واقع میں وہ سچا ہی ہو۔ (ماخوذ از کبیر بزیادة)

﴿ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴾: "تم عقل کیوں نہیں رکھتے) یہ خطاب منافقین یہود کو ان کے رئیس علماء کی طرف سے ہی ہے کہ وہ تم پر تمہارے رب کے ہاں حجت پیش کریں گے "افلا تعقلون ان ذلک لا یلیق بما انتم علیه" تم عقل کیوں نہیں رکھتے، بیشک تم جو طریقہ اختیار کیے ہو وہ تمہارے لائق نہیں۔

اسی معنی کو علامہ رازی رحمہ اللہ نے بہتر قرار دیتے ہوئے یوں ذکر فرمایا:

"وهذا الوجه اظهر لانه من تمام الحکایة عنهم فلا وجه لصرفه عنهم الی غیرهم"

یہی معنی مراد لینا زیادہ واضح ہے کیونکہ اس سے پہلے ذکر کیے گئے واقعہ کی تکمیل ہو رہی ہے لہٰذا جن لوگوں کا پہلے ذکر آ رہا ہے ان سے ہٹا کر اور طرف پھیرنا صحیح نہیں۔

واضح ہوا کہ ﴿ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴾ سے مراد مومن لینا اور یہ معنی کرنا کہ تم ان یہود کے ایمان پر طمع کیوں کرتے ہو کیا تم عقل نہیں رکھتے واضح نہیں بلکہ سیاق و سباق سے ہٹ جاتا ہے۔ (ماخوذ از کبیر)

﴿ اَوَلَا يَعْلَمُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَمَا يُعْلِنُوْنَ ۞ ﴾(۷۷)

۱) ''کیا نہیں جانتے کہ اللہ جانتا ہے جو کچھ وہ چھپاتے ہیں اور جو کچھ ظاہر کرتے ہیں''۔

۲) ''کیا وہ نہیں جانتے کہ بیشک اللہ جانتا ہے جو کچھ وہ چھپاتے ہیں اور جو کچھ ظاہر کرتے ہیں''۔

بیان قرآن کیا ہی ذیشان ہے: مختصر ذکر میں کتنی وسعت ایک ہی مضمون مختلف معانی پر مشتمل ہے اس آیۃ کریمہ میں علماء یہود کا اس طرح ذکر ہے:

" ان الیھود کانوا یعرفون اللہ ویعرفون انہ تعالیٰ یعلم السرو العلانیۃ فخوفھم اللہ بہ"

کہ وہ تو اللہ تعالیٰ کی معرفت رکھتے تھے انہیں یہ معلوم تھا کہ اللہ تعالیٰ ہر ظاہر و باطن کو جانتا ہے۔ ان کو اللہ تعالیٰ نے خوف دلایا کہ تم جانتے ہوئے پھر یہ کیوں کہتے ہو کہ مسلمانوں کے سامنے نبی کریم ﷺ کی جو شان بیان ہے اسے نہ بیان کرو تا کہ وہ تم پر رب کے ہاں حجت پیش نہ کریں۔ کیا رب خود نہیں جانتا تم نبی کریم ﷺ کی شان میں صفات کو چھپانے کا مشورہ دے کر اپنی حماقت کا ثبوت پیش کر رہے ہو۔

اور اگر اس آیۃ کریمہ میں ان لوگوں کا ذکر ہے جو رب تعالیٰ کی معرفت نہیں رکھتے تھے عزیر علیہ السلام کو خدا کا بیٹا مانتے تھے تو اب مطلب یہ ہوگا:

" فرغبھم بھذا القول فی ان یتفکروا فیعرفوا ان لھم ربا یعلم سرھم وعلانیتھم وانھم لا یامنون حلول العقاب بسبب نفاقھم "

کہ ان کو رغبت دلائی گئی کیا وہ نہیں جانتے؟ انہیں جاننا چاہئے ان کو چاہئے کہ وہ تفکر کریں اور پہچانیں کہ رب تعالیٰ ہر ظاہر اور باطن کو جانتا ہے۔ وہ منافقت کر کے رب تعالیٰ کے عذاب سے اگر بچنا چاہیں تو بچ نہیں سکیں گے ان پر عذاب آ کر رہے گا۔ (از کبیر)

﴿ اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَمَا يُعْلِنُوْنَ ﴾

" یعنی ما اسروا من کفرھم بمحمد ﷺ وتکذیبھم بہ وھم یجدونہ مکتوبا عندھم "

یعنی وہ جو نبی کریم ﷺ سے کفر کرنے کو چھپا کر رکھتے ہیں اور نبی کریم ﷺ کی تکذیب کو

چھپا کر رکھتے ہیں حالانکہ وہ توراۃ میں پاتے بھی ہیں ان کو چھپانے کا کیا فائدہ جب رب تعالیٰ جانتا ہے۔ (ابن کثیر)

یعنی اللہ تعالیٰ جانتا ہے جو وہ بعض کفریات کو پوشیدہ رکھتے ، اور بعض کو ظاہر کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ جانتا ہے جو وہ نبی کریم ﷺ کے اوصاف کو چھپاتے ہیں اور کلمات کی تحریف کو ظاہر کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے غضب اور عذاب کے جتنے اسباب ان کی طرف سے پائے جاتے ہیں خواہ وہ پوشیدہ رکھیں یا ظاہر کریں کہ اللہ تعالیٰ ان کو جانتا ہے۔ (از مظہری)

مقصد واضح ہوا کہ اللہ تعالیٰ ان کے ظاہر اقوال وافعال کو جانتا ہے ان کے باطنی اقوال وافعال کو جانتا ہے تو ان کا چھپانا ان کو رب تعالیٰ کے عذاب سے نہیں بچا سکے گا۔

﴿ وَمِنْهُمْ اُمِّيُّوْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ الْكِتَابَ اِلَّآ اَمَانِيَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ ﴾ (آیت نمبر ۷۸)

۱) ''اور ان میں کچھ ان پڑھ ہیں کہ جو کتاب کو نہیں جانتے مگر زبانی پڑھ لینا یا کچھ اپنی من گھڑت اور وہ نرے گمان میں ہیں''۔

۲) ''اور ان میں سے کچھ ان پڑھ ہیں جو نہیں جانتے کتاب کو مگر زبانی پڑھ لینا یا اپنی آرزوئیں نہیں ہیں وہ مگر گمان میں''۔

اللہ تعالیٰ نے یہود کے عناد کا ذکر فرمایا اور ان کے ایمان لانے کی طمع نہ کرنے کو بیان فرمایا اور یہود کے چار فرقوں کا ذکر فرمایا:

'' الفرقة الاولى هى الفرقة الضالة المضلة وهم الذين يحرفون الكلم عن مواضعه ''

پہلا فرقہ جس کا ذکر فرمایا وہ ہے جو خود بھی گمراہ تھے دوسروں کو بھی گمراہ کرتے تھے۔ اور اللہ تعالیٰ کی کتاب توراۃ میں اپنی مرضی سے تبدیلی کر لیتے تھے۔

'' والفرقة الثانية المنافقون '' دوسرا فرقہ منافقین کا تھا جو ایمان والوں سے مل کر کہتے ہم ایمان لے آئے ہیں۔ اور کافروں سے مل کر کہتے ہم تمہارے ساتھ ہیں۔

" والفرقة الثالثة الذین یجادلون المنافقین " اور تیسرا فرقہ ان میں سے وہ تھا جو منافقین کو یہ کہتے کہ تم توراۃ کے بیانات مسلمانوں پر کیوں واضح کرتے ہو۔

" والفرقة الرابعة هم المذکورون فی هذه الآیة " اور چوتھا فرقہ وہ ہے جن کا ذکر اس آیۃ کریمہ میں ہے۔ یہ وہ لوگ تھے جو جاہل تھے لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے کتاب یعنی توراۃ کو سمجھنے کی ان میں صلاحیت نہیں تھی وہ صرف کتاب کے الفاظ کو پڑھنا جانتے تھے معانی نہیں سمجھ سکتے تھے اور اپنی من گھڑت آرزوئیں رکھتے تھے وہ یقینی علم تو رکھتے نہیں تھے البتہ وہ صرف اپنا گمان رکھتے تھے جو غلط ہی ہوتا تھا۔ (از کبیر)

لیکن یہ بھی خیال رہے کہ یہود کا ایک فرقہ خوش قسمت لوگوں کا بھی تھا جو علم والے لوگ تھے کتاب کو پڑھنا بھی جانتے تھے اور سمجھتے بھی تھے، یہ حضرت عبداللہ بن سلام ؓ جو یہود کے بہت بڑے عالم تھے یہ اور ان کے ساتھی دولت ایمان سے مالا مال ہو گئے۔ علامہ رازی رحمہ اللہ نے چار باطل فرقوں کا ذکر فرمایا۔

تنبیہ : جو شخص اس آیۃ اور پہلی آیات میں غور و فکر کرے اور اسے پتہ چل جائے کہ یہود کے اتنے فرقے ہیں اور ان کی یہ یہ صفات ہیں پھر اس امت کی طرف توجہ کرے تو اسے وہی صفات ان میں بھی نظر آئیں گی۔

" فان فیهم من یعاند الحق ویسعی فی اضلال الغیر "
بیشک ان میں بھی کئی لوگ وہ ہیں جو خود بھی دین حق سے عناد رکھتے ہیں اور غیروں کو گمراہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

" وفیهم من یکون متوسطا " کئی لوگ وہ ہیں جو متوسط ہوتے ہیں یعنی دین حق کے باغیوں سے جب ملتے ہیں تو ان کے ساتھ ہوتے ہیں اور کبھی علم والے اور حق والوں کے ساتھ ہوتے ہیں یہی سب سے زیادہ ملک وملت کے لئے نقصان دہ ہوتے ہیں کیونکہ یہ نظر تو "علم والے" آتے ہیں لیکن ہوتے بکاؤ مال ہیں اور جی حضوری ہوتے ہیں۔ ان کا کام حاکموں کی خوشامد کے بغیر کچھ نہیں ہوتا۔ جو بھی حاکم آئے خواہ کتنا بڑا ظالم ہو خواہ بہت بڑا بے دین ہو۔ خواہ دین اسلام کو مٹانے کے درپے ہو خواہ

علماء کو دہشت گرد کہنے والا ہو، خواہ علماء کو صفحہ ہستی سے مٹانے کی تمنا رکھنے والا ہو، خواہ وہ یہودیوں اور عیسائیوں کا یار ہو یہ گروہ جی حضوریوں کا اسی کی تعریف کرے گا۔ یہ سب لوگ مل کر ''ہندو، مسلمان اور عیسائی'' ہیں سب بھائی بھائی، کے مصداق یک جہتی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔

" وفيهم من يكون عاميا محضا مقلدا " اوراس امت میں کئی لوگ عوام ہوتے ہیں جو مسائل سے مکمل طور پر بے خبر ہوتے ہیں وہ سنی سنائی باتوں پر کان دھرتے ہیں جیسا کسی نے کہا وہی مان لیا۔ کوئی اللہ والا مل گیا تو یہ بھی نیک ہو گیا اور کوئی گمراہ کرنے والا مل گیا تو یہ بھی گمراہ ہو گیا۔

اوراس امت میں جھوٹ بولنے والے، وعدہ کی مخالفت کرنے والے، امانت میں خیانت کرنے والے، اورغدر کرنے والے منافقوں کی علامت رکھنے والوں کی بھی کوئی کمی نہیں۔ (از کبیر بزیادہ)

﴿ وَمِنْهُمْ اُمِّيُّوْنَ ﴾: من تبعيضيه ہے ان میں سے بعض ان پڑھ ہیں چونکہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے کہ یہود کے کئی فرقے تھے ان میں سے ایک فرقہ یہ تھا یہ مسئلہ " من " سے واضح ہوا۔

﴿ اُمِّيُّوْنَ ﴾ جمع ہے " امی " کی۔ " امی " کا ایک معنی یہ ہے " هو من لا يقر بكتاب ولا رسول " " امی " اسے کہتے ہیں جو کتاب اور رسول کا اقرار نہ کرے۔ دوسرا معنی یہ ہے "من لا يحسن الكتابة والقراءة " جو اچھے طریقہ سے لکھنا، پڑھنا نہ جانے۔

آیۂ کریمہ میں یہی معنی معتبر ہے کہ وہ "ان پڑھ" تھے کیونکہ وہ اپنی کتاب اور اپنے رسول کا اقرار کرتے تھے اگرچہ ان کا اپنی کتاب پر ایمان نہیں، ایمان ہوتا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی ایمان لاتے۔ اسی دوسرے معنی پر ﴿ لَا يَعْلَمُوْنَ الْكِتَابَ ﴾ "وہ کتاب کا علم نہیں رکھتے" بھی دلالت کر رہا ہے۔

﴿ لَا يَعْلَمُوْنَ الْكِتَابَ اِلَّا اَمَانِيَّ ﴾: " امانی " جمع ہے " امنية " کی جو اصل میں "امنونة " (افعولة) تھا۔ اصل میں اس کا ایک ہی معنی ہے اسے سے آگے کئی معانی لئے گئے۔ وہ اصل واحد یہ ہے " ما تخيله الانسان فيقدر فى نفسه وقوعه " انسان کسی چیز کے واقع ہونے کا خیال کرے کہ ایسا ہو گا تو اسے " امنيه " کہا جاتا ہے۔

پھر اس کی دو صورتیں ہیں کبھی مطلب آرزو دلانا، یعنی دوسرے کو بتانا کو میں اس کام کی توقع رکھتا ہوں۔ وہ آرزو رکھے کہ فلاں شخص نے یہ کام کرنا ہے۔ اسی معنی میں "يعدهم ويمنيهم" استعمال

ہے۔اور کبھی اس کا معنی ہوتا ہے آرزو رکھنا جیسا کہ ﴿ تِلْکَ اَمَانِیُّھُمْ ﴾ (یہ ان کی آرزوئیں ہیں) میں یہی معنی لیا گیا ہے۔اسی اصل معنی کا اعتبار کرتے ہوئے "امنیۃ" کا معنی "جھوٹ" بھی لیا جاتا ہے کہ وہ بھی انسان اپنے نفس میں رکھتا ہے کہ میں یہ کہوں گا پھر وہ جھوٹ بولتا ہے۔

"والمروی عن ابن عباس ومجاهد ﷺ ان الامانی هنا الا كاذيب ای الا کاذیب اخذوها تقليدا من شياطين المحرفين"

حضرت ابن عباس اور حضرت مجاہد ﷺ سے مروی ہے کہ اس آیۃ کریمہ میں جو "امانی" کا ذکر ہے اس کا معنی ہے "ان کے جھوٹ" اب مکمل مفہوم یہ ہو گیا کہ وہ کتاب کو نہیں جانتے سوائے جھوٹی باتوں کے جو انہوں نے اپنے تحریف کرنے والے شیطانوں سے حاصل کی ہیں۔

اور اسی اصل معنی کا اعتبار کرتے ہوئے یہ معنی لیا گیا ہے "الا ما يقرء ون قراءة عارية عن معرفة المعنى وتدبره" یعنی وہ کتاب کو نہیں جانتے سوائے پڑھنے کے جو معنی سمجھنے اور اس میں تدبر سے خالی ہونے کے۔آسان مطلب یہ تھا کہ وہ پڑھنا جانتے تھے لیکن سمجھنا نہیں جانتے تھے۔

صاحب کشاف نے یہ بیان کیا ہے کہ یہ معنی بھی اصل معنی سے ہی ماخوذ ہے کہ جس طرح کوئی شخص کسی چیز کو دل میں رکھے اور تمنا کرے کہ یہ اس طرح حاصل ہو جائے "وكذالك القارئى يقدر ان كلمة كذا بعد كذا" اسی طرح قاری جو کتاب کو سمجھنے سے قاصر ہو وہ بھی صاف یہی سوچتا رہتا ہے کہ یہ کلمہ ایسا ادا کرنا ہے اور اس کے بعد کلمہ ایسے ادا کرنا ہے۔

آجکل کے بیکار قاری صرف اچھی آواز سے قرآن پاک کے الفاظ کو سریلی آواز اور طرز وادا سے پڑھنے والے جو معانی سے بے خبر ہوتے ہیں وقف کرنے کا پتہ نہیں ہوتا کہ کہاں مضمون ختم ہو رہا ہے وقف کرنا چاہئے اور کہاں وقف نہیں کرنا چاہئے ان کے لئے یہ لمحہ فکر ہے جو چیز قابل تعریف نہیں وہ اس پر ناز کر کے علماء کرام پر اعتراض کرتے رہتے ہیں یہ تو قرآن پڑھنا نہیں جانتے کاش ان جاہلوں کو کچھ سمجھ آئے۔

تنبیہ: جب "امانی" کا معنی آرزوئیں کیا جائے، تو مطلب یہ ہوگا کہ "وہ کتاب کا علم نہیں رکھتے سوائے اپنی من گھڑت آرزؤں کے" اب دیکھنا یہ ہے کہ ان کے من گھڑت اقوال کیا تھے۔

(۱) وہ یہ کہتے تھے کہ باقی انسانوں سے رب تعالیٰ کا تعلق یہ ہے کہ وہ اس کی مخلوق ہیں۔ اور اس کے عبادت گزار ہیں۔ رب تعالیٰ ان کا خالق اور معبود ہے:

"ما محبوب وپسر خوانده ایم پس ہر گناہے که از ما سرزد شود حق تعالٰی بسبب فرط محبت از ما درگزر فرماید"

لیکن ہم تو اللہ تعالیٰ کے محبوب ہیں اور ہم اس کی اولاد سمجھے جاتے ہیں۔ لہٰذا ہم سے کوئی گناہ بھی سرزد ہوا تو اللہ تعالیٰ ہمیں بے پناہ محبت کی وجہ سے معاف کردے گا۔

(۲) ہمارے آباء واجداد عالی قدر انبیاء کرام تھے، ان کا رب تعالیٰ کے ہاں خصوصی مرتبہ ہے وہ اس کی مرضی کو تبدیل کرسکتے ہیں اگر بالفرض اللہ تعالیٰ نے ہمیں عذاب دینے کا ارادہ فرمایا:

"پدران ما را بجدوکد خلاص خواہند کنانید"

تو ہمارے آباء واجداد اپنی کوشش اور محنت سے ہمیں چھڑالیں گے۔

تنبیہ: اہل سنت مسلمانوں کا عقیدہ یہ ہے کہ انبیاء کرام شفاعت فرمائیں گے رب تعالیٰ کے ہاں اپنے عجز کا اظہار کریں گے اور رب تعالیٰ ان پر اپنی خصوصی مہربانی فرماتے ہوئے ان کی سفارش کو قبول فرمائے گا۔ اور یہود کا عقیدہ یہ ہے کہ انبیاء کرام اپنی وجاہت سے رب تعالیٰ کو مرضی تبدیل کرنے پر مجبور کردیں گے، یہ فرق واضح رہے کہ کوئی گستاخِ انبیاء کرام ان کی شفاعت کو اور اہل سنت کے عقیدہ کو یہود کے عقیدہ سے تشبیہ نہ دے۔

(۳) وہ کہتے تھے بیشک یہود کافر بھی کیوں نہ ہوجائیں رب تعالیٰ ان کو چالیس دنوں سے زیادہ عذاب نہیں دے گا وہ چالیس دن بھی اس لئے کہ ہمارے آباؤ اجداد نے چالیس دن بچھڑے کی پوجا کی تھی۔

(۴) یہود کی شریعت قیامت تک واجب العمل ہے یہ کبھی منسوخ نہیں ہوسکتی۔ یہ ان کا صریح جھوٹ تھا کہ ان کی اپنی کتاب نبی کریم ﷺ کی شریعت کو ناسخ کہتی تھی۔

(۵) اور وہ یہ کہتے تھے کہ نبوت کی استعداد بنی اسرائیل میں سے صرف حضرت اسحاق علیہ السلام کی اولاد میں پائی جاتی ہے۔ کسی اور خاندان میں نبوت کی استعداد ہی نہیں۔

یہ ان کی من گھڑت آرزوئیں اور خیالات باطلہ، اور جھوٹے اقوال تھے، بس یہی ان کے علم کے

محور تھا توراۃ کے حقیقی علم سے خالی تھے البتہ پڑھنا جانتے سمجھتے نہیں تھے اور من گھڑت اقوال کو جانتے۔
(ماخوذ از کبیر، عزیزی، روح المعانی، کشاف)

اس وضاحت کے بعد اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کی طرف غور کریں آپ نے دونوں معنی تحریر کر کے تفاسیر کا نچوڑ پیش کر دیا (جو کتاب کو نہیں جانتے مگر زبانی پڑھ لینا یا کچھ اپنی من گھڑت) راقم نے بھی اسی معنی کو نقل کیا ہے۔

﴿وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ﴾ : ''نہیں ہیں وہ مگر گمان میں'' یعنی ان کو یقینی علم حاصل نہیں تھا بلکہ ان کا علم ظنی تھا جن کا علم قطعی اور یقینی نہ ہو ان کو ایمان کیسے حاصل ہوتا ایمان کی دار و مدار تو علم یقینی پر ہے۔ (روح المعانی)

فائدہ : آیۃ کریمہ سے یہ فائدہ حاصل ہوا کہ معارف (علمی مسائل) تمام کسبی ہیں۔ ضروری (بدیہی) نہیں۔ اسی لئے علم نہ حاصل کرنے والے صرف گمان سے بیان کرنے والے کی مذمت کی گئی۔

☆ اور یہ فائدہ حاصل ہوا '' **بطلان التقليد مطلقا وهو مشكل لان التقليد فى الفروع جائز عندنا** '' اگر چہ بظاہر مطلقا تقلید کا باطل ہونا سمجھ میں آ رہا ہے حالانکہ یہ کہنا خود باطل ہے کیونکہ تقلید اصول میں (یعنی اعتقادیات میں) منع ہے فروع میں جائز ہے یہی ہمارا مذہب ہے۔

خیال رہے یہود جو کہ جاہل تھے اور علماء کی تقلید کرتے تھے ان کی مذمت صرف اسی وجہ سے کی گئی کہ وہ باطل عقائد ان سے حاصل کر کے گمراہ ہو گئے۔

☆ اور فائدہ یہ حاصل ہوا کہ گمراہ کرنے والا اگر چہ برا انسان ہے۔ لیکن گمراہ کرنے والے کے جال میں پھنس کر گمراہ ہونے والا، صحیح عقائد بیان کرنے والے کی بات کو نہ تسلیم کرنے والا بھی برا انسان ہے۔ اسی وجہ سے رب تعالیٰ نے گمراہ کرنے والے اور گمراہ ہونے والے دونوں کی ہی مذمت بیان کی۔

☆ اور فائدہ یہ حاصل ہوا '' **ان الاكتفاء بالظن فى اصول الدين غير جائز** '' اصول دین میں یعنی اعتقادیات میں صرف ظن (گمان) پر اکتفاء کرنا جائز نہیں بلکہ یقینی علم حاصل ہونا چاہئے۔ (از کبیر)

﴿ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتَابَ بِاَيْدِيْهِمْ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ لِيَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا فَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا كَتَبَتْ اَيْدِيْهِمْ وَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا يَكْسِبُوْنَ ﴾ (آیت ۷۹)

۱) ''تو خرابی ہے ان کے لئے جو کتاب اپنے ہاتھ سے لکھیں پھر کہہ دیں یہ خدا کے پاس سے ہے کہ اس کے عوض تھوڑے دام حاصل کریں تو خرابی ہے ان کے لئے ان کے ہاتھوں کے لکھے سے اور خرابی ان کے لئے اس کمائی سے''۔

۲) ''تو ہلاکت ہے ان لوگوں کے لئے جو لکھتے ہیں کتاب اپنے ہاتھوں سے، پھر کہتے ہیں یہ اللہ کی طرف سے ہے تاکہ حاصل کریں اس کے بدلے تھوڑا مال تو ہلاکت ہے ان کے لئے اس سے جو ان کے ہاتھوں نے لکھا، اور ہلاکت ہے ان کے لئے اس سے جو وہ کسب کرتے ہیں''۔

اس آیۃ کریمہ میں یہود کی ایک اور قسم کا ذکر کیا جا رہا ہے جو دوسرے لوگوں کو گمراہی کی دعوت دیتے تھے، اور جھوٹ کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کرتے، اور لوگوں کا مال باطل طریقہ سے کھاتے ہیں۔ (ابن کثیر)

یہ لوگ توراۃ کی تحریف کر کے نبی کریم ﷺ کے اوصاف کو بدل کر اور توراۃ کے احکام کو بدل کر اپنی طرف سے اپنے ہی ہاتھوں سے لکھ کر یہ کہتے ہیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہی ارشاد فرمایا ہے ان کی تحریف کی وجہ یہ تھی کہ وہ اس کے بدلے دنیاوی نفع کچھ حاصل کر لیتے تھے تو رب تعالیٰ نے ان کے اس فعل اور ان کی لکھی ہوئی کتاب اور ان کی کمائی کے لئے لفظ ویل ذکر کیا جس کی تفصیل تو ان شاء اللہ قریب ہی آ رہی ہے مختصر مطلب یہ ہے کہ ان کے لئے خرابی ان کے لئے بربادی ہے ان کے لئے ہلاکت ہے۔

﴿ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتَابَ بِاَيْدِيْهِمْ ﴾:

" والويل الهلاک والدمار وهی کلمة مشهورة فی اللغة "

''ویل'' کا لغت میں مشہور معنیٰ ''ہلاک ہو جانا، برباد ہو جانا۔

ایک لفظ کثیر معانی پر مشتمل ہے:

☆ " عن ابی عیاض ویل صدید فی اصل جھنم " ابوعیاض فرماتے ہیں جہنم کی گہرائی اوراس کی تہ میں پیپ کی ایک وادی ہے جسے ویل کہا جاتا ہے۔ (ابن کثیر)

☆ " وقال عطاء بن یسار الویل واد فی جھنم لو ارسلت فیه الجبال لذابت من حرة " (شیخ زاده)

عطاء بن یسار کہتے ہیں ویل جہنم میں ایک وادی کا نام ہے اگراس میں پہاڑوں کوڈال دیا جائے تو وہ بھی اس کی گرمی کی وجہ سے پگھل جائیں۔

☆ " وروی عن ابی سعید الخدری ان النبی ﷺ قال ویل واد فی جھنم یھوی فیه الکافر اربعین خریفا قبل ان یبلغ قعره "

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ نے فرمایا ویل جہنم میں ایک وادی کا نام ہے (وہ اتنی زیادہ گہری ہے کہ) اس میں کافر کو جب پھینکا جائے گا تو وہ اس کی تہ میں چالیس سال تک پہنچے گا۔ (از شیخ زاده)

علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے ان معانی کے بغیر اور مزید معانی بیان کئے ہیں۔

☆ " وعن ابن عباس الویل المشقة من العذاب "

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ عذاب سے جو مشقت برداشت کرنی پڑتی ہے اسے ویل کہا جاتا ہے۔

☆ " وقال الخلیل الویل شدة الشر " خیل کہتے ہیں شر کی شدت کو بھی ویل کہا جاتا ہے۔

☆ " قال الاصمعی الویل تفجع " اصمعی نے کہا جزع فزع کو ویل کہا جاتا ہے۔

شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمہ اللہ نے کچھ اور معانی بھی تحریر فرمائے ہیں۔

☆ ابن جریر نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے نقل فرمایا کہ جہنم میں آگ کا ایک پہاڑ ہے اسے '' ویل '' کہا جاتا ہے۔ یہ وہی پہاڑ ہے جس پر ان یہود کو رکھا جائے گا جنہوں نے اللہ تعالیٰ

کی کتاب میں تحریف کی۔

☆ بزار وابن مردویہ نے سعد بن ابی وقاص سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ جہنم میں آگ کا ایک بہت بڑا پتھر ہے جس کو ''ویل'' کہا گیا ہے اس پر بے دین چوہدریوں اور بے ایمان جماعت کے لیڈروں کو کبھی اوپر چڑھایا جائے گا اور کبھی نیچے اتارا جائے گا۔ (از عزیزی)

تمام معانی کا مطلب ایک ہے: ''ویل'' جہنم میں ایک وادی کا بھی نام ہے جس کی گہرائی تک پہنچنے میں چالیس سال درکار ہوں گے۔ اس وادی میں جہنم والے لوگوں کی پیپ ہوگی، اس وادی میں اتنی شدید حرارت ہوگی کہ اس میں پہاڑ بھی پگھل جائیں گے۔

اور جہنم کے شعلے مارنے والی آگ کی بلندی ایک پہاڑ اور ایک بڑے پتھر یعنی چٹان کی طرح نظر آئے گی۔ اللہ تعالیٰ کی کتاب میں تحریف کرنے والوں کو کبھی بلندی تک پہنچایا جائے گا اور کبھی نیچے پھینکا جائے گا اس عذاب کی وجہ سے انہیں شدید مشقت اٹھانی پڑے گی۔ یہ عذاب ان کے لئے شدید شر کا سبب ہوگا۔ یہ ان کے لئے غم بڑھانے والا ہوگا، جس میں وہ جزع وفزع کریں گے۔ یہ شدید عذاب ان کے لئے خرابی اور بربادی کا سبب ہوگا۔

راقم کی اس توجیہ میں تمام معانی سمٹ کر ایک جگہ جمع ہو گئے کسی غیر مسلم، بے دین کو یہ کہنے کی جرات نہیں ہو سکے گی کہ تمہارے قرآن اور تمہاری احادیث میں تعارض پایا جاتا ہے۔ تعارض نہیں صرف جہالت سمجھنے میں رکاوٹ کا سبب ہے۔

﴿ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ﴾: ''پھر کہتے یہ اللہ کی طرف سے ہے'' وہ لوگ دو وجہ سے گناہ کے مرتکب ہو رہے تھے کیونکہ اللہ تعالیٰ کی کتاب اپنی طرف سے اس طرح کی عبارت اس کتاب کی عبارت سے ملا کر لکھنا کہ جس کو عام انسان اللہ تعالیٰ کی کتاب کا حصہ ہی سمجھے یہ بھی حرام اور گناہ کبیرہ کا سبب ہے۔ پھر دوسرا ان کا جھوٹ اور افتراء کہ یہ کلام رب تعالیٰ کا ہے یہ پہلے جرم سے بھی عظیم جرم تھا۔

انہوں نے تبدیل کیا: اگر چہ وہ توراۃ کے کئی احکام کو بھی اپنے مرضی کے مطابق تبدیل کرنے کے مجرم ہوئے تھے لیکن سب سے بڑا ظلم انہوں نے یہ کیا تھا کہ نبی کریم ﷺ کے جو اوصاف توراۃ میں ذکر تھے ان کو انہوں نے تبدیل کر دیا تھا، ان کا خیال تھا کہ ہمارے اس طریقہ سے لوگ کم تعداد میں اسلام قبول کریں گے۔ انہیں یہ معلوم نہیں تھا کہ جسے رب تعالیٰ بڑھانا چاہے اسے دنیا کی کوئی طاقت گھٹا نہیں سکتی۔

آج کل یہ سازش زور و شور سے چل رہی ہے کہ نبی کریم ﷺ کو ایک عام انسان کی حیثیت میں پیش کرو کہ محبت مصطفیٰ ﷺ کی وجہ سے لوگ جو تن، من، دھن کی بازی لگا دیتے ہیں اس میں کمی آ جائے یہ غیر مسلموں کو معلوم ہے کہ سچا اور حقیقی مسلمان محبت مصطفیٰ ﷺ کا متوالا ہوتا ہے، وہ آپ کے نام پر جان قربان کرنا ایمان کا حصہ سمجھتا ہے۔

یہود و نصاریٰ اور ان کے ایجنٹ آج کل اس کوشش میں ہیں کہ اس میں کمی ہو جائے وہ بدبخت نہیں سمجھتے کہ رب تعالیٰ نے فرما دیا ہے:

﴿ وَلَلْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰى ﴾:

''اے محبوب آپ کی ہر آنے والی گھڑی پہلی سے بہتر ہے''

جسے رب تعالیٰ نے بڑھانے کا وعدہ فرما دیا اسے یہ گھٹانے کی فکر میں ہیں۔ ان کم بختوں کو یہ بھی معلوم نہیں ہو رہا کہ ہمارا باپ جب پہلے حاکم تھا اس وقت سے وہ کوشش کر رہا ہے کہ نبی کریم ﷺ کی شان کو نام نہاد مسلمانوں کے ذریعے ہی کم کیا جائے۔ لیکن ایک دفعہ تو وہ دفعہ ہو گیا شان مصطفیٰ ﷺ بڑھتی چلی گئی، لیکن آجکل اس نے اپنے چیلے اور اپنی ذریت معنوی ماڈرن لوگوں کو بنایا ہوا ہے جن میں زیادہ زندیق، دہریے اور قادیانی ہیں۔ لیکن ایک مرتبہ خود ان بکاؤ مال لوگوں کا باپ اپنی تباہی کا شکار ہو چکا ہے۔ لیکن اس کی ذریت معنوی اس کی پشت پناہی کر رہی ہے۔

مقام افسوس یہ ہے کہ کافر سارے کے سارے ایک ہیں " الكفر ملة واحدة " کا کامل مصداق ہیں، لیکن مسلمان بھی کافروں کا ساتھ دے رہے ہیں اور یہ کہہ رہے ہیں کہ ہم عالمی برادری

کے ساتھ ہیں ہم یک جہتی کا مظاہرہ کر رہے ہیں خیر اس میں زیادہ تعجب اس لئے نہیں کہ قانون یہ ہے "کل شئی یرجع الی اصلہ" ہر چیز اپنے اصل کی طرف لوٹتی ہے۔اس لئے ذریت معنوی اپنے محسن باپ کی رقوم کا حق ادا نہ کرے تو اور کون کرے گا۔

﴿ لِيَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا ﴾: "تا کہ وہ حاصل اس کے بدلے تھوڑا ثمن" اشتراء کا معنی خریدنا ہے لیکن یہاں اس کا معنی ہے تبدیل کرنا، حاصل کرنا اور "ثمن" کسی چیز کی قیمت جو بیچنے اور خریدنے والے کے درمیان طے ہو جائے یہاں مطلقاً اس سے مراد مال ہے۔یعنی وہ دنیاوی مقاصد کے پیش نظر دنیا کا گھٹیا مال لے کر کتاب کی تحریف کرتے تھے۔

" وھو ان جل اقل قلیل بالنسبة الی ما استوجبوہ من العذاب الدائم وحرموہ من الثواب المقیم "

ذکر کیا گیا ہے کہ وہ قلیل مال لیتے تھے۔ دنیا کے لحاظ پر اگر چہ زیادہ مال بھی لے لیا جائے، لیکن وہ بنسبت دائمی عذاب کے مستحق ہونے اور ہمیشہ کے ثواب سے محروم ہونے کے گھٹیا ہی متصور ہوگا۔ (از روح المعانی)

﴿ فَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا كَتَبَتْ اَيْدِيْهِمْ ﴾: "تو خرابی ہے ان کے ہاتھوں کے لکھے سے"

﴿ وَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا يَكْسِبُوْنَ ﴾: "اور خرابی ان کے لئے اس کمائی سے"

" واما معنی فلان العبد انما یستحق الویل والعقاب لا جل فعلہ وکسبہ وھو الکتب والکسب ھھنا لا لاجل ذات المکتوب والمسکوب "

یعنی وہ خرابی اور ہلاکت کے مستحق اپنے فعل یعنی اللہ کی کتاب میں اپنی طرف سے عبارات کو لکھنے کی وجہ سے ہوئے اور اسی طرح اپنی طرف سے تحریف کر کے اس پر مال لینے کی وجہ سے خرابی کے مستحق ہوئے۔

نکتہ: ایک دفعہ ویل ذکر کے صرف معطوف اور معطوف علیہ کی صورت میں باقی جملے ذکر نہیں فرمائے بلکہ تین مرتبہ علیحدہ علیحدہ "ویل" ذکر کر کے اشارہ کیا کہ ان کے تین جرم علیحدہ علیحدہ تھے ہر جرم بذاتہ خود ہی بہت بڑا جرم تھا تین نے مل کر ان کو ایمان سے کتنا ہی دور کر دیا۔

اللہ تعالیٰ کی کتاب میں اپنی طرف سے ان کا عبارات کو شامل کرنا ایک جرم تھا۔ پھر اس کو رب تعالیٰ کی طرف منسوب کرنا دوسرا جرم تھا کہ یہ اللہ کا کلام ہے۔ اور پھر اس کے ذریعے رشوت لینا حرام طریقہ سے مال جمع کرنا اور ہی جرم تھا۔

فلذلک ذکر اللہ تعالیٰ لھم ثلاثۃ ویلات کل ویل بمقالۃ ذنب "

اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے تین مرتبہ "ویل" ذکر فرمایا یعنی ہر گناہ کے مقابلہ میں "ویل" ذکر کیا تین گناہ اور تین "ویل"۔ (از شیخ زادہ)

اب اس شیخ زادہ رحمہ اللہ کی تفسیر کے بعد اعلیٰ حضرت کے ترجمہ پر ایک نظر پھر کریں۔ تینوں کا علیحدہ علیحدہ نمایاں طور پر فرق ترجمہ سے انشاء اللہ نظر آئے گا۔

مسئلہ : قرآن پاک میں بطور تفسیر عربی الفاظ، یا احادیث مبارکہ کو اس طرح لکھنا کہ قرآن پاک اور غیر قرآن کا فرق نظر نہ آئے ناجائز ہے۔ اسی لئے عربی تفاسیر میں قرآن پاک کے الفاظ مبارکہ پر لکیر کھینچ دی جاتی ہے۔ یا ان کو بریکٹ میں لکھ دیا جاتا ہے۔ یا ان کی لکھائی کا رنگ مختلف کر دیا جاتا ہے۔

فائدہ جلیلہ : عبد الرزاق اور ابن ابی داؤد نے عبد اللہ بن شُقیق عقیلی سے روایت بیان کی:

" کان اصحاب رسول اللہ ﷺ یشددون فی بیع المصاحف ویرونہ عظیما "

رسول اللہ ﷺ کے صحابہ کرام قرآن پاک کے نسخوں کو بیچنے سے ممانعت میں شدت اختیار فرماتے تھے اور اسکے بیچنے میں بہت ناپسندیدگی کا اظہار کرتے تھے۔

حضرت امام زین العابدین رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ صحابہ کرام کے زمانہ میں قرآن پاک کے نسخوں کو بیچنے کا رواج نہیں تھا۔ بلکہ طریقہ یہ رائج تھا کہ اگر کسی کو قرآن پاک کے نسخے کی ضرورت در پیش آتی تو وہ لکھنے کا تمام سامان مہیا کر کے مسجد کے منبر کے پاس آ کر بیٹھ جاتا۔ اور دوسرے احباب کو کہتا کہ آپ قرآن پاک کے لکھنے میں میری امداد کریں۔ جو شخص بھی لکھنا جانتا ہوتا وہ اس کے لکھنے میں امداد کرتا

اس طرح بہت سے آدمیوں کے مل کر لکھنے کی وجہ سے قرآن پاک کا نسخہ چند دنوں میں تیار ہو جاتا۔

"اول ایں بدعت در آخر زمان معاویہ بن ابی سفیان رائج شدہ"

قرآن پاک کی نسخے لکھ کر بیچنے کی بدعت سب سے پہلے حضرت امیر معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہما کے زمانہ میں جاری ہوئی۔

"لیکن ایں بدعت حسنہ است بدعة سیئہ نیست"

لیکن یہ اچھی بدعت ہے جو جائز ہے بلکہ مستحسن اور مستحب ہے اس بدعت کو ناجائز کہنا جہالت ہوگا۔

بات بات پر بدعت بدعت کہنے والوں کو چاہئے کہ وہ قرآن پاک کے طبع شدہ نسخے خرید کر بدعت کے مرتکب نہ ہوں بلکہ اپنے ہاتھوں سے قرآن پاک لکھ کر پڑھا کریں۔ یہ کون سا طریقہ ہے جو جی میں آئے وہ جائز ہو جائے اور جی میں نہ آئے وہ ناجائز ہے۔

قرآن پاک کا نسخہ بیچنے کے جواز پر اجماع امت ہے:

جب علماء نے غور کیا، تحقیق کی کہ اگر کوئی شخص قرآن پاک لکھ کر وہ نسخہ بیچ دیتا ہے تو اس میں حرام ہونے کی تو کوئی وجہ نہیں۔ "واجماع برجواز آں متحقق گشت" تو اس کے جواز پر اجماع متحقق ہو گیا۔

تنبیہ: زیر بحث آیۃ کریمہ سے یہ ثابت کرنا ممکن نہیں کہ قرآن پاک کے نسخے تیار کر کے بیچنا یہود کی مشابہت ہے کیونکہ یہود تو اللہ کی کتاب میں اپنی طرف سے عبارات کو شامل کر کے کہتے تھے کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے ان کا یہ فعل تو کفر تھا۔

لیکن کوئی مومن نہ اس طرح کی جرات کر سکتا ہے اور نہ ہی اس کے متعلق سوچ سکتا ہے حقیقت تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک کی حفاظت خود اپنے ذمہ کرم پر کی ہے اس لئے یہود و نصاریٰ کی کوئی کوشش بھی قرآن پاک کو تبدیل کرنے کی تا قیامت کامیاب نہیں ہو سکے گی۔

☆ قرآن پاک کے نسخے تیار کر کے بیچنے کے متعلق ابن ابی داؤد نے روایت کی کہ حضرت ابن عباس

اور محمد بن حنفیہ سے سوال کیا گیا تو انہوں نے فرمایا " لا باس انما یاخذون اجور ایدیھم " کوئی حرج نہیں وہ اپنے ہاتھوں کی کمائی کی اجرت حاصل کر رہے ہیں۔

☆ ایک اور قول محمد بن حنفیہ نے بیان کیا ہے کہ علماء نے کہا ہے " لا باس انما بیع الورق وعمل یدیه " کہ کوئی حرج نہیں بیشک یہ اوراق کی بیع ہے اور ہاتھوں کی کمائی ہے ہے۔

☆ حضرت امام محمد باقر سے روایت ہے " لا بأس بشراء المصاحف وان یعطی الاجر علی کتابتھا " کہ قرآن پاک کے نسخے خریدنے اور ان کی کتابت پر اجرت دینے میں کوئی حرج نہیں۔

(از عزیزی)

راقم کا موقف اس میں یہ ہے کہ ابتدائی طور پر نبی کریم ﷺ کے زمانہ اور صحابہ کرام کے دور میں تقوی کے طور پر قرآن پاک کے نسخے تیار کر کے نہیں بیچے جاتے تھے اسی تقوی کے پیش نظر متقدمین میں سے بعض حضرات نے پسند نہیں کیا تھا، لیکن جب یہ دیکھا گیا کہ لوگ اب سست ہوتے جا رہے ہیں قرآن پاک کے نسخے تیار کرنے میں ایک دوسرے کی معاونت نہیں ہو رہی تو بطور محنت و مزدوری کے تیار کرنے میں کوئی وجہ ناجائز نہ ہونے کی پا کر جواز کا قول کیا گیا۔

اس لئے یہ کہنا کہ پہلے بلا تحقیق اور مسئلہ کی طرف توجہ کرنے کے بغیر عدم جواز کا فتوی دیا گیا پھر تحقیق کر کے جواز کا فتوی دیا گیا یہ کوئی مناسب قول نہیں اور سلف صالحین متقدمین صحابہ کرام اور تابعین کے متعلق یہ کہنا کسی حد تک مناسب نظر نہیں آتا۔

☆☆☆☆☆

﴿ وَقَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً ؕ قُلْ اَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللّٰهِ عَهْدًا فَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ عَهْدَهٗٓ اَمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَالَا تَعْلَمُوْنَ ﴾ (آیت ۸۰)

۱) ''اور بولے ہمیں تو آگ نہ چھوئے گی مگر گنتی کے دن تم فرمادو کیا خدا سے تم نے کوئی عہد لے رکھا ہے جب تو اللہ ہرگز اپنا عہد کا خلاف نہ کرے گا یا خدا پر وہ بات کہتے ہو جس کا تمہیں علم نہیں''۔

۲) اور انہوں نے کہا ہرگز ہمیں نہیں چھوئے گی آگ مگر چند دن فرمادیجئے کیا تم نے لیا ہے اللہ سے عہد پھر تو ہرگز نہیں کرے گا اللہ اپنے عہد کا بلکہ تم کہتے ہو اللہ پر وہ بات جو تم نہیں جانتے''۔

شانِ نزول: نبی کریم ﷺ کے زمانہ کے یہود کے مختلف اقوال کے بعد یہ آیت نازل ہوئی ان کے اقوال تمام باطل تھے۔

(۱) " قال ابن عباس قالت اليهود مدة الدنيا سبعة آلاف سنة وانا نعذب بكل الف سنة يوما ثم ينقطع عنا العذاب بعد سبعة ايام " (خازن)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں یہود (کبھی تو یہ) کہتے تھے کہ دنیا کی کل مدت سات ہزار سال ہے اور ہمیں ہر ہزار سال کے بدلے ایک دن عذاب دیا جائے گا۔ یعنی ہمیں کل سات دن عذاب دیا جائے گا پھر ہم سے عذاب کو اٹھالیا جائے گا۔

(۲) "روى الضحاك عن ابن عباس رضی اللہ عنہما ان اليهود زعمت انهم وجدوا فى التوراة ان ما بين طرفى جهنم سيرة اربعين سنة الى ان ينتهوا الى شجرة الزقوم وانهم يقطعون فى كل سيرة سنة فيكملونها " (ابو السعود)

ضحاک حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ بیشک یہود (کبھی یہ) گمان کرتے تھے کہ انہوں نے توراۃ میں یہ پایا ہے کہ جہنم کی دونوں طرفوں میں چالیس سال کی راہ ہے چالیس سال کی مسافت کے بعد جہنم والے تھوہر کے درخت کے پاس پہنچیں گے۔ لیکن ہم وہ چالیس دنوں میں مسافت طے کرلیں گے۔

(۳) " وقال قتادة وعطاء یعنون اربعین یوما التی عبد فیھا آباؤھم العجل "

قتادہ اور عطاء فرماتے ہیں کہ یہود (کبھی تو یہ کہتے تھے) کہ ہم تو سمجھتے ہیں کہ ہمیں صرف چالیس دن عذاب ہوگا وہ بھی اس لئے کہ ہمارے آباءواجداد نے چالیس دن بچھڑے کی پوجا کی تھی۔

(۴) " وقال الحسن وابو العالیة قالوا ان ربنا عقب علینا فی امر فاقسم لیعذبنا اربعین یوما فلن تمسنا النار الا اربعین یوما تحلة القسم "

حضرت حسن اور ابوالعالیہ کہتے ہیں بیشک ہمارے رب نے ہم پر کسی معاملہ میں عتاب فرمایا پھر قسم اٹھا دی کہ وہ ہمیں چالیس دن عذاب دے گا۔ بس وہی چالیس دن تک رب تعالیٰ ہمیں عذاب صرف اس لئے دی گا تا کہ اس کی قسم پوری ہو جائے۔ (مظھری)

(۵) " قیل ان النبی ﷺ قال للیھود من اھل النار ، قالوا نحن ثم تخلفونا انتم فقال کذبتم لقد علمتم انا لا نخلفکم "

ایک قول یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ایک مرتبہ یہود کو کہا کہ جہنم میں کون جائے گا تو انہوں نے کہا کہ ہم جائیں گے (لیکن ہم تو بہت تھوڑے دن رہیں گے) پھر ہمارے پیچھے تم جہنم میں جاؤ گے (معاذ اللہ) (اور پھر تم جہنم میں ہمیشہ رہو گے) تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا تم جھوٹے ہو، تمہیں علم حاصل ہے کہ ہم تمہارے بعد جہنم میں نہیں جائیں گے۔ (قرطبی)

یہی قول ان کا تفسیر ابن کثیر میں وضاحت سے مذکور ہے:

" عن ابی ھریرة قال لما فتحت خیبر اھدیت لرسول ﷺ شاة فیھا سم فقال رسول اللہ ﷺ اجمعوا لی من کان من الیھود ھھنا فقال لھم رسول اللہ ﷺ من ابوکم قالوا فلان قال کذبتم بل ابوکم فلان فقالوا صدقت وبررت ثم قال لھم ھل انتم صادقی عن شئی ان سالتکم عنه قالوا نعم یا ابا القاسم قالوا نعم یا ابا القاسم وان کذبناک عرفت کذبنا کما عرفته فی ابینا فقال لھم رسول اللہ ﷺ من اھل النار فقالوا نکون فیھا یسیرا ثم تخلفونا فیھا فقال لھم رسول اللہ ﷺ اخسئوا واللہ لا نخلفکم فیھا ابدا ثم قال لھم رسول اللہ ﷺ ھل انتم صادقی

عن شئی ان سألتکم عنه قالوا نعم یا ابا القاسم قال هل جعلتم فی هذه الشاة سما فقالوا نعم قال فما حملکم علی ذلک فقالوا اردنا ان کنت کاذبا ان نستریح منک وان کنت نبیا لم یضرک "

(رواه الامام احمد والبخاری والنسائی من حدیث اللیث بن سعد بنحوه) (ابن کثیر)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے جب خیبر فتح ہوا تو رسول اللہ ﷺ کو ایک بکری (کا گوشت) ہدیہ کے طور پر دی گئی جس میں زہر ملا دیا گیا تھا۔ تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا یہود کو میرے پاس جمع کرو (جب وہ جمع ہو گئے) تو نبی کریم ﷺ نے ان سے پوچھا تمہارا باپ کون ہے؟ انہوں نے کہا فلاں آپ نے فرمایا تم نے جھوٹ بولا ہے تمہارا باپ فلاں ہے انہوں نے کہا تم نے سچ کہا ہے تم نے درست کہا ہے پھر آپ نے ان کو کہا کہ اگر میں تم سے ایک سوال کروں تو کیا تم مجھے سچ بتاؤ گے، انہوں نے کہا اگر ہم نے جھوٹ بولا تو اے ابوالقاسم آپ کو ہمارے جھوٹ کا پتہ چل جائے گا جیسا کہ تمہیں ہمارے باپ کے متعلق پتہ چل گیا ہے نبی کریم ﷺ نے فرمایا (جہنم کی) آگ میں کون جائیں گے وہ کہنے لگے ہم تھوڑی دیر کے لئے جائیں گے پھر تم ہماری جگہ جاؤ گے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا دفعہ ہو جاؤ، قسم ہے اللہ تعالیٰ کی ہم تمہاری جگہ کبھی نہیں جائیں گے پھر آپ نے ان سے پوچھا کہ میں تم سے سوال کروں تو تم کیا اس کا سچا جواب دو گے؟ انہوں نے کہا ہاں اے ابوالقاسم، آپ نے فرمایا کیا تم نے اس بکری (کے گوشت) کو زہر آلود کیا؟ انہوں نے کہا ہاں آپ نے فرمایا ایسا کرنے پر تمہیں کس چیز نے برانگیختہ کیا؟ وہ کہنے لگے ہم نے ارادہ کیا کہ اگر تم جھوٹے ہوئے تو ہمیں تم سے راحت حاصل ہو جائے گی اور اگر تم سچے نبی ہوئے تو تمہیں یہ زہر کوئی نقصان نہیں دے گا۔

یہود کے ان تمام لغو، بیہودہ، جھوٹے، باطل اقوال کے بعد اس آیۃ کریمہ کا نزول ہوا۔ یہاں سے یہود کی ایک اور قباحت کا ذکر کیا جا رہا ہے کہ وہ اپنی طرف سے یقینی دعویٰ کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں عذاب نہیں دے گا سوائے چند دنوں کے، تو رب تعالیٰ نے اپنے نبی کریم ﷺ کو ارشاد فرمایا کہ آپ ان کو کہہ دیجئے کیا تم نے اللہ تعالیٰ سے کوئی عہد لے رکھا ہے ہاں اگر اس کا تمہارے ساتھ کوئی عہد ہے

کہ وہ تمہیں سوائے چند دنوں کے عذاب نہیں دے گا تو یقیناً ایسا ہی ہونا چاہئے کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنے وعدہ کے خلاف نہیں کرتا لیکن یہ تمہارا دعوی ہی دعوی ہے اس پر تمہارے پاس کوئی دلیل نہیں ۔صرف زبانی طور پر بغیر کسی دلیل کے تمہارے قول کا کوئی اعتبار نہیں وہ تو سراسر جھوٹ ہے۔

بلکہ تم اللہ تعالیٰ کی طرف جھوٹ کی نسبت کر رہے ہو یعنی یہ قول بھی تمہارا من گھڑت اور جھوٹا ہے اور کہتے یہ ہو کہ اللہ تعالیٰ ہمیں سوائے چند دنوں کے عذاب نہیں دے گا سوائے چند دنوں کے۔تم صرف اپنے عقل سے یہ کہہ رہے ہو اور منسوب رب تعالیٰ کی طرف کر رہے ہو حقیقت میں تم ایک اور عظیم جرم کے مرتکب ہو رہے ہو۔

﴿وَقَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّا اَیَّامًا مَّعْدُوْدَةً ﴾:

" المس ایصال الشئی بالبشرة بحیث تتأثر الحاسة به واللمس کالطلب له ولذلک یقال المسه فلا اجده" (بیضاوی)

" مس " کا معنی یہ ہے کسی چیز کو چمڑے تک پہنچانا اس لحاظ پر کہ وہ حس کو قبول کرے اور اسی حس کی طلب کو " لمس " کہا جاتا ہے۔جیسا کہ بیان کیا جاتا ہے " المسه فلا اجده " میں اسے تلاش کر رہا ہوں لیکن پا نہیں رہا۔اسی وجہ سے کہیں " مس " (چھونا) کے پائے جانے کے باوجود "لمس " (طلب کرنا) نہیں پایا جاتا۔﴿ اِلَّا اَیَّامًا مَّعْدُوْدَةً ﴾ محصورة، یعنی معدودہ کا معنی ہے گنتی کے چند دن۔

طلباء کرام مستثنیٰ مفرغ کو جانتے ہیں یہاں بھی استثناء مفرغ پایا گیا ہے اصل معنوی لحاظ پر عبارت یوں ہوگی:

"﴿ لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ ﴾ ابدا ﴿ اِلَّا اَیَّامًا ﴾ قلائل "

" ہرگز ہمیں آگ مس نہیں کرے گی کبھی بھی سوائے چند دنوں کے"۔

اسلئے کہ ﴿ مَعْدُوْدَةً ﴾ کا لفظ جب مطلق ذکر کیا جائے تو اس سے مراد "قلیل" ہی لیا جاتا ہے۔

جیسا کہ رب تعالیٰ کے ارشاد گرامی ﴿ دراهم معدودة ﴾ میں بھی قلیل دراھم ہی مراد ہیں۔

(از بیضاوی و شیخ زادہ)

تنبیہ : ﴿ مَعْدُوْدَةً ﴾ کا معنیٰ قلیل جو ذکر کیا ہے اس سے مراد جمع قلت والا معنیٰ نہیں جو دس سے زیادہ پر نہ بولا جا سکے۔ بلکہ یہاں با محاورہ معنیٰ مراد لیا گیا ہے، چند دن۔ رمضان کے تیس روزوں کے لئے بھی ﴿ ایاً ما مَعْدُوْدَا تٍ ﴾ ذکر کیا گیا ہے جو سال کی بنسبت چند دن ہی ہیں۔

طلباء کرام کی توجہ کے لئے: اس مقام پر ﴿ اَیَامًا مَعْدُوْدَةً ﴾ ذکر کیا گیا ہے اور سورۃ آل عمران میں ﴿ اَیَامًا مَعْدُوْدَاتٍ ﴾ ذکر کیا ہے وجہ فرق کیا ہے؟ جبکہ موصوف دونوں میں ایک ﴿ ایاما ﴾ ہے۔ تو اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ اسم اگر مذکر ہو (غیر ذوی العقول سے ہو) تو اس کی صفت کی جمع ''تا'' سے آتی ہے۔ یعنی واحد مؤنث ہوگی۔ جیسے کوز کی جمع کیزان اور اس کی صفت ''مکسورة'' آتی ہے اور اسی طرح ''ثوب'' کی جمع ''ثیاب'' اور اسکی صفت ''مقطوعة'' آتی ہے۔

اور جب اسم غیر ذو العقول واحد مؤنث ہو تو اس کی جمع کی صفت ''الف، تا'' سے آئے گی جیسا کہ ''جرة'' کی جمع ''جرار'' آتی ہے اس کی صفت کی جمع ''مکسورات'' الف تا سے آتی ہے۔ لیکن مذکر غیر ذوی العقول جمع کی صفت ''الف تا'' سے آ سکتی ہے جیسے ﴿ اَیَامًا مَعْدُوْدَاتٍ ﴾ الشهور الماضيات، لہٰذا سورۃ بقرہ میں اصل مذکور ہے ﴿ اَیَامًا مَعْدُوْدَةً ﴾ اور سورۃ آل عمران میں فرع ذکر ہے ﴿ اَیَامًا مَعْدُوْدَاتٍ ﴾

﴿ قُلْ اَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللّٰهِ عَهْدًا فَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ عَهْدَهٗ ﴾:

''فرما دیجئے کیا تم نے اللہ سے عہد لیا ہے پھر تو ہرگز اللہ تعالیٰ اپنے وعدہ کے خلاف نہیں کرے گا''

﴿ اَتَّخَذْتُمْ ﴾ باب افتعال ہے اس میں اصل میں دو ہمزے تھے ایک استفہام کا اور ایک باب افتعال کے باب کا ہمزہ تخفیف کے طور پر حذف کر دیا اور استفہام کا ہمزہ انکار کے لئے ہے۔ یعنی مفہوم یہ ہو گیا کہ آپ فرما دیجئے تم نے اللہ تعالیٰ سے کوئی عہد نہیں لیا کہ وہ وعدہ کے خلاف نہ کرے۔

﴿ فَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ عَهْدَهٗ ﴾ يدل على انه سبحانه وتعالىٰ منزه عن الكذب وعده ووعيده قال اصحابنا لان الكذب صفة نقص والنقص على الله محال "

اللہ تعالیٰ وعدہ کی خلاف ورزی نہیں فرماتا کیونکہ وعدہ کی خلاف ورزی جھوٹ ہے
اللہ تعالیٰ اپنے وعد اور وعید میں جھوٹ سے پاک ہے اور یہی وجہ ہے کہ اہل سنت
وجماعت کا مذہب یہ ہے کہ جھوٹ ایک ایسی صفت ہے کہ جس سے نقص لازم آتا ہے
اللہ تعالیٰ کی طرف نقص کی نسبت محال ہے۔ (از کبیر)

یہاں یہ بھی خیال رہے کہ عہد لینے کا مطلب خبر دینا وعدہ کرنا ہے اصل مطلب یہ ہے کہ کیا تمہیں اللہ تعالیٰ نے خبر دی ہے یا اللہ تعالیٰ نے تمہارے ساتھ وعدہ کیا ہے؟

﴿ اَمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴾ "بلکہ تم کہتے ہو اللہ پر جو تم نہیں جانتے"

دینی طلباء کرام کے لئے: (ام) کی دو قسمیں ہیں: **متصله اور منقطعة** " یہاں آیۃ کریمہ میں ایک احتمال یہ ہے (ام) متصلہ ہو یہ دو چیزوں کے درمیان برابری کے لئے آتا ہے اور دونوں میں ایک چیز کی تعیین چاہتا ہے بظاہر مطلب تو یہ ہے کیا تم نے اللہ تعالیٰ سے وعدہ لیا ہے............ یا تم اللہ تعالیٰ پر وہ کہتے ہو جو تم نہیں جانتے یعنی سوال کرنے والا دو چیزوں میں سے ایک کی تعیین کا سوال کر رہا ہوتا ہے۔اسے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ دونوں میں سے ایک کا وقوع ہوا ہے۔لیکن (ام) متصلہ لینے کی صورت میں ایک بات یہ ذہن میں رہے " **فلا يكون الاستفهام على حقيقته** "کہ استفہام حقیقی معنی میں نہیں۔سوال کرنا مقصود نہیں۔اور دوسری یہ بات ذہن میں رہے:

" وخرج ذلک مخرج المتردد فی تعیینه علی سبیل التقریر
لاولئک المخاطبین لعلم المستفهم وهو النبی ﷺ بوقوع احدهما "

کہ یہاں سوال کرنے والے نبی کریم ﷺ ہیں کیونکہ " **قل** " سے خطاب آپ کو ہی ہے اور آپ کو کوئی تردد نہیں تھا آپ کو تو یقینی طور پر معلوم تھا کہ "یہ لوگ وہ چیز اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کر رہے جس کا انہیں علم نہیں" البتہ ان لوگوں کو تردد تھا کہ وہ کیا جواب دیں۔اور یہاں سے ایک اور مسئلہ سمجھ آ گیا کہ (ام) متصلہ کے بعد کبھی جملہ بھی آ جاتا ہے کیونکہ کبھی دو حکموں کے درمیان برابری کرنی مقصود ہوتی ہے " **وبهذا صرح ابن الحاجب فی الایضاح** " علامہ ابن حاجب نے ایضاح میں اس کی

وضاحت کی ہے۔

☆ " ویحتمل ان تکون منقطعة بمعنی بل ، والتقدیر بل تقولون "

اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ (ام) منقطعہ ہو بل (بلکہ) کے معنی میں ہو تقدیر عبارت کی یہ ہو "بلکہ تم کہتے ہو" (بل) اضراب کے لئے آتا ہے۔

خیال رہے کہ اعلیٰ حضرت کا ترجمہ " ام متصلہ " کے مطابق ہے اور راقم کا ترجمہ " ام منقطعہ " کے برابر ہے تاہم جب مفسرین کرام کی تفاسیر کو مدنظر رکھ کر وضاحت کی جائے تو دونوں میں نمایاں فرق نظر نہیں آئے گا بلکہ بہت قریب قریب ہوں گے۔ کیا تم نے اللہ تعالیٰ سے وعدہ لے رکھا ہے کہ وہ تمہیں عذاب سوائے چند دنوں کے نہیں دے گا پھر تو وہ یقینی طور پر اپنے وعدہ کی خلاف ورزی نہیں کرتا، لیکن یہ غلط ہے کہ تم نے وعدہ لے رکھا ہو۔ یا تم اللہ تعالیٰ پر وہ بات کہتے ہو جو تم نہیں جانتے، ہاں ایسا ہی ہے یقیناً تم اللہ تعالیٰ پر وہ بات کہہ رہے ہو جو تم نہیں جانتے۔

دوسرا مطلب کیا تم نے اللہ تعالیٰ سے وعدہ لے رکھا ہے کہ وہ تمہیں عذاب نہیں دے گا پھر تو تمہیں عذاب نہیں دے گا کیونکہ وہ وعدہ کی خلاف ورزی نہیں فرماتا، خبردار تمہیں یہ نہیں کہنا چاہئے کیونکہ تم نے کوئی وعدہ نہیں لے رکھا۔ بلکہ تم تو اللہ تعالیٰ پر وہ بات کہہ رہے جو تم نہیں جانتے۔

تنبیہ : یہاں علامہ رازی رحمہ اللہ نے ایک اعتراض و جواب ذکر فرمایا کہ یہود نے جب اپنے گمان سے بیان کیا کہ ہمیں زیادہ دیر عذاب نہیں ہوگا۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان کی مذمت کی تو قیاس کیسے صحیح ہے؟ لیکن وہ اعتراض اور اس کے کئی جواب بہت واضح طور پر حکیم الامت علامہ مفتی احمد یار خان رحمہ اللہ نے بیان فرمائے ان کو ذکر کرنا یقیناً بہت ہی مفید ہے۔

اعتراض : اس آیۃ سے معلوم ہوا کہ قیاس کرنا سخت گناہ بلکہ کفر ہے کیونکہ یہود نے قیاس سے اپنا چند روزہ عذاب مانا اور آیت نے ان کی سخت تردید کی اور حنفی، شافعی وغیرہ تمام مقلدین قیاس کرتے ہیں لہٰذا وہ سب گمراہ ہیں (معاذ اللہ) (غیر مقلد)۔

جواب اول: یہودیوں نے عقائد میں قیاس کیا تھا یہ واقعی ناجائز ہے مقلدین فروعی اعمال میں

قیاس کرتے ہیں نہ کہ عقائد میں۔

جواب دوم: یہود نے خبر میں قیاس کیا کہ قیامت میں ہماری بخشش ہو گی اور خبر میں قیاس نہیں ہوسکتا۔اس کے لئے نقل دلیل ضروری ہے ہم لوگ احکام شرعیہ میں قیاس کرتے ہیں۔

جواب سوم: انہوں نے نص کے مقابل قیاس کیا، کیونکہ توراۃ نے کفار کی بخشش کا انکار کیا انہوں نے قیاس سے اس کو ثابت کیا اور نص کے مقابل قیاس کرنا حرام ہے۔ان کا حال شیطان کے حال کی طرح ہوا، ہم ایسا قیاس نہیں کرتے۔ جہاں نص نہ ہو وہاں قیاس کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔

جواب چہارم: ان کا قیاس فلسفی قیاس آرائی تھی یعنی ان کا قیاس من گھڑت بلا دلیل تھا کیونکہ ان کے قیاس میں کسی آیۃ کی تائید نہیں تھی۔ ہمارا قیاس شرعی ہوتا ہے جس کی آیۃ یا حدیث سے تائید ہوتی ہے۔

جواب پنجم: ان کا قیاس بلا ضرورت تھا۔اور ہمارا قیاس شرعی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے ہوتا ہے تو یقیناً قیاس بھی شرعی کہلاتا ہے لہٰذا ان کا قیاس بے دینی تھا اور ہمارا قیاس دینی ہے۔یعنی نبی کریم ﷺ کی شریعت کی چار دلیلیں ہیں: قرآن، حدیث، اجماع اور چوتھی دلیل ہے ہی قیاس۔کوئی غیر مقلد بغیر قیاس کے زندہ رہ نہیں سکتا فرق اتنا ہے کہ ہم مجتہدین کے قیاس پر عمل کرتے ہیں اور وہ جہلاء اور گمراہوں کے قیاس پر عمل کرتے ہیں گویا ہم اماموں کے مقلد ہیں اور وہ نفس اور شیطان کے۔ (از نعیمی)

☆☆☆

﴿ بَلٰی مَنْ کَسَبَ سَیِّئَةً وَّاَحَاطَتْ بِهٖ خَطِیْئَتُهٗ فَاُولٰٓئِکَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ ﴾

۱) ''ہاں کیوں نہیں جو گناہ کمائے اور اس کی خطا اسے گھیر لے وہ دوزخ والوں میں ہے انہیں ہمیشہ اس میں رہنا''۔

۲) ''ہاں کیوں نہیں جس نے کسب کیا برائی کا اور احاطہ کرلیں اس کا اس کی خطائیں تو وہ لوگ جہنم والے ہیں وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے''۔

یہود کے دعوی کو رد کیا جا رہا ہے جو انہوں نے کہا تھا کہ ہمیں زیادہ دیر عذاب نہیں ہوگا، بلکہ صرف چند دن عذاب ہوگا تو رب تعالیٰ نے اس آیۃ کریمہ میں ان کا رد فرمایا کہ تمہارا دعوی باطل ہے۔ عذاب کیوں نہیں ہوگا جب کہ قانون باری تعالیٰ یہ ہے کہ جب کوئی گناہوں کا عمل کرے اور وہ اس کی غلطیاں اس کا ایسا احاطہ کرلیں کہ اسے ایمان کی دولت سے بھی محروم کردیں تو وہ لوگ جہنمی ہیں اور جہنم میں ہمیشہ رہیں گے۔

﴿ بَلٰی ﴾ : نفی کے بعد ثبوت کے لئے آتا ہے جیسا کہ رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿ اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ ﴾ کیا میں تمہارا رب نہیں؟ ﴿ قَالُوْا بَلٰی ﴾ انہوں نے کہا ہاں کیوں نہیں یعنی تو ہمارا رب ہے۔ اسی طرح جب انہوں نے کہا ﴿ لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ ﴾ ''ہمیں ہرگز آگ نہیں چھوئے گی'' تو رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿ بَلٰی ﴾ کیوں نہیں یعنی تمہیں آگ ضرور چھوئے گی کیونکہ تم نے تحریف کی وجہ سے کفر اختیار کرلیا۔

﴿ مَنْ کَسَبَ سَیِّئَةً ﴾ : والکسب جلب النفع کسب کا اصل میں معنی یہ ہے ''نفع حاصل کرنا'' والسیئة ، الفاحشة الموجبة للنار '' وہ گناہ جو جہنم میں جانے کا ذریعہ ہوا سے ''سیئة'' کہا جاتا ہے اسی وجہ سے کبیرہ گناہوں پر ''سیئة'' کا اطلاق ہوتا ہے کیونکہ وہ بھی آگ میں جانے کا ذریعہ ہیں۔ '' ای یستحق فاعلها النار ان لم یغفرله '' یعنی اگر گناہ کبیرہ کرنے والے شخص نے توبہ نہ کی یا رب تعالیٰ نے اپنی مہربانی سے اس کی مغفرت نہ کی تو وہ جہنم کا مستحق ہوگا۔

فصاحت قرآن: ''کسب'' کا معنی ہے ''نفع حاصل کرنا'' اس کے بعد ''سیئة'' کا ذکر کیا جو جہنم میں جانے کا ذریعہ ہے اس سے یہ واضح کیا کہ وہ اپنے کفر یعنی اللہ کی کتاب کی تحریف سے بظاہر دنیا کا گھٹیا مال حاصل کرتے اور وہ سمجھتے کہ ہم نفع حاصل کر رہے ہیں لیکن درحقیقت ان کے لئے خسارا کا ہی سبب تھا کیونکہ ان کے اس فعل نے ان کو جہنمی بنا دیا۔

﴿وَاَحَاطَتْ بِهٖ خَطِیْٓئَتُهٗ﴾ احاطہ کا معنی واضح ہے گھیر لینا، غالب آ جانا، ہر طرف سے شامل ہو جانا: ﴿خَطِیْٓئَتُهٗ﴾ اصل میں اس غلطی کو کہتے ہیں جو بلا ارادہ سرزد ہو۔ جیسا کہ کسی شکار کی طرف تیر پھینکا لیکن غلطی سے اس کی زد میں کوئی انسان آ جائے، اسی طرح نشہ کی حالت میں کسی کا نقصان کر دیا یہ سب خطیات کہلائیں گی۔

تاہم خطائیں باوجود احاطہ کر لینے کے قابل توبہ ہیں۔ خواہ کفر اور شرک کی حد تک بھی ہوں۔ کیونکہ کفر اور شرک کو چھوڑ کر تائب ہو کر انسان جب مسلمان ہو جائے تو وہ قابل بخشش ہے، خواہ اس کے بعد وہ کئی گناہوں میں مبتلا ہو۔ ہاں البتہ جب کفر اور شرک پر اس کی موت آ گئی توبہ نہ کر سکا تو وہ ہمیشہ کے لئے جہنم میں رہے گا۔

﴿فَاُولٰٓئِکَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ﴾

یہاں اصحاب کی نار کی طرف اضافت تلازم پر دلالت کر رہی ہے کہ جن کا گناہوں نے احاطہ کر لیا اور اسی پر ان کی موت آ گئی آگ ان کو لازم رہے گی۔ وہ آگ میں ہمیشہ رہیں گے یعنی کافر کو کبھی بھی جہنم سے نکال کر جنت میں نہیں پہنچایا جائے گا۔ (ماخوذ از روح المعانی)

یہود دو وجہ سے مذمت کے مستحق ہوئے:

یہود کی تحریف اور غلطی کی وجوہ کو سمجھنے کے لئے پہلے یہ سمجھا جائے کہ ہر شریعت میں معاصی کے دو مرتبے رہے۔ ایک یہ کہ اعتقاد تو ملت حقہ کے مطابق ہو لیکن عمل مخالفت ہو مثال کے طور پر شراب پینے، زنا کرنے، چوری کرنے، لواطت کرنے، غیر کے مال کو غصب کرنے کو حرام سمجھے، اور ان پر عذاب کے

لاحق ہونے کا خوف بھی رکھے، لیکن بوجہ حجاب طبعی اور غلبہ شہوت کے اس سے یہ افعال سرزد ہوں تو اسے فاسق وفاجر کہا جائے گا۔ فاسق وفاجر کو اگر عذاب دیا گیا تو وہ عذاب ختم بھی ہوگا اور وہ عذاب کے ختم ہونے کے بعد جنت میں آجائیں گے۔

معاصی کا دوسرا مرتبہ یہ ہے کہ اعتقاد ہی باطل ہو یعنی اللہ تعالیٰ اور انبیاء کرام اور ملائکہ اور آخرت اور آسمانی کتب پر اس کا ایمان نہ ہو۔ اور اسی طرح حرام چیزوں کو حرام ہی نہ سمجھے تو وہ شخص کافر زندیق اور ملحد کہلاتا ہے وہ جہنم میں دائمی عذاب میں ہوگا اس کا عذاب کبھی ختم نہیں ہوگا۔ اس مسئلہ کو مسلمان اہل علم نے اس طرح بیان کیا۔

" الفاسق لا یخلد فی النار والکافر مخلد فی النار "

فاسق آگ میں ہمیشہ نہیں رہے گا اور کافر آگ میں ہمیشہ رہے گا۔

لیکن یہود نے ان دونوں وجہ کی مخالفت کی اور من گھڑت اقوال پیش کیے کیونکہ یہود نے کہا:

﴿ لَنْ یَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا ﴾ یہود کے بغیر ہرگز کوئی جنت میں داخل نہیں ہوگا۔

یعنی یہود نے مسلمانوں کے جنت میں جانے کی نفی کی، خواہ نیک ہوں یا گنہگار ان کا یہ قول جھوٹ پر مبنی تھا انہوں نے اپنے من گھڑت قول کو رب تعالیٰ کی طرف منسوب کیا۔ اسی طرح دوسرا مرتبہ معاصی کا کفر ہے۔ کافر جہنم سے کبھی باہر نہیں آئے گا۔ ہمیشہ جہنم میں رہے گا یہود اللہ کی کتاب میں تحریف کر کے کافر ہونے کے باوجود کہتے تھے کہ ہم جہنم میں ہمیشہ نہیں رہیں گے بلکہ ہمیں اگر عذاب ہوا تو صرف چند دن ہوگا ان کا یہ قول بھی جھوٹ پر مبنی تھا۔ لہٰذا ان دو جھوٹے اقوال اور قانون قدرت میں تحریف کی وجہ سے ان کی مذمت کی گئی۔ (از عزیزی)

☆☆☆

﴿ وَالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِکَ اَصۡحٰبُ الۡجَنَّةِ هُمۡ فِیۡهَا خٰلِدُوۡنَ ﴾ (آیت ۸۲)

۱) ''اور جو ایمان لائے اور اچھے کام کیے وہ جنت والے ہیں انہیں ہمیشہ اس میں رہنا''۔

۲) ''اور وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے عمل کیے اچھے وہ لوگ جنت والے ہیں انہیں اس میں ہمیشہ رہنا ہے''۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں جب آیۃ وعید (عذاب والی آیۃ) کو ذکر کیا، تو ساتھ ہی آیۃ وعد کو ذکر فرمایا اس میں چند فوائد پائے جاتے ہیں۔

ایک فائدہ یہ حاصل ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا نظام عدل واضح ہوتا ہے اس لئے کہ جو لوگ ہمیشہ کفر پر قائم رہنے والے ہیں ان کے لئے جب دائمی عذاب ہے تو یقیناً عدل وانصاف کا تقاضا یہی تھا کہ جو لوگ ہمیشہ ایمان پر ثابت رہنے والے ہیں ان کو قائم ودائم رہنے والی نعمتوں سے نوازا جائے۔

دوسرا فائدہ یہ حاصل ہوا کہ مومن کو چاہئے کہ اللہ تعالیٰ سے خوف بھی رکھے اور اس کی رحمت کی امید بھی رکھے جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا'' **لو وزن خوف المؤمن ورجاؤہ لا عتدلا** '' اگر مومن کے خوف اور امید کا وزن کیا جائے تو دونوں برابر ہوں۔ یعنی دونوں چیزیں ایک جیسی سمجھے تاہم رب تعالیٰ کی رحمت وسیع ہے اس کی وسعت پر امید رکھنا بھی اس کی شان کریمی کے مطابق ہے۔ مومن کو یہ اعتدال اسی وقت سمجھ آ سکتا ہے جب آیات وعید کے ساتھ آیات وعد کو بھی ذکر کیا جائے۔

تیسرا فائدہ یہ حاصل ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے وعد سے اس کی کامل رحمت کا ظہور ہوتا ہے اور اس کی وعید سے اس کی کامل حکمت کا ظہور ہوتا ہے جس سے انسانوں کو اللہ تعالیٰ کی صفات کی معرفت حاصل ہوتی ہے۔ (از کبیر)

تنبیہ: ایمان پر قائم رہنا، اور ایمان پر ہی موت کا آنا جنت میں جانے کا ذریعہ ہے اگر العیاذ باللہ مرتد ہو جائے اور اس کی موت حالت ارتداد پر ہی آ جائے تو وہ ہمیشہ جہنم میں رہے گا۔

☆ حضرت سفیان بن عبداللہ تقفی نے نبی کریم ﷺ کی خدمت میں عرض کیا:

" یا رسول اللہ قل لی فی الاسلام قولا لا اسأل عنہ احدا بعدک قال قل آمنت باللہ ثم استقم " (رواہ مسلم)

یا رسول اللہ ﷺ آپ مجھے اسلام کے متعلق ارشاد فرمائیں کہ مجھے آپ کے بعد کسی سے سوال کرنے کی ضرورت درپیش نہ آئے آپ نے فرمایا تم یہ کہو میں نے اللہ پر ایمان لایا پھر اس پر قائم رہو۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی بھی اسی پر دلالت کر رہا ہے:

﴿ اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَااللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا فَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ ﴾

''بیشک وہ لوگ جنہوں نے کہا ہمارا رب اللہ ہے پھر وہ اس پر قائم رہے تو انہیں کوئی خوف نہیں اور نہ وہ غمناک ہوں گے''۔ (از قرطبی)

فائدہ : ایمان کے بعد اعمال صالحہ کا ذکر فرمایا جس سے پتہ چلا کہ ایمان اصل میں تصدیق قلبی کا نام ہے اعمال صالحہ اس کا جزء نہیں کیونکہ جزء کا عطف کل پر نہیں ہوتا۔ اسی سے یہ مسئلہ بھی واضح ہو گیا کہ گناہ کبیرہ کا مرتکب فاسق و فاجر تو ہوتا ہے لیکن ایمان سے خارج نہیں ہوتا بلکہ مؤمن ہی رہتا ہے:

" لان الایمان اشرف من العمل لکونہ اساس جمیع الحسنات اذ الاعمال ساقطة عن درجة الاعتبار عند عدمہ "

کیونکہ ایمان تمام اعمال سے اشرف ہے اور تمام نیکیوں کی بنیاد ہے کیونکہ ایمان کے علاوہ نیک اعمال کبھی انسان سے ساقط بھی ہو جاتے ہیں۔ جیسا کہ حالت حیض میں عورت سے نماز ساقط ہو جاتی ہے اور مرد یا عورت ایک دن ایک رات سے زیادہ بیہوش ہو جائیں تو نماز ساقط ہو جاتی ہے لیکن ایمان کسی حال میں بھی ساقط نہیں ہوتا۔

نکتہ : ایمان کے ساتھ اعمال صالحہ کے ذکر میں یہ نکتہ پایا گیا ہے:

" وھو ان یکون الایمان فی مقابلة السیئة المفسرة بالکفر عند البعض والعمل الصالح فی مقابلة الخطیئة المفسرة بما عداہ "

وہ یہ ہے کہ پہلی آیت مبارکہ میں ''سیئة'' کا ذکر ہی جس سے مراد کفر لیا گیا ہے۔ اس کے مقابل

اس آیۃ میں ایمان کا ذکر کیا گیا ہے۔اوراسی طرح پہلی آیۃ میں ﴿ خَطِیْئَۃُ ﴾ کا ذکر ہے جس سے مراد کفر کے علاوہ اور گناہ مراد ھیں اس آیۃ میں اس کے مقابل اعمال صالحہ کا ذکر ہے۔

﴿ اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ﴾ سے مراد عام حکم:

" والمراد من ﴿ اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ﴾ امة محمد ﷺ ومؤمنوا الأمم قبلهم "

اس آیۃ کریمہ میں ایمان کا جوذکر کیا گیا ہے وہ عام ہے نبی کریم ﷺ کی امت کو بھی شامل ہے اور پہلی امتوں کے مؤمنین کو بھی شامل ہے۔

فائدہ جلیلہ :

" ان خلودهم في النار بسبب افعالهم السيئة وعصيانهم وخلودهم في الجنة بمحض لطفه تعالى وكرمه والا فالايمان والعمل الصالح لا يفي بشكر ما حصل للعبد من النعم العاجلة "

بیشک لوگوں کا آگ میں داخل ہونا ان کے برے افعال اور نافرمانی کی وجہ سے ہوگا اور ان کا کفر جہنم میں ہمیشہ رہنے کا ذریعہ ہوگا۔لیکن جنت میں ہمیشہ رہنے کا انعام صرف اللہ تعالیٰ کے لطف وکرم سے حاصل ہوگا ورنہ بندے پر اللہ تعالیٰ کے اتنے انعام ہیں جو بندہ حاصل کر چکا ہوتا ہے کہ ان انعامات کو شمار کرنا چاہے تو شمار نہیں کر سکتا تو انسان کا ایمان اور نیک عمل تو ان انعامات کا شکریہ بھی ادا نہیں کر سکتے تو یوں سمجھیں کہ انسان اس مزدور کی طرح ہے جو مزدوری پہلے لے لے کام بعد میں کرے وہ کام ختم کرنے پر مزدوری کا حقدار تو نہیں ہوتا کیونکہ وہ پہلے مزدوری کا حقدار تو نہیں ہوتا کیونکہ وہ پہلے مزدوری حاصل کر چکا ہوتا ہے لیکن مالک اس پر پھر رحم کرے اور انعام سے نواز دے تو اسکی کرم نوازی۔

اسی طرح انسان اللہ تعالیٰ کے عظیم اور ان گنت انعامات پہلے حاصل کر چکا ہے لیکن ایمان اور نیک اعمال کی وجہ سے اللہ تعالیٰ اپنے لطف وکرم سے مزید انعام سے نوازے گا کہ جنت میں ہمیشہ رہنے اور جنت کی عظیم نعمتوں سے انسان کی پھر تکریم ہوگی۔

اسی سے ایک اور مسئلہ واضح ہوگیا کہ " ان الوعيد من الكريم مظنة الخلف دون الوعد" رب تعالیٰ جو کریم ذات ہے اس کی طرف سے وعید اس کی مشیت پر موقوف ہے اگر کفر کی حد تک گناہ نہ

ہوئے تو رب تعالیٰ نے چاہا تو گرفت فرمائے گا، اور اگر معاف کردے تو اسکی مرضی اور اس کا کرم ہوگا۔

لیکن رب تعالیٰ نے اپنے بندوں سے جو وعدہ فرمایا ہے اگر چہ اس پر کوئی چیز لازم تو نہیں ہوتی لیکن اس نے اپنے کرم سے اپنے آپ پر لازم قرار دے دیا ہے لہذا وعدہ میں ایسا نہیں ہوگا کہ وہ چاہے تو وہ نعمتیں عطا کرے اور چاہے تو نہ عطا کرے۔ (از روح المعانی)

راقم نے جس انداز پر اردو میں مسئلہ سمجھایا ہے اس میں خلف فی الوعید کی کوئی بات نہیں۔

تنبیہ: کوئی شخص اپنی نیکیوں کو عظیم اور کثیر نہ سمجھے اور ان پر اترائے نہیں اور تکبر نہ کرے اور ریاء کاری نہ کرے ورنہ اس کی نیکیاں ضائع ہو جائیں گی۔ یہ بھی خیال رہے کہ رب تعالیٰ کسی کی نیکیوں کو ضائع نہیں کرتا لیکن بندہ خود نیک عمل ریاء کاری کے طور پر کرے تو وہ نیک عمل ضائع ہو جاتا ہے کیونکہ وہ نیک عمل بنتا ہی نہیں اس نیک عمل کو بندے نے خود ہی ضائع کیا ہے۔

اور اسی طرح کوئی شخص اپنے گناہوں کو حقیر اور قلیل نہ سمجھے کیونکہ تھوڑے تھوڑے جمع ہو کر اس کی ہلاکت کا سبب بن جائیں گے

☆ "وعن عبد الله بن مسعود ﷺ ان رسول الله ﷺ قال ایاکم و محقرات الذنوب، فانهم یجتمعن علی الرجل حتی یهلکنه" (مسند احمد)

حضرت عبداللہ بن مسعود ﷺ نے فرمایا بیشک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا گناہوں کو حقیر سمجھنے سے اپنے آپ کو بچا کر رکھو، بیشک وہ گناہ جمع ہو کر انسان کی ہلاکت کا سبب بن جاتے ہیں۔ پھر نبی کریم ﷺ نے ایک مثال سے مسئلہ کو سمجھایا کہ جس طرح کوئی قوم جنگل میں اترے قوم کا سردار ان کو لکڑیاں جمع کرنے کا حکم دے تو ایک شخص لکڑیاں لائے پھر دوسرا شخص لائے اس طرح جب کئی آدمی لکڑیاں جمع کریں اور آگ جلائی جائے اب آگ میں جو چیز بھی ڈالو وہ جل جائے گی۔

(از صابونی)

☆☆☆☆☆

﴿ وَاِذْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَ بَنِیْٓ اِسْرَآئِیْلَ لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰہَ وَبِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا وَّذِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰکِیْنِ وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا وَّاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ ثُمَّ تَوَلَّیْتُمْ اِلَّا قَلِیْلًا مِّنْکُمْ وَاَنْتُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴾ (آیت ۸۳)

۱) ''اور جب ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا کہ اللہ کے سوا کسی کو نہ پوجو اور ماں باپ کے ساتھ بھلائی کرو اور رشتہ داروں اور یتیموں اور مسکینوں سے اور لوگوں سے اچھی بات کہو اور نماز قائم رکھو اور زکوۃ دو پھر تم پھر گئے مگر تم میں کے تھوڑے اور تم روگرداں ہو''۔

۲) ''اور جب لیا ہم نے وعدہ بنی اسرائیل سے کہ عبادت نہ کرنا سوائے اللہ تعالیٰ کے اور والدین سے احسان کرنا اور رشتہ داروں سے اور یتیموں سے اور مسکینوں سے (احسان کرنا) اور کہو لوگوں سے اچھی بات، اور قائم کرو نماز، اور دو زکواۃ پھر تم پھر گئے سوائے تھوڑے تم میں سے اور تم ہی اعراض کرنے والے ہو''۔

☆ یہاں سے مراد اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کا ذکر فرمایا کہ ان کو اپنے اوامر میں سے کچھ امر (حکم) دیئے گئے اور ان سے ان پر عمل کرنے کا عہد لیا گیا لیکن وہ تمام سے پھر گئے اور قصداً انہوں نے اعراض کیا حالانکہ وہ جانتے بھی تھے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے احکام ہیں۔ اور وہ کام انہوں نے بغیر کسی بھول کے کیے یعنی عمداً ان کا اعراض تھا علم نہ ہو، یا بھول ہو جائے تو کسی حد تک وہ قابل معافی جرم ہوتا ہے۔ (از ابن کثیر)

☆ رب تعالیٰ نے جس طرح گزشتہ آیات میں بنی اسرائیل پر اپنی نعمتوں کا ذکر کیا لیکن ساتھ ساتھ بنی اسرائیل کا ان نعمتوں کی قدر نہ کرنا اور اس پر مختلف نافرمانیوں کا ذکر کیا اسی طرح اس آیۃ میں بھی اللہ تعالیٰ نے اپنی نعمت کا ذکر فرمایا اور ساتھ ہی یہ ذکر فرما دیا کہ اے بنی اسرائیل تم نے اس سے اعراض کیا یعنی تم اس سے پھر گئے یہ پھر جانا اور اعراض کرنا تمہاری عادت ہے۔
اس آیۃ میں کیسے نعمت کا ذکر کیا گیا؟ وہ یہ ہے کہ رب تعالیٰ نے ان کو چند چیزوں کا مکلف بنایا یعنی

ان پر عمل کرنے کا حکم دیا کہ تم صرف اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنا۔ اور والدین سے اچھا سلوک کرنا اور رشتہ داروں اور یتیموں اور مسکینوں سے بھلائی سے درپیش آنا اور لوگوں سے اچھا کلام کرنا اور نماز قائم کرنا اور زکواۃ دینا۔

" وذلک لان التکلیف بھذہ الاشیاء موصول الی اعظم النعم وھو الجنة والموصل الی النعمة نعمة فھذہ التکلیف لا محالة من النعم "

یہ اس وجہ سے نعمت ہے کہ ان چیزوں کی تکلیف دینا بہت بڑی نعمت کے حاصل کرنے اور اس تک پہنچنے کا ذریعہ ہے وہ بہت بڑی نعمت جنت ہے جو چیز نعمت تک پہنچائے وہ نعمت ہے تو یقیناً یہ تمام احکام عظیم نعمتیں ہیں۔ (از کبیر)

﴿وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِىْ اِسْرَائِيْلَ لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ﴾:

"اور جب لیا ہم نے عہد بنی اسرائیل کے عبادت نہ کرنا سوائے اللہ کے"۔

﴿لَا تَعْبُدُوْنَ﴾ میں ایک احتمال یہ ہے کہ یہ خبر ہے لیکن اس میں معنی نہی والا ہے (تم عبادت نہ کرو سوائے اللہ کے) جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا " لا یضار کاتب ولا شھید " یہ صیغے بھی خبر ہیں۔ لیکن ان میں بھی معنی نہی والا ہے صریح نہی سے زیادہ بلاغت اس میں پائی جاتی ہے۔

" ویعضدہ قراء ۃ لا تعبدوا " ایک قراءت میں ذکر ہی نہی ہے ﴿لَا تَعْبُدُوْا﴾ اس سے اس معنی کو تائید ملتی ہے اعلیٰ حضرت کا ترجمہ اسی قول کے مطابق "اللہ کے سوا کسی کو نہ پوجو"

وقیل تقدیرہ ان لا تعبدوا فلا حذف ان رفع " اور اس میں ایک قول یہ ہے کہ یہ اصل میں ﴿اَنْ لَّا تَعْبُدُوْا﴾ تھا لیکن " ان " کو حذف کر دیا گیا اور نون اعرابی جو " ان " کی وجہ سے محذوف ہوا تھا وہ " ان " کے حذف ہونے کی وجہ سے واپس لوٹ آیا اب ﴿لَا تَعْبُدُوْنَ﴾ حالت رفعی میں ہے۔

راقم کا ترجمہ اسی تفسیر کے مطابق ہے "عبادت نہ کرنا سوائے اللہ تعالیٰ کے"۔

" ویدل علیہ قراء ۃ ان لا تعبدوا " اور اس پر وہ قراءت دلالت کر رہی ہے جس میں

ﻩ اَنْ لَا تَعْبُدُوْا ﻩ ہے۔ (از بیضاوی)

خیال رہے کہ میثاق کا معنی یہ ہے " المیثاق اسم لما تقع به الوثاقة " جس چیز کے ذریعے کسی کو مضبوط بنایا جائے اسے میثاق کہا جاتا ہے گویا کہ مطلب یہ ہوا کہ رب تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے بہت پختہ وعدہ لیا ان احکام پر عمل کرنے کا لیکن وہ اس سے پھر گئے۔ (از شیخ زادہ بتغیر)

ﻩ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ﻩ: اس میں بھی دو ہی احتمال ہیں ایک احتمال یہ ہے کہ اس میں ﻩ اَحْسِنُوْا ﻩ (امر کا صیغہ) مقدر ہو معنی یہ ہو "اور ماں باپ سے بھلائی کرو" اعلیٰ حضرت کا یہی ترجمہ ہے۔ اور دوسرا احتمال یہ ہے " وتحسنون " مقدر ہو۔ اصل میں " ان تحسنوا " ہو لفظ "ان" کو مقدر کر کے " تحسنون " رفعی حالت میں کر دیا گیا ہو۔ اس لحاظ پر معنی یہ ہوگا "اور والدین سے احسان کرنا" راقم کا یہی ترجمہ ہے۔

اللہ تعالیٰ کی عبادت کے بعد والدین سے بھلائی کے ذکر کی وجوہ:

(۱) اللہ تعالیٰ کی نعمتیں بندے پر سب نعمتوں سے عظیم نعمتیں ہیں۔ اسی وجہ سے سب نعمتوں کے شکر پر اللہ تعالیٰ کی نعمتوں پر شکر بھی مقدم (پہلے) ہوگا۔ پھر اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے بعد والدین کی اولاد پر عظیم نعمتیں ہیں، کیونکہ والدین اولاد کے لئے اصل ہیں۔ اور اولاد کے موجود ہونے کا سبب اور ذریعہ ہیں اور والدین اپنی اولاد کی تربیت کرتے ہیں یہ بھی والدین کا اولاد پر احسان عظیم ہے۔

لیکن والدین کے بغیر باقی رشتہ دار اگرچہ بعض اوقات تربیت تو کرتے ہیں لیکن وہ اصل نہیں یعنی وجود کا ذریعہ نہیں لہذا واضح ہوا " ان انعماهما اعظم وجوه الانعام بعد انعام الله تعالیٰ " بیشک والدین کا انعام اللہ تعالیٰ کے انعام کے بعد عظیم ہے کیونکہ اس کی وجوہ عظیم ہیں۔

(۲) اللہ تعالیٰ انسان کے موجود کرنے میں مؤثر حقیقی ہے، اور والدین مجازی طور پر اور ظاہر عرف کے مطابق مؤثر ہیں " فلما ذكر المؤثر الحقيقي اردفه بالمؤثر بحسب العرف الظاهر " جب اللہ تعالیٰ نے اپنی عبادت کا ذکر فرمایا جو مؤثر حقیقی ذات ہے تو اس کے بعد والدین سے بھلائی کرنے کا حکم دیا کہ وہ ظاہر عرف کے مطابق مجازی طور پر مؤثر ہیں۔

(۳) اللہ تعالیٰ بندوں پر جو انعام کرتا ہے وہ اس کے بدلہ میں کسی چیز کی طلب نہیں کرتا بلکہ مقصد صرف لوگوں پر بھلائی کرنا، ان کو نعمتیں عطاء کرنا۔ رب تعالیٰ دنیاوی نعمتیں ہر نیک اور گنہگار کو عطا کرتا ہے اسی طرح وہ ہر مومن اور کافر کو عطا کرتا ہے۔

اسی طرح والدین بھی اپنی اولاد پر انعام بغیر کسی عوض (بدلہ) کے کرتے ہیں، نہ اس میں کوئی مالی بدلہ ان کے پیش نظر ہوتا ہے، اور نہ ہی وہ ثواب کی غرض سے انعام عطا کرتے ہیں۔ بلکہ فقط ان کا مقصد اولاد پر مہربانی کرنا ہوتا ہے۔ اولاد نیک ہو یا بد مؤمن ہو یا کافر والدین اس کی تربیت کرتے ہیں، اسے اپنے انعام سے نوازتے ہیں۔

"فمن هذا الوجه اشبه انعامهما انعام الله تعالیٰ" اسی وجہ سے والدین کا انعام اللہ تعالیٰ کے انعام کے مشابہ ہو گیا لیکن رب تعالیٰ کا انعام حقیقی اور والدین کا رب تعالیٰ کی عطاء ہے۔

(۴) اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر انعام کرتا ہے وہ اس سے ملال میں نہیں آتا، بندے عظیم جرم بھی کریں وہ ان سے اپنی نعمتیں چھینتا نہیں، بلکہ اس کی نعمتیں لگاتار جاری رہتی ہیں۔ اسی طرح والدین کو بھی اپنی اولاد پر انعام کرنے سے ملال نہیں ہوتا اور وہ اولاد کی نافرمانی سے اپنی نعمتیں بھی نہیں چھینتے بلکہ ان پر اپنی نعمتوں کو جاری رکھتے ہیں۔

(۵) والدین اپنی اولاد پر مشقت کرتے ہیں وہ اپنی اولاد کے مال میں نفع طلب کرتے ہیں اور اس کے مال کی زیادتی کے طلب گار ہوتے ہیں۔ اور ان کے مال کو نقصان اور خسارے سے بچانے کی کوشش کرتے ہیں، اسی طرح اللہ تعالیٰ بندے کو طاعت کا حکم دیتا ہے تاکہ وہ رب کا مطیع بن کر اپنے آپ کو خسارے سے بچالے پھر اللہ تعالیٰ ان کے اعمال جو بظاہر ختم ہو چکے ہوتے ہیں ان کو ہمیشہ کے لئے باقی رکھتا ہے۔ جیسا کہ رب تعالیٰ نے فرمایا:

مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ

''ان کی مثال جو اللہ کی راہ میں مال خرچ کرتے ہیں اس دانہ کی طرح ہے جس نے اگائیں سات بالیاں ہر بالی میں سو دانے ہوں''۔

یعنی بظاہر انہوں نے مال خرچ کر دیا لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کے ثواب کو ہمیشہ کے لئے باقی رکھ دیا۔

(۲) اللہ تعالیٰ کی نعمتیں عظیم ہونے کے باوجود ''نظری اور استدلالی ہیں'' یعنی دلائل سے ان کا کامل علم حاصل ہوتا ہے اور والدین کی نعمتیں بدیہی ہیں ان میں نظر و استدلال کی ضرورت نہیں۔ لیکن والدین کی نعمتیں بدیہی ہونے کی باوجود قلیل ہیں۔

" والرجحان لنعم الله فلا جرم جعلنا نعم الوالدين كالتالية لنعم الله تعالیٰ "

جب اللہ تعالیٰ کی نعمتیں عظیم ہیں اور کثیر ہیں اور والدین کی نعمتیں حقیر اور قلیل ہیں تو

یقیناً والدین کی نعمتوں کا درجہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے بعد میں ہے۔

یہی وجہ ہے کہ رب تعالیٰ نے اپنی عبادت کا ذکر پہلے کیا اور والدین سے بھلائی کا ذکر بعد میں کیا۔

(از کبیر)

مسئلہ: اکثر علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ والدین کی تعظیم واجب ہے، اگرچہ اس کے والدین کافر ہی کیوں نہ ہوں اس پر چند دلائل واضح طور پر موجود ہیں:

(۱) اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے ﴿ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ﴾ اس میں کوئی قید نہیں کہ والدین مومن ہوں یا کافر ہوں اس لئے کہ اصول فقہ میں یہ ضابطہ مذکور ہے '' **ان الحكم المرتب على الوصف مشعر بعلية الوصف** '' جب حکم کسی وصف پر مرتب ہو تو وہ وصف اس کے لئے علت کی حیثیت ہوتا ہے۔

اس لئے آیت کریمہ سے یہ حکم واضح ہوگا'' **ان الامر بتعظيم الوالدين لمحض كونهما والدين وذلک يقتضی العموم** '' کہ اللہ تعالیٰ نے والدین کی تعظیم کا جو حکم دیا ہے اس کا تعلق ان کے والدین ہونے سے ہے لہذا یہ حکم عام ہے جو والدین مومن ہوں یا کافر ہوں سب کو شامل ہے۔

(۲) رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿ وَلَا تَقُلْ لَّهُمَا اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا ﴾ ماں باپ کو اف نہ کہو اور ان کو جھڑکو نہیں۔ اس آیۃ کریمہ میں بھی مطلقاً والدین کی تعظیم کے خلاف کام کرنے سے منع کیا گیا۔

(۳) ابراہیم علیہ السلام نے اپنے چچا آزر (جو آپ کی والدہ کا دوسرا خاوند تھا، اور آپ کے باپ کی طرح تھا) کو کفر سے ایمان لانے کی دعوت بڑی مہربانی اور لطافت سے دی اس میں کوئی سخت کلامی اور درشتی (سخت انداز سے بولنا) نہیں تھی رب تعالیٰ نے آپ کی دعوت ایمان کا ذکر یوں فرمایا:

﴿ يَا اَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا يَسْمَعُ وَلَا يُبْصِرُ وَلَا يُغْنِىْ عَنْكَ شَيْئًا ﴾

اے میرے باپ تو کیوں عبادت کرتا ہے ان کی جو سنتے نہیں اور دیکھتے نہیں اور نہ کچھ تیرے کام آئیں

" ثم ان كان اباه كان يؤذيه ويذكر الجواب الغليظ وهو عليه السلام كان يتحمل ذلك "

پھر اگر آپ کا باپ آپ کو تکلیف دیتا اور سخت کلامی سے جواب دیتا تو ابراہیم علیہ السلام اسے برداشت فرماتے آپ اس قسم کا سخت کلام نہیں فرماتے تھے۔

جب یہ ثابت ہو گیا کہ ابراہیم علیہ السلام کا اپنے باپ (چچا) سے درپیش آنے کا طریقہ کیا تھا تو ہمیں بھی چاہئے کہ ہم بھی وہی طریقہ اختیار کریں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ﴿ ثُمَّ اَوْحَیْنَا اِلَیْکَ اَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ اِبْرَاهِیْمَ حَنِیْفًا ﴾ ارشاد فرما کر ہمیں ان کے طریقہ کے مطابق چلنے کا حکم فرمایا۔ (از زبیر)

تنبیہ : حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ کا باپ ابو عامر سخت کافر تھا انہوں نے نبی کریم ﷺ سے اسے قتل کرنے کی اجازت طلب کی آپ نے منع فرمایا۔ ہاں اگر ماں باپ یا کوئی رشتہ دار اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے مقابلہ میں آجائیں یعنی بیٹا مسلمانوں کی جانب ہو اور باپ کافروں کی جانب سے میدان جنگ میں آمنے سامنے آجائیں تو باپ کا لحاظ نہیں کیا جائے گا حضرت ابو عبیدہ بن جراح نے اپنے باپ جراح کو احد میں قتل کیا۔ اور حضرت علی اور حضرت حمزہ اور حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ نے بدر میں اپنے قریبی رشتہ داروں عتبہ، شیبہ اور ولید کو قتل کیا۔

اور حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنے بیٹے عبد الرحمٰن (انہوں نے بعد میں اسلام قبول کیا) سے مقابلہ کرنے کی اجازت حضور ﷺ سے طلب کی لیکن آپ نے انہیں اپنے پاس ہی رکھنے کی وجہ سے اجازت عطا نہ فرمائی۔ (از تفسیر عزیزی، و از حاشیہ جلالین پ ۲۸ زیر آیة ان الذین یحادون الله)

والدین سے احسان کا مطلب:

" والاحسان الى الوالدين معاشرتهما بالمعروف والتواضع لهما وامتثال امرهما والدعاء بالمغفرة بعد مماتهما وصلة اهل ودهما "

(قرطبی)

والدین سے احسان کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ان کی ضروریات کا دنیا کی زندگی میں اچھی طرح خیال رکھے، اور ان کے سامنے عاجز ہو کر رہے، ان کے حکم کو مانے، اور ان

کی وفات کے بعد ان کے لئے مغفرت کی دعاء کرے اور ان کے ساتھ محبت کرنے والے احباب سے اچھا تعلق رکھے۔

ماں باپ کی فرمانبرداری: حضرت بہز بن حکیم اپنے باپ اور وہ ان کے دادا (یعنی اپنے باپ) سے روایت کرتے ہیں انہوں نے کہا میں نے عرض کیا:

" یا رسول اللہ من ابر قال امک قلت ثم من قال امک قلت ثم من قال امک ، قلت ثم من ، قال اباک ثم الاقرب فالاقرب "

(ترمذی، ابوداؤد، مشکوۃ باب البر والصلۃ)

یارسول اللہ میں کس سے زیادہ احسان کروں اور کس کے ساتھ زیادہ صلہ رحمی کروں؟ تو آپ نے فرمایا "اپنی ماں سے" میں نے عرض کیا پھر کس سے؟ آپ نے فرمایا اپنی ماں سے۔ میں نے عرض کیا پھر کس سے؟ آپ نے فرمایا "اپنی ماں سے" میں نے پھر کہا اور کس سے تو آپ نے ارشاد فرمایا اپنے باپ سے اس کے بعد اپنے قریبی رشتہ داروں سے اور پھر جو ان کے بعد قریبی ہوں۔

اس حدیث پاک میں قریبی رشتہ داروں پر احسان کرنے اور صلہ رحمی سے درپیش آنے پر برانگیختہ کیا گیا، لیکن ماں کا حق سب سے زیادہ بیان کیا گیا اسکے بعد باپ کا اور اس کے بعد باقی رشتہ داروں کا جو زیادہ قریبی ہوں گے ان کا حق پہلے، پھر ان کے بعد والوں کا حق ہے۔

ماں کا حق سب سے زیادہ کیوں؟

" سبب تقدیم الام کثرۃ تعبہا علیہ وشفقتہا وخدمتہا " (نووی)

ماں کا حق سب سے مقدم ہونے کی وجہ یہ ہے کہ ماں بچے پر سب سے زیادہ شفقت برداشت کرتی ہے اور اس پر سب سے زیادہ شفقت کرتی ہے اور بچے کی خدمت سب سے زیادہ ماں ہی کرتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

ﻩ حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ كُرْهًا وَّوَضَعَتْهُ كُرْهًا وَحَمْلُهٗ وَفِصٰلُهٗ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا ﴾ (پ ۲۶)

"اسکی ماں نے اسے پیٹ میں رکھا تکلیف سے اور جنا اس کو تکلیف سے اور اسے اٹھائے پھرنا اور اس کا دودھ چھڑانا تیس مہینہ میں ہے (یعنی کم از کم مدت حمل چھ ماہ اور زیادہ سے زیادہ دودھ پلانے

کی مدت دو سال ہے) اس آیہ کریمہ میں رب تعالیٰ نے تین چیزوں سے ماں کا حق مقدم ہونا واضح فرمایا ہے:

(۱) ماں حمل کی مشقت برداشت کرتی ہے (۲) بچے کو جننے کی تکالیف برداشت کرتی ہے

(۳) بچے کو دودھ پلانے کی محنت اور رنج اٹھاتی ہے۔ (مرقاۃ)

ماں، باپ سے محبت خیر و برکت کا ذریعہ ہے:

حضرت انس ﷺ نے فرمایا رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

" من احب ان یبسط له فی رزقه وینساله فی اثره فلیصل رحمه "

(بخاری، مسلم، مشکوٰۃ باب البر والصلة)

جو شخص پسند کرتا ہو کہ اس کا رزق کشادہ کر دیا جائے اور اس کی عمر میں برکت ہو تو وہ صلہ رحمی کرے۔

یعنی پہلے ماں، باپ پھر اور رشتہ داروں سے اچھا سلوک رکھے احسان کرے ان پر مہربانی کرے نرم طریقے سے درپیش آئے ان کے احوال کی رعایت رکھے یعنی مرض، صحت، خوشحالی اور تنگدستی وغیرہ کے مطابق ان کی حاجت کو پورا کرے۔

سوال: " ان الآجال والارزاق مقدرة ولا تزید ولا تنقص "

موت کا وقت مقرر ہے اور رزق کی مقدار بھی مقرر ہے ان میں نہ کمی ہوتی ہے نہ زیادتی۔ حدیث پاک میں رزق کی کشادگی اور عمر کی زیادتی کا کیا مطلب ہے؟

پہلا جواب: " ان الزیادة بالبرکة فی البر " بیشک عمر کی زیادتی سے مراد عمر میں برکت کا آنا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ اس انسان کو نیکیوں کی توفیق عطا فرما دیتا ہے اور اسے توفیق دیتا ہے کہ وہ ایسے اعمال کرے جو اسے آخرت میں نفع پہنچائیں۔ اپنے اوقات کو نفع میں مصروف رکھے ضائع ہونے سے بچائے، اسی طرح اس کے رزق میں بھی برکت آ جاتی ہے حلال طور پر رزق حاصل کرنے اور حرام سے بچنے کی اسے توفیق دے دی جاتی ہے اور تھوڑے رزق پر بھی اس کے دل کو اطمینان حاصل ہوتا ہے۔ ایسا اطمینان حرام رزق سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ بلکہ وہ تمام اوقات ڈر اور خوف طرح طرح کی تکالیف اور اولاد کے بے راہ روی سے غیر مطمئن ہوتا ہے۔

دوسرا جواب: " انه بالنسبة الی مایظهر للملائکة فی اللوح المحفوظ " یہ عمر اور رزق کی زیادتی بنسبت ملائکہ کے لوح محفوظ میں نظر کرنے کے ہے۔

یعنی لوح محفوظ میں مثلاً لکھا ہوا ہی یہ ہوتا ہے کہ اس کی عمر ساٹھ سال ہونی تھی۔لیکن والدین اور اقرباء کی صلہ رحمی کی وجہ سے اس کی عمر چالیس سال اور کر دی گئی یہی حال رزق کا بھی ہوگا۔یعنی اگر یہ شخص صلہ رحمی نہ کرتا تو اس کی عمر کم ہوتی اور رزق بھی کم ہوتا۔لیکن اللہ تعالیٰ کی توفیق اور مہربانی سے اس نے صلہ رحمی کرنی ہے تو اس کی عمر اور رزق میں بھی زیادتی یقیناً ہونی ہے۔

تیسرا جواب: " ان المراد بقاء ذکره الجمیل بعده فکانه لم یمت " بیشک عمر اور رزق کی زیادتی سے مراد یہ ہے کہ اس کا اچھا ذکر اس کے دنیا سے چلے جانے کے بعد بھی باقی رہے گا گویا کہ وہ فوت نہیں ہوا، جب اس کا نام زندہ ہے تو وہ بھی زندہ ہی ہے۔ (ماخوذ از مرقاۃ ونووی)

یہ تینوں جواب دراصل مجتمع ہو کر ایک جواب ہیں کیونکہ ان کے اجتماع میں کوئی تعارض نہیں قبلہ استاذی المکرم حضرت مولنا محمد اشرف سیالوی مدظلہ العالی سے یہی سنا۔

ماں باپ انسان کے لئے جنت و دوزخ ہیں: حضرت ابوامامہ ﷺ فرماتے ہیں، ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ والدین کے ان کی اولاد پر کیا حقوق ہیں؟ تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا" **هما جنتک ونارک** " وہ دونوں (ماں باپ) تمہارے لئے جنت اور دوزخ ہیں۔ (ابن ماجہ۔ مشکوۃ باب البر والصلة)

سبحان اللہ میرے پیارے مصطفیٰ محمد ﷺ کا کیسا مختصر اور حکمت بھرا جواب ہے (یہ نبی کریم ﷺ کا خصوصی کمال ہے کہ آپ کو جوامع الکلم سے نوازا گیا یعنی بات مختصر اور مطالب بہت) کہ ماں باپ کی فرمانبرداری ان پر احسان کرنا، ان سے حسن سلوک سے درپیش آنا جنت میں جانے کا سبب ہے۔اور ان کی نافرمانی، سخت کلامی، ان کے حکم کو تسلیم نہ کرنا، ان کی دیکھ بھال نہ کرنا، یعنی ان کو ناراض کرنا جہنم میں جانے کا ذریعہ ہے۔

ماں باپ کو رحمت سے دیکھنا حج کا ثواب ہے:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا بیشک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

" ما من ولد بار ینظر الی والدیہ نظرۃ رحمۃ الا کتب اللہ لہ بکل نظرۃ حجۃ مبرورۃ قالوا ان نظر کل یوم مائۃ مرۃ قال نعم اللہ اکبر و اطیب "

(بیہقی ، مشکوۃ باب البر والصلۃ)

کوئی ایسی فرمانبردار اولاد نہیں جو اپنے والدین کو رحمت کی نظر سے دیکھے مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ اس کے لئے ہرنظر کے بدلے ایک مقبول حج کا ثواب لکھ دیتا ہے صحابہ کرام نے عرض کیا اگرچہ ہرروز سومرتبہ بھی دیکھے؟ آپ نے فرمایا ہاں (اگرچہ ہرروز سو مرتبہ بھی دیکھے) اللہ سب سے بڑا اور سب سے پاکیزہ ہے۔

وضاحت حدیث: ماں باپ دونوں زندہ ہوں یا ایک ہو اور اس ایک کو نظر رحمت سے دیکھنے پر بھی یہی ثواب ہے " نظرۃ رحمۃ " سے مراد شفقت کرنا، مہربانی کرنا، ان کی جائز بات تسلیم کرنا، ان کی ضروریات کا لحاظ کرنا " حجۃ مبرورۃ " سے مراد نفلی مقبول حج ہے۔ اور یہ بھی خیال رہے کہ یہ ثواب کا حاصل فرضی حج کا بدل نہیں بن سکتا۔

" اللہ اکبر و اطیب " سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بہت بڑا ہے، اس کی عظمت انسان کے تصور سے بالاتر ہے اور اس کے انعامات اور اس کی مہربانیاں اتنی کثیر ہیں جو انسان کے شمار میں نہیں آسکتیں۔ اور اللہ تعالیٰ بہت پاکیز ہے یعنی اس کی قدرت میں کمی کا عیب نہیں لگایا جا سکتا وہ اپنے ارادہ اور مشیت میں نقصان سے پاک ہے۔ (از مرقاۃ)

نتیجہ واضح ہوا کہ اگر کوئی شخص یہ کہے یہ کیسے ہوسکتا ہے ایک سو حج کا ثواب مل جائے تو وہ شخص در حقیقت اللہ تعالیٰ کی عظمت اور اس کی قدرت سے غافل ہے اسے اللہ تعالیٰ کی رحمت کے بے حساب ہونے کا علم نہیں۔

ماں باپ کی نافرمانی نا قابل معافی جرم ہے:

حضرت ابوبکرۃ سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

" کل الذنوب یغفر اللہ منھا ما شاء الاعقوق الوالدین فانہ یعجل لصاحبہ فی الحیاۃ قبل الممات " (بیہقی ، مشکوۃ)

تمام گناہوں کو اللہ تعالیٰ جتنا چاہے معاف فرما دیتا ہے سوائے ماں باپ کی نافرمانی کے

، بیشک اللہ تعالیٰ ماں باپ کے نافرمان کو جلدی ہی اس کی زندگی میں موت سے پہلے اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔

یعنی ماں باپ کی نافرمانی کے جرم کو معاف نہیں کیا جائے گا اخروی عذاب کے علاوہ اسے دنیا میں بھی پکڑ ہو سکتی ہے یعنی رب تعالیٰ چاہے تو دنیا میں ہی اسے ذلیل و خوار کر دے۔

ماں باپ کی خدمت جہاد اور ہجرت سے پہلے: حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص فرماتے ہیں ایک شخص نبی کریم ﷺ کی طرف متوجہ ہوا اور عرض کیا میں آپ سے جہاد اور ہجرت پر بیعت کرنا چاہتا ہوں تا کہ میں اللہ تعالیٰ سے اس کا اجر حاصل کر سکوں۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کیا تمہارے ماں باپ سے کوئی ایک زندہ ہے؟ ہاں، بلکہ دونوں ہی زندہ ہیں تو آپ نے فرمایا:

" فتبتغی الاجر من اللہ قال نعم قال فارجع الی والدیک فاحسن صحبتهما " (مسلم ج ۲ کتاب البر والصلة والادب)

کیا واقعی تم اللہ تعالیٰ سے اجر حاصل کرنا چاہتے ہو؟ صحابی نے عرض کیا ہاں (یارسول اللہ) آپ نے فرمایا اپنے والدین کے پاس لوٹ کر چلے جاؤ ان کے پاس رہ کر ان کی خدمت کے آداب اچھے طریقہ سے بجالاؤ۔

اس حدیث پاک سے ماں باپ کی فرمانبرداری کی فضیلت واضح ہوئی۔ ماں باپ کی خدمت کا جہاد سے بھی زیادہ اہم ہونا سمجھ آیا۔ جب تک جہاد ہر شخص پر فرض عین نہ ہو جائے اس وقت تک ماں باپ کی اجازت کے بغیر جہاد میں شریک ہونا جائز نہیں۔ بشرطیکہ ماں باپ دونوں مسلمان ہوں۔ اگر ایک مسلمان ہو تو اسی سے اجازت طلب کرنا ضروری ہے۔ ہاں اگر ماں باپ کافر و مشرک ہیں تو ان سے جہاد میں شریک ہونے کے لئے اجازت طلب کرنا ضروری نہیں۔

ماں باپ سے احسان کی تین قسمیں:

(۱) اپنے قول و فعل سے ان کو ایذاء نہ پہنچائے۔ (۲) اپنے بدن اور مال سے ان کی خدمت کرے

(۳) جب وہ بلائیں تو فوراً حاضر ہو جائے۔

پہلی قسم کی اطاعت ہر حال میں واجب ہے کیونکہ ماں باپ کو ایذاء دینے والا عاق اور نافرمان

کہلاتا ہے۔دوسری اطاعت جب واجب ہے کہ ماں باپ حاجت مند ہوں اور اولاد میں اس خدمت کی قدرت ہو اگر انہیں حاجت نہیں یا اولاد میں طاقت نہیں تو اس قسم کی اطاعت واجب نہیں۔تیسری قسم کی خدمت کی یہ شرط ہے کہ ان کی خدمت میں حاضر ہونے سے کوئی شرعی خرابی پیدا نہ ہو۔اگر نماز کا وقت جارہا ہو ادھر ماں باپ بلا رہے ہوں تو ان کے پاس نہ جائے بلکہ پہلے نماز پڑھے۔ (ازنعیمی)

نفلی نماز اور والدین: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک شخص جریج اپنے عبادت خانہ میں عبادت میں مشغول تھا۔حمید بن ھلال کہتے ہیں حضرت ابوہریرہ نے ہمیں اس کی ماں کے اسے بلانے کی کیفیت بھی بیان کی، یعنی اس کی ماں نے اپنے ہاتھوں کی ہتھیلیوں کو اپنے ابروؤں پر رکھ کر اوپر اس کے عبادت خانہ کی طرف دیکھ کر اسے بلایا اور کہا" یا جریج ان امک فتکلمنی " اے جریج میں تیری ماں ہوں میرے ساتھ کلام کر۔

لیکن اس نے اسے نماز نوافل جاری رکھے ہوئے پایا۔جریج نے کہا اے اللہ یہ میری ماں ہے اور یہ میری نماز (یعنی اس نے سوچا میں کیا کروں ماں سے کلام کروں یا نوافل ادا کرتا رہوں، آخر کار اس کے دل نے نوافل نماز کو ترجیح دی اور ماں سے کلام نہ کرنے کا فیصلہ کرلیا) اس نے نماز کو اختیار کیا۔ماں واپس چلی گئی، پھر دوسرے دن لوٹ کر آئی، پھر اس نے کہا اے جریج میں تمہاری ماں ہوں، میرے ساتھ کلام کرو جریج نے پھر کہا اے اللہ یہ میری ماں ہے اور یہ میری نماز۔اس نے نماز کو ترجیح دی۔اس کی ماں نے کہا:

" اللهم ان هذا جريج وهو ابني واني كلمته فابى ان يكلمني اللهم فلا تمته حتى تريه الموسات "

اے اللہ بیشک یہ جریج ہے اور وہ میرا بیٹا ہے بیشک میں نے اس سے کلام کیا اس نے میرے ساتھ کلام کرنے سے انکار کردیا، اے اللہ اس وقت تک موت نہ عطا کر یہاں تک کہ اسے فاحشہ عورتیں دکھادے۔

راوی کہتے ہیں اگر اس کی ماں اس کے لئے کسی بڑے فتنہ میں مبتلاء ہونے کی بددعاء کرتی تو وہ

بھی قبول ہو جاتی۔ (ماں کی دعاء کی قبولیت کا اندازہ کریں) ایک شخص بھیڑ بکریاں کا چرواہا اس کے عبادت خانہ میں آ کر پناہ پکڑتا تھا ایک دن ایک عورت دیہات سے باہر آئی اس سے چرواہے نے بدفعلی کی وہ حاملہ ہوگئی، یہاں تک کہ اس نے ایک بچہ جنم دیا۔ لوگوں نے اس عورت سے پوچھا یہ بچہ کس کا ہے؟ اس نے کہا اس عبادت خانہ میں ایک شخص ہے اس کا ہے۔ لوگ اپنے زمین کھودنے کے آلات لے کر آ گئے۔ انہوں نے باہر سے (جریج کو) پکارا لیکن اسے نماز پڑھتے ہوئے پایا۔ اس نے لوگوں سے کوئی بات نہ کی۔ ان لوگوں نے اس کے عبادت خانہ کو گرانا شروع کر دیا۔ جب اس نے یہ ماجرا دیکھا تو وہ اپنے عبادت خانہ سے نیچے اترا۔ ان لوگوں نے کہا اس عورت سے پوچھ۔

حضور ﷺ نے فرمایا وہ مسکرایا اس نے بچے کے سر پر ہاتھ پھیرا اور کہا تمہارا باپ کون ہے؟ اس نے کہا میرا باپ بھیڑ بکریوں کا چرواہا ہے۔ جب لوگوں نے اس (ننھے معصوم بچے) سے یہ سنا تو (معذرت کے طور) پر کہا کہ ہم نے تمہارا عبادت خانہ جو گرایا ہے اسے سونے اور چاندی سے تعمیر کر دیتے ہیں۔ اس نے کہا نہیں تم مٹی کا ہی بنا دو جیسا وہ پہلے تھا۔ اتنا کہہ کر وہ پھر اپنے عبادت خانہ پر چڑھ گیا۔

(مسلم ج ثانی کتاب البر والصلة والادب)

اس حدیث پاک سے واضح ہوا کہ ماں کو راضی رکھنا نفلی عبادت سے مقدم ہے ماں کی ناراضگی اور بد دعاء دنیا اور آخرت میں عذاب کا سبب ہے۔ ماں باپ کا حکم پہلے مانے اور نفلی نماز بعد میں ادا کرے۔

مسئلہ: اگر نماز نفل جاری ہو تو ماں باپ کے بلانے پر نماز کو مکمل کر کے جائے نماز توڑے نہیں، جریج نے نماز کو نہ توڑنے کا فیصلہ نہیں کیا تھا بلکہ اس نے فیصلہ یہ کیا تھا کہ دو رکعت نفل مکمل کر کے پھر دو رکعت اور کی نیت کر لو، نوافل جاری رکھو، ماں سے بات کر کے وقت ضائع نہ کرو۔ اس کا یہ فیصلہ رب تعالیٰ کو بھی پسند نہ آیا اور ماں کی ناراضگی کا بھی ذریعہ بنا۔

مسئلہ: ماں باپ اگر گنہگار یا بد مذہب ہوں تو ان کی نرمی سے راہ راست پر لانے کی کوشش کرے اور اگر منافق یا کافر ہوں تو ان سے بھی ماں باپ کے ناطے نرم سلوک رکھے۔ (اس مسئلہ کی تفصیل پہلے بیان ہو چکی ہے)۔

ماں باپ کے ساتھ احسان کرنے کے آداب:

(۱) ماں باپ سے دلی محبت رکھے۔

(۲) بات چیت اور اٹھنے بیٹھنے میں ان کے ادب کا لحاظ رکھے راستے میں ان کے آگے نہ چلے اور ان کے نام سے انکو نہ بلائے بلکہ ادب واحترام سے ان کو بلائے۔

(۳) جتنا ممکن ہو سکے اتنا اپنا مال اور اپنی جان ان پر قربان کرے۔

(۴) ہر کام اور ہر بات میں ان کی رضا مندی کا خیال رکھے۔

(۵) ان کی وفات کے بعد ان کی وصیت کو پورا کرے۔

(۶) ان کے لئے مغفرت کی دعا کرتا رہے۔

(۷) ان کے لئے جتنا ہو سکے کبھی کبھی صدقہ وخیرات کرتا رہے۔

(۸) ہر ہفتہ میں ایک مرتبہ قبرستان میں ان کی قبر کی زیارت کے لئے جائے اور اگر ہو سکے تو سورۃ یٰسین پڑھ کر ان کو ثواب پہنچائے۔

(۹) ماں باپ کے دوستوں اور قرابت داروں سے محبت رکھے۔ ان کے ساتھ اچھا سلوک کرے نیک بخت اولاد اپنے والدین کے دوستوں کو اپنے والدین کی طرح سمجھتی ہے۔

(۱۰) جتنا ہو سکے اپنے والدین کے متعلقین کو تحائف، ھدایا وغیرہ دے یہ علامات محبت ہیں۔

(تفسیر عزیزی)

ایک مرتبہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما مکہ مکرمہ آ رہے تھے دوران سفر آپ نے اپنے ساتھ ایک گدھا بھی رکھا ہوا تھا کہ جب اونٹ کی سواری سے تھکان محسوس ہو تو گدھے پر سوار ہو کر کچھ راحت حاصل کرلیں گے۔ اور ایک پگڑی آپ نے اپنے سر سے باندھ رکھی تھی۔

اسی سفر کے دوران ایک دن آپ اپنے گدھے پر سوار تھے، آپ کے قریب سے ایک اعرابی (دیہاتی) کا گزر ہوا آپ نے اس سے پوچھا کیا تم فلاں ابن فلاں نہیں ہو (یعنی اس کے باپ دادا کا نام لے کر اس سے پوچھا) اس نے کہا میں اسی شخص کا بیٹا ہوں۔

آپ نے اپنا گدھا اسے دے دیا کہ تم اس پر سواری کرو اور پگڑی بھی دے دی کہ یہ تم اپنے سر سے باندھ لو، آپ کے بعض ساتھیوں نے آپ کو (بطور تعجب) کہا کہ اس شخص کو آپ نے اپنے آرام کے لئے لیا ہوا گدھا دے دیا اور پگڑی بھی دے دی جو آپ اپنے سر سے باندھتے تھے۔

دوسری روایت میں ہے کہ یہ اعرابی تو تھوڑے مال پر بھی خوش ہو جاتے ہیں آپ نے فرمایا:

" انی سمعت رسول اللہ ﷺ یقول ان من ابر البر صلة الرجل اهل ودابیه بعد ان یولی وان اباه کان صدیقا لعمر "

(مسلم ج ۲ باب فضل صلة اصدقاء الاب والام ونحوهما)

بیشک میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ بیشک سب احسانوں سے اچھا احسان (یعنی سب فرمانبرداریوں سے اچھی فرمانبرداری) یہ ہے کہ انسان اپنے ماں باپ کا جانشین بننے کے بعد اپنے (ماں) باپ کے ساتھ تعلق رکھنے والے احباب کے ساتھ احسان سے پیش آئے، بیشک اس کا باپ (میرے باپ حضرت) عمر کا دوست تھا۔

بڑھاپے میں ماں باپ سے زیادہ شفقت ومحبت کا حکم دیا گیا:

حضرت ابو ہریرہ ؓ سے مروی ہے آپ نے کہا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

" رغم انفه رغم انفه رغم انفه قیل من یا رسول اللہ ﷺ قال من ادرک والدیه عند الکبر احدهما او کلاهما ثم لم یدخل الجنة "

(مسلم مشکوۃ باب البر والصلة)

وضاحت حدیث: رغم انفه کے دو معنی لئے گئے ہیں ایک یہ کہ خبر ہو۔ اس صورت میں معنی یہ ہوگا کہ اس شخص کا ناک خاک آلود ہو گیا یعنی ذلیل وخوار ہو گیا اور دوسرا معنی یہ ہے (کہ شائد آپ نے ایسی شخص کے خلاف دعا فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا) کہ وہ شخص ذلیل وخوار ہو جائے۔ اس معنی کے لحاظ سے سخت الفاظ سے ڈرایا گیا ہے جس کے خلاف نبی کریم ﷺ دعاء فرما دیں وہ کتنا ہی بدبخت ہوگا۔ (مرقاۃ)

اس حدیث پاک سے یہ نتیجہ حاصل ہوا

" ان برهما عند کبرهما وضعفها بالخدمة والنفقة وغیر ذلک سبب لدخول الجنة فمن قصر فی ذلک فاته دخول الجنة " (نووی)

بیشک ماں باپ سے احسان کرنا ان کے بڑھاپے اور کمزور حال ہوتے وقت جنت میں داخل ہونے کا ذریعہ ہے وہ احسان یہ ہے ان کی خدمت کرنا، انہیں خرچ دینا اور ہر طرح کی ان کی ضروریات کا خیال رکھنا اور جس شخص نے اس حال میں ان پر احسان کرنے میں کوتاہی کی وہ جنت میں داخل ہونے سے محروم ہوگیا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے:

﴿ وَقَضٰى رَبُّکَ اَلَّا تَعْبُدُوْا اِلَّا اِیَّاہُ وَبِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا اِمَّا یَبْلُغَنَّ عِنْدَکَ الْکِبَرَ اَحَدُھُمَا اَوْ کِلَاھُمَا فَلَا تَقُلْ لَّھُمَا اُفٍّ وَّلَا تَنْھَرْھُمَا وَقُلْ لَّھُمَا قَوْلًا کَرِیْمًا ☆ وَاخْفِضْ لَھُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْھُمَا کَمَا رَبَّیٰنِیْ صَغِیْرًا ﴾ (پ ۱۵ سورۃ اسراء)

''اور تمہارے رب نے حکم دیا کہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو اور ماں باپ کے ساتھ اچھا سلوک کرو اگر تیرے سامنے ان میں سے ایک یا دونوں بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو ان سے اف (ہوں) نہ کہنا اور نہ جھڑکنا اور ان سے تعظیم کی بات کہنا۔ اور ان کے لئے عاجزی کا بازو بچھا نرم دلی سے اور عرض کر اے میرے رب تو ان دونوں پر رحم کر جیسا کہ ان دونوں نے بچپن میں مجھے پالا''

اس آیۃ کریمہ کے ترجمہ سے اتنا واضح ہوگیا کہ والدین سے بڑھاپے میں زیادہ شفقت اور محبت کرنے کا حکم دیا گیا آیۃ کریمہ کی مکمل وضاحت اپنے محل پر ہی انشاء اللہ آئے گی۔

ماں باپ کی وفات کے بعد ان سے حسن سلوک کا حکم:

حضرت ابو ربیعہ ساعدی فرماتے ہیں کہ میں بارگاہ رسالت میں حاضر تھا اسی اثناء میں ایک انصاری حضور اکرم ﷺ کی خدمت اقدس میں آیا اور عرض کی یا رسول اللہ میرے والدین کی وفات کے بعد کیا مجھ پر ان سے حسن سلوک کرنا ضروری ہے؟

" قال نعم خصال اربع الصلوۃ علیھما والاستغفار وانجاز عھدھما واکرام صدیقھما وصلۃ الرحم التی لارحم لک الا من قبلھما فھو الذی بقی علیک من برھما بعد موتھما "

(ابن ماجہ، صحیح ابن حبان، روح المعانی)

''حضور نے فرمایا چار باتیں تجھ پر ضروری ہیں ان کی نماز جنازہ ادا کرنا، ان کے لئے

دعاء مغفرت کرتے رہنا جو وعدہ انہوں نے کیا تھا اسے پورا کرنا۔ اوران کے دوستوں کا احترام کرنا اوران کے رشتہ داروں سے صلہ رحمی کرنا جن سے ان کی وجہ سے رشتہ داری ہو۔ یہ نیکی ایسی ہے جوان کی وفات کے بعد بھی تم پر لازمی ہے"۔ (ضیاء القرآن)

ابن ابی الدنیا نے محمد بن نعمان سے مرفوع حدیث بیان کی کہ حضور ﷺ نے فرمایا:

"من زار قبر ابویه او احدهما فی کل جمعة غفرله و کتب براہ"

(بیہقی، روح المعانی)

جس شخص نے ہر جمعہ میں (ہفتہ میں ایک دن) اپنے والدین کی قبر کی زیارت کی یا ان میں ایک کی قبر کی زیارت کی (یعنی ایک کا ہی ابھی انتقال ہوا) اس کی مغفرت کر دی جاتی ہے اوراس کا (گناہوں اورعذاب سے) بری ہونا لکھ دیا جاتا ہے۔

خدارا انصاف کریں: آیئے بدمذہبوں کے نقش قدم پر چلنے والو، یہود ونصاریٰ کے پیروکارو، ذرا ضد اور ہٹ دھرمی کو چھوڑ کر انصاف کا فیصلہ کریں۔ ایسا مقام جو اسلام نے عورت کو بحیثیت ماں ہونے کے اور مرد کو بحیثیت باپ ہونے کے دیا وہ کسی اور مذہب میں ہے؟ انسانی حقوق کے دعویدارو، اسلام کے مخالفین ایسی کوئی مثال نہیں پیش کر سکتے۔

کیا خوب مفکر اسلام مفسر قرآن حضرت پیر محمد کرم شاہ رحمہ اللہ نے بیان فرمایا "ان واضح تعلیمات اور روشن ارشادات کے بعد آپ یورپ وامریکہ وغیرہا متمدن ممالک کے حالات کا جائزہ لیجئے وہاں آپ کو ایسی اولاد شاذونادر ہی ملے گی جو بوڑھے والدین کی خدمت اپنے لئے سرمایہ سعادت یقین کرتی ہو۔

شادی کے بعد لڑکا اپنے والدین سے الگ ہو جاتا ہے اوراپنے والدین کی خدمت کے لئے اخلاقی یا قانونی ذمہ داری قبول نہیں کرتا۔ اسی لئے توان ممالک کی حکومتوں کو ایسی پناہ گاہیں بنانا پڑتی ہیں جہاں بوڑھے اور والدین کو رکھا جائے تاکہ وہ زندگی کے آخری ایام وہاں بسر کر سکیں۔

(ضیاء القرآن)

افسوس صد افسوس یہ ہے کہ آج کل پاکستان میں بھی اسلامی تعلیمات سے ہٹ کر بوڑھوں کے لئے پناہ گاہیں بنانے کی سوچ تیز ہوتی جارہی ہے یا دوسرے لفظوں میں یوں کہیں یہودیت ونصرانیت کی تہذیب وتمدن کو حاصل کرنے کی بے چینی لاحق ہو رہی ہے۔

نبی کریم ﷺ کا دودھ پلانے والی ماؤں کا احترام:

حضرت ابوالطفیل غنوی فرماتے ہیں میں نبی کریم ﷺ کے پاس بیٹھا ہوا تھا:

"اذ اقبلت امرأة فبسط النبی ﷺ رداء ہ حتی قعدت علیه فلما ذهبت قیل هذه ارضعت النبی ﷺ" (ابو داود، مشکوۃ باب المحرمات)

ایک عورت آئی جس کے لئے نبی کریم ﷺ نے اپنی چادر بچھائی وہ اس پر بیٹھی پھر چلی گئی۔ تو (لوگوں کو) بتایا گیا کہ اس نے نبی کریم ﷺ کو دودھ پلایا ہے۔

یہ حضرت حلیمہ سعدیہ تھیں جو حنین کے دن نبی کریم ﷺ کے پاس آئی تھیں: "فقام الیها وبسط رداء ہ لها وجلست" اور آپ ان کے لئے کھڑے ہوئے اور ان کی تعظیم کی اور ان کے ساتھ خوش خلقی سے پیش آنے کے لئے آپ نے چادر بچھائی جس پر وہ بیٹھیں۔ جن لوگوں کو علم نہیں تھا وہ تعجب کر رہے تھے کہ عظیم المرتبت عورت کون ہے۔ لیکن جب علم ہوا تو پتہ چلا کہ نبی کریم ﷺ نے اپنی دودھ پلانے والی ماں کا کتنا عظیم احترام کیا۔ (مرقاۃ، مواهب اللدنیه)

نبی کریم ﷺ کا اپنی پرورش کرنے والی کی زیارت کرنا:

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے نبی کریم ﷺ کے وصال کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو کہا چلو ہم حضرت ام ایمن رضی اللہ عنہا کی زیارت کریں "کما کان رسول الله ﷺ یزورها" جس طرح رسول اللہ ﷺ ان کی زیارت کیا کرتے تھے۔ جب ہم ان کے پاس پہنچے تو وہ روئیں۔ حضرت ابو بکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما نے انہیں کہا تو کیوں رو رہی ہو حالانکہ نبی کریم ﷺ کا مقام اللہ تعالیٰ کے ہاں بہت بہتر ہے۔ انہوں نے فرمایا میں اس لئے نہیں رو رہی کہ مجھے یہ علم نہیں کہ رسول اللہ ﷺ کا مقام اللہ تعالیٰ کے نزدیک بہت بلند و بالا ہے۔ میرے رونے کی وجہ یہ ہے کہ آسمانوں سے وحی کا سلسلہ منقطع ہو گیا ہے۔ انہوں نے ان دونوں کو بھی رونے پر برانگیختہ کر دیا۔ ان دونوں حضرات نے بھی رونا شروع کر دیا۔

(مسلم ج ۲ باب فضائل ام ایمن)

ام ایمن نبی کریم ﷺ کو اپنی گود میں لے کر پرورش کرنے والی ہیں۔ حضور ﷺ ان کی زیارت کے لئے جاتے تھے۔ اس حدیث پاک سے یہ واضح ہوا کہ نیک لوگوں کی زیارت کرنا مستحب ہے خواہ زیارت کرنے والا خود بھی اس سے زیادہ افضل کیوں نہ ہو۔ اپنے متعلقین کے احباب کی زیارت کرنا بھی مستحب ہے۔

کسی کے ماں باپ کو گالیاں دینے سے منع کرنے میں حکمت:

حضرت عبداللہ بن عمرو ﷺ نے کہا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ یہ بہت بڑا گناہ ہے کہ کوئی شخص اپنے ماں باپ کو گالیاں دے۔ صحابہ کرام نے عرض کیا یا رسول اللہ کوئی ایسا شخص بھی ہوگا جو اپنے ماں باپ کو گالیاں دیتا ہوگا۔

" قال نعم یسب ابا الرجل فیسب اباہ ویسب امه فیسب امه "

(بخاری، مسلم، مشکوۃ باب البر والصلة)

آپ نے فرمایا ہاں جو شخص کسی کے باپ کو گالیاں دیتا ہو وہ اس کے باپ کو گالیاں دے اور یہ کسی کی ماں کو گالیاں دے وہ اس کی ماں کو گالیاں دے۔

یعنی کسی کے ماں باپ کو گالیاں نہ دو ورنہ وہ تمہارے ماں باپ کو گالیاں دے گا۔ اس پر تم خود اپنے ماں باپ کو گالیاں دینے کا سبب بنو گے۔

فائدہ عظیمہ : اسکندر سے کسی نے پوچھا کہ تمہارے والدین کا تم پر احسان زیادہ ہے یا استاذ کا۔ اس نے کہا مجھ پر میرے استاذ کا احسان زیادہ ہے۔

" لانه تحمل انواع الشدائد والمحسن علیه عند تعلیمی ارتعنی فی نور العلم "

اس لئے کہ استاذ نے میری تعلیم میں طرح طرح کی مشکلات وتکالیف کو برداشت کر کے مجھے نور علم سے خوشحال کیا۔

لیکن اس کے برخلاف والدین کی اپنی خواہشات کا بھی کچھ دخل تھا جنہوں نے مجھے عالم عدم سے نکال کر عالم کون وفساد کی آفات وبلیات کے حوالے کر دیا۔

کلمات ماثورہ میں ایک مشہور قول یہ ہے " **خیر الآباء من علمک** " بہتر آباء وہ ہیں

جنہوں نے تمہیں علم سکھایا"۔ فتاوی عالمگیری میں ہے:

" حق العالم علی الجاهل وحق الاستاذ علی التلمیذ واحد علی السواء وهو ان لا یفتح بالکلام قبله ولا یجلس مکانه وان غاب ولا یرد علی کلامه ولا یتقدم علی مشیه "

عالم کا حق جاہل پر اور استاذ کا حق شاگرد پر ایک جیسا ہی ہے وہ یہ کہ ان کے کلام سے پہلے یہ کلام شروع نہ کرے ان کی جگہ نہ بیٹھے بیشک وہ غائب ہی کیوں نہ ہو ان کے کلام کو رد نہ کرے ان کے آگے آگے نہ چلے، استاذ اور عالم کی مسند پر ان کی عدم موجودگی میں بھی نہ بیٹھے اور ان سے اگر اختلاف بھی ہو تو ان کے کلام کو رد کرنے کے بجائے مستحسن انداز پر اس پر دلائل پیش کرے۔

عالمگیری میں ہے:

" ینبغی للرجل ان یراعی حقوق استاذه وآدابه ولا یضن بشئی من ماله "

انسان کو چاہئے کہ وہ اپنے استاذ کے حقوق وآداب کی رعایت کرے اور اس پر اپنا مال خرچ کرنے میں بخل سے کام نہ لے یعنی استاذ اگر مالی طور پر پریشان حالی کا شکار ہو جائے تو شاگردوں کو چاہئے کہ اپنے مال سے استاذ سے تعاون کریں۔

عالمگیری میں تاتارخانیہ کے حوالہ سے نقل کیا گیا ہے:

" یقدم حق معلمه علی حق ابویه وسائر المسلمین ویتواضع لمن علمه خیرا ولو حرفا ولا ینبغی ان یخذله ولا یستاثر علیه احدا فان فعل ذلک فقد قصم عروة من عری الاسلام ومن اجلاله ان لا یقرع بابه بل ینتظر خروجه "

استاذ کا حق والدین کے حق اور تمام مسلمانوں کے حق سے مقدم ہے جس شخص نے اسے اچھا علم سکھایا ہو خواہ ایک حرف ہی ہو اس سے عاجزی کے ساتھ در پیش آئے۔ استاذ پر کسی اور کو ترجیح نہ دے اگر اس نے ایسا کیا تو اسلام کی رسیوں میں سے ایک رسی کو توڑ دیا استاذ کی بزرگی کا تقاضا یہ ہے کہ اس کے دروازے کو نہ کھٹکھٹائے بلکہ اس کے باہر آنے کا انتظار کرے۔

طبرانی نے حضرت ابوامامہ سے روایت کی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

" من علم عبدا آیة من کتاب اللہ تعالیٰ فھو مولاہ "

"جس شخص نے کسی کوقرآن پاک کی ایک آیۃ بھی سکھادی تو وہ اس کا مولی ہوگیا"۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

" من علمنی حرفا فقد صیرنی لہ عبدا ان شاء باع وان شاء اعتق "

جس شخص نے مجھے ایک حرف بھی سکھادیا بیشک اس نے مجھے اپنا غلام بنالیا، اگر چاہے تو فروخت کردے اور اگر چاہے تو آزاد کردے۔

یعنی اسے مجھ پر اتنا حق حاصل ہوگیا جتنا مالک کو اپنے غلام پر حق حاصل ہوتا ہے۔ یہاں تشبیہ ہے حقیقی غلامیت مراد نہیں۔ (از شرح الحقوق لطرح العقوق للامام احمد رضا خان بریلوی رحمہ اللہ)

نکتہ عظیمہ ، فائدہ جلیلہ : استاذی المکرم حضرت مولنا اشرف سیالوی مدظلہ العالی جامعہ جماعتیہ مہر العلوم رحیم ٹاؤن شکریال راولپنڈی (جو راقم کے زیر اہتمام چل رہا ہے) کے جلسہ دستار فضیلت پر تشریف لائے۔ دوران تقریر آپ نے فرمایا کہ نبی کریم ﷺ کو بھائی کہنا جائز نہیں۔ اس لئے کہ بھائی تو وہ ہوسکتا ہے کہ جن کا باپ ایک ہو۔ رب تعالیٰ کے ارشاد گرامی:

﴿ اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ وَاَزْوَاجُهٗ اُمَّهَاتُهُمْ ﴾

" یہ نبی مومنوں کا ان کی جان سے زیادہ مالک ہے اور اس کی بیبیاں ان کی مائیں ہیں" سے واضح ہورہا ہے کہ نبی کریم ﷺ اپنی امت کے تمام مومنین کے روحانی باپ ہیں اور آپ کی بیبیاں روحانی مائیں ہیں اور اس رشتہ سے " کل مومن اخوۃ " تمام مومنین آپس میں ایک دوسرے کے بھائی بھائی بن گئے۔ اگر نبی کریم ﷺ کو بھی اپنا بھائی مان لیا جائے تو اپنا روحانی باپ کسے مانا جائے گا۔ جس کی بنسبت آپ کو اپنا بھائی کہا جائے۔

اور اگر کوئی یہ کہے کہ سب ہی آدم علیہ السلام کی اولاد ہیں اس لئے آپ ہمارے بھائی ہیں۔ تو اس میں مومنین کی تخصیص کیا۔ آدم علیہ السلام کی اولاد میں تو کفار بھی داخل ہیں۔ اس طرح رب تعالیٰ کے ارشاد گرامی " کل مؤمن اخوۃ " میں مؤمن کی قید کا کوئی فائدہ ہی باقی نہیں رہتا۔

﴿ وَذِی الْقُرْبٰی ﴾ : عطف ہے " ذی القربی " کا " بالوالدین " پر۔ چونکہ رشتہ داروں کا حق والدین کے حق کے تابع ہے۔ اور رشتہ داروں پر احسان والدین کے احسان کے واسطہ سے ہے

اسی وجہ سے والدین کا ذکر پہلے کیا گیا اور قرابت داروں کا بعد میں " فلھذا حسن عطف القرابة علی الوالدین " اسی وجہ سے " ذی القربی " کا عطف " بالوالدین " پر بہتر ہے۔ (خازن)

﴿ اَلْقُرْبٰى ﴾ قرابت کے معنی میں ہے اور وہ مصدر ہے جیسا کہ " رجعی " اور " عقبی " مصدر ہیں۔

" ای امرنا ھم بالاحسان الی القرابات بصلة ارحامھم "

یعنی ہم نے ان کو حکم دیا کہ وہ صلہ رحمی کر کے اپنے رشتہ داروں پر احسان کریں۔ (قرطبی)

ایک احتمال اس میں یہ بھی ہے کہ " قربی " میں الف تانیث کا ہو اور معنی " رحم اور صلب " کی قرابت ہو۔

(روح المعانی)

حدیث شریف میں ہے " الرحم شجنة من الرحمن " یعنی قرابت شعبه ایست از شعبهای ظهور اسم رحمن گویا رحمت الهی دریں پرده ظهور میکند۔ یعنی حدیث شریف کا مطلب یہ ہے کہ " رحم " رحمٰن رب تعالیٰ کے اسم گرامی کے ظہور کے شعبوں میں سے ایک شعبہ ہے گویا کہ رحمت الٰہی اس پردہ سے ظاہر ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے رب تعالیٰ کی طرف سے رحم کو خطاب کرتے ہوئے کہا گیا " من وصلک وصلته ومن قطعک قطعته " یعنی جس نے صلہ رحمی کی میں اس سے قرب رکھوں گا۔ اور جس نے قطع رحمی کی میں اس سے مقاطعت کروں گا۔

عقلی مصلحت کا تقاضا یہ ہے کہ انسان اپنے قریبی رشتہ داروں سے اچھا سلوک رکھے کیونکہ انسان کو شادی وفات اور مشکلات میں بغیر کسی کی مالی معاونت، اور بدنی معاونت وغیرہ کے تمام کام سرانجام دینے ممکن نہیں اور یہ بھی واضح ہے کہ ہر انسان سے اس قسم کے کاموں میں امداد طلب کرنا ممکن نہیں۔

اس لئے ضروری ہے کہ ایسے لوگوں سے امداد طلب کی جائے جن سے طبعی طور پر محبت پائی جاتی ہو۔ اور قریبی رشتہ داری ہو جو اس کے حالات سے باخبر ہوں۔ اس کے دکھ درد کو اپنا دکھ درد سمجھتے ہوں۔ اس طرح رشتہ داروں کا ایک دوسرے سے تعاون کرنا ان کے لئے نفع مند ہوگا اس کے بغیر ان کی زندگی میں دشواریاں ہی دشواریاں ہوں گی۔

اہل قرابت کی دو قسمیں:

(۱) یعنی ان میں سے ایک قسم یہ ہے کہ رشتہ داری کے ساتھ ساتھ محرمیت (محرم ہونا) بھی حاصل ہو جیسا کہ چچا، ماموں، پھوپھی، خالہ، بھائی، بہن، بھائی اور بہن کی اولاد ان لوگوں سے احسان کرنا

فرض ہے اوراس کا تارک گنہگار ہے۔

(۲) دوسری قسم یہ ہے کہ رشتہ داری تو ہو لیکن محرمیت نہ ہو جیسے چچا کی اولاد، ماموں کی اولاد، پھوپھی کی اولاد، خالہ کی اولاد وغیرھا۔ ان کی امداد کرنا سنت مؤکدہ ہے۔ اس امداد سے مراد ہے ان کی مالی طور پر بدنی طور پر معاونت کرنا ان کی تکالیف میں ہاتھ بٹانا۔

" اما احسان بمعنی ترک ایذء پس نسبت بهمه اینها فرض است بلکه نسبت بسائر مسلمین "

لیکن احسان کا معنی یہ لینا کہ ان کو ایذاء نہ پہنچائی جائے۔ یہ احسان تمام رشتہ داروں پر کرنا فرض ہے بلکہ تمام مسلمانوں سے یہ احسان کرنا فرض ہے۔ اس لئے کہ کسی مسلمان کو بھی ایذاء پہنچانا، نقصان دینا ناجائز ہے حرام سے بچنا مسلمان کے لئے فرض ہے۔

نکتہ : ﴿ ذِی الْقُرْبٰی ﴾ کو واحد ذکر کیا گیا ہے۔ اور یتامی اور مساکین کو جمع ذکر کیا گیا ہے اس کی وجہ کیا ہے؟ تو اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ اس سے یہ سمجھایا گیا ہے کہ تمام رشتہ داروں سے ایک جیسا سلوک رکھے اگر محرم رشتہ دار ہیں تو ان تمام سے ایک جیسا تعلق رکھے تا کہ بعض کی دل شکنی کا سبب نہ بنے اگر رشتہ دار محرم نہیں تو ان تمام سے بھی ایک ہی قسم کا تعلق رکھے۔ لیکن یتیموں اور مسکینوں میں سے ہر ایک سے ایک جیسا سلوک کرنا ضروری نہیں۔

نکتہ ، دیگر : یہاں ﴿ وَذِی الْقُرْبٰی ﴾ میں باء کو نہیں ذکر کیا اور سورۃ نساء میں ﴿وَبِذِی الْقُرْبٰی ﴾ ذکر کیا جس میں " باء " بھی پائی گئی ہے وجہ فرق کیا ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں بنی اسرائیل سے وعدہ لینے کا ذکر ہے جو والدین کے بغیر اور رشتہ داروں کے حقوق کو کوئی حیثیت نہیں دیتے تھے اس لئے ﴿ وَبِالْوَالِدَیْنِ ﴾ کے تابع رشتہ داروں کا ذکر کیا گیا۔

اور سورۃ نساء میں نبی کریم ﷺ کی امت کو حکم دیا گیا ہے وہ رشتہ داروں کے حقوق کو فطری اور عقلی طور پر سمجھتے تھے ان کو تاکید کے طور پر شرعی حیثیت سے بھی حکم دے دیا گیا ہے۔ اسی وجہ سے سورۃ نساء میں "بـــا" کا اعادہ کر کے قرابت داروں کے حقوق کو مستقل حیثیت دے دی گئی اور یتامی اور مساکین کے

حقوق کوان تابع کر کے فرمایا:

﴿ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّبِذِى الْقُرْبٰى وَالْيَتَامٰى وَالْمَسَاكِيْنَ ﴾

﴿ وَالْيَتَامٰى ﴾: "یتیموں کے ساتھ بھلائی کرو" یتامی جمع ہے یتیم کی۔ جیسے ندیم کی جمع ندامی آتی ہے۔اور کبھی یتیم کی جمع ایتام بھی آتی ہے " والیتیم اصل معناه الانفراد " اور یتیم کا اصل معنی ہے منفرد ہونا۔اسی لئے کہا جاتا ہے " درة یتیمة " یکتا موتی، اور وہ گھر جو دوسرے گھروں سے جدا بنا ہوا ہو اسے " بیت یتیم " کہا جاتا ہے۔

آزاد کشمیر اور مری اور ایبٹ آباد وغیرہ کے پہاڑی علاقوں میں اکثر گھر بیوت یتامی (مرکب توصیفی) ہی ہیں۔اسی معنی کے لحاظ پر " یقال صبی یتیم ای منفرد من ابیه " بچے کو یتیم کہا جاتا ہے کہ یہ اپنے باپ سے منفرد ہے۔

"وقال ثعلب الغفلة " یتیم کا ایک معنی غفلت بھی ہے۔یتیم بچہ بھی چونکہ اپنے باپ کی فرمانبرداری سے غافل ہوتا ہے اس لئے اسے یتیم کہا جاتا ہے۔

" وقال ابو عمرو الابطاء " یتیم کا ایک معنی دیر کرنا بھی آتا ہے چونکہ یتیم بچے کا باپ نہیں ہوتا اس لئے گویا کہ اس سے باپ کی فرمانبرداری میں تاخیر ہوتی ہے لہٰذا اسے یتیم کہہ لیا جاتا ہے۔

" وهو فی الآدميين من قبل الآباء ولا يتيم بعد بلوغ وفی البهائم من قبل الامهات من قبل الامهات وفی الطيور من جهتهما "

انسان وہ یتیم ہے جس کا باپ نہ ہو اور اس وقت تک تیتیم ہے جب تک بالغ نہیں ہوتا، بالغ ہونے کے بعد یتیم نہیں رہتا اور چوپاؤں میں سے وہ یتیم ہے جس کی ماں نہ ہو، اور پرندوں میں سے وہ یتیم ہے جس کے ماں باپ دونوں ہی نہ ہوں۔(از روح المعانی)

مسئلہ: انسان کا نسب باپ کی طرف منسوب ہوتا ہے: " وانما اضيف الآدمی الی ابيه تشريفا له وصيانة له عن الضياع " انسان کی نسبت اس کے باپ کی طرف ہوتی ہے اس کی بزرگی کے پیش نظر اور اس کو ضائع ہونے سے بچانے کی غرض سے۔کیونکہ وراثت وغیرہ کی دارومدار اسی

پر ہے کہ اولاد کو باپ کی طرف منسوب کیا جائے۔

" ان الاصل فی الحیوانات الالحاق بالام " اصل یہ ہے کہ جانوروں کو ان کی ماؤں کی طرف منسوب کیا جائے اسی قانون کے پیش نظر اگر کوئی وحشی جانور باپ ہو اور گھریلو جانور ماں ہو تو ان کی اولاد کو گھریلو سمجھ کر قربانی کے جائز ہونے کا حکم ثابت ہے۔

" ان نزا الذئب علی الشاۃ یضحی بالولد " اگر بھیڑیئے اور بکری کے ملاپ سے کوئی بچہ پیدا ہو جائے تو اس کی قربانی جائز ہے اسے کھانا جائز ہے۔ اس لئے کہ اس کی ماں بکری ہے جو حلال جانور ہے۔ (شامی ج اول ص ۱۶۵)

یتیم کی پرورش مستحسن کام:

" قال رسول اللہ ﷺ ، کافل الیتیم لہ او لغیرہ انا وھو کھاتبن فی الجنۃ واشار مالک بالسبابۃ والوسطی "

حدیث پاک کے راویوں میں سے ایک راوی مالک نے اپنی شہادت کی انگلی اور درمیان والی انگلی سے اشارہ کر کے بتایا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا یتیم وغیرہ کی کفالت کرنے والا اور میں جنت میں اس طرح ہوں گے یعنی آپ نے اپنی انگلیوں سے اشارہ کر کے فرمایا جسے مالک نے اسی طرح بیان فرمایا "یعنی اسے میرا قرب حاصل ہوگا"۔

☆ " عن ابن عباس قال قال رسول اللہ ﷺ من ضم یتیما من بین مسلمین الی طعامہ وشرابہ حتی یغنیہ اللہ عزوجل غفرت لہ ذنوبہ البتۃ الا ان یعمل عملا لا یغفر ومن اذھب اللہ کریمتیہ فصبر واحتسب غفرت لہ ذنوبہ قال وما کریمتاہ ؟ قال عیناہ ، ومن کان لہ ثلاث بنات اوثلاث اخوات فانفق علیھن واحسن الیھن حتی یبن اویمتن غفرت لہ ذنوبہ البتۃ الا ان یعمل عملا لا یغفر ، فناداہ رجل من الاعراب ممن ھاجر فقال یا رسول اللہ او اثنتین ؟ فقال رسول اللہ ﷺ او اثنتین "

جس شخص نے مسلمانوں میں سے یتیم کو اپنے ساتھ کھانے ، پینے میں شریک کیا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے اسے بے پرواہ کر دیا (یعنی وہ بالغ ہوگیا) اللہ تعالیٰ (یتیم کو اپنے ساتھ کھانے پینے میں

شریک کرنے والے) اس شخص کے گناہ یقیناً معاف فرما دے گا ہاں البتہ اس نے کوئی ایسا عمل نہ کیا ہو جو قابل مغفرت نہیں۔ اور اللہ تعالیٰ نے جس شخص کی دو کریم چیزوں کو لے لیا اور اس نے صبر سے کام لیا اور دین پر قائم رہا تو اللہ تعالیٰ اس کے گناہوں کی مغفرت فرما دے گا۔

صحابہ کرام نے پوچھا یا رسول اللہ "وہ دو کریم چیزیں کیا ہیں"؟ آپ نے فرمایا اس کی دونوں آنکھیں۔ اور آپ نے فرمایا جس شخص نے اپنی تین بیٹیوں یا تین بہنوں (جو بیوہ ہوں یا مطلقہ) پر اپنا مال خرچ کیا اور ان پر احسان کیا یہاں تک کہ انہوں نے اور نکاح کر لیا یا وہ فوت ہو گئیں۔ تو اس شخص کی رب تعالیٰ یقیناً مغفرت فرمائے گا ہاں البتہ اس کا کوئی ایسا جرم نہ ہو جو قابل معافی جرم نہیں۔

ایک مہاجر اعرابی شخص نے آپ سے سوال کیا، یا رسول اللہ یا دو ہوں (یعنی دو بیٹیوں اور دو بہنوں پر مال خرچ کرنے والے کا کیا حکم ہے؟) نبی کریم ﷺ نے فرمایا خواہ دو ہی ہوں یعنی دو کی ذمہ داری اٹھانے والا بھی قابل مغفرت ہوگا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اس حدیث کو عجیب حوصلہ افزاء مغفرت کا ذریعہ فرماتے تھے۔ حدیث پاک سے یتیم پر احسان کرنا باعث مغفرت ہونا واضح ہو گیا۔

﴿ وَالْمَسَاكِينَ ﴾: "اور مسکینوں سے بھلائی کرو" مسکین ماخوذ ہے سکون سے، چونکہ فقر نے اسے روک رکھا ہوتا ہے اس لئے اسے مسکین کہا جاتا ہے اور یا اسے مسکنۃ سے لیا ہوا ہے۔ جس کا معنی ہے حقیر اور ذلیل ہونا، یعنی وہ اپنے مال کے کم ہونے کی وجہ سے لوگوں کی نظر میں حقیر اور ذلیل ہوتے ہیں۔ مسکین کا سکون یا مسکنۃ سے ماخوذ ہونے کا فرق طلباء کرام راقم کے حاشیہ میزان الصرف میں دیکھیں۔

یتامی کے بعد مساکین کا ذکر کیا گیا اس لئے کہ انسان کبھی مساکین پر اس لئے رحم کرتا ہے کہ وہ میری خدمت کریں گے اس طرح انسان کی اپنی ذہنی کیفیت مساکین پر رحم کرنے کی زیادہ ہوتی ہے۔ لہٰذا رب تعالیٰ نے یتامی کا پہلے ذکر کر کے واضح کر دیا کہ رحم کرنے کے لحاظ پر ان کا حق پہلے ہے۔ اس وجہ سے بھی ان کا حق پہلے ہے کہ وہ نابالغ ہونے کی وجہ سے کوئی ذریعہ معاش حاصل نہیں کر سکتے۔ لیکن مساکین کچھ نہ کچھ محنت و مزدوری کر کے مال حاصل کر سکتے ہیں۔ (از کبیر)

مساکین پر رحم کرنا:

" وھذا یتضمن الحض علی الصدقة والمؤ اساة وتفقد احوال المساکین والضعفاء "

مسکینوں پر بھلائی کرنے کا حکم عطا فرما کر مسکین اور ضعیف لوگ جو کمزور حال ہیں ان پر صدقہ کرنے اور ان پر غم کھانے کا حکم دیا گیا۔

☆ " روی مسلم عن ابی ھریرة عن النبی ﷺ قال الساعی علی الارملة والمسکین کالمجاھد فی سبیل اللہ واحسبه قال وکالقائم لا یفتر وکالصائم لا یفطر "

حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیوہ عورت اور مسکین شخص کی امداد کرنے والا اس شخص کی طرح ہے جو اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرنے والا ہے۔ حضرت ابوہریرہ کہتے ہیں میرا گمان یہ ہے کہ آپ نے یہ بھی فرمایا کہ وہ اس شخص کی طرح ہے جو بغیر سستی کے قیام کرنے والا ہے (یعنی رات کو بغیر سستی کے نوافل ادا کرنے والے کی طرح ہے) اور اس روزہ دار کی طرح ہے جو افطار نہ کرتا ہو۔ یعنی سوائے ایام ممینہ (روزہ رکھنا جن دنوں میں منع ہے) کے ہر دن روزہ رکھے۔

☆ " قال ابن المنذر وکان طاؤس یری السعی علی الاخوات افضل من الجهاد فی سبیل اللہ " (از قرطبی)

ابن منذر نے کہا طاؤس بہنوں کی امداد کرنے کو اللہ کی راہ میں جہاد کرنے سے افضل سمجھتے تھے۔

لیکن یہ خیال رہے کہ یہ اس وقت ہے جب جہاد فرض نہ ہو جائے فرض عین کے مقابل مستحبات افضل نہیں ہو سکتے۔

﴿وَقُولُوا لِلنَّاسِ حُسْنًا﴾ : "اور کہو لوگوں سے اچھی بات" ای قولا حسنا سماہ به لمبالغة " "حسن" مصدر ہے مبالغہ کے طور پر ذکر ہے کہ تم لوگوں سے بہت ہی اچھی بات کرو۔

مختصر الفاظ لیکن معانی کثیر: یعنی اچھی بات کرنے کے کئی مطالب ہیں۔ بظاہر الفاظ مختصر ہیں لیکن مطالب کثیر ہیں۔

(۱) " والمراد قولوا لھم القول الطیب وجاوبوھم باحسن ما یحبون "

مراد یہ ہے کہ تم لوگوں سے اچھی بات کرو اور تم ان کو ایسا جواب دو جو وہ پسند کرتے ہوں۔

(۲) " مروهم بالمعروف وانهو هم عن المنكر "

اور اس سے مراد یہ ہے کہ لوگوں کو اچھے کاموں کا حکم دو اور برے کاموں سے منع کرو۔

(۳) " قولوا لهم لا اله الا الله مروهم بها "

لوگوں کے سامنے تم خود بھی " لا اله الا الله " کہو اور ان کو بھی حکم دو کہ تم بھی " لا اله الا الله " کہو۔

(۴) " اعلموهم بما فی کتابکم من صفة رسول الله ﷺ "

جو تمہاری کتاب میں نبی کریم ﷺ کی صفات مذکور ہیں وہ اور لوگوں کو بھی بتاؤ یعنی تمہارا دوسرے لوگوں کو صاف صاف بتانا اچھی بات ہے۔ (روح المعانی)

(۵) " قولوا للناس صدقا فی امر محمد ﷺ ولا تغیروا نعته "

نبی کریم ﷺ کی صفات کو تبدیل نہ کرو اور آپ کے متعلق لوگوں سے سچ سچ بیان کرو۔

(قرطبی)

یہاں سے پتہ چلا کہ نبی کریم ﷺ کے اوصاف کو چھپانا یہودیوں کا طریقہ تھا آج کل بھی جھگڑا صرف نبی کریم ﷺ کے اوصاف پر ہے آپ کے فضائل والی احادیث کو ایڑی چوٹی کا زور لگا کر ضعیف کہا جاتا ہے۔ گستاخانِ رسول اللہ ﷺ کی تو بات ہی کیا ہے لیکن افسوس کہ سنیت کے لبادہ میں گستاخوں کے ایجنٹ بھی وہی کام کر رہے ہیں جو ان کے آقاؤں نے کیا۔

مٹ گئے، مٹ جائیں گے سب اعداء تیرے ۔۔۔ نہ مٹا ہے نہ مٹے گا کبھی چرچا تیرا

تنبیہ: " والظاهر ان هذا الامر من جملة الميثاق الماخوذ علی بنی اسرائیل "
اس آیۂ کریمہ سے ظاہر طور پر یہی واضح ہو رہا ہے کہ ﴿ وَقُولُوا لِلنَّاسِ حُسْنًا ﴾ بھی اسی میثاق کا حصہ ہے جو بنی اسرائیل سے لیا گیا۔ یعنی جب ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا .... اور ان کو یہ کہہ کر "کہ لوگوں سے اچھی بات کرو" بھی عہد لیا۔ (روح المعانی)

اسی قول پر تقریباً قرطبی رحمہ اللہ کی یہ تفسیر بھی دلالت کر رہی ہے:

" وقال طلحة بن عمر قلت لعطاء انک رجل یجتمع عندک ناس ذو

اھـواء مـخـتـلفة وانا رجل فی حدة فاقول لھم بعض القول الغلیظ قال لا تفعل یقول اللہ تعالیٰ ﴿ وَقُولُوا لِلنَّاسِ حُسْنًا ﴾ فدخل فی ھذہ الآیة الیھود والنصاری فکیف بالحنیفی وفی بعض نسخ الاصل " وفی غیرھما "۔

طلحہ بن عمر نے کہا، میں نے عطا کو کہا بیشک تو وہ شخص ہے جس کے پاس لوگ جمع ہوتے ہیں جو مختلف خواہشات اور مختلف طبیعتیں رکھنے والے ہوتے ہیں۔ (لیکن تم ان سے اچھا کلام کرتے ہو) لیکن میری طبیعت میں تیزی ہے کہ میں بعض لوگوں سے سخت کلام بھی کر لیتا ہوں۔ انہوں نے کہا ایسا نہ کیا کرو کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ﴿ وَقُولُوا لِلنَّاسِ حُسْنًا ﴾ لوگوں سے اچھی بات کہو۔ جب اس آیۃ میں یہود اور نصاری داخل ہیں تو ان کے غیر کیوں داخل نہیں ہوں گے۔ یعنی اگر چہ یہ بنی اسرائیل سے عہد لیا گیا تھا لیکن حکم عام ہے۔ جو نبی کریم ﷺ کی امت کو بھی شامل ہے۔

☆ " وروی عن النبی ﷺ انہ قال لعائشة لا تکونی فاحشة فان الفحش لو کان رجلا لکان رجل سوء "

نبی کریم ﷺ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو فرمایا فحش کلام والی کبھی نہ بننا، اس لئے کہ فحش کلام کرنے والا شخص برا شخص ہوتا ہے۔

ایک اور قول: ابھی تک جو ذکر کیا اس کا مطلب یہ تھا کہ ﴿ وَقُولُوا لِلنَّاسِ حُسْنًا ﴾ بھی بنی اسرائیل سے لئے ہوئے میثاق کا حصہ ہے کہ یہ خطاب بھی بنی اسرائیل کو ہے۔ لیکن ایک قول یہ ہے "ان المخاطب به الامة" کہ بیشک اس میں خطاب ہے نبی کریم ﷺ کی امت کو پھر اس میں کلام ہے کہ یہ منسوخ آیات قتال سے یا محکم ہے (یعنی منسوخ نہیں) اسی طرح اسمیں مختلف اقوال ہیں۔ کہ "للناس" سے مراد نیک مؤمن لوگ ہوں۔ مطلب یہ ہے کہ نیک مومن لوگوں سے اچھی بات کرو، اس قول کے مطابق کفار اور فساق سے اچھی بات کرنے کا حکم ہمیں نہیں دیا گیا، بلکہ ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ ہم ان پر لعنت کریں ان کی مذمت بیان کریں اور ان سے جنگ کریں۔ اسی طرح رب تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ ﴾

"اللہ پسند نہیں کرتا بری بات کا اعلان مگر مظلوم سے"۔

یعنی مظلوم شخص ظالم کے برے اقوال وافعال کو لوگوں اور حکام سے واضح طور پر بیان کرے۔

لیکن ایک اور قول یہ ہے:

" فینبغی للانسان ان یکون قوله للناس لینا ووجهه منبسطا طلقا مع البر والفاجر والسنی والمبتدع من غیر مداهنة ومن غیر ان یتکلم معه بکلام یظن انه یرضی مذهبه"

کہ انسان کو چاہئے کہ وہ لوگوں سے نرم کلام کرے اور کشادہ روئی (ہنس مکھ ہوکر) سے کلام کرے، خواہ نیک لوگوں سے بات کرے یا برے لوگوں سے، سنت کے مطابق چلنے والوں سے کلام کرے یا بدعت پر عمل کرنے والوں سے کلام کرے، البتہ اس میں چاپلوسی نہ پائی جائے اور یہ محسوس نہ ہو کہ یہ اس کے دین اور اس کے طریقہ کو پسند کرتا ہے۔

ان حضرات کی دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کو فرمایا: ﴿ فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّیِّنًا ﴾ ''تم دونوں اس سے نرم بات کرو'' مراد اس سے فرعون ہے یعنی فرعون سے نرم کلام کرنے کا حکم اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء کرام کو دیا ہے۔

" فالقائل لیس بافضل من موسی وهارون والفاجر لیس باخبث من فرعون"

اللہ تعالیٰ نے جب حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کو حکم دیا کہ فرعون کے پاس جا کر اسے تبلیغ کرو لیکن اس سے بات نرم کرو، تو یہی حکم سب کے لئے ہوگا، کیونکہ کوئی اور شخص بات کرنے والا ان دونوں نبیوں سے افضل نہیں ہوسکتا اور جس سے بات ہوگی وہ فرعون سے زیادہ خبیث نہیں ہوسکتا۔ اور رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿ اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ ﴾

''اپنے رب کی راہ کی طرف حکمت اور اچھی نصیحت سے بلاؤ''

اور رب تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَلَا تَسُبُّوا الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَیَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًا بِغَیْرِ عِلْمٍ ﴾

''اور انہیں گالی نہ دو جن کو وہ اللہ کی سوا پوجتے ہیں کہ وہ اللہ کی شان میں بے ادبی کریں گے

زیادتی اور جہالت سے"۔

اس آیۃ میں کفار کے باطل معبودوں کو گالی دینے سے منع کیا گیا ہے تا کہ وہ اپنی جہالت اور ضد اور عناد کی وجہ سے بے جا زیادتی کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی شان میں گستاخی نہ کریں۔

محاکمہ : جب سخت کلام کرنے اور نرم کلام کرنے کے احکام پائے جاتے ہیں۔تو یقیناً ان کے علیحدہ علیحدہ مطالب بھی ہیں۔اس لئے ان کو اسطرح بیان کیا جائے کہ کوئی تعارض نظر نہ آئے اور نہ ہی بیان کرنے والوں کے درمیان کوئی اختلاف نظر آئے اس کی وضاحت یہ ہے:

لوگوں سے کلام یا دینی امور کے متعلق ہوگی یا دنیاوی امور کے متعلق ہوگی۔اگر دینی امور کے متعلق ہو تو کفار کو دعوت ایمان دینی مقصود ہو، یا فساق کو طاعت کی دعوت دینی مقصود ہو " فلا بد وان تکون بالقول الحسن " تو ضروری ہے کہ اچھی بات کے ذریعے ان کو راہ راست پر لانے کی کوشش کرے۔اسی وجہ سے رب تعالیٰ نے حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کو فرمایا:

﴿ فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى ﴾

"اس سے نرم بات کرو شائد وہ نصیحت حاصل کرلے یا ڈر جائے"۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے جلیل القدر انبیاء کرام کو جب فرعون سرکش، کافر، خدائی کے دعویدار سے نرم بات کرنے کا حکم دیا تو پتہ چلا کہ کسی کو بھی دعوت ایمان دینی ہو تو نرم گفتگو کی جائے۔نبی کریم ﷺ کو بھی خطاب کرتے ہوئے رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

" ولو کنت فظا غلیظ القلب لا نفضوا من حولک "

اگر آپ تند مزاج اور سخت دل ہوتے تو وہ ضرور آپ کے گرد سے ہٹ جاتے۔

" واما دعوة الفساق فالقول الحسن فیه معتبر '

فاسق لوگوں کو جب دعوت دی جائے تو اس وقت بھی نرم اور اچھی بات کی جائے۔

اسی وجہ سے رب تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ ﴾

"یعنی حکمت اور اچھے وعظ سے حق راہ کی دعوت کا حکم فرمایا گیا ہے"۔

" واما الامور الدنيوية فمن المعلوم بالضرورة انه اذا امكن التوصل الى الغرض بالتلطف من القول لم يحسن سواه "

دیناوی معاملات بھی اگر نرم گفتگو سے حاصل ہو جائیں تو نرم گفتگو ہی کرے کسی قسم کی سخت کلامی کرنا منع ہے ہاں اگر بغیر ڈانٹ کے دنیاوی معاملہ کا کوئی حل نہ نکلے تو بارعب بات کرنا گرجدار آواز میں بات کرنا جائز ہے تا کہ وہ معاملہ حل ہو جائے۔

کفار اگر ایمان نہ لائیں، اپنے کفر پر قائم رہیں تو ان سے جنگ کرنا ان پر لعنت بھیجنا ان پر سختی کرنا ہی رب تعالیٰ کو پسند ہے اسی لئے نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام کی شان میں فرمایا:

" محمد رسول الله والذين معه اشداء على الكفار رحماء بينهم "

محمد رسول اللہ اور ان کے ساتھ والے کافروں پر سخت ہیں اور آپس میں نرم دل۔

صحابہ کرام کفار پر اس طرح سخت حملہ آور ہوتے جیسے شیر شکار پر حملہ کرتا ہے۔ اور صحابہ کرام کا تشدد کفار کے ساتھ اس حد پر تھا کہ وہ لحاظ رکھتے تھے کہ ان کا بدن کسی کافر کے بدن سے نہ چھو جائے اور ان کے کپڑے سے کسی کافر کا کپڑا نہ لگنے پائے۔ اور آپس میں نرمی کا یہ مقام تھا کہ ایک دوسرے پر اس طرح مہربانی کرتے اور اس طرح محبت سے درپیش آتے جیسے باپ بیٹے میں محبت ہوتی ہے۔ یہ محبت اس حد تک پہنچ گئی تھی کہ جب ایک دوسرے کو دیکھتے تو شدید محبت کی وجہ سے ایک دوسرے کو گلے لگا لیتے اور مصافحہ کرتے۔ اور رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿ يَآ اَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنَافِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ ﴾

''اے نبی کفار اور منافقین سے جہاد کرو اور ان پر سختی فرماؤ''۔

اس آیۃ کریمہ میں بھی کفار اور منافقین سے رعب دار کلام کرنے اور جہاد کرنے کا حکم دیا کہ کافروں سے اس طرح کلام نہ کرو کہ تمہاری بزدلی نظر آئے، کفار کی خوشامد نہ کرو ان کے سامنے جی حضوری نہ بن جاؤ۔

یہاں یہ بھی خیال رہے کہ آیۃ کریمہ میں بظاہر خطاب نبی کریم ﷺ کو ہے لیکن مراد آپ کی امت ہے۔ اسی لئے راقم نے وضاحت کرتے ہوئے ایسے الفاظ ذکر کیے ہیں جو امت کی طرف منسوب ہیں۔ نبی کریم ﷺ کی طرف ''بزدلی، خوشامد'' جیسے الفاظ استعمال نہیں کیے جا سکتے۔

تنبیہ : کسی کو راہ راست پر لانے کے لئے نرم کلام کرنے کا اور مقصد ہے اور کسی سے ڈر کر، یا کسی کے سامنے خوشامد کے طور پر نرم کلام کرنے کا اور مقصد ہے۔ پہلا انداز قابل تعریف ہے اور دوسرا انداز قابل مذمت ہے اسی طرح سخت کلامی کی بھی دو ہی صورتیں ہیں۔ ایک یہ ہے کہ بارعب، بلند آواز سے کلام کی جائے کسی کے سامنے سر نہ جھکایا جائے۔ اس انداز سے کفار سے کلام کرنا قابل تعریف ہے تاکہ کفار کو معلوم ہو جائے کہ مسلمان جرأت اور بہادری کا مالک ہے۔

دوسرا انداز یہ ہے بیہودہ کلام کرے، گالیاں نکالے، ایسا انداز اختیار کرنا مسلمان کی شان کے لائق نہیں۔ وہ مومن سے کلام کرے یا کافر سے کلام سنجیدہ بیہودہ، بکواس بازی نہ ہو۔ انسانیت کا یہی تقاضا ہے۔ (ماخوذ از قرطبی، روح المعانی، کبیر، خزائن العرفان بزیادۃ)

﴿ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ﴾ : ''اور نماز قائم کرو اور زکواۃ دو'' یہ خطاب بھی بنی اسرائیل کو ہی ہے نماز اور زکواۃ ان پر بھی فرض تھی۔ اگرچہ مقدار وغیرہ میں بھی فرق تھا۔ یہود پر زکواۃ مال کا چوتھا حصہ فرض تھی۔ پھر وہ لوگ زکواۃ اپنے غریب لوگوں کو دیتے تھے یا کہ ان کی قربانی کی طرح زکواۃ کی قبولیت کی بھی علامت یہ تھی کہ آگ آتی اور اس مال کو کھا جاتی۔

علامہ آلوسی نے اس قول کو مطلقاً ذکر کیا۔ لیکن علامہ قرطبی نے ذکر کیا کہ قول یہ نقل کا محتاج ہے نقلی دلیل کا ملنا ضروری ہے جس سے پتہ چل جائے کہ واقعی قدرتی طور پر آگ آتی تھی جو ان کی زکواۃ کو کھا جاتی تھی۔ نماز اور زکواۃ کا مختصر ذکر رکوع نمبر ۵ میں گزر چکا ہے۔ دوبارہ اعادہ کی ضرورت نہیں۔

تنبیہ : پہلے والدین اور رشتہ داروں پر احسان کرنے کا حکم دیا۔ پھر زکواۃ ادا کرنے کا حکم دیا جس سے واضح ہوا کہ پہلا حکم صدقات مستحبہ سے ہے۔ اور زکواۃ ادا کرنا فرض ہے اسے سے یہ واضح ہو گیا کہ زکواۃ والدین یا اولاد کو نہیں دی جائے گی کیونکہ زکواۃ اصول (باپ داد، پردادا، دادی، پردادی وغیرھا، ماں، نانی، نانا، پرنانا وغیرہ) اور فروع (اولاد اور اولاد کی اولاد نیچے تک) کو نہیں دی جا سکتی۔ اور زوجین بھی ایک دوسرے کو زکواۃ نہیں دے سکتے۔ اصول وفروع کی مالی معاونت زکواۃ کے مال کے غیر مال سے کی جائے گی زکواۃ مستحقین کو ہی دی جائے گی۔

﴿ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْكُمْ وَاَنْتُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴾:

''پھر تم پھر گئے سوائے تھوڑے تم میں سے اور تم ہو ہی اعراض کرنے والے''۔

یہ خطاب نبی کریم ﷺ کے زمانہ کے یہود کو ہے کہ تم نے نبی کریم ﷺ کے معجزات کو دیکھ کر اعراض کر لیا۔ ہاں البتہ تم میں سے تھوڑے ایمان لائے۔ انہوں نے اعراض نہیں کیا وہ حضرت عبداللہ بن سلام اور کعب بن احبار اور ان کے ساتھی ہیں ؓ۔

اور ضمناً اس میں ان کے آباؤ اجداد کا بھی ذکر ہے کہ تمہارے آباء واجداد کا بھی یہی طریقہ چلا آ رہا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے وعدہ کر لیتے تھے پھر اعراض کر لیتے تھے۔

اعتراض: ﴿ تَوَلَّيْتُمْ ﴾ اور ﴿ وَاَنْتُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴾ کا ایک ہی مطلب ہے پھر جانا، اعراض کرنا، ایک ہی معنی پر دلالت کرنے والے دو لفظوں کو ایک ہی جگہ ذکر کرنے کا کیا مطلب؟

جواب نمبر ۱: " التولی بالجسم والاعراض بالقلب " ﴿ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ تم جسمانی طور پر پھر گئے کہ نبی کریم ﷺ سے دور ہو گئے۔ آپ کے قریب تم نے بیٹھنے سے اعراض کیا۔ اور ﴿ وَاَنْتُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴾ سے مراد دل سے پھرنا ہے۔ یعنی تم نبی کریم ﷺ سے حسد اور عناد کرنے لگے جس کی وجہ سے تم نے دل سے ان کو نبی نہیں مانا اور ایمان قبول نہیں کیا۔

جواب نمبر ۲: ﴿ وَاَنْتُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴾ حال لان التولی فیہ دلالۃ علی الاعراض " یعنی ﴿ وَاَنْتُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴾ جملہ حالیہ ہے کیونکہ ﴿ تَوَلَّيْتُمْ ﴾ اعراض پر دلالت کر رہا ہے اب مفہوم اس طرح ہوگا پھر تم پھر گئے ایسے حال میں کہ تم اعراض کرنے والے ہو۔ اس جواب کو پنجابی کے اس جملہ سے اچھی طرح سمجھا جا سکتا ہے ''منہ ادھر چا کے دفعہ ہو گیا'' یعنی منہ پھیر کر تم ادھر چلے گئے۔ (از قرطبی)

جواب نمبر ۳: ﴿ وَاَنْتُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴾ ای وانتم قوم عادتکم الاعراض والتولی عن المیثاق " ﴿ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ تم میثاق سے پھر گئے اور ﴿ وَاَنْتُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ تمہاری عادت ہی یہ ہے کہ اعراض کرنا۔ (روح المعانی)

روح المعانی کے جواب کے مطابق اعلیٰ حضرت کا ترجمہ ہے ''اور تم روگرداں ہو'' راقم نے عوام کے سمجھنے کے لئے ذرا زیادہ واضح کر دیا ''تم ہو ہی اعراض کرنے والے''۔

گذشته سے پیوسته : قولِ حسن (اچھی بات) کے متعلق علامہ رازی رحمہ اللہ نے بیان فرمایا:

'' ان القول الحسن ليس عبارة عن القول الذی يشتهونه ويحبونه ، بل القول الحسن هو الذی يحصل انتفاعهم به ونحن اذا لعناهم وذممناهم ليرتدعوا به عن الفعل القبيح كان ذلك المعنى نافعافی حقهم فكان ذلك اللعن قولا حسنا ونافعا كما ان تغليظ الوالد فی القول قد يكون حسنا ونافعا من حيث انه يرتدع به عن الفعل القبيح ''

(کبیر)

اچھی بات کا صرف یہ ہی مطلب نہیں کہ مخاطب اسے سن کر خوش ہو اور پسند کرے بلکہ اچھی بات وہ ہے جس سے مخاطب کو نفع ہو، لہٰذا کافروں پر لعنت کرنا، ان کی مذمت بیان کرنا درحقیقت ان کے لئے نفع مند ہے تاکہ وہ کفر سے باز آ جائیں اس لحاظ پر ان پر لعنت کرنا اور ان کی مذمت بیان کرنا ان سے اچھی گفتگو ہوگی نہ کہ بری۔ انسان کبھی اپنی اولاد سے بظاہر سخت لہجہ میں بات کرتا ہے لیکن اولاد کی اچھی تربیت کی لئے اور غلط کاموں سے روکنے کے لئے یہ طریقہ استعمال کیا جاتا ہے جو اولاد کے حق میں سخت بات ہونے کے باوجود اچھی بات ہوگی۔

فائدہ: اسی سے یہ فائدہ حاصل ہو گیا کہ استاذ اگر شاگرد کو سبق یاد کرنے کیلئے اس کی اچھی تربیت کیلئے بطور سرزنش کے سخت کلام کرے تو اسے اچھا کہا جائے گا۔ اس بات کو برا نہیں کہا جا سکتا، ہاں البتہ گالیاں دینا، بیہودہ بکواس کرنا، بلاوجہ سرزنش کرنا استاذ کی شان کے لائق نہیں۔ اس سے استاذ کا وقار کم ہوتا ہے، بڑھتا نہیں۔ بعض استاذ اپنا رعب جمانے کی سوچ میں اپنے آپ کو بے وقار بنا لیتے ہیں۔

☆☆☆

﴿ وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ لَا تَسْفِكُوْنَ دِمَآءَ كُمْ وَلَا تُخْرِجُوْنَ اَنْفُسَكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ ثُمَّ اَقْرَرْتُمْ وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ ﴾ (آیت ۸۴)

۱) ''اور جب ہم نے تم سے عہد لیا کہ اپنوں کا خون نہ کرنا اور اپنوں کو اپنی بستیوں سے نہ نکالنا پھر تم نے اس کا اقرار کیا اور تم گواہ ہو''۔

۲) اور جب لیا ہم نے تم سے عہد کہ تم نہ بہانا اپنوں کا خون، اور نہ نکالنا تم اپنوں کو اپنی بستیوں سے پھر تم نے اقرار کر لیا ایسے حال میں کہ تم گواہ تھے''۔

اس آیۃ کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے یہود پر اپنے ایک اور انعام کا ذکر فرمایا لیکن انہوں نے اپنی عادت کے مطابق اس انعام کی قدر بھی نہ کی اور وعدہ کو توڑ دیا۔ چونکہ اللہ تعالیٰ نے ان سے ایک دوسرے کا خون نہ بہانے اور ایک دوسرے کو اپنی بستیوں سے نہ نکالنے کا وعدہ لیا جو یقیناً ان کے لئے عذاب سے بچنے اور جنت میں جانے کا ذریعہ ہونے کی وجہ سے عظیم انعام تھا لیکن انہوں نے اس وعدہ کو بھی توڑ دیا، عمل نہ کیا، جو ان کے لئے ذلت و رسوائی کا سبب بنا، جس کا ذکر اگلی آیۃ میں آ رہا ہے۔

شان نزول: اس آیۃ کریمہ اور آنے والی آیۃ کریمہ کا ایک ہی مضمون ہے اور ایک ہی شان نزول ہے۔ یہ آیۃ کریمہ نبی کریم ﷺ کے زمانہ کے مدینہ طیبہ میں رہنے والے یہود کے حق میں نازل ہوئی۔ جو اوس اور خزرج کی لڑائیوں میں معاونت کرتے تھے۔

اوس اور خزرج انصار تھے جو زمانہ جاہلیت میں بت پرست تھے، اور ان کے درمیان کثیر لڑائیاں واقع ہوئیں مدینہ طیبہ میں یہود کے تین قبیلے تھے۔ ایک بنو قینقاع اور دوسرا بنو النضیر۔ یہ دونوں خزرج قبیلہ کے حلیف تھے۔ اور تیسرا قبیلہ بنو قریظہ تھا جو اوس کے حلیف تھے۔ جب اوس اور خزرج کی آپس میں لڑائی ہوتی تو خزرج کے حلیف بنو قینقاع اور بنو النضیر ان سے مل جاتے اور بنو قریظہ اپنے حلیف اوس سے مل جاتے۔

جب ان کے درمیان لڑائی ہوتی تو یہودیوں کے ہاتھوں دوسرے یہودی بھی مارے جاتے، اور

لڑائی میں جو قبیلہ غالب آ جاتا وہ دوسرے قبیلہ کو اپنی بستی سے نکال دیتا اور ان کا مال چھین لیتے۔ یہودیوں کے جو لوگ قیدی ہو چکے ہوتے تھے جب لڑائی ختم ہو جاتی تو دوسرا گروہ ان کا فدیہ دے کر چھڑا لیتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ان دونوں آیتوں میں اس کا ذکر کیا جس کی تفصیل ان شاء اللہ آ رہی ہے۔

(از صابونی)

﴿ وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ لَا تَسْفِكُوْنَ دِمَآءَكُمْ ﴾:

''اور جب لیا ہم نے تم سے عہد کہ نہ بہانا اپنوں کا خون''۔

﴿ تَسْفِكُوْنَ ﴾ السفک سے لیا ہوا ہے۔ جس کا معنیٰ ہے:

'' السفک فی الدم صبه و کذا فی الجوهر المذاب وفی الدمع ''

خون بہانا، آنسو بہانا، کسی دھات یعنی سونے، چاندی وغیرہ کو پگھلانا۔

اعتراض : ﴿ لَا تَسْفِكُوْنَ دِمَآءَكُمْ ﴾ کا ظاہر طور پر معنی یہ ہے کہ ''تم اپنے خون نہ بہاؤ'' انسان کی فطرت کا تقاضا ہے کہ وہ موت سے ڈرتا ہے مرنے کو اس کا جی نہیں چاہتا۔ جب کوئی انسان اپنے آپ کو قتل نہیں کرتا، اپنے آپ کو قتل کرنے سے گھبراتا ہے تو نہی (روکنے) کا کیا فائدہ ہے۔

پہلا جواب: کبھی کبھی لوگ موت سے ڈرنے کی باوجود اپنے آپ کو قتل کر لیتے ہیں، اس کی ایک وجہ یہ ہوتی ہے:

'' کثیر ممن صعب علیه الزمان وثقل علیه امر من الامور فیقتل نفسه ''

کہ انسان کثیر مشکلات میں مبتلاء ہو جاتا ہے جو اس کی قوت برداشت سے باہر ہو جاتا ہے تو وہ اپنے آپ کو قتل کر کے ان مصائب سے اپنے آپ کو آزاد کر لیتا ہے۔ (از کبیر)

لیکن اس کا یہ فعل حرام ہوتا ہے اللہ تعالیٰ نے اس سے منع کیا کہ تم اپنے آپ کو مشکلات کی وجہ سے قتل نہ کرنا مصائب کی وجہ سے صرف موت کی تمنا بھی منع ہے اپنے آپ کو قتل کر دینا تو شدید جرم ہے۔

☆ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

'' لا یتمنین احدکم الموت من ضر اصابه ''

تم میں سے کوئی شخص بھی مصیبت و ضرر میں موت کی ہرگز تمنا نہ کرے۔

اگر اس کو بہت مجبوری ہو موت کی تمنا وہ ضرور ہی کرنا چاہتا ہے تو اس طرح دعا کرے۔

" اللهم احینی ما کانت الحیاۃ خیرا لی وتوفنی اذا کانت الوفاۃ خیرا لی "
(بخاری ، مسلم ، مشکوۃ باب تمنی الموت وذکرہ)

یعنی انسان کو کسی قسم کا ضرر بھی پہنچے خواہ مالی ضرر ہو، یا بدنی، اگر وہ اس ضرر ونقصان، مصیبت والم اور دکھ، درد پر موت کی تمنا کرتا ہے اور یہ کہتا ہے اے اللہ مجھے موت دے دے۔ تو یہ اس کے جزع وفزع پر دلالت کرے گا، اور بے صبری اور بے ثباتی پائے جائے گی لہذا یہ جائز نہیں۔ ہاں اگر انسان موت کی تمنا ضروری ہی کرنا چاہتا ہے صبر کا دامن لبریز ہو چکا ہے مصائب وآلام پر قائم رہنا ناممکن ہو چکا ہے تو پھر بھی یہ نہ کہے کہ اے اللہ مجھے موت عطا کر۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف اپنا معاملہ سپرد کرتے ہوئے یوں عرض کرے اے اللہ اس وقت تک مجھے زندہ رکھ جب تک میرے لئے زندگی بہتر ہے اور اے اللہ مجھے وفات عطا کر دے جب میرے لئے وفات بہتر ہو۔

اس طرح انسان نے گویا کہ اللہ تعالیٰ کی تقدیر پر رضامندی کا اظہار کر دیا ہے اور کامل بے صبری کا مظاہرہ نہیں کیا۔

☆ " عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ ﷺ لا یتمنی احدکم الموت اما محسنا فلعلہ ان یزداد خیرا واما مسیئا فلعلہ ان یستعتب " (بخاری مشکوۃ باب تمنی الموت وذکرہ)

حضرت ابوھریرہ ؓ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تم میں سے کوئی ایک آدمی بھی موت کی تمنا نہ کرے اگر وہ نیک ہوا تو ہو سکتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی نیکیوں میں اور زیادتی کرے اور اگر وہ گناہگار ہوا تو ہو سکتا ہے اللہ تعالیٰ اسے توبہ کی توفیق عطا فرمادے۔

یعنی اگر انسان کو اللہ تعالیٰ عمر زیادہ عطا فرمائے اور ساتھ ساتھ نیکیوں کی توفیق بھی عطا فرمادے تو یہ انسان کے مراتب ومدارج میں بلندی کا ذریعہ ہوگا۔ لیکن اگر کوئی شخص گناہ کی زندگی گزار رہا ہے تو انسان کو بھی موت کی طلب کرنا درست نہیں کیونکہ ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے موت سے پہلے کسی وقت توبہ کی توفیق عطا فرمادے۔ جس سے اس کے گناہ بخش دیئے جائیں تو اس طرح عمر کی زیادتی اس انسان کے لئے بھی مفید ہوگی۔

فائدہ : چند مقامات وہ ہیں جہاں موت کی تمنا جائز ہے۔

" وقد افتی النووی انه لا یکره تمنی الموت لخوف فتنة دینیة بل قال مندوب " (مرقاۃ حوالہ مذکور)

علامہ نووی رحمہ اللہ نے اس پر فتوی دیا ہے کہ اگر ایسے فتنے نمودار ہو جائیں جن سے دین میں خلل آ رہا ہو تو ایسی صورت میں موت کی تمنا کرنا مکروہ نہیں۔ بلکہ مستحب ہے کہ وہ موت کی طلب کرے۔ کیونکہ اسے دین میں واقع ہونے والے فتنوں کی پریشانی سے راحت حاصل ہونے کا ذریعہ موت کی تمنا ہے جو یقیناً مستحسن تمنا ہے۔

" وکذا یندب تمنی الشهادة فی سبیل الله لانه صح عن عمر ﷺ وغیره " (مرقاۃ)

اسی طرح اللہ تعالیٰ کی راہ میں شہادت حاصل ہونے کی تمنا کرنا مستحب ہے جیسے حضرت عمر ﷺ اور دوسرے صحابہ کرام سے ثابت ہے کہ وہ حصول شہادت کی دعائیں کرتے رہے۔

خود نبی کریم ﷺ دعا فرماتے رہے کہ اے اللہ مجھے شہید کر دیا جائے پھر زندہ کر دیا جائے پھر شہید کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کے جسم اطہر کو ظاہر طور پر تو کافروں سے محفوظ رکھا تا کہ آپ کے جسم اطہر سے توہین آمیز سلوک نہ کر سکیں اور یہ بھی نہ کہہ سکیں کہ ہم نے مسلمانوں کے نبی کو قتل کر دیا ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے آپ کی دعا کو اس طرح قبول کیا کہ خیبر میں ایک یہودیہ نے آپ کو زہر آلود بکری کا گوشت کھلایا۔ اس وقت گوشت نے خود نبی کریم ﷺ کو بتایا کہ میں زہر آلود ہوں، لیکن آپ جو ایک دو لقمے لے چکے تھے اس زہر کا اثر آپ کے جسم اطہر میں محفوظ رکھا گیا، پھر زہر کے اثر کو لوٹایا گیا تو آپ کو شہادت کا درجہ بھی عطا کر دیا گیا۔

دوسری وجہ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمہ اللہ نے اپنی معروف تصنیف " سر الشهادتین " میں بیان کی کہ آپ کی دعا قبول کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے آپ کو دونوں شہادتوں (ظاہری اور سری) کا درجہ نصیب فرمایا ہے وہ اس طرح کہ حضرت امام حسن ﷺ جو نبی کریم ﷺ کے سر مبارک سے لے کر ناف تک آپکے مشابہ ہیں آپ کو زہر کی وجہ سے شہادت نصیب ہوئی اور حضرت امام حسین ﷺ جو ناف

سے لے کر پاؤں تک نبی کریم ﷺ کے مشابہ ہیں آپ کو ظاہری شہادت میدان جنگ میں نصیب ہوئی۔ اس طرح ان دونوں حضرات کی شہادت سے نبی کریم ﷺ کو بھی شہادت کا مرتبہ نصیب فرمادیا۔

مسلم شریف میں " من طلب الشهادة صادقا اعطيها ولو لم تصبه " جس شخص نے صدق دل سے شہادت طلب کی اللہ تعالیٰ اسے شہادت کا مرتبہ عطا فرماتا ہے خواہ وہ بظاہر شہید نہ بھی ہو۔

" ويندب ايضا تمنى الموت ببلد شريف لما فى البخارى ان عمر رضی اللہ عنہ قال اللهم ارزقنى شهادة فى سبيلك واجعل موتى ببلد رسولك فقالت بنته حفصة انى يكون هذا فقال ياتى به الله اذا شاء اى وقد فعل فان قاتله كافر مجوسى "

مدینہ طیبہ میں موت کی تمنا کرنا بھی مستحب ہے بخاری شریف میں ہے بے شک حضرت عمر رضی اللہ عنہ دعا کرتے تھے " اے اللہ مجھے اپنے راستہ میں شہادت نصیب فرما، اور میری موت اپنے رسول کے شہر میں مجھے نصیب فرما۔ آپ کی بیٹی (ام المؤمنین) حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا یہ کیسے ہوگا (کہ شہادت بھی ملے اور موت بھی مدینہ طیبہ میں آئے) مدینہ طیبہ میں کس سے جنگ ہوگی اور کیسے شہادت آئے گی؟ آپ نے بطور تعجب یہ عرض کیا حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا جب اللہ تعالیٰ چاہے گا تو ایسے ہی ہوگا آپ کی دعا کو اللہ تعالیٰ نے اسی طرح قبول فرمایا جیسے آپ نے عرض کیا کہ مدینہ طیبہ میں ہی آپ کو شہادت نصیب ہوئی کیونکہ آپ کا قاتل کافر، مجوسی تھا۔

سبحان اللہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جس خواہش کا اظہار کیا اور کامل توقع کی اللہ تعالیٰ نے اسے پورا فرمایا ہے۔ (ماخوذ از مرقاۃ وسر الشہادتین)

دوسری وجہ اپنے آپ کو قتل کرنے کی یہ ہوتی ہے:

" كما ثبت فى اهل الهند انهم يقدرون فى قتل النفس التخلص من عالم الفساد واللحوق بعالم النور "

جیسا کہ اہل ہند کے متعلق ثابت ہے وہ اپنے آپ کو اس لئے مار دیتے تھے کہ وہ عالم فساد سے چھٹکارا حاصل کر کے عالم نور سے مل جائیں۔

یعنی ان کا عقیدہ ہوتا ہے کہ اپنے آپ کو رب تعالیٰ کی رضاء کیلئے بھوکا رکھ کر مار دینا رب تعالیٰ کے قریب کر دیتا ہے اور ظلمت سے نکال کر نورانیت تک پہنچا دیتا ہے۔ یہ ان کا عقیدہ باطل تھا۔ اس لئے کہ رب تعالیٰ کا قرب نبی کریم ﷺ کی شریعت کے مطابق چلنے سے حاصل ہوتا ہے نہ کہ آپ کی شریعت کی مخالفت سے۔ لہٰذا واضح ہوا کہ خودکشی اور بھوک ہڑتال حرام فعل ہیں۔

☆ "عن انس قال جاء ثلاثة رهط الى ازواج النبی ﷺ یسألون عن عبادة النبی ﷺ فلما اخبروا بها كانهم تقالوها فقالوا این نحن من النبی ﷺ وقد غفر الله ما تقدم من ذنبه وما تاخر فقال احدهم اما انا فاصلی اللیل ابدا وقال الآخر انا اصوم النهار ابدا ولا افطر وقال الآخر انا اعتزل النساء فلا اتزوج ابدا فجاء النبی ﷺ فقال انتم الذین قلتم كذا وكذا اما والله انی لاخشاكم لله واتقاكم له لكنی اصوم وافطر واصلی وارقد واتزوج النساء فمن رغب عن سنتی فلیس منی" (بخاری، مسلم، مشکوۃ باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ)

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ایک قبیلہ کے تین شخص آئے نبی کریم ﷺ کی ازواج سے آپ کی عبادت کے متعلق سوال کرنے لگے جب ان کو آپ کی عبادت کے متعلق خبر دی گئی تو انہوں نے اسے کم سمجھا، وہ کہنے لگے ہمیں نبی کریم ﷺ سے کیا نسبت (یعنی کہاں ہم اور کہاں آپ) یقیناً آپ کا مرتبہ بلند ہے آپ کو تھوڑی عبادت کافی ہے ہمیں زیادہ عبادت کرنی چاہیئے) اللہ تعالیٰ نے آپ کو تو پہلے اور پچھلے گناہوں سے محفوظ رکھا ہوا ہے تو ان میں سے ایک نے کہا میں ہمیشہ ساری رات نماز پڑھا کروں گا۔ اور دوسری نے کہا میں ہمیشہ روزہ رکھوں گا، کبھی افطار نہیں کروں گا، ایک اور نے کہا میں ہمیشہ عورتوں سے دور رہوں گا کبھی شادی نہیں کروں گا۔

اتنی دیر میں نبی کریم ﷺ تشریف لے آئے۔ آپ نے فرمایا تم نے اس اس طرح کہا ہے؟ خبردار قسم ہے اللہ تعالیٰ کی بیشک میں بنسبت تمہارے اللہ تعالیٰ سے زیادہ ڈرتا ہوں اور اللہ تعالیٰ سے بنسبت تمہارے تقویٰ بھی زیادہ رکھتا ہوں لیکن میں روزہ بھی رکھتا ہوں اور افطار بھی کرتا ہوں۔ اور نماز بھی پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں اور عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں، جس شخص نے میری سنت سے اعراض کیا وہ مجھ سے نہیں۔

خیال رہے کہ تمام رات عبادت کرنا یا ہمیشہ روزہ رکھنا منع تو نہیں، لیکن جب نبی کریم ﷺ کی عبادت کو کم سمجھ کر اس طرح کی عبادت کو اپنے آپ پر لازم کر دیا جائے تو وہ سنت سے اعراض ہے۔ جس کو نبی کریم ﷺ نے پسند نہیں فرمایا۔

تنبیہ : نکاح کے خطبہ میں علماء کرام سے سنتے ہیں کہ وہ اس طرح ایک حدیث پڑھتے ہیں:

" قال رسول الله ﷺ النکاح من سنتی فمن رغب عن سنتی فلیس منی "

یہ مکمل الفاظ راقم کو کہیں نظر نہیں آئے۔ اگر کسی مہربان کی نظر سے یہ مکمل حدیث گزری ہو تو مجھے ضرور مطلع کرے۔ البتہ راقم یوں پڑھ لیتا ہے۔

" النکاح من سنۃ رسول الله ﷺ قال رسول الله ﷺ فمن رغب عن سنتی فلیس منی "

☆ " وقدروی ان عثمان بن مظعون بایع فی عشرة من اصحاب رسول الله ﷺ فعزموا ان یلبسوا المسوح وان یهیموا فی الصحراء ولایأ ووا البیوت ولا یاکلوا اللحم ولا یغشوا النساء فبلغ ذلک النبی ﷺ فجاء الی دار عثمان بن مظعون فلم یجده فقال لا مرأته ما حدیث بلغنی عن عثمان ؟ وکرهت ان تفشی سر زوجها وان تکذیب رسول الله ﷺ فقالت یا رسول الله ان کان قد بلغک شئی فهو کما بلغک فقال قولی لعثمان اخلاف لسنتی ام علی غیر ملتی انی اصلی وانام واصوم وافطر واغشی النساء وآوی البیوت وآکل اللحم فمن رغب عن سنتی فلیس منی ، فرجع عثمان واصحابه عما کانوا علیه "

روایت کیا گیا ہے کہ حضرت عثمان بن مظعون ؓ نے دس صحابہ کرام کے ساتھ مل کر ایک معاہدہ کیا اور سب نے پختہ ارادہ کیا کہ وہ پھٹے پرانے کپڑے پہنیں گے۔ اور جنگل میں پھریں گے (یعنی جنگل میں ہی رہیں گے) گھروں میں کبھی نہیں رہیں گے، اور گوشت نہیں کھائیں گے، اور عورتوں سے جماع نہیں کریں گے۔ نبی کریم ﷺ کو جب یہ خبر ملی تو آپ حضرت عثمان بن مظعون کے گھر تشریف لائے وہ گھر موجود نہیں تھے۔ آپ نے ان کی عورت سے پوچھا، وہ کیا بات ہے جو مجھے عثمان کی جانب سے پہنچی ہے؟ تو اس عورت نے ناپسند سمجھا کہ وہ اپنے خاوند کا راز افشاء (ظاہر) کرے۔ اور یہ بھی ناپسند کیا کہ وہ نبی کریم ﷺ سے جھوٹا کلام کرے (اس نے نہایت حکمت بھرا جواب دیا) اس نے کہا

یارسول اللہ اگر آپ تک ان کی کوئی بات پہنچی ہے تو اسی طرح ہوگی جس طرح آپ تک پہنچی ہے۔

آپ نے فرمایا عثمان کو کہہ دینا کیا تم میری سنت کا خلاف کر رہے ہو۔ یا میرے دین کو چھوڑ رہے ہو۔ بیشک میں نماز پڑھتا ہوں اور سوتا ہوں، اور روزہ رکھتا ہوں اور افطار بھی کرتا ہوں، اور اپنی ازواج سے تعلق ازدواجی بھی رکھتا ہوں۔ اور گھروں میں رہتا ہوں اور گوشت بھی کھاتا ہوں۔ جس نے میری سنت سے اعراض کیا وہ مجھ سے نہیں (یعنی اس کا میرے ساتھ تعلق نہیں)۔ حضرت عثمان اور ان کے ساتھ مل کر معاہدہ کرنے والوں نے نبی کریم ﷺ کے ارشاد گرامی کے بعد اپنے اپنے ارادہ سے رجوع کر لیا۔ (قرطبی)

دوسرا جواب: اپنے آپ کو قتل کرنے سے منع کرنے کا یہ مطلب ہے:

"المراد لا يقتل بعضكم بعضا وجعل غير الرجل نفسه اذا اتصل به نسبا ودينا"

مراد اس سے یہ ہے کہ تم میں سے کوئی ایک دوسرے کو قتل نہ کرے۔ جب کوئی شخص نسبی یا دینی لحاظ سے تعلق رکھنے والا ہو، اسے قتل کرنا اپنے آپ کو ہی قتل کرنا ہے۔

جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے کہ بچھڑے کی پوجا کے بعد بنی اسرائیل کو توبہ کا حکم دیا گیا۔ وہاں بھی رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے:

﴿فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ﴾ "تم ایک دوسرے کو قتل کرو"۔ (از کبیر)

"وذلك ان اهل الملة الواحدة بمنزلة النفس الواحدة"

ایک ہی دین پر چلنے والے لوگ تمام ایک ہی نفس شمار ہوتے ہیں کسی کو نقصان پہنچانا اپنے آپ کو نقصان پہنچانا ہے۔

☆ "كما قال عليه الصلوة والسلام مثل المؤمنين فى توادهم وتراحمهم وتواصلهم بمنزلة الجسد الواحد اذا اشتكى منه عضو تداعى له سائر الجسد بالحمى والسهر"

نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی اس پر دلالت کر رہا ہے مومن لوگ ایک دوسرے کے ساتھ محبت کرنے اور ایک دوسرے پر رحم کرنے اور ایک دوسرے سے تعلق جوڑنے کے لحاظ پر ایسے ہی ہیں، جس طرح ایک

جسم ہوتا ہے جب ایک عضو کو تکلیف ہو تو تمام جسم کو بخار ہوتا ہے اور تمام جسم بے قرار ہوتا ہے۔ (ابن کثیر)

تیسرا جواب: " انه اذا قتل غيره فكانما قتل نفسه لانه يقتص منه "

یعنی مراد یہ ہے کہ تم دوسروں کو نہ قتل کرو کیونکہ تمہارا دوسروں کو قتل کرنا اپنے آپ کو قتل کرنا لازم آئے گا۔ اس لئے کہ تمہیں قصاص کے طور پر قتل کر دیا جائے گا۔

چوتھا جواب: لا تتعرضوا لمقاتلة من يقتلكم فتكونوا قد قتلتم انفسكم "

تم ایسے لوگوں کے ساتھ قتال کے در پے نہ ہو کہ وہ تمہیں قتل کر دیں۔ اس طرح گویا کہ تم نے خود ہی اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالا حالانکہ تمہیں منع بھی کیا گیا تھا کہ تم اپنے ہی بھائیوں کو نہ قتل کرو، لیکن تم ان کے ساتھ قتال میں مشغول ہو کر اپنے ہی بعض آدمیوں کے ہلاکت کا سبب بنتے ہو۔

پانچواں جواب: " لا تسفكون دماء كم من قوامكم فى مصالح الدنيا بهم فتكونون مهلكين لانفسكم "

تم صرف دنیاوی مقاصد کے لئے اپنے خون نہ بہاؤ، اس میں تو صرف اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنا ہے۔ یعنی مقصد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رضاء کے لئے کافروں کو قتل کرنا اور اپنی جانوں کو قربان کرنا تو ثواب کا ذریعہ ہے لیکن صرف دنیاوی مقاصد کے لئے قتال میں شریک ہونا سوائے اپنے آپ کو ہلاک کرنے کے اور کچھ بھی نہیں۔ (از کبیر)

﴿ وَلَا تُخْرِجُوْنَ اَنْفُسَكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ ﴾: "اور نہ نکالنا اپنوں کو اپنی بستیوں سے"

اس میں دو احتمال پائے گئے ہیں ایک یہ " لا تفعلوا ما تستحقون بسببه ان تخرجوا من ديار كم " تم ایسا کوئی کام نہ کرو جس کی وجہ سے تمہیں تمہاری بستیوں سے ہی نکال دیا جائے۔

دوسرا احتمال یہ ہے:

" المراد لانهى عن اخراج بعضهم بعضا من ديارهم لان ذلك يعظم فيه المحنة والشدة حتى يقرب من الهلاک "

کہ روکنے کا مطلب یہ ہے کہ تم آپس میں ایک دوسرے کو ان کے گھروں سے نہ نکالو
اس میں تمہارے لئے عظیم محنت اور شدت پائی جائی گی یہاں تک کہ ہلاکت کے
قریب پہنچ جاؤ گے۔ (از کبیر)

تنبیہ: ﴿ لَا تَسۡفِكُوۡنَ دِمَآءَكُمۡ وَلَا تُخۡرِجُوۡنَ اَنۡفُسَكُمۡ مِّنۡ دِيَارِكُمۡ ﴾ میں جتنے احتمالات ذکر کیے گئے ہیں وہ تمام کے تمام ہی مراد ہیں یعنی مختصر الفاظ مبارکہ کثیر معانی پر مشتمل ہیں اس کا یہ مطلب نہیں کہ یوں کہا جائے یا یہ مطلب ہے یا یہ مطلب ہے۔ نہیں اس طرح نہیں بلکہ تمام معانی مجتمع ہیں ان کے اجتماع میں کوئی تعارض نہیں پایا گیا۔

﴿ ثُمَّ اَقۡرَرۡتُمۡ ﴾: "ای ثم اقررتم بالمیثاق واعترفتم علی انفسکم بلزومه"

یعنی پھر تم نے میثاق کا اقرار کرلیا اور اپنے نفسوں پر اس کا لازم ہونے کا اعتراف کرلیا۔ (کبیر)

﴿ وَاَنۡتُمۡ تَشۡهَدُوۡنَ ﴾: حال مؤکدہ یعنی جملہ حالیہ ہے اور حال مؤکدہ ہے اس صورت میں مطلب یہ ہوگا۔ پھر تم نے میثاق کا اقرار کرلیا۔ ایسے حال میں کہ تم گواہ تھے۔

(روح المعانی)

☆☆☆☆☆

﴿ ثُمَّ اَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ تَقْتُلُوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَتُخْرِجُوْنَ فَرِيْقًا مِّنْكُمْ مِّنْ دِيَارِهِمْ تَظٰهَرُوْنَ عَلَيْهِمْ بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَاِنْ يَّاْتُوْكُمْ اُسٰرٰى تُفٰدُوْهُمْ وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ اِخْرَاجُهُمْ اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴾ (آیت ۸۵)

۱) ''پھر یہ جوتم ہو اپنوں کو قتل کرنے لگے، اور اپنے میں سے ایک گروہ کو ان کے وطن سے نکالتے ہو۔ ان پر مدد دیتے ہو (ان کے مخالف کو) گناہ اور زیادتی میں، اگر وہ قیدی ہو کر تمہارے پاس آئیں تو بدلا دے کر چھڑا لیتے ہو، اور ان کا نکالنا تم پر حرام ہے، تو کیا خدا کے کچھ حکموں پر ایمان لاتے ہو، اور کچھ سے انکار کرتے ہو۔ تو جو تم میں سے ایسا کرے تو اس کا بدلہ کیا ہے مگر یہ کہ دنیا میں رسوا ہو اور قیامت میں سخت تر عذاب کی طرف پھیرے جائیں گے اور اللہ تمہارے کوتکوں سے بے خبر نہیں''۔

۲) ''پھر تم یہ ہو کہ قتل کرتے ہو اپنوں کو، اور نکالتے ہو تم اپنے ایک فریق کو ان کے گھروں سے امداد کرتے ہو ان کے خلاف گناہ اور ظلم سے، اور اگر آئیں تمہارے پاس قیدی ہو کر تم ان کا فدیہ دیتے ہو، حالانکہ حرام تھا تم پر ان کا نکالنا، کیا تم ایمان رکھتے ہو بعض کتاب سے اور کفر کرتے ہو بعض سے، تو نہیں جزاء جو شخص کرے یہ، تم میں سے، سوائے رسوائی کے دنیا کی زندگی میں۔ اور قیامت کے دن پھیریں جائیں گے سخت عذاب کی طرف اور نہیں اللہ غافل اس سے جو تم عمل کرتے ہو''۔

توراۃ میں اللہ تعالیٰ نے یہود کو ارشاد فرمایا تم آپس میں ایک دوسرے کو قتل نہ کرنا۔ اور تم ایک دوسرے پر ظلم کر کے ان کو ان کے گھروں اور بستیوں سے نہ نکالنا۔ اور اپنے ہی یہود کے خلاف کسی

دوسرے کی امداد نہ کرنا۔ اور اگر تمہارے یہود کسی کے قیدی ہو جائیں تو فدیہ دے کر ان کو چھڑا لینا۔ یہود نے رب تعالیٰ کے تین احکام کو پشت ڈال دیا، ان سے روگردانی کی۔

ایک دوسرے کو اپنے حلیفوں سے مل کر قتل بھی کرتے۔ اور ظلم کر کے ان کو گھروں سے نکال بھی دیتے۔ اپنے ہی یہود کے خلاف اپنے حلیفوں کی امداد کرتے۔ البتہ ایک کام کرتے کہ یہود میں سے کوئی قیدی ہو جاتا تو یہ فدیہ دے کر اسے چھڑا لیتے تھے۔

جب ان سے پوچھا جاتا تم ایسا کیوں کرتے ہو تو یہ کہتے کہ ہمیں توراۃ میں یہ حکم دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ احکام تو دوسرے بھی توراۃ میں ہیں لیکن تم ان پر عمل نہیں کرتے، اس کا تو یہ مطلب ہوا کہ تم بعض کتاب پر ایمان رکھتے ہو اور بعض کا انکار، تمہارا یہ فعل دنیا میں رسوائی کا سبب ہے اور قیامت کے دن تمہیں سخت عذاب کی طرف لوٹایا جائے گا۔ تم یہ نہ سمجھنا کہ اللہ تعالیٰ تمہارا عملوں سے بے خبر ہے وہ کسی طرح بھی تمہارے عملوں سے غافل نہیں۔ (از خازن)

﴿ ثُمَّ اَنۡتُمۡ هٰٓؤُلَآءِ تَقۡتُلُوۡنَ اَنۡفُسَكُمۡ ﴾: ''پھر تم یہ قتل کرتے ہو اپنوں کو'' ثم تراخی کے لئے آتا ہے۔ ﴿ هٰٓؤُلَآءِ ﴾ کا اشارہ ذات کی طرف ہوتا ہے۔ ان کا وعدہ سے پھر جانا اگرچہ اس سے ان کی صفت بدلی لیکن اسے ذات کے بدلنے سے تعبیر فرمادیا۔ یعنی اللہ تعالیٰ سے وعدہ کرنے کے بعد پھر جانے کو اس طرح ذکر فرمایا کہ تم تو یہ ہو جنھوں نے وعدہ کیا تھا کہ ہم اپنوں کا خون نہیں بہائیں گے اور اپنوں کو گھروں سے نہیں نکالیں گے اور اپنوں کے خلاف دوسروں کی امداد نہیں کریں گے جب تم وعدہ سے پھر گئے تو گویا کہ تم وہ رہے ہی نہیں جو وعدہ کرتے وقت تھے۔ (از بیضاوی)

خیال رہے ﴿ تَقۡتُلُوۡنَ اَنۡفُسَكُمۡ ﴾ میں وہ تمام احتمال پائے جاتی ہیں جو ﴿ لَا تَسۡفِكُوۡنَ دِمَآءَكُمۡ ﴾ میں ذکر کئے گئے ہیں۔

اعتراض: انتم حاضرین کے لئے اور ﴿ هٰٓؤُلَآءِ ﴾ غائبین کے لئے ہے ایک ہی جملہ میں مخاطبین اور غائبین کا اجتماع کیسے صحیح ہے؟

جواب: ﴿ هٰٓؤُلَآءِ ﴾ سے ﴿ اَنۡتُمۡ ﴾ کی تاکید کی گئی اور خبر ﴿ تَقۡتُلُوۡنَ ﴾ ہے یہ جواب

زیادہ قوی ہے تاہم اس کے اور جواب بھی دیئے گئے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ تقدیر عبارت کی اس طرح ہو ﴿ ثُمَّ اَنْتُمْ یا هٰؤُلَاءِ ﴾ اے لوگو پھر تم یہ ہو۔ اس طرح دونوں لفظ خطاب کے لئے ہو گئے۔ ان جوابات میں سے ایک اور جواب یہ ہے کہ تقدیر عبارت کی یہ ہے " ثم انتم اعنی هؤلاء الحاضرين " پھر تم میری مراد یہ حاضرین ہیں۔ ان جوابات میں سے ایک یہ بھی ہے " انه بمعنى الذين وصلته " کہ ﴿ هٰؤُلَاءِ ﴾ ﴿ اَلَّذِيْنَ ﴾ کے معنی میں ہو یعنی اشارہ موصول کے معنی میں استعمال ہو۔ اور اس کا صلہ ﴿ تَقْتُلُوْنَ ﴾ ہو۔

خیال رہے کہ اگرچہ آخری تین جوابات کو علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے ضعیف قرار دیا ہے لیکن راقم کے قول کو اعلیٰ حضرت کے ترجمہ سے تائید حاصل ہوگئی کہ صرف ایک ہی کتاب کو ذہن میں نہ بٹھایا جائے، کیونکہ علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے ﴿ هٰؤُلَاءِ ﴾ کو موصول کے معنی میں لینا کوفی نحویوں کا ضعیف مذہب قرار دیا ہے لیکن اعلیٰ حضرت نے اسے ضعیف نہیں تسلیم کیا اسی لئے ترجمہ موصول والا کیا ہے "پھر یہ جو تم ہو"۔

﴿ وَتُخْرِجُوْنَ فَرِيْقًا مِّنْكُمْ مِّنْ دِيَارِهِمْ ﴾:

''اور تم نکالتے ہو اپنے ہی ایک فریق کو ان کے گھروں سے''

یعنی تم اپنے حلیفوں سے مل کر اپنے ہی خاندان کے یہودیوں کو گھروں سے نکال دیتے ہو۔

نکتہ: پہلی آیۃ میں ذکر کیا گیا ﴿ وَلَا تُخْرِجُوْنَ اَنْفُسَكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ ﴾ اور اس آیۃ میں ذکر کیا گیا ﴿ وَتُخْرِجُوْنَ فَرِيْقًا مِّنْكُمْ مِّنْ دِيَارِهِمْ ﴾ چونکہ پہلی آیۃ میں ﴿ وَلَا تُخْرِجُوْنَ اَنْفُسَكُمْ ﴾ ذکر فرمایا جس سے یہ مسئلہ بیان کیا گیا کہ تم اپنے ہی رشتہ داروں کو جو ان کے گھروں سے نکالتے ہو وہ درحقیقت تم اپنے آپ کو ہی نکال رہے ہو، کیونکہ اپنے خاندانی اور اپنے دینی بھائیوں کو تکلیف دینا اپنے آپ کو تکلیف دینا ہے۔ اس کے بعد ﴿ مِنْ دِيَارِكُمْ ﴾ ذکر کیا۔ جس کا معنیٰ "اپنے گھروں سے" اب مکمل مطلب یہ ہو گیا۔ تم اپنے آپ کو اپنے گھروں سے نہ نکالو اگرچہ مراد یہ ہے کہ تم اپنے بھائیوں کو ان کے گھروں سے نہ نکالو۔

دوسری آیۃ میں چونکہ ﴿ فَرِيْقَ ﴾ ذکر کیا ہے جو اسم ظاہر ہے درجہ غائب میں ہے تو اس لئے

﴿ مِنۡ دِیَارِهِمۡ ﴾ میں بھی ضمیر غائب کی ذکر کردی گئی، کہ تم اپنے ہی ایک فریق کو ان کے گھروں سے نکالتے ہو۔ (ماخوذ از روح المعانی)

﴿ تَظٰهَرُوۡنَ عَلَیۡهِمۡ بِالۡاِثۡمِ وَالۡعُدۡوَانِ ﴾:

''تم امداد کرتے ہو ان کے خلاف گناہ اور ظلم سے''

﴿ تَظٰهَرُوۡنَ ﴾ کا معنی ہے '' نتعاونون '' تم امداد کرتے ہو۔ یہ لفظ '' ظهر '' سے لیا ہوا ہے جس کا معنی ''پیٹھ'' چونکہ کسی کی امداد کرنے سے اس کی پشت پناہی ہوتی ہے اس لئے ﴿ تَظٰهَرُوۡنَ ﴾ کا معنی ہوا تعاون کرنا۔

﴿ عَلَیۡهِمۡ ﴾ لفظ '' علی '' سے بعض اوقات ضرر کا معنی لیا جاتا ہے اس لئے یہاں مطلب ہو گیا ان کے خلاف یعنی تم اپنے خاندانی اور مذہبی بھائیوں کے خلاف اپنے حلیفوں کی امداد کرتے ہو۔ (از قرطبی)

﴿ بِالۡاِثۡمِ ﴾ اس کے معانی یہ ہیں '' الاثم الفعل الذی یستحق علیه صاحبه الذم واللوم '' وہ فعل جس کی وجہ سے فاعل (کام کرنے والے) کی مذمت کی جائے اور اسے ملامت کا مستحق سمجھا جائے اسے '' اثم '' کہا جاتا ہے۔

'' وقیل ما تنفر منه النفس ولا یطمئن الیه القلب ''

اور جس کام سے نفس نفرت کرے اور دل اس سے مطمئن نہ ہو اسے ''اثم'' کہا جاتا ہے۔

حدیث شریف میں ہے '' الاثم ما حاک فی صدرک '' جو تمہارے دل میں کھٹکے (جس کے کرنے سے ملامت کا خطرہ ہو) وہ اثم ہے۔ شراب کو بھی اثم کہا جاتا ہے جیسا کہ شاعر نے کہا:

شربت الاثم حتی ضل عقلی　　　كذلک الاثم تذهب بالعقول

میں نے شراب پیا جس سے میری عقل زائل ہوگئی　　　اسی طرح گناہوں سے بھی عقل زائل ہوتی ہے

﴿ وَالۡعُدۡوَانِ ﴾ تجاوز الحد فی الظلم '' ظلم میں حد سے تجاوز کرنا ''عدوان'' کہلاتا ہے۔ (از روح المعانی)

تنبیه: '' الآیة تدل علی ان الظلم کما هو محرم فکذا اعانة الظالم علی ظلمة محرمة ''

(کبیر)

اس آیہ کریمہ سے یہ واضح ہوا کہ جس طرح ظلم کرنا حرام ہے اسی طرح ظالموں کی امداد کرنا بھی حرام ہے۔ واضح ہوا کہ مسلمانوں کے خلاف یہود ونصاری کی امداد کرنا حرام ہے۔

اعتراض : اللہ تعالیٰ ظالم کوظلم کی قدرت عطا فرماتا ہے اور ہر قسم کی رکاوٹ اور موانع کو زائل کرتا ہے۔ اور اس پر خواہشات کو مسلط کر دیتا ہے جس کی وجہ سے وہ ظلم کرتا ہے۔

" فلو كانت اعانة الظالم على ظلمه قبيحة لوجب ان لا يوجد ذلك من الله تعالیٰ "

اگر ظالم کی ظلم پر معاونت برا کام ہوتا تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ظالم کی معاونت نہ پائی جاتی۔

جواب : " انه وان مكن الظالم من ذلك فقد زجره عن الظلم بالتهديد و الزجر "

اللہ تعالیٰ نے بیشک انسان کو قدرت دے رکھی ہے اسے مختار بنایا ہے چاہے تو وہ اپنے اختیار سے ظلم ہی کیوں نہ کرتا رہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ظلم پر اپنی گرفت اور عذاب کا ذکر بھی کیا ہے تو واضح ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ظلم پر معاونت نہیں پائی جاتی۔ کسی کو مختار بنانا اور کام کی قدرت دینا اور چیز ہے، اور کسی کی معاونت کرنا اور چیز ہے معاونت میں خوشی اور رغبت پائی جاتی ہے۔

" بخلاف المعين للظالم على ظلمه فانه يرغبه فيه ويحسنه فی عينه ويدعوه اليه فظهر الفرق "

ظالم کے ظلم پر معاونت کرنے والا اس کے ظلم کو پسند کرتا ہے۔ اور اس کی آنکھ میں اسکا ظلم حسین نظر آتا ہے اور وہ اسے ظلم کرنے کی دعوت دیتا ہے کہ تم ظلم کو جاری رکھو۔

اب بہت واضح طور پر فرق کا پتہ چل گیا کہ معاونت کیا ہے اور قدرت واختیار دینا کیا ہے۔

(از کبیر)

تنبیہ : اگرچہ ظلم کرنا بھی حرام ہے اور ظلم کی معاونت بھی حرام ہے لیکن ظلم کرنا عظیم جرم ہے اور ظلم کی معاونت اس سے کچھ کم ہے۔ وجہ یہ ہے کہ کوئی شخص دوسرے کو ظلم کرنے پر آمادہ کرتا رہے اور اسے امداد کرنے کی پیشکش کرے لیکن وہ ظلم نہ کرے تو اس کی معاونت کا کوئی اثر نہیں ہوگا۔ لیکن ظلم کرنے والا کبھی بغیر کسی معاونت کے ظلم کر لیتا ہے۔

تو اسی سے واضح ہو گیا کہ ظلم بنسبت معاونت ظلم کے عظیم جرم ہے۔ اگر چہ دونوں فعل ہی حرام ہیں۔
(از کبیر)

اللہ تعالیٰ ظالموں کے ظلم سے بچائے اے مولائے کائنات ظلم اور ظلم کی معاونت سے دور رکھ۔

﴿ وَاِنْ يَّاْتُوْكُمْ اُسٰرٰى تُفٰدُوْهُمْ ﴾:

''اور اگر وہ تمہارے پاس قیدی ہو کر آئیں تو تم ان کا فدیہ دے دیتے ہو''۔

یعنی وہ اللہ تعالیٰ کے اس حکم پر عمل کرتے کہ یہود اپنے دوسرے یہود بھائیوں کو فدیہ دے کر قید سے چھڑا لیتے ''اساری'' جمع ہے اسیر کی۔ اسیر کا لفظ ماخوذ ہے '' اسارۃ '' (بکسر الھمزۃ) سے '' اسارۃ '' اس رسی کو کہا جاتا ہے جس کے ذریعے اونٹ کی پیٹھ پر پالان باندھتے ہیں۔

چونکہ اس زمانہ میں قیدی کو بھی رسی سے باندھا جاتا تھا اس لئے اسے اسیر کہہ لیا جاتا تھا، بعد میں مطلقاً محبوس کو اسیر کہا جانے لگا خواہ اسے رسی سے باندھا گیا ہو یا نہ باندھا گیا ہو۔ (از شیخ زادہ)

فائدہ : اسی آیۃ سے ایک اور فائدہ بھی حاصل ہو گیا:

'' وقیل معناہ ان یاتوکم اساری فی ایدی الشیاطین تتصدون لا نقاذھم بالارشاد والوعظ مع تضییعکم کقولہ تعالیٰ اتامرون الناس بالبر وتنسون انفسکم ''

کہ ان کے ایک اور طریقہ کی مذمت کی طرف بھی اشارہ ملتا ہے کہ اگر ان کے پاس شیطانوں کے ہاتھوں میں کوئی قیدی بن کر آتے یعنی گناہوں میں مبتلاء ہوتے تو یہود کے علماء ان کو وعظ و نصیحت کرتے اور ان کی رہنمائی کرتے لیکن خود اس پر عمل نہیں کرتے تھے جیسا کہ رب تعالیٰ نے فرمایا (ترجمہ) ''کیا تم لوگوں کو نیکی کا حکم دیتے ہو اور اپنی جانوں کو بھولتے ہو''۔ (بیضاوی)

حضرت عبداللہ بن سلام کا قول:

عبد خیر سے مروی ہے کہ ہم نے سلمان بن ربیعہ باہلی کی معیت میں ایک شہر کا محاصرہ کیا ہم نے اس شہر کو فتح کر لیا اور وہاں کے کئی لوگوں کو قید کر لیا۔

حضرت عبداللہ بن سلام نے ایک یہودیہ کو سات سو درہم سے خرید لیا، جب آپ جالوت کی قوم کے ایک سردار کے قریب سے گزرے اس کے پاس سواری سے اتر کر اسے کہا کیا تم اپنے دین پر قائم رہنے والی اس عورت کو خریدنا چاہتے ہو؟ اس نے کہا ہاں میں خرید لیتا ہوں۔ آپ نے اسے بتایا کہ میں نے سات سو درہم سے خریدا ہے اس نے کہا تم مجھ سے سات سو درہم مزید نفع لے لو۔ آپ نے فرمایا میں نے قسم اٹھا رکھی ہے کہ چار ہزار درھم سے کم پر نہیں بیچنا۔ اس نے کہا میں اس قیمت پر نہیں خریدتا۔ آپ نے فرمایا تم ضرور خریدو گے یا اپنے دین کا انکار کرو گے۔

آپ نے اسے کہا ذرا میرے قریب ہو جاؤ، وہ قریب ہوا آپ نے اس کے کان میں کہا تورات میں یہ ہے:

" انک لا تجد مملوک من بنی اسرائیل الا اشتریته فاعتقته وان یاتو کم اساری تفادوهم وهو محرم علیکم اخراجهم "

بیشک تم بنی اسرائیل سے کوئی مملوک نہ پاؤ مگر یہ کہ اسے خرید کر آزاد کر دو اگر تمہارے پاس قیدی آئیں تو ان کا فدیہ دو اور تم پر حرام ہے کہ اپنے ہی یہودیوں کو ان کے گھروں سے نکالو۔

اس نے کہا کیا تم عبداللہ بن سلام ہو؟ آپ نے فرمایا ہاں۔ وہ چار ہزار درھم لے آیا۔ لیکن آپ نے اس سے دو ہزار درھم لئے اور دو ہزار واپس کر دیئے۔ (ابن کثیر)

☆ " اخبرنا ابو العالیة ان عبد الله بن سلام مر علی رأس الجالوت بالکوفة وهو یفادی من النساء من لم یقع علیه العرب ولا یفادی من وقع علیه العرب فقال عبد الله اما انه مکتوب عندک فی کتابک ان تفادیهن کلهن " (ابن کثیر)

ابوالعالیہ نے بیان کیا بیشک عبداللہ بن سلام جالوت قوم کے ایک سردار کے قریب سے کوفہ میں گزرے وہ ان عورتوں کا فدیہ دے کر چھڑاتا جن سے عرب لوگوں نے جماع نہ کیا ہوتا اور جن سے انہوں نے جماع کر لیا ہوتا ان کا فدیہ نہیں دیتا تھا۔ حضرت عبداللہ بن سلام ؓ نے فرمایا تمہاری کتاب میں یہ ہے کہ تمام کا فدیہ دے کر ان چھڑاؤ۔

قیدیوں کو چھڑانے کا حکم شریعت مصطفوی میں:

" عن الحکم عن جده ان رسول الله ﷺ کتب کتابا بین المهاجرین والانصار ان یعقلوا معاقلهم ویفدوا عانیهم بالمعروف والاصلاح بین المسلیمن "

حکم اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے مہاجرین اور انصار کے درمیان ایک معاہدہ تحریر فرمایا کہ ایک دوسرے کی دیت ادا کرنا، اور قیدیوں کو اچھی طرح قانون کے مطابق فدیہ دے کر چھڑانا اور مسلمانوں کے درمیان اصلاح کرنا۔

☆ " عن ابی موسی الاشعری قال قال رسول الله ﷺ اطعموا الطعام وافشوا السلام وعودوا المریض وفکوا العانی "

حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے فرمایا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا طعام کھلاؤ، سلام عام کرو، مریض کی عیادت کرو، اور قیدیوں کو چھڑاؤ۔

" فهذان الخبران یدلان علی فکاک الاسیر لان العانی هو الاسیر "

یہ دونوں حدیثیں قیدیوں کو چھڑانے پر دلالت کرتی ہیں احادیث میں جو لفظ "العانی" استعمال ہوا ہے اس کا معنی قیدی ہے۔

☆ " وقدروی عمران بن حصین وسلمة بن الاکوع ان النبی علیه السلام فدی اساری من المسلمین بالمشرکین"

حضرت عمران بن حصین اور سلمۃ اکوع رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں بیشک نبی کریم ﷺ نے مسلمان قیدیوں کا فدیہ مشرک قیدی دیئے۔

واضح ہوا کہ قیدیوں کا بدلہ قیدی دے کر اپنے قیدی چھڑانا بھی شریعت مصطفوی کا قانون ہے۔

☆ " سئل الحسین بن علی علیهما السلام علی من فدی الاسیر قال علی الا رض التی یقاتل عنها "

بشر بن غالب کہتے ہیں حضرت امام حسین بن علی رضی اللہ عنہما سے سوال کیا گیا کہ قیدی کا فدیہ کون ادا کرے؟ تو آپ نے فرمایا جن لوگوں سے مل کر اس نے قتال کیا ہے وہی فدیہ بھی ادا کریں۔ یعنی

جس زمین اور شہر کے دفاع کے لئے وہ جنگ میں شریک ہونے کی وجہ سے قیدی ہوا ہے ان لوگوں پر ہی فدیہ لازم ہے۔ (احکام القرآن لجصاص)

یاد رفتگان: جصاص کا حوالہ تحریر کرنے پر اپنے مہربان، مخلص دوست مولنا ابو الفضل اللہ دتہ سیالوی رحمہ اللہ آف بھابڑا ضلع سرگودھا کی یاد آئی۔ جنھوں نے اپنی زندگی کے آخری ایام علالت میں مجھے جصاص کا مطالعہ کرنے کا مشورہ دیا۔ جب آپ کمپلیس اسلام آباد میں زیر علاج تھے۔ چند ہی روز کے بعد آپ کا وصال ہو گیا اللہ تعالیٰ آپ کی قبر کو کشادہ فرمائے جنت الفردوس عطا فرمائے۔

(آمین ثم آمین)

﴿ وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ اِخْرَاجُهُمْ ﴾ اس جملہ کا تعلق ماقبل جملہ ﴿وَتُخْرِجُوْنَ فَرِيْقًا مِّنْ دِيَارِهِمْ﴾ سے ہے۔ اور درمیان میں جملہ معترضہ ہے اب معنی یوں ہو گیا ''اور نکالتے ہو تم اپنے ایک فریق کو ان کو بستیوں سے حالانکہ ان کا نکالنا تم پر حرام قرار دیا گیا۔

دینی طلباء کرام کے لئے: ھو ضمیر کا مرجع " اخراج " ہے جس پر ﴿ وَتُخْرِجُوْنَ ﴾ دلالت کر رہا ہے۔ اور بعد میں آنے والا ﴿ اِخْرَاجُهُمْ ﴾ تاکید ہے ضمیر کے مرجع کی۔

دوسرا احتمال یہ ہے کہ " ھو " اور آنے والا جملہ اس کی تفسیر بیان کر رہا ہے۔

تیسرا احتمال یہ کہ " ھو " ضمیر مبھم ہو اور آنے والا جملہ اس کی تفسیر ہو۔

ضمیر شان اور ضمیر مبھم میں فرق: اگرچہ دونوں ہی اس کی محتاج ہوتی ہیں کہ آنے والا جملہ ان کی تفسیر بیان کرے، لیکن ان میں فرق یہ ہے۔ کہ ضمیر شان میں مسؤل عنہ (جس کے متعلق سوال ہو) کا اجمالی طور پر لحاظ کیا جاتا ہے۔ پھر آنے والے جملہ سے اس کے تعین کو بیان کیا جاتا ہے کہ اس کی شان یہ ہے جس کے متعلق سوال کیا گیا ہے۔

یعنی پہلا جملہ ذکر کیا گیا ﴿ وَتُخْرِجُوْنَ فَرِيْقًا مِّنْكُمْ مِّنْ دِيَارِهِمْ ﴾ ''نکالتے ہو تم اپنے ایک فریق کو ان کے گھروں سے'' تو ضمناً سوال ہوا کہ ان کو گھروں سے نکالنے کا حکم کیا ہے؟ تو جواب دیا گیا کہ ہاں اس کی شان یہ ہے یعنی ہاں اس کا حکم یہ ہے'' کہ تم پر ان کا نکالنا حرام کیا گیا''۔

ضمیر مبہم میں ضمناً سوال نہیں ہوتا۔ اور نہ ہی کسی چیز کی تعیین ہوتی ہے۔ بلکہ بیان کرنے والا خود ہی ابہام کو دور کرنے کے لئے ایک جملہ ذکر کر دیتا ہے جس میں تفسیر پائی جاتی ہے۔

(از بیضاوی و شیخ زادہ)

﴿ اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ﴾:

''کیا تم ایمان لاتے ہو بعض کتاب پر اور انکار کرتے ہو بعض کا''۔

یعنی توراۃ میں تمہیں قیدیوں کا فدیہ دے کر چھڑانے کا جو حکم دیا گیا ہے اس پر تو تم عمل کرتے ہو گویا کہ اس پر تمہارا ایمان ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے لیکن اسی کتاب میں رب تعالیٰ نے تمہیں یہ حکم بھی دیا ہے کہ اپنے ہی نسبی اور دینی بھائیوں کو قتل نہ کرو، ان کو گھروں سے نہ نکالو، اور ان کے خلاف دوسرے کافروں کی امداد نہ کرو۔ ان تمام احکام پر تمہارا عمل نہیں، گویا کہ تم نے ان احکام کو اللہ تعالیٰ کے احکام ہی تسلیم نہیں کیا۔

رب تعالیٰ کے اس ارشاد سے واضح ہو گیا:

- ''اگر بیک حکم کتاب خود نگردید کافر مطلق شدید''

اگر اللہ تعالیٰ کی کتاب کا ایک حکم بھی تسلیم نہ کیا تو مطلقاً کافر ہو جائے گا۔ (از عزیزی)

کیونکہ یہ مسئلہ بھی روز روشن کی طرح واضح ہے کہ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ فلاں شخص آدھا کافر ہے اور فلاں چوتھائی حصہ کافر ہے یقیناً جب کافر ہو گا تو پکا اور مکمل کافر ہو گا۔

﴿ فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ﴾:

''جو شخص تم میں سے یہ کرے اس کی نہیں جزاء سوائے دنیا کی زندگی میں رسوائی کے''۔

﴿ خِزْيٌ ﴾ کا معنی ہے ذلت جس سے انسان کو حیاء محسوس ہو۔ اسی وجہ سے ﴿ خِزْيٌ ﴾ دونوں معنوں میں بیک وقت بھی استعمال ہوتا ہے اور علیحدہ علیحدہ بھی۔ تاہم ذلت کو حیاء لازم ہے۔

''یقال اخزاه الله ای اذله ومقته وابعده''

جس طرح کہا جاتا ہے'' اخزاه الله '' اللہ تعالیٰ اسے ذلیل کرے اور اس سے ناراض ہو اور

حالات سے تمام انبیاء کرام کو خبر دی گئی تھی۔ یہود نے نبی کریم ﷺ کی تکذیب کی۔ اور مصطفیٰ کریم ﷺ کی صفات کو چھپایا تو رب تعالیٰ نے ان کو لعنت کا مستحق قرار دیا۔

(از صابونی)

نکتہ: ﴿ خِزْیٌ ﴾ کو نکرہ ذکر کر کے اس طرف اشارہ کیا کہ رب تعالیٰ نے ان کو دنیا میں بہت زیادہ ذلت اور رسوائی عطا کی۔ (از روح المعانی)

﴿ وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰى اَشَدِّ الْعَذَابِ ﴾:

''اور قیامت کے دن پھیریں جائیں گے سخت عذاب کی طرف''

" یردون ای یصیرون الیہ فلا یلزم کینونتھم قبل ذلک فی اشد العذاب "

بظاہر ایک وہم پیدا ہوتا تھا کہ ﴿ یُرَدُّوْنَ ﴾ کا معنی ہے ''لوٹایا جانا'' یہ اس وقت صادق آتا ہے۔ جب وہ پہلے بھی شدید عذاب میں ہوں اور قیامت کے دن پھر ان کو شدید عذاب کی طرف لوٹایا جائے۔ حالانکہ آیۃ کا یہ مفہوم نہیں۔ تو اس کے جواب کی طرف اشارہ ہے کہ ﴿ یُرَدُّوْنَ ﴾ کا یہاں معنیٰ ''پھیرا جانا'' ہے۔

قیامت کا عذاب زیادہ شدید ہوگا کیونکہ دنیا کی رسوائی ختم ہونے والی ہے لیکن قیامت کا عذاب ختم ہونے والا نہیں، پھر قیامت میں بھی کافروں کو ان کے کفر کے مطابق مختلف درجوں کے عذاب دیئے جائیں گے اگرچہ وہ عذاب ہمیشہ رہنے کے لحاظ پر سب کے لئے برابر ہوگا۔ (از روح المعانی)

ایک غلط فہمی کا ازالہ: علامہ رازی رحمہ اللہ نے ایک سوال وجواب کو بیان فرمایا جس سے غلط فہمی ہوتی ہے لیکن غور کرنے سے واضح ہو جاتا ہے کہ آپ نے درست تحریر فرمایا:

" ففیہ سوال وھو ان عذاب الدھریۃ الذین ینکرون الصانع یجب ان یکون اشد من عذاب الیھود فکیف قال فی حق الیھود ﴿ یُرَدُّوْنَ اِلٰى اَشَدِّ الْعَذَابِ ﴾ ولجواب المراد منہ انہ اشد من الخزی الحاصل فی الدنیا فلفظ الاشد وان کان مطلقا الا ان المراد اشد من ھذہ الجھۃ " (کبیر)

اس میں سوال یہ ہوتا ہے کہ دھریہ لوگ جو اللہ تعالیٰ کا ہی انکار کرتے ہیں کوئی خالق، محی

اسے (اپنی رحمت سے) دور کرے۔ (ماضی کے مطابق خبر والا معنی بھی کیا جا سکتا ہے)۔ اور کبھی "اخزاہ اللہ" کا معنی اس طرح کرلیا جاتا ہے "اوقعة موقعا یستحی منه" اللہ تعالیٰ اسے ایسی جگہ پر واقع کرے جس سے اسے حیاء آئے۔

دنیا میں ان کی ذلت ایسے کو تیسا: دنیا میں ان کو فضیحت (رسوائی) اور سزا دے کر اور جزیہ مقرر کر کے اور ان کے دشمنوں کو ان کے خلاف غلبہ عطاء کر کے ذلیل کیا گیا تاہم بنی قریظہ اور بنی نضیر کو اسی طرح کی سزا دے کر رسوا کیا گیا جیسا کہ وہ خود کرتے تھے۔

" وقدروی عن ابن عباس رضی الله عنهما انه قال کان عادة بنی قریظة القتل وعادة بنی النضیر الاخراج فلما غلب رسول الله ﷺ اجلی بنی النضیر وقتل رجال قریظة واسر نساء هم واطفالهم "

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ بیشک بنی قریظہ کی عادت تھی کہ وہ دوسروں کو قتل کرتے تھے اور بنی نضیر کی عادت تھی کہ وہ دوسروں کو جلاوطن کرتے تھے جب نبی کریم ﷺ یہود پر غالب ہوئے تو آپ نے بنی نضیر کو جلاوطن کر دیا اور بنی قریظہ کے مردوں کو قتل کرا دیا۔ اور ان کی عورتوں اور بچوں کو قید کرلیا۔ (از روح المعانی)

یہود کی اور رسوائی: یہود یہ عقیدہ بھی رکھتے تھے کہ جو کچھ توراۃ میں ہے وہ حق ہے لیکن جاننے، پہچاننے اور اس کے صحیح ہونے کی شہادت دینے کے باوجود اس کی مخالفت کرتے تھے " **فلهذا لایؤتمنون علی ما فیها ولا علی نقلها** " وہ اللہ کی کتاب میں جو کچھ مذکور تھا اس کی مخالفت کر کے امانت میں خیانت کے مرتکب ہوئے۔ اور اسی طرح اس کے مسائل جو دوسروں پر بیان کرتے تھے ان میں بھی حق بیان نہیں کرتے تھے، لہٰذا کتاب میں خلل واقع کرنے کی وجہ سے گویا کہ امانت میں خیانت کے مرتکب ہو رہے تھے۔

" ولا یصدقون فیما کتموه من صفة رسول الله ﷺ ونعته ومبعثه ومخرجه ومهاجره وغیر ذلک من شؤنه التی اخبرت بها الانبیاء قبله علیهم الصلوة والسلام والیهود علیهم لعائن الله یتکاتمونه بینهم "

نبی کریم ﷺ کی صفات اور آپ کی بعثت (اعلان نبوت) آپ کا مکہ سے نکلنا یعنی ہجرت کرنا اور آپ کے حالات جو توراۃ میں مذکور تھے یہود نے ان کو چھپایا۔ حالانکہ ان تمام

اور میت نہیں مانتے ان کا عذاب یہود سے شدید ہوگا تو یہود کے متعلق ﴿ یُـرَدُّوْنَ اِلٰـی اَشَدِّ الْعَذَابِ ﴾ کہنے کا کیا مطلب ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ دنیا میں ان کو جو رسوائی حاصل ہوئی ہے اس کی بنسبت قیامت کے دن ان کو عذاب اشد ہوگا مراد اشد اسم تفضیل سے یہی نسبت ہے اگر چہ ذکر مطلق ہے۔

علامہ رازی کے اس قول سے غلط فہمی اس لئے ہوئی کہ ایک تو ﴿ یُـــــــرَدُّوْنَ ﴾ کا معنی ﴿یُـصِـیْـرُوْنَ ﴾ پھیرا جانا ہے دوسرا یہ کہ جہنم میں مختلف درجات کے کفار کو عذاب ہوں گے۔ اس لئے اس سوال و جواب کی کوئی حیثیت ہی نہیں، لہٰذا اسے ذکر کرنے کی کوئی خاص وجہ نہیں۔

لیکن راقم کے نزدیک سوال حقیقت پر مبنی ہے کہ جب جہنم میں کفار کو عذاب مختلف درجات کے ہوں گے تو یہود کے عذاب کو دھریہ لوگوں کو عذاب سے اشد کہنا کیسے صحیح؟ اس کے جواب کی ضرورت تھی جو آپ نے ذکر فرمایا کہ یہاں یہود کے اپنے دنیا کے عذاب کی بنسبت اخروی عذاب کو اشد کہا گیا ہے۔

(واللہ اعلم بالصواب)

﴿ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴾ : ''اور نہیں اللہ تعالیٰ غافل اس سے جو تم عمل کرتے ہو''

'' اعتراض وتذییل لتاکید الوعید المستفاد مما قبله ای انه بالمرصاد لا یغفل عما تعملون من القبائح ''

یہ جملہ معترضہ ہے (ان کے نزدیک جو آخر میں جملہ معترضہ کے قائل ہیں) اور پہلے جملہ کے ساتھ ہی اسے بطور تاکید ذکر کیا کیونکہ پہلے جملہ سے ان کا وعید کا مستحق ہونا سمجھ میں آ رہا تھا اور اس جملہ میں بتایا گیا کہ اللہ تعالیٰ کے علم میں سب کچھ ہے وہ تمہارے برے اعمال سے غافل نہیں۔ (روح المعانی)

خیال رہے کہ اعلیٰ حضرت کا ترجمہ اسی کے مطابق ہے (اور اللہ تمہارے کوتکوں سے بے خبر نہیں) برے اعمال کو آپ ''کوتکوں'' سے تعبیر فرماتے ہیں۔ لیکن ہمارے آج کل کے محاورہ میں ''کوتکوں'' کا استعمال نہیں۔ اس لئے راقم نے ترجمہ یہ لکھا ''اور نہیں اللہ غافل اس سے جو تم عمل کرتے ہو۔

تنبیہ : راقم نے شروع شروع تو ترجمہ سلیس اردو میں آسان کرنے کی کوشش کی۔ لفظوں کے مطابق ترجمہ نہیں لیا۔ لیکن اب کوشش یہ کر رہا ہوں۔ کہ پہلے لفظ کا ترجمہ پہلے، دوسرے کا بعد میں ہو سوائے مرکب اضافی کے اس میں جب تک مضاف الیہ کا ترجمہ پہلے نہ ہو تو بات بنتی نہیں کوشش پھر بھی ہے کہ

ترجمہ آسان رہے لیکن لفظوں کی ترتیب کے مطابق ترجمہ سے سلیس اردو نہیں بنتی۔

فائدہ : علامہ رازی رحمہ اللہ نے اس جملہ میں ایک عجیب وسعت کا ذکر کیا۔

﴿ وَمَا اللّٰہُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴾ تهديد شديد وزجر عظيم عن المعصية وبشارة عظيمة على الطاعة لان الغفلة اذا كانت ممتنعة عليه سبحانه مع انه اقدر القادرين وصلت الحقوق لا محالة الى مستحقيها "

اس جملہ میں معصیت سے شدید طور پر ڈرایا گیا ہے اور عظیم زجر کی گئی۔ اور طاعت میں بشارت عظیمہ بھی پائی گئی۔ اس لئے کہ جب یہ معلوم ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ غافل نہیں ہو سکتا اور یہ بھی واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ عظیم قدرت کا مالک ہے تو یقیناً مستحقین کو اللہ تعالیٰ نے ان کے حقوق عطا فرمانے ہیں معصیت کا عمل کرنے والوں کو ان کے عمل کے مطابق اور طاعت کا عمل کرنے والوں کو ان کے عمل کے مطابق رب تعالیٰ جزاء دے گا۔ (از کبیر)

☆ " روی عن عمر ﷺ انه قال ان بنی اسرائیل قد مضوا وانتم تعنون بهذا یاامة محمد وبما یجری مجراه "

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا بنی اسرائیل تو گزر چکے ہیں اب اے امت مصطفیٰ ﷺ اس آیۃ کریمہ سے تم عبرت حاصل کرو کہ اگر تم نے اللہ تعالیٰ کے احکام سے روگردانی کی تو تم رب تعالیٰ کی گرفت میں ہو گے کیونکہ رب تعالیٰ تمہارے اعمال سے بے خبر نہیں۔

(از روح المعانی)

☆☆☆

﴿ اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ اشْتَرَوُا الْحَیٰوۃَ الدُّنْیَا بِالْاٰخِرَۃِ فَلَا یُخَفَّفُ عَنْھُمُ الْعَذَابُ وَلَا ھُمْ یُنْصَرُوْنَ ﴾ (آیت ۸٦)

۱) ''یہ ہیں وہ لوگ جنھوں نے آخرت کے بدلے دنیا کی زندگی مول لی توان پر سے عذاب ہلکا ہوگا اور نہ ان کی مدد کی جائے''

۲) ''یہ لوگ ہیں جنھوں نے حاصل کی دنیا کی زندگی آخرت کے بدلے تو نہیں تخفیف کی جائے گی ان سے عذاب کی اور نہ ان کی مدد کی جائے گی''۔

﴿ اِشْتَرَاءَ ﴾ کا معنی خریدنا، یہاں مجازی معنی مراد ہے اختیار کرنا، تبدیل کرنا، پسند کرنا، حاصل کرنا وغیرہ۔ یعنی وہ اللہ تعالیٰ کے احکام پر عمل کر کے آخرت کا اجر وثواب حاصل کر سکتے تھے لیکن انہوں نے دنیا کی زندگی اور دنیاوی منافع کو ترجیح دے کر رب تعالیٰ کے احکام سے روگردانی کر لی:

﴿ فَلَا یُخَفَّفُ عَنْھُمُ الْعَذَابَ ﴾ ''تو نہیں تخفیف کی جائے ان سے عذاب کی''

عذاب کی تخفیف کبھی عذاب کو ختم کرنے سے کی جاتی ہے اور کبھی عذاب کو کل وقت یا بعض وقت میں کم کر کے تخفیف کی جاتی ہے۔ جب رب تعالیٰ نے فرمایا کہ ان سے عذاب میں تخفیف نہیں ہوگی، تو واضح ہوا کہ ان کا عذاب نہ ختم ہوگا، نہ کم ہوگا۔

﴿ وَلَا ھُمْ یُنْصَرُوْنَ ﴾ ''اور ان کی امداد نہیں کی جائے گی'' یعنی دنیا میں ان سے رسوائی ختم کر کے ان کی امداد نہیں کی جائے گی اور ان سے دنیا میں جزیہ ختم کر کے ان کی امداد نہیں کی جائے گی۔ اور آخرت میں ان سے عذاب ختم کر کے ان کو امداد نہیں کی جائے گی۔ اور نہ ہی کوئی شخص ان کی طرف سے فدیہ لے کر ان کو اخروی عذاب سے چھڑا سکے گا۔ اور نہ ہی کوئی ان کو جبراً چھڑا سکے گا۔ طلباء کرام خصوصی طور پر یہ یاد رکھیں کہ یہاں '' ھم '' کو مقدم ''تقوی'' کے لئے کیا گیا ہے۔
حصر کے لئے مقدم نہیں ذکر کیا گیا۔ اس لئے ایسا نہیں کہا جا سکتا کہ یہ معنی کیا جائے کہ صرف یہود کی امداد نہیں کی جائے گی اور کافروں کی امداد کی جائے گی۔ نہیں نہیں ایسا نہیں بلکہ مطلب صرف اتنا ہے کہ یہود کی امداد نہیں کی جائے گی۔ (ماخوذ از کبیر، روح المعانی، وتفسیر ابی السعود)

﴿وَلَقَدْ اٰتَیْنَا مُوْسَی الْکِتٰبَ وَقَفَّیْنَا مِنْ بَعْدِہٖ بِالرُّسُلِ وَاٰتَیْنَا عِیْسَی ابْنَ مَرْیَمَ الْبَیِّنٰتِ وَاَیَّدْنٰہُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ اَفَکُلَّمَا جَآءَکُمْ رَسُوْلٌ بِمَا لَا تَہْوٰۤی اَنْفُسُکُمُ اسْتَکْبَرْتُمْ فَفَرِیْقًا کَذَّبْتُمْ وَفَرِیْقًا تَقْتُلُوْنَ﴾ (آیت ۸۷)

۱) ''اور بیشک ہم نے موسیٰ کو کتاب عطا کی اور اس کے بعد پے در پے رسول بھیجے۔ اور ہم نے عیسیٰ بن مریم کو کھلی نشانیاں عطاء کیں اور پاک روح سے اس کی مدد کی تو کیا تمہارے پاس کوئی رسول وہ لے کر آئے جو تمہارے نفس کی خواہش نہیں تکبر کرتے ہو تو ان (انبیاء) میں ایک گروہ کو تم جھٹلاتے ہو اور ایک گروہ کو شہید کرتے ہو''۔

۲) ''اور البتہ تحقیق ہم نے عطاء کو موسیٰ کو کتاب اور لگا تار بھیجے ہم نے ان کے پیچھے کئی رسول اور عطاء کیں ہم نے عیسیٰ بن مریم کو واضح نشانیاں، اور قوت دی ہم نے اس کو روح قدس سے کیا جب بھی لایا تمہارے پاس کوئی رسول وہ چیز جسے نہیں پسند کیا تمہارے نفسوں نے (تو) تم نے تکبر کیا تو ایک فریق کو تم جھٹلاتے ہو اور ایک فریق کو تم شہید کرتے ہو''۔

اللہ تعالیٰ نے یہود کو جو نعمتیں عطا کیں ان میں سے اور نعمت کا ذکر کیا جا رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی راہنمائی کے لئے موسیٰ علیہ السلام کو کتاب یعنی توراۃ عطا کی۔ اور اس کے بعد بھی پے در پے (لگا تار) انبیاء کرام ان کی ہدایت کے لئے رب تعالیٰ بھیجتا ہی رہا، پھر عیسیٰ علیہ السلام کو واضح نشانیاں دے کر بھیجا عیسیٰ علیہ السلام کی روح قدس سے امداد کی۔

لیکن بنی اسرائیل نے اپنی روش (اپنے طریقہ) کو نہ بدلا۔ بلکہ انبیاء کرام نے اگر رب تعالیٰ کی طرف سے ایسے احکام لائے جو ان کی خواہشات کے مطابق نہیں ہوتے تھے تو وہ تکبر، غرور کی وجہ سے ان کا انکار کر دیتے یہاں تک کہ بعض انبیاء کرام کو انہوں نے جھوٹا کہا اور بعض کو شہید کر دیا۔ (از کبیر)

﴿ وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ ﴾:

''اور البتہ تحقیق عطا کی ہم نے موسیٰ کو کتاب'' یہاں کتاب سے مراد توراۃ ہے۔

☆ '' عن ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما ان التوراۃ نزلت جملة واحدة فامر اللہ تعالیٰ موسیٰ علیہ السلام بحملها فلم يطق فبعث بكل حرف منها ملكا فلم يطيقوا حملها فخففها اللہ تعالیٰ لموسی علیہ السلام فحملها ''

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں بیشک توراۃ تمام ایک مرتبہ ہی نازل ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو اس کے اٹھانے کا حکم دیا آپ نہ اٹھا سکے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ہر حرف کے بدلے ایک فرشتہ اٹھانے کے لئے بھیجا۔ وہ بھی نہ اٹھا سکے تو اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کے لئے اس کا اٹھانا آسان کر دیا۔ تو آپ نے اسے اٹھالیا۔ (از روح المعانی)

یعنی نہ تو الفاظ میں کمی ہوئی اور نہ ہی اس کی برکت اور عظمت میں کوئی کمی ہوئی بلکہ رب تعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ سے موسیٰ علیہ السلام کے لئے اس کا بوجھ ہلکا کر دیا۔ جیسا کہ قرآن پاک نبی کریم ﷺ کی امت کے سینوں میں محفوظ ہونا آسان کر دیا۔ حالانکہ یہی قرآن اگر پہاڑ پر نازل ہوتا تو وہ بھی قرآن پاک کی عظمت کی وجہ سے طاری ہونے والی خشیت سے پھٹ جاتا۔ جیسا کہ رب تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْآنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ﴾

''اگر ہم یہ قرآن کسی پہاڑ پر اتارتے تو ضرور تو اسے دیکھتا جھکا ہوا پاش پاش ہوتا اللہ کے خوف سے''

﴿ وَقَفَّيْنَا مِنْ بَعْدِهٖ بِالرُّسُلِ ﴾: ''اور لگا تار بھیجے ہم نے اس کے پیچھے کئی رسول''

'' وقفينا ای واتبعنا '' ہم نے پیچھے بھیجا '' التقفية الاتباع والارداف '' کہ یہ لفظ ''تقفيه'' سے ماخوذ ہے جس کا معنیٰ ہے پیچھے ہونا، کسی کے ساتھ سواری پر اس کے پیچھے سوار ہونا ''قفاء'' گردن کے پچھلے حصہ کو کہتے ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ ''ہم نے موسیٰ کے بعد کئی رسول پے در پے بھیجے'' دوسرے مقام پر رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿ ثُمَّ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا تَتْرَا ﴾ پھر ہم نے اپنے رسول لگا تار بھیجے '' (تترا) ای واحدا

بعد واحد "یعنی تترا کا معنی ہے ایک دوسرے کے بعد بھیجنا۔

موسیٰ علیہ السلام سے لے کر عیسیٰ علیہ السلام تک ہزاروں کی تعداد میں انبیاء کرام تشریف لائے سب کا عمل توراۃ پر ہی رہا۔ شریعت ایک ہی رہی البتہ بعض اوقات شریعت پر عمل چھوڑ دیا گیا شریعت گویا کہ درجہ معدومیت میں پہنچ گئی تو اور رسول مبعوث ہو گئے۔ موسیٰ علیہ السلام کے بعد آنے والے جلیل القدر انبیاء کرام یہ تھے: حضرت یوشع بن نون، حضرت اشمویل، حضرت داؤد، حضرت سلیمان، حضرت ارمیاء، حضرت حزقیل، حضرت الیاس، حضرت یونس، حضرت زکریا، حضرت یحییٰ علیھم السلام۔ (از خازن)

یہ بھی خیال رہے کہ زبور میں احکام نہیں تھے صرف اذکار و اوراد تھے۔

﴿ وَآتَيْنَا عِيسَى بْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنَاتِ ﴾:

"اور ہم نے عطا کیں عیسیٰ بن مریم کو واضح نشانیاں"

﴿ الْبَيِّنَاتِ ﴾ سے مراد عیسیٰ علیہ السلام کے معجزات بھی ہیں، مردہ کو زندہ کرنا مادر زاد اندھے کو نظر عطا کرنا، اور برص کی مرض والے کو صحیح کرنا۔ ﴿ الْبَيِّنَاتِ ﴾ سے مراد انجیل بھی جو واضح احکام دلائل پر مشتمل تھی۔ ﴿ عیسیٰ ﴾ عبرانی لفظ ہے جس کا معنی ہے "سردار" اور "مبارک"۔ (از روح المعانی)

" ومریم در لغت عبرانی بمعنی خادم است چوما در ایشان رابرای
خدمت بیت المقدس نذر کرده بود ابشان را مریم نام گزاشت "
(عزیزی)

مریم کا معنی عبرانی زبان میں "خادم" ہے چونکہ آپ کی والدہ نے بیت المقدس کی خدمت کیلئے نذر مانی تھی اس لئے آپ کا نام بھی مریم رکھا۔

﴿ وَاَيَّدْنَاهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ﴾ : "اور امداد کی ہم نے اس کی روح قدس سے"

﴿ اَيَّدْنَاهُ ﴾ قویناه، ہم نے اس کو طاقت دی مراد امداد کی ہاتھ کو "ید" کہا جاتا ہے اور اس کی جمع "ایدی" آتی ہے چونکہ ہاتھ میں بھی پکڑنے کی قوت پائی جاتی ہے اسے اس لئے "ید" کہہ لیا جاتا ہے۔

﴿ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ﴾ روح سے مراد وہی روح ہو جس پر حیات کی دارومدار ہے اور "قدس"

سے مراد اللہ تعالیٰ ہو اضافۃ تشریفیہ ہے جس طرح عبد اللہ، امۃ اللہ، بیت اللہ، ناقۃ اللہ'' میں اضافۃ تشریفیہ پائی گئی ہے۔تقریباً اسے یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ گویا اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہم نے عیسیٰ کو اپنی طرف سے خصوصی روح عطاء فرمائی وہ روح ہمارے تقرب کی وجہ سے عیسیٰ علیہ السلام کی تقویت کا سبب بنی۔

'' وقال ابن عباس هو اسم الله الاعظم الذی کان عیسی یحیی به الموتی ''

اسی طرح روح قدس کا اور یہ بھی معنی ہے ''اللہ کا اسم اعظم'' جس کی وجہ سے آپ مردوں کو زندہ فرماتے تھے۔اب مطلب یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے گویا کہ یہ فرمایا ہم نے عیسیٰ کی اپنے اسم اعظم سے امداد فرمائی جس سے آپ کے معجزات کا ظہور ہوتا تھا۔

''وقیل هو الانجیل لانه حیاة القلوب سماه روحا کما سمی القرآن روحا ''

اسی طرح روح القدس سے مراد ''انجیل'' بھی ہے کیونکہ وہ دلوں کو زندہ کرتی جب تک (اصلی حال میں تھی اور منسوخ نہیں ہوئی تھی) جس طرح قرآن پاک کو روح کہا گیا ہے جیسا کہ رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿اِنَّا اَنۡزَلۡنَا اِلَیۡکَ رُوۡحاً﴾ بیشک ہم نے آپ کی طرف روح (قرآن پاک) کو نازل فرمایا۔

'' وقیل هو جبریل ووصف بالقدس وهو الطهارة لانه لم یقترف ذنبا قط ''

اور مطلب یہ ہے کہ روح سے مراد جبریل ہے اور قدس سے مراد پاک ہونا ہے یعنی جبریل نے کبھی گناہ کا ارتکاب نہیں کیا اب مطلب یہ ہوگا کہ ہم نے جبریل پاک کے ذریعہ آپ کی امداد کی۔

'' وقیل القدس هو الله تعالیٰ والروح جبریل کما تقول عبد الله سمی جبریل روحا للطافته لانه روحانی خلق من النور ''

اور مطلب یہ ہے کہ قدس سے مراد اللہ تعالیٰ اور روح سے مراد جبریل، اضافۃ تشریفیہ ہے جیسے کہ عبد اللہ میں ہے، جبریل کو روح اس لئے کہا گیا ہے کہ اس میں لطافت پائی گئی ہے وہ روحانی ہے نور سے پیدا کیا گیا ہے۔اس صورت میں معنی یہ ہوگا ''ہم نے اپنی نورانی مخلوق جبریل کے ذریعے ان کو طاقت دی (امداد کی)۔

'' وقیل سمی روحا لمکانه من الوحی الذی هو سبب حیاة القلوب ''

اور وجہ جبریل کو روح کہنے کی یہ ہے کہ جبریل وحی لانے کی وجہ سے دلوں کی زندگی کا سبب ہے جس طرح روح سے ظاہری طور پر حیات حاصل ہوتی ہے۔ اس صورت میں مطلب یہ ہوگا ہم نے ان کی امداد کی وحی لانے والے جبریل کے ذریعے۔

تنبیہ : اگر چہ یہ تمام معانی اجتماعی طور پر مراد لئے جاسکتے ہیں لیکن " **وحمل روح القدس هنا علی جبریل اولی** " یہاں روح القدس مراد جبریل لینا زیادہ بہتر ہے۔ (از خازن)

عیسیٰ علیہ السلام کو جبریل کی تائید اس طرح حاصل تھی کہ آپ جہاں چلتے تھے جہاں جاتے تھے جبریل آپ کے ساتھ ہوتے اور آپ کی معاونت کرتے۔ (از خازن)

فائدہ : نبی کریم ﷺ نے حضرت حسان ﷺ کو فرمایا " **اهجهم وروح القدس معک** " ان کافروں کو ھجو بیان کر و روح قدس تمہارے ساتھ ہیں۔ اور ایک مقام پر فرمایا " **اهجهم وجبریل معک** " ان کفار کی ھجو بیان کریں جبریل تمہارے ساتھ ہیں۔

اگر چہ نبی کریم ﷺ کے ارشادات گرامیہ سے ظاہر طور پر یہ معنی سمجھ آ رہا ہے کہ تم کفارہ کی ھجو بیان کرو تمہارے ساتھ روح قدس جبریل ہیں۔ یعنی ان کی تائید تمہیں حاصل ہے۔ چونکہ حضرت حسان ﷺ کے لئے حضور ﷺ نے دعاء فرمائی " **اللهم ایده بروح القدس** " اے اللہ انہیں روح قدس کی تائید عطا فرما۔ (از روح المعانی وقرطبی)

لیکن حضرت حسان ﷺ نے کمال عقیدت سے یہ بیان کیا کہ میرے امداد کرنے والے جبریل بھی نبی کریم ﷺ ہیں اور روح القدس بھی آپ ہی ہیں۔ سبحان اللہ حضرت حسان ﷺ کو یقین تھا کہ نبی کریم ﷺ کو رب تعالیٰ نے گناہوں سے معصوم پیدا کیا اس لئے آپ روح قدس ہیں۔

لیکن افسوس صد افسوس سنیت کے لبادہ میں اغیار آج کل نبی کریم ﷺ کی طرف ذنب بمعنی گناہ لے کر ذنب در ذنب میں مبتلاء ہو رہے ہیں " **اللهم انا نعوذ بک من الجاهلین** " اور حضرت حسان ﷺ کو یہ بھی یقین تھا کہ نبی کریم ﷺ نورانی مخلوق تھے کہاں جبریل کی نورانیت جو فرع ہے اور کہاں آپ کی نورانیت جو اصل ہے۔ حضرت حسان ﷺ نے کیا خوب بیان فرمایا:

وجبریل رسول اللہ فینا   وروح القدس لیس لہ کفاء

(مسلم ج ۲ باب فضائل حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ)

اللہ کے رسول جبریل ہم میں ہیں   اور روح قدس ہیں جن کا کوئی مثل نہیں

خیال رہے کہ بعض شارحین نے اس شعر میں جبریل سے مراد جبریل ہی لیا لیکن راقم کے نزدیک سیاق وسباق کے لحاظ پر یہی معنی زیادہ قریب ہے جو ذکر کر دیا ہے۔

فائدہ جلیلہ : "عن عائشة قالت كان رسول الله ﷺ يضع لحسان منبرا فی المسجد يقوم عليه قائما يفاخر عن رسول الله ﷺ او ينافح ويقول رسول الله ﷺ ان الله يؤيد حسان بروح القدس ما نافح او فاخر عن رسول الله ﷺ" (رواه البخاری، مشکوۃ باب البیان والشعر)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں رسول اللہ ﷺ حضرت حسان رضی اللہ عنہ کے لئے مسجد میں منبر رکھتے اور اس پر حضرت حسان کھڑے ہو کر نبی کریم ﷺ کی مدح کرتے اور کفار کی ھجو کی مدافعت کرتے۔ یعنی ان کی ھجو کا آپ جواب دیتے رسول اللہ ﷺ فرماتے تھے۔ بیشک اللہ تعالیٰ حسان کی روح قدس سے تائید عطا فرمائے جب تک یہ اللہ کے رسول (ﷺ) کی طرف سے کفار کی ھجو کی مدافعت کرتے رہیں۔

﴿ اَفَكُلَّمَا جَاۗءَكُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰٓى اَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ ﴾ :

"کیا جب بھی لایا جائے تمہارے پاس کوئی رسول وہ چیز جس کو نہیں پسند کیا تمہارے نفسوں نے (تو) تم نے تکبر کیا"۔

یعنی رب تعالیٰ نے انبیاء کرام کو بنی اسرائیل کی راہنمائی کے لئے بھیجا لیکن جب انہوں نے اللہ تعالیٰ کے احکام پیش فرمائے تو ان کو پسند نہ آئے تو انہوں نے تکبر کر کے ان سے روگردانی کر لی۔

ان کے تکبر کرنے کی وجہ کیا تھی: یہود کا انبیاء کرام کی تکذیب کرنا اور ان کو شہید کرنا اور ان کے بتائے ہوئے حق راستہ سے روگردانی کرنا اس وجہ سے تھا:

"وانما كانوا كذلک لارادتهم الرفعة فی الدنيا وطلبهم لذاتها والترؤس على عامتهم واخذ اموالهم بغير حق وكانت الرسل تبطل عليهم ذلک فيكذبونهم لاجل ذلک"

کہ یہود کی نظر میں دنیاوی رفعت کی قدر ومنزلت تھی دین کے معاملہ میں انہیں کوئی

پرواہ نہیں تھی وہ صرف دنیا کی لذات کو حاصل کرنے کے درپے تھے، وہ عام لوگوں کو ڈراتے رہتے تھے ان کو دھمکیاں دیتے رہتے تھے لوگوں کا مال ناحق جابرانہ اور غاصبانہ طور پر لے لیتے تھے۔

ان کے ان غلط کاموں پر انبیاء کرام انہیں متنبہ کرتے، ان کو بتاتے کہ تم باطل کام کر رہے ہو، انبیاء کرام کے حق راہ بتانے پر اور ان کو غلط کاموں سے روکنے کی وجہ سے انہوں نے انبیاء کرام کی تکذیب شروع کر دی۔

﴿ فَفَرِيقًا كَذَّبْتُمْ وَفَرِيقًا تَقْتُلُونَ ﴾: ایک فریق کی تم تکذیب کرتے ہو یعنی موسیٰ علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام وغیرہما کی انہوں نے تکذیب کی۔ اور ایک فریق کو تم شہید کرتے ہو۔ یعنی حضرت یحیٰ، حضرت زکریا، حضرت شعیاء وغیرھم علیھم السلام کو انہوں نے شہید کیا۔

"ویوھمون عوامھم کونھم کاذبین ویحتبون فی ذلک بالتحریف وسوء التاویل"

اور ان کے علماء عوام کے دلوں میں یہ وہم ڈالتے کہ یہ انبیاء (معاذ اللہ) جھوٹے ہیں اور کتب میں تحریف کر کے اور غلط تاویلیں کر کے عوام کو حق سے برگشتہ کرتے۔

"ومنھم من کان یستکبر علی الانبیاء استکبار ابلیس علی آدم"

ان یہود میں سے کئی لوگ اپنے آپ کو انبیاء کرام سے اعلیٰ سمجھتے ان کا تکبر ایسا تھا جیسا کہ شیطان نے آدم علیہ السلام کے سامنے سجدہ کرنے سے تکبر کیا اور رب تعالیٰ کے حکم کا انکار کیا۔ نبی کریم ﷺ کو شہید کرنے میں بھی یہود نے بہت کوشش کی۔ آپ کو زہر آلود بکری کا گوشت کھلا کر شہید کرنے کی کوشش کی۔ پھر آپ پر جادو کر کے آپ کو شہید کرنے کی کوشش کی لیکن اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو بتا دیا کہ کس نے جادو کیا اور کیسے کیا۔

اس طرح اللہ تعالیٰ نے آپ کو ظاہری شہادت سے تو محفوظ رکھا البتہ اس زہر کا اثر لوٹ آیا تھا جب آپ کا وصال ہوا تو گویا کہ یوں کہا جا سکتا ہے کہ نبی کریم ﷺ کی شہادت باطنیہ بھی یہود کے ہاتھوں سے ہوئی۔

یہود و ہنود کا اشتراک: کفار مکہ کو بھی نبی کریم ﷺ سے اسی قسم کی مخالفت تھی جیسے بنی اسرائیل کو انبیاء کرام سے مخالفت رہی۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا؛

﴿ وَاِذَا تُتۡلٰی عَلَیۡهِمۡ اٰیَاتُنَا بَیِّنٰتٍ قَالَ الَّذِیۡنَ لَا یَرۡجُوۡنَ لِقَآءَنَا ائۡتِ بِقُرۡاٰنٍ غَیۡرِ هٰذَآ اَوۡ بَدِّلۡهُ قُلۡ مَا یَکُوۡنُ لِیۡۤ اَنۡ اُبَدِّلَهٗ مِنۡ تِلۡقَآیِٔ نَفۡسِیۡ اِنۡ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوۡحٰۤی اِلَیَّ ﴾ (سورة یونس آیة ۱۵)

''اور جب تلاوت کی جاتی ہیں ان پر ہماری آیات جو واضح ہیں کہتے ہیں وہ لوگ جو نہیں امید کرتے ہماری ملاقات کی کہ لے آؤ قرآن اس کے سوا، یا اسے بدل دو، آپ فرما دیں نہیں ہے (یہ حق) میرے لئے کہ میں اسے تبدیل کر دوں اپنی طرف سے میں نہیں تابعداری کرتا سوائے اس کے جو میری طرف وحی کی جاتی ہے''۔

کفار کا مطالبہ: کفار کی ایک جماعت نبی کریم ﷺ کے پاس آئی وہ کہنے لگے کہ اس قرآن میں ہمارے معبودوں کے خلاف بیان کیا گیا ہے۔ اور ہر قسم کی ہماری عیاشی کے ذرائع شراب نوشی، جوابازی لوٹ کھسوٹ، رشوت، سود خوری کو حرام قرار دے دیا گیا ہے۔ اس لئے ہمارا مطالبہ صرف یہ ہے کہ اس قرآن کے علاوہ کوئی اور قرآن لے آؤ، یا اسی قرآن کو بدل کر اس میں ترمیم کر دو، تاکہ ہم اپنے معبودوں کی عبادت بھی کرتے رہیں۔ اور عیاشی کے تمام ذرائع پر عمل کرتے رہیں اور تمہارا قرآن بھی ان کو جائز قرار دے تو ہمارا اور تمہارا جھگڑا ختم ہو جاتا ہے ہم تم پر ایمان لے آئیں گے۔

نبی کریم ﷺ نے رب تعالیٰ کے حکم سے ان کو دو ٹوک جواب دیا کہ قرآن رب کا کلام ہے رب تعالیٰ کی طرف سے جو وحی آتی ہے میں وہی بیان کرتا ہوں۔ قرآن کو میں بدل دوں یہ ہو ہی نہیں سکتا۔ نبی کریم ﷺ کے اس ارشاد پر کفار بت پرست آپ کے مخالف ہو گئے بتوں کا مخالف سمجھنے لگے اپنے باطل دین کا مخالف سمجھنے لگے بلکہ یہوں کہیں کہ غنڈے اور بدمعاش نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام کو (معاذ اللہ) دہشت گرد سمجھنے لگے جھوٹے لوگ معاذ اللہ آپ کی تکذیب کرنے لگے۔

آپ کو راستے سے ہٹانے کے مختلف حربے استعمال کرنے لگے لیکن کفار ذلیل ہوئے مصطفیٰ کریم ﷺ اور آپ کے صحابہ کو رب تعالیٰ نے رفعت و بلندی سے نوازا۔ ایک وقت وہ بھی آیا جب فتح مکہ کے وقت بڑے بڑے جابر کفار حضور ﷺ کے سامنے سر جھکانے لگے۔

تاریخ واقعات کو دہرا رہی ہے: آجکل کفار کے یار، یہود ونصاریٰ کے مددگار، بدکردار لوگ علماء کو دہشت گرد کہہ رہے ہیں وہ بھی چاہتے ہیں کہ جو ہم کہیں علماء اسے جائز قرار دے دیں جب علماء کہتے ہیں کہ حرام کو حلال کہنا ہم سے ممکن نہیں تو وہ کہتے ہیں کہ یہ پاگل ہیں، یہ دہشت گرد ہیں ان کو مٹادو دینی مدارس کو ختم کر کے ایسے مدارس بناؤ جس سے فارغ ہونے والے نام نہاد مولوی ہماری ہاں میں ہاں ملادیں۔

یہی ہنود کی پرانی تاریخ آج پھر دوہرائی جارہی ہے لیکن اپنے آباؤ اجداد، اپنے پیشواؤں کی طرح انشاء اللہ یہ بھی ذلیل ہوں گے۔ اور علماء کرام انشاء اللہ زندہ رہیں گے، ان کے مٹانے سے نہیں مٹیں گے۔ ؏ یہ چراغ پھونکو سے نہ بجھایا جائے گا۔

تنبیہ: ﴿لَا تَهْوٰى﴾ ماخوذ "هوی" (بالکسر) سے اس کا معنی ہے محبت کرنا "**لا تهوی انفسكم ای لا تحب انفسكم**" جس چیز کو تمہارے نفس پسند نہیں کرتے، اور جب "هوی" (بالفتح) ہو تو اس کا معنی گرنا ہوتا ہے ﴿اَفَكُلَّمَا﴾ میں استفہام توبیخ کے لئے ہے:

"وقال توبيخا اكفرتم بهم فكلماجاءكم"

یعنی ان کو ڈانٹے ہوئے، زجر کرتے ہوئے فرمایا کیا تم ان سے کفر کرتے ہو جب وہ احکام لاتے ہیں جو تمہیں پسند نہیں آتے۔ یعنی ان کا انبیاء کرام کے خلاف تکبر کرنا اور انکار کرنا کفر ہے۔

(از مظہری)

☆☆☆☆☆

﴿ وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا غُلْفٌ بَلْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ فَقَلِيْلًا مَّا يُؤْمِنُوْنَ ﴾ (آیت ۸۸)

۱) ''اور یہودی بولے ہمارے دلوں پر پردے پڑے ہیں بلکہ اللہ نے ان پر لعنت کی ان کے کفر کے سبب تو ان میں تھوڑے ایمان لاتے ہیں''۔

۲) ''اور انہوں نے کہا ہمارے دلوں پر پردے ہیں بلکہ لعنت ہے ان پر اللہ کی بوجہ ان کے کفر کے تو تھوڑے ہیں جو ایمان لاتے ہیں''۔

اس آیۂ کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے ان پر نعمت عظمی کا ذکر فرمایا اور ساتھ ہی ان کی عادت جو کجروی (ٹیڑھی چال) کی تھی اسے بھی ذکر کر دیا۔ نبی کریم ﷺ کا تشریف لانا اور ان کو دعوت اسلام دینا بہت بڑی نعمت تھی، لیکن انہوں نے یہ کہا کہ ہمارے دلوں پر تو پردے چھائے جاتے ہیں جو تم ہمیں دعوت اسلام دیتے ہو وہ ہماری سمجھ میں نہیں آ سکتی تو رب تعالیٰ نے ان کا رد کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ غلط کہتے ہیں ان کے دلوں میں تو سمجھنے کی صلاحیت موجود ہے البتہ ان کے کفر کی وجہ سے ان پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہے اسی لئے وہ ایمان سے دور ہیں تھوڑے ہی ہیں جو ایمان لاتے ہیں۔

﴿ وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ﴾: ''اور انہوں نے کہا ہمارے دلوں پر پردے ہیں'' یہ مختصر سے الفاظ مبارکہ ہیں لیکن کثیر معانی پر مشتمل ہیں:

﴿ وَقَالُوْا ﴾ میں ضمیر یہود کی طرف لوٹ رہی ہے یعنی یہود نے کہا۔

﴿ غُلْفٌ ﴾ جب لام کے سکون سے ہو تو یہ " اغلف " کی جمع ہے جس کا معنی ہوتا ہے پیدائشی پردہ جس کی وجہ سے کوئی چیز دل میں محفوظ نہ رہ سکے اور سمجھ میں کچھ نہ آئے۔ اور ﴿ غُلُفٌ ﴾ جب لام کے ضمہ سے ہو تو یہ جمع ہوتی ہے ''غلاف'' کی یہ کسی چیز کو ڈھانپ دینے کو کہا جاتا ہے۔ اس کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ جو چیز دل میں ہے پردہ نے اسے محفوظ کر دیا ہے۔

(مختصر از مظہری)

قدرے تفصیل:

" عن ابن عباس وقالوا قلوبنا غلف ای فی اکنة "

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں اس کا معنی یہ ہے کہ یہودیوں نے کہا'' ہمارے دل پردہ میں ہیں۔

" وعن ابن عباس وقالو قلوبنا غلف ای لا تفقه "

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں ایک اس کا معنی یہ ہے کہ یہودیوں نے کہا'' ہمارے دل سمجھتے نہیں''۔

" وعن ابن عباس وقالوا قلوبنا غلف هی القلوب المطبوع علیها "

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں اس کا ایک معنی یہ ہے یہودیوں نے کہا ہمارے دلوں پر مہر لگادی گئی ہے۔

اور یہی قول حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ کا بھی ہے کیونکہ انہوں نے فرمایا اس کا معنی یہ " علیها طابع " ہمارے دلوں پر مہر ہے۔

" وقال مجاهد وقالوا قلوبنا غلف علیها غشاوة ، وقال السدی یقولون علیها غلاف وهو الغطاء "

مجاہد اور سدی دونوں حضرات کے اقوال کا مطلب تقریباً ایک ہی ہے کہ ان یہودیوں نے کہا ہمارے دلوں پر پردہ چھا گیا۔

قال مجاهد وقتاده وقرأ ابن عباس غلف بضم اللام وهو جمع غلاف ای قلوبنا اوعیة لکل علم فلانحتاج الی علمک "

مجاہد اور قتادہ نے کہا حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی قرأت میں ''غلف'' لام کی پیش سے بھی پڑھا گیا ہے جو غلاف کی جمع ہے۔ اس لحاظ سے ان کا کہنا یہ تھا کہ ہمارے دلوں میں جو علم پہلے سے موجود ہے اس پر غلاف چڑھا کر اسے محفوظ کر دیا گیا ہے لہٰذا ہم تمہارے علم کے محتاج نہیں۔ (از ابن کثیر)

تین معانی واضح ہیں:

" احدها انه جمع اغلف والا غلف هو ما فی غلاف ای قلوبنا مغشاة باغطیة مانعة من وصول اثر دعوتک الیها "

ان میں سے ایک معنی یہ ہے کہ غلف جمع ہے اغلف کی اور اغلف اسے کہتے ہیں جو غلاف میں ہو یعنی ان کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ ہمارے دلوں پر پردے چھائے ہوئے ہیں جو تمہاری دعوت کو ہمارے دلوں تک پہنچنے سے مانع ہیں۔

وثانیها روی الاصم عن بعضم ان قلوبهم غلف بالعلم ومملؤة بالحکمة فلا حاجة معها بهم الی شرع محمد علیه السلام"

ان معانی میں دوسرا یہ ہے کہ ان کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ ان کے دل علم اور حکمت سے بھرے ہوئے ہیں یعنی ان کے دلوں پر غلاف چڑھا کر علم وحکمت کو محفوظ کر دیا گیا ہے لہٰذا اس کے ہوتے ہوئے محمد (ﷺ) کی شریعت کی ضرورت نہیں۔

" وثالثها غلف ای کالغلاف الخالی لا شئی فیه مما یدل علی صحة قولک"

ان معانی میں تیسرا یہ ہے کہ ہمارے دلوں پر تو خالی غلاف ہے ان میں کوئی چیز نہیں جس سے سمجھ آئے کہ تمہاری بات صحیح ہے یعنی ان کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ ہمارے دل تو سمجھنے سے خالی ہیں لہٰذا تمہارا ہمیں تبلیغ کرنا اس لئے مفید نہیں ہوسکتا کہ ہم میں سمجھنے کی صلاحیت ہی نہیں۔ (از کبیر)

خیال رہے کہ وہ اپنے آپ کو بڑا عقل مند بھی سمجھتے تھے لیکن یہ ان کا کہنا صرف ان کی کجروی کی وجہ سے تھا۔

﴿ بَلْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ ﴾: "بلکہ لعنت ہے ان پر اللہ کی بوجہ ان کے کفر کے"

اللہ تعالیٰ نے ان کا رد کیا کہ ان کا یہ کہنا غلط ہے کہ ہمارے دلوں میں تمہاری بات آ نہیں سکتی اللہ تعالیٰ تو ہر شخص کو سمجھنے کی صلاحیت عطا کر کے پیدا فرماتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

" ما من مولود الا یولد علی الفطرة فابواه یهود انه وینصرانه ویمجسانه" (رواه البخاری ومسلم من حدیث ابی هریرة)

کسی بچے کو نہیں پیدا کیا جاتا سوائے فطرۃ کے البتہ اس کے ماں باپ اسی یہودی بنا دیتے ہیں یا نصرانی بنا دیتے ہیں یا مجوسی بنا دیتے ہیں۔

مطلب واضح ہے کہ ہر بچہ پیدائش کے وقت فطرۃ اسلامیہ پر پیدا ہوتا ہے اس میں اسلام کے سمجھنے کی صلاحیت ہوتی ہے لیکن وہ اپنے والدین کو دیکھ کران کا مذہب ہی اختیار کرتا ہے اگر اس کے ماں باپ یہودی ہوئے تو انہوں نے اسے اپنی یہودیہ طرز سے اس سے یہودی بنا دیا۔ اور اگر اس کے ماں باپ نصرانی ہوئے تو وہ اسے اپنی نصرانی روش سے نصرانی بنا دیتے ہیں۔ اور اگر اس کے والدین مجوسی ہوئے تو وہ اسے اپنے دین کی تربیت کرنے سے اپنے جیسا مجوسی بنا دیتے ہیں۔

" رد لما قالو والمعنی انها خلقت علی الفطرة والتمکن من قبول الحق ولکن الله خذلهم بکفرهم "

یعنی ان کے اقوال کا رد اس طرح کیا گیا کہ وہ فطرۃ اسلامیہ پر پیدا کئے گئے حق کے قبول کرنے کی انکو طاقت دی گئی لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کو ان کے کفر کی وجہ سے رسوا اور ذلیل کیا۔ اور ان کی استعداد کو ان کے کفر نے باطل کیا ان کے کفر نے ان کو توبہ کرنے سے ہی دور کر دیا توبہ کرتے اسلام قبول کرتے تو یقیناً رب تعالیٰ اسے شرف قبولیت عطا فرماتا۔ رب تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ فَاَصَمَّهُمْ وَاَعْمٰی اَبْصَارَهُمْ ﴾ "(ان کو ان کے کفر نے) بہرا اور اندھا کر دیا ہے"۔

(از مظہری وبیضاوی)

لعنت کیا ہے؟ " واصل اللعن الطرد والابعاد " عرب کی کلام میں لعنت کا معنی دور کرنا، ہانکنا چلانا ہے۔ اسی لئے بھیڑیئے کو بھی "ذئب لعین" کہا جاتا ہے کہ اسے بھی دور بھگایا جاتا ہے۔

" فالمعنی ابعدهم الله من رحمته " یہاں مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنی رحمت سے دور کیا۔

" وقیل من توفیقه وهدایته " یہاں لعنت کا معنی یہ لیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنی توفیق اور ہدایت سے دور کیا۔

" وقیل من کل خیر " اور یہ مطلب بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو ہر بھلائی سے دور کر دیا۔

(قرطبی)

مسئلہ : جب لعنت کا معنی یہ لیا جائے کہ اللہ تعالیٰ اپنی ہر قسم کی رحمت سے دور کرے تو یہ لعنت صرف

کافر کے لئے ہے مومن فاسق کے لئے نہیں۔اور اس کافر پر شخصی طور پر لعنت بھیجی جاسکتی ہے جس کی کفر پر موت یقینی ہے جیسے ابوجہل، ابولہب، فرعون، نمرود وغیرھا۔جس شخص کی موت کفر پر یقینی طور پر ثابت نہ ہواس پر شخصی طور پر لعنت نہیں بھیجی جاسکتی البتہ صرف اتنا کہنا کافی ہے:

• ﴿ لَعْنَةُ اللهِ عَلَى الْكَافِرِيْنَ ﴾ ''اللہ کی لعنت ہو کافروں پر''

اگر وہ شخص کافر ہوا تو اس لعنت میں خود شامل ہو جائے گا اور اگر کافر نہ ہوا تو لعنت بھیجنے والا گنہگار نہیں ہوگا۔لعنت کا جب یہ معنی لیا جائے کہ رب تعالیٰ کی رحمت خاصہ (جو مقربین مومنین کو حاصل ہوتی ہے) سے دور ہو تو اس معنی کے لحاظ سے فاسق و فاجر پر لعنت بھیجی جاسکتی ہے لیکن یہ بھی شخصی نہ ہو، اجتماعی ہو اس طرح کہنا جائز ہوگا۔

" لعنة الله على الفاسقين ، لعنة الله على الظالمين ، لعنة الله على الكاذبين "

اسی معنی کے لحاظ پر نبی کریم ﷺ نے بعض عورتوں پر لعنت فرمائی۔

حضرت اسماء بنت ابی بکر نے کہا کہ ایک عورت نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی اس نے عرض کیا کہ میری بیٹی کے بال بیماری کی وجہ سے گر گئے ہیں میں نے اس کی شادی کرنی ہے کیا میں اسے دوسری عورتوں کے بال لگادوں؟ تو آپ نے فرمایا" لعن الله الواصلة و المستوصلة "دوسروں کے بال ملانے والیوں اور ملوانے والیوں پر اللہ کی لعنت۔

وضاحت حدیث: انسانی بالوں کی وگ لگانی حرام ہے کیونکہ انسان کے بالوں یا دوسرے اجزاء سے نفع حاصل کرنا حرام ہے ہاں اگر کسی جانور کے بال ہوں ان میں نجاست نہ ہو وہ خاوند کی اجازت سے لگاسکتی ہے۔ (نووی ج ۲ ص ۲۱۲)

اسی طرح پلاسٹک کی وگ جو آج کل استعمال ہوتی ہے وہ بھی جائز ہے۔البتہ عام طور پر سر کے بالوں کا جوڑا بنا کر سر پر بال فیشن کے طور پر لپیٹے جاتے ہیں جو اونٹ کی کوہان کی طرح نظر آتے ہیں یہ ممنوع ہے تاہم غسل کے بعد بال خشک کرنے کے لئے عارضی طور پر بالوں کا جوڑا بنانا راقم کو ممنوع نظر نہیں آتا۔

" واما تحمير الوجه والخضاب بالسواد فان فعلته بغير اذن الزوج

فحرام وان اذن جاز علی الصحیح "(نووی شرح مسلم ج ۲ ص ۲۱۲)

لیکن چہرے کا سرخ کرنا یا بالوں کا سیاہ کرنا اگر خاوند کی اجازت کے بغیر ہو تو حرام ہوگا اگر خاوند کی اجازت سے ہو تو صحیح یہ ہی ہے کہ جائز ہے تاہم اس حال میں بے حجاب ہو کر دوسرے نامحرم لوگوں کے سامنے آنا منع ہے۔

فائدہ : حرام کی معاونت بھی حرام ہے انسانی بال دوسری عورت یا مرد کے بالوں سے ملانے والی عورت پر مرد پر بھی اسی طرح لعنت ہوگی۔ جس طرح اس کو کہہ کر اپنے بالوں سے ملوانے والی پر لعنت ہے۔

☆ " عن عبد الله قال لعن الله الواشمات والمستوشمات والنامصات والمتنصمات والمتفلجات للحسن المغيرات خلق الله " (مسلم ج ۲ ص ۲۱۳)

حضرت عبداللہ (بن مسعود) رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اللہ کی لعنت ہو رنگ بھرنے والی اور بھروانے والی پر، اور بال نوچنے والی اور نچوانے والی پر اور دانتوں کے درمیان حسن کے لئے کشادگی (جھری) بنانے والی پر کیونکہ وہ اللہ کی تخلیق کو بدلنے والی ہیں۔

وضاحت حدیث: " واشمات " وہ عورتیں ہیں جو دوسری عورتوں کے جسم میں سوئی چبھو کر خون نکال کر اس میں رنگ بھر دیتی تھیں جس طرح اب بھی لوگ اپنے جسم پر نام لکھواتے ہیں یا پھول بنواتے ہیں یا جانوروں کی تصاویر بنواتے ہیں۔

" مستوشمات " یہ وہ عورتیں ہیں جو اس طرح اپنے جسم میں رنگ بھرواتی ہیں۔

خیال رہے کہ یہ فعل مردوں اور عورتوں کے لئے ایک جیسا ہی حرام ہے لیکن اس وقت عام طور پر یہ فعل صرف عورتوں میں پایا جاتا تھا اس لئے ان کا ہی تذکرہ کیا گیا ہے۔

"نامصات " چہرے کے بال نوچنے والی عورتوں کو کہا جاتا ہے۔

" متنمصات " نوچوانے والی عورتوں کو کہا جاتا ہے لیکن یہ ابروٶں کے بال یا چہرے پر کہیں بال ہوں تو ان کا یہ حکم ہے۔ البتہ داڑھی یا مونچھوں پر عورت کے بال آجائیں تو اس کے لئے نوچنا مستحب ہے۔

" متفلجات " ان عورتوں کو کہتے ہیں جو اپنے سامنے والے دانتوں کو ریتی سے رگڑ کر ان کے

درمیان فرجہ (کشادگی ، جھری) بناتی تھیں تا کہ ان کے دانت حسین وجمیل نظر آئیں ۔اس غرض سے ایسا کرنے والی چونکہ اللہ تعالیٰ کی تخلیق کو بدلنے کی کوشش کرتی ہیں للہذا لعنت کی مستحق ہوتی ہیں ہاں اگر علاج کرنے کی غرض سے یا کسی عیب کو زائل کرنا مقصود ہو تو جائز ہے۔ (نووی شرح مسلم ج ۲ ص ۲۱۳)

یزید پر لعنت کا حکم: اگر چہ علامہ تفتازانی رحمہ اللہ نے شرح عقائد میں بہت سختی کی ہے اور کہا ہے۔

"لعنة الله عليه وعلى انصاره واعوانه"

یزید اور اس کے تمام مددگاروں پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو۔

"قال السيوطى لعن الله قاتل الحسين وابن زياد ومعه ويزيد"

(حاشیہ نبراس ص ۵۵۴)

علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے بیان فرمایا اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو امام حسین ﷺ کے قاتل اور ابن زیاد اور اس کا ساتھ دینے والے قاتلوں اور یزید پر۔

لیکن کچھ حضرات نے یزید پر شخصی لعنت سے اجتناب بھی کیا ہے۔

"وبهذا ظهر ان استدلالهم على لعن يزيد بالنصوص العامة غير صحيح" (نبراس ص ۵۵۵)

صاحب نبراس نے اپنے دلائل ذکر کرنے کے بعد کہا ہے کہ اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ یزید پر لعنت کرنے والے حضرات کے عام نصوص سے استدلات درست نہیں۔

قول فیصل: سب سے بہتر ارشاد سید الاولیاء حضرت پیر مہر علی شاہ رحمہ اللہ کا ہے۔ایک شخص نے عرض کیا کہ شیخ عبد الحق محدث دہلوی لعن یزید کے جواز کا فتوی دیتے ہیں۔فرمایا کہ" شیخ موبموسفتہ محبت بنو فاطمہ ہیں" پس ان کو ایذاء پہنچانے والے کو حق میں پورے طور پر مجوز لعنت ہیں۔لیکن بعض اہل علم نے اس میں تامل کیا ہے اور کہا ہے کہ آخرت کا حال معلوم نہیں ممکن ہے یزید نے توبہ کی ہو علامہ تفتازانی نے اس کے رد میں خوب فرمایا ہے کہ قتل ذریت طیبہ اور ان کی اہانت بطور یقین اور امر مشہور ہے اور توبہ امر محتمل پس احتمال وظن یقین سے کیا نسبت رکھتے ہیں اور بہت سے دیگر محققین بھی لعن کا جواز ثابت کرتے ہیں۔

ہمارے مخلصوں میں سے ایک شخص کو دمشق کی سیر وسیاحت کا اتفاق ہوا ہے اس نے بیان کیا ہے

کہ سارے شہر کی آلودگیاں اور خاکروبہ یزید کے قبر کے پاس ڈالتے ہیں وہ جگہ آبادی سے بہت دور ہے ہاں جواز اور لزوم میں فرق ہے لعن کو عادت بنانا ضروری اور لازم نہیں۔ بہتر ہے کہ بحکم فرمودہ حق تعالیٰ ﴿ فَلَعْنَةُ اللهِ عَلَى الظَّالِمِينَ ﴾ پر کفایت کی جائے۔ بجائے لعن کے اللہ اللہ کرنا اولین وآخرین کے حق میں بہتر کام ہے۔ (ملفوظات مهريه ملفوظ نمبر ۱۶۴، ۱۲۴)

﴿فَقَلِيلًا مَّا يُؤْمِنُونَ﴾: ''تو تھوڑے ہیں جو ایمان لاتے ہیں'' اس کی تفسیر میں تین احتمال ہیں

" احدها ان القليل صفة المؤمن ای لا یؤمن منهم الا القليل "

ایک احتمال یہ ہے کہ قلیل صفت ہے مومن کی معنی یہ ہے کہ ان میں ایمان لانے والے نہیں ہیں سوائے تھوڑوں کے۔

" وثانيها انه صفة الايمان ای لا يؤمنون الا بقليل مما كلفوا به "

دوسرا معنی یہ ہے کہ قلیل صفت ہو ایمان کی۔ اب مطلب یہ ہوگا کہ وہ نہیں ایمان لاتے سوائے تھوڑی چیزوں کے یعنی ان کو جن احکام کا مکلف بنایا ہے بعض پر وہ ایمان لاتے ہیں اور بعض کا انکار کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر رب تعالیٰ کو مان لیا انبیاء کرام کا انکار کر دیا۔

" وثالثها معناه لا يؤمنون اصلا لا قليلا ولا كثيرا ، كما يقال قليلا ما يفعل بمعنى لا يفعل البتة "

اور تیسرا معنی یہ ہے کہ وہ بالکل ایمان نہیں لاتے نہ قلیل پر نہ کثیر پر، جیسا کہ کہا جاتا ہے ''قلیلا ما فعل''، لیکن اس کا معنی یہ مراد لیا جاتا ہے ''وہ بالکل کام کرتا ہی نہیں''۔

علامہ کسائی رحمہ اللہ نے بھی بیان فرمایا ہے کہ عرب لوگ جب کسی زمین سے گزرتے ہیں تو کہتے ہیں " قليلا ما تنبت "، لیکن معنی وہ یہ مراد لیتے ہیں کہ یہ زمین تو کچھ اگاتی ہی نہیں۔

اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ نے پہلا معنی ہی مراد لیا ہے راقم نے بھی وہی نقل کیا ہے علامہ رازی رحمہ اللہ نے بھی اسے ہی ترجیح دی اور فرمایا " والوجه الاول اولى " پہلا معنی ہی زیادہ بہتر ہے۔ کیونکہ اسے رب تعالیٰ کے دوسرے ارشاد گرامی سے تائید حاصل ہے۔

﴿ بَلْ طَبَعَ اللهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُونَ إِلَّا قَلِيلًا ﴾

''بلکہ اللہ تعالیٰ نے مہر لگا دی ان (کے دلوں) پر تو نہیں ایمان لاتے مگر تھوڑے''

کیونکہ اس آیۂ کریمہ میں تھوڑے ایمان لانے والوں کا ہی ذکر ہے۔ (از کبیر)

اور پہلے معنی کو ہی تفسیر کواشی میں بھی ترجیح دی گئی۔

" وفی الکواشی ما زائدة ای وقلیلا یؤمنون لا ن مؤمنی المشرکین اکثر من مؤمنی الیھود " (شیخ زادہ)

تفسیر کواشی میں ذکر کیا گیا ہے " ما " زائد ہے یعنی تھوڑے ہی ایمان لاتے ہیں کیونکہ مشرکین سے زیادہ لوگوں نے ایمان قبول کیا اور یہود سے تھوڑے لوگوں نے ایمان قبول کیا۔

﴿ وَلَمَّا جَاءَهُمْ كِتَابٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ وَكَانُوْا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَلَمَّا جَاءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ﴾

۱) "اور جب ان کے پاس اللہ کی وہ کتاب (قرآن) آئی جو ان کے ساتھ والی کتاب (توراۃ) کی تصدیق فرماتی ہے اور اس سے پہلے وہ اس نبی کے وسیلہ سے کافروں پر فتح مانگتے تھے تو جب تشریف لایا ان کے پاس وہ جانا پہچانا اس سے منکر ہو بیٹھے تو اللہ کی لعنت منکروں پر"۔

۲) "اور جب آئی ان کے پاس کتاب اللہ کی طرف سے جو تصدیق کرتی ہے اس کی جو ان کے پاس ہے اور وہ تھے اس سے پہلے فتح طلب کرتے ان لوگوں پر جو کافر ہوئے۔ تو جب آئے ان کے پاس وہ جن کو پہچانتے تھے کفر کیا انہوں نے ان سے تو لعنت ہے اللہ کی کافروں پر"۔

یہاں سے ایک اور نعمت اور بنی اسرائیل کا اپنی عادت کے مطابق انکار کرنے کا ذکر کیا جا رہا ہے۔

بنی اسرائیل نبی کریم ﷺ کی تشریف آوری سے پہلے آپ کے وسیلہ سے جنگ میں دعا کرتے تو اللہ تعالیٰ ان کو فتح عطا فرماتا یہ ان کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے عظیم نعمت تھی۔ لیکن جب آپ تشریف لائے تو بنی اسرائیل نے اپنی کتاب میں آپ کے بیان کئے ہوئے اوصاف سے آپ کو پہچان بھی لیا، لیکن پھر بھی آپ کی نبوت کو تسلیم نہ کیا انکار کیا، جس کی وجہ سے وہ کافر ہوئے اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنی لعنت کا مستحق قرار دیا۔

﴿ وَلَمَّا جَآءَهُمْ كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ﴾: ''اور جب آئی ان کے پاس کتاب اللہ کی طرف سے'' اس آیۃ کا عطف ہے ﴿ وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ﴾ پر۔ ''کتاب'' سے مراد قرآن پاک ہے اس کی تنکیر یعنی تنوین تعظیم پر دلالت کر رہی ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ جب آئی ان کے پاس عظیم کتاب یقیناً سب سے عظیم کتاب قرآن پاک ہی ہے۔

'' ووصفه بما عنده للتشريف والايذان بانه جدير بان يقبل ما فيه ويتبع لانه من خالقهم والههم الناظر في مصالحهم ''

پھر کتاب کا وصف یہ ذکر فرمایا کہ وہ اللہ کی طرف سے ہے، اس سے کتاب اور بزرگی، برتری کا ذکر فرمایا اور اسی سے واضح طور پر یہ پتہ چل گیا کہ یہ کتاب جب عظیم کتاب ہے اور رب تعالیٰ کی طرف سے آئی ہے جو ان کا خالق ہے اور ان کا معبود ہے وہ اپنے بندوں کی مصلحتوں کو نظر میں رکھتا ہے تو انہیں بھی چاہئے کہ وہ کتاب کے احکام پر عمل کریں اور اس کے تمام احکام کی حقانیت کو تسلیم کریں۔

﴿ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ ﴾ ''تصدیق کرنے والی ہے اس کی جو ان کے پاس ہے'' یہ کتاب کی دوسری صفت ہے۔ البتہ پہلی صفت ﴿ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ﴾ کو پہلے ذکر فرمایا اس لئے کہ کتاب کا اللہ کی طرف سے ہونا اس پر دلالت کرتا ہے کہ یہ صفت پہلے درجہ کی ہے۔ اور دوسری صفت کا درجہ بھی بعد میں ہے کہ رب تعالیٰ نے اس کتاب کو اپنی طرف سے نازل فرمایا اور پہلی کتب کی تصدیق کرنے والی بنایا۔

(از روح المعانی)

﴿ لِمَا مَعَهُمْ ﴾ يعني التوراة والانجيل يخبرهم بما فيها '' قرآن پاک تصدیق کرنے والا ہے جو ان کے پاس تو راۃ اور انجیل ہیں ان کی۔ یعنی ان کو خبر دیتا ہے کہ جو تمہارے پاس اللہ کی کتابیں ہیں ان میں کیا ہے۔ اس طرح تمہیں قرآن پاک کے ہونے میں بلاشبہ ایمان لانا چاہئے۔

(از قرطبی)

'' مصدق لما معهم في امر يتعلق بتكليفهم بتصديق محمد ﷺ في النبوة ''

نبی کریم ﷺ کے اوصاف اور آپ کی نبوت اور آپ پر ایمان لانے کا ذکر تو راۃ وانجیل میں تھا قرآن پاک نے بھی اس کی تصدیق فرمائی گویا کہ قرآن پاک دلائل نبوت میں ان کی کتب کے موافق

ہے۔ہاں البتہ خیال یہ رہے " انہ لیس بموافق لما معھم فی سائر الشرائع " کہ قرآن پاک پہلی کتب کے تمام احکام شرائع میں ان کے موافق نہیں، بلکہ پہلی کتب کے کئی احکام کو قرآن پاک نے منسوخ فرمایا۔

" والمراد ان موافقته لکتبھم فیما یختص بالنبوۃ وما یدل علیھا من العلامات والنعوت والصفات "

قران پاک پہلی کتب کے ان چیزوں میں موافق ہے جو نبوت کے ساتھ خاص ہیں اور نبوت پر دلالت کرنے والی علامت اور صفات ہیں۔ (از کبیر)

﴿ وَكَانُوْا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ﴾ ان الفاظ مبارکہ کے نزول میں چند وجہ بیان کی گئی ہیں۔راقم کے نزدیک وہ تمام ہی معتبر ہیں، ان میں کوئی تعارض نہیں کسی کے انکار کی ضرورت نہیں۔

" احدھا ان الیھود من قبل مبعث محمد علیه السلام ونزول القرآن کانوا یستفتحون ای یسألون الفتح والنصرۃ وکانوا یقولون ، اللھم افتح علینا وانصرنا بالنبی الامی "

ایک وجہ سے شان نزول یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کی بعثت (اعلان نبوت) سے پہلے اور قرآن پاک کے نازل ہونے سے پہلے یہود فتح ونصرت نبی کریم ﷺ کے وسیلہ سے طلب کرتے تھے اور یہ دعا کرتے تھے"اے اللہ ہمیں امی نبی کے وسیلہ سے فتح ونصرت عطا فرما۔

(از کبیر)

جب یہود اور مشرکین کے درمیان سخت لڑائی ہوتی تو یہود توراۃ کو اپنے ہاتھوں میں لے کر رب تعالیٰ کے حضور عرض کرتے:

" اللھم انا نسألک بحق نبیک الذی وعدتنا ان تبعثه فی آخر الزمان ان تنصرنا الیوم علی عدونا فینصرون "

اے اللہ بیشک ہم تجھ سے سوال کرتے ہیں تیرے نبی کے واسطے جس کا تو نے ہم سے وعدہ کیا ہے کہ تو ان کو آخر زمانہ میں مبعوث فرمائے گا کہ تو آج ہماری امداد فرما کہ ہم دشمن پر غالب آجائیں تو اللہ ان کی امداد فرماتا۔ (از روح المعانی)

" یعنی طلب فتح ونصرت میکر دند از جناب الهیٰ بنام ایں پیغمبر ومیدانستند کہ نام او ایں قدرٔ برکت دارد کہ بسبب ذکر آں وتوسلی باں فتح ونصرت حاصل میشود "

یعنی یہود نبی کریم ﷺ کا نام رب تعالیٰ کے حضور پیش کرنے فتح ونصرت طلب کرتے تھے اور وہ جانتے تھے کہ اس نام میں بڑی برکت ہے کہ اس کے ذکر کی وجہ فتح ونصرت حاصل ہوتی ہے۔

ابونعیم، بیہقی اور حاکم نے روایت بیان کی کہ وہ یہ دعا کرتے تھے۔

" اللھم ربنا انا نسألک بحق احمد النبی الامی الذی وعدتنا ان تخرجہ لنا فی آخر الزمان وبکتابک الذی تنزل علیہ آخر ما ینزل ان تنصرنا علی اعدائنا "

اے اللہ اے ہمارے بیشک ہم تجھ سے نبی امی حضرت محمد ﷺ کے وسیلہ سے سوال کرتے ہیں جن کو تو نے آخر زمانہ میں مبعوث کرنا ہے اور تیری اس کتاب کے وسیلہ سے تجھ سے دعا کرتے ہیں جس کتاب کو تو نے آخری نبی پر نازل کرنا ہے کہ تو ہمارے دشمنوں کے مقابل ہماری امداد فرما۔ (از عزیزی)

" یستفتحون ای یستنصرون ، والاستفتاح الاستنصار " وہ لوگ امداد طلب کرتے تھے استفتاح کا معنی استنصار (یعنی امداد طلب کرنا) آتا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ یہود کو جب کبھی شکست ہوئی تو انہوں نے رب تعالیٰ کے حضور یہ دعا فرمائی:

" انا نسئلک بحق النبی الامی الذی وعدتنا ان تخرجہ لنا فی آخر الزمان الا تنصرناعلیھم "

بیشک ہم تجھ سے سوال کرتے ہیں نبی امی کے واسطہ سے جن کو آخر زمانہ میں مبعوث کرنے کا تو نے ہمارے ساتھ وعدہ کیا ہے کہ تو ہماری امداد فرما۔ (از قرطبی)

علامہ بیضاوی اور مظہری وغیرہما نے بھی یہی معنی درج کیا ہے لیکن افسوس کہ آج کل کے مفسرین جو رسول اللہ ﷺ کی محبت سے دور ہیں انہوں نے اپنی اردو تفاسیر میں اس معنی کو نقل نہیں کیا۔ اصل ان کو اللہ تعالیٰ کی عظمت وکبریائی کا پتہ تو نہیں ہے نبی کریم ﷺ کے وسیلہ سے دعا کرنا ان کو پسند نہیں لیکن نبی کریم ﷺ کی شان چھپانے سے چھپ نہیں سکتی۔

وسیلہ کے متعلق ارشادات مصطفوی:

" کان النبی ﷺ یستفتح بصعالیک المهاجرین ای یستنصر بدعائهم وصلوتهم"

نبی کریم ﷺ غریب مہاجرین سے امداد طلب کرتے تھے یعنی ان کی دعاؤں اور ان کو نمازوں کے وسیلہ سے رب تعالیٰ کے حضور دعا فرماتے وہ فتح سے نواز دیتا۔

☆ " روی النسائی عن ابی سعید الخدری ان النبی ﷺ قال انما نصر الله هذه الامة بضعفائها بدعوتهم و صلاتهم و اخلاصهم"

حضرت ابو سعید خدری ؓ فرماتے ہیں بیشک نبی کریم ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ اس امت پر اس کے ضعیف لوگوں کی دعاؤں اور نمازوں اور خلوص سے امداد فرماتا ہے۔

☆ " وروی النسائی ایضا عن ابی الدرداء قال سمعت رسول الله ﷺ یقول ابغونی الضعیف فانکم انما ترزقون وتنصرون بضعفائکم"

حضرت ابو الدرداء ؓ فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا مجھے غریب لوگوں میں تلاش کرو، بیشک تمہیں رزق دیا جاتا ہے اور تمہاری امداد کی جاتی ہے تمہارے غریب لوگوں کے وسیلہ سے ہی۔

☆ عن ابی سعید الخدری عن النبی ﷺ قال یأتی علی الناس زمان یغزو فئام من الناس فیقال لهم فیکم من رأی رسول الله ﷺ فیقولون نعم فیفتح لهم ثم یغزو فئام من الناس فیقال لهم هل فیکم من رأی من صحب رسول الله ﷺ فیقولون نعم فیفتح لهم ثم یغزو فئام من الناس فیقال لهم فیکم من رأی من صحب من صحب رسول الله ﷺ فیقولون نعم فیفتح لهم"
(مسلم ج ۲ ص ۳۱۶ باب فضل الصحابة ثم الذین یلونهم ثم الذین یلونهم)

حضرت ابو سعید خدری ؓ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا لوگوں پر ایک زمانہ آئے گا کہ (مسلمانوں کا) لشکر جہاد کرے گا تو ان سے پوچھا جائے گا کیا تم میں کوئی صحابی بھی ہے؟ وہ کہیں گے ہاں ہم میں صحابی ہیں تو صحابی کی برکت سے ان کو فتح حاصل ہو جائے گی۔ پھر ایک لشکر جہاد کرے گا تو

ان سے پوچھا جائے گا کیا تم میں کوئی ایسا شخص بھی ہے جس نے رسول اللہ ﷺ کے صحابی کو (حالت ایمان میں) دیکھا ہو؟ وہ کہیں گے ہاں ہم میں ایسا شخص ہے تو ان کو اس تابعی کی برکت سے فتح حاصل ہوگی۔ پھر ایک لشکر جہاد کرے گا ان سے پوچھا جائے گا کیا تم میں سے ایسا شخص ہے جس نے رسول اللہ ﷺ کے صحابی کے صاحب (تابعی) کو دیکھا ہو؟ تو وہ کہیں گے ہاں ہم میں ایسا شخص (تبع تابعی) موجود ہے تو ان کو اس تبع تابعی کے وسیلہ سے فتح حاصل ہوگی۔

دوسری وجہ شان نزول کی:

"نزلت فی بنی قریظة والنضیر کانوا یستفتحون علی الاوس والخزرج برسول اللہ ﷺ قبل المبعث"

یہ آیت بنی قریظہ اور بنی نضیر کے متعلق نازل ہوئی کہ وہ اوس اور خزرج پر رسول اللہ ﷺ کی بعثت سے آپ کے وسیلہ سے فتح طلب کرتے تھے۔

تیسری وجہ:

"کانوا یقولون لمخالفیهم عند القتال هذا نبی قد اظل زمانه ینصرنا علیکم"

بنی اسرائیل اپنے مخالفین کو لڑائی کے وقت بتاتے تھے کہ اب آخر الزمان نبی کا زمانہ قریب آچکا ہے وہ جب تشریف لے آئیں گے تو تمہارے خلاف ہماری امداد کریں گے۔

چوتھی وجہ:

"کانوا یسالون العرب عن مولده ویصفونه بانه نبی من صفته کذا وکذا ویتفصحون عنه علی الذین کفروا ای علی مشرکی العرب"

بنی اسرائیل مشرکین عرب سے نبی کریم ﷺ کی ولادت کے متعلق سوال کرتے رہتے تھے کہ وہ آخر الزمان نبی ان ان صفات والے ہیں کیا وہ پیدا ہو چکے ہیں؟ (از کبیر بتغیر الترتیب)

تنبیہ: ان میں پہلی دو وجہ میں امداد طلب کرنا، فتح طلب کرنے کا معنی پایا گیا ہے جو زیادہ واضح معنی وہی ہے اور چوتھی وجہ میں "یستفتحون" کا معنی پوچھنا، وضاحت طلب کرنا ہے۔

لیکن دوسری وجہ میں معنی بیان کرنا لیا گیا ہے کہ وہ اپنے مخالفین سے بیان کرتے تھے کہ جب نبی کریم ﷺ تشریف لائیں گے تو وہ تمہارے خلاف ہماری امداد فرمائیں گے۔

﴿ یَسۡتَفۡتِحُوۡنَ ﴾ کا یہ معنی کیسے لیا گیا ہے؟ جس میں طلب والا معنی نہیں۔ اس کے متعلق مظہری، روح المعانی، بیضاوی وغیرہ میں بیان کیا گیا ہے جس سے واضح ہو جاتا ہے کہ کیا مطلب ہے عبارت بیضاوی کی ملاحظہ ہو۔

"او یفتحون علیھم ویعرفونھم ان نبیا یبعث فیھم وقد قرب زمانہ والسین للمبالغة"

﴿ یَسۡتَفۡتِحُوۡنَ ﴾ کا معنی یا تو یہ ہے کہ وہ ان پر واضح طور پر کھول کر بیان کرتے اور ان کی پہچان کراتے کہ بیشک آخر الزمان نبی مبعوث ہونے ہی والے ہیں ان کا زمانہ قریب آ چکا ہے۔

بظاہر وہم تھا کہ باب استفعال میں ''سین'' طلب کے لئے آتا ہے۔ تو یہاں ''سین'' کا کوئی معنی نہیں تو اس کا جواب دیا گیا کہ اس معنی کے لحاظ سے ''سین'' مبالغہ کے لئے ہے۔ یعنی معنی یہ ہوا کہ وہ بہت واضح طور پر بیان کرتے ہیں اور بہت واضح پہچان کراتے ہیں۔

تمام معانی یک جا جمع کریں: اگر غور و فکر کیا جائے۔ اور تمام معانی کو جمع کر لیا جائے تو قرآن پاک کی عظمت سمجھ میں آئے گی کہ کیسی عظمت والی یہ کتاب ہے جس کے ایک ایک لفظ میں معانی و مطالب کے دریا موجزن ہیں۔ نبی کریم ﷺ کی تشریف آوری سے پہلے بنی اسرائیل کفار کے مقابل جنگ میں آپ کے وسیلہ سے فتح طلب کرتے تو ان کو فتح دی جاتی اور یہود کے خاص قبائل بنو قریظہ اور بنو نضیر جب اوس اور خزرج کے مقابلہ میں آپ کے وسیلہ سے فتح طلب کرتے تو ان کو فتح دی جاتی۔ آپ کی تشریف آوری سے پہلے وہ آپ کے منتظر رہتے تھے مکہ کے مشرکین سے طلب کرتے رہتے تھے کیا ان صفات کا کوئی بچہ تو پیدا نہیں ہوا۔ اور وہ کفار کو بتاتے رہتے تھے کہ آخر الزمان نبی تشریف لانے والے ہی ہیں جب وہ تشریف لائیں گے تو وہ بھی ہماری امداد فرمائیں گے۔ جب وہ نبی تشریف لائے تو انہوں نے پہچاننے کے باوجود ان کا اقرار کر دیا۔

راقم کی اس وضاحت کے بعد اگر آپ انصاف کی نظر سے دیکھیں گے تو واضح ہو جائے گا کہ نبی کریم ﷺ کے وسیلہ سے فتح طلب کرنے کو نہ ذکر کرنا اور چھپانا بھی بے انصافی ہے۔ اور

"یستفتحون" کو "یفتحون" (بیان کرنا) کے معنی میں لینے کو رد کرنا بھی زیادتی ہے۔

﴿ فَلَمَّا جَاءَ هُمْ مَّا عَرَفُوْا ﴾: "ما" موصولہ ہے جاء کا فاعل ہے اور عائد محذوف ہے:

"ای ما عرفوہ یعنی محمدا ﷺ عرفوہ بنعتہ فی التوراۃ"

یعنی انہوں نے اس ذات یعنی محمد ﷺ کو پہچان لیا کیونکہ ان کی صفات توراۃ میں موجود تھیں جو ان لوگوں نے پڑھی ہوئی تھیں اور جانتے تھے۔ (مظھری)

﴿ كَفَرُوْا بِهٖ ﴾: "انہوں نے کفر کیا آپ سے" یعنی ان کے کفر کی وجہ ان کا حسد اور اپنے مال کی آمد اور ریاست کے زوال کا خطرہ ان کے کفر کا سبب تھا۔ پہچاننے کی باوجود انہوں نے انکار کر دیا۔

﴿ فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكَافِرِيْنَ ﴾ "تو اللہ کی لعنت ہے کافروں پر" یعنی ان کا نبی کریم ﷺ کا انکار کرنا ایمان نہ لانا صریح کفر تھا اور کافر لعنت کے مستحق ہوتے ہیں۔

تنبیہ: "فالمراد الابعاد من خیرات الآخرۃ لان البعد من خیرات الدنیا لا یکون ملعونا"

کافروں پر لعنت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو آخرت کی مہربانیوں اور بھلائیوں سے دور کر دیا اس لئے کہ دنیا کی بھلائی سے دور رہنے والے کو ملعون نہیں کہتے۔ (از کبیر)

بلکہ فقیر و غریب اللہ تعالیٰ کی کامل رحمت کے مستحق ہوتے ہیں اور ان کی برکت سے دوسروں کو بھی رزق ملتا ہے۔

اعتراض: رب تعالیٰ نے جب یہ فرمایا ﴿ وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا ﴾ اور کہو لوگوں سے اچھی بات اور یہاں فرمایا ﴿ فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكَافِرِيْنَ ﴾ اللہ کی لعنت ہو کافروں پر۔ ان دونوں میں تطبیق کیسے ممکن ہے کہ اچھی بات بھی کرو اور ان پر لعنت بھی بھیجو لعنت کیسے اچھی بات ہے؟

جواب: "ان لعن من یستحق اللعن من القول الحسن" بیشک وہ شخص جو لعنت کا مستحق ہے اس پر لعنت بھیجنا اس کے حق میں اچھی بات ہی ہے۔ (از کبیر)

اعتراض: آیۃ کریمہ سے پتہ چلتا ہے کہ یہود نبی کریم ﷺ کی نبوت کو پہچانتے تھے کیونکہ توراۃ میں اس کا ذکر تھا۔ اب اس میں دیکھنا یہ ہے کہ توراۃ میں نبی کریم ﷺ کی نبوت کا تفصیلی ذکر تھا۔ یا اجمالی۔

اگر تفصیلی ذکر تھا کہ فلاں شخص فلاں صورت سے متصف ہوں گے ان کی سیرت یہ ہوگی فلاں سال میں تشریف لائیں گے فلاں جگہ پر تشریف لائیں گے تو انکار کی گنجائش باقی نہیں رہتی کیونکہ توراۃ تو اتر سے منقول ہو رہی تھی۔ تو کس طرح ان تمام نے انکار کیا۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ توراۃ میں نبی کریم ﷺ کا اجمالی طور پر ذکر تھا تو یہ کہنا کیسے صحیح ہے کہ انہوں نے آپ کو پہچان لیا۔

جواب : توراۃ میں نبی کریم ﷺ کے اوصاف اجمالی طور پر ذکر تھے اس طرح ان میں تفصیل نہیں تھی کہ آپ کی تعیین ہو جاتی۔ البتہ نبی کریم ﷺ کے معجزات کے ذریعے ان صفات کو تاکید حاصل ہو گئی۔ اب ان کا انکار کرنا گویا کہ کامل پہچاننے کے بعد انکار تھا۔ (از کبیر)

ضیاء النبی سے اقتباسات : مفسر قرآن مفکر اسلام حضرت پیر محمد کرم شاہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔

علامہ ابن جوازی رقم طراز ہیں:

" وقال لهم معاذ بن جبل ولبشر بن البراء اتقوا الله واسلموا قد كنتم تستفتحون علينا بمحمد ﷺ وانا اهل شرك تخبرونا انه مبعوث وتصفونه لنا بصفته فقال سلام بن مشكم ما هو بالذى كنا نذكر لكم ماجاء نا بشئى نعرفه " (الوفاء ج اول ص ۴۴)

معاذ بن جبل اور بشر بن براء رضی اللہ عنہما نے فرمایا اے گروہ یہود اللہ سے ڈرو اور اسلام قبول کرو۔ تمہیں وہ بات بھول گئی جب ہم مشرک تھے تو تم حضور ﷺ کے وسیلہ سے ہم پر فتح حاصل کرتے تھے اور ہمیں بتاتے تھے کہ وہ مبعوث ہونے والے ہیں اور ان کی صفات کے بارے میں بھی ہمیں بتایا کرتے تھے سلام بن مشکم نے کہا نہیں یہ وہ نہیں ہیں جن کا ہم ذکر کرتے تھے یہ کوئی ایسی چیز لے کر نہیں آئے جسے ہم جانتے ہوں۔

حقیقت کے اس کھلے انکار کو بجز حسد اور بغض باطنی کے اور کیا کہا جا سکتا ہے۔ (ضیاء النبی ج اول ص ۴۹۵)

حضور ﷺ کا ذکر خیر توراۃ وانجیل میں:

عطاء بن یسار سے مروی ہے آپ کہتے ہیں میری ملاقات حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص ﷺ سے ہوئی میں نے کہا حضور کی جن صفات کا ذکر خیر توراۃ میں آیا ہے ان سے مجھے آگاہ فرمایئے۔ آپ نے کہا بیشک توراۃ میں حضور کی وہی صفات بیان کی گئی ہیں جو قرآن میں بیان ہیں۔ پھر آپ نے

توراۃ کی مندرجہ ذیل آیۃ تلاوت کی۔

﴿یا ایھا النبی انا ارسلناک شاھدا ومبشرا ونذیرا﴾ وحرزا للامیین انت عبدی ورسولی سمیتک المتوکل لست بفظ ولا غلیظ ولا صخاب فی الاسواق ولا تجزی بالسیئة السیئة ولکن تعفو وتغفر ولن یقبضه الله حتی یقیم به الملة العوجاء بان یقولوا لا اله الا الله فیفتح به اعیان عمیا و آذنا صما وقلوبا غلفا (انفرد باخراجه البخاری)

توراۃ کی آیۃ کا ترجمہ: اے نبی ہم نے بھیجا ہے آپ کو گواہ بنا کر، خوشخبری دینے والا، بروقت ڈرانے والا امیوں کے لئے جائے پناہ، تو میرا بندہ ہے اور میرا رسول ہے میں نے تیرا نام المتوکل رکھا ہے نہ تو درشت خو ہے نہ سخت دل اور نہ بازاروں میں شور مچانے والا ہے تو برائی کا بدلہ برائی سے نہیں دیتا بلکہ معاف کر دیتا ہے اور بخش دیتا ہے اللہ تعالیٰ آپ کو اپنی طرف نہیں بلائے گا یہاں تک ایک ٹیڑھی ملت کو آپ کو ذریعے درست کر دے اور وہ سب کہنے لگیں " لا اله الا الله " اللہ تعالیٰ آپ کے ذریعہ سے اندھی آنکھوں کو بینا بہرے کانوں کو شنوا (سننے والا) غلافوں میں لپٹے ہوئے دلوں کو نور ہدایت سے منور کر دے۔

(الوفا لابن الجوزی جلد اول ص ۳۷، ضیاء النبی جلد اول ص ۲۹۲)

نبی کریم ﷺ کو پہچاننے کے باوجود انکار کے ایک مثال:

علامہ ابن قیم لکھتے ہیں حضرت صفیہ (جن کو بعد میں ام المؤمنین بننے کا شرف حاصل ہوا) یہ حیی بن اخطب رئیس یہود کی بیٹی تھیں ان کے چچا کا نام ابویاسر بن اخطب تھا، آپ کہتی ہیں کہ میرے والد اور میرے چچا تمام بچوں سے زیادہ میرے ساتھ محبت کرتے تھے جب بھی میں ان سے ملاقات کرتی تو مجھے اٹھا کر سینے سے لگا لیتے۔ جب اللہ کے پیارے رسول قبا میں تشریف لائے اور بنی عمرو بن عوف کے محلّہ میں قیام فرمایا تو میرا والد اور میرا چچا صبح اندھیرے منہ حضور کی خدمت میں حاضر ہونے کے لئے گئے اور سورج غروب ہونے کے بعد واپس لوٹے جب وہ واپس آئے میں نے محسوس کیا وہ تھکے ہوئے ہیں۔ افسردہ خاطر (پریشان دل) ہیں اور بڑی مشکل سے ہولے ہولے چل رہے ہیں میں نے حسب معمول ان کو محبت بھرے کلمات سے مرحبا کہا لیکن ان دونوں میں سے کسی نے میری طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا میں نے اپنے چچا ابویاسر کو اپنے باپ سے یہ کہتے ہوئے سنا کیا یہ وہی ہیں؟

اس نے کہا بیشک خدا کی قسم، پھر چچا نے پوچھا کیا تم نے ان کو توراۃ میں بیان کردہ نشانیوں اور

صفات سے پہچان لیا ہے؟ اس نے جواب دیا بیشک خدا کی قسم پھر چچا نے پوچھا بتاؤ اب کیا خیال ہے؟

میرے باپ نے جواب دیا:

" عداوته و اللہ ما بقیت " خدا کی قسم جب تک زندہ رہوں گا ان سے عداوت کرتا رہوں گا۔

(ھداۃ الحیاری ابن قیم ص ۴۰ ضیاء النبی جلد اول ص ۷۹۴ سیرت ابن ھشام ج ۲)

﴿بِئْسَمَا اشْتَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ اَنْ يَّكْفُرُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بَغْيًا اَنْ يُّنَزِّلَ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَاۗءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۚ فَبَاۗءُوْ بِغَضَبٍ عَلٰي غَضَبٍ ۭ وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ﴾

۱) "کس برے مولوں انہوں نے اپنی جانوں کو خریدا کہ اللہ کے اتارے سے منکر ہوں اس کی جلن سے کہ اللہ اپنے فضل سے اپنے جس بندے پر چاہے وحی اتارے تو غضب پر غضب کے سزاوار ہوئے اور کافروں کے لئے ذلت کا عذاب ہے"۔

۲) "کتنی ہی بری چیز ہے کہ بیچا انہوں نے اس کے بدلے اپنی جانوں کو کہ وہ ان کا کفر کرنا ہے اس چیز کے ساتھ جو نازل فرمائی اللہ نے اس حسد سے کہ نازل کرتا ہے اللہ اپنے فضل سے جس پر چاہے اپنے بندوں سے تو وہ مستحق ہوئے غضب کے ساتھ غضب پر۔ اور کافروں کے لئے عذاب ہے ذلت کا"۔ (آیت ۹۰)

نبی کریم ﷺ پر اللہ تعالیٰ کے فضل سے وحی کا نازل ہونا حقیقت میں تمام انسانوں کے لئے نعمت تھی کہ وہ آپ پر ایمان لاکر " خیر الامۃ " (بہتر امت) بن جائیں۔ یہود کے لئے خصوصا نعمت تھی کہ وہ تو آپ کی انتظار کر رہے تھے لیکن وہ حسد اور سرکشی کی وجہ سے اس کو برداشت نہ کر سکے، انہوں نے کفر اختیار کیا اپنی جانوں پر عذاب کی پرواہ نہ کی تو گویا کہ انہوں نے کفر کو حاصل کیا اور اس کے بدلہ میں اپنی جانوں کو عذاب کے حوالے کر دیا۔

اس طرح انہوں نے پہلے بھی عیسیٰ علیہ السلام سے کفر کیا اب پھر نبی کریم ﷺ سے کفر کیا تو وہ غضب

پر غضب کے مستحق ہوئے۔اور انہوں نے اپنے آپ کو کفر کی وجہ غضب کا مستحق ٹھہرایا اور پھر نبی کریم ﷺ کے ساتھ حسد کر کے اپنے آپ کو اور زیادہ غضب کا مستحق بنا لیا۔اس طرح وہ غضب پر غضب کے مستحق ہوئے جس کی وجہ سے وہ ذلت وخواری کے عذاب میں مبتلاء ہونے کے لائق ہو گئے۔

﴿ بِئْسَمَا اشْتَرَوْا بِهٖۤ اَنْفُسَهُمْ ﴾ : ''کتنی ہی بری چیز ہے کہ بیچا انہوں نے اس کے بدلے اپنی جانوں کو'' ''بئس'' فعل ذم ہے اس میں ضمیر مستتر اس کا فاعل ہے ما نکرہ ہے شئی کے معنی میں ہے جو تمیز ہے اور ﴿ اِشْتَرَوْا ﴾ اس کی صفت ہے۔ ﴿ اِشْتَرَوْا ﴾ کے دونوں معنی آتے ہیں بیچنا اور خریدنا زیادہ مفسرین کرام نے بیچنے والا معنی پسند کیا ہے تاہم علامہ رازی رحمہ اللہ نے خریدنے والا معنی راجح قرار دیا۔

﴿ اَنْ یَّكْفُرُوْا بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ ﴾ : ''وہ ان کا کفر کرنا ہے اس چیز کے ساتھ جو نازل فرمائی اللہ نے'' یہ جملہ مخصوص بالذم ہے جو مبتداء محذوف کی خبر ہے وہ ہے ''ھو''

اب توجہ فرمائیں کہ یہاں تک جو ذکر کیے گئے الفاظ مبارکہ کا مطلب کیا ہے کچھ وضاحت کی جاتی ہے۔جب ﴿ اِشْتَرَوْا ﴾ کو''بیع''(بیچنے) کے معنی میں لیا جائے تو اس کا مطلب سمجھنے کے لئے پہلے یہ سمجھا جائے کہ مکلّف کو ایمان لانے کا حکم دیا گیا تا کہ ایمان اسے جنت میں پہنچانے کا ذریعہ بن جائے۔تو یقیناً کفر اسے آگ تک پہنچائے گا۔

جب انسان کسی ایک کو اختیار کرے گا تو اس کی حیثیت یہ ہوگی ''اختیار تملک سلعة علی سلعة'' سامان کے بدلے سامان کی ملکیت کو اختیار کرنے کی جو حیثیت ہے۔جب کوئی شخص ایمان حاصل کر کے نجات اور کامیابی حاصل کر لے تو اس وقت کہا جاتا ''نعم ما اشتری'' (اچھی چیز اس نے خریدی) یعنی اچھی چیز کو حاصل کیا۔اور اگر کوئی شخص کفر کو اختیار کر کے اپنی عاقبت برباد کر دے اور عذاب کا مستحق ہو جائے تو کہا جاتا ہے ﴿ بِئْسَمَا اشْتَرٰی ﴾ اس نے بری چیز خریدی۔

اب واضح ہوا کہ ﴿ اِشْتَرَوْا ﴾ کا معنی جب بیچنے والا لیا جائے تو ﴿ بِئْسَمَا اشْتَرَوْا بِهٖۤ اَنْفُسَهُمْ ﴾ کا معنی یہ ہوگا ''باعوا نفسهم بكفرهم'' بری ہے وہ چیز کہ انہوں نے اپنی جانوں کو کفر

کے بدلے بیچ دیا۔ ان کے اس سودے کو بری چیز کہا گیا ہے اس کی وجہ یہ ہے:

" لان الذی حصلوه علی منافع انفسهم لما کان الکفر صاروا بائعین انفسهم بذلک "

کہ انہوں نے اپنے نفسوں کے منافع کے خلاف کفر کو اختیار کیا تو گویا کہ وہ اپنے نفسوں کو کفر کے بدلے بیچنے والے ہوئے۔ یہ سودا ان کا یقیناً نقصان والا سودا تھا کہ منافع کے بدلے عذاب حاصل کیا تو یہ کتنی ہی بری چیز ہے۔ (از کبیر)

اس معنی کو راجح سمجھتے ہوئے علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے بیان فرمایا:

" ای باعوا فالانفس بمنزلة المثمن والکفر بمنزلة الثمن لان انفسهم الخبیثة لاتشتری بل تباع "

﴿اِشْتَرَوْا﴾ کا معنی یہ ہے انہوں نے بیچا ان کی جانیں مبیع (جس چیز کو بیچا جائے) کے درجہ میں ہیں۔ اور کفر ثمن (یعنی بطور قیمت طے شدہ مال) کے درجہ میں ہے۔ انہوں نے اپنی جانوں کو کفر کے بدلے بیچ دیا۔ یہ معنی کرنا بہتر کیوں ہے اس لئے کہ خبیث نفوس کو خریدا تو نہیں جاسکتا البتہ ان کو بیچا جاسکتا ہے۔ (روح المعانی)

لیکن علامہ رازی رحمہ اللہ خریدنے والے معنی کو راجح سمجھ کر بیان کرتے ہیں کہ اشتراء کا معنی اس مقام پر "خریدنا" " هو الاصح عندی " وہ میرے نزدیک زیادہ صحیح ہے اس لئے کہ مکلّف جب اللہ تعالیٰ کے عذاب کا اپنے نفس پر خوف رکھتا ہے تو وہ ایسے کام کرتا ہے جو اس کے گمان کے مطابق اسے عذاب سے بچانے کا ذریعہ ہوتے ہیں۔ اس صورت میں یہ کہا جائے گا " فکانه اشتری نفسه بتلک الاعمال " گویا کہ اس نے اپنی جان کو ان اعمال کے ذریعے خرید لیا۔

" فهولاء الیهود لما اعتقدوا فیما اتوا به انها تخلصهم من العقاب وتوصلهم الی الثواب فقد ظنوا انهم قد اشتروا انفسهم بها فذمهم الله تعالیٰ "

ان یہود کا بھی جب یہ اعتقاد تھا کہ ہم جو کام کر رہے ہیں اس کے ذریعے اپنے آپ کو عذاب سے چھڑا رہے ہیں اور ثواب حاصل کر رہے ہیں۔ تو انہوں نے اپنے گمان کے مطابق اپنے نفسوں کو اپنے اعمال کے بدلے خریدا چونکہ ان کا گمان باطل تھا۔ جس کام کو وہ ثواب کا ذریعہ اور عذاب سے بچنے

کا ذریعہ سمجھ رہے تھے وہ حقیقت میں ان کے لئے عذاب کا ذریعہ تھا۔ اسی لئے رب تعالیٰ نے ان کی مذمت بیان فرمائی۔ (از کبیر)

﴿ اَنْ یَّکْفُرُوْا بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ ﴾ سے ماقبل کی وضاحت فرمادی کہ وہ بری چیز کیا ہے وہ اللہ تعالیٰ نے جو نازل فرمایا اس سے کفر کرنا ہے۔

" ولا شبهة ان المراد بذلک کفرهم بالقرآن لان الخطاب فی الیهود و کانوا مؤمنین بغیره "

یہود چونکہ اللہ تعالیٰ اور قیامت کے دن اور فرشتوں وغیرہ پر ایمان رکھتے تھے صرف وہ قرآن پاک پر ایمان نہیں رکھتے تھے، اسی لئے یہاں ﴿ اَنْ یَّکْفُرُوْا بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ ﴾ ذکر کیا کہ ان کا کفر اس چیز سے تھا جس کو رب تعالیٰ نے اتارا۔ مراد اس سے قرآن پاک ہی ہے۔ (از کبیر)

﴿ بَغْیًا اَنْ یُّنَزِّلَ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ عَلٰی مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ﴾:

''اس حسد سے کہ نازل کرتا ہے اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے جس پر چاہے اپنے بندوں میں سے''۔

یہاں سے ان کے کفر کی وجہ بیان کی جارہی ہے کہ وہ لوگ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہونے والے کلام (قرآن) سے کفر کیوں کرتے تھے؟ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اس پر حسد کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہے فضل کر کے اس پر وحی نازل کر دیتا ہے۔

" انهم ظنوا ان هذا الفضل العظیم بالنبوة المنتظرة یحصل فی قومهم فلما وجدوه فی العرب حملهم ذلک علی البغی والحسد "

اصل وجہ ان کے حسد کی یہ تھی کہ وہ اس کے منتظر تھے کہ آخر الزمان نبی ہماری قوم میں آئیں گے۔ جن کی وجہ سے ہمیں رب تعالیٰ کا عظیم فضل حاصل ہوگا۔ لیکن جب نبی کریم ﷺ عرب میں حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی اولاد میں تشریف لے آئے تو وہ آپ سے حسد کرنے لگے اور حد سے تجاوز کرنے لگے۔

(از کبیر)

﴿اَلْبَغْیَ﴾ کا معنی ظلم اور فساد ہے عرب کہتے ہیں " بغی الجرح " زخم فاسد ہو گیا (یعنی زیادہ خراب ہو گیا) " وقیل اصله الطلب " ، البغی '' کا حقیقی معنی ''طلب کرنا'' ہے پھر طلب کی

مختلف قسمیں ہیں۔ اگر کسی کی نعمت کے زوال کی طلب پائی جائے تو" بغی " کا معنیٰ" حسد کرنا" اور اگر کسی پر تجاوز کرنا مطلوب ہو تو" بغی " کا معنیٰ "ظلم کرنا" اور اگر بدکاری کی طلب ہو تو" بغی" کا معنیٰ " فجور " ہوگا۔

" والمراد به هنا بمعونة المقام طلب ما ليس لهم فيؤل الى الحسد "

یہاں آیۃ کریمہ میں" بغی " کا مطلب یہ ہے طلب کرنا اس چیز کا جس کے وہ حقدار نہیں تھے وہ ساتھ ساتھ یہ بھی تمنا کر رہے تھے کہ نبی کریم ﷺ پر اللہ تعالیٰ کا جو فیضان ہے وہ زائل ہو جائے۔ اس لئے بغی کا معنیٰ یہاں "حسد" لیا گیا ہے۔

﴿ وَقِيلَ ﴾ ، الظلم " یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ "بغی" کا یہاں معنیٰ "ظلم" ہے۔ (از روح المعانی)

لیکن راقم کے نزدیک دونوں معانی بیک وقت پائے جاتے ہیں کیونکہ حسد مستلزم ہے ظلم کو۔

تنبیہ : اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ نے " بغیا " کا ترجمہ "جلن" کیا ہے۔ جب کہ مفسرین کرام نے "حسد" معنی بیان کیا ہے درحقیقت "حسد" بھی مجازی معنی ہے اور جلن بھی مجازی معنی ہے راقم کے خیال میں اعلیٰ حضرت نے اس حدیث کو مدنظر رکھتے ہوئے ترجمہ کیا ہے۔

☆ " عن ابی هريرة عن النبی ﷺ قال اياكم الحسد فان الحسد ياكل الحسنات كما تاكل النار الحطب " (رواہ ابو داؤد ، مشكوة باب ما ينهى عنه من التهاجر)

حضرت ابوہریرہ ﷺ نے فرمایا رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے تم اپنے آپ کو حسد سے بچا کر رکھو بیشک حسد نیکیوں کو ایسے کھا جاتا ہے جیسے آگ لکڑیوں کو کھا جاتی ہے۔

اس حدیث شریف میں حسد کو آگ سے تشبیہ دی گئی یعنی کسی کی نعمت کو دیکھ کر دل میں اس طرح جلن پیدا ہوتی ہے جس طرح آگ سے جلن پیدا ہوتی ہے جب وہ دوسرے کی نعمتوں کا زوال طلب کرتا ہے تو وہی جلن اس کی نیکیوں کو جلا کر خاکستر بنا دیتی ہے۔

"واعلم ان هذه الآية تدل على ان الحسد حرام "

"بیشک یہ آیۃ اس پر دلالت کر رہی ہے کہ حسد حرام ہے"۔ (کبیر)

﴿ فَبَآءُوا بِغَضَبٍ عَلٰى غَضَبٍ ﴾ : "تو وہ مستحق ہوئے غضب کے ساتھ غضب پر"

"باء وا" کا حقیقی معنی ہے "رجعوا" وہ لوٹے۔ یہی معنی خازن نے بیان کیا ہے۔ لیکن ابن کثیر نے بیان کیا:

" ومعنی باء وا استوجبوا واستحقوا واستقروا بغضب علی غضب "

" بـاء وا " کا معنی یہ ہے وہ لائق ہوئے، وہ مستحق ہوئے، انہوں نے حاصل کیا۔ اعلیٰ حضرت کا ترجمہ اسی کے مطابق ہے "وہ سزاوار ہوئے" راقم نے بھی اسی کے مطابق تحریر کیا "وہ مستحق ہوئے"۔

بغضب علی غضب کے معانی میں وسعت: پہلے "غضب" اور دوسرے "غضب" کے مختلف مطالب ہیں ان میں کئی وجوہ ہیں یعنی ایک جملہ کے کئی مطالب ہیں۔

" وقال ابو العالیة غضب اللہ علیهم بکفرهم بالانجیل وعیسی ثم غضب اللہ علیهم بکفرهم بمحمد ﷺ وبالقرآن "

(۱) یعنی انہوں نے عیسیٰ علیہ السلام سے کفر کیا تو وہ غضب کے مستحق ہوئے پھر انہوں نے نبی کریم ﷺ سے کفر کیا تو پھر غضب کے مستحق ہوئے۔

(۲) پہلے انجیل سے کفر کرنے کی وجہ سے غضب کے مستحق ہوئے۔ پھر قرآن پاک سے کفر کی وجہ سے غضب کے مستحق ہوئے۔

(۳) " قال السدی اما الغضب الاول فهو حین غضب علیهم فی العجل واما الغضب الثانی فغضب علیهم حین کفروا بمحمد ﷺ "

جب انہوں نے بچھڑے کی پوجا کی تو اس وقت وہ غضب کے مستحق ہوئے۔ اور پھر جب انہوں نے نبی کریم ﷺ سے کفر کیا تو غضب کے مستحق ہوئے۔ (ابن کثیر)

زیادہ بہتر یہ ہے:

" لیس المراد اثبات غضبین فقط بل المراد اثبات انواع من الغضب مترادفه لاجل امور مترادفه صدرت عنهم نحو قولهم (عزیر ابن اللہ، ید اللہ مغلولة، ان اللہ فقیر ونحن اغنیاء) وغیر ذلک من انواع کفرهم "

یعنی غضب پر غضب سے مراد صرف دو غضب نہیں۔ بلکہ ان کے کفریات بہت تھے، ہر کفر کی وجہ سے وہ غضب کے مستحق ہوئے، لہٰذا کئی قسم کے کفریات کے وجہ سے کئی قسم کے غضب کے مستحق ٹھہرے۔ ان کے ان گنت کفریات سے تین مثالیں علامہ رازی رحمہ اللہ نے پیش فرمائی ہیں۔

انہوں نے کہا" عزیر ابن الله " حضرت عزیر علیہ السلام اللہ کے بیٹے ہیں۔رب کی اولاد ماننا کفر ہے۔اور انہوں نے کہا" ید الله مغلولة " اللہ کے ہاتھ تنگ ہیں۔معاذ اللہ رب تعالیٰ کو تنگدست کہہ کر وہ کفر کے مرتکب ہوئے۔اور انہوں نے کہا﴿ اِنَّ اللّٰهَ فَقِيْرٌ وَّنَحْنُ اَغْنِيَاءُ ﴾ ''بیشک اللہ تعالیٰ فقیر ہے اور ہم غنی ہیں۔اس طرح کے ان کے کثیر کفریات پائے جاتے ہیں یقیناً کثیر غضبوں کے بھی مستحق ہیں۔ (از کبیر)

ایک معنی یہ بھی ہے:

" ان المراد به تاكيد الغضب وتكثيره لاجل ان هذا الكفر وان كان واحدا الا انه عظيم "

بیشک دوسرا غضب پہلے غضب کی تاکید ہے، کثرت اس لحاظ سے ہے کہ اگرچہ ان کا کفر قرآن پاک سے ایک کفر ہے، مگر عظیم کفر ہے، اس لئے وہ بہت بڑے غضب کے مستحق ہوئے۔ (از کبیر)

﴿ وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴾ : ''اور کافروں کے لئے عذاب ہے ذلت کا'' جب ان کے کفر کا سبب حسد اور ظلم تھا جس کی اصل وجہ ان کا تکبر تھا۔تکبر ذلت کا ذریعہ ہے جیسا کہ رب تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِيْ سَيَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دَاخِرِيْنَ ﴾

بیشک وہ لوگ جو میری عبادت سے تکبر کرتے ہیں وہ جہنم میں داخل ہوں گے ذلیل ہوکر۔

خیال رہے کہ حدیث شریف میں" عبادتی " دعا کے معنی میں بھی استعمال ہے۔اس آیۃ کریمہ سے واضح ہوا کہ تکبر باعث عذاب اور باعث ذلت ہے خواہ وہ تکبر عبادت سے ہو خواہ دعا سے ہو خواہ ایمان نہ لانے سے ہو۔

☆ " عن عمرو بن شعيب عن ابيه عن جده عن النبی ﷺ قال يحشر لمتكبرون يوم القيامة امثال الذر فی صور الناس يعلوهم كل شئی من الصغار حتی يدخلوا سبحنا فی جهنم يقال له بولس تعلوهم نار الانيار يسقون من طينة الخبال عصارة اهل النار "

نبی کریم ﷺ نے فرمایا قیامت کے دن متکبر لوگ چھوٹی چھوٹی چیونٹیوں کی طرح ہوں گے اگرچہ شکلیں ان کی انسانوں والی ہی ہوں گی۔ان کی ذلت اور حقارت کی وجہ سے ان پر تمام چیزوں کو بلندی حاصل ہوگی یہاں تک کہ ان کو جہنم کے قید خانہ میں داخل کر دیا جائے گا جس کو''بولس'' کہا جاتا ہے ان پر

بہت شدید آگ چھا جائے گی ان کو جہنمیوں کا خون اور پیپ پلائے جائیں گے۔(ابن کثیر)

فائدہ : "مھین" ماخوذ ہے "ھوان" سے

"وھو ما اقتضی الخلود فی النار دائما بخلاف خلود العصاۃ من المسلمین فان ذلک تمحیص لھم وتطھیر"

جو تقاضا کرتا ہے جہنم میں ہمیشہ رہنے کا، بخلاف نافرمان مسلمانوں کے ان کو عذاب زیادہ دیر تک تو ہوسکتا ہے جس طرح قاتل کو ہونا ہے لیکن ہمیشہ عذاب ہو جہنم سے نہ نکالا جائے ایسا نہیں ہوگا اور مومنین کو عذاب بھی صرف پاک وصاف کرنے کے لئے ہوگا۔ (از قرطبی)

﴿ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا نُؤْمِنُ بِمَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَيَكْفُرُوْنَ بِمَا وَرَآءَهٗ وَهُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَهُمْ قُلْ فَلِمَ تَقْتُلُوْنَ اَنْۢبِيَآءَ اللّٰهِ مِنْ قَبْلُ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴾(۹۱)

۱) "اور جب ان سے کہا جائے کہ اللہ کے اتارے پر ایمان لاؤ تو کہتے ہیں وہ جو ہم پر اترا اس پر ایمان لاتے ہیں اور باقی سے منکر ہوتے ہیں۔ حالانکہ وہ حق ہے ان کے پاس والے کی تصدیق فرماتا ہوا تم فرماؤ کہ پھر اگلے انبیاء کو کیوں شہید کیا اگر تمہیں اپنی کتاب پر ایمان تھا"۔

۲) "اور جب ان کو کہا جاتا ایمان لاؤ اس پر جو اللہ نے نازل فرمایا۔ تو وہ کہتے ہیں ہم لاتے ہیں اس پر جو ہم پر اتارا گیا، اور کفر کرتے ہیں اس سے جو اس کے ماسواء ہے حالانکہ وہ حق ہے تصدیق کرنے والا ہے اس کی جو ان کے پاس ہے۔ فرمادیجئے تو کیوں تم شہید کرتے رہے اللہ کے نبیوں کو اس سے پہلے، اگر تم ایمان والے تھے"۔

یہاں سے یہود کی ایک اور قباحت کا ذکر کیا جا رہا ہے کہ جب ان کو کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ جو کچھ نازل کیا یعنی قرآن پاک، توراۃ اور انجیل ان تمام پر ایمان لاؤ، تو وہ رب تعالیٰ کے اس ارشاد پر جواب یہ دیتے ہیں کہ ہم تو ایمان صرف اس پر لاتے ہیں جو ہماری طرف نازل ہوا یعنی ہمارا ایمان تو صرف توراۃ پر ہے اور وہ اس کے ماسوا سے کفر کرتے ہیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے کہا کہ وہ توراۃ کے بغیر باقی کتب قرآن اور انجیل کو تسلیم نہیں کرتے حالانکہ وہ حق ہے جس کی حقانیت حقیقت میں بھی ہے۔ اور اس کی حقانیت کو یہ لوگ بھی تسلیم کرتے ہیں۔ ان کے اس جھوٹے دعوی کو کہ ہمارا ایمان توراۃ پر ہے رب تعالیٰ نے رد کرنے کے لئے نبی کریم ﷺ کو فرمایا اے محبوب تم فرما دو کہ اگر تم اپنے اس دعوی میں سچے ہو کہ تمہارا ایمان توراۃ پر ہے تو انبیاء کرام کو شہید کیوں کرتے رہے کیا توراۃ میں ناحق قتل کرنے سے منع کیا گیا؟

واضح ہوا کہ تمہارا دعوی جھوٹا ہے حقیقت یہ ہے کہ تمہارا ایمان توراۃ پر بھی نہیں۔

﴿ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ ﴾:

''اور جب ان کو کہا جاتا ایمان لاؤ جو اللہ نے نازل فرمایا'' ﴿ لَهُمْ ﴾ میں ضمیر یہود کی طرف لوٹ رہی ہے۔ یعنی جب یہود کو کہا جاتا ایمان لے آؤ۔

﴿ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ ﴾ سے مراد بعض حضرات نے فقط قرآن پاک لیا ہے کہ یہود کو جب کہا جاتا کہ تم قرآن پر ایمان لاؤ لیکن بعض حضرات نے بیان فرمایا " ای بکل بما انزل اللہ " کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر وہ جو اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا اس پر ایمان لاؤ۔ عموم والا معنی لینا اس لئے زیادہ بہتر ہے کہ " ما " ، " الذی " کے معنی میں ہے جس میں عموم پایا گیا۔ ان کو جب تمام آسمانی کتب پر ایمان لانے کا حکم دیا گیا تو انہوں نے بعض پر ایمان کا دعوی کیا اور بعض سے کفر کا اقرار کیا تو رب تعالیٰ نے ان کی مذمت بیان کی۔

حقیقت بھی یہی ہے کہ یہود انجیل کو اللہ تعالیٰ کی کتاب نہیں مانتے تھے اور عیسیٰ علیہ السلام کو

اللہ تعالیٰ کا نبی نہیں تسلیم کرتے تھے۔ یہ خطاب چونکہ نبی کریم ﷺ کے زمانہ کو ہے تو ان کو گویا کہ کہا گیا تم قرآن پاک پر ایمان لاؤ کہ یہ اللہ کی کتاب ہے اور محمد ﷺ اللہ کے آخری نبی ہیں۔ اور اب عمل صرف قرآن پاک پر ہی ہوسکتا ہے باقی کتب منسوخ ہوچکی ہیں۔

اور انجیل پر تمہارا یہ ایمان ہونا ضروری ہے کہ وہ اللہ کی کتاب ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی اور وہ اللہ کے نبی ہیں۔ لیکن اب وہ منسوخ ہوگئی اب اس کے احکام پر عمل نہیں ہوسکتا۔

اور توراۃ پر تمہارا ایمان اس طرح ہو کہ توراۃ اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے اور اللہ کے نبی موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی اس کے جمیع احکام سچے ہیں۔ یہ نہیں کہ جو دل نے مان لیا اسے سچا کہہ لیا اور جو دل نے نہ مانا اسے بدل ڈالا اور توراۃ کے متعلق بھی تمہارا ایمان یہ ہو کہ یہ منسوخ ہوچکی ہے۔ (از کبیر)

﴿ قَالُوْا نُؤْمِنُ بِمَآ اُنْزِلَ عَلَیْنَا ﴾ :

''انہوں نے کہا ہم ایمان لاتے ہیں اس چیز پر جو ہم پر نازل فرمائی''۔ یعنی ان کے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ہمارا ایمان توراۃ پر ہے۔ اور اُن صحیفوں پر بھی ہمارا ایمان ہے جو موسیٰ علیہ السلام کی شریعت کی تائید کرتے ہیں۔ (کبیر)

﴿ وَیَکْفُرُوْنَ بِمَا وَرَآءَهٗ ﴾ : ''اور کفر کرتے ہیں اس کے ماسواء سے''

" ثم اخبر الله تعالیٰ عنهم انهم یکفرون بما وراءه وهو الانجیل والقرآن واورد هذه الحکایة عنهم علی سبیل الذم لهم "

یہود چونکہ خود بھی کہتے تھے کہ ہم تو توراۃ کے بغیر قرآن اور انجیل کو تسلیم نہیں کرتے تو اللہ تعالیٰ نے ان کی مذمت بیان کرتے ہوئے اور ان کے اقوال کے حکایت بیان کرتے ہوئے بیان فرمایا کہ وہ اس کے ماسواء سے کفر کرتے ہیں۔ (از کبیر)

فائدہ : جب دلائل سے واضح ہوچکا تھا کہ اللہ تعالیٰ کی تمام کتابیں حق ہیں اور ان کا رب تعالیٰ کی طرف سے نازل ہونا بھی دلائل سے ثابت ہوچکا تھا تو ان پر ایمان لانا واجب ہوگیا۔

" فثبت ان الایمان ببعض ما انزل الله دون البعض تناقض "

اسی سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ کی بعض کتب پر ایمان رکھنا اور بعض کے ساتھ نہ رکھنا معتبر ہی نہیں۔ یعنی یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ قرآن پاک اور انجیل پر وہ ایمان نہ رکھیں اور توراۃ پر ان کا ایمان صحیح ہو کیونکہ توراۃ تو خود حکم دیتی ہے کہ ان کتب کو اللہ تعالیٰ کا کلام سمجھ کر ایمان لاؤ۔ (از کبیر)

﴿ وَهُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَهُمْ ﴾:

''اور وہ حق ہے تصدیق کرنے والا ہے اس کو جو ان کے پاس ہے'' ''ھو'' ضمیر ماوراء کی طرف لوٹ رہی ہے یعنی توراۃ کے ماسوا جس کو وہ تسلیم نہیں کرتے حقیقت میں وہ حق ہے تصدیق کرنے والی ہیں جو ان کے پاس ہے یعنی قرآن پاک اور انجیل توراۃ کی تصدیق کرنے والی کتابیں ہیں۔

طلباء کرام توجہ فرمائیں: ﴿ وَهُوَ الْحَقُّ ﴾ میں حصر حقیقی نہیں، کہ توراۃ کے ماسواء یعنی قرآن اور انجیل ہی فقط حق ہیں۔

" لانہ جمیع کتب اللہ حق لا سیما التوراۃ لان کون القرآن مصدقالها یدل علی حقیتها ایضا "

اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کی تمام کتب ہی حق ہیں۔ خاص کر کے توراۃ بھی حق ہے کیونکہ قرآن پاک جب توراۃ کی تصدیق کرنے والا ہے تو یقینی طور پر توراۃ کا حق ہونا ثابت ہو گیا۔

لہٰذا ﴿ وَهُوَ الْحَقُّ ﴾ میں حصر ادعائی ہے کیونکہ وہ " ماوراءہ " کو ہی فقط ناحق سمجھ رہے تھے تو ان کا رد کرتے ہوئے۔ ادعائی طور پر اسی " ماوراءہ " کے حق ہونے کو بطور حصر بیان کر دیا گیا۔ (از شیخ زادہ)

اور یہ بھی خیال رہے ''وراء'' اصل میں مصدر ہے وراہ یریہ، قضی یقض کی طرح آتا ہے جس کا معنی ہوتا ہے ''مخفی کرنا''۔ پھر یہ ظرف کے معنی میں غالب استعمال ہوتا ہے۔ اور اکثر طور پر ''خلف'' (پیچھے آنا) کے معنی میں استعمال ہوتا ہے لیکن بعض اوقات ''قدام'' کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے جیسا کہ " من ورائهم جهنم "اور " وكان ورائهم ملك " میں " وراء " سامنے، آگے کے معنی میں استعمال ہے۔ (از شیخ زادہ)

" خلف " کے معنی کا اعتبار کرتے ہوئے " وراء " کا معنی " سواء " بھی کر لیا جاتا ہے۔

" اما قوله تعالیٰ ﴿ وهو الحق مصدقا لما معهم ﴾ فهو كالاشارة الى ما يدل على وجوب الايمان بمحمد ﷺ "

اللہ تعالیٰ کے ارشاد گرامی ﴿ وَهُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَهُمْ ﴾ سے واضح ہو جاتا ہے کہ نبی کریم ﷺ پر ایمان لانا ضروری ہے اس پر دو دلیلیں ہیں۔

پہلی دلیل ﴿ وَهُوَ الْحَقُّ ﴾ ہے اس لئے کہ جب نبی کریم ﷺ پر معجزات کا ظہور ہوا اور ان کی وجہ سے آپ کی نبوت واضح طور پر ثابت ہو گئی۔ پھر آپ نے خبر دی کہ بیشک یہ قرآن اللہ کی طرف سے نازل ہوا اور مکلفین کو قرآن پر ایمان لانے کا حکم دیا" وكان الايمان به واجبالا محالة " تو یقیناً آپ کے ساتھ ایمان لانا واجب ہو گیا کیونکہ قرآن پاک تو اللہ اور اس کے رسول ﷺ پر ایمان لانے کا حکم دیتا ہے۔

" وعند هذا يظهر ان الايمان ببعض الانبياء وبعض الكتب مع الكفر ببعض الانبياء وبعض الكتب محال "

یہاں سے ہی یہ بھی واضح ہو گیا کہ بعض انبیاء کرام اور بعض آسمانی کتب پر ایمان لانا، اور بعض انبیاء کرام اور بعض کتب سے کفر کرنا محال ہے۔

دوسری دلیل ﴿ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَهُمْ ﴾ ہے اس کی تقریر دو وجہ سے ہے۔ ایک یہ کہ نبی کریم ﷺ نے کسی سے علم حاصل نہیں کیا آپ نے کسی استاذ سے کوئی فائدہ حاصل نہیں کیا۔ لیکن آپ نے واقعات جو بیان فرمائے وہ توراۃ کے موافق تھے ان میں کوئی فرق نہیں تھا۔

" علمنا انه عليه الصلوة والسلام انما استفادها من الوحى والتنزيل "

اسی سے واضح طور پر علم حاصل ہو گیا کہ بیشک نبی کریم ﷺ نے وحی اور قرآن پاک سے فائدہ حاصل کیا۔ اس دلیل کا بیان دوسری وجہ سے اس طرح ہے۔ بیشک قرآن پاک نبی کریم ﷺ کی نبوت پر دلالت کرتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے یہ بھی بیان فرمایا کہ قرآن پاک توراۃ کی تصدیق کرتا ہے۔

تو اسی سے واضح ہوجاتا ہے کہ توراۃ کا نبی کریم ﷺ کی نبوت کی خبر پر مشتمل ہونا ضروری ہے۔ ورنہ قرآن پاک توراۃ کی تصدیق کرنے والا نہیں بن سکتا بلکہ تکذیب کرنے والا ہوگا۔

" واذا كانت التوراة مشتملة على نبوة محمد عليه الصلوة والسلام وهم قد اعترفوا بوجوب الايمان بالتوراة لزمهم من هذه الجهة وجوب الايمان بالقرآن وبنبوة محمد عليه الصلوة والسلام "

جب توراۃ نبی کریم ﷺ کی نبوت پر مشتمل ہے تو انہوں نے جب جب اعتراف کرلیا توراۃ پر تو ہمارا ایمان لانا ضروری ہے تو اسی سے ثابت ہوگیا کہ قرآن پاک پر ایمان لانا ضروری ہے اور حضرت محمد ﷺ کی نبوت پر ایمان لانا بھی ضروری ہے۔ (از کبیر)

﴿ قُلْ فَلِمَ تَقْتُلُوْنَ اَنْبِيَآءَ اللّٰهِ مِنْ قَبْلُ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴾:

''فرمادیجئے تو کیوں تم شہید کرتے رہے اللہ کے نبیوں کو اس سے پہلے اگر تم ایمان والے تھے''

یہاں سے اللہ تعالیٰ نے ان کے اس دعوی کو کہ ہمارا ایمان توراۃ پر ہے رد کیا کہ تمہارا دعویٰ غلط اور باطل ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ توراۃ میں مذکور ہے کہ معجزہ نبی کی صداقت پر دلالت کرتا ہے۔ اور توراۃ اس پر دلالت کرتی ہے:

" من كان صادقا فى ادعاء النبوة فان قتله كفر "

''جو شخص نبوۃ کے دعوی میں سچا ہوا اسے شہید کرنا کفر ہے''

" واذا كان الامر كذلك كان السعى فى قتل يحيى وزكريا وعيسى عليه السلام كفرا فلم سعيتم فى ذلك ان صدقتم فى ادعائكم كونكم مؤمنين بالتوراة "

''جب یہ ثابت ہوگیا کہ توراۃ میں انبیاء کرام کو شہید کرنا کفر بیان کیا گیا ہے تو یقیناً حضرت یحیٰ، حضرت زکریا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو شہید کرنے کی کوشش کفر تھی۔ جب تمہارا دعوی بھی یہ ہے کہ ہمارا ایمان توراۃ پر ہے تو پھر تم نے کیوں کوشش کی انبیاء کرام کو شہید کرنے کی''۔ (از کبیر)

خیال رہے رازی رحمہ اللہ نے " فلم سعتیم " ذکر فرمایا" فلم قتلتم " نہیں کہا۔ کیونکہ عیسیٰ علیہ السلام کو اگر چہ انہوں نے شہید کرنے کی کوشش کی لیکن شہید کر نہیں سکے۔ اسی طرح نبی کریم ﷺ کو شہید کرنے کی بھی انہوں نے کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکے۔

نکتہ : " وفی اضافة (انبياء) الى الاسم الكريم تشريف عظيم وايذ ان بانه كان ينبغى لمن جاء من عند الله تعالىٰ ان يعظم وينصر لا ان يقتل " (روح المعانی)

لفظ انبیاء کی اضافت لفظ اللہ کی طرف اضافت تشریفیہ ہے جس سے یہ واضح ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنے والی عظیم ہستیاں قابل تعظیم ہیں۔ ان کی امداد کی جائے نہ کہ ان کو شہید کیا جائے۔

تنبیہ : خطاب اگر چہ نبی کریم ﷺ کے زمانہ کے یہود کو ہے لیکن مراد ان کے اسلاف ہیں جنہوں نے انبیاء کرام کو شہید کیا تھا، البتہ ان کو خطاب کرنے کی وجہ یہ تھی کہ یہ اپنے آباء اجداد کے اس فعل پر رضامند تھے اسی لئے انہوں نے بھی نبی کریم ﷺ کو شہید کرنے کی کوشش کی۔

خیال رہے کہ بظاہر وہم یہ ہوتا ہے کہ مراد جب ان کے آباء اجداد ہیں تو ﴿ تَقْتُلُوْنَ ﴾ مضارع کا صیغہ حال پر دلالت کرنے والا کیوں ذکر کیا، ماضی کا صیغہ ذکر کیوں نہیں کیا؟ تو اس کا جواب واضح ہے کہ ان کی رضامندی کی وجہ سے مخاطبین یہی تھے کہ تم کیوں قتل کرتے ہو۔ (از کبیر)

☆☆☆☆☆

﴿ وَلَقَدْ جَآءَكُمْ مُّوسٰى بِالْبَيِّنٰتِ ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْ بَعْدِهٖ وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴾ (آیت ۹۲)

۱) ''اور بے شک تمہارے پاس موسیٰ کھلی نشانیاں لے کر تشریف لایا پھر تم نے اس کے بعد بچھڑے کو معبود بنالیا اور تم ظالم تھے''۔

۲) ''اور البتہ تحقیق لائے تمہارے پاس موسیٰ کھلی نشانیاں، پھر بنالیا تم نے بچھڑے کو معبود ان کے بعد، اور تم ظلم کرنے والے ہوئے''۔

یہ آیۃ کریمہ پہلے گزر چکی ہے، اس کی وضاحت کچھ ضرورت کے مطابق ذکر کردی گئی۔ اب دوبارہ زیادہ وضاحت کی ضرورت نہیں رہے گی۔ البتہ مختصر وضاحت انشاء اللہ ذکر ہوگی۔

آیۃ کریمہ کے تکرار (دوبارہ ذکر کرنے) کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب نبی کریم ﷺ کے زمانہ کے یہود کے طریقہ کے حکایت بیان فرمائی، اور ان کے عناد اور تکذیب کا ذکر فرمایا، تو ان کے آباؤ اجداد کا بھی ذکر فرمایا کہ وہ انبیاء کرام کو شہید کرتے رہے۔ اسلئے ان کی تکذیب کا ذکر موجود یہود سے زیادہ ضروری تھا۔ اس لئے موسیٰ علیہ السلام اور ان کی نشانیوں کا ذکر لوٹایا گیا کہ وہ موسیٰ علیہ السلام کے واضح معجزات کو دیکھنے کے باوجود بچھڑے کی پوجا کرنے لگ گئے۔

" وهو مع ذلک صابر ثابت على الدعاء الى ربه والتمسک بدينه وشرعه فكذلك القول فى حالى معكم وان بالغتم فى التكذيب والانكار "

لیکن موسیٰ علیہ السلام صبر و استقلال سے ان کو رب تعالیٰ کی طرف بلاتے ہی رہے۔ اور فرماتے رہے کہ تم شریعت اور دین پر عمل کرو۔ گویا کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا یہی میرا حال ہے تمہارے ساتھ اگر چہ تم میری تکذیب میں مبالغہ کر رہے ہو اور واضح طور پر انکار کر رہے ہو، لیکن میں بھی صبر استقلال سے تمہیں دعوت ایمان دے رہا ہوں۔ (از کبیر)

﴿ وَلَقَدْ جَآءَكُمْ مُّوسٰى بِالْبَيِّنٰتِ ﴾: ''اور البتہ تحقیق لائے تمہارے پاس موسیٰ کھلی

نشانیاں''۔ جب ان کو ایمان لانے کا حکم دیا تو انہوں نے کہا ہم تو توراۃ کے بغیر کسی چیز کو نہیں مانتے تو اللہ تعالیٰ نے ان کا رد کرنا شروع کیا، اسی زجر و توبیخ کا یہ حصہ ہے کہ تمہارے آباؤ اجداد کے پاس موسیٰ علیہ السلام معجزات لائے قطعی دلائل لائے لیکن وہ لوگ پھر بچھڑے کی پوجا کر کے ظالم ہوئے۔

تو گویا کہ ﴿ امنو ﴾ کے تحت داخل کر کے توبیخ کے لئے اس آیۂ کریمہ کو ذکر کیا۔ اس لحاظ پر صرف لفظی تکرار رہے گا مقاصد علیحدہ علیحدہ ہوں گے۔ (از روح المعانی)

﴿ بالبینٰت ﴾ کا معنی واضح کھلی چیز ہے، یہاں کیا مراد ہے؟ یہاں اس کے مقصد میں وسعت پائی جاتی ہے:

(۱) " الدلائل الدالة على صدقة عليه السلام في دعوته "، بينات " کا ایک مطلب یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے ایسے دلائل عطاء فرمائے جو آپ کی دعوت الی الحق (حق راہ کی تبلیغ) کی صداقت پر دلالت کرنے والے تھے۔

(۲) " المعجزات المؤيدة لنبوته كالعصا ولايد وانفلاق البحر " دوسرا معنی یہ ہے کہ آپ کو معجزات عطاء کئے گئے جو آپ کی نبوت کے لئے تائید تھے جس طرح عصا کا اژدہا بن جانا، ہاتھ کا سفید ہو کر چمکنا، اور دریا کا پھٹنا وغیرھا۔

(۳) " وقيل الاظهر ان يراد بها الدلائل الدالة على الوحدانية " بعض حضرات نے کہا زیادہ ظاہر یہ ہے کہ مراد اس سے وہ دلائل ہیں جو اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر دلالت کرتے ہیں۔

(روح المعانی)

" ﴿ بالبینٰت ﴾ اى بالآيات الواضحات والدلائل القاطعات على انه رسول الله وانه لا اله الا الله "

بینات کا معنی واضح نشانیاں اور قطعی دلائل جو اس پر دلالت کرتے ہیں کہ بیشک آپ اللہ کے رسول ہیں اور بیشک اللہ کے بغیر کوئی معبود نہیں۔ (ابن کثیر)

(۴) " والآيات البينات هى الطوفان والجراد والقمل والضفادع والدم والعصاء واليد وفرق البحر وتظليلهم بالغمام والمن والسلوى والحجر وغير ذلك من الآيات شاهدوها " (ابن کثیر)

واضح نشانیاں جو اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو عطا فرمائیں وہ یہ تھیں طوفان، مکڑی، کیڑے،

مینڈک اور خون یہ چیزیں فرعون اور اس کے ساتھ ایمان رکھنے والے لوگوں کے لئے عذاب بنے جن کی تفصیل انشاء اللہ سورۃ اعراف میں آئے گی۔تفسیر خزائن العرفان کے حوالہ سے راقم نے اپنی تصنیف تذکرۃ الانبیاء میں ان کا ذکر کیا ہے۔

اور واضح نشانیاں، عصا کا اژدہا بننا، ید بیضاء، اور دریا کا پھٹنا اور بادل کا سایہ کرنا اور من وسلوی کا نازل ہونا اور پتھر سے پانی کے چشموں کا جاری ہونا، اور ان کے بغیر بھی کئی واضح نشانیاں آپ کو عطا ہوئیں جو تمہارے پاس لائے اور تم ان کا مشاہدہ کرر ہے تھے۔

راقم کے نزدیک تمام معانی بیک وقت مراد ہیں علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے بھی اسے ہی اولی (بہتر) قرار دیا:" وعندی الحمل علی العموم بحیث یشمل ذلک ایضا اولی واظھر "

(روح المعانی)

اور میرے نزدیک عموم پر محمول کرنا ہی زیادہ ظاہر اور زیادہ بہتر ہے تاکہ تمام معانی کو شامل ہو جائے یعنی آپ کو ہر طرح کی واضح نشانیاں عطاء ہوئیں، معجزات عطاء ہوئے، آپ کی نبوت وصداقت پر دلالت کرنے والے دلائل حاصل ہوئے، اور آپ کو اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر دلالت کرنے والے دلائل قاطعہ (قطعی دلیلیں) عطاء کی گئیں۔

﴿ ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ ﴾ : ''پھر تم نے بنالیا بچھڑے کو معبود'' اگر چہ ظاہری طور پر صرف اتنا ہی معنی ہے کہ ''پھر تم نے بچھڑا بنالیا'' لیکن بچھڑا بنانا صرف سامری کا فعل تھا تمام کا نہیں۔لہٰذا یہاں ایک مفعول محذوف ہے علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے کیا خوب تفسیر کی۔

﴿ ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ ﴾ ای الذی صنعه لکم السامری من حلیکم الها "

پھر تم نے اس بچھڑے کو معبود بنالیا جو سامری نے تمہارے زیورات سے بنالیا۔

﴿ مِنْ بَعْدِهٖ ﴾ : ''ان کے بعد'' یعنی موسیٰ علیہ السلام کے طور پر جانے کے بعد، جب آپ توراۃ لینے کے لئے اللہ تعالیٰ کے حکم سے طور پر گئے تو آپ کی غیر موجودگی میں سامری نے بنی اسرائیل سے زیورات لے کر ایک بچھڑا بنادیا جس کی ان لوگوں نے پوجا شروع کردی (زیادہ وضاحت چھٹے رکوع میں گزر چکی ہے)۔

عجیب نکتہ: "ثم" تراخی پر دلالت کرتا ہے یعنی یہ کام کچھ دیر کے بعد ہوا۔

"یشیر ھذا العطف علی انھم فعلوا ذلک بعد مھلة من النظر فی الآیات وذلک اعظم ذنبا واکثر شفاعة لحالھم"

لفظ "ثم" سے جو عطف کیا گیا ہے اس سے اس مسئلہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ انہوں نے بچھڑے کی پوجا واضح آیات کو دیکھنے کے بعد کی۔ جو ان کا عظیم گناہ تھا۔ اور بہت ہی زیادہ ان کے حال کے لئے برائی کا سبب تھا۔

﴿ وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴾: "اور تم ظلم کرنے والے ہو" ظلم کا معنی یہ ہے "وضع الشئی فی غیر محله" ایک چیز کو جہاں رکھنا تھا اس سے ہٹا کر دوسری جگہ رکھ دینا۔ اسی لئے علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے ﴿ وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴾ کی تفسیر ان الفاظ سے کی "ای واضعون الشئی فی غیر محله اللائق به او مخلون بآیات الله تعالیٰ" تم ظلم کرنے والے ہو یعنی ایک چیز جہاں رکھنے کے قابل تھی وہاں سے ہٹا کر تم دوسری جگہ رکھنے والے ہو اور اللہ تعالیٰ کی آیات میں خلل ڈالنے والے ہو۔

"وفیھا التعریض بانھم صرفوا العبادة عن موضعھا الاصلی الی غیر موضعھا"

اور اس میں یہ اشارہ موجود ہے کہ بیشک انہوں نے عبادت کو اپنی اصلی جگہ سے ہٹا کر دوسری جگہ رکھ دیا کیونکہ عبادت تو صرف رب تعالیٰ کی ہو سکتی ہے لیکن انہوں نے بچھڑے کی عبادت شروع کر دی۔ اور مطلق ظلم کر کے یہ واضح کیا کہ انہوں نے بچھڑے کی عبادت کر کے عظیم ظلم کیا۔

"ان عبادة العجل کل الظلم وان من ارتکبھا لم یترک شیأ من الظلم"

اس لئے کہ بچھڑے کی عبادت کرنا تمام کے تمام مظالم کو حاصل کرنا ہے اس لئے جس نے بچھڑے کی عبادت کا ارتکاب کیا اس نے ظلم کی آخری حد کو بھی عبور کر لیا، ظلم کا کوئی حصہ باقی رہنے نہیں دیا۔

نکتہ: جملہ اسمیہ دوام واستمرار پر دلالت کرتا ہے جس سے یہ مسئلہ واضح ہو گیا کہ گویا کہ اللہ تعالیٰ نے یہ کہا: "وانتم قوم عادتکم الظلم واستمر منکم ومنه عبادة العجل" ظلم کرنا تمہاری عادت ہے اور تم ہمیشہ ظلم کرتے ہی رہتے ہو، تمہارے مظالم میں سے عظیم ظلم بچھڑے کی عبادت کرنا ہے۔

(ماخوذ از روح المعانی)

﴿ وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاسْمَعُوْا قَالُوْا سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا وَاُشْرِبُوْا فِىْ قُلُوْبِهِمُ الْعِجْلَ بِكُفْرِهِمْ قُلْ بِئْسَمَا يَاْمُرُكُمْ بِهٖٓ اِيْمَانُكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴾ (آیت ۹۳)

۱) ''اور یاد کرو جب ہم نے تم سے پیمان لیا اور کوہ طور کو تمہارے سروں پر بلند کیا لو جو ہم تمہیں دیتے ہیں زور سے اور سنو، بولے ہم نے سنا اور نہ مانا اور ان کے دلوں میں بچھڑا رچ رہا تھا ان کے کفر کے سبب تم فرما دو کیا برا حکم دیتا ہے تم کو تمہارا ایمان اگر ایمان رکھتے ہو''۔

۲) ''اور یاد کرو جب لیا ہم نے تم سے عہد اور بلند کیا ہم نے تمہارے (سروں) اوپر طور لے لو وہ چیز جو دی ہم نے تمہیں، مضبوطی سے، اور سنو، انہوں نے کہا ہم نے سنا، اور نافرمانی کی، اور پلا دی گئی ان کے دلوں میں بچھڑے کی محبت بوجہ ان کے کفر کے۔ آپ فرما دیں بری ہے وہ چیز حکم دیتا ہے تمہیں جس کا تمہارا ایمان اگر ہو تم ایمان والے''۔

یہاں سے یہود کی اور قباحت کا ذکر کیا جا رہا ہے رب تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم نے ان سے عہد لیا کہ جب ہم تمہیں کتاب عطاء کر دیں تو اس کے احکام پر سختی سے عمل کرنا لیکن کتاب کے ملنے پر اس کے احکام کو سخت سمجھ کر انہوں نے انکار کر دیا، تو ہم نے جبریل کو حکم دیا جس نے ان کے سروں پر طور پہاڑ کو اٹھا کر لا یا، پھر ہم نے ان کو کہا ہمارے حکم کو سنو، یعنی اسے سن کر قبول کرو، انہوں نے کہا ہم نے سنا، لیکن وہ دل میں کہنے لگے ہم نے نافرمانی کی دراصل اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ کافر ہو چکے تھے کیونکہ بچھڑے کو انہوں نے معبود مان لیا تھا اور بچھڑے کی محبت ان کے دلوں میں پلا دی گئی جس کی وجہ سے ان کے دلوں میں بچھڑا رچ گیا تھا۔

رب تعالیٰ نے اپنے محبوب کریم ﷺ کو ارشاد فرمایا کہ آپ ہی ان کو فرما دیں وہ چیز بری ہے جس کا تمہیں تمہارا ایمان حکم دے رہا ہے یعنی بچھڑے کی محبت پر جو تمہارا ایمان ہے (اگر چہ حقیقت میں وہ کفر

ہے) وہ تمہارا ایمان جو تمہیں رب تعالیٰ کے حکم سے پھیر رہا ہے وہ تمہیں بری چیز کا حکم دے رہا ہے یعنی تمہیں جہنم کا ایندھن بنا رہا ہے اگر تم مومن ہو یعنی ادھر تمہارا ایمان کا دعوی اور ادھر بچھڑے کی پوجا اور رب کے احکام کی نافرمانی یہ تمہارے ایمان میں شک پیدا کرنے کے ذریعے ہیں۔

تنبیہ :﴿ وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ ﴾ تک الفاظ مبارکہ پہلے بھی گزر چکے ہیں تکرار اپایا گیا ہے اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ عرب حضرات کا یہ طریقہ ہے کہ وہ جب کسی کلام میں زور دینا چاہیں۔ اس میں تاکید ثابت کرنا چاہیں تو وہ الفاظ کو مکرر (دوبارہ) ذکر کرتے ہیں۔ اس لئے یہاں بھی تاکید کے لئے دوبارہ ذکر کر دیا گیا۔

اور دوسری وجہ یہ ہے کہ یہاں ﴿ وَاسْمَعُوْا ﴾ سے لے کر آخر آیۃ تک زیادتی بھی ہے اس لئے کامل تکرار بھی نہیں۔ (از کبیر) ان کے سروں پر پہاڑ کو اٹھا کر لانا اور ان کا یہ گمان کرنا کہ یہ ہم پر گرنے والا ہے اس کا سورۃ اعراف میں تفصیلی طور پر ذکر ہے۔ انشاء اللہ وہاں ہی ﴿ و اذ نتقنا الجبل فوقهم كانه ظلة و ظنوا انه واقع بهم ﴾ کے مطابق وضاحت کی جائے گی۔

شاہ عبدالعزیز صاحب نے ایک اور وجہ بیان کی کہ بظاہر تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ پہاڑ کے ان کے سروں پر اٹھانے کو دوبارہ ذکر کیا تو یہ تکرار ہے لیکن حقیقت میں تکرار نہیں، کیونکہ یہاں بعد میں ﴿ وَاسْمَعُوْا ﴾ ہے جس کا معنی ہے "سنو" اور پہلے جو ذکر ہے اس میں بعد میں ہے ﴿ واذكرو ﴾ یاد رکھو۔

گویا کہ یہ آیۃ واقعہ کی ابتداء ہے اور جو آیۃ پہلے گزر گئی وہ واقعہ کی انتہاء ہے کیونکہ سننا پہلے ہے اور یاد رکھنا بعد میں ہے۔ (عزیزی)

راقم کو علامہ رازی رحمہ اللہ کا قول ہی تحقیقی نظر آیا کیونکہ ﴿ وَاسْمَعُوْا ﴾ کا مطلب صرف سننا نہیں بلکہ سن کر قبول کرنا مراد ہے اسی لئے تو ان کے قول ﴿ سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا ﴾ کی مذمت بیان کی گئی۔ لہٰذا ﴿ وَاسْمَعُوْا ﴾ اور ﴿ واذكروا ﴾ کا مفہوم تقریباً ایک ہی ہے کہ رب تعالیٰ کے احکام کو سن کر ہمیشہ کے لئے قبول کر لو یہ مفہوم ہے ﴿ وَاسْمَعُوْا ﴾ کا اور ان کو یاد رکھو یعنی ان پر ہمیشہ عمل کرو یہ مفہوم ہے ﴿ واذكروا ﴾ کا۔ (واللہ اعلم بالصواب)

﴿ وَاسْمَعُوْا ﴾ ای استجیبوا و اطیعوا ای فیما امرتم به " (خازن)

یعنی ﴿ وَاسْمَعُوْا ﴾ کا مطلب یہ ہے ان احکام کو قبول کرو اور فرمانبرداری کرو یعنی جن چیزوں

کا تمہیں حکم دیا جا رہا ہے ان کو سن کر قبول کرو اور ان پر ہمیشہ کے لئے عمل جاری رکھو۔

﴿ قَالُوْا سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا ﴾: ''انہوں نے کہا ہم نے سنا اور نافرمانی کی''

﴿ قَالُوْا سَمِعْنَا ﴾ قولک . ﴿ وَعَصَيْنَا ﴾ امرک . (ابو السعود)

انہوں نے کہا ہم نے تمہارے قول کو سنا اور اور تمہارے احکام کی نافرمانی کی۔ اسی طرح ان کے اس قول کا یہ مطلب بھی تھا:

" قالوا بلسان القال سمعنا وبلسان الحال وعصينا "

انہوں نے زبان سے کہا ہم نے سنا، اور دل میں کہا ہم نے نافرمانی کی۔

ایک قول یہ ہے کہ انہوں نے زبان سے تو کہا تھا ﴿ سَمِعْنَا ﴾ ہم نے سنا۔ لیکن ﴿وَعَصَيْنَا﴾ کے الفاظ انہوں نے اگرچہ زبان سے یا دل سے ادا تو نہیں کئے تھے لیکن اللہ تعالیٰ کے احکام پر دیدہ دانستہ عمل نہ کر کے انہوں نے ﴿ وَعَصَيْنَا ﴾ کا مظاہرہ کیا۔

لیکن اس قول کو علامہ رازی رحمہ اللہ نے رد کیا کہ بلا وجہ ظاہری معنی سے پھیرنا درست نہیں کیونکہ رب تعالیٰ نے ﴿ قَالُوْا ﴾ کے بعد ﴿ سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا ﴾ کا ذکر فرمایا جو ان کا مقولہ ہی ہو سکتے ہیں اسلئے زبان حال اور زبان مقال کا فرق ہو تو سکتا ہے لیکن مطلقاً قول کی نفی کسی حد تک بھی درست نہیں۔

(ماخوذ از کبیر، روح المعانی، قرطبی)

فائدہ عظیمہ: ان لوگوں کے سروں پر پہاڑ کا اٹھا کر لانا " انه من اعظم المخوفات " بیشک بہت بڑا ڈرانے کا ذریعہ تھا۔ لیکن وہ پھر اپنے کفر پر قائم رہے اور واضح طور پر یہ کہا ﴿ سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا ﴾ ہم نے سنا اور نافرمانی کی۔

" وهذا يدل على ان التخويف وان عظم لايوجب الانقياد "

یہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ اگرچہ بہت عظیم خوف بھی کیوں نہ دلا دیا جائے اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ دل سے مطیع بھی ہو جائے۔ (از کبیر)

اسی سے اساتذہ کو بھی سبق حاصل کرنا چاہئے کہ وہ گالیاں دے کر، ظالمانہ مار سے اپنا رعب جمانے اور طلباء کو اپنا مطیع بنانے میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ محنت کر کے اسباق پڑھانے سے ہی، شفقت و محبت سے ہی کسی کے دل میں کوئی آ سکتا ہے۔ بیہودہ گالیاں دینے والے استاذ کو ظاہری طور پر ان کے

شاگرد گالیاں دیں یا نہ دیں، دل میں گالیاں ضرور دیتے ہیں۔ میرا اسکول کا ایک کلاس فیلو کہتا تھا میرا استاذ جب مجھے ایک مرتبہ گدھا کہتا ہے تو میں دل میں اسے دس مرتبہ گدھا کہتا ہوں تو گدھا، تو گدھا کی دل میں رٹ لگا دیتا ہوں۔

﴿ وَاُشْرِبُوْا فِیْ قُلُوْبِهِمُ الْعِجْلَ ﴾: ''ان کے دلوں میں بچھڑے کی محبت پلا دی گئی''

اگر چہ بظاہر معنی یہ ہے کہ ان کے دلوں میں بچھڑا پلا دیا گیا۔ لیکن یہاں مجاز کا استعمال ہے جس میں دو وجہ ہیں اس کی ایک وجہ یہ کہ حذف مضاف پایا گیا ہے یعنی معنی یہ ہے " واشربوا فی قلوبهم حب العجل " اور ان کے دلوں میں بچھڑے کی محبت پلا دی گئی۔

" معناه تداخلهم حبه والحرص علی عبادته كما يتداخل الصبغ الثواب "

اب اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ ان کے دلوں میں بچھڑے کی محبت اور بچھڑے کی عبادت پر حرص ایسے داخل ہو چکی ہے جیسے کہ رنگ کپڑے میں سرایت کر جاتا ہے۔ اسی صورت کے مطابق اعلیٰ حضرت کا ترجمہ ہے ''ان کے دلوں میں بچھڑا رچ رہا تھا''۔

راقم کا ترجمہ بھی اسی صورت کے لحاظ پر ہے۔ البتہ راقم نے ابتدائی حذف مضاف کا لحاظ کرتے ہوئے ظاہری الفاظ کے مطابق ترجمہ کیا ہے اور اعلیٰ حضرت نے حاصل ہونے والے نتیجہ کے مطابق ترجمہ کیا ہے۔ دوسری وجہ یہ تھی:

" كما ان الشرب مادة لحياة ما تخرجه الارض فكذا تلك المحبة كانت مادة الجميع ما صدر عنهم من الافعال "

کہ جس طرح پانی زمین کو پلایا جائے تو اس کے ذریعے زمین سے پودے اگتے ہیں۔ اسی طرح ان لوگوں کے دلوں میں بچھڑے کی جو محبت تھی وہ ان سے افعال کے صادر ہونے کا ذریعہ بنی۔ اس مناسبت کی وجہ سے ان کے دلوں کی محبت کو پانی کے پلائے جانے سے تشبیہ دی گئی۔ (از کبیر)

تنبیہ: بعض حضرات نے ذکر فرمایا کہ موسیٰ علیہ السلام نے بچھڑے کا برادہ بنایا اور اس کو پانی میں بہا دیا۔ پھر بنی اسرائیل کو کہا یہ پانی پیو، تو سب نے پانی پیا۔ جن کے دلوں میں بچھڑے کی محبت تھی ان کے ہونٹ زرد ہو گئے جیسے کہ سونے کا رنگ ہوتا ہے۔

اور ایک قول یہ بھی ہے کہ جن لوگوں کے دلوں میں بچھڑے کی محبت تھی وہ پانی پینے سے مجنوں

ہو گئے۔ یہ ذکر کرنے کے بعد علامہ قرطبی رحمہ اللہ بیان فرماتے ہیں:

"اما تذریتہ فی البحر فقد دل علیہ قولہ تعالیٰ ثم لننسفنہ فی الیم نسفا، واما شرب الماء وظہور البرادۃ علی الشفاہ فیردہ قولہ تعالیٰ ﴿ واشربوا فی قلوبہم العجل ﴾ ...... واللہ اعلم بالصوب." (قرطبی)

جہاں تک تعلق ہے بچھڑے کے برادہ کو دریا میں بہانے کا وہ تو درست ہے کیونکہ اس پر تو قرآن پاک کے یہ الفاظ مبارکہ دلالت کررہے ہیں ﴿ ثم لننسفنہ فی الیم نسفا ﴾ پھر ہم ریزہ ریزہ کر کے دریا میں بہائیں گے۔ لیکن پانی کا پینا اور ان کے ہونٹوں پر برادہ کا زرد رنگ کا ظاہر ہونا درست نظر نہیں آتا کیونکہ بچھڑے کا پانی پینا قرآن پاک میں مذکور نہیں، بلکہ ان کے دلوں میں بچھڑے کا پلایا جانا مذکور ہے۔

﴿ بِكُفْرِهِمْ ﴾: "بوجہ ان کے کفر کے"

"بسبب کفرھم وذلک لانھم کانوا مجسمۃ او حلولیۃ ولم یروا جسما اعجب منہ فتمکن فی قلوبھم ما سول لھم السامری"

بنی اسرائیل نے بچھڑے کا جسم عجیب وغریب دیکھ کر اس کی عبادت شروع کر دی اور ان کے دلوں میں وہ جاگزیں ہو گیا (جگہ پکڑ گیا) جیسا کہ مجسمہ فرقہ کا طریقہ ہے کہ جو پتھر خوبصورت دیکھا اسی کو خدا مان لیا اگر کوئی دوسرا پتھر خوبصورت نظر آ گیا تو اسے خدا بنا لیا پہلے خدا صاحب کو پھینک دیا۔ اسی وجہ سے وہ خدا تعالیٰ کا بھی جسم مانتے ہیں۔ یا حلولیہ فرقہ کی طرح انہوں نے بچھڑے کی پوجا اس لئے شروع کر دی تھی کہ اس میں خدا حلول کر گیا یہی ان کے کفر کی وجہ تھیں۔ (از بیضاوی)

﴿ قُلْ بِئْسَمَا يَأْمُرُكُمْ بِهٖٓ اِيْمَانُكُمْ ﴾: "فرما دیجئے بری ہے وہ چیز حکم دیتا ہے تمہیں جس کا تمہارا ایمان" بظاہر یہاں وہم ہوتا ہے کہ ابھی پہلے ذکر کیا کہ ان کا کفر سبب ہے ان کے بچھڑے سے محبت کرنے کا۔ اب یہ فرمایا گیا کہ بچھڑے کی عبادت بری چیز ہے تمہارے ایمان نے تمہیں بچھڑے کی عبادت کا حکم دے کر بری چیز کا حکم دیا۔ ان دونوں میں مطابقت کیسے کہ ایک ہی چیز کا سبب ایمان بھی ہو اور کفر بھی ہو۔ تو اس کا جواب یہ دیا گیا۔

﴿ اِيْمَانُكُمْ ﴾ ای ایمانکم الذی زعمتم فی قولکم "نؤمن بما انزل علینا"

کہ یہاں ایمان سے مراد وہ ایمان ہے جس کا یہود دعوی کرتے تھے کہ ہمارا ایمان توراۃ پر ہے۔ ان کا یہ دعوی باطل تھا کیونکہ ان کا انجیل اور قرآن پاک اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور نبی کریم ﷺ سے

ایمان نہ لانا کفر ہی تھا۔

اب واضح ہوا کہ حقیقی سبب کفر ہی تھا ان کا ایمان کا دعوی بھی درحقیقت کفر ہی تھا۔

(از قرطبی)

اعتراض: ایمان تو عرض ہے اس سے امر اور نہی متصور ہی نہیں تو کس طرح یہ کہا گیا'' کہ وہ چیز بری ہے جس کا تمہارا ایمان تمہیں حکم دیتا ہے۔

جواب: " الداعی الی الفعل قد یشبه بالامر " کام کا سبب کبھی امر کے مشابہ ہوتا ہے۔ جس طرح رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے ﴿ اصلوتک تأمرک ﴾ کیا تمہاری نماز تمہیں حکم دیتی ہے۔ اور ارشاد گرامی ہے:

﴿ ان الصلوة تنهی عن الفحشاء والمنکر ﴾

بے شک نماز بے حیائی اور برے کاموں سے روکتی ہے۔

﴿ اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ﴾: ''اگر تم ہو ایمان والے'' ان الفاظ مبارکہ سے ان کے دعوی ایمان کو غلط قرار دیا جا رہا ہے تقدیر عبارت کی اس طرح ہوگی:

" ﴿ اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ﴾ بها ما امرکم بهذه القبائح ورخص لم ایمانکم بها "

اگر تم واقعی مومن ہو تو کس چیز نے تمہیں ان قبیح کاموں کا حکم دیا ہے۔ کیا یہ بھی ممکن ہے کہ ایمان قبیح کاموں کی رخصت دے۔ واضح ہوا کہ ایمان کے منافی کام اور دعوی ایمان ان میں تناقض ہے لہٰذا تمہارا دعوی ایمان جھوٹا اور باطل ہے۔ اور تقدیر عبارت کی اس طرح بھی ہے۔

" ﴿ ان کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ﴾ بها فبئس ما آمرکم به ایمانکم بها لان المؤمن ینبغی ان لا یتعاطی الا ما یقتضیه ایمانه لکن الایمان بها لا یأمر به فاذن لستم بمؤمنین "

اگر تمہارا ایمان کا دعوی ہے کہ تم مومن ہو تو اس کا یہ مطلب ہوگا کہ تمہارا ایمان تمہیں برائی کا حکم دیتا ہے کیونکہ مومن تو وہی کام کرتا ہے جو اس کا ایمان تقاضا کرتا ہے لیکن ایمان تو قبیح کاموں کا حکم نہیں دیتا تو اس سے پتہ چلا کہ تم مومن ہی نہیں ہو۔

(از بیضاوی)

﴿ قُلْ اِنْ كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ عِنْدَ اللّٰهِ خَالِصَةً مِّنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴾ (آیت ۹۴)

۱) ''تم فرماؤ اگر پچھلا گھر اللہ کے نزدیک خالص تمہارے لئے ہو نہ اوروں کے لئے تو بھلا موت کی آرزو تو کرو اگر سچے ہو''۔

۲) ''آپ فرما دیں، اگر ہے تمہارے لئے دار آخرت اللہ کے نزدیک خالص سوائے اور لوگوں کے، تو تمنا کرو تم موت کی اگر تم سچے ہو''۔

جس طرح پہلے یہود کے غلط دعوے اور قبیح باتیں اور قبیح اعمال کا ذکر ہو رہا ہے اس آیۃ کریمہ میں بھی ان کے غلط دعوی کا رد کیا جا رہا ہے۔

شان نزول میں چند وجوہ:

(۱) یہود کے مختلف دعوؤں کا رب تعالیٰ نے ذکر فرمایا ان کے رد میں ہی یہ آیۃ نازل ہوئی ان کا دعوی یہ تھا: ﴿ لن یدخل الجنة الامن کان هودا او نصاری ﴾ ہرگز جنت میں کوئی داخل نہیں ہوگا سوائے یہود اور نصاری کے۔

یعنی یہودی کہتے تھے جنت میں ہمارے بغیر کوئی اور نہیں جائے گا، نصرانی کہتے تھے ہمارے بغیر جنت میں کوئی اور نہیں جائے گا اور ان کا دعوی یہ تھا ﴿ نحن ابناء الله و احباؤه ﴾ ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے محبوب ہیں۔ اسی طرح وہ اور یہ کہتے تھے ﴿ لن تمسنا النار الا ایاما معدودة ﴾ ہمیں آگ ہرگز نہیں مس کرے گی سوائے چند دنوں کے۔ ان کے ان دعاوی باطلہ کے بعد یہ آیۃ کریمہ نازل ہوئی۔

(۲) اور ان کا عقیدہ یہ تھا کہ ہم حق پر ہیں کیونکہ نسخ ہماری شریعت میں جائز نہیں باقی سب فرقے باطل پر ہیں۔ ان کے اس دعوی کے رد میں اس آیۃ کریمہ کا نزول ہوا۔

(۳) وہ اپنے آپ کو اکابر انبیاء کرام کی اولاد سے ہونے کی وجہ سے یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ ہمارے آباء و اجداد حضرت ابراہیم، حضرت اسحاق اور حضرت یعقوب علیہم السلام ہمیں رب تعالیٰ سے ضرور چھڑا

لیں گے، کیونکہ ان کا زور چلتا ہے اور ہمیں ثواب تک پہنچادیں گے اسی وجہ سے وہ اپنے آپ کو تمام عرب لوگوں پر برتر سمجھتے تھے اور نبی کریم ﷺ کے تشریف لانے سے پہلے کہتے وہ ہمارے ہی خاندان سے تشریف لائیں گے لیکن آپ جب حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد سے آئے تو وہ لوگوں کے دلوں میں یہ شک ڈالنے لگے کہ یہ آخری نبی نہیں کیونکہ پہلے سارے انبیاء کرام حضرت اسحاق علیہ السلام کی اولاد سے آئے یہ بھی اگر نبی ہوتے تو ان کی اولاد سے ہی تشریف لاتے۔

ان کے اس دعوی کے بعد کہ ہم اکابر انبیاء کرام کی اولاد ہونے کی وجہ سے جنت کی نعمتیں حاصل کریں گے اس آیۃ کریمہ کا نزول ہوا۔ مسئلہ واضح ہے کہ ان تمام وجوہ کے بعد آیۃ کریمہ کا نزول ہوا۔ تمام وجوہ ہی اس کا شان نزول ہیں۔ (از کبیر)

﴿ قُلْ اِنْ كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ عِنْدَ اللّٰهِ خَالِصَةً مِّنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴾

''رب تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو حکم دیا کہ آپ ان سے فرمادیں کہ اگر تم اپنے دعوی میں سچے ہو کہ تم اللہ تعالیٰ کے محبوب ہو اور جنت صرف تمہارے لئے ہے اور جنت کی نعمتیں صرف تمہارے لئے ہیں اور یہ کسی کو حاصل نہیں ہوئیں تو تم موت کے تمنا کرو اگر تم اپنے دعوی میں سچے ہو''۔

وجہ اس کی یہ ہے کہ کوئی انسان اپنے گھر منتقل ہونے کو ناپسند نہیں کرتا۔ اور نہ ہی کوئی انسان باغ میں جانے اور اس کی سیر کو مکروہ سمجھتا ہے بلکہ ہر شخص اپنے گھر میں آنے اور باغ میں جانے کی تمنا کرتا ہے۔ اسی طرح وہ انسان جس کو یہ معلوم ہو کہ رب تعالیٰ کے پاس جا کر ہمیں کرامات اور درجات حاصل ہونے ہیں اور ہمیں عطیات اور ھدیئے وصول ہونے ہیں تو وہ تمنا رکھے گا کہ جلدی میں اللہ تعالیٰ کے حضور پہنچ کر یہ انعامات حاصل کرلوں۔

اگر تم بھی اپنے دعوی میں سچے ہو کہ تم اللہ کے محبوب ہو تو موت کی تمنا کرو تا کہ تم دنیا کے غموں سے نجات حاصل کرلو، اور مصائب برداشت کرنے سے چھٹکارا حاصل کرلو اور دائمی نعمتوں کو حاصل کرلو۔

اعتراض: یہود الزامی طور پر یوں کہہ سکتے ہیں کہ تمہارا دعوی بھی یہ ہے کہ جنت مومنین کے لئے ہے تو تم ہی موت کی تمنا کرلو تا کہ جنت میں جلدی پہنچ جاؤ۔ تم ایسا کیوں نہیں کرتے۔

پہلا جواب: یہود کا دعویٰ یہ تھا کہ ہمارے بغیر دوسرا کوئی جنت میں جائے گا ہی نہیں۔ نبی کریم ﷺ کی امت کے مؤمنین کا یہ کوئی دعویٰ نہیں۔ بلکہ ہمارا ایمان یہ ہے کہ آدم علیہ السلام سے لے کر قیامت تک جو بھی ایمان والے ہوں گے وہ جنت میں جائیں گے۔ اور انبیاء کا یہ دعویٰ بھی نہیں کہ ہمیں عذاب ہونا ہی نہیں۔

" بل المؤمن و ان جل قدره غير الانبياء عليهم الصلوة و السلام فانه لا يزول عنه خوف الخاتمة "

بلکہ مؤمن کتنی بڑی شان والا ہی کیوں نہ ہو وہ اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈرتا ہے اس کے دل سے خاتمہ کا خوف نہیں نکلتا کہ پتہ نہیں میرا انجام کیا ہوگا۔

ہاں صرف انبیاء کرام کو اپنے خاتمہ بالخیر کا یقین ہوتا ہے البتہ تعلیم امت کے لئے وہ بھی اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہتے ہیں۔ جب مؤمنین کو اللہ تعالیٰ کا خوف حاصل رہتا ہے تو وہ موت کی تمنا اس لئے نہیں کرتے کہ ہمیں رب کے حضور جانے سے ڈر لگتا ہے ہوسکتا ہے ہم عذاب میں مبتلاء نہ ہو جائیں۔ لیکن یہود تو خوف رکھتے ہی نہیں اس لئے ان کو موت کی تمنا کرنے کے متعلق کہا گیا کہ تم بلاخوف جنت میں پہنچ جاؤ۔

دوسرا جواب: یہود کا تو یہ دعویٰ تھا کہ ہم اللہ کے حبیب ہیں اور اللہ کے بیٹے ہیں اس لئے ان کو کہا گیا کہ تم موت کی تمنا کرو کیونکہ موت تمہیں تمہارے دعویٰ کے مطابق باپ اور محب تک پہنچائے گی۔ " ولا احد يرغب ولا ينفر عن الحبيب والاب " کوئی ایک اپنے حبیب اور اپنے باپ سے اعراض نہیں کرتا اور نفرت نہیں کرتا۔ جب تم تمنا نہیں کر رہے تو تم دعویٰ میں جھوٹے ہو۔

مؤمنین کا ایسا کوئی دعویٰ نہیں تھا بلکہ وہ تو اللہ تعالیٰ کے خوف سے لمبی حیات کو چاہتے تھے اور وہ یہ بھی ایمان رکھتے تھے کہ موت کا وقت مقرر ہے لہذا پہلے موت کی طلب مؤمنین سے ہو ہی نہیں سکتی۔

(از شیخ زادہ)

بہت خوبصورت عبارت:

" ان كنتم احباء الله فالمحبة داعية الى الشوق ، والشوق داع الى محبة لقاء المحبوب ومحبة لقائه داعية الى تمنى سهولة السبيل اليه ولا سبيل الى سهولة السبيل اليه الا بالموت فيجب ان يكون الموت متمنى فتركهم تمنى ذلك دلالة على ان لا محبة منكم له "

(شیخ زادہ)

اگر تم اپنے دعویٰ میں سچے ہو کہ تم اللہ کے محبوب ہو تو پھر تمہیں یہ خیال کرنا چاہئے کہ محبت شوق کی دعوت دیتی ہے اور شوق محبوب کی ملاقات کی محبت کی دعوت دیتا ہے اور محبوب کی ملاقات کی محبت وتمنا اس چیز کی تمنا کی دعوت دیتی ہے جس سے ملاقات کی آسانی سے راہ نکل آئے۔ تمہارے دعویٰ کے مطابق جو تمہارا محبوب اور محبّ ہے یعنی اللہ تعالیٰ اس کی ملاقات کی آسان راہ سوائے موت کے نہیں، تو ضروری ہے کہ موت کی تمنا کرو اگر تم نے موت کی تمنا نہ کی تو تم جھوٹے ہو تمہیں کوئی محبت نہیں۔

فائدہ جلیلہ : "لان من ایقن انہ من اھل الجنۃ اشتاقھا واحب التخلص الیھا من الدار ذات الشوائب"

ہاں جن کو یقین ہوتا ہے کہ وہ جنتی ہیں (وہ اللہ تعالیٰ کا خوف رکھتے ہیں) لیکن جنت کے حصول کے مشتاق ہوتے ہیں جنت سے ان کو محبت ہوتی ہے وہ تو بار بار اسے طلب کرتے ہیں۔

شربت الحب کا سا بعد کاس   وما نفد الشراب ولا رویت

میں نے محبت کا ایک پیالہ پیا پھر دوسرا پیا   (پیتا ہی رہا) نہ شراب محبت ختم ہوا نہ میں سیراب ہوا

محبت کی زیادتی تو چاہتی ہے کہ انسان اس کی طرح دیوانہ وار لپکے پیچھے ہٹ جائے تو محبّ کیسا؟ نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے "حبک الشئ یعمی ویصم" کسی چیز کی محبت تمہیں اندھا اور بہرا کر دیتی ہے۔ (رواہ احمد وابوداؤد عن ابی الدرداء ؓ صابونی ج اول ص ۸۹)

موت اور شیر خدا:

حضرت علی ؓ صفین (بکسر الصاد وتشدید الفاء وکسرھا، فرات کے کنارے ایک مقام) کے میدان میں ادھر ادھر گھوم رہے تھے ایک طرف آپ کے موافقین کی جماعت ہے اور دوسری طرف آپ کے مخالفین کی جماعت ہے۔ آپ نے ایک کرتی پہنی ہوئی ہے بلا خوف وخطر ادھر ادھر گھوم رہے ہیں آپ کے بیٹے حضرت امام حسن ؓ نے عرض کیا "ما ھذا بزی المحاربین" کیا جنگ کرنے والے ایسا ہی لباس پہنتے ہیں آپ زرع اور خود (لوہے کی ٹوپی) کا استعمال کریں۔

"فقال یا بنی لایبالی ابوک أعلی الموت سقط اما علیہ سقط الموت"

تو آپ نے فرمایا اے میرے پیارے بیٹے تیرے باپ کو کوئی پرواہ نہیں کہ موت پر گر

جائے یا موت اس پر گر جائے۔

موت کا انسان پر گرنا یہ معنی رکھتا ہے کہ انسان کے غالب گمان میں موت کے خطرات سامنے موت کے اسباب موجود ہیں۔ دشمن کی یلغار ہو میدان کارزار ہو جنگ کا گرم بازار ہو اس کے ہاتھ میں تلوار ہو۔ بڑا خوف وخطرہ دیوانہ وار جنگ کرتے ہوئے شہید ہو گیا تو یہ سمجھیں کہ وہ موت پر گر گیا کہ اس نے موت کو دبوچ لیا، موت کو جان چھڑانے نہیں دی، موت نکل کر جاتی کہاں اس کو تو بہادر مسلمان سے واسطہ پڑا ہوا تھا کسی کافر سے واسطہ ہوتا تو شائد موت اس سے بچ کر نکل جاتی۔ موت کا انسان پر گرنے کا یہ مطلب ہے کہ موت اس پر اچانک آ جائے وہ موت سے غافل تھا یا وہ موت سے بھاگ رہا تھا لیکن موت نے اسے دبوچ لیا۔

حضرت عمار رضی اللہ عنہ اور موت:

صفین کے میدان میں حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ دیوانہ وار یہ کہہ رہے تھے:

الآن القی الاحبة　　　　محمد اثم حزبه

اب میں اپنے محبوبوں سے ملاقات کروں گا　　　　وہ میرے محبوب محمد ﷺ اور ان کے اصحاب ہیں

کیا خوب تمنا تھی کہ موت جب احباء سے ملاقات کا ذریعہ ہے تو موت سے ڈر کیا؟ موت کی تو مجھے تمنا ہے کہ حبیب پاک اور یاران مصطفیٰ ﷺ سے ملاقات ہو گی۔ سبحان اللہ کیا خوب عقیدہ تھا صحابہ کرام کا کہ موت کے بعد حیات ہے اگر حیات (زندگی) نہیں تو ملاقات کا کیا مطلب؟

معلوم ہوا کہ صحابہ کرام کا یہ عقیدہ تھا موت مٹنے کا نام نہیں۔ موت تباہ و برباد ہونے کا نام نہیں۔ موت خاک کا ڈھیر بن جانے کا نام نہیں۔ موت کے بعد وہ زندگی حاصل ہوتی ہے جس میں پہلے تشریف لے جانے والے محبوبوں سے ملاقات ہوتی ہے۔

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ اور موت:

جب حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ پر موت کا وقت آیا آپ فرما رہے تھے:

جاء حبیب علی فاقة　　،　　فلا افلح الیوم من قد ندم

حبیب سے مراد موت ہے "علی فاقة" میں دو ترکیبیں ہیں یا تو حال ہے اس صورت میں معنی یہ ہوگا "جاء نی حبیب حال کونی محتاجا الیه و مشتاقا" میرے پاس میری محبوبہ موت آ گئی ایسے حال میں جب اس میں کا محتاج اور مشتاق ہوں۔

دوسری ترکیب کہ حذف مضاف ہو عبارت یوں ہو جائے "جاء علی ذی فاقة و حاجة الیه" معنی اس صورت میں بھی پہلے معنی کے قریب ہی ہوگا۔ دوسرا مصرع "فلا افلح الیوم من قد ندم" ماضی پر "لا" داخل ہے نفس پر بددعا کا احتمال بھی ہے اور شعر کے تسلسل کو قائم رکھنے کے لئے "لا" کو "ما" کی جگہ لایا گیا ہو اور خبر ہو یہ بھی احتمال ہے۔

اب شعر کا معنی واضح ہو گیا میرے پاس میرا حبیب (موت) آ گیا جب کہ میں اس کا محتاج اور مشتاق ہوں آج جو شخص نادم ہو گیا وہ کامیاب نہیں ہو سکتا۔ یا یہ کہا جائے اگر میں موت کو دیکھ کر آج نادم ہو جاؤں تو مجھے کامیابی حاصل نہ ہو۔ (از بیضاوی و شیخ زاده)

نتیجہ واضح ہوا کہ مومن موت سے ڈرتا ہی نہیں بلکہ خوشی سے موت کو گلے لگاتا ہے کافر بڑے دعوے کرتے ہیں بڑی بڑھکیں مارتے ہیں لیکن موت سے ایسے ڈرتے ہیں جیسے کوا غلیل سے ڈرتا ہے۔

یہود اگر موت کی تمنا کر لیتے:

"روی ابن عباس عن النبی ﷺ انه قال لو تمنوا الموت لغص کل انسان بریقه وما بقی علی وجه الارض یهودی الامات"

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ بیشک نبی کریم ﷺ نے فرمایا اگر وہ موت کی تمنا کر لیتے تو ان میں سے ہر شخص اپنی تھوک میں غوطے کھانے لگتا یعنی ہر ایک تباہ و برباد ہوتا، روئے زمین پر کوئی یہودی باقی نہ رہتا یہاں تک کہ وہ موت کی گرفت میں آ جاتا۔

(از خازن)

فائدہ: "نقل عن العشرة المبشرین بالجنة ان کل واحد منهم یحب الموت ویحن الیه"

وہ دس صحابہ کرام جن کے نام لے کر نبی کریم ﷺ نے ان کو جنت کی بشارت دی یعنی عشرہ مبشرہ میں سے ہر ایک موت سے محبت رکھتا تھا اور ہر کوئی موت کا مشتاق تھا۔ (مدارک)

فوائد عظیمہ:" اخرج ابن المبارک فی الزھد والبیھقی عن ابن عمر قال قال رسول اللہ ﷺ تحفۃ المؤمن الموت "

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مومن کا تحفہ موت ہے

☆ " وعن الحسین بن علی مرفوعا مثلہ بلفظ الموت ریحانۃ المؤمن "

حضرت امام حسین بن علی رضی اللہ عنہما سے مرفوع حدیث مروی ہے کہ موت مؤمن کے لئے گل ریحانہ ہے (پھول کا نام ریحانہ)۔

☆ " وقال حبان بن الاسود الموت جسر یوصل الحبیب الی الحبیب "

حضرت حبان بن اسود فرماتے ہیں موت ایک پل ہے جو دوست کو دوست تک پہنچاتا ہے۔

☆ " ان القبر اول منزل من منازل الآخرۃ " (رواہ الترمذی وابن ماجہ عن عثمان مرفوعا)

یہی آیت جو زیر بحث ہے اور جن احادیث کو ذکر کیا گیا ہے ان سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ قبر آخرت کی منازل میں سے پہلی منزل ہے۔ اسی پر ایک حدیث جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے مرفوع طور پر مروی ہے صراحتاً دلالت کر رہی ہے۔ (از مظھری)

موت کی تمنا اور دعا کا حکم: قاضی محمد ثناء اللہ مظہری رحمہ اللہ نے اس مسئلہ کو اسی آیۃ کریمہ کی تفسیر میں واضح طور پر ذکر کیا ہے اس کو ذکر کرنے میں کچھ تکرار بھی ہو جائے گا لیکن وضاحت کے لئے تکرار عذر کی حیثیت رکھتا ہے۔

سوال: کیا موت کی تمنا کرنا اور موت کے لئے دعاء کرنا جائز ہے؟

جواب: اگر مال میں نقصان ہو جانے کی تکلیف کو برداشت نہ کر سکنے کی وجہ سے یا جسمانی تکلیف کی وجہ سے موت کے لئے دعا کرے تو جائز نہیں۔ اسی طرح اہل وعیال کی تکالیف کو دیکھ کر یا اہل وعیال کی طرف سے حاصل ہونے والی تکالیف کے پیش نظر موت کی دعا کرے تو جائز نہیں۔

☆ " عن انس قال قال رسول اللہ ﷺ لا یتمنین احدکم الموت لضر نزل بہ فان کان ولا بد متمنیا فلیقل اللھم احینی ما کانت الحیوۃ خیر الی وتوفنی اذا کانت الوفاۃ خیر الی " (بخاری، مسلم)

حضرت انس ﷺ نے فرمایا رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے تم میں سے کوئی شخص بھی تکلیف آ جانے کی وجہ سے موت کی ہرگز تمنا نہ کرے۔ اگر موت کی تمنا اس کے لئے ضروری ہے تو وہ یہ دعا کرے اے اللہ جب تک میرے لئے زندگی بہتر ہے اس وقت تک مجھے زندہ رکھ اور جب میرے لئے موت بہتر ہو تو مجھے موت عطا کر دے۔

☆ " وفی روایة لهما " اذا مات احدکم انقطع عمله وانه لا یزید عمره الا خیرا "

بخاری و مسلم کی ایک روایت میں یہ ہے کہ جب تم میں سے کوئی ایک فوت ہو جائے تو اس کے عمل ختم ہو جاتے ہیں بیشک اس کی عمر کی زیادتی نہیں زیادہ کرتی کسی چیز کو سوائے اس کی بھلائی کے۔

اس حدیث سے بھی واضح ہوا کہ عمر کا زیادہ ہونا اس کی نیکیوں کے زیادہ ہونے کا سبب ہے۔

☆ " وعن ابی هریرة مرفوعا لا یتمنین احدکم الموت اما محسنا فلعل ان یزداد واما مسیئا فلعل ان یستعتب " (رواہ البخاری)

حضرت ابو ہریرہ ﷺ سے مرفوع حدیث مروی ہے کہ تم میں سے ہرگز کوئی ایک موت کی تمنا نہ کرے اگر وہ نیک ہوا تو ہو سکتا ہے (اس کو نیکی کے کام کرنے کی توفیق ہو جائے تو) اس کی نیکیاں بڑھ جائیں۔ اور اگر وہ گنہگار رہا تو ہو سکتا ہے رب تعالیٰ کو راضی کر لے یعنی توبہ کر لے۔

☆ "وعن ابی هریرة قال قال رسول الله ﷺ لا یتمنی احدکم الموت ولا یدع به من قبل ان یاتیه انه اذا مات انقطع عمله وانه لا یزید المؤمن عمراه الا خیرا " (رواہ مسلم)

حضرت ابو ہریرہ ﷺ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کوئی ایک تم میں سے موت کی تمنا نہ کرے اور نہ ہی موت کے لئے دعا کرے موت کے آنے سے پہلے اس لئے کہ جب کوئی فوت ہو جاتا ہے اس کے عمل ختم ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ مؤمن کی عمر کی زیادتی مؤمن کے لئے بہتر ہی ہوتی ہے۔

تنبیہ : موت کی تمنا زبان سے کرنا اور موت کا سوال منع ہے۔ تکالیف کے پیش نظر بھی موت کا خیال دل میں آ جانا دل میں موت کی رغبت کا آ جانا منع نہیں۔ کیونکہ یہ انسان کی قدرت سے باہر ہے۔

" واما ان کان التمنی لخوف الفتنة فی الدین فلا بأس به "

اگر دین میں فتنہ سے بچنے کے لئے موت کی تمنا کی جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔

☆ "واخرج مالک والبزار عن ثوبان فی دعائه ﷺ واذا اردت بالناس فتنة فاقبضنی

الیک غیر مفتون "

حضرت ثوبان ﷺ فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ یہ دعا فرماتے تھے (اے اللہ) جب تو لوگوں کو فتنہ میں مبتلا کرنے کا ارادہ فرمائے تو میری روح کو قبض کر لینا تا کہ بغیر فتنہ میں مبتلاء ہونے کے میں تیرے حضور پہنچ جاؤں۔

☆ " اخرج الطبرانی عن عمرو بن عنبسته عن رسول الله ﷺ قال لا یتمنی احدکم الموت الا ان لا یثق بعمله فان رأیت فی الاسلام ست خصال فتمنوا الموت و ان کانت نفسک فی یدک فارسلها اضاعة الدم و امارة الصبیان و کثرة الشرط و امارة السفهاء وبیع الحکم ونشؤ یتخذ القرآن مزا میر "

حضرت عمرو بن عنبسہ کہتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم میں سے کوئی ایک موت کی تمنا نہیں کرتا سوائے اس کے کہ اسے اپنے اعمال پر بھروسہ نہ ہو۔ اگر تم اسلام میں چھ چیزیں دیکھ لو تو پھر موت کی تمنا کرلو، اگر چہ تمہارا نفس تمہارے ہاتھ میں بھی ہو تو اسے چھوڑ دو،

(وہ چھ چیزیں یہ ہیں) ناحق مؤمنوں کا خون بہانا، اور چھوکروں (کم عمر لوگ) کی حکومت کا قائم کرنا، اور کثیر شرطیں لگانا، اور بے وقوفوں کا حاکم بن جانا، اور عدالتی فیصلوں کو بیچنا اور ایسی جماعت کا پیدا ہو جانا جو قرآن پاک گانے کی طرز پر پڑھیں۔

خیال رہے ایک اور حدیث پاک میں قطع رحم کا بھی ذکر ملتا ہے اس طرح گویا کہ سات چیزوں کا ذکر ہو گیا۔

رب کی ملاقات کا شوق: " واما ان کان التمنی شوقا الی لقاء الله تعالیٰ فذلک محمود "

اللہ تعالیٰ کی ملاقات کے شوق کی وجہ سے موت کی تمنا کرنا اچھا فعل، قابل تعریف عمل ہے۔

☆ " عن عائشة قالت کنت اسمع نه لا یموت نبی حتی یخیر بین الدنیا والآخرة قالت اصابت رسول الله ﷺ شدیدة فی مرضه فسمعته یقول مع الذین انعم الله علیهم من النبیین والصدیقین والشهداء والصالحین وحسن اولئک رفیقا ، فظننت انه خیر "

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں میں (اکثر اوقات حضور سے) سنا کرتی تھی کہ بیشک کوئی نبی

فوت نہیں ہوتے یہاں تک کہ ان کو اختیار دے دیا جاتا ہے دنیا میں رہیں یا آخرت کو پسند کریں، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں نبی کریم ﷺ جب شدید مرض میں تھے تو میں نے آپ کو یہ پڑھتے ہوئے سنا:
" مع الذین انعم اللہ علیھم من النبیین والصدیقین والشھداء والصالحین وحسن اولئک رفیقا "
تو میں نے سمجھ لیا کہ آپ کو بھی دنیا و آخرت کا اختیار دے دیا گیا (آپ نے آخرت کو پسند کرلیا)۔

☆ وروی النسائی عنها قالت اغمی رسول الله ﷺ وهو فی حجری فجعلت امسحه وادعو له بالشفاء بهذه الکلمات اذهب الباس رب الناس فافاق فانتزع یده من یدی فقال بل اسئل الله الرفیق الاعلی "

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں رسول اللہ ﷺ پر (آخری ایام مرض میں) بے ہوشی طاری ہوگئی، آپ کا سر مبارک میری گود میں تھا۔ میں نے آپ کے جسم پر پھر ہاتھ پھیر کر آپ کے لئے شفاء حاصل ہونے کی غرض سے دعا کرنے لگی "اے لوگوں کے رب آپ کی تکلیف کو دور فرما" آپ کو افاقہ ہوا تو آپ نے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ سے کھینچ لیا اور آپ فرمانے لگے بلکہ میں سوال کرتا ہوں اللہ تعالیٰ سے رفیق اعلیٰ کا، یعنی آپ اللہ تعالیٰ سے ہی ملاقات کرنے کے لئے بے تاب تھے، رفیق اعلیٰ سے مراد بھی رب تعالیٰ ہے آخری وصال کے وقت آپ کی بے قراری کی بھی یہی وجہ تھی۔

ان دونوں احادیث سے بھی واضح ہوا کہ رسول اللہ ﷺ وفات کی دعا فرما رہے تھے۔

☆ " واخرج الطبرانی ان ملک الموت جاء الی ابراهیم لیقبض روحه فقال ابراهیم یا ملک الموت هل رأیت خلیلا یقبض روح خلیله ، فعرج ملک الموت الی ربه فقال قل له هل رأیت خلیلا یکره لقاء خلیله فرجع فقال اقبض روحی الساعة "

ملک الموت (عزرائیل) حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس آیا تاکہ آپ کی روح کو قبض کرے تو ابراہیم علیہ السلام نے کہا اے ملک الموت کیا تم نے دیکھا ہے کہ دوست اپنے دوست کی روح کو قبض کرتا ہو۔ تو ملک الموت اپنے رب کے حضور حاضر ہوا (ابراہیم علیہ السلام کا پیغام پہنچایا) تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا، جاؤ میرے خلیل کو کہو کیا تم نے دیکھا ہے کہ کوئی دوست اپنے دوست سے ملنا ناپسند کرتا ہو، تو عزرائیل لوٹ کر ابراہیم علیہ السلام کے پاس آئے (اور اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچایا) تو ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا ابھی میری روح قبض کرلو۔

اعتراض : " روی احمد عن ابی امامة قال جلسنا الی رسول اللہ ﷺ فذکرنا ورققنا فبکی سعد بن ابی وقاص فاکثر البکاء فقال یا لیتنی مت فقال النبی ﷺ یا سعد اعندی تتمنی الموت فردد فذلک ثلاث مرات ثم قال یا سعد ان کنت خلقت للجنة فما طال عمرک وحسن عملک فھو خیر لک "

حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ہم رسول اللہ ﷺ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے آپ نے ہمیں رقت آمیز نصیحت فرمائی، تو حضرت سعد بن ابی وقاص بہت زیادہ روئے تو آپ نے کہا کاش کہ میں مرجاتا، تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا اے سعد کیا میرے پاس تم موت کی تمنا کرتے ہو آپ نے ان الفاظ کو تین مرتبہ لوٹایا، پھر فرمایا اے سعد اگر تم جنت کے لئے پیدا کئے گئے تو تمہاری لمبی عمر اور تمہارے اچھے عمل تمہارے لئے بہتر ہیں۔

اس حدیث پاک کو بیان کرنے کے بعد اعتراض کی دارومدار اس پر ہے کہ حضرت سعد موت کی تمنا اپنے مال یا اپنے جسمانی نقصان کی وجہ سے نہیں کررہے تھے، بلکہ اللہ تعالیٰ کے عذاب کے خوف سے موت کی تمنا کررہے تھے لیکن نبی کریم ﷺ نے منع فرمایا پتہ چلا کہ عذاب کے ڈر سے بھی موت کی تمنا جائز نہیں۔

جواب : منع اس لئے کیا گیا تھا کہ حضرت سعد ﷺ نے خیال کیا تھا کہ شائد موت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بچنا ممکن ہے۔ لیکن نبی کریم ﷺ کے منع کرنے کی وجہ یہ تھی:

" لکن الموت لا یغنی من عذاب اللہ شیئا بل لابد لذلک من الاستغفار والمبادرة فی الاعمال الصالحة والاجتناب عن المعاصی "

لیکن موت اللہ تعالیٰ کے عذاب سے نہیں بچاسکتی، بلکہ اس کے لئے ضروری ہے کہ استغفار کی جائے اور نیک اعمال کی طرف جلدی کی جائے اور گناہوں سے اجتناب کیا جائے۔

یعنی واضح ہوا کہ اگر معصیت کے ڈر سے موت طلب کی جائے کہ اللہ تعالیٰ مجھے موت عطاء کر کے گناہوں سے بچالے تو یہ یقینی طور پر جائز ہے۔ لیکن اگر موت اس لئے طلب کی جائے کہ موت کی وجہ سے عذاب سے بچ جاؤ تو اس کا فائدہ نہیں۔ کیونکہ گناہ توبہ سے معاف ہوتے ہیں موت سے معاف نہیں ہوتے۔

(ماخوذ از مظہری)

﴿ وَلَنْ يَّتَمَنَّوْهُ اَبَدًا بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ بِالظّٰلِمِيْنَ ﴾ (آیت ۹۵)

۱) ''اور ہرگز کبھی اس کی آرزو نہ کریں گے ان بداعمالیوں کے سبب جو آگے کر چکے ہیں اور اللہ خوب جانتا ہے ظالموں کو''۔

۲) ''اور ہرگز وہ نہیں تمنا کریں گے اس کی کبھی، بوجہ اس کے جو (برے اعمال) وہ پہلے کر چکے ہیں اور اللہ خوب جانتا ہے ظالموں کو''۔

یعنی یہود اگر چہ دعوی تو کرتے ہیں کہ جنت صرف ہمارے لئے ہے لیکن وہ اپنی بداعمالیوں کو جانتے ہوئے کبھی بھی موت کی تمنا نہیں کریں گے۔ یعنی حقیقت میں وہ خود بھی سمجھتے ہیں کہ جنت تو نیک لوگوں کے لئے ہے برے لوگوں کے لئے نہیں لہٰذا ان کا دعوی باطل ہے اور وہ ظالم ہیں ظالموں کو اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے۔

﴿ وَلَنْ يَّتَمَنَّوْهُ اَبَدًا بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ ﴾: ''اور ہرگز وہ نہیں تمنا کریں گی اس کی کبھی''۔ ضمیر منصوب کی موت کی طرف لوٹ رہی ہے اور ﴿ اَبَدًا ﴾ نفی کی تاکید کے لئے ہے زیادہ طور پر مثبت میں اس کا معنی ہوتا ہے ''ہمیشہ'' اور نفی میں ''کبھی بھی''۔ '' وهذه الجملة اخبار بالغيب '' یہ جملہ یعنی ﴿ وَلَنْ يَّتَمَنَّوْهُ اَبَدًا ﴾ غیبی خبر ہے:

'' فان عدم تمنيهم الموت في المستقبل وهو غيب لا يعلم بالحس ولا ببديهة العقل ولم ينصب عليه دليل ايضا فكانت الآية من المعجزات الدالة على حقية رسالة بنبينا عليه الصلوة والسلام ''

بیشک ان کا موت کی تمنا نہ کرنا مستقبل سے تعلق رکھتا ہے اور یہ غیب کا علم ہے نہ تو اس کا علم حواس سے حاصل ہوتا ہے اور نہ ہی بداہت عقل سے اور نہ ہی اس پر کوئی دلیل قائم ہے۔ اور یہ آیۃ نبی کریم ﷺ کے معجزات سے ہے جو آپ کی رسالت کی حقانیت پر دلالت کرتی ہے۔ کیونکہ نبی کریم ﷺ نے جو خبر دی وہی ہوا کیونکہ یہود تو آپ کی تکذیب کرنا غنیمت سمجھتے۔ اگر کوئی ان سے موت کی تمنا کرتا تو وہ کہتا کہ میں

موت کی تمنا کر رہا ہوں تو ضرور یہ بات مشہور ہوتی۔

لیکن وہ تو نبی کریم ﷺ کی اس خبر سے ایسے مبہوت ہوئے کہ انہیں معلوم تھا کہ نبی کریم ﷺ نے جو خبر دی وہ ہو کر رہے گی۔ ان کو یہ معلوم ہو چکا تھا کہ نبی کریم ﷺ فرما چکے ہیں کہ اگر کسی یہودی نے موت کی تمنا کی تو سب کے سب مر جائیں گے۔

اس واضح ارشاد کے بعد یہود سے موت کی تمنا ممکن ہی نہیں تھی۔ (از بیضاوی وشیخ زادہ)

تنبیہ: اس خبر کا تعلق نبی کریم ﷺ کے زمانہ کے یہود سے ہے، ہر زمانہ کے یہود سے نہیں۔ علامہ آلوسی رحمہ اللہ بیان فرماتے ہیں:

" والمراد لن یتمنوہ ما عاشوا ، وھذا خاص بالمعاصرین لہ ﷺ علی ما روی عن نافع ﷺ قال خاصمنا الیھودی وقال ان فی کتابکم ﴿فتمنو الموت﴾......الخ ، فانا اتمنی الموت ، فمالی لا اموت ، فسمع ابن عمر رضی اللہ عنھما فغضب فدخل بیتہ وسل سیفہ وخرج ، فلما رآہ الیھودی فر منہ ، وقال ابن عمر اما واللہ لو ادرکتہ لضربت عنقہ "

رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی ﴿ ولن یتمنوہ ابدا ﴾ ہرگز وہ موت کی تمنا بھی نہیں کریں گے، اس کا یہ مطلب ہے جب تک وہ زندہ رہیں گے یہ حکم نبی کریم ﷺ کے زمانہ کے یہود سے خاص ہے۔

اس پر دلیل وہ روایت جو حضرت نافع سے مروی ہے کہ ایک مرتبہ یہودی نے ہمارے ساتھ جھگڑا کیا اور کہا بیشک تمہاری کتاب میں ﴿ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ ﴾ مذکور ہے میں تو موت کی تمنا کر رہا ہوں مجھے موت کیوں نہیں آتی، حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے جب سنا تو آپ غصہ میں آ گئے، آپ اپنے گھر تشریف لے گئے تلوار سونت (تان) کر باہر تشریف لائے، یہودی کو جب پتہ چلا تو وہ بھاگ گیا، حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا خبردار قسم ہے اللہ تعالیٰ کی اگر میں اسے پا لیتا تو اس کی گردن اڑا دیتا۔ اس کے بعد حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا:

" توھم ھذا الکلب اللعین الجاھل ان ھذا لکل یھودی او للیھود فی کل وقت لا انما ھو لاولئک الذین کانوا یعاندون ویجحدون نبوۃ النبی ﷺ بعد ان عرفوا "

کہ اس جاہل نعتی کتے کو یہ غلط وہم ہوا کہ یہ حکم ہر زمانے کے ہر یہودی کے لئے ہے حالانکہ ایسا نہیں، بلکہ یہ ان یہود کے لئے جو نبی کریم ﷺ کی نبوت کو پہچان لینے کے باوجود انکار کرنے لگے اور آپ سے عناد رکھنے لگے۔

خیال رہے کہ ابتدائی طور پر حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کو شدید غصہ آیا حالانکہ آپ دھیمے مزاج کے تھے، اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اپنی ناسمجھی سے قرآن پاک پر غلط اعتراض کر رہا تھا۔ آپ سے یہ برداشت نہ ہوا تو آپ نے تلوار لے لی، لیکن بعد میں آپ نے ان کو کلام کے ذریعے سمجھایا کہ قرآن پاک کی آیۃ کریمہ کا اصل مطلب کیا ہے۔ علامہ آلوسی فرماتے ہیں " **وکانت المحاجة معهم باللسان دون السيف** " یہ حجت آپ نے ان پر زبان سے پیش فرمائی تلوار سے نہیں۔ (از روح المعانی)

اعتراض: یہ کیسے کہا گیا ہے کہ وہ ہرگز تمنا نہیں کریں گے حالانکہ تمنا تو دل کا کام ہے دل پر کوئی مطلع نہیں۔

جواب: ہم یہ تسلیم نہیں کرتے کہ تمنا یہاں دل کا فعل مراد ہے، بلکہ ہم کہتے ہیں زبان سے ان کا کہنا مراد ہے " لیت کذا " کاش کہ ایسا ہوتا۔ اگر تسلیم کر بھی لیا جائے کہ امر قلبی ہے تو پھر بھی ظاہر ہو جاتا کیونکہ وہ نبی کریم ﷺ سے مخالفت رکھتے تھے تو یقیناً وہ بتاتے کہ ہم تو تمنا کر رہے ہیں ہم پر موت کیوں نہیں آتی یہ مشہور ہو جاتا۔ (از روح المعانی)

سب سے بڑی بات یہ ہے کہ یہ نبی کریم ﷺ کا معجزہ ہے رب تعالیٰ نے آپ کو بتایا کہ وہ موت کی ہرگز تمنا نہیں کریں گے۔ جب رب تعالیٰ نے آپ کو ان کے دل کی تمنا پر، مطلع کر دیا تو اب یہ کہنا ممکن ہی نہیں کہ حضور کو ان کے دلوں پر اطلاع حاصل نہیں تھی۔

﴿ **بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ** ﴾: کا حقیقی معنی یہ ہے بسبب اس کے جو ان کے ہاتھوں نے پہلے کیا۔ یہاں اگرچہ حقیقی معنی بھی مراد لیا جا سکتا ہے کہ وہ موت کی تمنا ہرگز کبھی بھی نہیں کریں گے بوجہ توراۃ کی تحریف کرنے کے کیونکہ وہ جانتے ہیں جو اپنے ہاتھوں سے کسب کر چکے ہیں۔

تاہم یہاں مجازی معنی لینا بہتر ہے کیونکہ وہ عام ہے جس میں حقیقی معنی بھی "عموم المجاز" کے ضابطہ کے مطابق داخل ہے " ید " کا مجازی معنی "شخص" آتا رہتا ہے اور " ید " کا معنی "قدرت" بھی لیا جاتا ہے۔ یہاں مراد یہ ہے کہ جو ان کے نفسوں نے پہلے کیا۔

﴿ بِمَا قَدَّمَتْ اَیْدِیْهِمْ ﴾ ای بسبب ما عملوا من المعاصی الموجبة للنار کالکفر بمحمد ﷺ والقرآن وقتل الانبیاء "

یعنی وہ ہرگز موت کی تمنا نہیں کریں گی کبھی، بوجہ اس کے کہ جوانہوں نے گناہوں کا ارتکاب کیا ایسے گناہ جو جہنم میں لے جانے کا ذریعہ ہیں جیسا کہ نبی کریم ﷺ اور قرآن پاک سے کفر اور انبیاء کرام کو شہید کرنا ان کے لئے جہنم کے اسباب تھے۔

(از روح المعانی)

﴿ وَاللّٰهُ عَلِیْمٌ بِالظّٰلِمِیْنَ ﴾ : "اور اللہ خوب جانتا ہے ظالموں کو" ان کو جو یہ دعوی تھا کہ جنت تو صرف ہمارے لئے ہے کسی اور کے لئے نہیں یہ ظلم تھا کیونکہ وہ جنت کے مستحق نہیں اور مومن مستحق تھے انہوں نے الٹ بیان کیا۔ اور ان الفاظ مبارکہ میں ان کو دھمکی بھی دے دی گئی کہ اللہ تعالی جب ظالموں کے ظلم اور ان کے برے اعمال کو جانتا ہے تو وہ رب تعالی کی گرفت سے کیسے بچ سکیں گے۔ دوسری آیة میں اسی مفہوم کو واضح طور پر بیان کر دیا گیا:

﴿ ولا تحسبن الله غافلا عما یعمل الظالمون ﴾

"اور ہرگز گمان نہ کرو کہ اللہ غافل ہے اس چیز سے جو ظالم کرتے ہیں"

(از بیضاوی وشیخ زادہ)

نکتہ : یہاں ذکر فرمایا ﴿ وَلَنْ یَّتَمَنَّوْهُ اَبَدًا ﴾ لفظ "لن" سے نفی کی تاکید کی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس مقام پر ان کا دعوی بہت بڑا تھا کہ دار آخرت صرف ہمارے لئے خاص ہے باقی لوگوں کو اخروی نعمت اور جنت حاصل نہیں ہوگی۔ تو ان کے اس عظیم دعوی کو سخت تاکید سے رد کیا گیا اس لئے لفظ "لن" ذکر فرمایا کہ وہ ہرگز موت کی تمنا نہیں کریں گے پتہ چلا کہ وہ اپنے دعوی میں سراسر جھوٹے ہیں۔

لیکن سورۃ جمعہ میں بیان کیا گیا ﴿ ولا یتمنونه ابدا ﴾ یہاں لفظ "لا" ذکر کیا جو نفی تو کرتا ہے لیکن تاکید نہیں کرتا کیونکہ اس مقام پر ان کا دعوی تھا ﴿ انهم اولیاء الله من دون الناس ﴾ بیشک وہ اللہ کے دوست ہیں اور وہ لوگ اللہ کے دوست نہیں۔

اگر چہ دعوی ولایت بھی اعلی درجہ کا دعوی تھا لیکن یہ جنت میں جانے کا ذریعہ ہے اس لئے یہ دعوی پہلے دعوی سے کم درجہ ہے لہذا یہاں نفی "لا" کے ذریعے کر دی جس میں بنسبت "لن" کے کم قوت پائی گئی۔

(ماخوذ از کبیر)

﴿وَلَتَجِدَنَّهُمْ اَحْرَصَ النَّاسِ عَلٰی حَیٰوةٍ وَمِنَ الَّذِیْنَ اَشْرَکُوْا یَوَدُّ اَحَدُهُمْ لَوْ یُعَمَّرُ اَلْفَ سَنَةٍ وَمَا هُوَ بِمُزَحْزِحِهٖ مِنَ الْعَذَابِ اَنْ یُّعَمَّرَ وَاللّٰهُ بَصِیْرٌ بِمَا یَعْمَلُوْنَ﴾ (آیت ۹۶)

۱) ''اور بیشک تم ضرور انہیں پاؤ گے کہ سب لوگوں سے زیادہ جینے کی ہوس رکھتے ہیں اور مشرکوں سے ایک کو تمنا ہے کہ کہیں ہزار برس جئے اور وہ اسے عذاب سے دور نہیں کرے گا اتنی عمر دیا جانا اور اللہ ان کے کوتک دیکھ رہا ہے''۔

۲) ''اور البتہ تم ضرور برضرور پاؤ گے ان کو لوگوں سے زیادہ حریص زندگی پر اور مشرکوں سے (زیادہ حریص) پسند کرتا ہے ان میں سے ہر ایک کاش عمر دی جاتی اسے ہزار سال، حالانکہ وہ اسے عذاب سے دور نہیں کرے گا عمر کا دیا جانا، اور اللہ تعالیٰ دیکھ رہا ہے جو وہ عمل کرتے ہیں''۔

یہود چونکہ اپنے کفر اور برے اعمال سے اچھی طرح باخبر ہیں انہیں معلوم ہے کہ ان کا مقام جہنم ہے وہ تو صرف ظاہری ظاہری اپنے آپ کو ہی جنت کا مستحق مانتے ہیں۔ اسی لئے نبی کریم ﷺ کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ آپ ضرور برضرور ان کو دوسرے لوگوں سے زیادہ دنیا کی زندگی پر حریص پائیں گے بلکہ مشرک قیامت پر ایمان نہیں رکھتے ان سے بھی ان کو زیادہ حرص ہے زندگی پر تو وہ جنت کے مستحق کیسے ہوئے۔

ان میں سے ہر شخص چاہتا ہے کہ اسے بہت بڑی عمر دے دی جائے، لیکن ان کا بڑی عمر کی تمنا کرنا ان کو عذاب سے نہیں بچا سکے گا جتنی عمر بھی دے دی جائی آخر انہوں نے عذاب میں مبتلاء ہونا ہی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ ان کے اعمال کو دیکھ رہا ہے۔ ایسا بھی نہیں ہو سکے گا کہ وہ اپنے اعمال کو اللہ تعالیٰ سے مخفی رکھ سکیں۔

﴿ وَلَتَجِدَنَّهُمْ اَحْرَصَ النَّاسِ عَلٰی حَیٰوۃٍ ﴾

خطاب نبی کریم ﷺ کو یعنی ضمیر خطاب کا مرجع آپ ہیں۔ ''لام'' مؤطہ للقسم ہے اور ﴿تجدن﴾ وجود سے لیا ہوا ہے "الوجود بالعقل" کی دو قسمیں ہیں جب ''عرفت'' کے معنی میں ہو تو ایک مفعول کا تقاضا کرے گا۔ اور جب اس کا معنی "علمت" کی معنی کے قریب ہو تو دو مفعولوں کا تقاضا کرتا ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے پہلی آیۃ میں خبر دی ہے کہ وہ ہرگز موت کی تمنا نہیں کریں گے تو یہاں علمت والا معنی ہو گیا۔ اسی لئے اسکے دو مفعول ہیں ایک "ھم" اور دوسرا ﴿اَحْرَصَ النَّاسِ﴾

﴿حرص﴾ کا معنی شدت طلب، اور بعض حضرات نے کہا ہے کہ حرص ضد ہے قناعت کی یعنی تھوڑی چیز پر اکتفاء نہ کرنا حرص ہے۔

﴿حَیٰوۃٍ﴾ کو نکرہ ذکر کیا جس سے مراد حیات کے افراد سے ایک فرد یعنی حیات متطاولہ (لمبی زندگی) ہے اس لحاظ پر تنوین تعظیم کے لئے ہے۔ اگر تنوین تحقیر کے لئے ہو تو اس سے یہ مسئلہ ثابت ہو گا کہ وہ دنیا کی لمبی زندگی طلب کرتے ہیں لیکن وہ حقیر ہے یعنی اصل زندگی اخروی زندگی ہے رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی ﴿وان الدار الآخرۃ لھی الحیوان﴾ اسی پر دلالت کر رہا ہے۔ تیسرا احتمال یہ بھی ہے کہ تنوین ابہام کے لئے ہے مطلب یہ ہو گا کہ وہ مبہم زندگی کی حرص رکھتے ہیں۔ بعد میں ﴿اَلْفَ سَنَۃٍ﴾ سے لمبی زندگی کا ذکر کر دیا۔ (از بیضاوی و شیخ زادہ، روح المعانی)

﴿ وَمِنَ الَّذِیْنَ اَشْرَکُوْا ﴾ : اس میں اگرچہ ترکیب کے لحاظ پر تین احتمال ہیں البتہ آسان اور مشہور قول کو ہی نقل کرنے پر اکتفاء کر رہا ہوں۔ واؤ عطف کے لئے ہے معنوی صورت یہ ہو جائے گی " ان الیھود احرص الناس علی حیوۃ واحرص من الذین اشرکوا " کہ یہود دنیا کی زندگی پر لوگوں سے زیادہ حریص ہیں اور مشرکوں سے بھی زیادہ حریص ہیں۔ جس طرح یہ جملہ ذکر کیا جاتا ہے " ھو اسخی الناس ومن حاتم " وہ شخص لوگوں سے زیادہ سخی ہے اور حاتم سے بھی زیادہ سخی ہے۔

البتہ یہ خیال کیا جائے کہ مشرکین اگر چہ ﴿ النَّاسِ ﴾ ''لوگوں'' میں داخل ہیں لیکن ان کو علیحدہ ذکر کیا اس لئے کہ ان کو شدید حرص حاصل ہے اور یہود کی زیادہ توبیخ پائی گئی ہے کیونکہ مشرکین کا تو قیامت پر ایمان ہی نہیں۔ وہ تو دنیا کی زندگی کے بغیر کوئی اور زندگی جانتے ہی نہیں ان کا دنیا کی زندگی پر زیادہ حرص کرنا اس لئے ہے کہ وہ دنیا کو ہی اپنے لئے جنت سمجھتے ہیں۔ لیکن اہل کتاب جب قیامت کو بھی مانتے ہیں۔ اور یہ بھی دعوی کرتے ہیں کہ جنت کے حقدار صرف ہم ہی ہیں پھر ان کا مشرکوں سے بھی دنیا کی زندگی پر زیادہ حرص کرنا باعث مذمت اور باعث توبیخ ہے۔ یہود کی مشرکین پر دنیا کی زندگی میں زیادہ حرص کی وجہ یہ تھی:

" انهم علموا انهم صائرون الى النار لا محالة والمشركون لا يعلمون ذلك "

کہ وہ جانتے تھے کہ جو ہمارے عمل ہیں ان کی وجہ سے یقیناً ہم نے جہنم کی آگ میں ہی جانا ہے اس لئے وہ یہ تمنا کرتے تھے کہ اے اللہ ہمیں دنیا کی زندگی میں ہی رکھ تاکہ ہم عذاب سے بچ سکیں۔ لیکن مشرکین کو تو جہنم کی آگ کا کوئی علم ہی نہیں تھا لہٰذا ان کا دنیا کی زندگی کو صرف منافع کیے لئے پسند کرنا تھا نہ کہ کسی ڈر کی وجہ سے۔

﴿ يَوَدُّ اَحَدُهُمْ لَوْ يُعَمَّرُ اَلْفَ سَنَةٍ ﴾:

اگر ''لو'' ان مصدریہ کے معنی میں ہو تو اس صورت میں مطلب ہوگا پسند کرتا ہے ہر ایک ان میں سے ہزار سال عمر دیا جانا۔ اور اگر ''لو'' بمعنی ''لیت'' کے ہو یعنی تمنی کیے لئے تو معنی ہوگا، پسند کرتا ہے ہر ایک ان میں سے کاش کہ اسے عمر دی جاتی ہزار سال۔ (از جلالین، بیضاوی)

یعنی یہود مشرکوں سے بھی دنیا کی زندگی پر حریص تھے ان کی تمنا بھی ان کی طرح ہی تھی ﴿ مِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا ﴾ میں کئی احتمال ہیں ایک یہ ہے اس سے مراد مجوس (آگ پرست) ہوں کیونکہ وہ اپنے بادشاہ کو کہتے تھے '' عش الف نيروز '' تم ہزار نوروز زندہ رہو۔ اور اسی طرح کبھی کہتے '' عش الف مهرجان '' تم ہزار مہرجان زندہ رہو۔ چونکہ نوروز اور مہرجان سال میں ایک ایک مرتبہ آتے ہیں

اس لئے ان کا مطلب یہ ہوتا ''تم ہزار سال زندہ رہو''۔

اسی طرح عجمی مشرکین مراد ہوں کیونکہ وہ کہتے تھے ''زی ہزار سال'' ہزار سال زندہ رہو۔ اور اس سے مراد مشرکین عرب بھی لئے گئے ہیں اور اس سے مراد مطلقاً مشرکین بھی لئے گئے ہیں۔ اور یہ بھی خیال رہے کہ زیادہ مناسب قول یہ ہے کہ مشرکین سے مراد عام مشرک ہی ہوں۔ اور " المراد بالالف التکثیر وھو معروف فی کلام العرب " ہزار سال سے مراد خاص ہزار سال معین نہیں بلکہ مراد بہت سال اس طرح عرب میں زیادہ استعمال ہے۔

﴿ وَمَا هُوَ بِمُزَحْزِحِهٖ مِنَ الْعَذَابِ اَنْ یُّعَمَّرَ ﴾:

ضمیر غائب یعنی " ھو " کا مرجع " احدھم " ہے۔

" الزحزۃ، التبعید والانحاء " یعنی "مزحزح " کا معنی دور کرنا، اور کنارہ پر کرنا۔ یعنی ان میں سے جو کوئی بھی چاہتا ہے کہ اسے لمبی عمر عطاء کی جائے اسے لمبی عمر کا عطا کیا جانا عذاب سے دور نہیں کرسکتا۔ یعنی کتنی بھی عمر اسے دے دی جائے اسے عذاب حاصل ہونا ہی ہے۔

﴿وَاللّٰهُ بَصِیْرٌ بِمَا یَعْمَلُوْنَ ﴾:

''اور اللہ دیکھ رہا ہے جو وہ عمل کرتے ہیں''۔ یا یہ معنی کیا جائے ''اور اللہ جانتا ہے جو وہ عمل کرتے ہیں''۔ مطلب واضح ہے کہ ان کے کفریات رب کے علم میں ہیں تو ان کو لمبی عمر اس کے عذاب سے کیسے بچائے گی۔

☆☆☆☆☆

﴿ قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ فَاِنَّه نَزَّلَه عَلٰى قَلْبِكَ بِاِذْنِ اللّٰهِ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَهُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ﴾

۱) ''تم فرمادو جوکوئی جبریل کا دشمن ہوتو اس (جبریل) نے تو تمہارے دل پر اللہ کے حکم سے یہ قرآن اتارا اگلی کتابوں کی تصدیق فرماتا اور ہدایت و بشارت مسلمانوں کو''۔

۲) ''آپ فرمادیں جوشخص دشمن ہے جبریل کا تو بیشک اس نے اتارا ہے وہ (قرآن) تمہارے دل پر اللہ کے حکم سے، وہ تصدیق کرنے والا ہے اس چیز کی جوان کے پاس ہے اور ہدایت اور بشارت ہے مومنوں کے لئے''۔ (آیت نمبر ۹۷)

اس آیۂ کریمہ میں یہود کی ایک اور کجروی کا ذکر ہے کہ ایمان نہ لانے کے لئے انہوں نے جھوٹے بہانے بنانے شروع کئے۔

شان نزول: اس آیۂ کریمہ میں شان نزول کی چند وجوہ ہیں۔ یعنی چند واقعات کے در پیش آنے کے بعد یہ آیۂ کریمہ نازل ہوئی۔

(۱) " اخرج البخاری عن انس بن مالک قال سمع (عبد الله بن سلام) بمقدم رسول الله ﷺ وهو فی ارض یخترف فاتی النبی ﷺ فقال انی سائلک عن ثلاث لا یعلمهن الا نبی ما اول اشراط الساعة، وما اول طعام اهل الجنة، وما ینزع الولد الی ابیه او الی امه؟ قال اخبرنی بهذه جبریل آنفا، قال جبریل؟ قال نعم، قال ذاک عدو الیهود من الملائکة فقرأ هذه الاية ﴿ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ فَاِنَّه نَزَّلَه عَلٰى قَلْبِكَ ﴾ واما اول اشراط الساعة فنار تحشر الناس من المشرق الی المغرب واما اول طعام یاکله اهل الجنة فزیادة کبد الحوت، واذا سبق ماء الرجل ماء المرأة نزع الولد واذا سبق ماء المرأة نزعت، قال اشهد ان لا اله الا الله وانک رسول الله، یا رسول ان الیهود قوم بهت وانهم ان یعلموا باسلامی قبل ان تسألهم یبهتونی، فجاء ت الیهود فقال الیهود فقال لهم رسول الله ﷺ ای رجل عبد الله ابن سلام فیکم؟ قالوا خیرنا وابن خیرنا وسیدنا وابن سیدنا، قال ارأیتم ان اسلم؟ قالوا اعاذه الله من ذلک، فخرج عبد الله فقال اشهد ان لا اله الا الله واشهد ان

محمد ارسول اللہ فقالوا ھو شرنا و ابن شرنا و انتقصوہ فقال ھذا الذی کنت اخاف یا رسول اللہ "

حضرت انس بن مالک ﷺ فرماتے ہیں ایک شخص (عبداللہ بن سلام) نے سنا کہ نبی کریم ﷺ (یہاں) تشریف لائے ہیں وہ اپنے باغ میں پھل چن رہا تھا تو وہ نبی کریم ﷺ کے پاس آیا تو کہا بیشک میں آپ سے تین چیزوں کے متعلق سوال کرتا ہوں۔ جن کو نبی کے بغیر کوئی نہیں جانتا۔

(وہ پہلا سوال یہ ہے) قیمت کی نشانیوں میں پہلی نشانی کون سی ہوگی۔

(دوسرا سوال یہ ہے) کہ جنت والوں کا پہلا طعام کون سا ہوگا۔

(تیسرا سوال یہ ہے) کہ بچہ کبھی باپ کی شکل میں ہوتا ہے اور کبھی ماں کی شکل میں اسکی کیا وجہ ہے۔

نبی کریم ﷺ نے فرمایا ان چیزں کے متعلق ابھی مجھے جبریل نے آ کر بتایا ہے تو اس شخص نے کہا جبریل نے بتایا ہے؟ آپ نے فرمایا ہاں جبریل نے بتایا ہے وہ کہنے لگا فرشتوں میں سے جبریل تو یہود کا دشمن ہے۔ (اس وقت اس آیۃ کا نزول ہوا) تو نبی کریم ﷺ نے ﴿مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ فَإِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ﴾ اس آیۃ کو مکمل طور پر پڑھا۔ (پھر آپ نے سوالات کے جوابات دیئے) (آپ نے فرمایا پہلے سوال کا جواب یہ ہے) قیامت کی نشانیوں میں سے پہلی نشانی یہ ہے کہ آگ آئے گی جو لوگوں کو مشرق سے مغرب کی طرف جمع کر دے گی۔

(دوسرے سوال کا جواب یہ ہے) جنت والوں کو کھانے کے لئے سب سے پہلا طعام مچھلی کے جگر کا ایک حصہ دیا جائے گا۔ (تیسرے سوال کا جواب یہ ہے) جب مرد کا پانی (نطفہ) سبقت (پہل) کر جائے تو مرد بچے کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے (یعنی اس کا ہم شکل ہوتا ہے) اور جب عورت کا پانی سبقت کر جائے تو وہ اپنی طرف کھینچ لیتی ہے (یعنی بچہ اس کا ہم شکل ہوتا ہے)

تو اس شخص نے کہا " اشھد ان لا الہ الا اللہ و انک رسول اللہ " (یہ تھے حضرت عبداللہ بن سلام ﷺ) وہ کہنے لگے یا رسول اللہ بیشک یہود بہتان لگانے والی قوم ہے۔ اگر ان کو میرے ان سوالات کرنے سے پہلے اسلام قبول کرنے کا پتہ چلتا تو وہ مجھ پر بہتان لگاتے۔

تو (اتنی دیر میں) کچھ اور یہودی آ گئے نبی کریم ﷺ نے ان کو کہا عبداللہ بن سلام تم میں کیسا شخص ہے؟ وہ کہنے لگے کہ وہ تو ہم سے بہتر شخص ہے اور ہمارے بہتر شخص کا بیٹا ہے۔ وہ تو ہمارا سردار ہے اور ہمارے سردار کا بیٹا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا تمہاری کیا رائے ہے اگر وہ اسلام لے آئیں وہ کہنے لگے اللہ تعالیٰ اس کو اس (اسلام) سے اپنی پناہ میں رکھے۔ تو حضرت عبداللہ بن سلام باغ سے باہر تشریف لے آئے، اور یہ پڑھنے لگے " **اشهد ان لا اله الا الله واشهد ان محمدا رسول الله** " تو وہ یہودی کہنے لگے یہ ہم میں بہت برا شخص ہے اور ہم میں بہت برے شخص کا بیٹا ہے۔ اور عبداللہ بن سلام کی تنقیص بیان کرنے لگے (عیب لگانے شروع کر دیئے) تو حضرت عبداللہ بن سلام نے حضور کی خدمت میں عرض کیا یا رسول اللہ میں اسی (ان کی بہتان بازی) کا خوف رکھتا تھا۔

(۲) شان نزول کی دوسری وجہ یہ ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا یہود رسول اللہ ﷺ کے پاس آ کر کہنے لگے اے ابوالقاسم آپ ہمیں پانچ چیزوں کے متعلق خبر دیں۔

" **فان انبأتنا بهن عرضنا انک بنی واتبعناک** "

اگر آپ نے ان کی خبر دے دی تو ہم پہچان لیں گے کہ آپ نبی ہیں اور ہم آپ کی تابعداری کریں گے۔

نبی کریم ﷺ نے ان سے وعدہ لیا جیسا کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے بیٹوں سے (مصر کی روانگی پر) وعدہ لیا اور کہا " **والله علی ما نقول وکیل** " جو ہم کہتے ہیں اللہ اس پر کارساز ہے۔ پھر آپ نے فرمایا وہ لاؤ (یعنی جن چیزوں کے متعلق پوچھنا چاہو پوچھ لو) انہوں نے کہا آپ ہمیں نبی کی علامات کے متعلق خبر دیں آپ نے فرمایا " **تنام عيناه ولا ينام قلبه** " نبی کی آنکھیں سوتی ہیں اور دل نہیں سوتا۔

پھر انہوں نے کہا آپ ہمیں بتائیں " **کیف تؤنث المرأة کیف تذکر** " عورت کیسے کبھی مؤنث نما بچہ جنتی ہے اور کبھی مذکر نما، تو آپ نے ارشاد فرمایا:

" **يلتقي الماء ان فاذا علا ماء الرجل ماء المرأة اذكرت واذا علا ماء المرأة ماء الرجل انثت** "

دو پانی (مرد اور عورت کے) ملتے ہیں جب مرد کا پانی عورت کے پانی پر غالب

آ جائے تو عورت مذکر نما بچہ جنتی ہے اور جب عورت کا پانی مرد کے پانی پر غالب آ جائے تو عورت کا بچہ مؤنث نما ہوتا ہے۔

پھر انہوں نے کہا آپ ہمیں بتائیں حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے آپ پر کیا چیز حرام کی آپ نے فرمایا:

" كان يشتكى عرق النساء فلم يجد شيأ يلائمه الا البان كذا ، قال احمد قال بعضهم يعنى الابل فحرم لحومها "

کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کو عرق النساء کا درد لاحق تھا، کوئی چیز اس کے موافق نہ پائی سوائے اونٹوں کے دودھ کے، تو آپ نے اونٹوں کا گوشت اپنے آپ پر حرام کرلیا۔ یہود نے کہا آپ نے سچ کہا۔

پھر انہوں نے سوال کیا کہ آپ ہمیں بتائیں کہ رعد (بجلی کی کڑک) کیا چیز ہے؟ آپ نے فرمایا:

" ملك من ملائكة الله عزوجل موكل بالسحاب بيديه اوفى يديه مخراق من نار يزجربه السحاب يسوقه حيث امره الله تعالىٰ "

وہ اللہ تعالیٰ کے فرشتوں میں سے ایک فرشتہ ہے جو بادلوں پر مقرر ہے اس کے ہاتھ میں لوہے کی گرز ہوتی ہے جس کے ذریعے وہ بادلوں کو چلاتا ہے جہاں اللہ تعالیٰ اسے حکم دیتا ہے۔ پھر انہوں نے پوچھا، بجلی میں آواز کیا ہوتی ہے؟ آپ نے فرمایا " صوته " وہ فرشتے کی ہی آواز ہوتی ہے جو بادلوں کو چلاتے وقت وہ نکالتا ہے انہوں نے کہا آپ نے سچ فرمایا۔

پھر یہود نے کہا ایک سوال باقی رہ گیا ہے اس کا اگر آپ نے جواب دیا تو ہم آپ کی تابعداری کرلیں گے۔ (وہ سوال یہ ہے) کہ ہر نبی کے پاس ایک فرشتہ خبریں لاتا رہا آپ ہمیں بتائیں آپ کے پاس کون سا فرشتہ وحی لاتا ہے۔

" قال جبريل عليه السلام " نبی کریم ﷺ نے فرمایا جبریل علیہ السلام (وحی لاتے ہیں)۔

" قالوا جبريل ذلك الذى ينزل بالحرب والقتال والعذاب عدونا لو قلت ميكائيل الذى ينزل بالرحمة والقطر والنبات لكان "

وہ کہنے لگے جبریل تو جنگوں اور قتال کے احکام لاتا ہے اور عذاب مسلط کرتا ہے وہ ہمارا دشمن ہے اگر تم میکائیل کا نام لیتے تو پھر ہم ایمان لے آتے کیونکہ وہ رحمت اور بارش اور نباتات اگانے کے

احکام نازل کرتا ہے۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے اس آیۃ کریمہ کا نزول فرمایا۔ (روح احمد والترمذی والنسائی)

تنبیہ : بعض مفسرین نے اسی روایت کو ذکر کیا ہے جس میں یہ ذکر کیا گیا ہے کہ سوال کرنے والا ابن صوریا تھا راقم کے نزدیک کوئی تعارض نہیں۔ کیونکہ یہود کی ایک جماعت حاضر ہوئی سوال ابن صوریا نے کئے تصدیق کرنے والے دوسرے بھی تھے۔ (واللہ اعلم بالصواب)

(۳) شان نزول کی تیسری وجہ یہ تھی کہ حضرت عمر بن خطاب ﷺ اور یہود کے درمیان ایک مناظرہ ہوا۔ یہ آیۃ حضرت عمر ﷺ کی تائید میں نازل ہوئی۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ حضرت عمر ﷺ فرماتے ہیں کہ میں یہود کے مدرسہ میں حاضر ہوتا رہتا تھا وجہ اس کی یہ تھی:

" فاعجب من التوراۃ کیف تصدق القرآن ومن القرآن کیف یصدق التوراۃ "

کہ میں توراۃ کو سن کر تعجب کرتا تھا کہ توراۃ کیسے قرآن پاک کی تصدیق کرتی ہے اور قرآن پاک توراۃ کی کیسے تصدیق کرتا ہے۔

ایک دن یہود مجھے کہنے لگے اے ابن خطاب تمہارے تمام ساتھیوں سے تم ہمیں زیادہ اچھے لگتے ہو اور ہم تم سے محبت کرتے ہیں میں نے پوچھا اس کی وجہ کیا ہے؟ انہوں نے کہا کہ تم ہماری محافل میں آتے ہو۔ تو میں نے کہا بیشک میں تمہارے پاس صرف اس لئے آتا ہوں کہ میں تعجب کرتا ہوں کہ قرآن پاک کس طرح توراۃ کی تصدیق کرتا ہے اور توراۃ قرآن پاک کی کیسے تصدیق کرتی ہے۔

اتنے میں رسول اللہ ﷺ وہاں سے گزرے وہ کہنے لگے اے ابن خطاب وہ تمہارے صاحب ہیں ان سے جا کر ملو۔ آپ فرماتے ہیں میں نے انہیں کہا میں تمہیں اللہ تعالیٰ جس کے بغیر کوئی معبود نہیں کی قسم دلا کر کہتا ہوں میں تم سے نبی کریم ﷺ کے حقوق کی حفاظت کر مطالبہ نہیں کرتا۔ اور نہ ہی یہ کہتا ہوں کہ تم ان کی کتاب کو امانت کی طرح محفوظ رکھو۔ (پھر آپ نے کہا) کیا تم جانتے ہو کہ بیشک وہ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں؟ وہ خاموش رہے۔ ان کے بڑے عالم نے انہیں کہا اس شخص نے تمہارے ساتھ بہت سخت وعدہ لے کر کلام کیا ہے تم اسے جواب دو " قالوا فانت عالمنا و کبیرنا فاجبه انت " ان سب نے کہا تم ہمارے عالم ہو تم ہمارے بڑے ہو تم ہی اسے جواب دے دو۔

" قال اما اذا تشدتنا بما تشدتنا فانا نعلم انه رسول الله "

اس عالم نے کہا جب تم نے ہم سے اللہ تعالیٰ کی قسم دلا کر سوال کیا تو (اس کا جواب یہ ہے) کہ

بیشک ہم یقیناً جانتے ہیں کہ تحقیق وہ اللہ کے رسول ہیں۔ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں میں نے انہیں کہا ''تم برباد ہو جاؤ گے'' (یعنی آپ کی رسالت کا یقینی علم جب تمہیں حاصل ہو پھر ایمان نہ لانا دین و دنیا میں ہلاکت کا) نے کہا ہم ہلاک نہیں ہوں گے۔ میں نے کہا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ تم ہلاک نہ ہو جب تم جانتے بھی ہو کہ بیشک وہ اللہ کے رسول ہیں پھر تم ان کی تابعداری نہیں کرتے اور ان کی تصدیق نہیں کرتے۔ انہوں نے کہا فرشتوں میں ایک ہمارا دشمن ہے اور ایک ہمارا دوست ہے اور ان کی نبوت کا ساتھی یعنی ان کے پاس وحی لانے والا ہمارا دشمن ہے۔

" قلت و من عدو کم و من سلمکم ؟ قالوا عدونا جبریل و سلمنا میکائیل "

حضرت عمر فرماتے ہیں میں نے کہا تمہارا دشمن کون ہے اور دوست کون؟ انہوں نے کہا ہمارا دشمن جبریل ہے اور ہمارا دوست میکائیل ہے کیونکہ جبرئیل سخت طبیعت کا مالک ہے مشکلات اور سخت عذاب اور ہر قسم کی سختی کی وجوہ کو وہی لاتا ہے لیکن میکائیل رحمت اور مہربانی والا فرشتہ ہے۔

" قال قلت و ما منزلتهما من ربهما عزوجل ؟ قالوا احدهما عن یمینه والآخر عن یساره "

آپ فرماتے ہیں میں نے کہا ان دونوں کا اپنے رب تعالیٰ کے حضور کیا مقام ہے انہوں نے کہا ایک اس کے دائیں طرف ہوتا ہے اور دوسرا دوسری طرف ہوتا ہے۔ تو میں نے کہا قسم ہے اس ذات کی جس کے بغیر کوئی معبود نہیں جب ان دونوں کا یہ مقام ہے تو جو دشمن ہے وہ ان دونوں کا دشمن ہوگا اور جو دوست ہے دونوں کا دوست ہے۔ یہ ہو نہیں سکتا کہ جبریل میکائیل کے دشمن کا دوست ہو اور یہ بھی نہیں ہو سکتا کہ میکائیل دوست ہو جبریل کے دشمن کا۔

آپ فرماتے ہیں پھر میں کھڑا ہوا نبی کریم ﷺ کے پیچھے چلا، آپ ایک قبیلہ کے خوخہ (چھوٹا دروازہ) سے نکل رہے تھے۔ تو آپ نے فرمایا اے ابن خطاب کیا میں تمہیں وہ آیات نہ سناؤں جو ابھی تھوڑی دیر پہلے نازل ہوئیں۔ پھر آپ نے ﴿ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ ﴾ سے لے کر دونوں آیتوں کے آخر تک پڑھا۔ تو میں نے عرض کیا یا رسول اللہ میرے ماں باپ آپ پر قربان میں اسی ارادہ سے آیا تھا کہ آپ کو خبر دوں لیکن رب تعالیٰ لطیف و خبیر نے مجھ سے پہلے ہی آپ کو خبر دے دی۔

(ماخوذ از صاوی)

﴿ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰی قَلْبِکَ بِاِذْنِ اللّٰهِ ﴾ :

پہلی ضمیر " فانه " میں جبریل کی طرف لوٹ رہی ہے۔اور دوسری ضمیر " نزله " میں قرآن پاک کی طرف لوٹ رہی ہے۔اس لحاظ پر معنی ہوگا بیشک جبریل قرآن نازل کرتا ہے آپ کے دل پر اللہ کے حکم سے۔ایک اور احتمال یہ ہے کہ پہلی ضمیر اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹے اور دوسری جبریل کی طرف اس صورت میں معنی گا:

" فَاِنَّ اللّٰه نزل جبریل بالقرآن علی قلبک "

بیشک اللہ تعالیٰ نے جبریل کے واسطہ سے آپ کے دل پر قرآن نازل کیا اپنے ہی حکم سے۔

﴿ عَلٰی قَلْبِکَ ﴾ فرمایا " علیک " نہیں فرمایا اس لئے کہ یا تو ''قلب'' سے مراد روح ہے یعنی اس نے وحی نازل کی آپ کی روح پر،اور اگر ''قلب'' سے مراد خاص عضو ہو تو مراد محل فہم اور محل حفظ ہوگا کیونکہ باقی حواس باطنہ مراد نہیں ہوں گے۔مطلب یہ ہوگا کہ آپ کے دل پر قرآن نازل کیا تا کہ آپ سمجھ سکیں اور یاد کرسکیں۔

" وقیل کنی بالقلب عن الجملة الانسانیة کما یکنی ببعض الشئی عنه کله "

اور ایک مطلب یہ بھی ہے کہ ذکر قلب کا ہے اور مراد اس سے تمام انسانیت ہے جیسا کہ ذکر بعض اور مراد کل بطور مجاز مرسل آتا رہتا ہے۔اب اس صورت میں مطلب ہوگا ''بیشک اس نے آپ پر نازل کیا۔

" وقیل معنی ﴿ نَزَّلَهٗ عَلٰی قَلْبِکَ ﴾ جعل ﴿ قَلْبِکَ ﴾ متصفا باخلاق القرآن ومتأدبا بآدابه کما فی حدیث عائشة رضی اللّٰه عنها کان خلقه القرآن یرضی لرضاه ویغضب لغضبه "

اور اس کا یہ مطلب ہے کہ آپ کے دل پر قرآن نازل کیا کہ آپ کا دل قرآن پاک کے اخلاق سے متصف ہوگیا اور قرآن پاک کے آداب سے متصف ہوگیا۔جس طرح حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث پاک میں ہے کہ نبی کریم ﷺ کا خلق قرآن پاک ہے جن چیزوں کو قرآن پاک نے پسند فرمایا وہی نبی کریم ﷺ کو پسند تھیں۔اور جن چیزوں کو قرآن پاک میں ناپسندیدہ قرار دیا گیا وہ آپ کو ناپسند تھیں۔یعنی پسند یا ناپسند قدرتی طور پر قرآن پاک کے مطابق تھیں۔ان میں تکلف کی ضرورت نہیں تھی۔

تنبیہ : آیۃ کریمہ کی ابتداء " قل " سے ہے اے محبوب آپ فرمادیں اس کے مطابق عقل کا تقاضا

یہ ہے کہ "علی قلبی" ہونا چاہئے تھا لیکن نبی کریم ﷺ نے رب تعالیٰ کے قول کی حکایت بیان کی اوراشارہ فرمایا کہ قائل سفیر محض (فقط بیان کرنے والا) ہے۔

﴿ بِاِذۡنِ اللّٰہِ ﴾: اذن کا معنی بتانا، اجازت دینا، رخصت دینا یہاں اجازت دینا مراد ہو''اللہ کی اجازت سے'' تو پھر بھی درست ہے۔اور مجازی معنی لیا جائے''اللہ کے حکم سے'' یا مجازی معنی یہ لیا جائے اللہ تعالیٰ کی طرف سے طاقت دینے سے۔یا یہ معنی ہو''اللہ تعالیٰ کے اختیار دینے سے'' سب معانی درست ہیں۔

﴿ مُصَدِّقًا لِّمَا بَیۡنَ یَدَیۡهِ ﴾ : لفظی معنی اس طرح ہے''تصدیق کرنے والا ہے اس چیز کی جوان کے ہاتھوں کے درمیان ہے'' مرادی معنی یہ ہے''تصدیق کرنے والا ہے اس چیز کی جوانکے سامنے ہے''۔

﴿ مُصَدِّقًا لِّمَا بَیۡنَ یَدَیۡهِ ﴾ من الکتب الالٰھیة التی معظمها التوراة"

قرآن پاک تمام کتب الاھیہ کی تصدیق کرنے والا ہے ان تمام میں سے معظم توراۃ ہے۔ یہاں توراۃ ہی مرادلینا بہتر ہے کیونکہ خطاب یہود کو ہو رہا ہے۔

﴿ وَهُدًی وَّبُشۡرٰی لِلۡمُؤۡمِنِیۡنَ ﴾ : ''اور ہدایت اور بشارت ہے مومنوں کے لئے'' قرآن پاک اگرچہ تمام لوگوں کے لئے ہدایت ہے لیکن اس ہدایت کو قبول مومنوں نے کیا لہٰذا مومنین کا خصوصی ذکر فرمایا اور بشارت بھی یقیناً مومنوں کے لئے ہی ہے جنھوں نے ایمان لایا ہدایت کو قبول کیا وہی جنت اور جنت کی نعمتوں کی بشارت کے مستحق ہیں۔

آیۃ کریمہ سے حاصل ہوا: حضرت جبریل علیہ السلام کی شان بلند ہے آپ رفیع القدر اسلئے کہ اللہ تعالیٰ اور اشرف الخلوق حضرت محمد ﷺ کے درمیان واسطہ ہیں۔اور اس کتاب کو نازل کرنے والے ہیں جو صفات عظیمہ والی ہے۔جن میں سے کچھ کا ذکر اس آیۃ میں ہی کر دیا گیا اور اسی آیۃ کریمہ سے یہود کا باعث مذمت ہونا واضح ہو گیا:

" حیث ابغضوا من کان بھذه المنزلة العظیمة الرفیعة عند الله تعالیٰ "

کیونکہ انہوں نے اس ذات سے بغض کیا جس کا مقام رب تعالیٰ کے ہاں بہت ہی بلند و بلا ہے۔

﴿ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَرُسُلِهٖ وَجِبْرِيْلَ وَمِيْكٰلَ فَاِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِيْنَ ﴾ (آیت ۹۸)

۱) ''جو کوئی دشمن ہو اللہ اور اس کے فرشتوں اور اس کے رسولوں اور جبریل اور میکائیل کا تو اللہ دشمن ہے کافروں کا''۔

۲) ''جو شخص ہے دشمن اللہ کا اور اس کے فرشتوں کا اور اس کے رسولوں کا اور جبریل کا اور میکائیل کا تو بیشک اللہ دشمن ہے کافروں کا''۔

اس آیۃ میں یہود کا رد کیا گیا ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتوں اور اس کے رسولوں اور جبریل اور میکائیل کا دشمن ہے وہ کافر ہے، اللہ تعالیٰ کافروں کا دشمن ہے یعنی ان کو دائمی عذاب میں مبتلاء فرمائے گا ان کا ٹھکانا جہنم ہوگا۔

اعتراض : " العداوۃ للشئی طلب الاضرار به بغضاله "

کسی کے ساتھ بغض رکھنے کی وجہ سے اسے نقصان پہنچانے کی طلب کرنا عداوت کہلاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کو نقصان پہنچانا جب ممکن نہیں۔ کسی کو اس کی طاقت حاصل نہیں تو اللہ تعالیٰ کے ساتھ دشمنی کرنے کا کیا مطلب ہو سکتا ہے؟

پہلا جواب: اللہ کے ساتھ عداوت رکھنے کا مجازی معنی معتبر ہے کہ عناد کی وجہ سے رب تعالیٰ کے احکام کی مخالفت کرنا اور رب تعالیٰ کی طاعت کو ناپسند سمجھنا گویا کہ عداوت ہی ہے۔ کیونکہ دشمن بھی اپنے دشمن کے احکام کو پرواہ میں نہیں لاتا اور اپنے دشمن کی فرمانبرداری نہیں کرتا۔

دوسرا جواب: اصل میں مقصد تو رب تعالیٰ کے مقربین کی عداوت کا ذکر کرنا تھا۔

" الا انه افتتح الکلام بذکر عداوۃ اللہ تعالیٰ تمهیدا لذکرهم و تعظیما لهم وبیانا لفضل منزلتهم "

لیکن ابتداء کلام میں اللہ تعالیٰ کی عداوت کا ذکر درحقیقت ان کے ذکر کے لئے تمہید ہے۔ اور ان

کی عظمت کے ذکر اور ان کی فضیلت مراتب کا ذکر ہے۔ جیسا کہ رب تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ ﴾ — الخ

اس میں مال غنیمت کے مصارف کا ذکر کیا گیا:

" فصدر مصارف خمس الغنیمة بذکره تعالیٰ تعظیما لهم لا لبیان انه تعالیٰ من جملة المصارف "

اور غنیمت کے خمس کے مصارف کو اللہ تعالیٰ کے ذکر سے شروع فرمایا صرف ان مصارف کی تعظیم کے لئے کیونکہ اللہ تعالیٰ کی ذات پاک کوئی مصرف نہیں۔

تیسرا جواب: اللہ تعالیٰ کی عداوت سے مراد درحقیقت اللہ کے بندوں کی عداوت ہے جس کا بعد میں بیان آ رہا ہے کہ وہ اللہ کے بندے کون ہیں۔ اللہ کے فرشتے اور اس کے رسول اور جبریل میکائیل ہیں۔ جیسا کہ رب تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ ان الذین یحاربون الله ورسوله ﴾ اور ارشاد گرامی: ﴿ ان الذین یؤذون الله ورسوله ﴾ بیشک مراد ان دونوں آیتوں میں:

" بیان حکم محاربة عباد الله وایذائهم دونه لا ستحالة المحاربة والاذیة علیه تعالیٰ "

پہلی آیۃ میں ذکر ہے (بیشک وہ لوگ جو اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کرتے ہیں) اور دوسری آیۃ میں ذکر ہے "بیشک وہ لوگ جو اللہ اور اس کے رسول کو ایذاء دیتے ہیں" (تکلیف پہنچاتے ہیں) ان دونوں آیتوں میں بھی ذکر تو اللہ تعالیٰ کا ہے لیکن مراد اس کے بندے ہیں۔ کیونکہ اللہ سے جنگ کرنا اور اللہ تعالیٰ کو ایذاء دینا محال ہے کسی انسان کو طاقت ہی نہیں۔ (از شیخ زادہ)

جبریئل ومیکائیل کو علیحدہ ذکر کرنے کی وجہ:

ملائکہ کا ذکر جب پہلے ہو گیا تو اسی میں جبریئل اور میکائیل کا ذکر بھی ہو گیا ان کو دوبارہ ذکر کرنے کی وجہ کیا ہے؟ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ ان دونوں کی فضیلت کو ذکر کرنا مقصود تھا کہ یہ دونوں اپنی رفعت شان کے لحاظ پر گویا کہ ملائکہ سے علیحدہ جنس ہیں:

" فان التغایر فی الوصف قد ینزل منزلة التغایر فی الذات "

بیشک تغایر وصفی کو کبھی تغایر ذاتی کے درجہ میں سمجھ لیا جاتا ہے۔ جیسا کہ ابو الطیب نے کہا:

فان تفق الانام وانت منهم ، فان المسک بعض دم الغزال

اگر چہ لوگ تمام ایک جیسے ہیں اور تم بھی ان میں سے ہو بیشک کستوری بھی ہرن کے خون کا حصہ ہی ہے

یعنی جس طرح کستوری ہرن کے خون کا حصہ ہونے کے باوجود علیحدہ حیثیت رکھتی۔ اسی طرح ابو الطیب نے اپنے ممدوح کو کہا تم اگر چہ لوگوں میں سے ہی ہو لیکن بلند شان رکھنے کی وجہ سے گویا کہ تمہاری حیثیت دوسرے لوگوں سے علیحدہ ہے۔

دوسری وجہ ان دونوں فرشتوں کو علیحدہ ذکر کرنے کی یہ ہے کہ یہ بتانا مقصود ہے:

" من عادی احدهم فکانما عادی الجمیع فی انه کافر "

کہ جس نے اللہ تعالیٰ کے رسولوں میں سے کسی ایک کے ساتھ دشمنی کی اس نے تمام سے ہی دشمنی کی ایک سے دشمنی کرنا بھی کفر ہے اور سب سے دشمنی کرنا بھی کفر ہے۔

خیال رہے کہ یہاں " رسل " سے مراد عام ہے جو پیغمبروں اور رسولوں سب کو شامل ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے:

﴿ الله یصطفی من الملائکة رسلا و من الناس ﴾

''اللہ تعالیٰ نے ملائکہ اور لوگوں سے رسولوں کو برگزیدہ بنایا''۔

جب کہ ملائکہ کا ذکر رسل میں آسکتا تھا تو علیحدہ ذکر کیا کیونکہ یہود کا رد اس بات کا کرنا مقصود تھا (کہ جبریل ہمارا دشمن ہے)۔

کسی ایک سے دشمنی پر وعید نبی کریم ﷺ کے ارشاد سے ثابت ہے۔ بخاری نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا:

" قال رسول الله ﷺ من عادی لی ولیا فقد بارزنی بالحرب "

''رسول اللہ ﷺ نے فرمایا (جس نے میرے ولی سے دشمنی کی تحقیق وہ میرے مقابل جنگ کے لئے آ گیا'' (حدیث قدسی)

نتیجہ واضح ہوا:

" ان من عادی ولیا لله فقد عادی الله ومن عادی الله فان الله عدوله ومن کان الله عدوه فقد خسر الدنیا والآخرة "

بیشک جس نے اللہ کے ولی سے دشمنی کی تحقیق اس نے اللہ سے دشمنی کی جس نے اللہ سے دشمنی کی بیشک اللہ اس کا دشمن ہوا۔ جس کا اللہ دشمن ہوا وہ دنیا اور آخرت میں خسارے میں رہا۔

تیسری وجہ ان دونوں فرشتوں کو علیحدہ ذکر کرنے کی یہ تھی:

" ان المحاجة التی وقعت بین الیهود ورسول الله ﷺ کانت فیهما والآیة انما نزلت بسببهما فلا جرم نص علی اسمیهما "

یہود اور رسول اللہ ﷺ کے درمیان جو بحث ہوئی۔ اس میں یہود نے ان دونوں فرشتوں کا ہی ذکر کیا کہ جبریل ہمارا دشمن ہے اور میکائیل ہمارا دوست ہے آیۃ کریمہ کا جب شان نزول ہی یہ ہے تو اسی وجہ سے ان دو کا صراحۃً ذکر کیا گیا۔

" فاعلمهم الله تعالیٰ ان من عادی واحدا منهما فقد عادی الآخر وعادی الله ایضا "

تو اللہ تعالیٰ نے ان کو بتایا کہ جو شخص ایک کا دشمن ہوگا وہ حقیقت میں دونوں کا ہی دشمن ہوگا، بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کا بھی دشمن ہوگا۔ لہٰذا تمہارا یہ کہنا باطل ہے کہ ایک دشمن ہے اور دوسرا دوست ہے۔

(ماخوذ از شیخ زادہ وصاوی و ابن کثیر)

وجہ تسمیہ: " قال الماوردی ان جبریل ومیکائیل اسمان احدهما عبد الله والآخر عبید الله لان ایل هو الله تعالیٰ وجبر هو عبد ومیکا هو عبید فکان جبریل عبد الله ومیکائیل عبید الله "

" ایل " اللہ تعالیٰ کا اسم گرامی ہے۔ یعنی " ایل " کا معنیٰ "اللہ" اور "جبر" کا معنیٰ "عبد" اور "میکا" کا معنیٰ "عبید" ہے۔ اس طرح جبریل کا معنیٰ "عبداللہ" اور میکائیل کا معنیٰ "عبیداللہ"۔ اور بعض حضرات نے اسرافیل کا معنیٰ "عبدالرحمٰن" بیان کیا۔

☆ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں رسول اللہ ﷺ یہ پڑھتے تھے:

" اللهم رب جبریل ومیکائیل واسرافیل اعوذ بک من حر النار وعذاب القبر "

(از قرطبی)

اور حدیث شریف میں یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ رات کو قیام فرماتے اور یہ دعا پڑھتے:

" اللهم رب جبرائیل ومیکائیل واسرافیل فاطر السموت والارض عالم الغیب والشهادة انت تحکم بین عبادک فیما کانوا فیه

یختلفون اهدنی لما اختلف فیه من الحق باذنک انک تهدی من تشاء الی صراط مستقیم" (ابن کثیر)

لفظ جبریل کے متعلق: اس لفظ میں آٹھ لغات پائی گئی ہیں تاہم چار زیادہ مشہور ہیں:

(۱) جبریل (بکسر الجیم) یہ لغت ہے بنی حجاز کی۔ (۲) جبریل (بفتح الجیم) یہ حسن اور ابن کثیر کی قراءۃ ہے۔ (۳) جبرئیل (بروزن سلسبیل) یہ اہل کوفہ کی قراءت ہے۔ (۴) جبرائیل (بکسر الجیم، والھمزۃ بعد الالف)۔

لفظ میکائیل کے متعلق: اس لفظ میں چھ لغات ہیں تین ان میں سے زیادہ مشہور ہیں:

(۱) میکال، یہ بنی حجاز کی لغت، اسی لغت کے مطابق قرآن پاک میں پڑھا جارہا ہے۔

(۲) میکاییل (الف کے بعد دو یا ہیں یہ نافع کی قراءت ہے)۔

(۳) میکائیل (الف کے بعد ہمزہ اور یا ہے) یہ ہمزہ کی قراءت ہے۔ (ماخوذ از قرطبی)

جبریل کی افضلیت: حضرت جبریل علیہ السلام کی افضلیت پر ایک دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کا ذکر پہلے کیا ہے اور میکائیل علیہ السلام کا بعد میں۔ ان کا پہلے ذکر کیا جانا ان کی فضیلت پر دلالت کرتا ہے کیونکہ اکثر طور پر افضل کا ذکر پہلے کیا جاتا ہے اگر چہ کبھی اس کے خلاف بھی واقع ہو جاتا ہے۔

دوسری دلیل یہ ہے کہ جبریل قرآن پاک نازل کرتے رہے وحی لاتے رہے اور علم ان کے واسطہ سے ہی نبی کریم ﷺ کی امت کو دیا گیا " وھو مادۃ بقاء الارواح " علم روحوں کی بقاء کا مادہ ہے۔ اور اسرافیل خوشحالی اور بارشیں لاتے ہیں یہ بدنوں (جسموں) کی بقاء کا مادہ ہے۔

" ولما کان العلم اشرف من الاغذیۃ وجب ان یکون جبریل افضل من میکائیل "

جب علم غذاؤں سے اشرف ہے تو ضروری ہے کہ جبریل افضل ہوں میکائیل سے۔

تیسری دلیل یہ ہے کہ جبریل کا وصف رب تعالیٰ نے بیان فرمایا ﴿ مطاع ثم امین ﴾ مطلقاً جب جبریل کو مطاع کہا گیا کہ ان کی طاعت فرشتے کرتے ہیں تو پتہ چلا کہ تمام فرشتے آپ کی طاعت کرنے والے ہیں:

" وظاھرہ یقتضی کونہ مطاعا بالنسبۃ الی میکائیل فوجب ان یکون افضل منہ "

اسی سے یہ بھی ظاہر ہو جاتا ہے کہ آپ کی طاعت کرنے والے میکائیل بھی ہیں۔ لہذا میکائیل سے جبریل کا افضل ہونا واضح طور پر ثابت ہو گیا۔ خیال رہے کہ راقم نے اس مقام پر روح المعانی کو بھی دیکھا تاہم کبیر کی بحث کو مفید پا کر ذکر کیا گیا۔

﴿وَلَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَیْکَ اٰیٰتٍ بَیِّنٰتٍ وَمَا یَکْفُرُ بِهَآ اِلَّا الْفٰسِقُوْنَ﴾ (آیت ۹۹)

۱) "اور بیشک ہم نے تمہاری طرف روشن آیتیں اتاریں اور انکے منکر نہ ہوں گے مگر فاسق لوگ"۔

۲) "اور البتہ تحقیق نازل کیں ہم نے تمہاری طرف واضح آیات، اور نہیں کفر کرتے ان کے ساتھ مگر فاسق لوگ"۔

"اعلم ان هذا نوع آخر من قبائحهم وفضائهم" اس آیۂ کریمہ میں یہود کے اور قبیح اقوال اور ان کے لئے رسوا کن عذاب کا ذکر ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی واضح آیات کا انکار کر کے کافر ہو گئے اور دائمی عذاب کے مستحق ہو گئے۔

شانِ نزول کی دو وجہ:

(۱) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے یہود اوس اور خزرج پر رسول اللہ ﷺ کی بعثت سے پہلے آپ کے وسیلہ سے فتح طلب کرتے تھے آپ جب عرب میں مبعوث ہوئے تو انہوں نے آپ کا انکار کیا اور کفر میں مبتلا ہو گئے تو حضرت معاذ بن جبل ﷛ نے فرمایا اے یہود کے قبیلہ اللہ سے ڈرو اور اسلام لے آؤ۔

"فقد كنتم تستفتحون علينا بمحمد ونحن اهل الشرك وتخبروننا انه مبعوث وتصفون لنا صفته"

تم تو ہم پر محمد (ﷺ) کے وسیلہ سے فتح طلب کرتے تھے اور ہم مشرک تھے تم ہمیں خبر دیتے تھے کہ وہ مبعوث ہونے والے ہیں تم ان کی صفات ہمارے سامنے بیان کرتے تھے۔

"فقال بعضهم ما جاء نا بشئی من البينات وما هو بالذی كنا نذكر لكم فانزل الله تعالىٰ هذه الاية"

ان میں سے کسی نے کہا یہ شخص ہمارے پاس کوئی واضح نشانیاں نہیں لایا۔ یہ وہ شخص نہیں جس کا ہم تمہارے سامنے ذکر کرتے تھے تو اللہ تعالیٰ نے اس آیۃ کریمہ کو نازل فرمایا۔

(از کبیر)

(۲) شان نزول کی دوسری وجہ یعنی ان دو واقعات کے بعد اس آیۃ کا نزول ہوا یہ بھی خیال رہے کہ یہ دونوں قول حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے ہیں۔ اس آیۃ کریمہ کے نازل ہونے کا سبب حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ مروی ہے کہ ابن صوریا نبی کریم ﷺ کی خدمت میں آیا:

"وقال الرسول اللہ ﷺ ما جئتنا بشئی نعرفه وما انزل علیک من آیات فنتبعک"

اور آپ کو کہنے لگا تم ہمارے پاس کوئی نشانی نہیں لائے کہ ہم تمہیں پہچان لیں اور تم پر کوئی آیات نازل نہیں ہوئیں کہ ہم تمہیں تابعداری کریں۔ اس وقت اس آیۃ کا نزول ہوا۔ (از روح المعانی)

﴿ وَلَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَیْکَ اٰیٰتٍ بَیِّنٰتٍ ﴾:

"ای انزلنا الیک یا محمد علامات واضحات دالات علی نبوتک"

نبی کریم ﷺ کو خطاب کرتے ہوئے رب تعالیٰ نے فرمایا "البتہ تحقیق ہم نے نازل کیں آپ کی طرف واضح نشانیاں جو آپ کی نبوت پر دلالت کرتی ہیں۔

وہ آیات کیا ہیں؟ وہ آیات یہ ہیں جن پر کتاب اللہ (قرآن پاک) مشتمل ہے یعنی یہود کے علوم کی مخفی باتیں، اور ان کی خبروں کے چھپے ہوئے راز، پہلے بنی اسرائیل (یعنی گزرے ہوئے) کی خبریں۔ اور ان کی کتابوں میں جو کچھ تھا ان کی خبریں قرآن پاک نے دیں حالانکہ تمام یہود بھی وہ نہیں جانتے تھے صرف ان کے علماء اور پادری جانتے تھے۔ بنی اسرائیل کے پہلے لوگوں نے جو تحریف کی قرآن پاک نے اس کا بھی بتایا۔ اور ان کے بعد میں آنے والوں نے جو تحریف کی اس کے متعلق بھی بتایا۔ پھر جو احکام انہوں نے بدلے رب تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ پر کتاب نازل کر کے انکو اطلاع دی۔

﴿ فکان فی ذلک من امرہ الآیات البینات لمن انصف من نفسه ﴾

اگر کوئی اپنے آپ پر انصاف کرتے ہوئے حق گوئی سے کام لے تو وہ یقیناً یہ کہے گا کہ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ پر واضح آیات کو نازل فرمایا۔

(از صابونی)

آیات سے مراد قرآن پاک کی آیات ہوں کیونکہ ظاہر یہی ہے۔ لیکن اگر اس کے ساتھ باقی تمام دلائل بھی مراد ہو جائیں تو زیادہ بہتر ہے۔

" وقال بعضهم لا يمتنع ان يكون المراد من الآيات البينات القرآن مع سائر الدلائل نحو ام تناعهم من المباهلة ومن تمنى الموت وسائر المعجزات نحو اشباع الخلق الكثير من الطعام القليل ونبوع الماء من بين اصابعه وانشقاق القمر "

بعض حضرات نے یہ بیان کیا ہے کہ اس میں کوئی وجہ امتناع کی نہیں کہ قرآن پاک کی آیات بینات کے ساتھ دوسرے تمام دلائل بھی مراد لئے جائیں۔ ان لوگوں کا مباہلہ کے لئے سامنے نہ آنا۔ اور موت کی تمنا نہ کرنا۔ اور تمام معجزات بھی ساتھ ہی مراد ہوں جس طرح کثیر مخلوق کو تھوڑے طعام سے سیر کرا دینا۔ انگلیوں سے پانی کے چشمے جاری کر دینا اور چاند کے دو ٹکڑے کر دینا۔ (از کبیر)

اگرچہ بعض حضرات نے صرف قرآن پاک کی آیات سے خاص کیا ہے ان کا کہنا ہے کہ انزال یا تنزیل کا تعلق آیات قرآنیہ سے ہی ہوتا ہے لیکن علامہ آلوسی رحمہ اللہ روح المعانی میں بیان فرماتے ہیں:

" (والآيات) القرآن والمعجزات والاخبار عما خفى واخفى فى الكتب السابقة او الشرائع والفرائض او مجموع ما تقدم كله والظاهر الاطلاق "

آیات سے مراد قرآن پاک کی آیات اور معجزات اور مخفی چیزوں کی خبر دینا اور پہلی کتب میں جن چیزوں کو مخفی رکھا گیا ان کی خبر دینا۔ یا آیات سے مراد شرعی احکام اور فرائض یا مراد یہ تمام چیزیں ہوں جن کا ذکر کیا گیا۔ اسی آخری قول کو پسند کرتے ہوئے کہا گیا کہ ظاہر یہی ہے کہ مطلقاً عموم ذکر ہو۔ ابھی تک مفسرین کرام کے اقوال جو ذکر کئے گئے ان سے یہ واضح ہو رہا ہے کہ اگر کوئی یہ ایمان رکھتا ہو کہ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ پر آیات بینات کو نازل فرمایا تو اسے نبی کریم ﷺ کا علم غیب ماننا پڑے گا۔ کیونکہ مخفی چیزوں کی خبر علم غیب ہی تو ہے۔

آیات کی وجہ تسمیہ: آیات کو آیات کہنے کی کئی وجوہ ہیں۔ مقصد سب کا ایک ہی ہے کیونکہ

"آیۃ" اصل مطلب یہ ہے " ان الآیۃ ھی الدالۃ " بیشک آیۃ کا معنی ہے دلالت کرنی والی۔

(۱) آیۃ کو آیۃ کہنے کی وجہ یہ ہے کہ قرآن پاک کی ہر آیۃ اپنی فصاحت وبلاغت کے لحاظ پر صدق مدعی پر دلالت کرتی ہے۔لہذا اس دلالت کے لحاظ پر آیۃ کہہ دیا گیا۔

(۲) دوسری وجہ " ان منہا ما یدل علی الاخبار عن الغیوب فھی دالۃ علی تلک الغیوب " بیشک بعض ایات غیبی خبریں دیتی ہیں۔ان کا غیبی خبروں پر دلالت کرنے کی وجہ سے نام آیات رکھا لیا کیا خوب بات سمجھ میں آئی کی نبی کریم ﷺ پر جب قرآن کے نازل ہونے کو تسلیم کرلیا جائے اور یہ بھی مان لیا جائے کہ قرآنی آیات غیبی علوم، غیبی خبروں پر مشتمل ہیں لیکن یہ نہ مانا جائے کہ نبی کریم ﷺ کو علم غیب حاصل ہے کون سا انصاف ہے۔

(۳) چونکہ قرآن پاک کی آیات توحید، نبوت اور شرعی احکام پر دلالت کرتی ہیں اس لئے ان کو آیات کہا گیا ہے۔

اعتراض: جب آیۃ کا معنی دلیل کرلیا گیا ہے تو آیات کے ساتھ ﴿ بینات ﴾ کے ذکر کا کیا فائدہ ہے؟ کیونکہ " الدلیل لا یکون الا بینا " دلیل تو ہوتی ہی وہ ہے جو بین ہو۔

جواب: دلیل سے علم حاصل کرنے کے طریقہ میں تفاوت پایا جاتا ہے کیونکہ بعض دلیلیں وہ ہوتی ہیں جن کے مقدمات زیادہ ہوتے ہیں ان کے ذریعے مطلب تک پہنچنا مشکل ہوتا ہے۔اور بعض دلیلوں کے مقدمات تھوڑے ہوتے ہیں ان کے ذریعے مقاصد کا حاصل کرنا آسان ہوتا ہے ایسی دلیلوں کو بینات کہا گیا ہے۔ (از کبیر)

اعتراض: " الانزال عبارۃ عن تحریک الشئی من الا علی الی الاسفل وذاک لا یتحقق الا فی الجسمی فھو علی ھذا الکلام محال "

﴿ انزل ﴾ "اتارنا" کا مطلب یہ ہے کہ کسی چیز کو بلند مقام سے پست مقام کی طرف حرکت دینا۔ یہ صرف جسموں میں متحقق ہے آیات جب اجسام نہیں تو آیات کے اتارنے کا کیا مطلب؟

جواب: " ان جبریل لما نزل من الأعلی الی الاسفل واخبر بہ سمی ذلک انزالہ "

جبریل جب بلندی سے پستی کی طرف تشریف لاتے اور آیات نبی کریم ﷺ پر پیش کرتے تو

اس کو انزال کہہ دیا گیا۔ (از کبیر)

﴿ وَمَا يَكْفُرُ بِهَآ اِلَّا الْفٰسِقُوْنَ ﴾ :

''اور نہیں کفر کرتے ان کے ساتھ مگر فاسق''۔

آیات سے کفر دو طرح ہے۔ دونوں ہی یہاں مراد ہیں۔ ایک یہ ہے کہ آیات کے صحیح ہونے کا علم حاصل ہو پھر ان کا انکار کر دیا جائے۔ اور دوسرا یہ ہے کہ آیات سے جاہل رہنے اور ان میں غور وفکر نہ کرنے، تدبر نہ کرنے اور ان کے دلائل سے اعراض کرنے کی وجہ سے انکار پایا جائے۔ انکار کسی طرح بھی پایا جائے کفر ہے لہٰذا آیۃ کریمہ میں حکم عام ہے جو دونوں قسموں کو شامل ہے۔

فسق کا لغوی معنی: " الفسق فی اللغة خروج الانسان عما حدله "

انسان کا حد سے نکل جانا فسق ہے جیسا کہ رب تعالیٰ نے ابلیس کے متعلق فرمایا:

﴿ ففسق عن امر ربه ﴾ اس نے اپنے رب کے حکم سے تجاوز کیا۔

اسی خروج کے معنی کا اعتبار کرتے ہوئے عرب کہتے ہیں " فسقت النواة " گٹھلی کھجور سے نکل گئی۔

فسق کے قریب فجور: اس لئے کہ فجور کا معنی ماخوذ ہے۔

" فجور السد الذی یمنع الماء " یعنی وہ رکاوٹ اور بند جو پانی کو روکے اس کا کھل جانا، شگاف پڑ جانا " فجور " کہلاتا ہے۔ چونکہ پانی کے بند کے پھٹ جانے سے فساد پھیلتا ہے پانی ہر طرف تباہی پھیلا دیتا ہے۔ اسی معنی کو مدنظر رکھتے ہوئے اس انسان کو بھی فاجر کہہ لیا جاتا ہے جو حد سے تجاوز کر جائے۔ اس کے گناہ بھی چونکہ فساد کا ذریعہ بنتے ہیں۔

اعتراض : صغیرہ گناہ کے مرتکب کو فاجر نہیں کہا جاتا حالانکہ حد سے تجاوز وہ بھی کرتا ہے۔ اسے حد سے تجاوز کے باوجود فاجر نہ کہنے کی کیا وجہ ہے؟

جواب: جس طرح بند سے معمولی پانی کے نکلنے کو فجور نہیں کہتے، بلکہ جب زیادہ پانی نکلے، فساد پھیلائے اس وقت فجور کے لفظ کا استعمال ہوتا ہے اسی طرح جب گناہوں میں بھی زیادہ حد سے

تجاوز ہو جو فساد کا ذریعہ بنے اس وقت اس شخص کو فاجر کہا جائے گا۔

" و کذالک الفسق انما یقال اذ اعظم التعدی "

اسی طرح فسق کا استعمال بھی اس وقت ہوگا جب وہ زیادہ تجاوز کرے اور حد سے زیادہ بڑھ جائے۔

(از کبیر)

﴿ الفاسقون ﴾ المتمردون فی الکفر الخارجون عن الحدود فانّ من لیس علی تلک الصفات من الکفرة لا یجترئ علی الکفر بمثل هاتیک البینات "

فاسقوں کا معنی ہے کفر میں سرکشی کرنے والے، حد سے تجاوز کرنے والے اس لئے کہ یہاں ان لوگوں کا ذکر ہے جو واضح آیات کا انکار کرنے والے ہیں، یہ وہی ہو سکتے ہیں جو کفر میں حد سے بڑھے ہوئے ہیں۔ کیونکہ ان کے بغیر کوئی جرات نہیں کر سکتا کہ آیات بینات کا انکار کرے۔

یعنی یہاں معنی تقریباً یہ ہوگیا " وما یکفربها الا الکافرون المتمردون " آیات بینات سے کفر نہیں کرتے سوائے سرکش کافروں کے۔

" قال الحسن اذا استعمل الفسق فی نوع من المعاصی وقع علی اعظم افراد ذلک النوع من کفر او غیره "

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ نے فرمایا کہ جب فسق کا استعمال کسی گناہ سے ہو تو اس سے مراد عظیم گناہ ہوگا خواہ کفر ہو یا غیر کفر ہو۔

" فاذا قیل هو فاسق فی الشرب فمعناه هو اکثر ارتکابا له "

جب یہ کہا جائے کہ فلاں شراب کی وجہ سے فاسق ہے تو اس کا معنی ہوتا ہے وہ بہت زیادہ شراب پیتا ہے اور جب کہا جائے " هو فاسق فی الزنا یکون معناه هو اشد ارتکابا له " کہ وہ زناء کی وجہ سے فاسق ہے تو مطلب یہ ہوگا کہ وہ بہت زیادہ زنا کا مرتکب ہے۔

(از روح المعانی و کبیر)

﴿ اَوَ كُلَّمَا عٰهَدُوْا عَهْدًا نَّبَذَهٗ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴾ (آیت ۱۰۰)

۱) ''اور کیا جب کوئی عہد کرتے ہیں ان میں کا ایک فریق اسے پھینک دیتا ہے بلکہ ان میں بہتیروں کو ایمان نہیں''۔

۲) ''اور کیا جب کوئی عہد کیا انہوں نے پختہ عہد، توڑ دیا اسے ایک فریق نے ان سے بلکہ اکثر ان کے ایمان نہیں رکھتے''۔

یہاں سے یہود کی اور قباحت اور کجروی کا ذکر کیا جا رہا ہے کہ ان کا طریقہ یہ ہے کہ وعدہ کر لینا اور توڑ دینا۔

شان نزول میں چند وجوہ: یعنی چند وجہ کے درپیش آنے کے بعد آیۃ کریمہ کا نزول ہوا۔

(۱) مالک بن صیف یہودی نے جب یہ کہا:

" واللہ ما اخذ علینا عھد فی کتابنا ان نؤمن بمحمد ﷺ ولا میثاق "

قسم ہے اللہ تعالیٰ کی کہ رب تعالیٰ نے ہم سے کوئی ایسا وعدہ نہیں لیا جو ہماری کتاب میں ہو کہ ہم محمد ﷺ پر ایمان لائیں۔ (تو آیۃ کریمہ نازل ہوئی)

(۲) " وقیل فی الیھود عاھدوا ان خرج لنؤمنن بہ ولنکونن معہ علی مشرکی العرب فلما بعث کفروا بہ "

دوسری وجہ شان نزول کی یہ ہے کہ یہود نے وعدہ کیا کہ جب آخر الزمان نبی تشریف لائیں گے تو ہم ان پر ایمان لائیں گے اور ہم مشرکوں کے خلاف نبی کا ساتھ دیں گے۔ لیکن جب نبی کریم ﷺ تشریف لائے تو انہوں نے وعدہ کو توڑ دیا اور کفر کیا۔

(۳) تیسری وجہ شان نزول کی یہ ہے:

" وقال عطاء فی الیھود عاھدوا رسول اللہ ﷺ بعھود فنقضوھا کفعل قریظۃ والنضیر "

کہ عطاء نے کہا یہود کے متعلق یہ آیت نازل ہوئی۔ جب کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے وعدہ کیا کہ وہ آپ کے خلاف مشرکین کا ساتھ نہیں دیں گے لیکن پھر جنگ احزاب (خندق کے موقع پر) میں بنی قریظہ اور بنی نضیر نے مکہ کے مشرکوں کا ساتھ دیا۔ بلکہ مشرکین کو جنگ کے لئے آمادہ کرنے والے ہی یہود تھے۔

(۴) اللہ تعالیٰ نے جب وہ دلائل ظاہر فرمائے جو رسول اللہ ﷺ کی نبوت پر دلالت کرنے والے تھے اور آپ کی شریعت کے صحیح ہونے پر دلالت کرتے تھے۔

" کان ذلک کالعهد منه سبحانه وقبولهم لتلک الدلائل کالمعاهدة منهم لله سبحانه وتعالیٰ "

اوران دلائل کو قبول کرنا ان کی طرف سے رب تعالیٰ سے وعدہ کرنا تھا اور پھران سے روگردانی کرنا وعدہ کو توڑنا تھا۔

(۵) " انهم کانوا یعاهدون الله کثیرا وینقضونه " یہود کے وعدہ کو توڑنے کا ذکر عام ہے وہ اکثر اوقات اللہ تعالیٰ سے وعدہ کرتے تھے اور پھر اسے توڑ دیتے تھے۔

﴿ اَوَ كُلَّمَا عٰهَدُوْا عَهْدًا ﴾ ہمزہ استفہام انکاری کے لئے ہے یعنی مفہوم یہ ہوگا اور کیا جب انہوں نے وعدہ کیا توڑ دیا ایک فریق نے ان میں سے، حالانکہ ان کو یہ وعدہ نہیں توڑنا چاہئے تھا۔ اور ساتھ ساتھ ہی ہمزہ سے یہ سمجھا دیا گیا" واعظام ما یقدمون علیه " کہ وہ جو کام کرتے تھے ان کے بڑے جرائم تھے۔

﴿ عَهْدًا ﴾ مصدر ہے مفعول مطلق تاکید کے لئے استعمال ہے جب بھی انہوں نے وعدہ کیا وعدہ کرنا، اس تاکید والے معنی سے پختگی سمجھ میں آتی ہے راقم نے اپنے ترجمہ میں ''پختہ عہد'' ذکر کیا۔

﴿ اَوَ كُلَّمَا عٰهَدُوْا ﴾ علی عهد بعد عهد نقضوه ونبذوه "

یہاں ﴿ كُلَّمَا ﴾ سے واضح ہوا کہ انہوں نے کئی مرتبہ عہد کیا اور کئی مرتبہ توڑا اور پھینکا (پست پشت ڈالا) اسی سے یہ سمجھ آ گیا کہ بار بار وعدہ کرنا اور توڑنا ان کی عادت بن چکا تھا۔ ضمناً اس میں نبی کریم ﷺ کو تسلی بھی دی گئی کہ آپ دل تنگ نہ ہونا کہ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی آیت سے کفر کرتے ہیں۔

یہ کوئی نئی بات نہیں " بل هو سجيتهم وعادتهم وعادة سلفهم " بلکہ ہمیشہ وعدہ کو توڑنا قبیح اقوال وافعال نے ان کو گھیرے میں لے رکھا ہے اور ان کی یہ عادت بن چکی ہے اور ان سے پہلے گزرے ہوئے ان کے آباء واجداد کی بھی یہی عادت تھی۔ (از کبیر)

﴿ نَّبَذَهٗ فَرِيقٌ مِّنۡهُمۡ ﴾ : " ای نقضه فريق منهم " منصوب ضمیر عہد کی طرف لوٹ رہی ہے۔اور " نبذ " کا مرادی معنی "توڑنا" ہے یعنی ایک فریق نے ان میں سے وعدہ کو توڑ دیا راقم نے یہی ترجمہ کیا ہے۔(توڑ دیا اسے ایک فریق نے ان سے)۔

وقال ابن جرير " اصل النبذ الطرح والالقاء " ابن جریر نے بیان کیا ہے کہ " نبذ " کا حقیقی معنی پھینکنا اور ڈال دینا اسی وجہ سے پھینکے ہوئے بچے کو لقیط بھی کہا جاتا ہے اور منبوذ بھی۔اسی طرح تمر (خشک کھجور) اور زبیب (کشمش) کو جب پانی میں ڈالا جائے تو اسے نبیذ کہا جاتا ہے۔ (از صابونی)

اعلیٰ حضرت کا ترجمہ اسی حقیقی معنی کے مطابق ہے (ان میں کا ایک فریق اسے پھینک دیتا ہے) تفسیر کبیر میں ہے " نقضوه ونبذوه " انہوں نے توڑ دیا اور پھینک دیا۔حضرت پیر محمد کرم شاہ رحمہ اللہ نے اسی کے مطابق ترجمہ کیا "توڑ پھینکا"۔

﴿ بَلۡ اَكۡثَرُهُمۡ لَا يُؤۡمِنُوۡنَ ﴾ : اس کے دو مقصد ہیں ایک یہ کہ ان فاسقوں میں سے اکثر آپ کی تصدیق نہیں کریں گے کبھی بھی، کیونکہ ان کو آپ سے حسد اور عناد ہے۔

دوسرا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنی کتابوں کی تصدیق نہیں کرتے بلکہ وہ منافقوں کی طرح ہیں، لوگوں کے سامنے یہ ظاہر کرتے ہیں کہ ہمارا اپنی کتابوں اور نبیوں سے ایمان ہے۔لیکن نبی کریم ﷺ پر ایمان نہ لا کر وہ اس بات کا ثبوت پیش کرتے ہیں کہ ان کا ایمان اپنی کتب اور انبیاء سے نہیں۔ (از کبیر)

☆☆☆☆☆

﴿ وَلَمَّا جَآءَهُمْ رَسُولٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ نَبَذَ فَرِيقٌ مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ كِتٰبَ اللّٰهِ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ كَاَنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴾ (آیت ۱۰۱)

۱) ''اور جب ان کے پاس تشریف لایا اللہ کے یہاں سے ایک رسول ان کی کتابوں کی تصدیق فرماتا ہے تو کتاب والوں سے ایک گروہ نے اللہ کی کتاب اپنے پیٹھ پیچھے پھینک دی گویا وہ کچھ علم ہی نہیں رکھتے''۔

۲) ''اور جب تشریف لایا ان کے پاس رسول اللہ کی طرف سے تصدیق کرنے والا اس چیز کی جو ان کے پاس ہے پھینک دیا ایک فریق نے ان لوگوں سے جن کو کتاب دی گئی، اللہ کی کتاب کو پیچھے اپنی پیٹھوں کے گویا کہ وہ نہیں جانتے''۔

اس آیۂ کریمہ میں بھی یہود کی قباحت کجروی کا ذکر ہے کہ ان کے پاس جب بھی کوئی رسول تشریف لائے جو ان کی کتاب، ان کے نبی اور ان کے دین کی تصدیق کرنے والے، حق تو یہ تھا کہ یہ لوگ نبی پر ایمان لائے نبی کی صداقت کو اپنی کتاب سے ہی سمجھتے لیکن انہوں نے علم رکھنے کے باوجود جاہلانہ طریقہ سے اللہ کی کتب سے ہی اعراض کرلیا۔

﴿ وَلَمَّا جَآءَهُمْ رَسُولٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ﴾ : یہاں رسول سے مراد کون سے رسول ہیں؟ تفسیر خازن اور مدارک ان مذکورہ الفاظ مبارکہ کی تفسیر کی گئی ''یعنی محمد ﷺ'' سے کہ یہاں رسول سے مراد نبی کریم حضرت محمد ﷺ ہیں۔

اعلیٰ حضرت کا ترجمہ اسی کے مطابق ہے ''جب ان کے پاس تشریف لایا اللہ کے یہاں سے ایک رسول''۔ ''ایک رسول'' ذکر فرما کر اعلیٰ حضرت نے تخصیص کی طرف اشارہ کر دیا۔ لیکن بیضاوی اور مظہری نے تعیم کو پسند کیا: ﴿ وَلَمَّا جَآءَهُمْ رَسُولٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ ﴾ كعيسى ومحمد عليهما السلام'' جب ان کے پاس تشریف لایا رسول، یعنی یہاں رسول سے مراد عیسیٰ علیہ السلام

اور نبی کریم حضرت محمد ﷺ دونوں ہی ہیں۔ (بیضاوی)

راقم نے اسی قول کے مطابق ترجمہ کیا ہے "ایک رسول" ترجمہ نہیں کیا بلکہ "رسول" ذکر کیا جو عموم پر دلالت کر رہا ہے۔

﴿ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ ﴾: "(وہ رسول) تصدیق کرنے والے اس چیز کی جو ان کے پاس تھی"۔ یعنی ان کے اعتقاد کی تصدیق رسول نے کی وہ اعتقاد جو ان کا موسیٰ علیہ السلام کی نبوت کے متعلق تھا اور اسی طرح توراۃ کی صحت کی تصدیق کی۔

" فان كل واحد من عيسى ومحمد عليهما الصلوة والسلام كان معترفا بذلك ومصدقا له وان كل واحد منهما كان مصدقا معهم من الكتاب فی وجوب التوحيد والايمان واصول الشرائع "

بیشک ہر ایک رسول یعنی عیسیٰ علیہ السلام اور نبی کریم ﷺ اعتراف کرتے کہ موسیٰ علیہ السلام سچے نبی ہیں، توراۃ سچی کتاب ہے اور اس کی تصدیق بھی فرماتے تھے۔ اور دونوں رسولوں میں سے ہر ایک نے ان کی کتاب میں جو توحید، ایمان اور اصول شرائع مذکور تھے ان کی تصدیق فرمائی۔

اور یہ بھی خیال رہے کہ نبی کریم ﷺ کا فقط تشریف لانا ہی توراۃ کی تصدیق تھی کیونکہ توراۃ میں نبی کریم ﷺ کے تشریف لانے کی بشارت دی گئی اور آپ کے اوصاف بیان کیے گئے۔ ان اوصاف کے مطابق ہی جب آپ تشریف لائے تو توراۃ کی تصدیق ہوگئی۔ (از شیخ زادہ)

عیسیٰ علیہ السلام نے جب نبی کریم ﷺ کے تشریف لانے کی بشارت دی اور توراۃ میں بھی بشارت دی گئی تھی تو یقیناً حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بھی توراۃ کی تصدیق کر دی۔

﴿ نَبَذَ فَرِيْقٌ مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ كِتٰبَ اللّٰهِ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ ﴾ :

"یعنی اہل کتاب میں سے ایک فریق نے اللہ کی کتاب کو اپنی پیٹھوں کے پیچھے پھینک دیا"۔

﴿ وراء ظهورهم ﴾ مثل لا عراضهم عنه رأسا بالاعراض عما يرمى به وراء الظهر لعدم الالتفات اليه "

پیٹھوں کے پیچھے کا مطلب یہ ہے کہ انہوں نے اللہ کی کتاب سے اس طرح مکمل طور پر اعراض کرلیا، جس طرح کسی چیز کو پیٹھ کے پیچھے پھینک دیا جائے اور اس کی طرف توجہ نہ کی جائے۔

﴿ کتاب اللہ ﴾ سے مراد کون سی کتاب ہے جس سے انہوں نے اعراض کیا؟ اس کے متعلق بعض حضرات نے بیان کیا "ما مع الرسول ﷺ وھو القرآن" کہ (کتاب اللہ) سے مراد وہ کتاب ہے جو رسول اللہ ﷺ کے پاس تھی یعنی قرآن پاک۔ مطلب یہ ہوا کہ انہوں نے قرآن پاک سے مکمل اعراض کیا۔ تاہم (کتاب اللہ) سے مراد "توراۃ" لینے کو علامہ رازی رحمہ نے راجح قرار دیا۔ اس پر مندرجہ ذیل دلائل پیش کئے گئے ہیں۔

(۱) " ان النبذ لا یعقل الا فیما تمسکوا به اولا واما اذا لم یلتفتوا الیه لا یقال انهم نبذوه "

رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿ نبذوه ﴾ انہوں نے پھینک دیا۔ یہ اس وقت ہوسکتا ہے جب پہلے ایک چیز کو حاصل کیا جائے پکڑا جائے، پھر پھینک دیا جائے توراۃ میں تو یہ ممکن ہے کیونکہ وہ نبی کریم ﷺ کہ آمد سے پہلے آپ کی اوصاف بھی بیان کرتے رہے۔ آپ کے وسیلہ سے جنگوں میں فتح بھی حاصل کرتے رہے لیکن آپ کے تشریف لانے کے بعد انہوں نے توراۃ کے ان مسائل سے اعراض کردیا۔ لیکن قرآن پاک پر نہ انہوں نے عمل کیا اور نہ ہی ﴿ نبذ ﴾ "پھینکنے" کا معنی پایا جاسکتا ہے۔

(۲) دوسری دلیل یہ ہے کہ رب تعالیٰ نے ذکر فرمایا:

﴿ نَبَذَ فَرِيْقٌ مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ ﴾ "اھل کتاب سے ایک فریق نے پھینک دیا"

" ولو کان المراد به القران لم یکن لتخصیص الفریق معنی لان جمیعهم لا یصدقون بالقرآن "

اگر یہ مراد ہوتا کہ اہل کتاب نے قرآن پاک کو پس پشت ڈال دیا تو ایک فریق کا ذکر نہ کیا جاتا، کیونکہ قرآن پاک کی تصدیق تو تمام نے ہی نہیں کی۔

(۳) " وان المعرفة اذا اعیدت معرفة کان الثانی عین الاول "

قانون یہ ہے کہ معرفہ کو جب معرفہ کر کے لوٹایا جائے تو ثانی عین اول ہوتا ہے جب پہلے ﴿اُوْتُوا الْكِتٰبَ ﴾ میں الکتاب معرفہ ہے جس سے مراد توراۃ ہے تو ثانی ﴿ كِتٰبَ اللّٰهِ ﴾ جو معرفہ ہے اس سے مراد بھی توراۃ ہی ہوگی۔

(۴) " وان مذمتهم فی انهم نبذوا الکتاب الذی اوتوه واعترفوا بحقیته اشد "

ان کی شدید مذمت ہی اس لئے کی گئی کہ انہوں نے اسی کتاب کو پس پشت ڈال دیا جو ان کو عطا کی گئی اور انہوں نے اس کے حق ہونے کا بہت زیادہ اعتراف کیا تھا۔ ان کا اس کے بعد انکار کرنا مکابرہ اور عناد تھا۔ اس سے بھی پتہ چلا کہ ﴿ کِتٰبَ اللّٰهِ ﴾ سے مراد توراۃ ہی ہے۔

(۵) " لما روی عن السدی قال لما جاء هم محمد صلی الله تعالیٰ عارضوه بالتوراة فاتفقت التوراة والفرقان فنبذوا التوراة واخذوا الکتاب آصف وسحر هاروت وماروت فلم توافق القران "

سدی سے مروی ہے جب نبی کریم تشریف لائے اور قرآن پاک پیش فرمایا تو انہوں نے قرآن پاک کو توراۃ سے مطابقت دی تو انہوں نے توراۃ کو قرآن پاک کے موافق پایا۔ تو انہوں نے توراۃ کو پس پشت ڈال دیا اور انہوں نے آصف کی کتاب پر عمل شروع کر دیا اور ہاروت اور ماروت کے جادو پر عمل شروع کیا کیونکہ ان کو انہوں نے آصف کی کتاب پر عمل شروع کر دیا اور ہاروت اور ماروت کے جادو پر عمل شروع کیا کیونکہ ان کو انہوں نے قرآن کے موافق نہیں پایا۔ (ماخوذ از کبیر و روح المعانی)

ان تمام دلائل سے یہ پتہ چلا کہ ﴿ کِتٰبَ اللّٰهِ ﴾ سے مراد توراۃ ہے۔

راقم کا موقف یہ ہے کہ تعمیم ہی بہتر ہے جو تمام اقوال کو شامل ہے کہ انہوں نے توراۃ سے بھی اعراض کیا اور قرآن پاک سے بھی اعراض کیا کیونکہ ﴿ نبذ ﴾ کا جب مجازی معنی اعراض کرنا لے لیا تو اب یہ ضرورت نہیں کہ یہ کہا جائے کہ ﴿ نَبَذَ ﴾ کا معنی ہے حاصل کر کے پھینکنا۔ جہاں تک معتبر دلیل معرفہ والی ہے اس کے متعلق بھی نور الانوار پڑھے ہوئے طلباء جانتے ہیں کہ کبھی کبھی اس کے خلاف بھی واقع ہو جاتا ہے۔ (واللہ اعلم بالصواب)

﴿ كَاَنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴾ : "گویا کہ وہ نہیں جانتے"

" انه کتاب الله یعنی ان علمهم به رصین یقین ولکن یتجاهلون عنادا "

یعنی ان کو یقین تھا کہ توراۃ اللہ کی کتاب ہے قرآن پاک اللہ کی کتاب ہے لیکن وہ عناد کی وجہ سے جاہل بنے رہے ایسے جیسا کہ وہ جانتے ہی نہیں کہ یہ اللہ کی کتاب ہے۔

(از بیضاوی)

فائدہ : ابھی جن دو آیات کا ذکر ہوا ہے ان سے یہ واضح ہوا کہ یہود کے بڑے بڑے چار فرقے تھے:

ایک فرقہ وہ جنھوں نے توراۃ پر ایمان لایا اس کے حقوق کا پاس کیا۔ توراۃ کے حکم کے مطابق ہی انہوں نے نبی کریم ﷺ پر ایمان لایا اور قرآن پاک کو اللہ تعالیٰ کا سچا کلام تسلیم کیا۔ یہ ﴿بل اکثرھم لا یؤمنون﴾ سے سمجھ آیا۔ کہ ان سے اکثر نے ایمان قبول نہیں کیا تو پتہ چلا کہ بعض نے ایمان قبول کیا یہ ایمان لانے والے حضرت عبداللہ بن سلام اور ان کے ساتھی تھے۔

دوسرا فرقہ وہ تھا جنھوں نے ظاہراً تو احکامِ توراۃ کو نہیں توڑا لیکن جہالت کی وجہ سے ایمان بھی قبول نہیں کیا کیونکہ یہ لوگ خود تو جانتے نہیں تھے جیسا ان کو علماء نے کہہ دیا وہ تسلیم کر لیا چونکہ یہود کے علماء تو نبی کریم ﷺ کے اوصاف چھپاتے تھے اس لئے جاہل لوگ کثیر تعداد میں ایمان قبول نہ کر سکے۔ اس فرقہ کا بھی رب تعالیٰ کے ان الفاظ مبارکہ ﴿بل اکثرھم لا یؤمنون﴾ سے ہی علم حاصل ہوا۔

تیسرا فرقہ وہ تھا جنھوں نے علم رکھنے کے باوجود ظاہراً اللہ تعالیٰ کے وعدوں کو توڑا، حدود سے تجاوز کیا سرکشی اور فسق کی وجہ سے " وھم المغیون بقولہ نبذہ فریق منھم " یہ وہ لوگ ہیں جن کو حدود سے تجاوز کرنے کی وجہ سے "مغیون" کہا جاتا ہے اس فرقہ کا رب تعالیٰ کے اس ارشاد سے پتہ چلا ﴿نَبَذَ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ﴾ .

چوتھا فرقہ وہ تھا جو ظاہری طور پر توراۃ پر عمل کر رہے تھے لیکن مخفی طور پر توراۃ کے احکام کو پس پشت ڈال دیا یہ لوگ عالم تھے لیکن سرکشی اور عناد کی وجہ سے جاہل بن بیٹھے۔ اس فرقہ کا رب تعالیٰ کے اس ارشاد گرامی ﴿كَاَنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ﴾ سے پتہ چلا۔

(ماخوذ از بیضاوی)

﴿ وَاتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوْا الشَّيَاطِيْنُ عَلٰى مُلْكِ سُلَيْمَانَ وَمَا كَفَرَ سُلَيْمَانُ وَلٰكِنَّ الشَّيَاطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ وَمَا اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَارُوْتَ وَمَارُوْتَ وَمَا يُعَلِّمٰنِ مِنْ اَحَدٍ حَتّٰى يَقُوْلَا اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ ☆ فَيَتَعَلَّمُوْنَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُوْنَ بِهٖ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهٖ وَمَا هُمْ بِضَارِّيْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ وَيَتَعَلَّمُوْنَ مَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ وَلَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ اشْتَرَاهُ مَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ وَلَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهٖ اَنْفُسَهُمْ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴾ (آیت ۱۰۲)

۱) ''اور اس کے پیرو ہوئے جو شیطان پڑھا کرتے تھے سلطنت سلیمان کے زمانہ میں۔ اور سلیمان نے کفر نہیں کیا ہاں شیطان کافر ہوئے لوگوں کو جادو سکھاتے ہیں۔ اور وہ جادو جو بابل میں دو فرشتوں ہاروت وماروت پر اترا اور وہ دونوں کسی کو کچھ نہ سکھاتے جب تک یہ نہ کہہ لیتے کہ ہم تو نری آزمائش ہیں۔ تو اپنا ایمان نہ رکھو۔ تو ان سے سیکھتے وہ جس سے جدائی ڈالیں مرد اور اس کی عورت میں اور اس سے ضرر نہیں پہنچا سکتے کسی کو مگر خدا کے حکم سے اور وہ سیکھتے ہیں جو انہیں نقصان دے گا اور نفع نہ دے گا اور بیشک ضرر انہیں معلوم ہے کہ جس نے یہ سودا لیا آخرت میں اس کا کچھ حصہ نہیں اور بیشک کیا بری چیز ہے وہ جس کے بدلے انہوں نے اپنی جانیں بیچیں کسی طرح انہیں علم ہوتا''۔

۲) ''اور انہوں نے تابعداری کی جو پڑھتے تھے شیطان سلیمان کی سلطنت کے زمانہ میں اور نہیں کفر کیا سلیمان نے اور لیکن شیطانوں نے کفر کیا، سکھاتے لوگوں کو جادو۔ اور جو الہام کیا گیا دو فرشتوں پر

بابل میں یعنی ہاروت اور ماروت پر۔ اور وہ دونوں نہیں سکھاتے تھے کسی ایک کو یہاں تک کہ وہ کہتے ہم تو صرف آزمائش ہیں۔ تو تم کفر نہ کرو۔ تو وہ سیکھتے تھے ان دونوں سے، وہ کہ تفریق ڈالتے جس کے ذریعے مرد اور اس کی زوجہ کے درمیان۔ اور وہ نہیں ضرر پہنچا سکتے اس کے ذریعے کسی ایک کو سوائے اللہ تعالیٰ کے ارادہ کے اور وہ سیکھتے جو نقصان دیتا ان کو اور نفع نہیں دیتا ان کو اور تحقیق جان لیا انھوں نے جس نے حاصل کیا یہ نہیں اس کا آخرت میں کوئی حصہ اور برا ہے جس کے بدلے انہوں نے اپنی جانوں کا سودا کیا کسی طرح وہ جان لیتے''۔

یہاں سے یہود کے اور قبیح افعال کا ذکر کیا جا رہا ہے کہ وہ جادوگری میں مشغول رہتے۔ خود بھی جادو کرتے اور جادو سیکھتے اور دوسروں کو بھی جادوگری کی طرف بلاتے۔

شان نزول: یہود حضرت سلیمان علیہ السلام کو نبی نہیں تسلیم کرتے تھے۔ بلکہ ان کو جادوگر اور بادشاہ مانتے تھے وہ کہتے تھے کہ ہوا پر سوار ہو کر سفر کرنے والا جادوگر ہی ہو سکتا ہے۔ نبی نہیں ہو سکتا نبی کریم ﷺ نے جب حضرت سلیمان علیہ السلام کی نبوت کا ذکر فرمایا تو یہود نے جو کہا اسے شہر بن حوشب بیان فرماتے ہیں:

" قال اليهود انظروا الى محمد يخلط الحق بالباطل يذكر سليمان مع الانبياء وانما كان ساحرا يركب الريح "

یہود نے کہا محمد کو دیکھو وہ حق کو باطل سے ملا رہا ہے۔ سلیمان کو انبیاء کے ساتھ ذکر کر رہا ہے حالانکہ سلیمان تو جادوگر تھا کیونکہ وہ ہوا پر سوار ہوتا تھا۔

اللہ تعالیٰ نے ان کی مذمت میں اس آیۃ کریمہ کو نازل کیا اور ضمناً یہ بیان کر دیا کہ سحر کفر ہے۔

کیونکہ جب یہ فرمایا:

﴿ وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ ﴾

''لیکن شیطانوں نے کفر کیا جو لوگوں کو جادو سکھاتے''۔

تو اسی سے اشارہ فرما دیا کہ جادو کفر ہے۔

سحر کا لغوی معنی: " واصل السحر صرف الشئى عن حقيقته الى غيره فكان الساحر لما ارى الباطل فى صورة الحق وخيل الشئى على غير حقيقته فقد سحرا لشئى عن وجهه اى صرفه " (تاج العروس)

سحر کا حقیقت میں معنی یہ ہے کہ ایک چیز کی حقیقت کو بدل دینا۔ گویا کہ جادوگر جب باطل چیز کو حق کی صورت میں دکھاتا ہے۔ اور وہ چیز اپنی حقیقت کے علاوہ دوسری حقیقت میں نظر آتی ہے۔ تو یہی سمجھ آتا ہے کہ اس نے ایک چیز کو اس کی حقیقت سے بدل دیا ہے۔

سحر کا اصطلاح شرع میں معنی: " السحر یستعمل بما لطف وخفی سببه ویستعان فی تحصیله بالتقرب الی الشیطان بارتکاب القبائح "

سحر کا استعمال وہاں ہوتا ہے جہاں اس کے اسباب مخفی ہوں اور اس کے حاصل کرنے میں شیطان کا تقرب حاصل کیا جائے اور قبیح کاموں کا ارتکاب کیا جائے۔

پھر اس کی تین قسمیں ہیں: قولی، عملی اور اعتقادی۔

سحر قولی: " کالرقی التی فیها الفاظ الشرک ومدح الشیطان وتسخیره "

ایسے منتر جنتر سے جادو کیا جائے جس میں شرک والے الفاظ ہوں اور شیطان کی مدح پائی جائے اور شیطان کو مسخر کر کے اپنا مددگار بنایا جائے۔

سحر عملی: " کعبادة الکواکب والتزام الجنایة وسائر الفسوق "

جیسا کہ ستاروں کی عبادت کرنا، اور جنایت کو لازم پکڑنا، اور ہر قسم کے کبائر گناہوں کا ارتکاب کرنا اور ان کے ذریعے شیطان سے امداد طلب کرنا۔

سحر اعتقادی: " کاستحسان ما یوجب التقرب الیه ومحبته ایاه وذلک لا یستتب الا بمن یناسبه فی الشرارة وخبث النفس فان التناسب شرط التضام والتعاون "

شیطان کے قریب جو چیز کرے اسے اچھا سمجھنا، شیطان سے محبت کرنا یہ اس وقت تک ٹھیک حاصل نہیں ہوگا جب تک شرارت میں اس کے مناسب نہ ہوا اور اس جیسی خباثت نہ پائی جائے۔ کیونکہ ایک دوسرے سے ملنے اور تعاون کے لئے مناسبت ضروری ہے۔

یعنی شیطان سے امداد طلب کرنا اور اعتقاد رکھنا کہ یہ امداد کرے گا جس سے سحر حاصل ہو جائے گا

یہ اسی وقت ہوگا جب جادو کرنے والا بھی شیطان کی طرح شریر اور خبیث النفس ہوگا۔ (از روح المعانی)

فائدہ : جواہر مکلفہ کی دو قسمیں ہیں، ایک قسم جسمانی محسوس، دوسری قسم روحانی معقول پھر ہر ایک کی تین تین قسمیں ہیں۔ خیر اور شر اور خیر و شر کے درمیان ہونا۔

" فالخیر من الروحانی الارواح المقدسة وھی الملائکة "

روحانی خیر ارواح مقدسہ ہیں اور یہ ملائکہ ہیں۔

" والشریر شیاطین الجن " اور روحانی شر ارواح خبیثہ یہ شیاطین جن ہیں۔

" والمتوسط مومنوا الجن " اور متوسط مومن جن ہیں جن کا ذکر سورۂ جن میں ہے۔

ملائکہ صرف بہتر لوگوں سے ملتے ہیں اور ان سے تعاون کرتے ہیں کیونکہ نیک لوگ اپنے اقوال افعال کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کا تقرب حاصل کرنے میں اور عبادت میں ہیشگی کرنے کی وجہ سے ملائکہ کے مشابہ ہیں۔

اسی طرح شیاطین صرف شریر لوگوں سے ملتے ہیں اور ان سے تعاون کرتے ہیں یعنی مشرک، خبیث، شیطان کی عبادت کرنے والے اور رب تعالیٰ سے عناد رکھنے والے شیطان کے مشابہ ہوتے ہیں اس لئے شیطان ان کی امداد کرتا ہے۔ جیسا کہ رب تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ ھل انبئکم علی من تنزل الشیاطین تنزل علی کل افاک اثیم ﴾

"کیا میں تمہیں خبر دوں کس پر اترتے ہیں شیطان، اترتے ہیں ہر بڑے بہتان والے گنہگار پر"

اور ارشاد فرمایا:

﴿ ومن یعش عن ذکر الرحمن نقیض له شیطانا فھو له قرین ﴾

"اور جو اعراض کرے رب تعالیٰ کے ذکر سے ہم اس پر شیطان کو مسلط کر دیتے ہیں تو وہ اس کا ساتھی ہوتا ہے"۔ (ماخوذ از شیخ زادہ)

سحر اور معجزہ اور کرامت میں فرق:

جادو میں بھی رب تعالیٰ نے بندوں کی آزمائش کے لئے اثرات رکھ دیئے ہیں بظاہر یہ ہی سمجھ

آتا ہے کہ یہ کام خرق عادت ہے لیکن جب جادو کی تعریف کے بعد یہ بیان کیا گیا ہے:

" ذلک لا یستتب الا لمن یناسبه فی الشرارة وخبث النفس فان التناسب شرط فی التضام والتعاون "

سحر (جادو) اس وقت تک نہیں پایا جا سکتا جب تک وہ اپنے مناسب سے امداد طلب نہ کرے اور وہ اس کا مناسب شرارت اور خباثت نفس میں ہو مناسب شرط ہے ان کے آپس میں ملنے اور تعاون کے لئے۔

" وبهذا تمیز الساحر عن النبی والولی " اسی سے واضح ہو گیا کہ ساحر (جادوگر) نبی اور ولی سے دور ہے نبی کا معجزہ خرق عادت کام ہوتا ہے۔ معجزہ میں دعوت نبوت ضروری ہے نبی کا معجزہ اس کے دعوی کے مطابق ہوتا ہے۔ جیسا کہ ایک اعرابی نے نبی کریم ﷺ کو کہا کہ آپ مجھے کوئی "نشانی" (معجزہ) دکھائیں میں اسے دیکھ کر یقین کرلوں کہ آپ اللہ کے نبی ہیں تا کہ میں ایمان لاؤں تو آپ نے فرمایا جاؤ اس درخت کو کہو تمہیں اللہ کا نبی بلا رہا ہے۔

جب اس اعرابی نے درخت کو نبی کریم ﷺ کا پیغام پہنچایا تو اسنے ادھر ادھر جھک کر اپنی جڑوں کو زمین سے اکھیڑا اور نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر سلام عرض کیا پھر آپ کے حکم سے اپنی جگہ واپس چلا گیا۔

جھوٹا مدعی نبوت اپنے دعوی کے مطابق کوئی کام خرق عادت نہیں کر سکتا جیسا کہ مسیلمہ کذاب کو لوگوں نے کہا کہ محمد مصطفیٰ ﷺ تو معجزات دکھاتے ہیں تم بھی کوئی معجزہ دکھاؤ تو اس نے کہا کہ ایک آنکھ جس کی ضائع ہو اسے میرے پاس لایا جائے کہ میں اس کی ضائع آنکھ پر ہاتھ پھیر کر اسے درست کر دوں۔ ایک آنکھ والے شخص کو لایا گیا مسیلمہ نے اس کی آنکھ پر ہاتھ پھیرا تو رب تعالیٰ نے اس کی دوسری آنکھ کو بھی ضائع کر دیا۔

اور ولی کی کرامت بھی خرق عادت کام کا نام ہی ہے لیکن اس میں دعوی نبوت نہیں ہوتا۔ اور کرامت دکھانے کا دعوی اور چیلنج بھی نہیں پایا جاتا۔ اب کافی حد تک جادو اور معجزہ اور کرامت میں فرق تو واضح ہو گیا۔ لیکن زیادہ وضاحت کے لئے شیخ زادہ کی مندرجہ ذیل عبارت کو دیکھئے:

" ان السحر لا یثبت الامن کل مشرک خبیث فی نفسه شریر فی طبعه متدنس فی بدنه فلذلک قیل اکثر من یعمل السحرهم الیهود وعبدة الاصنام وحیض النساء وانهم لا یعلمونه الا فی الامکنة القذرة علی الهیات القبیحة وان سحرهم متی قوبل بالاستعاذة باللہ تعالیٰ وبذکره بطل سلطانه "

جادو صرف مشرک، خبیث النفس اور شریر طبیعت والے اور جسمانی طور پر گندے شخص سے ہی ہوسکتا ہے اکثر طور پر جادوگر یہود اور بت پرست ہوتے ہیں اور حیض والی عورتیں جادو کرتی ہیں جادو کرنے والے ناپاک جگہ میں اور قبیح حالت میں (ننگے ہوکر) جادو کرتے ہیں یعنی ان کے جادو کے اثر انداز ہونے کے لئے خباثت، ناپاکی اور رب سے دور ہونا ضروری ہوتا ہے۔ اسی لئے وہ اپنے جادو میں اگر " اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم " پڑھ لیں۔ اور اللہ تعالیٰ کا ذکر کسی طرح بھی کرلیں تو ان کا جادو بے اثر ہوکر رہ جاتا ہے۔

" واما ما کان من الانبیاء والاولیاء فلا یکون الامن یؤمن مخلص فی ایمانه مقدس فی نفسه خیر فی طبعه طاهر فی بدنه ویزداد ما کان منهم باز دیاد تقربهم الی اللہ تعالیٰ ".

انبیاء کرام اور اولیاء کرام اپنے ایمان میں کامل اور مخلص ہوتے ہیں ان کے نفوس پاکیزہ ہوتے ہیں ان کی طبیعتوں میں خیر اور بھلائی ہوتی ہے ان کے بدن پاکیزہ ہوتے ہیں ان کو اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہوتا ہے۔

ان پاک ہستیوں کے خرق عادت کام معجزات ہوں گے جب انبیاء کرام سے ثابت ہوں۔ اور اولیاء کرام کے خرق عادت کام کرامات ہوں گی۔ اولیاء عظام کو جتنا اللہ تعالیٰ سے تقرب زیادہ ہوتا چلا جائے گا اتنی ہی ان کی کرامات میں زیادتی ہوتی چلی جائے گی۔ (ماخوذ از شیخ زادہ بزیادۃ)

سحر کے اثرات : معتزلہ سحر کے اثرات یعنی حقائق کے بدلنے کو تسلیم نہیں کرتے ان کے نزدیک صرف ملمع سازی اور ظاہری بناوٹ ہوتی ہے۔

" وجوز اهل السنة ان یقدر الساحر علی ان یطیر فی الهواء ویقلب الحمار انسانا والانسان حمارا الا انهم قالوا ان اللہ تعالیٰ هو الخالق

لهـذه الاشياء عند ما يقرأ الساحر فی خصوصها كلمات معينة فاما ان يكون المؤثر فيها هو الفلك والنجوم فلا "

اہل سنت و جماعت کے نزدیک ساحر کو یہ قدرت حاصل ہوتی ہے کہ وہ ہوا میں اڑے اسی طرح گدھے کو انسان بنادے یا انسان کو گدھا بنادے۔ لیکن جادوگر کو ذاتی طور پر یہ قدرت حاصل نہیں ہوتی بلکہ جادوگر اپنے خاص کلمات سحریہ جب پڑھتا ہے تو اللہ تعالیٰ ان میں تاثیر پیدا کر دیتا ہے جس کی وجہ سے اشیاء کی حقیقتیں بدل جاتی ہیں۔ درحقیقت ہر چیز کا خالق اللہ تعالیٰ ہے اللہ تعالیٰ جادو میں یہ اثر اس لئے پیدا فرماتا ہے کہ لوگوں کی آزمائش کی جاسکے۔ کون جادو کے اثرات دیکھ کر گمراہ ہوتے ہیں اور کون ایمان پر قائم کرتے ہیں۔

خیال رہے کہ اہل سنت جادو میں فلک اور ستاروں کو مؤثر نہیں مانتے جیسا کہ ستارہ پرست ستاروں کو مؤثر بناتے ہیں۔ (از شیخ زادہ)

ساحر کا حکم:

" قال الشيخ ابو منصور الماتريدی رحمه الله القول بان السحر علی الاطلاق كفر خطأ بل يجب البحث عن حقيقته فان كان ذلک رد مالزم فی شرط الايمان فهو كفر والا فلا ثم السحر الذی هو كفر يقتل عليه الذكور لا الاناث" وما ليس بكفر وفيه اهلاک النفس ففيه حكم قطاع الطريق ويستوی فيه المذكر والمؤنث وتقبل توبته اذا تاب ومن قال لا تقبل فقد غلط فان سحرة فرعون قبلت توبتهم "

(مدارک)

حضرت شیخ ابو منصور ماتریدی رحمہ اللہ نے سحر کو مطلقاً کفر قرار دیا کہ ہر ساحر کافر ہے لیکن یہ قول درست نہیں بلکہ صحیح قول یہ ہے کہ ایسا سحر جس میں یہ شرط پائی جائے کہ ایسے الفاظ ذکر کئے جائیں جو ایمان کے زوال کا سبب ہوں تو وہ سحر یقیناً کفر ہے جس میں ایسے الفاظ کا استعمال نہ ہو جو ایمان کے زوال کا سبب بنیں وہ کفر نہیں۔ وہ جادو جو کفر ہے اس کا مرتکب جادوگر جب مذکر ہو تو اسے قتل کر دیا جائے گا لیکن مؤنث کو قتل تو نہیں کیا جائے گا البتہ اسے قید کر لیا جائے گا تا کہ وہ توبہ کر لے۔

یعنی جادوگر جب اپنے جادو میں کلمات کفریہ بولے تو وہ مرتد ہے۔ مرد ہو تو اسے تین دنوں کی مہلت دی جائے تو بہ کرلے تو ٹھیک ورنہ تین دنوں کے بعد اسے قتل کر دیا جائے گا اور اگر عورت ہو تو اسے توبہ کرنے تک قید میں رکھا جائے گا۔ وہ جادو جس میں کلمات کفریہ تو نہیں لیکن اس جادو کے ذریعے کسی نفس کو قتل کر دیا جائے تو وہ قطاع الطریق (ڈاکوؤں) کے حکم میں ہوگا۔ ایسا جادو کرنے والا خواہ مذکر ہو یا مؤنث ہو واجب القتل ہوگا۔

بعض حضرات نے بیان کیا ہے کہ جادوگر کی توبہ قبول نہیں لیکن قول درست نہیں اس لئے کہ فرعون نے جو جادوگر موسیٰ علیہ السلام کے مقابل بلائے تھے انہوں نے توبہ کرلی تو اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ کو قبول فرمالیا۔

تنبیہ : جو جادو کفر نہیں وہ حقیقت میں اصطلاح شرح میں جادو ہی نہیں، کیونکہ جادو میں شیطان سے امداد طلب کرنا ضروری ہے ہاں البتہ بعض کام حیرت انگریز ہوتے ہیں جو بظاہر جادو نظر آتے ہیں لیکن حقیقت میں وہ جادو نہیں ہوتے کیونکہ ان میں شیطان سے امداد طلب نہیں کی جاتی اور کلمات کفریہ نہیں پائے جاتے۔

راقم کے نزدیک شیخ ابو منصور ماتریدی رحمہ اللہ کا قول بھی درست ہے کیونکہ انہوں نے اس سحر کو مطلقاً کفر قرار دیا جو اصطلاح شرع میں سحر ہے۔ وہ یقیناً کفر ہی کفر ہے۔ علامہ نسفی رحمہ اللہ کی وضاحت بھی درست ہے کیونکہ عوام تو ہر کام جو عام عادت کے خلاف ہو نبی اور ولی سے سرزد نہ ہوا سے سحر کہہ لیتے ہیں۔ اس لئے اس وضاحت کی ضرورت تھی کہ بعض سحر کفر ہیں اور بعض کفر نہیں۔

یہی وجہ ہے کہ اس آیۃ کریمہ کی تفسیر میں علامہ رازی رحمہ اللہ نے کبیر میں اور شاہ عبدالعزیز رحمہ اللہ نے عزیزی میں جادو کی آٹھ قسمیں بیان کی ہیں تا کہ اصطلاح شرع میں جادو اور عوام کے نزدیک جادو میں فرق بھی ہو جائے۔ اور یہ بھی معلوم ہو جائے کہ کون سا جادو کفر ہے اور کون سا کفر نہیں۔

جادو کی اقسام:

جادو کی آٹھ قسمیں بعض ان میں سے کفر ہیں اور بعض کفر نہیں۔

پہلی قسم : کلدانیین اور بابل والے لوگوں کا سحر ہے یہ لوگ پہلے زمانہ میں پائے گئے جو عام طور پر جادو کیا کرتے تھے۔

" وهم قوم يعبدون الكواكب ويزعمون انها هى المدبرة لهذا العالم "

یہ وہ لوگ تھے جو ستاروں کی عبادت کرتے تھے اور گمان یہ کرتے تھے کہ یہ ستارے ہی اس جہان کے مدبر ہیں۔ ان ستاروں سے ہی خیر وشر حاصل ہوتے ہیں اور ان ستاروں سے ہی نیک بختی اور بدبختی حاصل ہوتی ہے یعنی تمام نظام کائنات میں مؤثر حقیقی وہ لوگ ستاروں کو مانتے۔

" وهم الذين بعث الله تعالىٰ ابراهيم عليه السلام مبطلا لمقالتهم وردا عليهم فى مذاهبهم "

یہ وہ لوگ ہیں جن کا رد کرنے کے لئے اور ان کے اقوال کو باطل ثابت کرنے کے لیے اور ان کے مذہب کو جھوٹا ثابت کرنے کے لئے رب تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو مبعوث فرمایا۔ (از کبیر)

یہ قسم جادو کی کفر ہے جیسا کہ تعریف سے واضح ہے۔

نمرودی جادو کی مثالیں:

اسی پہلی قسم کو بیان کرتے ہوئے شاہ عبدالعزیز رحمہ اللہ نے بیان فرمایا کہ معتبر تواریخ سے یہ حاصل ہوا کہ نمرود نے جادو سے حیرت انگیز چیزوں کو ایجاد کر رکھا تھا جن کی تعداد چھ تھی:

(۱) اس نے تانبے سے ایک بطخ بنا رکھی تھی جب کوئی جاسوس یا چور شہر میں آتا اس بطخ سے آواز آتی۔ تمام شہر والے اس کی آواز سنتے اور سمجھ جاتے کہ اس کا مقصد کیا ہے وہ جاسوس اور چور کو پکڑ لیتے تھے۔

(۲) ایک طبل اس نے بنوا رکھی تھی۔ جب کوئی چیز کسی شخص کہ گم ہو جاتی تو وہ اس طبل کے پاس آ کر نقارہ کی چوب سے اسے کوٹتا تو طبل سے آواز آتی کی تمہاری چیز فلاں جگہ پر ہے اس کے وہ شخص اپنی چیز کو وہاں سے ہی تلاش کرتا جو اسے مل جاتی۔

(۳) اس نے ایک آئینہ ایجاد کروایا۔ جس سے غائب کے حال کا پتہ چلایا جاتا تھا۔ جب بھی صاحب عرض (سامان کا مالک) اس آئینہ میں نگاہ کرتا اور اس غائب کا تصور کر کے آئینہ کو

دیکھا تو وہ غائب آئینہ میں نمودار ہو جاتا۔ خواہ وہ غائب شہر میں ہوتا یا جنگل میں، کشتی میں ہوتا یا پہاڑ پر، جس حال میں وہ ہوتا اسی حال میں نظر آتا۔ بیمار ہوتا یا تندرست، فقیر ہوتا یا مالدار، زخمی ہوتا یا مقتول جس حال میں ہوتا اسی طرح نظر آتا۔

(۴) ایک حوض اسے نے بنوا رکھا تھا۔ جس کے پاس سال کے بعد ایک مرتبہ بڑے بڑے لوگ آتے تھے وہ اپنی کھانے پینے کی اشیاء لاتے تھے اور حوض میں ڈال دیتے تھے۔ لوگ اس کے اردگرد کھڑے ہو جاتے پانی پلانے والے حوض کے کنارے پر بیٹھ جاتے۔ جس شخص کے لئے جو ڈول نکالتے اس میں کھانے کی وہی چیز آتی جو اس نے ڈالی ہوتی۔

(۵) ایک تالاب اس نے جھگڑے مٹانے اور مقدمات کے فیصلے کرنے کے لئے بنوایا ہوا تھا۔ جب دو شخصوں کے درمیان جھگڑا ہوتا حق و باطل کے درمیان تمیز نہ ہو سکتی تو وہ دونوں اس تالاب کے پاس آ کر اس میں چھلانگ لگاتے۔ جو شخص حق پر ہوتا اس کے ناف کے نیچے کنارے تک پانی پہنچتا۔ اور جو شخص باطل پر ہوتا اس کے سر سے پانی گزر جاتا اگر وہ توبہ کر لیتا تو بچ جاتا اور اگر توبہ نہ کرتا تو غرق ہو جاتا۔

(۶) نمرود کی سرائے کے دروازے کے باہر ایک درخت تھا جس کے سایہ میں اس کے درباری لوگ بیٹھتے تھے۔ جتنے لوگ زیادہ ہوتے جاتے اتنا ہی سایہ بڑھتا رہتا۔ لیکن ایک لاکھ کی تعداد کو تو یہ سایہ کفایت کرتا ایک لاکھ سے اگر ایک شخص بھی بڑھ جاتا تو سایہ مکمل ختم ہو جاتا سب دھوپ پر بیٹھتے۔

" نمرود که بادشاه آنها بود نیز دریں باب توغل بسیار داشت "

جب جادوگروں نے ان چیزوں کو ایجاد کیا تو ان کو ہی دیکھ کر نمرود نے خدائی کا دعوی کر دیا کہ جبکہ میری رعایا کے جادوگر اس قسم کے کام کر سکتے تو خود بادشاہ کا کتنا ہی بلند مقام ہوگا۔ لہذا میں خدا ہی ہو سکتا ہوں خدا سے کم مرتبہ کے دعوی کا کیا فائدہ۔ (از عزیزی)

یقین جانئے آج کل کے بادشاہ فرعون اور نمرود سے عملی طور پر کوئی کم نہیں۔ آئے دن قانون بدلتے رہتے ہیں اپنی مرضی کے قوانین بنانا۔ اپنی مرضی کے لوگوں کو فائدہ پہنچانے کے لئے قوانین بنانا اور اپنے مخالفین کو نقصان پہنچانے کے لئے قوانین بنانا اور بی حضوری قاضیوں سے من مانے فیصلے کرانا

کیا فرعون اور نمرود کا مثل نہیں۔ میرا تو گمان یہی ہے کہ اگر علماء اور عوام کا ان کو ڈر نہ ہو تو یہ خدائی کا دعوی کرنے میں کوئی دیر نہ کریں۔

دوسری قسم : جنوں اور شیطانوں کو اپنے تابع کیا جاتا ہے یہ عمل آسان ہے اور زیادہ رواج بھی اس کا ہے۔ بڑے بڑے جنوں کو مسخر کر لیا جاتا ہے لیکن اس میں بتوں کو معبود سمجھا جاتا ہے ان کا واسطہ پیش کیا جاتا ہے۔ ان بتوں کے نام پر نذر مانی جاتی ہے جانوروں کو ذبح کیا جاتا ہے اور ان بتوں کے پاس اچھے اچھے عطریات پیش کیے جاتے ہیں (کفر صریح لازم می آید) اس سے صریح کفر لازم آتا ہے۔ اس کا سمجھنا کوئی مشکل بھی نہیں کیونکہ بتوں سے امداد طلب کرنا اور ان کے واسطہ سے کوئی کام کرنا یقینی طور پر کفر ہے۔

خیال رہے کہ اسی تسخیر کو " الاستعانة بالارواح الارضية " (زمین روحوں سے امداد طلب کرنا) سے بھی تعبیر کر دیا جاتا ہے اور اسی کا نام "عزائم" اور اسی کا نا" تسخیر الجن " (جنوں کو تابع کرنا) بھی ہے۔

خیال رہے کہ کبھی امداد ارواح فلکیہ سے بھی طلب کی جاتی ہے لیکن وہ عبادت میں اعلیٰ مقام پیدا کرنے اور رب تعالیٰ کا تقرب حاصل کرنے کے بعد اسے کرامت کہا جائے گا وہ سحر حقیقی بھی نہیں اور مجازی بھی نہیں۔

تیسری قسم : فوت شدہ آدمیوں کی روحوں کو مسخر کرنا (اپنے تابع کرنا) لیکن ان روحوں کو تابع کرنے میں بھی بڑے بڑے شیاطین کے ناموں کا وسیلہ پیش کیا جاتا ہے بہت بڑی تعظیم ان شیاطین کی کی جاتی ہے اور ان کے ناموں کی نذر مانی جاتی ہے۔ اس طرح روحوں کو اس طرح اپنے تابع کر لیا جاتا ہے۔ جس طرح نوکر کو تابع کیا جاتا ہے ان روحوں کو بلا کر ان سے کام کرائے جاتے جو خرق عادت ہوتے ہیں۔ زیادہ طور پر ان روحوں کی مدد سے شہوت اور غضب پر مبنی کام کرائے جاتے ہیں۔ اس قسم کا جادو عام طور پر ہندو لوگ اور فساق لوگ کرتے ہیں۔

" ایں هم یا مستلزم کفر است یا قریب بسرحد کفر میر ساند "

جادو کی یہ قسم یا تو مستلزم کفر ہے اور یا کفر کے قریب ہے۔

چوتھی قسم : یہ ہے کہ کسی کے خیالات کو فاسد کر دیا جائے ، اس میں بعض جنوں کی روحوں کا وسیلہ پکڑا جاتا ہے۔اور کسی کے خیال میں تصرف کیا جاتا ہے تا کہ جو چیز موجود نہیں اسے نظر آئے یا ہولناک صورتیں کسی کی نظر میں اس جادو سے آ جاتی ہیں جن سے وہ دوڑتا ہے یا حرکات غیر واقعیہ کو واقعیہ سمجھتا ہے۔

اس قسم کو نظر بندی اور خیال بندی کہا جاتا ہے فرعون کے جادوگروں نے جو اپنا کرتب دکھایا اس کا ذکر رب تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ فاذا حبالهم وعصيهم يخيل اليه من سحرهم انها تسعى ﴾ (طه ٦٦)

تو ان کی رسیاں اور لاٹھیاں ان کے جادو کے زور سے ان کے خیال میں دوڑتی معلوم ہوئیں۔

یہ جادو بذاتہ (ذاتی طور پر) کفر نہیں۔ہاں اگر کوئی یہ جادو کرتے وقت یعنی کسی کی نظر بندی میں جنوں کی ارواح سے التجاء کرے اور بڑے جنات اور شیاطین کا واسطہ ڈالے اور ان کی حد سے زیادہ تعظیم کرے تو اس صورت میں یہ کفر ہوگا۔یہی جادو اگر اولیاء کرام کے مقابل کیا جائے کہ انسان ان کا اس جادو کے ذریعے مقابلہ کرے تو حرام ہے۔اور اسی جادو کے ذریعے اگر کسی شخص کو دھوکہ دینا مقصود ہو کہ اس کا مال ہڑپ کر لیں گے تو یہ بھی گناہ کبیرہ ہوگا اور حرام کا ارتکاب لازم آئے گا۔

اگر اسی جادو کے ذریعے انبیاء کرام سے مقابلہ کیا جائے تو کفر ہوگا کیونکہ انبیاء کرام سے مقابلہ کفر ہے اسی لئے موسیٰ علیہ السلام کے مقابل جادوگروں نے توبہ کے وقت کہا ﴿ آمنا برب هارون وموسى ﴾ ہم ایمان لائے ھارون اور موسی کے ایمان پر۔

پانچویں قسم : یہ اصحاب اوہام کا سحر ہے (یعنی وہم سے جادو کیا جاتا ہے) اس جادو کا پہلے ہندوؤں میں بہت رواج تھا لیکن اب اس کا نام ونشان نہیں۔اس جادو کو "تعلیق الوهم" بھی کہا جاتا ہے۔اس کا طریقہ یہ ہے کہ جو صورت واقعہ میں مطلوب ہو تصور کرنے والا اسے اپنی نظر کے سامنے لاتا ہے پھر اس کو حاصل کرنے کے لئے وہم کو اس کے ساتھ متعلق کرتا ہے تو وہ مطلوبہ صورت حاصل ہو جاتی ہے۔

لیکن اس کے لئے شرط یہ ہے کہ غذا کم کھائے ، اور لوگوں سے کنارہ کش ہو جائے جس طرح

ہندوؤں کے جوگی کرتے ہیں۔اس قسم کے جادو کا حکم یہ ہے کہ اگر غرض مباح ہو تو یہ جادو بھی مباح ہوگا جیسا کہ دو بدکاروں کے درمیان تفریق کرنی مقصود ہو یا کسی ظالم اور کافر کو ہلاک کرنا مقصود ہو تو یہ جائز ہے۔اگر کسی ممنوع غرض کے لئے یہ جادو کرے تو حرام ہوگا جیسا کہ میاں بیوی کے درمیان جدائی ڈالنے کے لئے یا کسی معصوم کو ہلاک کرنے کے لئے جادو کیا جائے تو ناجائز ہوگا۔

" بالجمله حکم مباشرت فعل دارد وفی نفسه قبیح نیست "

حاصل کلام یہ ہے کہ جادو کی یہ قسم ذاتی طور پر قبیح (بری) نہیں البتہ اغراض فاسدہ کے ملنے سے اس میں قباحت (برائی) آجاتی ہے۔

چھٹی قسم : یہ ہے کہ بعض دواؤں کے ذریعے عجیب اثر دکھایا جائے۔ جب کہ دوسرے شخص کو معلوم نہ ہو کہ اس دوا میں یہ اثر ہے تو حیرت انگیز اثر اس کو دکھائی دے گا اس کا نام سحر نیرنج ہے۔جیسا کہ چونہ کو سرکہ میں تر کر کے سمندر جھاگ اس میں ملالے اور اس کا لیپ انگلیوں پر کرے اس کے اوپر مٹی کا تیل لگا کر آگ لگائے تو انگلیاں چراغ کا کام دیں گی لیکن جلیں گی نہیں۔

البتہ ان کے نہ جلنے کی ایک مختصر میعاد ہوگی۔کوئی تجربہ کرتے کرتے انگلیاں نہ جلا بیٹھے۔اسی طرح طعام میں ایسی دوا کا استعمال کرنا جو عقل کو زائل کر کے بے وقوف بنادے یا نشہ آور دھواں دماغ تک پہنچے تو دماغ کام نہ کرے۔

" نحو دماغ الحمار اذا تناوله الانسان تبلد عقله وقت فطنته "

اسی طرح جب کوئی انسان گدھے کا دماغ کھالے تو وہ بددماغ ہو جاتا ہے اس کی سمجھ کم ہو جاتی ہے اسی وجہ سے بعض لوگوں کو "خر دماغ" کہا جاتا ہے۔

ساتویں قسم : جسے سحر الحیل کہتے ہیں اس میں عجیب آلات کے ذریعے حیرت انگیز کام کرنا لازم آتا ہے۔سائنسی ایجادات تمام اسی میں آتی ہیں جیسے ٹیلی فون، ٹیلی ویژن، ریڈیو وغیرہ۔ لیکن خیال رہے کہ اب ہماری اصطلاح میں ان ایجادات کا نام سحر سرے سے ہے ہی نہیں۔ یہ جائز ہے لیکن شرط اس میں بھی یہ ہے کہ کسی کو نقصان پہنچانے کی غرض نہ ہو۔

سنا ہے ایڈز کی مرض یہودی اور عیسائیوں نے جراثیم کو ایجاد کر کے مسلمانوں میں پھیلانے کی

غرض سے ایجاد کی لیکن مسلم ممالک تو اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے ابھی تک کافی حد تک محفوظ ہیں البتہ وہ لوگ خود اس کی زد میں ہیں۔

آٹھویں قسم : شعبدہ بازی اور ہاتھ کی صفائی ہے یہ عام طور پر مردوں اور عورتوں کو تعجب میں ڈالنے کے لئے لوگ کرتے ہیں۔اس میں صرف چالاکی کو دخل ہوتا ہے۔کسی چیز کو بیگ وغیرہ میں چھپالیا، عام لوگوں کو دکھایا کہ دیکھو بیگ خالی ہے اسمیں کوئی چیز نہیں، پھر وہاں سے کوئی چیز نکال دیں یا ہاتھ وغیرہ میں وہ چیز رکھ لی تھی پھر جلدی سے اس میں ڈال دی۔اس طرح کے کام بظاہر حیرت انگیز ہوتے ہیں لیکن ان میں چالاکی اور پھرتیلا پن کا دخل ہوتا ہے۔

آخری تین قسموں کا حکم:

"ایں ہر سہ قسم سحر نہ کفراست ونہ حرام مگر آنکہ غرضی فاسد قصد کنند پس بآں قصد حرمت متحقق گردد"

آخر میں جن تین قسموں کو ذکر کیا گیا ہے یہ حقیقت میں جادو ہیں ہی نہیں۔ان میں کوئی شیطانوں سے امداد نہیں لی جاتی۔لہٰذا یہ قسمیں نہ کفر ہیں اور نہ حرام ہیں ہاں البتہ کسی غلط ارادہ سے یہ کام کریں اور کسی کو نقصان دینے کا ارادہ ہو تو اس غلط مقصد کی وجہ سے یہ کام حرام ہو جائیں گے۔لیکن ذاتی طور پر ان میں کوئی گناہ نہیں۔ (ماخوذ از کبیر وعزیزی)

جادو کی پہلی قسم کا دفاع:

اللہ تعالیٰ کے اسماء گرامی اور آیات قرآنی کے ذریعے اور عبادات میں خلوص پیدا کر کے فرشتوں کے ذریعے اس جادو کو توڑا جاتا ہے جو شیطان کی امداد سے کیا جاتا ہے۔یہ وہی لوگ کرتے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے عملیات میں خصوصی مقام دے رکھا ہوتا ہے۔

دوسری قسم کا دفاع:

یعنی وہ جادو جو کہ موکلات ارضیہ اور جنوں کو مسخر کر کے کیا جاتا ہے اس کا زوال بھی اللہ تعالیٰ کے نیک بندے اللہ تعالیٰ کے اسماء اور قرآن پاک کی آیات کے ذریعے ہی کرتے ہیں۔جادو کے دفاع کے لئے پھر

جادوگروں کے جال میں پھنسنا" جو کفر و شرک اور شیطانوں سے امداد طلب کرنے میں مبتلاء ہیں" حماقت ہے۔

تیسری قسم کا دفاع:

یعنی شیطانوں کے واسطہ سے روحوں سے جو امداد لے کر لوگوں کو نقصان پہنچایا جاتا ہے اس کا زوال اللہ تعالیٰ کے نیک بندے اس طرح کرتے ہیں کہ:

"تحصیل ربط بارواح طیبه صلحاء و اولیاء است که اکثر اویسی مشربان بعمل می آرند و در حوائج خود و دیگر خلق بآں منتفع میشوند و در طریق تحصیل آں نیز طهارت و تلاوت و ارسال ثواب صدقات برائے آں ارواح منظور ی دارند"

کہ اپنے آپ کو پاکیزہ رکھ کر، تلاوت قرآن پاک کر کے اور صدقات کا ثواب نیک لوگوں، اولیاء کرام کی روحوں کو پہنچا کر ان بزرگوں کی روحوں سے رابطہ کر کے ان سے اپنی حاجات کے مندفع کرنے کے لئے اور دوسرے لوگوں کو نفع پہنچانے کے لئے امداد طلب کرتے ہیں۔ یعنی ارواح صلحاء و اولیاء ان کی امداد کرتی ہیں جس کی وجہ سے بد روحوں کی وجہ سے کیا ہوا سحر زائل ہوتا ہے۔ یہ عمل اویسی حضرات زیادہ کرتے ہیں۔

چوتھی قسم کا دفاع:

"اصلاح قسم پنجم عقد همت ست که از مشائخ کبار و اولیای ابرار برائے حل مشکلات بوقوع آمده"

پانچویں قسم کی اصطلاح اور اس کا دفاع بھی بڑے بڑے مشائخ اور اولیاء کرام کی ہمت سے ہی ہوسکتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کو مشکلات کے حل کی ہمت دے رکھی ہے۔ اولیاء کرام اللہ تعالیٰ کے اسماء گرامیہ کے ذکر میں مستغرق ہونے کی وجہ سے رب تعالیٰ کے فضل سے روح کی ترقی کے منازل طے کر لیتے ہیں جن کو درجات رفیعہ حاصل ہو جاتے ہیں۔

پانچویں قسم کا دفاع:

اللہ تعالیٰ کے اسماء اور قرآن پاک کی آیات میں تفکر کرنا اور ان کو پڑھتے رہنا اور اپنے احوال کی اصلاح کرنا اس قسم کے ازالہ کے لئے مفید ہے۔ (ماخوذ از عزیزی)

تعویذات کا حکم:

ولا بأس بالمعاذات اذا کتب فیها القرآن او اسماء الله تعالیٰ"

جو تعویذ قرآن پاک کے الفاظ مبارکہ سے لکھے جائیں، یا اللہ تعالیٰ کے اسماء گرامی لکھے ہوں اسی طرح جن دعاؤں کا احادیث میں ذکر ہے ان میں بھی اللہ تعالیٰ کا ہی ذکر ہے۔ ان میں کوئی حرج نہیں وہ تعویذ لکھنے لکھوانے استعمال کرنے جائز ہیں۔

" ویقال رقاه الراقی رقیا ورقیه اذ اعوذه ونفث فی عوذته "

اسی طرح قرآن واحادیث اللہ تعالیٰ کے ذکر اللہ تعالیٰ کے اسماء گرامی رسول اللہ ﷺ کے اسماء گرامی کو پڑھ کر تکلیف کی جگہ پھونکنا یعنی دم کرنا بھی جائز ہے۔

" وانما نکره العوذة اذا کانت بغیر لسان العرب ولا یدری ما هو ولعله یدخله سحر او کفر او غیر ذلک واما ما کان من القرآن او شئی من الدعوات فلا بأس به "

دم اور تعویذ ایسی زبان میں ہوں جن کے معانی کا پتہ نہ ہو تو وہ جائز نہیں کیونکہ ہو سکتا ہے وہ سحر ہو کفریہ کلمات ہوں یا حرام کی طرف لے جانے والے الفاظ ہوں۔ لیکن قرآن پاک اور دعائیہ کلمات سے دم اور تعویذ جائز ہیں۔

" والخیط کان یربط فی العنق او فی الید فی الجاهلیة لدفع المضرة عن انفسهم علی زعمهم وهو منهی عنه وذکر فی حدود الایمان انه کفر "

زمانہ جاہلیت میں گردن یا ہاتھ میں ایک دھاگہ باندھا جاتا تھا کہ لاحق ہونے والے نقصانات

اور ضرر دینے والی اشیاء اس سے دور ہو جاتی ہیں۔ یہ ناجائز ہے اگر اس دھاگہ کو مستقل طور پر دافع ضرر، دافع بلاء سمجھے اللہ تعالیٰ کو تسلیم نہ کرے تو یہ کفر ہے۔

تنبیہ : کسی دواء، کسی دم، کسی تعویذ اور کسی جنتر منتر (ٹونہ) کو اگر مستقل طور پر باعث شفاء دافع بلاء سمجھا جائے اور تصور یہ کیا جائے کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کو اس میں کوئی دخل نہیں تو شرک لازم آئے گا۔

فائدہ : " وفی المجتبی اختلف فی الاستشفاء بالقرآن بان یقرأ علی المریض او الملدوغ الفاتحة او یکتب فی ورق ویعلق علیه اوفی طست ویغسل ویسقی "

سورۃ فاتحہ سے شفاء حاصل کرنا احادیث سے ثابت ہے بالاتفاق جائز ہے البتہ اس میں علماء کا اختلاف ہے کہ فاتحہ کے ذریعے شفاء حاصل کرنے کا طریقہ بہتر کون سا ہے بعض حضرات نے کہا مریض اور سانپ، بچھو وغیرہ سے ڈسے ہوئے شخص پر فاتحہ کا پڑھ کر پھونکنا بہتر ہے اور بعض حضرات نے کہا کاغذ پر لکھ کر گلے میں ڈالنا بہتر ہے۔ اور بعض حضرات نے کہا کسی طشت، پلیٹ وغیرہ پر لکھ کر پھر دھوکر وہ پانی پلانا بہتر ہے۔

راقم کے نزدیک تینوں طریقوں میں سے جس پر بھی عمل کرے وہ ہی مستحسن طریقہ ہے۔

فائدہ جلیلہ: " وعن النبی ﷺ انه کان یعوذ نفسه قال ﷺ وعلی الجواز عمل الناس الیوم وبه وردت الآثار "

نبی کریم ﷺ خود اپنے آپ کو دم کرتے تھے دم کرنے کے جواز پر آج تک لوگ عمل کر رہے ہیں اور اس کا جواز احادیث مبارکہ سے ثابت ہے۔

مسئلہ : " ولا بأس بان یشد الجنب والحائض التعاوید علی العضد اذا کانت ملفوفة "

اجنبی شخص یا حیض والی عورت اپنے بازو پر تعویذ باندھیں جو تعویذ کسی چیز میں بند لپٹا ہوا ہو تو جائز ہے۔ اسی سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ جیب وغیرہ میں رکھا ہوا تعویذ، یا قرآن کی آیۃ کو جیب میں ڈالا ہوا ہو تو بیت الخلاء وغیرہ میں جانا جائز ہے۔

مسئلہ : " وفی الخانية بساط او مصلی کتب علیه فی النسج " الملک للہ " یکره استعماله وبسطه والقعود علیه "

فتاوی قاضی خان میں ہے کہ اگر کوئی چٹائی یا مصلی ایسا ہو جس کو بنتے وقت اس کی بنائی میں "الملک للہ" لکھ دیا گیا اس کا استعمال کرنا، اسے بچھانا اور اس پر بیٹھنا مکروہ ہے۔

خیال رہے تمام متبرک الفاظ کا یہی حکم ہے خواہ وہ بنائی میں لکھے جائیں یا بعد میں اوپر لکھ دیا جائے ان کا ادب کیا جائے توہین نہ کی جائے۔ عام طور پر مصلی میں کعبہ شریف اور نبی کریم ﷺ کے روضہ منورہ کی تصاویر بنی ہوتی ہیں۔ راقم نے ایسے مصلی کو کبھی استعمال نہیں کیا۔ راقم کے نزدیک ان تصاویر پر بیٹھنا ادب کے خلاف ہے اس مسئلہ میں اہل علم کی تحقیق کیا ہے مجھے اس کا کوئی علم نہیں تاہم میں نے اپنی عقیدت ومحبت کا ذکر کر دیا ہے۔

مسئلہ : کسی قسم کا تعویذ دوسرے لوگوں کو نقصان پہنچانے کے لئے لکھنا اور لکھوانا حرام ہے کوئی عمل کسی قسم کا بھی ہو، جس سے کسی کو نقصان پہنچانا، تکلیف دینا مقصود ہو وہ حرام ہے۔ علماء کرام کو مساجد سے نکالنے کے لئے منافقانہ طرز رکھنے والے نمازی بھی اسی قسم کے حرام کے مرتکب ہوتے ہیں۔

مسئلہ : " لا بأس بوضع الجماجم فی الزرع والمبطخة لدفع ضرر العین حق تصیب المال والآدمی والحیوان ویظهر اثره فی ذلک عرف بالآثار فاذا نظر الناظر الی الزرع یقع نظره اولا علی الجماجم لارتفعها فتظره بعد ذلک الی الحرث لا یضره "

کھیتی میں اور خربوزوں وغیرہ کی بیلوں میں کھوپریوں کا لٹکانا نظر لگنے سے بچاؤ کے لئے جائز ہے۔ کیونکہ نظر کا لگ جانا حق ہے کبھی مال کو نظر لگ گئی کبھی انسانوں کو اور کبھی حیوانوں کو۔ نظر کے اثرات کا ثبوت احادیث مبارکہ میں موجود ہے۔ اس لئے جب کھیتی پر نظر ڈالنے والا پہلے کھوپریوں کو دیکھے گا اس کے بعد وہ کھیتی کو دیکھے گا تو اس کی نظر سے کوئی نقصان نہیں ہوگا۔

لیکن خیال رہے کہ یہ صرف سبب سمجھے۔ حقیقی طور پر یہی سمجھے کہ اللہ تعالیٰ ہی مؤثر حقیقی ہے۔

" روی ان امرأة جاءت الی النبی ﷺ وقالت نحن من اهل الحرث وانا نخاف علیه العین فامر النبی ﷺ ان یجعل فیه الجماجم "

روایت کیا گیا ہے کہ بیشک ایک عورت نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کرنے لگی کہ ہم کھیتی باڑی کرتے ہیں ہمیں نظر لگنے کا ڈر رہتا ہے تو نبی کریم ﷺ نے کھیت میں کھوپریوں کے رکھنے کا حکم دیا۔ (ماخوذ از شامی ج ۵ ص ۲۵۶ کتاب الحظر والاباحة)

عام طور پر لوگ نئے مکانوں پر ہنڈیا رکھ دیتے ہیں اس کا جواز بھی اسی حدیث سے واضح طور پر سمجھ آتا ہے۔ ہر کام کو شرک سے تعبیر کرنا، مسلمانوں کو مشرک بناتے رہنا جہلاء کا کام ہے، اہل علم کا یہ طریقہ نہیں۔ راقم نے جز اول میں بھی اس مسئلہ کو بیان کیا ہے یہاں کچھ مختلف انداز پر بیان کیا تاکہ جادو اور تعویذات میں فرق سمجھ آسکے۔

﴿ وَاتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ عَلٰى مُلْكِ سُلَيْمٰنَ ﴾ :

''اورانہوں نے تابعداری کی جو پڑھتے تھے شیطان سلیمان کی سلطنت کے زمانہ میں''۔ ﴿ وَاتَّبَعُوْا ﴾ کا عطف ہے ''نبذ'' پر یعنی یہود نے اللہ تعالیٰ کے وعدہ کو اور اللہ تعالیٰ کی کتاب کو پس پشت ڈال دیا اور جادو کی کتابوں کی تابعداری کرنے لگ گئے۔

﴿ تَتْلُوا ﴾ اگرچہ مستقبل کا صیغہ ہے لیکن ان لوگوں کی ماضی کی حالت کو مستقبل سے تعبیر کر دیا گیا اسی وجہ سے ترجمہ ماضی کا کیا گیا۔

ضابطہ : '' والعرب يستعمل الماضي موضع المستقبل وبالعكس مجازاً ''
عرب حضرات ماضی کو کبھی مجازی طور پر مستقبل کے معنی میں اور کبھی مستقبل کو مجازاً ماضی کے معنی میں استعمال کرتے رہتے ہیں۔

'' تتلوا ما مشتق من التلاوة بمعنى القراءة او من التلو بمعنى التبعية ''

یالفظ ﴿ تَتْلُوا ﴾ مشتق ہے تلاوۃ سے جس کا معنی ہے پڑھنا، اس صورت میں وہی معنی ہوگا جو ذکر کر دیا گیا اور اگر مشتق ہو '' تلو '' سے تو معنی ہوتا ہے تابعداری کرنا۔ اب اس صورت میں معنی یہ ہوگا ''اورانہوں نے (یہود نے) تابعداری کی جس کی تابعداری کی شیاطین نے سلیمان کی سلطنت کے زمانہ میں'' (لیکن راقم کو اس معنی میں تکلف نظر آتا ہے۔

﴿ عَلٰى مُلْكِ سُلَيْمٰنَ ﴾ متعلق بتتلوا علی تضمين الافتراء ای تتلوا الشياطين مفترين على ملك سليمان قائلين بان ملكه كان به ''

یعنی ﴿ عَلٰى مُلْكِ سُلَيْمٰنَ ﴾ جار مجرور کا تعلق ﴿ تَتْلُوا ﴾ سے ہے قاعدہ تضمین جاری

کیا گیا یعنی افتراء کے معنی کو متضمن ہے تا کہ ﴿ عَلٰی ﴾ کا استعمال صحیح ہو سکے۔ پہلے دونوں معانی کے لحاظ پر ﴿ عَلٰی ﴾ بمعنی "فی" استعمال ہے۔ اس ترکیب کے لحاظ پر معنی بہت خوبصورت سمجھ کے قریب ہے۔ اور تابعداری کی انہوں نے جو افتراء باندھتے تھے شیاطین سلیمان کی سلطنت پر (کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی بادشاہت جادو کی وجہ سے قائم تھی)۔

سلیمان علیہ السلام کو انہوں نے جادوگر کیوں کہا؟

بغوی نے بیان کیا کہ سدی نے کہا شیاطین آسمانوں کی طرف چڑھتے (کیونکہ آسمان دنیا پر ان کو چڑھنے کی اجازت تھی) تو فرشتوں کے کلام کو سنتے، خاص کر کے مستقبل کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو جو علم عطا کیا ہوتا ہے اس کے متعلق سن کر "کہ فلاں شخص کی موت فلاں جگہ آئے گی اور یہ یہ کام فلاں لوگوں نے فلاں دنوں میں کرنے ہیں"۔ وہ کاہنوں کے پاس آ کر بتاتے لیکن اس میں وہ اپنی طرف سے بھی کثیر جھوٹوں کی آمیزش کر دیتے۔

بعض روایات میں ستر جھوٹ اور بعض میں ننانوے جھوٹ ملانے کا ذکر ملتا ہے لیکن مراد اس سے تقریباً کثرت ہی ہے یعنی وہ کثیر جھوٹ ملا کر فرشتوں کا کلام کاہنوں تک پہنچاتے لوگ سمجھتے کہ کاہنوں کو علم غیب حاصل ہے لوگوں نے وہ لکھ لیا۔ اور اسی طرح بنی اسرائیل میں یہ مشہور ہو گیا کہ جن غیب کا علم رکھتے ہیں۔

حضرت سلیمان علیہ السلام نے کچھ حضرات کو بھیج کر وہ جادو کی تمام کتابیں جمع کرا لیں اور ایک صندوق میں بند کر کے اپنی کرسی کے نیچے دفن کرا دیا۔

"وقال لا اسمع احدا یقول ان الشیطان یعلم الغیب الا ضربت عنقه"

اور آپ نے فرمایا کہ میں کسی کو یہ کہتے ہوئے نہ سنوں کی "شیطان غیب جانتا ہے اگر میں نے کسی سے یہ سنا تو میں اس کی گردن اڑا دوں گا"۔ جب سلیمان علیہ السلام کا وصال ہو گیا اور وہ علماء کرام بھی دنیا سے رخصت ہو گئے جو یہ جانتے تھے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے جادو کی کتابوں کو دفن کیا۔ تو ان کے بعد جب دوسرے لوگوں کا زمانہ آ گیا جو حضرت سلیمان علیہ السلام کے جادو کی کتب کو دفن کرنے

کی وجہ نہیں جانتے تھے تو ان کے پاس شیطان انسانی شکل میں آیا۔ بنی اسرائیل کے چند لوگوں کو جمع کر کے کہنے لگا کیا میں تمہیں ایک خزانہ پر مطلع نہ کروں؟ انہوں نے کہا ہاں تم ہمیں بتاؤ۔

شیطان نے کہا کرسی کے نیچے سے جگہ کو کھودو، ان کو وہ جگہ تو دکھار ہا تھا لیکن خود ایک کنارے پر کھڑا تھا:" وذالک انه لم یکن یدنو شیطان من الکرسی الا احترق " اس کی وجہ یہ تھی کہ اگر شیطان خود کرسی کے قریب آتا تو وہ ضرور جل جاتا۔ انہوں نے جگہ کو کھودا اور جادو کی کتابوں کو نکال دیا۔

" قال الشیطان ان سلیمان کان یضبط الجن والانس والشیاطین والطیر بهذه "

شیطان نے کہا بیشک سلیمان اسی جادو کی وجہ سے جنات اور انسانوں اور شیاطین اور پرندوں پر حکومت کرتے تھے۔ " وفشا فی الناس ان سلیمان کان ساحرا " لوگوں میں یہ مشہور ہو گیا کہ سلیمان جادوگر تھے۔

دوسری وجہ حضرت سلیمان علیہ السلام کو جادوگر کہنے کی یہ تھی کہ آصف نے حضرت سلیمان علی علیہ السلام سے تعلیم حاصل کی شیطانوں نے خود جادو کی کتابیں لکھ کر آصف کی طرف منسوب کر دیں اور یہ آپ کے مصلی کے نیچے دفن کر دیں۔ آپ کے وصال کے بعد ان کتابوں کو شیطانوں نے نکال کر یہ کہا کہ یہی علم آصف نے سلیمان سے حاصل کیا تھا " وانما ملککم سلیمان بهذا " اور تم پر حضرت سلیمان علیہ السلام نے اسی جادو کی وجہ سے بادشاہت کی۔

" فاما علماء بنی اسرائیل وصلحاؤهم فقالوا معاذ الله ان یکون هذا من علم سلیمان "

بنی اسرائیل کے علماء اور صلحاء نے تو شیطانوں کے اس افشاء پر " کہ سلیمان جادوگر تھے " کہا کہ اللہ کی پناہ یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کا یہ علم ہو اور آپ نے اس کے ذریعے حکومت کی ہو۔

" واما السفلة فقالوا هذا علم سلیمان واقبلوا علی تعلمه ورفضوا کتب انبیائهم "

لیکن جاہل گھٹیا، کمینے لوگ یہ کہنے لگے کہ سلیمان کا یہی علم تھا وہ لوگ اسکے سیکھنے کی طرف متوجہ ہو

گئے اور انہوں نے انبیاء کرام کی کتب کو چھوڑ دیا اور حضرت سلیمان علیہ السلام کو جادوگر کہنا شروع کر دیا۔

﴿ وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ ﴾: یعنی ما سحر سلیمان فیکفر عبر عن السحر بالکفر لیدل علی ان السحر کفر وان من کان نبیا کان معصوما عنه"

(اور نہیں کفر کیا سلیمان نے) اس کا مطلب یہ ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے کوئی سحر نہیں کیا کہ کفر لازم آتا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کے سحر نہ کرنے کو کفر نہ کرنے سے تعبیر فرمایا۔ تاکہ معلوم ہو جائے کہ وہ سحر جس کو اصطلاح شرع میں سحر کہا گیا ہے وہ کفر ہے بیشک نبی کا سحر سے معصوم ہونا ضروری ہے۔

فائدہ: "فلما جاء محمد ﷺ برأ اللہ تعالیٰ سلیمان من ذلک"

حضرت سلیمان علیہ السلام پر بنی اسرائیل نے جو جادوگر ہونے کا عیب لگایا تھا۔ اس عیب سے اللہ تعالیٰ ان کو اس وقت بری فرمایا جب نبی کریم محمد مصطفیٰ ﷺ تشریف لائے۔

اسی سے یہ واضح ہوا کہ نبی کریم ﷺ کے انبیاء کرام پر بھی احسانات عظیمہ ہیں۔

(ماخوذ از مظہری)

﴿ وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ ﴾ "اور لیکن شیطانوں نے کفر کیا سکھاتے لوگوں کو جادو" اس سے پہلے جو بحث ذکر کی گئی اسی سے واضح ہو جاتا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی طرف جادو کو منسوب کرنے والے شیاطین تھے اور وہ خود ہی لوگوں کو جادو سکھاتے تھے تو رب تعالیٰ نے ان کا رد فرمایا کہ سلیمان نے تو جادو نہیں کیا کہ کفر لازم آتا ہاں البتہ وہ جادو کرنے والے اور دوسرے لوگوں کو سکھانے والے، اس طرح جادو کے ارتکاب سے کفر کرنے والے شیاطین ہی تے جو جھوٹ کی وجہ سے حضرت سلیمان علیہ السلام کی طرف جادو کی نسبت کر کے اور ہی جرم کے مرتکب ہوئے۔

﴿ وَمَآ اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَارُوْتَ وَمَارُوْتَ وَمَا يُعَلِّمٰنِ مِنْ اَحَدٍ حَتّٰى يَقُوْلَآ اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ ﴾:

"اور جو الہام کیا گیا دو فرشتوں پر بابل میں یعنی ہاروت اور ماروت پر اور وہ دونوں نہیں سکھاتے تھے کسی ایک کو یہاں تک کہ وہ کہتے ہم تو صرف آزمائش ہیں تو تم کفر نہ کرو"۔

﴿ وَمَآ اُنْزِلَ عَلَی الْمَلَکَیْنِ ﴾ ای الھماہ من السحر " اس مقام پر انزال کا معنی الہام لیا گیا ہے یعنی جو جادو الہام کیا گیا دو فرشتوں پر۔" ببابل ، بلد فی سواد العراق " بابل عراق کے علاقہ میں شہر کا نام ہے۔ ﴿ هَارُوْتَ وَمَارُوْتَ ﴾ ترکیبی لحاظ پر یہ بدل ہے ﴿ مَلَکَیْنِ ﴾ کا یا عطف بیان ہے اسی لئے راقم نے اپنے ترجمہ میں "یعنی" کا لفظ بڑھایا ہے۔ (ماخوذ از جلالین)

ہاروت و ماروت کی وجہ تسمیہ:

بعض حضرات نے تو یہ کہا ہے کہ یہ عجمی لفظ ہیں۔ عجمہ اور علمیت کی وجہ سے غیر منصرف ہیں "وقیل عربیان من الھرت والمرت بمعنی الکسر" بعض حضرات نے کہا ہے کہ یہ دونوں لفظ عربی ہیں "ھرت اور مرت" سے ماخوذ ہیں جس کا معنی ٹوٹنا۔ (از روح المعانی)

ممکن ہے کہ ان کو منکسر المزاج ہونے کی وجہ سے، یعنی نرمی سے دوسروں کو نصیحت کرنے کی وجہ سے ہاروت اور ماروت کہہ دیا گیا ہو آیۃ کریمہ کا مفہوم تقریباً واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے لوگوں کی آزمائش کے لئے دو فرشتوں ہاروت اور ماروت کو جادو کا الہام کر کے بابل شہر میں اتارا کہ تم وہاں جا کر لوگوں کو جادو سکھاؤ۔

جو ان کے پاس جادو سیکھنے کے لئے آتا وہ فرشتے پہلے اسے نصیحت کرتے کہ ہم تو رب تعالیٰ کی طرف سے آزمائش بنا کر بھیجے گئے ہیں جو جادو سیکھے گا وہ کافر ہو جائے گا اس لئے تم جادو سیکھ کر کافر نہ بنو۔ البتہ جو شخص جادو سیکھنے سے بچ گیا وہ کفر سے بھی بچ جائے گا۔ اگر کوئی شخص ان کی نصیحت پر عمل کر لیتا تو ٹھیک ورنہ وہ اسے جادو سکھا دیتے۔

تنبیہ: علامہ آلوسی رحمہ اللہ بیان فرماتے ہیں کہ تعجب ہے جو قرطبی نے بیان کیا ہے کہ "ہاروت و ماروت" بدل ہے شیاطین سے اور ﴿ مَآ اُنْزِلَ ﴾ میں "ما" نافیہ ہے۔ اور ملکین سے مراد جبرائیل اور میکائیل ہیں۔ اس لئے کہ یہود نے گمان کیا کہ اللہ تعالیٰ نے ان دونوں یعنی جبرائیل اور میکائیل پر جادو اتارا۔ اور امام قرطبی رحمہ اللہ نے بیان فرمایا کہ کلام میں تقدیم و تاخیر ہے تقدیر عبارت کی یہ ہے:

" ﴿ وَمَا کَفَرَ سُلَیْمٰنُ ﴾ ﴿ وَمَآ اُنْزِلَ عَلَی الْمَلَکَیْنِ ﴾ ﴿ وَلٰکِنَّ الشَّیٰطِیْنَ ﴾ ﴿ هَارُوْتَ وَمَارُوْتَ ﴾ ﴿ کَفَرُوْا یُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ ﴾ ﴿ بِبَابِلَ ﴾ "

اس کا رد علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے ان الفاظ سے کیا:

" ولا یخفی لدی کل منصف انه لا ینبغی لمؤمن حمل کلام الله تعالیٰ وهو فی اعلی مراتب البلاغة والفصاحة علی ما هو ادنی من ذلک وما هو الا مسخ لکتاب الله تعالیٰ عزشانه واهباط له علی شاٰواه ومفاسد قلة البضاعة لا تحصی "

کسی انصاف کرنے والے سے یہ مخفی نہیں کہ کسی مؤمن کی شان کے لائق ہو کہ اللہ تعالیٰ کا کلام جو فصاحت و بلاغت کے اعلیٰ مراتب پر ہے اسے ادنی پر محمول کیا جائے اس سے تو اللہ تعالیٰ کے کلام کا مسخ لازم آئے گا۔ اور اس کو اپنے اعلیٰ مقام سے گرانے کے مترادف ہے اور اس کے قیمتی سرمایہ فصاحت و بلاغت کو کم کرنے کے بے شمار مفاسد لازم آئیں گے۔ (از روح المعانی)

خیال رہے کہ راقم کا یہ انداز تحریر نہیں کہ مفسرین کرام کے اختلاف کو ذکر کیا جائے۔ لیکن طلباء کرام کے فائدہ کے لئے اس بحث کو ذکر کر دیا ہے۔

فائدہ : " وقال قتادة کان اخذ علیهما ان لایعلما احد احتی یقولا انما نحن فتنة "

قتادۃ فرماتے ہیں کہ ان دونوں فرشتوں سے رب تعالیٰ نے وعدہ لیا کہ جب بھی کوئی تمہارے پاس جادو سیکھنے کے لئے آئے تو اسے بتانا کہ ہم تو آزمائش ہیں۔ یعنی یہ بتانے کے بغیر ہرگز کسی کو جادو نہ سکھانا۔

" فتنة " سے مراد کیا ہے؟ " واما الفتنة فهی المحنة والاختبار " فتنہ سے مراد محنت، آزمائش۔

" وقال ابن جریج فی هذه الآیة لا یجترئ علی السحر الا کافر "

ابن جریج نے کہا اس آیۃ سے، یہ واضح ہوا کہ جادو کی جرات سوائے کافر کے اور کوئی نہیں کر سکتا۔

حدیث صحیح میں مذکور ہے۔

" من اتی کاهنا او ساحرا فصدقه بما یقول فقد کفر بما انزل الله علی محمد ﷺ "

جو شخص کسی کاہن اور ساحر کے پاس آیا اور اس نے جو کہا اس شخص نے اس کی تصدیق کر دی تو کافر ہو جائے گا۔ مسئلہ واضح ہے کہ کفر کو صحیح تسلیم کرنا بھی کفر ہے۔ (از صابونی)

﴿ فَيَتَعَلَّمُونَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُونَ بِهِ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهِ ﴾

''تو وہ سیکھتے تھے ان دونوں سے وہ کہ تفریق ڈالتے جس کے ذریعے مرد اور اس کی زوجہ کے درمیان''

﴿ مِنْهُمَا ﴾ میں ضمیر ''ہاروت وماروت'' کی طرف لوٹ رہی ہے ''ما'' سے مراد سحر ہے یعنی لوگ آتے اور ہاروت اور ماروت سے جادو سیکھتے۔ جس کے ذریعے وہ افعال مذمومہ (برے کام) میں تصرف کر لیتے۔ ان افعال مذمومہ میں سب سے زیادہ قبیح یہ تھا کہ وہ سحر کے ذریعے زوجین (میاں بیوی) کے درمیان تفریق ڈال دیتے حالانکہ پہلے ان دونوں کے درمیان بہت بڑا میل جول اور بہت بڑی محبت پائی جاتی۔ زوجین کے درمیان تفریق ڈالنا شیطانوں کا کام ہے۔ جیسا کہ مسلم نے اپنی صحیح میں رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ذکر فرمایا:

'' ان الشیطان لیضع عرشه علی الماء ثم یبعث سرایاہ فی الناس فأقربهم عنده منزلة اعظم عنده فتنة '' ، یجئی احدهم فیقول ما زلت بفلان حتی ترکته وهو یقول کذا وکذا فیقول ابلیس لا واللہ ما صنعت شیأ ویجئی احدهم فیقول ما ترکته حتی فرقت بینه وبین اهله قال فیقر به ویدنیه ویلتزمه ویقول نعم انت ''

بیشک شیطان اپنا تخت پانی پر رکھتا ہے پھر وہ اپنے لشکر لوگوں میں بھیجتا ہے اس کے زیادہ قریب مرتبہ کے لحاظ پر وہ ہوتا ہے جو اس کے نزدیک بڑا فتنہ برپا کر کے آتا ہے۔ ان میں سے کوئی ایک آتا ہے تو وہ کہتا ہے میں فلاں سے اس وقت تک نہیں ہٹا جب تک اسے ایسے ایسے کہتے ہوئے نہیں چھوڑا۔ ابلیس کہتا ہے قسم ہے اللہ تعالیٰ کی تو نے کچھ نہیں کیا۔ ان میں سے ایک اور آتا ہے وہ کہتا ہے میں نے نہیں چھوڑا اسے یہاں تک کہ میں نے اس کے اور اس کی زوجہ کے درمیان جدائی کرا دی تو وہ اسے اپنے قریب کرتا ہے گلے لگاتا ہے اپنا مقرب بنالیتا ہے اور کہتا ہے تو بہت اچھا ہے۔

یعنی مرد اور عورت کے درمیان جدائی پیدا کرنا بہت بڑا فتنہ ہے کیونکہ اس کے اوپر کئی اور فتنے بدکاریاں مرتب ہوتی ہیں۔ (از صابونی)

﴿ وَمَا هُمْ بِضَآرِّيْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ﴾:

''اور وہ نہیں ضرر (نقصان) پہنچا سکتے اس کے ذریعے کسی ایک کو سوائے اللہ کے حکم سے''۔

﴿هُمْ﴾ ضمیر کا مرجع ہے ''سحرۃ'' یا ''یہود'' یا ''شیاطین'' ہیں ﴿بِهٖ﴾ ضمیر کا مرجع '' السحر '' ہے ﴿مِنْ اَحَدٍ﴾ میں من زائد ہے ﴿اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ﴾ ای بارادته وقضائه ، یعنی اذن کا معنی ارادہ اور قضاء ہے۔ جن حضرات نے '' بامر اللہ '' معنی کیا ہے اس کا مطلب بھی ارادہ اور قضاء ہی ہے ''امر'' کا معنی اگرچہ اردو میں ''حکم'' کیا جاتا ہے لیکن حکم سے مراد بھی ''ارادہ وقضاء'' ہی ہے۔

اب معنی واضح ہو گیا اور وہ جادوگر، اور یہود اور شیاطین جادو کے ذریعے کسی ایک کو کوئی ضرر نہیں پہنچا سکتے سوائے اللہ تعالیٰ کے اردہ اور اس کی قضاء کے۔ خیال رہے کہ ''اذن'' کا معنی ''امر'' کر کے اسے حقیقی معنی میں اس لئے نہیں لیا جا سکتا کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے:

﴿ ان اللہ لا یأمر بالفحشاء والمنکر ﴾

''بیشک اللہ تعالیٰ نہیں حکم دیتا بے حیائی اور برے کاموں کا''

اس بحث سے یہ سمجھ لیا جائے کہ ''اذن'' کا معنی ''امر'' مفسرین کرام نے کیا ہے اردو تراجم میں ''حکم'' معنی کیا گیا ہے۔ اعلیٰ حضرت نے بھی یہ معنی کیا ہے لیکن ''امر'' اور حکم کا مجازی معنی ارادہ اور قضاء ہی ہے۔
(ماخوذ از قرطبی وبیضاوی وشیخ زادہ)

﴿ وَيَتَعَلَّمُوْنَ مَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ ﴾:

''اور وہ سیکھتے ہیں جو ان کو ضرر دیتا اور نفع نہ دیتا'' یعنی ان کا جادو سیکھنا ان کے لئے ضرر نقصان کا سبب تھا '' والعمل بالسحر کفر یتضرر به المرء فی الاخرۃ '' کیونکہ جادو کا عمل کفر ہے اور کفر سے انسان کو آخرت میں نقصان ہوتا ہے یعنی اس کی وجہ سے عذاب دے کر اسے ضرر پہنچایا جائے گا۔ اور جادو سیکھنے میں انہیں کوئی نفع نہیں۔ بعض چیزوں میں کچھ نفع اور کچھ نقصان ہوتا ہے۔ لیکن جادو میں صرف ضرر ہی ضرر ہے۔

'' وما یکون ضررا محضا یکون فی غایة الرداءۃ ''

اور جس چیز میں صرف نقصان ہی پایا جائے وہ بہت گھٹیا چیز ہوتی ہے۔

بظاہر اس میں وہم یہ ہوتا ہے کہ جادو کا علم حاصل کرنا بذات خود نفع مند ہے کیونکہ یہ علم ہے اور علم نفع دینے والی چیز کا نام ہے تو اس کا جواب یہ دیا گیا۔

﴿ وَلَا يَنْفَعُهُمْ ﴾ اذ مجرد العلم به غير مقصود و لا نافع الدارين "

کہ علم حاصل کرنے کا اصل مقصد اس پر عمل کرنا ور دنیا و آخرت میں اس عمل کے ذریعے نفع حاصل کرنا ہے فقط علم کوئی نفع مند نہیں۔ جب جادو کا علم حاصل کرنا ہی ان کے لئے آزمائش کا سبب تھا، اور اس پر عمل کرنا ناجائز تھا، تو یقیناً اس میں ان کو کوئی نفع نہیں تھا بلکہ ان لوگوں کے لئے جادو سے اجتناب کرنا ضروری تھا۔ (ماخوذ از بیضاوی و شیخ زادہ)

﴿ وَلَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ اشْتَرٰهُ مَا لَهٗ فِی الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ﴾:

"اور تحقیق جان لیا انہوں نے جس نے حاصل کیا یہ نہیں ہے اس کا آخرت میں کوئی حصہ"۔ یہود نے اللہ کی کتاب اور انبیاء کرام کی تعلیمات کو چھوڑ کر جادو پر عمل شروع کر دیا۔ ان کا اللہ کی کتاب اور اللہ کے رسولوں کو چھوڑ کر جادو کا عمل کرنا ان کیلئے آخرت میں کسی طرح بھی نفع مند نہیں تھا اور اس کا انہیں بھی علم تھا۔

﴿ خَلَاقٍ ﴾ کا معنی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے "نصیب" بیان فرمایا۔

مطلب واضح ہے کہ یہود کو یقینی طور پر علم تھا کہ وہ جو سودا کر رہے ہیں کہ دین چھوڑ کر جادو حاصل کر رہے ہیں اس کا آخرت میں انہیں کوئی حصہ یعنی کسی قسم کا اجر و ثواب حاصل نہیں ہوگا۔ (از بیضاوی)

اس میں یہود کی زیادہ مذمت پائی گئی ہے کہ انہوں نے قباحت کا علم رکھنے کے باوجود اس کا ارتکاب کیا۔

﴿ وَلَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴾

"اور برا ہے جس کے بدلے انہوں نے اپنی جانوں کا سودا کیا کسی طرح وہ جان لیتے"۔

﴿ وَلَبِئْسَ ﴾ البديل ما استبدلوا به من السحر عوضا عن الايمان ومتابعة الرسول "

مطلب یہ ہے کہ انہوں نے جادو کو حاصل کر کے ایمان اور رسول کی متابعت کو ترک کر دیا جو ان

کی جانوں کے لئے نقصان دہ تھا۔ تو گویا کہ انہوں نے جادو کے عوض اپنی جانوں کو عذاب کے حوالے کرنے کا سودا کرلیا۔ (از صابونی)

قاضی مظہری رحمہ اللہ نے حذف مضاف کا قانون بیان فرمایا ﴿ وَلَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهٖٓ ﴾ یعنی باعوا به حظوظ ﴿ اَنْفُسَهُمْ ﴾ اور برا ہے جس کے بدلے انہوں نے اپنی جانوں کے حصوں (منافع، اجر وثواب) کو بیچ دیا۔ (مظہری)

﴿ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴾ ''کسی طرح ان کو علم ہوتا'' اس پر بظاہر اعتراض یہ ہوتا ہے کہ پہلے ذکر فرمایا ﴿ وَلَقَدْ عَلِمُوْا ﴾ تحقیق انہوں نے جان لیا۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ انہیں معلوم تھا کہ ان کا سودا خسارے کا ہے لیکن ﴿ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴾ سے پتہ چلتا ہے ان کو علم نہیں تھا ان دونوں میں تطبیق کیسے؟

اس کا ایک جواب یہ ہے " معناه انهم لما لم يعملوا بها علموا فكانهم ما علموا " کہ وہ جانتے تو تھے اور یقینی طور پر جانتے تھے یہ مفہوم ہے ﴿ وَلَقَدْ عَلِمُوْا ﴾ کا۔ لیکن وہ اپنے علم کے مطابق نہیں کرتے تھے اس لئے گویا کہ وہ نہیں جانتے تھے یہ مفہوم ہے ﴿ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴾ کا۔

اس کا دوسرا جواب ہے:

" وقيل المثبت العقل الغريزى والعلم الاجمالى بقبح الفعل وترتب العقاب والمنفى العلم بحقيقة ما يلحقه من العذاب "

جہاں علم کا ثبوت اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں عقل دے رکھی ہے اور ان کو اجمالی طور پر اتنا علم حاصل ہے کہ یہ کام برا ہے اس پر عذاب مرتب ہوتا ہے تاہم ان کو تفصیلی علم حاصل نہیں۔ جہاں علم کی نفی کی گئی ہے اس سے مراد یہ ہے کہ ان کو اس حقیقت کا علم نہیں کہ ان کو کتنا عذاب ہونا ہے کیسا عذاب ہونا ہے یعنی وہ اتنا علم رکھتے تھے کہ ان کو عذاب ہوگا وہ اس عذاب کی تفصیل کو نہیں جانتے تھے۔

اس کا تیسرا جواب جس کو قاضی مظہری رحمہ اللہ نے ''والمختار عندی'' (اور میرا مختار یہ ہے) سے تعبیر فرمایا یہ ہے:

" ان العلم علمان علم يتعلق بظاهر القلب وذا لا يستطيع العمل "

بیشک علم کی دو قسمیں ہیں ان میں سے ایک قسم یہ ہے جس کا تعلق دل کے ظاہری حصہ سے ہوتا

ہے وہ دل کے اندر اثر انداز نہیں ہوتا اس علم سے عمل حاصل نہیں ہوتا۔ یہود کو یہی علم حاصل تھا رب تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ یعرفونہ کما یعرفون ابناء ھم ﴾ وہ آپ کو پہچانتے ہیں جیسا کہ اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں لیکن اس علم اور معرفت نے بھی ان کو کوئی نفع نہ دیا۔ اور رب تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ مثلھم کمثل الحمار یحمل اسفارا ﴾

''(ان کی مثال) گدھے کی مثال ہے جو پیٹھ پر کتابیں اٹھائے''

یہ علم یہود کو حاصل تھا جس کا ذکر ﴿ ولقد علموا ﴾ میں ہے لیکن اس علم نے ان کو کوئی نفع نہ دیا۔

" وعلم وھبی یتخلص الی صمیم القلب بعد انجلائہ والی النفس بعد اطمینانہ "

علم کی دوسری قسم ''علم وہبی'' ہے یہ دل کی کدورت کے زوال اور اسے جلاء حاصل ہونے کے بعد حاصل ہوتا۔ جو دل کی گہرائیوں کے ساتھ خالص اثر انداز ہوتا ہے جس سے صمیم قلب ہو جاتا ہے۔ یہ علم انسان کو عمل کے اعلیٰ مقام تک پہنچا دیتا ہے۔

اور یہی علم نفس کے ساتھ خالص متعلق ہو جاتا ہے جب نفس کو اطمینان حاصل ہو جائے۔ یہی علم وہ ہے جس میں کمال ہے اور یہ علم یہود کو حاصل نہیں تھا اسی لئے فرمایا ﴿ لو کانوا یعلمون ﴾ ''کسی طرح وہ جانتے''۔ علم وہبی کا ثبوت قرآن وحدیث سے رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی ﴿ انما یخشی اللہ من عبادہ العلماء ﴾ بیشک اللہ سے ڈرنے والے اللہ کے بندوں سے علماء ہی ہیں۔ یہ علم وہی ہے جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے بندوں میں سے علماء کو رب تعالیٰ کا کامل خوف حاصل ہوتا ہے۔

☆ " وقولہ علیہ السلام العلماء ورثۃ الانبیاء یحبھم اھل السماء ویستغفرلھم الحیتان فی البحر اذا ماتوا الی یوم القیمۃ "

اور نبی کریم ﷺ نے فرمایا علماء انبیاء کے وارث ہیں ان سے آسمان والے محبت کرتے ہیں اور جب یہ فوت ہو جائیں تو ان کے لئے دریاؤں میں مچھلیاں قیامت تک بخشش طلب کرتی رہیں گی۔

(رواہ ابن النجار عن انس)

☆ " خیر الخیار خیار العلماء وشر الشرار شرار العلماء "

سب سے بہتر لوگوں میں بہتر وہ علماء ہیں جو بہتر ہوں اور سب شر لوگوں میں زیادہ شر وہ علماء ہیں

جو شر ہوں۔ اس حدیث پاک میں دونوں علموں کا ذکر کیا گیا علم وہبی اور وہ علم جو قلب (دل) کے ظاہر سے متعلق ہو۔ (رواہ الدارمی من حدیث الاحوص بن حکیم)

☆ " وعن الحسن قال العلم علمان فعلم فی القلب فذلک العلم النافع وعلم علی اللسان فذلک حجة اللہ علی ابن آدم "

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں علم کی دو قسمیں ہیں ایک علم وہ جو دل میں ہوتا ہے یہ علم نفع مند ہے۔ اور دوسرا علم جو زبان پر ہوتا ہے یہ اللہ تعالیٰ کی ابن آدم پر حجت ہے (کہ اے انسان تو جاننے کے باوجود بیان کرنے کے باوجود اس پر عمل کیوں نہیں کر سکے گا۔ (رواہ الدارمی)

ہاروت اور ماروت کے متعلق اسرائیلی روایات:

اس واقعہ میں اسرائیلی روایات بیس سے تجاوز کر جاتی ہیں۔ ایک روایت کے ذکر کرنے کے بعد علامہ آلوسی رحمہ اللہ فرماتے ہیں.

" الی غیر ذلک من الآثار التی بلغت طرقها نیفا وعشرین "

اسی طرح اور روایات سے بھی ثابت ہے جو تیس سے انتیس تک ہیں۔ (روح المعانی)

مختلف اسناد اور مختلف الفاظ سے ثابت ہونے والی روایات کا مفہوم تقریباً ایک ہی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے:

ھاروت اور ماروت کا واقعہ یہ ہے کہ جب انسانوں کے گناہ فرشتے آسمانوں کی طرف لے جاتے تو وہ کہتے کہ ان کو شرم آنی چاہئے کہ یہ کتنے گناہ کرتے ہیں۔ رب تعالیٰ نے فرمایا اگر میں تمہیں زمین پر بھیجوں اور تم میں وہی چیزیں (شہوات) رکھ دوں جو ان میں رکھی ہیں تو تم بھی ان ہی کاموں کے مرتکب ہو جاؤ جن کے انسان مرتکب ہو رہے ہیں۔

﴿ فقالوا سبحانک مالنا ان نعصیک ﴾

"تو فرشتوں نے کہا اے اللہ تیری ذات پاک ہے ہم تیری نافرمانی نہیں کریں گے"

رب تعالیٰ نے فرمایا تم دو کا انتخاب کر لو جن کو تم بہتر سمجھتے ہو، ہاروت اور ماروت کا انتخاب کر لیا

گیا۔ ان کو اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی طرح خواہشات نفسانیہ عطا کر دیں۔ اور زمین پر بھیج دیا اور ان کو حکم دیا کہ لوگوں میں انصاف سے فیصلے کرنا اور ان کو شرک سے منع کرنا، اور ناحق قتل سے روکنا اور زنا سے منع کرنا اور شراب پینے سے لوگوں کو منع کرنا۔

یہ ہر روز زمین پر آتے رب تعالیٰ کے حکم کے مطابق فیصلے کرتے لوگوں کو بتاتے کہ ہم تمہارے لئے آزمائش ہیں۔ جادو نہ سیکھو، اگر کوئی ان کے روکنے کے باوجود سیکھتا تو اسے سکھا دیتے۔ ہر شام کو یہ اللہ تعالیٰ کے اسم اعظم کو پڑھتے اسی کے ذریعے آسمانوں پر چڑھ جاتے ایک ماہ تک یہ سلسلہ اسی طرح چلتا رہا۔ اس کے بعد دونوں فرشتے ایک زھرۃ نامی عورت کے عشق میں مبتلاء ہو گئے جب اس نے انہوں نے اپنی حاجت طلب کرنے کے متعلق کہا تو اس نے کہا تم شراب پیو اور میرے خاوند کو قتل کرو تو میں تمہاری حاجت کو پورا کروں گی۔ انہوں نے شراب پی لیا اسی نشہ کی حالت میں اس عورت سے زنا کے مرتکب بھی ہو گئے۔ جب ایک شخص (عورت کے خاوند) کو آتے ہوئے دیکھا تو اسے قتل بھی کر دیا۔

ان جرائم کے بعد وہ اسم اعظم پڑھ کر آسمان کی طرف جانے کی کوشش کرتے ہیں لیکن ناکام ہو جاتے ہیں ان کے پروں میں طاقت ہی نہیں رہتی وہ عورت اسم اعظم پڑھ کر آسمانوں پر چلی گئی اسے ستارہ بنا دیا گیا زہرہ ستارہ وہی ہے۔

ایک روایت میں یہ بھی آیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

" لعن الله الزهرة فانما هي التي فتنت الملكين هاروت وماروت "

اللہ تعالیٰ زہرہ پر لعنت کرے کہ اس نے دو فرشتوں کو فتنہ میں ڈال کر برباد کر دیا۔

وہ دونوں فرشتے جب آسمانوں پر چڑھنے میں ناکام ہو گئے تو اس وقت کے نبی حضرت ادریس علیہ السلام کے پاس آئے۔ اور ان سے عرض کیا کہ ہماری شفاعت کریں۔ ان کی شفاعت پر اللہ تعالیٰ نے ان کو اختیار دے دیا کہ چاہیں تو دنیا کا عذاب پسند کر لیں اور چاہیں تو آخرت کا عذاب پسند کر لیں انہوں نے دنیا کا عذاب پسند کیا۔ ان کو بابل کے ایک کنوئیں میں ان کے بالوں سے لٹکا دیا گیا وہ کنواں آگ سے بھرا ہوا ہے یہ عذاب ان کو اس وقت ہوتا رہے گا جب تک دنیا قائم ہے۔

(ماخوذ از مظهری)

اسرائیلی روایات کون سی ہیں؟

کعب بن احبار ﷺ جو پہلے یہودیوں کے عالم تھے وہ ایمان لے آئے یہ تابعی تھے صحابی نہیں تھے۔ حضرت کعب بن احبار اکثر طور پر صحابہ کرام اور تابعین کو یہود کے واقعات اور ان کے اقوال سناتے رہتے تھے آپ کے سنانے کی وجہ یہ ہوتی تھی کہ لوگ ان کے غلط اقوال سے اجتناب کریں عبرت پکڑیں اور قرآن پاک، دین اسلام اور یہودیت میں فرق کریں۔

حضرت کعب بن احبار ﷺ کے بیان کردہ واقعات کو صحیح اسناد سے آگے بیان بھی کر دیا گیا۔ اس لحاظ پر اس واقعہ سے متعلق صحیح اسناد سے بیس روایات سے زائد مروی ہیں۔ اگر ان کا وہی مطلب لیا جائے جو حضرت کعب کے بیان کا ہوتا تھا کہ یہود ہاروت اور ماروت کا واقعہ اس طرح بیان کرتے تھے تو درست ہوگا۔ اگر ان واقعات کا مطلب اس طرح بیان کیا جائے کہ یہ مطلب قرآن وحدیث کے مطابق ہے تو غلط ہوگا۔ (ماخوذ از التبیان للکاظمی)

اسرائیلی روایات کا مفسرین کرام نے رد کیا:

" فقد انكره جماعة منهم القاضی عیاض وذكر ان ما ذكره اهل الاخبار ونقله المفسرون فی قصة هاروت وماروت لم یرد منه شئی لا سقیم ولا صحیح عن رسول الله ﷺ ولیس هو شیا یؤخذ بالقیاس "

ان اسرائیلی روایات کا علماء کی جماعت نے انکار کیا ہے جن میں قاضی عیاض رحمہ اللہ بھی ہیں جو واقعات اہل اخبار نے بیان کئے ہیں۔ اور مفسرین کرام نے ہاروت اور ماروت کے متعلق جن روایات کو نقل کیا ہے ان میں سے کوئی روایت بھی صحیح یا ضعیف رسول اللہ ﷺ سے ثابت نہیں۔ اور یہ مسئلہ قیاس سے ثابت ہونے والا نہیں کہ قیاس کیا جائے۔

☆ " وذكر فی البحر ان جمیع ذلک لا یصح منه شئی "

بحر میں ذکر کیا گیا ہے کہ تمام روایات اس واقعہ میں بیان ہونے والی صحیح نہیں۔ یعنی یہ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ رسول اللہ ﷺ کے ارشادات ہیں۔

☆ " ولم یصح ان رسول الله ﷺ كان یلعن الزهرة "

نبی کریم ﷺ کی طرف منسوب ہونے والا قول کہ آپ زہرہ پر لعنت کرتے تھے صحیح نہیں یعنی آپ کا یہ ارشاد ہی نہیں۔ اور یہ روایت حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کی جاتی ہے لیکن ان سے بھی اس روایت کا صحیح ثبوت نہیں۔

☆ اور امام رازی رحمہ اللہ نے بھی اس روایت کو ذکر کرنے کے بعد فرمایا: "**ان هذه الرواية فاسدة مردودة غير مقبولة**" بیشک یہ روایت فاسد ہے مردود ہے، مقبول نہیں۔

☆ شہاب عراقی رحمہ اللہ نے واضح طور پر ذکر فرمایا کہ جو شخص ہاروت اور ماروت کے متعلق یہ عقیدہ رکھے:

"انهما ملكان يعذبان على خطيئتهما مع الزهرة فهو كافر بالله تعالىٰ العظيم"

کہ وہ دونوں فرشتے زہرہ کے ساتھ گناہ میں مبتلاء ہونے کی وجہ سے عذاب دیئے جا رہے ہیں وہ شخص اللہ تعالیٰ کا منکر ہے، کافر ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ فرشتے معصوم ہیں رب تعالیٰ نے ان کی عصمت کو بیان فرمایا:

﴿ **لا يعصون الله ما امرهم ويفعلون ما يؤمرون ☆ لا يستكبرون عن عبادته ولا يستحسرون ☆ يسبحون الليل والنهار لا يفترون** ﴾

"وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی نافرمانی نہیں کرتے وہی کرتے ہیں جس کا ان کو حکم دیا جاتا ہے اور یہ ارشاد فرمایا وہ اللہ کی عبادت سے تکبر نہیں کرتے اور تھکتے نہیں اور یہ ارشاد فرمایا وہ دن رات اللہ کی تسبیح کرتے ہیں سستی نہیں کرتے"۔

☆ "**والزهرة كانت يوم خلق الله تعالىٰ السماوات والارض والقول بانها تمثلت لهما فكان ما كان وردت الى مكانها غير معقول ولا مقبول**"

یہ کہنا کہ وہ زہرہ نامی عورت ستارہ بن گئی اور وہاں پہنچ گئی جہاں زہرہ ستارہ کی جگہ تھی یہ عقل کے خلاف ہے اور مقبول بھی نہیں کیونکہ زہرہ ستارہ کو تو اسی دن پیدا کر دیا گیا جس دن اللہ تعالیٰ نے زمین وآسمان پیدا فرمائے۔

تنبیہ: بعض لوگوں نے ہاروت اور ماروت کے اس واقعہ کا مطلقاً انکار کر دیا تھا کہ اس کا کوئی ثبوت

ہی نہیں۔ان پر علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے اعتراض کیا کہ نفس واقعہ کا انکار کرنا صحیح نہیں کیونکہ اسے امام احمد، ابن حبان، اور بیہقی وغیرہ نے بیان کیا ہے کوئی روایت مرفوع اور کوئی حضرت علی اور حضرت ابن عباس اور ابن عمر اور ابن مسعود ﷺ پر موقوف ہیں اس میں متعدد صحیح روایات ثابت ہیں جو ان روایات پر واقف ہیں وہ ان کی صحت پر یقین رکھتے ہیں اور ان کی کثرت اور قوت مخرج کے لحاظ پر بھی ان پر کامل وثوق کیا جا سکتا ہے۔

" وذهب بعض المحققين ان ماروى مروى حكاية لما قاله اليهود وهو باطل فى نفسه وبطلانه فى نفسه لاينافى صحة الرواية ولا يرد ما قاله الامام السيوطى عليه انما يرد على المنكرين بالكلية "

محققین علماء کرام نے بیان فرمایا ہے کہ یہود نے جو بیان کیا ہے وہ باطل ہے لیکن ان کے باطل اقوال کو جو بیان کیا گیا ہے اس میں روایات صحیحہ کثیر تعداد میں موجود ہیں واقعہ کا باطل ہونا صحت روایات کے منافی نہیں۔

لہٰذا واضح ہوا کہ علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے جو بیان فرمایا ہے وہ ان لوگوں کا رد فرمایا جو یہ کہتے تھے کہ یہ واقعہ کسی روایت سے ثابت نہیں علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے ان کا رد کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ واقعہ تو صحیح اسناد سے متعدد روایات سے ثابت ہے۔لیکن آپ نے یہ نہیں فرمایا کہ واقعہ باطل نہیں کہ آپ کا رد کیا جائے۔

(ماخوذ از روح المعانی)

تنبیہ : حضرت کعب بن احبار کی تمام روایات کو اسرائیلی روایات کہنا بھی بے دانشی (ناسمجھی) ہے صرف وہی روایات اسرائیلی ہوں گے جن کو جلیل القدر مفسرین کرام نے اسرائیلی کہا ہے آج کل کے معاندین کے اقوال باطلہ کا کوئی اعتبار نہیں۔

گزشتہ سے پیوستہ : کیا جادوگر سے سوال کیا جا سکتا ہے کہ وہ جادو کو کھول دے؟ حضرت سعید ابن میّب نے اس کی اجازت دی ان کا قول امام بخاری نے نقل فرمایا " **وقال الشعبى لا باس بالنشرة** " اور شعبی نے بھی یہ کہا ہے کہ جادو کھلوانے میں کوئی حرج نہیں۔

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ نے اسے مکروہ بیان فرمایا ہے کیونکہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے

مروی ہے آپ نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں عرض کیا:

"یا رسول اللہ ھلا تنشرت فقال اما اللہ فقد شفانی وخشیت ان افتح علی الناس شرا"

یارسول اللہ آپ جادو کو (کسی جادوگر سے) کھلواتے کیوں نہیں؟ آپ نے فرمایا مجھے اللہ تعالیٰ نے شفا عطا فرمادی ہے مجھے ڈر ہے کہ میرے اس فعل سے (جادوگروں سے جادو اگر کھلواؤں) تو لوگوں پر شر کا دروازہ نہ کھل جائے یعنی ایسا نہ ہو کہ لوگ جادوگروں کے پاس جا کر جادو کا عمل عام نہ شروع کر دیں۔

علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے وہب سے نقل کیا کہ بیری کے سات پتے لئے جائیں پھر ان کو دو پتھروں کے درمیان کوٹ لیا جائے پھر ان کو پانی میں حل کر دیا جائے ان پر آیۃ الکرسی پڑھی جائے جادو کئے ہوئے شخص کو تین سانسوں میں پلا دیا جائے اور باقی سے وہ غسل کر لے تو اسے شفاء حاصل ہو جائے گی۔

علامہ صابونی رحمہ اللہ فرماتے ہیں زیادہ بہتر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جادو کے زوال کے لئے سورۃ الفلق اور سورۃ الناس کو نازل فرمایا ان کو ہی پڑھ کر دم کیا جائے۔ چونکہ حدیث شریف میں بھی رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے "لم یتعوذ المتعوذ بمثلھا" ان دو سورتوں جیسی کوئی اور چیز نہیں جس سے پناہ پکڑنے والا پناہ پکڑے۔

"وکذلک قراءۃ آیۃ الکرسی فانھا مطردۃ للشیطان"

اسی طرح آیۃ الکرسی کا پڑھنا بھی شیطان کو بھگاتا ہے۔ (از صابونی)

ہاروت اور ماروت کے آنے کی فقط یہ وجہ:

ان دونوں فرشتوں کو زمین پر بھیجنے کی وجہ یہ تھی کہ یہ لوگوں کو جادو کے متعلق بتائیں کہ جادو سیکھنا ناجائز ہے اور ان لوگوں کو جادو اور معجزہ میں فرق معلوم ہو جائے۔ اور ان کو یہ پتہ چل جائے کہ اللہ تعالیٰ کی آزمائش میں اسکے حکم کے خلاف کام کرنا باعث کفر ہے۔ اور اس کی منشا کے مطابق کام ذریعہ نجات ہے۔ (از مظہری)

ایک سوال اور اس کا حل: اگر یہاں یہ سوال کیا جائے کہ جب یہ کام انبیاء کرام علیہم الصلوۃ والسلام بھی کر سکتے تھے اس پر فرشتوں کو مامور فرمانے کی کیا حکمت تھی اس کا جواب یہ ہے کہ انبیاء کرام علیہم الصلوۃ والسلام کا بنیادی کام یہ تھا کہ وہ لوگوں کو کفر و شرک سے بچنے کی تعلیم دیتے تھے اگر وہ

فرشتوں کی طرح لوگوں کو سحر کے اعمال کفریہ وشرکیہ سکھاتے تو یہ ان کے بنیادی کام کے خلاف ہوتا اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس کام پر فرشتوں کو مامور فرمایا۔ (التبیان للکاظمی رحمه الله)

نبی کریم ﷺ پر جادو:

" عن عائشة قالت سحر رسول الله ﷺ يهودى من يهودى بنى زريق يقال له لبيد بن الاعصم قالت حتى كان رسول الله ﷺ يخيل اليه انه يفعل الشئى وما يفعله حتى اذا كان ذات يوم او ذات ليلة دعا رسول الله ﷺ ثم دعا ثم دعا ثم قال يا عائشة اشعرت ان الله افتانى فيما استفتية فيه جاء نى رجلان فقعد احدهما عند رأسي والآخر عند رجلى فقال الذى عند رأسي للذى عند رجلى او الذى عند رجلى للذى عند رأسي ما وجع الرجل قال مطبوب قال من طبه قال لبيد بن الاعصم قال فى اى شئى قال فى مشط ومشاطة وجب طلعة ذكر ، قال فاين هو قال فى بئرذى اروان قالت فاتاها رسول الله ﷺ فى اناس من اصحابه ثم قال يا عائشة والله لكان ماء ها نقاعة الحناء ولكان نخلها رؤس الشياطين قالت فقلت يا رسول الله افلا احرقته قال لا اما انا فقد عافانى الله وكرهت ان اثير على الناس شرا فامرت بها فدفنت "

(مسلم ج ۲ باب السحر)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں رسول اللہ ﷺ پر بنی زریق کے یہودیوں میں سے ایک یہودی نے جادو کر دیا۔ اس یہودی کا نام لبید بن اعصم تھا۔ آپ فرماتی ہیں اس کا اثر یہاں تک ہوگیا کہ آپ خیال فرماتے تھے کہ یہ کام کرلیا ہے۔ حالانکہ آپ نے وہ کیا نہیں ہوتا تھا۔ ایک روز رسول اللہ ﷺ نے دعا فرمائی، پھر دعا فرمائی، پھر دعا فرمائی۔ پھر آپ نے فرمایا اے عائشہ کیا تمہیں معلوم ہے اللہ تعالیٰ نے مجھے وہ بتا دیا ہے جو میں نے پوچھا۔ میرے پاس دو شخص آئے ایک میرے سر کے پاس بیٹھ گیا اور دوسرا میرے پاؤں کے پاس بیٹھ گیا۔ ان میں سے ایک نے دوسرے سے پوچھا اس شخص کو کیا تکلیف ہے (درد

کس وجہ سے ہیں) دوسرے نے جواب دیا کہ اس پر جادو کر دیا گیا ہے پہلے نے کہا اس پر جادو کس نے کیا دوسرے نے کہا لبید بن اعصم نے۔ پہلے نے پھر کہا کس چیز میں جادو کیا ہے؟ دوسرے نے جواب دیا کنگھی اور کنگھی کرتے ہوئے گرنے والے بالوں میں اور مذکر کھجور کے شگوفہ میں۔ پہلے نے پھر کہاں انہیں کہاں رکھا ہوا ہے اس نے کہا" بئر ذی اروان " میں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں نبی کریم ﷺ اپنے صحابہ کرام میں سے چند صحابہ کو ساتھ لے کر اس کنوئیں کے پاس آئے اس کا پانی ایسے سرخ تھا جیسے اس میں مہندی گھول دی گئی ہو۔ اور اس کے (اردگرد) کھجوروں کے سر ایسے ہیں جیسے شیاطین کے سر ہوں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں میں نے عرض کیا آپ نے ان کو جلا کیوں نہیں دیا۔ آپ نے فرمایا نہیں جلایا۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے آرام دے دیا۔ اور میں نے ناپسند سمجھا کہ لوگوں پر شر پھیلاؤں میں نے حکم دیا ان چیزوں کو دفن کر دیا گیا۔

وضاحت حدیث:

اس حدیث پاک کی وضاحت میں امام رازی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اہل سنت کے جمہور علماء کا یہ مذہب ہے کہ سحر ثابت ہے اور سحر کی حقیقت ہے۔ معتزلہ نے کہا سحر خیالات باطلہ ہیں لیکن حقیقت میں یہ کہنے والوں کے خیالات باطلہ ہیں۔

" وقد انکر بعض المبتدعة هذا الحديث بسبب آخر فزعم انه يحط منصب النبوة "

بعض مبتدعین نے اس حدیث کا انکار کر دیا کہ اس سے منصب نبوت میں فرق پڑتا ہے لیکن یہ ان کا کہنا باطل، جھوٹ اور من گھڑت قول ہے۔

" لان الدلائل لاقطعية قد قامت على صدقه و صحته و عصمته فيما يتعلق بالتبليغ و المعجزة شاهدة بذلک وتجويز ما قام الدليل بخلافه باطل "

اس لئے کہ دلائل قطعیہ قائم ہیں اس پر کہ حدیث پاک صحیح ہے اور آپ پر جادو کا ہونا سچ ہے۔ البتہ نبی کریم ﷺ کی تبلیغ اور اس کے ساتھ متعلق امور جادو کے دوران بھی جاری رہے بلکہ یہ نبی کریم ﷺ

کا معجزہ ہے کہ جادو نے آپ کی تبلیغ میں کوئی اثر نہ کیا۔ لہٰذا واضح ہوا کہ جو حکم دلائل سے ثابت ہو اس کے خلاف کہنا باطل ہے۔

" قال القاضی عیاض وقد جاء ت روایات هذا الحدیث مبینة ان السحر انما تسلط علی حسده وظواهر جوارحه لا علی عقله وقلبه واعتقاده "

قاضی عیاض رحمہ اللہ فرماتے ہیں اس حدیث کی روایات واضح ہیں بیشک جادو کا اثر نبی کریم ﷺ کے جسم پر اور ظاہری اعضاء پر ہوا۔ آپ کی عقل اور دل اور اعتقاد پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔ اور اس حدیث پاک میں نبی کریم ﷺ کے دعاء کرنے سے یہ ثابت ہوا۔

" هذا دلیل لا ستحباب الدعاء عند حصول الامور المکروهات وتکریره وحسن الا لتجاء الی الله تعالیٰ "

کہ یہ دلیل ہے کہ مشکل اور تکالیف کے وقت دعاء کرنا مستحب ہے اور دعا میں تکرار یعنی اللہ تعالیٰ سے التجاء کرنے میں دعا بار بار کی جائے تین مرتبہ دعا کرنا مستحب ہے۔

(مشاطه) بضم المیم کنگھی کرتے ہوئے سر اور داڑھی کے جو بال گریں۔ (مشط) بضم المیم وبکسرها ، کنگھی۔ (ذی اروان) ایک کنواں ہے جو مدینہ طیبہ میں بنی زریق کے باغ میں تھا بخاری میں اس کا نام " ذروان " ذکر ہے۔

راقم کے خیال میں اصل نام " ذی اروان " ہے اور مخفف طور پر بولتے میں "ذروان" آیا ہوا ہے اسی لئے علامہ نووی رحمہ اللہ نے دونوں کو صحیح کہا اور پہلے کو اجود (عمدہ) کہا۔ رسول اللہ ﷺ نے ان چیزوں کو جلایا نہیں جن پر جادو کیا گیا تھا بلکہ دفن کر دیا۔ اس کی وجہ آپ نے خود ہی بیان فرما دی کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے آرام دے دیا۔ جلانے میں لوگوں میں شر پھیلتا۔ یعنی جادو کا چرچا ہوتا جادو کے سیکھنے، سکھانے کا عام چرچا ہوتا جس سے مسلمانوں میں فتنہ پھیلتا۔

(ماخوذ از نووی)

﴿ وَلَوْ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَمَثُوْبَةٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ خَيْرٌ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴾ (آیت ۱۰۳)

۱) "اوراگر وہ ایمان لاتے اور پرہیزگاری کرتے تو اللہ کے یہاں کا ثواب بہت اچھا ہے کسی طرح انہیں علم ہوتا"۔

۲) "اوراگر وہ ایمان لاتے اورتقوی حاصل کرتے البتہ ثواب دیئے جاتے اللہ کی طرف سے (وہ جو) بہت اچھا ہے کسی طرح وہ جانتے"۔

﴿ وَلَوْ اَنَّهُمْ ﴾: ای الیھود ، یعنی " ھم "ضمیر یہود کی طرف لوٹ رہی ہے۔

﴿ اٰمَنُوْا ﴾ : بکتابھم وبما امروا بالایمان بہ مما نزل بعدہ " اوراگروہ یہود اپنی کتاب (توراۃ) پرایمان لاتے اوراس چیز پرایمان لاتے جوبعد میں نازل ہوئی اوراس پرایمان لانے کاحکم دیا گیا۔ (تیسیر الرحمن)

﴿ اٰمَنُوْا ﴾بالنبی والقرآن " اوراگر یہود نبی کریم ﷺ پراورقرآن پاک پرایمان لاتے۔ (جلالین)

﴿ وَاتَّقَوْا ﴾ ای المعاصی التی حکیت عنھم " اوراگروہ ان گناہوں سے بچ جاتے جوگناہ ان کے بیان کئے جاتے ہیں۔ (روح المعانی)

﴿ وَاتَّقَوْا ﴾ عن متابعۃ المنسوخ بعد نزول الناسخ ومتابعۃ کتب السحر " اوراگروہ منسوخ کتاب ودین کی متابعت سے ناسخ کے نازل ہونے کے بعد بچ جاتے اور جادو کی کتابوں کی تابعداری سے بچ جاتے۔ (تیسیر الرحمن)

﴿ لَمَثُوْبَةٌ ﴾ یہ " لو " کا جواب ہےاوراصل میں " لا ثیبوا مثوبۃ من عند اللہ خیرا " البتہ ان کوثواب دیاجاتا اللہ کے ہاں بہتر۔ (بیضاوی)

﴿مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ خَيْرٌ ﴾ یعنی اللہ کے ہاں دنیااوردنیا کی تمام چیزوں سے بہتر ان کوثواب دیاجاتا چہ جائیکہ وہ رشوت حاصل کریں یعنی ان کو رشوت سے حاصل ہونے والے مال اور جادو سے حاصل ہونے والے مال سے بہتر ثواب دیا جاتا۔ (تیسیر الرحمن)

﴿ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴾ ''کسی طرح وہ جانتے''،یعنی اگر وہ جانتے حقائق کو کہ ثواب رشوت وغیرہ سے بہتر ہے لیکن ان کو اس کا پتہ نہ چل سکا کیونکہ انہوں نے دنیاوی منافع کو اخروی سعادت پر ترجیح دی۔ (از تیسیر الرحمن)

مفہوم واضح ہے کہ یہود اگر ایمان لاتے اور تقوی اختیار کرتے تو ان کو اللہ کے ہاں بہتر ثواب عطا کیا جاتا کسی طرح وہ حقائق کو جانتے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں علم حق عطا فرمائے اور اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور نبی کریم ﷺ کی محبت پر قائم ودائم رکھے۔

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا وَقُوْلُوا انْظُرْنَا وَاسْمَعُوْا ۭ وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴾ (آیت ۱۰۴)

۱) اے ایمان والو راعنا نہ کہو اور یوں عرض کرو کہ حضور ہم پر نظر رکھیں اور پہلے سے ہی بغور سنو اور کافروں کے لئے دردناک عذاب ہے۔

۲) اے ایمان والو نہ کہو راعنا اور کہو نظر کرم فرماؤ ہم پر۔ اور (پہلے سے ہی) بغور سنو۔ اور کافروں کے لئے عذاب ہے دردناک۔

اللہ تعالیٰ نے یہود کے قبیح افعال واقوال اور اعتقادات کی وضاحت فرمادی، لیکن ان کا تعلق نبی کریم ﷺ کی بعثت سے پہلے سے ہے۔ اب ان کے وہ قبائح (برے افعال واقوال) بیان کئے جارہے ہیں جن کا تعلق نبی کریم ﷺ کی بعثت کے بعد سے ہے۔

یہود نے نبی کریم ﷺ کی بعثت کے بعد آپ پر طعن کرنے، آپ کے عیوب نکالنے، اور آپ کے دین میں طعن پیش کرنے کی انتھک کوشش کی، لیکن ان کی کوششیں تمام کی تمام ناکام ثابت ہوئیں۔

شانِ نزول: نبی کریم ﷺ جب کوئی ارشاد فرماتے، اگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس پر توجہ نہ کرنے کی وجہ سے نہ سمجھ پاتے تو آپ کی خدمت میں عرض کرتے '' راعنا یا رسول اللہ '' آپ ہماری انتظار فرمائیں۔ آپ ہماری رعایت فرمائیں یارسول اللہ۔ یعنی آپ ذرا ٹھہر ٹھہر کر ارشاد فرمائیں۔ اور یہ ارشاد پھر سے لوٹا دیں تا کہ ہم سمجھ سکیں۔

یہود نے جب سنا کہ نبی کریم ﷺ کے صحابہ کرام ان کی خدمت میں " راعنا " کا لفظ بولتے ہیں تو وہ بہت خوش ہوئے کیونکہ یہ کلمہ ان کی زبان میں گالی کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ (جیسا کہ آنے والی وضاحت میں ان شاء اللہ سمجھ آجائے گا) اس لئے وہ ایک دوسرے کو کہنے لگے "کنا نسب محمدا سرا فاعلنوا به الآن" کہ ہم محمد کو دل دل میں گالیاں دیا کرتے تھے، لیکن اب تو اعلانیہ طور پر گالیاں دو۔ یعنی " راعنا " کہہ کر گالی دو۔

انہوں نے بھی اسی لفظ کا استعمال کرنا شروع کر دیا۔ جب وہ منافقانہ چال سے " راعنا یارسول الله " کہتے، تو "یضحکون فیما بینهم" ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر ہنستے، کہ ہم تو گالیاں دے رہے ہیں۔

(نبی کریم ﷺ تو سن کر خاموش رہتے کیونکہ آپ اپنے اخلاق کریمانہ کی وجہ سے ذاتی انتقام نہیں لیتے تھے)

حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ یہود کی زبان کو جانتے تھے۔ آپ نے جب ان کو ہنستے ہوئے دیکھا تو سمجھ گئے کہ یہ لوگ تو " راعنا " کے لفظ کو غلط طور پر استعمال کر رہے ہیں تو آپ نے یہود کو کہا " لئن سمعتها من احد منکم یقولها لرسول الله ﷺ لاضربن عنقه " اگر میں نے تم میں سے کسی ایک کو رسول اللہ ﷺ کے سامنے " راعنا " کہتے ہوئے سنا تو میں اس کی گردن اڑا دوں گا۔

وہ کہنے لگے کہ یہ لفظ تو تم خود بھی استعمال کرتے ہو۔ تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے اس آیۃ کریمہ کو نازل فرمایا صحابہ کرام کو بھی " راعنا " کہنے سے منع کر دیا۔ اگرچہ صحابہ کرام اس لفظ کا معنی وہ لیتے تھے جو نبی کریم ﷺ کی شان کے مطابق ہوتا تھا۔ لیکن یہود مسلمانوں کے "راعنا" کے لفظ کے استعمال سے غلط معنی مراد لیتے تھے تو مسلمانوں کو بھی اس لفظ کے استعمال سے منع کر دیا۔

" لکی لایجد الیهود بذلک سبیلا الی شتم رسول الله ﷺ" تاکہ یہود کو نبی کریم ﷺ کو اس لفظ کے ذریعے گالی دینے کا موقع نہ مل سکے۔ (از خازن)

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا : (اے ایمان والو) اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کی امت کو قرآن پاک میں

اٹھاسی مقامات میں ﴿ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ﴾ سے خطاب فرمایا۔

ایک عظیم نکتہ : حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ رب تعالیٰ نے توراۃ میں یہود کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا " یاایھا المساکین " (اے مسکینو) فکأنه سبحانه وتعالیٰ لما خاطبهم اولا بالمساکین اثبت المسکنة لهم آخرا حیث قال ﴿ وَضُرِبَتْ عَلَیْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ ﴾ رب تعالیٰ نے ابتدائی طور پر ہی جب ان کو مسکین کہہ کر خطاب کیا تو ان پر بعد میں اسی لئے مسکینی کو مسلط کر دیا۔ رب تعالیٰ نے خود فرمایا ''اوران پر مسلط کر دی گئی ذلت اور مسکینی'' اسی سے یہ ثابت ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ نے جب نبی کریم ﷺ کی امت کو ﴿ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ﴾ کہہ کر پکارا تو ''فانه تعالیٰ یعطیهم الامان من العذاب فی النیران یوم القیامة " اللہ تعالیٰ ان کو قیامت کے دن عذاب سے امان (حفاظت) عطا فرمائے گا۔

اور وجہ یہ ہے کہ " اسم المؤمن اشرف الاسماء والصفات "مؤمن بندوں کے ناموں اور صفات میں اعلیٰ اور اشرف نام اور اشرف صفت ہے۔ جب رب تعالیٰ نے دنیا میں ہمیں اشرف اور اعلیٰ قسم کے نام اور صفت سے خطاب فرمایا " فنرجو من فضله ان یعاملنا فی الآخرة باحسن المعاملات " تو ہم امید کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے آخرت میں بھی ہمارے ساتھ اچھا معاملہ فرمائے گا۔

(از کبیر)

لَاتَقُوْلُوْا رَاعِنَا : (نہ کہو راعنا) ایمان والوں کو راعنا کہنے سے منع فرمادیا۔

اس کی چند وجوہ ہیں۔

1) پہلی وجہ تو وہی ہے جس کا ذکر شان نزول میں آچکا ہے، کہ مسلمان " راعنا " کا لفظ ذکر کر کے صحیح معنی لیتے کہ آپ ہماری انتظار فرمائیں۔ اور آپ ہماری رعایت فرمائیں۔ لیکن یہود کی زبان میں یہ لفظ بطور گالی کے استعمال ہوتا تھا۔ وہ اس کا معنی لیتے " اسمع لاسمعت " سنو نہ سن سکو۔ یعنی اللہ تعالیٰ تمہیں سننے کی توفیق عطا نہ فرمائے۔ (معاذاللہ)

اللہ تعالیٰ کا ایک اور ارشاد گرامی اسے زیادہ واضح کر رہا ہے۔

مِنَ الَّذِیْنَ هَادُوْا یُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ وَیَقُوْلُوْنَ سَمِعْنَا وَعَصَیْنَا وَاسْمَعْ غَیْرَ

مُسْمَعٍ وَّرَاعِنَا لَيًّا بِاَلْسِنَتِهِمْ وَطَعْنًا فِى الدِّيْنِ ﴾ (نساء آیۃ ۴۶)

بعض یہودی کلاموں کو ان کی جگہ سے پھیرتے ہیں اور کہتے ہیں ہم نے سنا اور نہ مانا۔ (اور نبی کریم ﷺ کو کہتے) اور آپ سنیں، نہ سنائے جائیں۔ اور راعنا کہتے زبانیں پھیر کر دین میں طعنہ کیلئے۔

۲) قطرب نے کہا اگر چہ یہ لفظ صحیح معنی رکھتا ہے۔ یعنی صحابہ کرام اس کا صحیح معنی ہی مراد لیتے تھے لیکن اہل حجاز " ماکانوا یقولونها الا عند الهزؤ والسخرية فلاجرم نهى الله عنها " اس لفظ کو مزاح اور ٹھٹھا کے وقت استعمال کرتے تھے اس لئے یقیناً اللہ تعالیٰ نے اس سے منع فرمایا۔ تاکہ نبی کریم ﷺ کے حضور ایسا کوئی لفظ استعمال نہ ہو۔ جس میں ٹھٹھا، مزاح کا پہلو نکلے، جس سے ان کے اعمال برباد نہ ہو جائیں۔

۳) یہود اس لفظ " راعنا " کو پھیر کر، لمبا کر کے، یوں پڑھتے " راعینا " اور اس کا معنی یہ مراد لیتے " انت راعینا غنمنا " تم ہماری بھیڑ بکریوں کو چرانے والے ہو۔ رب تعالیٰ نے مومنوں کو بھی اس سے منع فرمادیا کہ تم بھی " راعنا " نہ کہو، تاکہ یہود غلط معنی مراد نہ لے سکیں۔

۴) "راعنا" باب مفاعلہ سے جو شرکت جانبین کو چاہتا ہے۔ اس لحاظ پر معنی یہ ہوگا کہ تم ہماری رعایت کرو ہم تمہاری رعایت کریں گے۔ تم ہماری انتظار کرو ہم تمہاری انتظار کریں گے۔

" فنهاهم الله تعالى عنه وبين ان لابد من تعظيم الرسول عليه السلام فى المخاطبة على ما قال ﴿ لَاتَجْعَلُوْا دُعَآءَ الرَّسُوْلِ بَيْنَكُمْ كَدُعَآءِ بَعْضِكُمْ بَعْضًا ﴾

تو رب تعالیٰ نے اس لفظ کے استعمال سے ہی منع کر دیا۔ کیونکہ نبی کریم ﷺ کی تعظیم ضروری ہے۔ اسلئے کہ رب تعالیٰ نے فرمایا "تم رسول اللہ کو ایسے نہ پکارو جیسے آپس میں ایک دوسرے کو پکارتے ہو"۔

(۵) " راعنا " میں خطاب کرنے والا اپنے آپ کو بڑا سمجھتا ہے۔ اگر چہ صحابہ کرام اس معنی کو مراد نہیں لیتے تھے لیکن لفظ کا تقاضا یہ تھا کہ اس کا معنی یہ ہو " راع کلامی ولا تغفل عنه ولاتشتغل بغيره " میرے کلام کی رعایت کرو، انتظار کرو، غافل نہ ہو۔ کسی اور طرف مشغول نہ ہو۔

یہ معنی یقیناً نبی کریم ﷺ کی شان کے لائق نہ تھا۔ اس لئے وہ لفظ ہی استعمال کرنے سے منع کر دیا، جس لفظ میں بے ادبی کا پہلو پایا جائے۔

لیکن " انظرنا " کہنے والا اپنے آپ کو بڑا نہیں سمجھتا بلکہ عاجزانہ طور پر کہتا ہے، میرے سوال کی انتظار کریں، اپنے کلام میں توقف کریں، اپنا بیان ٹھہرا کر کریں تا کہ میں سمجھ سکوں۔ اسی لئے "انظرنا" کہنے کا حکم دیا۔

(۶) " راعنا " رعونۃ " سے مشتق ہو تو اس کا معنی ہوتا ہے " حماقت " یہود چونکہ اس معنی میں بھی استعمال کرتے تھے۔ لہٰذا رب تعالیٰ نے ایمان والوں کو منع کیا کہ تمہارے صحیح استعمال کے باوجود یہود چونکہ نبی کریم ﷺ کو (معاذ اللہ) احمق کہہ رہے ہیں۔ لہٰذا تم یہ لفظ ہی استعمال کرنا چھوڑ دو۔

یہ تمام وجوہ ہی سبب ہیں مومنوں کو "راعنا" کے لفظ کے استعمال کرنے سے منع کرنے کی۔

وَقُولُوا انْظُرْنَا : اور کہو ہماری طرف نظر کرم فرماؤ۔

یہاں بھی مختلف وجوہ ہیں۔ ان میں سے ایک وجہ یہ ہے کہ کبھی ذکر کیا جاتا ہے " نظرہ " اس کا معنی مراد لیا جاتا ہے "انتظرہ" اس نے فلاں کی انتظار کی۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کے ارشاد گرامی ﴿اُنْظُرُونَا نَقْتَبِسْ مِنْ نُوْرِكُمْ﴾ میں " انظرونا " انتظار کے معنی میں استعمال ہے۔

اب معنی یہ ہوگا "اور کہو ہماری انتظار فرمائیں۔

اور وجہ یہ ہے کہ کبھی کہا جاتا ہے " انظرنا " تو معنی اس کا یہ لیا جاتا ہے " انظر الینا " ہماری طرف نظر رحمت فرمائیں۔

اور وجہ یہ ہے کہ " انظرنا " ماخوذ ہے "النظرۃ " سے جس کا معنی ہے مہلت دینا۔ اس صورت میں معنی یہ ہوگا "ہمیں مہلت دیں۔"

وَاسْمَعُوْا: میں تین مطلب ہیں۔ ایک یہ کہ پہلے ہی کامل توجہ سے سنو۔ ادھر ادھر توجہ نہ کروتا

کہ نبی کریم ﷺ سے لوٹانے کا تمہیں مطالبہ ہی نہ کرنا پڑے۔

اور مطلب یہ ہے کہ یہود کو اشارۃً سمجھانا مقصود تھا کہ انہوں نے کہا تھا ﴿ سَمِعْنَا وَ عَصَيْنَا ﴾ ہم نے سنا اور نافرمانی کی۔ مسلمانوں کو حکم دیا ﴿ وَاسْمَعُوْا ﴾ تم سن کر قبول کرلو۔ اگرچہ صحابہ کرام نے سن کر قبول کیا ہوا تھا لیکن مقصد یہود کو سنانا تھا کہ تم بھی سن کر قبول کرلو۔ سن کر نافرمانی نہ کرو۔ اور مطلب یہ تھا کہ جو تمہیں "راعنا" کہنے سے منع کیا گیا ہے۔ اسے سنو۔ پھر اس کلمہ کو نہ لوٹانا۔

وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ اَلِيْمٌ : اور کافروں کے لئے دردناک عذاب ہے۔

" اذا لم يسلكوا مع الرسول هذه الطريقة من الاعظام و التبجيل " یعنی نبی کریم ﷺ کی عظمت نہ بیان کرنا، آپ کی بزرگی کا لحاظ نہ کرنا دردناک عذاب کا سبب ہے۔ (ماخوذ از کبیر)

"ووضع المظهر موضع المضمر ايذانا بان التهاون برسول الله ﷺ كفر يوجب اليم العذاب"

" وللكافرين "اسم ظاہر کو ذکر کیا، ضمیر کو نہیں لایا گیا یہ بتانے کے لئے کہ نبی کریم ﷺ کی شان میں گستاخی کرنا، نازیبا الفاظ استعمال کرنا کفر ہے اور باعث عذاب ہے اور وہ عذاب بھی دردناک ہوتا ہے۔
(روح المعانی)

تنبیه : ان الله تعالیٰ نهی المؤمنين عن مشابهة الكافرين قولا و فعلا " بے شک اللہ تعالیٰ نے مومنوں کو کافروں کی مشابہت سے منع فرمایا ہے کہ قول و فعل میں کفار کی مشابہت نہ کی جائے۔

نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے " من تشبه بقوم فهو منهم " جس شخص نے کسی قوم سے مشابہت کی وہ ان سے ہی ہے۔ یہود جب مسلمانوں کو سلام کہتے تو " السام عليكم " کہتے۔ السام کا معنی موت ہے لیکن ہمیں یہ حکم ہے کہ ہم ان کے جواب میں سلام نہ کہیں بلکہ صرف "وعلیکم" کہہ کر جواب دیں۔

اس آیۃ سے یہ پتہ چلا کہ مسلمانوں کو کفار کی مشابہت سے منع کیا گیا ہے یہ ان کے اقوال، افعال، لباس اور ان کی عادات بلکہ ان کی عبادات میں بھی ان کی مشابہت نہ کریں۔ (از صابونی)

مقام توجه : " فی هذه الآية دلالة على تجنب الالفاظ المحتملة التی فیها التعریض

للتنقیص و الغض"

اسی آیۃ کریمہ سے یہ مسئلہ بھی سمجھ آ گیا کہ ایسے الفاظ جن کے معانی میں احتمال ہو کہ تعریضاً یہ نبی کریم ﷺ کی تنقیص (شان کی کمی) اور آپ کی شان کو چھپانے والے معانی ہیں تو ان الفاظ سے اجتناب ضروری ہے۔

گناہوں کے اسباب سے بچنا بھی ضروری ہے:

''اس آیۃ کریمہ میں مسلمانوں کو''راعنا'' کہنے سے منع کیا، اس لئے کہ اسی لفظ کو یہود غلط معنی میں لیتے تھے جو باعث کفر تھا، لہٰذا اس لفظ کا استعمال ہی منع کر دیا گیا۔

☆ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ﴿ وَلَاتَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللهِ فَيَسُبُّوا اللهَ عَدْوًاۢ بِغَيْرِ عِلْمٍ ط﴾ (الانعام آیۃ ۱۰۸)

اور انہیں گالی نہ دو جن کو وہ اللہ کے سوا پوجتے ہیں کہ وہ اللہ کی شان میں بے ادبی کریں گے زیادتی اور جہالت سے۔

چونکہ بتوں کی مذمت بیان کرنا، ان کو گالی دینا سبب بنتا ہے اللہ تعالیٰ کی شان میں گستاخی کرنے کا، کیونکہ کفار جوابی طور پر اللہ تعالیٰ کی شان میں گستاخی کرتے ہیں، اس لئے معبودانِ باطلہ کو گالی دینے سے منع کر دیا گیا۔

☆ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ام حبیبہ اور ام سلمہ رضی اللہ عنہما نے حبشہ میں ایک گرجا دیکھا جس میں تصاویر تھیں۔ ان دونوں نے ان تصاویر کا ذکر رسول اللہ ﷺ سے کیا۔

"فقال رسول الله ﷺ ان اولئک اذا کان فیھم الرجل الصالح فمات بنوا علی قبرہ مسجدا و صوّروا فیہ تلک الصور اولئک شرار الخلق عنداللہ" (اخرجہ البخاری ومسلم)

تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بے شک ان لوگوں میں جب کوئی نیک آدمی فوت ہو جاتا تو اس کی قبر کے پاس وہ مسجد بنالیتے پھر اس مسجد میں اس نیک آدمی اور دوسرے نیک آدمیوں کی تصویریں رکھ لیتے۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں وہی بری مخلوق ہے۔

یعنی وہ لوگ نیک آدمیوں کی تصویریں بنا کر مسجد میں رکھ لیتے، تا کہ ان کے ذریعے اپنے دل کو تسلی دیں، اوران نیک لوگوں کے احوال کو یاد کر کے ان جیسے اعمال کو بجالاسکیں۔ ان قبروں کے پاس وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے۔ اس طرح کچھ وقت گذر گیا۔ ان کے بعد آنے والے لوگ اصلی حالات سے جاہل تھے۔ شیطان نے ان کے دلوں میں وسوسہ ڈالا کہ تمہارے آباء واجداد تو ان بزرگوں کی عبادت کرتے تھے۔ تو ان لوگوں نے ان تصویروں کی عبادت شروع کردی۔ آہستہ آہستہ ان تصویروں کے بت بنالئے۔ اس طرح بت پرستی شروع ہوگئی۔

" فحذر النبی ﷺ عن مثل ذلک " نبی کریم ﷺ نے اس قسم کی چیزوں سے ڈرایا۔

یعنی ذی روح چیزوں کی تصویریں بنانا۔ پھر بزرگوں کی تصویروں کو بطور تعظیم گھروں میں رکھنا، اور مساجد میں ذی روح چیزوں کی تصویروں کو رکھنا، اوران کے سامنے نماز ادا کرنا حرام قرار دیا۔

وجہ اس کی یہی تھی کہ بت پرستی کے اسباب کو بھی حرام قرار دے دیا، تا کہ بت پرستی سے اجتناب ہو سکے۔

نبی کریم ﷺ نے فرمایا: " اشتد غضب الله علی قوم اتخذوا قبور انبیائهم و صالحیهم مساجد "

اللہ تعالیٰ کا اس قوم پر غضب بہت سخت ہوتا ہے جو انبیاء کرام اور اولیاء کرام کی قبروں کو سجدہ گاہ بنا لیتے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ کا اورارشاد یہ ہے۔ " اللهم لاتجعل قبری وثنا یعبد " اے اللہ میری قبر کو بتوں کی طرح عبادت گاہ نہ بنانا۔ (کہ اسے سجدہ کیا جائے)

☆ " وروی مسلم عن النعمان بن بشیر قال سمعت رسول الله ﷺ یقول الحلال بیّن والحرام بیّن و بینهما امور متشابهات فمن اتقی الشبهات استبرأ لدینه وعرضه ومن وقع فی الشبهات وقع فی الحرام کالراعی یرعی حول الحمی یوشک ان یقع فیه "

حضرت نعمان بن بشیر ﷺ فرماتے ہیں۔ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ حلال واضح ہے اور حرام واضح ہے۔ ان کے درمیان ایسے امور ہیں جن کے حلال ہونے اور حرام ہونے میں شبہ پایا جاتا ہے۔ جو شخص شبہ والے امور سے بچ گیا، اس نے اپنے دین اوراپنی عزت کو بچالیا۔ جو شخص

شبہ والی چیزوں میں واقع ہو گیا وہ حرام میں واقع ہو گیا۔ جیسا کہ چرواہا جو (کھیت کی) حد بندی کے اردگرد جانوروں کو چرائے ان کے کھیت میں واقع ہونے کا احتمال پایا جاتا ہے۔

واضح ہوا کہ نبی کریم ﷺ نے شبہات سے اس لئے منع کیا تا کہ حرام کاموں کے ارتکاب سے بچا جا سکے۔

☆ "وقال رسول الله ﷺ ان من الکبائر شتم الرجل والدیه قالوا یارسول الله وهل یشتم الرجل والدیه ؟ قال ، نعم یسب ابا الرجل فیسب اباه ویسب امه فیسب امه"

نبی کریم ﷺ نے فرمایا بہت بڑا گناہ ہے کہ کوئی شخص اپنے والدین کو گالی دے۔ صحابہ کرام نے عرض کیا کوئی شخص اپنے والدین کو بھی گالی دیتا ہے؟ آپ نے فرمایا جو شخص کسی کے باپ کو گالی دے، وہ اس کے باپ کو گالی دے۔ اور جو شخص کسی کی ماں کو گالی دے وہ اس کے ماں کو گالی دے۔

یعنی کسی کے ماں باپ کو گالی دینے سے منع کیا تا کہ وہ اس کے ماں باپ کو گالی نہ دے۔ گویا کہ ماں باپ کو گالی دینے کے ذریعہ اور سبب سے بھی منع فرمایا۔ (ماخوذ از قرطبی)

شان نبوت کے مناسب نہیں کہ ایک بات تم بار بار پوچھتے رہو، یہ کمال ادب اور انتہاء تعظیم ہے جس کی تعلیم عرش وفرش کے مالک نے غلامان مصطفیٰ علیہ السلام کو دی۔ اب جو لوگ حضور کریم ﷺ کو صرف بڑے بھائی کی سی حیثیت دیتے ہیں یا اپنے جیسا بشر ثابت کرنے میں اپنی ساری قابلیتیں صرف کر دیتے ہیں وہ اپنے انجام پر خود ہی غور کر لیں۔

ادب گاہیست زیر آسماں از عرش نازک تر
نفس گم کردہ می آید جنید و بایزید ایں جا

(ضیاء القرآن)

☆☆☆

﴿ مَايَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَلَا الْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يُّنَزَّلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ خَيْرٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَاللّٰهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ط وَاللّٰهُ ذُوالْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ﴾ (آیت ۱۰۵)

۱) وہ جو کافر ہیں کتابی یا مشرک وہ نہیں چاہتے کہ تم پر کوئی بھلائی اترے تمہارے رب کے پاس سے، اور اللہ اپنی رحمت سے خاص کرتا ہے جسے چاہے اور اللہ بڑے فضل والا ہے

۲) نہیں پسند کرتے کافر اہل کتاب ہوں یا مشرک کہ نازل کی جائے کوئی بھلائی تمہارے رب کی طرف سے اور اللہ خاص کرتا ہے اپنی رحمت جسے چاہے اور بڑے فضل والا ہے۔

اس سے پہلے یہ ذکر کیا گیا کہ یہود بظاہر نبی کریم ﷺ سے محبت کرتے، اور ظاہری طور پر آپ کے ادب واحترام کا لحاظ کرتے لیکن در پردہ، دل ہی دل میں آپ کو گالیاں دیتے، آپ کی شان میں گستاخی کرتے، اور اس تاک میں رہتے کہ مسلمان کوئی ایسا لفظ نبی کریم ﷺ کے لئے استعمال کریں جو ذو معنیین (دو معنوں والا) ہو۔ جس کا ایک معنی اچھا ہو جس میں مسلمان اس لفظ کو استعمال کریں۔ اور ایک معنی سے برائی اور مذمت سمجھ آئے جس میں ہم استعمال کریں تا کہ ہم دل ہی دل میں اپنے غیظ و غضب کی بھڑاس نکال لیں۔

اس آیۃ کریمہ میں ان کی وہی چال مسلمانوں سے ذکر کی جا رہی ہے۔ کہ وہ مسلمانوں سے بظاہر محبت کا اظہار کرتے ہیں کہ ہم تمہارے ساتھ محبت کرتے ہیں، لیکن مسلمانوں پر اللہ تعالیٰ کی کوئی رحمت بھی دل میں پسند نہیں کرتے۔ (از بیضاوی و شیخ زادہ)

شان نزول: کفار نے مسلمانوں سے جب ظاہری طور پر محبت کرنے کا دعویٰ کیا کہ ہم تمہارے ساتھ محبت کرتے ہیں۔

" فان الکفار لما اظهروا مودة المسلمین کان المسلمین یوالونهم ویرکنون الیهم

فنھوا عن ذلک"

کفار نے جب مسلمانوں سے محبت کرنے کا ظاہری دعوی کیا تو مسلمان بھی ان سے محبت کرنے لگے اور ان کی طرف میلان کرنے لگے۔ تو رب تعالیٰ نے اس آیۃ کریمہ کو نازل کر کے واضح کر دیا کہ کفار خواہ اہل کتاب ہوں یا مشرک ہوں وہ تو نہیں پسند کرتے کہ تم پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی بھلائی نازل ہو۔

وہ اپنے دعوی میں جھوٹے ہیں۔ ان سے محبت نہ کرو، ان سے دوستی قائم نہ کرو۔ ان کی طرف میلان نہ کرو۔

ایک مقام پر فرمایا: ﴿ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْكٰفِرِیْنَ اَوْلِیَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِیْنَ ط ﴾

اے ایمان والو کافروں کو دوست نہ بناؤ مسلمانوں کے سوا۔ (النساء آیة ۱۴۴)

یعنی تم صرف آپس میں مسلمان ہی ایک دوسرے سے دوستی قائم کرو۔ کفار سے دوستی قائم نہ کرو

اور ارشاد فرمایا: ﴿ وَلَا تَرْكَنُوْۤا اِلَى الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ ۙ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ اَوْلِیَآءَ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ ۞ ﴾ (هود، آیة ۱۱۳)

اور ظالموں کی طرف نہ جھکو کہ تمہیں آگ چھوئے گی اور اللہ کے سوا تمہارا کوئی حمایتی نہیں پھر مدد نہ پاؤ گے۔

شان نزول کی ایک اور وجہ:

مسلمانوں نے اپنے حلیف یہود کو کہا تم محمد ﷺ پر ایمان لے آؤ، تو وہ کہنے لگے۔ " **وددنا لو کان خیرا مما نحن علیه فنتبعه فاکذبھم اللہ تعالیٰ بذلک** " ہم بھی یہی چاہتے ہیں کہ ایمان لے آئیں، لیکن وہ دین جب ہمارے دین سے بہتر ہو جس کی ہم تابعداری کر رہے ہیں۔ رب تعالیٰ نے اس آیۃ کریمہ میں یہود کی تکذیب کی کہ وہ اپنے اس دعویٰ میں جھوٹے ہیں وہ تو چاہتے ہی نہیں کہ نبی کریم ﷺ پر وحی نازل ہو، یا مومنوں کو کوئی بھلائی حاصل ہو۔

وہ غلط کہتے ہیں کہ ہم تو ایمان لانا پسند کرتے ہیں، لیکن تمہارا دین ہمارے دین سے بہتر نہیں۔

ان کے دونوں دعوے جھوٹے ہیں۔ ان کا یہ کہنا کہ ہم پسند کرتے ہیں کہ ہم ایمان لائیں یہ سراسر غلط ہے، وہ تو ایمان لانا ہی نہیں چاہتے اور ان کا یہ کہنا بھی باطل ہے کہ تمہارا دین ہمارے دین سے اچھا نہیں، یہ تو صرف ان کا زبانی دعویٰ ہے۔ وہ اپنے اس دعویٰ پر کوئی دلیل تو قائم کریں۔

(ماخوذ از شیخ زادہ و روح المعانی)

مقام توجہ: پہلی آیت میں یہود کے قبائح کا ذکر کیا جو وہ رسول اللہ ﷺ کی شان میں گستاخی کرتے تھے۔ اور اس آیۃ میں بھی یہود کے مسلمانوں سے منافقانہ انداز سے پیش آنے کا ذکر کیا ہے، لیکن دونوں میں وجہ بیان مختلف ہے۔ اور علیحدہ علیحدہ غرض پائی گئی ہے۔

" فان الاول لتأديب المؤمنين وهذا لتكذيب اولئك الكافرين " پہلی آیت میں مومنوں کو ادب سکھانا مقصود ہے کہ تم کوئی ایسا لفظ ذکر ہی نہ کرو جس سے کفار کو نبی کریم ﷺ کی شان میں گستاخی کا موقع مل سکے۔

اور دوسری آیۃ میں ذکر کیا گیا ہے کہ کفار جھوٹے ہیں۔ ان کی محبت کے دعوے تسلیم نہ کرنا۔

(از روح المعانی)

مَایَوَدُّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا مِنۡ اَهۡلِ الۡکِتٰبِ وَلَاالۡمُشۡرِکِیۡنَ :

(نہیں پسند کرتے کافر خواہ اہل کتاب ہوں یا مشرک ہوں)

" ما " نافیہ ہے۔ اور " یود " ماخوذ ہے " ود " سے اور " ود " کے دو معنی آتے ہیں۔ تاہم مراد دونوں ہی ہوتے ہیں۔ البتہ کبھی ایک قصداً مراد ہوتا ہے۔ اور دوسرا تبعا اور کبھی دوسرا قصدا مراد ہوتا ہے اور پہلا تبعاً۔ " الود محبة الشئ و تمني كونه " " ود " کا ایک معنی ہے کسی چیز سے محبت کرنا، اور دوسرا معنی ہے تمنا کرنا۔ البتہ ان دونوں معنوں کے استعمال میں فرق ہے۔ اگر کسی چیز کی تمنا کرنے والا معنی لیا جائے تو مفعول جملہ ہوگا۔ جیسا کہ " وددت لو تفعل كذا " میں تمنا کرتا ہوں کاش تو ایسے کرے۔

اور اگر محبت والا معنی لیا جائے تو مفعول مفرد ہوگا۔ " وددت الرجل " میں فلاں شخص سے محبت کرتا ہوں۔

البتہ یہ واضح ہے کہ مراد تمنا والا معنی ہو تو اس میں محبت پائی جائے گی۔ اور اگر مراد محبت والا معنی تو

اس میں تمنا پائی جائے گی۔اور یہ بھی خیال رہے کہ جب " ود " کا ذکر ہوگا تو اسی سے یہ بھی واضح ہوگا کہ وہ اسے ناپسند نہیں کرتا۔ (از روح المعانی)

یعنی اس ایک لفظ " مایود " سے وسیع تر معنی حاصل ہوگیا کہ کافر پسند ہی نہیں کرتے (محبت نہیں رکھتے) اور کافر تمنا ہی نہیں رکھتے۔ بلکہ کافر تو ناپسند کرتے ہیں کہ تمہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی بھلائی حاصل ہو جائے۔

" من اهل الكتاب ولا المشركين " یہاں " من " بیان کے لئے ہے۔جس کا معنی ہوتا ہے یعنی۔اعلیٰ حضرت کا ترجمہ " من " بیانیہ کے مطابق ہے۔راقم نے وہی نقل کیا۔تاہم " من "تبعیض کے لئے ہو یہ بھی احتمال ہے۔اس وقت " مـــن " کا معنی "سے" ہوتا ہے۔ضیاء القرآن میں یہی معنی مذکور ہے۔("من " میں دو احتمالوں کا ذکر روح المعانی میں ہے۔)

اَنْ يُّنَزَّلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ خَيْرٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ :

(یہ کہ نازل کی جائے تم پر کوئی بھلائی تمہارے رب کی طرف سے)

یہاں پہلا " من " استغراق کے لئے ہے۔اور دوسرا " من " ابتدائیہ ہے۔

"خیر" سے مراد کیا ہے؟:وفسر الخير بالوحی والمعنی انهم يحسدونكم به وما يحبون ان ينزل عليكم شئ منه "

خیر سے مراد وحی ہے،یعنی وہ تم پر حسد کرتے ہیں اور نہیں چاہتے کہ تم پر رب تعالیٰ کی طرف کچھ نازل ہو۔ یہود کہتے تھے کہ نبوت حضرت اسحاق علیہ السلام کی اولاد کا حق ہے ۔ جب نبی کریم ﷺ بنی اسماعیل میں تشریف لائے تو وہ حسد کرنے لگے اور آپ پر ایمان نہ لائے ، یہود میں سے کئی لوگ منافقانہ طور پر آپ سے محبت کا دم بھی بھرتے تھے لیکن دل میں آپ کو پسند نہیں کرتے تھے اور نہ ہی یہ پسند کرتے کہ آپ پر وحی نازل ہو۔

اسی طرح مشرکین چاہتے تھے کہ مکہ اور طائف میں سے کسی رئیس پر قرآن نازل ہوتا۔وہ اس لئے حسد کرتے تھے کہ قریش میں بنی عبدالمطلب میں ایک یتیم اور غریب شخص پر قرآن کیوں نازل ہوگیا۔

" وقالوا لولا نزل هذا القرآن علی رجل من القریتین عظیم " اورانہوں (مشرکین) نے کہا یہ قرآن کیوں نازل نہیں کیا گیا دو بستیوں (مکہ اور طائف) کے کسی بڑے شخص پر۔

خیر سے مراد علم بھی لیا گیا ہے۔ کہ وہ نہیں چاہتے کہ تمہیں علم جیسی عظیم اور لازوال نعمت عطاء کی جائے۔ اور خیر سے مراد نصرۃ (امداد) بھی ہے۔ کہ کفار نہیں چاہتے کہ اللہ تعالیٰ اپنی طرف سے امداد عطاء کرے۔

" ولعل المراد به ما یعم ذلک " شاید مراد خیر سے عام ہو۔ ہر قسم کی بھلائی مراد ہو۔

یعنی کفار نہیں چاہتے کہ نبی کریم ﷺ اور مؤمنین کو کسی قسم کی کوئی بھلائی بھی رب تعالیٰ کی طرف سے عطاء ہو کیونکہ وہ حسد کرتے تھے اور انہیں اپنی ریاست (چوہدراہٹ) کے زوال کی فکر رہتی تھی۔

وَاللّٰهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ: ''اور اللہ خاص کرتا ہے اپنی رحمت سے جسے چاہے''

یہ جملہ ابتدائیہ ہے۔ خیر کے نازل کرنے اور اس میں حکمت کی وضاحت کی جارہی ہے، کہ کفار باوجود اس کے کہ ناپسند کریں لیکن اللہ تعالیٰ جسے چاہے بھلائی عطاء فرمادے۔

" والمراد من الرحمة ذلک الخیر الا انه عبر بها اعتناء وتعظیما لشانه "

رحمت سے مراد وہی خیر جس کا ذکر پہلے کیا گیا۔ البتہ عظمت شان کے پیش نظر اور اہتمام شان کے لئے رحمت سے تعبیر کر دیا گیا۔

یعنی اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے جسے چاہے بھلائی عطاء فرمائے، کفار کے ناپسند کرنے سے رب تعالیٰ اپنے خاص بندوں کو اپنی رحمت اور بھلائی سے محروم نہیں فرماتا۔

ایک عظیم نکتہ:

" وفی اقامة لفظ " الله " مقام ضمیر ربکم تنبیه علی ان تخصیص بعض الناس بالخیر دون بعض یلائم الالوهیة کما ان انزال الخیر علی العموم یناسب الربوبیة " (روح المعانی)

جب پہلے " ربکم " ذکر ہو چکا ہے، تو ضمیر ذکر ہو جاتی جو " ربکم " کی طرف لوٹتی، لیکن ظاہر لفظ " الله " ذکر کیا گیا اس کی وجہ کیا ہے؟۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ربوبیت کا تقاضا یہ ہے کہ تمام پر

رحمت ہو۔لیکن اللہ تعالیٰ جسے چاہے اپنی رحمت خاصہ سے نوازتا ہے یہ اس کے مقام الوہیت کا تقاضا ہے کہ وہ معبود ہے۔اس پر کوئی چیز لازم نہیں کہ وہ ضرور ہی تمام کو اپنی خاص رحمت عطاء کرے۔

البتہ اللہ تعالیٰ رب بھی ہے۔صفت ربوبیۃ چاہتی ہے کہ ہر کسی پر رحمت ہو۔اس صفت ربوبیۃ کی وجہ سے رحمت عامہ ہر کسی کو حاصل ہے۔جس سے مومن اور کافر تمام ہی نفع حاصل کر رہے ہیں۔

وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ :" ذو " کا معنی صاحب، مالک، والا۔(اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔)

یہاں سے حسد کرنے والے اور مسلمانوں پر رب تعالیٰ کی نعمتوں کو ناپسند کرنے والے لوگوں کو بتانا مقصود ہے، کہ جب رب تعالیٰ کی وسیع نعمتوں سے ہر شخص نفع اٹھا رہا ہے۔اس کے فضل اور نعمتوں کے ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر میں ہر شخص مستغرق ہے تو کسی کو بھی حق نہیں پہنچتا کہ وہ کسی دوسرے سے حسد کرے، اور یہ پسند کرے کہ کسی کو نعمت اور رحمت حاصل نہ ہو۔

مقام توجہ:" وان حرمان بعض عباده ليس لضيق فضله بل لمشيئته وما عرف فيه من حكمته "

اللہ تعالیٰ اگر اپنے بعض بندوں کو اپنی رحمت خاصہ سے محروم کرتا ہے تو اس کا یہ مقصد نہیں ہوتا کہ اسکے فضل میں کوئی کمی ہے یا اسکے فضل میں کوئی تنگی ہے۔اس کا فضل تو وسیع تر ہے۔البتہ اس کی مشیئت کا تقاضا جہاں پایا جائے اور اسکی حکمت جہاں پائی جائے وہاں اپنی رحمت خاصہ سے وہ نوازتا ہے۔

جہاں اس کی مشیئت میں یہ ہو کہ اسے رحمت خاصہ سے دور رکھنا ہے تو اس کو محروم کرنا بھی حکمت کے عین تقاضا کے مطابق ہے۔اور یہ واضح ہوا کہ " ان كل خير ناله عباده في دينهم و دنياهم فانه منه ابتداء وتفضلا عليهم من غير استحقاق احدمنهم لذلك بل له الفضل والمنة على خلقه "

بندوں کو جو بھی بھلائی دین و دنیا میں حاصل ہوتی ہے وہ صرف اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے حاصل ہوتی ہے۔یہ وجہ نہیں کہ بندے اس کے مستحق ہوتے ہیں۔یا اللہ تعالیٰ پر واجب ہوتا ہے کہ وہ عطاء کرے۔بندوں پر تو پہلے ہی اللہ تعالیٰ کے ان گنت انعام ہیں ان کا بھی وہ شکر یہ ادا نہیں کر سکتے، چہ جائیکہ وہ اپنی عبادات وغیرہ کے ذریعے اپنے آپ کو مستحق سمجھیں۔ (ماخوذ از روح المعانی و خازن)

﴿مَا نَنۡسَخۡ مِنۡ اٰيَةٍ اَوۡ نُنۡسِهَا نَاۡتِ بِخَيۡرٍ مِّنۡهَاۤ اَوۡ مِثۡلِهَا ؕ اَلَمۡ تَعۡلَمۡ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ قَدِيۡرٌ ☆﴾ (آیت ۱۰۶)

۱) جب کوئی آیت ہم منسوخ فرمائیں یا بھلا دیں تو اس سے بہتر یا اس جیسی لے آئیں گے، کیا تجھے خبر نہیں کہ اللہ سب کچھ کر سکتا ہے۔

۲) جو ہم منسوخ کرتے ہیں کوئی آیت۔ یا بھلا دیتے ہیں کوئی آیت، ہم لے آتے ہیں بہتر اس سے، یا اس کی مثل (اے مخاطب) کیا تو نہیں جانتا بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

شان نزول: یہود کے مختلف قسم کے اعتراضات اور دین میں طعن کا ذکر کیا جا رہا ہے۔ ان اعتراضات میں سے ان کا اسلام کے خلاف یہ اعتراض تھا۔

" فقالوا الا ترون الی محمد یامر اصحابه بامر ثم ینهاهم ویأمرهم بخلافه ویقول الیوم قولا وغدا یرجع عنه فنزلت هذه الآیة "

کہ وہ کہنے لگے کیا تم محمد کو نہیں دیکھتے کہ وہ اپنے اصحاب کو آج ایک حکم دیتا ہے۔ پھر اس سے منع کر دیتا ہے۔ اور اسکے خلاف حکم دے دیتا ہے۔ اور آج ایک بات کرتا ہے۔ کل اس سے رجوع کر لیتا ہے۔ تو ان کے رد کیلئے اور نسخ کی حکمت بیان کرنے کیلئے یہ آیۂ کریمہ نازل ہوئی۔ (از کبیر)

خصوصاً جب بیت المقدس قبلہ منسوخ کر کے کعبہ شریف کو قبلہ بنا دیا گیا تو وہ زیادہ ہی اعتراض کرنے لگے۔ (خازن)

نسخ کے معانی: نسخ کا معنی زائل کرنا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا" فینسخ الله ما یلقی الشیطٰن" تو اللہ تعالیٰ زائل کر دیتا ہے (مٹا دیتا ہے) جو شیطان اس میں ڈال دیتا ہے۔

اور نسخ بمعنی تبدیل کرنا۔ جیسا کہ رب تعالیٰ نے فرمایا " واذا بدلنا آیة مکان آیة "اور جب ہم تبدیل کر دیں ایک آیۃ کو دوسری آیۃ کی جگہ۔ (یہ بھی نسخ ہی ہے اگر چہ لفظ' بدلنا' استعمال ہوا ہے)

اور نسخ بمعنی تحویل۔ جیسا کہ کہا جاتا "تناسخ المواریث" یعنی وراثت کا ایک سے دوسرے کی طرف منتقل ہونا۔ اور نسخ بمعنی نقل کرنا۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے۔ "نسخت الکتاب" میں نے کتاب کو نقل کیا، یعنی اس کے الفاظ اور خط کو فلاں کتاب یا فلاں جگہ سے نقل کیا۔ (از الاتقان)

نسخ اور متقدمین ومتاخرین علماء کرام:

متقدمین علماء کرام نے پانچ صد آیات کو منسوخ مانا ہے۔ اور متاخرین نے ان کی تعداد کو بہت کم مانا ہے۔

اس پر مفتی محمد شفیع صاحب نے یوں تبصرہ کیا: جس طرح ایک حکم کو بالکلیہ منسوخ کر کے اس کی جگہ دوسرا حکم لانے میں ہے۔ جیسے بیت المقدس کے بجائے بیت اللہ کو قبلہ بنا دینا۔ اسی طرح کسی مطلق یا عام حکم میں کسی قید وشرط کو بڑھا دینا بھی ایک قسم کی تبدیلی ہے۔ اسلاف امت نے نسخ کو اسی عام معنی میں استعمال فرمایا ہے۔ جس میں کسی حکم کی پوری تبدیلی بھی داخل ہے اور جزوی تبدیلی قید وشرط یا استثناء وغیرہ کی بھی اس میں شامل ہے۔ اسی لئے متقدمین حضرات کے نزدیک قرآن میں آیات منسوخہ پانچ سو تک شمار کی گئی ہیں۔

حضرت متاخرین نے صرف اس تبدیلی کا نام نسخ رکھا ہے۔ جس کی پہلے حکم کے ساتھ کسی طرح تطبیق نہ ہو سکے، ظاہر ہے کہ اس اصطلاح کے مطابق آیات منسوخہ کی تعداد بہت گھٹ جائے گی۔

اسی کا لازمی اثر یہ تھا کہ متقدمین نے تقریباً پانچ سو آیات قرآنی میں نسخ ثابت کیا تھا۔ جس میں معمولی سی تبدیلی قید وشرط یا استثناء وغیرہ کو بھی شامل کیا تھا اور حضرات متاخرین میں علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے صرف بیس آیتوں کو منسوخ قرار دیا، ان کے بعد حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ نے ان میں بھی تطبیق کی صورت پیدا کر کے صرف پانچ آیتوں کو منسوخ فرمایا ہے۔ جن میں کوئی تطبیق بغیر تاویل بعید کے نہیں ہو سکتی، یہ امر اس لحاظ سے مستحسن ہے کہ احکام میں اصل بقاء حکم ہے، نسخ خلاف اصل ہے۔ اس لئے جہاں آیت کے معمول بہا (اس پر عمل کئے جانے) ہونے کی کوئی توجیہ ہو سکتی ہے۔ اس میں بلا ضرورت نسخ ماننا درست نہیں۔ لیکن اس تقلیل کا یہ منشاء ہرگز نہیں ہو سکتا کہ مسئلۂ نسخ اسلام یا قرآن پر کوئی عیب تھا

جس کے ازالہ کی کوشش چودہ سو برس تک چلتی رہی، آخر انکشاف حضرت شاہ ولی اللہ کو ہوا، جس میں گھٹتے گھٹتے پانچ رہ گئیں۔ اور اب اس کا انتظار ہے کہ کوئی جدید محقق ان پانچ کا بھی خاتمہ کر کے بالکل صفر تک پہنچا دے۔

مسئلہ نسخ کی تحقیق میں ایسا رخ اختیار کرنا نہ اسلام اور قرآن کی کوئی صحیح خدمت ہے۔ اور نہ ایسا کرنے سے صحابہ و تابعین اور پھر چودہ سو برس کے علماء متقدمین و متأخرین کے مقالات و تحقیقات کو دھویا جا سکتا ہے۔ اور نہ مخالفین کی زبانِ طعن اس سے بند ہو سکتی ہے۔ بلکہ اس زمانے کے ملحدین کے ہاتھ میں یہ ہتھیار دینا ہے کہ یہ بھی ہو سکتا ہے، کہ چودہ سو برس تک علماء کچھ کہتے رہے ہوں اور آخر میں اسکا غلط ہونا ثابت ہو جائے۔ معاذ اللہ'' اگر یہ دروازہ کھلے گا تو قرآن اور شریعت سے امن اٹھ جائیگا۔

(معارف القرآن)

راقم نے یہ طویل اقتباس نقل کیا ہے، کیونکہ راقم بھی آخری سطور سے مکمل اتفاق رکھتا ہے۔ اور اسی کے مطابق کامل ذہن میں بات یہی راسخ تھی جسے مفتی صاحب کے تبصرہ سے تائید حاصل ہوئی۔

علامہ کاظمی رحمہ اللہ کا محاکمہ: حضرت علامہ احمد سعید کاظمی رحمہ اللہ نے متقدمین اور متأخرین کے اقوال میں یوں تبصرہ فرمایا؛ متقدمین نے نسخ کو ''ازالہ'' کے معنی میں استعمال کیا ہے۔ اور انہوں نے کہا ہے کہ کسی چیز کو کسی دوسری چیز سے زائل کر دینا نسخ ہے۔ اور ''ازالہ'' کو انہوں نے عام رکھا کسی آیت کی تلاوت کا ازالہ بھی نسخ ہے اور کسی حکم شرعی کا بدل جانا بھی نسخ ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ کسی حکم شرعی یا آیۃ کے اوصاف میں سے کسی وصف کے جزوی ازالہ کو بھی اپنی اصطلاح میں وہ نسخ ہی کہتے ہیں۔ مثلاً کسی آیۃ کا اس کے متبادر معنی سے غیر متبادر معنی کی طرف مصروف ہو جانا، اسی طرح استثناء نیز تخصیص عام، تقیید مطلق یا کسی قید کے اتفاقی ہونے کا بیان وغیر ذلک۔ جس آیۃ یا حکم شرعی کے کسی وصف میں انہیں ادنیٰ ترین جزوی ازالہ نظر آیا اسی کو انہوں نے نسخ سے تعبیر کر دیا۔ اوصاف آیات کے کسی وصف میں اس نوعیت کا ازالہ بکثرت آیات میں پایا جاتا ہے۔ اس لئے ان کے نزدیک آیات منسوخہ کی تعداد پانچ سو بلکہ اس سے بھی زائد تک پہنچ گئی۔

اور متاخرین نے لفظ نسخ کو صرف ابدال یا تبدیل کے معنی میں استعمال کیا اور مذکورہ بالا نوعیت

کے جزوی ازالہ یا جزوی تبدیلی کو انہوں نے نسخ نہیں کہا، چنانچہ متأخرین اور بعض اصولیین کے نزدیک نسخ کے معنی ہیں:

" بیان انتهاء التعبد بقرائتها ......او الحكم المستفاد منها "......او بهما جميعا "

(از روح المعانی)

یعنی عبادت سمجھ کر کسی آیۃ کے پڑھنے کی مدت ختم ہو جانے کا بیان۔ یا جو حکم اس آیۃ سے مستفاد ہوتا ہے بطور عبادت اس پر عمل کرنے کی مدت ختم ہو جانے کا بیان۔ یا دونوں کی انتہاء مدت کا بیان نسخ ہے۔

اس تفصیل سے واضح ہو گیا کہ آیات منسوخہ کی تعداد میں متقدمین اور متأخرین کا اختلاف ان کی اصطلاح پر مبنی ہے۔ جس کی حیثیت نزاع لفظی سے زیادہ کچھ نہیں " **لكل ان يصطلح بما شاء** " ہر طبقہ کے علماء کو اپنی اصطلاحات کے وضع کرنے کا حق حاصل ہے۔ (از التبان مع التبیان للکاظمی)

نسخ کا علم عظیم ہے:

" قال الائمة لا يجوز لاحد ان يفسر كتاب الله الا بعد ان يعرف منه الناسخ والمنسوخ "

ائمہ کرام نے فرمایا کہ کسی شخص کو قرآن پاک کی تفسیر لکھنے کا حق نہیں پہنچتا جب تک اسے کتاب اللہ میں ناسخ اور منسوخ کا علم نہ ہو۔

حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے ایک قاضی سے پوچھا کیا تو ناسخ و منسوخ کا علم رکھتا ہے؟ اس نے کہا مجھے تو اس کا علم نہیں تو آپ نے فرمایا " **هلكت واهلكت** " تو خود بھی ہلاک ہو گیا اور دوسروں کو بھی تو نے ہلاکت میں ڈال دیا۔ (الاتقان)

نسخ کا علم رکھنا عظیم فائدہ پر مرتب ہے:

" لا يستغني عن معرفته العلماء ولا ينكره الا الجهلة الاغبياء "

علماء کرام نسخ کے علم سے مستغنی نہیں ہو سکتے اور نسخ کا انکار صرف جاہل اور کند ذہن لوگ ہی کرتے ہیں۔ کیونکہ قرآن پاک کے نسخ کے علم پر ہی احکام کے علم کی دارومدار ہے۔ اور اسی پر ہی حلالی و حرام کی معرفت کی دارومدار ہے۔

ابو البختری فرماتے ہیں: حضرت علی رضی اللہ عنہ ایک مسجد میں داخل ہوئے، وہاں ایک شخص

لوگوں کو وعظ کر رہا تھا اور خوف دلا رہا تھا۔ آپ نے فرمایا یہ کیا ہو رہا ہے۔ لوگوں نے کہا ایک شخص لوگوں کو وعظ کر رہا ہے آپ نے فرمایا:

" لیس برجل یذکر الناس ، لکنه یقول انا فلان ابن فلان فاعرفونی "

" یہ شخص لوگوں کو وعظ نہیں سنا رہا بلکہ اپنا چرچا کر رہا ہے کہ لوگ مجھے پہچان لیں کہ میں فلاں ابن فلاں ہوں"

پھر آپ نے اسے اپنی طرف بلایا، اور اس سے پوچھا " اتعرف الناسخ من المنسوخ " کیا تم ناسخ و منسوخ کو جانتے ہو؟ اس نے کہا میں تو نہیں جانتا۔ تو آپ نے فرمایا " فاخرج من مسجدنا ولا تذکر فیه " پھر تو تم ہماری مسجد سے نکل جاؤ اور یہاں آ کر وعظ نہ کیا کرو۔ (از قرطبی)

مطلب واضح ہوا کہ ناسخ و منسوخ کا علم عظیم علم ہے۔ اسکے بغیر انسان میں اہلیت نہیں پائی جاتی کہ وہ قرآن پاک کی تفسیر کرے یا لوگوں کو وعظ سنائے۔ اسی سے یہ مسئلہ بھی واضح ہو گیا کہ مبلغ بننے کیلئے علم کا ہونا ضروری ہے بغیر علم کے تبلیغ کرنے سے کسی کو نقصان تو پہنچایا جا سکتا ہے، نفع نہیں پہنچایا جا سکتا۔

نسخ کی حقیقت کو سمجھیں:.......... نسخ کا اصطلاح شرع میں معنی یہ ہے:

" رفع التابید المستفاد من اطلاقها ولذا عرفه بعضهم برفع الحکم الشرعی فهو بیان بالنسبة الی الشارع ورفع بالنسبة الینا "

بظاہر جو حکم سمجھ آ رہا تھا کہ یہ ہمیشہ کے لئے رہے گا، کیونکہ اس میں ظاہری طور پر کوئی قید نہیں تھی کہ یہ حکم فلاں وقت اٹھا لیا جائے، اس حکم کو اٹھا لینا نسخ ہے۔ لیکن شارع (رب تعالیٰ جو شریعت کا حکم دینے والا ہے) کے نزدیک پہلے سے ہی اس حکم کا ایک وقت مقرر ہوتا ہے کہ فلاں وقت اس حکم کو اٹھا لیا جائے گا، اگرچہ بظاہر اس کا ذکر نہیں ہوتا۔ جب وہ وقت آتا ہے تو اس حکم کو اٹھا لیا جاتا ہے، ہم سمجھتے ہیں کہ یہ حکم اٹھا لیا گیا ہے۔ یعنی نسخ جب ہماری طرف منسوب ہوگا ہم کہیں گے کہ یہ حکم منسوخ ہو گیا، تو ہماری طرف منسوب ہونے کے لحاظ پر مطلب یہ ہوگا کہ یہ حکم اٹھا لیا گیا ہے۔ اور رب تعالیٰ کی طرف جب منسوب ہوگا تو مطلب یہ ہوگا کہ اس حکم کی مدت ختم ہو چکی ہے جس مدت کے لئے اسے نافذ کیا گیا تھا۔ (از روح المعانی)

نسخ حکمت باری تعالیٰ کا ایک کرشمہ ہے:

اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی مصلحتوں کو جانتا ہے کہ کون سا حکم کس وقت تک مفید ہے اور کون سا حکم کس وقت نافذ کرنے کی ضرورت ہے۔ ہم اپنی ظاہری زندگی میں اس کا مشاہدہ کر رہے ہیں کہ حکیم اور ڈاکٹر حضرات مریض کی مرض کے مطابق دوا بدلتے رہتے ہیں اور ان کو مختلف اوقات میں مختلف غذائیں کھانے کے لئے مشورہ دیتے ہیں۔ جب اطباء حضرات کا دواؤں اور غذاؤں کو مریضوں کی حالت کے مطابق تبدیل کرتے رہنا حکمت کا تقاضا ہے تو یقیناً رب تعالیٰ جو قادر مطلق ہے اور حکیم مطلق ہے اس کے احکام بھی بندوں کی مصلحتوں کے مطابق ہوتے ہیں۔ حکمت کا یہی تقاضا ہے کہ ایک ضرورت تک ایک حکم نافذ کیا جائے پھر دوسرا۔

خصوصاً عرب لوگ جو کفر و شرک اور عیاشی اور گناہوں میں سرتاپا مبتلاء تھے ان کو راہ راست پر لانا اور ان سے بری رسموں کا چھڑانا یہ تقاضا کرتا تھا کہ ان کو آہستہ آہستہ، تدریجاً تدریجاً سیدھی راہ پر لایا جائے اسی حکمت کے پیش نظر رب تعالیٰ نے احکام کی مدت کی حدود مقرر فرمائیں۔ ان حدود کے آنے پر وہ احکام ختم فرما کر دوسرے احکام نافذ فرمائے۔ جن کو ہم نے سمجھا کہ یہ حکم اٹھا لیا گیا ہے۔

(از بیضاوی و روح المعانی)

قرآن پاک میں کوئی اختلاف نہیں:

یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہے کہ قرآن مجید میں کوئی اختلاف نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا ﴾

''یعنی اگر قرآن مجید غیر اللہ کا کلام ہوتا لوگ اس میں بہت اختلاف پاتے''

یعنی نظم کلام میں بہت تفاوت ہوتا۔ مضامین بھی متناقض (ایک دوسرے سے مختلف) ہوتے۔

کثرت الفاظ اور کثرت معانی کے لحاظ سے ''اختلافا کثیرا'' فرمایا گیا۔ جب کہ قرآن پاک کے نظم کلام اور اس کے معانی و مضامین میں ایک بھی اختلاف موجود نہیں جو صداقت قرآن کی روشن دلیل ہے۔ اگر کسی نے قرآن میں کہیں اختلاف سمجھا تو یہ اس کے اپنے فہم کی غلطی ہے۔ اللہ تعالیٰ

کا کلام تعارض، تناقض اور اختلاف سے پاک ہے۔ قرآن پاک میں نسخ ضرور پایا گیا۔ مگر اختلاف اور تناقض سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ مظہری میں ہے:

" واما الناسخ والمنسوخ فلیس من باب الاختلاف " (مظہری پ ۵ ج ۲ ص ۱۷۰)

یہود اور مشرکین نے بعض احکام شرع کے منسوخ ہونے پر مذاق اڑایا تھا۔ اور آج تک بعض ملحدین بھی یہ اعتراض کرتے ہیں کہ کسی حکم شرعی کے منسوخ ہونے کا قول اس لئے صحیح نہیں کہ اس سے لازم آتا ہے کہ شارع نے جو حکم پہلے دیا تھا وہ قابل عمل نہ تھا جسے منسوخ کرنا پڑا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ نسخ کا قول کسی حکم شرعی کے ناقص ہونے کو ہرگز مستلزم نہیں، نہ اس سے شارع کی لاعلمی ثابت ہوتی ہے۔ نسخ کے معنی پر غور کرنے سے یہ حقیقت واضح ہو کر سامنے آجاتی ہے کہ اہل حق جن احکامِ شرع کو منسوخ مانتے ہیں وہ اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ احکام منسوخہ ایک وقت خاص تک عمل کرنے کے لئے نازل ہوئے تھے۔ جب وہ مدت پوری ہوگئی تو شارع نے اس مدت عمل کی انتہاء اور اختتام کو بیان کر دیا۔ یہی نسخ ہے اور اس سے کسی حکم کا ناقص ہونا یا شارع کا لاعلم ہونا ثابت نہیں ہوتا، بلکہ اس سے شارع کے کمالِ علم وحکمت کا اثبات ہوتا ہے۔

(از التبیان للکاظمی)

نسخ کی بحیثیت حکم وتلاوت تین قسمیں:

(۱) " نسخ الحکم دون التلاوۃ " حکم منسوخ ہو جائے، تلاوت منسوخ نہ ہو، قرآن پاک میں یہی نسخ زیادہ مشہور ہے۔ اس صورت میں جو آیۃ منسوخ ہوگی وہ قرآن پاک میں موجود ہوگی۔ اور جو ناسخ ہوگی وہ بھی قرآن پاک میں موجود ہوگی۔ دونوں کی تلاوت ہوگی۔ فرق یہ ہوگا کہ منسوخ آیۃ کا حکم جاری نہیں ہوگا۔

جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿ وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا وَّصِيَّةً لِّاَزْوَاجِهِمْ مَّتَاعًا اِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ اِخْرَاجٍ ﴾

" اور جو تم میں مریں اور بیبیاں چھوڑ جائیں وہ اپنی عورتوں کے لئے وصیت کر جائیں سال بھر تک نان نفقہ دینے کی بے نکالے "

اس آیت کریمہ میں یہ حکم تھا کہ جن عورتوں کے خاوند فوت ہو جائیں ان کی عدت ایک سال ہے۔اوران کوایک سال تک نان نفقہ دیا جائے اور ایک سال تک ان کو گھر میں رہنے دیا جائے ان کو نکالا نہ جائے۔لیکن اس حکم کی انتہاء کا وقت جب آ گیا،تو دوسرا حکم نافذ فرما کر اسے منسوخ کر دیا۔رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿ وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا يَّتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّعَشْرًا ﴾

''اور تم میں جو مریں اور بیبیاں چھوڑیں وہ چار مہینے دس دن اپنے آپ کو روکے رکھیں''

یعنی جن عورتوں کے خاوند فوت ہو جائیں ان کی عدت ایک سال کو منسوخ کر کے چار مہینے دس دن کر دی گئی تا قیامت اب یہی جاری رہے گی۔

یہ دونوں آیتیں قرآن پاک میں پڑھی جا رہی ہیں۔لیکن جس آیۃ کو پہلے ذکر کیا ہے اس کا حکم منسوخ ہے۔

(۲) '' نسخ التلاوة دون الحكم '' تلاوت منسوخ ہو جائے،حکم باقی رہے،جیسا کہ آیۃ رجم:

" عن ابن عباس قال عمر بن الخطاب وهو جالس على منبر رسول الله ﷺ ان الله بعث محمدا ﷺ بالحق وانزل عليه الكتاب فكان مما انزل الله آية الرجم قرأناها ووعينا وعقلناها فرجم رسول الله ﷺ ورجمنا بعده فاخشى ان طال بالناس زمان ان يقول قائل ما نجد الرجم في كتاب الله تعالىٰ فيضلوا بترك فريضة انزلها الله وان الرجم في كتاب الله حق ......الخ " (مسلم ج ثانی باب حد الزنا)

'' حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں حضرت عمر بن خطاب ؓ نے منبر رسول اللہ ﷺ پر بیٹھ کر ارشاد فرمایا بیشک اللہ تعالیٰ نے محمد ﷺ کو حق سے مبعوث فرمایا اور آپ پر کتاب کو نازل فرمایا،اور اللہ تعالیٰ نے آپ پر آیۃ رجم (زانی کو سنگسار کرنا) کو نازل فرمایا،ہم نے اسے پڑھا،اور یاد کیا اور سمجھا۔رسول اللہ ﷺ نے رجم کرنے کا حکم نافذ فرمایا۔ہم نے آپ کے بعد رجم کا حکم جاری رکھا۔مجھے ڈر ہے کہ کچھ وقت جب گزر جائے گا تو کہنے والا کہے گا کہ ہم رجم کا ذکر اللہ کی کتاب (قرآن پاک) میں نہیں پاتے۔اللہ تعالیٰ نے جس آیۃ کو نازل کر کے ایک حکم کو فرض کیا اسے چھوڑنے کی

وجہ سے وہ گمراہ ہو جائیں گے اور دوسروں کو بھی گمراہ کریں گے۔ حالانکہ رجم کا حکم
کتاب اللہ میں حق طور پر ثابت ہے۔

آیۃ رجم " الشیخ والشیخۃ اذا زنیا فارجموھما البتۃ " تلاوت کے لحاظ پر منسوخ ہے۔ لیکن اس کا حکم باقی ہے۔ (سنگسار کرنے کے حکم کو توڑنے والے گمراہ ہیں۔)

" ھذا الذی خشیۃ قد وقع من الخوارج ومن وافقھم وھذا من کرامات عمر ویحتمل من ذلک من جھۃ النبی ﷺ " (نووی)

حضرت عمر کا یہ فرمانا کہ کچھ وقت گزرنے پر لوگ انکار کریں گے۔ خارجیوں نے اور ان کے یاروں نے اس کا انکار کیا۔ یہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی کرامت ہے جو واقع ہو چکی ہے۔ اور یہ بھی احتمال ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو نبی کریم ﷺ سے پتہ چلا ہو۔ تو اس صورت میں نبی کریم ﷺ کا علم غیب ثابت ہوگا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی کرامت اور کمال ثابت ہوگا۔

خیال رہے کہ ہمارے ملک پاکستان میں بھی یہود ونصاریٰ کے آلہ کار سرکاری اہم عہدوں پر قائم رہنے والے پڑھے لکھے بے وقوفوں نے ضیاء الحق کے دور حکومت میں رجم کا انکار کیا جس کا کیس عدالت میں چلتا رہا۔ سبحان اللہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول جگمگا رہا ہے۔ گمراہ لوگ آیۃ رجم کا انکار کر کے یہود ونصاریٰ کو خوش کر کے ان سے ڈالر بٹور رہے ہیں۔

(۳) " نسخ الحکم والتلاوۃ معا " حکم اور تلاوت دونوں کا منسوخ ہو جانا۔ جیسا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

> " کان فیما انزل من القرآن عشر رضعات معلومات یحرمن ، ثم نسخن بخمس معلومات " (رواہ مسلم)
>
> "کہ قرآن پاک میں نازل کیا گیا کہ دس مرتبہ کسی عورت کا دودھ پینے سے رضاعت ثابت ہوگی، جس سے حرمت ثابت ہوگی۔ پھر پانچ مرتبہ دودھ پینے کا حکم نازل کر کے دس مرتبہ والا حکم منسوخ کر دیا گیا"

یہاں یہ خیال رہے کہ دونوں آیتیں دس دفعہ دودھ پینے والی اور پانچ مرتبہ دودھ پینے والی منسوخ ہیں اور دونوں ہی حکم اور تلاوت کے لحاظ پر منسوخ ہیں۔ کیونکہ پانچ مرتبہ والی آیۃ ﴿وَاُمَّھَاتُکُمُ

الَّتِیْ اَرْضَعْنَکُمْ وَاَخَوَاتُکُمْ مِّنَ الرَّضَاعَةِ ﴾ سے منسوخ ہے۔ اس میں حکم مطلق ہے۔ لہٰذا اب قلیل دودھ پینے سے یا کثیر پینے سے ہر حالت میں رضاعت ثابت ہو جائے گی۔ (ماخوذ از شیخ زادہ)

نسخ بحیثیت ناسخ کے چار قسم ہے:

(۱) نسخ الکتاب بالکتاب..... قرآن پاک کی آیت کو قرآن پاک کی آیت سے منسوخ کیا گیا۔ قرآن پاک میں یہی نسخ باقی قسموں سے زیادہ پایا گیا ہے۔ پہلے دو آیتوں کا ذکر کیا گیا کہ جس میں فوت شدہ آدمی کی عورت کی عدت ایک سال وہ منسوخ ہے چار ماہ دس دن والی آیت سے۔ اس میں قرآن پاک کی آیۃ کو قرآن پاک کی آیۃ سے ہی منسوخ کیا گیا۔

اسی طرح قتال (جہاد) میں پہلے ایک مسلمان کو دس کافروں کے مقابل قائم رہنے کا حکم تھا، پھر اس میں تخفیف کر کے ایک کو دو کے مقابل قائم رہنے کا حکم دیا گیا۔ لہٰذا پہلا حکم ﴿ اِنْ یَّكُنْ مِّنْكُمْ عِشْرُوْنَ صٰبِرُوْنَ یَغْلِبُوْا مِائَتَیْنِ ﴾ اگر تم میں سے بیس صبر کرنے والے ہوں گے دو سو پر غالب ہوں گے۔ منسوخ کر دیا گیا۔ یعنی اس میں تخفیف کر کے یہ حکم نافذ فرمایا ﴿ فَاِنْ یَّكُنْ مِّائَةٌ صَابِرَةٌ یَّغْلِبُوْا مِائَتَیْنِ ﴾ اگر تم میں سے ایک سو صبر کرنے والے ہوئے، تو دو سو پر غالب آئیں گے۔

اس طرح الاتقان میں کئی آیات کو ذکر کیا گیا ہے، جو قرآن پاک کی دوسری آیات سے منسوخ ہیں۔

(۲) "نسخ الکتاب بالسنة" قرآن پاک کی کسی آیت کو حدیث پاک سے منسوخ کیا جائے۔ جیسا کہ رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے ﴿ لا یحل لک النساء من بعد ﴾ نبی کریم ﷺ کی زوجیت میں جب بیک وقت نو ازواج مطہرات تھیں تو حکم ہوا کہ اس کے بعد (یعنی نو ازواج کے بعد) آپ کے لئے عورتیں حلال نہیں۔

اس آیۃ کو حدیث پاک سے منسوخ کیا گیا ہے وہ حدیث حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے:

"ان النبی ﷺ اخبرها بان الله تعالیٰ اباح له من النساء ما شاء"

"بیشک نبی کریم ﷺ نے انہیں خبر دی کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے لئے جائز کر دیا کہ آپ جتنی عورتوں سے نکاح کرنا چاہیں کر سکتے ہیں"

خیال رہے کہ آپ کے لئے نکاح کرنے کی حد کو اٹھا دیا گیا تھا لیکن پھر بھی آپ نے بیک وقت نو عورتوں سے زائد کے ساتھ نکاح نہیں کیا۔

اعتراض: یہ حدیث خبر واحد ہے۔ خبر واحد سے قرآن پاک کی آیۃ کو منسوخ نہیں کیا جا سکتا۔ تو یہ مثال کیسے صحیح ہے؟

جواب: احادیث کی یہ اقسام ہمارے لحاظ سے ہیں۔ صحابہ کرام کے لحاظ سے نہیں۔

" فان هذا الخبر عنده ليس خبر الواحد بل هو سمع من فی رسول الله ﷺ"

''جس صحابی نے یہ روایت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے بیان کی انہوں نے خود بھی نبی کریم ﷺ کے منہ مبارک سے سنی اس لئے ان کے حق میں یہ خبر واحد نہیں''

(۳) **نسخ السنة بالكتاب**...... حدیث پاک منسوخ ہو قرآن پاک کے ذریعے۔ جیسا کہ بیت المقدس کا قبلہ ہونا حدیث پاک سے ثابت ہے۔ لیکن اس کا منسوخ ہونا قرآن پاک کی آیت ﴿ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ﴾ (مسجد حرام کی طرف اپنے چہرہ کو پھیر لیں) سے ثابت ہے۔

(۴) **نسخ السنة بالسنة**...... حدیث پاک منسوخ ہو حدیث پاک کے ذریعے۔ جیسا کہ ابن ماجہ نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ذکر کی:

" قال رسول الله ﷺ كنت نهيتكم عن زيارة القبور فزوروها فانها تزهد فی الدنيا وتذكر الآخرة "

''رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں نے تمہیں قبروں کی زیارت سے منع کیا تھا، (اب) تم قبروں کی زیارت کرو کیونکہ اس سے دنیا میں زہد حاصل ہوتا، اور آخرت کی یاد آتی ہے۔''

واضح ہوا کہ قبروں کی زیارت کی ممانعت والی حدیث منسوخ ہو گئی اور اجازت والی ناسخ ہو گی۔

(ماخوذ از الاتقان و نور الانوار مع قمر الاقمار)

وضاحت حدیث: نبی کریم ﷺ نے پہلے قبروں کی زیارت سے منع فرمایا تھا، کیونکہ زمانہ جاہلیت قریب تھا، لوگ بت پرستی کے عادی تھے، اس لئے منع کیا تا کہ لوگ قبر والوں کو معبود نہ سمجھ لیں، جب صحابہ کرام کے دلوں میں اسلام اور اسلامی طور طریقے راسخ ہو گئے تو آپ نے اجازت فرما دی۔

فائدہ : مرقاۃ شرح مشکوۃ باب زیارۃ القبور میں ہے:

" اذا تحیرتم فی الامور فاستعینوا باھل القبور "

"جب تمھیں کچھ معاملات میں حیرانی و پریشانی ہوتو قبر والوں سے امداد طلب کرو"

اسی طرح قبروں کی زیارت سے انسان کو آخرت کی یاد حاصل ہوتی ہے۔ وہ اس کی تیاری کرتا ہے، برائیوں کو چھوڑ دیتا ہے اور نیکیاں کرتا ہے، وہ کتنے بے نصیب ہیں جو قبرستان میں بھی فحش مزاح سے باز نہیں آتے۔

تنبیہ : عورتوں کے لئے بھی قبروں کی زیارت کرنا جائز ہے۔ عام طور پر ایک حدیث پاک بطور دلیل پیش کی جاتی ہے کہ عورتوں کی قبروں کی زیارت کرنے پر لعنت ہے۔ لیکن حدیث پاک کی مکمل وضاحت نہیں کی جاتی، جو خود محدثین کرام نے بیان کی ملاحظہ فرمائیں۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا

" لعن زوارات القبور " قبروں کی زیارت کرنے والی عورتوں پر لعنت ہے

(مسند احمد ، ترمذی ، ابن ماجہ ، مشکوۃ باب زیارۃ القبور)

ترمذی نے اس حدیث پاک کو حسن صحیح کہا ہے ، اور خود ہی حدیث پاک کی وضاحت ان الفاظ سے کی ہے۔

" قد رأی بعض اھل العلم ان ھذا کان قبل ان یرخص النبی ﷺ فی زیارۃ القبور فلما رخص دخل فی رخصتہ الرجال و النساء و قال بعضھم انما کرہ زیارۃ القبور للنساء لقلۃ صبرھن و لشدۃ جزعھن "

(مشکوۃ باب زیارۃ القبور)

امام ترمذی نے کہا کہ بعض اہل علم نے کہا ہے کہ اس حدیث پاک کے متعلق وضاحت یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے قبروں کی جو رخصت فرمائی ہے، یہ حدیث اس سے پہلے کی ہے۔ کیونکہ پہلے مردوں کو منع کیا گیا تھا اور عورتوں کو بھی منع کیا گیا تھا۔ جب اجازت فرمائی تو مردوں اور عورتوں تمام کے لئے ہی اجازت فرمائی۔ اور بعض حضرات نے فرمایا کہ اگر عورتیں صبر نہ کریں اور قبروں پر جا کر زور زور سے رونا، پیٹنا، جزع و فزع کرنا شروع کر دیں تو ایسی حالت میں ان کا قبروں پر جانا منع ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا قبروں کی زیارت کرنا ان کی زبان سے ہی سنیے۔ آپ فرماتی ہیں۔

" کنت ادخل بیتی الذی فیه رسول الله ﷺ وانی واضع وجهی واقول انما هو زوجی وابی فلما دفن عمر معهم فوالله ما دخلته الا وانا مشدودة علی ثیابی حیاء من عمر " (مسند احمد، مشکوۃ باب زیارۃ القبور)

" میں اس حجرہ میں داخل ہوتی جس میں رسول اللہ ﷺ مدفون ہیں تو میں پردے کا زیادہ اہتمام نہ کرتی، کیونکہ میرے خیال میں آتا کہ ایک میرے خاوند ہیں اور دوسرے میرے باپ (ابوبکر صدیق) ہیں۔ لیکن جب حضرت عمر بھی اسی حجرہ میں ان کے ساتھ دفن ہوگئے تو میں نے حضرت عمر سے حیاء کرتے ہوئے پہلے سے زیادہ پردہ کا اہتمام شروع کردیا"

اس حدیث پاک کی شرح بیان کرتے ہوئے حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔

" قولها حیاء من عمر اوضح دلیل علی حیوة المیت وعلی انه ینبغی احترام المیت عند زیارته مهما امکن لاسیما الصالحون بان یکون فی غایته الحیاء والتأدب بظاهره وباطنه فان للصالحین مددا ظاهرا بالغا لزوارهم بحسب ادبهم ونیتهم وقبولهم " (لمعات حاشیہ مشکوۃ)

" حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا ارشاد " حیاء من عمر " میت کی حیات پر بڑی واضح دلیل ہے، اور یہ ثابت ہو رہا ہے کہ قبر کی زیارت کے وقت جتنا ممکن ہو سکے صاحب قبر کا اہتمام کیا جائے خصوصاً نیک لوگوں کی قبروں پر جا کر نہایت حیاء کرتے ہوئے ظاہری اور باطنی ادب کا پاس کرے، کیونکہ زیارت کرنے والے جتنا زیادہ ادب کریں گے اور خالص نیت رکھیں گے اور نیک لوگوں کی امداد کو قبول کریں گے اتنی ہی زیادہ ان کی طرف سے ان لوگوں کو کامل امداد حاصل ہوگی"۔

اسی حدیث کی وضاحت میں استاذی المکرم حضرت علامہ مولانا محمد اشرف سیالوی مدظلہ العالی نے جلاء الصدور میں ایک سوال و جواب ذکر فرمایا۔ جو بہت ہی زیادہ مفید ہے۔ اور نبی کریم ﷺ کے حاضر و ناظر ہونے پر بھی عام حلقوں کی جانب سے یہی سوال کیا جاتا ہے۔ جواب سے انشاء اللہ مزاج میں انصاف رکھنے والوں کو اطمینان قلب حاصل ہوگا۔

سوال: جن کی نگاہ کئی من مٹی کے اندر سے باہر دیکھ سکتی ہے، کیا وہ حجاب وستر کے اندر نہیں

دیکھ سکتی، پھر اس اہتمام کا مقصد کیا ہوگا (یعنی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دفن کے بعد پردے کا جو اہتمام کیا اس خیال سے کہ وہ مجھے قبر کے اندر سے مٹی کے ڈھیر کے نیچے سے بھی دیکھ رہے ہیں۔ جو اتنی نظر رکھتا ہو اس کی نگاہ میں کپڑے کے پردے کی کیا حیثیت ہوگی)؟

جواب: جتنی قدر بندے کی طاقت میں ہے اس قدر پر اہتمام وانتظام بھی لازم ہے۔ اور شیخ نے "مهما امکن" (جتنا ممکن ہو) سے اس کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ مثلاً خلوت اور تنہائی میں بھی بندہ پر لازم ہے کہ وہ اپنی شرمگاہ کو ڈھانپے۔ انسانوں وغیرہ سے نہ سہی، اللہ رب العزت سے حیاء کرتے ہوئے اس پر ستر (پردہ) لازم ہے۔ لہٰذا جو جواب اللہ علیم وخبیر کی نسبت سے یہاں دیا جائے گا وہی جواب اہل قبور کی طرف سے بھی سمجھ لیا جائے۔ حدیث پاک ملاحظہ ہو۔

"وعن يعلى قال ان رسول الله ﷺ رأى رجلا يغتسل بالبراز فصعد المنبر فحمد الله واثنى عليه ثم قال ان الله حيى ستير يحب الحياء والستر فاذا اغتسل احدكم فليستتر" (رواه ابوداؤ و نسائی)

"حضرت یعلی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک آدمی کو کھلی جگہ میں بغیر پردہ کے غسل کرتے دیکھا تو آپ منبر پر جلوہ افروز ہوئے اور اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا کے بعد فرمایا "بیشک اللہ تعالیٰ شرمیلا، پردہ پوش، حیاء اور پردہ کو پسند کرنے والا ہے۔ لہٰذا تم میں سے کوئی شخص جب بھی غسل کرے تو ستر اور پردہ کے اندر کرے"

ملا علی قاری حنفی نے ابن حجر رحمہما اللہ سے نقل کرتے ہوئے فرمایا:

"من ثم قال ائمتنا يحرم كشف العورة فى الخلوة بغير الحاجة لان فيه ترك الحياء من الله تعالىٰ"

"اسی وجہ سے ہمارے ائمہ کرام نے فرمایا کہ تنہائی اور علیحدگی میں بھی بلاوجہ ستر وحجاب کا ترک حرام ہے۔ کیونکہ اس میں بارگاہ خداوندی کے لائق شرم وحیاء کو ترک کرنا لازم آتا ہے"

ائمہ کرام کے اس قول پر سوال وارد ہوا کہ جب اللہ تعالیٰ ظاہر اور چھپی ہوئی ہر چیز کو جانتا ہے تو اس سے پردہ کرنا اور لباس پہن کر ہی نماز ادا کرنا خلوت میں کیوں ضروری، اس کا مقصد کیا ہے؟

اس کا جواب یوں دیا گیا:

"ورده بانه تعالىٰ وانه احاطه علمه بهما الا انه يرى المستور على

حالة تقتضی الادب وشتان ما بینهما " (مرقاۃ المفاتیح)

ائمہ کرام نے اس سوال کو یوں رد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا علم اگر چہ مستور و غیر مستور دونوں کو محیط ہے لیکن شرم و حیاء والے مستور کو ایسی حالت میں دیکھتا ہے جس کا ادب تقاضا کرتا ہے بخلاف غیر مستور کے اور دونوں کے دیکھنے میں بڑا فرق ہے۔

لہٰذا جس طرح علم باری تعالیٰ کے محیط ہونے کے باوجود ستر کا حکم دیا گیا ہے اور شرم و حیاء والی حالت کو اختیار کرنا لازم کیا گیا ہے۔ اسی طرح ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ نے بھی ادب اور شرم و حیاء والی ہیئت کو اختیار فرمایا اور جس طرح اللہ تعالیٰ مستور کے ساتھ تقاضاء ادب کے مطابق سلوک فرماتا ہے، یہی حالت اہل قبور کو بھی سمجھنی چاہئے۔

نیز اللہ تعالیٰ اپنی حیاء (جو اس کی شان کے لائق ہے) کے مطابق کسی کے مخفی اندام کی طرف توجہ نہ فرمائے باوجود "علیم وخبیر وبصیر" ہونے کے اور اسی طرح اپنے مقبول بندے انبیاء کرام، اولیاء عظام کو علم اور نظر عطا فرمانے کے باوجود ان کی توجہ کو اس جانب سے ہٹالے تو کوئی بعید نہیں۔

نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں "انی اراکم من خلفی کما اراکم من بین یدی" (اپنی صفوں کو درست کر کے ایک دوسرے سے مل کر کھڑے ہوا کرو) میں تمہیں پیٹھ کے پیچھے سے اسی طرح دیکھتا ہوں، جس طرح سامنے سے دیکھتا ہوں۔ جب نبی کریم ﷺ پر سامنے اور پیچھے کے حالات ایک جیسے ظاہر ہیں تو یقیناً آپ پر کوئی چیز مخفی تو نہیں، لیکن پھر بھی ادب کا تقاضا یہی ہے کہ لباس پہن کر نماز ادا کی جائے، انسان اپنی طرف سے جتنا ممکن ہو پردہ رکھے۔ اور اسی طرح نبی کریم ﷺ علم و بصارت کے باوجود کسی طرف توجہ نہ فرمائیں جو آپ کی شان کے لائق نہیں تو کوئی بعید نہیں۔ (انتہی)

نسخ الکتاب بالسنة میں امام شافعی رحمہ اللہ کا موقف:

امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں، قرآن پاک کی کسی آیۃ کو منسوخ نہیں کیا جا سکتا۔ وہ اپنے اس موقف کو دلائل سے پیش کرتے ہیں۔ ان کے دلائل اور جوابات پر نظر کریں۔

امام شافعی رحمہ اللہ کی ایک دلیل یہ ہے کہ رب تعالیٰ کا ارشاد یہ ہے ﴿ نَأْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَا أَوْ مِثْلِهَا ﴾

ہم اس سے بہتر یا اس کی مثل لے آتے ہیں۔ یعنی جو آیۃ منسوخ ہو ناسخ اس سے بہتر ہو، یا اس کی مثل ہو۔ حدیث پاک کو ناسخ نہیں مانا جا سکتا کیونکہ حدیث میں الفاظ نبی کریم ﷺ کے ہوتے ہیں۔

اسی طرح بعض لوگوں کا موقف یہ ہے کہ ناسخ میں آسانی ہو، مشکل نہ ہو، اگر نسخ آسان کی مشکل کے ذریعے ہو جائے تو ناسخ منسوخ سے خیر یا مثل نہیں ہوگا۔

امام شافعی رحمہ اللہ کی پہلی دلیل اور تیسرے درجہ میں بعض لوگوں کا موقف جو بیان کیا ہے کہ ناسخ مشکل نہ ہو منسوخ سے۔ ان کا جواب یہ ہے کہ ہم یہ تسلیم نہیں کرتے کہ ناسخ منسوخ سے مشکل نہیں ہو سکتا، کیونکہ احکام کی مشروعیت اور آیات کا نزول بندوں کی مصلحت اور ان کے نفوس کی تکمیل کے لئے ہے جو صرف اللہ تعالیٰ کے فضل اور اس کی رحمت پر مبنی ہے۔ یہ مصلحت زمانے کے اختلاف سے مختلف ہو گی۔ اور بعض لوگوں کے مطابق ایک چیز بہتر ہوتی ہے، اور بعض کے لحاظ پر دوسری چیز بہتر ہوتی ہے۔

جس طرح معالج ایک دواء ایک شخص کے لئے تجویز کرتا ہے اسے وہ نفع دیتی ہے، لیکن دوسرے شخص کو وہی دواء اسی بیماری کے لئے نفع نہیں دیتی کیونکہ مزاج مختلف ہیں۔

اسی طرح کبھی دوسری دواء پہلی سے زیادہ کڑوی ہو گی اور پہلی سے زیادہ مہنگی ہو گی، لیکن مفید زیادہ ہو گی۔ اسی سے یہ واضح ہوا:

"قد یکون الاثقل اصلح فی انتظام المعاش و انظم فی اصلاح المعاد واللہ تعالیٰ لطیف حکیم"

کہ کبھی مشکل کام دنیا کی زندگی کی گزران کے انتظام کے لئے زیادہ مفید ہوتا ہے۔ اور اخروی زندگی کی بہتری کے لئے بھی مشکل کام ہی کبھی زیادہ نفع مند ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ لطیف و حکیم ہے، وہ اپنے بندوں کی مصلحتوں کو جانتا ہے۔ ان مصلحتوں کے مطابق ہی حکم نافذ فرماتا ہے۔ اسی بحث سے امام شافعی رحمہ اللہ کی پہلی دلیل کا جواب بھی آ گیا کہ بہتر ہونا ظاہری طور پر مراد نہیں۔ بلکہ بہتر ہونے یا مثل ہونے سے مراد نفع دینے میں بہتر ہو یا مثل ہو۔ حدیث پاک سے اگر آیۃ کو منسوخ کر دیا گیا ہو گا تو وہ بھی نفع میں بہتر یا مثل ہو گا۔

البتہ یہ کہنا کہ قرآن پاک تو اللہ تعالیٰ کا کلام ہے قدیم ہے۔ حدیث پاک حادث ہے۔

قرآن پاک کی نماز میں تلاوت ہوتی ہے۔اور حدیث پاک کی نہیں ہوتی۔قرآن پاک کو جبرائیل نے رب تعالیٰ کی طرف سے وحی کی صورت میں پیش کیا، حدیث پاک کو یہ حیثیت حاصل نہیں، لہٰذا حدیث قرآن پاک کے نہ مثل ہے اور نہ بہتر ہے۔تو اس کا جواب یہ ہے:

" وليس المراد بالخيرية والمماثلة في اللفظ حتى لا تكون السنة كذلک بل في النفع والثواب فيجوز ان يكون ما اشتملت عليه السنة خيرا في ذلک "

کہ بہتر ہونے یا مثل ہونے سے مراد لفظ میں بہتری یا مثلیت مراد نہیں کہ حدیث پاک کے الفاظ سے بہتر اور مثل نہیں، بلکہ بہتر یا مثل ہونے کا مقصد نفع اور ثواب میں بہتر یا مثل ہونا ہے۔اس لحاظ پر حدیث پاک میں حکم زیادہ نفع مند یا اس جیسا ہوسکتا ہے۔

امام شافعی رحمہ اللہ کی دوسری دلیل کہ رب تعالیٰ نے " نأت " کو اپنی طرف منسوب کیا کہ ہم اس سے بہتر یا اس کی مثل لاتے ہیں حدیث پاک تو نبی کریم ﷺ کی طرف منسوب ہے۔

اس کا جواب بھی پہلے جواب سے ہی سمجھ آ گیا کہ نسخ میں الفاظ مراد ہی نہیں بلکہ مضمون مراد ہے۔مضمون نبی کریم ﷺ کی احادیث مبارکہ میں بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے پیش کیا جاتا ہے۔ رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی اس میں بہت واضح ہے:

﴿ وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ﴾

"نبی کریم ﷺ اپنی خواہش سے کوئی بات نہیں کرتے بلکہ وہی کرتے ہیں جو آپ کی طرف وحی کی جاتی ہے"

اس سے واضح ہوا کہ احادیث مبارکہ کے مضامین رب تعالیٰ کی طرف ہی منسوب ہیں، اگرچہ الفاظ نبی کریم ﷺ کے ہوتے ہیں۔لیکن الفاظ جب مقصود ہی نہیں تو حدیث پاک کو ناسخ ماننا " نأت " کے منافی نہیں۔ (ماخوذ از روح المعانی)

اَوْ نُنْسِهَا: اس میں مشہور قراءت نون کے ضمہ اور سین کے کسرہ سے ہے۔جس کا ماخذ انساء یا نسیان ہے۔جس کا معنی ہے بھلانا، یعنی ہم ان آیات کو لوگوں کے دلوں سے ہی بھلا دیتے ہیں۔کہ وہ ان کے پڑھنے پر قادر ہی نہیں رہتے۔جیسا کہ حدیث پاک سے یہ مضمون زیادہ واضح ہو جاتا ہے۔

ابن شہاب کہتے ہیں مجھے ابوامامہ بن سہل بن حنیف نے سعید بن میسب (رضی اللہ عنہ) کی مجلس میں حدیث بیان کی:

" ان رجلا قام من الليل ليقرأ سورة من القرآن فلم يقدر على شئ منها وقام آخر فلم يقدر على شئ منها ، وقام آخر فلم يقدر على شئ منها، فغدوا على رسول الله ﷺ فقال احدهم قمت الليلة يا رسول الله لأقرأ سورة من القرآن فلم اقدر على شئ منها فقام الآخر فقال وانا والله كذلك يا رسول الله ، فقام الآخر فقال وانا والله كذلك يا رسول الله فقال رسول الله ﷺ انها مما نسخ الله البارحة " (قرطبی وهكذا في ابن كثير)

ایک شخص نے رات کو کھڑے ہوئے ایک سورۃ پڑھنی چاہی وہ اس کے پڑھنے پر قادر نہ ہو سکے، دوسرے صحابی سے بھی یہی صورت درپیش آئی اور تیسرے سے بھی ایسا ہی ہوا۔ صبح نبی کریم ﷺ کی خدمت میں ایک شخص نے عرض کیا یارسول اللہ آج رات کو میں فلاں سورۃ پڑھنا چاہتا تھا لیکن نہ پڑھ سکا۔ مجھے اس کے پڑھنے کی قدرت ہی حاصل نہ ہوسکی۔ ایک اور صحابی نے عرض کیا یارسول اللہ قسم ہے اللہ کی میرے ساتھ بھی یہی صورت درپیش آئی۔ اور ایک تیسرے شخص نے کہا اللہ کی قسم یا رسول اللہ مجھے بھی اسی کیفیت کا سامنا کرنا پڑا۔ حضور نے فرمایا وہ سورۃ گزشتہ رات منسوخ ہوگئی۔

اور ایک قراءت میں " ننسأها " نون اور سین کے فتح اور اس کے بعد ہمزہ سے پڑھا ہے۔ جس کا معنی ہے تاخیر کرنا اب معنی یہ ہوگا کہ ہم اسے لوح محفوظ میں یا ملائکہ کے پاس ہی چھوڑ دیتے ہیں۔ اسے کچھ دیر سے نازل کرتے ہیں۔ اس کا ایک مفہوم یہ بھی ہے کہ ہم کسی آیۃ کو مجمل ذکر کرتے ہیں۔ جب ضرورت درپیش آتی ہے تو ہم اسے بیان کر دیتے ہیں " ثم ان علينا بيانه " اسی مفہوم کو واضح کر رہا ہے۔

" اوننسأها اى نؤخر انزالها الى وقت ثان فنأت بدلا منها في الوقت المتقدم ما يقوم مقامها "

یعنی " ننسأها " کی قراءت میں معنی یہ ہوگا کہ کسی آیت کا نزول ہم کچھ وقت تک مؤخر کر دیتے ہیں۔ پھر اس پہلے وقت کے بدل دوسرے وقت میں ہم اسے لے آتے ہیں...... (از شیخ زادہ)

نَأْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَا اَوْ مِثْلِهَا:

ہم لے آتے ہیں اس سے بہتر یا اس کی مثل اس کا مطلب یہ ہے:

" بما هو خير للعباد فی النفع والثواب او مثلها فی الثواب "

کہ ہم منسوخ آیت کے بدل وہ ناسخ لے آتے ہیں جو بندوں کے نفع اور ثواب میں ان کے لئے بہتر ہو یا ثواب میں اس کی مثل ہو۔

علامہ بیضاوی رحمہ اللہ کی اس تفسیر سے ایک اور مسئلہ واضح ہو گیا کہ آیات کی فضیلت بعض کی بعض پر بحسب الذات اور بحسب الالفاظ نہیں، کیونکہ تمام آیات اللہ تعالیٰ کا کلام ہیں:

" فلا يتفاضل بعضها على بعض فی انفسها من حيث انها كلام الله ووحيه وكتابه بل التفاضل فيها انما هو بحسب ما يحصل منها للعباد فی الآخرة او فی الدنيا او فيهما "

اور اللہ تعالیٰ کے کلام میں بعض آیات بعض سے افضل بحیثیت اللہ کا کلام ہونے کے، بحیثیت وحی کے اور بحیثیت کتاب اللہ ہونے کے تو نہیں ہو سکتیں۔ البتہ بندوں کے لئے آخرت میں نفع مند ہونے کے لحاظ سے یا دنیا میں نفع مند ہونے کے لحاظ سے یا دنیا اور آخرت میں نفع مند ہونے کے لحاظ سے فضیلت حاصل ہو سکتی ہے۔

بحیثیت نفع مند ہونے کے نسخ کی تین قسمیں:

(۱) ناسخ بنسبت منسوخ کے خفیف ہو جس کا دنیا میں فائدہ ہو۔ جیسا کہ فوت شدہ شخص کی زوجہ کی عدت ایک سال سے کم کر کے چار ماہ دس دن کر دی گئی۔ جو دنیا میں نفع مند ہے۔ کیونکہ ایک سال عدت گزارنا مشکل تھا اور چارہ ماہ دس دن آسان ہے۔

اسی طرح رات کے قیام کی تہجد تک فرضیت کو منسوخ کر دینے سے مشکل کو آسان کر دیا گیا۔ جس کا دنیا میں نفع ہوا۔

(۲) جو آخرت میں نفع مند ہو اگر چہ دنیا میں وہ زیادہ مشکل نظر آئے۔ جیسا کہ پہلے قتال سے دور

رہنا اور درگزر کرنا اور معاف کرنا ضروری تھا، پھر قتال کا حکم فرض کیا جو بظاہر دنیا کے لحاظ سے مشکل ہے، لیکن اجر و ثواب اور اخروی نفع کے لحاظ سے پر پہلے حکم سے بڑھ کر ہے۔

اسی طرح زناء کی حد پہلے زبان سے سرزنش کرنا۔ پھر ایک سال تک ان کو گھروں میں بند رکھنے کا حکم تھا، پھر اسے منسوخ کر کے سو کوڑے لگانے یا سنگسار کرنے کا حکم نافذ کر دیا۔ جو بظاہر مشکل ہے۔ لیکن نظام کو درست رکھنے اور لوگوں کو غلط کاری سے روکنے کے لئے زیادہ نفع مند ہے۔ جس میں اخروی ثواب بھی زیادہ ہے۔

اسی طرح پہلے عاشورہ کا روزہ فرض ہوا، پھر ایام بیض (چاند کی تیرہ، چودہ اور پندرہ تاریخوں) کے روزے فرض ہوئے، پھر رمضان کا مکمل مہینہ روزے فرض کر دیئے گئے، جو بظاہر مشکل حکم ہے، لیکن آخرت میں زیادہ نفع مند ہے، کیونکہ اس میں اجر و ثواب زیادہ ہے۔

(۳) ناسخ اور منسوخ بظاہر برابر ہوں۔ نہ ایک میں مشقت زیادہ ہو اور نہ دوسرے میں۔ بلکہ تخفیف اور مشقت کے لحاظ پر برابر ہوں۔ جیسا کہ بیت المقدس کا قبلہ ہونا منسوخ کر دیا اور کعبہ شریف کے قبلہ ہونے کا حکم نافذ کر دیا گیا۔ مشقت اور تخفیف کے لحاظ پر دونوں برابر ہیں

تاہم راقم کو یہ بات بھی واضح نظر آتی ہے کہ اگرچہ مشقت اور تخفیف کے لحاظ سے دونوں میں مثلیت ہے، لیکن رب تعالیٰ کا منسوخ کرنا جب مصلحت کی وجہ سے ہو تو اس لحاظ سے ناسخ مثل ہونے کے باوجود بھی خیر ہے۔ ابھی جو تین قسمیں بیان کی ہیں ان کو علامہ قرطبی رحمہ اللہ کی تفسیر کے خوبصورت الفاظ میں طلباء کرام دیکھیں:

" والمعنى نات بما هو انفع لكم ايها الناس في عاجل ان كانت الناسخة اخف وفي آجل ان كانت اثقل ومثلها ان كانت مستوية "

(ماخوذ از شیخ زادہ و قرطبی)

علامہ رازی نے بیان فرمایا:

(نأت بخير منها او مثلها) فيه قولان احدهما انه الاخف والثاني انه الاصلح لحق كان بها والثاني اولى لانه تعالىٰ يصرف المكلف عن مصالحه لا على ما هو اخف لطباعه "

''خیر لانے کا ایک مطلب بعض حضرات نے بیان کیا کہ ناسخ خفیف ہونا چاہئے لیکن محققین کا قول یہ ہے کہ ناسخ بندوں کے لئے نفع مند ہونا چاہئے، یہی قول زیادہ بہتر تحقیق پر مبنی ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ بندوں کو مصلحت پر مبنی حکم دیتا ہے، صرف تخفیف والا حکم دینا مقصود نہیں ہوتا''

اس پر بظاہر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ اگر دوسرا حکم اصلح (زیادہ صلاحیت پر مبنی) ہے۔ تو پہلا حکم غیر اصلح ہوگا۔ تو رب تعالیٰ نے اس کا حکم پہلے کیوں دیا تھا جب کہ رب تعالیٰ بندوں کی مصالح کا لحاظ کرتا ہے۔ تو اس کا جواب یہ ہے۔

'' الاول کان اصلح من الثانی بالنسبة الی الوقت الاول والثانی علی عکس الاول ''

پہلا حکم بھی بہتر تھا لیکن اس کی ایک خاص مدت تھی۔ جب اس کی مدت ختم ہوگئی تو اب دوسرے کی بہتری کا وقت شروع ہوگیا۔ یعنی رب تعالیٰ کا کوئی حکم بھی ایسا نہیں کہ اسے کہا جائے '' یہ بہتر نہیں '' البتہ وقت گزرنے پر جب وہ حکم ہی ختم ہو جائے تو اب یہ کہا جا سکے گا کہ اس پر عمل کرنا اب بہتر نہیں۔ بلکہ دوسرے حکم پر عمل کرنا بہتر ہے۔ (از شیخ زادہ)

﴿ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴾

''کیا تمھیں معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے''

خطاب اگرچہ بظاہر نبی کریم ﷺ کو ہے، لیکن مراد اس سے ہر مخاطب ہے، اور ہمزہ استفہام تقریری کے لئے ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ اے سننے والے کیا تمہیں علم نہیں، یعنی تمہیں علم تو حاصل ہے کہ بیشک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔ تو اس پر یقین رکھو کہ وہ نسخ پر بھی قادر ہے۔ اور پہلی آیت سے نفع کے لحاظ پر بہتر لانے پر بھی قادر ہے۔ اور پہلی آیت کی مثل نفع والا حکم لانے پر بھی قادر ہے۔ (از بیضاوی)

یعنی جب تم اللہ تعالیٰ کی قدرت کو جانتے ہو تو ناسخ ومنسوخ کو نہ تسلیم کرنا تمہاری ضد اور ہٹ دھرمی پر دلالت کرے گا۔

آیۃ کریمہ سے حاصل ہوا کہ نسخ عقلاً اور نقلاً جائز ہے۔ بلکہ نقلی دلائل یعنی قرآن وحدیث سے

ثابت ہے کہ نسخ واقع ہوا ہے۔ لیکن یہود کہتے ہیں کہ نسخ عقلاً جائز نہیں۔ اور نقلاً بھی جائز نہیں۔ بعض یہود نے کہا کہ عقلاً تو جائز نقلاً ثابت نہیں۔ مسلمانوں کا نسخ کے جواز پر اجماع...... صرف ابومسلم اصفہانی اور معتزلہ نے جواز کا انکار کیا ہے۔

تنبیہ : عقلاً جواز کا یہ مطلب ہے کہ نسخ کے جواز کو عقل تسلیم کرتی ہے۔ یہ مطلب نہیں کہ نسخ قیاس سے جائز ہے۔ قیاس سے کسی آیۃ اور حدیث کو منسوخ نہیں کیا جا سکتا۔

اور یہ بھی خیال رہے کہ نسخ کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ ناسخ اور منسوخ کے متعلق یہ بھی علم ہو کہ پہلی آیت نزول کے لحاظ پر کون سی ہے اور دوسری کون سی۔ اسی طرح نبی کریم ﷺ کا پہلا ارشاد یا فعل کون سا اور بعد والا کون سا ہے کیونکہ مؤخر مقدم کا ناسخ ہو سکتا ہے۔ مقدم مؤخر کا ناسخ نہیں ہو سکتا۔

منکرین نسخ کے دلائل :

(۱) اس آیۃ میں ''ما ننسخ من آیة'' سے مراد قرآن پاک کی آیتیں نہیں، بلکہ پہلی آسمانی کتب کے احکام کی منسوخی ہے۔ جیسا کہ ہفتہ کے دن کی تعظیم کو منسوخ کر دیا گیا۔

اسی طرح مشرق اور مغرب کی طرف منہ کر کے نماز ادا کرنے کو منسوخ کر دیا۔ چونکہ یہود و نصاریٰ کہتے تھے '' ولا تؤمنوا الا لمن تبع دینکم '' تم ایمان نہ لاؤ سوائے اس کے جو تمہارے دین کی تابعداری کرے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے اس قول کو رد کرنے کے لئے اس آیۃ کریمہ کو نازل کیا۔

ان کی اس دلیل کا جواب یہ ہے کہ ''آیات'' کو جب مطلق ذکر کیا جائے تو اس سے مراد قرآن پاک کی آیات ہی ہوتی ہیں۔ پہلی شریعتوں کا منسوخ ہونا احادیث صحیحہ سے بہت واضح طور پر ثابت ہے۔

(۲) ان کی اور دلیل یہ ہے کہ اس آیۃ میں نسخ کا معنی نقل کرنا ہے۔ جس کا مطلب ہے قرآن پاک کی آیات کو لوح محفوظ سے نقل کرنا۔

ان کی اس دلیل کا جواب یہ ہے کہ قرآن پاک تو تمام ہی لوح محفوظ سے نقل کیا گیا ہے۔ اس آیۃ کریمہ میں تمام قرآن پاک کی منسوخیت کا ذکر نہیں بلکہ بعض آیات کے منسوخ کرنے کا ذکر ہے۔ لہٰذا لوح محفوظ سے منتقل کرنے والا معنی مراد لینا صحیح نہیں۔ اور وجہ یہ بھی واضح رہے کہ اگر لوح محفوظ سے منتقل کرنے کا

معنی لیا جائے تو بعد والے الفاظ مبارکہ ﴿ نَأْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَا اَوْ مِثْلِهَا ﴾ کا مفہوم باقی نہیں رہتا۔

(۳) ان کی اور دلیل یہ ہے کہ اس آیۃ کریمہ میں نسخ کا وقوع ذکر نہیں بلکہ امکان ذکر ہے، اس کا مطلب درحقیقت یہ ہے "لو وقع النسخ لوقع الی خیر منه" اگر نسخ واقع ہوتا تو ہم اس سے بہتر یا اس کی مثل لے آتے یعنی نسخ واقع ہی نہیں ہوا کہ ہم اس سے بہتر یا اس کی مثل لاتے

اس کا جواب یہ ہے کہ اس آیۃ کریمہ میں لفظ "ما" ذکر ہے جس کے موصولہ ہونے کا بھی احتمال پایا گیا ہے۔ اس کے شرطیہ ہونے کو یقینی نہیں کہا جا سکتا۔ اگر کہا بھی جائے تو یہ کہا جائے گا کہ یہ شرط کے معنی کو متضمن ہے اس لئے "ما" کی جگہ "لو" ذکر کر کے وقوع کی نفی کرنا باطل ہے۔ کیونکہ "لو" عین شرط پر دلالت کرتا ہے اور "ما" شرط کے معنی کو متضمن ہے۔ کہاں عین شرط اور کہاں معنی شرط کو متضمن ہونا "فیهما بون بعید"

(۴) رب تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ﴾

''بیشک ہم نے قرآن نازل کیا، اور بیشک ہم ہی اس کے محافظ ہیں''

اور ارشاد فرمایا ﴿ سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰى ﴾ ''ہم آپ کو پڑھائیں گے آپ بھولیں گے نہیں''

ان آیات کے بعد ﴿ اَوْ نُنْسِهَا ﴾ یا ہم بھلا دیں گے کا کیا مطلب ہوگا؟ پتہ چلا نسخ کا وقوع درست نہیں۔ ان کی اس دلیل کا جواب یہ ہے کہ پہلی آیت جو تم نے پیش کی ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی اپنی طرف سے قرآن پاک میں تحریف نہیں کر سکے گا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ رب تعالیٰ خود بھی منسوخ نہیں فرمائے گا۔

دوسری آیۃ جو تم نے پیش کی اس میں آگے "الا ما شاء الله" مستثنیٰ بھی موجود ہے۔ جو واضح طور پر دلالت کر رہا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ تمہارے دلوں سے کسی چیز کو بھلانا چاہے تو بھلا دے گا۔ پھر صحابہ کرام کے بھول جانے سے یہ بھی لازم نہیں کہ نبی کریم ﷺ سے بھی ان آیات کو بھلا دیا گیا ہو۔ ہوسکتا ہے آپ کو یاد رہی ہوں آپ نے پڑھی نہ ہوں۔

(۵) اور ان کی دلیل یہ ہے کہ رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿ مَا يُبَدَّلُ الْقَوْلُ لَدَيَّ ﴾ میرے ہاں بات

بدلتی نہیں ۔ اس آیۃ کریمہ سے پتہ چلا کہ نسخ نہیں ہوسکتا ۔ کیونکہ نسخ میں تبدیلی ہے اور رب تعالیٰ نے اپنے قول میں تبدیلی کی نفی فرمائی ۔ ان کی اس دلیل کا جواب یہ ہے کہ یہ حکم قیامت میں ہوگا جب گمراہ لوگ کہیں گے کہ ہمیں تو شیطان نے ورغلایا تھا ۔ تو رب تعالیٰ فرمائے گا کہ میرے پاس جھگڑا نہ کرو میں تمہیں پہلے ہی عذاب کا ڈر بتا چکا تھا ۔ اب میرا حکم بدلتا نہیں بلکہ کافروں کو عذاب ہو کر رہے گا۔

اس آیۃ کریمہ میں نسخ کی تبدیلی کی نفی کا کوئی ذکر نہیں ۔ بلکہ دوسری آیات میں نسخ اور تبدیلی کا واضح طور پر ذکر ہے:

﴿ وَاِذَا بَدَّلْنَآ اٰيَةً مَّكَانَ اٰيَةٍ ﴾ اور جب ہم ایک کے بدلے دوسرے آیت کو لے آتے ہیں۔

﴿ يَمْحُوا اللّٰهُ مَا يَشَآءُ وَيُثْبِتُ ﴾ اللہ تعالیٰ جسے چاہے مٹادے، جسے چاہے ثابت رکھے۔

ان آیات سے منسوخ ہونا واضح ہو چکا ہے ۔ خیال رہے کہ ہر آیت کی وضاحت اسی کے محل میں ان شاء اللہ ذکر کی جائے گی ۔ یہ اجمالی طور پر ذکر ہے۔

نسخ کے جواز پر دلائل:

نسخ کی جو مختلف لحاظ سے اقسام بیان کی ہیں ان میں آیات اور احادیث سے جو مثالیں ذکر کی ہیں، ان تمام سے واضح ہے کہ نسخ واقع ہوا ہے ۔ اسی طرح نسخ کے جواز کے جو لوگ قائل نہیں ان کے دلائل کے جو جوابات ذکر کئے ہیں ان سے بھی نسخ کے جواز کا پتہ چل گیا ۔ تا ہم مختصر طور پر کچھ مزید وضاحت کے لئے چند مثالیں پیش کی جارہی ہیں۔

(۱) دلائل سے یہ ثابت ہے کہ نبی کریم ﷺ کی نبوت برحق ہے " **ونبوته لا تصح الا مع القول بنسخ شرع من قبله ، فوجب القطع بالنسخ** " اور آپ کی نبوت کو اس وقت تک ماننا صحیح نہیں ہوسکتا جب تک پہلی شریعتوں کو منسوخ نہ مانا جائے ۔ تو یقینی طور پر یہ پتہ چل گیا کہ نسخ کا وقوع صحیح ہے۔

(۲) رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نَاجَیْتُمُ الرَّسُوْلَ فَقَدِّمُوْا بَیْنَ یَدَیْ نَجْوٰىكُمْ صَدَقَةً ﴾

اس آیۃ کریمہ میں نبی کریم ﷺ سے سرگوشی کرنے سے پہلے صدقہ کرنے کا حکم دیا گیا۔ پھر اسے منسوخ کر دیا گیا۔

خیال رہے کہ حضرت علی المرتضیٰ ﷺ نے صدقہ کر کے تنہائی میں بات کی یا نہیں کی۔ وہ ذکر اسی آیۃ کی وضاحت میں ہی انشاء اللہ آئے گا۔ تاہم یہ یاد رہے کہ نسخ کے لئے ایک مرتبہ اس پر عمل کرنا کوئی ضروری نہیں۔ کیونکہ پچاس نمازوں کو منسوخ کر کے پانچ کر دی گئیں۔ پچاس پر کسی نے بھی عمل نہیں کیا، نہ نبی کریم ﷺ نے اور نہ ہی آپ کی امت میں سے کسی ایک نے اس پر عمل کیا۔

(۳) رب تعالیٰ نے نسخ پر اعتراض کرنے والوں کو بے وقوف کہا۔ کیونکہ بیت المقدس کے قبلہ کو منسوخ کر کے کعبہ شریف کو قبلہ بنانے کے حکم پر اعتراضات کرنے والوں کا ذکر رب تعالیٰ نے یوں فرمایا:

﴿ سَیَقُوْلُ السُّفَهَآءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلّٰىهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِیْ كَانُوْا عَلَیْهَا ﴾

''اب کہیں گے بیوقوف لوگ کس نے پھیر دیا مسلمانوں کو ان کے اس قبلہ سے جس پر تھے''

(ماخوذ از کبیر بتصرف)

☆☆☆☆☆

﴿ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ﴾ (آیت ۱۰۷)

۱) کیا تجھے خبر نہیں کہ اللہ ہی کے لئے ہے آسمانوں اور زمین کی بادشاہی اور اللہ کے سوا تمہارا نہ کوئی حمایتی نہ مددگار۔

۲) کیا تمہیں علم نہیں بیشک اللہ کے لئے ہی ہے بادشاہی آسمانوں اور زمین کی۔ اور نہیں تمہارے لئے سوائے اللہ کے کوئی حمایت کرنے والا اور نہ کوئی مددگار۔

نسخ کا انکار کرنے والوں کو رب تعالیٰ نے فرمایا کیا تمہیں معلوم نہیں کہ بیشک اسی کے لئے آسمانوں اور زمین کی بادشاہی ہے، یعنی جس کے قبضہ قدرت میں تمام مخلوق ہے، کیا اس کی قدرت سے بعید ہے کہ وہ نسخ نہ کر سکے، یہ تمہاری سوچ باطل ہے۔ اگر تم اپنی اسی گمراہی پر قائم رہے تو اللہ تعالیٰ کے سوا تمہارا کوئی اور حمایت کرنے والا نہیں ہوگا۔ اور نہ ہی تمہارا کوئی مددگار ہوگا۔

﴿ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ﴾

”کیا تمہیں علم نہیں بیشک اللہ کے لئے ہی ہے بادشاہی آسمانوں اور زمین کی“

یعنی اللہ تعالیٰ ہی آسمانوں اور زمین میں متصرف ہے، آسمانوں اور زمین میں اسی کی سلطنت ہے کسی اور کی نہیں۔ آسمانوں اور زمین کی تمام مخلوق میں اسی کا حکم چلتا ہے، یہ بھی خیال رہے کہ آسمانوں اور زمین کا ذکر کر کے رب تعالیٰ نے اپنی تمام مخلوق کا ذکر کر دیا آسمانوں سے مراد تمام علو یعنی تمام عالم بالا مراد ہے۔ اور زمین سے مراد تمام سفل (تمام عالم پست)۔ یعنی اللہ تعالیٰ کا ہی حکم چلتا ہے تمام کائنات میں۔ وہ جو چاہے امر فرمائے یا نہی وہ جو چاہے منسوخ فرمائے یا تبدیل کرے، کسی کو حق نہیں کہ اس سے سوال کرے۔

(اَلَمْ تَعْلَمْ) ”وان كان خطابا للنبى ﷺ لكن فيه تكذيب لليهود الذين انكروا النسخ وجحدوا نبوة عيسى ومحمد عليهما السلام فاخبرهم الله ان له ملك السموات والارض وان الخلق كلهم عبيده وتحت تصرفه يحكم فيها بما يشاء وعليهم السمع والطاعة“

(اَلَمْ تعلم) میں بظاہر خطاب نبی کریم ﷺ کو ہے لیکن حقیقت میں یہود کو خطاب ہے، اوران یہود کی ہی تکذیب ہے جنہوں نے نسخ کا انکار کیا۔ اورعیسیٰ علیہ السلام اور نبی کریم ﷺ کی نبوت کا انکار کیا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو خبر دی کہ بیشک اسی کیلئے آسمانوں اور زمین کی بادشاہی ہے۔ اور بیشک تمام مخلوق اسی کی غلام ہے اور تمام اسی کی بندے ہیں۔ اور اسی کے زیر تصرف ہیں۔ وہ جو چاہے حکم فرماتا ہے۔ اس کے بندوں کو چاہئے اس کے حکم کو قبولیت کے کانوں سے سنیں اور اسی ذات کی طاعت کریں۔

" وَمَالَكُمْ يعني يا معشر الكفار عند نزول العذاب مِنْ دُوْنِ اللهِ اى مماسوى الله مِنْ وَّلِيٍّ اى قريب و صديق وقيل من وال وهو المقيم بالامور وَّلَا نَصِيْرٍ اى ناصر يمنعكم من العذاب "

یعنی اے کافرو جب اللہ تعالیٰ کا عذاب تم پر نازل ہوا تو کوئی بھی اللہ کا غیر تمہارا قریبی اور دوست اور تمہارے امور کا والی نہیں ہوگا۔ اور نہ ہی تمہارا کوئی مددگار ہوگا جو تم سے عذاب کو روک کر رکھے۔ عذاب قریب نہ آنے دے۔ (خازن)

ابن کثیر فرماتے ہیں: جس طرح اس کی بادشاہی میں کوئی جھگڑا کرنے والا نہیں، اسی طرح وہ جو چاہے حکم فرمائے ﴿ اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْحُكْمُ ﴾ خبردار مخلوق بھی اسی کی ہے اور حکم بھی اس کا ہے۔

سورۃ عمران میں صراحۃً خطاب اہل کتاب کو جس میں نسخ کا وقوع ذکر ہے۔ یعنی اس آیۃ میں نسخ کے وقوع کا ذکر ہے:

﴿ كُلُّ الطَّعَامِ كَانَ حِلًّا لِّبَنِىْٓ اِسْرَآئِيْلَ اِلَّا مَا حَرَّمَ اِسْرَآئِيْلُ عَلٰى نَفْسِهٖ ﴾

اس آیت کریمہ میں ذکر ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے آپ پر جس چیز کو (اونٹ کے گوشت کو) حرام کیا وہ بنی اسرائیل پر بھی حرام ہوگئی۔ حالانکہ پہلے وہ ان پر حلال تھی۔

حلت کو ختم کر کے حرمت کا حکم نافذ کرنا ہی نسخ ہے۔ جو خود بنی اسرائیل پر واقع ہو چکا ہے۔

اس کے بعد ابن کثیر فرماتے ہیں:

" والمسلمون كلهم متفقون على جواز النسخ فى احكام الله تعالىٰ لما له فى ذلك من الحكمة البالغة و كلهم قال بوقوعه "

''مسلمان تمام نسخ کے جواز پر متفق ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی حکمت کا تقاضا ہے کہ وہ اپنے احکام کو نسخ فرمائے۔ تمام مسلمان اس پر متفق ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے کلام میں نسخ واقع ہو چکا ہے۔

(اَلَمْ تَعْلَمْ) کی تفسیر میں ابن کثیر کی اس وضاحت سے بھی بخوبی معلوم ہوگیا کہ یہ خطاب یہود کو ہے، مسلمانوں کو نہیں۔ تاہم خازن نے بھی بعد میں ایک قول نقل کیا ہے کہ بعض حضرات نے کہا ہے کہ یہ خطاب مسلمانوں کو ہے۔ اور اسی طرح کئی اور مفسرین کرام نے بھی بیان کیا ہے۔

اگر خطاب یہود کو ہوتو وہی تفسیر کامل ہے جو خازن نے ذکر فرمائی۔ اس سے یہ واضح ہے کہ (وَمَا لَكُمْ مِنْ دُوْنِ اللهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ) کا کیا مطلب ہے لیکن اگر خطاب مومنوں کو ہوتو تفسیر عزیزی کی اس تفسیر کو ضرور مدنظر رکھا جائے۔

" یعنی وحال آنکه نیست شما را سوای خدا کارسازی که کار معاش ومعاد شمارا اصلاح کند . اگر کارسازی دیگر شمارا میبود وگنجائش داشت که ایں کارساز را متلون المزاج ومتبدل الحکم فهمید ترك داده بآں کار ساز دیگر رجوع می آوردید وچارهٔ معاش ومعاد خود ازومی جستید " (عزیزی)

یعنی اللہ تعالیٰ کے بغیر دنیا اور آخرت میں کوئی کارساز نہیں۔ اگر کوئی اور کارساز ہوا تو وہ اللہ تعالیٰ کا ہی محتاج ہوگا۔ درحقیقت رب تعالیٰ ہی کارساز ٹھہرے گا۔

اہل سنت و جماعت کا عقیدہ ہی یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ حقیقی طور پر مددگار ہے۔ اس کے بندے اسی کی عطاء سے مددگار ہیں۔ اس مسئلہ کو ﴿اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ﴾ کی وضاحت کرتے ہوئے راقم نے کافی حد تک واضح کر دیا ہے۔

ولی اور نصیر میں فرق: "ولی" کا معنی مالک ہے، اور یہ بھی واضح ہے کہ مالک کبھی نصرت پر قادر نہیں ہوتا، اور کبھی قادر تو ہوتا ہے، لیکن امداد نہیں کرتا۔

اور "نصیر" کا معنی ہے "معین" (مددگار) مدد کرنے والا کبھی مالک ہوتا ہے۔ کبھی مالک نہیں ہوتا بلکہ اجنبی ہوتا ہے۔ (روح المعانی)

خیال رہے کہ روح المعانی کی اس تفسیر سے ہی واضح ہو رہا ہے کہ یہ فرق بندوں کے ولی ہونے اور نصیر ہونے میں ہے ورنہ اللہ تعالیٰ کے متعلق یہ کہنا کسی حال میں جائز نہیں " هو الولی ولا يقدر على النصرة " وہ ولی یعنی مالک تو ہے لیکن امداد کرنے پر قادر نہیں۔

﴿ اَمۡ تُرِيۡدُوۡنَ اَنۡ تَسۡـَٔلُوۡا رَسُوۡلَكُمۡ كَمَا سُئِلَ مُوۡسٰى مِنۡ قَبۡلُ‌ؕ وَمَنۡ يَّتَبَدَّلِ الۡكُفۡرَ بِالۡاِيۡمَانِ فَقَدۡ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيۡلِ ﴾

۱) کیا یہ چاہتے ہو کہ اپنے رسول سے ایسا سوال کرو جو موسیٰ سے پہلے ہوا تھا۔ اور جو ایمان کے بدلے کفر لے وہ ٹھیک راستہ سے بہک گیا۔

۲) کیا تم ارادہ کرتے ہو کہ تم سوال کرو اپنے رسول سے جیسا کہ سوال کیا گیا موسیٰ سے (اس سے) پہلے اور جو حاصل کرے کفر ایمان کے بدلے، تو تحقیق وہ بھٹک گیا سیدھی راہ سے۔ (آیت ۱۰۸)

"ام تــریـدون" میں خطاب کسے ہے؟ اس مسئلہ کو سمجھنے کے لئے پہلے یہ سمجھا جائے کہ نبی کریم ﷺ تمام لوگوں کے رسول ہیں۔ خواہ مومن ہوں یا کافر یہود ہوں یا نصاری۔ اس طرح تمام لوگ ہی آپ کی امت میں داخل ہیں۔ البتہ فرق یہ ہے کہ جن لوگوں نے آپ پر ایمان لایا وہ امت اجابت کہلاتے ہیں۔ ان کی شان میں ہی رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿ كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ ﴾ تم بہتر امت ہو۔

جن لوگوں نے آپ پر ایمان نہیں لایا وہ امت دعوت کہلاتے ہیں۔ کہ نبی کریم ﷺ نے ان کو دعوت ایمان دی لیکن انہوں نے قبول نہیں کیا وہ کفار یہود اور نصارٰی ہی رہے۔

اب اس تمہید کے بعد یہ سمجھنا آسان ہو گا کہ (ام تریدون) کے خطاب میں تین احتمال ہیں۔ ایک یہ کہ یہ خطاب مسلمانوں کو ہے۔ دوسرا یہ کہ یہ خطاب مشرکین کو ہے اور تیسرا یہ کہ یہ خطاب یہود کو ہے۔ جب خطاب میں یہ چند احتمال ہیں تو شان نزول میں بھی اسی طرح چند وجوہ ہوں گی۔

پہلا احتمال: جب خطاب مسلمانوں کو ہو، تو اس میں پھر کئی وجوہ سے ان کو کہا گیا کہ کیا تم ارادہ رکھتے ہو کہ اپنے رسول ﷺ سے ایسے سوال کرو جیسے موسیٰ علیہ السلام سے سوال کئے گئے۔ یعنی تمہیں سوال نہیں کرنے چاہیں، اگر تم نے رب تعالیٰ کے احکام کا انکار کیا تو کافر ہو جاؤ گے۔ جو شخص ایمان کے بدلے کفر کو اختیار کرے گا وہ سیدھی راہ سے بھٹک جائے گا۔ اگر آیۃ کریمہ میں خطاب

مومنوں کو ہو تو اس کا ایک مطلب یہ ہے:

" نهى الله المؤمنين فى هذه الآية الكريمة عن كثرة سؤال النبى ﷺ عن الاشياء قبل كونها "

رب تعالیٰ نے اس آیۃ کریمہ میں مومنوں کو نبی کریم ﷺ سے کثرت سوال سے منع فرمایا کہ کسی چیز کے واقع ہونے سے پہلے جو سوال تم کرتے ہو وہ درست نہیں ان سے باز آ جاؤ۔

کسی چیز کے واقع ہونے سے پہلے سوال کرنے سے منع کرنے میں حکمت یہ تھی " ولا تسألوا عن النبى ﷺ قبل كونه فلعله ان يحرم من اجل تلك المسئلة " کہ تم نبی کریم ﷺ سے کسی چیز کے واقع ہونے سے پہلے اس لئے سوال نہ کرو کہ کہیں تمہارے سوال کی وجہ سے وہ چیز حرام نہ ہو جائے جو تمہارے لئے باعث مشقت بن جائے۔

☆ " ولهذا جاء فى الصحيح ان اعظم المسلمين جرما من سأل عن شئ لم يحرم فحرم من اجل مسئلته "

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، بیشک مسلمانوں میں سے عظیم جرم والا وہ شخص ہے جس نے کسی چیز کے بارے میں سوال کیا تو وہ حرام ہو گئی، حالانکہ پہلے حرام نہیں تھی۔

☆ " ولما سئل رسول الله ﷺ عن الرجل يجد مع امرأته رجلا فان تكلم تكلم بامر عظيم وان سكت سكت على مثل ذلك فكره رسول الله ﷺ المسائل وعابها ثم انزل الله حكم الملاعنة "

نبی کریم ﷺ سے جب یہ سوال کیا گیا کہ ایک شخص اپنی عورت کے ساتھ ایک شخص کو برائی کا ارتکاب کرتے ہوئے پائے تو وہ کیا کرے، اگر کلام کرے تو امر عظیم ہوگا، کیونکہ اس کے پاس گواہ تو ہیں نہیں اور اگر خاموش رہے تو ایسے عظیم جرم پر خاموش کیسے رہے؟ نبی کریم ﷺ نے اس قسم کے سوالات کو ناپسند کیا اور معیوب سمجھا۔ تو لعان کا حکم نافذ ہوا اور لعان والی آیت نازل ہوئی (جس کا ذکر سورۃ نور میں ہے)۔

☆ مسلم اور بخاری میں حدیث حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔

" ان رسول الله ﷺ كان ينهى عن قيل وقال واضاعة المال وكثرة السوال "

بیشک رسول اللہ ﷺ قیل وقال (بحث ومباحثہ جو باعث نزاع ہو) سے اور مال کو ضائع کرنے

اور زیادہ سوال کرنے سے منع فرماتے۔

☆ " قال رسول الله ﷺ ان الله کتب علیکم الحج فقال رجل کل عام یا رسول الله فسکت عنه رسول الله ﷺ ثلاثا ثم قال علیه السلام لا ولو قلت نعم لوجبت ولو وجبت لما استطعتم ذرونی ما ترکتم فانما هلک من کان قبلکم بکثرة سؤالهم واختلافهم علی انبیائهم فاذا امرتکم بامر فأتوا منه ماستطعتم وان نهیتکم عن شئ فاجتنبوه " (رواہ مسلم)

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا بیشک اللہ تعالیٰ نے تم پر حج فرض فرمایا، ایک شخص نے عرض کیا۔ یا رسول اللہ کیا ہر سال حج فرض ہے، نبی کریم ﷺ نے تین مرتبہ اپنے ارشاد کو لوٹایا اور صحابی بھی سوال کرتے رہے، آپ خاموش رہے۔ پھر آپ نے فرمایا اگر میں ہاں کہہ دیتا تو ہر سال حج فرض ہو جاتا۔ اگر فرض ہو جاتا تمہیں ادا کرنے کی طاقت نہ ہوتی۔ جب میں تمہیں چھوڑ دوں تو تم بھی چھوڑ دیا کرو بیشک تم سے پہلے لوگ انبیاء کرام سے زیادہ سوال کرنے اور ان سے زیادہ اختلاف کرنے کی وجہ سے ہلاک ہو گئے۔ جب میں تمہیں کوئی حکم دوں تو طاقت کے مطابق اس پر عمل کرو، اور اگر میں تمہیں کسی چیز سے منع کروں تو اس سے رک جاؤ۔

☆ " قال انس بن مالک نهینا ان نسأل رسول الله ﷺ عن شئ فکان یعجبنا ان یأتی الرجل من اهل البادیة فیسأله فنسمع "

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں، جب ہمیں منع کر دیا گیا کہ ہم رسول اللہ ﷺ سے زیادہ سوال نہ کیا کریں۔ تو ہم یہ چاہتے تھے کہ کوئی شخص دیہات سے آئیں جو آپ سے سوال کریں تو ہم بھی ان کے جوابات سن لیں۔

تنبیہ: جن سوالات سے منع کیا گیا یہ وہ سوالات تھے جو بلاوجہ کئے جاتے تھے۔ اور ایسے سوالات سے منع کیا گیا جن کی وجہ سے کسی حکم کے فرض ہو جانے کا خدشہ ہوتا، یا وہ سوالات کسی چیز کو حرام کرنے کا ذریعہ بنتے، لیکن کسی مسئلہ کو سمجھنے کے لئے دین میں سمجھ حاصل کرنے کے لئے سوال کرنا منع نہیں، بلکہ سوال کرنا ضروری ہوتا ہے۔ جیسا کہ حدیث شریف میں ہے:

" انما شفاء الغی السوال " جہالت سے نجات حاصل کرنے کا ذریعہ سوال ہے (ابوداؤد ج ا ص ۴۹)

یہ بھی واضح ہوا کہ طلباء کا اساتذہ سے لغو اور بیہودہ سوال کرنا منع ہے۔ مقصودی، تعمیری سوالات کیے جائیں۔ عبداللہ بن ابی کی ذریت معنوی کا طریقہ بیہودہ باتیں اور بیہودہ سوال کرنا ہے۔

☆ "عن ابی العالیة فی قوله تعالیٰ (ام تریدون ان تسألوا رسولکم ......الخ) قال قال رجل یا رسول الله لو کانت کفارتنا کفارات بنی اسرائیل فقال النبی ﷺ اللهم لانبغیها ثلاثا ، ما اعطاکم الله خیر مما اعطی بنی اسرائیل ، کانت بنو اسرائیل اذا اصاب احدهم الخطیئة وجدها مکتوبة علی بابه وکفارتها ، فان کفرها کانت له خزیا فی الدنیا وان لم یکفرها کانت له خزیا فی الآخرة فما اعطاکم الله خیر مما اعطی بنی اسرائیل ، قال (ومن یعمل سوء ا او یظلم نفسه ثم یستغفر الله یجد الله غفورا رحیما) وقال الصلوات الخمس من الجمعة الی الجمعة کفارة لما بینهن وقال من هم بسیئة فلم یعملها لم تکتب علیه وان عملها کتبت سیئة واحدة ومن هم بحسنة لم یعملها کتبت له حسنة واحدة وان عملها کتبت له عشر امثالها"

ابوالعالیہ نے اسی آیۃ کی تفسیر میں ذکر کیا ہے کہ ایک شخص نے نبی کریم ﷺ کی خدمت میں عرض کیا کہ ہمارے اسی طرح گناہوں کے کفارات ہونے چاہئیں جیسے بنی اسرائیل کے لئے تھے۔ تو نبی کریم ﷺ نے تین مرتبہ عرض کیا اے اللہ ہم یہ نہیں چاہتے۔ پھر آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے جو تمہیں عطاء کیا ہے وہ بہتر ہے اس سے جو بنی اسرائیل کو عطاء کیا۔ نبی اسرائیل جب بھی کوئی گناہ کرتے تو ان کے دروازوں پر وہ لکھ دیا جاتا اور ان پر کفارہ لازم آتا۔ اگر وہ کفارہ ادا کرتے تو انہیں دنیا میں رسوائی حاصل ہوتی، اور اگر وہ کفارہ نہ ادا کرتے تو ان کو آخرت میں رسوائی حاصل ہوتی۔ جو اللہ تعالیٰ نے تمہیں عطاء کیا ہے وہ بہتر ہے اس سے جو بنی اسرائیل کو عطاء کیا۔ پھر آپ نے یہ آیۃ کریمہ پڑھی:

﴿ وَمَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا اَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهٗ ثُمَّ يَسْتَغْفِرِ اللّٰهَ يَجِدِ اللّٰهَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴾

"اور جو شخص برائی کا عمل کرے یا اپنے نفس پر ظلم کرے، پھر اللہ تعالیٰ سے مغفرت طلب کرے، تو اللہ کو بخشنے والا، رحم کرنے والا پائے گا"۔

اور آپ نے فرمایا جمعہ سے جمعہ تک (ہر روز) پانچ نمازیں ادا کرنا ان کے درمیان خطاؤں کا کفارہ ہیں۔ اور آپ نے فرمایا جس شخص نے برائی کا ارادہ کیا لیکن اس پر عمل نہ کیا تو اس پر کوئی گناہ نہیں

لکھا جائے گا۔اور اگر اس پر عمل کرے گا تو اس پر ایک ہی برائی کو لکھا جائے گا۔اور اگر نیکی کا ارادہ کیا اور اس پر عمل نہ کیا تو ایک نیکی اس کے لئے لکھ دی جائے گی۔اور اگر اس پر عمل بھی کر لیا تو اس کے لئے دس نیکیاں لکھ دی جائیں گی۔

☆ نبی کریم ﷺ جب غزوۂ خیبر کے لئے تشریف لے گئے تو آپ کے لشکر کا ایک درخت کے قریب سے گزر ہوا جس کی مشرکین عبادت کرتے تھے۔اور اس کے ساتھ اپنے ہتھیار اور کھانے، پینے کی اشیاء لٹکا دیتے تھے۔اسے ''ذات انواط'' کہا جاتا، کچھ نو مسلم لوگوں نے نبی کریم ﷺ کی خدمت میں عرض کیا یا رسول اللہ " **اجعل لنا ذات انواط کما لھم ذات انواط** " ہمارے لئے بھی ایسا ہی ذات انواط بنا دیں، جس طرح ان کا ہے۔حضور ﷺ نے فرمایا سبحان اللہ " **ھذا کما قال قوم موسی اجعل لنا الھا کما لھم الھة** " یہ تو ایسا ہی سوال ہے جیسا کہ موسیٰ علیہ السلام کی قوم نے ان سے کہا تھا ہمارے لئے ایسا خدا بنا دیں جیسا کہ ان لوگوں کے خدا ہیں۔(یہ سوال ان کا کچھ لوگوں کو بت پرستی کرتے ہوئے اور کچھ کو گاؤ پرستی کرتے ہوئے دیکھ کر تھا)اور ساتھ ہی نبی کریم ﷺ نے یہ بھی فرمایا:

" والذی نفسی بیدہ لترکبن سنن من قبلکم "

''قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے(سوالات کا اگر یہی سلسلہ رہا) تو تم ضرور بر ضرور پہلے لوگوں کے طریقہ پر چل پڑو گے۔

سبحان اللہ نبی کریم ﷺ کا یہ ارشاد گرامی کتنا ہی روز روشن کی طرح ظاہر و باہر ہے کیونکہ دنیائے عالم کے تمام مسلمان یہود و نصاریٰ کے طریقہ پر عمل کر کے، یہود و نصاریٰ کے ساتھ دوستی قائم کر کے بظاہر خوش ہیں، لیکن در حقیقت رب تعالیٰ کے اس حکم کی کھلی خلاف ورزی ہے۔

﴿ يَآاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ وَالنَّصٰرٰى اَوْلِيَاءَ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَاءُ بَعْضٍ ﴾

''اے ایمان والو نہ بناؤ یہود و نصاریٰ کو دوست وہ آپس میں ایک دوسرے کے دوست ہیں''

کفار کی دوستی کے نتائج آہستہ آہستہ نکلتے ہیں۔جب مسلمانوں کو وہ ہر طرح کا نقصان پہنچانے پر حاوی ہو جاتے ہیں تو وہ ایسا نقصان پہنچاتے ہیں جس سے مسلمان برسوں تک کراہتے رہیں۔

جن کے نتائج بعد میں برے نکلنے ہوں ان سے پہلے ہی اجتناب کر لیا جائے تو بہتر ہے ورنہ بربادی ہی بربادی ہوتی ہے۔ جب ہمارے ملک پاکستان میں ۱۹۷۳ء میں لاہور کے مسلمانوں پر گولی چلانے کا حکم دیا تو حبیب جالب نے کہا۔

گولیوں سے محبت بو رہے ہو — اہل وطن کا چہرہ خون سے دھو رہے ہو
تمہیں گماں ہے کہ رستہ کٹ رہا ہے — مجھے یقین ہے کہ منزل کھو رہے ہو

حالیہ دور میں جب افغانستان کے مسلمانوں کو شہید کرنے میں نام نہاد مسلمانوں نے اہم کردار ادا کیا، تو راقم نے اسی رباعی کو یوں پڑھا۔

کفار سے محبت کا بیج بو رہے ہو — اہل اسلام کا چہرہ خون سے دھو رہے ہو
تمہیں گماں ہے قرضہ گھٹ رہا ہے — مجھے یقیں ہے قرضے میں ڈبو رہے ہو

دوسرا احتمال: " اَمْ تُرِیْدُوْنَ " کا خطاب مشرکین کو ہو، تو اس میں بھی ان کے چند سوالات کے بعد آیۃ کریمہ کا نزول ہوا اس میں ایک وجہ یہ تھی، کہ عبداللہ بن امیہ مخزومی قریش کے چند لوگوں کو ساتھ لایا اور نبی کریم ﷺ کی خدمت حاضر ہو کر

﴿ وَقَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَکَ حَتّٰی تَفْجُرَلَنَا مِنَ الْاَرْضِ یَنْبُوْعًا ☆ اَوْ تَکُوْنَ لَکَ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِیْلٍ وَّ عِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْاَنْھٰرَ خِلٰلَھَا تَفْجِیْرًا ☆ اَوْ تُسْقِطَ السَّمَآءَ کَمَا زَعَمْتَ عَلَیْنَا کِسَفًا اَوْ تَاْتِیَ بِاللهِ وَالْمَلٰٓئِکَةِ قَبِیْلًا ☆ اَوْ یَکُوْنَ لَکَ بَیْتٌ مِّنْ زُخْرُفٍ اَوْ تَرْقٰی فِی السَّمَآءِ ط وَلَنْ نُّؤْمِنَ لِرُقِیِّکَ حَتّٰی تُنَزِّلَ عَلَیْنَا کِتٰبًا نَّقْرَؤُهٗ ط ﴾ (بنی اسرائیل آیات ۹۰ تا ۹۳)

کہنے لگے ہم تم پر ہرگز ایمان نہیں لائیں گے یہاں تک کہ تم ہمارے لئے زمین سے کوئی چشمہ جاری کر دو۔ یا تمہارے لئے کھجوروں اور انگوروں کا کوئی باغ ہو، پھر تم اس کے اندر بہتی نہریں جاری کر دو۔ یا تم ہم پر آسمان ٹکڑے ٹکڑے کر کے گرا دو جیسا تم نے ہم پر گمان کیا (یعنی جیسا تم نے ہمیں کہا ہے) یا اللہ اور فرشتوں کو ضامن لے آؤ۔ یا تمہارے لئے سنہری گھر ہو۔ یا تم آسمان پر چڑھ جاؤ اور ہم تمہارے آسمان پر چڑھ جانے پر بھی ہرگز ایمان نہیں لائیں گے۔ جب تک ہم پر ایک کتاب (خط) نہ اتارو کہ ہم پڑھیں۔

کریمہ کا نزول ہوا۔اس لئے تمام مل کر شان نزول ہیں۔اس پر تائید علامہ آلوسی رحمہ اللہ کی تفسیر سے مل گئی، آپ نے شان نزول کی کئی وجوہ ذکر کرنے کے بعد فرمایا " ولا مانع کما فی البحر من جعل الکل اسبابا " تمام کو ہی شان نزول کے اسباب بنانے میں کوئی مانع نہیں۔

كَمَا سُئِلَ مُوسٰى مِنْ قَبْلُ : (جیسا کہ سوال کیا گیا موسیٰ سے اس سے پہلے)

تقریباً ابھی تک جو ذکر کیا ہے اس سے واضح ہو چکا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام سے رب تعالیٰ کو ظاہر طور پر دیکھنے۔اور جسم والی کوئی چیز ظاہر طور پر معبود بنا کر دینے کا سوال کیا گیا تھا۔

وَمَنْ يَتَبَدَّلِ الْكُفْرَ بِالْإِيمَانِ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيلِ :

اگر ﴿ اَمْ تُرِيْدُوْنَ ﴾ میں خطاب مومنوں کو ہو تو " ومن یتبدل " کا معنی " ومن یشتر " ہوگا۔یعنی جس نے حاصل کیا کفر کو ایمان کے بدلے تحقیق وہ بھٹک گیا سیدھی راہ سے۔اور اگر خطاب مشرکین اور یہود کو ہو تو ﴿ وَمَنْ يَتَبَدَّلِ ﴾ کا معنی ہوگا جس نے کفر کو اختیار کیا ایمان کے بدلے وہ سیدھی راہ سے بھٹکا ہوا ہے۔

تنبیه : ابھی تک جو بحث ذکر کی اس میں مختلف سوالات ذکر کئے گئے ہیں ان میں سے بعض کفر پر مبنی ہیں اور بعض گناہ پر۔اور بعض خلاف اولیٰ ہیں۔اس لئے ضابطہ یہ جاننا ضروری ہے کہ کون سا سوال جو ان کی سرکشی اور حسد پر مبنی تھا وہ باعث کفر تھا۔

" طلب الدلیل علی الشئ لایکون کفرا " کسی چیز پر دلیل کو طلب کرنا کفر نہیں۔اسی طرح احکام کے نسخ میں حکمت کا طلب کرنا بھی کفر نہیں کیونکہ ملائکہ نے بھی رب تعالیٰ سے بشر کی تخلیق کی حکمت کا سوال کیا تھا۔

اور ایمان لانے کیلئے معجزات کی طلب بھی کفر نہیں۔اسی سے معلوم ہو گیا کہ عبداللہ بن امیہ مخزومی کے سوالات سرکشی اور ہٹ دھرمی پر مبنی تھے جو باعث کفر تھے۔

" فَقَدْ ضَلَّ " میں " قد " تحقیق کے لئے ہے۔" سَوَآءَ السَّبِيلِ " سے مراد سیدھی راہ۔

آیۂ کریمہ سے واضح ہوا کہ انبیاء کرام کی تصدیق کرنے سے عدول، ان کی اتباع سے روگردانی، ان کے احکام کو تسلیم کرنے سے گریز کرنا گمراہی اور بھٹکنے کا ذریعہ ہے۔

(تمام بحث ماخوذ از ابن کثیر و کبیر و شیخ زادہ و روح المعانی و قرطبی)

کتاب اتارنے سے ان کا مطلب یہ تھا کہ رب تعالیٰ کی طرف سے ہماری طرف ایک خط آئے جس میں یہ لکھا ہوا کہ اے عبداللہ بن امیہ مخزومی " ان محمد رسول الله فاتبعوه " بے شک محمد اللہ کے رسول ہیں اور ان کی تابعداری کرو۔

دوسرے لوگ کہنے لگے اگر تمہیں یہ طاقت نہیں تو تم قرآن ایک مرتبہ ہی لے آؤ جس میں حلال وحرام اور حدود اور فرائض کا ذکر ہو جیسا کہ موسیٰ علیہ السلام لائے ایک مرتبہ ہی کتاب کو لائے۔

تو اس وقت ان کو حکم دیا گیا۔ ﴿ اَمۡ تُرِیۡدُوۡنَ اَنۡ تَسۡاَلُوۡا رَسُوۡلَکُمۡ کَمَا سُئِلَ مُوۡسٰی مِنۡ قَبۡلُ ﴾ کیا تم ارادہ کرتے ہو کہ تم اپنے رسول (جو تمہیں ایمان کی دعوت دینے کے لئے آئے ہیں) سے ایسے سوال کرو جیسا کہ موسیٰ سے اس سے پہلے سوال کیا گیا۔

کیونکہ ان کی قوم نے کہا تھا ﴿ لَنۡ نُّؤۡمِنَ لَکَ حَتّٰی نَرَی اللّٰہَ جَہۡرَۃً ﴾ ہم ہرگز تم پر ایمان نہیں لائیں گے۔ یہاں تک کہ اللہ کو ظاہر طور پر دیکھ لیں۔ مشرکین کو خطاب کی دوسری وجہ تھی کہ بعض مشرکین نے سوال کیا تھا ﴿ اَنۡ تَجۡعَلَ الصفا لهم ذهبا فقال عليه الصلوٰة والسلام سؤالكم كالمائدة لبنى اسرائيل فابوا ورجعوا "

کہ تم ہمارے لئے صفا پہاڑی کو سونا بنا دو، تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ تمہارا یہ سوال تو ایسا ہی ہے جیسا کہ بنی اسرائیل نے عیسیٰ علیہ السلام سے آسمانوں سے کھانے کا دسترخوان اتارنے کا سوال کیا تھا۔ آپ کے اس ارشاد پر وہ مشرکین واپس چلے گئے۔ اور ایمان لانے سے انہوں نے انکار کر دیا۔ تیسری وجہ قریش کو خطاب کی یہ تھی کہ بعض قریش نے بھی نبی کریم ﷺ سے سوال کیا تھا ہم اللہ کو ظاہر طور پر دیکھنے کے بغیر ایمان نہیں لائیں گے۔

تیسرا احتمال: اَمۡ تُرِیۡدُوۡنَ کے خطاب میں تیسرا احتمال یہ ہے کہ یہ خطاب یہود کو ہو۔ کیونکہ انہوں نے بھی مشرکین کی طرح نبی کریم ﷺ سے سوال کیا تھا کہ تم موسیٰ علیہ السلام کی طرح تمام کتاب ایک مرتبہ ہی لے آؤ۔

علامہ رازی رحمہ اللہ نے اسی قول کو زیادہ پسند کیا ہے کہ پہلے ﴿ یٰبَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ ﴾ سے تمام ذکر بنی اسرائیل کا آ رہا ہے اس لئے یہ خطاب بھی یہود کو ہونا زیادہ صحیح ہے۔

تمام احتمالات اجتماعی طور پر مراد ہیں: راقم کا موقف یہی ہے کہ تمام واقعات کے بعد آیۃ

﴿ وَدَّ كَثِيرٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتَابِ لَوْ يَرُدُّوْنَكُم مِّنْ بَعْدِ اِيمَانِكُمْ كُفَّارًا ج حَسَدًا مِّنْ عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ مِّنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ ج فَاعْفُوْا وَاصْفَحُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ط اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴾ (آیت ۱۰۹)

۱) بہت کتابیوں نے چاہا کاش تمہیں ایمان کے بعد کفر کی طرف پھیر دیں اپنے دلوں کی جلن سے بعد اس کے کہ حق ان پر خوب ظاہر ہو چکا ہے تو تم چھوڑ و اور درگزر کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا حکم لائے بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

۲) پسند کرتے ہیں بہت اہل کتاب ، کاش پھیر دیں تمہیں بعد تمہارے ایمان کے کفر کی طرف بوجہ حسد رکھنے اپنے نفسوں میں ۔ اس کے بعد جب ظاہر ہو گیا ان پر حق تو تم معاف کر دو اور درگزر کرو یہاں تک کہ لے آئے اللہ تعالیٰ اپنا حکم بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

شان نزول: فخاص ابن عازوراء اور زید بن قیس اور چند اور یہود نے احد کے واقعہ کے بعد حضرت حذیفہ بن یمان اور عمار بن یاسر رضی اللہ عنہما کو کہا، کیا تم دیکھتے نہیں کہ احد میں تمہیں مصیبت پہنچی اگر تم حق پر ہوتے تو تمہیں یہ مصیبت نہ پہنچتی۔

" فارجعوا الی دیننا فھو خیر لکم وافضل و نحن اھدی منکم سبیلا "

تم ہمارے دین کی طرف آ جاؤ یہ تمہارے لئے بہتر ہے اور افضل ہے، کیونکہ ہم تم سے زیادہ سیدھی راہ پر قائم ہیں۔

حضرت عمار بن یاسر نے ان سے پوچھا تمہارے دین میں وعدہ کو توڑنے کا کیا حکم ہے؟ انہوں نے کہا وعدہ کو توڑنا بہت شدید جرم ہے، یعنی بہت بڑا گناہ ہے۔

حضرت عمار نے کہا" انی قد عاهدت انی لا اکفر بمحمد ماعشت " بے شک میں نے وعدہ کرلیا ہے کہ جب تک زندہ رہوں گا محمد (ﷺ) سے کفر نہیں کروں گا۔ اس لئے میں تمہارے دین میں آ کر وعدہ کو نہیں توڑ سکتا۔

" قالت الیهود اما هذا فقد صبأ " یہودی کہنے لگے یہ شخص دین سے پھر گیا۔ یعنی اس نے بھی، ایمان قبول کر کے اچھا کام نہیں کیا، کیونکہ وہ تو صرف یہودیت کو ہی اپنا دین سمجھتے تھے۔

" وقال حذیفة واما انا فقد رضیت بالله ربا وبالاسلام دینا وبالقرآن اماما وبالكعبة قبلة و بالمؤمنین اخوانا "

حضرت حذیفہ ﷺ نے کہا میں اللہ کے رب ہونے پر (بعض مفسرین نے " و بمحمد نبیا " کے الفاظ بھی ذکر فرمائے۔ کہ محمد ﷺ کے نبی ہونے پر) اور اسلام کے دین ہونے پر، اور قرآن کے امام ہونے پر، اور کعبہ کے قبلہ ہونے اور مؤمنوں کے بھائی ہونے پر راضی ہوں۔

اس کے بعد یہ دونوں حضرات نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور یہود کے مکر کرنے اور دین سے پھیرنے کی کوشش کرنے اور اپنے اپنے جوابات کو حضور کے سامنے ذکر کیا۔

تو آپ نے فرمایا" اصبتما خیرا وافلحتما "تم دونوں نے بھلائی کو پالیا اور کامیابی حاصل کرلی۔

تو اس واقعہ کے بعد اس آیۃ کریمہ کا نزول ہوا کہ بہت سے اہل کتاب یہ چاہتے ہیں کہ تمہیں ایمان سے پھیر کر کافر بنا دیں۔ ان کی یہ خواہش حسد کی وجہ سے ہے جو وہ اپنے نفسوں میں رکھتے ہیں۔ حالانکہ ان کے سامنے حق بہت واضح ہے۔ (از کبیر)

یعنی حق کے واضح ہونے کے بعد حق پر قائم لوگوں کو پھیرنے کی کوشش کرنا حماقت ہی حماقت ہے

شان نزول کی اور وجہ:

" روی ان کعب بن اشرف الیهودی کان شاعرا وکان یهجو النبی ﷺ وفیه انزل الله "

اور وجہ یہ بیان کی گئی کہ کعب بن اشرف یہودی اور شاعر تھا۔ نبی کریم ﷺ کی شان کے مخالف اپنے اشعار میں آپ کی ہجو کرتا تھا اور چاہتا یہ تھا کہ تمام مسلمان یہودی ہو جائیں، اس کے رد میں اللہ تعالیٰ نے اس آیۃ کو نازل کیا۔ (از صابونی)

شان نزول کی اور وجہ:

عام یہودی نبی کریم ﷺ کی تشریف آوری سے پہلے آپکے وسیلہ سے جنگ میں فتح حاصل کرتے۔
" فلما جاء النبی ﷺ من ولد اسمعیل عرفوہ وکفروا بہ بعد معرفتھم ایاہ حسدا "

جب نبی کریم ﷺ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں تشریف لائے تو وہ آپ کو پہچاننے کے باوجود حسد کی وجہ سے آپ سے کفر کرنے لگے، اور اس خیال سے کہ ان کی ریاست نہ چلی جائے اور ان کے متبعین نہ ختم ہو جائیں تو وہ چاہنے لگے کہ کاش مسلمان بھی اپنے دین سے پھر جائیں۔ (از شیخ زادہ)

شان نزول کی اور وجہ:

حیی بن اخطب اور ابو یاسر بن اخطب عرب کے یہود میں سے سب سے زیادہ نبی کریم ﷺ سے حسد کرتے اور مؤمنین سے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے خصوصی انعامات سے جو ان کو نوازا وہ اس پر حسد کرتے تھے اور کوشش کرتے کہ مؤمنین کو ایمان سے پھیر دیں تو یہ آیۃ نازل ہوئی۔ تمام وجوہ پہلے در پیش آئیں اور آیۃ کریمہ کا نزول بعد میں ہوا اس لئے تمام وجوہ ہی شان نزول ہیں۔ (ابن کثیر)

" وَدَّ " کا معنی محبت کرنا، پسند کرنا اور چاہنا ہے۔ مودت اور محبت کا فرق پہلے بیان کیا جا چکا ہے۔

" كُفَّارًا " حال ہے " کم " ضمیر مخاطب سے، مطلب یہ ہے کہ بہت سے اہل کتاب چاہتے ہیں کہ مسلمانوں کو العیاذ باللہ مرتد بنا دیں۔

حَسَدًا : یا تو مفعول لہ ہے اور علت ہے " ود " کی۔ " یردونکم " کی علت نہیں۔ کیونکہ وہ مطلقاً چاہتے تھے کہ مسلمان مرتد ہو جائیں۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے مصدر ہو منصوب حال ہونے کی وجہ سے ہو اور " حسدا " حاسدین کے معنی میں ہو۔ خیال رہے راقم کا ترجمہ مفعول لہ والا ہے۔

مِنْ عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ : سے یہ ثابت کیا ہے کہ حسد ان کے نفسوں میں ایسا راسخ ہے جیسا کہ ان کی ذاتیات میں داخل ہے۔

﴿مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ﴾ (اس کے بعد کہ ان کے لئے حق ظاہر ہو گیا) حق ظاہر ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ان پر نبی کریم ﷺ کی صفات اور معجزات واضح تھے کیونکہ توراۃ میں ان کا ذکر تھا۔

فَاعْفُوْا وَاصْفَحُوْا :العفو ترک عقوبة المذنب والصفح ترک التثریب والتانیب "
" عفو " کا معنی گناہگار کی سزا کو ترک کر دینا، اور صفح کا معنی ہے ملامت کرنا چھوڑ دینا، اور اس کی طرف رجوع کرنا چھوڑ دینا۔

" صفح " میں بنسبت " عفو " کے زیادہ مبالغہ پایا گیا ہے۔ کیونکہ کبھی کوئی شخص دوسرے کو معاف تو کر دیتا ہے۔ لیکن ملامت کرنا نہیں چھوڑتا۔

حتی یأتی اللہ بامرہ : (یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کا حکم آ جائے) ابتدائی طور پر مسلمانوں کو حکم دیا گیا کہ کفار اگر کچھ زیادتی کریں تو معاف کر دو اور درگزر کر لو، لیکن پھر قتال کا حکم دے دیا۔ اور ارشاد فرمایا۔
" قاتلوا الذین لا یؤمنون باللہ ولا بالیوم الآخر " ان لوگوں سے قتال کرو (جنگ کرو) جو اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان نہیں رکھتے۔

اسی طرح " امر " سے مراد قریظہ کو قتل کرنے اور بنی نضیر کو جلاء وطن کرنے کا حکم آ جائے تو پھر اس پر عمل کرنا۔

" امر " سے مراد قیامت کا دن بھی ہے کہ قیامت کو ان کا فیصلہ ہو جائے گا۔ اور " امر " سے مراد قوت رسالت اور کثرت امت بھی مراد ہے۔ یعنی ابھی معاف کر دو اور درگزر کر دو، جب رسول اللہ ﷺ کو اپنی امت کی تعداد زیادہ ہونے پر قوت حاصل ہو جائے گی تو پھر قتال کا حکم نافذ ہو جائے گا۔

حضرت قتادہ، سدی، اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم کا قول یہ ہے۔ " ان الآیة منسوخة بآیة السیف " بے شک یہ آیہ قتال والی آیات سے منسوخ ہے۔

البتہ بعض حضرات نے بیان کیا کہ نسخ کی تعریف جب یہ ہے کہ شارع کی طرف سے ایک حکم کی مدت کی انتہاء ہوتی ہے۔ اور دوسرے حکم کی ابتداء ہوتی ہے۔ وہ پہلا حکم مطلق ہوتا ہے۔ اسکے ساتھ اسکے حکم ختم ہونے کی قید نہیں ہوتی۔ یہاں تو ﴿فَاعْفُوْا وَاصْفَحُوْا﴾ کے ساتھ ﴿حَتّٰی یَاْتِیَ اللّٰہُ﴾ کی قید موجود ہے۔ جس سے پہلے ہی پتہ چل رہا ہے کہ اس حکم کو ختم کر دیا جائے گا۔ لہٰذا یہ حکم ہمارے نزدیک بھی منسوخ نہیں۔

تاہم یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ اختلاف بھی اصطلاحات کا اختلاف ہے۔ بعض حضرات کے نزدیک

منسوخ ہونے کے لئے مطلق ہونا ضروری ہے۔اور بعض کے نزدیک مقید کو بھی منسوخ کیا جا سکتا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ : (بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے)

یعنی کفار سے انتقام لینا، اور مومنوں کی امداد کرنا، اور مومنوں کو کفار پر قدرت دینا اللہ تعالیٰ کی قدرت میں داخل ہے۔اور یہ بھی مراد ہو سکتا ہے کہ جو میں نے تمہیں ابھی تک معاف کرنے اور درگزر کرنے کا حکم دیا ہے اسے قبول کرلو، جس نے اس حکم سے اعراض کیا اور میرے حکم کی مخالفت کی وہ میری گرفت میں ہوگا۔ میں اس کی گرفت پر قادر ہوں۔ (ماخوذ از روح المعانی)

عبداللہ بن ابی کا حسد کرنا اور نبی کریم ﷺ کا معاف کرنا:

اسی آیۃ کے مطابق علامہ قرطبی رحمۃ اللہ علیہ ایک حدیث پاک کو ذکر فرماتے ہیں۔جس سے واضح ہے کہ جب تک معاف کرنے کا حکم رہا حضور ﷺ معاف فرماتے رہے۔خصوصاً منافقین کو اس لئے بھی معاف فرماتے تھے کہ لوگ یہ نہ کہیں کہ یہ اپنے مسلمان ساتھیوں کو ہی قتل کر دیتے ہیں۔ چونکہ منافقین بظاہر اپنے آپ کو مسلمان کہلاتے تھے۔

"عن اسامة بن زيد اخبره ان النبی ﷺ رکب حمارا عليه اکاف تحته قطيفة فدكية واردف وراءه ابیّ وفی المجلس عبدالله بن رواحة فلما غشيت المجلس عجاجة الدابة خمر عبدالله بن ابی انفه بردائه ثم قال لاتغبروا علينا فسلم عليهم النبی ﷺ ثم وقف فنزل فدعاهم الی الله وقرأ عليهم القرآن فقال عبدالله بن ابی ايها المرء لااحسن من هذا ان كان ما تقول حقا فلا تؤذنا فی مجالسنا وارجع الی رحلک فمن جاءک منا فاقصص عليه فقال عبدالله بن رواحة اغشنا فی مجالسنا فانا نحب ذلک قال فاستب المسلمون والمشركون واليهود حتى هموا ان يتواثبوا فلم يزل النبی ﷺ يخفّضهم ثم ركب دابته حتى دخل على سعد بن عبادة فقال الی سعد الم تسمع الی ما قال ابو حباب يريد عبدالله بن ابی قال كذا كذا قال اعف عنه يا رسول الله واصفح فوالله لقد اعطاک الله الذی اعطاک ولقد اصطلح اهل هذه البحيرة ان يتوّجوه فيعصبوه بالعصابة فلما رد الله ذلک بالحق الذی اعطاكه شرق بذلک فذلک فعل به ما رأيت فعفا عنه النبی ﷺ"

(مسلم ج ۲ باب ما لقی النبی ﷺ من اذی المشركين والمنافقين وهكذا فی البخاری)

حضرت اسامہ بن زید فرماتے ہیں۔ بے شک نبی کریم ﷺ گدھے پر سوار ہوئے اس پر زین تھی اور اس کے نیچے فدک کی بنی ہوئی ایک چادر تھی آپ نے اپنے پیچھے میرے باپ کو سوار کیا۔ آپ بنی حارث بن خزرج قبیلہ میں سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کی عیادت کے لئے تشریف لے گئے۔ یہ وقعہ بدر سے پہلے کا ہے۔ نبی کریم ﷺ ایک مجلس سے گذرے وہاں مسلمان اور مشرکین یعنی بت پرست اور یہود موجود تھے۔ ان میں عبداللہ بن ابی بھی موجود تھا۔ جس مجلس میں عبداللہ بن ابی تھا جب اس میں نبی کریم ﷺ کی سواری کے قدموں سے اٹھنے والی گرد وغبار پہنچی تو اس نے اپنے ناک کو اپنی چادر سے ڈھانپ لیا۔ پھر کہنے لگا ہمیں غبار آلود نہ کیا کرو۔ اتنی دیر میں نبی کریم ﷺ نے ان کو سلام کہا پھر آپ ٹھہرے اور سواری سے اتر آئے۔ ان کو اللہ تعالیٰ (کی توحید) کی دعوت دی۔ اور ان پر قرآن پڑھا۔ تو عبداللہ بن ابی نے کہا اے انسان میں اسے اچھا نہیں سمجھتا۔ اگر تم حق کہتے ہو تو ہمیں ہماری مجالس میں آکر تکلیف نہ پہنچایا کرو۔ تم اپنے گھر لوٹ کر چلے جاؤ۔ جو شخص تمہارے پاس آجائے اسی پر بیان کیا کرو۔ تو حضرت عبداللہ بن رواحہ نے کہا (یارسول اللہ) آپ ہماری مجالس میں تشریف لایا کریں ہم اسے پسند کرتے ہیں۔

راوی کہتے ہیں اس پر مسلمانوں، مشرکوں اور یہود کے درمیان گالی گلوچ شروع ہوگئیں، یہاں تک کہ ایک دوسرے پر حملہ کرنے کا انہوں نے ارادہ کرلیا، نبی کریم ﷺ ان کو خاموش کراتے رہے۔ پھر آپ اپنی سواری پر سوار ہوئے یہاں تک کہ حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کے پاس تشریف لے آئے آپ نے (ان کی عیادت کی اور) ان کو کہا، اے سعد کیا تم نے سنا نہیں جو ابوحباب نے کہا، (ابوحباب سے مراد عبداللہ بن ابی ہے) پھر آپ نے بتایا اس نے اس اس طرح کہا۔

حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے عرض کیا یارسول اللہ آپ اسے معاف فرمادیں اور درگزر فرمائیں۔ قسم ہے اللہ تعالیٰ کی، تحقیق اللہ تعالیٰ نے آپ کو عطاء کیا (جو منصب اور رفعت) جو عطاء کیا۔ (اس کی ایک وجہ آپ کے منصب کی بلندی، اور دوسری وجہ یہ تھی) اس شہر (مدینہ طیبہ) کے لوگوں نے اتفاق کرلیا تھا کہ حاکمیت کا تاج عبداللہ بن ابی کو پہنا دو، اور اسی پر اتفاق کرلو اور اس کی پشت پناہی کرو۔ جب اللہ تعالیٰ نے آپ کو حق سے مبعوث فرمایا۔ آپ یہاں تشریف لائے، تو اس کا معاملہ رب تعالیٰ نے درہم برہم کردیا۔ تو وہ حسد کرنے لگا، اسی وجہ سے اس نے آپ کو یہ کہا، اور آپ سے وہ سلوک کیا جو

آپ نے دیکھا تو نبی کریم ﷺ نے اسے معاف کر دیا۔

خیال رہے کہ ایک حدیث میں یہ ہے۔ " ذلک قبل ان یسلم عبداللہ " یہ عبداللہ بن ابی کے اسلام لانے سے پہلے کا واقعہ ہے اس اسلام سے مراد اس کا ظاہری اور منافقانہ طور پر اسلام لانا مراد ہے، جو اس نے بدر کے واقعہ کے بعد ظاہری طور پر اسلام لانے کا دعوی کیا تھا۔ اگر چہ وہ مرتے دم تک کافر اور منافق ہی رہا۔

ایک اور حدیث میں ہے۔ " فکان بینھم ضرب بالجرید و بالاید والنعال" مسلمانوں اور کفار کے درمیان چھڑیاں، ہاتھ اور جوتے چل گئے، یعنی لڑائی شروع ہوگئی۔

دونوں حدیثوں میں اختلاف نہیں، مطلب یہ ہے کہ انہوں نے ایک دوسرے پر حملہ کرنے کا ارادہ کر لیا کہ ایک دوسرے کو قتل کر دیں، تاہم ان کے درمیان چھڑیوں اور مکوں اور جوتوں سے لڑائی شروع ہوگئی تھی۔

خیال رہے کہ اور حدیث شریف میں یہ بھی ہے۔

" قال الیک عنی فواللہ لقد آذانی نتن حمارک قال فقال رجل من الانصار واللہ لحمار رسول اللہ ﷺ اطیب ریحا منک "

عبداللہ بن ابی نے کہا تم مجھ سے دور ہٹ جاؤ، مجھے تمہارے گدھے کی بو سے تکلیف پہنچی ہے۔ وہاں ہی ایک انصاری صحابی تھے انہوں نے کہا قسم ہے اللہ تعالی کی رسول اللہ ﷺ کا گدھا تمہاری اعلی قسم کی خوشبو سے بھی زیادہ خوشبودار ہے۔ یعنی کستوری کی خوشبو سے بھی آپکے گدھے میں زیادہ خوشبو ہے۔

یہ بات بھی ذہن میں رہے کہ بعض اوقات مختلف احادیث کا مجموعی بیان واقع کی تکمیل کرتا ہے۔ جیسا کہ یہاں تمام احادیث کو جمع کریں تو واقعہ مکمل نظر آئے گا۔

حسد کے متعلق علامہ رازی رحمہ اللہ کا تفصیلی بیان:

اسی آیۃ کریمہ کی تفسیر میں علامہ رازی رحمہ اللہ نے حسد کی تعریف اور حسد کے اسباب اور حسد کی برائی کو بیان فرمایا ہے۔ جس کا ذکر کرنا یقیناً بہت مفید ہے۔

حسد کی مذمت میں احادیث:

(۱) قال علیه الصلوٰة والسلام " الحسد یأکل الحسنات کما تأکل النار الحطب "

حسد نیکیوں کو ایسے کھا جاتا ہے جیسے آگ لکڑیوں کو کھا جاتی ہے۔

(۲) حضرت انس ﷺ فرماتے ہیں۔ ہم ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے نبی کریم ﷺ نے فرمایا اس راستہ سے ایک شخص آ رہا ہے جو جنتی ہے۔ تو انصار میں سے ایک شخص آ گئے، جن کی داڑھی وضوء کی وجہ سے صاف ستھری تھی، انہوں نے اپنے بائیں ہاتھ میں اپنے جوتے پکڑے ہوئے تھے۔ تو انہوں نے سلام کیا دوسرے دن نبی کریم ﷺ نے وہی کل والا ارشاد فرمایا۔ اور آنے والے بھی وہی شخص تھے۔ اور تیسرے دن بھی آپ نے وہی ارشاد فرمایا اور آنے والے بھی وہی شخص تھے۔

جب نبی کریم ﷺ مجلس سے اٹھ کر تشریف لے گئے۔ تو عبداللہ بن عمرو بن العاص اس شخص کے پیچھے چلے، اور ان کو کہا کہ مجھے اپنے باپ سے کچھ تکلیف پہنچی ہے۔ میں نے قسم اٹھالی کہ ان کے پاس (یعنی اپنے گھر) تین دن داخل نہیں ہوں گا۔ اس لئے میرا خیال ہے کہ آپ مجھے اپنے گھر تین دن رکھ لیں (تاکہ میری قسم پوری ہو جائے) انہوں نے کہا ٹھیک ہے آ جاؤ۔ (یہ ان کے گھر چلے گئے) تین راتیں ان کے پاس گزاریں۔ عبداللہ بن عمرو بن العاص نے ان کو رات کو اٹھ کر زیادہ عبادت کرتے ہوئے نہ دیکھا سوائے اس کے کہ وہ جب اپنے بستر پر کروٹ بدلتے تو اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتے۔ وہ رات کو قیام نہیں کرتے تھے۔ نہ دیکھا سوائے اس کے کہ فجر کی نماز کے لئے اٹھتے۔ اور البتہ ان سے خیر کے کلمات کے بغیر کوئی کلمہ نہ سنا گیا۔

جب تین راتیں گزر گئیں۔ تو یہ کہتے ہیں کہ میں نے ان کے عمل کو کم سمجھا۔ تو میں نے کہا اے اللہ کے بندے میرے اور میرے والد کے درمیان کوئی رنجش نہیں تھی۔ لیکن میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا آپ نے (تمہارے متعلق) اس اس طرح فرمایا تو میں نے ارادہ کیا کہ میں تمہارے اعمال کو دیکھوں، لیکن میں نے تمہارے اعمال کو کثیر نہیں پایا، تو وہ کیا وجہ ہے جس کی وجہ سے تم اس مرتبے پر پہنچے ہو، تو انہوں نے کہا میرے عمل تو اور کوئی نہیں سوائے اس کے جو تم نے دیکھ لئے۔

یہ کہتے ہیں جب میں نے پیٹھ پھیر لی۔ یعنی واپس لوٹنے لگا، تو آپ نے مجھے واپس بلایا، اور کہا

" ما هو الا ما رأيت غير انى لم اجد على احد من المسلمين فى نفسى عيبا و لا حسدا على خير اعطاه الله اياه "

کہ اور تو کوئی عمل نہیں سوائے اس کے جو تم نے دیکھا ہے۔ البتہ مسلمانوں میں سے میں کسی ایک کو عیب نہیں لگاتا۔ اور اللہ تعالیٰ نے کسی کو اگر کوئی بھلائی عطاء کی ہو تو میں اس پر حسد نہیں کرتا۔

" فقال عبدالله هى التى بلغت بك وهى التى لا تطاق "

حضرت عبداللہ نے کہا یہی وہ چیز ہے جس کی وجہ سے تم اس منصب پر پہنچے ہو، اس کی ہر شخص طاقت نہیں رکھتا۔

(۳) قال عليه الصلوة والسلام رب اليكم داء الامم قبلكم ، الحسد والبغضاء ، والبغضة هى الحالقة لا اقول حالقة الشعر ولكن حالقة الدين "

نبی کریم ﷺ نے فرمایا پہلی امتوں کی بیماری تمہیں لاحق ہوگئی۔ یعنی حسد اور بغض اور بغض حالقہ ہے، حالقہ کہنے سے میرا یہ مطلب نہیں کہ وہ بالوں کو مونڈنے والی کوئی چیز ہے، بلکہ میرا مقصد تو یہ ہے کہ وہ دین کو برباد کردینے والی چیز ہے۔

(۴) قال عليه الصلوة والسلام انه سيصيب امتى داء الامم قالوا ماداء الامم قال الاشر والبطر والتكاثر والتنافس فى الدنيا والتباعد والتحاسد حتى يكون البغى ثم الهرج "

نبی کریم ﷺ نے فرمایا، بے شک میری امت کو وہی بیماری لگ جائے گی، جو پہلی امتوں کو لگی۔ صحابہ کرام نے پوچھا (یارسول اللہ) وہ پہلی امتوں کی بیماری کون سی تھی۔ آپ نے فرمایا حرص اور اکڑ (تکبر) اور کثرت مال، اور دنیا کو پسند کرنا، اور ایک دوسرے سے دور رہنا اور حسد کرنا یہاں تک کہ ان میں بغاوت آجائے گی۔ پھر قتل کرنا ایک دوسرے کو ان میں واقع ہوجائے گا۔

(۵) موسیٰ علیہ السلام جب رب کے حضور حاضر ہوئے تو عرش کے سائے میں ایک شخص کو دیکھا، آپ کو اس پر رشک آیا، اور آپ نے کہا یہ شخص رب تعالیٰ کا مکرم ہے۔ اپنے رب سے اس کے نام کے متعلق سوال کیا۔ اس کا نام تو آپ کو نہ بتایا گیا۔ البتہ رب نے کہا۔

" احدثك من عمله ثلاثا كان لايحسد الناس على ما آتاهم الله من فضله ، و كان لا يعق

والدیه ولا یمشی بالنمیمة "

میں تمہیں اس شخص کے تین عمل بتاتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو اپنے فضل سے جو مال وغیرہ عطاء فرمایا یہ ان پر حسد نہیں کرتا تھا۔ اور اپنے والدین کی نافرمانی نہیں کرتا تھا۔ اور چغلخوری نہیں کرتا تھا۔

(۶) قال علیه الصلوة والسلام ان لنعم الله اعداء قیل وما اولئک قال الذین یحسدون الناس علی ما آتاهم الله من فضله "

نبی کریم ﷺ نے بیان فرمایا بے شک اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے دشمن ہیں، آپ سے پوچھا گیا وہ کون لوگ ہیں؟ آپ نے فرمایا جو لوگوں سے حسد کرتے ہیں اس چیز پر جو اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے ان کو عطاء کیا ہوتا ہے۔

حسد کی مذمت میں آثار:

عوف بن عبداللہ گئے فضل ابن مہلب کے پاس جب وہ واسط کے حاکم تھے، تو انہوں نے کہا میں تمہیں نصیحت کرتا ہوں۔ " ایاک والکبر " کہ اپنے آپ کو تکبر سے بچا کر رکھو، کیونکہ یہی سب سے پہلا گناہ ہے جس کی وجہ سے ابلیس نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی، پھر آپ نے یہ آیۃ پڑھی۔

﴿ وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِیْسَ اَبٰی وَاسْتَكْبَرَ ﴾

اور جب ہم نے کہا فرشتوں کو سجدہ کرو آدم کو تو سب نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے اس نے انکار کیا اور تکبر کیا۔

پھر انہوں نے کہا " ایاک والحرص فانه اخرج آدم من الجنة " تم اپنے آپ کو حرص سے بچا کر رکھو کیونکہ حرص نے آدم علیہ السلام کو جنت سے نکالا۔ پھر انہوں پڑھا۔ " اهبطا منها " رب تعالیٰ نے آدم علیہ السلام اور حضرت حوا کو حکم دیا جنت سے اتر جاؤ۔ پھر انہوں نے کہا۔ " ایاک والحسد فانه قتل ابن آدم اخاه حین حسده " اپنے آپ کو حسد سے بچا کر رکھو، بے شک حسد کی وجہ سے آدم علیہ السلام کے ایک بیٹے نے اپنے بھائی کو قتل کر دیا۔

☆ ابن زبیر کہتے ہیں میں نے کسی ایک پر دنیا کی وجہ سے حسد نہیں کیا، اس لئے کہ اگر وہ دنیا دار

جنتی ہے۔ " فکیف احسده علی الدنیا وھی حقیرۃ فی الجنة " تو میں اس پر دنیا کی وجہ سے کیوں حسد کروں جو بنسبت جنت کے حقیر ہے اور اگر وہ شخص جہنمی ہے۔ "فکیف احسده علی امر الدنیا وھو یصیر الی النار " تو میں اس سے کیسے حسد کروں دنیا کی وجہ سے جو جہنم تک پہنچانے کا ذریعہ ہے۔

☆ قال معاویة کل الناس اقدر علی رضاہ الا الحاسد فانه لا یرضیه الا زوال النعمة "

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا میں تمام لوگوں کو راضی کرنے پر قادر ہوں سوائے حاسد کے، حسد کرنے والے کو سوائے نعمت کے زوال کے کوئی چیز راضی نہیں کرسکتی۔

☆ اور بعض بزرگوں نے کہا ہے حاسد مجالس میں سوائے مذمت اور ذلت کے کچھ حاصل نہیں کرسکتا۔ اور حاسد ملائکہ سے سوائے لعنت اور ان کی ناراضگی کے کچھ حاصل نہیں کرسکتا۔ اور حاسد مخلوق سے سوائے جزع وفزع کے کچھ حاصل نہیں کرسکتا۔ اور حاسد کو جزع وفزع سے زیادہ شدت اور ڈر ہی حاصل ہوتا ہے۔ اور حاسد کو موقف (حساب وکتاب کے لئے قیامت میں ٹھہرنے کے مقام) میں سوائے رسوائی اور عذاب کے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔

حسد کیا ہے؟ جب اللہ تعالیٰ نے تمہارے بھائی کو نعمت عطاء کی ہو۔ " فان اردت زوالھا فھذا ھو الحسد " اور اس نعمت کے زوال کو تم چاہتے ہو تو یہ حسد ہے۔

خیال رہے کہ حسد میں یہ ضروری نہیں کہ انسان یہ خواہش کرے کہ اس کی نعمت زائل ہو کر مجھے مل جائے۔ کبھی یہ خواہش ہوتی ہے۔ لیکن کبھی دوسرے کی نعمت کا صرف زوال طلب کیا جاتا ہے۔ اس کے حصول کی تمنا نہیں ہوتی، جیسا کہ زیر بحث آیۃ میں واضح ہے اہل کتاب مؤمنین سے ایمان کا زوال تو چاہتے تھے۔ لیکن اپنے لئے ایمان بھی نہیں چاہتے تھے۔

" وان اشتھیت لنفسک مثلھا فھذا ھو الغبطة والمنافسة " اور اگر کسی کی نعمت کے زوال کو تم نہ چاہو صرف یہ تمنا کرو کہ یہ نعمت مجھے بھی مل جائے اسے " غبطہ اور منافسہ " کہا جاتا ہے۔ جسے ہم اپنی زبان میں " رشک کرنا " کہتے ہیں۔ حسد ہر حال میں حرام ہے۔ البتہ اگر نعمت کسی فاجر یا کافر کو حاصل ہو جس کی وجہ سے شر اور فساد پھیلا رہا ہو۔

" فلا یضرک محبتک لزوالها " تو اس شخص کی نعمت کے زوال کی تمنا کرنا جائز نہیں۔ اس لئے کہ اس کی نعمت کے زوال کی تمنا مقصود نہیں، بلکہ اس کی نعمت اور مال و دولت کے زوال کی فقط اس لئے تمنا پائی گئی ہے کہ اس کے فساد سے لوگوں کو آرام مل جائے۔ جیسا کہ کوئی غاصب لیڈر ملک کا حکمران بن جائے، دین اسلام کا مخالف ہو جائے۔ یہود و نصاری کا یار بن جائے تو اس کی حکمرانی کے زوال کی دعاء کرنا حسد نہیں، گناہ نہیں، بلکہ مستحب ہے۔

حسد کی جو تعریف کی گئی ہے اس پر قرآن پاک شاہد ہے۔ ایک تو یہی آیۃ جس کی بحث جاری ہے۔ اس میں ذکر ہے۔ " لویردونکم من بعد ایمانکم کفارا حسدا من عند انفسهم " کثیر اہل کتاب یہ چاہتے ہیں۔ (کاش وہ تمہیں ایمان سے کفر کی طرف پھیر لیں بوجہ اپنے نفسوں میں حسد رکھنے کے) یعنی وہ ایمان والوں کی نعمت ایمان کا زوال چاہتے یہی ان کا حسد تھا۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ ﴿ وَدُّوا لَوْ تَكْفُرُوْنَ كَمَا كَفَرُوْا فَتَكُوْنُوْنَ سَوَآءً ﴾ (النساء آیۃ ۸۹)

وہ (منافقین) تو چاہتے ہیں کہ کہیں تم بھی کافر ہو جاؤ جیسے وہ کافر ہوئے تم سب ایک سے ہو جاؤ

اس آیۃ کریمہ سے بھی ثابت ہے کہ منافقین چاہتے تھے کہ مؤمنین سے ایمان جیسی نعمت عظمی زائل ہو جائے۔

اور ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

﴿ اِنْ تَمْسَسْكُمْ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ وَاِنْ تُصِبْكُمْ سَيِّئَةٌ يَّفْرَحُوْا بِهَا ﴾

اگر تمہیں بھلائی پہنچے تو ان کو (منافقین کو) غمناک کر دیتی ہے۔ اور اگر تمہیں کوئی مصیبت پہنچے تو وہ اس سے خوش ہوتے ہیں۔

" وهذا الفرح شماتة والشماتة والحسد متلازمان " کسی کی مصیبت پر خوش ہونا درحقیقت شماتت ہے لیکن شماتت اور حسد ایک دوسرے کو لازم ہیں۔

علامہ رازی رحمہ اللہ نے حسد کی تعریف پر کئی اور آیات کو بھی ذکر کیا ہے۔ لیکن مسئلہ سمجھنے کیلئے میرے خیال میں اتنے دلائل ہی کافی ہیں۔ ہر آیۃ کی مکمل وضاحت اپنے اپنے محل سے ہی تعلق رکھتی ہے۔

منافسہ اور غبطہ کا حکم: منافسہ کبھی واجب ہوتا ہے، کبھی مستحب اور کبھی مباح۔

منافسہ واجبہ: اگر دوسرے شخص کو دینی نعمت حاصل ہے جیسا کہ ایمان، نماز اور زکوۃ، اسکی تمنا کرنا واجب ہے، کیونکہ اگر اسکی تمنا نہیں کرے گا تو اسکے خلاف تو معصیت ہے اور معصیت پر راضی ہونا حرام ہے۔

منافسہ مستحبہ: واما ان کانت تلک النعمة من الفضائل المندوبة کالانفاق فی سبیل اللہ والتشمیر لتعلیم الناس کانت المنافسة فیها مندوبة "

اگر کسی کو مستحب کاموں پر عمل کرنے کی نعمت حاصل ہے تو اس جیسی نعمت کے حصول کی تمنا مستحب ہے۔ جیسا کہ کسی کو رب تعالیٰ نے اپنی راہ میں خرچ کرنے کی توفیق عطاء کر رکھی ہے اور لوگوں کو دین کی تعلیم دینے پر کوئی کمربستہ ہو تو ان میں منافسہ مستحب ہے۔

منافسہ مباح: اگر کسی کو مباح قسم کی نعمتیں حاصل ہیں تو ان جیسی نعمتوں کی طلب مباح ہوگی۔ جیسا کہ کسی کے کپڑے دیکھ کر، سواری وغیرہ دیکھ کر یہ تمنا کرے مجھے بھی ایسی چیزیں حاصل ہوں۔

تنبیہ: اگر کسی کو نعمت حرام طریقہ سے حاصل ہے تو انسان یہ چاہے کہ مجھے بھی اسی قسم کی نعمت حاصل ہو جائے اور بے شک حرام طریقہ سے ہی حاصل ہو جائے یہ منافسہ حرام ہوگا۔

حاصل کلام: نتیجہ واضح ہوا کہ کسی کی نعمت کے زوال کا مطالبہ حرام ہے، اور کسی کی نعمت کے زوال کی طلب نہ ہو، لیکن اس جیسی نعمت کے حصول کی طلب جائز ہے۔

منافسہ کے جواز پر دلائل: (۱) ﴿وَفِیْ ذٰلِکَ فَلْیَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ﴾ اور اسی پر چاہئے کہ للچائیں للچانے والے، اس سے پہلے جنت کی نعمتوں کا ذکر ہے، پھر ان پر رغبت رکھنے اور حاصل کرنے کی تمنا کا حکم دیا۔

پتہ چلا کہ کسی کو حاصل شدہ نعمتوں جیسی نعمتیں حاصل ہونے کی تمنا کرنا جائز ہے بشرطیکہ اس کی نعمت کا زوال نہ طلب کیا جائے۔

(۲) اور رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا؛ ﴿ سَابِقُوْا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ﴾ اپنے رب کی مغفرت کی طرف سبقت کرو۔ یعنی ایک دوسرے سے آگے بڑھنے اور مغفرت حاصل کرنے کی کوشش کرو۔

کیونکہ سبقت اس وقت کی جاتی ہے جب یہ خوف ہو کہ ہوسکتا ہے میری سستی کی وجہ سے وہ نعمت مجھ سے رہ نہ جائے جس طرح دو غلام ہوں تو ایک دوسرے سے آگے نکل کر اپنے مولیٰ سے انعام حاصل کرنا چاہیں۔

اس آیۃ سے بھی یہ واضح ہوا کہ کسی نعمت کے حاصل کرنے میں کوشش کرنا کسی سے آگے بڑھنا جائز ہے۔

☆ نبی کریم ﷺ نے فرمایا " **لا حسد الا فی اثنین رجل آتاه الله مالا فانفقه فی سبیل الله ، ورجل آتاه الله علما فهو یعمل به و یعلمه الناس** "

سوائے دو شخصوں کے کسی سے حسد نہ کرے، ایک وہ جسے اللہ تعالیٰ نے مال عطاء کیا ہو اور وہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرتا ہو اور ایک وہ جس کو اللہ تعالیٰ نے علم عطاء کیا ہو وہ اس پر عمل کرتا ہو اور لوگوں کو بھی تعلیم دیتا ہو۔

" **وهذا الحدیث یدل علی ان لفظ الحسد قد یطلق علی المنافسة** "

اس حدیث پاک سے واضح ہو رہا ہے کہ کبھی حسد کا مجازی معنی منافسہ لیا جاتا ہے، جیسا اس حدیث میں حسد کا اطلاق منافسہ پر ہے۔

اور یہ بھی خیال رہے کہ حدیث میں "دو" کی قید اتفاقی ہے، ہر شخص جو نیکی کا عمل کرے، اس جیسی نیکی کے حاصل کرنے کی تمنا مستحب ہے، خواہ وہ نیکی کوئی بھی ہو۔

تنبیہ : منافسہ کی دو صورتیں ہیں۔ ایک منافسہ محضہ اور دوسرا منافسہ مستلزمِ حسد، پہلی قسم والا منافسہ جائز ہے۔ دوسرا ناجائز ہے۔

منافسہ محضہ : یہ ہے کہ دوسرے کی نعمت کو دیکھ کر یہ طلب کرے کہ مجھے بھی یہ نعمت مل جائے، نہ تو یہ اس کی نعمت کا زوال طلب کرے، اور نہ ہی اسکی طلب اسکی نعمت کے زوال کو مستلزم ہو، یہ منافسہ جائز ہے۔

منافسہ مستلزم حسد یہ ہے کہ اگر چہ یہ دوسرے کی نعمت کا زوال طلب نہیں کر رہا، لیکن اس کی طلب ایسی ہے جو اس کی نعمت کے زوال کو مستلزم ہے تو یہ حسد ہی ہے جو نا جائز ہے۔ جیسا کہ ایک شخص کسی کے مکان، کسی کی سواری، کسی کے منصب وغیرہ کو دیکھ کر یہ تمنا کرے کہ اس کی یہ چیز مجھے مل جائے۔ اس میں دوسرے کی نعمت کا زوال لازم آتا ہے۔ یہ نا جائز ہے۔ ہاں البتہ یہ خیال کر کے وہ بیچے میں خرید لوں یہ تمنا جائز ہے۔

حسد سے نکلنا قوت ارادیہ پر مبنی ہے:

نبی کریم ﷺ نے فرمایا: "ثلاث لاینفک المؤمن عنھن الحسد والظن والطیرة"

تین چیزیں ایسی ہیں جن سے مؤمن کا چھٹکارا نہیں، وہ یہ ہیں حسد اور ظن (کسی کے خلاف بدگمانی) اور فال پکڑنا۔ اور بعد میں آپ نے یہ ذکر فرمایا "ولہ منھن مخرج اذا حسدت فلا تبغ" ان سے نکلنا کا یہ طریقہ ہے کہ جب تمہارے دل میں حسد آئے تو اس پر عمل نہ کرو، یعنی پختہ ارادہ اور ہمت سے اس سے باز آجاؤ۔ یہی طریقہ دوسری دو چیزوں سے نکلنے کا بھی ہے۔

حسد کے مراتب: علامہ غزالی رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔ حسد کے چار مراتب ہیں۔

(۱) دوسرے کی نعمت کے زوال کو چاہنا، خواہ اسے وہ نعمت حاصل نہ بھی ہو۔ یہ حسد کا درجہ انتہاء حسد اور مقصودِ حسد ہے۔

(۲) حسد کا دوسرا درجہ یہ ہے کہ بظاہر تو یہ دوسرے کی نعمت کا زوال طلب نہیں کر رہا، بلکہ صرف اپنے لئے وہ نعمت طلب کر رہا ہے۔ لیکن جب تک اس کی نعمت زائل نہ ہو اسے مل نہیں سکتی جیسا کہ یہ طلب کرے کہ اس کی خوبصورت زوجہ مجھے مل جائے۔ اسے تب ہی ملے گی جو اس سے اس کی زوجیت کا زوال ہوگا۔ یہ تمنا مستلزم زوال نعمت غیر ہے۔

(۳) تیسرا درجہ حسد کا یہ ہے کہ اس کی تمنا دوسرے شخص سے برابری حاصل کرنے کی ہو۔ پہلی تمنا تو یہ ہو کہ مجھے بھی اس کی نعمت جیسی نعمت مل جائے۔ ہاں اگر مجھے اس جیسی نعمت نہ ملے تو

دوسری تمنا یہ ہے کہ اس کی نعمت بھی زائل ہو جائے تا کہ دونوں میں برابری ہو جائے۔

(۴) چوتھا درجہ جو حقیقت حسد نہیں بلکہ منافسہ اور غبطہ ہے، مجازی طور پر اسے حسد کہا جاتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ دوسرے کی نعمت کا زوال طلب نہ کیا جائے، نہ دوسرے کی نعمت کے زوال کو اس کی تمنا مستلزم ہو، اس کی تمنا صرف یہ ہو کہ مجھے اس کی نعمت جیسی مل جائے۔

" وهذا الاخير هو المعفو عنه ان كان فى الدنيا و المندوب اليه ان كان فى الدين "

یہ چوتھی قسم اگر دنیا کی طلب ہو تو معاف ہے یعنی اس پر کوئی گناہ بھی نہیں اور ثواب بھی نہیں۔ اگر دین کے کاموں کی طلب ہو تو مستحب ہے جس پر ثواب ہوتا ہے۔

باقی تینوں قسمیں ناجائز ہیں۔ پہلی قسم زیادہ مذموم (بری) ہے۔ دوسری اس سے کچھ کم، اور تیسری اس سے بھی کچھ کم۔

حسد کے اسباب:

(۱) عداوت اور بغض حسد کا سبب ہیں۔ جب کوئی شخص کسی کو اذیت پہنچائے، تو جسے تکلیف پہنچائی جائے اس کے دل میں بغض اور غضب پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ غضب کینہ پیدا کرتا ہے، اور کینہ کی وجہ سے وہ انتقام لینے کی کوشش کرتا ہے۔ اگر انتقام نہ لے سکے تو پھر یہ چاہتا ہے کہ اسے کوئی مصیبت پہنچے، اگر اسے کوئی مصیبت پہنچے تو وہ خوش ہوتا ہے۔ اور کوئی نعمت حاصل ہو تو یہ غم اور پریشانی میں مبتلاء ہو جاتا ہے۔ اور یہی چاہتا ہے کہ اس کی نعمت کب زائل ہو جائے

اسی سے واضح ہو گیا کہ بغض اور غضب کو حسد لازم ہے۔ کبھی ان سے جدا نہیں ہوتا۔ ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ کبھی وہ اپنی عداوت اور حسد کو ظاہر کرنے کی طاقت نہیں رکھتا، اور دل ہی دل میں جلتا رہتا ہے۔ جب اسے مصیبت پہنچے تو یہ خوش ہوتا ہے۔

حسد کی اسی قسم کا رب تعالیٰ نے ذکر فرمایا؛

" واذا لقوكم قالوا اٰمنا واذا خلوا عضوا عليكم الانامل من الغيظ قل موتوا بغيظكم ان الله عليم بذات الصدور ، ان تمسسكم حسنة تسؤهم وان تصبكم سيئة يفرحوا بها "

جب وہ (منافقین) آپ سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں ہم ایمان لے آئے ہیں۔ اور جب علیحدہ ہوتے ہیں تو غصے کی وجہ سے تم پر انگلیوں کے پورے کاٹتے ہیں۔ فرمادو اپنے غیظ و غضب کی وجہ سے مرجاؤ، بے شک اللہ تعالیٰ سینوں کی باتوں کو جاننے والا ہے۔ اگر تمہیں کوئی بھلائی پہنچے تو ان کو پریشانی ہوتی ہے۔ اور اگر تمہیں کوئی مصیبت پہنچے تو وہ خوش ہوتے ہیں۔

کبھی کبھی وہ حسد کو اپنے کلام سے ظاہر بھی کرتے رہتے ہیں۔ لیکن دلوں میں اور ہی زیادہ وہ حسد رکھتے ہیں۔

رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿وَدُّوْا مَا عَنِتُّمْ قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَآءُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ وَمَا تُخْفِي صُدُوْرُهُمْ اَكْبَرُ﴾

وہ پسند کرتے اسے جو تمہیں مشقت پہنچے، ظاہر ہو گیا ہے بغض ان کے مونہوں سے، اور جو ان کے سینے چھپا کر رکھتے وہ اور ہی بڑا ہے۔

"واعلم ان الحسد ربما افضى الى التنازع والتقاتل"

اس قسم کا حسد جس کا سبب غیظ و غضب اور عداوت ہو وہ بسا اوقات جھگڑے اور فساد اور قتل و غارت تک پہنچا دیتا ہے۔

(۲) حسد کا دوسرا سبب ہے "تـعـزز" اپنے آپ کو بڑی عزت والا سمجھنا، جب کسی ایک کو کوئی منصب حاصل ہو جائے جس کی وجہ سے اسے رفعت (بلندیٔ شان) حاصل ہو جائے، یہ برداشت نہ کر سکے اور یہی چاہے کہ اس کا وہ منصب زائل ہو جائے۔

اس صورت میں یہ ضروری نہیں کہ یہ تمنا کرے کہ مجھے بھی وہ منصب مل جائے۔ بلکہ اس کا مقصد تو یہ ہے کہ وہ مجھ سے اونچا نہ رہے، بلکہ میرے برابر ہو جائے۔ یہ صرف اس کی رفعت اور منصب کا زوال چاہتا ہے۔

(۳) "الاستخدام من الغير" تیسرا سبب حسد کا یہ ہے کہ کسی کی طبیعت میں یہ ہو کہ وہ یہ چاہے کہ لوگ میری خدمت گزاری میں رہیں۔ جب کسی اور کو کوئی نعمت مل جائے تو یہ سمجھے کہ جب

کوئی شخص باکمال ہوگیا تو وہ میری خدمت کیسے کرے گا۔لہٰذا یہ نعمت اس سے زائل ہو جائے تو پھر ہی وہ مجھے سردار اور چوہدری مانے گا۔

یہی حسد کفار نبی کریم ﷺ سے رکھتے تھے، وہ کہتے تھے۔

" کیف یتقدم علینا غلام یتیم و کیف نطاطئ له رؤوسنا "

ایک یتیم کو ہم پر برتری کیسے حاصل ہوگئی، ہم اس کے سامنے سر کیسے جھکائیں۔

رب تعالیٰ نے ذکر فرمایا؛

﴿ وَقَالُوْا لَوْلَانُزِلَ هٰذَا الْقُرْآنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ ﴾

اور انہوں نے کہا قرآن کیوں نازل نہیں ہوا ان دو بستیوں (مکہ اور طائف) کے کسی بڑے شخص پر یعنی وہ لوگ مال دار، اور سردار اور چوہدری، اور بیجا حکم چلانے والوں کو اپنے زعم باطل میں بڑا سمجھتے تھے۔

اسی طرح قریش کے قول کو رب تعالیٰ نے ذکر فرمایا۔﴿ أَهٰؤُلَاءِ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنْ بَيْنِنَا ﴾ کیا یہی لوگ ہیں جن پر ہمارے درمیان اللہ تعالیٰ نے احسان فرمایا۔یعنی انہوں نے نبی کریم ﷺ اور آپ کے خاندان کو حقیر سمجھتے ہوئے (معاذ اللہ) یہ کہا۔

(۴) حسد کا چوتھا سبب ہے "تعجب" جس طرح اللہ تعالیٰ نے پہلی امتوں کی خبر دی۔انہوں نے انبیاء کرام کو کہا ﴿ مَا اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا ﴾ نہیں ہو تم مگر ہمارے جیسے بشر۔

فرعون اور اس کی قوم نے حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کے متعلق کہا۔

﴿ اَنُؤْمِنُ لِبَشَرَيْنِ مِثْلِنَا وَ قَوْمُهُمَا لَنَا عَابِدُوْنَ ﴾ کیا ہم اپنے جیسے دو بشروں پر ایمان لے آئیں جن کی قوم کے لوگ ہمارے خدمت گزار ہیں۔

اور انہوں نے تعجب کرتے ہوئے کہا۔ " ابعث الله بشرا رسولا " کیا اللہ تعالیٰ نے بشر کو رسول بنا کر بھیجا۔اور رب تعالیٰ نے ان کے تعجب کو ذکر فرمایا۔

﴿ اَوَعَجِبْتُمْ اَنْ جَآءَكُمْ ذِكْرٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَلٰى رَجُلٍ مِّنْكُمْ لِيُنْذِرَكُمْ ﴾

کیا تم تعجب کرتے ہو اس پر کہ تمہارے رب کی طرف سے نصیحت آئی تمہارے پاس تم میں سے ہی ایک شخص کے ذریعے جو تمہیں ڈراتا ہے۔

ان تمام آیات سے واضح ہوا کہ ان لوگوں کے ایمان نہ لانا اور انبیاء کرام کی رسالت و نبوت کو نہ تسلیم کرنے، اور اس پر حسد کرنے کا سبب تعجب تھا۔

(۵) حسد کا پانچواں سبب مقاصد کے فوت ہونے کا خوف ہے۔ یہ اس وقت ہوتا ہے جب کئی لوگ ایک ہی مقصد، ایک منصب، ایک ہی نعمت کے حصول کے لئے ایک دوسرے سے مزاحمت کریں کبھی تو ایک ہی عورت سے شادی کرنے کے لئے کئی آدمی تمنا کرتے ہیں۔ ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے لئے ہر حربہ استعمال کرتے ہیں۔ اور حسد کرتے ہیں کہ اسے یہ نعمت نہ حاصل ہو۔

اسی طرح کبھی بھائی ایک دوسرے پر حسد کرتے ہیں کہ دوسرے بھائی کو والدین محبوب نہ سمجھیں والدین اسے نہ مال دیں اور نہ اس پر شفقت کریں۔ یہی حسد حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ ان کے بھائیوں کو تھا۔

اسی طرح یہ حسد کبھی واعظین کو حاصل ہوتا ہے، وہ چاہتے ہیں کہ ایک دوسرے سے لوگوں کی مقبولیت میں اور مال کے حاصل کرنے میں بڑھ جائیں۔

اللہ کے فضل و کرم سے راقم اس حسد سے بچا ہوا ہے۔ نہ تو سحر آمیز وعظ آتا ہے، اور نہ ہی مال کی ہوس و تمنا کبھی کی، اور نہ ہی وعظ و خطاب کا شوق دل میں آیا، سیدھے سادے انداز میں لوگوں کو مسائل بتا دیتا ہوں، انداز تکلم کسی کو پسند آئے یا نہ آئے کبھی فکر نہیں ہوتی۔

(۶) حسد کا چھٹا سبب ہے کہ ریاست کو پسند کرے، اور اپنے لئے ایسے مراتب پسند کرے کہ دوسرا اس کے ساتھ اس کے فن میں کوئی شریک نہ ہو، اگر اسے پتہ چل جائے کہ کوئی اور اس جیسا فن رکھتا ہے تو یہ اس کی موت کی تمنا کرے۔ کہ وہ مر جائے تاکہ میرا فن اور میرا منصب یکتا رہے دوسرا اس میں کوئی شریک نہ ہو۔

یا یہ تمنا کرے کہ اس سے وہ نعمت ہی زائل ہو جائے، تاکہ میرا ثانی کوئی نہ رہے۔ راقم کے

خیال میں یہ حسد طبیبوں میں زیادہ پایا جاتا ہے۔ اکثر طور پر وہ نسخے سنبھال کر رکھتے ہیں کسی کو نہیں بتاتے بلکہ یوں کہا جائے کہ وہ اپنے نسخے اپنے ساتھ ہی لے کر مر جاتے ہیں۔

(۷) حسد کا ساتواں سبب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بندوں پر بھلائی کے کاموں میں بخل کرنا، یعنی جب کوئی شخص سخاوت کرے تو اسے پسند نہ آئے، وجہ اس کی بھی درحقیقت یہ ہوتی ہے کہ سخاوت کی وجہ سے جب کسی کی تعریف کی جائے تو اسے پسند نہ آئے اسی وجہ سے کہا جاتا ہے۔

"**البخیل من بخل بمال غیرہ**" کامل بخیل وہ ہے جو غیر کے مال سے بخل کرے۔ یعنی خود سخاوت نہ کرنا تو دور کنار ہے بلکہ دوسرے کی سخاوت پر بھی جلنا اور حسد کرنا۔

جیسا کہ آج کل یہود و نصاریٰ کے یار دینی مدارس کے امداد کرنے والوں پر جل رہے ہیں۔ اور یہ سوچ رہے ہیں کہ ان لوگوں کو تنگ کیا جائے جو امداد کرتے ہیں لیکن ان مکاروں اور منافقوں کو معلوم نہیں کہ

نہ رہا ابن زیاد نہ اس کا جور و جفا رہا تو نام حسین جسے زندہ کرتی ہے کربلا

"**وھذا خبث فی الجبلة لاعن سبب عارض فتعسر ازالتہ**"

یہ حسد نفس کی خباثت کی وجہ سے ہوتا ہے۔ اس میں کوئی اسباب عارض نہیں ہوتے، اسی وجہ سے پلید شیطانوں کا حسد زائل ہونا مشکل ہوتا ہے۔

حسد کے اسباب سے سمجھ آیا:

ابھی تک حسد کے جو اسباب ذکر کئے گئے ہیں ان سے یہ سمجھ آیا کہ ایک ہی منصب اور ایک ہی پیشہ والے ایک دوسرے سے حسد کریں گے۔ دوسرے سے نہیں۔

عالم، عالم سے حسد کرتا ہے عابد سے نہیں، عابد، عابد سے حسد کرتا ہے عالم سے نہیں، تاجر، تاجر سے حسد کرتا ہے۔ جوتا بنانے والا، جوتا بنانے والے سے حسد کرتا ہے کپڑا بیچنے والے سے نہیں۔ ایک شخص اپنے بھائی اور اپنے چچازاد سے جتنا حسد کرتا ہے اتنا دوسرے لوگوں سے حسد نہیں کرتا۔ عورت اپنی سوکن سے جتنا حسد کرتی ہے اتنا اپنے خاوند کی ماں اور بیٹی سے حسد نہیں کرتی۔

حسد سے بچنے کا ذریعہ:

حسد کو زائل کرنے کی دواء دو چیزیں ہیں۔ ایک علم، دوسرا عمل۔

علم کے پھر دو مقام ہیں۔ اجمال اور تفصیل،

علم اجمالی یہ ہے کہ انسان یہ جانے کہ جس چیز کا تعلق وجود سے ہے خواہ موجود ہے یا موجود ہونا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی قدرت اور قضاء میں داخل ہے۔ جب انسان کو یہ علم حاصل ہو جائے اور اللہ تعالیٰ کی قضاء اور تقدیر پر راضی ہو جائے۔ تو حسد خود بخود زائل ہو جائے گا، اس لئے کہ انسان اس پر کامل یقین رکھے گا کہ جو مجھے ملا ہے یا ملنا ہے وہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی تقدیر میں ہے جو دوسرے کو حاصل ہے وہ بھی اسی کی تقدیر میں ہے۔ میرے حسد کرنے اور جلنے کا کیا فائدہ۔

علم تفصیلی یہ ہے کہ انسان کو یہ علم حاصل ہونا چاہئے کہ حسد کا نقصان مجھے ہی حاصل ہونا ہے دین میں اور دنیا میں بھی۔ میں نے جس سے حسد کیا اس کا نقصان نہ تو دینی ہے اور نہ دنیاوی۔ بلکہ میرے حسد کا اسے نفع ہی نفع ہونا ہے۔ دین میں بھی اور دنیا میں بھی۔

حسد کرنے والے کو دین میں نقصان ہونے کی چند وجوہ ہیں۔

(۱) اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ انسان کو یہ معلوم ہونا چاہیے اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لئے جو تقسیم فرمائی وہ اس کی حکمت کے تقاضا کے مطابق ہے، اگر میں نے اللہ تعالیٰ کی تقسیم کو ناپسند سمجھا اور اس کی تقسیم میں جھگڑا کیا تو یہ اللہ تعالیٰ وحدہ لاشریک پر اعتراض ہوگا۔ جو ایمان سے دور ہونے کا ذریعہ بن جائے گا۔

(۲) انسان کو یہ علم ہونا چاہیے کہ اگر میں نے کسی سے حسد کیا تو مجھے اللہ تعالیٰ کے ولیوں سے دور ہونا پڑے گا اور شیطان کا قرب حاصل ہو جائے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اولیاء اللہ اس پر خوش ہوتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو نعمتوں سے نوازا ہے۔ جب کوئی شخص اللہ کے بندوں کی نعمتوں پر حسد کرے اولیاء اللہ اسے اپنے آپ سے دور کر دیتے ہیں۔

لیکن شیطان اور تمام کافر حسد کرنے والے پر خوش ہوتے ہیں۔ لہٰذا وہ حسد کرنے والے کو اپنا

قریبی دوست بنا لیتے ہیں۔

(۳) " العقاب العظیم المرتب علیه فی الآخرة "حسد کرنے والے کو دینی نقصان کی تیسری وجہ یہ ہے کہ اسے آخرت میں بہت بڑا عذاب ہوتا ہے۔

حسد کرنے والے کو دنیاوی نقصان یہ ہوتا ہے۔ کہ حسد کی وجہ سے وہ ہمیشہ غم میں ہوتا ہے، اور اس کی طبیعت بجھی بجھی رہتی ہے۔ اور سب سے بڑا نقصان اے حسد کرنے والے تیرا یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ تیرے دشمنوں کو نعمتیں عطاء کرتا ہی رہے گا۔ جب تو نے ہر نعمت کو دیکھ کر جلنا ہے تو تجھے ہر وقت غم میں رہنا پڑے گا۔

اور غم کی وجہ سے تیرے بدن کو مرض لاحق ہوگی اور صحت تیری زائل ہو جائے گی۔ اور تجھے وسوسہ کی بیماری لاحق ہوگی کھانے پینے میں تجھے کوئی لذت حاصل نہیں ہوگی۔

ابھی تک جو ذکر کیا ہے۔ اس سے بہت واضح ہوگیا ہے کہ حسد کرنے والے کو دین و دنیا میں نقصان ہوتا ہے۔

جس سے حسد کیا جائے اس کا دین اور دنیا میں کوئی نقصان نہیں۔

جب یہ بات واضح ہے کہ کسی کے حسد کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا زوال نہیں ہوسکتا، بلکہ جب تک اللہ تعالیٰ کی تقدیر میں رہنا ہے اس وقت تک رہنا ہی رہنا ہے۔ کیونکہ رب تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

﴿ فَاِنَّ كُلَّ شَيْءٍ عِنْدَه' بِمِقْدَارٍ ﴾ بے شک ہر چیز اس کے ہاں ایک اندازے کے مطابق ہے، یعنی ہر چیز تقدیر کے مطابق ہے۔ اور ارشاد باری تعالیٰ ﴿ وَلِكُلِّ اَجَلٍ كِتَابٌ ﴾ ہر اجل لوح محفوظ میں ہے۔

جب ہر چیز کا وقت مقرر ہے، ہر چیز رب تعالیٰ کی تقدیر میں ہے تو کسی کے حسد کرنے سے دوسرے کا کیا نقصان ہونا ہے۔

﴿ ومهما لم تزل النعمة بالحسد لم يكن على المحسود ضرر فى الدنيا ولا عليه اثم فى الآخرة ﴾

جب حسد کی وجہ سے نعمت کا زوال نہیں تو جس سے حسد کیا جائے اس کا دنیا میں کوئی نقصان نہیں اور نہ ہی اسے آخرت میں کوئی گناہ ہوتا ہے کہ اس کا اخروی نقصان ہو۔

جس سے حسد کیا جائے اسے دین میں یہ نفع حاصل ہوتا ہے۔ کہ وہ مظلوم ہے، حاسد اپنے قول اور فعل سے اسے ایذاء پہنچاتا ہے۔ اس کی غیبت کرتا ہے۔ اس پر عیب لگاتا ہے، اس کی پردہ دری کرتا ہے۔ اس کے گناہوں کا ذکر کرتا ہے۔

یہ تمام چیزیں دراصل اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے لئے نعمتیں اور ہدیئے ہیں۔ کیونکہ اگر حسد کرنے والے نے اس سے اپنے ذمہ حقوق کو معاف نہ کرایا تو قیامت کے دن اس کی نیکیاں اسے دے دی جائیں گی، جس سے یہ حسد کرتا رہا۔ جس سے حسد کیا جائے اسے دنیا میں بھی نفع حاصل ہوتا ہے، کیونکہ انسان کی اہم غرض یہ ہوتی ہے کہ وہ دشمنوں کو غم پہنچانا چاہتا ہے، جب حاسد اس کی نعمتوں کو دیکھ کر جلے گا، اور اسے غم لاحق ہوگا تو یہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوگا کہ اپنے حاسد دشمن کو جلا رہا ہے۔

" ان العاقل لایشتھی موت عدوہ بل یرید طول حیاتہ لیکون فی عذاب الحسد "

عقلمند شخص اپنے دشمن کی موت کی تمنا نہیں کرتا۔ بلکہ اس کی لمبی حیاتی کو چاہتا ہے۔ تاکہ وہ حسد کے عذاب میں مبتلاء رہے۔

لا مات اعداؤک بل خلدوا　　حتی یروا منک الذی یکمد

لازلت محسودا علی نعمة　　فانما الکامل من یحسد

تمہارے دشمن نہ مریں بلکہ ہمیشہ زندہ رہیں۔ یہاں تک کہ تمہاری نعمتوں کو دیکھ کر ان کی طبیعت میں جمود رہے۔

جس سے حسد کیا جائے ان کی نعمتیں قائم رہیں۔　　تاکہ حسد کرنے والوں کا حسد کامل ہوتا رہے

" ان الحاسد یصیر مذموما بین الخلق ملعونا عندالخالق وھذا من اعظم المقاصد للمحسود "

بے شک حسد کرنے والا مخلوق کے ہاں مذموم (قابل مذمت) ہوتا ہے۔ اور خالق کے ہاں لعنت کا مستحق ہوتا ہے۔ لہٰذا جس سے حسد کیا جائے گا اسے عظیم مقصد حاصل ہوگیا کہ اس کا دشمن مخلوق کے ہاں مذموم اور خالق کے ہاں ملعون ہے۔

عمل سے حسد کا زوال:

ان الحاسد اذا اتی بضد موجبات الحسد علی سبیل التکلف یصیر ذلک بالآخرہ طبعا له فیزول الحسد عنه"

حسد کرنے والا جب حسد کے اسباب کے خلاف کام شروع کر دے اگرچہ ابتدائی طور پر تکلف سے وہ کام کرے گا لیکن آہستہ آہستہ وہ کام اسکی طبیعت میں راسخ ہو جائیگا۔ اور حسد کا زوال ہو جائیگا۔

واضح ہوا کہ حسد کے موذی مرض کی دواء علم اور عمل ہے۔ پہلے یہ پتہ چلے کہ حسد کے نقصانات کیا ہیں۔ پھر حسد کے اسباب کے خلاف محنت و مشقت کرے تو ان شاء اللہ حسد سے اسے نجات حاصل ہو جائیگی۔

(ماخوذ از کبیر، واحیاء العلوم)

آیۃ کریمہ سے حاصل ہونے والے مسائل:

اہل کتاب مؤمنین کو ایمان سے ہٹانے کو پسند کرتے تھے، حالانکہ ان پر یہ بات واضح ہو چکی تھی کہ ایمان صواب (درست) اور حق ہے۔

اور وہ بھی جانتے تھے کہ جو شخص حق پر ہو اسے حق سے پھیرنا اس وقت تک ممکن نہیں جب تک اس پر شبہات نہ ڈالیں جائیں۔ " لان المحق لایعدل عن الحق الا بشبهة "

شبہ وہ دو قسم کا ڈالتے تھے، ایک تو یہ کہ مسلمانوں کو کہنا تمہیں گھروں سے نکالا گیا ہے۔ تم پر معیشت تنگ ہے۔ یعنی مال و دولت کی تمہارے پاس کمی ہے۔ اور تم پر کفار کی جنگوں کا ہر وقت خوف مسلط رہتا ہے۔ لہٰذا " فاتر کوا الایمان الذی ساقکم الی هذه الاشیاء " تم ایمان کو چھوڑ دو جس نے تمہیں ان چیزوں کی طرف پہنچایا ہے۔ اور وہ شبہات اس طرح پیش کرتے کہ نبی کریم ﷺ کے جو اوصاف اور علامات توراۃ میں بیان کئے گئے تھے۔ ان کو بدل دیتے تھے، اور آپ کے معجزات پر شکوک و شبہات پیدا کر کے لوگوں کو ایمان سے پھیرنے کی کوشش کرتے لیکن صحابہ کرام کو ایمان سے پھیرنا ان کی طاقت سے باہر تھا۔

﴿ فَاعْفُوْا وَاصْفَحُوْا ﴾ (معاف کرواور درگذر کرو) کا یہ مطلب نہیں کہ وہ تمہیں ایمان سے پھیرنے کی کوشش کریں تو تم ان کے اس عمل کو پسند کرلو اس لئے کہ یہ کفر ہے۔

" ولایجوز ان یأمرھم تعالی بالعفو والصفح علی وجه الرضاء بما فعلوا لان ذلک کفر "

بلکہ اس کا مطلب یہ ہے۔ " ان المراد ترک المقابلة والاعراض عن الجواب " کہ تم ان سے مقابلہ کو چھوڑ دو، اور جواب دینے سے اعراض کرلو، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کا حکم آ جائے۔ (پہلے وضاحت ذکر کی جا چکی ہے)۔

اعتراض: حسد کرنے والے کے دل میں نفرت پائی جاتی ہے۔ جس کی وجہ سے وہ حسد کرتا ہے۔ جس شخص سے یہ حسد کررہا ہے جب اس کے خلاف اس کے دل میں نفرت ہے۔ " **فھذا امر غیر داخل فی وسعه فکیف یعاقب علیه** " تو اس پر عذاب کیسے ہوگا، دل میں پائی جانے والی چیزوں پر تو بندے کو اختیار ہی نہیں۔

جواب: اس کی وسعت میں دو چیزیں پائی گئی ہیں۔ ایک تو یہ کہ یہ اس نفرت پر راضی ہے۔ لہٰذا دل میں پائی جانے والی نفرت پر راضی ہونا جب اسی کے اختیار میں ہے تو اس وجہ سے یہ عذاب کا مستحق ہوگا۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ یہ اس نفرت کا اظہار دوسرے کے عیب بیان کر کے کرتا ہے، اور اس کی نعمتوں کو زائل کرنے کی کوشش بھی کرتا ہے، اور اس کی نعمت کے زوال کے اسباب کو پسند کرتا ہے، یہ سب کچھ اس کے اختیار میں ہے۔ اسی پر عذاب مرتب ہوگا۔ (از کبیر)

☆☆☆

﴿ وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ ؕ وَمَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِکُمْ مِّنْ خَیْرٍ تَجِدُوْہُ عِنْدَاللّٰہِ ؕ اِنَّ اللّٰہَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ ﴾(۱۱۰)

۱) اور نماز قائم رکھواور زکوٰۃ دواور اپنی جانوں کے لئے جو بھلائی آگے بھیجو گے اسے اللہ کے یہاں پاؤ گے، بے شک اللہ تمہارے کام دیکھ رہا ہے۔

۲) اور قائم رکھو نماز، اور دو زکوٰۃ، اور جو آگے بھیجو گے اپنی جانوں کے لئے پالو گے اسے اللہ کے ہاں، بے شک اللہ تمہارے عملوں کو دیکھنے والا ہے۔

اس سے پہلی آیت میں یہود کو معاف کرنے اور درگزر کرنے کا حکم دیا۔ جس میں غیر کی اصلاح مقصود تھی۔

اب اس آیۃ کریمہ میں نماز ادا کرنے اور زکوٰۃ دینے اور ہر قسم کے نیکی کے کام کا حکم دے کر ان کو اپنے نفسوں کی اصلاح کا حکم دیا گیا۔ (از کبیر)

﴿ وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ ﴾ کے متعلق پہلے وضاحت ذکر ہو چکی ہے

﴿ وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ ﴾ عطف علی (فاعفوا) کأنه تعالٰی امرهم بالصبر والمخالقة واللجأ الی الله تعالٰی بالعبادة والبر ﴾ (بیضاوی)

﴿وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ﴾ الخ کا عطف ہے (فَاعْفُوْا) پر، گویا کہ اللہ تعالیٰ نے پہلی آیۃ کریمہ میں ان کو صبر کرنے اور حسن خلق کا حکم دیا، اب اس آیۃ کریمہ میں عبادت اور نیکی سے پناہ پکڑنے کا حکم دیا۔

" واقیموا الصلوٰۃ ...... الخ " سے اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو عبادت پر برانگیختہ کیا تاکہ قیامت کے دن ان کو نفع ہو، دنیا میں بھی اللہ تعالیٰ کی ان کو امداد حاصل ہو، اور قیامت کے دن بھی رب تعالیٰ کی طرف سے ان کو نصرت حاصل ہو، قیامت کے دن اعمال نے ہی کام آنا ہے۔ اس دن کوئی عذر قبول نہیں ہوگا۔ (از ابن کثیر)

﴿وَمَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِکُمْ مِّنْ خَیْرٍ﴾

(اور جو آگے بھیجو تم اپنے نفسوں کے لئے بھلائی کے کام)

" فان الخیر یتناول اعمال البر کلها " خیر کا لفظ نیکی کے تمام کاموں کو شامل ہے۔ خواہ وہ فرائض ہوں یا نوافل ہوں، نماز ہو یا صدقات ہوں، البتہ نماز اور زکوۃ کو علیحدہ ذکر کیا ہے اس پر تنبیہ کرتے ہوئے کہ یہ اللہ کے ہاں عظمت شان اور قدر میں بلندی رکھتی ہیں۔

نماز اللہ تعالیٰ اور اس کے بندے کے درمیان قربت کا ذریعہ ہے، جو تمام نیکی کے افعال کو جامع ہے۔ اور اس میں بہت ہی زیادہ خشوع اور خضوع (عجز و انکسار) پایا جاتا ہے۔ اور نماز میں اللہ تعالیٰ کے حضور قیام اور اس ذات کبریاء سے عاجز بندے کی مناجات پائی جاتی ہے۔ اور اسی نماز میں تمام باطنی اعضاء استعمال ہوتے ہیں۔ کیونکہ دل میں نیت پائی جاتی ہے۔ اور خلوص پایا جاتا ہے۔ اور رب تعالیٰ کا خوف پایا جاتا ہے۔ اور اس کی رضاء پائی جاتی ہے۔ اور ذہن عقلی نماز میں رب تعالیٰ کی تعظیم اور تکریم کے لئے حاضر ہوتا ہے تا کہ اللہ کی نعمتوں کا ہر عضو شکر کر سکے۔ جتنی انسان کی وسعت ہوتی ہے وہ اللہ تعالیٰ کی عظمت کو بجالاتا ہے۔

اسی طرح زکوۃ قربة مالیه ہے، اور اغنیاء اللہ تعالیٰ کا شکریہ ادا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں دنیا میں مال عطاء کر کے اور اس کو ضروریات میں خرچ کرنے کی توفیق عطا کر کے اور لذت عیش عطا فرما کر اپنے فضل سے نوازا ہے تو وہ لوگ زکوۃ ادا کر کے رب تعالیٰ کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔ رب تعالیٰ کے حکم کو بجالا کر ایک فریضہ کو ادا کرنے کی ذمہ داری پوری کرتے ہیں بالخصوص اللہ تعالیٰ نے جب زمین کو تمام کے لئے مسخر کیا ہے۔ ﴿ وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ﴾

اور زمین کی تمام چیزوں کو تمام کے نفع کے لئے بنایا، جیسا کہ رب تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ﴾ پھر بعض لوگوں کو جب زیادہ نعمتیں عطاء ہوں تو ان کا شکر کرنا بھی ضروری ہوتا ہے۔

اور زکوۃ ادا کرنے میں تالیف قلوب بھی پائی گئی ہے۔ کیونکہ جس کو زکوۃ دی جائے گی اسکے دل میں دینے والے کیلئے الفت پائی جائے گی۔ اسی طرح ایک دوسرے پر اظہار شفقت و رحمت پایا جائیگا۔

اور زکوۃ کا ادا کرنا اللہ تعالیٰ کی رحمت کا ذریعہ ہے۔ " فان الراحمین یرحمهم ارحم الراحمین " کیونکہ رحم کرنے والوں پر ارحم الراحمین رحم کرتا ہے۔ (ماخوذ از شیخ زادہ)

تنبیہ: علامہ رازی رحمہ اللہ نے ذکر فرمایا ہے کہ نماز اور زکوٰۃ احکام فرضیہ ہیں، ان دو کا ذکر عظمت شان کی وجہ سے کردیا گیا، اور باقی فرضی عبادات ان کے ضمن میں آ گئی ہیں۔ اور ﴿وَمَا تُقَدِّمُوا لِاَنْفُسِكُمْ مِّنْ خَيْرٍ﴾ میں " خیر " سے مراد نفلی نمازیں اور نفلی صدقات ہیں۔

راقم کے نزدیک علامہ رازی رحمہ اللہ نے " من خیر " سے مراد " التطوعات من الصلوٰۃ والزکوٰت " جو ذکر کیا ہے اس سے مراد بھی یہ ہے کہ نفلی نمازوں اور صدقات کا ذکر ان کی عظمت شان کے پیش نظر کردیا گیا باقی ہر قسم کی بھلائیاں ان کے ضمن میں آ گئیں۔

راقم کے نزدیک تو یہ عظمت قرآن ہے کہ جب یہ بیان کرو کہ " من خیر " سے مراد ہر قسم کی نیکی کا کام ہے خواہ فرض ہو یا نفل، خواہ نماز و زکوٰۃ ہو یا اس کے علاوہ، البتہ نماز اور زکوٰۃ کا ذکر ان کی عظمت شان اور رفعت قدر کے پیش نظر کردیا گیا ہے۔

یا یوں بیان کیا جائے کہ نماز اور زکوٰۃ کا ذکر کرکے تمام فرائض کو ذکر کردیا گیا۔ اور "من خیر" سے مراد نفلی نماز اور صدقات ذکر کرکے تمام نفلی نیکیوں کا ذکر کردیا گیا ہے۔

حکمت: " والحکمۃ الکلیۃ فی جمیع ما انعم اللہ تعالیٰ بہ علی المکلفین فی الدنیا ان یقدموہ الی معادھم ویدخروہ الی یومھم الآجل "

اللہ تعالیٰ نے مکلفین کو جو نعمتیں عطاء کی ہیں ان تمام کا تقاضا یہی ہے کہ ان کو قیامت کے لئے آگے بھیجے، رب تعالیٰ نے پاؤں دیئے ہیں تو نیکی کے کاموں کی طرف ان سے چل کر جائے، غرضیکہ ہر عضو، ہر نعمت کو رب کی راہ میں لگا کر اپنی آخرت کو سنوارنے کا ذریعہ بنائے۔

☆ حدیث پاک میں ہے۔

" ان العبد اذا مات قال الناس ما خلّف وقالت الملائکۃ ما قدّم "

انسان جب فوت ہو جاتا ہے تو لوگ کہتے ہیں وہ پیچھے کیا چھوڑ کر گیا، اور فرشتے کہتے ہیں اس نے آگے کیا بھیجا، یعنی مرنے والے کے ورثاء مال کی فکر میں ہوتے ہیں لیکن فرشتے اس کے نیکی کے کاموں کو دیکھتے ہیں، جن پر اسے جزاء وخیر کا مستحق قرار دیا جاتا ہے۔

☆ عن عبد اللہ قال قال رسول اللہ ﷺ " ایکم مال وارثہ احب الیہ من مالہ " قالوا یارسول اللہ ما منا من احد الا مالہ احب الیہ من مال وارثہ قال رسول اللہ ﷺ " لیس منکم من احد الامال وارثہ احب الیہ من مالہ ، مالک ما قدمت و مال وارثک ما اخرت "

(نسائی و ھکذا فی البخاری بالالفاظ المختلفۃ)

حضرت عبداللہ ﷺ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا'' تم میں سے کون سا شخص اپنے مال سے زیادہ اپنے وارث کے مال کو محبوب رکھتا ہے؟ صحابہ کرام نے عرض کیا یا رسول اللہ ہم میں سے کوئی ایک بھی نہیں جسے اپنے مال سے زیادہ اپنے وارث کے مال سے محبت ہو (یعنی ہر شخص اپنے مال کو ہی پسند کرتا ہے) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم میں سے کوئی ایک بھی ایسا نہیں جسے اپنے مال سے زیادہ وارث کے مال سے محبت نہ ہو۔

تمہارا مال تو وہ ہے جو تم نے آگے بھیج دیا۔ اور جو تم نے پیچھے چھوڑا وہ تمہارے وارث کا مال ہے۔

☆ " وعن عمر بن خطاب ﷺ انه مر ببقيع الغرقد فقال السلام عليكم اهل القبور اخبار ما عندنا ان نساء كم قد تزوجن و دوركم قد سكنت و اموالكم قد قسمت فاجابه هاتف يا ابن الخطاب اخبار ما عندنا ان ما قدمناه وجدناه ، وما انفقنا فقد ربحناه وما خلفناه فقد خسرناه "

حضرت عمر بن خطاب ﷺ جنت البقیع سے گزرے تو آپ نے فرمایا " السلام علیکم اهل القبور " اے قبروں والو تم پر سلام ہو۔ ہمارے پاس (تمہاری) خبر یہ ہے، کہ تمہاری بیویوں نے اور شادیاں کرلیں، اور تمہارے گھروں میں تمہارے ورثاء رہ رہے ہیں، اور تمہارے مال تقسیم کر لئے گئے ہیں۔

غیبی آواز آپ کے پاس آئی، جس میں یہ جواب دیا گیا اے ابن خطاب ہمارے پاس (ہماری) خبر یہ ہے کہ جو ہم نے آگے بھیجا وہ ہم نے پالیا۔ اور جو ہم نے خرچ کرلیا اس سے ہم نے نفع اٹھالیا۔ اور جو ہم پیچھے چھوڑ آئے اس میں ہمیں خسارہ ہوا۔

قدم لنفسك قبل موتك صالحا . واعمل فليس الى الخلود سبيل

اپنی موت سے پہلے اپنے لئے نیکی کے عمل کرلے۔ اور عمل کرلے یہاں تو نے ہمیشہ نہیں رہنا۔

قدم لنفسك توبة مرجوة قبل الممات وقبل حبس الالسن

اپنے لئے توبہ کی قبولیت کی امید پر عمل آگے بھیج

موت کے آنے سے پہلے، اور زبان کے بند ہونے سے پہلے

ولدتك اذ ولدتك امك باكيا والقوم حولك يضحكون سرورا

فاعمل ليوم تكون فيه اذا بكوا في يوم موتك ضاحكا مسرورا

جب تیری ماں نے تجھے جنا تو تو رورہا تھا اور لوگ تیرے ارد گرد خوشی سے ہنس

رہے تھے۔

آج کچھ عمل کر لے کہ تیری موت کے وقت لوگ رو رہے ہیں، تو خوشی سے ہنس رہا ہو۔

سابق الی الخیر وبادر بہ فانما خلفک ما تعلم

وقدم الخیر فکل امرئ علی الذی قدمہ یقدم

نیکی کے کاموں میں سبقت کر اور اس کی طرف جلدی کر جو تو نے پیچھے چھوڑ جانا ہے اسے تو جانتا ہی ہے۔

نیکیاں آگے بھیج، ہر انسان نے جو آگے بھیجنا ہے اسی سے اس نے آگے بڑھنا ہے۔

اسعد بمالک فی حیاتک انما یبقی وراءک مصلح و مفسد

و اذا ترکت لمفسد لم یبقہ واخوا الصالح قلیلہ یتزید

وان استطعت فکن لنفسک وارثا ان المورّث نفسہ لمسدّد

نیکی کی راہ میں اپنا مال اپنی زندگی میں خرچ کر لو، تمہارے پیچھے باقی رہنے والے کوئی نیک ہوں گے کوئی فسادی۔

جب تم نے اپنا مال فساد پھیلانے والوں کے لئے چھوڑا تو وہ ضائع ہو گیا۔ اور نیک لوگوں کو دیا ہوا قلیل مال بھی بڑھتا رہے گا۔

اگر تم طاقت رکھتے ہو تو اپنا وارث اپنے آپ کو ہی بنالو، جو اپنے آپ کو اپنا وارث بنا لیتا ہے وہ درست راہ پر ہوتا ہے۔

اس تمام بحث سے یہ واضح ہوا کہ اپنے لئے آگے بھیجی ہوئی نیکی نے ہی کام آنا ہے۔ جو مال اللہ کی راہ میں اپنی زندگی میں خرچ کر لیا اس کا نفع حاصل ہوتا ہے۔ اسی کا خود وارث بنتا ہے۔ (از قرطبی)

"تجدوہ عند اللہ" (پالو گے اسے اللہ کے ہاں) یعنی جو کام بھی نیکی کا تم نے کیا اس کا ثواب تم اللہ کے ہاں پالو گے۔

یہاں یہ مطلب نہیں کہ تم وہ اپنے اعمال ہی پالو گے۔ عمل تو باقی نہیں رہتے۔ البتہ ان کا ثواب حاصل ہونا ہے۔ (از کبیر)

﴿اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ بَصِيۡرٌ﴾ (بے شک اللہ تمہارے عملوں کو دیکھنے والا ہے) یعنی تمہارے اعمال کو رب تعالیٰ دیکھ رہا ہے۔ اس لئے تمہارا کوئی عمل ضائع نہیں جائے گا۔ خواہ وہ نیک عمل ہوا یا برا۔ ہر عمل کے مطابق عمل کرنے والے کو ثواب یا عذاب دیا جانا ہے۔ (از کبیر)

﴿ وَقَالُوا لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى ط تِلْكَ اَمَانِيُّهُمْ ط قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صَادِقِيْنَ ﴾

۱) اور اہل کتاب بولے ہرگز جنت میں نہ جائے گا مگر وہ جو یہودی یا نصرانی ہو یہ ان کی خیال بندیاں ہیں۔تم فرماؤ لاؤ اپنی دلیل اگر سچے ہو۔

۲) اور انہوں نے کہا ہرگز داخل نہیں ہوگا جنت میں سوائے اس کے جو یہودی ہو یا نصرانی، یہ آرزوئیں ہیں ان کی۔تم فرماؤ، لے آؤ تم دلیل اگر ہو تم سچے۔ (آیت ۱۱۱)

اس آیۃ کریمہ میں یہود و نصاریٰ کے کلام کو خلط ملط کرنے اور مسلمانوں کے دلوں میں شکوک و شبہات ڈالنے کا ذکر کیا جارہا ہے۔کہ وہ کہنے لگے جنت میں تو صرف یہود جائیں گے۔اور دوسرے فرقے کا دعویٰ تھا جنت میں صرف نصاریٰ جائیں گے۔ان کا مطلب یہی ہوتا تھا کہ مسلمان اسلام سے پھر جائیں۔ (از کبیر)

شانِ نزول: نجران کے یہود و نصاریٰ کا ایک وفد نبی کریم ﷺ کے پاس آیا۔وہ ایک دوسرے کی تکذیب کرنے لگے۔یہود کہنے لگے کہ جنت میں صرف یہود جائیں گے۔نصاریٰ کہنے لگے جنت میں صرف نصاریٰ جائیں گے۔اگرچہ مقصد ہر فریق کا مسلمانوں کے دلوں میں مشکوک و شبہات ڈالنا تھا۔تاہم ضمناً ہر فریق ایک دوسرے کی تکذیب بھی کر رہا تھا۔

وَقَالُوا لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى: (اور انہوں نے کہا ہرگز جنت میں نہیں داخل مگر وہ جو یہودی ہو یا نصرانی) یہاں یہ مطلب نہیں کہ یہود و نصاریٰ مجموعی طور پر یہ کہتے تھے کہ جنت میں ہم یہودی اور نصرانی جائیں گے۔بلکہ یہودی صرف اپنے جنتی ہونے کے دعویدار تھے۔اور نصرانی صرف اپنے جنتی ہونے کے دعویدار تھے۔

اس پر قریب ہی آنے والی آیۃ کریمہ شاہد ہے۔﴿ وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ لَيْسَتِ النَّصٰرٰى عَلٰى شَيْءٍ وَّقَالَتِ النَّصٰرٰى لَيْسَتِ الْيَهُوْدُ عَلٰى شَيْءٍ ﴾ یہود نے کہا نصاریٰ کسی چیز (کسی

دین) پر نہیں۔اور نصرانیوں نے کہا یہود کسی چیز (یعنی کسی دین) پر نہیں۔

اس سے واضح ہوا کہ ہر فریق دوسرے فریق کو بے دین سمجھتا تھا۔لہٰذا یہود کا نصرانیوں کو جنتی کہنا کسی طرح بھی ثابت نہیں ہوسکتا۔اسی طرح نصاریٰ کا یہود کو جنتی کہنا بھی ثابت نہیں ہوسکتا۔(از خازن)

(وقالوا) عطف علی (ود) والضمیر لاھل الکتاب من الیھود والنصاری " (وقالوا) کا عطف ہے (ود) پر اور ضمیر " اھل کتاب " کی طرف لوٹ رہی ہے۔اھل کتاب یہودی بھی ہیں اور نصرانی بھی ہیں۔ " ھودا او نصاری " لف ونشر مرتب ہیں۔یعنی حاصل کلام یہ ہوا۔" وقالت الیھود والنصاری لن یدخل الجنة الا من کان ھودا او نصاری "

لف ونشر مرتب یہ ہوتا ہے کہ پہلے چند چیزوں کو ایک ساتھ ذکر کر دیا جائے۔پھر چند چیزیں ذکر ہوں۔پہلی کا تعلق پہلی سے ہو اور دوسری کا تعلق دوسری سے ہو۔جیسا کہ یہاں " وقالوا " کی ضمیر ''اہل کتاب'' کی طرف لوٹ رہی ہے۔اس سے مراد ''یہود اور نصاریٰ'' ہیں۔اب " ھودا " کا تعلق یہود سے ہوگیا۔اور نصاریٰ کا تعلق نصاریٰ سے ہوگیا۔

اب معنوی طور پر مطلب یہ ہوگیا۔" وقالت الیھود لن یدخل الجنة الا من کان ھودا وقالت النصاری لن یدخل الجنة الا من کان نصاری "اور یہود نے کہا ہرگز جنت میں کوئی داخل نہیں ہوگا سوائے یہودیوں کے۔اور نصاریٰ نے کہا ہرگز جنت میں کوئی داخل نہیں ہوگا سوائے نصرانیوں کے۔ (از بیضاوی و شیخ زادہ)

اعتراض : کان میں ضمیر جو اسم ہے وہ واحد ہے۔اور خبر " ھودا او نصاری " جمع ہے۔ ''کان '' کا اسم واحد اور خبر جمع کیسے صحیح ہے؟

جواب : چونکہ لفظ " من " کا ذکر ہے۔جو لفظی طور پر واحد ہے۔لیکن اس کے معنی میں عموم پایا جاتا ہے،اس لئے معنوی طور پر جمع ہے۔اسی وجہ سے اس کی دونوں حیثیتوں کا لحاظ کیا گیا ہے۔(روح المعانی)

" ھودا " فراء کے نزدیک اصل میں " یھود " تھا،یاء کو حذف کر دیا گیا۔لیکن باقی حضرات کے نزدیک " ھود "،جمع ہے۔" ھائد "کی،جس کا معنیٰ ''توبہ کرنا'' چونکہ یہود نے بچھڑے کی پوجا کے بعد توبہ کر لی تھی اس لئے ان کو " ھود " کہہ لیا گیا۔

"نصاری" لفظ ماخوذ ہے " نصرة " سے جس کا معنی ہے، امداد کرنا۔ نصاری کا نام عیسیٰ علیہ السلام کی امداد کی وجہ سے نصاریٰ رکھ لیا گیا۔ (از شیخ زادہ و عزیزی)

﴿ تِلْكَ اَمَانِيُّهُمْ ﴾ (یہ ان کی آرزوئیں ہیں) امانی جمع ہے امنية کی۔ اصل میں امنوية ہے بروزن افعولة جیسے اضحوكة اور " اعجوبة " استعمال ہوتے ہیں۔ اور یہ لفظ " التمنی " سے ماخوذ ہے جس کا معنی ہے آرزو کرنا تمنا کرنا۔ (مدارک)

راقم نے اسی کے مطابق معنی کیا ہے، لیکن " تلك الامانی الباطلة " باطل آرزوئیں مراد ہیں، اسی وجہ سے اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ نے ترجمہ کیا ہے۔ "یہ ان کی خیال بندیاں ہیں"۔

تنبیه : "امنية" کا معنی کبھی تو یہ ہوتا ہے کہ وہ کلام جو واقع ہونے والی تقریر پر از روئے تمنا کے برانگیختہ کرے۔ اور کبھی صرف تقدیر کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ جیسا کہ کہا گیا ہے۔

ولا تقولن لشئ سوف افعله حتی تلاقی ما یمنی لک المانی

تم ہرگز کسی چیز کے متعلق یہ نہ کہو کہ میں یہ کروں گا۔

یہاں تک تمہاری ملاقات تو اسی سے ہوتی ہے جو تمہاری تقدیر میں ہونا ہے۔

اور کبھی " امنية " کا معنی صرف تمنا کرنا ہے خواہ حق ہو یا باطل ہو، جس طرح اس آیۃ میں استعمال ہے ﴿ تِلْكَ اَمَانِيُّهُمْ ﴾ یہ جملہ معترضہ ہے، لیکن یہاں جملہ معترضہ کا یہ معنی نہیں کہ ایک جملہ نامکمل ہونے کے درمیان یہ واقع ہے، بلکہ یہاں یہ مطلب ہے کہ دو کلامیں جو معنوی طور پر متصل ہیں ان کے درمیان یہ جملہ واقع ہے۔ اور اس کا کوئی محل اعراب نہیں۔

دو کلاموں کے درمیان اتصال کیسے ہے؟ وہ یہ کہ نبی کریم ﷺ کو حکم دیا گیا کہ آپ ان کو فرمائیں ﴿ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ ﴾ (تم دلیل لاؤ) دلیل تو دعوی پر لائی جاتی ہے۔ ان کا دعوی یہ تھا۔

﴿ لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى ﴾

اعتراض: جملہ معترضہ تو پہلے جملہ کی تاکید کے لئے آتا ہے۔ اس جملہ میں پہلے جملہ کی تاکید کیسے پائی گئی۔

جواب: پہلا جملہ ہے﴿ وَقَالُوا لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْنَصٰرٰى ﴾ یہ ان کے من گھڑت اور باطل دعویٰ کی حکایت ہے۔اور " امـانـی " کا معنی کبھی یہ بھی ہوتا ہے۔ "لاثبـوت لهـا " اس کا کوئی ثبوت نہیں۔اب پہلے جملہ اوراس جملہ معترضہ کا مجموعی مفہوم یہ ہوگیا۔ "قـول لا دليـل عـليـه غير ثابت " یہ ان کا ایسا قول ہے کہ جس پر کوئی دلیل نہیں اور نہ ہی یہ ثابت ہے۔جیسا کہ کسی شاعر نے کہا؛

من ادعى شيئا بلا شاهد　　لابد ان تبطل دعواه

جو شخص بلا دلیل دعوی کرے　　ضروری ہے کہ اس کا دعوی باطل ہو۔

(ماخوذ از شیخ زادہ)

قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ: ''فرمادو لے آؤ تم دلیل اگر تم سچے ہو''

" قل " خطاب ہے نبی کریم ﷺ کو (قل) یعنی یا محمد، اے محمد آپ فرمادیں۔ (خازن)

اعلیٰ حضرت کئی مقام پر " قـل " کا معنی کرتے ہیں۔''اے محبوب'' تو اس سے کئی جہلاء جل کر دھوکا میں مبتلاء ہوجاتے ہیں کہ ''اے محبوب'' کسی لفظ کا معنی نہیں۔کاش ان کو پتہ ہوتا کہ یہ " قل " میں ضمیر کے مرجع کا ذکر ہے۔ " هاتوا "میں مختلف احتمالات پائے گئے ہیں۔

(۱) هاتوا اصل میں " هاتيوا " ہے،امر ہے،اس کا فعل " هـاتـى يهاتى " استعمال ہوتا ہے۔ اس کا معنی حاضر کرو، لاؤ۔ یہ قول ہے ابوحیان کا۔اسی کو علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے پسند کیا ہے

(۲) دوسرا احتمال یہ ہے کہ " هـاتـوا "اصل میں " آتـوا " ہے۔ ہمزہ کو " هـاء " سے بدل دیا گیا ہے۔تفسیر ابی السعود اور عزیزی میں یہی قول ذکر کیا گیا ہے۔(معنی وہی ہے حاضر کرو۔لاؤ)

(از کبیر)

(۳) " هات صوت بمنزلة هاء في معنى احضر " " هات " صوت ہے " هاء " کی طرح معنی وہی ہے حاضر کرو لاؤ یہ قول علامہ رازی رحمہ اللہ کا ہے۔ (از کبیر)

(۴) یہ اسم فعل ہے، امر کے معنی میں ہے۔معنی وہی ہوگا ''لاؤ'' دوسرے اقوال کے ساتھ صاوی میں یہ قول بھی مذکور ہے۔

راقم کے نزدیک یہ تمام احتمالات دراصل اس لفظ کے استعمال کے مختلف طریقے ہیں۔یعنی ان تمام طریقوں پر یہ استعمال ہوتا ہے۔اور ہر طریقہ درست ہے،کسی قول کو غلط کہنا غلط ہے۔

(برھانکم) البرهان الدليل على صحة الدعوى " دعویٰ کے صحیح ہونے پر جو دلیل لائی جائے اسے برھان کہا جاتا ہے۔

" برھان " یا تو مشتق ہے۔" البرہ " سے،اور نون زائد ہے۔اس صورت میں معنی ہوتا ہے۔"قطع کرنا" دلیل بھی دعویٰ میں واقع ہونے والے شبہات کو منقطع کر دیتی ہے،اس لئے اسے برھان کہا جاتا ہے۔

اور بعض حضرات نے کہا ہے۔" برھان " مشتق ہے۔" البرھنة " سے،اس صورت میں نون اصلی ہوگا۔معنی یہ ہوگا "بیان کرنا" چونکہ دلیل سے دعویٰ کو بیان کیا جاتا ہے۔اس لئے اسے برھان کہا جاتا ہے۔

﴿إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِيْنَ﴾ (اگر تم سچے ہو) جواب شرط محذوف ہے،ماقبل ﴿هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ﴾ اس پر دلالت کر رہا ہے کیونکہ محققین نحویوں کے نزدیک جزاءِ شرط مقدم نہیں ہوسکتی شرط سے۔

اب مکمل مفہوم یہ ہوگیا۔اے محبوب آپ فرمادو کہ اگر تم اپنے اس دعویٰ میں سچے ہو کہ جنت کے مستحق صرف ہم ہی ہیں تو اپنے دعویٰ پر دلیل لاؤ۔ (از روح المعانی)

یعنی اگر تم دلیل نہیں لاسکو گے تو تم اپنے دعویٰ میں جھوٹے ہوگے۔جب وہ دلیل لانے سے عاجز آگئے تو ان کا جھوٹا ہونا بھی واضح ہوگیا۔

گذشتہ سے پیوستہ:

اعتراض: ﴿تِلْكَ اَمَانِيُّهُمْ﴾ میں اشارہ ﴿وَقَالُوْا لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ﴾ کی طرف ہے،ان کی یہ ایک آرزو ہے۔" امانی " جمع کا صیغہ کیوں ذکر کیا گیا۔

پہلا جواب: " تلک " کا اشارہ صرف ایک چیز کی طرف نہیں بلکہ متعدد چیزوں کی طرف ہے۔ایک تو ﴿مَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ﴾ الخ میں ذکر ہو چکا ہے کہ وہ چاہتے تھے مومنوں پر اللہ تعالیٰ اپنی رحمت نازل نہ فرمائے۔

دوسری چیز ﴿ وَدَّ كَثِيْرٌ ﴾ الخ، میں گذر چکی ہے کہ وہ چاہتے تھے کہ مومن کافر ہو جائیں۔

اور تیسری چیز اس آیۃ میں ذکر ہے کہ جنت میں صرف ہم داخل ہوں گے، مومن داخل نہیں ہوں گے۔ ان تمام چیزوں کی طرف اشارہ ہے کہ ان کی یہ تمام خواہشات باطل ہیں۔ (از کبیر)

دوسرا جواب : وہ اپنی ایک ہی آرزو کو بار بار دل میں لوٹاتے تھے۔ اس تکرار کی وجہ سے گویا کہ ان کی کئی آرزوئیں بن گئیں۔

تیسرا جواب : اگرچہ ان کی آرزو ایک ہی کیوں نہ ہو لیکن وہ اپنے باطل ہونے کی وجہ سے اس درجہ پر پہنچی ہوئی تھی کہ اسے جمع کا درجہ حاصل تھا، گویا کہ متعدد افراد اس میں پائے گئے "وهذا من بديع الاعجاز ونفائس البيان" ان دونوں جوابوں سے قرآن پاک کا عمدہ اعجاز اور نفیس بیان سمجھ میں آتا ہے۔

چوتھا جواب : اگر اشارہ ﴿ وَقَالُوْا لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ ﴾ کی طرف ہو تو پھر بھی بظاہر ایک چیز ہے، لیکن حقیقت میں متعدد چیزیں ہیں۔ ایک چیز یہود کا کہنا جنت میں صرف یہود داخل ہوں گے۔ اور دوسری چیز نصاریٰ کا کہنا جنت میں صرف نصاریٰ داخل ہوں گے، تیسری چیز ان کا کہنا جنت میں اور کوئی داخل نہیں ہوگا۔ یعنی مسلمان جنت میں داخل ہونے سے محروم ہوں گے۔

(از روح المعانی)

☆☆☆

﴿بَلٰی مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗۤ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ وَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ﴾ (آیت ۱۱۲)

۱) ہاں کیوں نہیں جس نے اپنا منہ جھکایا اللہ کے لئے اور وہ نکوکار ہے تو اس کا نیک بدلہ اس کے رب کے ہاں ہے۔ اور انہیں کچھ اندیشہ ہے اور نہ کچھ غم۔

۲) ہاں کیوں نہیں جس شخص نے جھکا دیا اپنے آپ کو اللہ کے لئے اور وہ نکوکار ہے۔ تو اس کے لئے اس کا اجر ہے اس کے رب کے ہاں۔ اور نہ خوف ہوگا ان کو اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

اللہ تعالیٰ نے اس آیۃ کریمہ میں یہود اور نصاریٰ دونوں فریقوں کا رد فرمایا کہ وہ دونوں اپنے دعوی میں جھوٹے ہیں۔ ان کا دعوی تو یہ ہے کہ جنت میں ہرگز کوئی اور داخل نہیں ہوگا سوائے اس کے جو یہودی ہیں۔ یہ یہود کا قول تھا۔ اور نصاریٰ نے کہا سوائے نصرانیوں کے جنت میں کوئی اور داخل نہیں ہوگا رب تعالیٰ نے فرمایا جنت میں تو صرف وہ لوگ جائیں گے جنہوں نے اپنے آپ کو اللہ کے لئے جھکا دیا۔ اعتقاد اور اعمال اور اقوال ان کے صرف رب تعالیٰ کی رضاء کے لئے ہوتے ہیں۔

واضح ہوا کہ پہلی قوموں میں بھی اور رسول اللہ ﷺ کی امت میں بھی وہی جنت کے مستحق ہوں گے جو اللہ تعالیٰ کے مطیع ہیں۔ صرف زبانی دعویٰ کہ جنت کے مستحق ہم ہی ہیں یہ باطل ہے۔

بَلٰی : (ہاں کیوں نہیں) "بلیٰ" نفی کے بعد ثبوت کے لئے آتا ہے۔ جیسا کہ یوم میثاق کو تمام اولاد آدم سے رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ﴾ کیا میں تمہارا رب نہیں۔ تو اس کے جواب میں ﴿قَالُوْا بَلٰی﴾ سب نے کہا ہاں کیوں نہیں۔ یعنی تو ہمارا رب ہے۔

اسی طرح یہاں بھی یہود و نصاریٰ کا کسی اور کے لئے جنت میں داخل ہونے کی نفی کرنے کو اللہ تعالیٰ نے " بلیٰ " کہہ کر رد فرما دیا ہاں کیوں نہیں۔ یعنی جنت میں تو اور لوگ بھی داخل ہوں گے۔

خیال رہے کہ یہ مطلب جو بیان کیا ہے۔ اس میں اس ایک لفظ " بـلٰـی " سے یہود و نصاریٰ کا

رد ہو گیا، اب " بلیٰ " پر وقف کرنا مستحسن ہوگا۔ اب آنے والا جملہ ﴿مَنْ اَسْلَمَ﴾ الخ علیحدہ ہوگا

ہاں اگر ﴿یدخلھا﴾ کو محذوف مانا جائے، اور ﴿مَنْ اَسْلَمَ﴾ کو فاعل مانا جائے تو اس صورت میں " بلیٰ " پر وقف درست نہیں ہوگا۔ بلکہ اب تمام کا ایک مفہوم ہوگا۔ جو آیۃ کے ترجمہ کے بعد متصل ذکر کیا جا چکا ہے۔

مَنْ : میں دو احتمال ہیں ایک یہ کہ یہ شرطیہ ہو، اس صورت میں ﴿فَلَهٗ اَجْرُهٗ﴾ الخ جواب شرط ہوگا اور فاء جزائیہ کہلائے گی۔

دوسرا احتمال یہ ہے کہ " من " موصولہ ہو۔ لیکن شرط کے معنی کو پھر بھی مستلزم ہے۔ اسی لئے خبر پر فاء آئی ہوئی ہے۔ یہ دراصل قرآن پاک کی عظمت ہے کہ ایک ایک لفظ کتنے کتنے معانی پر مشتمل ہے۔
(از بیضاوی و شیخ زادہ)

اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ : "و معنی اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ" " اخلص فی دینه لله " ایک معنی اس کا یہ ہے کہ جس نے اپنے دین میں اللہ تعالیٰ کے لئے خلوص رکھا۔

اور اس کا معنی یہ ہے۔ " اخلص عبادته لله " جس نے اللہ کے لئے اپنی عبادت میں خلوص رکھا

اور اس کا معنی یہ ہے کہ جس نے اپنا منہ اللہ کے لئے جھکایا۔ البتہ " وجه " (منہ) کا ذکر کیوں کیا، اس لئے کہ

" انه اشرف الاعضاء و مجمع المشاعر و موضع السجود ومظهر آثار الخضوع الذی هو من اخص خصائص الاخلاص "

کہ یہ تمام اعضاء سے اشرف ہے۔ اسی میں وہ تمام علامات پائی جاتی ہیں جن سے کسی کی پہچان ہوتی۔ یہ سجدہ کا مقام ہے۔ اسی پر خشوع وخضوع کے آثار مرتب ہوتے ہیں۔ جو اخلاص میں سب سے زیادہ مقصود ہے۔ یعنی خضوع سے ہی پتہ چلتا ہے کہ اس میں خلوص پایا گیا ہے۔

" فاذا جاء الانسان بوضع جبهه علی الارض فی السجود فقد جاء بجميع اعضائه "

جب انسان اپنے منہ کو یعنی پیشانی کو زمین پر رکھے تو گویا کہ اس نے اپنے تمام اعضاء کو زمین پر رکھ لیا۔

عمرو بن نفیل نے کہا:

واسلمت وجھی لمن اسلمت　　له الارض تحمل صخرا ثقالا

واسلمت وجھی لمن اسلمت　　له المزن تحمل عذبا زلالا

اور میں نے اپنے منہ کو جھکالیا اس ذات کے لئے جس کے لئے جھک گئی زمین جس نے بہت بھاری پتھر اٹھا رکھے ہیں۔

اور میں نے اپنے منہ کو جھکالیا اس ذات کے لئے جس کے لئے بادل جھک گئے جنہوں نے میٹھا اور ٹھنڈا پانی اٹھا رکھا ہے۔

اعلیٰ حضرت نے ﴿اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ﴾ کا معنی اسی قول کے مطابق کیا ہے۔ ''جس نے اپنا منہ جھکایا''

اس کا اور معنی یہ ہے۔ " وذکر الوجه واراد به نفس الشئ " کبھی وجہ کا ذکر کیا جاتا ہے لیکن اس سے مراد ذات ہوتی ہے۔ یعنی ''جس نے اپنے آپ کو جھکالیا۔''

علامہ کاظمی رحمہ اللہ نے یہی ترجمہ کیا ہے۔ راقم نے وہی نقل کیا ہے۔

" لله " ای خالصا لله تعالیٰ لایشوبه شرک فلا یکون عابدا مع الله غیره او معلقا رجاء بغیره "

''اللہ کے لئے'' کا مطلب یہ ہے کہ جس نے اپنے آپ کو خالص اللہ تعالیٰ کے لئے جھکایا، اس میں شرک کا کوئی شائبہ نہ پایا جائے۔ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی اور عبادت کا مستحق نہ سمجھے۔ اور اپنی امید رب کے بغیر کسی اور پر اس طرح نہ رکھے کہ رب تعالیٰ کے مقابل ہو کر حقیقی طور پر کوئی اور بھی امداد کر سکتا ہے۔ ہاں یہ عقیدہ رکھے کہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی طاقت سے اسکے بندے بھی امداد کرتے ہیں۔

" وفی ذلک دلالة علی ان المرء لاینتفع بعمله الا اذا فعله علی وجه العبادة فی الاخلاص والقربة "

اور اسی سے یہ مسئلہ حاصل ہو گیا کہ انسان کو اپنے اعمال سے اس وقت تک فائدہ حاصل نہیں ہوگا جب تک وہ کام بطور عبادت نہ کرے اور اس میں بھی خلوص پایا جائے اور رب تعالیٰ کے تقرب کا اسے ذریعہ سمجھے۔ (ماخوذ از خازن و تفسیر ابی السعود و کبیر)

اس کا اور معنی یہ ہے " واما مجاز عن القصد لان القاصد للشئ مواجه له " کہ وجہ کا

مجازی معنی قصد کرنا، کیونکہ کسی چیز کا ارادہ کرنے والے کو " مواجه له " کہا جاتا ہے۔ (روح المعانی)

قرطبی میں اس معنی کو سب سے زیادہ مختار سمجھا گیا ہے۔ اب مطلب یہ ہوگا۔ جس نے اللہ کی طاعت کا ارادہ کرلیا۔

وَهُوَ مُحْسِنٌ: (اور نیکوکار ہوا) ایک معنی احسان کا وہی ہے جس کا ذکر حدیث پاک میں ہے۔ " ان تعبد الله کأنک تراه فان لم تکن تراه فانه یراک " کہ تو اللہ کی عبادت کرے گویا کہ تو اسے دیکھ رہا ہے۔ اگر تو اسے نہیں دیکھ رہا تو بے شک وہ تجھے دیکھ رہا ہے۔ (از روح المعانی)

یہ جملہ حال ہے۔ یعنی معنی یہ ہوگا۔ **" والحال انه محسن فی جمیع اعماله التی من جملتها الاسلام المذکور وحقیقة الاحسان الاتیان بالعمل علی الوجه اللائق وهو حسنه الوصفی التابع لحسنه الذاتی "**

حال یہ ہے کہ وہ اپنے تمام اعمال اچھے کرے، ان تمام اعمال میں اپنے آپ کو رب کے حضور جھکانا بھی ہے۔

(بلکہ راقم کے نزدیک اپنے آپ کو رب کے حضور جھکانے سے ہی نیک اعمال اور درست اعتقاد حاصل ہوتے ہیں)

جب انسان اچھے اعمال کرتا ہے تو اسے حسن وصفی حاصل ہوتا ہے۔ یہ حسن وصفی درحقیقت حسن ذاتی کے تابع ہوتا ہے۔ جس کی اصل خلقت اور جبلت میں پاکیزگی ہوگی، اس کی عادات اور اس کے اعمال بھی پاکیزہ ہوں گے۔ پھر اسے وہ منصب حاصل ہوگا جس کا ذکر حدیث پاک میں ہے۔ جس کو اوپر روح المعانی کے حوالہ سے ذکر کیا جا چکا ہے۔ (ابو السعود)

فائدہ: عمل کے مقبول ہونے کی دو شرطیں ہیں۔ ایک یہ ہے کہ وہ عمل خالص اللہ تعالیٰ کی رضاء کے لئے کیا جائے اور دوسرا یہ ہے کہ وہ شریعت کے مطابق ہو۔

اگر کوئی شخص عمل تو اللہ تعالیٰ کے لئے کرتا ہے لیکن وہ عمل شریعت کے مطابق نہیں تو وہ مقبول نہیں۔

☆ قال رسول الله ﷺ من عمل عملا لیس علیه امر فهو رد " (رواه مسلم من حدیث عائشة)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے عمل کیا لیکن وہ ہمارے امر کے خلاف ہو تو وہ مردود ہوگا۔

اسی سے معلوم ہوا کہ اسلام میں " رھبانیة " نہیں۔یعنی جوگیوں اور پادریوں کی طرح دنیا والوں سے کنارہ کش ہونا، ہمیشہ جنگل میں رہنا، نماز باجماعت کو ترک کر دینا اور انسانوں سے منہ موڑ لینا جائز نہیں۔اگرچہ ان کاموں میں بظاہر اللہ تعالیٰ کی رضاء مندی مقصود ہوتی ہے۔لیکن نبی کریم ﷺ کی شریعت کے مخالف ہے۔آپ کی اتباع کے خلاف ہے۔

آپ کے ارشاد کے خلاف ہے کیونکہ آپ نے فرمایا" لا رھبانیة فی الاسلام "اسلام میں رہبانیت نہیں۔

دوسری چیز عمل کی مقبولیت کے لئے یہ ہے کہ وہ کام خالص اللہ تعالیٰ کے لئے ہو۔جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ﴿ فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ ☆ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلوٰتِهِمْ سَاهُوْنَ ☆ الَّذِيْنَ هُمْ يُرَآئُوْنَ ﴾ تو خرابی ہے ان نمازیوں کیلئے جو اپنی نماز سے بھولے بیٹھے ہیں۔اور وہ جو دکھاوا کرتے ہیں۔
(از ابن کثیر)

تنبیہ: شریعت کے مخالف وہ کام ہے جو قرآن اور سنت کے مخالف ہو۔وہ شریعت کے مخالف کام نہیں جو نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام نے نہیں کئے۔بلکہ ہر نئے کام کے لئے ضابطہ خود نبی کریم ﷺ نے بیان فرمایا ہے۔

☆ " قال رسول الله ﷺ من سن فی الاسلام سنة حسنة فله اجرها و اجر من عمل بها من بعده من غير ان ينقص من اجورهم شئ ومن سن فی الاسلام سنة سيئة كان عليه وزرها ووزر من عمل بها من بعده من غير ان ينقص من اوزارهم شئ " (مشکوۃ باب العلم)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، جس شخص نے اسلام میں اچھا طریقہ ایجاد کیا اسے اس کا ثواب ملے گا، اور اس کے بعد جتنے لوگ اس پر عمل کریں گے ان کے مطابق بھی اس کو ثواب ملے گا۔جب کہ ان عمل کرنے والوں کے ثواب میں کوئی کمی واقع نہیں ہوگی۔اور جو شخص اسلام میں برا طریقہ رائج کرتا ہے، اس کو برے طریقہ کے راوج دینے کا گناہ ہوگا۔اور جتنے لوگ اس پر عمل کریں گے ان کے مطابق بھی ایجاد کرنے والے کو گناہ ہوگا۔جب کہ ان کے گناہوں میں کوئی کمی نہیں ہوگی۔

اس حدیث پاک سے واضح ہوا کہ اسلام میں اچھا طریقہ ایجاد کرنا ناجائز نہیں۔ بلکہ مستحب ہے کیونکہ نیکیوں کا سبب ہے۔البتہ برا طریقہ رائج کرنا گناہوں کا سبب ہے اس سے بچنا ضروری ہے۔

یہ سوال نہایت لغو اور بے حقیقت ہے کہ اسلام کیا اس وقت مکمل نہیں تھا؟ اسلام مکمل ہی تھا، اسی لئے تو نبی کریم ﷺ نے خود ہی اپنی امت کے لئے ایک قانون اور ضابطہ پیش فرمادیا تا کہ اس قانون پر عمل کرنے والوں کو کوئی شخص غیر اسلامی شعار پر عمل کرنے کا طعنہ نہ دے سکے، بلکہ ایسا اعتراض علم شریعت سے بے خبری کی علامت ہے۔

﴿فَلَهٗ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَاهُمْ يَحْزَنُوْنَ﴾

اس کیلئے اجر ہے اسکے رب کے ہاں اور کوئی خوف نہیں ان پر اور نہ ہی وہ غمگین ہونگے۔

یعنی جن لوگوں نے اپنے آپ کو رب کے لئے جھکا دیا ایسے حال میں کہ وہ نیکوکار رہوئے ان کو ان اعمال کا ثواب حاصل ہوگا۔ اور ان کو آخرت میں کوئی خوف نہیں ہوگا۔ اور ان کے دنیا کے فوت ہونے کا کوئی غم نہیں ہوگا۔ (از خازن)

فائدہ جلیلہ: ﴿اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ﴾ میں اپنے آپ کو رب تعالیٰ کے لئے جھکانے کا مقصد ہے کہ اخلاص سے اپنے آپ کو رب کے حضور جھکائے، اخلاص کو سمجھنے کے لئے چند مسائل کا سمجھنا ضروری ہے۔

پهلا مسئله: نیت کی فضیلت کے بیان میں، نبی کریم ﷺ نے فرمایا" انما الاعمال بالنیات "اعمال کا دارومدار نیات پر ہے۔

اور نبی کریم ﷺ نے فرمایا: " ان الله لاینظر الی صورکم وانما ینظر الی قلوبکم ونیاتکم "
بیشک اللہ تعالیٰ تمہاری صورتوں کو نہیں دیکھتا، بیشک وہ تو صرف تمہارے دلوں اور نیتوں کو دیکھتا ہے

ان احادیث مبارکہ سے یہ فائدہ حاصل ہوا کہ نیت ایک اعلیٰ عمل کا نام ہے، جس پر تمام اعمال کا دارومدار ہے۔

دوسرا مسئلہ : انسان کو جب یقین حاصل ہو یا غالب گمان ہو کہ اس کام میں میرا فائدہ ہے یا اس کام کی وجہ سے میری مصیبت ٹل جاتی ہے، تو وہ اس کام کو کرنے کی طرف کامل میلان رکھتا ہے، اور چاہتا ہے کہ یہ کام کرلیا جائے۔ وہ شخص اس کام کے عدم سے وجود کو ترجیح دیتا ہے۔ اس کو ارادہ کہا جاتا ہے، اسی ارادہ کا نام نیت ہے۔ اس نیت کی وجہ علم یا غالب گمان یا اعتقاد ہوتے ہیں۔

پھر اس میں چار صورتیں ہیں۔

(۱) اس نیت وارادہ کا باعث ایک چیز ہو، جس طرح انسان کا سامنا اچانک ایک درندے سے ہو جائے، تو انسان درندے کو دیکھ کر اسی جگہ کھڑا ہو جائے۔ اس کھڑے ہونے والے فعل کا سبب صرف اس کا یہ اعتقاد ہے کہ بھاگنے میں کوئی نفع نہیں۔ اور بھاگنے کو چھوڑنے میں کوئی نقصان نہیں۔

اس نیت کا نام ہے خالصہ اور اس نیت کی وجہ سے کئے جانے والے کا نام ہے اخلاص۔

(۲) ایک کام کے کرنے کے دو مستقل سبب ہوں، ہر سبب علیحدہ علیحدہ مستقل طور پر تقاضا کرتا ہو کہ یہ فعل پایا جائے جیسا کہ ایک شخص سے اس کا فقیر دوست سوال کرے، یہ اس کی حاجت کو پورا کرے۔ اس کا رفیق ہونا بھی چاہتا ہے کہ اس کی امداد کی جائے اور اس کا فقیر ہونا بھی تقاضا کرتا ہے کہ اس کی امداد کی جائے۔ اس موافقت کا نام باعث ہے۔

(۳) کسی کام کے دو سبب ہوں لیکن علیحدہ علیحدہ دونوں مستقل نہ ہوں، بلکہ دونوں مل کر ایک سبب کی حیثیت ہوں، جیسا کہ والدین کا خدمت کے مستحق ہونا بوجہ والدین ہونے کے اور ان کے شفیق ہونے کے۔ والدین سے چونکہ شفقت جدا نہیں ہوتی۔ اس لئے یہ مجموعی طور پر سبب ہے کہ اولاد والدین کی خدمت کرے اس سبب کا نام ہے "مشارکۃ"

(۴) کسی کام کا ایک سبب ہو اور دوسرا اس کا معاون ہو، جیسے کوئی آدمی کسی نیکی کے کام کے لئے جاتا ہے اور وہاں اس کی ایسے لوگوں سے ملاقات ہو جائے جن کو دیکھنے سے اس پر وہ نیکی کا کام آسان ہو جائے اس سبب کا نام ہے "معاونۃ۔"

تیسرا مسئلہ : نبی کریم ﷺ نے فرمایا " نیۃ المؤمن خیر من عملہ " مومن کی نیت اس کے عمل سے بہتر ہے۔ اس کا مطلب کیا ہے۔

اس میں کئی وجوہ بیان کی گئی ہیں۔ لیکن سب سے بہتر اور صحیح وجہ یہ ہے۔ نیت جب تک تمام انواع فتور سے خالی نہ ہو وہ نیت جازمہ (یقینی نیت) نہیں ہوسکتی۔

اور جب تمام قسم کے فتور سے نیت خالی ہوگی تو رکاوٹ اگر درپیش نہ آئے تو اس پر عمل کا پایا جانا ضروری ہوگا۔

" واذا کان کذلک ثبت ان النیۃ لاتنفک البتۃ عن الفعل " جب اس طرح ہوا تو ثابت ہوگیا کہ نیت فعل سے جدا نہیں ہوگی۔ " فیدعی ان ھذہ النیۃ افضل من ذلک العمل " بے شک یہ نیت اس عمل سے افضل ہوگی، کیونکہ بغیر نیت کے یہ عمل ممکن ہی نہیں تھا۔

اصل میں مقصد تمام اعمال کا اللہ تعالیٰ کی معرفت سے دل کا منور ہونا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے ماسوا سے دل کا پاک ہونا مقصد عظیم ہے۔ اور یہ بھی واضح ہے کہ نیت دل کی صفت ہے، اور عمل دل کی صفت نہیں لہٰذا صفت قلب کی تاثیر زیادہ قوی ہے بنسبت ظاہری اعضاء کے اعمال کے کیونکہ ان کا دل میں اتنا اثر نہیں جتنا خود دل کی صفات کا دل پر اثر ہے۔

" فلا جرم نیۃ المؤمن خیر من عملہ " اس لحاظ پر یقیناً مومن کی نیت اس کے عمل سے بہتر ہوگی۔

چوتھا مسئلہ : اعمال کی تین قسمیں ہیں۔

(۱) طاعات۔ (۲) معاصی۔ (۳) مباحات۔

معاصی : نیت کی وجہ سے گناہ کے افعال نہیں بدلتے، بلکہ وہ گناہ ہی ہوتے ہیں۔ کوئی جاہل یہ نہ سمجھے کہ نبی کریم ﷺ کے ارشاد " انما الاعمال بالنیات " کا مطلب یہ ہے کہ نیت سے معصیت طاعت بن جائے گی۔ نہیں ایسا نہیں ہوگا۔ اگر کوئی شخص یہ سمجھے کہ غیر کا مال اس کی اجازت کے بغیر کسی فقیر کو دینے سے ثواب حاصل ہوگا۔ یہ غلط ہے۔ ایسا ممکن نہیں۔

کوئی یہ سوچے کہ حرام مال سے مسجد بنانے کا ثواب مل جائے گا۔ یہ باطل ہے۔ اس سے ثواب

حاصل نہیں ہوسکتا۔

طاعات : کا تعلق نیات سے ہے۔ اصل میں بھی اور فضیلت میں بھی۔

اصل میں طاعت کی نیت کا یہ مطلب ہے کہ صرف اللہ تعالیٰ کی عبادت کی نیت کرے اب نیت کا بھی ثواب ہوگا۔ اور اگر ریاء کاری کی نیت کرے تو معصیت ہوگی۔

فضیلت میں نیت کا یہ مطلب ہے کہ کثیر کاموں کی نیت سے نیکیاں زیادہ حاصل ہوں، جن کی وجہ سے فضیلت حاصل ہوگی۔ مثال کے طور پر ایک شخص مسجد میں بیٹھے، اس میں اعتقاد رکھے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا گھر ہے۔ پھر یہ ارادہ رکھے کہ اس میں نیک لوگوں سے ملاقات ہوگی۔

نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

" من قعد فی المسجد فقد زار اللہ وحق علی المزور اکرام زائرہ "

جو شخص مسجد میں بیٹھا تحقیق اس نے اللہ تعالیٰ کی زیارت کی، جس کی زیارت کی جائے اس پر حق ہے کہ وہ زیارت کرنے والے کی عزت کرے۔ گویا کہ مسجد میں بیٹھنے والے کو اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے عزت عطاء فرماتا ہے۔

اور یہ کہ مسجد میں بیٹھنے والا ایک نماز کے بعد دوسری نماز کی انتظار میں ہوتا ہے۔ " فیکون حال الانتظار کمن ھو فی الصلوٰۃ " نماز کی انتظار کرنے والا ایسا ہی ہوتا ہے۔ جیسے نماز ادا کرنے والا ہوتا ہے۔

اور یہ کہ مسجد میں بیٹھنے والے کو اعتکاف اور روزے کی حالت حاصل ہوتی ہے۔ کیونکہ وہ کئی مشاغل سے اپنے آپ کو روک کر رکھے ہوئے ہے۔

اور یہ ہے کہ مسجد میں بیٹھے ہوئے شخص کو لوگوں سے گپ شپ، ہنسی مذاق سے اجتناب حاصل ہوتا ہے۔

مسجد میں بیٹھے ہوئے شخص کا کامل طور پر دل اللہ تعالیٰ کی طرف مائل ہوتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے ماسوا کی طرف اس کی توجہ نہیں ہوتی۔ جو شخص مسجد میں ہوگا۔ یقیناً کسی نہ کسی کو اچھے کام کی نصیحت کرے

گا۔ برے کاموں سے روکے گا، تو اسے تعلیم اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا ثواب حاصل ہوگا۔

اور فائدہ اسے یہ حاصل ہوگا کہ وہ دوسرے مسلمان لوگوں سے بھائی چارہ کی فضاء حاصل کرے گا۔ اور اسے یہ فائدہ ہوگا کہ وہ اللہ تعالیٰ سے حیاء کرتے ہوئے گناہوں کو چھوڑ دے گا۔

یعنی بظاہر وہ صرف مسجد میں بیٹھا ہے، لیکن حقیقت میں وہ کئی نیک کاموں کی نیات سے کثیر فضیلتیں حاصل کر رہا ہے۔

مباحات: سائر المباحات ولا شئ منها الا ويحتمل نية او نيات يصير بها من محاسن القربات فما اعظم خسران من يغفل عنها ولا يصرفها الى القربات "

ہر مباح کام نیکی کی نیت سے مستحب اور قربت کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ جو شخص اس سے غافل رہے اور وہ مباح کام سے ثواب نہ حاصل کر سکے وہ بہت بڑے خسارے میں ہے۔

مثال کے طور پر انسان خوشبو استعمال کرے تو یہ مباح ہے نہ اس میں کوئی ثواب اور نہ گناہ، لیکن اگر خوشبو کو استعمال کرتے ہوئے دنیا کی لذات کو حاصل کرنے کا ارادہ کرے، اور کثرت مال پر فخر کرے اور مخلوق کو دکھانا چاہے۔ اور یہ ارادہ کرے کہ عورتیں میری طرف میلان کریں تو خوشبو کا استعمال معصیت ہوگا۔

اور اگر یہ ارادہ کرے کہ خوشبو کا لگانا سنت ہے، اور اس سے بو زائل ہوگی جو اللہ تعالیٰ کے بندوں کی اذیت کا سبب بنتی ہے۔ اور خوشبو لگا کر مسجد کی تعظیم کا ارادہ کرے تو یہ طاعت ہوگی۔

☆ واذا عرفت ذلک فقس عليه سائر المباحات "

جب تو نے اس ایک مثال کو سمجھ لیا تو اسی پر تمام مباحات کو قیاس کر۔

" والضابط ان كل ما فعلته لداعي الحق فهو العمل الحق ، و كل ما عملته لغير الله فحلالها حساب و حرامها عذاب "

ضابطہ یہ ہے کہ ہر کام جس میں اللہ تعالیٰ کی رضاء کی نیت ہو وہ کام حق ہے۔ اور وہ کام جس میں اللہ تعالیٰ کی رضاء کو مدنظر نہیں رکھا گیا لیکن وہ کام گناہ والا نہیں تو حلال ہے، اور اگر گناہ والا ہے تو حرام ہوگا، جس پر عذاب ہوگا۔

پانچواں مسئلہ : صرف زبان سے کہنا کہ میں نیت کر رہا ہوں یا دل میں سوچنا کہ میں نیت کر رہا ہوں، یہ حقیقت میں نیت نہیں، بلکہ نیت یہ ہے کہ نفس کو کسی کام پر برانگیختہ کیا جائے۔ تا کہ اس کا میلان پایا جائے اس کام کی طرف جس کا کرنا مقصود ہو۔

جب تک کسی کام کی خواہش نہ پائی جائے اس وقت تک نیت بھی حقیقۃ نہیں پائی جائے گی۔

ایک آدمی نے سیر ہو کر کھانا کھایا ہوا ہے۔ وہ زبان سے کہے " نویت ان اشتھی طعاما " میں کھانے کی خواہش کی نیت کرتا ہوں۔ یا دل میں یہی نیت کرے اسے نیت نہیں کہا جا سکتا، کیونکہ نیت تو وہ ہے جو کام کرنے پر برانگیختہ کرے۔

اگر نیت کا یہ حقیقی معنی سمجھ آئے تو کوئی جاہل نہیں کہہ سکے گا کہ نیت تو صرف دل سے ہوتی ہے زبان سے نہیں۔ بہت واضح مسئلہ ہے کہ اگر نیت نے کام پر برانگیختہ کیا تو وہ نیت ہے خواہ زبان سے ہو یا دل سے، اور اگر کام پر برانگیختہ نہ کیا تو وہ نیت نہیں خواہ زبان سے ہو یا دل سے ہو۔

چھٹا مسئلہ: لوگ مختلف قسم کی نیت کرنے والے ہیں۔ کوئی نیکی کا کام اس نیت پر کرتے ہیں کہ جہنم کی آگ سے بچ جائیں۔ اور کوئی عبادت اس نیت سے کرتے ہیں کہ جنت حاصل ہو جائے۔

کامل لوگ وہ ہیں جو اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کی نیت کرتے ہیں۔ جب رب راضی ہوگا تو خود بخود جنت بھی حاصل ہوگی۔ اور جہنم سے نجات بھی حاصل ہوگی۔ (از کبیر)

ان چھ مسائل کو جب انسان سمجھے گا تو اسی وقت کامل اخلاص سمجھ آئے گا، کہ کامل اخلاص کیا ہے

تنبیہ : پانچواں مسئلہ جو ذکر کیا گیا ہے اس پر تفسیر کبیر کی عبارت بھی مدنظر رہے۔

" اعلم ان الجاهل اذا سمع الوجوه العقلية والنقلية فی انه لا بد من النية فيقول فی نفسه عند تدريسه وتجارته نويت ان ادرس لله واتجر لله يظن ان ذلک نية وهيهات فذاک حديث نفس او حديث لسان والنية بمعزل عن جميع ذلک انما النية انبعاث النفس وميلها الى ماظهر لها ان فيه غرضها اما عاجلا واما آجلا والميل اذ لم يحصل لم يقدر الانسان على اكتسابه وهو كقول الشبعان نويت ان اشتهی الطعام " (کبیر)

مفہوم تقریبا ذکر کر دیا گیا۔ لفظی ترجمہ پیش نہیں کیا جاتا۔ عبارت کو آسان طریقہ سے سمجھایا جاتا ہے۔

﴿وَقَالَتِ الْيَهُودُ لَيْسَتِ النَّصٰرٰى عَلٰى شَيْءٍ ص وَّقَالَتِ النَّصٰرٰى لَيْسَتِ الْيَهُودُ عَلٰى شَيْءٍ لا وَّهُمْ يَتْلُونَ الْكِتٰبَ ط كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ مِثْلَ قَوْلِهِمْ ج فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ﴾ (آیت ۱۱۳)

۱) اور یہودی بولے نصرانی کچھ نہیں اور نصرانی بولے یہودی کچھ نہیں ، حالانکہ وہ کتاب پڑھتے ہیں، اسی طرح جاہلوں نے ان کی سی بات کہی تو اللہ قیامت کے دن میں فیصلہ کردے گا جس بات میں جھگڑ رہے ہیں۔

۲) اور کہا یہودیوں نے نہیں ہیں نصرانی کسی چیز (دین) پر۔ اور کہا نصرانیوں نے نہیں ہیں یہودی کسی چیز (دین) پر، حالانکہ وہ کتاب پڑھتے ہیں۔ اسی طرح کہا ان لوگوں نے جو علم نہیں رکھتے، مثل ان کی بات کے۔ تو اللہ فیصلہ فرمائے گا ان کے درمیان قیامت کے دن جس میں وہ اختلاف کررہے ہیں۔

پہلی آیت میں دونوں یعنی یہود و نصاریٰ کے اقوال جو ایک دوسرے کے خلاف تھے ان کو جمع کر کے ذکر کیا، اس آیۃ میں ان کے اقوال کی تفصیل بیان کی جارہی ہے کہ ہر فریق دوسرے کے متعلق کیا کہتا ہے۔ دونوں فریقوں میں سے ہر فریق دوسرے کے دین کا کیسے انکار کرتا ہے۔

مختصر مطلب : یہود اور نصاریٰ دونوں اہل کتاب تھے۔ یہود اپنے آپ کو موسیٰ علیہ السلام کا پیروکار کہتے تھے اور دعویٰ ان کا یہ تھا کہ ہمارا توراۃ پر ایمان ہے۔ اور نصاریٰ کا دعویٰ یہ تھا کہ ہمارا ایمان انجیل پر ہے اور ہم عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت کو تسلیم کرتے ہیں۔ لیکن ہر فریق دوسرے کو جھوٹا کہتا تھا، یہودی کہتے تھے کہ نصرانی کسی دین پر قائم نہیں، اور نصرانی کہتے تھے یہودی کسی دین پر قائم نہیں۔

حالانکہ دونوں فریق اپنے دعویٰ ایمانی میں بھی جھوٹے تھے۔ کیونکہ توراۃ میں انجیل کی تصدیق

پائی جاتی، اور انجیل تصدیق کر رہی تھی توراۃ کی۔ اگر یہود کا توراۃ پر ایمان ہوتا تو وہ انجیل کو بھی اللہ تعالیٰ کی کتاب تسلیم کرتے اور عیسیٰ علیہ السلام کو بھی اللہ تعالیٰ کا نبی مانتے۔ اور اگر نصاریٰ کا انجیل پر ایمان ہوتا تو وہ یقیناً موسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا نبی اور توراۃ کو اللہ کی کتاب مانتے۔

واضح ہوا کہ ہر فریق ان میں سے جھوٹا تھا اور اپنے دین پر بھی قائم نہیں تھا۔

اسی طرح مشرکین و کفار کے بعض گروہ دوسرے گروہ کو بے دین کہتے تھے کہ یہ تو کسی چیز پر قائم نہیں

یہ جو دنیا میں اختلاف کر رہے ہیں قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ان کے درمیان فیصلہ فرمادے گا۔
وہ فیصلہ یقیناً ہر ایک کے خلاف ہوگا کیونکہ ان تمام فریقوں میں سے کوئی بھی ایمان پر قائم نہیں خواہ یہودی ہو یا نصرانی۔ مشرکین ہوں یا مجوسی وغیرھا۔

کچھ تفصیل: آیۃ کریمہ کا شان نزول وہی ہے جو پہلی آیت ﴿وَقَالُوا لَنۡ يَّدۡخُلَ الۡجَنَّةَ اِلَّا مَنۡ كَانَ هُوۡدًا اَوۡ نَصٰرٰى﴾ میں ذکر کر دیا گیا۔

مدینہ طیبہ کے یہود کے علماء اور نجران کے نصاریٰ کا ایک دوسرے سے مناظرہ ہوا۔ یہ ان کا مناظرہ نبی کریم ﷺ کے پاس تھا۔

" حتی ارتفعت اصواتهم فقال لهم اليهود ما انتم على شئ من الدين و كفروا بعيسى والانجيل وقالت لهم النصارى ما انتم على شئ من الدين و كفروا بموسى والتوراة فنزلت "

یہاں تک کہ ان کی آواز ایک دوسرے پر بلند ہونے لگی، یہود نے نجران کے عیسائیوں کو کہا تم کسی دین پر نہیں، اور انہوں نے عیسیٰ علیہ السلام اور انجیل سے کفر کیا۔ اور نصاریٰ نے ان کو کہا تم کسی دین پر نہیں ہو، انہوں نے موسیٰ علیہ السلام اور توراۃ سے کفر کیا۔ اس وقت یہ آیۃ کریمہ نازل ہوئی۔

(از معالم التنزیل)

تنبیہ: " ولاشک ان المناظرة على هذا الوجه ليست لاظهار الصواب بل هی مکابرة محضة " (شیخ زادہ)

جب ایک دوسرے پر الزام تراشی مقصود ہو، ہر ایک فریق کی کوشش ہو کہ میری بات صحیح ہو یا غلط ہو، اسے ہی تسلیم کیا جائے تو اسے مناظرہ نہیں کہا جاتا کیونکہ مناظرہ میں درست راہ کو تلاش کرنا مقصود ہوتا ہے۔

اگر اظہار صواب مقصود ہی نہ ہو، بلکہ صرف جھگڑا اور شور وغل مقصد ہو تو اسے مجادلہ، اور مکابرہ تو کہا جا سکتا ہے۔ مناظرہ نہیں کہا جا سکتا۔ بات بات پر مناظرہ کا چیلنج کرنے والے درحقیقت جہلاء ہوتے ہیں۔ جو جاہل لوگوں میں سستی شہرت حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

" اللهم انا نعوذبک من المنافقين المجادلين "

عَلٰی شَیْءٍ: کا ایک مطلب تو وہی ہے جو معالم التنزیل میں بیان کیا گیا ہے۔ " **ما انتم علی شیٔ من الدین** " تم دین کی کسی چیز پر نہیں ہو۔ اس کے مطابق راقم نے ترجمہ کیا ہے تا کہ طلباء کرام کو ایک وجہ یہ بھی سمجھ آ جائے۔

اور دوسرا معنی علامہ آلوسی اور علامہ رازی رحمھما اللہ نے بیان فرمایا ہے کہ اس میں عموم بہتر ہے یعنی مطلقاً " شیٔ " کی نفی پائی گئی ہے۔ " **فاذا نفی مطلقا کان ذلک مبالغة فی عدم الاعتداد بما هم عليه وصار كقولهم " اقل من لاشیٔ "**

جب مطلق شے کی نفی ہوگی تو اس میں زیادہ مبالغہ پایا جائے گا کہ ہر فریق دوسرے کے متعلق کہتا تھا کہ وہ تو کچھ بھی نہیں کہ ان کا کوئی شمار کیا جائے۔ یہ کلام ایسے ہی ہے جیسے کہا جاتا " **اقل من لاشیٔ** " یہ تو لاشیٔ سے بھی کم ہے۔ (اعلیٰ حضرت کا ترجمہ اسی قول کے مطابق ہے) (از روح المعانی)

تنبیه: اگرچہ یہ بات مدینہ طیبہ کے یہود اور نجران کے نصرانیوں کے درمیان ہوئی، لیکن عیسیٰ علیہ السلام کی تشریف آوری کے بعد سے ہی یہ اختلافات یہودیوں اور نصرانیوں کے درمیان آ رہے تھے۔

كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ مِثْلَ قَوْلِهِمْ: اسی طرح کہا ان لوگوں نے جو نہیں جانتے ان کی بات کی طرح۔ یعنی بے علم لوگوں نے بھی یہود و نصاریٰ کی طرح ہی کہا۔

" الذین لایعلمون " سے مراد کون لوگ ہیں اور کن سے ان کی یہود و نصاریٰ کی بات تھی؟

اس میں مختلف وجوہ ہیں، جو تمام ہی مراد ہیں۔ " **یعنی مشرکی العرب قالوا فی نبیهم محمد ﷺ واصحابه انهم لیس علی شیٔ** " اس سے مراد مشرکین عرب ہیں کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام کو کہا " تم کسی معتبر دین پر نہیں۔ "

" **وقیل امم کانت قبل الیهود والنصاری مثل قوم نوح وهود وصالح ولوط وشعیب قالوا**

فی انبیائھم لیسوا علی شئ"

اسی طرح یہود و نصاریٰ سے پہلے والی قوموں نے ایک دوسری قوم اور اس کے نبی کے متعلق کہا کہ یہ تو کسی معتبر دین پر قائم نہیں۔ یعنی نوح علیہ السلام اور ھود علیہ السلام اور صالح علیہ السلام لوط علیہ السلام اور شعیب علیہ السلام کی قوموں نے ایک دوسرے کے متعلق کہا یہ تو کسی چیز پر نہیں۔ (خازن)

اس سے مراد مشرکین عرب اور ان کے بغیر اور بت پرست لوگ ہیں، اور مجوسی، اور اسی طرح پہلے گزرے ہوئے کفار مراد ہیں۔ جب کہ ہر فریق نے دوسرے کی تکذیب کی، خواہ دوسرا فریق حق پر قائم ہی کیوں نہ تھا، یعنی پہلی امتوں میں سے ایمان رکھنے والے لوگوں کی تکذیب کفار ہر زمانہ میں کرتے رہے اور یہی کہتے رہے کہ یہ تو کسی چیز پر نہیں۔ (از مظہری)

" ای الجھلة الذین لا علم عندھم و لا کتاب کعبدة الاصنام و المعطلة قالوا لاھل کل دین لیسوا علی شئ وھذا توبیخ عظیم لھم حیث نظموا انفسھم مع علمھم فی سلک من لایعلم "

اس سے مراد وہ جاہل لوگ ہیں جن کے پاس نہ علم تھا اور نہ کتاب جیسے بت پرست لوگ اور تعطیلیہ فرقہ، انہوں نے تمام دین والوں کے متعلق کہا یہ کسی معتبر دین پر نہیں۔ اس آیۃ کریمہ میں یہود و نصاریٰ کو ڈانٹ دی گئی کہ تم نے وہی ایک دوسرے کو کہا جو جاہل لوگ کہتے تھے، لہٰذا تم اہل علم ہونے کے باوجود جاہل لوگوں کی طرح کلام کر رہے ہو۔ (مدارک)

فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ :

تو اللہ فیصلہ کرے گا ان کے درمیان قیامت کے دن جس میں وہ اختلاف کر رہے ہیں۔

فیصلہ کرنے کا ایک مطلب یہ ہے کہ ہر فریق کی تکذیب فرمائے گا اور ان کو آگ میں داخل کر دے گا۔ اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ تکذیب کرنے والے ظالم سے مظلوم جس کی تکذیب کی گئی ہے، کو انصاف دلائے گا۔ اور تیسرا مطلب یہ ہے کہ جن کو جنت میں داخل کرے گا ان کو بھی دوسرے دیکھ کر حسرت کر رہے ہوں گے۔ اور جن کو جہنم میں داخل کرے گا ان کو جنت والے ظاہر ظاہر دیکھ رہے ہوں گے، اور رب تعالیٰ کا شکر ادا کر رہے ہوں گے کہ ہمیں اس عذاب سے بچا لیا گیا۔

اور چوتھا مطلب یہ ہے کہ حق راہ پر چلنے والے اور باطل راہ پر چلنے والے فریق کے اختلاف میں فیصلہ فرمائے گا۔ (از کبیر)

﴿وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنْ يُّذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ وَسَعٰى فِيْ خَرَابِهَا ؕ اُولٰٓئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ اَنْ يَّدْخُلُوْهَا اِلَّا خَآئِفِيْنَ ۵ لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَّلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ﴾ (آیت ۱۱۴)

۱) اوراس سے بڑھ کر ظالم کون جو اللہ کی مسجدوں کو روکے ان میں نام خدا لئے جانے سے، اوران کی ویرانی میں کوشش کرے، ان کو نہ پہنچتا تھا کہ مسجدوں میں جائیں مگر ڈرتے ہوئے ان کیلئے دنیا میں رسوائی ہے۔اوران کیلئے آخرت میں بڑا عذاب۔

۲) اورکون شخص بڑا ظالم ہے اس سے جو منع کرے اللہ کی مسجدوں میں اللہ کا نام ذکر کئے جانے سے۔ اور وہ کوشش کرے ان کی ویرانی میں۔ ان لوگوں کے لائق نہیں کہ وہ داخل ہوں مسجدوں میں مگر ڈرتے ہوئے، ان کے لئے دنیا میں رسوائی ہے۔ اور ان کے لئے آخرت میں بڑا عذاب۔

شان نزول: نبی کریم ﷺ ہجرت کے چھٹے سال تقریباً ڈیڑھ ہزار صحابہ کرام کو ساتھ لے کر مدینہ طیبہ سے مکہ مکرمہ کی طرف عمرہ کرنے کی غرض سے روانہ ہوئے۔ لیکن جب آپ مقام حدیبیہ میں پہنچے تو مشرکین نے آپ کو عمرہ کرنے سے روک دیا۔ حضور ﷺ اور صحابہ کرام عمرہ کرنے کے بغیر ہی واپس آ گئے۔ تو یہ آیت کریمہ مشرکین مکہ کی مذمت میں نازل ہوئی۔

اس آیت کریمہ کے نزول سے پہلے ایک اورصورت بھی درپیش آ چکی تھی۔ وہ یہ ہے کہ جب بیت المقدس سے تبدیل ہو کر قبلہ کعبہ شریف بن گیا۔ تو یہود لوگوں کو کعبہ شریف کی طرف منہ کر کے نماز ادا کرنے سے منع کرتے تھے۔ اس طرح گویا کہ وہ کعبہ شریف کو ویران کرنے میں کوشش کرتے تھے۔

آیۃ کریمہ کے نزول کی تو یہ دو ہی وجہ زیادہ واضح ہیں۔ البتہ آیۃ کریمہ اپنے مضمون کے لحاظ پر اور بھی وجوہ کو شامل ہے۔

" ان مشرکی العرب منعوا الرسول علیه الصلوٰة والسلام عن الدعاء الی الله بمکة والجؤه الی الهجرة فصاروا مانعین له ولاصحابه ان یذکروا الله فی المسجد الحرام "

مشرکین عرب نے رسول اللہ ﷺ کو مکہ مکرمہ میں دعوت الی اللہ (اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کی طرف دعوت دینے) سے روک دیا تھا، آپ کو اور آپ کے صحابہ کرام کو ہجرت کرنے پر مجبور کر دیا تھا، تو وہ مسجد حرام میں اللہ تعالیٰ کے ذکر سے روکنے والے تھے، ان کی مذمت بھی اس آیۃ کریمہ میں موجود ہے۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنے گھر کے پاس مسجد بنائی جس سے آپ کو روک دیا گیا۔ آپ کو قریش کے بچے اور عورتیں ایذاء پہنچاتے تھے۔ اس آیۃ کریمہ میں ان لوگوں کی مذمت بھی پائی گئی۔

☆ " عن عبدالله قال بینما رسول الله ﷺ ساجد و حوله ناس من قریش اذ جاءه عقبة بن ابی معیط بسلا جزور فقذفه علی ظهر رسول الله ﷺ فلم یرفع رأسه فجاءت فاطمة فاخذته عن ظهره ودعت علی من صنع ذلک "

حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک وقت رسول اللہ ﷺ سجدہ فرما رہے تھے۔ آپ کے ارد گرد کچھ قریش کے لوگ تھے (سات کی تعداد میں تھے) عقبہ بن ابی معیط (دوسری روایت زیادہ صحیح یہ قرار دیا گیا کہ ولید بن عقبہ آیا) اور اونٹنی کی جیلی لا کر آپ کی پیٹھ پر رکھ دی۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا (جو اس وقت بچی تھیں) نے آ کر آپ کی پیٹھ سے جیلی کو ہٹایا۔ اور ان کے خلاف دعاء کی۔

یہ آیت کریمہ اپنے مضمون کے لحاظ پر اس واقعہ کو بھی شامل ہے کہ مشرکین نبی کریم ﷺ کے نماز پڑھنے میں رکاوٹ ڈالتے تھے۔

تنبیہ : سلا کا معنی اوجری عوام میں زیادہ مشہور ہے، کئی مترجمین نے بھی اوجری معنی کیا ہے۔ تاہم " المنجد " میں معنی جیلی ہی کیا گیا ہے۔ اور " نووی شرح مسلم ج ۲ باب مالقی النبی ﷺ من اذی المشرکین والمنافقین " میں مذکور ہے۔

" السلا بفتح السین و تخفیف اللام مقصور وهو اللفافة التی یکون فیها الولد فی بطن الناقة وسائر الحیوان وهی من الآدمیة مشیمة "

" سلا " سین پر فتح ہے۔ اور لام مخفف اور مقصور ہے۔ یہ وہ پردہ ہے جس میں بچہ ہوتا ہے۔

اونٹنی اور باقی حیوانات کے پیٹ میں پایا جانے والا یہ پردہ " سـلا " کہلاتا ہے۔اور عورتوں کے پیٹ میں بچہ کا یہی لفافہ مشیمہ کہلاتا ہے۔اردو میں اسے جیلی کہا جاتا ہے۔اور پنجابی میں " جیر "

☆ " عن ابی هريرة قال قال ابو جهل هل يعفر محمد وجهه بين اظهركم قال فقيل نعم قال واللات والعزى لئن رأيته يفعل ذلك لاطأن على رقبته او لاعفرن وجهه فى التراب قال فاتى رسول الله ﷺ وهو يصلى زعم ليطأ على رقبته قال فما فجئهم منه الا وهو ينكص على عقبيه ويتقى بيديه قال فقيل له ما لك قال ان بينى و بينه لخندقا من نار وهولا واجنحة فقال رسول الله ﷺ لو دنا منى لاختطفته الملائكة عضوا عضوا " (مسلم ج ۲ باب صفة القيامة والجنة والنار)

حضرت ابوہریرہ ﷺ فرماتے ہیں۔ایک مرتبہ ابوجہل نے کہا کیا محمد تمہارے سامنے اپنے چہرے کو مٹی میں ملتے ہیں۔(سجدہ کرتے ہیں) دوسرے لوگوں نے کہا ہاں۔یہ کہنے لگا قسم ہے لات اور عزیٰ کی اگر میں نے اسے ایسے کرتے ہوئے دیکھا تو اس کی گردن دبوچ دوں گا۔اسی دوران نبی کریم ﷺ تشریف لے آئے اور نماز پڑھنے لگے۔ابوجہل نے خیال کیا کہ آپ کی گردن دبوچ دے۔ابھی آگے آیا ہی تھا کہ اچانک الٹے پاؤں پیچھے بھاگے جا رہا ہے۔اور اپنے ہاتھ مار مار کر اپنا بچاؤ کر رہا تھا۔اس سے پوچھا گیا تمہیں کیا ہو گیا۔وہ کہنے لگا میرے اور اس کے درمیان آگ کی ایک خندق تھی اور بہت بڑی ہولناکی تھی۔اور کئی پر تھے۔

نبی کریم ﷺ نے فرمایا اگر وہ میرے قریب آتا تو فرشتے اس کا ایک ایک عضوا دھیڑ دیتے۔

☆ آیۃ کریمہ اپنے مضمون کے لحاظ پر اس واقع کو بھی شامل ہے کہ ابوجہل نے نبی کریم ﷺ کو مسجد حرام میں نماز پڑھنے۔اور اللہ تعالیٰ کا نام لینے سے روکنے کی ناکام کوشش کی۔

☆ اسی طرح یہ آیۃ کریمہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی اس روایت کو بھی اپنے مضمون کے لحاظ پر شامل ہے۔اگر چہ وہ واقعہ وجہ نزول نہیں۔لیکن بیت المقدس سے لوگوں کو عبادت سے منع کر کے اسے ویران کیا گیا۔

" وقال ابن عباس ان ملك النصارى غزا بيت المقدس فخربه والقى فيه الجيف وحاصر

اھلہ وقتلھم وسبی البقیۃ واحرق التوراۃ ولم یزل بیت المقدس خرابا حتی بناہ اھل الاسلام فی زمن عمر"

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ نصرانیوں کے بادشاہ طیطوس بن اسیانوس رومی نے جنگ کر کے بیت المقدس کو خراب کر دیا۔ اور اس میں مردہ جانور ڈال دئے۔ اور اس شہر میں رہنے والوں کا محاصرہ کر لیا۔ اور ان کو قتل کرا دیا اور کچھ کو قید کر لیا۔ اور توراۃ کو جلا ڈالا۔ اسی طرح بیت المقدس کی حالت رہی یہاں تک کہ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں اسی علاقہ کو فتح کر کے بیت المقدس کو تعمیر کیا گیا۔

☆ بخت نصر کے زمانہ میں بھی بیت المقدس کو خراب کیا گیا، لوگوں کو اس میں عبادت سے روکا گیا۔ لہٰذا یہ آیت کریمہ اپنے مضمون کے لحاظ پر اسے بھی شامل ہے۔ (از کبیر بتغیر و تصرف)

اس آیۃ کریمہ کا ماقبل سے تعلق بیان کردہ بحث سے واضح ہو گیا۔ کیونکہ پہلی آیت میں یہود اور نصاریٰ اور مشرکین کا ذکر کیا کہ وہ ایک دوسرے کو بے دین کہتے تھے۔ اس آیۃ کریمہ میں بھی ان کا ہی ذکر ہے کہ وہ مساجد کو ویران کرنے کی کوشش میں رہتے ہیں۔ اور مساجد میں اللہ تعالیٰ کا نام لینے والوں کو روکتے ہیں۔ (از کبیر)

اعتراض: جب شان نزول سے پتہ چلا کہ مشرکین نے مسجد حرام سے اللہ تعالیٰ کا نام لینے سے منع کیا، تو ﴿مَسَاجِدَ اللهِ﴾ جمع ذکر کرنے کی کیا وجہ ہے؟

جواب: اگر چہ آیۃ کریمہ کے شان نزول کے لحاظ پر ایک مسجد حرام ہے " لکن المراد بہ کل المساجد "لیکن حکم کے لحاظ پر تمام مساجد کا یہی لحاظ ہے۔

دوسرا جواب: اگر نزول کے لحاظ پر ایک مسجد کا ہی اعتبار کیا جائے تو پھر بھی مسجد حرام کی فضیلت کے پیش نظر جمع ذکر کر دیا گیا۔ جیسا کہ کوئی شخص کسی ایک نیک شخص کو اذیت (تکلیف) پہنچائے تو یہ کہا جائے۔ ﴿وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ آذَى الصَّالِحِيْنَ﴾ اس شخص سے بڑھ کر ظالم کون ہو سکتا ہے جو نیک لوگوں کو ایذاء پہنچاتا ہے۔ لیکن یہ بھی خیال رہے کہ حکم پھر بھی عام رہی رہے گا۔ تمام مساجد میں اللہ تعالیٰ کے ذکر سے منع کرنے کا یہی حکم ہے کہ وہ روکنے والا شخص بہت بڑا ظالم ہو گا۔

وَمَنْ اَظْلَمُ : میں استفہام انکاری پایا گیا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کی مساجد میں ذکر سے منع کرنے والے سے کوئی بڑا ظالم نہیں ہوسکتا۔

تنبیہ : یہاں مطلقاً ظلم کا ذکر ہے۔ تمام ظلموں سے بڑھ کر ظلم یہی ہو اور کوئی ظلم بڑا نہ ہو یہ مراد نہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ﴿ اِنَّ الشِّرْکَ لَظُلْمٌ عَظِیْمٌ ﴾ بے شک شرک ظلم عظیم ہے۔

اسی طرح زنا اور کسی نفس کو قتل کرنا بھی بہت بڑا ظلم ہے۔ یا تو یہی کہا جائے کہ یہ کلام بامحاورہ ہے۔ مطلب یہ ہے مساجد سے روکنا بڑا ظلم ہے۔ شرک بڑا ظلم ہے۔ زنا بڑا ظلم ہے۔ کسی نفس کو ناحق قتل کرنا بڑا ظلم ہے۔

یا یہ کہا جائے۔ " انه عام دخله التخصيص فلا يقدح فيه " کہ اگرچہ مساجد میں ذکر سے روکنے کو عام کر کے ذکر کیا گیا ہے۔ لیکن مراد عام مخصوص البعض ہے۔ لہٰذا شرک اور زنا اور ناحق کسی کو قتل کرنا اس سے بھی بڑا ظلم ہے۔ (از کبیر بزیادۃ)

اَنْ یُّذْکَرَ فِیْهَا اسْمُهٗ : ملحوظ رہے کہ یہاں ذکر سے وہی ذکر مراد ہے جس کا تعلق اذان، نماز یا اذکار حسنہ سے ہو۔ جہر شدید کے ساتھ ذکر کرنا جو کسی نمازی یا دوسرے عبادت گزار کے لئے موجب تشویش ہو ہرگز جائز نہیں۔ ایسے جہر شدید سے روکنا ضروری ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے شدت جہر سے صحابہ کرام کو روکا ہے، ارشاد فرمایا

" اربعوا على انفسكم فانكم لاتدعون اصم ولا غائبا " (بخاری ص ۴۲۰)

یعنی تم جہر میں اتنی شدت اختیار نہ کرو، اپنی جانوں پر نرمی کرو، کیونکہ تم کسی بہرے یا غائب کو نہیں پکار رہے۔ (التبیان للکاظمی)

خیال رہے کہ مطلقاً بلند آواز سے ذکر منع نہیں۔ اور نماز کے بعد بھی بہت زیادہ بلند آواز سے ذکر کرنا منع ہوگا۔ جبکہ نمازیوں کو تکلیف ہو۔ معمولی آواز سے ذکر کرنا مستحسن ہے۔ راقم کی کتاب "نماز کے بعد بلند آواز سے ذکر، اور دعا مستحب ہے۔" کا مطالعہ کریں۔

مخفی نہ رہے کہ رسول اللہ ﷺ کا ذکر اللہ تعالیٰ کے ذکر سے جدا نہیں۔ درود شریف، کلمہ شہادت، اذان اور نماز میں اللہ کے ذکر کے ساتھ حضور ﷺ کا ذکر شامل ہے۔ حضور کے ذکر کے بغیر نہ اذان ہوگی، نہ درود، نہ کلمہ شہادت، نہ نماز، اللہ اور رسول دونوں کے ذکر سے مسجدیں آباد ہوتی ہیں، معلوم ہوا کہ ذکر رسول ﷺ سے روکنا بھی مسجدوں کو ویران کرنا ہے۔ (التبیان للکاظمی)

وَسَعٰی فِیۡ خَرَابِہَا : (اور کوشش کرتا ہے ان کو ویران کرنے کی)

اس سے مراد صرف مساجد کو شہید کرنا نہیں، بلکہ عام ہے کہ ہر وہ کام، ہر وہ قول، ہر وہ طریقہ جو نمازیوں کو مسجد میں آنے سے روکے وہی مسجد کو ویران کرنے کا سبب ہے۔ لیکن اس سے یہ مراد نہیں کہ امام اگر یہ کہے رشوت حرام ہے۔ شراب حرام ہے۔ جوا حرام ہے۔ سود حرام ہے تو لوگ ناراض ہو جائیں، کسی قسم کی حق بات کرنے سے لوگ ناراض ہوتے ہوں تو ہوتے رہیں۔

اُولٰٓئِکَ مَا کَانَ لَہُمۡ اَنۡ یَّدۡخُلُوۡہَاۤ اِلَّا خَآئِفِیۡنَ :

اس کلام کے کئی مطالب ہیں۔ یعنی ایک جملہ کئی معانی کو شامل ہے۔

(ا) ظاہر الکلام ان الذین آمنوا وسعوا فی تخریب المسجد ھم الذین یحرم علیھم دخولہ الاخائفین "

بظاہر مطلب یہ ہے کہ بے شک وہ لوگ جو ایمان لائے اور کوشش کی مسجد کو ویران کرنے کی، ان لوگوں کو مسجد میں داخل ہونا حرام ہے سوائے اس کے وہ اللہ تعالیٰ کا خوف کرتے ہوئے داخل ہوں۔

(۲) " ما کان ینبغی لھم ان یدخلوا مساجد اللہ الا خائفین علی حال الھیبۃ وارتعاد الفرائص من المؤمنین ان یبطشوا بھم فضلا ان یستولوا علیھا و یمنعوا المؤمنین منھا "

اللہ تعالیٰ کی مساجد میں اس کے ذکر سے روکنے والے کفار کے متعلق ہے کہ انہیں حق نہیں پہنچتا کہ وہ اللہ کی مساجد میں داخل ہوں۔ سوائے اس کے کہ ان پر ہیبت طاری ہوگی، مومنوں سے ڈرتے ہوئے ان کے کندھے کانپ رہے ہوں گے کہ یہ ہمیں پکڑ نہ لیں۔ چہ جائیکہ کہ یہ کفار مساجد کے متولی

بن بیٹھیں اور مؤمنوں کو ان مساجد سے روکنا شروع کر دیں۔

مطلب واضح ہوا کہ انہیں حق تو نہیں پہنچتا، اور زیادہ طور پر مسلمان اپنی مساجد کے امور کے خود ہی متولی ہوتے ہیں۔ اور کفار مساجد میں دخل اندازی سے ڈرتے ہیں۔ ہاں کبھی وہ اپنی سرکشی اور وقتی غلبہ کی وجہ سے مساجد میں تسلط جما بیٹھتے ہیں تو مسلمانوں کو مساجد میں اللہ تعالیٰ کے ذکر سے روکتے ہیں۔

(۳) اللہ تعالیٰ کی طرف سے مسلمانوں کو اس آیہ کریمہ میں بشارت دی گئی ہے کہ عنقریب مسجد حرام اور دوسری مساجد پر مسلمانوں کو ہی غلبہ حاصل ہوگا۔ اور کفار و مشرکین کو ذلت حاصل ہوگی۔ یہاں تک کہ مسجد حرام میں کوئی ایک ان میں سے داخل نہیں ہو سکے گا۔ سوائے اس کے کہ وہ ڈر رہا ہوگا کہ کہیں مجھے پکڑ کر سزا نہ دی جائے، یا یہ کہ اگر میں نے اسلام قبول نہ کیا تو مجھے کہیں قتل ہی نہ کر دیا جائے۔

" وقد انجز الله صدق هذا الوعد فمنعهم من دخول المسجد الحرام و نادی فیهم عام حج ابوبکر ﷺ (الا لا یحجن بعد العام مشرک)

تحقیق اللہ تعالیٰ نے اپنے وعدہ کو پورا فرما دیا کہ مشرکین کو مسجد حرام میں داخل ہونے سے منع کر دیا گیا اور جس سال حضرت ابوبکر ﷺ کی زیر قیادت حج کیا گیا اسی سال اعلان کر دیا گیا خبردار اس سال کے بعد کوئی مشرک حج نہیں کرے گا۔

" وامر النبی ﷺ باخراج الیهود من جزیرة العرب " اور نبی کریم ﷺ نے حکم فرمایا یہود کو جزیرۂ عرب سے نکال دینے کا، یعنی یہود کو کبھی جزیرۂ عرب میں داخل نہ ہونے دینا۔

حضرت ابوبکر ﷺ کے زیر قیادت کئے جانے والے حج کے دوسرے سال ہی نبی کریم ﷺ کی زیر قیادت اور آپ کی معیت میں حج کیا گیا، اس وقت مسجد حرام اور تمام باقی مساجد پر مسلمانوں کو غلبہ حاصل ہو گیا۔

" لایجترئ احد من المشرکین ان یحج و یدخل المسجد الحرام "

اس کے بعد کسی مشرک کو جرأت حاصل نہ ہوسکی کہ وہ حج کرے اور مسجد حرام میں داخل ہو۔

(۴) اگر چہ بظاہر یہ کلام خبری ہے لیکن معنی انشاء ہے۔ اس میں نہی پائی گئی ہے۔ ان کو منع کر دیا گیا کہ تم اللہ کی مساجد میں داخل نہ ہونا سوائے خوف رکھنے کے، یعنی اسلام لانے اور اللہ تعالیٰ کا خوف رکھنے کے بعد داخل ہوسکو گے۔

لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ : (ان کو دنیا میں رسوائی ہوگی) اس رسوائی سے مراد یہ ہے کہ ان کو ایسی ذلت حاصل ہوگی جو مساجد میں داخل ہونے سے ان کے لئے مانع ہوگی۔ اور یہ کہ کفار نے اگر مسلمانوں کے ملک میں رہنا ہو تو جزیہ دے کر رہیں۔

یعنی ان پر جزیہ مقرر کیا جانا ان کے لئے باعث ذلت ہوگا۔

اور یہ کہ کفار کو جنگ میں قتل کر دینے کے حکم سے ان کی ذلت ہوگی۔ یعنی ہر قسم کی ذلت کا ان کو سامنا کرنا پڑے گا۔

" ان الخزی لا یکون الا مایجری مجری العقوبة من الهوان والاذلال " یعنی ہر طرح کی رسوائی اور ذلت کے حاصل ہونے کو " خزی " کہا جاتا ہے۔

یعنی ان کو رسوائی عطاء کر کے دراصل اللہ تعالیٰ کی طرف سے کفر پر قائم رہنے سے جھڑکا جاتا ہے کہ ابھی تمہارے لئے سوچنے کا موقع ہے کہ تم ایمان لے آؤ تا کہ اخروی دائمی عذاب سے بچ جاؤ۔

وَلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ : (اور ان کے لئے آخرت میں بڑا عذاب ہوگا)

اللہ تعالیٰ نے جب ان لوگوں کے بڑے ظلم کو ذکر کیا کہ مساجد کو ویران کرنے اور اللہ تعالیٰ کے ذکر سے مساجد میں روکنے کی وجہ سے وہ بڑے ظالم ہیں۔ " فبین انهم یستحقون العقاب العظیم" تو بیان فرمایا کہ وہ بڑے عذاب کے مستحق ہوں گے۔ (از کبیر)

فائدہ: "لایجوز نقض المسجد ولا بیعه ولا تعطیله وان خربت المحلة"

کسی مسجد کو گرانا، کسی مسجد کو بیچنا اور کسی مسجد کو معطل چھوڑنا جائز نہیں، اگر چہ محلّہ برباد بھی کیوں نہ ہو جائے۔

" ولا یمنع بناء المساجد الا ان یقصدوا الشقاق و الخلاف " مساجد کی تعمیر سے کسی کو نہ منع کیا جائے ، ہاں اگر کوئی فتنہ وفساد اور اختلاف پیدا کرنا چاہے تو منع ہوگا ایسی مسجد کو بنانا۔

یعنی اگر ایک مسجد کے متصل ہی دوسری مسجد بنالی جائے۔ مقصد صرف لڑائی جھگڑا ہو۔ تو دوسری مسجد بنانے والے ثواب کے بجائے گناہ حاصل کررہے ہیں۔ (از قرطبی)

اگر ایک مسجد میں دو امام اس غرض سے مقرر کر دئے جائیں کہ ان کی آپس میں لڑائی ہوتی رہے۔ مسجد کا نظام ایک تماشا دکھائی دے تو دوسرے امام کا مقرر کرنا جائز نہیں ہوگا۔ دوسرا امام درحقیقت امام نہیں ہوگا شیطان ہوگا۔ ہاں اگر ایک امام ہو۔ دوسرا نائب اور معاون ہے بغیر کسی فتنہ وفساد کے نظام چلائے تو درست اقدام ہے۔

مساجد کی انتظامیہ کے لوگ اگرچہ کئی نیک بھی ہوتے ہیں۔ لیکن زیادہ طور پر ائمہ مساجد پر اپنا تسلط قائم رکھنے ، ان کو محکوم سمجھنے ، کسی اور نمازی کی رائے کو کوئی فوقیت نہ دینے ، اپنے فیصلوں کو زبردستی ٹھونسنے کی وجہ سے ثواب سے بھی محروم رہتے ہیں ، اور گناہ ہی حاصل کرتے ہیں۔

جب راولپنڈی (پاکستان) میں حکومت کی جانب سے مساجد کو شہید کر کے سڑکوں کو کشادہ کیا جانے لگا ، مساجد کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کیا جانے لگا۔ مساجد کی انتظامیہ اور ان کے اماموں سے سودا کیا جانے لگا تو راقم نے ایک رسالہ '' مسجد اور اس کے احکامات '' تحریر کیا فائدہ کے لئے اسے یہاں شامل کیا جارہا ہے۔

☆☆☆

اَعُوْذُ بِاللهِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ
﴿ بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ﴾

﴿ مَا كَانَ لِلْمُشْرِكِیْنَ اَنْ یَّعْمُرُوْا مَسٰجِدَ اللهِ شٰهِدِیْنَ عَلٰی اَنْفُسِهِمْ بِالْكُفْرِ اُولٰئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ وَفِی النَّارِ هُمْ خٰلِدُوْنَ ☆ اِنَّمَا یَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللهِ مَنْ اٰمَنَ بِاللهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَی الزَّكٰوةَ وَلَمْ یَخْشَ اِلَّا اللهَ فَعَسٰی اُولٰئِكَ اَنْ یَّكُوْنُوْا مِنَ الْمُهْتَدِیْنَ ﴾
(پ ۱۰ / ۹)

مشرکوں کو نہیں (حق) پہنچتا کہ اللہ کی مسجدیں آباد کریں، خود اپنے کفر کی گواہی دے کر۔ ان کا تو سب کیا دھرا اکارت (ضائع) ہے۔ اور وہ ہمیشہ آگ میں رہیں گے۔ اللہ کی مسجدیں وہی آباد کرتے ہیں جو اللہ اور قیامت پر ایمان لاتے اور نماز قائم کرتے ہیں اور زکوۃ دیتے ہیں۔ اور اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے تو قریب ہے کہ یہ لوگ ہدایت والوں میں ہوں۔

عمارة المسجد؟

مسجد کی ''عمارۃ'' کے دو مطلب ہیں، ایک یہ کہ مسجد میں زیادہ سے زیادہ وقت عبادت کے لئے گزارنا، اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ مسجد کی تعمیر کرنا۔ اگر یہ دوسرا معنیٰ لیا جائے تو آیۃ کریمہ کا مطلب یہ ہوگا کہ کافروں کے لئے لائق نہیں کہ وہ مساجد کی تعمیر و مرمت کریں۔ اس کی کئی وجوہات ہیں۔

(۱) کفار و مشرکین کو تعمیر مسجد کا حق اس لئے نہیں پہنچتا کہ مساجد عبادت کے لئے بنائی جاتی ہیں اس لئے ضروری ہے کہ ان کی تعظیم کی جائے لیکن کافر تو مساجد کی بے حرمتی کرتے ہیں ان کی تعظیم نہیں کرتے۔

(۲) اور وجہ یہ ہے کہ کافر ناپاک ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی اس پر واضح طور پر دلالت کر رہا ہے ﴿اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ﴾ یقیناً مشرک ناپاک ہیں اور ناپاک لوگوں سے مساجد کو پاک کرنے کا حکم بھی رب تعالیٰ نے خود فرمایا۔ ﴿ اَنْ طَهِّرَا بَیْتِیَ لِلطَّآئِفِیْنَ وَالْعٰكِفِیْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ﴾ یہ کہ میرے گھر کو طواف کرنے والوں اور اعتکاف بیٹھنے والوں اور رکوع

کرنے والوں اور سجدہ کرنے والوں کے لئے پاک رکھو۔

(۳) اور وجہ یہ بھی ہے کہ کافر نجاست سے پرہیز نہیں کرتا؛ اس لئے بسا اوقات کافر کے مسجد میں آنے سے مسجد کو گندگی سے ملوث کرنا لازم آئے گا۔

(۴) اور وجہ یہ ہے کہ کافر مسجد میں آ کر مسلمانوں کی عبادت میں فساد ہی پیدا کرے گا حالانکہ مساجد جائے امن وسکون ہیں۔

(۵) اور یہ بھی وجہ ہے کہ کافر مسجد کو تعمیر کر کے مسلمانوں پر اپنا احسان جتائے گا۔ یہ جائز نہیں کہ مسلمان کافر کے احسان مند رہیں اور وہ اپنا احسان جتلاتا پھرے۔

جب پہلا معنی مراد لیا جائے کہ عمارة المسجد کا معنی ''عبادت کے ذریعے مسجد کو آباد کرنا ہے'' تو یہ...... رب کی عبادت کرنا...... کافر سے ویسے ہی ممکن نہیں، اگر کوئی منافقت سے عبادت کے لئے مسجد میں آئے تو اس پر کڑی نظر رکھنے کی ضرورت ہے۔

مسجد کو آباد کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ پر ایمان ہونا ضروری ہے۔ اس لئے کہ مسجد وہ مقام ہے جہاں اللہ تعالیٰ کی عبادت کی جاتی ہے اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے بغیر ممکن نہیں کہ وہ شخص مسجد تعمیر کرے۔ اسی طرح آخرت کے دن پر ایمان ہونا بھی ضروری ہے۔ کیونکہ جس شخص کا قیامت پر ایمان ہوگا وہی اللہ تعالیٰ کا عبادت گزار ہوگا۔ اور جو شخص قیامت کا منکر ہوگا وہ اللہ تعالیٰ کا عبادت گزار نہیں ہوگا۔ اور جب تک انسان اللہ تعالیٰ کی عبادت نہیں کرے گا وہ مسجد بھی تعمیر نہیں کرے گا۔

خیال رہے کہ اللہ تعالیٰ پر ایمان اس وقت تک مکمل نہیں ہوگا جب تک انبیاء کرام اور کتب الٰہیہ اور ملائکہ پر ایمان نہیں ہوگا۔ اس لئے واضح ہوا کہ مسجد کو وہی شخص عبادت کے ذریعے یا تعمیر کے ذریعے آباد کرے گا جس کا اللہ تعالیٰ، انبیاء کرام، آسمانی کتب، فرشتوں اور قیامت پر ایمان ہوگا۔

اسی طرح وہ شخص جو نماز ادا کرتا ہوگا وہی مسجد کی تعمیر کرے گا کیونکہ مسجد کے تعمیر کرنے میں ''مقصد عظیم'' نماز ادا کرنا ہے۔ انسان جب تک نماز کے وجوب کو ماننے والا نہیں ہوگا وہ مسجد بھی تعمیر نہیں کرے گا۔

علامہ رازی رحمۃ اللہ علیہ کے اس قول......"فالانسان مالم یکن مقرا بوجوب الصلوات امتنع ان یقدم علی بناء المسجد"......سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ انسان نماز کی فرضیت کو ماننے والا ہو لیکن غفلت ولا پرواہی کے باعث نماز ادا نہ کرتا ہو تو وہ بھی بعض اوقات مسجد تعمیر کر دیتا ہے۔

رب تعالیٰ نے مساجد تعمیر کرنے والوں کے اوصاف میں زکوٰۃ ادا کرنے کا ذکر بھی کیا ہے، ایک وجہ تو یہ ہے کہ نماز کے ساتھ کئی مقامات پر زکوٰۃ کا ذکر کیا گیا ہے اس لئے یہاں بھی ذکر کر دیا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اس سے اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ مسجد تعمیر کرنا مستحب ہے جبکہ زکوٰۃ ادا کرنا فرض ہے۔ اس لئے انسان کو چاہئے کہ فرائض کو ضروری طور پر ادا کرے، پھر بعد میں اللہ تعالیٰ توفیق عطا فرمائے تو مستحبات پر بھی عمل کرے۔

مسجد کی تعمیر کرنے والے وہ لوگ ہیں جن کے دل میں تقویٰ اور خشیت الٰہی پائے جائیں۔

مسجد کے فضائل و آداب:

انسان کے لئے ضروری ہے کہ مسجد میں سوائے عبادت اور نیکی کی باتوں کے دنیاوی باتیں نہ کرے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

" یأتی فی آخر الزمان ناس من امتی یأتون المساجد یقعدون فیھا حلقا ذکرھم الدنیا وحب الدنیا لا تجالسوھم ، فلیس للہ بھم حاجة "

آخر زمانہ میں میری امت سے کچھ لوگ ایسے ہوں گے جو مساجد میں آ کر حلقہ بنا کر بیٹھیں گے وہ دنیا کا ذکر کریں گے اور انہیں دنیا سے ہی محبت ہو گی، ان کے ساتھ تم نہ بیٹھنا، ان لوگوں سے اللہ تعالیٰ کو کوئی واسطہ نہیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ کو ان کے دین سے دور رہنے اور دنیا میں مشغول رہنے کی کوئی پرواہ نہیں بلکہ وہ اپنا ہی نقصان کر رہے ہوں گے۔

نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

" الحدیث فی المسجد یاکل الحسنات کما تأکل البھیمة الحشیش "

مسجد میں کلام نیکیوں کو ایسے کھا جاتی ہے جیسے چوپائے گھاس کو کھاتے ہیں۔

خیال رہے اس کلام سے مراد وہ کلام ہے جس کا تعلق دنیاداری سے ہو۔ لیکن دینی کلام، مسائل پر گفتگو اور ہر وہ کلام جس میں نیک مقصد ہو۔ کسی کی راہنمائی کرنا مقصود ہو، وہ جائز ہے اور اس میں ثواب ہے۔

نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

" من اسرج فی مسجد سراجا لم تزل الملائکة وحملة العرش یستغفرون له مادام فی المسجد ضوؤه "

جس نے مسجد میں چراغ جلایا (یعنی روشنی کی) تو اللہ تعالیٰ کے فرشتے اور حاملین عرش ہمیشہ اس کے لئے بخشش طلب کرتے رہتے ہیں جب تک مسجد میں وہ روشنی رہتی ہے۔

(ماخوذ از تفسیر کبیر ج ۱۶ ص ۸ تا ۱۰)

تعمیر مسجد ذریعہء جنت:

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

" من بنی لله مسجدا بنی الله له بیتا فی الجنة "

(بخاری مسلم، مشکوۃ باب المساجد)

جس شخص نے اللہ تعالیٰ کے لئے مسجد بنائی اللہ تعالیٰ اس کے لئے جنت میں گھر بنائے گا۔

یعنی جس شخص نے اللہ تعالیٰ کی رضامندی حاصل کرنے کے لئے مسجد کی تعمیر کی اللہ تعالیٰ اسے جنت میں مقام عطا فرمائے گا۔

مساجد اللہ کی پسندیدہ جگہیں ہیں:

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

" احب البلاد الی الله مساجدها وابغض البلاد الی الله اسواقها "

تمام مقامات سے اللہ تعالیٰ کو مساجد سے زیادہ محبت ہے اور تمام مقامات سے رب تعالیٰ کو زیادہ ناپسند مقام بازار ہیں۔ (مسلم، مشکوۃ، باب المساجد)

مساجد سے محبت کی وجہ یہ ہے کہ مساجد میں انسان اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتا ہے جس سے انسان کو اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہوتا ہے جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ اسے اپنی رحمت سے نوازتا ہے۔

" المراد بحب الله المساجد ارادة الخیر لاهلها "

اللہ تعالیٰ کا مساجد سے محبت کرنے کا مطلب بھی یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ مساجد میں عبادت کرنے والوں کو خیر (بھلائی، رحمت) عطا فرماتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

" المساجد مواطن المتقین " مساجد متقین کے مقامات ہیں۔

اللہ تعالیٰ کو بازار کیوں ناپسند ہیں؟

حضرت ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں:

" والاسواق محل افعال الشیاطین من الحرص والطمع و الخیانۃ و الغفلۃ "

(مرقاۃ المفاتیح)

بازار شیطانوں کے مقامات ہیں یہی وجہ ہے کہ بازاروں میں حرص، لالچ، خیانت اور غفلت زیادہ پائی جاتی ہے۔ غفلت سے مراد نمازوں میں کوتاہی کرنا، سچ نہ بولنا، جھوٹ کی پرواہ نہ کرنا، ملاوٹ، دھوکہ بازی جیسے کام ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا بازاروں سے بغض رکھنے کا مطلب یہ ہے ...... " وبالبغض خلافہ " ...... کہ مساجد کے برخلاف بازاروں میں رہنے والوں پر اللہ تعالیٰ کی رحمت نہیں ہوتی، وہ اس کی رحمت سے دور ہوتے ہیں۔

تنبیہ: بازار و مسجد کے اس حکم کے متعلق ملا علی قاریؒ وضاحت فرماتے ہیں:

" وھذا بطریق الاغلبیۃ والا فقد یقصد المسجد بقصد نحو الغیبۃ وقد یدخل السوق لطلب الحلال "

(مرقاۃ المفاتیح)

مساجد اور بازاروں کا یہ حکم اکثری اور غالب طور پر ہے۔ وگرنہ جو لوگ مسجد میں غیبت کرنے، چوری کرنے، فساد و فتنہ پھیلانے، امام کو تنگ کرنے کے لئے آتے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے دور ہی رہیں گے۔ ایسے لوگوں سے اللہ تعالیٰ ناراض ہوتا ہے۔

تاہم اگر کوئی شخص بازار میں رزق حلال تلاش کرنے کے لئے جائے، سچ بولے، صاف ستھری تجارت کرے تو وہ یقیناً اللہ تعالیٰ کی رحمت کا مستحق ہوتا ہے۔

نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

"طلب کسب الحلال فریضة بعد الفریضة"

حلال روزی کمانا دوسرے فرائض کو ادا کرنے کے بعد فرض ہے۔ (بیهقی ، مشکوٰة باب طلب کسب الحلال)

نبی کریم ﷺ سے پوچھا گیا یا رسول اللہ کون سا کسب پاکیزہ اور حلال ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا:

"عمل الرجل بیده و کل بیع مبرور"

کسی انسان کا اپنے ہاتھوں سے کمانا اور صاف ستھری تجارت کرنا (کسب حلال ہے۔)

(مسند احمد ، مشکوٰة باب طلب کسب الحلال)

مسجد میں آمد و رفت سے جنت میں مہمان نوازی:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"من غدا الی المسجد اوراح اعد اللہ نزله من الجنة کلما غدا اوراح"

جو شخص صبح، شام مسجد میں جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کے لئے جنت میں مہمانوں والا کھانا تیار فرماتا ہے جب بھی صبح جائے یا شام جائے۔ (بخاری ، مسلم ، مشکوٰة باب المساجد)

یعنی عبادت کی غرض سے مسجد میں صبح و شام جانے سے انسان اللہ تعالیٰ کا جنتی مہمان بن جاتا ہے۔ خیال رہے "راح" کا لفظ ظہر سے عشاء تک کے تمام وقت کو شامل ہے۔ مطلب واضح ہوا کہ پانچ نمازیں ادا کرنا مقصود ہیں اور یہ عمل بھی ہمیشہ جاری رکھے۔

ملا علی قاریؒ شرح کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"کلما استمر غدوه ورواحه استمر اعداد نزله فی الجنة"

جب انسان ہمیشہ کے لئے نماز ادا کرے گا، ہر روز مسجد میں جانے کا معمول بنائے گا تو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے وہ اللہ تعالیٰ کا جنت میں مہمان رہے گا۔ ہر روز اسے بطور مہمان کھانے میسر ہوں گے۔

یہاں سے ہی ایک مسئلہ سمجھ میں آیا۔ جیسے کہا جاتا ہے..... "الحرکة سبب البرکة"..... حرکت برکت کا سبب ہے۔ یعنی انسان ہاتھ پہ ہاتھ دھرے نہ بیٹھا رہے بلکہ اعمال جاری رکھے۔

دوسرا مسئلہ یہ واضح ہوا کہ "الذهاب الی الطاعة علامة اعداد اللہ المثوبة" نیکی کا

کام کرنے کے لئے جانا، اللہ تعالیٰ کے ثواب عطاء کرنے کی علامت ہے۔ یعنی عبادت سے اللہ تعالیٰ کی رضامندی حاصل ہوتی ہے۔ (از مرقاۃ)

مسجد میں دور سے چل کر آنا زیادہ ثواب کا سبب ہے:

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ مسجد کے اردگرد کچھ جگہ خالی تھی، قبیلہ بنو سلمہ نے ارادہ کیا کہ وہ مسجد کے قریب منتقل ہو جائیں، نبی کریم ﷺ کو پتہ چلا تو آپ نے ان سے کہا مجھے یہ خبر ملی ہے کہ تم مسجد کے قریب منتقل ہونے کا ارادہ رکھتے ہو (کیا ایسا ہی ہے؟) انہوں نے عرض کیا ہاں یارسول اللہ ﷺ (ہمارا یہی ارادہ ہے) تو آپ ﷺ نے فرمایا اے بنی سلمہ "**دیارکم! تکتب آثارکم، دیارکم! تکتب آثارکم**" تم اپنے گھروں کو لازم پکڑو تمہارے قدموں کے آثار کو لکھا جائیگا۔

(مسلم، مشکوٰۃ باب المساجد)

اگرچہ نبی کریم ﷺ نے دو مرتبہ "**دیارکم تکتب آثارکم**" کے الفاظ مبارکہ ہی ذکر فرمائے ہیں، لیکن یہ تکرار تاکید کے لئے نہیں بلکہ علیحدہ علیحدہ مفہوم ہے۔

ایک مرتبہ آپ کے الفاظ مبارکہ کا مفہوم یہ ہے۔ "**التزموا دیارکم تکتب فی صحف الاعمال ای کثرۃ الخطا سبب لزیادۃ الاجر**" اپنے گھروں کو لازم پکڑو یعنی وہیں رہو جتنے زیادہ قدم چلو گے اتنا ہی زیادہ ثواب تمہارے نامہ اعمال میں لکھا جائے گا۔

دوسری مرتبہ بھی آپ نے الفاظ مبارکہ تو وہی ذکر فرمائے لیکن ان کا مطلب یہ ہے۔ "**الزموا دیارکم تکتب فی کتب السیر**" تم اپنے گھروں میں ہی رہو تمہارا ذکر سیرت کی کتابوں میں لکھا جائے گا۔ یعنی تمہارا واقعہ اور تمہارا عبادت میں مشقت برداشت کرنا سلف صالحین کی سیرت کی کتابوں میں لکھا جائے گا؛ تاکہ دوسرے لوگ بھی اسی کی تمنا کریں اور وہ بھی اپنی عبادت میں کوشش کریں اور مشقت برداشت کریں۔

یعنی ان صحابہ کرام کا عمل ایک اور حدیث پاک کا بھی عملی نمونہ تھا۔ وہ حدیث یہ ہے:

"**من سن سنۃ حسنۃ فلہ اجرھا واجر من عمل بھا الی یوم القیامۃ**"

جس شخص نے اچھا عمل رائج کیا اسے اس کا ثواب ملے گا اور جس شخص نے بھی اس پر عمل کیا اسے بھی ایسا ہی ثواب ملے گا۔

" وفیہ تنبیہ ان فی الحدیث معجزۃ لہ علیہ السلام واشارۃ الی ان التکرار لیس للتاکید بل بشارۃ الی الکتابتین "
(مرقاۃ ج ۲ ص ۱۹۴)

واضح ہوا کہ حدیث پاک سے نبی کریم ﷺ کا معجزہ ثابت ہورہا ہے کہ آپ نے دومرتبہ ذکر فرمایا یہ تکرار تاکید کیلئے نہیں بلکہ دومرتبہ ان کے عمل کو لکھے جانے کا ذکر ہے۔ ایک مرتبہ نامہ اعمال میں اور ایک مرتبہ سیرت کی کتب میں۔ نبی کریم ﷺ کا ارشاد حرف بحرف ثابت ہو چکا ہے کیونکہ حدیث پاک کے شارحین نے اپنی اپنی کتب میں ذکر کیا ہے۔ راقم جیسا سیاہ کار بھی صحابہ کرام کے اس عظیم عمل کو ذکر کر کے اپنی نجات کا ذریعہ بنا رہا ہے۔ (ان شاء اللہ العزیز)

مسجد سے دل لگانے والا اللہ کی رحمت کے سایہ میں:

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

" سبعة یظلهم الله في ظله یوم لا ظل الا ظله امام عادل وشاب نشأ في عبادة الله وّرجل قلبه معلق بالمسجد اذا خرج منه حتی یعود الیه وّرجلان تحابا في الله اجتمعا علیه وتفرقا علیه وّرجل ذكر الله خالیا ففاضت عیناه وّرجل دعته امرأة ذات حسب وجمال فقال اني اخاف الله وّرجل تصدق بصدقة فاخفاها حتی لا تعلم شماله ماتنفق یمینه "

(بخاری ، مسلم مشکوۃ باب المساجد)

سات قسم کے شخص اس دن اللہ تعالیٰ رحمت کے سایہ میں ہوں گے جس دن اس کی رحمت کے سایہ کے بغیر اور کوئی سایہ نہیں ہوگا۔

(۱) عدل وانصاف کرنے والا حاکم۔

(۲) جوانی میں اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے والا۔

(۳) اور وہ شخص جس کا دل مسجد سے معلق رہے جب مسجد سے نکلے تو پھر مسجد کیطرف لوٹنے کی تمنا رکھے

(۴) اور دو شخص جو آپس میں اللہ تعالیٰ کی رضامندی کی خاطر محبت رکھیں جب دونوں جمع ہوں اور جب دونوں علیحدہ ہوں (یعنی آمنے سامنے بھی محبت رکھیں اور ایک دوسرے کے پیچھے بھی محبت رکھیں۔ ایسا نہ ہو کہ ان کی محبت منافقت پر مبنی ہو اور وہ کسی ابوجہل کے آلہ کار بنے ہوئے ہوں)

(۵) اور وہ شخص جو اللہ تعالیٰ کا ذکر علیحدہ ہو کر کرے اور اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوں (یعنی لوگوں سے علیحدہ ہو کر، ریاکاری سے ہٹ کر اور معبودان باطلہ سے دور رہ کر صرف اللہ تعالیٰ کی عبادت کرے، خلوص ومحبت سے عبادت کرے اور دل میں خوف الٰہی ہو جس سے عبادت کرتے ہوئے آنکھیں ڈبڈبا جائیں)

(۶) اور وہ شخص جسے ایک عورت خوبصورت اور حسب ونسب والی دعوتِ گناہ دے تو وہ کہے میں اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہوں (اس طرح وہ اس سے بچ کر رہے)

(۷) اور وہ شخص جو مخفی طور پر صدقہ دے یہاں تک کہ بائیں ہاتھ کو معلوم نہ ہو سکے جو دائیں ہاتھ نے خرچ کیا ہو (اس سے مراد نفلی صدقہ ہے کیونکہ زکوۃ ظاہراً دینا بہتر ہے تاکہ یہ خود اس تہمت سے بچ سکے کہ یہ زکوٰۃ ادا نہیں کرتا اور دوسری وجہ یہ ہے کہ دوسرے لوگ بھی اسے دیکھ کر زکوٰۃ ادا کریں)

تحیة المسجد :

حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

" اذا دخل احدکم المسجد فلیرکع رکعتین قبل ان یجلس "

جب تم میں سے کوئی ایک مسجد میں داخل ہو تو وہ بیٹھنے سے پہلے دو رکعت ادا کرے۔

(بخاری، مسلم، مشکوۃ، باب المساجد)

ایک روایت میں اس طرح ذکر ہے۔

" اعطوا المساجد حقها ، قالوا وما حقها یارسول الله ؟ قال ان تصلوا رکعتین قبل ان تجلسوا "

حضور ﷺ نے فرمایا: مساجد کو ان کا حق دو، صحابہ کرام نے پوچھا یارسول اللہ مساجد کا حق کیا ہے؟ آپ نے فرمایا مساجد میں بیٹھنے سے پہلے دو رکعت (نوافل) ادا کرنا۔ (مرقاۃ ج۲ ص ۱۹۸)

تحیة المسجد کا بدل:

" ومن دخله کراهة الصلوة او وهو محدث قال اربع سبحان الله والحمد لله ولا اله الا الله

والله اکبر وزاد بعضهم ولا حول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم" (مرقاۃ ج ۲ ص ۱۹۹)

اگر کوئی شخص مسجد میں ایسے وقت داخل ہو جس میں نوافل ادا کرنے منع ہوں (جیسے صبح صادق سے لے کر طلوع آفتاب تک اور عصر کی نماز ادا کر لینے کے بعد سے مغرب کی نماز ادا کر لینے تک نوافل ادا کرنے منع ہیں۔ اسی طرح طلوع آفتاب اور غروب آفتاب اور ضحوۃ کبری یعنی عام طور پر جسے زوال کہا جاتا ہے ان اوقات میں بھی نوافل ادا کرنے مکروہ ہیں) یا وہ بے وضو ہو تو دو رکعت نوافل نہ ادا کرے بلکہ چار مرتبہ...... "سُبْحَانَ اللهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَلاَ اِلٰهَ اِلاَّ اللهُ وَاللهُ اَكْبَرُ"...... پڑھے۔ بعض حضرات نے فرمایا ان الفاظ کے بعد" وَلاَ حَوْلَ وَلاَ قُوَّةَ اِلاَّ بِاللهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ" بھی پڑھے۔ یعنی تیسرا کلمہ مکمل پڑھے۔ سلف صالحین میں سے بعض حضرات نے بیان کیا ہے کہ چار مرتبہ تیسرا کلمہ پڑھ لینے سے دو رکعت نوافل کا ثواب مل جائے گا۔

اس قول پر امام کبیر تابعی حضرت جابر بن زید کی روایت تائید کر رہی ہے۔ آپؒ نے فرمایا" اذا دخلت المسجد فصل فیه فان لم تصل فاذکر اللہ فکانک قد صلیت" جب تم مسجد میں داخل ہو تو دو رکعت نوافل ادا کر لو اگر تم نماز نہ ادا کر سکو تو اللہ تعالیٰ کا ذکر ہی کر لو، اس سے تمہیں ایسا ہی ثواب حاصل ہو گا جیسا کہ تم نے نماز ادا کی۔

" ومن دخل المسجد الحرام واراد الطواف فلیبدأ به والا فلیصل "

جو شخص مسجد حرام میں داخل ہو وہ اگر طواف کرنے کا ارادہ رکھتا ہو تو وہ پہلے طواف کرے، اگر طواف کا ارادہ نہ ہو تو تحیۃ المسجد ادا کرے۔

" ان الزائر اذا دخل المسجد النبوی یصلی اولا ثم یزورہ تقدیما لحق اللہ تعالیٰ وتعظیمه علی حق رسول اللہ وتکریمه "

بے شک رسول اللہ ﷺ کے روضہ مطہرہ کی زیارت کرنے کے ارادہ سے جانے والا شخص جب مسجد نبوی شریف میں داخل ہو تو پہلے تحیۃ المسجد ادا کرے تاکہ اللہ تعالیٰ کے حق اور اللہ تعالیٰ کی تعظیم کو رسول اللہ ﷺ کے حق و تکریم پر مقدم رکھے۔ (مرقاۃ ج ۲ ص ۱۹۹)

" واداء الفرض ینوب عنها وکل صلوۃ اداها عند الدخول بلانیة التحیة لان التحیة

لتعظیمه وحرمته وقد حصل ذلک بما صلاه ولا تفوت بالجلوس عندنا وان کان الافضل فعلها قبله "

مسجد میں جاتے ہوئے فرض نماز ادا کرنا یا سنت وغیرہ ادا کرنا "تحیۃ المسجد" کے قائم مقام ہوں گے۔ کیونکہ تحیۃ المسجد ادا کرنے کا مقصد مسجد کی تعظیم وتحریم ہے وہ ہر قسم کی نماز سے حاصل ہوجاتی ہے۔ اگر چہ علیحدہ دو رکعت تحیۃ المسجد کے ارادہ سے ہی ادا کرنا افضل ہے۔
(نورالایضاح، مراقی، ذریعۃ النجاح ص ۱۰۰)

حدیث شریف میں جو ذکر ہے کہ بیٹھنے سے پہلے تحیۃ المسجد ادا کرے وہ بیان افضلیت ہے۔ اگر پہلے بیٹھ گیا پھر نماز ادا کی تو تحیۃ المسجد کا مقصد فوت نہیں ہوگا۔

مسجد میں داخل ہونے کی دعا:

نبی کریم ﷺ نے فرمایا: تم میں سے جب بھی کوئی شخص مسجد میں داخل ہو تو یہ پڑھے۔

" اَللّٰهُمَّ افۡتَحۡ لِیۡ اَبۡوَابَ رَحۡمَتِکَ "

اے اللہ! میرے لئے اپنی رحمت کے دروازے کھول۔

مسجد سے باہر نکلنے کی دعاء:

نبی کریم ﷺ نے فرمایا تم میں سے جب بھی کوئی شخص مسجد سے باہر آئے تو یہ کہے۔

" اَللّٰهُمَّ اِنِّیۡ اَسۡئَلُکَ مِنۡ فَضۡلِکَ "

اے اللہ میں تجھ سے تیرے فضل کا سوال کرتا ہوں۔ (مسلم، مشکوۃ باب المساجد)

دونوں دعاؤں میں وجہ فرق:

مسجد میں داخل ہوتے وقت رحمت کی دعا کی جاتی ہے۔ اس لئے کہ انسان جب مسجد میں داخل ہوتا ہے تو عبادت میں مشغول ہوتا ہے۔ جو حصولِ ثواب اور دخول جنت کا ذریعہ ہے۔ اس کے مناسب رحمت کی دعا ہی ہے۔ لیکن جب مسجد سے باہر آئے تو رزق حلال کی تلاش میں ہوتا ہے۔ اس لئے وہاں مناسب یہی ہے کہ اللہ کے فضل کی طلب کرے؛ کیونکہ رزق حلال کو حاصل کرنا رب تعالیٰ کا فضل ہے۔

اللہ تعالیٰ نے خود فرمایا:

﴿فَانْتَشِرُوْا فِی الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ﴾...... جب نماز جمعہ ادا کرلو...... تو زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کے فضل کو حاصل کرو، یعنی تجارت کرو اور رزق حلال کو حاصل کرو۔

(مرقاۃ ج ۲ ص ۱۹۸)

فائدہ جلیلہ:

"عن فاطمۃ الکبریٰؓ قالت کان رسول اللہ ﷺ اذا دخل المسجد صلی علی محمد و سلم"

حضرت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ جب مسجد میں داخل ہوتے تھے تو (اپنے آپ پر درود پاک ان الفاظ میں) پڑھتے تھے۔ "صلّٰی علی محمد و سلّم"

آپ کو اپنے آپ پر ایمان لانا واجب تھا اس وجہ سے آپ اپنے آپ پر درود شریف پڑھتے اور اس میں امت کو تعلیم دینا بھی مقصود تھا تا کہ میری امت بھی جب مسجد میں داخل ہو تو دعا سے پہلے درود شریف پڑھے۔ (حاشیہ ترمذی)

"و فی خبر الحاکم و صححہ اذا دخل احدکم المسجد فلیسلم علی النبی ﷺ"

مستدرک حاکم میں صحیح حدیث بیان کی گئی ہے۔ "جب تم میں سے کوئی ایک مسجد میں داخل ہو تو نبی کریم ﷺ پر درود پڑھے"۔ (مرقاۃ ج ۲ ص ۱۹۸)

ان روایات اور اقوال ائمہ سے معلوم ہوا کہ مسجد میں داخل ہوتے اور نکلتے وقت رحمت و فضل کی دعاؤں میں ابتداء درود شریف سے کرے؛ تا کہ حصول برکت اور قبولیت دعا کا ذریعہ ہو۔

مسجد سے نکلتے ہوئے یہ بھی پڑھے:

عالمہ ابن سنی رحمہ اللہ نے بیان کیا ہے کہ جب انسان مسجد سے نکلنے کے ارادہ پر مسجد کے دروازہ پر آ کر کھڑا ہوتا ہے تو شیطانی لشکر اس طرح جمع ہو جاتے ہیں جس طرح شہد کی مکھیاں اپنے چھتے پر جمع ہوتی ہیں۔ اس لئے وہ درج ذیل دعا پڑھے تا کہ ان کے وسوسوں اور ہر قسم کے ان سے واقع ہونے والے خطرات سے محفوظ رہ سکے۔

(وہ دعا یہ ہے) "اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُ بِکَ مِنْ اِبْلِیْسَ وَجُنُوْدِہٖ"

اے اللہ میں تیری پناہ پکڑتا ہوں شیطان اور اس کے لشکر سے۔ (از مرقاۃ ج ۲ ص ۱۹۸)

مسجد میں سوال کرنا اور سائل کو عطا کرنے کا حکم:

اس مسئلہ میں اگرچہ اہل علم نے اختلاف کیا ہے تاہم علامہ ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس پر شاندار محاکمہ بیان کیا ہے، جس میں تمام اقوال جمع ہو سکتے ہیں۔

کچھ حضرات نے مطلقاً سائل کو عطا کرنے سے منع کیا ہے انہوں نے بطور دلیل یہ کہا ہے کہ بعض روایات میں اس طرح آتا ہے۔

"ینادی یوم القیامة لیقم بغیض اللہ فیقوم سؤال المسجد"

قیامت کے دن جب یہ نداء دی جائے گی کہ اللہ کے غیض سے کوئی شخص کھڑا ہو جائے تو وہی شخص کھڑا ہوگا جو مسجد میں سوال کیا کرتا تھا۔ خیال رہے غیـــض کا معنی ''کمی، تھوڑی مقدار'' ہے۔ لہذا یہ معنی ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی جس شخص پر کم رحمت ہے وہ کھڑا ہو۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ ''غیـــض'' بمعنی غیظ ہو جائے جس کا معنی ناراضگی ہے۔

کچھ حضرات نے مطلقاً سوال کرنے اور سائل کو عطا کرنے کا جواز تسلیم کیا ہے ان کی دلیل یہ ہے صحیح حدیث میں یہ مذکور ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے پوچھا:......

" ھل احـدکـم مـنـکـم اطعم الیوم مسکینا فقال ابوبکرؓ دخلت المسجد فاذا انا بسائل فوجدت کسرة خبز فی ید عبدالرحمن فاخذتھا فدفعتھا الیه "

......کیا کسی شخص نے تم میں سے آج سائل کو کھانا کھلایا ہے تو حضرت ابوبکر صدیق ؓ نے عرض کیا (ہاں یا رسول اللہ) میں مسجد میں داخل ہوا تو میں نے ایک سائل کو پایا میں نے ...... اپنے بیٹے عبدالرحمٰن کے ہاتھ میں ایک روٹی کا ٹکڑا پایا، میں نے وہ روٹی کا ٹکڑا اس کے ہاتھ سے لے کر سائل کو دے دیا۔ رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابوبکر صدیق کے اس فعل کو جنت میں جانے کا ذریعہ قرار دیا۔

محاکمہ:

بعض حضرات نے تفصیل ذکر کی ہے اور اس مسئلہ کو اس طرح بیان کیا ہے کہ دونوں قسم کی احادیث پر عمل کیا جا سکے اور یہی قول بہتر بھی ہے۔

(۱) "من یؤذی الناس بالمرور ونحوہ فیکرہ اعطاؤہ لانہ اعانۃ لہ علی ممنوع"

جوشخص لوگوں کو گذرتے ہوئے تکلیف دے یعنی گردنوں کو پھاند کر آگے صف میں پہنچنے کی کوشش کرے یا اور اسی طرح کسی قسم کی تکلیف کا سبب بنے اسے کچھ نہ دیا جائے کیونکہ دوسروں کو تکلیف دینا منع ہے اور ممنوع چیز پر معاونت بھی ممنوع ہے۔

خیال رہے کہ اسی طرح پیشہ ور بھکاری جھوٹی قسمیں اٹھا کر اپنی حالت زار بیان کرنے والے سائلین کی امداد بھی نہ کی جائے۔ ایسے لوگوں کی امداد کرنا درحقیقت ان کو اس پیشہ پر قائم رکھنا لازم آتا ہے۔ ان کی حوصلہ شکنی ضروری ہے۔

(۲) "ومن لایؤذی فیسن اعطاؤہ لان السئول کانوا یسألون علی عھد رسول اللہ ﷺ فی المسجد"

اور جوشخص سوال کرنے میں کسی کو ایذاء نہ پہنچاتا ہو ایسے شخص کو عطا کرنا سنت ہے؛ کیونکہ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ اقدس میں سائل لوگ مسجد میں سوال کرتے تھے (اور ان کے سوال کے مطابق ان کی حاجت کو پورا کیا جاتا تھا)۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایک سائل کو انگوٹھی عطا کی جب آپ رکوع میں تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی مدح فرمائی اور ارشاد فرمایا:

﴿ یُؤْتُوْنَ الزَّکٰوۃَ وَھُمْ رَاکِعُوْنَ ﴾

وہ حالت رکوع میں اللہ تعالیٰ کی راہ میں مال خرچ کرتے ہیں۔

علامہ ملا علی قاری رحمہ الباری فیصلہ کن بات کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"والظاھر ان الخلاف خلاف عصر وزمان لاختلاف السائلین واللہ اعلم"

(ماخوذ از مرقاۃ ج ۲ ص ۱۹۹، ۲۰۰)

ظاہر بات یہ ہے کہ یہ "اختلاف" زمانہ کے اختلاف اور سائلین کے اختلاف کی وجہ سے ہے۔ جب سائلین کسی کو تنگ کرنے والے نہیں ہوتے تھے۔ پیشہ ور بھکاری نہیں ہوتے تھے، حاجت مند ہوتے تو سوال کرتے اس وقت سوال کرنے والوں کو دینا مطلقاً جائز تھا۔ اب چونکہ اکثر سائلین دوسروں کو ایذاء پہنچانے والے ہوتے ہیں۔ پیشہ ور بھکاری ہوتے ہیں اس لئے ضروری ہے کہ انسان

اپنی بصیرت سے اندازہ لگائے، کوئی شخص ضعیف ہے۔ کوئی حاجت مند نظر آتا ہو تو اسے کچھ دے دیا جائے ورنہ بغیر کسی تنگی، ترش روئی، ڈانٹ ڈپٹ کے خاموشی سے سائل کے قریب سے ہٹ جائے۔ اس لئے کہ رب تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَاَمَّا السَّائِلَ فَلاَ تَنْهَرْ ﴾ اور جو مانگنے آئے اسے نہ جھڑکیں۔

بدبودار چیز کھا کر مسجد میں نہ جائے:

حضرت جابر ﷺ سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"من اکل من هذه الشجرة المنتنة فلا یقربن مسجدنا فان الملائکة تتأذی مما یتأذی منه الانس"

جو شخص اس بدبودار پودے کو کھائے وہ ہماری مساجد کے قریب ہرگز نہ آئے۔ بے شک فرشتوں کو بھی اس چیز سے تکلیف ہوتی ہے جس سے انسانوں کو تکلیف ہوتی ہے۔

(بخاری، مسلم، مشکوۃ باب المساجد)

نبی کریم ﷺ نے جس پودے کی طرف اشارہ کیا اس سے مراد "تھوم" ہے۔ پیاز کا بھی یہی حکم ہے کیونکہ دوسری حدیث پاک میں صراحۃً تھوم اور پیاز سے ممانعت کا ذکر ہے۔ ہر بدبودار چیز کا حکم بھی یہی ہے۔ مسجد میں انسان نہ ہوں تب بھی یہی حکم ہے؛ کیونکہ فرشتوں کو تکلیف ہوتی ہے۔ اسی سے واضح ہوا کہ سگریٹ، حقہ پی کر یا نسوار کھا کر آنے کا حکم بھی یہی ہے؛ کیونکہ جو انسان سگریٹ یا حقہ نہیں پیتا اور نسوار نہیں کھاتا اسے ان چیزوں کی بدبو سے تکلیف محسوس ہوتی ہے۔

مسجد میں خوشبو لگانا مستحب ہے:

"عن عائشة قالت امر رسول الله ﷺ ببناء المسجد فی الدور و ان ینظف و یطیب"

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے اپنے اپنے محلّہ میں مسجد بنانے اور ان کو صاف رکھنے اور ان میں خوشبو لگانے کا حکم فرمایا۔ (ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ، مشکوۃ باب المساجد)

ہر محلّہ میں مسجد بنانے کا حکم اس لئے فرمایا گیا کہ مسجد کے دور ہونے کی وجہ سے بعض اوقات لوگ مسجد میں نماز ادا کرنے کے ثواب سے محروم ہو جاتے ہیں اور جماعت سے نماز ادا نہیں کر سکتے کیونکہ مسجد

دور ہونے کی وجہ سے وہ جانے میں مشقت سمجھتے ہیں۔ اس لئے ہر محلّہ میں مسجد بنانے کا حکم دیا تا کہ لوگ آسانی سے بغیر کسی مشقت کے نماز باجماعت ادا کر سکیں۔

علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر فرمایا کہ عطاء کہتے ہیں ''اللہ تعالیٰ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو جب بھی کسی شہر کی فتح نصیب فرماتا تو......

''امر المسلمین ببناء المسجد وامرهم ان لا يبنوا مسجدين يضار احدهما الآخر''

......آپ مسلمانوں کو مساجد کی تعمیر کا حکم دیتے اور یہ فرماتے کہ دو مسجدیں اس طرح نہ بنائی جائیں کہ ایک مسجد سے دوسری کو نقصان ہو۔

''ومن المضارة فعل تفريق الجماعة اذا كان هناك مسجد يسعهم فان ضاق سنّ توسعة او اتخاذ مسجد يسعهم.''

ایک مسجد سے دوسری کو نقصان اس وقت ہوتا ہے جب لوگوں کو جماعت سے متفرق کر دیا جائے۔ حالانکہ وہ ایک ہی مسجد سب کے لئے کافی بھی ہو اور بہت زیادہ فاصلہ بھی نہ ہو کہ لوگوں کو آنے جانے میں مشکل درپیش آتی۔

اگر مسجد تنگ ہو جائے تو اسے ہی وسیع کرنا مسنون ہے یا ساتھ ہی نئی مسجد بنالی جائے کہ اس میں تمام نمازی سما سکیں۔ ایسی صورت میں پہلی مسجد کو قرآن پاک پڑھنے، ذکر واذکار وغیرہ کے لئے مختص کر دیا جائے اور سب لوگ ایک ہی مسجد میں نماز ادا کریں۔ ہاں اگر فاصلہ زیادہ ہو لوگوں کو ایک ہی مسجد میں آنا دشوار ہو تو وہ اپنے قریب مسجد بنالیں تو یہ درست ہے۔

☆ ''يستحب تجمير المسجد بالبخور''مسجد میں خوشبو سلگانا مستحب ہے۔ اگر بتی کا یہی حکم ہے۔ البتہ احتیاط کی ضرورت ہے کہ قالین وغیرہ کو بے احتیاطی سے آگ نہ لگ جائے

☆ ''واستحب بعض السلف تخليق المسجد بزعفران والطيب''

سلف صالحین نے مسجد کو زعفران سے اور ہر قسم کی خوشبو سے خوشبودار کرنے کو مستحب قرار دیا ہے البتہ خوشبو کا پاک ہونا ضروری ہے۔

☆ ''وانه يستحب كنس المسجد وتنظيفه''

مسجد میں جھاڑو دینا اور مسجد کی صفائی کرنا مستحب ہے۔

" وقد روی ابن ابی شیبة انه علیه السلام کان یتتبع غبار المسجد بجریدة "

ابن ابی شیبہ نے روایت ذکر کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ خود مسجد کی صفائی فرماتے تھے۔ مسجد کے گرد وغبار کو کھجور کے جھاڑو سے اپنے ہاتھ مبارک سے صاف فرماتے تھے۔

مسجد میں سونے کا حکم:

" یکره النوم فی المسجد للمقیم عندنا وعند غیرنا ویجوز للمسافر "

مسجد میں مقیم آدمی کے لئے سونا مکروہ ہے۔ البتہ مسافر کے لئے سونا جائز ہے۔

(حاشیة ترمذی باب النوم فی المسجد)

" قال ابن عباس لایتخذه مبیتا ومقیلا " وذهب قوم من اهل العلم الی قول ابن عباس "

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا مسجد میں رات کو سونے یا دن کو سونے کی عادت بنانا جائز نہیں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے قول کو ہی اہل علم حضرات نے پسند فرمایا ہے۔ (ترمذی باب النوم فی المسجد)

مسجد میں مقیم آدمی کے سونے کی عادت بنانے میں دو خرابیاں لازم آتی ہیں حالانکہ ان سے اجتناب ضروری ہے۔

(ا) "یکره تحریما اخراج الریح فی المسجد ولعله یستثنی منه المعتکف لکونه معذورا "

مسجد میں ہوا کا خارج کرنا مکروہ تحریمی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لیٹ کر سونا یا تکیہ اور دیوار وغیرہ سے سہارا لگا کر سونا وضوء کو توڑ دیتا ہے۔ وضوء کے ٹوٹنے کی یہی وجہ ہے کہ مفاصل (جوڑوں) کے ڈھیلے ہونے سے ہوا کے خارج ہونے کا امکان ہوتا ہے۔ مسجد میں سونے کی عادت بنانے میں بھی یقیناً ہوا کا خارج ہونا لازم آئیگا جو مکروہ تحریمی ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ مسجد میں مقیم شخص سونے کی عادت نہ بنائے۔

اعتراض:

" عن ابن عمر قال کنا ننام علی عهد رسول الله ﷺ فی المسجد و نحن شباب "

قال ابو عیسی حدیث ابن عمر حدیث حسن صحیح وقد رخص قوم من اهل العلم فی النوم فی المسجد . "

حضرت ابن عمرؓ سے مروی ہے آپ فرماتے ہیں ہم رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں مسجد میں سو جاتے تھے جب ہم جوان تھے۔

ابو عیسیٰ ترمذی نے حضرت ابن عمر کی روایت کردہ حدیث کو حسن صحیح قرار دیا اور ساتھ ہی یہ ذکر کیا ہے کہ اہل علم کی ایک قوم نے مسجد میں سونے کی رخصت دی ہے۔

اس سے تو واضح ہوا کہ مسجد میں سونا جائز ہے۔ نبی کریم ﷺ کا منع نہ فرمانا جواز کے لئے حدیث تقریری ہے لہذا سونے کی عادت بنانے کی ممانعت کیسے ثابت ہوتی ہے ؟

جواب:

" اما نوم ابن عمر فکان لانه لم یکن له بیت و کان عزبا و کذلک ثبت النوم عن بعض الصحابة فی شرح مسلم للنووی حملوه علی حالة العذر "

حضرت ابن عمرؓ مسجد میں اس لئے سوتے تھے کہ آپ کا اپنا کوئی مکان نہیں تھا، اس لئے بھی کہ آپ جوان تھے لہٰذا کسی کے گھر سونا ممکن نہیں تھا۔ اسی طرح اور بھی کئی صحابہ کرام اسی عذر کے پیش نظر مسجد میں سو جایا کرتے تھے۔

واضح ہوا کہ بعض صحابہ کرام کا مسجد میں سونا مجبوری کے پیش نظر تھا۔ مسافر کے لئے سونا اب بھی جائز ہے لیکن بغیر مجبوری یا مسافر ہونے کے مسجد میں سونے کی عادت بنانا جائز نہیں۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا

" لایزال احدکم فی صلوة مادام ینتظرها و لا تزال الملائکة تصلی علی احدکم مادام فی المسجد " اللهم اغفرله اللهم ارحمه " مالم یحدث فقال رجل من حضرموت وما الحدث یا اباهریرة ؟ فقال فساء او ضراط "

(ترمذی باب ماجاء فی القعود فی المسجد وانتظار الصلوة من الفضل)

تم میں سے جب کوئی شخص نماز کی انتظار میں ہو وہ درحقیقت نماز میں ہی ہوگا۔ اور جب تک کوئی شخص مسجد میں ہو فرشتے اس کے لئے یہ دعا کرتے ہیں۔ اے اللہ اس کی مغفرت فرما، اے اللہ اس پر رحم کر۔ فرشتوں کی یہ دعا اس وقت تک جاری رہتی ہے جب تک اس شخص کو "حدث" لاحق نہ ہو۔

''حضر موت'' کے ایک شخص وہاں موجود تھے انہوں نے پوچھا اے ابو ہریرہ ''حدث'' سے مراد کیا ہے۔ تو انہوں نے فرمایا کہ حدث سے مراد آہستہ آواز میں یا بلند آواز میں ہوا کو خارج کرنا ہے۔ اس سے واضح ہوا کہ مسجد میں ہوا کا خارج کرنا فرشتوں کی رحمت بھری دعا سے محرومیت کا سبب ہے؛ لہٰذا مسجد میں سونے کی عادت نہ بنائے۔

مسجد میں سونے کی دوسری خرابی

(۲) " ان الكلام فی المسجد یأكل الحسنات كما یأكل النار الحطب "

بے شک مسجد میں کلام کرنا نیکیوں کو اس طرح کھا جاتا ہے جس طرح آگ لکڑیوں کو کھا جاتی ہے۔ اس سے واضح ہوا کہ مقیم شخص اگر مسجد میں سونے کی عادت بنائے گا تو مسجد میں کلام کرنا بھی اس کی مجبوری اور اس کا مقصود ہوگا۔ لہٰذا ضروری ہے کہ وہ اس سے اجتناب کرے۔ لیکن خیال رہے کلام سے مراد دنیاوی کلام ہے۔ دینی کلام، شرعی مسائل بیان کرنا سنت اور مستحب ہے۔

دنیاوی کلام میں بھی وعید شدید اس صورت میں ہے۔ جس کے متعلق صاحب بحرالرائق نے فرمایا:

" وقال صاحب البحر هذا اذا دخل المسجد لارادة الكلام ولو عرضه فلا "

(ترمذی مع حاشیہ باب النوم فی المسجد)

صاحب بحرالرائق نے یہ بیان کیا ہے کہ دنیاوی کلام نیکیوں کو اس وقت کھا جاتی ہے جب کہ مسجد میں وہ داخل ہی کلام کی غرض سے ہوا اور اگر وہ داخل تو عبادت کی غرض سے ہو لیکن بالطبع کوئی کلام بھی کر لے تو اس میں کوئی حرج نہیں اگرچہ بہتر ہے کہ دنیاوی کلام سے جتنا ہو سکے اجتناب کرے۔

مسجد میں خرید و فروخت اور گم شدہ چیز کا اعلان منع ہے:

حضرت ابو ہریرہ ﷺ سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ''من سمع رجلا ینشد ضالة فی المسجد فلیقل لا ردها الله علیک فان المساجد لم تبن لهذا ''

جو شخص کسی کو مسجد میں گمشدہ چیز کا اعلان کرتے ہوئے سنے وہ کہے اللہ تعالیٰ تمہیں یہ چیز نہ لوٹائے بے شک مساجد اس لئے نہیں بنائی گئیں۔ (بلکہ اللہ تعالیٰ کے ذکر، قرآن پاک کی تلاوت، وعظ و نصیحت

اورعبادت کے لئے بنائی گئی ہیں) (رواہ مسلم ، مشکوۃ باب المساجد)

" واما انشاد الضالة فله صورتان احداهما ان ضل شئ فی خارج المسجد وینشده فی المسجد لاجتماع الناس فهواقبح واشنع واما لوضل فی المسجد فیجوز الانشاد بلا شغب "

(حاشیہ ترمذی ص ۱۹۵)

گم شدہ اشیاء کے اعلان کی دوصورتیں ہیں ایک یہ کہ اگرکوئی چیز مسجد کے باہر گم جائے اوراس کا اعلان مسجد میں آ کراس لئے کرے کہ یہاں لوگ جمع ہیں تو یہ بہت قبیح وشنیع (بہت بری چیز) ہے لیکن اگرکوئی چیز مسجد میں گم ہوجائے تو اس کا اعلان جائز ہے بشرطیکہ اس میں شوروغوغا نہ پایا جائے۔

وحسن الترمذی خبر " اذا رأیتم من یبیع اویبتاع فی المسجد فقولوا : لا اربح الله تجارتک "

ترمذی نے حسن حدیث بیان کی ہے کہ جب تم کسی شخص کو مسجد میں خریدوفروخت کرتے ہوئے دیکھوتو کہو اللہ تعالیٰ تمہیں اس تمہاری تجارت میں نفع نہ دے۔

ہاں البتہ یہ خیال رہے کہ اعتکاف بیٹھے ہوئے شخص کے لئے جائز ہے کہ وہ کسی چیز کوخریدے یا بیچے کیونکہ بعض اوقات انسان کو خریدوفروخت کی ضرورت درپیش ہوتی ہے۔لیکن اس میں شرط یہ ہے کہ جس چیز کی خریدوفروخت کی جارہی ہواسے مسجد میں نہ لایا جائے۔

" وکذا یندب ان یقال لمن انشد شعرا مذموما " فض الله فاک " ثلاثا للامر بذلک رواه ابن السنی "

اسی طرح مستحب یہ ہے کہ اگرکوئی شخص برے اشعار مسجد میں پڑھے تو سننے والے یہ کہیں کہ اللہ تعالیٰ تمہارے دانت توڑدے، یہ تین مرتبہ کہا جائے، کیونکہ اسی کا حکم دیا گیا ہے۔ ابن سنی نے یہ روایت بیان کی ہے۔

برے شعر کے ساتھ "برے" کی صفت ذکر کرنے سے واضح ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی حمدوثناء، نبی کریم ﷺ کی نعت یا ذکرونصیحت پر مشتمل اشعار کا یہ حکم نہیں، بلکہ ان کا مسجد میں پڑھنا مستحب ہے۔کیونکہ نبی کریم ﷺ کے سامنے مسجد میں منبر پر حضرت حسان رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ کی تعریف میں اشعار پڑھتے تھے اور حضوران کے لئے دعا فرماتے تھے۔ (ماخوذ از مرقاۃ ج ۲ ص ۱۹۹ ، حاشیہ ترمذی ص ۱۹۸)

فائدہ عظیمہ:

" عن انس ابن مالک قال قال رسول اللہ ﷺ صلوة الرجل فی بیته بصلوة وصلوته فی مسجد القبائل بخمس وعشرین صلوة وصلوته فی المسجد الذی یجمع فیه بخمسائة صلوة وصلوته فی المسجد الاقصیٰ بخمسین الف صلوة وصلوته فی مسجدی بخمسین الف صلوة وصلوته فی المسجد الحرام بمائة الف صلوة"

(رواہ ابن ماجہ ۔ مشکوۃ باب المساجد)

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا انسان اپنے گھر نماز ادا کرے تو اسے ایک نماز کا ثواب حاصل ہوگا اپنے محلّہ کی مسجد میں (باجماعت) نماز ادا کرے تو اسے پچیس نمازوں کا ثواب حاصل ہوگا، اور اگر جامع مسجد میں نماز باجماعت ادا کرے تو اسے پانچ سو نمازوں کا ثواب حاصل ہوگا، اور مسجد اقصیٰ (بیت المقدس) میں نماز ادا کرے تو اسے پچاس ہزار نمازوں کا ثواب حاصل ہوگا، اگر میری مسجد (مسجد نبوی) میں نماز ادا کرے تو اسے پچاس ہزار نمازوں کا ثواب ہوگا اور "مسجد حرام" میں نماز ادا کرے تو اسے ایک لاکھ نمازوں کا ثواب حاصل ہوگا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا محبت بھرا ارشاد:

" واما مزید المضاعفة فاسباب التفضیل لا تنحصر فی ذلک فالصلوات الخمس بمعنی للمتوجه لعرفة افضل بمسجد مکة وان انتفت عنها المضاعفة اذ فی الاتباع مایربو علیها ولذا قال عمر رضی اللہ عنہ بمزید المضاعفة بمسجد مکة مع قوله بتفضیل المدینة "

(از جواہر البحار ج ۴ ص ۱۰)

تعداد کی زیادتی میں فضیلت کا انحصار نہیں ۔بعض اوقات ایک مقام کو تعداد کی زیادت حاصل ہوتی اور دوسرے مقام کو تعداد کی زیادتی حاصل نہیں ہوتی لیکن افضلیت اسے حاصل ہوتی ہے۔ جیسے دوران حج مقامات عرفات کی طرف متوجہ ہونے والے شخص کا منیٰ میں نماز ادا کرنا افضل ہے بنسبت مسجد حرام میں نماز ادا کرنے کے، حالانکہ تعداد کی زیادتی منیٰ میں حاصل نہیں۔ یعنی وہ نمازیں جو منیٰ میں ادا کرنی ہیں ان کو منیٰ میں ادا کرنے سے ثواب ایک ایک نماز کا حاصل ہوگا اور وہی نمازیں اگر مسجد حرام میں آکر ادا کرے تو ثواب لاکھ لاکھ کا حاصل ہوگا، لیکن منیٰ میں ادا کرنا باوجود ایک نماز کا ثواب حاصل

ہونے کے زیادہ فضیلت رکھتا ہے؛ کیونکہ دراصل رسول اللہ ﷺ کی تابعداری ہی باعث فضیلت ہے۔

یہی وجہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ مسجد حرام میں نماز ادا کرنے سے ایک لاکھ نماز کے ثواب حاصل ہونے کو ماننے کے باوجود فرماتے تھے کہ مسجد نبوی میں نماز ادا کرنا مسجد حرام میں نماز ادا کرنے سے زیادہ فصیلت رکھتا ہے۔

یعنی مسجد نبوی میں نماز ادا کرنے سے ثواب پچاس ہزار کا ملتا ہے لیکن وہ بھاری ہے بنسبت مسجد حرام میں نماز ادا کرنے پر، حالانکہ مسجد حرام میں نماز ادا کرنے سے ثواب ایک لاکھ کا ہی ملتا ہے۔ وجہ اس کی صرف یہ ہے مسجد نبوی میں رسول اللہ ﷺ کا قرب حاصل ہے جو مسجد حرام میں نہیں۔

''کم و کیف '' کا فرق جاننے والے اس بات کو اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں کہ ایک طرف ''کمیت'' (مقدار عددی) زیادہ ہے جب کہ دوسری طرف ''کیف'' (مرتبہ وکوالٹی) زیادہ ہے

(از جواھر البحار ج ۴ ص ۱۰)

نبی کریم ﷺ کے قرب کی وجہ سے افضلیت کیوں؟

" ونقل القاضی عیاض وغیرہ الاجماع علی تفضیل ما ضم الاعضاء الشریفة حتی علی الکعبة المنیفة ونقل عن ابی عقیل الحنبلی ان تلک البقعة افضل من العرش وصرح الفاکھانی بتفضیلھا علی السموات." (مرقاۃ ج۲ ص ۱۹۰ ھکذا قال النووی)

قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر فرمایا ہے کہ اس پر اجماع امت ہے کہ وہ مقام یعنی رسول اللہ ﷺ کی قبر شریف کا وہ حصہ جس سے آپ کے جسم مبارک کے اعضاء شریفہ کا تعلق ہے وہ کعبہ مکرمہ سے افضل ہے اور ابو عقیل حنبلی رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے کہ وہ حصہ عرش معلّٰی سے بھی افضل ہے اور علامہ فاکہانی رحمۃ اللہ علیہ نے وضاحت فرمائی ہے کہ قبر شریف کا وہ حصہ تمام آسمانوں سے افضل ہے۔

واضح ہوا کہ جب حضور ﷺ کی وجہ سے وہ مقام افضل ہوگیا تو آپ کے قرب کی وجہ سے نماز میں بھی افضلیت کا حاصل ہونا یقینی امر ہے۔

ایک غلطی کا ازالہ:

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''لا تشدوا الرحال الا الی ثلاثة مساجد مسجد الحرام والمسجد الاقصٰی ومسجدی ھذا''

(بخاری، مسلم، مشکوۃ باب المساجد)

سوائے تین مساجد کے سامان سفر نہ باندھو! وہ تین مساجد یہ ہیں مسجد حرام، مسجد اقصیٰ اور میری یہ مسجد (مسجد نبوی)۔

اس حدیث پاک سے کئی لوگ غلط فہمی کا شکار ہو گئے اور انہوں نے اس حدیث سے یہ ثابت کرنے کی ناکام کوشش کی کہ مزارات کی زیارت کے لیے جانا حرام ہے۔

ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں، حدیث پاک کا صحیح مطلب یہ ہے:

"لا تشدوا الی غیرها لان ما سوی الثلاثة متساو فی الرتبة غیر متفاوت فی الفضیلة و کان الترحل الیه ضائعا و عبثا"۔

ان تین مساجد کے بغیر اور مساجد کی طرف اس غرض سے سفر نہ کرو کہ ان میں ثواب زیادہ ہے کیونکہ باقی مساجد ثواب میں متساوی ہیں، اس لیے ان کی طرف زیادہ ثواب کی غرض سے جانا بے فائدہ ہے۔

اس حدیث پاک سے نیک لوگوں کی قبور کی زیارت کو کیسے منع کیا جاتا ہے جبکہ اسکا ذرا بھر ذکر نہیں؟

" وما تبین لی ان الامر کذلک بل الزیارة مامور بها لخبر، کنت نهیتکم عن زیارة القبور الا فزوروها "

علامہ قاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں، یہی معنی مراد لیا جا سکتا ہے کہ تین مساجد کے بغیر اور مساجد کی طرف زیادتی ثواب کی غرض سے جانے سے منع کیا گیا۔ قبور کی زیارت کی ممانعت کس طرح ثابت ہو سکتی ہے جبکہ دوسری حدیث شریف میں ہے۔ ''میں نے تمہیں قبور کی زیارت سے منع کیا تھا، خبردار اب زیارت کیا کرو''۔

یعنی ابتدائے اسلام میں قبور کی زیارت سے منع کیا گیا تھا پھر وہ حکم منسوخ ہو گیا اور قبور کی زیارت کی اجازت دے دی گئی۔

" واما المشاهد فلا تساوی بل برکة زیارتها علی قدر درجاتهم عند الله "

تین مساجد کے بغیر اور مساجد سے روکنا تو ثابت ہو سکتا ہے کیونکہ وہ مساوی ہیں۔ لیکن مزارات کی زیارت برابر نہیں بلکہ ان کی زیارت میں اسی طرح برکت حاصل ہوگی جس طرح ان کے درجات اللہ تعالیٰ کے ہاں ہوں گے۔

یعنی درجات کے فرق سے زیارت کے حصول میں بھی اسی طرح فرق حاصل رہے گا۔

ثم لیت شعری من یمنع هذا القائل من شد الرحال لقبور الانبیاء کابراهیم وموسیٰ ویحییٰ ومنع من ذلک فی غایة الاحالة واذا جوز ذلک لقبور الانبیاء والاولیاء فی معناهم فلایبعد ان یکون ذلک من اغراض الرحلة کما ان زیارة العلماء فی الحیاة من المقاصد"

(مرقاة ج ۲ ص ۹۰)

علامہ ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں اولیائے کرام کی قبروں کی زیارت سے منع کرنے والوں کو کاش میرے جیسا علم حاصل ہو جاتا تو انہیں یہ بات سمجھ آتی کہ وہ جلیل القدر انبیائے کرام جیسے ابراہیم، موسیٰ اور یحییٰ علیہم السلام کی قبور کی زیارت کے لئے جانے سے کیسے منع کر سکیں گے؟ جبکہ ان کی زیارت سے منع کرنا محال ہے۔ تو واضح ہوا کہ انبیائے کرام کی قبور کی زیارت کے لئے جانا جائز ہے جب یہ جواز ثابت ہو گیا تو اولیائے کرام کی قبور کی زیارت کرنے کا جواز بھی ثابت ہو جائے گا کیونکہ انبیائے کرام کو اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہے اور اولیاء عظام بھی رب تعالیٰ کے مقرب ہونے کی وجہ سے انبیائے کرام کے مقرب ہو گئے۔

مزید فرماتے ہیں: قبور کی زیارت کرنے میں بھی کئی مقاصد ہوتے ہیں جس طرح علماء کرام کی ظاہری حیات میں ان کی زیارت کرنے میں کئی مقاصد ہوتے ہیں۔

راقم کا موقف:

یہ حدیث زیادہ ثواب یعنی ہزاروں کی تعداد میں ثواب کی غرض سے جانے کے ساتھ مقید ہے اور ''نہی'' حرمت پر مبنی بھی نہیں۔ کیونکہ پہلے ابن ماجہ سے ایک حدیث ذکر کی جا چکی ہے کہ جامع مسجد میں نماز ادا کرنا پانچ سو نمازوں کا ثواب حاصل کرنا ہے۔ اس سے بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ عام مساجد کی بنسبت جامع مسجد میں ثواب کی غرض سے جانا کوئی منع نہیں بلکہ زیادتی ثواب کا سبب ہے۔
خود نبی کریم ﷺ ہر ہفتہ کے دن مسجد قبا کی زیارت کے لئے تشریف لے جاتے تھے۔

مساجد میں شور و غوغا، قیامت کی نشانی:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ سے ایک حدیث روایت کی جس میں قیامت کی نشانیوں کا بیان ہے اس میں ایک نشانی یہ ہے۔ ''ظهرت الاصوات فی المساجد'' مساجد میں

آوازیں بلند ہوں گی۔

جیسا کہ ہم دیکھتے ہیں کہ مساجد میں ایک دوسرے کے خلاف سیاسی محاذ آرائی عروج پر ہے۔ مساجد میں نمازی اور کمیٹیوں کے اختلاف درحقیقت سیاسی اختلافات کی وجہ سے پائے جاتے ہیں یا چوہدراہٹ کا جھگڑا ہوتا ہے۔ آئے دن فساد برپا ہوتا رہتا ہے جس سے شرفاء کا ذہنی سکون چھن جاتا ہے۔ مساجد کے امام بھی ان جھگڑوں کی زد میں آنے کی وجہ سے بےچین ہوتے ہیں۔ مساجد کی شان کے لائق یہ ہے کہ عبادت کی جائے حق بات بیان ہو لڑائی جھگڑا نہ ہو اور فتنہ وفساد سے مساجد میں اجتناب کیا جائے

مسجد تا قیامت مسجد ہے:

" ولو خرب ما حوله واستغنىٰ عنه يبقىٰ مسجداعندالامام والثانی ابدًا الیٰ قیام الساعة وبه یفتی حاوی القدسی. جزم به في الاسعف حیث قال ولو خرب المسجد وما حوله وتفرق الناس عنه لا یعود الیٰ ملک الواقف عند ابی یوسف فیباع نقضه باذن القاضی ویصرف ثمنه الیٰ بعض المساجد " (شامی ج ۳ ص ۵۰۷)

اگر مسجد کا اردگرد خراب ہوجائے، اس مسجد کی ضرورت نہ رہے تو وہ مسجد تا قیامت مسجد ہی رہے گی۔ (اس سے مسجد کے احکام واپس نہیں لیے جاسکتے) اسی پر فقہائے کرام کا فتویٰ ہے۔ (حاوی القدسی)

''اسعاف'' میں بھی اسی قول پر اعتماد ویقین کیا گیا ہے کہ اگر مسجد اور مسجد کا اردگرد خراب بھی ہوجائیں، لوگ وہاں سے دوسری جگہ منتقل ہوجائیں پھر بھی مسجد کی جگہ واقف (وقف کرنے والے) کی ملکیت میں نہیں آئے گی۔ ہاں البتہ مسجد کی تعمیر پر لگا ہوا سامان، دروازے کھڑکیاں، چھت، اینٹیں وغیرہ دوسری مسجد پر لگادی جائیں تو یہ جائز ہے۔

فتاویٰ قاضی خان میں ہے:

" وفی الخانیة رباط بعید استغنی عنه المارة وبجنبه رباط آخر قال السید الامام ابوشجاع تصرف غلة الی الرباط الثانی کالمسجد اذا خرب واستغنی عنه اهل القریة فرفع ذلک الی القاضی فباع الخشب وصرف الثمن الی مسجد آخر جاز."

(شامی ج ۳ ص ۵۰۷)

فتاوی قاضی خان میں مذکور ہے کہ اگر ایک سرائے راستہ سے دور ہے جو مسافروں کے کام نہیں

آ سکتی اور دوسری سرائے راستہ کے قریب ہے جس میں گزرنے والے سکونت کرتے رہتے ہیں تو اس صورت میں دور والی سرائے کا سامان قریب والی سرائے میں لگا دیا جائے، سید امام شجاع رحمۃ اللہ علیہ کا اسی پر فتویٰ ہے۔

اسی طرح اگر ایک مسجد خراب ہو جائے اور اس بستی والے لوگوں کو اس کی ضرورت نہیں رہی تو قاضی سے اجازت لے کر اس کی لکڑیاں وغیرہ بیچ کر دوسری مسجد پر لگا دی جائیں۔

راقم کے خیال میں قاضی سے اجازت لینے کی قید خورد برد سے بچانے اور نزاع سے بچانے کے لئے ہے۔ اگر ایسے خطرات نہ ہوں تو معاملہ قاضی کے پاس لے جانا ضروری نہیں خاص کر کے آجکل کے قاضی اور آجکل کی عدالتیں۔ الامان الحفیظ۔

''ولا سیما فی زماننا فان المسجد او غیرہ من رباط اوحوض اذا لم ینقل یأخذ انقاضہ اللصوص والمتغلبون کما ھو مشاھد'' (شامی ج ص۲۰۷)

ایک مسجد، حوض یا سرائے وغیرہ اگر خراب ہو جائے، لوگ وہاں سے منتقل ہو جائیں اور اس کی ضرورت ختم ہو جائے تو زیادہ بہتر یہی ہے کہ اس کا سامان دوسری مسجد، دوسرے حوض یا دوسری سرائے کی طرف منتقل کر دیا جائے۔ اگر ایسا نہ کیا گیا تو چور، بدمعاش لوگ وہ سامان اٹھا کر لے جائیں گے، خاص کر کے ہمارے زمانہ میں اس طرح کے معاملات واقع ہو رہے ہیں جن کا مشاہدہ کیا جا رہا ہے۔

یہ تو علامہ شامی کے زمانہ کی بات تھی۔ اب ہم اپنے زمانہ کو دیکھیں تو بہت واضح ہے کہ لوگوں کے دلوں سے خوف خدا جاتا رہا، مسجد کے مال کو مالِ غنیمت سمجھ کر لوگ ہڑپ کر جائیں گے۔ جب آباد مساجد کی گھڑیاں، دریاں، ٹونٹیاں، لاؤڈ سپیکر وغیرہ آئے دن چوری ہو رہے ہیں تو غیر آباد مساجد کو مساجد سمجھ کر لوگ کیسے معاف کریں گے؟ یہ کہنا کہ ان کا سامان اپنے تصرف میں کوئی نہیں لائے گا، یہ خوش فہمی باطل ہے۔

وقف کرنے کیساتھ ہی مالک کی ملکیت ختم:

" یزول الملک بالقول عند ابی یوسف رحمه الله وهو قول الائمة الثلاثة وهو قول اکثر اهل العلم وعلیٰ هذا مشائخ بلخ وفی المنیة وعلیه الفتویٰ کذا فی فتح القدیر وعلیه الفتوی کذا فی السراج الوهاج " (عالمگیری ج ۲ ص ۳۵۲)

زمین کا مالک جب زبان سے ہی وقف کردے تو اس کا ملک زائل ہو جاتا ہے۔ یہی قول ائمہ ثلاثہ کا ہے۔ اسی پر اکثر اہل علم ہیں اور اسی پر بلخ کے مشائخ ہیں۔ منیہ میں ذکر ہے کہ اسی پر فتویٰ ہے۔ فتح القدیر میں بھی یہی ذکر ہے۔

تنبیہ: اگرچہ اس مسئلہ میں ائمہ کرام کا اختلاف ہے لیکن فتویٰ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے قول پر ہی ہے۔ ...... کہ جونہی واقف (وقف کرنے والے) نے زبان سے وقف کرنے کا قول کیا وہ جائیداد وقف ہو جائے گی اور اس کی ملکیت زائل ہو جائے گی ...... امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک زمین کو علیحدہ کر دینا، یہاں تک کہ قبرستان کے لئے زمین ہو تو اس میں کسی ایک کا دفن ہونا، مسجد کے لئے ہو تو کسی ایک کا نماز ادا کر لینا مالک کی ملکیت کو ختم کر دے گا۔ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک صرف علیحدہ کر دینا زوال ملکیت کے لئے کافی ہے۔ لیکن امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک صرف زبان سے کہہ دینا ہی کافی ہے۔

صاحب درمختار اور علامہ شامیؒ نے فرمایا:

" ویزول ملکه عن المسجد والمصلی بالفعل والمصلی شمل مصلی الجنازة ومصلی العید بالفعل ای بالصلوٰة فیه وبقوله جعلته مسجدا عند الثانی ای عند ابی یوسف یزول بمجرد القول وشرط محمد والامام الصلوٰة فیه ای مع الافراز "
(من درمختار و شامی ج ۳ ص ۴۰۴، ۴۰۵)

"واعلم ان الوقف انما احتیج فی لزومه الی القضاء." (شامی ج ۳ ص ۴۰۵)

اور ایک قول کے مطابق عند الامام توقف علی القضاء بھی ہے۔

" وقدم فی التنویر والدرر والوقایة وغیرها قول ابی یوسف وعلمت ارجحیته فی الوقف والقضاء " (شامی ج ۳ ص ۴۰۵)

فقہ کی اکثر کتب تنویر الابصار، درر، وقایہ وغیرہا میں امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے قول کو ہی مقدم سمجھا گیا ہے۔ علامہ ابن عابدین شامی رحمۃ اللہ علیہ اپنا مختار بھی یہی بیان کرتے ہیں کہ میں نے وقف اور قضاء میں امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے قول کو ہی راجح قرار دیا ہے۔

مسجد کو شہید کر کے نئی مسجد بنانے کا حکم:

اگر کوئی شخص اس محلہ کا نہیں جہاں مسجد واقع ہے اور وہ چاہتا ہے کہ میں اس مسجد کو شہید کر کے اس کی جگہ پختہ نئی مسجد بنا دوں۔ تو اسے یہ حق حاصل نہیں۔ ہاں البتہ اہل محلہ اس پر راضی ہو جائیں تو وہ ایسے کر سکتا ہے۔ یا مسجد کے گرنے کا خطرہ ہو تو اہل محلہ یا قاضی سے پوچھے بغیر وہ نئی مسجد تعمیر کر سکتا ہے۔ اہل محلہ خود پہلی مسجد کو شہید کر کے نئی بنانا چاہتے ہوں تو وہ بنا سکتے ہیں لیکن بشرطیکہ وہ اس پر مال اپنی طرف سے خرچ کریں، مسجد کے وقف شدہ مال سے قاضی کی اجازت کے بغیر خرچ نہ کریں۔

فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

" عند الهندية مسجد مبنى اراد رجل ان ينقضه ويبنيه احكم ليس له ذلك لانه لا ولاية لـه "مضمرات" الا ان يخاف ان ينهدم إن لم يهدم . " تتارخانيه" وتاويله ان لم يكن البانى من اهل تلك المحلة واما اهلها فلهم ان يهدموه ويجددوا بناؤه ويفرشوا الحصير ويعلقوا القناديل لكن من ما لهم لا من مال المسجد الا بامر القاضى "خلاصه".

(شامی ج ۳ ص ۴۰۵)

راقم کے نزدیک تعاملِ ناس کے پیشِ نظر قاضی سے اجازت لینے کی ضرورت نہیں۔

کشادگیٔ مسجد:

فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

" قوم بنوا مسجدا واحتاجوا الى مكان يتسع المسجد واخذوا من الطريق وادخلوا فى المسجد ان كان يضر باصحاب الطريق لا يجوز وان كان لا يضر بهم رجوت ان لا يكون به بأس كذا فى المضمرات"

(عالمگیری ج ۲ ص ۴۵۶، ۴۵۷)

کچھ حضرات نے مسجد بنائی لیکن بعد میں اس کی توسیع کی ضرورت پیش آئی یعنی نمازیوں پر وہ مسجد تنگ ہوگئی اور ان لوگوں نے راستہ کی کچھ زمین مسجد میں شامل کر لی۔ اگر گزرنے والوں کے لئے تکلیف کا

سبب ہے تو نا جائز ہے یعنی گزرنے والوں کے لئے راستہ کو تنگ کرنا جائز نہیں اور اگر راستہ تنگ نہیں ہوا تو یہ جائز ہے، مضمرات میں اسی طرح مذکور ہے اور یہی قول مختار ہے۔

نیز خزانۃ المفتیین میں بھی یہی ہے۔

" ان ارادوا ان یجعلوا شیئًا من المسجد طریقًا للمسلمین فقد قیل لیس لھم ذلک وانہ صحیح کذا فی المحیط" (عالمگیری ج۲ ص۴۵۷)

اگر لوگ یہ چاہیں کہ مسجد کی کچھ جگہ مسلمانوں کے راستہ میں شامل کرلیں تو یہ ان کے لئے جائز نہیں اور یہی صحیح ہے۔ محیط میں بھی یہی مذکور ہے۔

سبحان اللّٰہ ! جب مسجد کا کچھ حصہ بھی سڑک میں شامل نہیں کیا جا سکتا تو پوری مسجد کو سڑک میں شامل کرنا کس طرح جائز ہے۔ دراصل جب سے اپنی مرضی کے مطابق دین کو ڈھالنا شروع کر دیا گیا، اس وقت سے دینی مسائل کا حلیہ بگاڑ دیا گیا۔ دو جملے اکثر طور میں پڑھے لکھے بے وقوفوں کی زبان سے سنتا ہوں تو حیران ہوتا ہوں۔ ایک تو یہ کہ '' کچھ نہیں ہوتا '' دوسرا یہ کہ '' سب ٹھیک ہے ''۔ کاش! وہ پیشاب پی کر اور اپنی ماں یا بیٹی سے نکاح کر کے بھی یہی دو جملے استعمال کریں۔

الٹی چال: مسئلہ تو یہ ہے کہ راستہ کی جگہ مسجد میں شامل کرنا جائز ہے بشرطیکہ گزرنے والوں کے لئے راستہ تنگ نہ کر دیا جائے لیکن مسجد کی جگہ کو راستہ میں کسی طرح بھی شامل کرنا جائز نہیں۔

الٹی ہی چال چلتے ہیں چمچگانِ ملوک
خرد کا نام جنوں، جنوں کا نام خرد رکھ دیا

لیکن آج کل اسلامی ملک میں مسلمان حکمران اور ان کے مسلمان چمچگان مساجد کو اس لئے شہید کر رہے ہیں کہ گاڑیوں کی آمد و رفت کے لئے آسانی ہو جبکہ اکثر و بیشتر گاڑیاں حرام کمائی کے مال سے حاصل کی ہوئی ہیں۔

مسجد کی توسیع کیلئے ساتھ والی زمین قاضی جبرًا لے لے:

" ولو ضاق المسجد علی الناس وبجنبہ ارض لرجل تؤخذ ارضہ بالقیمۃ کرھا کذا فی فتاوی قاضیخان " (عالمگیری ج۲ ص۴۵۶)

اگر مسجد لوگوں پر تنگ ہو جائے، اس کے اطراف میں کسی شخص کی زمین ہو تو اس زمین کی قیمت ادا کر کے وہ زمین اس شخص سے زبردستی بھی لی جاسکتی ہے۔

فتاوٰی قاضی خان میں بھی یہی مذکور ہے۔

" ارض وقف علی مسجد والارض بجنب ذلک المسجد وارادوا ان یزیدوا فی المسجد شیئاً من الارض جاز لکن یرفعون الأمر إلی القاضی لیأذن لھم "

(عالمگیری ج۲ص۴۵۶)

مسجد کے لئے زمین وقف کی گئی ہو اور اس کے اطراف میں زمین ہو، لوگ چاہتے ہوں کہ اس زمین سے اور بھی ملا کر مسجد کی توسیع کر لی جائے تو یہ ان کے لئے جائز تو ہے لیکن یہ معاملہ قاضی کے پاس لے جائیں تاکہ وہ ان کو اجازت دے۔

وجہ یہ ہی ہے کہ کسی قسم کا نزاع نہ ہو۔ قاضی کے فیصلہ کے بعد ہر شخص مطمئن ہو جائے گا اور معاملہ خوش اسلوبی سے طے پا جائے گا۔ تاہم یہ بھی ضروری ہے کہ صاحب ارض کو قیمت دی جائے تاکہ اس کا بھی نقصان نہ ہو اور اگر مسجد کی زمین کے ساتھ ہی اور وقف شدہ زمین ہو تو مسجد کی ضرورت کے پیش نظر قاضی اس کو مسجد میں ملانے کی اجازت دے سکتا ہے۔

مسجد تعمیر ہو جانے کے بعد نیچے یا اوپر دکانیں بنانا منع ہے:

" اذا اراد انسان ان یتخذ تحت المسجد حوانیت غلة لمرمة المسجد أو فوقه لیس له ذلک کذا فی الذخیرة " (عالمگیری ج۲ص۴۵۵)

مسجد کے نیچے یا اوپر مسجد کی آمدنی کے لئے دکانیں بنانا منع ہے۔ لیکن خیال رہے کہ یہ حکم مسجد بن جانے کے بعد کا ہے۔

مسجد کی تعمیر سے پہلے نیچے دکانیں بنا کر اوپر مسجد بنانا جائز تو ہے تاہم بہتر پھر بھی نہیں۔

" ولو کان السرداب لمصالح المسجد جاز کما فی مسجد بیت المقدس کذا فی الھدایة "

(عالمگیری ج۲ص۴۵۶)

اگر مسجد کا تہہ خانہ مسجد کی ضروریات ومصالح کے لئے بنایا گیا ہو تو جائز ہے جیسا کہ مسجد بیت المقدس میں تہہ خانہ مسجد کی ضروریات کے لئے بنایا گیا ہے۔ ہدایہ میں بھی یہ مسئلہ اسی طرح مذکور ہے۔

عارضی مسجد حکمِ مسجد میں نہیں:

کسی جگہ ضرورت کے پیش نظر نماز پڑھنی شروع کر دی گئی۔ زمین مسجد کے لئے وقف نہیں اور مسجد کا اسے حکم نہیں دیا گیا تو اس پر مسجد والے احکام جاری نہیں کیے جائیں گے۔

" متولی مسجد جعل منزلا موقوفا علی المسجد مسجدا وصلی الناس فیه سنین ثم ترک الناس الصلوة فیه فاعید منزلا مستغلا جاز لانه لم یصح جعل المتولی ایاہ مسجدا کذا فی الواقعات الحسامیة " (عالمگیری ج ۲ ص ۳۵۶)

مسجد کی آمدنی کے لئے ایک مکان وقف کیا گیا۔ مسجد کے متولی نے اس مکان میں بھی لوگوں کو نماز پڑھنے کی اجازت دے دی، کئی سال اس میں لوگ نماز ادا کرتے رہے، پھر لوگوں نے اس میں نماز ادا کرنی چھوڑ دی تو پھر اسے وہی مکان والی حیثیت حاصل ہوگی، مسجد والا حکم حاصل نہیں ہوگا کیونکہ متولی کی طرف سے اس میں نماز کی اجازت دینے سے وہ مسجد نہیں بن گئی، جب تک وقف کرنے والا اسے مسجد کے لیے وقف نہ کرے وہ وقف ہونے کے باوجود مسجد نہیں۔

مرض موت میں اپنے مکان کو مسجد بنانے کا حکم:

کوئی شخص اپنی جائیداد کے تہائی حصہ سے زائد کی وصیت نہیں کر سکتا۔ اگر تہائی حصہ سے زائد کی وصیت کرے تو وہ بھی تہائی حصہ تک ہی جاری ہوگی، اس سے زائد کی وصیت باطل ہو جائے گی۔

ایک شخص نے اپنی مرض موت میں اپنے مکان کو مسجد بنا دیا لیکن یہ مکان اسکی جائیداد کا تہائی حصہ نہیں بن سکتا بلکہ اس مکان میں بھی ورثاء کا حصہ بنتا ہے تو اس مکان کو مسجد بنانا باطل ہو جائیگا۔ یہ مکان اسکے ورثاء میں تقسیم ہو جائے گا۔ (ہاں البتہ مکان کے تہائی حصہ کی قیمت کسی مسجد میں خرچ کرنی پڑے گی)۔

فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

" مریض جعل دارہ مسجدا ومات ولم تخرج من الثلث ولم تجز الورثة صار کله میراثا وبطل جعله مسجدا لان للورثة فیه حقا فلم یکن مفرزا عن حقوق العباد فقد جعل المسجد جزءا شائعا فیبطل " (عالمگیری ج ۲ ص ۴۵۶)

مسجد کی جگہ کو بیچنا جائز نہیں:

فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

" وفی وقف الخصاف اذا جعل ارضه مسجدا وبناه واشهد ان له ابطاله وبيعه فهو شرط باطل ويكون مسجدا " (عالمگیری ج۲ص۴۵۷)

امام خصاف نے کتاب الوقف میں ذکر کیا ہے کہ جب کوئی شخص اپنی زمین پر مسجد تعمیر کر لے پھر اس پر گواہ پیش کرے کہ مجھے حق حاصل ہے کہ میں اسے گرا دوں اور اپنی زمین بنالوں یا بیچ دوں تو اس کے اس دعویٰ کو نہیں سنا جائے گا۔ وہ زمین مسجد ہی رہے گی، اس کا یہ شرط لگانا باطل ہو جائے گا۔

مسجد کے لیے جمع ہونے والے مال سے خدام کو تنخواہ دی جا سکتی ہے:-

"وللمتولی ان يستاجر من يخدم المسجد بكنسه ونحو ذلك بأجر مثله او زيادة يتغابن " (عالمگیری ج۲ص۴۶۱)

مسجد کے متولی کے لیے یہ جائز ہے کہ مسجد کی صفائی کے لیے تنخواہ پر خادم مقرر کرے۔ مناسب مقدار میں تنخواہ دی جائے جو عام خدام کی ہوتی ہے یا کچھ زائد بھی ہو تو جائز ہے۔

مسجد کی ضروریات کے لیے جمع ہونے والے فنڈ کا بھی یہی حکم ہے۔

امام اور مؤذن کی رہائش کا حکم:

مسجد کی تعمیر کے نام پر حاصل کیے ہوئے مال سے امام اور مؤذن کی رہائش کے لیے مکان تعمیر نہ کیا جائے بلکہ مسجد کی متعلقہ ضروریات کے لیے ہی مال حاصل کیا جائے۔ اگر صرف مسجد کی تعمیر کا نام لے کر مال حاصل کیا گیا تھا تو ایسے تعمیری کاموں میں خرچ کرنے کیلئے مال دینے والے سے اجازت طلب کرنی پڑے گی۔ اگر چہ عام رواج کے مطابق لوگوں کو معلوم تو ہوتا ہے کہ مسجد کی تعمیر سے مراد مسجد کا وضوء خانہ، استنجاء خانے، امام اور مؤذن کی رہائش گاہیں، مسجد کی ضرورت کا سٹور اور مسجد کی آمدنی کا ذریعہ بنانے کے لیے دکانیں بھی ہیں۔ لیکن پھر بھی اعلان اس انداز میں کیا جائے کہ جس میں کسی قسم کے ناجائز ہونے کا شائبہ بھی نہ پایا جائے۔

" متولى المسجد اذا اشترى بالغلة التي اجتمعت عنده من الوقف منزلا ودفع المنزل الى

المؤذن یسکن فیه ان علم المؤذن ذلک کره ان یسکن فی ذلک المنزل لان هذاالمنزل من مستغلات الوقف ویکره للامام والمؤذن ان یسکن فی ذلک المنزل کذا فی فتاوی قاضیخان " (عالمگیری ج ۲ ص ۴۶۲)

مسجد سے گزرنے کا حکم:

بعض اوقات مسجد کے دو دروازے ہوتے ہیں، ایک دروازہ سے داخل ہوکر مسجد کے حصہ سے گزرتے ہوئے دوسرے دروازہ سے گزرا جاتا ہے۔ ایسی صورت میں بوجہ عذر گزرنا جائز، اور بغیر عذر کے ناجائز ہے۔ مسجد کا ادب واحترام ملحوظ خاطر رکھا جائے۔ عذر سے مراد بارش کا ہونا یا مسجد سے نکلنا ہے۔ مطلقاً شارع عام (گذرگاہ) بنانا جائز نہیں۔

اسی گذرگاہ کے متعلق فرمایا گیا:

" جاز لکل احد ان یمر فیه حتی الکافر الا الجنب والحائض والدواب " (در مختار، زیلعی)

" وقد قال فی البحر وکذا یکره ان یتخذ المسجد طریقا وان یدخله بلا طهارة " (شامی ج ۳ ص ۴۲۰)

" المشی فیها وقت المطر ونحوه لاجل الصلوة او للخروج من الجمع لا لمرور المارین مطلقا کالطریق العام " (شامی ج ۳ ص ۴۲۰)

" لا یجوز ان یتخذ المسجد طریقا " (شامی ج ۳ ص ۴۲۰)

"لو جعل الطریق مسجدا یجوز لا جعل المسجد طریقا" (شامی ج ۳ ص ۴۲۰)

راستہ کو مسجد بنانا جائز ہے لیکن مسجد کو راستہ بنانا جائز نہیں۔

خیال رہے کہ مندرجہ بالا حکم کا تعلق اس راستہ سے نہیں جو مسجد کے ایک دروازہ سے داخل ہوکر دوسرے دروازہ سے نکل جائے لیکن مسجد کا صحن یا مسجد کا کوئی حصہ اس میں شامل نہ ہو یا مسجد کی حد بندی سے باہر ہو، اسے مسجد والا حکم حاصل نہیں۔

مسجد کی زمین کو فروخت کرنا جائز نہیں:

" فی فتاوی الحجة لو صار احد المسجدین قدیما وتداعی الی الخراب فاراد اهل السکة بیع القدیم وصرفه فی المسجد الجدید فانه لا یجوز " (عالمگیری ج ۲ ص ۴۵۸)

فتاوی حجۃ میں یہ مذکور ہے کہ ایک مسجد قدیم ہے وہ خراب ہو چکی ہے، اس میں لوگ نماز نہیں ادا کرتے۔ دوسری مسجد جدید ہے، اہل محلّہ چاہتے ہیں کہ پرانی مسجد کی زمین کو بیچ کر نئی مسجد کی تعمیر پر لگا دیں تو وہ ایسا نہیں کر سکتے۔ وجہ وہی ہے جس کا پہلے ذکر کیا جا چکا ہے کہ مسجد تا قیامت مسجد ہے۔ مسجد کی زمین کو بیچا نہیں جا سکتا۔

مسجد کی زمین کو کسی اور تصرف میں لانا منع ہے:

"ارض وقف علی مسجد صارت بحال لا تزرع فجعلها رجل حوضا للعامة لا یجوز للمسلمین انتفاع بماء ذلک الحوض کذا فی القنیة." (عالمگیری ج۲ص ۴۶۴)

مسجد کے لیے زمین وقف کی گئی وہ کاشت کے قابل نہیں (کہ اس کی پیداوار کو مسجد پر خرچ کیا جائے) کسی شخص نے وہاں عام لوگوں کے نفع کے لیے تالاب بنا دیا تو مسلمانوں کے لئے اس تالاب سے نفع حاصل کرنا جائز نہیں۔

بوقت مشکل مسجد کا مال بطور قرض لینا:

"اما المال الموقوف علی المسجد الجامع ان لم تکن للمسجد حاجة للمال فللقاضی ان یصرف فی ذلک (ای لنائبة نابت الاسلام مثل حادثة الروم) لکن علی وجه القرض فیکون دینا فی مال الفئ" (عالمگیری ج۲ص ۴۶۴)

جو مال جامع مسجد پر وقف کیا گیا ہے اگر اس مال کی مسجد کو وقتی طور پر ضرورت نہیں تو قاضی کے لیے جائز ہے (کہ اگر اسلام اور مسلمین پر کوئی مشکل وقت آ جائے، کفار حملہ آور ہو جائیں، ان کی یلغار کو روکنا ہو) کہ وہ مال بطور قرض لے لے اور مال فئ میں سے بعد میں ادا کرے۔

مسجد کے مال کو کیسے خرچ کیا جائے؟

اگر مال دینے والے نے مشروط کیا ہے تعمیر سے تو وہ مال تعمیر پر ہی خرچ کیا جائے۔ اگر مال دینے والے نے بغیر کسی شرط کے مسجد کی ضروریات کے لیے مال دیا ہے تو وہ انتظامیہ جس طرح چاہے خرچ کرے۔

"قالوا ان وسع الواقف ذلک للقیم وقال تفعل ما تری من مصلحة المسجد کان له ان یشتری للمسجد ما شاء وان لم یوسع ولکنه وقف لبناء المسجد وعمارة المسجد لیس للقیم ان یشتری به دهنا او حصیرا او حشیشا وغیرها." (عالمگیری ج۲ص۴۶۱)

مسجد پر مال وقف کرنے والے شخص نے اگر منتظم مسجد کو اختیار دیا ہو کہ تم جس طرح چاہو خرچ کرو تو منتظم کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ جیسے چاہے خرچ کرے اور اگر مال دینے والے نے مال صرف مسجد کی تعمیر کے لیے دیا ہے تو منتظم کے لیے جائز نہیں کہ وہ مال "تعمیرات" کے بغیر دوسرے مصارف..... چراغ جلانے کے لیے تیل، چٹائیاں، چٹائیوں کی جگہ سردیوں میں ڈالے جانے والے گھاس کی خرید ..... پر خرچ کرے۔ اس لیے منتظمین کو چاہیے کہ وہ مطلقاً مسجد کی ضروریات کے لیے چندہ جمع کریں۔ کسی خاص کام کے لیے مختص نہ کریں ورنہ اسی کام پر مال خرچ کرنا پڑے گا۔

" ولو وقف علی عمارته یصرف الی بنائه وتطیینه دون تزیینه "

(عالمگیری ج۲ص۴۶۱)

اگر کسی شخص نے مال صرف تعمیر کے لیے دیا ہے تو اس کو تعمیر اور لپائی یعنی پلستر پر خرچ کیا جاسکتا ہے۔ وہ مال آرائش اور زیب وزینت پر نہیں خرچ کیا جاسکتا۔

مساجد کو برباد کرنے والے ظالم ہیں:

﴿ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنْ یُّذْکَرَ فِیْهَا اسْمُهٗ وَسَعٰی فِیْ خَرَابِهَا ﴾

(پ۱ع۱۴)

اور اس سے بڑھ کر ظالم کون ہے جو اللہ کی مسجدوں سے روکے اللہ کا نام لیے جانے سے اور ان کی بربادی میں کوشش کرے۔

آیت کریمہ کا شان نزول خواہ بخت نصر کا بیت المقدس کو برباد کرنا ہو، یا کفار مکہ کا نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام کو عمرہ ادا کرنے اور مسجد حرام میں داخل ہونے سے منع کرنا ہو۔ خواہ نصاریٰ کے بادشاہ کا بیت المقدس میں مردہ جانوروں کا پھینکنا اور توراۃ کو جلانا ہو یا مشرکین مکہ کا نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام کو مسجد حرام میں داخل ہونے سے منع کرنا اور ہجرت پر مجبور کرنا ہو۔ خواہ تحویل قبلہ کے وقت یہود کا کعبہ شریف کی طرف متوجہ ہو کر نماز ادا کرنے سے منع کرنا ہو۔ بہر حال مراد عام ہے۔ ہر مسجد کا یہی حکم ہے اور ہر شخص جو مساجد میں اللہ کا ذکر کرنے سے منع کرے اور مساجد کو برباد کرے وہ بہت بڑا ظالم ہے۔

علامہ آلوسی اور امام فخر الدین رازی فرماتے ہیں:

" وظاهر الآية العموم فی کل مانع وفی کل مسجد وخصوص السبب لا یمنعه "

(کبیر، روح المعانی)

ظاہر آیت کریمہ سے عموم ہی سمجھ آ رہا ہے، ہر روکنے والا شخص اور مسجد کو برباد کرنے والا شخص مراد ہے اور ہر مسجد مراد ہے۔ خصوص سبب اس سے مانع نہیں۔

مساجد کو برباد کرنے والا بڑا ظالم کیوں؟

''ظلم'' کا معنی ہے کسی چیز کو اپنے محل میں نہ رکھنا۔ یعنی کسی کا حق مارنا۔ حق دنیاوی بھی ہوتا ہے اور دینی بھی۔ پھر لوگوں کا اپنے آپ پر بھی حق ہوتا ہے۔ پھر کعبہ معظمہ، مسجد اور قرآن شریف کا بھی حق ہے کہ انکی تعظیم کی جائے۔ مساجد کو برباد کرنے والا اللہ اور اسکے رسول ﷺ کا حق مارتا ہے، اور مسلمانوں کا حق بھی مارتا ہے۔ خود مسجد کا حق برباد کرتا ہے، یہاں تک کہ اپنے نفس کا حق بھی تباہ کرتا ہے۔

اس شخص کا حق تو یہ تھا کہ وہ مسجد میں حاضر ہو کر عبادت کرتا، اپنے نفس کو عذاب سے بچاتا، خود مسجد میں عبادت نہ کرنے سے اپنے نفس کا حق بھی برباد کر رہا ہے۔ مسجد کا حق چھین کر مسجد کی بے حرمتی کر رہا ہے، اللہ اور اسکے رسول ﷺ کو ناراض کر رہا ہے اور مسلمانوں کیلئے مشکلات پیدا کر کے ان کو نمازوں سے روک رہا ہے۔ یہ شخص بہت بڑا ظالم کیوں نہ ہو جبکہ چور مالی ظلم کرتا ہے، قاتل جانی ظلم کرتا ہے اور یہ شخص ایمانی ظالم ہے۔ لہٰذا یہ شخص بدترین شخص ہے اور بہت بڑا ظالم ہے۔ (ملخص از تفسیر نعیمی)

مسجد کو برباد کرنے کی دو قسمیں ہیں:

" السعی فی تخریب المسجد قد یکون لوجهین احدهما منع المصلین والمتعبدین والمتعهدین له من دخوله فیکون ذلک تخریبا والثانی بالهدم والتخریب "

(تفسیر کبیر)

مسجد کو برباد کرنے کی کوشش دو طرح ہے:

(۱) ایک ان میں سے یہ ہے کہ نمازیوں، عبادت گزاروں اور مسجد میں جانے کا عہد کرنے والوں کو مساجد میں داخل ہونے سے روکنا یہ درحقیقت مساجد کے لیے تخریب کاری ہے کیونکہ ایسے افعال سے مساجد برباد ہوتی ہیں۔ چونکہ نمازیوں، عبادت گزار لوگوں سے ہی مساجد آباد ہوتی ہیں، جب ان کو ہی

روک دیا گیا تو مساجد خود بخود ویران ہو جائیں گی۔

(۲) مساجد کی بربادی کی دوسری قسم یہ ہے کہ مساجد کو منہدم کر دیا جائے، یعنی مساجد کو گرا کر شہید کر دیا جائے، ان پر بلڈوزر چلا دیے جائیں، یہ ظلم عظیم ہے، ایسے فعل کے مرتکب لوگ ظالم ہیں جو خدا کی گرفت میں آئیں گے، اس وقت ان کو اپنے کیے ہوئے کاموں کے انجام کا پتہ چلے گا۔

مقامِ حیرت!

ہندوستان میں غیر مسلم جب بابری مسجد کو شہید کریں تو پاکستان کے مسلمان احتجاجی مظاہرے کریں، خطباء مساجد میں اپنے اپنے خطابات میں ان کی پرزور مذمت کریں، آج کے وزیراعظم جناب محمد نواز شریف اس وقت کے بھی وزیراعظم تھے، وہ بھی اپنی زبان ذیشان سے ہندوستان کی شدید مذمت کریں، ہماری نیشنل اسمبلی کے ارکان بھی مذمت کریں لیکن شاہراہوں کو کشادہ کرنے کے لئے مساجد کو شہید کرنا کہاں کا انصاف ہے؟ عوام ٹس سے مس نہیں ہو رہے، خطباء خاموش ہیں۔ ارکان اسمبلی کی زبانیں بند ہیں۔ حکومت خود یہ کام کرا رہی ہے۔ یہ ظلم عظیم نہیں تو اور کیا ہے؟ یہ قہر خداوندی کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔ مجھے امید ہے مساجد کو شہید کرانے والے دنیا میں ہی خدا کی گرفت میں آئیں گے۔ اللہ تعالیٰ ہمارا حامی و ناصر ہو۔

تنبیہ: کسی کی زمین پر بغیر اجازت کے مسجد بنانا جائز نہیں۔ جو مسجد مغصوبہ زمین پر بنائی گئی ہو اس میں نماز ادا کرنا حرام ہے۔ اسلام آباد میں حکومت کی زمین پر ناجائز طور پر جہلاء نے جہاں جہاں مساجد بنائی ہیں۔ ان تمام کا یہی حکم ہے۔ ہاں اگر مسجد تو غاصبانہ طور پر بنائی گئی تھی بعد میں حکومت نے اجازت دے دی تو اجازت کے بعد نمازیں ادا کرنا درست ہوگا۔ اجازت سے پہلے جو نمازیں ادا کی گئی تھیں وہ حرام طور پر ادا ہوئیں۔

صاحب نور الانوار لکھتے ہیں:

"وكذا الصلوة فی الارض المغصوبة مشروعة فی ذاتها وانما تحرم لاجل مشغل ملك الغير"
(نور الانوار ص ۲۲)

مغصوبہ زمین میں نماز ادا کرنا اگرچہ ذاتی طور پر جائز نظر آتا ہے کہ وہ نماز ادا کر رہا ہے، نیکی کا کام کر رہا ہے لیکن غیر کی ملکیت میں جبراً یا بے اجازت نماز ادا کرنے کی وجہ سے حرام ہے۔

اعتراض: بعض لوگ ایسے غاصبانہ قبضے پر بھی جواز کا فتویٰ دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ علامہ

شامی رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے۔

" وفی شرح المنیة للحلبی بنی مسجدا فی ارض غصب لاباس بالصلوة فیه "

(شامی جلد اول ص ۲۸۱)

منیہ کی شرح حلبی میں ذکر ہے کہ مغصوبہ زمین میں مسجد بنائی گئی ہوتو اس میں نماز ادا کرنے میں کوئی حرج نہیں ۔

اس سے تو پتہ چلا ہے کہ مغصوبہ زمین میں نماز جائز ہے۔حرام کہنا کیسے صحیح ہے؟

جواب : جیسا کہ نورالانوار کی عبارت سے واضح ہے کہ مغصوبہ زمین میں نماز ادا کرنا بذاتہ جائز ہے لیکن ملک غیر کی وجہ سے حرام ہے۔علامہ شامی نے جو عبارت نقل کی ہے۔اس کا مطلب بھی یہی ہے۔جیسا کہ میں نے اپنے رسالہ ''اقامت بیٹھ کر سننا مستحب ہے'' میں ذکر کیا ہے کہ علامہ شامی کے لفظ ''لابأس '' سے کئی جہلاء منافقین غلطی کا شکار ہوئے اصل میں لاباًس سے مطلقاً جواز کا ذکر نہیں۔ بلکہ فریضہ کی ادائیگی کا ذکر ہے۔کیونکہ علامہ شامی نے اسی عبارت کیساتھ متصل یہ عبارت ذکر کی ہے۔

" وفی الواقعات بنی مسجد علی سور المدینة لاینبغی ان یصلی فیه لانه حق العامة فلم یخلص لله تعالیٰ کالمبنی فی ارض مغصوبة " (شامی جلد اول ص ۲۸۱)

واقعات میں مذکور ہے کہ شہر کی دیوار پر اگر کسی نے مسجد بنائی تو اس میں نماز ادا کرنا درست نہیں کیونکہ وہ خاص اللہ تعالیٰ کا حق نہیں بلکہ اس میں بندوں کا حق ہے جیسا کہ مغصوبہ زمین میں نماز ادا کرنا درست نہیں

اب واضح ہوا کہ مغصوبہ زمین میں نماز ادا کرنا جائز نہیں لہٰذا مغصوبہ زمین میں مساجد بنا کر اپنے آپ کو مبلغ ظاہر کرنے والے درحقیقت لوگوں کی نمازوں کو برباد کرنے والے ہیں اور لوگوں سے اللہ کے نام پر چندہ بٹور کر حرام کام پر لگانے والے ہیں۔ایسے گربہ مسکینوں، تخریب کاروں سے بچنا ضروری ہے۔

مغصوبہ زمین پر بنائی گئی مسجد میں اعتکاف:

نماز کی طرح مغصوبہ زمین پر بنائی گئی مسجد میں اعتکاف خصوصاً رمضان المبارک کے مقدس مہینے میں اعتکاف سنت ادا نہ ہوگا۔لہٰذا ایسی مساجد میں اجر وثواب کی غرض سے اعتکاف بیٹھ کر اپنا وقت ضائع نہ کیا جائے۔

﴿ وَ لِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ فَاَیْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ ﴾ (آیت ۱۱۵)

۱) اور پورب پچھم سب اللہ ہی کا ہے تو تم جدھر منہ کرو ادھر وجہ اللہ (خدا کی رحمت تمہاری طرف متوجہ) ہے بے شک اللہ وسعت والا، علم والا ہے۔

۲) اور اللہ کے لئے مشرق ہے اور مغرب، تو جدھر تم منہ کرو ادھر ہی اللہ متوجہ ہے، بیشک اللہ وسعت والا علم والا ہے۔

شان نزول: اس آیۃ کریمہ کے نزول میں چند وجوہ پائی جاتی ہیں۔ یعنی کئی واقعات پہلے رونما ہوئے اور آیۃ کریمہ کا نزول بعد میں ہوا۔ اس طرح تمام صورتیں نزول کی وجوہ ہیں۔

(ا) نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام جب مکہ مکرمہ میں تھے۔ "وقد كان رسول الله ﷺ يصلى بمكة الى بيت المقدس والكعبة بين يديه" تو بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز ادا فرماتے تھے البتہ کعبہ شریف بھی آپ کے سامنے ہوتا، یعنی اس طرح کھڑے ہوتے کہ کعبہ بھی سامنے رہے اور توجہ بیت المقدس کی طرف بھی ہو جائے جب آپ مدینہ طیبہ میں آ گئے تو سولہ، سترہ ماہ بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز ادا کرتے رہے۔ یہاں وہ صورت نہیں تھی کہ بیت المقدس کی طرف منہ کرنے سے کعبہ کی طرف بھی منہ ہو جاتا، اس لئے کہ بیت المقدس مدینہ طیبہ سے شمالی جانب ہے اور کعبہ شریف جنوبی جانب ہے۔

حضور کے دل میں خیال آتا رہتا کہ کعبہ شریف ہی قبلہ ہو جائے۔ تو جب تک قبلہ منسوخ نہیں ہوا اس وقت تک آپ کے دل کی تسلی کیلئے یہ آیت نازل ہوئی۔ ﴿ وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ﴾ اور اللہ کے لئے ہی ہے مشرق و مغرب۔

مطلب یہ کہ کسی سمت کو بھی کمال حاصل ہوگا تو اس وجہ سے کہ رب تعالیٰ نے اس کی طرف توجہ کرنے کا حکم دیا ہے۔

(۲) "عن ابن عمر انه کان یصلی حیث توجهت به راحلته ویذکر ان رسول اللہ ﷺ کان یفعل ذلک ویتاول هذه الایة فاینما تولوا فثم وجه اللہ"

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما اپنی سواری پر نوافل ادا فرماتے رہتے تھے۔آپ کی سواری جس طرف بھی متوجہ ہوتی رہتی، آپ فرماتے رسول اللہ ﷺ اسی طرح نوافل شہر کے بعد سواری پر ادا فرماتے رہتے۔تو رب تعالیٰ نے اس آیۃ کریمہ کو نازل فرمایا۔﴿ فاینما تولوا فثم وجه اللہ ﴾

(۳) بخاری میں حضرت نافع سے مروی ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے جب نماز خوف کے بارے میں سوال کیا گیا تو آپ نے نماز خوف کے متعلق مکمل وضاحت فرمائی۔پھر فرمایا؛

"فان کان خوف اشد من ذلک صلوا رجالا قیاما علی اقدامهم ورکبانا مستقبلی القبلة وغیر مستقبلیها ، قال نافع ولا اری ابن عمر ذکر ذلک الا عن النبی ﷺ"

کہ اگر خوف بہت ہی زیادہ ہو یعنی ایک امام کے پیچھے دو گروہ بن کر نماز نہ ادا کی جا سکے تو علیحدہ علیحدہ نماز ادا کی جائے جس طرح ممکن ہو۔سواری پر نماز ادا کریں تو سواری قبلہ کی طرف متوجہ ہو یا قبلہ کی طرف متوجہ نہ ہو۔

حضرت نافع کہتے ہیں حضرت ابن عمر نے یقیناً یہ نبی کریم ﷺ سے سن کر ہی بیان فرمایا ہوگا۔تو اس سے واضح ہوا کہ اس آیۃ کے نزول کا تعلق صلوۃ خوف سے بھی ہے۔

(۴) قبلہ کے مشتبہ ہونے کی صورت میں صحابہ کرام نے اپنی اپنی سوچ اور خیال کے مطابق نماز ادا کر لی،تو بعد میں پتہ چلا کہ بعض حضرات کا منہ قبلہ کی طرف نہیں ہو سکا، نبی کریم ﷺ کی خدمت میں عرض کیا تو اس آیۃ کریمہ کا نزول ہوا۔

خیال رہے کہ قبلہ کے مشتبہ ہونے کے متعلق کئی روایات بیان کی گئی ہیں مقصد سب کا ایک ہی ہے۔

(ماخوذ از فتح القدیر)

قرطبی رحمہ اللہ نے ان وجوہ کے بغیر ایک اور وجہ بھی بیان کی۔

حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے حضرت نجاشی کی وفات پر لوگوں کو مدینہ طیبہ

کے باہر جمع کر کے نماز جنازہ ادا فرمائی، تو بعض حضرات نے کہا۔ " کیف نصلی علی رجل مات وھو یصلی الی بیت المقدس حتی مات " ہم اس شخص پر نماز جنازہ کیسے پڑھیں جو بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتا رہا۔ تو اس وقت یہ آیۃ نازل ہوئی۔

خیال رہے کہ حضرت نجاشی حبشہ کے والی (حاکم) تھے۔ ان کا نام "اصحمہ" تھا۔ عربی میں اس کا معنی ہے۔ "عطیہ" انہوں نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ صرف اپنے نظام حکومت کی وجہ سے نبی کریم ﷺ کی ملاقات کے لئے حاضر نہیں ہو سکے تھے۔ اس لئے تابعی ہیں۔ صحابی نہیں۔ شائد بعض حضرات کا یہ کہنا بھی عدم علم کی وجہ سے تھا۔

نجاشی کا جنازہ پڑھانے کی حکمت:

" ان الارض دحیت لہ جنوبا و شمالا حتی رأی نعش النجاشی کما دحیت لہ شمالا و جنوبا حتی رأی المسجد الاقصی "

بے شک نبی کریم ﷺ کے لئے زمین شمال وجنوب کی طرف وسیع فرما دی، حجاب اٹھ گئے، یہاں تک کہ آپ نجاشی کو دیکھ کر ان کی نماز جنازہ پڑھا رہے تھے۔ جس طرح مسجد اقصیٰ آپ کے سامنے کر دی گئی تھی کہ آپ دیکھ کر مسجد اقصیٰ کی تمام علامات کو بیان فرما رہے تھے۔ جب واقعہ معراج ذکر کرنے کے بعد آپ سے مسجد اقصیٰ کی علامات پوچھی گئیں۔

" فانہ اذ رآہ فما صلی علی غائب وانما صلی علی مرئی حاضر والغائب مالا یری ، واللہ تعالیٰ اعلم "

بے شک جب نبی کریم ﷺ نجاشی کو دیکھ رہے تھے۔ تو یہ غائب شخص کی نماز جنازہ نہیں تھی، بلکہ حاضر جو دیکھا جا رہا تھا۔ اس کی نماز جنازہ تھی۔ کیونکہ غائب تو وہ ہوگا جو دیکھا نہ جائے۔

" قال ابن العربی والذی عندی فی صلوۃ النبی ﷺ علی النجاشی انہ علم ان النجاشی ومن آمن معہ لیس عندھم من سنۃ الصلوۃ علی المیت اثر ، فعلم انھم سیدفونہ بغیر صلوۃ فبادر الی الصلوۃ علیہ "

حضرت ابن عربی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ میرے نزدیک ایک اور وجہ بھی ہے کہ نبی کریم ﷺ کو معلوم

تھا کہ نجاشی اور دوسرے لوگ ان کے ساتھ ایمان لانے والوں کو نماز جنازہ کا مسنون طریقہ معلوم نہیں۔ ان تک ابھی یہ احادیث نہیں پہنچیں۔ اسلئے آپ نے نماز جنازہ پڑھائی تا کہ وہ اسی طرح دفن نہ کردیں۔ (از قرطبی)

اتنا واضح ہوگیا کہ نماز جنازہ غائبانہ کا کوئی وجود نہیں۔ نبی کریم ﷺ نے نجاشی کی نماز جنازہ جو پڑھائی اس میں آپ کی تخصیص تھی۔ اس کو دلیل بنانا کہ غائبانہ جنازہ جائز ہے درست نہیں۔ زیادہ وضاحت کے لئے راقم کی کتاب ''موت کا منظر مع احوال حشر ونشر'' کا مطالعہ کیا جائے۔

وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ : (اور اللہ کے لئے ہے مشرق اور مغرب)

مشرق: طلوع ہونے کی جگہ۔ مغرب: غروب ہونے کی جگہ

کبھی ایک سمت کا لحاظ کر کے مفرد ذکر کردیا جاتا ہے۔ جس طرح یہاں ذکر ہے۔ اور کبھی ہر روز کی معمولی تبدیلی جو ہوتی رہتی ہے۔ کہ طلوع اور غروب میں تھوڑا تھوڑا فرق آتا رہتا ہے۔ اس کو مدنظر رکھتے ہوئے جمع ذکر کیا جاتا ہے۔ جیسا کہ رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔ ﴿بِرَبِّ الْمَشَارِقِ وَالْمَغَارِبِ﴾ اور کبھی گرمیوں اور سردیوں کے نمایاں فرق کو مدنظر رکھتے ہوئے تثنیہ ذکر کیا جاتا ہے۔ جیسا کہ رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿رَبُّ الْمَشْرِقَيْنِ وَالْمَغْرِبَيْنِ﴾ یہاں مشرق ومغرب کا ذکر کر کے مراد زمین کے کنارے لئے گئے ہیں اور ثابت یہ کیا گیا ہے۔ "له الارض كلها لايختص به مكان دون مكان" کہ تمام زمین اللہ تعالیٰ کیلئے ہے یہ نہیں کہ کچھ مکان اس کے ہوں کچھ نہ ہوں۔

اس سے ماقبل آیۃ سے تعلق بھی واضح ہوگیا۔ "فان منعتم ان تصلوا فی المسجد الحرام او لاقصٰی قد جعلت لكم الارض مسجدا" کہ مسلمانوں کو حکم دیا گیا کہ اگر تمہیں مسجد حرام یا مسجد اقصیٰ سے نماز ادا کرنے سے منع کردیا جائے تو تمہارے لئے ساری زمین کو ہی مسجد بنادیا گیا ہے۔ تمام زمین ہی اللہ تعالیٰ کی ہے جہاں چاہو نماز ادا کرلو۔ (ماخوذ از قرطبی، بیضاوی، شیخ زادہ)

[illegible] : ﴿وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ﴾ میں لام اختصاص کا ہے، معنی یہ ہے "هو خالقهما و مالكهما﴾ کہ اللہ تعالیٰ مشرق ومغرب یعنی تمام زمین کا خالق اور مالک ہے۔ اسی سے پتہ چل گیا کہ رب تعالیٰ جسمیت سے پاک ہے، اور اللہ تعالیٰ کا جہت اور مکان سے پاک ہونا واضح ہوگیا۔

دلیل: مشرق اور مغرب دونوں جہتیں اللہ تعالیٰ کی مخلوق اور مملوک ہیں۔ اور یہ بھی واضح ہے کہ جہت اس امر ممتد کو کہتے ہیں جو طول اور عرض اور عمق کے لحاظ پر پھیلے۔ ہر وہ چیز جو اس طرح ہو وہ منقسم ہوتی ہے۔ جو چیز منقسم ہو وہ مؤلف و مرکب ہوتی ہے۔ ہر وہ چیز جو مؤلف و مرکب ہو اس کا خالق اور موجد ہونا ضروری ہے۔

یہ دلیل تمام جہات سے متعلق ہے۔ فوق، تحت وغیرہ تمام جہات کا خالق اللہ تعالیٰ ہے۔ یقینی بات ہے کہ خالق مقدم ہے مخلوق پر، جب جہات ہی اور مکانات ہی نہیں تھے۔ خالق کا وجود اس وقت ہے تو رب تعالیٰ کا جہات سے پاک ہونا واضح ہے۔

اسی طرح جہان کی تخلیق کے بعد بھی جہات سے پاک ہونا ضروری ہے، کیونکہ انقلاب حقائق ممکن نہیں۔

اعتراض: جب ساتھ ہی آگے آرہا ہے ﴿فَاَیْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ﴾ جس طرف تم منہ پھیرو اسی طرف اللہ تعالیٰ کا منہ ہے۔ تو کیسے کہا جا سکتا ہے کہ وہ جسم اور جہت اور مکان سے پاک ہے۔

جواب: یہاں "وجـــه" کا حقیقی معنیٰ "منہ اور چہرا" مراد ہی نہیں۔ ورنہ اللہ تعالیٰ کے کلام میں کذب لازم آئے گا کیونکہ "منہ" تو ایک طرف ہوتا ہے۔ مشرق کی طرف تو مغرب اور شمال و جنوب کی طرف نہیں ہوتا۔ اسی طرح اگر کسی دوسری جانب ہو تو اسی جانب ہوگا۔ جب رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿فَاَیْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ﴾ تم جدھر منہ پھیرو ادھر ہی ﴿وَجْهُ اللّٰهِ﴾ ہے۔ تو یقیناً اس کا مجازی معنیٰ معتبر ہے۔ وہ مجازی معنیٰ کیا ہے؟ اس میں کئی احتمال ہیں۔

(۱) وجـــه کی اضافت "اللہ" کی طرف تشریفی ہے۔ اور معنیٰ اس کا تخلیق اور ایجاد ہے اب مطلب یہ ہوگا۔ "تم جدھر منہ کرو اسی طرف کو اللہ تعالیٰ نے قبلہ بنایا ہے۔

(۲) وجہ کا معنیٰ قصد اور نیت ہو، جیسے ﴿اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ﴾ الخ میں یہی معنیٰ معتبر ہے اب مطلب یہ ہوگا۔ "جدھر تم منہ کرو وہی اللہ تعالیٰ کے ارادہ میں ہے۔

(۳) وجہ بمعنیٰ "رضا" ہو۔ جس طرح ﴿اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ﴾ میں یہی معنیٰ معتبر ہے۔

بے شک ہم تمہیں اللہ کی رضاء کے لئے کھلاتے ہیں۔ اب اس آیۃ کا مفہوم ہوگا تم جدھر منہ کرو ادھر ہی اللہ تعالیٰ کی رضاء ہے۔

"﴿فَثَمَّ وَجْهُ اللهِ﴾ مع انه لايجوز عليه المكان فلا بد من تأويله بأن المراد فثم قبلته التى يعبد بها اوثم رحمته ونعمته وطريق ثوابه والتماس مرضاته"

جب اللہ تعالیٰ کے لئے مکان اور جہت ثابت کرنا جائز نہیں تو ضروری ہے کہ اس کی تاویل کی جائے یا یہ کہا جائے وہی قبلہ ہے جس کی طرف توجہ کر کے عبادت کی جاتی ہے۔ یا یہ کہا جائے کہ اسی طرف اس کی رحمت اور نعمت ہے (اعلیٰ حضرت کا ترجمہ اسی کے مطابق ہے۔ راقم نے بھی وہی نقل کیا صرف مختصر کیا) اور یا یہ کہا جائے اسی طرف ثواب کا طریقہ ہے، اور یا یہ کہا جائے کہ اسی طرف اس کی رضاء کو حاصل کرنا ہے۔ (از کبیر)

علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے ان معانی کے علاوہ ذات بھی معنی کیا ہے۔ اس لحاظ پر معنی یہ ہوگا۔ "تم جدھر منہ کرو اسی طرف اللہ کی ذات ہے۔" (از روح المعانی)

خیال رہے "تولوا" اصل میں "تولیوا" ہے۔ "ولی یولی تولیة" سے لیا ہوا ہے۔ جو اصل میں متعدی ہے لیکن اس کا استعمال بمنزل لازم کے ہے۔

" ولى اذا اقبل وولى اذا ادبر وهو من الاضداد و معناه ههنا الاقبال "

ولّــی کا معنی متوجہ ہونا بھی ہے اور پیٹھ پھیرنا بھی ہے۔ یعنی اضداد کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ یہاں معنی متوجہ ہونا۔ یعنی جس طرف تم متوجہ ہو۔ (از کبیر و شیخ زادہ)

اِنَّ اللهَ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ : بے شک اللہ تعالیٰ وسعت والا، علم والا ہے۔

اعتراض: "انه تعالى وصف نفسه بكونه واسعا والسعة من صفة الاجسام"

اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کی صفت واسع ہونے سے بیان فرمائی ہے۔ اور "سعة" (وسعت) کا تعلق اجسام سے ہے۔ جب اللہ تعالیٰ جسم ہونے سے پاک ہے، تو اس کے "واسع" ہونے کا کیا مطلب ہے؟

جواب: اللہ تعالیٰ نے اپنی صفت واسع ہونا بیان فرمائی ہے۔اس کا حقیقی معنی تو نہیں لیا جا سکتا کیونکہ اس طرح تو رب تعالیٰ کا متجزی ہونا اور متبعض ہونا لازم آئے گا۔اور کسی اور خالق کا ماننا لازم آئے گا، جو جائز نہیں۔

" بل لابد وان یحمل علی السعة فی القدرة والملک ، او علی انه واسع العطاء والرحمة ، او علی انه واسع الانعام ببیان المصلحة للعبید لکی یصلوا الی رضوانه "

اس لئے ضروری ہے کہ اس کا معنی یہ لیا جائے کہ اللہ تعالیٰ وسیع قدرت اور وسیع ملکیت کا مالک ہے۔یا یہ معنی لیا جائے کہ وہ وسیع عطاء اور وسیع رحمت کا مالک ہے۔یا یہ معنی لیا جائے کہ وہ وسیع انعام کا مالک ہے کہ اپنے بندوں کی مصلحت کے پیش نظر ان کو انعام سے نوازتا ہے تو وہ بھی اس کی رضامندی کو حاصل کرتے ہیں۔

عَلِيمٌ: اس مقام پر تہدید کے لئے استعمال ہے کہ نمازی کو جب یہ معلوم ہوگا کہ اللہ تعالیٰ ظاہر و باطن کو جانتا ہے۔تو وہ نماز کی ادائیگی میں اور نماز کے ارکان وغیرہ میں سستی سے کام نہیں لے گا۔

" ویحتمل ان یکون قوله تعالیٰ (واسع علیم) انه تعالی واسع القدرة فی توفیة ثواب من یقوم بالصلوة علی شرطها و توفیة عقاب من یتکاسل عنها "

اور یہ احتمال بھی پایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ وسیع قدرت والا ہے لہٰذا جو نماز کو شرائط کے مطابق ادا کرے گا اس کو کامل ثواب عطاء فرمائے گا۔اور جو سستی سے کام لے گا اسے مکمل عذاب عطاء کرے گا۔

مظہری میں بیان کیا گیا ہے بے شک اللہ تعالیٰ اپنے نور کے احاطہ کے ذریعے وسعت والا ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے احاطہ کی کیفیت بیان نہیں ہو سکتی، اور اس کی حقیقت کو بیان نہیں کیا جا سکتا۔

" قال المجدد ﷺ فی حقیقة الصلوة انها وسعة ذاتیة بلا کیف لا تدرک کنهها "

مجدد رحمہ اللہ نے نماز کی حقیقت کے متعلق بیان فرمایا کہ نماز میں وسعت ذاتیہ پائی جاتی ہے۔ لیکن اس کی حقیقت اور کنہ کو بھی نہیں پایا جا سکتا۔ (مظہری)

قبلہ کے متعلق مسائل:

" لما کان المسجود له هو الله تعالی والتوجه الی الکعبة مامورا به کان السجود لنفس

الکعبة کفرا" (شامی ج اول ص ۳۱۵)

مسجود صرف رب تعالیٰ کی ذات ہے، کعبہ شریف کی طرف صرف توجہ کا حکم ہے۔ اگر کوئی شخص کعبہ کو معبود اور مسجود سمجھے گا تو وہ کافر ہو جائے گا۔

اس سے بت پرستوں کا اعتراض مندفع ہو جائے گا کہ وہ کہتے ہیں کہ جس طرح تم کعبہ کو سجدہ کرتے ہو اس طرح ہم بت کو سجدہ کرتے ہیں۔ یہ ان کا قول غلط ہے کیونکہ وہ بتوں کو معبود سمجھتے ہیں۔

رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿اجعل الآلهة واحد، ان هذا لشئ عجاب﴾ کیا اس (محمد) نے بہت معبودوں کا ایک معبود کر دیا، بے شک یہ عجیب بات ہے۔

اس سے واضح ہوا کہ بت پرست اپنے بتوں کو معبود سمجھتے تھے۔ جب نبی کریم ﷺ نے فرمایا۔ "لا الہ الا اللہ" (اللہ کے سوا کوئی اور معبود نہیں) تو وہ اس پر تعجب کرنے لگے کہ کیا یہ شخص کئی معبودوں کو ایک معبود بتا رہا ہے۔ یہ تو عجیب بات ہے۔

اور رب تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ ﴿مانعبدهم الا ليقربونا الى الله زلفى﴾ (وہ کہتے ہیں) ہم تو انہیں صرف اتنی بات کے لئے پوجتے ہیں کہ یہ ہمیں اللہ کے پاس نزدیک کر دیں۔

اس آیۃ کریمہ سے بھی واضح ہوا کہ بت پرست اپنے بتوں کی پوجا کرتے تھے، ان کو معبود سمجھتے تھے۔

یہاں سے ایک اور ضال و مضل فرقہ کا بھی رد ہو گیا جو یہ کہتے ہیں کہ بت پرستوں نے اپنے بتوں کو رب کے قریب کرنے کا وسیلہ اور ذریعہ بنایا ہوا تھا۔ اور سنیوں نے انبیاء و اولیاء کو وسیلہ بنایا ہوا ہے۔ لہٰذا یہ بھی بت پرستوں کی طرح مشرک ہیں۔

کاش کہ ان عقل کے اندھوں کو یہ آیات نظر آئیں جن کو ابھی ذکر کیا گیا ہے کہ بت پرست بتوں کو معبود اور مسجود سمجھتے تھے۔ اہل سنت و جماعت کے علماء کرام تو کیا بفضلہ تعالیٰ عوام میں سے کوئی جاہل بھی انبیاء کرام اور اولیاء کرام کو معبود نہیں سمجھتا۔ اللہ تعالیٰ کی مخلوق سمجھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا مقرب تسلیم کرتے ہیں۔ اور یہ عقیدہ سچا اور پکا رکھتے ہیں کہ یہ رب تعالیٰ کے قریب کرنے کا ذریعہ ہیں۔

نتیجہ واضح ہو گیا کہ ایک نظام کو مربوط بنانے کے لئے، ایک ڈسپلن پیدا کرنے کے لئے، ایک ہی طرف تمام متوجہ ہوں، جہاں مسلمانوں کو دیکھ کر ہی ان کی اجتماعیت کا پتہ چل جائے، قبلہ کی طرف منہ کرنے کا حکم دیا۔

اور روزمرہ انسان نماز پڑھنے سے یہ تجربہ حاصل کر رہا ہے کہ ایک طرف توجہ کرنے سے اور دائیں بائیں، ادھر ادھر نہ دیکھنے سے انسان یکسوئی، کامل توجہ سے نماز ادا کرتا ہے۔ نماز کے ختم ہونے پر، یا نماز سے پہلے جب ایک دوسرے کو دیکھ رہے ہوتے ہیں تو ذکر اور وظائف کے پڑھنے میں وہ کامل توجہ نہیں ہوتی جو نماز میں ہوتی ہے۔

امید ہے کہ استقبال قبلہ اور بت پرستی، اور اسی طرح بت پرستی اور انبیاء کرام اور اولیاء کو تقرب کا ذریعہ سمجھنے میں طلباء کرام فرق سمجھ چکے ہوں گے۔

مسئلہ: جہاں سے کعبہ شریف نظر آ رہا ہو وہاں تو کعبہ شریف کی طرف اس طرح توجہ کرنا ضروری ہے کہ انسان اور کعبہ شریف تک خط مستقیم جائے۔ اگر کعبہ شریف سے معمولی انحراف بھی ہوا تو نماز ادا نہیں ہوگی۔

خیال رہے کہ فقہاء کرام اکثر طور پر یہ مسئلہ تحریر کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔ ''مکی'' (مکہ میں رہنے والے) کے لئے یہ ضروری ہے۔ درمختار میں اسے واضح کر دیا گیا۔ " والمراد بقولی فللمکی مکی یعاین التعینة " کہ مکی سے مراد یہ ہے کہ جسے کعبہ شریف نظر آ رہا ہو اس کے لئے ضروری ہے کہ عین کعبہ کی طرف توجہ کرے۔ جسے نظر نہ آ رہا ہو اسے سمت مقرر کرنا ضروری ہے۔ پہلے چونکہ مکہ مکرمہ میں رہنے والوں کو کئی جگہ سے کعبہ شریف نظر آتا تھا۔ اب مسجد حرام کی تین منزلہ تعمیر کی وجہ سے مسجد کے اندر ہی آئیں تو کعبہ شریف نظر آتا ہے۔ یا قرب و جوار کی بلند بلڈنگوں کی چھتوں سے نظر آ سکتا ہے۔

مسئلہ: جن حضرات کو کعبہ شریف نظر نہیں آ رہا وہ نماز کے لئے کعبہ شریف کی سمت، جہت مقرر کریں، قریب رہنے والے کافی حد تک سمت بھی درست مقرر کر سکتے ہیں۔ کہ خط بالکل سیدھا کعبہ شریف سے گزرے۔

دوروالے جب جہت مقرر کریں تو ان کے لئے اتنا ہی ضروری ہے کہ کافی حد تک جہت مقرر کرنے میں احتیاط سے کام لیں لیکن دوری کی وجہ سے معمولی فرق نماز کے لئے مفسد نہیں۔" فعلم ان الانحراف الیسیرۃ لایضر " اسی سے معلوم ہوا کہ معمولی انحراف نماز میں نقصان نہیں دیتا۔

(از شامی)

اگرچہ دوروالوں کے لئے زاویہ حادہ (جو پینتالیس ڈگری سے کم ہو) تک فرق کو جائز رکھا گیا ہے۔تاہم آجکل سمت مقرر کرنے کے لئے بہتر آلے ایجاد ہو گئے ہیں۔اس لئے مساجد کا قبلہ مقرر کرنے کے لئے ان سے کام لیا جائے۔

سمت قبلہ کے معلوم کرنے کا طریقہ:

زمین ہموار کر کے بیچ میں ایک کھونٹی بالکل سیدھی گاڑ دیجئے۔۲۸ مئی کو گرینج ٹائم سے صبح کے ۹ بجکر ۱۶، ۱۷ منٹ اور ۱۶ جولائی کو گرینج ٹائم سے صبح کے ۹ بجکر ۲۵، ۲۶ منٹ یا ۲۹ نومبر کو گرینج ٹائم سے رات کے نو بجکر ۷، ۸ منٹ اور ۱۴ جنوری کو گرینج ٹائم سے رات کے ۹ بجکر ۲۸، ۲۹ منٹ پر اس کھونٹی کا سایہ سمت قبلہ بتائے گا۔یعنی اس کھونٹی کے سایہ کے کنارہ پر کھڑے ہو کر کھونٹی کی طرف رخ کر لیجئے مکہ معظمہ آپ کے سامنے ہوگا۔

تنبیہ: چونکہ مغربی پاکستان کا ٹائم گرینج ٹائم سے پانچ گھنٹے آگے ہے اس لئے گرینج ٹائم سے نو بجے مغربی پاکستان ٹائم سے دو بجتے ہیں۔اور ہندوستان کا ٹائم گرینج ٹائم سے ساڑھے پانچ گھنٹے آگے ہے۔اس لئے گرینج ٹائم کے نو بجے ہندوستانی ٹائم اڑھائی بجے ہوگا۔اور مشرقی پاکستان (جو غداروں نے مل کر بنگلہ دیش بنادیا) کا ٹائم گرینج ٹائم سے چھ گھنٹے آگے ہے۔اس لئے گرینج ٹائم کے نو بجے مشرقی پاکستان میں تین بجے ہوں گے۔

آسان بات: آجکل پاکستان وہی ہے جو پہلے مغربی پاکستان کہلاتا تھا، اس لئے پاکستان میں قبلہ معلوم کرنے کے لئے ۲۸ مئی دن کے دو بجکر سولہ، سترہ منٹ پر کھونٹی زمین میں گاڑ کر دیکھیں جس طرف سایہ جاری ہو، اس طرف کھڑے ہو کر کھونٹے کو اپنی پیشانی کے سامنے رکھیں وہی قبلہ ہے۔

اور ۱۶ جولائی دن کے دو بجکر پچیس، چھبیس منٹ پر یہی عمل کریں، قبلہ کی سمت معلوم ہو جائے گی۔

(از زبدۃ التوقیت) راقم کے نزدیک دن کو ہی عمل کرنا آسان اور بہتر ہے۔ تاہم اگر رات کو عمل کرنا ہو تو پاکستان میں رات کے دو بجکر سات، آٹھ منٹ پر یہ عمل ۲۹ نومبر کو کرے۔ اور ۱۴ جنوری کو رات کے دو بجکر اٹھائیس، انتیس منٹ پر یہی عمل کرے۔

مسئلہ: قبلہ زمین سے لے کر عرش تک ہے۔ صرف کعبہ شریف کے مکان کا نام نہیں۔ اسی لئے بلند پہاڑوں پر نماز ادا کی جائے جہاں توجہ مکان کی طرف نہ ہو۔ مکان نیچے رہ جائے تو نماز درست ہے۔ اس لئے کہ عرش تک جانے والی سمت اس کے سامنے ہے۔

اگر کعبہ شریف کی عمارت کو اٹھا بھی لیا جائے تو قبلہ وہی زمین اور فضا رہے گی۔ اگر وہی کعبہ کی دیواروں کے پتھر وغیرہ دوسری جگہ لگا کر عمارت بنالی جائے تو وہ قبلہ نہیں بن جائیگا۔

فائدہ جلیلہ:

" وفی البحر عن عدۃ الفتاوی الکعبۃ اذا رفعت عن مکانها لزیارۃ اصحاب الکرامۃ ففی تلک الحالۃ جازت الصلوٰۃ الی ارضها " (شامی ج اول ص ۳۱۸ باب شروط الصلوٰۃ)

کعبہ شریف کا مکان اگر نیک لوگوں کی زیارت کے لئے اٹھا لیا جائے تو پھر بھی نماز اسی سرزمین کی طرف منہ کر کے ادا کی جائے گی۔ تاہم راقم کا مؤقف اس پر یہ ہے کہ کعبہ شریف کا نیک لوگوں کی زیارت کرنے کا مطلب یہ ہے کہ انوار وتجلیات کعبہ بزرگوں کی زیارت کرتی ہیں۔ مکان شریف اپنی جگہ رہتا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

" وما ذکرہ فی البحر نقله فی التاتارخانیۃ عن الفتاوی العتابیۃ قال الخیر المرعلی وھذا صریح فی کرامات الاولیاء " (شامی حوالہ مذکور)

جو البحر الرائق میں ذکر ہے وہ تاتارخانیہ نے بھی فتاوی عتابیہ سے نقل کیا ہے۔ الخیر الرملی نے کہا ہے کہ یہ بہت واضح ثبوت ہے اولیاء کرام کی کرامات کا۔

یہ بھی خیال رہے کہ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما نے کعبہ شریف کو جب شہید کرایا نئی تعمیر

ے لئے اور اسی طرح جب حجاج بن یوسف نے کعبہ شریف کو تعمیر کرنے کے لئے شہید کرایا لوگ اسی سمت کی طرف منہ کر کے نماز ادا کرتے رہے۔

مسئلہ : اگر ایک شخص قبلہ کو جانتا تو ہے کہ قبلہ اس سمت ہے، لیکن قبلہ طرف منہ کرنے پر قادر نہیں کسی مرض کی وجہ سے یا مال کے خوف کی وجہ سے، اسی طرح دشمن وغیرہ کا خطرہ ہو تو وہ جس طرف منہ کرنے پر قادر ہو اسی طرف منہ کر کے نماز ادا کرے، اس کا قبلہ ہی جہت قدرت ہے۔

مسئلہ : اگر ایک شخص کو قبلہ کا علم نہیں تو وہاں دیکھے اگر کوئی شخص اس علاقہ کا قبلہ کو جاننے والا مل جائے تو اس سے پوچھے۔

اگر کوئی شخص تو نظر نہیں آتا لیکن کوئی مسجد نظر آئے تو اس سے قبلہ کی سمت کا تعین کرے۔

اگر قبلہ بتانے والا بھی کوئی شخص نہیں، اور مسجد وغیرہ بھی کوئی نہیں تو تحری کرے یعنی خود اپنی کوشش سے سورج وغیرہ کو دیکھ کر قبلہ کو پہچاننے کی کوشش کرے، جس طرف غالب گمان ہو جائے وہی قبلہ ہوگا۔ اگر نماز تو تحری کر کے شروع کی تھی، نماز کے درمیان کسی شخص نے بتا دیا کہ قبلہ اس طرف نہیں جدھر تمہارا منہ ہے بلکہ فلاں جانب ہے تو نماز کے اندر منہ ادھر پھیر لے جدھر کسی نے بتایا ہے۔

اگر نماز کے بعد کسی نے بتایا کہ تمہارا رخ درست نہیں تھا تو نماز کو لوٹانے کی ضرورت نہیں، بلکہ درست ہو چکی ہے کیونکہ قبلہ ہی وہ سمت تھی جو تحری سے متعین کی تھی۔

مسئلہ : اگر ایک شخص کو قبلہ معلوم نہیں تھا اس نے تحری بھی نہیں کی یعنی قبلہ کو جاننے پہچاننے کی کوئی کوشش نہیں کی بلکہ اسی طرح ہی ایک جانب منہ کر کے نماز ادا کر لی۔ اگر بعد میں کسی نے بتا دیا کہ قبلہ اسی طرف تھا جس طرف تم نے منہ کیا تو نماز ہو گئی، کیونکہ مقصود قبلہ ہی تھا جسے پا لیا گیا۔

ہاں اگر اس کا منہ غلط سمت تھا تو نماز نہیں ہوئی، کیونکہ قبلہ بھی نہیں پایا گیا، اور تحری جو فرض تھی وہ بھی نہیں پائی گئی لہذا اس نماز کا لوٹانا ضروری ہے۔

مسئلہ : اگر ایک شخص کو قبلہ کا علم نہیں تھا، لیکن اس نے تحری کر کے نماز کو شروع کیا، دوران نماز ہی رائے بدل گئی تو پھر جائے۔ اگر پھر رائے کسی اور سمت کی طرف بدل جائے پھر بھی پھر جائے۔

یعنی اس شخص کا قبلہ ہی تحری ہے جیسے جیسے تحری بدلے گی، ایسے ایسے اس کا قبلہ بدلتا رہے گا۔

(ماخوذ از درمختار و شامی)

فائدہ: ابھی جو مسائل بیان کئے ہیں ان سے ہی واضح ہو گیا کہ قرآن پاک میں تعارض نہیں، البتہ سمجھنے کی ضرورت ہے۔ اس لئے کہ جب قبلہ معلوم ہو اور قبلہ کی طرف منہ کرنے کی قدرت بھی حاصل ہو تو یہ حکم ہے۔ ﴿فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ﴾ کہ اپنے منہ مسجد حرام یعنی کعبہ کی طرف پھیر لو۔

اور اگر قبلہ معلوم نہیں۔ یا قبلہ کی طرف منہ کرنے کی قدرت نہیں یا سفر کے دوران سواری پر نفل نماز ادا کرنی ہے یا دشمن کے مقابل نماز خوف ادا کرنی ہے تو پھر اس آیۃ کریمہ کا حکم ثابت ہے۔

﴿وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ﴾ اور اللہ کے لئے ہی ہے مشرق اور مغرب تو جس طرف تم منہ پھیرو اسی طرف اللہ کی رحمت متوجہ ہے۔

﴿وَقَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا ۙ سُبْحٰنَهٗ ؕ بَلْ لَّهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ﴾ (آیت ۱۱۶)

۱) اور بولے خدا نے اپنے لئے اولاد رکھی، پاکی ہے اسے، بلکہ اسی کی ملک ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے، سب اس کے حضور گردن ڈالے ہیں۔

۲) اور انہوں نے کہا، بنائی ہے اللہ نے اپنی اولاد، حالانکہ وہ پاک ذات ہے، بلکہ اسی کی ملک ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور زمین میں تمام اسی کے فرمانبردار ہیں۔

پہلی آیۃ ﴿وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ لَيْسَتِ النَّصٰرٰى عَلٰى شَيْءٍ ... الخ﴾ میں یہود اور نصاریٰ اور مشرکین کے جھوٹ کو ذکر کیا گیا۔ اس آیۃ کریمہ میں بھی ان تینوں فرقوں کی کذب بیانی کا ذکر ہے۔ اور ان کا رد کیا گیا۔

شان نزول: ﴿وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ عُزَيْرُ نِ ابْنُ اللّٰهِ وَقَالَتِ النَّصٰرَى الْمَسِيْحُ ابْنُ اللّٰهِ﴾

یہود نے کہا عزیر اللہ کا بیٹا ہے۔ اور نصاریٰ نے کہا مسیح اللہ کا بیٹا ہے۔
اور مشرکین نے کہا ملائکہ اللہ کی بیٹیاں ہیں۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان کے رد کے لئے اس آیۃ کریمہ کو نازل کیا۔

وَقَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا : اور انہوں نے کہا بنائی ہے اللہ نے اپنی اولاد۔
" اتخاذ " کبھی بمعنی صنعت اور عمل کے آتا ہے۔ اس وقت اس کا ایک مفعول ہوتا ہے۔ اور کبھی بمعنی " تصییر " کے آتا ہے اس وقت اس کے دو مفعول ہوتے ہیں۔ اب معنی یہ ہوگا " صیر بعض مخلوقاته ولدا " اس نے اپنی مخلوقات میں سے بعض کو اپنی اولاد بنالیا۔ (ابو السعود)

ان کا قول اولاد کے متعلق کیسے تھا؟

" وهو اتخذ الله ولدا بمعنى ادعى فى حق بعض مخلوقاته انه ولده لا انه ولد حقيقة و كما يستحيل عليه تعالى ان يلد حقيقة فكذا يستحيل عليه التبنى و اتخاذ انولد "

اولاد بنانے کا مقصد یہ ہے کہ انکے کہنے کا یہ مطلب تھا کہ اللہ تعالیٰ کی حقیقی اولاد تو اگرچہ نہیں لیکن اس نے اپنی بعض مخلوق کے متعلق دعویٰ کیا ہے کہ وہ اس کی اولاد ہے۔ لیکن ان کا یہ کہنا بھی باطل تھا کیونکہ جس طرح اللہ تعالیٰ کی حقیقی اولاد محال ہے۔ اسی طرح اسکا کسی کو منہ بولی اولاد بنالینا بھی محال ہے۔
(شیخ زادہ)

سُبْحَانَهٗ : (وہ پاک ہے) سبحان مصدر ہے بمعنی تنزیه کے۔ یعنی اللہ تعالیٰ ان اسباب سے ہی پاک ہے جو اولاد کا تقاضا کرتے ہیں۔

اولاد کے تقاضا کرنے والے اسباب:

" وهو احتياجه الى من يعينه فى حياته " اولاد کا تقاضا کرنے والا ایک سبب یہ ہے کہ زندگی میں اولاد اس کی معاونت کرے۔

" ويقوم مقامه بعد مماته " اور موت کے بعد اس کے قائم مقام ہو۔ یعنی اولاد وارث بنے

اور اس کی جانشین بنے۔

" اما الوحشة تلحقه فيحتاج الى من يستأنس به " یا انسان اکیلے رہنے میں وحشت محسوس کرے تو چاہتا ہے کہ اس کی اولاد ہوتا کہ ان سے انس پکڑے، یعنی اولاد کی محبت اور پیار کی وجہ سے وحشت جاتی رہے۔

" اولدفع عدو يقهره فيحتاج الى من يستنصر فيعينه على قهره " یا اولاد کی محتاجی انسان کو اس لئے ہوتی ہے کہ اسے دشمن کے قہر اور دبدبہ کا سامنا ہوتا ہے تو وہ چاہتا ہے کہ میری اولاد ہو جو میرے دشمنوں سے مقابلہ کرے اور میری معاونت کر کے ان کے قہر کو مندفع کرے۔

" اولشهوات تغلبه وحوائج تمسه فيقضيها به " یا انسان کو ضروریات زندگی کی محتاجی ہو اور کھانے پینے کی اشیاء اور لباس وغیرہ کی ضرورت ہو تو وہ چاہتا ہے کہ اولاد ہو تا کہ میری کفالت کرے۔

ان تمام اسباب میں محتاجی پائی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ محتاجی سے پاک ہے، لہٰذا اولاد سے بھی پاک ہے۔ پھر ان میں بعض اسباب موت کا تقاضا کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ موت سے پاک ہے کہ اسے جانشین کی ضرورت ہو۔ لہٰذا وہ اولاد سے پاک ہے۔

پھر اولاد اپنے والدین کے مشابہ ہوتی ہے۔ اور اپنے والدین کی جنس سے ہوتی ہے۔ رب تعالیٰ تشبیہ اور جنسیت سے جب پاک ہے تو اولاد سے بھی پاک ہے۔ (ماخوذ از شیخ زادہ)

مخلوق اولاد نہیں ہو سکتی:

وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ واجب الوجود ہے۔ اس کے بغیر ہر چیز ممکن لذاتہ ہے۔ جو چیز ممکن لذاتہ ہو وہ حادث ہوتی ہے۔ ہر حادث واجب لذاتہ کی مخلوق ہے۔ " والمخلوق لا يكون ولدا " اور مخلوق اولاد نہیں ہو سکتی۔

واجب لذاتہ کے بغیر تمام چیزیں ممکن لذاتہ کیوں؟

اسلئے کہ اگر دو چیزیں واجب لذاتہ ہو جائیں تو وہ دونوں واجب الوجود ہونے میں مشترک ہوں گی۔ اور دونوں کے لئے کوئی چیز ایسی نہیں ہوگی جو ان کو ایک دوسرے سے ممتاز کرے۔ کیونکہ جو چیز

دونوں کے لئے وجہ اشتراک ہو وہ وجہ امتیاز نہیں بن سکتی۔

تو دونوں کا دو دو قیدوں سے مرکب ہونا لازم آئے گا۔ ہر مرکب چیز اپنے اجزء کی محتاج ہوتی ہے۔تو گویا کہ مرکب کا غیر چیز کا محتاج ہونا لازم آیا، " وکل مفتقر الی غیرہ فھو ممکن لذاتہ "اور ہر وہ جو غیر کا محتاج ہوتا ہے وہ ممکن لذاتہ ہوتا ہے۔

" فکل واحد من الموجودین الواجبین لذاتھما ممکن لذاتہ ، ھذا خلف " اس طرح ہر ایک واجب لذاتہ کا ممکن لذاتہ ہونا لازم آئے گا جو خلاف مفروض ہے۔

تو ثابت ہو گیا کہ واجب لذاتہ ، واجب الوجود صرف رب تعالیٰ ہے۔ باقی تمام کائنات ممکن لذاتہ ، اور اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہے۔لہٰذا مخلوق میں سے کوئی چیز بھی رب تعالیٰ کی اولاد نہیں ہو سکتی۔(از کبیر)

رب تعالیٰ کی اولاد ماننا اسے گالی دینا ہے:

رب تعالیٰ کی اولاد ماننا رب تعالیٰ کی توہین ہے۔ کیونکہ اس کی جنس ماننے سے اس کا محتاج ہونا، اس کا فناء ہو جانا لازم آتا ہے جن سے رب تعالیٰ پاک ہے۔

☆ "عن ابن عباس عن النبی ﷺ قال قال اللہ تعالیٰ کذبنی ابن آدم ولم یکن لہ ذلک وشتمنی ولم یکن لہ ذلک فاما تکذیبہ ایای فیزعم انی لا اقدر ان اعیدہ کما کان واما شتمہ ایای فقولہ ان لی ولدا فسبحانی ان اتخذ صاحبۃ او ولدا ' انفرد بہ البخاری من ھذا الوجہ "

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ رب تعالیٰ کہتا ہے۔ بیشک میرے بندے نے میری تکذیب کی حالانکہ اسے یہ حق نہیں پہنچتا تھا۔اور میرے بندے نے مجھے گالی دی حالانکہ یہ اس کے لائق نہیں تھا۔اس نے میری تکذیب کی کہ وہ یہ کہ اس نے گمان کیا کہ میں اسے لوٹانے پر قادر نہیں، اور اس کا مجھے گالی دینے کا مطلب یہ کہ وہ میری اولاد مانتا ہے۔حالانکہ میری ذات زوجہ اور اولاد سے پاک ہے۔

☆ " وفی الصحیحین عن رسول اللہ ﷺ انہ قال لا احد اصبر علی اذی سمعہ من اللہ انھم یجعلون لہ ولدا وھو یرزقھم و یعافیھم "

بخاری اور مسلم میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کوئی ایک رب تعالیٰ سے زیادہ صابر نہیں

ہوسکتا کہ وہ اذیت ناک باتیں سنتا ہے کہ لوگ اس کی اولاد مانتے ہیں پھر بھی وہ ان کو رزق دیتا ہے۔ اور معاف کرتا ہے۔ (از ابن کثیر)

بَلۡ لَّهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ :

”بلکہ اسی کی مِلک ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور زمین میں“

”بل“ اضراب کے لئے ہے۔ اور ”لہ“ میں ”لام“ تملیک کے لئے ہے۔ یہود و نصاریٰ اور مشرکین نے کہا رب کی اولاد ہے ان کے اس کہنے سے رب تعالیٰ کا مخلوق کے توالد و تناسل میں مشابہ ہونا۔ اپنی اولاد کا مشابہ ہونا اور ہم جنس ہونا۔ اور اولاد کا محتاج ہونا اور فوت ہونا لازم آ رہا تھا۔

”بل“ ذکر کر کے ان کے اس قول کو باطل کر کے یہ ثابت کیا کہ تمہارے اقوال باطل ہیں، ان سے لازم آنے والے عیوب سے وہ پاک ہے، بلکہ تمام آسمانوں اور زمین میں پائی جانی والی مخلوق اس کی ملکیت میں ہے۔ (از روح المعانی)

جب یہ واضح ہوگیا کہ تمام مخلوق اللہ تعالیٰ کی ملکیت میں ہے تو یہ خود بخود واضح ہو جائے گا کہ مخلوق میں کوئی بھی رب تعالیٰ کی اولاد نہیں ہوسکتی کیونکہ ولد مملوک نہیں ہوسکتا، یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی اولاد میں سے کسی مملوک ولد کو خرید لے تو وہ خود بخود آزاد ہو جائے گا۔

رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ﴿ مَا كَانَ اللّٰهُ اَنۡ يَّتَّخِذَ مِنۡ وَّلَدٍ سُبۡحٰنَهٗ اِذَا قَضٰۤى اَمۡرًا فَاِنَّمَا يَقُوۡلُ لَهٗ كُنۡ فَيَكُوۡنُ ﴾ (مریم، آیہ ۳۵) اللہ کو لائق نہیں کسی کو اپنی اولاد ٹھہرائے۔ وہ ذات پاک ہے۔ جب کسی کام کا حکم فرماتا ہے تو یونہی اس سے فرماتا ہے۔ ہو جا وہ فوراً ہو جاتا ہے۔

اس آیۃ کریمہ سے بھی واضح ہے کہ تمام کائنات رب کی مخلوق ہے جو اس کی ملکیت میں ہے۔ لہٰذا مخلوق کا اولاد ہونا ممکن نہیں۔ اور رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔

﴿ وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحۡمٰنُ وَلَدًا ☆ لَقَدۡ جِئۡتُمۡ شَيۡــًٔا اِدًّا ☆ تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرۡنَ مِنۡهُ وَتَنۡشَقُّ الۡاَرۡضُ وَتَخِرُّ الۡجِبَالُ هَدًّا ☆ اَنۡ دَعَوۡا لِلرَّحۡمٰنِ وَلَدًا ☆ وَمَا يَنۡۢبَغِىۡ لِلرَّحۡمٰنِ اَنۡ يَّتَّخِذَ وَلَدًا ☆ اِنۡ كُلُّ مَنۡ فِى السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ اِلَّاۤ اٰتِى الرَّحۡمٰنِ عَبۡدًا ☆ (مریم ۸۸ تا ۹۳)

اور کافر بولے رحمن نے اولاد اختیار کی۔ بے شک تم حد سے بھاری بات لائے۔ قریب ہے کہ آسمان اس سے پھٹ پڑیں اور زمین شق ہو جائے۔ اور پہاڑ گر کر پھٹ جائیں۔ اس پر کہ انہوں نے رحمان کے لئے اولاد بتائی۔ اور رحمن کے لائق نہیں کہ اولاد اختیار کرے۔ آسمانوں اور زمین میں جتنے ہیں سب اس کے حضور بندے ہو کر حاضر ہوں گے۔

ان آیات سے واضح ہوا کہ رب تعالیٰ کی اولاد ماننا عظیم جرم ہے۔ اس سے تو رب تعالیٰ کے عذاب کو دعوت دینا ہے۔ یہ بہتان تو زمین و آسمان اور پہاڑوں کے پھٹ جانے کا سبب ہے۔ رب تعالیٰ کی شان کے ہی لائق نہیں کہ اس کی اولاد مانی جائے۔ اس کی وجہ بہت واضح ہے کہ آسمانوں اور زمین میں پائے جانے والے اس کے عبد ہیں۔ اور عبد کا ولد ہونا ممکن نہیں۔

سوال : یہ آیت جو زیر بحث ہے اس میں ﴿ لَه' مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ﴾ ہے، یعنی اس میں لفظ " ما " ذکر ہے اور سورۃ مریم میں ﴿ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ﴾ مذکور ہے۔ جس میں " من " آیا ہوا ہے۔ وجہ فرق کیا ہے؟

جواب : " مـــن " ذوی العقول کے لئے آتا ہے۔ ذوی العقول کا اطلاق انسانوں، جنوں اور فرشتوں پر ہے۔

چونکہ رب تعالیٰ کی اولاد ماننے والوں نے حضرت عزیر علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور فرشتوں کو اولاد مانا تھا ان کے عقیدہ کا رد کرتے ہوئے سورۃ مریم میں "مـــن" ذکر کر دیا کہ جن کو تم نے اولاد مانا ہے وہ تو اس کی مخلوق اور اس کے بندے اور اس کے مملوک ہیں۔

اور اس زیر بحث آیت میں عموم ذکر کر کے مکمل ہی راستہ بند کر دیا، کہ مخلوق میں کسی کو بھی اگر کوئی رب تعالیٰ کی اولاد مانے تو غلط ہوگا۔ " ما " چونکہ غیر ذو العقول کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ اور بنسبت " من " کے اس میں عموم زیادہ ہوتا ہے۔

اور دوسرا جواب یہ ہے کہ ایک آیۃ میں " من " ذکر کر کے واضح کر دیا کہ کوئی ذوی العقول میں سے رب تعالیٰ کی اولاد نہیں بن سکتا۔ اور دوسری آیت میں " مـــا " ذکر کر کے واضح کر دیا کہ کوئی غیر

ذوالعقول میں سے اس کی اولاد نہیں۔

رب تعالیٰ کی اولاد ماننے کا وبال دنیا میں:

ابن ابی حاتم اور ابن المنذر نے روایت ذکر کی کہ کوئی درخت کانٹے دار نہیں تھا، اور کوئی پھل کڑوا اور بدذائقہ اور بدبودار نہیں تھا۔ اور پانی کہیں شور (نمکین) نہیں تھا۔

لیکن جب بدبخت لوگوں نے اللہ تعالیٰ کی اولاد ماننی شروع کی تو اللہ تعالیٰ نے درختوں کو خاردار اور پھلوں کو کڑوا اور بدذائقہ اور بدبودار بنا دیا۔ اور پانی کو نمکین بنا دیا۔ (از عزیزی)

تنبیہ: مسلمان جب بھی کسی کافر سے سنے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی اولاد کہہ رہا ہے۔ تو اسی وقت "سبحانہ" پڑھے کہ اللہ تعالیٰ تو اولاد سے پاک ہے۔ (از عزیزی)

كُلٌّ لَّهٗ قَانِتُوْنَ : تمام اسی کے فرمانبردار ہیں۔

"قنوت" کا اصل میں معنی ہے۔ "دوام" پھر چار معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔

(۱) ایک تو یہی معنی مراد لیا جاتا ہے یعنی دوام۔

(۲) دوسرا معنی "طاعت" ہے۔ جس طرح رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے۔ "یا مریم اقنتی لربک" اے مریم اپنے رب کی عبادت کرو۔

(۳) تیسرا معنی "طول القیام" (لمبا قیام) جیسا کہ نبی کریم ﷺ سے جب سوال کیا گیا "ای الصلوٰۃ افضل" کون سی نماز افضل ہے؟

تو آپ نے فرمایا "طول القنوت" جس نماز میں لمبا قیام پایا جائے وہ افضل ہے۔

(۴) چوتھا معنی ہے۔ "سکوت" جس طرح زید بن ارقم رضی اللہ عنہ کہتے ہیں۔ "کنا نتکلم فی الصلوٰۃ حتی نزل قولہ تعالیٰ ﴿وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ﴾ فامسکنا عن الکلام" ہم نماز میں کلام کر لیا کرتے تھے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد نازل ہوا۔ ﴿وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ﴾ (اور کھڑے ہو اللہ تعالیٰ کے لئے خاموش ہو کر) تو ہم نے نماز میں کلام کرنا چھوڑ دیا۔

﴿كُلٌّ لَّهٗ قَانِتُوْنَ﴾ ای کل ما فی السموات والارض قانتون مطیعون "تمام

چیزیں جو آسمانوں میں ہیں یا زمین میں رب تعالیٰ کی فرمانبردار ہیں۔ (از کبیر)

" کل " پر تنوین عوض مضاف الیہ ہے۔ یا معنی یہ ہے۔ " کل ما فیھما " آسمانوں اور زمین میں پائی جانے والے ہر چیز اس کی مطیع ہے۔

اور یا معنی یہ ہو۔ " کل من جعلوہ ولدا له مطیعون مقرون بالعبودیة " وہ تمام لوگ جنہوں نے رب تعالیٰ کی اولاد ٹھہرائی ہے وہ بھی اس کے مطیع ہیں، یعنی اپنی عبودیت کا اقرار وہ بھی کرتے ہیں۔

اعتراض : جب پہلے معنی کے لحاظ پر عموم ہے کہ آسمانوں اور زمین میں پائی جانے والی ہر چیز اس کی مطیع ہے، تو آسمانوں اور زمین میں پائی جانے والی چیزیں غیر ذوی العقول کثیر تعداد میں ہیں۔ تو " قانتون " کا ذکر کرنا کیسے صحیح ہے جب کہ واؤ، نون سے جمع ذوی العقول کی آتی ہے۔

جواب : اس جگہ قاعدہ تغلیب استعمال ہوا ہے۔ یعنی ذوی العقول کو مرتبہ اور شرافت کی وجہ سے غیر ذوی العقول پر ترجیح دی گئی ہے۔ (ماخوذ از بیضاوی)

نکتہ : جب قنوت کا اصل معنی دوام ہے۔ تو آیۃ کا معنی ہو گیا۔ ممکنات کا دوام اور ان کی بقاء اللہ تعالیٰ کی قدرت کی وجہ سے ہی ہے۔

" وھذا یقتضی ان العالم حال بقائه واستمرارہ محتاج الیه سبحانه وتعالٰی "

اور یہ چاہتا ہے کہ تمام جہان حالت بقاء اور اپنے دوام و قیام میں ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی ذات مقدسہ کا محتاج ہے۔

" فثبت ان الممکن یقتضی ان لاتنقطع حاجته عن المؤثر لاحال حدوثه ولا حال بقائه "

اسی سے ایک اور مسئلہ حل ہو گیا کہ ممکن ہمیشہ مؤثر حقیقی کا محتاج رہتا ہے۔ اس کی محتاجی اپنے مؤثر حقیقی سے کبھی حالت حدوث یا حالت بقاء میں ختم نہیں ہوگی۔ (از کبیر)

مقام توجہ : مفردات راغب میں ﴿ وَقُومُوا لِلّٰهِ قَانِتِيْنَ ﴾ کے متعلق بیان کیا گیا ہے۔ کہ " قنوت " کا معنی ہے۔ " طاعة مع الخضوع " یعنی فرمانبرداری کے ساتھ عجز کا ظہور بھی ہو " اسی کے مطابق اعلیٰ حضرت کا ترجمہ اس مقام پر ہے۔ " سب اس کے حضور گردن ڈالے ہیں۔"

ابن کثیر نے ذکر کیا ہے۔

" عن ابی سعید الخدری عن رسول اللہ ﷺ قال کل حرف من القرآن یذکر فیه القنوت فهو الطاعة "

حضرت ابو سعید خدری فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قرآن پاک میں جہاں بھی " قنوت " استعمال ہوا ہے۔اس کا معنی طاعت ہے۔طاعت والا معنی سب کو شامل ہے۔خواہ دوام ہو یا قیام۔سکوت ہو یا خضوع۔

فائدہ: ﴿كُلٌّ لَّهٗ قَانِتُوْنَ﴾ یعنی لا یمتنعون عن مشیئته و تکوینه و کلما هذا شانه لا یجانسه الواجب " سب اس کے مطیع ہیں۔یعنی رب تعالیٰ کو اس کی مشیت (چاہنا، ارادہ کرنا) اور اس کی تخلیق و ایجاد سے کوئی روک نہیں سکتا۔تو واضح ہو گیا کہ جس ذات کی یہ شان ہو اس کا کوئی ہم جنس نہیں ہو سکتا۔کیونکہ وہ واجب الوجود ہے۔کوئی ممکن واجب الوجود کے ہم جنس ہو یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔

" قانتون " سے ہی ایک اور مسئلہ سمجھ آ گیا۔" کلما زعموه الها من المسیح و عزیر والملائکة کلهم له قانتون مطیعون مقرون بالعبودیة فیکون الزاما بعد اقامة الحجة "

جن کو ان لوگوں نے معبود سمجھا ہے، یعنی عیسیٰ علیہ السلام اور عزیز علیہ السلام اور ملائکہ کو، وہ تمام تو خود اللہ تعالیٰ کے مطیع ہیں وہ تمام تو اقرار کرتے ہیں کہ معبود صرف رب تعالیٰ ہے ہم تو اس کے عبادت گزار ہیں

تو یہ لوگ ان کو کیسے معبود تسلیم کر رہے ہیں۔دلائل کے قائم کرنے کے بعد یہ ان کو الزامی جواب دیا گیا۔کہ تم جنہیں معبود کہہ رہے ہو وہ تو خود اپنی عبودیت کا اقرار کرتے ہیں۔ (از مظہری)

خلاصہ کلام: " ان الولد لا بد ان یکون من جنس الوالد واللہ تعالیٰ منزہ عن التشبیه والنظیر " بے شک اولاد کے لئے ضروری ہے کہ وہ والد کی جنس ہو۔اللہ تعالیٰ تو تشبیہ اور نظیر (مثل) سے پاک ہے۔تو یقیناً اس کی اولاد کا ہونا بھی محال ہے۔

" وان الولد انما یتخذ للحاجة الیه والانتفاع به عند عجز الوالد و کبره واللہ تعالیٰ منزه عن ذلک "

اولاد کی ضرورت تو والدین کو اس لئے ہوتی ہے کہ بوقت حاجت ان سے نفع حاصل کر لیا جائے۔خصوصاً والدین کو عاجز ہونے کے وقت اور بڑھاپے کے وقت اولاد کی ضرورت ہوتی ہے۔جب اللہ تعالیٰ عجز اور بڑھاپے سے پاک ہے، تو یقیناً اولاد سے بھی پاک ہے۔ (از خازن)

﴿بَدِیْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاِذَا قَضٰٓی اَمْرًا فَاِنَّمَا یَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَیَكُوْنُ﴾ (آیت ۱۱۷)

۱) نیا پیدا کرنے والا آسمان اور زمین کا۔ اور جب کسی بات کا حکم فرمائے تو اس سے یہی فرماتا ہے کہ ہو جا وہ فوراً ہو جاتی ہے۔

۲) بغیر مثال سابق کے پیدا کرنے والا ہے آسمانوں اور زمین کا۔ اور جب فیصلہ فرما لیتا ہے کسی چیز کا، تو یہی کہتا ہے اسے، ''ہو جا'' وہ فوراً ہو جاتی ہے۔

مختصر مطلب: اللہ تعالیٰ بغیر مثال اور بغیر نمونہ کے تمام آسمانوں اور زمینوں کو پیدا کرنے والا ہے وہ زمان و مکان سے پاک ہے، کیونکہ زمان اور مکان کا تعلق زمین و آسمان سے ہی ہے۔ اس نے تمام چیزوں کو پیدا فرمایا، کیونکہ اس آیۃ میں ﴿اَلسَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ سے مراد آسمانوں اور زمینوں کو بمع ان میں پائی جانے والی چیزوں کے پیدا کرنا ہے۔ اور رب تعالیٰ کسی چیز کو پیدا کرنے میں کسی آلہ اور کسی مادہ کا محتاج نہیں۔ وہ صرف یہ فرماتا ہے۔ '' کن '' ہو جا۔ تو وہ چیز فوراً موجود ہو جاتی ہے۔

قدرے تفصیل:

﴿بَدِیْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ " ای مخترعهما و بدعهما لا علی مثال سابق " (مدارک)

'' والابداع اختراع الشئ لا عن مادة ولا فی زمان ویستعمل ذلک فی ایجاده تعالی للمبادی '' (روح المعانی)

'' ابداع '' کا مطلب ہے کسی چیز کو بنانا، معرض وجود میں لانا، نہ اس کی مثال اور نمونہ پہلے موجود ہو۔ نہ ہی اس کا پہلے کوئی مادہ موجود ہو۔ اور نہ ہی اس پر کوئی زمانہ گزرے۔

یعنی '' ابداع '' کا اطلاق مخلوق کی ان چیزوں پر ہوتا ہے جو بغیر مثال سابق اور بغیر نمونہ کے ابتدائی طور پر تخلیق کی جائیں۔

اعلیٰ حضرت کا ترجمہ ''نیا پیدا کرانے والا'' بھی یہی ثابت کر رہا ہے کہ ابتدائی طور پر بغیر نمونہ کے

پیدا کرنے والا۔

اور راقم نے جو علامہ کاظمی رحمہ اللہ کا ترجمہ نقل کیا ہے: ''پیدا کرنے والا بغیر مثال سابق کے'' مطلب اس کا بھی وہی ہے۔ بنسبت اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کے عام فہم ہے۔

علامہ راغب اصفہانی نے بیان فرمایا: '' وهو غير الصنع اذ هو تركيب الصورة بالعنصر ''

ابداع، صنعت کا غیر ہے۔ کیونکہ صنعت میں کسی چیز کو عناصر سے مرکب ہونا ہوتا ہے جو ابداع میں نہیں

تنبیہ: ﴿بَدِيعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ میں وہی معنی معتبر ہے جو ''مدارک'' نے بیان کیا، یا بیضاوی سے وضاحت ان شاء اللہ قریب ہی ذکر کر دی جائے گی۔ ''روح المعانی'' سے ''ابداع'' کا جو معنی ذکر کیا ہے اس کا مطلب مطلقاً ''ابداع'' کا معنی بیان کرنا مقصود تھا کہ ''ابداع'' کے کون کون سے معانی پائے جاتے ہیں۔ راقم کے اس بیان سے یہ اعتراض خود بخود مندفع ہو گیا کہ زمین و آسمان کی تخلیق کے متعلق تو ﴿فی ستة ايام﴾ کا ذکر ہے کہ چھ دنوں میں پیدا کیا۔ تو بغیر زمان کے پیدا کرنے کا کیا مطلب ہوگا؟

تو اس کا جواب واضح ہے کہ اس مقام پر معنی صرف ''بغیر مثال سابق کے پیدا کرنا'' لیا گیا ہے۔ بغیر زمان کے پیدا کرنے والا معنی یہاں مراد نہیں۔

اعتراض: اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں مبدعات بھی، مصنوعات بھی ہیں اور مکونات بھی ہیں۔ تو کس طرح صحیح ہوگا کہ یہ کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ زمین و آسمان اور ان میں پائی جانے والی تمام چیزوں کا مبدع ہے۔

جواب: یہاں قاعدہ تغلیب پر عمل کیا گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ محتاج نہیں کہ کسی چیز کو پیدا کرنے میں مادہ کا محتاج ہو یا زمان کا محتاج ہو، یا مثال یا نمونہ کا محتاج ہو، البتہ وہ اپنی مرضی سے کسی چیز کو مبدع بنا دے یا مصنوع بنا دے یا مکون بنا دے۔ (از روح المعانی)

ان اصطلاحات میں فرق:

'' الابداع وهو اختراع الشئ لا عن شئ ولا فی زمان و يستعمل ذلك فی ايجاده

تعالی المبادی"

کسی چیز کو بغیر مادہ کے، بغیر زمانہ کے اور بغیر نمونہ کے بنانا "ابداع" کہلاتا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی ان موجودات پر بولا جاتا ہے جن کو بغیر نمونہ اور مثال سابق کے ابتدائی طور پر موجود کیا جائے۔ یعنی مبادی مبدعات ہیں۔

" والصنع هو تركيب صورة مع العنصر و يستعمل فی ايجاده تعالى الاجسام "

کسی چیز کی صورت کو عناصر سے بنایا جائے اسے "صنع" کہا جاتا ہے۔ صنعت کا تعلق اللہ تعالیٰ کی موجودات میں سے اجسام کے ساتھ ہے۔ یعنی اجسام مصنوعات ہیں۔

" والتسخير هو سوق الشئ الى ما هو الغرض المقصود منه طوعا او قهرا و يستعمل فی القوى التی اوجدها فی السحاب والامطار والاغذية والادوية "

کسی چیز کو غرض مقصود کی طرف چلانا خواہ وہ خوشی سے اسے قبول کرے یا جبر سے، اسے تسخیر کہا جاتا ہے۔ اس کا استعمال ان قوتوں میں سے ہے جو بادل اور بارشوں اور غذاؤں اور دواؤں میں ایجاد کی گئی ہیں۔

" والتكوين الذی يكون بتغيير وفی زمان غالبا " جس کی ایجاد میں تغیر (تبدیلی) اور زمانہ پایا جائے اسے تکوین کہا جاتا ہے۔ تکوین بھی اگرچہ ایجاد اور انشاء (پیدا کرنے) کے معنی میں استعمال ہے۔ لیکن تکوین میں تدریجاً ایک صورت کو بدل کر دوسری صورت میں لایا جاتا ہے۔ زمین و آسمان کی تخلیق میں جب اس قسم کا تغیر نہیں پایا گیا تو انکی تخلیق کے لئے لفظ تکوین بھی استعمال نہیں ہوا۔

(ماخوذ از بیضاوی و شیخ زادہ)

طلباء کرام توجہ فرمائیں:

بدیع، کی وضاحت میں لفظ "ابداع" ذکر کیا گیا ہے۔ جس سے اس مسئلہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ "بدیع" باب افعال کے اسم فاعل "مبدع" (بکسر الدال) کے معنی میں استعمال ہے۔

خیال رہے کہ اگرچہ اصمعی نے کہا ہے کہ فعیل بمعنی مفعل (اسم فاعل) استعمال نہیں ہوتا، لیکن اسکا یہ کہنا غلط ہے۔ ابن بری نے بیان کیا ہے کہ بہت سے الفاظ اس میں استعمال ہیں۔ انکار کرنا ممکن نہیں

سخین بمعنی مسخن ،قعید بمعنی مقعد، وصی بمعنی موصی، حکیم بمعنی محکم ، بریم بمعنی مبرم ،انیق بمعنی مونق اور بھی اس طرح کے کئی الفاظ استعمال ہیں۔ (از روح المعانی)

جو شخص کوئی ایسا کام کرے جو پہلے نہ پایا جائے تو اسے کہا جاتا ہے۔ "ابدعت" تو نے نیا کام کیا ہے۔

اسی وجہ سنت اور جماعت کے خلاف کام کرنے والے کو بدعتی کہا جاتا ہے۔ کیونکہ دین اسلام میں اس نے صحابہ کرام اور تابعین کے خلاف کام کیا۔

علامہ قرطبی رحمہ اللہ کی وضاحت:

ہر نیا کام جو مخلوق سے صادر ہوا سے دیکھا جائے کہ اس کی اصل شرع میں ہے یا نہیں۔ اگر اس کی اصل شرع میں ہے تو وہ کام محمود ہوگا۔ اور اگر اس کی اصل شرع میں نہیں تو مذموم ہوگا۔

اللہ تعالیٰ نے جن کاموں کو بہتر قرار دیا ان کے عموم میں وہ آتا ہے یا نبی کریم ﷺ نے جن کاموں پر برانگیختہ کیا ہے وہ نئے کام ان میں سے ہی ہیں۔ " فهي في حيز المدح " تو یہ کام مقام مدح میں ہیں۔ اگر چہ ان کی مثال موجود نہ ہی ہو۔ لہذا ہر قسم کی سخاوت (سخاوت ہے ہی نیک کاموں میں مال خرچ کرنا، برائی کی راہ میں مال خرچ کرنا سخاوت نہیں) اور ہر قسم کا نیک کام کرنا " فهذا فعله من الافعال المحمودة " یہ کام افعال محمودہ سے ہیں۔ اگر چہ کام کرنے والے کو پہلے اس کی مثال نہ ملے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول اسکی تائید کرتا ہے۔ " نعمت البدعة هذه " یہ بڑی اچھی بدعت ہے۔ آپ کا یہ ارشاد تراویح کی نماز کو باجماعت ادا کرنے پر تھا۔

" وهي وان كان النبي ﷺ قد صلاها الا انه تركها ولم يحافظ عليها ، ولا جمع الناس عليها ، فمحافظة عمر رضي الله عنه عليها ، وجمع الناس لها ، وندبهم اليها ، بدعة لكنها بدعة محمودة ممدوحة "

اگر چہ تراویح کی نماز نبی کریم ﷺ نے پڑھائی، لیکن پھر آپ نے اسے چھوڑ دیا۔ اور اس پر محافظت نہیں فرمائی۔ اور لوگوں کو جمع ہونے کا حکم نہیں فرمایا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس پر محافظت کرنے کو

جاری فرمایا اور لوگوں کو تراویح کی نماز با جماعت ادا کرنے کا حکم دیا۔ اور لوگوں کو نماز کی طرف بلایا۔ یہ تمام کام بدعت ہیں۔ لیکن قابل تعریف ہیں۔ لہٰذا یہ بدعت حسنہ ہے۔

بدعت قبیحہ کیا ہے؟

" وان كانت فى خلاف ما امر الله به ورسوله فهى فى حيز الذم والانكار "

اگر بدعت ایسی ہو جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے حکم کے خلاف ہو تو وہ مقام مذمت اور انکار میں ہے۔ یعنی وہ بدعت سیئہ، مذمومہ، قبیحہ کہلاتی ہے جو ناجائز ہے۔

" وهو معنى قوله ﷺ فى خطبته و شزالامور محدثاتها و كل بدعة ضلالة "

نبی کریم ﷺ جو اپنے خطبہ کے دوران فرمایا "شرامور وہ ہوں گے جو نئے نئے ہوں گے، اور ہر بدعت گمراہی ہے۔" اس کا یہی مطلب ہے کہ وہ کام قرآن پاک، حدیث پاک اور صحابہ کرام کے ارشادات کے مخالف ہو۔

بدعت کی دو قسموں کا ثبوت حدیث پاک سے:

نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا؛

" من سن فى الاسلام سنة حسنة كان له اجرها واجر من عمل بها من بعده من غير ان ينقص من اجورهم شئ ومن سن فى الاسلام سنة سيئة كان عليه وزرها ووزر من عمل بها من بعده من غير ان ينقص من اوزارهم شئ "

جس شخص نے اسلام میں اچھا طریقہ جاری کیا، اس شخص کو اچھا طریقہ ایجاد کرنے کا اجر ملے گا۔ اور اس کے بعد جو اس پر عمل کریں گے ان کے عمل کا بھی اسے ثواب حاصل ہوگا۔ جبکہ ان کے ثواب میں کوئی کمی نہیں ہوگی۔ اور جس شخص نے اسلام میں برا طریقہ جاری کیا۔ اس شخص کو برا طریقہ جاری کرنے کا گناہ حاصل ہوگا۔ اور اس کے بعد جتنے لوگ اس پر عمل کریں گے ان کا گناہ بھی اسے حاصل ہوگا۔ جب کہ ان کے گناہوں میں کوئی کمی واقع نہیں ہوگی۔

" وهذا اشارة الى ما ابتدع من قبيح و حسن وهو اصل هذا الباب "

اس حدیث سے واضح ہوا کہ کوئی بھی نیا کام ہوگا تو وہ یا تو قبیح ہوگا۔ یا حسن ہوگا۔ یہ حدیث پاک اس مسئلہ میں اصل (قانون اور ضابطہ) ہے۔

" وباللہ العصمة والتوفيق لارب غيره " اللہ تعالیٰ ہی بچانے والا ہے غلو اور تجاوز سے، ہر نئے کام کو حرام کہنا بھی بے وقوفی ہے اور ہر نئے کام کو مطلقاً جائز کہنا بھی نادانی ہے۔

اللہ تعالیٰ ہی توفیق عطاء فرمائے کہ صراط مستقیم سمجھ آئے کہ بدعت حسنہ اور سیئہ کا فرق معلوم ہو جائے۔ رب کائنات سے ہی دعاء ہے۔ کیونکہ اس کے بغیر کوئی رب حقیقی نہیں۔ (ماخوذ از قرطبی)

علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے بیہقی سے اور واضح الفاظ میں نقل فرمایا:

" المحدثات من الامور ضربان احدهما ما احدث مما يخالف كتابا او سنة او اثرا او اجماعا فهذه البدعة والثاني ما احدث من الخير لا خلاف فيه لواحد من هذا او هذه محدثة غير مذمومة " (الحاوی للفتاوی ج ۱ ص ۱۹۲)

نئے امور کی دو قسمیں ہیں ایک ان میں سے وہ ہے جو قرآن پاک یا حدیث پاک یا آثار صحابہ یا اجماع امت کے مخالف ہو، یہ بدعت گمراہی ہے یعنی ناجائز ہے۔ اس سے اجتناب ضروری ہے۔

دوسری قسم ان میں سے یہ ہے کہ کوئی نیا کام ہو لیکن نیکی کا کام ہو، اس کے جائز ہونے میں سے کسی کا کوئی اختلاف نہ ہو۔ بلکہ بالاتفاق جائز ہو، وہ کام مستحسن ہوگا۔ اس پر عمل کرنا باعث ثواب ہوگا۔ اور یہ بدعت کسی طرح بھی بری نہیں۔

اقسام بدعات: کچھ تفصیل سے بدعت کی پانچ قسمیں بن جاتی ہیں۔

واجب: جس طرح قرآن پاک اور حدیث پاک کو سمجھنے کے لئے علم نحو کا پڑھنا۔

حرام: اللہ تعالیٰ کا بندوں کی طرح جسم ثابت کرنا، اسی طرح بندے کو پتھر کی طرح غیر مختار سمجھنا وغیرہ۔

مستحب: دینی مدارس قائم کرنا، سرائے بنانا اور ہر بہتر کام جو نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام کے زمانہ میں نہیں تھا۔

مکروہ: ہر ایسا کام جس کے کرنے سے سنت کا ترک لازم آئے تو اگر سنت غیر مؤکدہ کا ترک لازم آئے تو مکروہ تنزیہی اور اگر سنت مؤکدہ کا ترک لازم آئے تو مکروہ تحریمی۔

مباح: جیسے صبح کی نماز یا عصر کے بعد مصافحہ کرنا لیکن بغیر سلام کے۔ اگر سلام بھی کرے تو مستحب ہوگا۔ (از حاشیہ مشکوۃ باب الاعتصام بالكتاب والسنة)

وَاِذَا قَضٰۤی اَمۡرًا فَاِنَّمَا یَقُوۡلُ لَہٗ کُنۡ فَیَکُوۡنُ :

اور جب فیصلہ فرمالیتا ہے کسی چیز کا، تو یہی کہتا ہے اسے ''ہوجا'' وہ فوراً ہوجاتی ہے۔

قضاء کے مختلف معانی استعمال ہیں:

۱) کبھی خلق (پیدا کرنے) کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ﴿فَقَضٰهُنَّ سَبۡعَ سَمٰوٰتٍ فِیۡ یَوۡمَیۡنِ﴾ اس نے دو دن میں سات آسمان تخلیق فرمائے۔

۲) قضاء بمعنی اعلام (بتانا، علم عطاء کرنا) جس طرح رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿وَقَضَیۡنَاۤ اِلٰی بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ فِی الۡکِتٰبِ﴾ ہم نے بتایا بنی اسرائیل کو کتاب میں۔

۳) قضاء بمعنی امر، جیسا کہ رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿وَقَضٰی رَبُّکَ اَلَّا تَعۡبُدُوۡۤا اِلَّاۤ اِیَّاہُ﴾ اور آپ کے رب نے حکم دیا کہ تم عبادت نہ کرو سوائے اس کے۔

۴) قضاء بمعنی الزام اور احکام جاری کرنا، اسی معنی کے لحاظ سے حاکم قاضی کہا جاتا ہے۔

۵) قضاء بمعنی حق کو پورا کرنا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ﴿فَلَمَّا قَضٰی مُوۡسَی الۡاَجَلَ﴾ جب موسیٰ نے حق (وعدہ) پورا کرلیا۔

۶) ارادہ کرنا، فیصلہ کرنا، جیسا کہ اسی آیۃ میں ﴿وَاِذَا قَضٰۤی اَمۡرًا﴾ اور جب وہ فیصلہ فرمالیتا ہے۔ اور جب وہ کسی چیز کی تخلیق کا ارادہ فرمالیتا ہے۔

۷) قضی بمعنی قدر، اس کی تقدیر میں آگیا۔ (۸) قضی بمعنی امضی جاری کردیا۔

خیال رہے آخری دو معنی اگر یہاں مراد ہوں تو اہل سنت کے نزدیک معنی یہ ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نے ازل میں مقدر فرمادیا۔ اور جس چیز کے جاری کرنے کا فیصلہ فرمالیا۔

لیکن معتزلہ کے نزدیک ایجاد اور تخلیق کے وقت ہی تقدیر اور امضاء مراد ہوتے ہیں۔
(از قرطبی)

﴿وَاِذَا قَضٰۤی اَمۡرًا﴾ '' ای اراد شیئا '' اس مقام پر '' امرا '' '' شیئا '' کے معنی میں ہے۔ یعنی جب اللہ تعالیٰ کسی چیز کی تخلیق کا ارادہ فرمالیتا ہے۔ اور فیصلہ فرمالیتا ہے۔ (بیضاوی)

قرآن پاک میں ''امر'' کئی معانی میں استعمال ہوا ہے:

۱) امر کا معنی دین، جیسا کہ '' حتی جاء الحق و ظهر امر الله '' میں استعمال ہے۔(یہاں تک کہ حق آ گیا اور اللہ کا دین یعنی اسلام غالب ہو گیا)۔

۲) امر کا معنی قول۔جیسا کہ '' فاذا جاء امرنا ''(جب ہمارا قول آ گیا)۔

۳) امر بمعنی عذاب۔جیسا کہ '' لما قضی الامر '' جب عذاب کا فیصلہ کر لیا گیا۔

۴) مذکر ''امر'' مراد حضرت عیسیٰ علیہ السلام '' اذا قضی امرا '' جب عیسیٰ کا فیصلہ کر لیا گیا، یعنی اللہ تعالیٰ کے علم میں تھا کہ آپ بغیر باپ کے پیدا ہوں گے۔

۵) امر سے مراد بدر میں قتل '' فاذا جاء امر الله '' جب اللہ کا امر (یعنی بدر میں کافروں کے قتل کئے جانے کا فیصلہ) آ گیا۔

۶) فتح مکہ۔﴿فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰی یَاْتِیَ اللّٰہُ بِاَمْرِہٖ﴾ انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ مکہ کو فتح فرما دے۔

۷) قریظہ کا قتل کیا جانا اور بنی نضیر کا جلاوطن کیا جانا۔﴿فَاعْفُوْا وَاصْفَحُوْا حَتّٰی یَاْتِیَ اللّٰہُ بِاَمْرِہٖ﴾ معاف کرو، اور درگزر کرو یہاں تک کہ قریظہ کو قتل کر دیا جائے اور بنی نضیر کو جلاوطن کر دیا جائے۔

۸) اَتٰی اَمْرُ اللّٰہِ (اللہ کا حکم آ جائے) یعنی قیامت آ جائے۔اس مقام میں امر بمعنی قیامت استعمال ہے۔

۹) امر بمعنی قضاء، (یُدَبِّرُ الْاَمْرَ) یعنی القضاء، وہ قضاء کی تدبیر فرماتا ہے۔

۱۰) امر بمعنی وحی، ﴿یُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَی الْاَرْضِ﴾ یعنی وحی نازل فرماتا ہے آسمان سے زمین کی طرف۔

۱۱) امر سے مراد امر الخلق ﴿اَلَآ اِلَی اللّٰہِ تَصِیْرُ الْاُمُوْرُ﴾ یعنی امور الخلائق، خبردار مخلوق کے امور اللہ کی طرف ہی لوٹتے ہیں۔

۱۲) امر سے مراد امداد۔﴿یَقُوْلُوْنَ هَلْ لَّنَا مِنَ الْاَمْرِ مِنْ شَیْءٍ﴾ وہ کہتے کیا ہمارے لئے امداد آئے گی۔﴿قُلْ اِنَّ الْاَمْرَ کُلَّهٗ لِلّٰہِ﴾ آپ فرما دیں بے شک امداد ساری کی ساری

اللہ کے پاس ہے۔

۱۳) امر سے مراد گناہ۔ ﴿فَذَاقَتْ وَبَالَ اَمْرِهَا﴾ (نافرمان بستیوں نے) اپنے عذاب کا وبال چکھا۔

۱۴) امر سے مراد شان اور فعل۔ ﴿وما امر فرعون برشید﴾ فرعون کا کوئی کام درست نہیں۔

(از قرطبی)

عقیدہ: مضمون آیت کے بارے میں جو ہمارا اعتقاد ہونا چاہئے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ وجود میں آنے والے تمام معلومات کا اللہ تعالیٰ ازل سے آمر ہے۔ مقدورات اور معلومات کے متأخر ہونے کے باوجود وہ ازل سے ہر مقدور کا قادر اور ہر معلوم کا عالم ہے۔ اس آیۃ سے جو زمانہ استقبال پر دلالت مفہوم ہوتی ہے وہ مامورات کے اعتبار سے ہے، کیونکہ لفظ کن صفت تکوین کا تقاضا کرتا ہے۔ صفت تکوین قدیم ہے جو اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ قائم ہے۔

مسئلہ: روح المعانی میں ہے محققین سادات حنفیہ اس طرف گئے ہیں کہ یہاں ''کن'' امر کا صیغہ ہے۔ حقیقت پر محمول ہے وہ فرماتے ہیں کہ تکوین اشیاء میں سنت الٰہیہ اسی طرف جاری ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی تکوین کلمہ ''کن'' سے فرماتا ہے۔ اگرچہ اس کلمہ کے بغیر بھی اشیاء کی تکوین ممتنع نہیں۔

اور ﴿اَنْ یَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَیَكُوْنُ﴾ سے کلام ازلی مراد ہے، اس لئے کہ کلام لفظی حادث ہے جس کا قیام اللہ تعالیٰ کے ساتھ ممکن نہیں۔ (روح المعانی ص ۲۳۶ ب ۱)

اعتراض: جب امر (کن) سے حقیقت امر مراد ہے تو کن کا مخاطب معدوم کو قرار دیں گے یا موجود کو، معدوم خطاب کا اہل نہیں اور موجود کو خطاب فرمانا ایجاد موجود ہے، جو تحصیل حاصل ہونے کی وجہ سے ممکن نہیں۔

جواب: جس چیز کو اللہ تعالیٰ پیدا فرمانا چاہتا ہے وہ خارج میں موجود نہیں ہوتی۔ لیکن علم الٰہی میں اس کی صورت موجود ہوتی ہے۔ وہی صورت علمیہ امر کن کا مخاطب ہے۔

علامہ آلوسی نے آگے چل کر فرمایا کہ معتزلہ اور کثیر اہل سنت کا مذہب یہ ہے کہ یہاں ﴿كُنْ فَیَكُوْنُ﴾ سے حقیقت امر اور اس کا بجالانا مراد نہیں، بلکہ جس چیز کے ساتھ ارادۂ الٰہیہ متعلق ہو جائے بلا تاخیر اس کے حصول کے لئے بطور تمثیل یہ کلام وارد ہے، کہ جس طرح کوئی مامور اور مطیع اپنے آمر اور

مطاع کا حکم بلاتوقف بجالائے اسی طرح مرادالٰہی بغیر کسی مہلت اور توقف کے حاصل ہو جاتی ہے۔

سوال : اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کے متعلق فرمایا ﴿خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ﴾ (کہ اللہ نے آدم علیہ السلام کو مٹی سے پیدا کیا۔ پھران سے کہا" کن " (ہوجا) "فیکون" تووہ ہوگئے) جب ہر چیز کی پیدائش امرکن سے ہوتی ہے پھرآدم علیہ السلام کومٹی سے پیدا کرنے کے بعد "کن" فرمانا، اور "کن" کےفوراًبعدان کا ہوجانا کیونکر قابل فہم ہوسکتا ہے؟ جب کہ "کن" بعد میں فرمایا گیا اور وہ پیدا پہلے ہوچکے تھے۔

اس اعتراض کی دارومداراس پر ہے کہ "خلق" کامعنی پیدا کرنا ہے۔اور "ثم" تراخی کے لئے آتا ہے۔اب مفہوم یہ ہے کہ آدم علیہ السلام کومٹی سے پیدا کیا۔اورمٹی سے پیدا کرنے کے بعد کہا "کن" ہوجا۔تو یہ کس طرح درست ہے؟

جواب: اس آیۃ میں "خلق" بمعنی "قدّر" ہے۔یعنی اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کے جسم کومٹی سے پیدا کرنا مقدر فرمادیا، پھران سے "کن" کہاتووہ ہوگئے۔ (مدارک ج ۱ ص ۲۳۵)

ایک اشکال کا حل: اگر یہ اشکال وارد کیا جائے کہ اجسام اور مادیات کی تکوین بسرعت وسہولت نہیں ہوتی۔زمین وآسمان کی پیدائش چھ دن میں ہوئی۔انسانی تخلیق مٹی کے ست (مٹی کی اصل خالص) سے شروع ہوکر ﴿ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا...... الخ﴾ نطفہ، علقہ، مضغہ، عظام، لحم (نطفہ، منجمد خون، لوتھڑا، ہڈیاں، گوشت) کے مراحل سے گزرتی ہوئی نو، دس ماہ کی مدت میں مکمل ہوتی ہے۔تمام حیوانات ونباتات کا یہی حال ہے، کہ عرصہ دراز میں یہ اشیاء معرض وجود میں آتی ہیں۔تدریج وتاخیر بظاہر ﴿كُنْ فَيَكُوْنُ﴾ کے خلاف ہے۔تواس کا حل یہ ہے کہ مشیت الٰہیہ کے مطابق اشیاء کا وجود میں آنا "کن فیکون" کے معنی ہیں۔لہٰذا جہاں مشیت الٰہیہ کاتعلق تدریج وتاخیر سے ہو وہاں تدریج و تاخیر ہی ﴿كُنْ فَيَكُوْنُ﴾ ہے۔

جس درجہ اور لحمہ میں کسی چیز کے وجود میں آنے سے مشیت الٰہیہ کا تعلق ہو، اگر اس سے ذرا پہلے یا بعد وہ چیز وجود میں آئے تو مشیت الٰہیہ کے خلاف ہوگا۔اور یقیناً یہ ﴿كُنْ فَيَكُوْنُ﴾ کے منافی قرار پائے گا۔لہٰذا اسے ﴿كُنْ فَيَكُوْنُ﴾ کے خلاف سمجھنا درست نہیں۔

علاوہ ازیں یہاں اس حقیقت کو بھی ملحوظ رکھ لیا جائے کہ تاخیر و تدریج کا ہر مرحلہ بیشمار تکوینات کا نتیجہ ہے۔

غور فرمائیے اگر آپ چراغ میں سرِ شام تیل ڈال کر اسے روشن کر دیں اور اس کی لو کو بغور دیکھتے رہیں۔ وہ آپ کو بالکل متصل ایک حال پر نظر آتی رہے گی۔ جب چراغ بجھنے لگے تو آپ دیکھیں گے کہ تیل کا آخری قطرہ ختم ہوتے ہی چراغ گل ہو جائے گا، دراصل یہ اس بات کا مشاہدہ ہے کہ تیل کا ہر قطرہ جو ہزارہا اجزاء پر مشتمل ہے نہایت سرعت کے ساتھ چراغ کی لو کی صورت میں آپ کے سامنے موجود ہے، جسے دیکھ کر عارف بے ساختہ بول اٹھتا ہے۔

کشتگانِ خنجرِ تسلیم را ہر زماں از غیب جانِ دیگر است

پس سمجھ لیجئے کہ اسی طرح تدریجی اشیاء کا وجود بھی لاتعداد تکوینات پر مشتمل ہے، یہ تدریجی نظام بے شمار حکمتوں پر مبنی ہے۔ جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں، مختصراً اتنا عرض کیے دیتا ہوں کہ اگر عالم مادیات میں یہ تدریجی نظام نہ ہوتا تو اسباب مادیہ بیکار ہو کر رہ جاتے۔ حالانکہ ہمارے رب نے کوئی چیز بیکار نہیں بنائی ﴿رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا﴾ (التبیان للکاظمی رحمہ اللہ) یہاں سے ایک اور سوال کا حل بھی سمجھ آ گیا۔ وہ سوال یہ ہے کہ جب یہود و نصاریٰ کے لوگ عقلاء تھے، ان کو معلوم تھا کہ انسان کی پیدائش میں توالد و تناسل کو دخل ہے تو ان کا عزیر علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام کو رب تعالیٰ کی اولاد تسلیم کرنے کا کیا مطلب ہے۔

تو اس کا جواب یہ ہے۔" وكان السبب في هذه الضلالة انه ورد اطلاق الاب على الله تعالى في الشرائع المتقدمة باعتبار انه السبب الاول وكثر هذا الاطلاق في الانجيل يوحنا ثم ظلت الجهلة ان المراد به معنى الولادة فاعتقدوا ذلك تقليدا وكفروا " کہ ان کی گمراہی کا سبب اصل میں یہ تھا کہ پہلی شریعتوں میں اللہ تعالیٰ پر "اب" کا اطلاق مجازی طور پر جائز تھا، کیونکہ مطلب یہ لیا جاتا تھا کہ وہ تخلیق کا سبب اول ہے۔ (جیسا کہ باپ سبب ثانی ہے) انجیل یوحنا میں اس کا استعمال کثیر طور پر ہوا پھر جاہلوں نے اس کا حقیقی معنی لے کر رب تعالیٰ پر جب "اب" بولنا شروع کر لیا تو اس کی اولاد بھی مان لی اس طرح وہ کافر ہو گئے۔ (از روح المعانی)

﴿وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ لَوْ لَا يُكَلِّمُنَا اللّٰهُ اَوْ تَأْتِيْنَآ اٰيَةٌ ؕ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّثْلَ قَوْلِهِمْ ؕ تَشَابَهَتْ قُلُوْبُهُمْ قَدْ بَيَّنَّا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ﴾ (آیت ۱۱۸)

۱) اور جاہل بولے اللہ ہم سے کیوں نہیں کلام کرتا ، یا ہمیں کوئی نشانی ملے ،ان سے اگلوں نے بھی ایسی ہی کہی ان کی سی بات ان کے ،ان کے دل ایک سے ہیں ، بے شک ہم نے نشانیاں کھول دیں یقین والوں کے لئے۔

۲) اور کہا ان لوگوں نے جو علم نہیں رکھتے ، کیوں نہیں کلام کرتا ہمارے ساتھ اللہ یا آجاتی ہمارے پاس کوئی نشانی، پہلے تھے ان کے قول کی طرح ،مشابہ ہیں ان کے دل تحقیق بیان کیں ہم نے نشانیاں اس قوم کے لئے جو یقین رکھتے ہیں۔

مختصر مطلب: یہود و نصاریٰ اور مشرکین کہنے لگے رب تعالیٰ ہمارے ساتھ کلام کیوں نہیں کرتا، یعنی ان کا مقصد یہ تھا کہ نبی بھیجنے کے بغیر براہ راست ہمیں کہتا یہ کام کرو، یہ نہ کرو، یا ہمارے ساتھ کلام کر کے ہمیں بتاتا ''محمد'' میرے نبی ہیں ،ان پر ایمان لانا۔

یا ہمارے پاس کوئی ایسی نشانی آجاتی جس سے ہم یقین کر لیتے کہ ہاں واقعی یہ نبی ہیں۔ ہمیں ایمان لانا چاہئے۔ رب تعالیٰ نے ان کے بیہودہ سوال کو رد کرتے ہوئے اور نبی کریم ﷺ کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا کہ ان لوگوں کے اس طرح کے کلام سے آپ دل تنگی محسوس نہ کریں، ان سے پہلے لوگ بھی انبیاء کرام سے ایسے ہی سوال کرتے رہے۔ اور انبیاء کرام صبر سے کام لیتے رہے۔

یہ لوگ اور پہلے لوگ اپنی کج روی اور ایمان نہ لانے اور طرح طرح کے سوال کرنے میں دلوں کے لحاظ پر ایک دوسرے کے مشابہ ہیں۔ اگر یہ یقین لانے کا ارادہ رکھتے تو ہم نے کتنی ہی واضح نشانیاں بیان کر دی ہیں تو یہ تسلیم کر لیتے۔ لیکن انہوں نے جب نہ ماننے کا فیصلہ ہی کر لیا ہے تو اس کا کوئی علاج نہیں۔

ماقبل سے تعلق بھی واضح ہو گیا کہ پہلے انہوں نے توحید باری تعالیٰ کے خلاف رب تعالیٰ کی اولاد

ٹھہرائی، اس کا ذکر کیا گیا، اب اس آیت میں ان کا نبوت کے خلاف عقیدہ رکھنا اور اس پر معترض ہونا کہ ہمیں کیا معلوم ہے یہ نبی ہیں، ان کی اس کج روی کا ذکر کیا جا رہا ہے۔

شان نزول: اس آیۃ کریمہ میں شان نزول کی تین وجوہ ہیں۔ یعنی تین فرقوں کے مختلف اوقات میں سوالات کے بعد آیۃ کریمہ نازل ہوئی۔ جو تمام واقعات مجموعی طور پر اس آیۃ کریمہ کا شان نزول ہیں۔

۱) مشرکین نے نبی کریم ﷺ سے کہا" **لن نؤمن لک حتی تفجرلنا من الارض ینبوعا** "
ہم ہرگز تم پر ایمان نہیں، یہاں تک تم ہمارے لئے زمین میں چشمے جاری کردو۔

اسی طرح مشرکین نے ہی کہا" **لو لا انزل علینا الملائکة او نری ربنا** " ہماری طرف فرشتے کیوں نہیں نازل کئے جاتے یا ہم اپنے رب کو دیکھ لیتے۔

اسی طرح ان مشرکین نے ہی یہ کہا﴿ لَوْ لَا يُكَلِّمُنَا اللّٰهُ اَوْ تَأْتِيْنَآ اٰيَةٌ ﴾ ہمارے ساتھ رب کلام کیوں نہیں کرتا یا ہمارے پاس کوئی نشانی آ جائے۔

ان مشرکین کے اس قسم کے سوالات اور ایمان نہ لانے کے لئے بہانے تراشنے پر اور ان مطالبات پر آیۃ کریمہ نازل ہوئی۔

اس قول کو قتادہ، سدی اور حسن بصری اور کئی حضرات نے بیان کیا، زیادہ مفسرین نے بھی یہی بیان کیا۔

۲) اور اس آیۃ کریمہ کے نزول کے متعلق یہ قول ہے کہ یہود نے یہ کہا تھا۔ اس پر دلیل حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔

" **ان رافع بن خزیمة من الیهود قال لرسول الله ﷺ ان کنت رسولا من عندالله تعالیٰ فقل لله یکلمنا حتی نسمع کلامه** "

بے شک رافع بن خزیمہ یہودی نے نبی کریم ﷺ سے کہا" اگر تم اللہ کی طرف سے رسول ہو، تو اللہ تعالیٰ کو کہو، وہ ہمارے ساتھ کلام کرے ہم اس کے کلام کو سنیں۔"

تو ہم آپ پر ایمان لے آئیں گے۔ اس کے کہنے پر یہ آیۃ کریمہ نازل ہوئی۔ یہود بھی اس قسم

کے سوال کرتے رہتے تھے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ یَسْئَلُکَ اَھْلُ الْکِتٰبِ اَنْ تُنَزِّلَ عَلَیْھِمْ کِتٰبًا مِّنَ السَّمَآءِ فَقَدْ سَاَلُوْا مُوْسٰۤی اَکْبَرَ مِنْ ذٰلِکَ ﴾

آپ سے سوال کرتے ہیں اہل کتاب کہ نازل کی جاتی ان پر کتاب آسمان سے، تحقیق انہوں نے موسیٰ سے اس سے بھی بڑا سوال کیا تھا۔ یعنی وہ کہتے تھے کہ ہمارے سامنے ایک مرتبہ ہی آسمانوں سے کتاب نازل ہوتو ہم ایمان لائیں گے۔ رب تعالیٰ نے ان کی مذمت بیان فرمائی کہ ایمان لانا توان کا مقصد ہی نہیں۔ ان کا کام تو صرف بہانے تراشنا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام پر کتاب ایک مرتبہ ہی نازل ہوئی اگر ان کے آباء واجداد ایمان لانا چاہتے تو ایک مرتبہ ہی تمام کتاب کے نازل ہونے پر ایمان لے آتے، لیکن وہ کہنے لگے ہم تو اس وقت تک ہرگز ایمان نہیں لائیں گے جب تک رب تعالیٰ کو ظاہر طور نہ دیکھ لیں۔

۴) حضرت مجاہد کا قول یہ ہے کہ سوال نصاریٰ نے کیا تھا۔ ان کے سوال پر یہ آیت نازل ہوئی۔

(از روح المعانی)

صحیح یہی ہے کہ مشرکین نے سوال کیا اور یہود نے بھی یہ ہی سوال کیا اور نصرانیوں نے بھی سوال کیا تو آیۃ کریمہ کا نزول ہوا۔ لہٰذا تمام واقعات مجموعی طور پر اس آیۃ کریمہ کا شان نزول ہیں۔

وَقَالَ الَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ : (اور ان لوگوں نے کہا جو علم نہیں رکھتے) جب اس سے مراد مشرکین ہوں تو ان کو بے علم، جاہل کہنے کی وجہ حقیقی طور پر پائی گئی ہے۔ " **لانهم لم يكن لهم كتاب ولاهم اتباع نبوة** " کیونکہ ان کے پاس نہ کتاب تھی اور نہ ہی وہ کسی نبی کے متبعین تھے۔

اور جب اس سے مراد یہود یا نصاریٰ ہوں تو ان کو بے علم اور جاہل کیوں کہا گیا؟ حالانکہ وہ کتاب کا علم رکھتے تھے اور یہود موسیٰ علیہ السلام اور نصاریٰ عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان رکھتے تھے۔

ان کو بے علم کہنے کی وجہ یہ تھی " **لتجاهلهم او لعدم علمهم بمقتضاه** " کہ وہ علم رکھنے کے باوجود جاہل بنے بیٹھے تھے۔ اور صحیح یہ ہے کہ وہ علم کے تقاضا کے مطابق جب عمل نہیں کررہے تھے تو وہ جاہل ہی تھے۔ کیونکہ ان دونوں فرقوں کے علم کے مطابق اور ان کی کتابوں کے تقاضا کے مطابق چاہئے یہ تھا کہ وہ نبی کریم ﷺ پر ایمان لائیں اور قرآن پاک کو اللہ تعالیٰ کی سچی کتاب تسلیم کریں۔ جب انہوں

نے یہ نہ کیا تو جاہل ہی تھے۔

لَوْلَا يُكَلِّمُنَا اللّٰهُ : (ہمارے ساتھ اللہ کلام کیوں نہیں کرتا) یعنی وہ ہمارے ساتھ کلام کیوں نہیں کرتا کہ بے شک تم اس کے رسول ہو۔ یا تو وہ ہمارے ساتھ اس طرح کلام کرے جیسے ملائکہ سے کرتا ہے۔ اور یا وہ ہماری طرف وحی نازل کرے۔

"وهو استكبار منهم يعد انفسهم الخبيثة كالملائكة والانبياء المقدسين عليهم الصلوة والسلام"

یہ ان کا کلام تکبر پر مبنی تھا کہ وہ اپنے خبیث نفسوں کو فرشتوں اور انبیاء کرام کی مقدس ذاتوں کی طرح سمجھنے لگے یہ بات وہ نہ سمجھ سکے کہ ہم میں یہ اہلیت ہی نہیں کہ رب ہمارے ساتھ کلام کرے۔ (از روح المعانی)

طلباء کرام توجہ فرمائیں: "لو لا" کی دو قسمیں ہیں۔ ایک "لو لا" تحضیضیہ ہے، اور ایک "لولا" امتناعیہ ہے۔ "لو لا" تحضیضیہ کے بعد فعل ظاہر ہوتا ہے یا مقدر ہوتا ہے۔ اگر "لو لا" تحضیضیہ ماضی پر داخل ہو تو شرم دلانی مقصود ہوتی "**لو لا فعلت هكذا**" تم نے ایسے کیوں نہیں کیا؟

اور اگر مضارع پر داخل ہو تو ایک کام پر برانگیختہ (ابھارنا) کرنا مقصود ہوتا ہے۔ جیسے "**لو لا تفعل هكذا**" تم ایسا کیوں نہیں کرتے۔ یعنی تمہیں اس طرح کرنا چاہئے۔

اور "لو لا" امتناعیہ کے بعد فعل نہیں ہوتا۔ بلکہ اسم ہوتا ہے۔ اس میں ایک چیز کا وجود دوسرے کے امتناع پر دلالت کرتا ہے۔ جیسا کہ کہا جائے "**لو لا زيد لهلكت**" اگر زید نہ ہوتا تو میں ہلاک ہو جاتا۔ یعنی وجود زید کی وجہ سے متکلم کی ہلاکت نہیں پائی گئی۔

اَوْ تَاْتِيْنَا آيَةٌ : (یا آ جاتی ہمارے پاس کوئی نشانی) یعنی ہمیں کوئی نشانی مل جاتی جو تمہاری صداقت پر دلالت کرتی۔

خیال رہے ان کا یہ کہنا کہ "ہمارے ساتھ اللہ کلام کیوں نہیں کرتا" تکبر کی وجہ سے تھا۔ اور ان کا یہ کہنا کہ "یا ہمارے پاس کوئی نشانی آ جاتی" انکار کی وجہ سے تھا۔

انکار کی دو وجہ تھیں۔ ایک تو یہ کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے آئی ہوئی نشانیوں کو معاذ اللہ

گھٹیا سمجھا۔ اور دوسری وجہ یہ تھی کہ عناد کی وجہ سے انہوں نے نشانیوں کا سرے سے انکار ہی کر دیا کہ نہیں ہمارے پاس تو کوئی نشانی آئی ہی نہیں۔ (بیضاوی و شیخ زادہ)

ان کی نادانی پر تعجب:

" والعجب عظموا انفسهم وهی احقر الاشیاء واستهانوا بآیات الله وهی اعظمها "

ان لوگوں کی حماقت اور نادانی پر تعجب ہے کہ انہوں نے اپنے نفسوں کو عظیم سمجھا جو حقیقت میں گھٹیا تھے (کیونکہ کفار تو جانوروں سے بھی زیادہ گھٹیا ہیں) اور اللہ تعالیٰ کی نشانیاں جو اصل میں عظمت رکھتی ہیں ان کو انہوں نے گھٹیا سمجھا۔ (شیخ زادہ)

كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّثْلَ قَوْلِهِمْ :

مفہوم یہ ہے کہ ان لوگوں سے پہلے لوگوں نے بھی ان کے قول کی طرح ہی کہا۔

یعنی ان لوگوں نے بھی پہلے لوگوں کی طرح کلام کر کے وہی مقاصد حاصل کرنے کی کوشش کی جو ان کے مقاصد تھے کیونکہ ان کا اس قسم کا کلام عناد، سرکشی، اپنی دنیاوی خواہشات پر مبنی تھا۔ یہ سیدھی راہ کو حاصل کرنے کا ارادہ ہی نہیں رکھتے تھے۔ (از شیخ زادہ)

تَشَابَهَتْ قُلُوْبُهُمْ : (ان کے دل مشابہ ہوگئے) یہ ان لوگوں اور پہلے لوگوں کے دل ایک دوسرے کے مشابہ ہوگئے۔ وجہ مشابہت کیا ہے؟ ﴿ تَشَابَهَتْ قُلُوْبُهُمْ ﴾ قلوب هؤلاء ومن قبلهم فی العمی والعناد "

ان لوگوں اور پہلے لوگوں کے دل اندھاپن اور عناد اور قساوت میں ایک دوسرے کے مشابہ ہو گئے۔

نکتہ : بظاہر عقل کا تقاضا یہ ہے کہ جب ان لوگوں نے پہلے لوگوں کی طرح سوال کیا، ان کی طرح مطالبہ کیا، تو کہنا یہ چاہئے تھا کہ ان کی زبانیں مشابہ ہوگئیں۔ ان کا کلام مشابہ ہوگیا۔ لیکن کہا یہ گیا ہے کہ ان کے دل مشابہ ہو گئے ہیں اس کی وجہ کیا ہے؟ اس کی وجہ کیا خوب بیان کی گئی ہے۔

" فان الالسنة ترجمان القلوب والقلب متی استحکم فیه الکفر والقسوة والعمی والسفه والعناد لایجری علی اللسان الا ما یبتنی علی التعلل والتباعد عن الایمان "

بے شک ہر شخص کی زبان اس کے دل کی ترجمان ہے۔ جس شخص کے دل میں کفر مستحکم ہوگا، اور دل میں قساوت پائی جائے گی، اور دل میں اندھا پن پایا جائے گا، اور دل میں بے وقوفی پائی جائے گی، اور دل میں عناد پایا جائے گا تو یقیناً اس کی زبان پر وہی کلمات جاری ہوں گے جو ایمان سے دور کرنے کا ذریعہ ہوں گے۔ (از شیخ زادہ)

قَدْ بَيَّنَّا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ :

تحقیق بیان کیں نشانیاں ہم نے اس قوم کے لئے جو یقین رکھتے ہیں۔

بظاہر یہاں یہ وہم ہوتا ہے کہ نشانیاں تو اس قوم کے لئے بیان کی جائیں جو یقین نہ رکھتے ہوں۔ جن کو پہلے ہی یقین ہے، ان کے لئے نشانیاں بیان کرنے کی کیا ضرورت ہے؟

تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں " یوقنون " کا یا تو مطلب یہ ہے۔ " یطلبون الیقین " یعنی ہم نے نشانیاں بیان کر دی ہیں اس قوم کے لئے جو یقین کے طلب کرنے والے ہیں۔

مطلب واضح ہے کہ کسی نشانی کو دیکھ کر وہی ایمان لاتا ہے جو یقین طلب کرنے کا ارادہ رکھتا ہو۔ جو شروع سے ہی ذہن میں یہ رکھ لے کہ میں نے ماننا ہی نہیں، اس کے لئے کوئی نشانی نفع مند نہیں۔

یا" یوقنون " کا مطلب یہ ہے" یوقنون الحقائق لایعتریهم شبهة ولاعناد "

یعنی ہم نے نشانیاں بیان کر دی ہیں اس قوم کے لئے جو حقائق پر یقین رکھتے ہوں۔ حقائق میں ان کو شبہات لاحق نہ ہوں اور وہ عناد بھی نہ رکھتے ہوں۔ مطلب واضح ہے کہ جو شخص نشانیوں کو دیکھ کر بھی انکار کر دے، ان پر طرح طرح کے شبہات پیش کرے وہ کبھی ایمان نہیں لاسکتا۔ نہ ہی وہ یقین کر سکتا ہے کیونکہ ضد اور عناد کی وجہ سے انکار کرنے اور نہ ماننے کا تو کوئی علاج ہی نہیں۔

روشن نشانیوں کا انکار:

"انه تعالی قد کلمهم واخبرهم بالوحی وهو القرآن انه ارسل رسوله بالهدی ودین الحق لیظهره علی الدین کله "

''ان کا یہ کہنا کہ اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ کلام کیوں نہیں کرتا؟ وہ ہمیں بتاتا کہ تم سچے رسول ہو۔تو ہم ایمان لاتے'' ان کا یہ کہنا حماقت پر مبنی تھا۔اللہ تعالیٰ نے ان سے کلام فرمایا۔ان کو وحی کے ذریعے خبر دی۔کیونکہ قرآن اللہ کا کلام ہی تو ہے۔اسی کلام الٰہی نے یہ بیان کیا'' وہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور سچے دین کے ساتھ بھیجا کہ اسے سب دینوں پر غالب کرے۔''

''و آتی رسوله آیات دالة علی رسالته کالقرآن وغیره من المعجزات کمجیٔ الشجر و کلام الذئب والشاة المشوية المسمومة واشباع الخلق الكثير من الطعام القليل وشق القمر''

اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کو ایسی نشانیاں عطاء فرمائیں جو آپ کی رسالت پر دلالت کر رہی تھیں جیسے قرآن پاک اور آپ کو کتنے ہی معجزات عطاء فرمائے، جن میں سے چند بہت زیادہ مشہور ہیں۔ جیسے درخت کا آپ کے پاس چل کر آنا۔بھیڑیئے کا آپ سے کلام کرنا، زہر آلود بھنی بکری (کے گوشت) کا آپ سے کلام کرنا۔تھوڑے طعام سے بہت سی مخلوق کو سیر کر دینا۔اور چاند کے دو ٹکڑے کر دینا۔

یہ ایسی نشانیاں تھیں جن کو مشرکین اور یہود و نصاریٰ سب ہی جانتے تھے، پھر ان کا کہنا کہ ہمارے پاس تو کوئی نشانی نہیں آئی اس کی وجہ صرف یہ تھی۔

" انهم ما قالوا ذلک لخفاء فی الآیات اولطلب مزید القین وانما قالوه عتوا وعنادا "

کہ انہوں نے سرکشی اور عناد کی وجہ سے انکار کیا تھا، یہ وجہ نہیں تھی کہ یہ نشانیاں کوئی مخفی تھیں۔یا وہ زیادہ یقین حاصل کرنے کے لئے اور نشانیاں طلب کرنا چاہتے تھے۔

(از بیضاوی و شیخ زادہ)

☆☆☆

﴿اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ۙ وَّلَا تُسْئَلُ عَنْ اَصْحٰبِ الْجَحِيْمِ﴾ (آیت ۱۱۹)

۱) بے شک ہم نے تمہیں حق کے ساتھ بھیجا خوشخبری دیتا اور ڈرسناتا اور تم سے دوزخ والوں کا سوال نہ ہوگا۔

۲) بے شک ہم نے بھیجا تمہیں حق کے ساتھ، خوشخبری دینے والا اور ڈر سنانے والے، اور تم سے نہیں سوال کیا جائے گا جہنم والوں کے متعلق۔

شان نزول: مشرکین اور نصاریٰ اور یہود نے جب عناد پر اصرار کیا، اور باطل عقائد ونظریات پر چمٹے رہے، حق کو تسلیم کرنے کی انہوں نے کوئی کوشش نہ کی، کبھی توحید باری تعالیٰ کے خلاف اور کبھی نبوت کے خلاف کلام پیش کرنا انہوں نے طریقہ بنالیا، تو کئی مرتبہ نبی کریم ﷺ انکے ایمان نہ لانے اور جہنم کا ایندھن بننے کی وجہ سے پریشان ہو جائے، تو رب تعالیٰ نے آپ کی تسلی کیلئے اس آیۃ کریمہ کو نازل کیا۔

گویا کہ یوں بیان فرمادیا" انه لامزید علی ما فعله فی مصالح دینهم من اظهار الادلة "

کہ ہم نے ان کو دین کی مصلحت کے لئے دلائل بیان کردیے کہ وہ ان سے راہنمائی حاصل کر کے راہ راست پر آجائیں، ایمان لے آئیں تا کہ اپنے آپ کو اخروی عذاب سے بچالیں، اس سے زیادہ ہماری کوئی ذمہ داری نہیں۔

" وانه لامزید علی ما فعله الرسول فی باب الابلاغ والتنبیه "

اور اے نبی کریم ﷺ آپ کا کام یہ تھا کہ آپ وہ دلائل ان تک پہنچادیں، ان کو متنبہ کردیں یعنی آپ کے ذمہ صرف اللہ تعالیٰ کے احکام پہنچانا تھا کہ ان کو بتادیں اللہ تعالیٰ کا کوئی شریک نہیں، اللہ تعالیٰ اولاد اور زوجہ سے پاک ہے۔ اور ان کو ایمان لانے پر اجر عظیم کے حاصل ہونے اور ایمان نہ لانے پر اخروی عذاب حاصل ہونے پر متنبہ کردیں۔

اے نبی کریم آپ نے یہ کام مستحسن طریقہ پر کردیا ہے۔ آپ نے تبلیغ فرمادی۔ آپ نے ان کو

متنبہ کر دیا، اب وہ ایمان نہ لا کر جہنم کا ایندھن بنتے ہیں تو بنتے رہیں، آپ کو غمزدہ ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ آیۃ کریمہ کے شان نزول پر غور کرنے سے رب تعالیٰ کی صفت قہاریت اور جباریت سمجھ آ گئی۔ اور نبی کریم ﷺ کی صفت رحمت نمایاں طور پر جگمگاتی ہوئی نظر آنے لگی۔

بِالْحَقِّ : کا تعلق اگر ارسال سے ہو تو اب مطلب یہ ہوگا۔ " **انا ارسلناک ارسالا بالحق** " بے شک ہم نے آپ کو رسول بنا کر بھیجا حق کے ساتھ، یعنی ہمارا آپ کو بھیجنا حق کے ساتھ ہے۔

اگر اس کا تعلق ﴿ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ﴾ کے ساتھ ہو تو اب معنی ہوگا۔ " **انت مبشر بالحق و منذر به** " ہم نے آپ کو بھیجا بشیر اور نذیر بنا کر۔ آپ ان کو بشارت دیتے ہیں حق کے ساتھ، اور آپ ان کو ڈراتے ہیں حق کے ساتھ یعنی آپ کا بشارت دینا اور آپ کا ڈرانا حق ہے اس میں باطل کا کوئی تصور بھی نہیں۔

اور تیسرا مطلب یہ ہے کہ "حق" سے مراد "دین اور قرآن ہو" اب اس صورت میں معنی یہ ہوگا
" **انا ارسلناک بالقرآن حال کونہ بشیرا لمن اطاع اللہ بالثواب ونذیرا لمن کفر بالعقاب** "

بے شک ہم نے آپ کو قرآن دے کر بھیجا، دراں حالیکہ (اس حال میں کہ) جو اللہ کی اطاعت کرے، اسے آپ ثواب کی بشارت دیں۔ اور جو کفر کرے اسے آپ عذاب سے ڈرائیں۔

اگرچہ یہ تینوں معانی معتبر ہیں، ایک ایک لفظ سے کثیر اور عظیم مطالب کا حاصل ہونا دراصل قرآن پاک کی عظمت پر دلالت کرتا ہے۔ تاہم زیادہ مشہور اور بہتر قول یہ ہے۔ "بشیر اور نذیر" صفت ہو رسول کی۔ اور معنی یہ ہو۔

" **انا ارسلناک یا محمد بالحق لتکون مبشرا لمن اتبعک واهتدی بدینک ومنذرا لمن کفر بک وضل عن دینک** "

اے نبی کریم بے شک ہم نے آپ کو حق سے بھیجا تا کہ جو لوگ آپ کی تابعداری کریں اور آپ کے دین پر چل کر ہدایت حاصل کر لیں ان کو آپ بشارت دیں۔ اور جو لوگ آپ سے کفر کریں، اور آپ کے دین سے گمراہ رہیں، ان کو آپ ڈرائیں۔ (اعلیٰ حضرت کا ترجمہ اسی قول کے مطابق ہے، یہی راقم نے بھی نقل کیا)۔ (کبیر)

حق سے مراد: یا تو حق سے مراد صدق ہے۔ یعنی ہم نے آپ کو بھیجا صدق سے۔ اور یا ''حق'' سے مراد قرآن ہے یعنی ہم نے آپ کو بھیجا قرآن عطاء کر کے۔ اور یا ''حق'' سے مراد السلام ہے۔ یعنی ہم نے آپ کو بھیجا اسلام کے ساتھ۔ اور بعض حضرات نے یہ معنی بیان کیا ہے '' **انا لم نرسلک عبثا بل ارسلناک بالحق** '' بے شک ہم نے آپ کو یونہی بے مقصد نہیں بھیجا بلکہ آپ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے۔

بَشِیْرًا: ''**ای مبشرا لاولیائی واهل طاعتی بالثواب العظیم**'' آپ کو بشارت دینے والا بنا کر بھیجا کہ آپ میرے دوستوں اور میری طاعت کرنے والوں کو عظیم ثواب کی خوشخبری دیں۔

وَنَذِیْرًا: ''**اے منذرا و مخوفا لاعدائی واهل معصیتی بالعذاب الالیم**'' آپ کو ڈرانے والا، اور خوف دلانے والا بنا کر بھیجا تا کہ آپ میرے دشمنوں اور میری نافرمانی کرنے والوں کو دردناک عذاب کا خوف دلائیں۔ (خازن)

تنبیه: بشیر اور نذیر ہونے کا ذکر فرمایا کہ آپ اہل طاعت کو خوشخبری دیں، اور اہل معصیت کو ڈرائیں، لیکن آپ پر یہ لازم نہیں کہ آپ ان کو جبری طور پر ایمان لانے پر مجبور کریں۔ وہ اپنے عقائد باطلہ پر اصرار کرتے ہیں تو کرنے دیں، تکبر کرتے ہیں تو کرنے دیں۔ آپ پر کچھ حرج نہیں۔

(روح المعانی)

وَلَاتُسْئَلُ عَنْ اَصْحَابِ الْجَحِیْمِ :

اور آپ سے سوال نہیں کیا جائے گا جہنم والوں کے متعلق''

'' وَلَاتُسْئَلُ '' میں دو قراءتیں ہیں۔ مشہور قراءت یہی ہے کہ یہ صیغہ نفی مجہول کا ہے (تاء پر ضمہ ہے) اسی قراءت کے مطابق ترجمہ کیا گیا ہے۔ اب اس قراءت کے مطابق چند مطالب ہیں۔

۱) کافروں کا ٹھکانا جہنم ہے۔ ان کی معصیت آپ کو کوئی نقصان نہیں پہنچائے گی، اور ان کے کفریات اور ایمان نہ لانے کا سوال آپ سے نہیں کیا جائے گا۔ '' **فانما علیک البلاغ وعلینا الحساب** '' آپ کا کام ہے تبلیغ فرما دینا، ہمارا کام ہے ان سے حساب لینا۔

۲) اے نبی کریم آپ کا کام ہے ہدایت دینا۔ اس ہدایت کو کوئی قبول کرے یا نہ کرے آپ

سے کوئی سوال نہیں کیا جائے گا، اس لئے آپ ان کے عذاب اور جہنم، ایمان نہ لانے سے کوئی فکر نہ کریں، آپ کو ان کے متعلق غمزدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔

۳) اے نبی کریم آپ کسی کی طاعت اور نافرمانی کا وقتی طور پر کوئی لحاظ نہ کریں، بلکہ آخرت کا دارومدار خاتمہ پر ہے خاتمہ ایمان پر ہوا تو نجات ہوگی اور خاتمہ کفر پر ہوا تو عذاب ہوگا۔

فائدہ: " وفی الآیة دلالة علی ان احدا لایسأل عن ذنب غیرہ و لا یؤاخذ بما اجترمه سواہ سواء کان قریبا و بعیدا "

اس آیۃ کریمہ سے یہ سمجھ آیا کہ کسی شخص سے دوسرے کے گناہوں کے متعلق سوال نہیں کیا جائے گا۔ اور نہ ہی کسی کے جرم کا مؤاخذہ (گرفت، پکڑ) دوسرے کو ہونا ہے خواہ قریبی رشتہ دار ہو، یا دور کا رشتہ دار ہو۔ (از کبیر)

دوسری قراءت: ولاتسأل (تاء پر فتحہ اور لام پر ضمہ) یعنی صیغہ نفی معلوم کا ہے لیکن معنی نہی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آپ جہنم والوں کے متعلق سوال نہ کریں۔

" انا ارسلناک بالحق بشیرا و نذیرا غیر سائل عنهم "

بے شک ہم نے آپ کو حق کے ساتھ بشیر اور نذیر بنا کر بھیجا ہے ان کے عذاب کے متعلق متفکر ہو کر سوال کرنے والا آپ کو بنا کر نہیں بھیجا۔

" لان علم الله تعالیٰ بکفرهم بعد انذارهم یغنی عن سؤاله عنهم "

اس لئے اللہ تعالیٰ کو معلوم ہے کہ آپ نے ان کو ڈرا دیا ہے لیکن وہ پھر بھی اپنے کفر پر قائم رہے۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کا جاننا ان کے بارے میں سوال سے بے پرواہ کر دیتا ہے۔ جب رب تعالیٰ جانتا ہے ان کے کفر کو تو آپ ان کے متعلق سوال نہ کریں۔ (از قرطبی)

شان نزول میں ایک ضعیف روایت:

یہی دوسری قراءت جو بیان کی گئی کہ نفی معروف کا صیغہ ہے جو نہی کے معنی میں ہے۔ یا عین نہی ہے جیسا کہ علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے بیان فرمایا۔

اس قراءت کے مطابق بعض حضرات نے کہا یہ آیۃ نبی کریم ﷺ کے اپنے والدین کے متعلق سوال کرنے پر نازل ہوئی۔ اس پر روایت یہ بیان کی جاتی ہے۔

" انه علیه الصلوة والسلام سأل جبریل عن قبریهما فدله علیهما فذهب فدعا لهما وتمنی ان یعرف حالهما فی الآخرة ، وقال لیت شعری ما فعل ابوای " فنزلت .

کہ نبی کریم ﷺ نے جبریل سے اپنے والدین کی قبروں کے متعلق پوچھا، انہوں نے آپ کو ان کی قبروں کی راہنمائی کی، آپ گئے۔ ان کے لئے دعاء کی۔ آپ کو یہ تمنا لاحق ہوئی کہ میں ان کے اخروی حالات کے متعلق علم حاصل کروں۔ تو آپ نے کہا " کاش مجھے یہ معلوم ہو جائے کہ میرے ماں باپ سے کیا کیا گیا۔" تو یہ آیت نازل ہوئی۔

اس روایت کے مطابق بعض حضرات نے نبی کریم ﷺ کے والدین کا (معاذ اللہ) کفر ثابت کیا ہے۔ کہ ان کے متعلق کہا گیا ہے کہ " آپ جہنمیوں کے متعلق سوال نہ کریں۔"

لیکن علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے بیان فرمایا ہے:

" لم یرد فی هذا الا اثر معضل ضعیف الاسناد فلا یعول علیه "

کہ اس مسئلہ کے متعلق کوئی صحیح یا حسن روایت ثابت نہیں، سوائے اس کے کہ معضل اور ضعیف الاسناد روایت ثابت ہے جس اعتبار کرنا ممکن نہیں۔ (از روح المعانی)

خیال رہے کہ "معضل" اسے کہا جاتا ہے جس کی سند سے دو یا دو سے زائد راوی ساقط ہوں۔

راقم نے ایک رسالہ لکھا ہے۔ جس کا نام " تکریم والدین مصطفیٰ ﷺ " ہے۔ اس رسالہ میں آپ کے والدین کریمین کے ایمان کے متعلق بحث کی گئی۔ اس رسالہ کو مکمل طور پر یہاں شامل کرنا ضروری ہے۔ تاکہ طلباء کرام اس مقام پر بعض تفاسیر کے مطالعہ سے غلطی کے مرتکب نہ ہو۔

☆☆☆☆☆

﴿بسم اللہ الرحمٰن الرحیم﴾

الحمد للہ الرزاق الماجد الباسط الراسع القادر . والصلوۃ علی النبی الذی انتقل من الطاهرالی الطاهر ، وعلی آله واصحابه الذین اطاعوه فی الباطن والظاهر . اما بعد !

فَاَعُوْذُ بِاللهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

﴿ بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴾

﴿ تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۘ مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللهُ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ ﴾ (پ ٣ ع ١)

یہ رسول ہیں کہ ہم نے ان میں سے ایک کو دوسرے پر افضل کیا۔ ان میں کسی سے اللہ تعالیٰ نے کلام فرمایا، اور کوئی وہ ہے جسے سب پر درجوں بلند کیا۔

(کنز الایمان فی ترجمة القرآن . از امام احمد رضا خان محدث بریلوی)

اجمعت الامة علی ان بعض الانبیاء افضل من بعض وعلی ان محمدا ﷺ افضل من الکل

(تفسیر کبیر ج ٦ ص ٢٠٨ زیر آیت مذکورہ)

اجماع امت اس پر ہے کہ بعض انبیاء کرام بعض پر افضل ہیں اور اس پر بھی اجماع امت ہے کہ تمام انبیائے کرام علیہم السلام سے افضل ہمارے نبی کریم محمد مصطفیٰ ﷺ ہیں۔

علامہ رازیؒ نے نبی کریم ﷺ کی افضلیت پر انیس دلائل قائم کئے۔ راقم نے اس پر ایک کا اضافہ کر کے اپنی کتاب "تذکرۃ الانبیاء" میں مکمل بیس دلائل نقل کئے ہیں۔ یہاں تبرکاً صرف ایک کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

قال اللہ تعالی : ﴿ وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴾ فلما کان رحمة لکل العالمین لزم أن یکون افضل من کل العالمین . (تفسیر کبیر جلد ٦ ص ٢٠٨)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی جب یہ ہے (ترجمہ) " اور ہم نے تمہیں نہ بھیجا مگر رحمت سارے جہان کے لئے " جب آپ کو تمام جہانوں کے لئے رحمت بنا کر بھیجا گیا تو یقیناً آپ تمام جہان والوں سے افضل بھی ہیں۔ "عالمین" میں تمام انبیاء کرام بھی داخل ہیں۔ تو آپ ﷺ کا تمام انبیائے کرام پر افضل ہونا بھی یقینی ہے۔

افضل الانبیاء بزبان افضل الانبیاء:

عن ابن عباسؓ قال قال رسول الله ﷺ ..... انا اکرم الاولین والآخرین علی الله ولا فخر "جزء الحدیث" (ترمذی، دارمی، مشکوۃ، باب فضائل سید المرسلین ص ۵۱۳)

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں اللہ تعالیٰ کے ہاں تمام اوّلین وآخرین سے زیادہ مکرم ہوں۔

یہ یقینی امر ہے جو سب سے زیادہ رب تعالیٰ کے نزدیک مکرم ہوگا وہ سب سے زیادہ افضل بھی ہوگا۔

"عن جابرؓ أن النبی ﷺ قال انا قائد المرسلین ولا فخر" (دارمی، مشکوۃ باب فضائل سید المرسلین ص ۵۱۴)

حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "میں تمام رسولوں کا قائد ہوں گا، مجھے اس پر کوئی فخر نہیں" یعنی آخرت میں، میں سب سے مقدم ہوں گا۔

آپ ﷺ کا تمام انبیائے کرام پر مقدم ہونا اور تمام کا قائد ہونا آپ ﷺ کی افضلیت پر واضح طور پر دلالت کر رہا ہے۔ اس سے آپ ﷺ کا افضل الانبیاء ہونا روز روشن سے بھی زیادہ واضح ہوگیا۔

"عن ابی بن کعب عن النبی ﷺ قال اذا کان یوم القیامۃ کنت امام النبیین وخطیبھم وصاحب شفاعتھم غیر فخر" (ترمذی، مشکوۃ ص ۵۱۴)

حضرت ابی ابن کعبؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "میں قیامت کے دن انبیائے کرام کا امام ہوں گا۔ میں ان کا خطیب ہوں گا، میں ان کا شفیع ہوں گا۔ مجھے اس پر کوئی فخر نہیں

"امام ہونا اور قائد ہونا" دونوں کا ایک ہی مقصد ہے، خطیب ہونے کا مطلب یہ ہے کہ میں اس وقت رب کے حضور کلام کروں گا۔ جب تمام انبیائے کرام خاموش ہوں گے۔ اور میں "مقامِ محمود" میں سب کی شفاعت کروں گا۔ (مرقاۃ المفاتیح)

سبحان اللہ! میرے پیارے حبیب پاک علیہ الصلوۃ والسلام جب امام الانبیاء ہیں اور شفیع الانبیاء ہیں تو افضل الانبیاء کیوں نہ ہوں؟

"عن ابی ھریرۃؓ قال قال رسول الله ﷺ انا سید ولد آدم یوم القیامۃ"

حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: قیامت کے دن مجھے تمام انسانوں پر سیادت

حاصل ہوگی۔

" السید " قال الهروی هو الذی یفوق قومه فی الخیر " نووی شرح مسلم

علامہ ہرویؒ نے فرمایا: " سید " وہ ہوتا ہے جو اپنی قوم پر بہتر ہونے میں فوقیت رکھتا ہو۔

جب میرے حبیب پاک ﷺ تمام انسانوں کے سردار ہیں تو یقیناً تمام سے فوقیت بھی رکھتے ہیں۔ یہی معنی ہے افضل ہونے کا۔

علامہ نوویؒ مزید تفصیل ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

" وقال غیره هو الذی یفزع الیه فی النوائب والشدائد فیقوم بامرهم ویتحمل عنهم مکارههم و یدفعها عنهم " نووی شرح مسلم

علامہ ہروی کے علاوہ دوسرے اہل علم نے " سید " کا معنی یہ بیان کیا ہے کہ " سید " وہ ہوتا ہے جس کی طرف لوگ مصائب وآلام میں رجوع کریں اور وہ ان کے مصائب کو دور کرے۔

اس سے پتہ چلا کہ حضور ﷺ تمام لوگوں کے حاجت روا ہیں۔ جن میں انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والتسلیم بھی شامل ہیں۔ یقیناً وہ ذات جو دوسرے حضرات کی حاجت روا ہے وہ ان سے افضل ہے۔ اس طرح افضل الانبیاء ہونا واضح ہوا۔

تنبیہ: " قوله ﷺ یوم القیامة مع أنه سیدهم فی الدنیا والآخرة فسبب التقیید أن فی یوم القیامة یظهر سودده لکل احد ولا یبقی منازع ولا معاند " نووی

نبی کریم ﷺ نے اپنی سیادت قیامت کے دن ہونے کا ذکر فرمایا، حالانکہ آپ دنیا میں بھی تمام کے سردار ہیں اور آخرت میں بھی تمام کے سردار ہوں گے۔ قیامت کے ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ قیامت کے دن آپ کی سیادت ہر ایک پر ظاہر ہوگی۔ اس دن کوئی جھگڑا کرنے والا، اور کوئی عناد رکھنے والا نہیں ہوگا۔

فقط اتنا سبب ہے انعقادِ بزمِ محشر کا
کہ ان کی شانِ محبوبی دکھائی جانیوالی ہے

نبی کریم ﷺ کا ارشاد بھی ایسے ہی ہے جس طرح رب ذوالجلال کا ارشادِ گرامی: لمن الملک الیوم ؟ آج کس کی بادشاہی ہے؟ یہ بھی قیامت کے دن ہی ذکر ہوگا، حالانکہ دنیا میں بھی رب ذوالجلال

ہی کی بادشاہی ہے۔لیکن دنیا میں مختلف خطوں کے مختلف بادشاہ کہلانے والے بھی قیامت کے دن صرف رب تعالیٰ ہی کی بادشاہی کو مانیں گے،ایسے ہی دنیا میں نبی کریم ﷺ کے وسیلہ جلیلہ کے منکرین بھی قیامت کے دن آپ ﷺ کا وسیلہ ڈھونڈ رہے ہوں گے۔آپ کو حاجت روا ماننے کے بغیر کوئی چارہ کار نہیں ہوگا۔

قول صحابی:

"عن ابن عباسؓ قال إن الله تعالیٰ فضل محمدا ﷺ علی الانبیاء وعلیٰ اهل السماء"

(مشکوۃ شریف باب فضائل سید المرسلین ص ۵۱۵)

حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا: بے شک اللہ تعالیٰ نے محمد ﷺ کو تمام انبیائے کرام پر اور تمام آسمانوں والوں پر فضیلت دی ہے۔

یہاں تک بیان کردہ مختصر مضمون سے واضح ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو" افضل الانبیاء" کہا؛ کیونکہ مفسرین کرام کا اس پر اجماع ہے کہ" ورفع بعضهم درجت " سے مراد حضور نبی کریم ﷺ ہی ہیں۔اور نبی کریم ﷺ کے اپنے ارشادات گرامی سے بھی واضح ہوا کہ:

"آپ افضل الانبیاء ، سید الانبیاء ، امام الانبیاء اور اکرم الانبیاء ہیں"

اور حضرت ابن عباسؓ کے قول سے بھی پتہ چلا کہ آپ تمام آسمان والوں اور تمام انبیائے کرام سے افضل ہیں۔

مقام یوسف علیہ السلام بزبان سید الانبیاء:

"عن ابن عمرؓ قال قال رسول الله ﷺ الكريم ابن الكريم ابن الكريم ابن الكريم يوسف بن يعقوب بن اسحاق بن ابراهيم عليهم السلام"

(بخاری شریف ، مشکوۃ شریف باب المفاخرۃ والعصبیۃ ص ۴۱۷)

حضرت ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کریم ابن کریم ابن کریم ابن کریم یوسف ابن یعقوب ابن اسحاق ابن ابراہیم علیہم السلام ہیں۔

اس حدیث پاک سے واضح ہوا کہ یوسف علیہ السلام کو خاندانی منصب کی وجہ سے ہی یہ کمال حاصل ہوا۔کہ آپ صاحب ایمان اور نبی، آپ کے والد گرامی صاحب ایمان اور نبی، اور آپ کے دادا

صاحب ایمان اور نبی ،اور آپ کے پردادا صاحب ایمان اور نبی ہیں ۔لہٰذا آپ علیہ السلام کو کریم ابن کریم ابن کریم ابن کریم ہونے کا شرف حاصل ہے۔

خاندانی عیب (گھٹیا کفو)

" واما فی العجم فتعتبر حریة و اسلاما فمسلم بنفسه او معتق غیر کفء لمن ابوھا مسلم او حر او معتق" (درمختار باب الکفاءة)

عجم میں کفو کا اعتبار حریت اور اسلام میں بھی ہے۔ جو شخص خود تو مسلمان ہے یا آزاد ہے وہ اس شخص کا کفو نہیں بن سکتا جس کا باپ بھی مسلمان ہے یا آزاد ہے خواہ وہ آزاد ہی آ رہا ہے، یا آزاد کیا گیا ہے۔

خیال رہے: اگر چہ عرب میں اسلام کا لحاظ کفو میں نہیں لیکن عجم میں ہے۔ جب نبی کریم ﷺ تمام عرب و عجم کے نبی ہیں تو یقیناً آپ کی شان کو اس طرح ماننا ضروری ہے کہ آپ ﷺ کو نہ عرب گھٹیا کہہ سکیں اور نہ عجم۔

اہل محبت کے لئے تو اتنا ہی لکھنا کافی ہے کہ:

"نبی کریم ﷺ افضل الانبیاء ہیں، اور یوسف علیہ السلام کریم ابن کریم ابن کریم ہیں۔ اور عجم کے نزدیک وہ شخص جس کا باپ کافر ہو وہ گھٹیا خاندان کا مالک ہے"

اگر یہ کہا جائے کہ نبی کریم ﷺ کے باپ.....معاذ اللہ.....کافر تھے تو آپ ﷺ کا یوسف علیہ السلام سے گھٹیا ہونا عجم کے نزدیک لازم آئے گا۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ کوئی شخص آپ ﷺ کی عیب جوئی کر سکے۔ آپ کو تمام عیوب سے پاک پیدا کیا گیا۔

خلقت مبرأ من کل عیب ☆ کانک قد خلقت کما تشاء

اگر چہ نہ ماننے والے کیلئے دلائل کے انبار بھی ناکافی ہیں، تاہم پھر بھی اپنی طرف سے کچھ دلائل پیش کرنے اس لئے ضروری ہیں کہ کم از کم سیدھے سادے، بھولے بھالے مسلمانوں کو منافقانہ چالبازیوں کے ساتھ راہِ حق سے بھٹکایا نہ جا سکے۔

ایمانِ والدینِ کریمین کے متعلق مسالک

اہل علم کا پہلا مسلک:

ایک مسلک یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کے والدین زمانہ فترت میں تھے۔ اس وقت ''بت پرست نہ ہونا، مشرک نہ ہونا'' ہی نجات کے لئے کافی ہے۔ وہ بت پرست نہ تھے لہذا جنتی ہیں۔

" المسلک الاول : انهما ماتا قبل البعثة ولا تعذیب قبلها لقوله تعالیٰ " وما كنا معذبين حتى نبعث رسولاً "

نبی کریم ﷺ کے والدین کریمین آپ کی بعثت سے پہلے فوت ہو گئے اور ''زمانہ فترت'' میں فوت ہونے والوں کو عذاب نہیں ہوگا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: (ترجمہ) اور ہم عذاب دینے والے نہیں جب تک ہم رسول نہ بھیج لیں۔

علمائے علم کلام وعلمِ اصول میں سے اشاعرہ اور فقہائے کرام میں سے شوافع کا اس مسئلہ میں اجماع ہے کہ'' جسے دعوت اسلام نہ ملے وہ فوت ہو جائے تو وہ نجات پائے گا۔ اور دعوتِ اسلام سے پہلے کسی کو قتل کرنا باعثِ لزومِ دیت وکفارہ ہے''۔

شیخ الاسلام شریف الدین مناوی رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے نبی کریم ﷺ کے والد مکرم کے متعلق سوال کیا۔ کیا وہ آگ میں جائیں گے؟ تو آپ نے سائل پر شدید غصہ کا اظہار کیا۔ سائل نے کہا کیا ان کا اسلام ثابت ہے؟ تو انہوں نے فرمایا!

" انه مات في الفترة ولا تعذيب قبل البعثة "

بیشک وہ زمانہ فترت میں فوت ہوئے اور بعثت سے پہلے فوت ہونے والوں کو عذاب نہیں ہوگا۔

دوسرا مسلک: آپ ﷺ کے والدین کریمین مومن تھے۔ کفر وشرک سے پاک تھے۔ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کو ماننے والے تھے۔ اور دین ابراہیمی پر قائم تھے، اگرچہ تفصیلی طور پر شریعت مصطفیٰ ﷺ کا نزول بعد میں ہوا لیکن اس کے اصول بھی دین ابراہیمی پر قائم ہیں، لہذا دین ابراہیمی پر قائم رہنے کی وجہ سے وہ جنتی ہیں۔ راقم کا بھی یہی مسلک ہے۔

تیسرا مسلک: نبی کریم ﷺ نے اپنے والدین کو زندہ کر کے ایمان کی دولت سے مالا مال کیا۔

چوتھا مسلک: نبی کریم ﷺ کے والدین ...... العیاذ باللہ ...... کافر و مشرک تھے۔

اس آخری مسلک والے کچھ احادیث کو نہ سمجھنے کی وجہ سے غلطی کا شکار ہوئے، جن کی تفصیل ان شاء اللہ بعد میں ذکر کی جائے گی۔

مسلک اول کے شواہد: حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو جب زندہ آسمانوں پر اٹھالیا گیا۔ انجیل میں بھی تحریف کردی گئی۔ اس وقت سے لیکر نبی کریم ﷺ کی بعثت تک کوئی اور شریعت نہیں آئی۔ اس دوران صرف بت پرستی سے دور رہنا ہی نجات کیلئے کافی تھا۔ یہ درمیانی زمانہ ''فترۃ'' کا زمانہ کہلاتا ہے۔

علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں یہی مضمون دوسری آیات کریمہ سے بھی ثابت ہے۔

☆ ﴿ ذٰلِکَ اَنْ لَّمْ یَکُنْ رَّبُّکَ مُهْلِکَ الْقُرٰی بِظُلْمٍ وَّاَهْلُهَا غٰفِلُوْنَ ﴾ (انعام آیت ۱۳۱)

یہ اس لئے کہ تیرا رب بستیوں کو ظلم سے تباہ نہیں کرتا، کہ ان کے لوگ بے خبر ہوں۔

☆ ﴿ وَلَوْلَا اَنْ تُصِیْبَهُمْ مُّصِیْبَةٌ بِمَا قَدَّمَتْ اَیْدِیْهِمْ فَیَقُوْلُوْا رَبَّنَا لَوْلَآ اَرْسَلْتَ اِلَیْنَا رَسُوْلًا فَنَتَّبِعَ اٰیٰتِکَ وَنَکُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ ﴾ ؟ (القصص آیت ۴۷)

اور اگر نہ ہوتا کہ کبھی پہنچتی انہیں کوئی مصیبت اس کے سبب جو ان کے ہاتھوں نے آگے بھیجا تو کہتے: اے ہمارے رب تو نے کیوں نہ بھیجا ہماری طرف کوئی رسول کہ ہم تیری آیتوں کی پیروی کرتے اور ایمان لاتے۔

☆ ﴿ وَلَوْ اَنَّآ اَهْلَکْنٰهُمْ بِعَذَابٍ مِّنْ قَبْلِهٖ لَقَالُوْا رَبَّنَا لَوْلَآ اَرْسَلْتَ اِلَیْنَا رَسُوْلًا فَنَتَّبِعَ اٰیٰتِکَ مِنْ قَبْلِ اَنْ نَّذِلَّ وَنَخْزٰی ﴾ (طٰہ، آیت ۱۳۴)

اور اگر ہم انہیں کسی عذاب سے ہلاک کر دیتے رسول کے آنے سے پہلے، تو ضرور کہتے: اے ہمارے رب تو نے ہماری طرف کوئی رسول کیوں نہ بھیجا کہ ہم تیری آیتوں پر چلتے قبل اس کے کہ ذلیل و رسوا ہوتے۔

☆ ﴿ وَمَا کَانَ رَبُّکَ مُهْلِکَ الْقُرٰی حَتّٰی یَبْعَثَ فِیْٓ اُمِّهَا رَسُوْلًا یَّتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِنَا ﴾

ترجمہ: اور تمہارا رب شہروں کو ہلاک نہیں کرتا جب تک ان کے اصل مرجع میں رسول نہ بھیجے، جو ان پر ہماری آیتیں پڑھے۔ (القصص آیت ۵۹)

☆ ﴿وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ فَاتَّبِعُوْهُ وَاتَّقُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ☆ اَنْ تَقُوْلُوْٓا اِنَّمَآ اُنْزِلَ الْكِتٰبُ عَلٰى طَآئِفَتَيْنِ مِنْ قَبْلِنَا ۪ وَاِنْ كُنَّا عَنْ دِرَاسَتِهِمْ لَغٰفِلِيْنَ﴾ (انعام آیت ۱۵۵، ۱۵۶)

اور یہ برکت والی کتاب ہم نے اتاری تو اس کی پیروی کرو۔ اور پرہیز گاری کرو کہ تم پر رحم ہو، کبھی کہو (یعنی تاکہ تم یہ نہ کہہ سکو) کہ کتاب تو ہم سے پہلے دو گروہوں پر اتری تھی اور ہمیں اس کے پڑھنے پڑھانے کی کچھ خبر نہ تھی۔

☆ ﴿وَمَآ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ اِلَّا لَهَا مُنْذِرُوْنَ ☆ ذِكْرٰى ۛ وَمَا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ﴾

(الشعراء آیت ۲۰۸ / ۲۰۹)

اور ہم نے کوئی بستی ہلاک نہ کی جسے ڈر سنانے والے نہ ہوں، نصیحت کیلئے۔ اور ہم ظلم نہیں کرتے۔

☆ ﴿وَهُمْ يَصْطَرِخُوْنَ فِيْهَا ۚ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا غَيْرَ الَّذِيْ كُنَّا نَعْمَلُ ؕ اَوَلَمْ نُعَمِّرْكُمْ مَّا يَتَذَكَّرُ فِيْهِ مَنْ تَذَكَّرَ وَجَآءَكُمُ النَّذِيْرُ ؕ فَذُوْقُوْا فَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ نَّصِيْرٍ﴾ (فاطر، آیت ۳۷)

وہ اس (جہنم کی آگ) میں چلاتے ہوں گے: اے ہمارے رب ہمیں نکال کہ ہم اچھا کام کریں، اس کے خلاف جو پہلے کرتے تھے۔ (جواب دیا جائے گا) اور کیا ہم نے تمہیں وہ عمر نہ دی تھی جس میں سمجھ لیتا جس نے سمجھنا ہوتا۔ اور ڈر سنانے والا تمہارے پاس تشریف لایا تھا۔ تو اب چکھو (جہنم کی آگ کا مزہ) کہ ظالموں کا کوئی مددگار نہیں۔

انبیائے کرام کی بعثت اور دعوت اسلام کے بغیر کسی کو عذاب نہیں دیا جائے گا، اسی مضمون پر علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے سات احادیث پیش کی ہیں ان میں ایک یہ ہے!

☆ " اخرج عبد الرزاق وابن جرير وابن المنذر وابن ابی حاتم عن ابی هريرة قال اذا كان يوم القيامة جمع الله اهل الفترة والمعتوه والاصم والابكم والشيوخ الذين لم يدركوا الاسلام ثم ارسل اليهم رسولا ان ادخلوا النار فيقولون كيف لم تأتنا رسل قال وايم الله لو دخلوها وكانت عليهم بردا وسلاما ثم يرسل اليهم فيطيعه من كان يريد ان يطيعه قال ابوهريرة اقرأوا ان شئتم "وما كنا معذبين حتى نبعث رسولا" اسناده صحيح على شرط الشيخين ومثله لا يقال من قبل الرأى فله حكم الرفع " (الحاوی للفتاوی ج ۲ ص ۲۰۴)

حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اصحاب فترت، نیم پاگل،

گونگے، بہرے اور بوڑھے جنہوں نے اسلام کو نہیں پایا ان لوگوں کے پاس فرشتوں کو بھیجے گا کہ ان کو آگ میں داخل کر دیا جائے ۔تو وہ کہیں گے ۔اے اللہ تعالیٰ کیسے ہمیں آگ میں بھیجا جا رہا ہے۔ ہمارے پاس تو کوئی رسول نہیں آیا تھا ۔راوی کہتے ہیں قسم ہے اللہ تعالیٰ کی اگر ان کو آگ میں بھیج دیا جاتا تو ان پر آگ ٹھنڈی اور سلامتی میں ہو جاتی ۔تو اس وقت ان کے پاس رسول کو بھیجا جائے گا۔ جن کی قسمت میں ہوگا وہ ایمان لے آئیں گے۔ حضرت ابو ہریرۃ نے اس پر دلیل پیش کرتے ہوئے کہا کہ اگر تم چاہتے ہو تو ''وما کنا معذبین حتی نبعث رسولا'' کی آیت پڑھو۔

یعنی ہم عذاب دینے والے نہیں جب تک ہم رسول نہ بھیجیں۔

علامہ سیوطیؒ سند پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں ۔اس حدیث کی سند بخاری و مسلم کی شرائط کے مطابق صحیح ہے اور یہ حدیث رائے کے مطابق بھی نہیں اس لئے یہ مرفوع حدیث کے حکم میں ہے ۔

(الحاوی للفتاوی ج ۲ ص ۲۰۵)

''وقال الامام فخر الدین الرازی فی المحصول شکر المنعم لا یجب عقلا خلافا للمعتزلۃ''

علامہ فخر الدین رازی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اپنی کتاب محصول میں ذکر کیا ''منعم ذات'' یعنی اللہ تعالیٰ جس کے ان گنت انعام ہیں ان کا شکر یہ ادا کرنا عقلاً لازم نہیں (بلکہ بعثت رسول ضروری ہے) قاضی تاج الدین سبکی رحمۃ اللہ علیہ نے شرح مختصر ابن الحاجب میں مسئلہء شکر منعم کے ضمن میں کہا کہ اس سے یہ مسئلہ بھی ثابت ہوتا ہے!

" من لم تبلغه الدعوة فعندنا يموت ناجيا ولا يقاتل حتى يدعى الى الاسلام وهو مضمون بالكفارة والدية ولا يجب القصاص على قاتله على الصحيح "

جس کے پاس دعوت اسلام نہ پہنچے اس کی موت حالت نجات پر ہوگی ۔اسے اس وقت تک قتل نہیں کیا جائے گا جب تک اسے دعوت اسلام نہ پہنچے ۔اگر کسی نے قتل کر دیا تو اس پر دیت و کفارہ کی ذمہ داری لازم ہوگی ۔اگر چہ قصاص لازم نہیں ہوگا۔ (الحاوی للفتاوی ج ۲ ص ۲۰۶)

تنبیہ: " هذا الحكم خاص بمن لم تبلغه دعوة نبي اصلا . اما من بلغه منهم دعوة احد من الانبياء السابقين ثم اصر على كفره فهو في النار قطعا وهذا لانزاع فيه " (الحاوی للفتاوی ج ۲ ص ۲۰۶)

یہ حکم ان لوگوں کے لئے خاص ہے جن کے پاس کسی نبی کی طرف سے کوئی دعوت اسلام نہ پہنچی ہو، لیکن وہ لوگ جن کے پاس دعوت اسلام پہنچی اور انہوں نے اسے نہ قبول کیا بلکہ وہ کفر پر ہی قائم رہے وہ جہنمی ہوں گے اس پر اہل علم کا اتفاق ہے۔

نبی کریم ﷺ کے والدین کریمین کو نہ تو پہلے انبیائے کرام علیہم السلام کی دعوت پہنچی اور نہ ہی حضور نبی کریم ﷺ کی دعوت پہنچی؛ کیونکہ حضرت عیسیٰ اور نبی کریم ﷺ کے درمیان تقریباً چھ سو سال کا زمانہ پایا گیا ،اس وقت روئے زمین پر مشرق و مغرب ،شمال و جنوب میں جہالت کا دور دورہ تھا۔صرف چند لوگ اہل کتاب کے اہل علم ملکِ شام میں تھے۔ان کو بھی حضور ﷺ کے والدین کریمین نہ پا سکے؛ کیونکہ حضرت عبداللہؓ جوانی میں ہی تقریباً اٹھارہ سال کی عمر میں وفات پا گئے۔

اور انہوں نے حضور علیہ الصلوۃ والسلام کا زمانہ بعثت بھی نہ پایا؛ کیونکہ حضرت عبداللہؓ نبی کریم ﷺ کی ولادت باسعادت سے پہلے ہی فوت ہو گئے۔اور حضرت آمنہ رضی اللہ عنہا ، نبی کریم ﷺ کی چھ سال کی عمر میں وفات پا گئیں۔ (الحاوی للفتاویٰ ج ۲ ص ۲۰۷)

اہل علم کا دوسرا مسلک: نبی کریم ﷺ کے والدین سے شرک ثابت نہیں بلکہ وہ ابراہیم علیہ السلام کے دین حنیف پر قائم تھے۔جس طرح عرب کے کئی اور لوگ بھی دین ابراہیمی پر قائم تھے۔جیسے زید بن عمرو بن نفیل ، ورقہ بن نوفل وغیرہ۔اس مسلک پر بہت سے اہل علم ہیں۔جن میں علامہ فخر الدین رازی رحمۃ اللہ علیہ بھی ہیں۔آپ نے اپنی کتاب اسرار التنزیل میں بیان کیا ہے۔

" ان آزر لم یکن والد ابراھیم بل کان عمه "

بے شک ''آزر'' حضرت ابراہیم علیہ السلام کا باپ نہیں تھا بلکہ چچا تھا۔

اس پر اہل علم کے بہت دلائل ہیں

" ان آباء الانبیاء ما کانوا کفارا "

بیشک انبیاء کرام میں سے کسی نبی کے آباء کافر نہیں تھے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی! ﴿ اَلَّذِیْ یَرٰکَ حِیْنَ تَقُوْمُ وَتَقَلُّبَکَ فِی السّٰجِدِیْنَ ﴾
(سورہ شعراء ۲۱۸، ۲۱۹)

جو تمہیں دیکھتا ہے جب تم کھڑے ہوتے ہو اور دورے کرتے ہوئے سجدہ کرنے والوں میں

" قیل معناه انه کان ینتقل نوره من ساجد الی ساجد وبهذا التقدیر فالآیة دالة علی ان جمیع آباء محمد ﷺ کانوا مسلمین وحینئذ یجب القطع بأن والد ابراهیم ما کان من الکافرین انما ذاک عمه "

آیت کریمہ کا معنی یہ ہوگا کہ آپ کا نور سجدہ کرنے والوں سے سجدہ کرنے والوں کی طرف منتقل ہوتا رہا۔ لہٰذا آیت کریمہ اس پر دلالت کر رہی ہے۔ کہ نبی کریم ﷺ کے آباء واجداد میں کوئی بھی کافر نہ تھا۔ یہاں سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ ابراہیم علیہ السلام کے باپ کافر نہ تھے، اور آزر آپ کا چچا تھا، باپ نہ تھا

(الحاوی للفتاوی ج ۲، ص ۲۰۲ تا ۲۱۰)

نبی کریم ﷺ کے آباء واجداد کے مشرک نہ ہونے پر خود نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی!

" ولم ازل انقل من اصلاب الطاهرین الی ارحام الطاهرات وقال تعالیٰ: ﴿انما المشرکون نجس﴾ فوجب ان لا یکون احد من اجداده مشرکا "

حضور ﷺ نے فرمایا میں ہمیشہ پاک پشتوں سے پاک رحموں میں منتقل ہوتا رہا، مشرک کبھی پاک نہیں ہو سکتے۔ اسلئے کہ ان کو خود رب تعالیٰ نے نجس (ناپاک) کہا ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ نبی کریم ﷺ کے آباء واجداد میں سے کوئی بھی مشرک نہ ہو۔ ورنہ حضور کا اپنا ارشاد گرامی ہی غلط ثابت ہوگا۔

(از الحاوی للفتاوی ج ۲، ص ۲۱۰)

اعتراض: حدیث شریف میں طاہر نسلوں سے منتقل ہونے کا مطلب تو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آپ کے آباء واجداد بدکاری سے پاک ہوں، اس سے شرک سے پاک ہونا ثابت نہیں ہو سکتا۔

جواب! "وتخصیص الطهارة بالطهارة من السفاح لا دلیل له یعول علیه، والعبرة لعموم اللفظ لا لخصوص السبب " (روح المعانی زیر آیت واذ قال ابراهیم لابیه آزر الخ پ ۷)

حدیث شریف میں مذکورہ طہارت کو صرف بدکاری سے طاہر ہونے کے ساتھ خاص کرنے پر کوئی دلیل نہیں پائی گئی جس پر اعتبار کیا جا سکے، اعتبار عموم الفاظ کا ہوتا ہے۔ خصوص اسباب کا نہیں۔

"آزر" حضرت ابراہیمؑ کا چچا تھا!

" ان آزر اسم لعم ابراهیم علیه السلام وجاء اطلاق الاب علی العم فی " قوله تعالیٰ:

﴿اَم کُنتُم شُهَدَآءَ اِذ حَضَرَ یَعقُوبَ المَوتُ اِذ قَالَ لِبَنِیهِ مَا تَعبُدُونَ مِن بَعدِی قَالُوا نَعبُدُ اِلٰهَکَ وَاِلٰهَ اٰبَآئِکَ اِبرٰهٖمَ وَاِسمٰعِیلَ وَاِسحٰقَ﴾ وفیه اطلاق الاب علی الجد ایضاً "۔

(روح المعانی زیر آیت مذکورہ بالا)

بے شک "آزر" حضرت ابراہیم علیہ السلام کے چچا کا نام ہے ۔لفظ "اب" کا اطلاق چچا اور دادا پر اس آیت کریمہ میں آیا ہوا ہے۔" ام کنتم شهداء ...... الآیۃ " ترجمہ: کیا تم اس وقت موجود تھے جب یعقوبؑ کو موت آئی جب کہ اس نے اپنے بیٹوں سے فرمایا: میرے بعد کس کی عبادت کرو گے؟ بولے : ہم عبادت کریں گے اس کی جو آپ کا خدا ہے اور آپ کے آباء ابراہیم اور اسماعیل اور اسحاق کا، ایک خدا۔ اور ہم اس کے حضور گردن رکھے ہیں۔

اس آیت کریمہ میں لفظ "آباء" استعمال ہوا ہے جو "اب" کی جمع ہے۔ لفظ "اب" کا اطلاق یعقوبؑ کے باپ حضرت اسحاقؑ پر اور آپ کے چچا (تایا) حضرت اسماعیلؑ پر اور آپ کے دادا حضرت ابراہیم پر ہوا۔

واضح ہوا کہ لفظ "اب" کا حقیقی معنی باپ ہے لیکن مجازی معنی کے لحاظ سے چچا اور دادا پر بولا جاتا ہے۔ بلکہ ماموں، نانا، سسر، استاذ کو بھی مجازاً "اب" (باپ) کہا جا سکتا ہے۔

اسی طرح حضور نے اپنے چچا حضرت عباس کے متعلق لفظ "اب" استعمال کیا۔" ردوا علی ابی عباس " فرمایا: مجھ پر میرے باپ (چچا) عباس کو لوٹاؤ!

وعن محمد بن کعب القرظی الخال والد والعم والد وتلا هذه الآیة ﴿ وإذقال ابراهیم لابیه الآیة﴾ (روح المعانی ج ۴ جزء ۷ ص ۱۹۵)

محمد بن کعب قرظیؒ نے فرمایا: ماموں کو بھی باپ کہہ لیا جاتا ہے اور چچا کو بھی باپ کہہ لیا جاتا ہے۔ اور یہ آیت کریمہ ﴿ وَاِذقَالَ اِبرٰهِیمُ لِاَبِیهِ اٰزَرَ﴾ کی تلاوت کی۔

آزر کو چچا کہنے والوں کی شاندار دلیل:

" اخرجه ابن المنذر فی تفسیره بسند صحیح عن سلیمان بن صرد قال لما ارادوا أن یلقوا ابراهیم علیه السلام فی النار جعلوا یجمعون الحطب حتی أن کانت

العجوز لتجمع الحطب فلما تحقق ذلک قال " حسبی الله تعالی ونعم الوکیل " فلما القوه قال الله تعالی : ﴿ یَا نَارُ کُونِیْ بَرْدًا وَّ سَلامًا عَلٰی اِبْرَاهِیْم ﴾ فکانت . فقال عمه من اجلی دفع عنه فارسل الله شرارة من النار فوقعت علی قدمه فاحرقته "

(روح المعانی جلد ۴ جز ۔ ص ۹۵)

ابن منذرؒ نے اپنی تفسیر میں سند صحیح سے سلیمان بن صرد سے روایت ذکر کی ہے کہ جب کفار نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں ڈالنے کا ارادہ کیا تو وہ جلانے کیلئے لکڑیاں جمع کرنے لگے۔ یہاں تک کہ کوئی بڑھیا عورت بھی ہوتی تو وہ بھی لکڑیاں جمع کرتی۔ جب آگ جلانے کا معاملہ مکمل ہو گیا تو ابراہیم علیہ السلام نے پڑھا" حسبی الله تعالی و نعم الوکیل "(مجھے اللہ کافی ہے اور وہی بہترین کارساز ہے) جب انہوں نے آپ کو آگ میں ڈال دیا تو اللہ تعالیٰ نے آگ کو حکم دیا: (ترجمہ)"اے آگ ہو جا ٹھنڈی اور سلامتی والی ابراہیم پر" آگ جب آپ پر ٹھنڈی اور با سلامت ہوگئی تو آپ کے چچا نے کہا:"یہ میری وجہ سے ابراہیم پر ٹھنڈی ہوئی ہے" تو اللہ تعالیٰ نے اس پر آگ کی ایک چنگاری بھیجی جو اس کے قدموں پر گری اور اس نے اسے جلا دیا۔

اس روایت میں واضح طور پر لفظ"عمہ" استعمال ہوا ہے جس کا معنی ہی "اس کا چچا" ہے۔

" اخرج محمد بن کعب وقتادة ومجاهد والحسن وغیرهم ان ابراهیم علیه السلام لم یزل یستغفر لابیه حتی مات فلما مات تبین له انه عدو لله فلم یستغفر له ثم هاجر بعد موته وواقعة النار الی الشام ثم دخل مصر واتفق له مع الجبار ما اتفق ثم رجع الی الشام ومعه هاجرة ثم امر الله تعالیٰ ان ینقلها وولدها اسمعیل الی مکة فنقلهما ودعا هناک فقال " ربنا انی اسکنت من ذریتی بواد غیر ذی زرع عند بیتک المحرم " (الی قوله) " رب اغفرلی ولوالدی وللمؤمنین یوم یقوم الحساب "

(روح المعانی زیر آیت مذکورہ)

محمد بن کعب قتادہ، مجاہد اور حسن وغیرہ نے بیان کیا ہے کہ بے شک ابراہیم علیہ السلام اپنے "اب" کے لئے استغفار کرتے رہے جب آپ پر اس (آزر) کا کفر ظاہر ہوا۔ یعنی جب آپ نے سمجھ لیا کہ یہ کفر کو چھوڑنے والا نہیں تو آپ نے اس اللہ کے دشمن کے لئے استغفار کرنی چھوڑ دی۔ پھر آپ نے اس کی موت اور آگ کے واقعہ کے بعد شام کی طرف ہجرت کی۔ آپ کے ساتھ آپ کی زوجہ "ہاجرہ" بھی تھیں۔ پھر اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم دیا کہ ھاجرہ اور اسماعیل کو مکہ میں چھوڑ آؤ۔ آپ نے اپنی

زوجہ اور اپنے بیٹے کو مکہ کی سرزمین میں چھوڑ کر دعاء کی۔

''ربنا انی اسکنت ...... الآیۃ'' اس دعا میں'' ربنا اغفرلی ولوالدی'' بھی کہا

(اے اللہ میری اور میرے والدین کی مغفرت فرما)

" فانہ یستنبط من ذلک ان المذکور فی القرآن ھو عمہ حیث صرح فی الأثر الأول ان الذی ھلک قبل الھجرۃ ھو عمہ ودل الأثر الثانی علی ان الاستغفار لوالدیہ کان بعد ھلاک ابیہ بمدۃ مدیدۃ فلو کان الھالک ھو ابوہ الحقیقی لم یصح منہ علیہ السلام ھذا الاستغفار لہ اصلا " . (روح المعانی زیر آیت مذکورہ)

واضح ہوا کہ آپ کا وہ باپ جس کا قرآن پاک میں کافر ہونا مذکور ہے وہ چچا ہے۔ چچا کو بھی باپ کہہ لیا جاتا ہے۔ اور وہ بھی آپ کی ہجرت سے پہلے آگ کے واقعہ کے وقت ہلاک ہو گیا۔ اس وقت ابراہیم علیہ السلام کی عمر تقریبا بیالیس سال تھی۔ یہ بات پہلی حدیث مبارکہ (جو ابن منذر سے سلیمان بن صرد سے روایت کی ہے) سے سمجھ میں آئی۔ اور دوسری حدیث مبارکہ (محمد بن کعب کی روایت کردہ) سے واضح ہوا کہ آپ نے جب ہجرت کی تو راستہ میں ظالم بادشاہ کا واقعہ درپیش آیا۔ آپ شام میں گئے پھر فلسطین میں۔ نوے (۹۰) سال کی عمر میں آپ نے حضرت اسماعیل علیہ السلام اور حضرت ہاجرہ رضی اللہ عنہا کو مکہ میں چھوڑا۔ اس وقت آپ نے اپنے والدین کیلئے دعاء کی'' ربنا اغفر لی ولوالدی '' اے ہمارے رب میری اور میرے والدین کی مغفرت فرما۔

واضح ہوا کہ آپ نے چچا کیلئے دعاء چھوڑ دی تھی اور وہ ہلاک بھی ہو گیا تھا۔ لیکن آپ اپنے والدین کیلئے بہت عرصہ بعد بھی دعاء کرتے رہے۔

نبی کریم ﷺ والدینِ کریمین کے ایمان پر دلالت کرنے والی احادیث

" عن ابی ھریرۃ قال ، قال رسول اللہ ﷺ بعثت من خیر قرون بنی آدم فقرنا حتی بعثت عن القرن الذی کنت فیہ " . (بخاری الحاوی للفتاوی ج۲ ص ۲۱۰)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں آدم علیہ السلام سے لیکر بہتر خاندانوں میں منتقل ہوتا آرہا ہوں یہاں تک اب جس خاندان میں میں ہوں۔

یقینی بات ہے کہ کافر کو "خیر" سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا وہ تو "شر" کا مصداق ہے۔ جب آپ نے اپنے تمام آباء واجداد کو خیر کہا ہے تو وہ تمام شرک سے پاک تھے۔

عن انس ان النبی ﷺ قال " ما افترق الناس فرقتین الا جعلنی الله فی خیر هما فاخرجت من بین ابویّ فلم یصبنی شی من عهد الجاهلیة " (بیهقی دلائل النبوة، الحاوی للفتاوی ج۲ ص ۲۱۰)

جب بھی لوگوں کے دو فرقے بنے تو اللہ تعالیٰ نے مجھے بہتر فرقہ میں رکھا یہاں تک کہ میں اپنے والدین سے دنیا میں آیا، مجھے زمانہ جاہلیت کی کسی برائی نے مس نہیں کیا (چھوا نہیں)۔

حدیث پاک سے واضح ہوا کہ حضور ﷺ ہمیشہ بہتر فرقہ میں تشریف لاتے رہے۔ بہتر فرقہ وہی ہو سکتا ہے۔ جو اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کو مانتا ہو۔ کافر کبھی بہتر نہیں ہو سکتے۔ اور جب نبی کریم ﷺ کو زمانہ جاہلیت کی کسی برائی نے بھی نہیں مس کیا تو کفر وشرک کیسے آپ کے والدین میں ثابت کیا جا سکتا ہے۔

" عن ابن عباس قال قال رسول الله ﷺ لم یزل الله ینقلنی من الاصلاب الطیبة الی الارحام الطاهرة مصفی مهذ با لاتنشعب شعبتان الا کنت فی خیر هما "۔

(ابو نعیم دلائل النبوة، الحاوی للفتاوی ج۲ ص ۲۱۱)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے کہا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ہمیشہ مجھے پاک پشتوں سے پاک رحموں کی طرف منتقل کیا گیا۔ صاف مہذب خاندانوں میں منتقل ہوتا رہا۔ جب بھی دو فرقے بنے مجھے بہتر فرقہ میں رکھا گیا۔

اس حدیث پاک میں طہارت، صفائی، تہذیب، خیر کے الفاظ استعمال ہوئے کافر کبھی ان اوصاف کے مالک نہیں ہو سکتے۔

" عن واثله بن الاصقع قال قال رسول الله ﷺ ان الله اصطفی من ولد ابراهیم اسمعیل واصطفی من ولد اسمعیل بنی کنانة واصطفی من بنی کنانة قریشا واصطفی من قریش بنی هاشم واصطفانی من بنی هاشم " ۔ (مسلم، الحاوی للفتاوی ج ۲ ص ۲۱۱)

واثلہ بن اصقع سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیشک اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کی اولاد سے اسماعیل علیہ السلام کو برگزیدہ بنایا، اسماعیل علیہ السلام کی اولاد سے کنانہ کو برگزیدہ بنایا اور کنانہ کی اولاد سے قریش کو برگزیدہ بنایا اور قریش سے بنو ہاشم کو اور بنو ہاشم سے مجھے۔

واضح ہوا کہ نبی کریم ﷺ کے آباء واجداد وہی تھے جو رب تعالیٰ کو پسند تھے!

"عن ابن عباس قال قال رسول الله ﷺ والله ما افترق فرقتان منذ خلق الله آدم الا كنت في خيرهما" (طبقات ابن سعد، الحاوی للفتاوی ج ۲ ص ۲۱۱)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قسم ہے اللہ تعالیٰ کی آدم علیہ السلام کی پیدائش سے لے کر جب بھی دو فرقے بنے تو میں ان میں سے بہتر میں رہا۔

رسول اللہ ﷺ قسم اٹھا کر ارشاد فرمار ہے کہ آدم علیہ السلام سے لیکر میرے والد تک میرے آباء و اجداد میں سے ہر شخص بہتر تھا، اب اس کے بعد بھی کوئی کافر مانے تو وہ اپنی قسمت پر روئے۔

تیسرا مسلک: نبی کریم ﷺ کے والدین کریمین کے متعلق تیسرا مسلک یہ ہے کہ آپ ﷺ نے والدین کو زندہ کیا۔ اور انہوں نے آپ پر ایمان لایا۔ اگر چہ اس مسلک والوں نے بھی ایک حدیث پیش کی ہے لیکن وہ ضعیف ہے۔ اسی لئے راقم الحروف کے نزدیک دوسرا مسلک ہی قوی ہے۔

"عن عائشةؓ ان رسول الله ﷺ سئل ربه ان يحي ابويه فاحياهما له فآمنا به ثم اماتهما" (الحاوی للفتاوی ج ۲ ص ۲۳۰)

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے: بے شک رسول اللہ ﷺ نے اپنے رب سے سوال کیا کہ میرے والدین کو زندگی عطا فرما! تو اللہ تعالیٰ نے انہیں زندہ کیا اور انہوں نے آپ پر ایمان لایا، پھر ان کو فوت کر دیا گیا۔

چوتھا مسلک: جیسا کہ ابتداء میں ذکر کیا گیا ہے کہ حضور ﷺ کے والدین کے متعلق چوتھا مسلک یہ ہے کہ وہ (اس مسلک کے پیروکار) انہیں (والدین کریمین) ......العیاذ باللہ......کافر ومشرک مانتے ہیں۔

ان لوگوں کی غلطی کی وجہ کچھ احادیث اور قرآن پاک کی ایک آیت کریمہ ہے۔ دراصل ان کو سمجھنے میں غلطی لگی ہے۔

درج ذیل میں ان لوگوں کے ''مذہب'' کو ''اعتراض'' کی صورت میں پیش کیا جاتا ہے اور ان کا ''رد'' جواب کی صورت میں۔

﴿والله يهدی من يشاء الی صراط مستقيم﴾

اعتراض: قرآن پاک میں ہے:

﴿وَلَا تُسْئَلُ عَنْ اَصْحٰبِ الْجَحِيْمِ﴾ جہنم والوں کے متعلق آپ سے نہیں پوچھا جائے گا۔

اس آیت کریمہ کا شان نزول یہ بیان کیا گیا ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا: ''لیت شعری ما فعل ابوای'' کاش کہ مجھے معلوم ہوتا کہ میرے والدین سے کیا کیا گیا۔ تو اس وقت یہ آیت مبارکہ نازل ہوئی۔

جواب: ''لم يخرج في شيء من كتب الحديث المعتمدة، وإنما ذكر في بعض التفاسير بسند منقطع لا يحتج به ولا يعول عليه'' (الحاوی للفتاوی ج ۲ ص ۲۲۲)

احادیث کی معتبر کتابوں میں اس روایت کا نام ونشان تک نہیں پایا گیا بعض تفاسیر نے منقطع سند سے بیان کیا ہے، جسے حجت نہیں بنایا جا سکتا اور نہ ہی اس پر کوئی اعتبار ہے۔

علامہ سیوطیؒ فرماتے ہیں اگر اس طرح کی کمزور روایات کو تسلیم کیا جائے تو ہم اس کے جواب میں ایک کمزور روایت پیش کر دیں گے۔ اس طرح ''معارضة الواهي بالواهي'' (کمزور کا معارضہ کمزور سے) ہو جائے گا۔ وہ کمزور روایت یہ ہے:

''هبط جبريل على فقال إن الله يقرئك السلام ويقول إني حرمت النار على صلب انزلك وبطن حملك وحجر كفلك'' (الحاوی للفتاوی ج ۲ ص ۲۲۴)

حضرت علی سے مرفوع روایت مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میرے پاس جبریل آئے تو انہوں نے کہا بے شک اللہ تعالیٰ آپ کو سلام کہتا ہے، اور یہ کہہ رہا ہے کہ بے شک میں نے آگ حرام کر دی ہے ان پشتوں پر جن سے آپ منتقل ہو کر آئے، اور ان رحموں (بچہ دانیوں) پر جن میں آپ رہے۔ اور ان گودوں پر جن میں آپ نے پرورش پائی۔

علامہ سیوطیؒ اس روایت پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں: ''إنا لا نرى ذلك ولا نحتج به'' بے شک ہم اس قسم کی کمزور روایات کا سہارا نہیں لیتے اور نہ ہی ان کو بطور حجت پیش کرتے ہیں۔ بلکہ بفضلہ تعالیٰ صحیح روایات کو بطور دلیل پیش کیا ہے۔

علامہ سیوطی کی اس بحث سے واضح ہو گیا کہ آیت کریمہ کے شان نزول کے لحاظ سے جو اعتراض کیا گیا وہ ایک ضعیف اور منقطع سند پر موقوف ہے۔ اس قسم کی روایت سے کسی کا گناہگار ہونا بھی ثابت نہیں کیا جا سکتا تو کفر وشرک کیسے ثابت کیا جا سکتا ہے۔

آیت کریمہ کا شانِ نزول: (سند صحیح سے)

"اخرج عبد بن حميد والفريابي وابن جرير وابن المنذر في تفاسيرهم عن مجاهد قال من اول البقرة أربع آيات في نعت المؤمنين و ثلاث عشرة في نعت المنافقين ومن أربعين آية إلى عشرين ومائة في بني اسرائيل ، اسناده صحيح ومما يؤكد ذلك أن السورة مدنية واكثر ما خوطب فيها اليهود" (الحاوی للفتاوی ج ۲ ص ۲۲۴)

عبد بن حمید اور فریابی اور ابن جریر اور ابن منذر نے اپنی تفاسیر میں مجاہد سے روایت بیان کی ہے کہ سورہ بقرہ کی پہلی چار آیتیں مومنین کی شان میں نازل ہوئیں اور تیرہ آیات منافقین کے متعلق نازل ہوئیں۔ اور آیت نمبر چالیس سے لیکر آیت نمبر ایک سوبیس تک بنی اسرائیل کے حق میں نازل ہوئیں اس روایت کی سند صحیح ہے اور خاص کر کے یہ بات بھی واضح ہے کہ یہ سورۃ مدنی ہے مدینہ طیبہ میں زیادہ طور پر خطاب یہود کو ہی ہوا۔

آیت کریمہ کا سیاق وسباق (یعنی اس سے پہلے والی آیات اور بعد والی) بھی اسی پر دلالت کر رہا ہے کہ یہ آیت کریمہ بھی بنی اسرائیل کے متعلق ہی ہے۔

واضح ہوا کہ اس آیت کے شان نزول سے نبی کریم ﷺ کے والدین کریمین کا کفر وشرک نہیں ثابت کیا جا سکتا۔

اعتراض: مستدرک حاکم میں ایک روایت مذکور ہے جس میں یہ ذکر ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ملیکہ کے دو بیٹوں کو کہا "امکما فی النار" "تمہاری ماں آگ میں ہے جب آپ کا یہ ارشاد ان پر شاق گذرا تو آپ نے ان کو بلایا اور ارشاد فرمایا "ان امی مع امکما فی النار" "بے شک میری ماں بھی تمہاری ماں کے ساتھ آگ میں ہے اس حدیث کی سند کو بھی مستدرک میں صحیح قرار دیا گیا ہے جب اس حدیث سے رسول اللہ ﷺ کی والدہ کا جہنمی ہونا ثابت ہے تو تم کس طرح جنتی ہونا اور حالت ایمان پر ہونا ثابت کرتے ہو؟

جواب: مستدرک میں احادیث کو صحیح کہنے میں بہت جگہ تساہل (آسان طلبی، عدم تحقیق) واقع ہے "وقد تقرر في علوم الحديث إنه لا يقبل تفرده بالتصحيح" "علوم حدیث میں یہ

بات واضح ہے کہ مستدرک میں جن احادیث کو صحیح کہا گیا ہے اگر ان کی تائید میں اور حدیث سند صحیح سے مل جائے تو اسے صحیح قرار دیا جائے گا ورنہ ان کے صحیح کہنے کو بلا چون و چرا صحیح تسلیم نہیں کیا جائے گا۔

پھر یہی حدیث جب ذہبی رحمہ اللہ نے ''مختصر المستدرک'' میں نقل کی اور حاکم کا قول نقل کیا ''انہ صحیح'' کہ یہ صحیح حدیث ہے تو اس کا ذہبی نے مؤاخذہ کرتے ہوئے یہ کہا'' قلت لا واللہ فعثمان بن عمیر ضعفه الدار قطنی.'' میں کہتا ہوں قسم ہے اللہ تعالیٰ کی اس روایت کی سند میں عثمان بن عمیر کا ذکر ہے جسے دار قطنی نے ضعیف قرار دیا ہے۔

جب بھی ذہبی نے اس حدیث کو ضعیف قرار دیا ہے اور قسم اٹھا کر ضعف ثابت کیا ہے۔ تو اس سے کفر و شرک جیسا عظیم جرم کیسے ثابت کیا جا سکتا ہے۔

اعتراض: مسلم میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے!

" ان رجلا قال یا رسول الله این ابی قال فی النار فلما قفی دعاه فقال ان ابی و اباک فی النار "

(مسلم ج اول باب بیان ان من مات علی الکفر فهی فی النار ص ۱۳۲)

ایک شخص نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اس نے عرض کیا یا رسول اللہ میرا باپ کہاں ہے ؟ (جنت میں یا دوزخ میں) آپ نے فرمایا آگ میں۔ جب وہ واپس جانے لگا تو آپ نے اسے بلایا اور فرمایا'' بے شک میرا باپ اور تمہارا باپ آگ میں ہیں''۔

ابوداؤد نے حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ سے حدیث روایت کی ہے۔

" انه ﷺ استاذن فی الاستغفار لأمه فلم یؤذن له "

بیشک نبی کریم ﷺ نے اپنی ماں کے لئے استغفار کرنے کی اجازت طلب کی تو آپ کو اجازت نہیں دی گئی۔

ان دونوں حدیثوں سے پتہ چلا کہ نبی کریم ﷺ کے والدین (معاذاللہ) کافر و شرک تھے، تم کیسے ان کو مسلمان مانتے ہو؟ اور کیسے کہتے ہو وہ مشرک نہیں تھے ؟

جواب: مسلم کی یہ حدیث ضعیف ہے۔ ضعیف حدیث سے احکام ثابت نہیں ہوتے۔ چہ جائیکہ کفر ثابت ہو اور وہ بھی سید الانبیاء محمد مصطفیٰ علیه التحية و الثناء کے والدین کریمین کا کفر ثابت ہو، یہ

کبھی ممکن نہیں ہو سکتا۔

"ان هذه اللفظة وهی قوله" ان ابی و اباك فی النار . لم یتفق علی ذکرها الرواة" .
(الحاوی للفتاوی ج۲ . ص ۲۲۶)

مسلم میں جو یہ لفظ" ان ابی و اباك فی النار "آئے ہوئے ہیں ان میں راویوں کا اتفاق نہیں کیونکہ مسلم نے یہ روایت حماد بن سلمہ سے تخریج کی ہے۔ حماد بن سلمہ اور ثابت حضرت انس سے روایت کرتے ہیں، اور اس کے مخالف" روایتِ معمر" ہے۔ حضرت معمر روایت کرتے ہیں ثابت سے اور ثابت انس سے اس روایت میں" ان ابی و اباك فی النار "کے الفاظ نہیں بلکہ اس میں یہ الفاظ ہیں" اذا مررت بقبر کافر فبشره بالنار "جب تم کسی کافر کی قبر سے گذرو تو اس کو نار کی بشارت دے دو۔ ان الفاظ میں حضور کے والد کا کوئی ذکر نہیں یہ روایت زیادہ صحیح ہے بنسبت حماد کی روایت کے!

" فان معمرا اثبت من حماد فان حمادا تکلم فی حفظه ووقع فی احادیثه مناکیر "
(الحاوی للفتاوی ج۲ ص ۲۲۳)

بیشک معمر کی حدیث حماد کی حدیث سے زیادہ صحیح ہے کیونکہ حماد کے حافظہ میں کلام ہے اور حماد کی روایت کردہ زیادہ احادیث منکر ہیں جو معروف کے مقابل ہونے کی وجہ سے مردود العمل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ امام بخاری نے حماد سے روایت نقل نہیں کی۔

" واما معمر فلم یتکلم فی حفظه ولا استنکر شیء من حدیثه " .
(الحاوی للفتاوی ج۲ ص ۲۲۳)

معمر کی روایت بزار اور طبرانی نے بیان کی۔ لیکن معمر کا حافظہ قوی تھا ان کے حافظہ کے متعلق کوئی کلام نہیں اور نہ ہی ان کی مرویات میں سے کوئی منکر ہے۔

معمر کی روایت کی مؤید روایات:

" عن ابراهیم بن سعد عن الزهری عن عامر بن سعد عن ابیه ان اعرابیا قال رسول اللہ ﷺ این ابی ؟ قال فی النار قال فأین ابوک قال حیثما مررت بقبر کافر فبشره بالنار "
(رواه البیهقی)

عامر بن سعد اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ ایک اعرابی نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں عرض کیا میرا باپ کہاں ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا آگ میں، اس نے کہا آپکے باپ کہاں ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا جب تمہارا گذر کسی کافر کی قبر سے ہوتو اسے آگ کی بشارت دے دیا کرو۔

نبی کریم ﷺ کا یہ جواب نہایت ہی حکیمانہ تھا جس میں آپ نے اس کے سوال کا ایسا جواب دیا جس سے اس کی دل شکنی نہ ہو۔ اگر آپ ﷺ یہ فرماتے کہ میرے والد تو جنت میں ہیں تو یقیناً وہ شخص پریشان ہوتا۔

" وهذا اسناد على شرط الشيخين فتعين الاعتماد على هذا اللفظ وتقديمه على غيره "

(الحاوی للفتاوی ج ۲ ص ۲۲۶)

اس روایت کا اسناد شرائط شیخین (بخاری و مسلم) پر ہونے کی وجہ سے صحیح ہے اور اس پر ہی اعتماد ہوگا۔ یہ روایت دوسری روایات سے مقدم ہوگی۔

طبرانی اور بیہقی نے اسی حدیث کے آخر میں ذکر کیا ہے کہ اعرابی نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ اور اس نے کہا!

" لقد كلفني رسول الله ﷺ تعبا ما مررت بقبر كافر الا بشرته بالنار "

رسول اللہ ﷺ نے مجھے مشقت میں مبتلاء کر دیا ہے کیونکہ میں جس کافر کی قبر سے گذرتا ہوں اسے آگ کی بشارت دیتا ہوں۔

معلوم ہوا کہ وہ اعرابی اپنی عربی زبان سے باخبر تھا، اور نبی کریم ﷺ کے طرز تکلّم سے بھی آشنا تھا، جس سے کلام کیا گیا جب اسی نے آپ کے ارشاد کو عام سمجھا تو دوسرے کسی کو کیا حق پہنچتا ہے کہ وہ نبی کریم ﷺ کے والدین کو کافر کہہ کر اپنی عاقبت کو برباد کرے۔

ابن ماجہ نے بھی یہی حدیث ابراہیم بن سعد کی روایت سے ذکر کی ہے، ابراہیم بن سعد نے زہری سے اور زہری نے سالم سے اور سالم نے اپنے باپ (عبد اللہ بن عمر) سے روایت کی ہے۔ انہوں نے کہا!

" جاء اعرابي الى النبي ﷺ فقال يا رسول الله ان ابي كان يصل الرحم فاين هو ؟

قال في النار قال فكأنه وجد من ذلک فقال یارسول الله فاين ابوک ؟ قال رسول الله ﷺ حیثما مررت بقبر مشرک فبشره بالنار ، قال فاسلم الاعرابی بعد قال لقد کلفنی رسول الله ﷺ تعبا ما مررت بقبر کافر الا بشرته بالنار "

نبی کریم ﷺ کی خدمت میں ایک اعرابی آیا اس نے کہا یارسول اللہ بیشک میرا باپ صلہ رحمی کرتا تھا وہ کہاں ہے (جنت میں یا دوزخ میں) تو آپ نے فرمایا وہ آگ میں ہے۔ اس نے (یہ جواب سن کر) اپنے دل میں غم پایا پھر کہا۔ یارسول اللہ آپ کے باپ کہاں ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب تمہارا کسی مشرک کی قبر سے گذر ہو تو اسے آگ کی بشارت دے دو، راوی کہتے ہیں اس کے بعد اس اعرابی نے اسلام قبول کرلیا اور وہ کہتے تھے کہ نبی کریم ﷺ نے مجھے مشقت میں مبتلاء کردیا ہے کہ میں جس قبر سے گذرتا ہوں اسے آگ کی بشارت دیتا ہوں۔

نکتہ: اعرابی کا اسلام قبول کرنے سے پہلے "یارسول اللہ" کہنا اس پر دلالت کر رہا ہے کہ اس کے دل میں اسلام راسخ ہو چکا تھا۔

اور ایک مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس اعرابی کا سوال تو اسلام قبول کرنے کے بعد ہو لیکن مندرجہ بالا عبارت کا مفہوم اس طرح بیان کیا جائے کہ وہ اعرابی چونکہ اسلام لا چکے تھے اس لئے اسلام لانے کے بعد نبی کریم ﷺ کے ارشاد کو تسلیم کرنے کے بغیر کوئی چارۂ کار نہ سمجھا۔ (الحاوی للفتاوی ج۲ ص۲۲۴)

والله اعلم بالصواب (راقم)

" فهذه الزيادة اوضحت بلا شک ان هذا اللفظ العام هو الذی صدر منه ﷺ ورأه الاعرابی بعد اسلامه امرا مقتضيا للامتثال فلم يسعه الا امتثاله " (الحاوی للفتاوی ج ۲ ص ۲۲۴، ۲۳۷)

اس زیادتی سے بلاشک یہ واضح ہوگیا کہ نبی کریم ﷺ نے جواب عمومی طور پر دیا اور اعرابی نے بھی اسلام قبول کرنے کے بعد اس امر کی فرمانبرداری کو لازم قرار دیا، اس نے بغیر تسلیم کرنے کے اپنے لئے کوئی چارہ کار نہ سمجھا۔

جو روایت معمر کی ثابت سے اور ثابت کی انس سے مذکور ہے بعینہ ان الفاظ سے ہی سعد ابن ابی وقاص سے بھی روایت بوار اور طبرانی نے بیان کی ہے۔

مسلم کی روایت میں غلطی کی وجوہ!

پہلی وجہ : وہی ہے جس کا ذکر کیا جا چکا ہے کہ حماد کے حافظہ میں کمی تھی اور اس کی روایات "منکر" بھی ہیں؛ لہٰذا حماد کی روایت سے کفر ثابت کرنا ممکن نہیں، ایسی حدیث سے عام حکم ثابت نہیں ہوسکتا تو کفر کیسے ثابت کیا جاسکتا ہے؟

دوسری وجہ :

" فعلم ان هذا اللفظ الاول من تصرف الراوی رواه بالمعنی علی حسب فهمه وقد وقع فی الصحیحین روایات کثیرة من هذا النمط فیها لفظ تصرف فیه الراوی وغیره اثبت منه "

(الحاوی للفتاوی ج۲ ص ۲۲۰)

معلوم ہوا کہ حماد کی روایت میں الفاظ" ان اباك و ابی فی النار "راوی کا تصرف ہے۔ یعنی روایت بالمعنی ہے روایت بالمعنی کا مطلب یہ ہے کہ" راوی، حدیث کا مفہوم اپنے الفاظ میں پیش کرے، وہ الفاظ نبی کریم ﷺ کے نہ ہوں" اس طرح کی روایات میں راویوں سے غلطی ہو جاتی ہے، ایسی روایات بخاری اور مسلم میں کئی ہیں ان روایات کے مقابل جب وہ روایات آجائیں جن کو بالفاظہ روایت کیا جائے تو وہ زیادہ معتبر ہوں گی۔ روایت بالفاظہ کا مطلب یہ ہے کہ حدیث کا راوی نبی کریم ﷺ کے منہ مبارک سے نکلے ہوئے الفاظ کو ہی ادا کرے ان میں کوئی لفظ بھی اپنی طرف سے نہ لائے۔

حدیث بالمعنی کی اور مثال

"عن عائشة ام المؤمنین انها قالت اتی رسول الله ﷺ بصبی فبال علی ثوبه فدعا بماء فاتبعه اياه"

(بخاری جلد اول باب بول الصبیان ص ۳۵)

ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ کے پاس ایک بچہ کو لایا گیا اس بچے نے آپ کے کپڑوں پر پیشاب کر دیا آپ نے پانی منگایا اور کپڑے پر بہایا۔

اس روایت کے برعکس دوسری روایت بالمعنی ذکر ہے جس میں غلطی کا احتمال ہے وہ روایت یہ ہے:

عن عبید الله بن عتبه عن ام قیس بنت محصن انها اتت بابن لها صغیر لم یاکل

الطعام الی رسول اللہ ﷺ فاجلسه رسول اللہ ﷺ فی حجرہ فبال علی ثوبه فدعا بماء فنضحه ولم یغسله ۔ (بخاری جلد اول باب بول الصبیان ص ۳۵)

عبداللہ بن عتبہ ام قیس بنت محصن سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے اپنے چھوٹے بچے کو رسول اللہ ﷺ کے پاس لایا جو کھانا نہیں کھا سکتا تھا، اس کو آپ نے اپنی گود میں بٹھایا، اس نے آپ کے کپڑوں پر پیشاب کر دیا آپ نے پانی طلب کیا وہ کپڑوں پر چھڑکا اور کپڑوں کو دھویا نہیں ۔

اسی مضمون کو بعض روایات میں " فرشه " سے بیان کیا گیا۔ اور بعض روایات میں ''فصب'' کے لفظ سے ذکر کیا گیا ہے ۔

"نضح " کا معنی ہے برتن کا رسنا اور پسینہ بہنا۔ اسلئے اس کا ظاہری مفہوم بنے گا'' پانی چھڑکا''

" رش " کا معنی ہے پانی چھڑکنا، بکھیرنا آسمان کا پھوار برسانا۔ اس کا بھی ظاہری معنی یہی ہوگا، پانی چھڑکا پھر " لم یغسله "کے الفاظ سے مزید غلطی ہوتی ہے کہ آپ نے کپڑوں کو دھویا نہیں جس سے پتہ چلتا ہے کہ بچے کا پیشاب ناپاک نہیں اور اس سے کپڑوں کا دھونا لازم نہیں ۔ حالانکہ اس طرح نہیں کیونکہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت میں ہے۔

" بماء فاتبعه '' ای اتبع رسول اللہ ﷺ البول بماء " (حاشیہ بخاری)

نبی کریم ﷺ نے پیشاب کا پانی سے پیچھا کیا یعنی آپ نے پانی بہایا اور کپڑے کو دھویا اس معنی پر وہ روایت دلالت کرتی ہے جس میں ''فصب'' کا لفظ ہے اور اس کا معنی ہی پانی بہانا اور گرانا ہے

اب تمام روایات کو تطبیق اس طرح دی جاسکے گی ''غسله من غیر فرک وغیر مبالغة '' آپ نے کپڑے کو دھویا لیکن دھونے میں مبالغہ نہیں کیا اور کھرچا نہیں اسلئے کہ بچے کے پیشاب میں زیادہ بو نہیں ہوتی ۔ بدبو کے زائل کرنے کے لئے زیادہ مبالغہ کیا جاتا ہے اب واضح ہوا کہ عبیداللہ بن عتبہ کی روایت بالمعنی ہے اگر اس کی تاویل نہ کی جائے تو معنی باطل ہوتا ہے ۔

تیسری وجہ : " ما خرج مسلم لحماد فی الاصول الا من حدیث عن ثابت " (الحاوی للفتاوی ج۲ ص ۲۲۴)

مسلم نے حماد کی روایات کو اصول میں ذکر نہیں کیا۔ صرف یہی حدیث ''ثابت'' سے

اصول میں ذکر کی ہے، اور اس میں بھی راقم کے نزدیک سہو ہوا ہے کہ اسے اصول میں نہیں ذکر کرنا چاہئے تھا۔ یعنی مسلم کا طریقہ ہے کہ بعض روایات کو باب (عنوان) کے مطابق بالاصالت ذکر کرتا ہے۔ اور بعض کو بالتبع۔ وہ روایات جو بالتبع ذکر کرتا ہے ان میں ضعیف حدیثوں کو نقل کر لیتا ہے۔ جیسا کہ کتاب الایمان (جمع الیمین) میں ایک حدیث کی سند یہ ہے۔

" حدثنا الصعق یعنی ابن حزن قال حدثنا مطر الوراق عن زهدم " .

اس حدیث کی سند پر الدار قطنی نے ان الفاظ سے اعتراض کیا۔

" الصعق ومطر لیسا قویین ولم یسمعه مطر من زهدم وانما رواه عن القاسم عنه "

صعق اور مطر قوی راوی نہیں اور مطر نے زہدم سے سنا بھی نہیں بلکہ اس کی روایت قاسم سے مروی ہے۔

دار قطنی کے اس استدراک پر علامہ نووی نے تحریر کیا!

" وهذا الاستدراک فاسد لان مسلما لم یذکر متاصلا وانما ذکره متابعة للطرق الصحیحة السابقة وقد سبق ان المتابعات یحتمل فیها الضعف "

دار قطنی کا یہ استدراک فاسد ہے کیونکہ مسلم نے یہ روایت بالاصالۃ ذکر نہیں کی بلکہ سابقہ صحیح طرق سے بیان کردہ احادیث کے بالتبع اس روایت کو ذکر کیا ہے۔ اور امام مسلم بالتبع ضعیف روایات بھی نقل کر لیتے ہیں۔

یہاں سے واضح ہوا کہ حماد کی روایت جب مسلم نے سوائے ثابت کی روایت کے بالاصالۃ ذکر نہیں کی تو اس کی وجہ صرف یہی ہو سکتی ہے کہ مسلم کے نزدیک بھی حماد ضعیف راوی ہے۔ لہذا یہ روایت بالاصالۃ نقل کرنے میں مسلم سے یقیناً سہو ہوا ہے۔ یہ بھی بالتبع ذکر ہونی چاہئے تھی تاکہ اس کا ضعف بھی واضح ہوتا۔

چوتھی وجہ : مسلم اور بخاری کے راویوں سے بھی کہیں نہ کہیں سہو ہوا ہے۔ مثال کے طور پر ایک حدیث پیش کر رہا ہوں اس کی طرف توجہ کریں۔

" عن عطاء قال حضرنا مع ابن عباس جنازة میمونة بسرف فقال هذا زوجة

رسول اللہ ﷺ فاذا رفعتم نعشها فلا تزعزعوها ولا تزلزلوها وارفقوا بها فانه كان عند رسول اللہ ﷺ تسع نسوة كان يقسم منهن لثمان ولا يقسم لواحدة قال عطاء التي كان رسول اللہ ﷺ لا يقسم لها بلغنا انها صفية وكانت آخر هن موتا ماتت بالمدينة (متفق عليه) وقال رزين قال غير عطاء هي سودة وهو اصح وهبت يومها لعائشة " (مشکوۃ باب القسم)

عطاء سے مروی ہے کہ ہم حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی معیت میں حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کے جنازہ میں مقام ''سرف'' میں حاضر ہوئے تو آپ نے فرمایا: یہ رسول اللہ کی زوجہ ہیں جب تم ان کے جنازہ کو اٹھانا تو اسے نہ حرکت دینا اور نہ جھنجوڑا دینا، بلکہ آرام اور نرمی سے اٹھانا۔ کیونکہ یہ نبی کریم ﷺ کے پاس رہنے والی نو ازواج مطہرات میں سے ہیں۔جن میں آپ باریوں کو برابر طور پر تقسیم فرماتے تھے وہ آٹھ تھیں ایک کی باری مقرر نہیں تھی۔

عطاء راوی نے کہا کہ وہ زوجہ جس کی باری آپ مقرر نہیں فرماتے تھے وہ حضرت صفیہ تھیں اور وہی مدینہ طیبہ میں سب سے آخر فوت ہوئیں۔

یہ حدیث بخاری اور مسلم دونوں نے ذکر کی ہے۔لیکن اس کے آخری حصہ میں عطاء راوی سے دوطرح کا سہو واقع ہوا ہے ایک تو وہی جو صاحب مشکوۃ نے رزین کے حوالہ سے نقل کر دیا کہ وہ زوجہ جن کی باری مقرر نہیں تھی وہ حضرت سودہ رضی اللہ عنہا تھیں حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا نہیں تھی؛ کیونکہ حضرت سودہ نے خود اپنی باری سے دستبردار ہونے کی درخواست کردی تھی۔حضور کی خدمت میں عرض کیا تھا کہ میں بوڑھی ہوگئی ہوں مجھے عام عورتوں کی سی خواہش نہیں آپ میری باری حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو دے دیں۔

راوی سے دوسرا سہو یہ ہوا ہے کہ راوی نے کہا سب سے آخری مدینہ طیبہ میں فوت ہونے والی یہی ہیں، حالانکہ یہ درست نہیں۔

" لانها ماتت في رمضان سنة خمسين في زمن معاوية وماتت ميمونة بعد سنة احدى وخمسين وعائشة سنة سبع وخمسين وسوده سنة اربع وخمسين وام سلمة سنة تسع وخمسين " (از مرقاۃ المفاتیح)

اس لئے کہ حضرت صفیہ کی وفات پچاس ہجری میں ہوئی اوران کے بعد چار ازواج مطہرات کی وفات ہوئی کیونکہ حضرت میمونہ کی وفات اکاون ہجری میں اور حضرت عائشہ کی ستاون ہجری میں اور حضرت سودہ کی چون ہجری میں اور حضرت ام سلمہ کی انسٹھ ہجری میں ہوئی۔ اس حدیث اوراس کی شرح سے یہ واضح ہوگیا کہ مسلم اور بخاری کے راوی سے بھی سہو ہوسکتا ہے۔ لہذا یہ روز روشن کی طرح واضح ہو گیا کہ مسلم اور بخاری کے راوی سے جب سہو ہوسکتا ہے تو اس حدیث میں بھی سہو ہوا ہے۔ جس میں رسول اللہ ﷺ کے والد مکرم کی طرف کفر کی نسبت کی گئی ہے۔

پانچویں وجہ :

مسلم کے راویوں سے ایسی احادیث بھی مروی ہیں جوراوی نے اپنے علم کے مطابق بات بیان کی ہے لیکن وہ دوسرے مشہور راویوں کی روایات کے خلاف ہونے کی وجہ سے معتبر نہ رہیں جیسا کہ حضرت نافع سے مروی ہے۔

" ذکر عند ابن عمر عمرة رسول اللہ من الجعرانہ فقال لم یعتمر منھا "۔

(مسلم ج ٢ باب نذر الکافر وما یفعل فیه اذا اسلم)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے نبی کریم ﷺ کے عمرہ کا تذکرہ کیا گیا کہ آپ نے جعرانہ سے عمرہ کا احرام باندھا، تو آپ نے کہا کہ حضور ﷺ نے وہاں سے عمرہ نہیں کیا۔ اس پر بحث کرتے ہوئے علامہ نووی فرماتے ہیں۔

" لم یعتمر منھا ھذا محمول علی نفی علمه ای انه لم یعلم ذلک وقد ثبت ان النبی ﷺ اعتمر من الجعرانة والاثبات مقدم علی النفی لما فیه من زیادة العلم وقد ذکر مسلم فی کتاب الحج اعتمار النبی ﷺ من الجعرانة عام حنین من روایة انس ﷺ واللہ اعلم "

حضرت ابن عمر کا یہ کہنا کہ حضور نے جعرانہ سے عمرہ نہیں کیا اسے ان کے علم نہ ہونے پر محمول کیا جائے گا، کہ آپ کو اس کا علم نہ ہوسکا، ورنہ نبی کریم ﷺ کا جعرانہ سے عمرہ کرنا ثابت ہے۔ اثبات والا قول نفی والے قول سے مقدم ہے؛ کیونکہ اثبات میں علم زیادہ پایا گیا ہے۔ اور خود مسلم نے کتاب الحج میں حضرت انس ﷺ کی روایت سے نبی کریم ﷺ کے جعرانہ سے عمرہ کرنے کا ذکر کیا ہے۔

ان مندرجہ بالا وجوہ کے پیش نظر یہ کہنا دشوار نہ رہا کہ مسلم کی حدیث بروایت حماد ضعیف ہے اس سے نبی کریم ﷺ کے والدین کا کفر ثابت نہیں ہوسکتا۔

یہی وجہ ہے کہ مسلم کی اس حدیث کے متعلق رئیس المتقین، استاذ الاساتذہ حضرت علامہ پیر سید حسین الدین شاہ دامت برکاتہ العالیہ مہتمم وشیخ الحدیث جامعہ رضویہ ضیاء العلوم راولپنڈی فرماتے ہیں کہ یہ حدیث متناً " مضطرب " ہے، لہٰذا قابل وثوق نہیں۔

متناً مضطرب کی ایک مثال:

فاطمہ بنت قیس سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے زکوۃ کے متعلق سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا "ان فی المال لحقا سوی الزکوۃ" بیشک مال میں سوائے زکوۃ کے حق ہے۔
اسی حدیث کے الفاظ اور معانی میں اضطراب ہے لہٰذا یہ حدیث قابل عمل اور قابل اعتبار نہیں، کیونکہ اس کے خلاف ابن ماجہ نے روایت یوں بیان کی ہے "لیس فی المال حق سوی الزکوۃ" مال میں سوائے زکوۃ کوئی حق نہیں۔ (نزھۃ النظر علی نخبۃ الفکر ص ۸۱)

یعنی فرض صرف زکوۃ ہے باقی تو صدقات واجبہ ہیں اور کوئی مستحب یہی ابن ماجہ کی جو روایت ہے وہی معتبر ہے پہلی روایت مضطرب ہو جانے کی وجہ سے قابل اعتبار نہیں۔

ابوداؤد کی حدیث "استغفار کی اجازت نہ ملنا" وہ بھی تعارض کی وجہ سے کفر ثابت کرنے میں ناکام ہے؛ کیونکہ دوسری صحیح احادیث سے پاک رحموں اور پاک صلبوں سے منتقل ہونا ثابت ہے
والحدیث الصحیح إذا عارضہ ادلۃ اخری ھی ارجح منہ وجب تاویلہ وتقدیم تلک الادلۃ علیہ کما ھو مقرر فی الاصول وبھذا الجواب الاخیر یجاب عن حدیث عدم الاذن فی الاستغفار. (الحاوی للفتاوی ج ۲ ص ۲۲۷)

صحیح حدیث کے مقابل جو دوسری صحیح احادیث آجائیں جو اس سے زیادہ راجح ہوں تو ضروری ہو جاتا ہے کہ صحیح حدیث کی تاویل کی جائے اور اسکے مقابل صحیح اور راجح روایات کو مقدم کیا جائے اصول حدیث میں اس ضابطہ کو واضح طور پر بیان کیا گیا ہے لہٰذا عدم استغفاد والی حدیث قابل تاویل ہے۔

اعتراض: امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے اپنی کتاب ''فقہ اکبر'' میں نبی کریم ﷺ کے والدین کے متعلق ذکر کیا ہے ''ماتا علی الکفر'' وہ دونوں کفر پر فوت ہوئے جب امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ انہیں کافر کہا ہے تو کس طرح ان کو مومن اور جنتی کہا جا سکتا ہے۔

جواب: فقہ اکبر کے نسخوں میں بہت اختلاف ہے بعض میں ہے'' ماتا علی الکفر '' وہ دونوں کفر پر فوت ہوئے بعض میں ہے''ماماتا علی الکفر '' وہ دونوں کفر پر فوت نہیں ہوئے اور بعض نسخوں میں'' ماتا علی الفترة '' وہ دونوں دین فترت پر پیدا ہوئے یعنی توحید پر قائم رہتے ہوئے دنیا سے گئے ہیں اور بعض نسخوں میں یہ مسئلہ بالکل ذکر ہی نہیں۔

مولوی وکیل احمد صاحب سکندر پوری نے فقہ اکبر کا نہایت صحیح نسخہ حیدر آباد سے حاصل کر کے چھپوایا اور ثابت کیا کہ یہ صحیح اور باقی نسخے غلط ہیں اس نسخہ میں اس مسئلہ کا ذکر نہیں۔

اتنے شدید اختلاف کے پیش نظر نبی کریم ﷺ کے والدین کریمین کو کافر و مشرک قرار دینا کہاں کا انصاف و ایمان ہے عقل کا تقاضا یہی ہے کہ ان کو مومن جنتی تسلیم کیا جائے۔

(از تفسیر نعیمی پ ۱ ص ۶۱۱)

فقہ اکبر میں راقم کا موقف:

راقم کے نزدیک صحیح یہ ہے کہ فقہ اکبر کا صحیح نسخہ'' ماماتا علی الکفر ''(وہ دونوں کفر پر نہیں فوت ہوئے) والا ہے کتابت کی غلطی سے لفظ مارہ گیا ہے ایسا اکثر طور پر تساہل ہو جاتا ہے کتابت میں غلطیوں کا وقوع ہوتا رہتا ہے اور جب پروف ریڈنگ میں ذرا بھر تساہل ہو جائے تو مسئلہ الٹ پلٹ ہو کر رہ جاتا ہے راقم کو تصنیفی میدان میں قدم رکھنے سے خاص تجربہ حاصل ہے نور الایضاح کا میں نے عربی حاشیہ ذریعۃ النجاح ترتیب دیا ہے جس کے ص ۴۵ حاشیہ نمبر ۲ پر ما اختلفوا کی جگہ اختلفوا تحریر ہو گیا دو تین ایڈیشن اسی طرح چھپ چکے ہیں اسی طرح کی اور بھی کئی اغلاط آ گئی ہیں اسی طرح میری تصنیف ''تذکرۃ الانبیاء'' کے ص ۵۴۰ پر آپ کی دعوت پر پہلے اسلام لانے والے عنوان کے تحت اصل مسودہ میں یہ عبارت ہے ''آزاد کردہ غلاموں میں حضرت زید اور غلاموں میں حضرت بلال'' لیکن پہلے ایڈیشن میں کتابت کی غلطی سے عبارت یہ ہے آزاد کردہ غلاموں میں حضرت بلال'' دوسرا ایڈیشن مکتبہ ضیائیہ بوہڑ بازار راولپنڈی نے چھپوایا چھپنے سے پہلے میں نے غلطی لگا کر دی لیکن تصحیح پھر غلط ہی ہوئی اب

عبارت یہ ہے آزاد کردہ غلاموں میں حضرت زید اور حضرت بلال'' یہ بھی غلط ہے اس طرح کتابت کی غلطیاں اور پروف ریڈنگ میں تساہل ہوتا رہتا ہے۔

نبی کریم ﷺ کے والدین کو کافر کہنا درحقیقت آپ کو ایذا دینا ہے

'' قال السهيلي في الروض الانف بعد ايراده حديث مسلم وليس لنا نحن ان نقول ذلك في ابويه ﷺ لقوله " لا تؤذوا الاحياء بسبب الأموات وقال تعالىٰ " ان الذين يؤذون الله ورسوله "(الآية) وسئل القاضي ابو بكر بن العربي احد ائمة المالكيه عن رجل قال: " ان ابا النبي ﷺ في النار" فاجاب بان من قال ذلك فهو ملعون ؛ لقوله تعالىٰ ﴿ ان الذين يؤذون الله ورسوله لعنهم الله في الدنيا والآخرة ﴾ قال ولا اذى اعظم من ان يقال عن ابيه انه في النار '' (الحاوی للفتاوی ج۲ ص ۲۳۱)

حضرت امام سہیلی نے الروض الانف میں مسلم کی حدیث ذکر کرنے کے بعد کہا ہے: ہمیں حق نہیں پہنچتا کہ ہم نبی کریم ﷺ کے والدین کے متعلق کفر کا قول کریں ؛ کیونکہ خود نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے۔ ''زندہ کو مردہ کی وجہ سے ایذا نہ پہنچاؤ'' اور رب تعالیٰ نے بھی فرمایا (ترجمہ) بیشک وہ لوگ جو اللہ اور اس کے رسول کو ایذاء پہنچاتے ہیں ان پر دنیا اور آخرت میں اللہ کی لعنت ہے۔ قاضی ابو بکر بن عربی سے مالکیہ میں سے کسی ایک شخص کے متعلق پوچھا گیا کہ وہ حضور کے والد کو کافر کہتا ہے (اس کا کیا حکم ہے؟) آپ نے فرمایا وہ ملعون ہے؛ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا جو شخص اللہ اور اس کے رسول کو ایذاء پہنچاتا ہے اس پر اللہ کی لعنت ہے دنیا اور آخرت میں۔ اس سے بڑھ کر اور ایذاء کیا ہو سکتی ہے کہ وہ آپ کے باپ کو کافر کہے؟

معاملہ قسمت کا:

کسی کی قسمت میں یہ ہے کہ وہ نبی کریم ﷺ کی عظمت کو بیان کرتا ہے۔ اور کسی کی قسمت میں ہے وہ تنقیص کرتا ہے اللہ تعالیٰ ہمیں نبی کریم ﷺ کی شان بیان کرنے کی توفیق لازوال عطا فرمائے اور تنقیص کرنے سے بچائے۔ آمین

بقول کسے! تنقیص نبی پہ جو اڑے ہوتے ہیں
وہ قہر مذلت میں پڑے ہوتے ہیں

شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

واما متاخرین پس تحقیق اثبات کردہ اند اسلام والدین بلکہ تمام آباء وامہات آنحضرت ﷺ را تا آدم علیہ السلام"

متاخرین نے تحقیق سے نبی کریم ﷺ کے والدین کے ایمان کو ثابت کیا ہے بلکہ آپ کے تمام آباءوامہات آدم علیہ السلام تک مومن ہونے کا ثبوت پیش کیا ہے۔

ایں علم گویا مستور بود از متقدمین پس کشف کرد آنرا حق تعالیٰ بر متاخرین " واللہ یختص برحمتہ من یشاء " (اشعۃ اللمعات جلد اول ص ۷۱۸)

یہ علم (یعنی نبی کریم ﷺ کے والدین کا ایمان پر ہونے کا علم) گویا کہ (بعض) متقدمین پر مستور تھا اللہ تعالیٰ نے متاخرین پر اسے منکشف کیا اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے جسے چاہے خاص فرماتا ہے۔

واضح ہوا کہ نبی کریم ﷺ کے والدین کریمین کو مومن سمجھنے والوں پر اللہ تعالیٰ کی خاص رحمت ہے جو اس رحمت خاصہ سے محروم ہوں گے وہی کافر سمجھیں گے۔

میت کو تکلیف دینا ایسا ہی ہے جیسے زندہ کو تکلیف دینا!

" عن عائشۃ ان رسول اللہ ﷺ قال کسر عظم المیت ککسرہ حیا "

(رواہ مالک وابو داؤد وابن ماجہ ، مشکوۃ باب دفن المیت)

حضرت عائشہ سے مروی ہے بیشک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میت کی ہڈی کو توڑنا ایسا ہی ہے جیسا زندہ کی ہڈی کو توڑنا ہے

" قال ابن الملک ان المیت یتألم "

ابن ملک نے کہا اس حدیث سے یہ ثابت ہوا میت کو درد ہوتا ہے۔

" قد اخرج ابن ابی شیبۃ عن ابن مسعود قال اذی المؤمن فی موتہ کأذاہ فی حیاتہ "

ابن ابی شیبہ نے حضرت عبداللہ ابن مسعود سے روایت بیان کی ہے کہ میت کو ایذاء دینا ایسے ہی ہے جیسے اسے اس کی زندگی میں ایذاء دی گئی ہو (مرقاۃ ج ۴ ص ۷۹)

قبروں کو مسمار کرنا ظلم عظیم ہے ایک حدیث جو بیان کی گئی ہے اس سے واضح ہوا کہ حضرت ابن عباس نے نبی کریم کی زوجہ مطہرہ کی چارپائی کو حرکت دینے سے بھی منع کیا۔ اسکی وجہ صرف ادب

احترام کا لحاظ تھا۔ کسی مسلمان کی قبر کو مسمار کرنا جرم ہے صحابہ کرام اور حضور کے والدین کی قبور کو مسمار کرنے کی خبر اگر صحیح ہے تو یہ عظیم ظلم کیا گیا ہے۔

رسول اللہ ﷺ کو ایذاء پہنچانا

إِنَّ الَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ اللهَ وَرَسُوْلَهٗ لَعَنَهُمُ اللهُ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَاَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا عَظِيْمًا ﴿﴾
(پ ۲۲ رکوع ۱۴)

بیشک جو ایذاء دیتے ہیں اللہ اور اس کے رسول کو ان پر اللہ کی لعنت دنیا اور آخرت میں اور اللہ نے ان کے لئے ذلت کا عذاب تیار کر رکھا ہے۔

اس آیت کریمہ کی تفسیر میں قاضی مظہری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا!

وجاز ان يكون معنى الآية الذين يؤذون رسول الله وذكر الله لتعظيم الرسول كانّ من اذى الرسول فقد اذى الله "

ایک معنی یہ بھی ہوسکتا ہے کہ آیت کریمہ میں مراد صرف رسول اللہ کو ایذاء دینا مراد لیا گیا ہو کیونکہ رسول اللہ ﷺ کو ایذاء دینا درحقیقت اللہ کو ایذاء دینا ہے۔ اس پر ایک حدیث پاک بھی شاہد ہے!

"عن عبد الله بن مغفل ﷺ قال قال رسول الله ﷺ الله الله فی اصحابی ، الله الله فی اصحابی، لا تتخذوهم غرضا من بعدی فمن احبهم فبحبی احبهم ومن ابغضهم فببغضی ابغضهم ومن آذاهم فقد آذانی ومن آذانی فقد آذی الله ومن آذی الله فیوشک ان یأخذ "
(رواه الترمذی مشکوة مناقب صحابه)

میرے صحابہ کے بارے میں اللہ سے ڈرتے رہو۔ اللہ سے ڈرتے رہو (دو مرتبہ یہی الفاظ فرمائے) ان کو میرے بعد موردِ طعن و تشنیع نہ بنانا۔ جس نے ان سے محبت کی اس نے میری محبت کی وجہ سے ان سے محبت کی، جس نے ان سے بغض رکھا اس نے میرے بغض کی وجہ سے ان سے بغض رکھا۔ جس نے ان کو ایذاء دی اس نے مجھے ایذاء دی، جس نے مجھے ایذاء دی اس نے اللہ کو ایذاء دی، جس نے اللہ تعالیٰ کو ایذاء دی قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے اپنی گرفت میں لے لے۔

اولیاء اللہ کو ایذاء پہنچانا

بعض حضرات نے کہا ہے" ان الذین یؤذون اللّٰه " کا مفہوم بحذف مضاف بھی ہوسکتا ہے۔" ان الذین یؤذون اولیاء اللّٰه " جو لوگ اللہ تعالیٰ کے اولیاء کو ایذاء دیتے ہیں وہ

دنیاوآخرت میں لعنت کے مستحق ہیں۔

رسول اللہ ﷺ کوایذاءدیناباعث کفر ہے

"من اذی رسول الله ﷺ طعن فی شخصه او دینه او نسبه او صفة من صفاته او بوجه من وجوه الشین فیه صراحة او کنایة او اشارة کفر ولعنه الله فی الدنیا والآخرة واعد له عذاب جهنم . وهل یقبل توبته ؟ قال ابن همام کل من ابغض رسول الله ﷺ بقلبه کان مرتدا فالسباب بالطریق الاولی ویقتل عندنا حدا فلا تقبل توبته فی اسقاط القتل"

(مظہری زیر آیت مذکورہ)

جس شخص نے رسول اللہ ﷺ کوایذاءدی خواہ آپ کی ذات میں طعنہ زنی کی، یا آپ کے دین میں، یا آپ کے نسب میں، یا آپ کی صفات میں سے کسی صفت میں، یا آپ کوکسی طرح بھی عیب لگایا صراحۃً یا کنایۃً یا اشارۃً وہ کافر ہوجائے گا۔اوراس پر اللہ تعالیٰ کی دنیا اور آخرت میں لعنت ہوگی اور اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے عذاب جہنم تیار کیا ہے۔(سوال کیا گیا) کیا ایسے شخص کی توبہ قبول ہوگی؟ ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: ہروہ شخص جس نے (العیاذ باللہ) رسول اللہ ﷺ سے دل سے بغض رکھا وہ مرتد ہوگیا اور گالی نکالنے سے بطریق اولیٰ مرتد ہوگا۔ ہمارے نزدیک اسے بطور حد قتل کیا جائے گا۔اس کی توبہ قتل کے ساقط کرنے کے لئے قبول نہیں کی جائے گی۔

مومنوں کوایذاءدینا:

﴿ وَالَّذِينَ يُؤْذُونَ الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ بِغَيْرِ مَا اكْتَسَبُوا فَقَدِ احْتَمَلُوا بُهْتَانًا وَإِثْمًا مُبِينًا ﴾

(پ ۲۲ رکوع ۱۴)

اور جولوگ ایمان والے مردوں اورعورتوں کوبغیرکوئی کسب کئے ایذاءدیتے ہیں انہوں نے بہتان اور کھلا گناہ اپنے سرلیا۔

"قال مقاتل نزلت فی علی بن ابی طالب ﷺ وقیل نزل فی شان عائشة رضی الله عنها قلت اللفظ عام فی کل من یؤذی مومنا او مومنة بای وجه کان وان کان المراد خاصا عن ابی هریرة قال قال رسول الله ﷺ المسلم من سلم المسلمون من لسانه ویده والمؤمن من امن الناس علی دمائهم واموالهم" (رواہ الترمذی والنسائی ۔ مظہری)

مقاتل نے کہا یہ آیت حضرت علی ﷺ کی شان میں نازل ہوئی (من سب علیا فقد

اذی رسول اللہ) بعض نے کہا یہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی شان میں نازل ہوئی (قاضی مظہری کہتے ہیں) میں کہتا ہوں : لفظ عام ہے اگر چہ مورد خاص ہے اسلئے اس سے مراد ہر مومن مرد اور عورت کو ایذاء دینا ہے۔خواہ کسی طرح بھی ایذاء دے۔

حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کامل مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھوں سے مسلمان سلامتی میں رہیں ۔مومن وہ ہے جس سے مومنوں کے مال اور ان کی جانیں محفوظ رہیں۔

نتیجہ :

☆ رسول اللہ ﷺ کو ایذاء دینا کفر ہے۔

☆ رسول اللہ ﷺ کو ایذاء دینے والا واجب القتل ہے توبہ کرنے کے باوجود واجب القتل ہی رہے گا۔

☆ رسول اللہ ﷺ کو ایذاء دینا رب تعالیٰ کو ایذاء دینا ہے۔

☆ رسول اللہ ﷺ کو ایذاء دینے والا ملعون ہے۔

☆ رسول اللہ ﷺ کو ایذاء دینے والا رسوا کن عذاب کا مستحق ہے۔

☆ اولیاء اللہ کو ایذاء دینے والا ملعون ہے۔

☆ ایمان والوں کو ایذاء دینے والا کامل مومن نہیں ہوسکتا۔

قبور کو مسمار کرنے سے مسلمانوں کی دل آزاری ہوتی ہے!

قبور کو مسمار کرنے سے ان کے لواحقین بالخصوص اور دوسرے مسلمان بالعموم قلبی تکلیف محسوس کرتے ہیں ایسا کرنے والے مسلمانوں کو ایذاء پہنچارہے ہیں ۔صحابہ کرام اور نبی کریم ﷺ کے والدین کریمین کی قبور کو مسمار کرنے سے اہل اسلام کو دکھ ہوا ہے۔

اللہ تعالیٰ شعائر اسلامیہ کا پاسِ ادب کرنے کی توفیق عطا فرمائے ، رسول اللہ ﷺ اور آپ کے والدین کریمین ،صحابہ کرام اور اہل بیت اطہار کی محبت پر قائم و دائم رکھے ! اور مسلمانوں کے درمیان تفرقہ ڈالنے والوں کو ہدایت عطا فرمائے۔

آمین ثم آمین بجاہ سید المرسلین

﴿وَلَنْ تَرْضٰی عَنْکَ الْیَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰی حَتّٰی تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ ؕ قُلْ اِنَّ هُدَی اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰی ؕ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ بَعْدَ الَّذِیْ جَآءَکَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ مَا لَکَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِیٍّ وَّلَا نَصِیْرٍ ﴾(۱۲۰)

۱) اور ہر گز تم سے یہود اور نصاریٰ راضی نہ ہوں گے جب تک تم ان کے دین کی پیروی نہ کرو، تم فرما دو، اللہ ہی کی ہدایت، ہدایت ہے۔ (اور اے سننے والے کے باشد) اگر تو ان کی خواہشوں کا پیرو ہوا بعد اس کے تجھے علم آ چکا تو اللہ سے تیرا کوئی بچانے والا نہ ہوگا اور نہ مددگار۔

۲) اور ہر گز راضی نہیں ہوں گے تم سے یہود اور نصاریٰ یہاں تک کہ تم تابعداری کرو ان کے دین کی، تم فرما دو، بے شک اللہ کی ہدایت ہی ہدایت ہے۔ اور (اے عام مخاطب) اگر تابعداری کی تم نے ان کی خواہشات کی اس کے بعد کہ آ گیا تمہارے پاس علم، تو نہیں ہوگا تمہارے لئے اللہ سے بچانے والا کوئی دوست اور نہ مددگار۔

شانِ نزول: اہل کتاب نبی کریم ﷺ سے مہلت طلب کرتے تھے، اور طمع دلاتے تھے کہ ہم آپ پر ایمان لے آئیں گے، تو اللہ تعالیٰ نے ان کے رد میں اس آیۃ کریمہ کو نازل کیا کہ بے شک آپ ان کو مہلت دیں، ان سے پرسکون ماحول قائم کریں وہ آپ سے راضی نہیں ہوں گے سوائے اس کے کہ آپ ان کے دین کی تابعداری کریں۔ یعنی جب وہ چاہتے ہیں کہ تم ان کے دین کو قبول کر لو تو وہ تمہارے دین پر کیسے آئیں گے۔ ان کا ایمان لانے کا طمع دلانا صرف ٹال مٹول کرنا مقصود ہے۔

دوسری وجہ: مدینہ طیبہ کے یہود اور نجران کے نصاریٰ نبی کریم ﷺ کے بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے کی وجہ سے امید کر رہے تھے کہ یہ ہمارے دین پر آ جائیں گے جب اللہ تعالیٰ نے بیت المقدس سے کعبہ کو قبلہ بنا دیا تو وہ ناامید ہو گئے کہ یہ لوگ تو ہمارے دین کو قبول نہیں کریں گے۔ تو اس وقت آیۃ کریمہ کا نزول ہوا۔

اور ساتھ ساتھ ہی نبی کریم ﷺ کو ان کے ایمان سے مکمل طور پر ناامید ہونے کے لئے کہا، کہ ان لوگوں کے ایمان لانے کی آپ ذرا بھر بھی امید نہ رکھیں کیونکہ یہ لوگ تو چاہتے یہی ہیں کہ تم بھی ان کے دین پر آ جاؤ۔ (از خازن)

فائدہ: یہاں یہود و نصاریٰ کا جو ذکر کیا گیا اس سے مراد ان کی قوم ہے، ہر ہر فرد مراد نہیں کہ ان میں سے کوئی ایک بھی ایمان نہیں لائے گا، بلکہ مراد یہ ہے کہ تمام یہود اور نصاریٰ ایمان نہیں لائیں گے۔

یہی وجہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن سلام اور ان کے ساتھی یہود میں سے ایمان لے آئے تھے، اور حبشہ وغیرہ کے کئی نصاریٰ بھی ایمان لے آئے تھے۔

اعتراض: اس آیۃ کریمہ سے پتہ چلتا ہے کہ یہود و نصاریٰ مجموعی طور پر کبھی ایمان نہیں لائیں گے، بلکہ وہ تو چاہتے ہیں کہ ایمان والے بھی ایمان چھوڑ کر ان کے دین پر آ جائیں۔

لیکن دوسری آیۃ میں ذکر ہے۔ ﴿ وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ ﴾ اس آیۃ سے واضح ہو رہا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام جب دنیا میں تشریف لے آئیں گے۔ تو اہل کتاب میں سے کوئی ایک بھی ایسا نہیں ہوگا۔ جو عیسیٰ علیہ السلام کی وفات سے پہلے ایمان نہ لے آئے۔

یہ بات بھی واضح ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام تو نبی کریم ﷺ کی شریعت کی تبلیغ فرما رہے ہوں گے تو اہل کتاب کا ایمان نبی کریم ﷺ پر اور آپ کی شریعت پر ہوگا۔

ان دونوں آیتوں میں تعارض نظر آتا ہے۔ ان میں تطبیق کیسے دی جائے کہ تعارض نہ رہے۔

جواب: قرآن پاک میں کہیں بھی تعارض نہیں، صرف کسی کو سمجھ نہ آئے تو وہ بظاہر تعارض سمجھ بیٹھتا ہے۔ کیونکہ اس آیۃ کو اور ﴿ وَدَّ كَثِيْرٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يَرُدُّوْنَكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِكُمْ كُفَّارًا ۚ حَسَدًا مِّنْ عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ ﴾ (پسند کرتے ہیں بہت سے اہل کتاب کاش کہ وہ تمہیں ایمان کے بعد کفر کی طرف پھیر دیں، اس حسد کی وجہ سے جو اپنے نفسوں میں رکھتے ہیں۔ اس کے بعد جب ان پر حق ظاہر ہو گیا۔)

کو ایک ساتھ سمجھا جائے تو واضح ہو جائے گا کہ ان کے ایمان نہ لانے کی وجہ صرف حسد تھا کہ وہ

نبی کریم ﷺ کی برتری کو پسند نہیں کرتے تھے، اور اپنی چوہدراٹ اور ریاست کے زوال کی وجہ سے ضد اور عناد کی وجہ سے ایمان نہیں لا رہے تھے۔ اس کی یہ وجہ نہیں کہ ان پر حق واضح نہیں تھا۔ بلکہ وہ نبی کریم ﷺ کی حقانیت کو تسلیم کرنے کے باوجود ضد کی وجہ سے ایمان نہ لانے پر ڈٹے ہوئے تھے۔

لیکن عیسیٰ علیہ السلام کے آنے پر جب ان کی ضد اور حسد اور عناد ختم ہو جائے گا تو ایمان لے آئیں گے۔

تنبیہ: ﴿وَلَنْ تَرْضٰی عَنْکَ الْیَهُوْدُ وَلَاالنَّصٰرٰی حَتّٰی تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ﴾ کا یہ مطلب نہیں کہ یہود و نصاریٰ دونوں فریق یہ چاہتے ہیں کہ مسلمان وہ دین قبول کرلیں جو یہودیت اور نصرانیت کا مجموعہ، چونکہ ایسا تو کوئی دین تھا ہی نہیں، بلکہ یہودی نصرانیوں کو بے دین کہتے تھے۔ اور نصرانی یہودیوں کو بے دین کہتے تھے۔

لہٰذا آیۃ کریمہ کا مطلب یہ ہے۔ ﴿وَلَنْ تَرْضٰی عَنْکَ الْیَهُوْدُ﴾ یعنی الا بالیهودية ﴿وَلَاالنَّصٰرٰی﴾ الا بالنصرانية " کہ تم سے ہرگز یہود راضی نہیں ہوں گے یہاں تک کہ تم ان کے دین یہودیت کو قبول کرلو، اور نصرانی تم سے ہرگز راضی نہیں ہوں گے یہاں تک کہ تم ان کے دین نصرانیت کو قبول کرلو۔ (خازن)

ملت کیا ہے؟ ﴿حَتّٰی تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ﴾ یعنی دینهم و طریقتهم " ملت سے مراد طریقہ اور دین ہے۔ (خازن)

یعنی یہود و نصاریٰ ہرگز تم سے راضی نہیں ہوں گے یہاں تک کہ تم ان کے دین اور طریقہ کو اختیار کرلو۔

البتہ ملت کو دین کیوں کہا گیا؟ اس کی وضاحت میں اگرچہ الفاظ مختلف ہیں تاہم مفہوم کچھ قریب قریب ہی ہے۔ ملت اور شریعت اور دین سب کا مطلب یہ ہے۔ " ما شرعه الله تعالیٰ لعباده علی لسان انبيائه " اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لئے جو شریعت کے احکام انبیاء کرام کے ذریعے مقرر فرمائے۔

شریعت کو شریعت کہنے کی وجہ علامہ جوہری رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں۔ شرع لهم الی سن ای جعله لهم سننا وطریقا والسنة السیرة والطریقة " شریعت کا مطلب ہے کہ ان کے لئے ایک طریقہ رائج کردیا۔

شریعت، پانی پروارد ہونے کی جگہ کو بھی کہا جاتا ہے، جس طرح پیاسے لوگ پانی کے حوض وغیرہ پر میٹھا اور ٹھنڈا پانی حاصل کرنے کے لئے جاتے ہیں، اسی طرح رب تعالیٰ کے تقرب کے پیاسے ثواب اور رحمت کی مٹھاس اور ٹھنڈک حاصل کرنے کے لئے احکام دینیہ کے مورد پر جمع ہوتے ہیں۔

علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے بیان فرمایا" الشریعة مادعا اللہ تعالیٰ عباده الی فعله " شریعت اس راہ کو کہا جاتا ہے۔ جس پر عمل کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو بلایا۔

دین کو دین کہنے کی وجہ یہ ہے۔" والدین باعتبار طاعته واجابة دعائه والانقیاد لامره " اللہ تعالیٰ کے حکم کی طاعت کرنے اور اس کے احکام کو بجالانے اور اس کے امر کی فرمانبرداری کرنے کو دین کہا جاتا ہے۔

علامہ قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔ " والدین مافعله العباد عن امره " اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق بندوں کا عمل کرنا دین ہے۔

ملت کو ملت کہنے کی وجہ بیان کرتے ہوئے علامہ راغب اصفہانی بیان کرتے ہیں۔ " الملة من امللت الکتاب ای املیته " " ملة " کا معنیٰ ماخوذ ہے " امللت الکتاب " خط لکھانا یہی معنیٰ " املیته " کا بھی ہے۔

عام طور پر شرعی مسائل جو انبیاء کرام کے ذریعے ملے ان کو حفظ کرنے کی غرض سے لکھ لیا جاتا ہے لہٰذا شریعت کو ملت بھی کہا جانے لگا۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ کا احکام شرع کی طرف بلانے اور کتب کے نازل کرنے کو بھی ملت کہا گیا ہے

مطلب واضح ہوگیا کہ ' ملت اور شریعت اور دین ' ایک چیز کا نام ہے۔ یہ لحاظ کیا جائے کہ انبیاء کرام نے رب تعالیٰ کے احکام کو ظاہر فرمایا اور لکھوائے تو ملت کہا گیا۔ یہ لحاظ کیا جائے کہ بندے

ان احکام پر عمل کر کے رب تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی طاعت کرتے ہیں تو اسے دین کہا گیا۔ اور یہ لحاظ کیا کہ پیاسے اس کی طرف جاتے ہیں تو شریعت کہا گیا۔ (ماخوذ از شیخ زادہ)

قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى : فرمادو بے شک اللہ کی ہدایت ہی ہدایت ہے

نبی کریم ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تم ان کو جواب دو کہ اللہ تعالیٰ کی ہدایت ہی اسلام اور وہی حق کی ہدایت ہے، جو تم دعوی کرتے ہو وہ تو راہ ہدایت نہیں، بلکہ باطل راہ اور گمراہی ہے۔ (از بیضاوی)

وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ : میں لام مؤطہ للقسم ہے۔ "اھوائھم" اھواء جمع ہے "ھوی" کی۔ اس کا معنی ہے ان کی ٹیڑھی آراء۔ یعنی "ھوی" وہ رائے ہے جو خواہشات پر مبنی ہو۔ خواہشات باطلہ کی وجہ سے جو رائے حاصل ہو وہ گمراہی کی طرف لے جانے والی ہے۔

" وسمي بذلك لانه يهوى صاحبه في الدنيا الى كل داهية وفي الآخرة الى هاوية "

یعنی "ھـوی" کو ھوی اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ انسان کو دنیا میں ہر قسم کی مصیبت میں گرادیتی ہے۔ اور آخرت میں جہنم کے مقام ھاویہ میں گرادے گی۔

بَعْدَ الَّذِیْ جَآءَکَ مِنَ الْعِلْمِ : (بعد اس کے کہ تمہارے پاس علم آجائے)

اس علم سے مراد یہ ہے کہ تمہارے پاس بیان آجائے کہ اللہ کا دین اسلام ہی ہے۔ اور یہ بیان آجائے کہ قبلہ وہی قبلہ ہے جو ابراہیم علیہ السلام کا تھا وہ کعبہ شریف ہے۔

مَالَکَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِیٍّ : ولی کا مطلب ہے۔ جو امور کا والی ہو، اور ان کے معاملات کو قائم کرے، رب کی طرف سے تمہارا کوئی ولی نہیں ہوگا۔

وَّلَا نَصِیْرٍ : کوئی تمہاری مدد کرنے والا اور کوئی تمہیں اللہ کے عذاب سے بچانے والا نہیں۔

انتباہ : " وقيل في قوله ﴿وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآئَهُمْ﴾ انه خطاب للنبي ﷺ والمراد به امته " ﴿وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ﴾ میں بظاہر خطاب نبی کریم ﷺ کو ہے اور مراد آپ کی امت ہے۔ (خازن)

اس لئے کہ نبی کریم ﷺ سے یہ ممکن ہی نہیں کہ آپ رب تعالیٰ کی طرف سے علم آنے کے بعد یہود و نصاریٰ کی خواہشات کی تابعداری کریں۔

" والمعنی ایاکم اخاطب ولکم اؤدب وانهی فقد علمتم ان محمدا ﷺ قد جاء کم بالحق والصدق وقد عصمته فلا تتبعوا انتم اهواء الکافرین ولئن اتبعتم اهوائهم بعد الذی جاء ک من العلم والبینات مالکم من دون الله من ولی ولا نصیر "

آیۃ کریمہ میں ﴿ولئن اتبعت﴾ سے لے کر آیۃ کے آخر تک کا مفہوم واضح ہو گیا کہ یہ حکم نبی کریم ﷺ کی امت کو ہے۔ گویا کہ رب تعالیٰ نے یہ فرمایا اے امت محمد مصطفیٰ ﷺ میں تمہیں خطاب کر رہا ہوں۔ میں تمہیں ادب سکھا رہا ہوں۔ میں تمہیں غلط راہ سے منع کر رہا ہوں۔

اور یہ بات تمہیں یقینی طور پر معلوم ہے کہ محمد ﷺ تمہارے پاس سچا دین اور حق دین لائے ہیں۔ ان کو تو میں نے کافروں کی خواہشات کی تابعداری کرنے سے بچایا ہوا ہے، لیکن تم کافروں کی خواہشات کی تابعداری نہ کرنا اگر تم نے ان کی خواہشات کی تابعداری کی جب کہ تمہارے پاس علم آ گیا اور واضح دلائل آ گئے تو تمہارے لئے اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بچانے کے لئے تمہارا کوئی یار و مددگار نہیں ہوگا۔
(خازن)

یوں بھی کہا جا سکتا ہے: اگر یہ کہا جائے کہ یہ خطاب تو نبی کریم ﷺ کو ہی ہے، لیکن بالفرض محال کے طور پر تو یہ درست ہے۔ اب مطلب یہ ہوگا کہ اے نبی کریم اگر تم نے بالفرض محال ان کی خواہشات کی تابعداری کی الخ۔ بالفرض محال میں حقیقت معتبر نہیں ہوتی جیسا کہ رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے۔ ﴿قُلْ اِنْ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ وَلَدٌ فَاَنَا اَوَّلُ الْعٰبِدِيْنَ﴾ فرما دو اگر رحمٰن کی اولاد ہوتی تو میں سب سے پہلے اس کی عبادت کرتا۔ یہ کلام بھی بالفرض محال پر مبنی ہے۔

یعنی خطاب نبی کریم ﷺ کو ہو لیکن بالفرض محال کے طور پر، اور امت کو سخت وعید کی گئی ہو۔
(از جلالین)

☆☆☆

﴿اَلَّذِیْنَ آتَیْنٰـھُمُ الْکِتٰبَ یَتْلُوْنَہٗ حَقَّ تِلَاوَتِہٖ ط اُولٰٓئِکَ یُؤْمِنُوْنَ بِہٖ ط وَمَنْ یَّکْفُرْ بِہٖ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴾(۱۲۱)

۱) جنہیں ہم نے کتاب دی ہے وہ جیسی چاہئے اس کی تلاوت کرتے ہیں وہی اس پر ایمان رکھتے ہیں، اور جو اس کے منکر ہیں تو وہی اس کے زیاں کار ہیں۔

۲) وہ لوگ جنہیں ہم نے عطاء کی کتاب وہ اس کی تلاوت کرتے ہیں جیسا حق ہے اس کی تلاوت کرنا، وہی لوگ ایمان رکھتے ہیں اس کے ساتھ۔ اور جو اس سے کفر کرتے ہیں وہی ہیں خسارہ اٹھانے والے۔

اَلَّذِیْنَ آتَیْنٰـھُمُ الْکِتٰبَ : (وہ لوگ جن کو دی ہم نے کتاب)

اس سے مراد کون سے لوگ ہیں؟

اس سے مراد نبی کریم ﷺ کی امت کے لوگ بھی ہیں۔ اور اس سے مراد نصرانیوں کے چند لوگ بھی ہیں۔ یعنی آیۃ کریمہ اپنے وسیع تر مفہوم کے لحاظ پر دونوں کو شامل ہے۔

علامہ رازی رحمہ اللہ کا مختار یہ ہے کہ اس سے مراد مومن ہیں۔ ماقبل سے رابطہ بھی موجود ہے، کیونکہ ﴿وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ﴾ میں خطاب نبی کریم ﷺ کی امت کو ہے۔ اور اس آیۃ کریمہ میں بھی آپ کی امت ہی مراد ہے۔

"الذین" سے مراد جب ایمان والے لوگ ہوں گے، تو "الکتاب" سے مراد قرآن پاک ہوگا۔ یہی قول بہتر ہے کیونکہ بعد میں ذکر ہو رہا ہے۔ ﴿یَتْلُوْنَہٗ حَقَّ تِلَاوَتِہٖ﴾ وہ لوگ اس کتاب کی تلاوت کرتے ہیں جیسا حق ہے اس کی تلاوت کرنا۔

اس جملہ میں قرآن پاک کی تلاوت کرنے کی رغبت دلائی گئی، اور قرآن پاک کی تلاوت پر برانگیختہ کیا گیا، اور تلاوت کرنے کی مدح کی گئی۔ جس کتاب کی یہ شان ہے وہ قرآن پاک ہی ہے۔ یہ مقام توراۃ اور انجیل کو حاصل نہیں۔

اُولٰٓئِکَ یُؤْمِنُوْنَ بِهٖ : (وہی اس پر ایمان رکھتے ہیں) اس جملہ میں حصر پائی گئی ہے کہ ''جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی وہ اس کی تلاوت کرتے ہیں جیسا کہ اس کی تلاوت کا حق ہے، وہی اس پر ایمان رکھتے ہیں۔

ایمان کو ان لوگوں پر منحصر کر دیا ہے، یہ شان صرف ایمان والوں کی ہے، اہل کتاب کو یہ مقام حاصل نہیں۔ (از کبیر)

فائدہ : ﴿ یَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ ﴾ کا معنی حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ نے یہ کیا'' یتبعونہ حق اتباعہ '' وہ تابعداری کرتے ہیں اس کتاب کی جیسے اس کی تابعداری کرنے کا حق ہے۔ یعنی قرآن پاک کے اوامر اور نواہی پر عمل کرتے ہیں۔ حلال کو حلال سمجھتے ہیں۔ اور حرام کو حرام سمجھتے ہیں۔ غرضیکہ قرآن پاک کے جمیع احکام کے مطابق عمل کرتے ہیں۔

حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ نے اس پر دلیل اس آیۃ سے پیش کی کہ ﴿ وَالْقَمَرِ اِذَا تَلٰهَا ﴾ میں ''تلاھا '' کا معنی پیچھے آنا لیا گیا ہے۔ اس معنی پر ایک حدیث بھی پیش کی گئی ہے۔

'' عن ابن عمر عن النبی ﷺ فی قوله تعالی ﴿ یَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ ﴾ قال یتبعونه حق اتباعه ''

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ﴿ یَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ ﴾ کے متعلق فرمایا وہ تابعداری کرتے ہیں اس کی جیسے اس کی تابعداری کرنے کا حق ہے۔

لیکن حدیث کے متعلق قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔ '' فی اسناده غیر واحد من المجهولین فیما ذکر الخطیب ابوبکر احمد الا ان معناه صحیح ''

اس حدیث کی اسناد کے متعلق خطیب ابوبکر احمد رحمہ اللہ نے ذکر فرمایا کہ اس میں کئی مجہول راوی ہیں۔ تاہم حدیث میں جو معنی پیش کیا گیا ہے وہ صحیح ہے۔

☆ '' قال ابوموسی الاشعری من یتبع القرآن یهبط به علی ریاض الجنة ''

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے فرمایا جو شخص قرآن پاک کی تابعداری کرتا ہے وہ اس کے ذریعہ جنت کے باغات تک پہنچ جاتا ہے۔

☆ '' وعن عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ هم الذین اذا مروا بآیة رحمة سالوها من الله واذا

مروا بآیة عذاب استعاذوا منها "

حضرت عمر بن خطاب ﷺ فرماتے ہیں کہ اس آیۃ کریمہ میں ﴿ یَتۡلُوۡنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ ﴾ سے مراد وہ لوگ ہیں، جو قرآن پاک کی تلاوت کرتے وقت جب رحمت کی آیۃ آئے تو وہ رحمت طلب کرتے ہیں۔ اور جب وہ عذاب والی کوئی آیۃ پڑھتے ہیں تو عذاب سے رب تعالیٰ کی پناہ پکڑتے ہیں۔

حضرت عمر ﷺ نے یہ معنی نبی کریم ﷺ کے طرز عمل سے لیا، حدیث شریف میں آپ کی تلاوت کو اسی طرح بیان کیا گیا۔

" عن النبی ﷺ کان اذا مر بآیة رحمة سأل و ذا مر بآیة عذاب تعوذ "

نبی کریم ﷺ جب رحمت کی آیۃ کی تلاوت فرماتے تو رب تعالیٰ سے رحمت کا سوال کرتے، اور جب عذاب والی آیۃ کی تلاوت کرتے تو عذاب سے رب تعالیٰ کی پناہ مانگتے۔

☆ " وقال الحسن هم الذین یعملون بمحکمه ، ویؤمنون بمتشابهه ، ویکلون ما اشکل علیهم الی عالمه "

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ﴿ یَتۡلُوۡنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ وہ محکم آیات پر عمل کرتے ہیں۔ اور متشابہات پر ایمان رکھتے ہیں۔ اور مشکلات کو علماء کے سپرد کر دیتے ہیں۔
(ماخوذ از قرطبی)

☆ " قال ابن مسعود والذی نفسی بیده ان حق تلاوته ان یحل حلاله ، ویحرم حرامه ویقرأه کما انزل الله ، ولا یحرف الکلم عن مواضعه ولا یتأول منه شیأ علی غیر تاویله

حضرت ابن مسعود ﷺ فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے کہ "تلاوت کرنے کا حق" یہ ہے کہ حلال کو حلال سمجھا جائے۔ اور حرام کو حرام سمجھا جائے۔ اور جس طرح اللہ تعالیٰ نے قرآن کو نازل فرمایا اسی طرح اسے پڑھا جائے۔ کسی طرح بھی اس کے کلمات میں تحریف نہ کی جائے۔ اور کسی قسم کی غلط تاویل نہ کی جائے۔

دوسرا احتمال: " الذین " سے مراد اہل کتاب میں سے یہود ہوں۔ اور کتاب سے مراد تورات ہو۔ تو اس سے مراد " هم مؤمنوا اهل الکتاب مثل عبدالله بن سلام و اصحابه " اہل کتاب میں حضرت عبداللہ بن سلام اور ان کے ساتھی ہیں۔ اب اس صورت میں "کتاب" سے مراد تورات ہوگی۔

اب مطلب یہ ہوگا کہ ''وہ لوگ جن کو ہم نے توراۃ عطاء کی وہ اس کی تلاوت کرتے ہیں جیسا کہ اس کے تلاوت کرنے کا حق ہے۔ اور وہ توارۃ پر ایمان رکھتے ہیں۔ یعنی اس میں نبی کریم ﷺ کے اوصاف پر کامل ایمان رکھتے ہیں، جس کی وجہ سے ان کو رب تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ اور قرآن پر ایمان لانے کی بھی توفیق عطاء فرمادی۔

تیسرا احتمال: " الـذیـن " سے مراد نصاری ہوں، اور'' کتاب'' سے مراد انجیل ہو، اس سورۃ میں آیۃ کریمہ کا تعلق اصحابہ سفینہ سے ہوگا، یعنی وہ لوگ جو حضرت جعفر بن ابی طالب کے ساتھ حبشہ سے کشتی میں سوار ہو کر آئے تھے۔ جن کی تعداد چالیس تھی، بتیس آدمی حبشہ سے اور آٹھ شام کے راہب حضرات تھے۔ جن میں بحیرا راہب بھی تھا۔ ان لوگوں نے نبی کریم ﷺ پر ایمان لایا۔

اب آیۃ کریمہ کا مفہوم یہ ہوگا، کہ وہ نصرانی لوگ جن کو ہم۔ نے انجیل دی، انہوں نے انجیل کو پڑھا جیسا اس کے پڑھنے کا حق تھا، یعنی نبی کریم ﷺ کے اوصاف کو حق مانا، اور انجیل پر ایمان رکھا، ان لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل وکرم سے نبی کریم ﷺ پر ایمان لانے کی توفیق عطاء فرمادی۔ (از خازن)

فائدہ: " وقال الکلبی الضمیر راجع الی محمد ﷺ ای یصفونه فی کتبهم حق صفته لمن سألهم من الناس "

کلبی رحمہ اللہ نے بیان کیا ہے کہ جب '' الـذیـن " سے مراد اہل کتاب ہوں خواہ یہود ہوں یا نصاری، تو " یتلـونـه " کی ضمیر نبی کریم ﷺ کی طرف لوٹے گی، اب مطلب یہ ہوگا کہ لوگوں میں سے جب کوئی تم سے نبی کریم ﷺ کے اوصاف کے متعلق پوچھے تو وہ صحیح حق پر مبنی بیان کردو۔ (مظہری)

وَمَنْ يَّكْفُرْ بِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ :

اور جو اس سے کفر کرتے ہیں وہی خسارہ اٹھانے والے ہیں۔

جب " الذین " سے مراد ایمان والے لوگ ہوں تو " به "، ضمیر کا مرجع " الکتاب "ہوگا، اور مراد اس سے قرآن پاک ہوگا۔ اب مطلب یہ ہوگا کہ جو لوگ قرآن پاک سے کفر کرتے ہیں وہ خسارہ اٹھانے والے ہیں۔

اور جب " الـذین " سے مراد "اہل کتاب" ہوں تو پھر بھی " بـه " سے مراد قرآن پاک ہی ہونا ہے لیکن بالواسطہ کیونکہ اصل میں اس طرح اسے بیان کیا جائے گا جس طرح خازن کی اس عبارت سے واضح ہے۔

" ﴿ ومن یکفر به ﴾ ای یجحد ما فیه من فرائض الله و نبوة محمد ﷺ "

اور جو اس سے کفر کرتے ہیں، یعنی اہل کتاب کا فریق اپنی اپنی کتاب میں بیان کردہ اللہ تعالیٰ کے فرائض کا انکار کرتے ہیں اور نبی کریم ﷺ کی نبوت کا انکار کرتے ہیں وہ خسارہ اٹھانے والے ہیں

اب اس سے واضح ہو گیا کہ یہود و نصاریٰ کا توارت و انجیل میں بیان کردہ نبی کریم ﷺ کے اوصاف اور آپ کی نبوت کو نہ تسلیم کرنا ہی دراصل قرآن پاک پر ایمان نہ لانے کا سبب تھا۔

تنبیہ : اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے۔ ﴿وَمَنْ يَكْفُرْ بِهٖ مِنَ الْاَحْزَابِ فَالنَّارُ مَوْعِدُهٗ﴾
اور جس شخص نے ان گروہوں میں سے اس (قرآن) کے ساتھ کفر کیا، اس کا ٹھکانا آگ ہے۔

بخاری شریف میں ہے۔

" والـذی نفسی بیده لایسمع بی احد من هذه الامة یهودی و لا نصرانی ثم لایؤمن بی الا دخل النار "

قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے، اس امت (امت دعوت) میں سے جس نے بھی میرے متعلق سنا خواہ یہودی ہو یا نصرانی پھر مجھ پر ایمان نہ لایا وہ ضرور جہنم کی آگ میں داخل ہوگا۔ (از صابونی)

☆☆☆

﴿ یٰبَنِیۡۤ اِسۡرَآئِیۡلَ اذۡکُرُوۡا نِعۡمَتِیَ الَّتِیۡۤ اَنۡعَمۡتُ عَلَیۡکُمۡ وَاَنِّیۡ فَضَّلۡتُکُمۡ عَلَی الۡعٰلَمِیۡنَ ☆ وَاتَّقُوۡا یَوۡمًا لَّاتَجۡزِیۡ نَفۡسٌ عَنۡ نَّفۡسٍ شَیۡـًٔا وَّلَا یُقۡبَلُ مِنۡهَا عَدۡلٌ وَّلَا تَنۡفَعُهَا شَفَاعَةٌ وَّلَاهُمۡ یُنۡصَرُوۡنَ ﴾ (آیت ۱۲۲،۱۲۳)

۱) اے اولاد یعقوب یاد کرو میرا احسان جو میں نے تم پر کیا اور وہ جو میں نے اس زمانہ کے سب لوگوں پر تمہیں بڑائی دی۔ اور ڈرو اس دن سے کہ کوئی جان دوسرے کا بدلہ نہ ہوگی اور نہ اس کو کچھ لے کر چھوڑیں، اور نہ کافر کو کوئی سفارش نفع دے اور نہ ان کی مدد ہو۔

۲) اے آلِ یعقوب یاد کرو میری وہ نعمتیں جو میں نے انعام کیں تم پر، اور بے شک میں نے فضیلت دی تمہیں (تمہارے زمانہ کے) تمام لوگوں پر؛ اور ڈرو اس دن سے جس دن نہیں بدلہ دے گا کوئی نفس کسی نفس کی طرف سے، اور نہیں قبول کیا جائیگا اس سے فدیہ، اور نہیں نفع دے گی کسی کو (بغیر اذن الٰہی کے) کوئی شفاعت، اور نہ ان کی مدد کی جائے گی۔

ان دونوں آیتوں کی وضاحت کافی حد تک رکوع نمبر ۵، اور نمبر ۶، میں بیان ہو چکی ہے، تاہم تفسیر عزیزی میں کچھ بحث ان آیات کی تفسیر میں بھی ذکر کی گئی ہے۔ لہٰذا اس سے ذکر کرنا یقیناً مفید ہے۔

تنبیہ: ﴿وَلَاهُمۡ یُنۡصَرُوۡنَ﴾ میں جن لوگوں کی امداد کی نفی کی گئی ہے۔ اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ کے احکام کی عدولی کی وجہ سے اس کی گرفت میں ہوں گے، عذاب کے جو مستحق ہو چکے ہوں گے، اگر وہ کافر ہوئے تو ان کی مدد اور شفاعت نہ ہی کوئی کرے گا اور نہ ہی قبول کی جائے گی۔ اور گنہگار لوگوں کی مدد اور شفاعت اللہ تعالیٰ کی طرف سے اجازت حاصل ہونے پر کی جائے گی اور اسے قبول کیا جائے گا، کیونکہ رب تعالیٰ نے خود فرمایا ﴿اِنَّا لَنَنۡصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا فِی

الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَیَوْمَ یَقُوْمُ الْاَشْھَادُ ﴾ بے شک ہم امداد کریں گے اپنے رسولوں اور ایمان والوں کی دنیا کی زندگی میں اور قیامت کے دن۔

مکرر ذکر کیوں؟ جب ان آیات کو پہلے بھی ذکر کر دیا گیا تو پھر دوبارہ ذکر کرنے کا کیا فائدہ؟ تو اس کا جواب یہ دیا گیا کہ بنی اسرائیل پر نعمتوں کے ذکر سے پہلے ان آیات کے ذکر کرنے کا مطلب یہ تھا کہ ان کو نعمتیں یاد دلائی جائیں، وہ ان نعمتوں کا شکر کریں، کفران نعم (نعمتوں کے شکر سے انکار) نہ کریں۔ اور منعم حقیقی کے حق کو پہچانیں۔

یہاں ان آیات کو ذکر کر کے ان کو بتایا گیا کہ تمہارا متبوع بننے کا خیال باطل ہے۔ جو تم چاہتے ہو کہ نبی کریم ﷺ اور ایمان والے حضرات تمہارے دین پر آ جائیں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ تم نے تو خود اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا انکار کیا، ان پر طرح طرح کی کجرویاں کرتے رہے۔ تمہاری تو کوئی شفاعت بھی نہیں کر سکے گا۔ تم کسی کی شفاعت کرو یہ تو اور ہی ناممکن ہے۔

لیکن نبی کریم ﷺ کو تو اوروں کی شفاعت کرنے کا حق حاصل ہوگا۔ اور آپ کی امت کے صالحین کو دوسروں کی شفاعت کا حق حاصل ہوگا۔ لہٰذا تم ان کو اپنے تابع بنانے کے تصورات کو اپنے ذہنوں سے نکال دو۔

اور وجہ مکرر ذکر کرنے کی یہ بھی ہے کہ پہلے اجمالی طور پر نعمتوں کی یاد دلائی، پھر تفصیلی طور پر چند نعمتوں کی یاد دلائی، پھر تفصیلی طور پر چند نعمتوں کا ذکر کیا پھر ان آیات میں نعمتوں کی یاد دلا کر گویا کہ نتیجہ اور خلاصہ ذکر فرما دیا۔

چند الفاظ مبارکہ میں فرق:

۱) پہلی آیۃ میں ذکر کیا گیا ﴿وَلَا یُقْبَلُ مِنْھَا شَفَاعَۃٌ ﴾ اور اس آیۃ کریمہ میں ذکر کیا گیا ﴿وَلَا تَنْفَعُھَا شَفَاعَۃٌ ﴾

۲) پہلی آیۃ میں ذکر ہوا ﴿لَا یُؤْخَذُ مِنْھَا عَدْلٌ ﴾ اس آیۃ میں ذکر ہوا ﴿لَا یُقْبَلُ مِنْھَا عَدْلٌ ﴾

۳) پہلی آیۃ میں شفاعت کو مقدم ذکر کیا گیا اور فدیہ کو مؤخر، اور اس آیۃ میں فدیہ کو مقدم ذکر کیا، اور شفاعت کو مؤخر ان میں وجہ فرق کیا ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ کافی حد تک اس قسم کی بحثوں کو پہلے ذکر کر دیا گیا، تاہم قدرے مناسب یہاں بھی ذکر کیا جا رہا ہے۔ شفاعت نفع دینے والی چیز ہے نقصان دہ نہیں، لیکن کافروں کے حق میں شفاعت قبول نہیں ہوگی۔

اسی طرح شفاعت کرنے والا اس کے نزدیک مقبول ہوتا ہے جس کے پاس وہ شفاعت کرنے کے لئے گیا ہے۔

پہلی آیۃ میں ﴿وَلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ﴾ اس لئے ذکر فرمایا ہے کہ اس سے پہلے ﴿وَلَا تَكُونُوٓا اَوَّلَ كَافِرٍۢ بِهٖ﴾ صراحۃً ذکر ہو چکا ہے۔

یعنی پہلے ان کو کفر سے منع کیا گیا، پھر ان کو بتایا گیا کہ اگر تم نے کفر کیا تو تمہارے حق میں کسی کی شفاعت قبول نہیں کی جائے گی، کیونکہ کافروں کے لئے کوئی شفاعت قبول نہیں۔

دوسری آیۃ سے پہلے مضمون یہ آ رہا تھا کہ یہود و نصاریٰ تو یہ چاہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام بھی ہمارے دین پر آ جائیں، تو ان کو بتایا گیا کہ نبی کریم ﷺ اور آپ کے ساتھ ایمان لانے والوں کی شفاعت لوگوں (گنہگاروں) کو نفع دے گی، لیکن تمہیں نفع نہیں دے گی، کیونکہ تم تو ان کو اپنا تابع بنانا چاہتے ہو، ان کی شفاعت تو ان لوگوں کو نفع دے گی جو ان کی تابعداری کرنے والے ہوں گے۔

اس سے واضح ہو گیا کہ کافروں کا کوئی فدیہ نفع نہیں دے گا۔ لیکن جہاں پہلے کافروں کا ذکر ہوا وہاں ﴿لَا يُؤْخَذُ﴾ ذکر کیا، کہ ان کے لئے فدیہ کسی سے لیا ہی نہیں جائے گا۔

اس وہم کو بھی رد کر دیا کہ کوئی شخص دنیا والوں پر اسے قیاس نہ کرے کہ بعض اوقات فدیہ لے کر تردد ہوتا ہے کہ اسے قبول کیا جائے یا نہ قبول کیا جائے۔

یہاں چونکہ پہلے صراحۃً ان کے کفر کا ذکر نہیں تھا لیکن اشارۃً ان کا کفر سمجھ میں آ رہا ہے اس لئے صرف ﴿لَا يُقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ﴾ پر اکتفاء کر لیا گیا کہ ان سے فدیہ قبول نہیں کیا جائے گا۔

راقم کے نزدیک دونوں آیات کا مجموعی مضمون مکمل مسئلہ بیان کر رہا ہے کہ ان کے لئے نہ شفاعت قبول کی جائے گی اور نہ ہی ان کو نفع دے گی۔ اور نہ ہی ان کے لئے فدیہ لیا جائے گا اور نہ ہی ان کی طرف سے فدیہ قبول کیا جائے گا۔

شفاعت اور فدیہ کی تقدیم وتاخیر کی وجہ یہ ہے کہ پہلی آیۃ میں ابتداء حادثہ کا ذکر تھا، ابتداء حادثہ میں شفاعت پہلے ہوتی ہے۔ فدیہ بعد میں، لہٰذا اسی انداز پر نفی بھی کر دی گئی۔ اور دوسری آیۃ میں انتہاء حادثہ کا ذکر کیا گیا، اور انتہاء حادثہ میں فدیہ پہلے دینے کی کوشش کی جاتی ہے، اس لیے اسی طرح نفی بھی کردی گئی، واللہ اعلم بالصواب، (ماخوذ از عزیزی)

خلاصہ کلام: بنی اسرائیل کو اللہ تعالیٰ نے اپنی کئی نعمتوں کی تفصیل کا ذکر کرنے کے بعد پھر اسی طرح کا خطاب کیا جیسا کہ ان نعمتوں کے ذکر کرنے سے پہلے خطاب فرمایا۔ ان کو فرمایا کہ اے بنی اسرائیل میری نعمتوں کو یاد کرو جو میں نے تمہیں عطاء کی ہیں۔ اور یہ بھی یاد کرو کہ میں نے تمہارے آباء واجداد کو انکے زمانے میں دوسروں پر فضیلت دی۔ جس کی وجہ سے لوگ تمہیں بھی عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

اور یہ بھی خیال رکھنا کہ رب تعالیٰ کی عدالت دنیا داروں کی نام نہاد عدالتوں کی طرح نہیں، دنیا دار تو بعض اوقات مجرم کی جگہ دوسرے کو یرغمال بنا کر مجرم کو چھوڑ دیتے ہیں۔ کبھی مجرم کے حق میں کسی کی سفارش مان کر مجرم کو چھوڑ دیتے ہیں۔

اور کبھی مال و دولت لے کر مجرم کو آزاد کر دیتے ہیں۔ اور کبھی اس مجرم کی دوسرے مدد کر کے اسے بزور بازو چھڑا لیتے ہیں۔ جیسا کہ ہم مشاہدہ کرتے ہی رہتے ہیں کہ ہمارے لٹھ بردار نوجوان اسی فیصد ملک کا مال وزر ہڑپ کرنے والے ہمیشہ اپنے مجرم، غاصب اور لیٹرے فرمانروا کی مدد کر کے شرفاء کی پگڑیوں کو اچھالتے ہیں، شرفاء کو مجرم ٹھہراتے ہیں، شرفاء کو اس ڈر سے ملک بدر کر دیتے ہیں کہ وہ کہیں ہمارے اندرونی راز نہ کھول دیں۔

لیکن رب قدوس کی پاک عدالت جو عدالت ہے خجالت نہیں، جو عدالت ہے ذلالت نہیں، جو عدالت ہے رذالت نہیں، اس عدالت عظمیٰ میں کسی مجرم کی جگہ غیر مجرم کو یرغمال نہیں بنایا جائے گا۔ کسی مجرم یعنی کسی کافر و مشرک کے حق میں کسی کی شفاعت کو نہ ہی قبول کیا جائے گا اور نہ ہی کسی کی شفاعت اسے نفع دے گی۔

اور رب کی عدالت میں فدیہ دے کر کسی کو چھڑانے کا تصور کرنا ہی باطل ہے۔ اور رب تعالیٰ سے کوئی زور آور نہیں، کوئی ڈنڈے والا کسی کو چھڑا لے یہ نہیں ہو سکے گا۔ (راقم)

وَاِذِ ابْتَلٰۤی اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ ؕ قَالَ اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ؕ قَالَ وَمِنْ ذُرِّیَّتِیْ ؕ قَالَ لَا یَنَالُ عَهْدِی الظّٰلِمِیْنَ

(آیت ۱۲۴)

۱) اور جب ابراہیم کو اس کے رب نے کچھ باتوں سے آزمایا تو اس نے وہ پوری کر دکھائیں، فرمایا میں تمہیں لوگوں کا پیشوا بنانے والا ہوں، عرض کی اور میری اولاد سے فرمایا میرا عہد ظالموں کو نہیں پہنچتا۔

۲) اور جب آزمایا ابراہیم کو ان کے رب نے چند باتوں سے، تو انہوں نے پورا کیا ان کو، کہا (رب نے) بے شک میں بنانے والا ہوں تمہیں لوگوں کا امام۔ انہوں نے کہا اور میری اولاد میں سے، کہا نہیں پہنچتا میرا عہد ظالموں کو۔

جب پہلے قبلہ کا ذکر ہوا کہ قبلہ کے بدل جانے پر یہود و نصاریٰ اس بات سے مایوس ہو گئے کہ نبی کریم ﷺ اور آپ کے صحابہ ان کے دین کو قبول نہیں کریں گے، جبکہ پہلے وہ امید رکھتے تھے۔

اس کے بعد قبلہ یعنی کعبہ شریف کی تعمیر اور ابراہیم علیہ السلام کا ذکر کیا۔ کہ کعبہ شریف ہی ابراہیم علیہ السلام کا قبلہ تھا۔ (از قرطبی)

جب پہلے یہود اور نصاریٰ اور مشرکین کا ذکر کیا کہ وہ ایمان لانے سے انکار کر رہے تھے، ایمان لانے سے انکار میں کئی حیلے، بہانے بنا رہے تھے۔ ٹال مٹول سے کام لے رہے تھے۔

تو اس کے بعد ابراہیم علیہ السلام کا ذکر کیا کیونکہ مشرکین بھی ان کا احترام کرتے تھے اور کہتے تھے کہ ہم ان کی اولاد سے ہیں اور انہوں نے کعبہ تعمیر کیا۔

اور یہود و نصاریٰ بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کو عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے، اپنے آپ کو ان کی اولاد سے کہتے تھے تو رب تعالیٰ نے ان کا تذکرہ کر کے گویا کہ یہود و نصاریٰ اور مشرکین کو کہا کہ تم نبی کریم ﷺ

کے اقوال کو قبول کرلو، ان کے دین کا اعتراف کرلو، اوران کی شریعت کے مطیع ہو جاؤ۔

ابراہیم علیہ السلام کے ذکر سے ان کو نبی کریم ﷺ کی اطاعت کا حکم کیسے دیا؟ اس میں چند وجوہ ہیں۔

۱) اللہ تعالیٰ نے جب ابراہیم علیہ السلام کو بعض تکلیف والے کاموں کا حکم دیا تو آپ نے ان کو پورا کیا، اور ذمہ داری کو مکمل کیا تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو منصب نبوت اور امامت پر فائز کر دیا، یعنی اعلان نبوت کا حکم دیا، کیونکہ نبی پیدائش سے پہلی ہی نبی ہوتا ہے۔

اس سے یہود اور نصاریٰ اور مشرکین کو متنبہ کیا کہ جب تم تمام ہی ابراہیم علیہ السلام کی بزرگی اور بلندیٔ شان کو تسلیم کرتے ہو تو اس پر بھی غور کرو کہ ان کو رب تعالیٰ کے حضور جھکنے اور عجز کرنے کی وجہ سے منازل رفیعہ حاصل ہوئے۔

تو تم بھی اگر دنیا اور آخرت میں بھلائی چاہتے ہو تو سرکشی اور عناد چھوڑ دو، اللہ تعالیٰ کے احکام کو دل و جان سے مان لو، اور رب تعالیٰ کی طرف سے تکالیف کو برداشت کرو، یہ تمام چیزیں اسی وقت حاصل کرسکو گے جب نبی کریم ﷺ پر ایمان لاؤ گے۔

۲) رب تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کو جب یہ فرمایا ﴿ لَايَنَالُ عَهْدِی الظّٰلِمِيْنَ ﴾ (نہیں پہنچتا میرا عہد ظالموں کو) تو اس سے واضح فرمادیا" ان منصب الامامة والرياسة فی الدين لايصل الی الظالمين " کہ بے شک منصب امامت اور دین میں منصب ریاست ظالموں کو نہیں مل سکتا۔

مشرکین اور یہود و نصاریٰ سب ہی یہ چاہتے تھے کہ یہ منصب ہمیں حاصل ہوتا، تو انہیں بتا دیا کہ جھگڑالو اور تعصب کی وجہ سے باطل راہ پر چلنے والے اس منصب کو کیسے حاصل کر سکتے ہیں۔ گویا کہ ان کو دعوت فکر دی کہ ذرا غور کرو، عقل سے کام لو کیا واقعی محمد (ﷺ) اس منصب کی قابل ہیں؟ جب یقیناً ہیں تو ان پر ایمان لے آؤ۔

۳) " وثالثها ان الحج من خصائص دين محمد ﷺ، فحكى الله تعالى ذلك عن ابراهيم ليكون ذلك كالحجة على اليهود والنصارى فی وجوب الانقياد لذلك "

تیسری وجہ یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کعبہ شریف کی تعمیر فرمائی، اور حج کا اعلان فرمایا،

لیکن آپ کے بعد حج کی فرضیت نبی کریم ﷺ اور آپ کی امت پر ہوئی، یعنی باقاعدگی سے حج پر عمل نبی کریم ﷺ نے کرایا، تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر کر کے یہود و نصاریٰ کو بتایا کہ جب تم اسے تسلیم کرتے ہو کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے مقرب اور جلیل القدر نبی تھے۔ جب تم یہ بھی مانتے ہو کہ کعبہ شریف انہوں نے ہی تعمیر کیا، جب تم یہ بھی مانتے ہو کہ حج کا اعلان انہوں نے ہی تعمیر کعبہ کے بعد فرمایا۔ جب تم یہ بھی تسلیم کرتے ہو کہ ابراہیم علیہ السلام نے حج کیا، اس کے بعد بطور فرض حج پر باقاعدگی سے عمل نہ ہوسکا۔

اب جب نبی کریم ﷺ کی شریعت میں فرض کر دیا گیا، باقاعدگی سے حج جاری ہو چکا ہے تو تمہیں خوش ہونا چاہئے کہ تمہارے جد امجد کی یاد دوبالا ہو رہی ہے۔ لہٰذا تمہیں نبی کریم ﷺ پر ایمان لانا چاہئے۔

۴) جب کعبہ شریف۔ کو قبلہ بنا دیا گیا تو یہود و نصاریٰ پر یہ شاق گذرا، تو رب تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کا ذکر فرمایا کہ اس کی تعمیر کرنے والے تو ابراہیم علیہ السلام ہیں۔ "**الذی یعترفون عظیمه و وجوب الاقتداء به**" یہ تو وہ ذات ہے جن کی تعظیم کا تم لوگ اعتراف کرتے ہو، اور جن کی اقتداء کو واجب قرار دیتے ہو، تو تمہیں چاہئے کہ دلوں سے غصہ کو نکال کر خوش ہو جاؤ کہ قبلہ تو وہی ہے جس کو ہمارے جد امجد نے بنایا۔ جب یہ بات تمہیں سمجھ آ جائے تو نبی کریم ﷺ پر ایمان بھی لے آؤ۔

۵) مشرکین بھی ابراہیم علیہ السلام کی تعظیم کرتے تھے، بلکہ ابراہیم علیہ السلام نے بطور نظافت جو کام کئے (جن کا ذکر ان شاء اللہ قریب ہی آ رہا ہے) وہ مشرکین بھی کرتے تھے، اور باوجود اس کے کہ نبی کریم ﷺ کی صداقت و امانت کے بھی معترف تھے، اور یہ بھی جانتے تھے کہ آپ کی شریعت میں ملت ابراہیمی کے بہت سے احکام موجود ہیں۔

تو ابراہیم علیہ السلام اور تعمیر کعبہ کا ذکر فرما کر انہیں بھی فرمایا گیا کہ تم نبی کریم ﷺ پر ایمان لاؤ۔ بلکہ تمہیں تو سب سے زیادہ حق پہنچتا ہے کہ تم ایمان لے آؤ کیونکہ تم حرم شریف میں رہنے والے ہو۔

(ماخوذ از کبیر)

وَاِذِابْتَلٰی اِبْرَاهِیْمَ رَبُّهٗ بِكَلِمَاتٍ فَاَتَمَّهُنَّ :

اور جب آزمایا ابراہیم کو ان کے رب نے چند باتوں سے تو انہوں نے ان کو پورا کیا۔

قال الجوهری " بلوته بلوا جربته واختبرته "یعنی ابتلاء کا معنی تکالیف شاقہ میں مبتلاء کرنا، اور تجربہ کرنا اور کسی کی آزمائش کرنا۔

آیۃ کریمہ میں ابتلاء کا کیا معنی ہے؟ یا تو معنی یہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کو رب تعالیٰ نے تکالیف شاقہ میں مبتلاء فرمایا تو آپ نے ان کو پورا کیا، یعنی صبر و تحمل سے ان کو برداشت کیا۔

اور یا معنی ہوگا آزمانا۔ مترجمین حضرات نے تقریباً یہی معنی اختیار کیا ہے۔ لیکن یہ بھی خیال رہے کہ " اختبـــار " آزمانا) کا حقیقی معنی تو یہ ہے کہ جس کے انجام اور عواقب امور کا پتہ نہ ہو کہ یہ اوامر و نواہی کو تسلیم کرے گا یا نہیں۔ مطیع ہوگا یا عاصی تو اس کو آزمایا جائے کہ پتہ چل جائے کہ یہ کیسا ہے؟ یہ معنی رب تعالیٰ کی شان کے لائق نہیں کہ وہ کسی کی آزمائش کر کے پتہ چلائے کہ یہ مطیع ہے یا عاصی، رب تعالیٰ تو بندوں کی پیدائش سے پہلے ہی ان کو جانتا ہے۔

لہذا رب تعالیٰ کے آزمانے کا مطلب " **کما قال فی الوسیط ابتلاء اللّٰہ تعالیٰ یعود اعلامه عباده لا الی استعلامه** " اس طرح ہوگا جیسا کہ وسیط میں بیان کیا گیا کہ رب تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کو آزما کر اپنے بندوں پر ان کا مرتبہ ظاہر فرما دیا۔

رب تعالیٰ نے آپ کو اس لئے نہیں آزمایا کہ پہلے رب تعالیٰ کو علم نہیں تھا تو آزمانے کے بعد علم حاصل ہوا۔ (از شیخ زادہ)

تنبیہ : ابھی جو مسئلہ ذکر کیا کہ رب تعالیٰ کے آزمانے کا مطلب کیا ہے؟ جب تک وہ نہ سمجھا جائے تو انسان اسی طرح بھٹکتا رہتا ہے جیسا کہ ہشام بن حکم بھٹکا، اس نے کہا

" **انه تعالی کان فی الازل عالما بحقائق الاشیاء و ما هیا تها فقط ، فاما حدوث تلک الماهیات و دخولها فی الوجود فهو تعالی لا یعلمها الا عند وقوعها** " (کبیر)

اللہ تعالیٰ ازل میں صرف اشیاء کی حقیقتوں اور ماہیتوں کو جانتا ہے۔ لیکن ان ماہیات کا حدوث

اور معرض وجود میں آنا اس وقت رب تعالیٰ کو معلوم ہوتا ہے جب وہ چیزیں واقع میں موجود ہو جاتی ہیں علامہ رازی رحمۃ اللہ نے تو اس پر طویل بحث کی ہے۔ تاہم خلاصہ یہی ہے کہ وہ اسی قسم کی آیات کے ظاہری ترجمہ کو دیکھ کر بھٹکا ہے کہ رب تعالیٰ اس لئے تو آزماتا ہے کہ وہ پہلے نہیں جانتا۔

کاش اسے یہ پتہ ہوتا کہ " اختبار " کا کبھی معنیٰ " اعلامہ عبادہ " ہوتا ہے کہ کسی کا امتحان لے کر اس کا مرتبہ دوسروں پر واضح کیا جاتا ہے کہ دوسروں کو اس کی شان کا پتہ چل جائے۔ رب تعالیٰ کے آزمانے کا یہی مطلب ہے۔ اور کبھی " اختبار " کا معنیٰ ہوتا ہے " استعلامہ " یعنی پہلے پتہ نہیں ہوتا تو اس کا پتہ چلانے کے لئے آزمایا جاتا ہے یہ معنیٰ رب تعالیٰ کی شان کے لائق ہی نہیں۔

مقام تعجب یہ ہے کہ علم والے لوگ بھی کبھی بھٹکتے ہیں تو عجیب طریقہ پر، یہ دونوں معنیٰ ایسے ہیں کہ ہم روزمرہ ان کا مشاہدہ کر رہے، تجربہ کر رہے ہیں، کہ آزمانے کی یہ دو ہی وجہ ہیں۔

آجکل قرآن پاک کے تراجم کو دیکھ کر علم سے خالی لیکن علم کے دعویدار اسی طرح بھٹک رہے ہیں، اور تمام قوم کو بھٹکانے کے لئے علماء کو ختم کر رہے ہیں۔ کہ جو ہم کہیں اسی کو سب ماننے والے ہو جائیں، کوئی اسے غلط کہنے والا نظر نہ آئے۔

اِبْرَاهِیْمَ : یہ لفظ سریانی زبان کا ہے۔ جس کا معنیٰ ہے " اب راحم " رحم کرنے والا باپ۔ آپ کے نام سے ہی پتہ چل رہا ہے کہ آپ بچوں پر رحم کرنے والے ہیں۔

" ولذالک جعل هو وسارة زوجته کافلین لاطفال المؤمنین الذین یموتون صغار الی یوم القیامة "

اسی وجہ سے آپ کو اور آپ کی زوجہ حضرت سارہ کو مومنوں کے فوت ہونے والے بچوں کا قیامت تک کفیل بنا دیا گیا ہے۔

بخاری شریف کی حدیث میں اس مسئلہ کی تائید پائی گئی ہے۔ حضرت سمرہ رضی اللہ عنہ نے نبی کریم ﷺ کے ایک طویل خواب کا ذکر فرمایا ہے۔ جس میں یہ مذکور ہے۔" ان النبی ﷺ رأی فی الروضة ابراهیم علیه السلام وحوله اولاد الناس " بے شک نبی کریم ﷺ نے ابراہیم علیہ السلام کو ایک باغ میں دیکھا، آپ کے اردگرد لوگوں کے بچے موجود تھے۔ (از قرطبی)

ابراہیم علیہ السلام کا نسب:

آپ تارخ ابن ناخور کے فرزند ہیں۔ آپ کا نام ابراہیم اور آپ کا لقب ابوالضیفان (بہت بڑے مہمان نواز) ہے۔ آپ کا نسب یہ ہے، ابراہیم ابن تارخ ابن ناخور ابن ساروع ابن رعوا بن تاتع ابن عابر ابن شالح ابن ارفخشذ ابن سام بن نوح (حقانی)

آپ کی پیدائش طوفان نوح کے سترہ سو نو سال بعد ہوئی اور عیسیٰ علیہ السلام سے تقریباً دو ہزار تین سو سال پہلے شہر بابل کے قریب قصبہ کونی میں ہوئی۔ (تفسیر عزیزی)

تفسیر خزائن العرفان میں ہے کہ آپ کی پیدائش اہواز کے علاقہ مقام سوس میں ہوئی۔

(خزائن العرفان)

تنبیہ: آزر ابراہیم علیہ السلام کے چچا کا نام ہے آپ کا باپ کا نام تارخ ہے۔

علامہ محمود آلوسی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" والذی عول علیه الجم الغفیر من اهل السنة ان آزر لم یکن والد ابراهیم علیه السلام وادعوا انه لیس فی آباء النبی ﷺ کافرا اصلا لقوله علیه الصلوٰة والسلام لم ازل انقل من اصلاب الطاهر الی ارحام الطاهرات "

اہل سنت کے کثیر اہل علم کا اسی پر اعتماد ہے کہ بے شک آزر ابراہیم علیہ السلام کا باپ نہیں تھا۔

اہل سنت کے جم غفیر کی دلیل یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کے آباء واجداد میں کوئی بھی کافر نہیں تھا۔

نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ میں ہمیشہ پاک پشتوں سے پاک رحموں کی طرف منتقل ہوتا رہا۔

اور یہ بھی واضح ہے کہ کفار و مشرکین تو کبھی پاک نہیں ہو سکتے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا ﴿ اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ ﴾ بے شک مشرک تو ناپاک لوگ ہیں۔ (از روح المعانی)

ابراہیم علیہ السلام کے چار بیٹے ہیں حضرت اسماعیل علیہ السلام، حضرت اسحاق علیہ السلام، مدین اور مدائن۔

(از قرطبی)

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا تفصیلی واقعہ ایک جگہ ہی کوئی دیکھنا چاہے تو راقم کی کتاب تذکرۃ الانبیاء کا مطالعہ کرے۔ یہاں تو آیۃ کریمہ کے مناسب ہی ذکر کیا جائے گا۔

بِكَلِمٰتٍ: کلمات جمع ہے کلمہ کی۔ مراد اس سے وہ چیزیں ہیں جن کی تکلیف ابراہیم علیہ السلام کو دی گئی۔ البتہ ان اشیاء کو کلمات اس لئے کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے کلام سے ان کا حکم دیا گیا، اور آپ کو تکلیف دی گئی۔

جیسا کہ عیسیٰ علیہ السلام کو ''کلمہ'' کہا گیا ہے۔ کیونکہ وہ کلمہ ''کن'' سے پیدا ہوئے۔ (قرطبی)

کلمات سے مراد اوامر و نواہی ہیں، یعنی اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کو اوامر و نواہی سے آزمایا، آپ نے ان کو پورا کیا۔ خیال رہے کہ اوامر و نواہی ارواح کے لئے فضل و احسان ہیں۔ لیکن ظاہر طور پر بدن کے لئے مشقت اور تھکاوٹ کا سبب بنتے ہیں۔ اس لئے ان سے انسان کی آزمائش کی جاتی ہے۔
(بیضاوی و شیخ زادہ)

امتحان مطابق شان:

یہ ہر شخص کی عقل تسلیم کرتی ہے کہ امتحان شان کے مطابق ہوتا ہے۔ جتنی شان بڑھتی چلی جائے گی اسی کے مطابق امتحان بڑھتا چلا جائے گا۔ پہلی جماعت کے لڑکے سے امتحان اس کی شان کے مطابق ہوگا۔ اور پانچویں جماعت کے لڑکے سے اس کے شان کے مطابق ہوگا۔ جیسا تعلیمی درجہ بڑھتا چلا جائے گا، اسی طرح امتحان بھی بڑھتا چلا جائے گا۔ نبی کریم ﷺ چونکہ سید الکائنات اور سید الانبیاء ہیں اس لئے آپ پر سب سے بڑے امتحانات آئے اور زیادہ سے زیادہ آپ کو مصائب کا سامنا پڑا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام رفیع منصب رکھنے کی وجہ سے اور جلیل القدر نبی ہونے کی وجہ سے کئی امتحانات میں مبتلاء ہوئے۔ یعنی کلمات سے مراد بہت سے امور ہیں۔

کلمات سے مراد ستارے، چاند اور سورج:

حضرت ابراہیم علیہ السلام جس قوم میں تشریف لائے وہ لوگ ستاروں کی پوجا کرنے والے اور چاند کی پوجا کرنے والے اور سورج کی پوجا کرنے والے تھے۔

ان لوگوں نے کوشش کی کہ ابراہیم بھی ہماری طرح ستاروں اور چاند اور سورج کی پوجا کریں۔ ان لوگوں کا آپ کو ان کی پرستش کی طرف مائل کرنا آپ کے لئے بہت بڑا امتحان تھا۔ جس میں آپ

نے عظیم کامیابی حاصل کی۔

جب ان لوگوں نے آپ کو ستاروں کی پوجا کرنے کے لئے کہا، تو آپ نے ان کے کہنے پر غور کیا، کہ ان لوگوں کا کہنا کیسے درست ہے؟

" فلما جن علیه اللیل رأی کوکبا قال هذا ربی فلما افل قال لا احب الآفلین "

پھر جب ان پر رات کا اندھیرا آیا ایک تارا دیکھا، بولے اسے میرا رب ٹھہراتے ہو، پھر جب وہ ڈوب گیا، بولے مجھے خوش نہیں آتے ڈوبنے والے۔

یعنی آپ نے ستارہ پرستوں کو دوٹوک جواب دے دیا کہ یہ ڈوب جانے والے خدا نہیں بن سکتے۔ اس امتحان میں آپ نے عظیم کامیابی حاصل کی۔

چاند کی پوجا کرنے والوں نے آپ کو چاند کی پوجا کرنے کی دعوت دی، آپ نے ان کی دعوت پر چاند کو دیکھ کر کہا۔

" فلما رأی القمر بازغا قال هذا ربی فلما افل قال لئن لم یهدنی ربی لاکونن من القوم الضالین "

پھر جب چاند چمکتا دیکھا بولے اسے میرا رب بتاتے ہو، پھر جب وہ ڈوب گیا، کہا اگر مجھے میرا رب ہدایت نہ کرتا تو میں بھی انہیں گمراہوں میں ہوتا۔

آپ نے چاند پرستوں کو بھی مایوس کر دیا، کہ تم چاہتے ہو کہ میں چاند کی پوجا کروں، کیا تمہیں معلوم نہیں کہ میرے رب نے مجھے ہدایت دے رکھی ہے۔ جسے رب نے ہدایت دے رکھی ہو وہ چاند کی پوجا کرے یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ سبحان اللہ اس امتحان میں بھی آپ کامیاب ہوئے۔

سورج کی پوجا کرنے والوں نے چاہا کہ ابراہیم بھی سورج کی پوجا کریں۔ انہوں نے بھی کوشش کی، آپ کو دعوت دی کہ تم بھی ہماری طرح سورج کی پرستش کرو۔

" فلما رأی الشمس بازغة قال هذا ربی هذا اکبر فلما افلت قال یقوم انی بریٔ مما تشرکون "

پھر سورج جگمگاتا دیکھا بولے اسے میرا رب کہتے ہو، یہ تو ان سب سے بڑا ہے۔ پھر جب وہ

ڈوب گیا، کہا اے قوم میں بے زار ہوں ان چیزوں سے جنہیں تم شریک ٹھہراتے ہوں۔
سورج کی پوجا کرنے والے بھی ناکام ہو گئے۔ آپ نے امتحان میں عظیم کامیابی حاصل کر لی۔

کلمات سے مراد ذبح ولد:

سات ذی الحج گذر جانے پر رات کو خواب دیکھا کہ کوئی کہنے والا کہہ رہا ہے۔ بے شک اللہ تعالیٰ تمہیں بیٹا ذبح کرنے کا حکم دیتا ہے، آپ نے صبح اس پر تفکر کیا اور کچھ تردد میں رہے کہ کیا یہ اللہ تعالیٰ کا ہی حکم ہے۔ یا خواب فقط خیال تو نہیں۔ اسی وجہ سے آٹھ ذی الحج کا نام یوم الترویہ رکھا گیا۔ (سوچ و بچار کا دن) آٹھ تاریخ کا دن گذر جانے پر رات پھر خواب دیکھا صبح یقین کر لیا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہی حکم ہے۔ اسی نو ذی الحج کو یوم عرفہ (پہچاننے کا دن) کہا جاتا ہے۔
اس کے بعد آنے والی رات کو پھر خواب دیکھنے پر صبح اس پر عمل کرنے کا مصمم ارادہ کر لینے پر ہی دس ذی الحج کو یوم النحر (ذبح کا دن) کہا جاتا ہے۔ (کبیر)
" ان اللہ تعالی جعل رؤیا الانبیاء علیھم السلام حقا " (کبیر)
بے شک اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام کے خوابوں کو حق بنایا یعنی ان کے خوابات سچے ہوتے ہیں، ان کو اپنے خوابوں پر عمل کرنا لازم ہوتا ہے۔
مطلب واضح ہے کہ بیٹے کو ذبح کرنے کا حکم دے کر عظیم امتحان لیا گیا۔ لیکن آپ نے اسے بھی پورا کیا۔
تفصیلی واقعہ سورۃ ''والصافات'' میں ان شاء اللہ آئے گا۔

کلمات سے مراد آگ:

ابراہیم علیہ السلام نے جب کفار کے بناوٹی خداؤں کو تباہ و برباد کر دیا، اور دلائل میں بھی ان پر غلبہ حاصل کر لیا، تو انہوں نے آپ سے انتقام لینے کا فیصلہ کر لیا اور سب سزاؤں سے سخت سزا تجویز کی، یعنی یہ کہ آپ کو آگ میں جلا دیا جائے حالانکہ آگ کا عذاب صرف اللہ تعالیٰ دے سکتا ہے۔ بندے

بے کے لئے جائز نہیں کہ کسی کو آگ کا عذاب دے۔ لیکن نمرود اور اس کی قوم نے آپ کو جلانے کی سزا دی اللہ تعالیٰ نے اس کا ذکر فرمایا:

﴿ قَالُوا ابْنُوا لَهٗ بُنْيَانًا فَأَلْقُوهُ فِي الْجَحِيمِ ﴾ (پ ۲۳ ع ۷)

وہ کہنے لگے اس کے لئے ایک عمارت بناؤ پھر اسے بھڑکتی آگ میں ڈال دو۔

یعنی اردگرد بہت بڑی دیوار بنا کر اس کے درمیان آگ جلاؤ، پھر ابراہیم کو اس میں ڈال دو،

﴿قَالُوا حَرِّقُوهُ وَانْصُرُوا اٰلِهَتَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ فَاعِلِيْنَ ﴾ ...... پ ۱۷ ع ۵) بولے اس کو جلا دو اور اپنے خداؤں کی مدد کرو اگر تمہیں کرنا ہے۔

مکمل واقعہ تو اپنی جگہ پر ہی آنا ہے۔ یہاں تو صرف اتنا سمجھا جائے کہ انہوں نے آگ جلا کر آپ کو آگ میں ڈال دیا۔

کتنا بڑا امتحان، لیکن عظیم کامیابی کو ذرا دیکھئے، آپ کے پاس ہواؤں کا فرشتہ آیا عرض کرنے لگا مجھے آپ حکم دیں تو میں آگ کو ختم کردوں۔ آپ نے فرمایا مجھے تمہاری امداد کی کوئی ضرورت نہیں ﴿حَسْبِيَ اللّٰهُ وَ نِعْمَ الْوَكِيْلُ ﴾ میرا اللہ مجھے کافی ہے اور وہی بہتر کارساز ہے۔

آپ کے پاس جبرائیل علیہ السلام آئے اور عرض کیا کہ آپ کو میری امداد کی ضرورت ہو تو میں آپ کی امداد کروں، آپ نے فرمایا مجھے تمہاری امداد کی ضرورت نہیں، جبرائیل نے کہا اچھا تو پھر اپنے رب تعالیٰ سے ہی سوال کرلو، تو آپ نے فرمایا" حسبی من سوالی علمه بحالی "وہ میرے حال کو جانتا ہے سوال کے بغیر ہی مجھے کافی ہے۔

کلمات سے مراد ہجرت:

﴿ وَقَالَ اِنِّيْ ذَاهِبٌ اِلٰى رَبِّيْ سَيَهْدِيْنِ ﴾ (پ ۲۳)

اور ابراہیم علیہ السلام نے کہا میں جا رہا ہوں، جہاں میرے رب نے حکم دیا ہے وہی میری راہنمائی فرمائے گا۔

یعنی آپ کو ہجرت کا حکم دے کہ آزمایا گیا تو آپ نے ہجرت کر کے آزمائش میں کامیابی حاصل

کی، حالانکہ وطن کو چھوڑنا بہت مشکل کام ہے۔

ابتدائی طور پر آپ نمرودی قوم سے ہجرت کر کے اپنے چچا ہاران کے پاس حران میں آ گئے، ہاران نے ابراہیم علیہ السلام کی نیک بختی دیکھ کر اپنی بیٹی سارہ کا نکاح آپ سے کر دیا۔ سارہ بہت ہی خوبصورت لڑکی تھی، مردوں میں حضرت یوسف اور عورتوں میں حضرت سارہ بہت حسین ہوئے، بلکہ حضرت یوسف علیہ السلام کو اپنی دادی حضرت سارہ کے حسن سے ہی حسن ملا تھا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے وہاں بھی اپنا سلسلہ تبلیغ جاری رکھا، اس لئے آپ کے چچا ہاران نے بھی آپ کو گھر سے نکال دیا۔ آپ ہجرت کر کے فلسطین میں تشریف لے گئے۔

کلمات سے مراد شرائع اسلام:

- تیس شرائع اسلام سے آپ کو آزمایا گیا، آپ ان پر پورے اترے۔

ان میں سے دس کا ذکر سورۃ براءۃ میں ہے:

﴿اَلتَّآئِبُوْنَ الْعٰبِدُوْنَ الْحٰمِدُوْنَ السَّآئِحُوْنَ الرّٰكِعُوْنَ السّٰجِدُوْنَ الْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَالْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ ؕ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾

توبہ والے، عبادت والے، حمد کرنے والے، روزے والے، رکوع کرنے والے، سجدہ کرنے والے، اچھے کاموں کا حکم دینے والے، برے کاموں سے روکنے والے، اللہ کی حدود کی حفاظت کرنے والے، اور خوشخبری دو مومنوں کو۔

اور دس کا ذکر احزاب میں ہے:

﴿اِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمٰتِ وَالْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ وَالْقٰنِتِيْنَ وَالْقٰنِتٰتِ وَالصّٰدِقِيْنَ وَالصّٰدِقٰتِ وَالصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰبِرٰتِ وَالْخٰشِعِيْنَ وَالْخٰشِعٰتِ وَالْمُتَصَدِّقِيْنَ وَالْمُتَصَدِّقٰتِ وَالصَّآئِمِيْنَ وَالصّٰٓئِمٰتِ وَالْحٰفِظِيْنَ فُرُوْجَهُمْ وَالْحٰفِظٰتِ وَالذّٰكِرِيْنَ اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّالذّٰكِرٰتِ ۙ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا﴾

بے شک مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں ، اور ایمان والے مرد اور ایمان والی عورتیں ، اور فرمانبردار مرد اور فرمانبردار عورتیں ، اور سچے مرد اور سچی عورتیں ، اور صبر والے مرد اور صبر والی عورتیں ، اور عاجزی کرنے والے مرد اور عاجزی کرنے والی عورتیں ، اور خیرات کرنے والے مرد اور خیرات کرنے والی عورتیں ، اور روزے رکھنے والے مرد اور روزے رکھنے والی عورتیں ۔ اور اپنی پارسائی نگاہ والے مرد ، اور نگاہ رکھنے والی عورتیں ، اور اللہ کو بہت یاد کرنے والے مرد اور یاد کرنے والی عورتیں ۔ ان سب کے لئے اللہ نے بخشش اور بڑا ثواب تیار کر رکھا ہے۔

اور دس کا ذکر سورۃ مومنون اور معارج میں ہے:

﴿قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ☆ الَّذِيْنَ هُمْ فِي صَلوتِهِمْ خَاشِعُوْنَ ☆ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ ☆ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ ☆ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ☆ اِلَّا عَلٰى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ☆ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ☆ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رَاعُوْنَ ☆ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ☆﴾

بے شک کامیاب ہوئے ایمان والے جو اپنی نماز میں گڑگڑاتے ہیں ، اور وہ جو کسی بیہودہ بات کی طرف التفات نہیں کرتے ۔ اور وہ کہ زکوۃ دینے کا کام کرتے ہیں ۔ اور وہ جو اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرتے ہیں ۔ مگر اپنی بیبیوں یا شرعی باندیوں پر جو ان کے ہاتھ کی ملک ہیں کہ ان پر کوئی علامت نہیں ، جو ان دو کے سوا کچھ اور چاہے وہی حد سے بڑھنے والے ہیں ۔ اور وہ جو اپنی امانتوں اور اپنے عہد کی رعایت کرتے ہیں ۔ اور وہ جو اپنی نمازوں کی نگہبانی کرتے ہیں ۔

یعنی ان تیس چیزوں کا حکم اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کو دیا تو آپ نے ان کو پورا کر کے کامیابی حاصل کی۔

کلمات سے مراد مناسک حج:

" واذا كلف ابراهيم عليه السلام ربه بمناسك الحج اى بمواضع العبادة المتعلقة بالحج واقامة ما يليق بكل موضع من العبادة كالطواف والسعى ورمى الجمار والاحرام والوقوف بعرفة و مزدلفة وغيره ذلك فاداهن تامات كاملات من غير نقصان " (شيخ زاده)

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آپ کے رب نے مناسک حج کی تکلیف دی یعنی وہ عبادت جو حج سے متعلق ہے اس کے مقامات کے متعلق حکم دیا کہ ہر فعل کو اسی کے مناسب مقام میں ادا کیا جائے، طواف اور سعی اور جمرات کو کنکریاں مارنے، اور احرام اور مقام عرفات پر ٹھہرنے، اور مزدلفہ میں رات گذارنے، وغیرہا کا حکم دیا آپ نے ان تمام عبادات کو رب تعالیٰ کے حکم کے مطابق کامل طور پر ادا کیا۔ ہر ایک کو اپنے اپنے محل میں ادا کیا، ان میں کوئی نقص نہیں آنے دیا۔

یعنی ابراہیم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے ان کاموں کے مکمل طور پر ادا کرنے کا حکم دے کر آزمایا آپ اس آزمائش میں پورے اترے۔

کلمات سے مراد دس سنن:

یہی وہ چیزیں ہیں جن کو کہا جاتا ہے یہ سنت ابراہیمی ہیں۔

ان دس چیزوں میں پانچ کا تعلق سر سے ہے۔ مونچھوں کا کٹانا، کلی کرنا، ناک میں پانی ڈالنا، مسواک کرنا، اور سر کے بالوں میں مانگ نکالنا۔

اور پانچ کا تعلق باقی جسم سے ہے۔ ناخن کاٹنا، زیر ناف بال مونڈنا، ختنہ کرانا، بغل کے بال اکھیڑنا، اور پیشاب پاخانہ کے مقام کو دھونا، یعنی استنجاء کرنا، ان کی تفصیل ان شاء اللہ قریب ہی ذکر کی جائے گی۔

تنبیہ: علامہ بیضاوی رحمہ اللہ نے ذکر فرمایا" وبالعشر التی هی من سننه "کہ کلمات سے مراد یہ بھی ہے کہ آپ کو دس چیزوں سے آزمایا جو آپ کی سنتیں ہیں۔ اسی کے مطابق راقم نے عنوان قائم کر دیا ہے۔ ورنہ یہی دس چیزیں خود حضرت ابراہیم علیہ السلام پر فرض تھیں، البتہ ہمارے لئے سنت ہیں۔ یعنی نبی کریم ﷺ نے بھی ان پر عمل کیا، اس لئے ہمارے لئے سنت مصطفیٰ ﷺ بھی ہیں، اور سنت ابراہیمی بھی ہیں۔

اس کو یوں ہی سمجھیں جیسا کہ نبی کریم ﷺ کے لئے تہجد کی نماز واجب تھی اور ہمارے لئے مستحب ہے، ہم اسے اپنے حق میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ تہجد کی نماز نبی کریم ﷺ کی سنت (غیر مؤکدہ) ہے۔

شاندار تحقیق:

اسی مسئلہ کی غزالیٔ دوراں حضرت علامہ سیّد احمد سعید کاظمی رحمہ اللہ نے شاندار تحقیق فرمائی ہے۔
اسی کو اپنی اس کاوش کا حصہ بنا رہا ہوں آیئے دیکھئے کیا خوب فرمایا۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث میں ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ''دس چیزیں فطرت سے ہیں''

اسی حدیث کے ہم معنی حدیث حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی مروی ہے وہ فرماتے ہیں کہ دس قسم کی طہارتوں سے اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کی آزمائش فرمائی۔

اکثر علماء کا قول یہ ہے کہ یہ سب کام ابراہیم علیہ السلام پر فرض تھے ہمارے لئے سنت ہیں۔ تفسیر خازن میں ہے۔ علماء نے فرمایا ''فطرۃ'' کے معنی سنت ہیں یعنی یہ سب کام انبیاء علیھم الصلوٰۃ والسلام کی سنتوں میں سے ہیں۔

بعض نے کہا ''فطرۃ'' سے مراد ملت ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ ''فطرۃ'' سے طریقہ مراد ہے۔
(خازن ص ۷۹ ج ۱)

علامہ نووی نے شرح مسلم میں اسی حدیث کے تحت فرمایا کہ ''فطرۃ'' دین کو کہتے ہیں۔
(مسلم ص ۱۲۸ ج ۱)

تنبیہ ضروری: ''فطرۃ'' کے بیان میں جو چار قول ہم نے نقل کئے ہیں وہ سب متقارب المعنی (قریب معنی والے) ہیں۔

ان میں تعارض سمجھنا صحیح نہیں۔ البتہ یہ بات ضرور سمجھنے کے لائق ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کو جن کاموں سے آزمایا گیا وہ سب ''فطرۃ'' سے ہیں۔ اور انبیاء کرام کو طبائع مقدسہ فطری امور سے مانوس رہتی ہیں۔ بالخصوص ایسے امور جن کا تعلق کمال طہارت و نظافت سے ہو اور حسن صورت و سیرت کا ان سے گہرا تعلق ہو۔

ایسی صورت میں یہ بات بعید از فہم ہو جاتی ہے کہ سب سے پہلے ابراہیم علیہ السلام نے یہ دس کام کیے یعنی ان سے پہلے کسی نبی یا رسول نے ان کاموں میں سے کوئی کام نہیں کیا، نہ لبیں ترشوائیں، نہ پانی سے استنجاء کیا، نہ ناف کے نیچے بال صاف کیے، نہ کلی کی، نہ ناک میں پانی ڈالا، نہ ناخن کٹوائے، ایک

ادنی مسلمان بھی جانتا ہے کہ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام ظاہری و باطنی پاکیزگی سے متصف ہوتے ہیں۔ ان کی طبیعتیں عام لوگوں کے طبائع سے بالکل مختلف ہوتی ہیں۔ ان میں اعلیٰ درجہ کی طہارت و نظافت پائی جاتی ہے۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ ان پاکیزہ خصلتوں سے محروم رہے ہوں؟

لہٰذا یوں کہنا چاہئے کہ ہر نبی ان خصائل حمیدہ سے متصف تھا، اور اس نے اپنی طبیعت مقدسہ کے تقاضے کے مطابق طہارت و نظافت کے یہ سب کام کئے مگر ان خصائل پر عمل کرنا ان میں سے کسی پر فرض نہ تھا، حکمت ابتلاء کے لئے ان امور خاصہ کی فرضیت سب سے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام پر ہوئی اور وہ ان فرائض پر اس خوبی کے ساتھ عمل پیرا رہے کہ آزمائش میں کامیاب ہو گئے ان سے پہلے کسی نبی کی آزمائش ان امور کے ساتھ نہ ہوئی تھی۔

یہ نہیں کہ ان سے کسی نبی کے عمل میں یہ پاکیزہ خصائل نہ پائے گئے ہوں۔ خصائل حمیدہ کے اعتبار سے ابراہیم علیہ السلام اور ان سے پہلے انبیاء کرام میں صرف اتنا فرق تھا کہ ابراہیم علیہ السلام ابتلاء کے بعد بطور فرض یہ کام کرتے تھے، اور ان سے پہلے انبیاء علیہم السلام محض اپنی طبیعت مقدسہ کے تقاضے سے ان پاکیزہ کاموں کو بجالاتے تھے۔ (التبیان مع البیان للکاظمی)

ابراہیم علیہ السلام سے تمام امتحان لئے گئے:

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے امتحان کے متعلق جتنے اقوال کلمات کے متعلق ذکر کئے گئے ہیں، وہ تمام امتحانات ہی آپ سے لئے گئے جن پر آپ پورے اترے۔

''کلمات'' کی تفسیر میں مختلف اقوال کو ذکر کرنے کے بعد علامہ قرطبی رحمہ اللہ بیان فرماتے ہیں

" وھذه الاقوال ليست بمتناقضة لان هذا كله مما ابتلى به ابراهيم عليه السلام "
(قرطبی)

ان تمام اقوال میں کوئی تعارض نہیں، کیونکہ ان تمام چیزوں سے ابراہیم علیہ السلام کو آزمایا گیا۔

ابراہیم علیہ السلام کے امتحانات قبل از نبوت ہوئے یا بعد از نبوت؟

" قيل كان قبل النبوة بدليل قوله فى سياق الآية انى جاعلك للناس اماما "

بعض حضرات نے کہا ہے کہ یہ امتحان نبوت سے پہلے تھے، اس لئے کہ بعد میں آ رہا ہے کہ ''بیشک میں بنانے والا ہوں تمہیں لوگوں کا امام'' جب امتحان سبب ہے آپ کو امامت کے عطاء کرنے کا تو سبب پہلے ہوگا۔ اور مسبب بعد میں ہوگا۔

'' وقیل بل کان ھذا الابتلاء بعد النبوة لان التکلیف لا یعلم الا من جھة الوحی الالٰھی وذلک بعد النبوة ''

اور بعض حضرات نے کہا ہے کہ آپ کے یہ امتحان نبوت کے بعد تھے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی آنے کے بعد ہی آپ کو ان امور کی تکلیف دی جا سکتی تھی، اور وحی کا آنا یقیناً نبوت کے بعد ہوتا ہے۔

شاندار محاکمہ:

'' والصواب ان فسر الابتلاء بالکوکب والقمر والشمس کان ذلک قبل النبوة وان فسر بما وجب علیه من شرائع الدین کان ذلک بعد النبوة ''

صحیح بات یہ ہے کہ ستارے اور چاند اور سورج کا امتحان نبوت سے پہلے تھا اور باقی امور شرعیہ جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ ان کا امتحان بعد از نبوت کے تھا۔ (خازن)

راقم کا موقف:

راقم کا موقف یہ ہے کہ جب امتحان صرف اس لئے تھا کہ لوگوں کو آپ کی شان کا پتہ چل جائے کہ آپ کو منازل رفیعہ حاصل ہیں تو واقعی آپ اس قابل ہیں کہ آپ اتنی عظیم آزمائشوں میں پورے اترے ہیں۔

امتحان لینے کا یہ مقصد ہی نہیں تھا کہ اللہ تعالیٰ کو پتہ نہیں تھا تو امتحان لے کر آپ کی شان کا پتہ چلایا کہ اس قابل ہیں اور یہ بات بھی واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ منصب نبوت کے لئے امتحان نہیں لیا کرتا، بلکہ وہ بغیر امتحان کے ہی جانتا ہے کہ یہ منصب نبوت کے قابل ہے رب تعالیٰ کا اپنا ارشاد گرامی ہی اس پر واضح دلیل ہے۔ '' اللہ اعلم حیث یجعل رسالته '' اللہ تعالیٰ سب سے زیادہ جانتا ہے کہ منصب نبوت کے قابل کون ہے۔

پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ﴿ وَاِذِابْتَلٰی ﴾ پر مرتب ﴿فَاَتَمَّهُنَّ ﴾ ہے۔ یعنی مقصد واضح ہے کہ جب ابراہیم علیہ السلام کو ان کے رب نے چند باتوں سے آزمایا، تو انہوں نے ان کو پورا کیا۔

امتحان کسی صورت میں بھی منصب نبوت عطاء کرنے کا سبب نہیں، اور بظاہر عربی کا کوئی لفظ بھی ایسا نہیں جو اس ترتب پر دلالت کرے۔

قَالَ اِنِّیْ جَاعِلُکَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ط قَالَ وَمِنْ ذُرِّیَّتِیْ ط قَالَ لَایَنَالُ عَهْدِی الظّٰلِمِیْنَ

کہا بے شک میں بنانے والا ہوں تمہیں لوگوں کا امام، کہا اور میری اولاد سے، کہا نہیں پہنچتا میرا وعدہ ظالموں کو۔

امام لغوی معنی کے لحاظ سے عام ہے:

" والامام هو الذی یؤتم به "امام وہ ہے جس کے اقتداء کی جائے۔ (خازن)

نیکی میں کسی کی اقتداء کی جائے یا برائی میں کسی کی اقتداء کی جائے وہ امام ہی ہے۔

رب تعالیٰ نے حضرت ابراہیم، حضرت اسحاق، حضرت یعقوب اور حضرت لوط علیہم السلام کا پہلے ذکر کیا، اس کے بعد فرمایا۔

" وجعلنا هم ائمة یهدون بامرنا و اوحینا الیهم فعل الخیرات واقام الصلوة وایتاء الزکوة وکانوا لنا عابدین "

اور ہم نے انہیں امام بنایا کہ ہمارے حکم سے ہدایت دیتے ہیں۔ اور ہم نے وحی کی ان کی طرف اچھے کام کرنے کی اور نماز قائم کرنے کی اور زکوۃ دینے کی، اور وہ ہماری بندگی کرتے ہیں۔

یعنی اس مقام پر "ائمة" کا اطلاق انبیاء کرام پر ہے، اور امامت سے مراد نبوت ہے۔

☆ اور دوسرے مقام پر، پہلے فرعون اور ہامان کا ذکر کیا، اس کے بعد ارشاد فرمایا ﴿ وَجَعَلْنَا هُمْ اَئِمَّةً یَّدْعُوْنَ اِلَی النَّارِ وَیَوْمَ الْقِیٰمَةِ لَایُنْصَرُوْنَ ﴾ اور ہم نے بنایا ہے ان کو امام جو آگ کی طرف بلاتے ہیں، اور قیامت کے دن ان کی امداد نہیں کی جائے گی۔ اس آیۃ میں

"ائمہ" کا ذکر کفار پر ہے، اور امامت سے مراد کفر کی طرف راہنمائی ہے۔

☆ خلفاء کو بھی امام کہا گیا ہے۔" لانهم رتبوا في المحل الذي يجب على الناس اتباعهم وقبول قولهم واحكامهم "

اس لئے کہ وہ بھی جو احکام نافذ کرتے ہیں جب وہ شریعت کے مطابق ہوں تو لوگوں پر لازم ہوتا ہے کہ ان کے اقوال کو اور احکام کو قبول کریں۔

☆ والقضاة والفقهاء ايضا ائمة لهذا المعنى " اسی معنی کے لحاظ پر قاضیوں اور فقہاء کرام کو بھی امام کہا گیا ہے کہ ان کے اقوال اور احکام پر لوگوں کو عمل کرنا ضروری ہوتا ہے۔

☆ اسی وجہ سے جو شخص نماز پڑھائے اسی بھی امام کہا جاتا ہے کیونکہ جو شخص اس کی نماز میں داخل ہو اس پر لازم ہو جاتا ہے۔ کہ وہ اس کی اقتداء کرے۔

نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے۔

"انما جعل الامام اماما ليؤتم به فاذا ركع فاركعوا واذا سجد فاسجدوا ولا تختلفوا على امامكم "

امام کو امام اس لئے بنایا جاتا ہے، کہ اس کی اقتداء کی جائے، جب وہ رکوع کرے تو تم بھی رکوع کرو، اور جب وہ سجدہ کرے تم بھی سجدہ کرو، اور اپنے امام کی مخالفت نہ کرو۔

ابھی تک جو بحث ذکر کی گئی ہے اس سے یہ واضح ہوا کہ امام عام ہے خواہ وہ سیدھی راہ کی ہدایت کرے اور لوگ اس کی اقتداء کریں، یا غلط راہ کی ہدایت کرے کہ لوگ اس کی اقتداء کریں، لیکن مطلقاً امام سے مراد سیدھی راہ کی ہدایت کرنے والا ہی ہے یہ اس طرح ہے جیسا کہ۔

"اسم الا له لايتناول الا المعبود الحق فاما المعبود الباطل فانما يطلق عليه اسم الا له مع القيد "

" الـــه " کا لفظ معبود حق پر مطلقاً بولا جاتا ہے، لیکن اگر اس کے ساتھ کوئی قید بڑھا دی جائے تو معبود باطل پر بولا جاتا ہے۔ جیسا کہ " فانظر الى الهك الذى ظلت عليه عاكفا " اور دیکھ اپنے اس معبود کی طرف جس کے سامنے تو دن بھی آسن مار رہا ہے۔ اس آیۃ میں سامری کو خطاب ہے، اسی کے بنائے ہوئے بچھڑے معبود کا ذکر ہے، لیکن مطلقاً " الــہ " ذکر نہیں، بلکہ مقید طور پر ذکر ہے۔ تو اپنے الٰہ کو دیکھ۔

زیر بحث آیت میں امام سے مراد کیا؟

جب ثابت ہوگیا کہ امام کا لفظ تو مطلقا راہنمائی کرنے والوں کو شامل ہے جن کی اقتداء کی جائے ،اور یہ بات بھی ثابت ہے کہ انبیاء کرام امامت کا اعلیٰ مرتبہ رکھتے ہیں۔

" وجب عمل اللفظ ھھنا علیه "تو واجب ہے کہ اس آیۃ میں "امام" سے مراد، نبی ہی ہے۔

اور وجہ یہ بھی واضح ہے کہ رب تعالیٰ نے اس آیۃ کریمہ میں امامت کا ذکر مقام احسان میں کیا ہے۔اور احسان میں نعمت عظمیٰ کا ذکر ہی ضروری ہے، وہ عظیم نعمت نبوت ہے۔ " فوجب حمل ھذہ الامامة علی النبوۃ " اس لئے ضروری ہے کہ اس آیۃ کریمہ میں امامۃ سے مراد نبوۃ ہی لی جائے۔
(ماخوذ از کبیر)

"والمراد بالامامة ھھنا النبوۃ او ما ھوا عم منه اعنی من یؤتم به ویجب اطاعته ولیس المراد به السلطنة والامامة بالمعنی الذی اخترعه الامامیة ولیس له فی اللغة والشرع اصل "

اس آیۃ کریمہ میں امامۃ سے مراد نبوۃ ہے، یا اس سے عام معنی مراد ہے۔مطلب یہ ہے کہ امام سے مراد اس مقام میں وہ امام ہے جس کی اقتداء کی جائے۔

امامۃ سے مراد نہ سلطنت ہے، اور نہ ہی وہ خاص امامۃ کا معنی مراد ہے جو امامیہ (یعنی شیعہ حضرات) نے گھڑ لیا ہے اس معنی کا لغت اور شرع میں کوئی وجود نہیں۔ (مظھری)

ابراہیم علیہ السلام کی امامت عامہ کا تقاضا نبوت:

رب تعالیٰ کا ارشاد ہے۔﴿ للناس اماما ﴾اس پر دلالت کرتا ہے کہ آپ کو تمام لوگوں کا امام بنایا گیا تھا۔جس ذات کا یہ مقام اس کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مستقل رسول ہو،

" لانه لو کان تبعا لرسول آخر لکان ماموما لذلک الرسول لا اماما له فحینئذ یبطل العموم "

اسلئے کہ اگر وہ کسی اور رسول کا تابع ہوتو یہ ماموم (مقتدی) ہوگا۔امام وہ دوسرا ہوگا۔اسکی امامت عامہ باطل ہوگی۔لہٰذا واضح ہوا کہ ابراہیم علیہ السلام کی امامت عامہ آپ کی نبوت کا تقاضا کرتی ہے۔
(کبیر)

نبی کا معصوم ہونا ضروری ہے:

رب تعالیٰ نے جب نبی کو امام کہا ہے اور یہ بھی واضح ہے کہ امام وہ ہوتا ہے جس کی اقتداء کی جائے تو اس سے واضح ہو گیا کہ نبی کا معصوم ہونا ضروری ہے۔ کیونکہ اگر نبی گنہگار ہو جائے۔ " **فیلزم ان یجب علینا فعل المعصیة** " تو ضروری ہوگا کہ ہم بھی معصیت میں اس کی اقتداء کریں کیونکہ نبی تو امام ہے۔ لیکن معصیت میں اقتداء کرنا حرام اور محال ہے تو پتہ چلا کہ نبی کا معصوم ہونا ضروری ہے۔ (کبیر)

قَالَ وَ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ : (کہا اور میری اولاد میں سے) رب تعالیٰ نے جب فرمایا کہ میں تمہیں امام بنانے والا ہوں، تو ابراہیم علیہ السلام نے عرض کیا ﴿ وَمِنْ ذُرِّيَّتِيْ ﴾ **یدل علی انه علیه السلام طلب ان یکون بعض ذریته ائمة للناس**"

اور میری اولاد میں سے۔ یہاں " من " تبعیض کے لئے ہے، گویا کہ آپ نے دعاء ہی یہ کی کہ اے اللہ میری اولاد میں سے بھی بعض کو منصب نبوت عطاء کرنا، آپ کی اس دعاء کو کامل طور پر قبول کر لیا گیا کہ آپ کی اولاد میں سے مؤمنین جو نبوت کے لائق تھے ان کو نبی بنا لیا گیا۔ ان میں سے جلیل القدر حضرات یہ ہیں۔

حضرت اسماعیل علیہ السلام، حضرت اسحاق، حضرت یعقوب، حضرت یوسف، حضرت موسیٰ، حضرت ہارون، حضرت داؤد، حضرت سلیمان، حضرت ایوب، حضرت یونس، حضرت زکریا، حضرت یحییٰ، حضرت عیسیٰ، اور حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہم وسلم۔

نبی کریم ﷺ آپ کی اولاد میں سے ہیں۔ جو افضل الانبیاء، افضل الائمہ ہیں۔ (کبیر)

یہ بھی خیال رہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بعد آنے والے سارے انبیاء کرام ہی آپ کی اولاد سے ہیں۔

قَالَ لَايَنَالُ عَهْدِى الظّٰلِمِيْنَ : کہا نہیں پہنچتا میرا عہد ظالموں کو۔

جب ابراہیم علیہ السلام نے رب کے حضور عرض کیا کہ میری اولاد میں سے بھی بعض کو نبی بنانا تو رب تعالیٰ نے بھی آپکی دعاء کو قبول کرلیا۔ اور ساتھ یہ بھی بتادیا کہ میرا یہ وعدہ ظالموں کو حاصل نہیں ہوگا۔

" لایکون جوابا عن ذلک السوال الا اذا کان المراد بھذا العھد تلک الامامة "

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب اولاد میں سے بعض کی نبوت کا سوال کیا تو آپ کو جواب جب یہ دیا گیا ﴿ لَايَنَالُ عَهْدِى الظّٰلِمِيْنَ ﴾ تو اس سے پتہ چل گیا کہ عہد سے مراد امامت یعنی نبوت ہے، تا کہ رب تعالیٰ کا جواب آپ کے سوال کے مطابق ہو۔ (کبیر)

نکتہ: ﴿ لَايَنَالُ عَهْدِى الظَّالِمِيْنَ ﴾ اس پر دلالت کر رہا ہے کہ رب تعالیٰ نے آپ کو یہ بتادیا کہ آپ کی بعض اولاد کو نبی بنادیا جائے گا، کیونکہ اگر یہ مطلب نہ ہوتا تو جواب صرف " لا " ہوتا یا جواب یہ ہوتا " لاینال عھدی ذریتک " کہ میرا وعدہ تمہاری اولاد کو نہیں پہنچے گا۔

لیکن یہ جواب نہیں دیا گیا، بلکہ کہا گیا کہ "میرا وعدہ ظالموں کو نہیں پہنچے گا" تو واضح کردیا کہ غیر ظالم جو منصب رسالت و نبوت کے اہل ہوں گے ان کو ضرور نبی بنادوں گا۔ (کبیر)

فائدہ جلیلہ :

یہاں مقام توجہ یہ ہے۔ " افما کان ابراھیم علیه السلام عالما بان النبوة لاتلیق بالظالمین قلنا بلی " کہ ابراہیم علیہ السلام کو کیا یہ معلوم تھا کہ نبوت ظالموں کو نہیں مل سکتی یا آپ کو علم نہیں تھا؟

تو اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو یہ علم حاصل تھا، کہ نبوت ظالموں کو نہیں مل سکتی اور یہ عقل کا تقاضا ہے کہ جب عام آدمی کو یہ پتہ ہے کہ نبی ظالم نہیں ہوسکتا تو نبی کو یہ علم نہ ہو، یہ کیسے ہوسکتا ہے۔

اب اس پر بظاہر یہ سوال ہوتا ہے کہ آپ نے رب تعالیٰ سے مطلق اولاد کا سوال ہی کیوں کیا ہے۔ یہ سوال کیوں نہیں کیا کہ اے اللہ میری اولاد سے مومنوں کو نبوت عطاء کر۔

تو اس کا جواب یہ ہے۔ " ولکن لم یعلم حال ذریته " کہ آپ نے سوال ہی بعض اولاد کے متعلق کیا، لیکن آپ نے اس طرف توجہ نہ کی کہ میری اولاد میں سے بعض ظالم بھی ہوں گے۔

تو رب تعالیٰ نے بیان فرما دیا کہ آپ توجہ فرمائیں، آپ کی اولاد میں سے بعض ظالم بھی ہوں گے، ظالموں کو میرا وعدہ نبوت نہیں پہنچے گا۔ (از کبیر)

خیال رہے کہ " لم یعلم " کا معنی ہے " لم یلتفت لیعلم " آپ نے توجہ نہیں فرمائی کہ جانتے۔

شیعہ اور امامت:

شیعہ حضرات کا قول یہ ہے کہ کوئی امام اس وقت تک امام نہیں ہو سکتا جب اس کی امامت پر نص نہ آئے اللہ تعالیٰ بیان فرمائے کہ یہ امام ہے تو وہی امام ہو سکتا ہے۔ اس آیۃ کریمہ سے بھی یہی سمجھ آیا۔

اور ﴿ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً ﴾ سے بھی یہی سمجھ آتا ہے کہ منصب خلافت بغیر نص کے حاصل نہیں ہو سکتا۔ ہم کہتے ہیں یہ غلط ہے، کیونکہ اس آیۃ میں امامۃ سے مراد ہی نبوۃ ہے۔ شیعہ حضرات کی امامۃ مراد ہی نہیں۔ اگر ہم تسلیم کر ہی لیں کہ اس آیۃ میں امامت سے مراد مطلق امامت ہے تو ہم کہیں گے کہ آیت تو طریق امامت ثابت کر رہی ہے۔ اس میں تو کوئی نزاع نہیں۔

" انما النزاع فی انه هل تثبت الامامة بغیر النص ولیس فی هذه الآیة تعرض لهذه المسئلة لا بالنفی ولا بالاثبات "

نزاع اس بات میں ہے کہ نص کے بغیر امامت ہمارے نزدیک ثابت ہو سکتی ہے۔ شیعہ کے نزدیک نہیں۔ اس آیۃ میں اس مسئلہ کی نفی یا اثبات کو بیان ہی نہیں کیا گیا۔ (کبیر)

شیعہ حضرات کی طرف سے اعتراض:

حضرت ابو بکر صدیق و حضرت عمر فاروق و حضرت عثمان رضی اللہ عنہم کی خلافتوں پر انکے اعتراض یہ ہیں کہ یہ لوگ کفر سے حالت ایمان کی طرف آئے ہیں۔ کافر ظالم ہوتا ہے، معصوم نہیں ہوتا۔ جب رب تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ میرا وعدہ ظالموں کو نہیں پہنچتا تو واضح ہوا کہ یہ لوگ امامت کے مستحق نہیں تھے۔

جواب: جب پہلے واضح طور پر بیان کیا جاچکا ہے کہ اس آیۃ میں " امامة " سے مراد "نبوة " ہے تو ان حضرات کی خلافت پر اس آیۃ کریمہ سے اعتراض کا مقصد ہی اپنی جہالت کا اظہار کرنا ہے۔

یہ صرف نبی کے لئے ضروری ہے کہ وہ نبوت سے پہلے بھی گناہوں سے پاک ہو، خلیفہ کے لئے یہ حکم ثابت کرنا درست نہیں۔

دوسرا جواب: " **ان التائب عن الکفر لایسمی کافرا** " جو شخص کفر سے توبہ کرلے اسے پھر بھی کافر کہنا اور ظالم کہنا ہی ظلم ہے۔ مؤمن کو کافر کہنے والا اپنی جان پر ظلم کررہا ہے اور اپنی عاقبت برباد کررہا ہے۔

اسی طرح " **والتائب عن المعصیة لایکون عاصیا** " گناہوں سے توبہ کرنے والا عاصی (گنہگار) نہیں رہتا۔ رب تعالیٰ نے جو ارشاد فرمایا ﴿ **وَلَا تَرْكَنُوْا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ** ﴾ ظالموں کی طرف میلان نہ کرو تمہیں آگ مس کرے گی۔ اس آیۃ میں جو ظالموں کی طرف میلان کرنے سے منع کیا گیا، اور اگر اس میلان سے انسان باز نہ آئے تو وہ جہنم کے عذاب کا مستحق ہوگا، اس بیان کا مطلب بھی یہ ہے۔ " **فانه نهی عن الرکون الیهم حال اقامتهم علی الظلم** " کہ مومنوں کو ظالموں کی طرف میلان کرنے سے روکا گیا ہے، کہ جب تک وہ ظلم پر قائم ہیں اس وقت تک ان کی طرف میلان نہ کرو۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان کی توبہ کے بعد بھی تم ان کی طرف میلان نہیں کرسکتے، اور توبہ کے بعد وہ ظالم ہی رہیں گے۔

اور رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿ **مَا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ مِنْ سَبِيْلٍ** ﴾ (احسان کرنے والوں پر کوئی گرفت نہیں) اس کا مطلب بھی یہ ہے، " **ما اقاموا علی الاحسان** " جب تک وہ احسان پر قائم ہیں۔ اس کا بھی یہ مطلب نہیں کہ کوئی شخص بدقسمتی سے احسان کو چھوڑ دے، معصیت کا مرتکب ہو جائے تو پھر اس کی گرفت نہیں۔

غرضیکہ نیک لوگوں کیلئے جس اجر و ثواب کا ذکر ہے اس کا تعلق ان کا اس نیکی پر قائم رہنے سے

ہے، اگر وہ نیکی کو چھوڑ کر معصیت کے مرتکب ہو جائیں تو اس کے بعد ان کا وہ مرتبہ موجود نہیں رہے گا۔

اسی طرح ظالموں کے لئے بھی اللہ تعالیٰ نے انعام سے محرومیت کا جو وعدہ کر رکھا ہے اس کا تعلق بھی ان کے ظلم کے دور سے ہے۔ جو شخص توبہ کر لے جب اس کو ظالم کہنا ہی گناہ ہے وہ ظالم رہتا ہی نہیں تو اس کو رب تعالیٰ کے انعام سے محروم قرار دینا جہالت نہیں تو اور کیا ہے۔ حماقت نہیں تو اور کیا ہے۔

(ماخوذ از کبیر)

مسئلہ: فاسق حالت فسق میں خلیفہ (مسلمانوں کا حاکم) بننے کی صلاحیت نہیں رکھتا، البتہ بعد میں فاسق ہو جائے تو دیکھا جائے اگر اس کا فسق اس کی ذات تک محدود ہے دوسرے لوگوں کو شریعت سے دور نہیں کیا جا رہا تو وہ خود بخود معزول تو نہیں ہوا البتہ اسے خلافت کو چھوڑ دینے کے متعلق کہا جائے، اور اگر اس کا فسق دوسروں کو بھی غرق کر رہا ہے۔ ان کو بھی فاسق بنا رہا ہے۔ وہ شرعاً خود بخود معزول ہو جاتا ہے۔ اگر خود بخود اپنے عہدہ سے نہ ہٹے تو مسلمان اسے خود بخود ہٹا دیں۔

اس مسئلہ کی زیادہ تفصیل پہلے ﴿اِنِّی جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً﴾ کی وضاحت کے ضمن میں گذر چکی ہے۔

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا مسلک:

بعض لوگوں نے یہ کہا تھا کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا مسلک یہ ہے۔

" انه یجوز کون الفاسق اماما و خلیفة ولا یجوز کون الفاسق قاضیا "

کہ فاسق کا امام اور خلیفہ ہونا جائز ہے۔ اور فاسق کا قاضی بننا جائز نہیں۔

" وهذا خطأ ولم یفرق ابوحنیفة بین الخلیفة والحاکم فی ان شرط کل واحد منهما العدالة وکیف یکون خلیفة وروایته غیر مقبولة واحکامه غیر نافذة "

ابوبکر رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ امام صاحب کی طرف یہ منسوب کرنا اور یہ کہنا کہ ان کا یہ مسلک ہے۔ "یہ غلط ہے" امام صاحب رحمہ اللہ نے خلیفہ و حاکم اور قاضی کے درمیان کوئی فرق نہیں کیا، بلکہ آپ کے نزدیک ہر ایک کا عادل ہونا مشروط ہے۔ جو شخص عادل نہیں وہ خلیفہ نہیں بن سکتا، اس کی

روایت مقبول نہیں اوراس کے احکام نافذ نہیں۔

اس مسئلہ پر ائمہ اور علماء کا اتفاق ہے:

" فثبت بدلالة الآية بطلان امامة الفاسق قال عليه السلام " " لاطاعة لمخلوق فی معصية الخالق " ودل ايضا على ان الفاسق لايكون حاكما ، وان احكامه لاتنفذ اذا ولى الحكم ، وكذلك لاتقبل شهادته ولاخبره اذا اخبره اذا اخبر عن النبی ﷺ ، ولا فتياه اذا أفتى ، ولايقدم للصلوة ، وان كان هوبحيث لواقتدى به فانه لاتفسد صلوته "

اس آیۃ کریمہ سے یہ ثابت ہوا کہ فاسق کی امامت (نبوت) باطل ہے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا۔

'' خالق کی نافرمانی کر کے مخلوق کی طاعت وفرمانبرداری نہ کی جائے۔''

اسی آیۃ سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ فاسق حاکم نہیں بن سکتا، اور نہ ہی اس کا کوئی حکم جاری ہو سکتا ہے۔ مطلب واضح ہے کہ اگر کوئی فاسق زبردستی حاکم بن جائے تو اس کے احکام کو تسلیم نہ کیا جائے۔

اسی طرح فاسق کی گواہی قبول نہ کی جائے۔ اور اگر فاسق نبی کریم ﷺ کی طرف سے کوئی خبر دے تو اسے قبول نہ کیا جائے۔ اور فاسق اگر کوئی فتوی دے تو اس کے فتوی کو قبول نہ کیا جائے، اور فاسق کو نماز کیلئے امام بنا کر آگے نہ کیا جائے، ہاں اگر فاسق کی اقتداء میں نماز ادا کر لی تو فریضہ ادا ہو جائیگا، اگر چہ وہ نماز ناقص ہوگی اسے لوٹانا واجب ہے۔ یعنی مکروہ تحریمی ہے کہ فاسق کے پیچھے نماز پڑھی جائے۔

(ماخوذ از کبیر)

آیۃ کریمہ سے عصمت انبیاء ثابت ہے:

اگر آیۃ کریمہ میں امامۃ سے مراد عام امامت لیں تو پھر بھی واضح ہے کہ ہر نبی امام ہوتا ہے۔ امام کے لئے دوسروں سے اولیٰ (بہتر) ہونا ضروری ہے۔ اگر نبی گنہگار ہو تو دوسروں سے گھٹیا ہوگا تو وہ نبی بننے کے قابل نہیں ہوگا۔

اور آیۃ کریمہ میں امامۃ سے مراد نبوت ہو جیسا کہ مفسرین کرام کا اتفاق ہے تو اس سے بھی واضح ہے کہ نبوت ظالم اور فاسق کو نہیں مل سکتی، لہٰذا نبی کا معصوم ہونا ضروری ہے۔ (از کبیر)

فائدہ عظیمہ:

''عہد'' کے لفظ سے ایک عظیم فائدہ یہ حاصل ہوا کہ رب تعالیٰ کا اپنے بندوں سے وعدہ ہے اور بندوں کا رب تعالیٰ سے وعدہ ہے، اسی لئے رب تعالیٰ نے فرمایا﴿ وَاَوْفُوْا بِعَهْدِیْٓ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ﴾ اور پورا کرو میرا وعدہ میں پورا کروں گا تمہارا وعدہ۔

بندوں کا رب تعالیٰ سے وعدہ'' لیس الا عھدا لخدمة و العبودیة '' صرف اسی کی ذات کی عبادت کرنا، اور اسی کی خدمت کو بجالانا ہے۔

اور رب تعالیٰ کا اپنے بندوں سے وعدہ'' لیس الا عھدا الرحمة و الربوبیة '' اپنی کریمی کے پیش نظر بغیر لازم ہونے کے یہ ہے کہ اے میرے بندوں میں تم پر رحم کروں گا اور تم میری ربوبیت سے فائدہ حاصل کرو گے۔

اب کوئی عقلمند شخص جب معمولی تفکر کرے تو اس پر یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہو جائے گی کہ بندوں نے اپنا وعدہ توڑ دیا(الا ما شاء اللہ) اور رب تعالیٰ نے اپنا وعدہ پورا فرمادیا۔

اس کو یوں سمجھیں'' کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کر کے، اسے زندگی عطاء کر کے، اور اسے عقل عطاء کر کے، اور اعضاء عطاء کر کے عظیم انعامات سے نوازا۔

اور تمام انعامات کا اصل مقصد یہ ہے کہ اے انسان تو اللہ تعالیٰ کی اطاعت، خدمت اور عبادت میں مشغول ہو جا۔

رب تعالیٰ نے فرمایا﴿ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنَ ﴾ میں نے جنوں اور انسانوں کو نہیں پیدا فرمایا، سوائے اس کے کہ وہ میری عبادت کریں۔

اور رب تعالیٰ کا مخلوق کو پیدا کرنا بے مقصد نہیں۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا﴿ وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا بَاطِلًا ﴾ اور ہم نے آسمانوں اور زمین اور ان کے درمیان چیزوں کو بے مقصد پیدا نہیں کیا۔

پھر مقصد واضح کر دیا کہ انسانوں اور جنوں کو پیدا کرنے کا مقصد ہی یہ ہے کہ وہ رب تعالیٰ کی عبادت کریں۔

" فهو سبحانه وفى بعهد الربوبية حيث خلقك واحياك وانعم عليك بوجوه النعم وجعلك عاقلا مميزا "

اے انسان رب تعالیٰ نے تجھے پیدا کر کے اور تجھے زندگی عطاء کر کے اور تجھے بے شار نعمتیں عطاء کر کے، اور تجھے عقل وتمیز عطاء کر کے اپنی ربوبیت کا وعدہ پورا فرما دیا۔

" فاذا لم تشتغل بخدمته وطاعته و عبوديته فقد نقضت عهد عبوديتك "

جب اے انسان تو رب تعالیٰ کی خدمت بجا نہیں لائے گا، اس کی اطاعت نہیں کرے گا، اور اس کی عبادت نہیں کرے گا، تو تو نے اپنے مالک سے کیے ہوئے وعدہ عبودیت کو توڑ دیا ہے۔

ایک اور وجہ دیکھیں:

رب تعالیٰ کا اپنے بندوں سے وعدہ ہے کہ وہ توفیق اور ہدایت عطاء فرمائے گا۔ اور بندوں کا رب تعالیٰ سے یہ وعدہ ہے کہ وہ اس کی عبادت میں کوشش کریں گے۔ اور عمل میں اجتہاد کریں گے۔

رب تعالیٰ نے تو اپنا وعدہ پورا کر دیا کہ ہر ذرہ ذرہ کو اے انسان تیرے لئے ہادی بنا دیا۔ جو تجھے راہ حق کی ہدایت کر رہے ہیں۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ ﴿ وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ ﴾ کوئی چیز ایسی نہیں جو اللہ تعالیٰ کی تسبیح وتحمید بیان نہ کرتی ہو۔" وانت ما وفيت البتة بعهد الطاعة والعبودية " لیکن اے انسان تو نے رب قدوس کے ساتھ طاعت وعبودیت کے وعدہ کو پورا نہیں کیا۔

ذرا اور توجہ: اے انسان اللہ تعالیٰ نے تجھے عظیم نعمت عطاء کی یعنی دولت ایمان سے مالا مال کیا

" لو فاتتك هذه النعمة لكنت اشقى الاشقياء ابد الآبدين ودهر الداهرين "

اگر تم سے یہ نعمت ایمان (العیاذ باللہ) فوت ہو جائے تو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے سب بدبختوں سے

زیادہ بد بخت ہو جائے گا۔

پھر یہ نعمت اللہ تعالیٰ کی طرف سے حاصل ہے، کیونکہ رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿ وما بکم من نعمۃ فمن اللہ ﴾ جو بھی نعمت تمہیں حاصل ہے وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔

پھر اللہ تعالیٰ نے اپنی نعمتوں پر شکر کرنے کا حکم دیا، اگر کسی کو شکر کرنے کی توفیق حاصل ہوگئی اور اس نے عبادت کی اور ذات باری تعالیٰ کی اطاعت کی تو اس نے اپنا وعدہ پورا کر دیا۔ اس قسم کے لوگ بہت کم ہی ہوتے ہیں۔

لیکن اگر کفرانِ نعمت کیا، یعنی رب تعالیٰ کی عبادت نہ کی، اس کی اطاعت سے منہ موڑ لیا، تو اس نے رب تعالیٰ سے کیے ہوئے اپنے وعدہ کو توڑ دیا، اور اپنی عاقبت کو برباد کرلیا۔ ﴿ قُتِلَ الْاِنْسَانُ مَا اَکْفَرَہٗ ﴾ انسان کفرانِ نعمت کی وجہ سے برباد ہو گیا۔

اسی مسئلہ پر اور دلیل: اے انسان تیرے ساتھ رب کا وعدہ یہ ہے کہ میں تمہیں نعمتیں عطاء کروں گا۔ اس نے تمہیں ان گنت نعمتیں عطاء کیں اور پھر تمہیں نعمتیں عطاء کیے جا رہا ہے۔ اس نے تم سے نعمتیں چھینیں نہیں، اور نہ ہی اس نے تم سے نعمتوں کو عطاء کرنا بند کیا۔

لیکن تم سے رب نے وعدہ یہ لیا کہ تم اس کی نعمتوں کو اسی کی راہ میں لگانا، پاؤں جب عظیم نعمت ہیں تو اسی کام کے لئے انسان چلے جس میں رب تعالیٰ کی رضاء ہو، ہاتھ جب عظیم نعمت ہیں تو انسان ان ہاتھوں سے وہی کام کرے جس سے رب راضی ہو، غرضیکہ ہر نعمت کو رب تعالیٰ کی رضاء مندی حاصل کرنے کے لئے اسی کی راہ میں لگائے۔

لیکن اے انسان اگر تو نے ایسا نہ کیا تو یقینی بات ہے کہ تو نے رب تعالیٰ سے کیے ہوئے وعدہ کو توڑ دیا ہے۔ انسان کے اسی نقض عہد کو رب تعالیٰ نے یوں بیان فرمایا۔ ﴿ کَلَّا اِنَّ الْاِنْسَانَ لَیَطْغٰی ☆ اَنْ رَّاٰہُ اسْتَغْنٰی ☆ ﴾ ہاں ہاں بیشک آدمی سرکشی کرتا ہے، اس پر کہ اپنے آپ کو غنی سمجھ لیا

اسی مسئلہ کو اسطرح سمجھیں: اللہ تعالیٰ نے انسان سے وعدہ کیا کہ میں تمہیں نعمتیں عطاء

کروں گا، اس نے ہمہ وقت بے شمار نعمتیں عطاء کر کے اپنا وعدہ پورا فرما دیا۔ لیکن انسان سے یہ وعدہ پورا فرما دیا۔ لیکن انسان سے یہ وعدہ لیا کہ میری نعمتوں سے فقراء کی امداد کرنا، اوران پر احسان کرنا، رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿وَاَحْسِنُوْا اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ﴾ اوراحسان کرو بے شک اللہ تعالیٰ پسند کرتا ہے، احسان کرنے والوں کو۔

" ثم انک توسلت به الی ایذاء الناس وایحاشھم " لیکن اے انسان تو نے ان نعمتوں کے ذریعے ہی لوگوں کو ستانا شروع کر دیا اوران کو خوف زدہ کرنا شروع کر دیا۔ کاش کہ تو رب تعالیٰ کی نعمتوں کو فقراء پر خرچ کر کے معاشرہ میں ان کو ایک مقام عطاء کرتا اور تیری بھی نیک نامی ہوتی، اوراجر عظیم حاصل کرتا۔

لیکن اس وعدہ کو بھی اکثر انسانوں نے توڑ دیا، ان کے اس وعدہ کو توڑنے کی مذمت میں رب تعالیٰ نے فرمایا۔ ﴿ اَلَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ وَيَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ ﴾ وہ لوگ بخل (کنجوسی) کرتے ہیں، اورلوگوں کو (بھی) بخل کا حکم دیتے ہیں۔

اسی مسئلہ پر توجہ فرمائیں:

" اعطاک النعم العظیمة لتکون مقبلا علی حمده وانت تحمد غیره "

اے انسان اللہ تعالیٰ کا تیرے ساتھ نعمتیں عطاء کرنے کا وعدہ تھا، اس نے تو اتنی نعمتیں تمہیں عطاء کر رکھی ہیں جو تمہارے شمار سے بھی باہر ہیں، لیکن اس نے تم سے وعدہ لیا تھا کہ میری حمد کرنا، تم اس وعدہ کو پورا نہیں کر رہے ہو، بلکہ اورلوگوں کی تعریفیں کر رہے ہو۔

خیال رہے انبیاء کرام، اولیاء عظام، علماء کرام کی تعریف کرنے میں رب تعالیٰ کی رضاء مندی پائی جاتی ہے۔ ان کی تعریف اسی لئے کی جاتی ہے کہ یہ رب تعالیٰ کے مقبول بندے ہیں۔ ان کی تعریف بالواسطہ اللہ تعالیٰ کی ہی تعریف ہے۔

غیروں کی تعریف اس وقت منع ہے جب دنیاوی منافع حاصل کرنے کے لئے بے دین لوگوں

کی تعریف کی جائے، پھر گویا کہ انسان رب تعالیٰ سے کئے ہوئے وعدہ کو توڑ دیا۔

اے اللہ تو کریم ہے ہم عاجز بندے:

اللہ تعالیٰ کی نعمتوں، احسانات اور اس کی ربوبیت کو بیان کرنا ہی ہماری طاقت میں نہیں۔ پھر ہم اگر یہ جاننا چاہیں کہ ہم رب تعالیٰ کی کتنی نعمتوں کا شکریہ ادا نہیں کر رہے۔ اور اس کی نعمتوں میں کسی طرح خلوص سے عبادت نہیں کر رہے تو یہ بھی ہماری وسعت سے خارج ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ ہماری ابتداء سے انتہاء تک رب تعالیٰ کی نعمتیں کثیر سے کثیر عظیم سے عظیم ہمیں حاصل ہو رہی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی تمام نعمتیں ہمارے علم میں بھی نہیں آ سکتیں۔ حق یہ تھا کہ ہر نعمت کا علیحدہ شکریہ ادا کیا جائے، اور ہر نعمت پر اس کی خدمت بجا لائی جائے اور عبادت کی جائے، لیکن ہم یہ نہ تو کر رہے اور نہ ہی کر سکتے ہیں، کیونکہ ہمیں رب تعالیٰ کی تمام نعمتوں کا علم نہیں، اور نہ ہی ہمیں ان نعمتوں کی کیفیات کا علم ہے۔

پھر ہماری طرف سے غفلت اور کوتاہی بڑھتی رہتی ہے، لیکن اللہ تعالیٰ ہماری تقصیرات کو نہیں دیکھتا بلکہ زیادہ سے زیادہ نعمتوں سے ہمیں نوازتا رہتا ہے۔

جب ہماری طرف سے کوتاہیوں کے باوجود رب تعالیٰ کا احسان اور لطف و کرم زیادہ سے زیادہ ہوتا رہتا ہے۔ تو ہم اس رحیم و کریم پروردگار کے حضور یہ عرض کرتے ہیں۔

" الهنا صدر منک مایلیق بک من الکرم والعفو والرحمة والاحسان وصدر منا مایلیق بنا من الجهل والعذر والتقصیر والکسل فنسالک بک وبفضلک العمیم ان تتجاوز عنا یا ارحم الراحمین "۔

اے اللہ جو تیری شان کے لائق ہے عفو و کرم اور رحمت و احسان تو وہی ہمارے ساتھ کر رہا ہے۔ اور ہم حقیر لوگوں کے جو لائق ہے ہم سے وہی جہالت و غدر اور کوتاہی اور سستی سرزد ہو رہی ہیں۔ یہ عرض کرتے ہیں کہ اے ارحم الراحمین ہماری غلطیوں کو معاف فرما، ہمارے گناہوں سے درگذر فرما

مطلب تقریباً یہی ہے کہ اے اللہ تو کریم ہے اور ہم تیرے عاجز بندے ہیں۔

(ماخوذ از کبیر)

سنن ابراہیمی پر قدرے تفصیل:

اجمالی طور پر پہلے یہ ذکر کیا جاچکا ہے، کہ دس چیزیں فطرت کے مطابق حضرت ابراہیم علیہ السلام پر فرض تھیں، اور وہی ہم پر سنت مصطفوی بھی ہیں اور سنت ابراہیمی بھی۔

اب ان کے متعلق کچھ تفصیل احادیث وغیرہ سے ذکر کی جارہی ہے، تاکہ قارئین کے لئے زیادہ نفع مند ہو سکے۔

۱) ختنہ کرنا: مسلم شریف میں اور مسند احمد میں یحیٰ کی روایت میں ہے۔ " انه اختتن حين بلغ ثمانين سنة واختتن بالقدوم " بے شک ابراہیم علیہ السلام نے اسی سال کی عمر میں ختنہ کیا اور آپ نے تیسہ سے ختنہ کیا۔

یعنی جب آپ پر ختنہ کے فرض ہونے کا حکم نافذ ہوا اس وقت آپ کی عمر اسی سال تھی، آپ نے لکڑی کاٹنے چھیلنے کا آلہ تیسہ لیا، اور اپنا ختنہ خود ہی کر دیا۔ سبحان اللہ یہ انبیاء کرام کے کام ہی ہیں جو مشکل مشکل امتحانات میں پورے اترے ورنہ عام انسان ایسے امتحان میں کامیاب نہیں ہوسکتا۔

خیال رہے "قدوم" قاف پر فتحہ، دال مشدد بھی استعمال ہے اور مخفف بھی، معنیٰ اس کا تیسہ۔

" قال عكرمة اختتن ابراهيم وهو ابن ثمانين سنة " قال : ولم يطف بالبيت بعد على ملة ابراهيم الا مختون "

حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا ابراہیم علیہ السلام نے اسی سال کی عمر میں اپنا ختنہ کیا، اور حضرت عکرمہ نے کہا کہ اس کے بعد ملت ابراہیمی پر قائم کسی شخص نے بغیر ختنہ کے طواف نہیں کیا۔

مسئلہ: جمہور احناف اور مالکیہ کا مذہب یہ ہے۔

" ان ذلک من مؤكدات السنن ومن فطرة الاسلام التى لايسع تركها فى الرجال "

کہ ختنہ کرنے کا فعل سنت مؤکدہ ہے اور فطرۃ اسلامیہ سے ہے۔ مردوں کا چھوڑنا سنت مؤکدہ

کی ترک لازم آئے گی۔

"عن ابی ھریرة ان رسول اللہ ﷺ قال الفطرة خمس الاختتان الخ"

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے نبی کریم ﷺ کا ارشاد بیان فرمایا کہ فطرت اسلامیہ پانچ چیزیں ہیں، ان میں آپ نے ختنہ کا بھی ذکر کیا۔

اس حدیث سے بھی ختنہ کا سنت ہونا واضح ہے۔ خیال رہے کہ ایک ضابطہ یہ ہے ذکر قلیل ذکر کثیر سے مانع نہیں لہٰذا کسی محل اور موقع کی مناسبت سے پانچ کا ذکر کرنا دوسری جگہ دس کے ذکر کے منافی نہیں۔

مسئلہ: اگر کوئی بچہ ختنہ شدہ پیدا ہوا تو وہ ختنہ کی مشقت سے بچ گیا ہے۔ اب اس کا ختنہ نہ ہو سکے گا اور نہ ہی ختنہ کرنے کی کوئی ضرورت ہوگی۔ کیونکہ اس کا ختنہ پہلے قدرتی طور پر ہو چکا ہے۔

حضرت میمونی کہتے ہیں، مجھے امام احمد رحمہ اللہ نے بتایا کہ ہمارے علاقہ میں ایک شخص تھا جس کا بچہ پیدا ہوا جس کا ختنہ قدرتی طور پر ہو چکا تھا۔ وہ شخص بہت غمناک تھا کہ میں بچے کا ختنہ کیسے کروں گا۔

تو آپ نے اس شخص کو فرمایا "اذا کان اللہ قد کفاک المؤمنة فماغمک بھذا" جب رب تعالیٰ تمہیں اس بچے کے ختنہ کی مشقت سے آزاد کر دیا ہے تو تمہیں اس کا کیا غم ہے۔

فائدہ جلیلہ:

"عن محمد بن حبیب الھاشمی خلق من الانبیاء اربعة عشر مختونین آدم وشیث و نوح و ھود و صالح و لوط وشعیب و یوسف و موسیٰ و سلیمٰن و زکریا و عیسٰی و حنظلة بن صفوان (نبی اصحاب الرس) و محمد ﷺ"

محمد بن حبیب ہاشمی کہتے ہیں کہ چودہ انبیاء کرام ختنہ شدہ پیدا ہوئے، حضرت آدم، حضرت شیث حضرت نوح، حضرت ہود، حضرت صالح، حضرت لوط، حضرت شعیب، حضرت یوسف، حضرت موسیٰ، حضرت سلیمان، حضرت زکریا، حضرت عیسیٰ، حضرت حنظلہ بن صفوان (اصحاب الرس کے نبی) اور حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہم وسلم۔

لیکن یہ بھی خیال رہے کہ ملاعلی قاری رحمہ اللہ نے تمام انبیاء کرام کے ختنہ شدہ ہونے کے قول کو ترجیح دی ہے۔ جیسا کہ راقم نے اپنی کتاب تذکرۃ الانبیاء میں ذکر کیا ہے۔

اعتراض: حدیث سے ثابت ہے کہ نبی کریم ﷺ کا ختنہ ہوا ہے۔ لہٰذا یہ کہنا کہ آپ ختنہ شدہ پیدا ہوئے کیسے صحیح ہے؟

" عن ابن عباس ان عبدالمطلب ختن النبی ﷺ یوم سابعه وجعل له مأدبة وسماه محمدا "

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ بے شک عبدالمطلب نے نبی کریم ﷺ کا ختنہ ساتویں دن کرایا، اور اسی دن احباب کی دعوت کی اور اسی دن آپ کا نام رکھا۔

جواب: یہ حدیث محمد بن ابی سری نے روایت کی ہے۔ اس حدیث کے متعلق یحیٰی بن ایوب فرماتے ہیں۔

" طلبت هذا الحديث فلم اجده عند احد من اهل الحديث ممن لقيته الا عند ابن ابی السری "

میں نے اس حدیث کو بہت تلاش کیا، لیکن حدیث بیان کرنے والے حضرات میں سے میں نے جس سے بھی ملاقات کی مجھی کسی کے پاس بھی یہ حدیث نہیں ملی سوائے ابن ابی السری کے۔

اس سے واضح ہوا کہ یہ حدیث دوسری معتبر احادیث کے مقابل قابل حجت نہیں، کیونکہ اس حدیث کے متعلق ابوعمرو نے فرمایا۔ **" هذا حديث مسند غريب "** یہ حدیث مسند غریب ہے۔ اس سے بھی اس کے قابل حجت نہ ہونے کا ذکر کیا گیا۔

یہ ذکر کرنے کے بعد ابوعمرو نے کہا۔ **" وقد قيل ان النبی ﷺ ولد مختونا "** تحقیق بیان یہی کیا گیا کہ نبی کریم ﷺ ختنہ شدہ پیدا ہوئے ہیں۔

فذكر ابونعيم الحافظ فی " كتاب الحلية " باسناده ان النبی ﷺ ولد مختونا

ابونعیم رحمہ اللہ نے " کتاب الحلیۃ " میں ذکر فرمایا ہے اسناد صحیحہ سے کہ نبی کریم ﷺ ختنہ شدہ پیدا ہوئے۔

مسئلہ : ختنہ بالغ ہونے سے پہلے کر دیا جائے۔ بچہ سات دن کا ہوتو ختنہ کرنا بہتر ہے۔

اس مسئلہ پر مختلف روایات ہیں، ان تمام سے نتیجہ واضح ہے جو میں نے عرض کر دیا ہے۔

علماء کے اقوال سے یہ بھی ملتا ہے۔ " ختن ابراهیم اسماعیل لثلاث عشر سنة " کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت اسماعیل علیہ السلام کا ختنہ جب کیا تو ان کی عمر تیرہ سال تھی۔

" وختن ابنه اسحاق لسبعة ایام " اور آپ نے اپنے بیٹے حضرت اسحاق علیہ السلام کا جب ختنہ کیا تو وہ سات دن کے تھے۔

☆ " وروی عن فاطمة انها کانت تختن ولدها یوم السابع " اور روایات میں آتا ہے حضرت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا نے اپنے بچوں کا ختنہ ساتویں دن کرایا۔

" وقال اللیث بن سعد " یختن الصبی ما بین سبع سنین الی عشر " لیث بن سعد رحمہ اللہ فرماتے تھے کہ بچوں کا ختنہ سات اور دس سال کے درمیان کرا دیا جائے۔

" وقال احمد " لم اسمع فی ذلک شیأ " حضرت امام احمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ختنہ کے متعلق معین مدت کے متعلق کوئی روایت سننے میں نہیں آئی۔

بخاری میں سعید بن جبیر کی روایت میں ہے۔

" سئل ابن عباس مثل من انت حین قبض رسول اللہ ﷺ قال انا یومئذ مختون "

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے سوال کیا گیا کہ جب نبی کریم ﷺ کا وصال ہوا تو آپ کتنے تھے۔ آپ نے فرمایا میں اس وقت مختون تھا، آپ نے مختون کا معنی قریب البلوغ لیا ہے۔

واضح ہوا کہ بالغ ہونے سے پہلے ضرور ختنہ کرا دیا جائے، سات دنوں پر کرائیں یا بعد میں کرائیں جائز ہے۔

بالغ ہونے کے بعد اسلام قبول کرنے کیلئے :

اگر چہ مالکی مذہب میں تو اس کے لئے مستحب ہے کہ وہ ختنہ کسی سے کرائے بعض حضرات نے زیادہ ہی تاکید کی ہے۔

لیکن احناف کے نزدیک بلاوجہ کسی کے تنگیز کو دیکھنا حرام ہے، اس لئے سنت پر عمل کرنے کے لئے حرام کا ارتکاب تو جائز نہیں۔ البتہ وہ شخص کسی ایسی عورت سے نکاح کرے جو ختنہ کرنا جانتی ہو، تو وہ نکاح کے بعد اس کا ختنہ کر دے، کیونکہ زوجہ اپنے خاوند کے تنگیز کو دیکھ سکتی ہے، اس طرح نہ حرام کا ارتکاب ہوگا۔ اور نہ سنت کی ترک لازم آئے گی۔

۴) زیرِ ناف بال مونڈنا:

حضرت ابراہیم علیہ السلام پر زیر ناف بال مونڈنا بھی فرض تھا، ہم پر سنت ہے۔ خیال رہے کہ زیر ناف بال دور کرنے کے لئے زیادہ طور پر احادیث میں "استحد" کے الفاظ استعمال ہیں، یعنی نبی کریم ﷺ نے لوہے کے آلہ (استرہ وغیرہ) کو استعمال کیا۔

اور ایک حدیث حضرت انس ﷺ سے مروی ہے، وہ فرماتے ہیں۔

"ان النبی ﷺ کان لایتنور ، وکان اذا اکثر الشعر علی عانته حلقه"

کہ بے شک نبی کریم ﷺ نے زیر ناف بالوں کو دور کرنے کے لئے چونہ (پاؤڈر وغیرہ) استعمال نہیں کیا، بلکہ جب بال دور کرنے کی ضرورت درپیش آتی تو آپ ان بالوں کو مونڈ کر دور کرتے

لیکن ایک دوسری حدیث حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے۔

"ان النبی ﷺ کان اذا اطلی ولی عانته بیده"

کہ بے شک نبی کریم ﷺ زیر ناف بالوں پر چونہ (پاؤڈر وغیرہ) استعمال کر کے ہاتھوں سے بالوں کو صاف کر دیتے۔ خیال رہے کہ " اطلی " کا معنی یہ بیان کیا گیا ہے۔ " اطلی " یعنی بالنورة وهی حجر یتخذ منه طلاء لازالة الشعر من بواطن الجسد " کہ آپ نے چونہ کا استعمال کیا، کیونکہ پتھر سے حاصل ہونے والے چونہ کو جسم کے اندرونی حصہ کے بال دور کرنے کے لئے جب استعمال کیا جائے تو اسے بھی بعض اوقات " طلاء " کہہ لیا جاتا ہے۔

دونوں حدیثوں میں تطبیق:

ابن خویز منداد کہتے ہیں۔

"وهذا یدل علی ان الاکثر من فعله کان الحلق وانما تنور نادرا لیصح الجمع بین الحدیثین"

اس سے واضح ہوا کہ نبی کریم ﷺ نے اکثر طور پر زیر ناف بالوں کو مونڈا ہے لیکن کبھی کبھی چونہ وغیرہ سے بھی بالوں کو دور کیا ہے۔ اس طرح دونوں حدیثوں میں مطابقت ہو جائے گی۔

اصل مقصد تو بالوں کو دور کرنا ہے جس طرح بھی کرے خواہ مونڈا کر یا پاؤڈر استعمال کر کے۔

خیال رہے کہ زیر ناف بالوں کو دور کرنا مردوں اور عورتوں کے لئے برابر ہے۔ اور دور کرنے کے دونوں طریقے بھی مردوں اور عورتوں کے لئے برابر ہیں۔

۳) بغلوں کے بال دور کرنا:

حضرت ابراہیم علیہ السلام پر بغلوں کے بال دور کرنا بھی فرض تھا ہم پر سنت ہے۔

تاہم بغلوں کے بال اکھیڑنا، نوچنا زیادہ بہتر ہے۔ اور زیر ناف بالوں کو مونڈنا بہتر ہے۔ تاہم اگر بغلوں کے بال مونڈے اور زیر ناف بال نوچے تو پھر بھی جائز ہے۔ کیونکہ مقصد صفائی کا حصول ہے، تاہم پہلی صورت زیادہ بہتر ہے۔

۴) استنجاء کرنا:

پیشاب، پاخانہ کے مقامات کو پانی سے دھونا مستحب ہے۔ اہل قبا پتھروں سے استنجاء کرنے کے بعد پانی سے استنجاء کرتے تھے، رب تعالیٰ نے ان کی تعریف فرمائی ﴿ اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ التَّوّٰبِیْنَ وَیُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِیْنَ ﴾ بے شک اللہ تعالیٰ توبہ کرنے والوں اور پاکیزگی کرنے والوں کو پسند فرماتا ہے۔

تنبیہ : استنجاء کرنا مستحب اس وقت ہے جب مخرج (نجاست کے نکلنے کا مقام) سے باہر نجاست نہ ہو، اور اگر مخرج سے باہر درہم سے کم نجاست ہو تو پانی سے استنجاء کرنا سنت ہے۔ اور اگر درہم کے برابر ہو تو واجب ہے اور اگر درہم سے زائدہ ہو تو فرض ہے۔ (منیة المصلی)

۵) ناخن کاٹنا:

" عن عمر بن بلال الفزاری قال سمعت عبدالله بن بشر المازنی یقول قال رسول الله ﷺ قصوا اظافیرکم وادفنوا قلاماتکم ونقوا براجمکم ونظفوا لثاثتکم من الطعام وتسننوا ولاتدخلوا علیّ قحرا بخرا "

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اپنے ناخن کاٹو، ناخنوں کے تراشے دفن کردو، اور اپنی انگلیوں کے

جوڑوں کی لکیروں (جھریوں) کو صاف ستھرا رکھو، کھانے کے بعد اپنے مسوڑھے صاف کرو، اور دانتوں کو صاف کرو، اور نہ داخل ہو مجھ پر ایسے حال میں کہ تمہارے دانت میلے کچیلے ہوں اور تمہارے منہ سے بو آرہی ہے۔

حل اللغات: قلامات جمع ہے قلامة (قاف پر ضمہ) کی، جس کا معنی ناخنوں کے تراشے، ان کو دفن کرنے کا حکم دیا کہ انسان کے اعضاء کے حصوں کی عزت پائی جائے، بے حرمتی نہ ہو۔

براجم: انگلیوں کے جوڑوں کے درمیان جھریاں۔ **لثاثة:** مسوڑھے، **تسننوا:** مسواک کرو دانت صاف کرو، **قحرا بخرا:** دانتوں کا میلا کچیلا اور بدبودار ہونا۔

ترمذی نے بیان کیا ہے ناخن کاٹنے کا حکم اس لئے دیا گیا ہے کہ بڑے ناخن دوسرے لوگوں کے لئے نقصان دہ ہوتے ہیں۔ کیونکہ ان سے کسی کو خراشیں آنے کا خطرہ ہوتا ہے۔ اور وجہ یہ ہے کہ بڑے ناخنوں میں میل جمع ہو جاتی ہے۔ اور جنابت کی حالت میں غسل کرتے ہوئے کبھی ناخنوں کے نیچے پانی نہیں پہنچ پاتا تو انسان حکم جنابت سے نہیں نکلتا۔

☆ "عن سليمان بن فرج ابی واصل قال اتی ابا ایوب ﷺ فصافحته فرأى فی اظفاری طولا فقال جاء رجل الی النبی ﷺ یسأله عن خبر السماء فقال یجئ احدکم یسأل عن خبر السماء واظفاره کاظافیر الطیر حتی یجتمع فیها الوسخ والتفث"

سلیمان بن فرج ابی واصل کہتے ہیں میں ابوایوب ﷺ کے پاس آیا۔ میں نے ان سے مصافحہ کیا۔ انہوں نے میرے ناخن بڑھے ہوئے دیکھے، تو فرمانے لگے۔ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں ایک شخص حاضر ہوا، آپ سے آسمانوں کے متعلق خبر پوچھنے لگا، تو آپ نے فرمایا تم میں سے کوئی ایک آتا ہے آسمانوں کے متعلق پوچھتا ہے حالانکہ ناخن اس کے ایسے بڑھے ہوئے ہوتے ہیں جیسے پرندوں کے، یہاں تک کہ ان میں میل کچیل جمع ہو جاتی ہے۔

فائدہ: جو شخص جمعرات کے دن عصر وقت کے ناخن اس طرح کاٹے کہ دائیں ہاتھ کی شہادت انگلی سے شروع کر کے چھوٹی انگلی پر ختم کرے، پھر بائیں ہاتھ کی چھوٹی انگلی سے شروع انگوٹھے تک کاٹے، پھر دائیں ہاتھ کے انگوٹھے کے ناخن کو کاٹے اس کے بعد دائیں پاؤں کی چھوٹی انگلی سے شروع کر کے

ترتیب وار بائیں پاؤں کی چھوٹی انگلی پر ختم کرے تو ان شاء اللہ تنگدستی و دینوی پریشانی اور آنکھ کی خرابی سے محفوظ رہے گا۔ (از روح البیان و شامی بحوالہ نعیمی)

۶) کلی کرنا: مسنون یہ ہے کہ کلی کرنے میں مبالغہ کرے، کیونکہ نبی کریم ﷺ کلی کرنے میں مبالغہ کرتے تھے مبالغہ کا طریقہ یہ ہے کہ پانی کو ایک طرف سے دوسری طرف پھیرے یا غرغرہ کرے، لیکن روزہ دار شخص کلی کرنے میں مبالغہ نہ کرے، بلکہ کلی کرتے وقت اعتدال رکھے۔

(کشاف الحقائق، حاشیہ کنز الدقائق)

۷) ناک میں پانی ڈالنا: وضوء کرتے وقت ناک میں پانی ڈالتے وقت بھی مبالغہ کرے، کہ پانی ناک کی ہڈی (منخرین) تک پہنچ جائے، یعنی پانی کو ذرا اوپر کھینچے تا کہ ناک کے نرم حصہ تک وہ گردش کرے، لیکن روزہ دار شخص ناک میں پانی ڈالتے وقت بھی مبالغہ نہ کرے۔

(کشاف الحقائق)

۸) مسواک کرنا: حضرت ابراہیم علیہ السلام پر یہ تمام چیزیں فرض تھیں جو ہمارے لئے مسنون ہیں۔ مسواک کو نبی کریم ﷺ پسند فرماتے تھے۔ اسی لئے آپ نے فرمایا" **لو لا ان اشق علی امتی لامرتھم (امر لوجوب) بالسواک عند کل صلوٰۃ**" (مسلم)

اگر میں اپنی امت پر شاق نہ سمجھتا تو ہر نماز کے لئے مسواک کا حکم دیتا۔

مقام توجہ: وضوء کے وقت مسواک سنت مؤکدہ ہے۔ احناف کے نزدیک مسواک سنت وضوء ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک سنت نماز ہے۔ یعنی اگر ایک شخص نے ایک وضوء سے کئی نمازیں پڑھ لیں تو سب میں اسے مسواک کی سنت پر عمل کرنے کا ثواب حاصل ہوگیا۔ لیکن امام شافعی فرماتے ہیں۔ ہر نماز کے وقت مسواک کرے گا تو سنت پر عمل ہوگا۔

مسواک کے اوقات مستحبہ:

" **ویستحب فی مواضع اصفرار السن و تغیر الرائحۃ والقیام من النوم والقیام الی الصلوٰۃ و دخول البیت ولاجتماع والاجتماع بالناس وقراء ۃ القرآن** "

چند مقامات وہ ہیں جہاں مسواک مستحب ہے۔ دانتوں کا زرد ہونا، اور منہ میں بوآنی شروع ہو جائے۔ اور نیند سے جب اٹھے۔ اور نماز کے وقت، اور گھر داخل ہوتے وقت، اور لوگوں کی مجلس میں

جانے کیلئے، اور قرآن پاک پڑھنے کیلئے۔ خیال رہے نماز کے وضوء کیلئے مسواک کچھ حضرات کے نزدیک مستحب ہے لیکن امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک سنت مؤکدہ ہے۔ (کشاف الحقائق)

تنبیہ: اگر لکڑی کی مسواک پاس ہے تو صرف انگلی سے دانت صاف کرنے سے سنت پر عمل نہیں ہوگا۔ ہاں اگر لکڑی کی مسواک پاس نہیں تو انگلی سے دانتوں کو صاف کرنے سے سنت کا ثواب مل جائے گا۔ بہتر تو یہ ہی صورت ہے کہ اسے ہی مدنظر رکھے۔

البتہ بعض فقہاء کرام نے یہ بیان فرمایا ہے کہ لکڑی کی مسواک پاس ہو تو اس کا استعمال کرنا بہتر ہے۔ انگلی کا استعمال کرنا جائز ہے اور سنت پر عمل ہو جائے گا۔ (کشاف الحقائق)

مسواک کیسی ہو: مسواک نرم ہو، سیدھی ہو، کم از کم چھوٹی انگلی جتنی موٹی ہو، اور ایک بالشت لمبی ہو، بالشت سے چھوٹی نہ ہو، ہاں استعمال کرتے کرتے چھوٹی ہو جائے تو کوئی حرج نہیں۔ (کشاف الحقائق)

نبی کریم ﷺ کا پیلو درخت کی مسواک کرنا اسی لئے تھا کہ وہ نرم ہوتی ہے، اس کے ریشے دانتوں اور مسوڑھوں کو بہتر طریقہ سے صاف کرتے ہیں اور اس مسواک سے مسوڑھوں کو نقصان بھی نہیں ہوتا۔

☆ "عن ابن عباس قال قال رسول الله ﷺ استاكوا مالكم تدخلون عليّ قلحا"

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مسواک کیا کرو، میرے پاس ملنے کیلئے بدبودار دانت لے کر نہ آیا کرو۔

۹) مونچھوں کا کاٹنا:

"روى الترمذي عن ابن عباس قال كان رسول الله ﷺ يقص من شاربه ويقول ان ابراهيم خليل الرحمن كان يفعله" قال هذا حديث حسن غريب.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ اپنی مونچھوں کو کاٹتے تھے، اور فرماتے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی اسی طرح کرتے تھے۔

فائدہ:

"اذا نبتت للمرأة لحية فيستحب لها حلقها" (نووی شرح مسلم ج ۱ ص ۱۲۹ باب خصال الفطرة)

عورت کی جب داڑھی نکل آئے تو اس کے لئے منڈانا مستحب ہے۔

"اذانبتت للمرأة لحية او شوارب فلا تحرم ازالتها بل يستحب عندنا"

(نووی شرح مسلم ج ۲ ص ۲۱۳ باب تحریم فعل المواصلة)

عورت کی جب داڑھی یا مونچھیں نکل آئیں تو ان کا زائل کرنا مستحب ہے۔

مقام توجہ:

مرد کو داڑھی بڑھانے اور مونچھیں کٹانے کا حکم دیا گیا ہے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ کے حکم کو بیان فرماتے ہیں کہ آپ نے فرمایا۔

"احفوا الشوارب واعفوا اللحية" مونچھوں کو کٹاؤ اور داڑھی کو بڑھاؤ۔

(مسلم ج ۱ باب خصال الفطرة ص ۱۲۹)

قاضی عیاض رحمہ اللہ نے فرمایا؛

"يكره حلقها و قصها و تحريقها" داڑھی کا منڈانا، کٹانا اور جلانا مکروہ تحریمی ہے۔

"واما الاخذ من طولها و عرضها فحسن و يكره الشهرة فى تعظيمها كما تكره فى قصها و جزها"

داڑھی کی لمبائی اور چوڑائی سے کانٹ چھانٹ بہتر ہے۔ اس لئے کہ داڑھی کو بڑھانے میں شہرت حاصل کرنا ایسے ہی مکروہ ہے جیسے داڑھی کا کٹانا مکروہ تحریمی ہے۔

"ومنهم من حد وبما زاد على القبضة فيزال" داڑھی کی حد ایک قبضہ (مٹھی برابر یعنی چار انگلیاں) ہے۔ جو اس سے بڑھ جائے اسے کاٹ دیا جائے۔ "كره مالك طولها" امام مالک رحمہ اللہ نے داڑھی کا زیادہ لمبا کرنا مکروہ قرار دیا ہے۔ (نووی شرح حدیث)

"واللحية عندنا طولها بقدر القبضة (بضم القاف)" ہمارے نزدیک داڑھی کی لمبائی ایک قبضہ (مٹھی بھر) کی مقدار ہے۔

"فان الطول المفرط يشوه الخلقة ويطلق السنة المغتابين بالنسبة اليه فلا بأس للاحتراز عنه على هذه النية"

داڑھی جب اتنی لمبی ہو جائے جو بدنما نظر آئے شکل کو بگاڑ دے، اور طعنہ زن اور غیبت کرنے والے لوگوں کی زبانیں اس کے خلاف بدگوئی کریں، باعث تضحیک یعنی مزاح کا سبب بنے تو اس وقت داڑھی کو قبضہ سے جو زائد ہے اس کو کٹادے، بلکہ ایسی صورت میں داڑھی کی زائد مقدار کو کٹانا واجب ہوگا

" وما وراء ذلک یجب قطعه روی عن+ رسول الله ﷺ انه کان یاخذ من اللحیة من طولها و عرضها اورده ابو عیسیٰ فی جامعه وقال من سعادة الرجل خفة لحیته "

قبضہ سے زائدہ داڑھی کا کٹانا واجب ہے۔ اس لئے کہ نبی کریم ﷺ اپنی داڑھی کو لمبائی اور چوڑائی سے کانٹ چھانٹ فرماتے تھے۔ اس حدیث کو ابوعیسیٰ ترمذی نے اپنی جامع میں ذکر فرمایا اور ساتھ ہی کہا کہ مرد کو قبضہ کی مقدار ہی داڑھی پر اکتفاء کرنا چاہئے یہ اس کی نیک بختی کی علامت ہے۔

" فیجعلها بین اللحیتین ای طویل و قصیر فان التوسط من کل شئ احسن و منه قیل خیر الامور اوسطها "

داڑھی درمیانی ہونی چاہئے قبضہ سے چھوٹی بھی نہ ہو اور بہت بڑی بھی نہ ہو، اس لئے کہ ہر چیز میں میانہ روی ہی بہتر ہے اس لئے کہ تمام امور میں میانہ روی بہتر ہے۔

" ومن ثم قیل کلما طالت اللحیة نقص العقل "

اسی وجہ سے کہا گیا ہے کہ جب داڑھی بہت لمبی ہو جائے تو وہ عقل کی کمی کی علامت ہے۔
(مرقاۃ ج۸ ص۲۹۸ باب الترجل)

داڑھی بھی ناف تک آ رہی ہو پھر سکوٹر پر سوار بھی ہو تو عجیب منظر ہوتا ہے۔ لوگ دیکھ کر نہ ہنسیں تو کیا کریں۔

اسلام کو باعث تضحیک نہ بنایا جائے بلکہ باعث تعریف بنایا جائے۔ بلاوجہ تکلف سے اپنی شکلوں کو نہ بگاڑیں۔

مونچھیں کٹائیں، منڈائیں نہیں:

مرد کے لئے مونچھوں کو کٹانا منڈانے سے افضل ہے۔ دونوں طرفوں میں مونچھیں لمبی کرنا جائز ہے، لیکن درمیان میں لمبی کرنا منع ہے۔

"ان السنة فی قص الشارب ان لایبالغ فی احفائه بل یقتصر علی ماتظهر به حمرة الشفة و طرفها"

مونچھوں کو بہت زیادہ نہ کٹائے بلکہ اتنا کٹائے جس سے ہونٹوں اور اس کی طرفوں میں جسم کی سرخی نظر آ جائے۔احادیث میں کٹانے سے مراد اتنا ہی ہے۔

" وقیل الافضل حلقه لحدیث والاکثرون علی القص بل رأی مالک تادیب الحالق "

بعضوں نے کہا ہے کہ افضل حلق ہے۔لیکن زیادہ حضرات اسی طرف ہیں کہ مونچھوں کو کٹایا جائے منڈایا نہ جائے، بلکہ امام مالک رحمہ اللہ تو مونچھوں کو منڈانے والے کو ادب سکھانے کے قائل ہیں۔

(مرقاۃ ج ۸ ص ۱۹۸ کتاب الاطعمۃ)

اعتراض : حدیث شریف میں تو" احفوا الشوارب " ذکر ہے،جس سے پتہ چلتا ہے کہ مونچھوں کو منڈانا افضل ہے۔

جواب : ابو عمر رحمہ اللہ فرماتے ہیں،اس مسئلہ میں دو حدیثیں استعمال ہیں۔ایک حدیث میں " احفوا " ذکر ہے " وھو لفظ محتمل التاویل " لیکن اس میں تاویل کا احتمال ہے، کیونکہ "احفاء " کا معنی کاٹنا بھی آتا ہے۔مونڈنا بھی آتا رہتا ہے،اور نوچنا بھی آتا رہتا ہے۔

اور دوسری حدیث میں " قصوا "ذکر ہے،"وھو مفسر والمفسر یقضی علی المجمل " جس کا معنی واضح طور پر کاٹنا ہے۔اس لئے یہ لفظ مفسر ہے،اور " احفوا " مجمل ہے۔لہٰذا مفسر کو مجمل پر ترجیح دی جائے گی۔

خیال رہے کہ مسئلہ کا تعلق افضلیت سے ہے، یہ نہیں کہ منڈانے کو کوئی حرام کہنا شروع کر دے یا مکروہ۔اس لئے کہ امام احمد رحمہ اللہ اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما مونچھوں کو بہت شدید پست کرتے تھے یہاں تک کہ ان کا چمڑا نظر آنے لگتا۔ (قرطبی)

ناخن اور بال وغیرہ کتنی مدت میں کاٹے جائیں؟

"عن انس قال وقت لنا فی قص الشارب و تقلیم الاظفار و نتف الابط و حلق العانة الا

نترک اکثر من اربعین لیلة" (مسلم)

حضرت انس ﷛ نے فرمایا ہمارے لئے ناخن کاٹنے، مونچھیں کاٹنے، بغلوں کے بال نوچنے، اورزیرناف بال مونڈنے کا وقت مقرر کیا گیا تھا کہ ہم چالیس دنوں سے زائد نہیں نہ چھوڑیں

" قال علماؤنا هذا تحديد فی اکثر المدة " علماء کرام نے یہ بیان کیا ہے کہ یہ تو زیادہ مدت کی حد ہے، کہ اس سے بھی زیادہ دیر کرنا منع ہے، اور یقیناً شکل کا بگاڑ بھی لازم آئے گا۔

" والمستحب تفقد ذلک من الجمعة الی الجمعة " مستحب یہی ہے کہ ایک جمعہ سے دوسرے جمعہ تک ناخن اور بال وغیرہ چھوڑے جائیں، پھر ان کو کاٹ دیا جائے۔

تنبیہ: یہ بھی خیال رہے کہ چالیس دن والی حدیث پر کلام ہے۔ لہٰذا وہ قابل حجت بھی نہیں، اس حدیث کے متعلق کیا کہا گیا ہے؟

" وهذا الحديث يرويه جعفر بن سليمان قال العقيلی فی حديثه نظر ، وقال ابو عمر فيه ليس بحجة ، لسوء حفظه و كثرة غلطه وهذا الحديث ليس بقوی من جهة النقل ولكنه قدل قال به قول ، واكثر علی ان لا توقيت فی ذلک و بالله التوفيق "

چالیس دنوں والی حدیث کو جعفر بن سلیمان نے روایت کیا ہے۔ عقیلی نے کہا اس حدیث میں نظر ہے۔ ابوعمر نے کہا اس میں حجت نہیں کیونکہ راوی کا حافظہ درست نہیں تھا جس کی وجہ سے ان سے غلطیاں سرزد ہو جاتی تھیں۔ اور یہ حدیث نقل کے لحاظ سے قوی نہیں۔ البتہ کچھ حضرات نے اس کا قول بھی کیا ہے۔ اور کچھ حضرات نے کہا ہے کہ کوئی وقت مقرر نہیں۔

راقم کا موقف:

انسانی فطرت جن ناخنوں کو بڑا کہے کہ یہ تو کاٹنے چاہئیں۔ بغلوں کے یہ بال بڑے ہو گئے۔ مونچھیں بڑی ہیں۔ لبوں تک آ رہی ہیں وغیرہ بس وہی حد ہے۔ اگر چہ کوئی وقت مقرر تو نہیں، لیکن عقل کا تقاضا یہی ہے۔ کہ ہر ہفتہ میں ان پر عمل ہو، کسی حد تک دو ہفتہ کی تاخیر کی گنجائش سمجھ آتی ہے۔ اس سے زائد انسانی فطرت اچھا نہیں سمجھتی، کسی کو انسانی فطرت ہی نہ حاصل ہو بندروں کی طرح ناخن بڑھائے

ہوئے ہوں تو ان کو دیکھ کر یہ دلیل نہ دی جائے کہ یہ بھی تو انسان ہے، وہ باندری انسان ہوتی تو انسانوں والا کام کرتی۔

۱۰) مانگ نکالنا:

• یعنی سیدھی مانگ نکالنا، ناک کی سیدھ سے سر کے بالوں کو دائیں، بائیں کرنا۔

☆ " خرج النسائی عن ابن عباس ان رسول اللہ ﷺ کان یسدل شعرہ وکان المشرکون یفرقون شعورھم' وکان یحب موافقہ اھل الکتاب فیما لم یؤمر فیہ بشیٔ، ثم فرّق رسول اللہ ﷺ بعد ذلک اخرجہ البخاری، و مسلم عن انس "

نسائی نے حضرت ابن عباس اور بخاری و مسلم نے حضرت انس رضی اللہ عنہم سے روایت بیان کی کہ بے شک رسول اللہ ﷺ اپنے بالوں کو لٹکاتے تھے۔ (یعنی پیشانی پر سیدھا نیچے چھوڑتے تھے) کیونکہ مشرکین مانگ نکالتے تھے، اور نبی کریم ﷺ کو جن چیزوں کا حکم نہیں دیا جاتا تھا ان میں آپ اہل کتاب کی موافقت زیادہ پسند فرماتے تھے، لیکن بعد میں رسول اللہ ﷺ نے مانگ نکالنی شروع فرمائی۔

یقینی بات ہے کہ آپ نے مانگ وحی خفی کے ذریعے نکالنی شروع فرمائی، لہٰذا وہ پہلا عمل بالوں کو سیدھا پیشانی پر چھوڑنے والا منسوخ ہو گیا ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام پر مانگ نکالنا فرض تھا، لیکن ہم پر " والفرق فی الشعر سنة لانه الذی رجع الیه النبی ﷺ " بالوں میں مانگ نکالنا سنت ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ نے اس عمل کی طرف رجوع کیا۔ یعنی ہمارے۔ لئے سنت ابراہیمی بھی ہے۔ اور سنت مصطفوی بھی ہے۔

حضرت عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ جمعہ کے دن مسجد کے دروازہ پر کھڑے ہوتے اگر کسی نے اپنے بالوں کو پیشانی پر لٹکایا ہوتا تو آپ اس کے بال کاٹ دیتے تھے۔

(تمام بحث ماخوذ از قرطبی و احکام القرآن للجصاص)

ابراہیم علیہ السلام کے بالوں کا سفید ہونا:

" وفی الموطأ وغیرہ عن یحییٰ بن سعید انه سمع سعید بن المسیب یقول ابراھیم علیه السلام اوّل من اختتن و اوّل من اضاف الضیف و اوّل من استحد واول من قلم الاظفار

واول من قص الشارب و اول من شاب ، فلما رأی الشیب قال ما ھذا ؟ قال وقار ، قال یارب زدنی وقارا"

حضرت سعید بن مسیّب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ابراہیم علیہ السلام نے ہی پہلے پہلے ختنہ کیا، آپ نے ہی پہلے مہمان نوازی (سے بہت زیادہ محبت) کی۔ سب سے پہلے بطور فرض زیر ناف بال آپ نے ہی مونڈے، سب سے پہلے بطور فرض آپ نے ہی ناخن کاٹے، اور سب سے پہلے بطور فرض آپ نے ہی مونچھیں کاٹیں۔ اور سب سے پہلے آپ کے ہی بال سفید ہوئے، آپ نے جب سفید بالوں کو دیکھا تو رب تعالیٰ سے پوچھا، اے رب یہ کیا ہے؟ رب نے فرمایا وقار ہے۔ آپ نے کہا اے میرے رب میرا وقار اور زیادہ کردے۔

☆ " عن سعید بن ابراھیم عن ابیه قال اوّل من خطب علی المنابر ابراھیم خلیل الله قال غیره و اول من ثرو الشرید واول من ضرب السیف ، واول من استاک ، واول من استنجی بالماء ، واول من لبس السراویل ، ورروی معاذ بن جبل قال قال النبی ﷺ ان اتخذ المنبر فقد اتخذه ابی ابراھیم و ان اتخذ العصا فقد اتخذھا ابی ابراھیم "

سعید ابن مسیّب اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ سب سے پہلے منبر ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام نے بنوایا کچھ اور حضرات کی روایات میں آتا ہے۔ سب سے پہلے ثرید آپ نے تیار کیا۔ سب سے پہلے تلوار آپ نے چلائی۔ سب سے پہلے بطور فرض مسواک آپ نے استعمال کی۔ سب سے پہلے پانی سے استنجاء بطور فرض آپ نے ہی کیا۔ سب سے پہلے سلوار آپ نے استعمال کی۔

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے فرمایا، نبی کریم ﷺ نے فرمایا میں منبر اس لئے بنوایا کہ میرے باپ ابراہیم علیہ السلام نے منبر بنوایا۔ اور میں نے عصا اس لئے بنوایا کہ میرے باپ ابراہیم علیہ السلام نے عصا بنوایا۔

مسئلہ: " واما الشیب فنور ویکره نتفه "سفید بال نور ہیں۔ ان کا نوچنا مکروہ ہے۔

نسائی اور ابوداؤد میں ہے کہ عمرو بن شعیب اپنے باپ، دادا سے روایت کرتے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

" لاتنتفوا الشیب ما من مسلم یشیب شیبة فی الاسلام الاکانت له نورا یوم القیامة و کتب الله له حسنة و حط عنه خطیئة "

سفید بال نوچو نہیں، کوئی مسلمان نہیں جس کے اسلام میں بال سفید ہو جائیں، مگر قیامت کے دن اس کے لئے نور بن جائیں گے۔ اور اللہ تعالیٰ اس کے لئے نیکیاں لکھے گا، اور خطاء مٹائے گا۔ (از قرطبی)

مسئلہ خضاب : پہلے تو صرف اتنا سمجھنا چاہئے کہ اصل جنس خضاب میں ہی اختلاف ہے کہ خضاب بہتر ہے یا خضاب نہ لگانا بہتر ہے۔

بعض حضرات نے کہا کہ خضاب نہ لگانا بہتر ہے، ان حضرات نے دلیل کے طور پر یہ کہا ہے۔ " **لانه ﷺ لم یغیر شیبه** " کہ نبی کریم ﷺ نے اپنے سفید بالوں پر خضاب نہیں لگایا، لہٰذا خضاب نہ لگانا ہی بہتر ہے۔

کچھ حضرات نے فرمایا ہے کہ خضاب لگانا بہتر ہے، کیونکہ

" **خضب جماعةمن الصحابة والتابعین ومن بعدهم للاحادیث التی ذکرها مسلم وغیره** "

صحابہ کرام اور تابعین اور ان کے بعد ایک ایک جماعت خضاب لگاتی رہی، کیونکہ مسلم وغیرہ میں ثابت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے سفید بالوں کو خضاب کے ذریعے بدلنے کا حکم دیا۔

☆ " **عن جابر بن عبدالله قال اتی بابی قحافة یوم فتح مکة ورأسه ولحیته کالثغامة بیاضا فقال رسول الله ﷺ غیّروا هذا بشیٔ واجتنبوا السواد** " (مسلم ج ۲ باب استحباب الخضاب)

حضرت جابر بن عبداللہ کہتے ہیں (حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے والد) ابو قحافہ کو فتح مکہ کے دن نبی کریم ﷺ کی خدمت میں لایا گیا، آپ کا سر اور داڑھی ثغامہ (ایک پودا جو نمک کی طرح سفید ہوتا ہے) کی طرح سفید تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اس کو کسی چیز سے بدل دو اور سیاہ رنگ سے اجتناب کرو۔

☆ " **عن ابی هریرة ان النبی ﷺ قال ان الیهود و النصاری لایصبغون فخالفوهم** " (مسلم ج ۲ باب استحباب الخضاب)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں بے شک نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ یہود اور نصاریٰ (اپنے

بالوں کو) نہیں رنگتے تم ان کی مخالفت کرو۔

سیاہ خضاب کے متعلق:

" و مذهبنا استحباب خضاب الشيب للرجل والمرأة بصفرة او حمرة و يحرم خضابه بالسواد على الاصح وقيل يكره كراهة تنزيه والمختار التحريم لقوله ﷺ واجتبوا السواد "

(نووی)

مرد اور عورت کے لئے سفید بالوں کو رنگنا ہمارے مذہب (قول نووی) میں مستحب ہے۔ وہ خضاب زرد رنگ کا ہو، یا سرخ ہو اصح مذہب یہ ہے کہ سیاہ رنگ سے رنگنا حرام ہے۔ اور بعض حضرات نے کہا کہ مکروہ ہے وہ بھی تنزیہی۔

مختار یہ ہے کہ سیاہ رنگ سے رنگنا حرام ہے، کیونکہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا" اجتنبوا السواد " (سیاہ سے اجتناب کرو) بعض حضرات نے حرام کہا ہے۔ اس کی اصل وجہ اختلاف یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے " اجتنبوا " امر کا صیغہ ذکر فرمایا ہے۔ کیا یہ وجوب کے لئے ہے، یا استحباب کے لئے۔ جن حضرات نے وجوب کے لئے کہا ہے انہوں نے اس کی مخالف جانب کو حرام کہا ہے۔

اور جن حضرات نے استحباب کیلئے کہا ہے۔ انہوں اسکی مقابل صورت کو مکروہ تنزیہی کہا ہے۔

(راقم)

" وخضب جماعة منهم بالحناء والكتم و بعضهم بالزعفران وخضب جماعة بالسواد روى ذلک عن عثمان والحسن والحيسن ابنى على و عقبة بن عامر وابن سيرين وابى بردة و آخرين "

(نووی حوالہ مذکور)

صحابہ کرام اور تابعین کی ایک جماعت نے مہندی اور کتم سیاہ رنگ (پتے والا پودہ) سے خضاب لگایا اور بعض نے زعفران سے اور ایک جماعت نے سیاہ رنگ کا خضاب استعمال کیا۔

یہ روایت حضرت عثمان، حضرت امام حسن اور حضرت امام حسین اور عقبہ بن عامر اور ابن سیرین اور ابو بردہ اور کئی حضرات سے مروی ہے۔

" قال القاضى قال الطبرانى الصواب ان الآثار المروية عن النبى ﷺ بتغير الشيب و

بالنهی عنه کلها صحیحة ولیس فیها تناقض بل الامر بالتغییر لمن شیبه کشیب ابی قحافة و النهی لمن له شمط فقط "

قاضی عیاض رحمہ اللہ نے بیان فرمایا کہ طبرانی نے بیان کیا ہے کہ درست قول یہ ہے کہ احادیث سفید بالوں کو بدلنے کے متعلق بھی وارد ہیں اور خضاب کی ممانعت کے متعلق بھی احادیث وارد ہیں۔ وہ سب صحیح ہیں۔ اور ان میں کوئی تناقض بھی نہیں، بلکہ حکم یہ ہے کہ جب بال حضرت ابوقحافہ رضی اللہ عنہ کی طرح خالص سفید ہو جائیں تو خضاب کو استعمال کرنے کا حکم دیا گیا، اور جب بال سیاہ وسفید ملے جلے ہوں تو خضاب کی ممانعت ہے۔

" قال واختلاف السلف فی فعل الامرین بحسب اختلاف احوالهم فی ذلک مع ان الامر والنهی فی ذلک لیس للوجوب بالاجماع ولهذا لم ینکر بعضهم علی بعض خلافه فی ذلک قال ولا یجوز ان یقال فیهما ناسخ و منسوخ "

قاضی عیاض رحمہ اللہ نے فرمایا کہ سلف صالحین کا اختلاف خضاب کے لگانے یا نہ لگانے میں اختلاف احوال کی وجہ سے تھا۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ احادیث میں امر یا نہی وجوب کے لئے نہیں، اسی پر اجماع امت ہے۔ اسی لئے بعض حضرات نے دوسرے بعض کا انکار نہیں کیا، اور یہ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ بعض احادیث ناسخ ہیں، اور بعض منسوخ ہیں۔

سبحان اللہ سلف صالحین کیسے ہی محققین تھے کہ مسئلہ کی تحقیق ان کو حاصل ہوتی بلاوجہ ایک دوسرے کے خلاف کیچڑ اچھالنا حرام کے فتوے لگانا ان کا طریقہ کار نہیں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی عزت کی جاتی تھی، آجکل کچھ بے سمجھ لوگوں نے تمام علماء کرام کی عزت کو خاک میں ملا دیا ہے، یہودیوں اور نصرانیوں کے آلہ کار لوگوں کو موقع میسر آ گیا کہ وہ کل تک جن کو استعمال کرتے رہے آج ان کو ہی دہشت گرد قرار دے دیا۔

" وقال غیره هو علی حالین فمن کان فی موضع عادة اهله الصبغ او ترکه فخروجه عن العادة شهرة و مکروه "

قاضی عیاض رحمہ اللہ کے بغیر دوسرے علماء کرام نے بیان فرمایا، خضاب لگانے یا نہ لگانے کا

دارومدار عادت کے مطابق ہے۔ جہاں عام لوگ خضاب لگاتے ہوں وہاں خضاب لگانا بہتر ہے اور نہ لگانا بہتر نہیں۔ اگر لوگوں کی عادت اس کے خلاف ہو تو حکم بھی اسی طرح مختلف ہوگا۔

" والثاني انه يختلف باختلاف نظافة الشيب فمن كان شيبة تكون نقية احسن منها مصبوغة والترك اولى ومن كانت شيبة تستبشع فالصبغ اولى هذا مانقله القاضي والاصح اوفق للسنة ما قدمناه عن مذهبنا والله اعلم "

اور وجہ اختلاف اور اس میں تطبیق کی صورت یہ ہے کہ جس شخص کو سفید بال خوبصورت لگ رہے ہوں اسے خضاب نہ لگانا بہتر ہے۔ اور جس کے سفید بال صاف نہ ہوں، خوبصورت نہ لگ رہے ہوں، اسے خضاب لگانا بہتر ہے۔ (ماخوذ از نووی)

راقم کا موقف:

خضاب لگانے یا نہ لگانے میں انسان کو اختیار ہے، اگرچہ علامہ نووی رحمہ اللہ اور کئی اہل علم نے مستحب بھی قرار دیا ہے۔

خالص سیاہ رنگ کے خضاب میں بھی اگرچہ اختلاف ہے بعض نے مکروہ تنزیہی کہا ہے۔ اور بعض نے حرام، لیکن راقم کا موقف اس میں یہی ہے کہ خالص سیاہ رنگ سے اجتناب ضروری ہے۔

صحابہ کرام نے مہندی اور کتم (سیاہ رنگ دینے والا پودہ) کو ملا کر خضاب لگایا ہے۔ اس لئے ایسا ہی خضاب لگایا جائے جس میں سرخ اور سیاہ کو ملا کر استعمال کیا جائے، بلکہ اب یہ بھی ضروری نہیں کیونکہ اب جتنے خضاب استعمال ہو رہے ہیں۔ وہ تمام مختلف رنگوں میں مل رہے ہیں، ان رنگوں میں براؤن بھی مل رہا ہے، جو تیار ہی سرخ اور سیاہ سے ہے وہ استعمال کر لیا جائے۔

کسی چیز کی اصل کا شریعت میں ملنا ضروری ہے، یا ممانعت کا نہ ملنا ضروری ہے۔ جب حناء اور کتم کا استعمال صحابہ کرام سے ملتا ہے، تو اسی سے واضح ہو گیا کہ سرخ اور سیاہ خضاب کو ملا کر استعمال کرنا جائز ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ خضاب لگانے والے علماء کرام مسئلے سے بخوبی واقف ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ علماء کرام کے بالوں میں جب خضاب کے رنگ کو مدہم دیکھتا ہوں تو وہ سرخی مائل نظر آتے ہیں۔

☆☆☆☆

﴿وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَیْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَاَمْنًا ؕ وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّی ؕ وَعَهِدْنَاۤ اِلٰۤی اِبْرٰهٖمَ وَ اِسْمٰعِیْلَ اَنْ طَهِّرَا بَیْتِیَ لِلطَّآئِفِیْنَ وَالْعٰكِفِیْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ﴾ (آیت ۱۲۵)

۱) اور یاد کرو جب ہم نے اس گھر کولوگوں کا مرجع اور امان بنایا اور ابراہیم کے کھڑے ہونے کی جگہ کونماز کا مقام بناؤ، اور ہم نے تاکید فرمائی ابراہیم واسماعیل کو کہ میرا گھر خوب ستھرا کرو طواف والوں اوراعتکاف والوں اور رکوع وسجود والوں کیلئے۔

۲) اور یاد کرو جب بنایا ہم نے اس مقام کولوٹنے کی جگہ لوگوں کے لئے ۔ اور امن والا، اور بناؤ تم ابراہیم کے کھڑے ہونے کی جگہ کونماز کا مقام ۔ اور ہم نے تاکید فرمائی ابراہیم اور اسماعیل کو کہ ستھرا کریں میرے گھر کوطواف کرنے والوں اور اعتکاف والوں اور رکوع کرنے والوں اور سجدہ کرنے والوں کے لئے ۔

آیۂ کریمہ کی وضاحت پیش کرنے سے پہلے راقم اپنی کتاب تسکین الجنان کا ایک ورق ذکر کررہا ہے۔جس سے تراجم کا فرق سمجھ میں آجائے۔

﴿وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَیْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَاَمْنًا﴾ (پ ۱ ع ۱۵)

ترجمہ	مترجم
اور جب ٹھہرایا ہم نے یہ گھر کعبہ اجتماع کی جگہ لوگوں کی اور پناہ	شاہ عبدالقادر
اور جب ہم نے مقرر کیا خانہ کعبہ کواجتماع کی جگہ لوگوں کے واسطے اور جگہ امن کی	محمود الحسن
اور یہ کہ ہم نے اس گھر (کعبے) کولوگوں کے لئے مرکز اور امن کی جگہ بنایا	مودودی
اور جب ہم نے خانہ کعبہ کولوگوں کے لئے جمع ہونے اور امن پانے کی جگہ مقرر کیا	فتح محمد
اور یاد کرو جب ہم نے اس گھر کولوگوں کے لئے مرجع اور امان بنایا	اعلیحضرت احمد رضا خان

اس مقام پر مثابۃ کا ترجمہ اجتماع کی جگہ کیا گیا ہے، اور اعلیٰ حضرت نے مرجع یعنی جائے رجوع

کیا ہے۔ اور یہ ترجمہ لغت کے مطابق ہے اور مقصد بھی بیان کرنے کا یہی ہے کہ لوگ اس کی طرف بار بار لوٹتے ہیں اور دیکھنے کے لئے بے قرار ہوتے ہیں۔

اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کی فوقیت پر جلالین کی عبارت ملاحظہ ہو۔ " مرجعا یثوبون الیه من کل جانب "یعنی مرجع بنایا کہ ہر جانب سے لوگ اس طرف لوٹتے ہیں۔

جلالین کے حاشیہ پر یہ ہے۔ " یثوبون ای یرجعون ثوب گردآمدن مردم (صراح) یہاں بھی معنی لوٹنا ہے۔

مدارک میں اس طرح ہے۔ " صباٰۃ و مرجعا للحجاج والعمار یتفرقون عنه ثم یثوبون الیه "

حاجیوں اور عمرہ کرنے والوں کے لئے مرجع بنایا جو اس سے جدا ہوتے ہیں اور پھر اس کی طرف لوٹتے ہیں۔

بیضاوی میں ہے۔ " مرجعا یثوبون الیه الزوار او امثالهم " مرجع ہے کہ اس کی طرف زائرین لوٹتے ہیں۔

تفاسیر کی عبارات سے یہ خود بخود پتہ چلتا ہے کہ صرف ''اجتماع کی جگہ'' ترجمہ کرنے سے اس کا مرجع ہونا نہیں سمجھ آتا۔ کیونکہ اجتماع تو ایک مرتبہ بھی پایا جائے۔ اگرچہ یہ کہنا درست تو ہے کہ وہ اجتماع کی جگہ ہے، لیکن بیت اللہ شریف تو بار بار لوٹنے اور مجتمع ہونے کی جگہ ہے۔ البتہ مرجع ترجمہ کرنے سے اجتماع کی جگہ سمجھ میں آجاتی ہے۔

کیونکہ حج کے لئے بار بار لوٹنا اجتماع کو بھی مستلزم ہے۔

(تسکین الجنان فی محاسن کنز الایمان ص ۳۵، ۳۶)

وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ: اس مقام پر " البیت " پر الف لام عہد خارجی ہے یا الف لام جنسی ہے۔ بعض حضرات نے الف لام عہد خارجی کہا ہے۔ اور اس کی خصوصیت کا اعتبار کرتے ہوئے۔ "البیت" سے مراد کعبہ شریف لیا ہے۔ اور بعض حضرات نے الف لام جنسی کہا ہے۔

علامہ رازی رحمہ اللہ کے نزدیک یہی قول معتبر ہے، آپ فرماتے ہیں، اس مقام پر فقط کعبہ شریف معتبر نہیں، کیونکہ آگے " امنا " آرہا ہے۔ صرف کعبہ شریف کو امن والا نہیں بنایا گیا۔

" وهذا صفة جميع الحرم ، لا صفة الكعبة فقط "

کیونکہ یہ صفت تمام حرم شریف کی ہے۔صرف کعبہ کی نہیں۔

اس پر دلیل بھی واضح طور پر قرآن پاک میں موجود ہے کہ ذکر " الکعبہ " ہے۔اور مراد اس سے ''حرم'' ہے۔جیسا کہ رب تعالیٰ نے فرمایا﴿هَدْياً بَالِغَ الْكَعْبَةِ﴾ اس مقام پر " الکعبة " سے مراد ''حرم'' ہے، کیونکہ " ھدی " کعبہ میں ذبح نہیں ہوتی اور نہ ہی مسجد حرام میں ذبح ہوتی ہے۔بلکہ اس سے مراد حرم ہے۔

اسی طرح رب تعالیٰ نے فرمایا﴿ فَلا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هٰذَا ﴾ اس مقام پر مسجد حرام سے مراد، حج اور نسکِ حج کے مقامات ہیں۔

ابھی تک جو بحث ذکر کی ہے اس سے واضح ہو گیا کہ " بیت کا وصف " امن " ذکر کر کے واضح کر دیا کہ البیت سے مراد حرم ہے۔البتہ " البیت " ذکر کر کے مراد ''حرم'' لینا کس وجہ سے ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے " ان حرمة الحرم لما كانت معلقة بالبيت جاز ان يعبر عنه باسم البيت " کہ بے شک حرم کی حرمت جب بیت اللہ شریف کی وجہ سے ہی ہے۔تو اسی وجہ سے ''البیت'' ذکر کر کے مراد حرم شریف لے لیا ہے۔

مَثَابَةً لِّلنَّاسِ: یہ ماخوذ ہے " ثاب يثوب مثابة و ثوبا " سے،جس کا معنی ہے ''لوٹنا'' جس طرح کہا جاتا ہے " ثاب الماء " اس کا مطلب ہے۔پانی انقطاع کے بعد نہر کی طرف لوٹ آیا۔

اسی طرح کہا جاتا " ثاب الی فلان عقله و تفرق عنه الناس ثم ثابوا " فلاں آدمی کی بے عقلی کی وجہ سے لوگ اسے چھوڑ چکے تھے لیکن اس کی عقل لوٹ آئی،اور لوگ بھی اس کی طرف لوٹ آئے،یعنی اس عبادت میں " ثاب " اور " ثابوا " کا معنی لوٹنا ہے۔اب مقصد یہ ہے کہ رب تعالیٰ نے فرمایا،مقام حرم کو ہم نے امن اور لوٹنے کی جگہ بنایا۔

" قال الحسن معناه انهم يثوبون اليه فی كل عام "

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ لوگ حرم شریف کی طرف ہر سال لوٹ کر آتے ہیں۔

اعتراض: تمام لوگ تو ہر سال لوٹ کر نہیں آتے، تو پھر لوٹنے کی جگہ بنانے کا کیا مطلب ہے۔

جواب: " وعن ابن عباس و مجاهد انه لاینصرف عنه احد الا هو یتمنی العود الیه "

حضرت ابن عباس اور مجاہد رضی اللہ عنہم فرماتے ہیں، کہ بے شک ہر شخص اگرچہ ہر سال لوٹ کر آ تو نہیں سکتا، لیکن ہر آدمی کے دل میں تمنا پائی جاتی ہے کہ وہ لوٹ کر آئے۔

دراصل یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعاء کا اثر ہے۔ آپ نے رب تعالیٰ سے دعاء فرمائی۔

" فاجعل افئدة من الناس تهوی الیهم " تو تو لوگوں کے کچھ دل ان (مکہ میں رہنے والوں) کی طرف مائل کر دے۔ " مثابة " کا ایک معنی ثواب دیا جانا بھی ہے۔ یعنی۔ " یحجون الیه فیثابون علیه " کہ وہ حج کریں گے تو ان کو ثواب عطاء کیا جائے گا۔

اسی سے ایک اور مسئلہ بھی واضح ہو گیا کہ تمام اعمال اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہیں۔ کیونکہ رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿ وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ ﴾ اور اللہ نے تمہیں اور تمہارے اعمال کو پیدا کیا۔

یعنی ان کا عمل چونکہ رب تعالیٰ کی توفیق سے ہوتا ہے۔ وہ اپنے نیک عمل کی وجہ سے رب تعالیٰ کے فضل سے ثواب کے مستحق ہوں گے لیکن وہ ثواب ان کو مالک الملک کی عطاء سے ہی حاصل ہوگا۔

وَاَمْنًا : (اور امن والا بنایا) یعنی اللہ تعالیٰ نے " جعل اهل الحرم آمنین من القحط والجدب " حرم والوں کو قحط سالی اور خشک سالی سے امن والا بنایا۔

اور یہ آیۂ کریمہ امر کے معنی کو بھی مستلزم ہے، کہ اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو حکم دیا ہے کہ تم حرم میں قتل و غارت نہ کرو، تم اس مقام کا احترام کرو۔ " فکان البیت محترما بحکم الله تعالیٰ " یعنی اللہ تعالیٰ کے حکم سے بیت اللہ شریف اور حرم شریف محترم ہو گئے۔ (از کبیر)

☆ " قال رسول الله ﷺ یوم فتح مکة ان هذا البلد حرمه الله یوم خلق السمٰوٰت والارض فهو حرام بحرمة الله الی یوم القیامة وانه لن یحل القتال فیه لاحد ولم یحل لی الا ساعة من نهار فهو حرام بحرمة الله الی یوم القیامة لایعضد شوکه ولاینفر صیده ولا یلتقط لقطته الا من عرفها ولایختلی خلاها ، فقال العباس یا رسول الله الا الا ذخر فانه لقینهم ولبیوتهم فقال الا الا ذخر " (بخاری ، مسلم ، مظهری)

فتح مکہ کے دن نبی کریم ﷺ نے فرمایا، بے شک اس شہر کو اللہ تعالیٰ نے زمین وآسمان کے پیدا کرنے کے دن سے ہی محترم بنایا، یہ قیامت تک اللہ تعالیٰ کے محترم کرنے سے محترم ہے۔ بے شک کسی کیلئے حلال نہیں کہ اس میں قتال کرے، میرے لئے بھی حرام ہے، صرف ایک گھڑی کیلئے میرے لئے حلال کیا گیا ہے، پھر قیامت تک اللہ تعالیٰ نے اس میں قتال کو حرام قرار دے دیا۔ اس کے پودے نہ کاٹے جائیں۔ اور اس کے شکار کو نہ بھگایا جائے، اور اس سے کسی گری ہوئی چیز کو نہ اٹھایا جائے، سوائے اس کے کہ اعلان کرنے کی غرض سے اٹھائے اور اس کا گھاس نہ کاٹا جائے۔ حضرت عباس ﷺ نے اذخر گھاس کے مستثنیٰ کرنے کی درخواست کی، تو آپ نے اذخر کو مستثنیٰ فرما دیا۔ یہ گھاس ان کے گھروں کی چھتوں پر ڈالنے کیلئے، لوہار کی بھٹی میں جلانے کے لئے اور قبروں میں ڈالنے کے کام آتا تھا۔

مسئلہ : ہر وہ درخت جو عام طور پر خود اگتا ہے جس طرح جھاڑی، اور کیکر وغیرہ، وہ خود ہی حرم میں اگ پڑے (پیدا ہو جائے) تو اس کا کاٹنا حرام ہے۔

اگر اسے ہی کسی نے لگایا تھا تو اس کا کاٹنا جائز ہے۔ ایسے ہی وہ درخت جن کو عام طور پر لوگ خود لگاتے ہیں جس طرح پھلدار درخت وغیرہ، ان کو کسی نے خود لگایا، یا وہ خود پیدا ہو گئے۔ دونوں صورتوں میں ان کا کاٹنا جائز ہے۔ (از شامی)

کیا خوب امن:

حرم شریف کو اللہ تعالیٰ نے کیا خوب امن والا بنایا کہ حرم میں اگر شکاری کتا اور ہرن جمع ہو جائیں تو کتے کو ہرن کے پکڑنے کے لئے برانگیختہ کرنا منع ہے۔ ہاں اگر ہرن حرم سے باہر نکل جائے تو پھر اس پر کتے کو چھوڑنا جائز ہو گا۔ (احکام القرآن للجصاص)

مفتی احمد یار خان رحمہ اللہ نے بیان فرمایا کہ حرم شریف میں قدرتی طور پر کسی بھیڑیے کو طاقت ہی حاصل نہیں ہوتی کہ وہ کسی بھیڑ، بکری پر حملہ کرے۔

علامہ رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں "جب حرم کے باہر کتا ہرن پر حملہ کرنا چاہے، اور اس کا پیچھا کرے، وہ ہرن اس سے بھاگ پڑے، اور کتا بھی اس کے پیچھے پیچھے ہو، " فاذا دخل الظبی الحرم لم یتبعہ

الکلب" تو وہ ہرن حرم میں داخل ہو جائے تو کتا اس کا پیچھا کرنا چھوڑ دیتا ہے۔

" وکانت الجاهلية متمسكين بتحريمه ، لايهيجون على احد التجأ اليه "

زمانہ جاہلیت میں بھی لوگ حرم شریف کا احترام کرتے تھے، اگر کوئی شخص حرم کی پناہ لے لیتا، تو دوسرے اس پر حملہ نہیں کرتے تھے۔

" وكانوا يسمعون قريشا اهل الله تعظيما له " چونکہ قریش کعبہ شریف کے خدام، حرم کے پاسبان تھے۔ اسی وجہ سے یعنی حرم کی تعظیم اور حرمت کی وجہ سے زمانہ جاہلیت میں بھی لوگ قریش کو" اہل اللہ" (اللہ والے) کہتے۔ (از کبیر)

مسئلہ: اگر کوئی شخص قتل کر کے حرم میں آجائے تو اس میں امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا مذہب یہ ہے کہ اس کو حرم شریف میں قصاص کے طور پر قتل نہیں کیا جائے گا۔

" لكن يضيق على الجانى ولايكلم ولا يطعم ولا يعامل حتى يخرج فيقتل "

البتہ اس پر تنگی کی جائے، اس سے کوئی کلام نہ کرے اور نہ اسے طعام دیا جائے۔ اور کسی طرح بھی اس سے کوئی معاملہ نہ کیا جائے، یہاں تک کہ وہ حرم سے نکل جائے، پھر اسے قتل کیا جائے۔

امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اگر کسی پر حد یا قصاص لازم ہو تو وہ حرم میں پناہ پکڑ لے، تو امام اس پر تنگی کرے تاکہ وہ حرم سے نکل جائے" فاذا خرج اقيم عليه الحد فى الحل فان لم يخرج جاز قتله فيه " جب وہ نکلے تو حرم سے باہر "حل" میں اسے قتل کیا جائے اور اس پر حد لگائی جائے، اگر نہ نکلے تو حرم کے اندر ہی اسے قتل کر دیا جائے۔

امام احمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔ حرم کے اندر پناہ لینے والے سے کسی طرح بھی قصاص نہیں لیا جائے گا۔ خواہ وہ قتل کا قصاص ہو، یا ہاتھ پاؤں وغیرہ کے کاٹنے کا قصاص ہو۔ ہاں البتہ حرم سے نکلنے پر قصاص لیا جائے گا۔ (از روح المعانی)

امام مالک رحمہ اللہ کا مذہب یہ ہے کہ بیت اللہ شریف میں تو کسی کو قتل نہیں کیا جائے گا۔ البتہ حرم میں قتل کرنے والے کو قتل کر دیا جائے گا، اور لڑائی کرنے والے سے لڑائی کی جائے گی۔ اور جو باہر سے

حرم میں پناہ لے اور اس پر حد لازم ہو تو اسے قید کر لیا جائے۔ (قرطبی)

امام اعظم رحمہ اللہ کا مذہب بھی یقیناً اعظم ہے کہ حرم کا بھی لحاظ کیا جائے۔ اور اس شخص پر کھانے، پینے کی اشیاء نہ پہنچنے دی جائیں۔ یقیناً وہ باہر نکلے گا۔ کوئی شخص اپنے کو بھوک سے قتل نہیں کرتا

لہٰذا علامہ قرطبی رحمہ اللہ کا یہ کہنا۔ " فنحن نقتله بالسیف وهو یقتله بالجوع " (ہم تلوار سے قتل کرتے ہیں اور امام اعظم رحمہ اللہ بھوک سے قتل کرتے ہیں) بے حقیقت ہو کر رہ گیا۔

مسئلہ: جو شخص حرم کے اندر قتل کرتا ہے۔ یا باعث حد کام کرتا ہے، تو اس سے قصاص لے لیا جائے گا، اور اس پر حد نافذ کر دی جائے گی۔ اسے حرم کی سرزمین امن نہیں دے گی۔ (قرطبی)

وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرَاهِيْمَ : اور بناؤ تم ابراہیم کے کھڑے ہونے کی جگہ کو نماز کا مقام

اس کی وجہ نزول کا ذکر اس حدیث میں ہے جو ابو نعیم نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت سے بیان کی۔

" ان النبی ﷺ اخذ بید عمر رضی اللہ عنہ فقال یا عمر هذا مقام ابراهیم فقال عمر افلا نتخذه مصلی فقال لم او مر بذلک فلم تغب الشمس حتی نزلت هذه الایة "

بے شک نبی کریم ﷺ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ہاتھ پکڑا، اور فرمایا اے عمر یہ مقام ابراہیم ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا، کیا ہم اس کو نماز کا مقام نہ بنالیں؟ تو حضور نے فرمایا ابھی مجھے اس کا حکم نہیں دیا گیا اسی دن غروب شمس (سورج غروب ہونے) سے پہلے اس آیۃ کریمہ کا نزول ہو گیا۔

خیال رہے کہ یہ حکم استحبابی ہے، کہ طواف کے بعد دو رکعت مقام ابراہیم کے پاس پڑھے، اگر وہاں جگہ نہ ملے تو مسجد حرام میں جہاں چاہے پڑھ لے۔

☆ عن انس بن مالک قال قال عمر وافقت ربی فی اربع ، قلت یا رسول اللہ لو صلیت خلف المقام فنزلت هذه الایة ﴿وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرَاهِيْمَ مُصَلًّى﴾ وقلت یا رسول اللہ لو ضربت علی نسائک الحجاب فانه یدخل علیهن البر والفاجر فانزل اللہ ﴿وَاِذَا سَاَلْتُمُوْهُنَّ مَتَاعًا فَسْئَلُوْهُنَّ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ﴾ ونزلت هذه الایة ﴿ولقد خلقنا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلَالَةٍ مِّنْ طِيْنٍ﴾ فلما نزلت قلت انا تبارک اللہ احسن الخالقین ، فنزلت

﴿فَتَبَارَکَ اللّٰہُ اَحۡسَنُ الۡخٰلِقِیۡنَ﴾ و دخلت علی ازواج النبی ﷺ فقلت لتنتهن اولیبدلنه الله بازواج خیر منکن فنزلت الآیة ﴿عَسٰی رَبُّہٗۤ اِنۡ طَلَّقَکُنَّ﴾ (مسند ابی داؤد الطیالسی)

حضرت انس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ارشاد یہ ہے کہ چار آیات کے نزول میں (میرے رب نے میری موافقت فرمائی یا) میں نے اپنے رب کی موافقت کی۔

میں نے کہا یا رسول اللہ کاش کہ مقام ابراہیم کے پیچھے نماز پڑھتے، تو یہ آیۃ نازل ہوئی۔ ﴿وَاتَّخِذُوۡا مِنۡ مَّقَامِ اِبۡرٰهٖمَ مُصَلًّی﴾ اور آپ فرماتے ہیں۔ میں نے کہا یا رسول اللہ کاش کہ آپ کی ازواج مطہرات پردہ کریں، کیونکہ کئی نیک لوگ اور کئی برے لوگ ان کے سامنے آتے ہیں۔ تو رب تعالیٰ نے پردہ کا حکم اس آیۃ میں نازل فرمادیا۔

﴿وَاِذَا سَاَلۡتُمُوۡهُنَّ مَتَاعًا فَسۡـَٔلُوۡهُنَّ مِنۡ وَّرَآءِ حِجَابٍ﴾

اور جب یہ آیۃ نازل ہوئی ﴿وَلَقَدۡ خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ مِنۡ سُلٰلَةٍ مِّنۡ طِيۡنٍ﴾ تو میں نے رب تعالیٰ کی توصیف میں یہ پڑھا ﴿فَتَبَارَکَ اللّٰہُ اَحۡسَنُ الۡخَالِقِیۡنَ﴾ تو اللہ تعالیٰ نے یہ الفاظ مبارکہ نازل فرمائے ﴿فَتَبَارَکَ اللّٰہُ اَحۡسَنُ الۡخَالِقِیۡنَ﴾ اور آپ فرماتے ہیں کہ میں نبی کریم ﷺ کی ازواج کے پاس گیا اور میں نے کہا تو تم نبی کریم ﷺ سے ناراضگی کا کام چھوڑ دو، یا وہ تمہیں طلاق دے دیں اور رب تعالیٰ تم سے بہتر ازواج ان کو عطاء کردے، تو رب تعالیٰ نے میری تائید میں آیۃ نازل فرمادی۔ ﴿عَسٰی رَبُّہٗۤ اِنۡ طَلَّقَکُنَّ ...... الخ﴾

علامہ قرطبی فرماتے ہیں۔ بدر کے قیدیوں کے متعلق بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی رائے کے مطابق آیۃ نازل ہوئی، اس طرح پانچ مقام ہوگئے۔ (قرطبی)

تاہم علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے تاریخ الخلفاء میں اور مقامات کا بھی تذکرہ کیا، ایک قول کے مطابق اٹھارہ آیات آپ کی رائے کے مطابق نازل ہوئیں۔

مقام ابراہیم کیا ہے؟

مقام ابراہیم وہ پتھر ہے جس پر ابراہیم علیہ السلام نے اپنے پاؤں رکھے اور آپ کی بہو یعنی

حضرت اسماعیل علیہ السلام کی زوجہ نے آپ کے پاؤں کو دھویا۔

اور اسی پتھر پر آپ نے کھڑے ہو کر کعبہ شریف کی تعمیر کی۔ اور اسی پتھر پر کھڑے ہو کر تعمیر کعبہ کے بعد آپ نے لوگوں کو حج کے لئے دعوت دی۔

اس مسئلہ کو سمجھنے کے لئے تفصیلی واقعہ بخاری شریف سے پیش کیا جاتا ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا، کہ حضرت سارہ رضی اللہ عنہا اور حضرت ہاجرہ رضی اللہ عنہا کی کچھ چپقلش اور نوک جھوک کی وجہ سے رب تعالیٰ نے اپنے نبی کا امتحان لینے اور کعبہ شریف کی تعمیر اور مکہ شریف کو بسانے کے لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حکم دیا کہ اپنی زوجہ ہاجرہ اور اپنے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو وہاں چھوڑ دو جہاں آجکل کعبہ شریف اور مسجد حرام آباد ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام رب تعالیٰ کے حکم سے اپنی زوجہ اور اپنے بیٹے اسماعیل علیہ السلام کو لائے کعبہ شریف کے پاس مسجد میں زمزم کے مقام پر ان کو چھوڑا، اس وقت اسماعیل علیہ السلام شیر خوار (دودھ پیتے) بچے تھے، اس وقت نہ مکہ شریف تھا اور نہ ہی وہاں کوئی پانی تھا۔

ابراہیم علیہ السلام نے اپنی زوجہ اور اپنے بیٹے کو چھوڑتے وقت ان کے پاس ایک تھیلا رکھا، اسمیں کچھ کھجوریں تھیں، اور ایک چھوٹا سا مشکیزہ رکھا اس میں پانی تھا، اور آپ پیچھے کی جانب لوٹے، تو حضرت ہاجرہ نے آپ کا پیچھا کیا اور آپ کو کہا اے ابراہیم آپ ہمیں اس وادی میں کیوں چھوڑ کر جا رہے ہو جہاں کوئی مونس و غمخوار نہیں، اور کوئی چیز نہیں۔ کئی مرتبہ حضرت ہاجرہ نے یہ سوال کیا، لیکن آپ نے ان کی طرف کوئی توجہ نہ کی۔

" فقالت له الله امرک بهذا قال نعم قالت اذ لا یضیعنا "

تو حضرت ہاجرہ نے پھر آپ سے یہ پوچھا، کیا آپ ہمیں اللہ تعالیٰ کے حکم سے یہاں چھوڑ کر جا رہے ہو؟ آپ نے فرمایا ہاں، یعنی اللہ کے حکم سے چھوڑ کر جا رہا ہوں، تو حضرت ہاجرہ نے کہا ٹھیک ہے ہمیں اللہ تعالیٰ ضائع نہیں کرے گا۔ یعنی ہماری حفاظت فرمائے گا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے کام کو سن کر حضرت ہاجرہ اپنی جگہ پر چلی گئیں۔ حضرت ابراہیم علیہ

السلام بھی وہاں سے چلے گئے اور جب آپ وادی میں پہنچے جہاں سے آپ کو وہ جگہ نظر نہیں آ رہی تھی، تو آپ نے بیت اللہ شریف کی طرف متوجہ ہو کر ہاتھ اٹھا کر دعا کی۔

﴿ رَبَّنَا اِنِّیْ اَسْکَنْتُ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ بِوَادٍ غَیْرِ ذِیْ زَرْعٍ عِنْدَ بَیْتِکَ الْمُحَرَّمِ ط رَبَّنَا لِیُقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ فَاجْعَلْ اَفْئِدَۃً مِّنَ النَّاسِ تَھْوِیْ اِلَیْھِمْ وَارْزُقْھُمْ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّھُمْ یَشْکُرُوْنَ ﴾

(سورۃ ابراھیم ۳۷)

اے میرے رب میں نے اپنی کچھ اولاد ایک نالے میں بسائی، جس میں کھیتی نہیں ہوتی، تیرے حرمت والے گھر کے پاس، اے ہمارے رب اس لئے کہ وہ نماز قائم رکھیں تو تو لوگوں کے کچھ دل ان کی طرف مائل کر دے، اور انہیں کچھ پھل کھانے کو دے شائید وہ احسان مانیں۔

حضرت ہاجرہ اپنے بیٹے کو دودھ پلانے لگیں، اور آپ کے پاس جو تھوڑا سا پانی تھا وہ ختم ہو گیا۔ آپ کو بھی پیاس شدید لگ گئی۔ آپ کا بیٹا بھی بھوکا اور پیاسا ہو گیا۔

آپ ادھر ادھر دیکھنے لگیں کہ کوئی شخص نظر آئے، یا پانی کا کوئی اتہ پتہ چلے، آپ اسی بے قراری میں قریب ہی صفا پہاڑی پر چڑھ کر دیکھنے لگیں، کچھ پتہ نہ چلنے پر مروہ پہاڑی پر آ گئیں، درمیان میں جب وادی (نشیبی جگہ) میں پہنچیں جہاں بچہ نظر نہیں آ رہا تھا وہاں سے آپ تیز چلیں، جب بچہ نظر آنے لگا، آہستہ چلنے لگیں۔

مروہ پر بھی کچھ نظر نہ آیا، اسی بے قراری میں صفا سے مروہ اور مروہ سے صفا پر آپ نے سات چکر لگا ڈالے۔

حضرت ابن عباس فرماتے ہیں۔ " **قال النبی ﷺ فلذلک سعی الناس بینھما** "

نبی کریم ﷺ نے فرمایا اسی لئے لوگ صفا اور مروہ کے درمیان سعی کرتے ہیں۔

جب آپ کا ساتواں چکر مروہ پر مکمل ہوا تو آپ نے ایک آواز سنی، آپ نے اپنے آپ کو خطاب کرتے ہوئی کہا، ذرا رکو، سنو، یہ آواز کہاں سے آئی، دوسری مرتبہ پھر آواز آئی، تیسری مرتبہ پھر آواز آئی۔ آپ نے کہا اگر یہ فریاد رس کی آواز ہے تو وہ کوئی فرشتہ ہی ہو سکتا ہے۔

" **فبحث بعقبہ او قال بجناحہ حتی ظھر الماء** "

حضرت اسماعیل علیہ السلام کی ایڑی کی رگڑ سے، یا (حضرت ابن عباس فرماتے ہیں۔ نبی کریم ﷺ نے) فرمایا کہ فرشتے کے پر سے وہاں پانی نکل آیا۔

خیال رہے کہ راقم نے اس کا حسین امتزاج کیا ہے کہ ادھر حضرت اسماعیل علیہ السلام ایڑی رگڑ رہے تھے، اسی ایڑی رگڑنے کی جگہ فرشتے کو پر مارنے کے لئے حکم دیا گیا، تا کہ زمین نرم ہو جائے، دراصل حضرت اسماعیل علیہ السلام کا اعجاز ہی ہے آپ کے ایڑی رگڑنے سے ہی پانی نکلا۔

حضرت ہاجرہ پانی کا چلو بھرتیں تو نیچے سے پانی اور جوش مارتا آپ نے پانی کو روکنے کے لئے اردگرد مٹی کا بند باندھ دیا۔ اور پانی کو کہا ''زم زم'' رک جا رک جا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں، نبی کریم ﷺ نے فرمایا۔

" یرحم اللہ ام اسماعیل لو ترکت زمزم او قال لو لم تغرف من الماء لکانت زمزم عینا معینا "

اللہ تعالیٰ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی والدہ پر رحم فرمائے، اگر آپ پانی کے لئے ''زم زم'' کے لفظ نہ استعمال فرماتیں۔ یا حضور نے فرمایا، اگر آپ اس پانی سے (جلدی سے) چلو نہ بھرتیں تو وہ پانی بہت بڑا چشمہ ہوتا۔

یعنی وہ عظیم نہر کی شکل اختیار کر کے روئے زمین والے لوگوں کو سیراب کرتا۔

اس فرشتہ نے حضرت ہاجرہ کو کہا، تم ضائع ہونے (ہلاک ہونے) کا کوئی خوف نہ رکھو، بے شک یہاں بیت اللہ ہے۔

" یبنیہ ھذا الغلام و ابوہ وان اللہ لایضیع اھلہ "

جس کی تعمیر یہ بچہ اور اس کا باپ کریں گے، اللہ تعالیٰ اپنے مقربین کو ضائع نہیں کرتا۔

یہ بھی خیال رہے کہ بیت اللہ تو حضرت آدم علیہ السلام کے وقت سے تھا، جس کی تفصیل انشاء اللہ بعد میں ذکر کی جائے گی۔ لیکن اس وقت ایک ٹیلے کی شکل میں نظر آتا تھا، وادیوں کا بارشی پانی اس کے دائیں بائیں گذر جاتا تھا۔

وہاں سے جرہم (جیم پر ضمہ) قبیلہ کا گذر ہوا۔ وہ بھی بیابان جنگل میں پانی کو تلاش کر رہے تھے،

کہیں کچھ دور فاصلہ سے پرندوں کو ایک جگہ کے اوپر اڑتے ہوئے دیکھا تو انہوں نے سمجھ لیا کہ وہاں کوئی پانی ہوگا جہاں پرندے اڑ رہے ہیں، ان میں کچھ آدمی آئے تو دیکھا کہ پانی کا ایک چشمہ ہے۔ اس کے قریب ایک عورت اور ایک بچہ ہے۔

وہ لوگ واپس گئے اپنے قبیلے والے لوگوں کو بتایا کہ وہاں پانی ہے، اور پانی کے پاس ایک عورت اور ایک بچہ ہے، وہ تمام لوگ وہاں آ گئے۔ حضرت ہاجرہ کو کہا۔

"اتاذنین لنا ان ننزل عندک قالت نعم ولکن لا حق لکم فی الماء قالوا نعم"

کیا تم ہمیں اجازت دیتی ہو کہ ہم تمہارے پاس ہی یہاں ٹھہر جائیں۔ آپ نے فرمایا ٹھیک ہے۔ تم رہ جاؤ۔ لیکن پانی پر تمہارا حق نہیں ہوگا۔ انہوں نے کہا ٹھیک ہے۔

حضرت ہاجرہ بھی چاہتی تھیں کہ یہاں انسان رہیں۔ تا کہ ان سے انس ہو۔ اس طرح وہ تمام قبیلہ مرد، عورتیں، چھوٹے، بڑے وہاں آباد ہو گئے۔ یہی مکہ شہر کی گویا کہ ابتداء ہے۔ اور بعد میں حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام نے کعبہ شریف کی بھی تعمیر کر دی۔

حضرت اسماعیل علیہ السلام کی پہلے عبرانی زبانی تھی، لیکن بنی جرہم کی زبان عربی تھی، جب سے وہ لوگ وہاں آباد ہوئے تو آپ کا ان سے میل جول اکثر اوقات رہتا تو آپ نے بھی عربی زبان بولنی شروع فرما دی۔

حضرت اسماعیل علیہ السلام جب جوان ہو گئے تو بنی جرہم نے ہی اپنے خاندان کی ایک لڑکی سے آپ کی شادی کر دی حضرت ہاجرہ رضی اللہ عنہا کا وصال ہو گیا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دل میں تمنا واقع ہوئی کہ میں اپنی زوجہ اور بیٹے کو مل کر آؤں۔ (یقینی بات ہے کہ وہاں چھوڑا بھی رب تعالیٰ کے حکم سے تھا، اور ملنا بھی اسی کی اجازت سے تھا، اس سے پہلے اجازت ہی نہیں ملی، اب اجازت ملی) آپ آئے تو آپ کو پتہ چلا کہ حضرت اسماعیل کی شادی ہو چکی ہے۔ آپ ان کی زوجہ کو ملے اس سے اسماعیل علیہ السلام کے متعلق پوچھا، تو اس نے بتایا۔ "خرج یبتغی لنا، وفی روایۃ ذھب یصید لنا" کہ وہ باہر کہیں گئے ہیں کہ ہمارے لئے کوئی رزق تلاش

کر کے لائیں۔اورایک روایت میں ہے کہ وہ ہمارے لئے شکار کرنے گئے ہیں۔

آپ نے اس عورت سے ان کے گذراوقات کے متعلق سوال کیا،تو اس نے بتایا" نحن فی ضیق و شدة " ہم تنگ حالی اور شدید پریشانی کی زندگی گذار رہے ہیں۔یعنی ہماری گذراوقات تنگی سے ہورہی ہے۔

اس کی اس شکایت کو اور رب تعالیٰ کی ناشکری کو ابراہیم علیہ السلام نے پسند نہ فرمایا۔کہ نبی کی زوجہ کو حق نہیں پہنچتا کہ وہ رب تعالیٰ کے فیصلہ کے خلاف شکایت کرے۔

" فقال اذا جاء زوجک اقرئی علیه السلام وقولی له یغیر عتبة بابه "

تو آپ نے فرمایا جب تمہارے خاوند آئیں تو ان کو میرا سلام کہنا،اور ان کو کہنا کہ تم اپنے دروازہ کی دہلیز بدل دو۔

حضرت اسماعیل علیہ السلام جب واپس آئے تو آپ کو محسوس ہوا کہ آج کوئی بزرگ شخصیت ہمارے گھر آئی۔تو آپ نے پوچھا کیا کوئی شخص آج آیا تھا۔آپ کی زوجہ نے بتایا کہ ہاں ایک شخص بزرگ قسم کے تشریف لائے تھے،انہوں نے تمہارے متعلق پوچھا،تو میں نے ان کو بتایا کہ وہ شکار کے لئے گئے ہیں۔پھر انہوں نے ہماری گذراوقات کے متعلق پوچھا تو میں نے ان کو بتایا کہ ہم تنگ حالی کی زندگی بسر کررہے ہیں۔

حضرت اسماعیل علیہ السلام نے پوچھا کیا وہ تمہیں کوئی وصیت بھی کر کے گئے ہیں؟اس نے کہا ہاں وہ مجھے کہہ گئے تھے کہ میں ان کا سلام تمہیں پہنچاؤں،اور یہ بھی کہہ گئے تھے کہ گھر کے دروازہ کی دہلیز بدل دو

حضرت اسماعیل علیہ السلام نے بتایا۔" ذلک ابی وقد امرنی ان افارقک الحقی باهلک فطلقها " کہ وہ میرے باپ تھے وہ مجھے حکم دے گئے کہ میں تمہیں جدا کردوں،آپ نے اسے طلاق دے دی اور کہا تم اپنے قبیلہ والوں سے مل جاؤ۔

آپ نے اسی قبیلہ کی ایک اور عورت سے شادی کرلی،کچھ عرصہ کے بعد حضرت ابراہیم علی علیہ السلام پھر تشریف لائے،اتفاقی طور پر پھر حضرت اسماعیل علیہ السلام سے ملاقات نہ ہوسکی۔ان کی زوجہ

سے ملکران کے متعلق پوچھا تو اس نے بتایا کہ وہ روزی کی تلاش کے لئے باہر تشریف لے گئے۔ آپ نے اس سے گذر اوقات کے متعلق پوچھا تو اس نے کہا۔ " **نحن بخیر وسعة وا ت علی اللہ عزوجل** " ہم بہتر حال میں ہیں اللہ تعالیٰ کی رحمت ہم پر ہے۔ ساتھ ہی اللہ تعالیٰ کی حمد وثنہ کی۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس سے پوچھا تمہارا طعام کیا ہے، تو اس نے بتایا کہ ہمارا طعام (شکارکا) گوشت اور زمزم کا پانی، تو آپ نے دعاء فرمائی۔ " **اللھم بارک لھم فی طعامھم و شرابھم** " اے اللہ ان کو طعام اور پانی میں برکت عطاء فرما۔

ابراہیم علیہ السلام نے اسے کہا جب تمہارے خاوند آئیں ان کو میرا سلام کہنا، اور کہنا کہ تمہارے گھر کے دروازہ کی چوکھٹ اچھی ہے، اسے قائم رکھنا۔

اسماعیل علیہ السلام واپس آئے تو آپ نے محسوس کیا کہ کوئی بزرگ آئے تھے۔ آپ نے اپنی زوجہ سے پوچھا کیا کوئی بزرگ آئے تھے۔ اس نے بتایا ہاں ایک خوبصورت چہرے والے بزرگ تشریف لائے تھے۔

آپ نے پوچھا، کیا وہ کوئی پیغام بھی دے کر گئے ہیں۔ تو آپ کی زوجہ نے انہیں بتایا کہ وہ تمہیں سلام کہنے کے متعلق ارشاد فرما کر گئے، اور یہ کہہ گئے کہ تمہارے گھر کے دروازہ کی دہلیز (نیچے والی چوکھٹ) اچھی ہے اسے قائم رکھنا۔

حضرت اسماعیل علیہ السلام نے فرمایا کہ وہ میرے باپ ہیں جو تمہارے متعلق وصیت فرما گئے ہیں کہ میں تمہیں اپنے پاس ہی رکھوں۔

حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اس دوسری زوجہ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ملاقات کے دوران کہا کہ آپ سواری سے نیچے اتریں، لیکن آپ سواری سے نیچے نہ اترے، آپ کی نیک پارسا بہو نے ایک پتھر لا کر آپ کے دائیں پاؤں کے نیچے رکھ کر دھویا، پھر وہی پتھر دسرے پاؤں کے نیچے رکھ کر دھویا۔

یہ پہلی مرتبہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا مقام ابراہیم پر کھڑا ہونا تھا۔ کہ آپ نے اس پر یکے بعد دیگرے کھڑے ہو کر پاؤں کو دھلوایا۔

پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام تیسری مرتبہ تشریف لائے، اس مرتبہ آپ نے خیال کیا اب اسماعیل علیہ السلام کو مل کر ہی جاؤں گا۔ آپ کعبہ شریف کے پاس ہی رک گئے۔ کچھ دیر بعد اسماعیل علیہ السلام آ گئے۔ زمزم کے قریب تیر درست کرنے لگے، باپ بیٹے نے ایک دوسرے کو دیکھا، گلے لگ کر ملے۔

دوسری مرتبہ مقام ابراہیم پر کھڑا ہونا اس وقت ثابت ہے جب کہ آپ کعبہ شریف کی تعمیر کر رہے تھے، آپ اس پتھر پر کھڑے ہوتے تو وہ نرم ہو جاتا، تا کہ آپ کے پاؤں کو تکلیف نہ ہو، اس پتھر پر آپ کے قدموں کے نشان پڑ گئے۔ (ماخوذ از خازن)

☆ " عن انس قال رأيت في المقام اثر اصابعه وعقبه و اخمص قدميه غير انه اذهبه مسح الناس بايديهم "

حضرت انس ﷺ فرماتے ہیں میں نے مقام ابراہیم میں ابراہیم علیہ السلام کے پاؤں مبارک کی انگلیوں اور ایڑیوں اور قدم کے تلوے اور ایڑی کے درمیان والے حصہ کے نشانات کو دیکھا، لیکن لوگوں کے اسے ہاتھ لگانے (اور چومنے) سے اس سے نشانات مٹ گئے ہیں۔ (قرطبی)

تیسری مرتبہ آپ مقام ابراہیم پر اس وقت کھڑے ہوئے جب آپ کعبہ شریف کی تعمیر سے فارغ ہوئے، تو آپ مقام ابراہیم کو ساتھ لے گئے، جبل ابی قبیس پر کھڑے ہو کر۔ " نادی ایها الناس حجوا بيت ربكم " نداء دی اے لوگو اپنے رب کے گھر کا حج کرو۔

یہ بھی خیال رہے کہ آپ جب اس پتھر پر کھڑے ہو کر کعبہ شریف کی تعمیر کرتے تو فارغ ہونے پر پتھر کو ایک طرف رکھ دیتے تھے۔ اس پتھر کو رکھنے کی کوئی معین جگہ نہ تھی، ابراہیم علیہ السلام کے بعد یہ کعبہ شریف کے اندر بھی رہا۔

البتہ بعد میں " وضع بعيدا من الحجر الاسود بسبعة وعشرين ذراعا " اس کو حجر اسود سے ستائیس ذراع دور رکھ دیا گیا۔ (روح المعانی)

اب بھی تقریباً وہیں ہے۔ چار پانچ فٹ بلند گول خول میں بند ہے، جسے شیشہ لگا ہوا ہے۔ چلتے چلتے کچھ نظر آ جاتا ہے۔ لیکن اسکے پاس کھڑے ہو کر غور سے دیکھنے کی سعودیہ کے خدام اجازت نہیں دیتے۔

حجر اسود اور مقام ابراہیم جنتی یاقوت ہیں:

"عن عبداللہ بن عمرو بن العاص قال سمعت رسول اللہ ﷺ یقول ان الرکن والمقام یاقوتان من یاقوت الجنة طمس اللہ نورھما ولو لم یطمس نورھما لاضاء ما بین المشرق والمغرب"

(اخرجہ الترمذی)

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص ؓ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے میں نے سنا کہ بے شک حجر اسود اور مقام ابراہیم جنت کے یاقوتوں میں سے یاقوت ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کے نور کو مٹا دیا ہے۔ اگر ان کا نور محو نہ کیا جاتا تو یہ مشرق و مغرب کے درمیان روشنی پھیلاتے۔

ترمذی نے بیان کیا ہے کہ یہی حدیث حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے موقوف طریقہ سے بھی ثابت ہے۔ (خازن)

تعمیر کعبہ:

آدم علیہ السلام کی تعمیر: ابن عساکر وغیرہ نے بیان کیا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام جب جنت سے تشریف لائے تو بارگاہ الٰہی میں عرض کیا کہ خدایا میں یہاں نہ تو ملائکہ کی تسبیح و تکبیر سنتا ہوں اور نہ کوئی عبادت گاہ دیکھتا ہوں، جیسے کہ آسمان میں بیت المعمور دیکھتا تھا۔ جس کے ارد گرد ملائکہ طواف کرتے تھے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا جاؤ جہاں ہم نشان بتاتے ہیں وہاں کعبہ بنا کر اس کے ارد گرد طواف بھی کرلو اور اس کی طرف نماز بھی ادا کرو۔ حضرت جبرائیل آدم علیہ السلام کی رہبری کے لئے ان کے ساتھ چلے اور انہیں وہاں لائے جہاں سے زمین بنی تھی یعنی کعبہ کی جگہ سے ہی سب سے پہلے پانی پر جھاگ، پھر جھاگ سے زمین کی ابتداء ہوئی۔

جبرائیل نے وہاں اپنا پر مار کر ساتویں زمین تک بنیاد ڈال دی جس کو ملائکہ نے پانچ پہاڑوں کے پتھروں سے بھرا، وہ یہ ہیں۔ کوہ لبنان، کوہ طور، جودی، حرا اور طور زیتا۔

بنیاد بھر کر نشان کے لئے ہر چار طرف کو دیوار اٹھا دی، اس طرف منہ کر کے آدم علیہ السلام نماز پڑھتے رہے، اور اس کا طواف بھی کرتے رہے۔ بعض روایات میں آیا ہے کہ بیت المعمور کو اس بنیاد پر

رکھ دیا گیا۔

طوفان نوح میں بیت المعمور کو اٹھا لیا گیا اور کعبہ کی جگہ اونچے ٹیلے کی طرح رہ گئی، لوگ یہاں آتے رہے، اور برکت کی دعاء کرتے رہے۔ (از عزیزی)

☆ " عن ابن عباس رضی الله عنهما قال علیه السلام اول بقعة وضعت فی الارض موضع البیت ثم مدت منها الارض وان اول جبل وضعه الله تعالی علی وجه الارض ابوقبیس ثم مدت منه الجبال "

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا سب سے پہلے زمین کا وہ حصہ بنایا گیا جو کعبہ شریف کا مقام ہے پھر اسی سے اور زمین کو پھیلایا گیا۔ اور بے شک سب سے پہلے پہاڑ جس کو زمین پر رکھا گیا وہ ابوقبیس ہے۔ اور اسی سے پھر اور پہاڑ پھیلائے گئے۔ (از کبیر)

روایت میں ذکر ہے۔" فحج آدم البیت من الهند اربعین سنة " آدم علیہ السلام نے ہند سے بیت اللہ شریف کے چالیس حج کئے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کعب سے سوال کیا یہ بیت اللہ کس طرح کا تھا؟ مطلب سوال کا یہ تھا کہ جب مشہور یہ ہے کہ بیت اللہ شریف کی تعمیر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کی تو اس وقت کیا صورت ہوگی۔

تو انہوں نے جواب دیا" ان هذا البیت انزله الله من السماء یا قوتة مجوفة " بیشک اس وقت بیت اللہ شریف کی یہ موجودہ حالت نہیں تھی بلکہ اللہ تعالیٰ نے آسمانوں سے یاقوت کا خول جو بیت کی طرح تھا اتار کران بنیادوں پر رکھ دیا تھا جو فرشتوں نے کھودی تھیں۔

خیال رہے کہ اس روایت کے مطابق بیت المعمور کو آسمانوں سے زمین پر نازل نہیں کیا گیا۔ بلکہ آسمانوں سے یاقوت جو بیت کی طرح تھا اسے نازل کیا گیا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

☆ " وعن علی رضی اللہ عنہ قال البیت المعمور بیت فی السماء وهو بحیال الکعبة من فوقها حرمته فی السماء کحرمة البیت فی الارض یصلی فیه کل یوم سبعون من الملائکة لایعودون فیه ابدا "

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا'' البیت المعمور'' آسمانوں میں ایک گھر ہے، وہ کعبہ شریف کی بالکل

سیدھ پر آسمانوں پر واقع ہے۔اس کی عزت آسمانوں میں ایسے ہی ہے جیسے زمین میں بیت اللہ شریف کی ہے۔اس میں ہر دن ستر ہزار فرشتے نماز پڑھتے ہیں۔ جوایک دفعہ نماز ادا کر لیتے ہیں۔ پھران کو کبھی دوبارہ نماز ادا کرنے کا موقع نہیں ملے گا۔یعنی فرشتوں کی بہت زیادہ تعداد کی وجہ سے ان کو دوبارہ موقع نہیں ملے گا۔ (از کبیر)

ابراہیم علیہ السلام کی تعمیر:

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب حضرت ہاجرہ اوراپنے بیٹے اسماعیل کو یہاں چھوڑااور یہاں آبادی ہوگئی تو ابراہیم علیہ السلام کوحکم دیا گیا کہ اسماعیل کوساتھ لے کر کعبہ تعمیر کرو،ایک بادل کاٹکڑا بھیج کر کعبہ کی حدکوواضح کیا گیا۔اور جبرائیل نے خط کھینچ دیا۔حضرت ابراہیم علیہ السلام نے آدم علیہ السلام کے زمانہ کی بنیادوں پر ہی عمارت تعمیر فرمائی۔کعبہ شریف کی بلندی نو ہاتھ۔رکن اسود سے رکن شامی تک ۳۲ ہاتھ۔رکن غربی سے رکن یمانی تک ۳۱ ہاتھ،رکن یمانی سے رکن اسود تک ۲۰ ہاتھ۔رکن شامی سے رکن غربی تک ۲۲ ہاتھ۔

یعنی کعبہ اس وقت مستطیل تھا۔لیکن طول اور عرض کی ایک ایک دیوار معمولی چھوٹی تھی۔ دروازے دو بنائے گئے،جوزمین کے ساتھ ملے ہوئے تھے۔کواڑ،زنجیروغیرہ نہیں تھے۔بعد میں تبع حمیری کے زمانہ میں کواڑ زنجیر وغیرہ لگائے گئے۔

ابراہیم علیہ السلام نے کعبہ شریف کوتعمیر فرمایااوراسماعیل علیہ السلام پتھراور گارہ وغیرہ دیتے تھے۔ سبحان اللہ کس شان سے اللہ کا گھر تعمیر ہوا۔اللہ کا نبی ہی معماراوراللہ کا نبی ہی معاون۔ (از عزیزی،نعیمی)

خیال رہے کہ اوپر جو رکن کا لفظ استعمال ہوا ہے۔اس سے مراد کونہ،رکن اسود سے مراد وہ کونہ ہے دیوار کا جس میں حجر اسود نصب ہے۔اسی طرح ہاتھ سے مراد انگلیوں سے لے کر کہنیوں تک لمبائی یعنی تقریباً ڈیڑھ فٹ،۲۰ ہاتھ کا مطلب تیس فٹ۔

ابراہیم علیہ السلام کی تعمیر کے بعد:

آپ کی تعمیر کے بعد جزوی طور پر مختلف اوقات میں تعمیر ہوتی رہی۔ ایک مرتبہ عمالقہ اور جرہم نے اسے تعمیر کیا۔ اس کے بعد قصی بن کلاب نے اس کی تعمیر کی جس میں چھت درخت مقل کی لکڑی کی بنائی جس پر بجائے تختوں کے خرمے کی لکڑی ڈالی۔

قریش کی تعمیر:

ایک عورت کعبہ شریف میں خوشبو سلگاتی تھی، ایک بار اچانک اس سے شعلہ اٹھا اور چھت جل گئی۔ اور دیواریں پہلے بوسیدہ ہو چکی تھیں۔ اس لئے قریش نے فیصلہ کیا کہ مکمل طور پر نئی تعمیر کی جائے۔

ولید بن مغیرہ کو عمارت کا امیر مقرر کیا گیا اور یہ طے ہوا کہ اس میں حلال مال خرچ ہوگا۔ اس وقت کے امیر لوگوں کے پاس زیادہ سود کے مال سے حاصل کردہ مال ہوتا تھا۔ اس لئے حلال مال کم مقدار میں جمع ہوا۔ قریش نے مال کی کمی اور کچھ اپنے مقاصد کے پیش نظر چند فرق کر دئے۔

۱) کعبہ کی کچھ زمین باہر نکال دی یعنی عمارت کو چھوٹا کر دیا۔ کعبہ سے باہر نکالی ہوئی زمین کو حطیم کہا جاتا ہے اسی میں میزاب رحمت (پرنالہ) گرتا ہے۔ چھوٹی چھوٹی دیوار سے آج بھی اسے علیحدہ نمایاں کیا ہوا ہے۔ طواف اس کے باہر سے ہی ہوتا ہے۔

۲) قریش نے دو دروازوں کے بجائے ایک کر دیا۔ وہ بھی بہت بلند تا کہ جسے چاہیں اندر جانے دیں۔ اور جسے چاہیں نہ جانے دیں۔ اب بھی اس پر عمل ہو رہا ہے۔ بادشاہوں کے لئے دروازہ کھلتا ہے خواہ وہ کتنے ہی بدکار کیوں نہ ہوں، صلحاء اتقیاء کے لئے کبھی دروازہ کھلنے کی خبر نہیں سنی گئی۔

۳) خانہ کعبہ کے اندر لکڑی کے ستونوں کی دو صفیں بنائی گئیں۔ ہر صف میں تین ستون بنائے گئے

۴) کعبہ شریف کی بلندی پہلے سے دوگنا کر دی گئی۔ پہلے بلندی نو ہاتھ تھی، انہوں نے اٹھارہ ہاتھ کر دی۔

۵) خانہ کعبہ کے اندر رکن شامی کے قریب ایک زینہ بنایا گیا جس سے چھت پر چڑھ سکیں۔

حضرت عبداللہ بن زبیر کی تعمیر:

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ نے کعبہ کے متصل بنیاد ابراہیمی (یعنی حطیم) کے پتھر مجھے دکھائے اور فرمایا کہ قریش نے اس میں کمی کر دی تھی، لوگ اگر نئے نئے مسلمان نہ ہوتے اور ان کے جذبات بھڑکنے کا اندیشہ نہ ہوتا تو میں ابراہیمی بنیادوں پر کعبہ دوبارہ تعمیر کر دیتا۔

اسی روایت کی بنیاد پر حضرت عبداللہ بن زبیر نے کعبہ شریف کو منہدم کر کے دوبارہ تعمیر کیا، حطیم کو کعبہ میں داخل کیا، دروازے دو بنائے جو زمین کے متصل تھے، خوشبودار مٹی چونہ میں ملا کر گارا لگایا گیا، دروازوں پر اندر باہر عنبر لگا کر خوشبودار کیا گیا، نہایت قیمتی ریشمی غلاف چڑھایا گیا۔ خیال رہے کہ سب سے پہلے کعبہ شریف کو غلاف چڑھانے والے کا نام اسعد ہے جو شاہ یمن تھا اور تبع کے لقب سے مشہور تھا۔ مدینہ طیبہ کی شہری بنیاد رکھنے والا یہی ہے۔

عبداللہ بن زبیر کی تعمیر ۲۷ رجب ۶۴ھ کو مکمل ہوئی۔ پھر حجاج بن یوسف (جو عبدالمالک بن مروان کا نائب تھا) نے ۷۴ھ میں عمارت کو منہدم کر کے پھر اسی طرح بنا دیا جیسے قریش نے بنایا تھا۔

پھر ہارون الرشید نے چاہا کہ کعبہ اس طرح بنا دیا جائے جیسے عبداللہ بن زبیر نے تعمیر کیا تھا، یعنی دراصل وہی ابراہیمی تعمیر بھی تھی۔ لیکن اس وقت کے اہل علم نے اس سے منع کیا کہ کوئی تمہارا مخالف آئے گا۔ وہ پھر تبدیل کر دے گا۔ اس طرح گرانا اور بنانا ایک کھیل بن جائے گا۔

اس کے بعد کئی مرتبہ مرمت ہوتی رہی۔ لیکن مکمل طور پر پوری عمارت کو دوبارہ نہیں بنایا گیا۔

کعبہ کی موجودہ تعمیر:

۱۰۴۰ھ میں سلطان مراد بن احمد خان شاہ قسطنطنیہ نے جب دیکھا کہ اس کی عمارت بہت پرانی ہو گئی ہے۔ تو اس نے سوائے رکن حجر اسود (وہ کونہ جس میں حجر اسود نصب ہے) کے تمام عمارت منہدم کر

کے نئی تعمیر کرائی۔

لیکن انہی بنیادوں اور اسی طرز پر جو حجاج بن یوسف نے بنائی تھی، اندر سنگ مرمر کا فرش بچھایا، اور اندر چھت پر نہایت نفیس مخملی چھت گیری لگائی۔ اور باہر کی دیواریں سنگ خارا سے چونہ میں چنیں۔ نہایت نفیس ریشمی سیاہ پردہ تمام خانہ کعبہ پر ڈالا جس پر کلمہ " **لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ ﷺ** " لکھا ہوا تھا۔ اور سنہری حاشیہ پر سلطان کا نام تھا۔

موجودہ کعبہ سلطان مراد کا بنا ہوا ہے، یعنی مکمل عمارت کو منہدم کر کے اس کے بعد نئے سرے سے تعمیر نہیں کیا گیا۔ یعنی اب کعبہ ان بنیادوں پر ہی ہے جو نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں تھیں۔

(ماخوذ از عزیزی و نعیمی)

تنبیہ : شیخ احمد بیہقی رحمہ اللہ نے کتاب شعب الایمان میں حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ذکر کی، وہ کہتے ہیں میں نے کہا یا رسول اللہ سب سے پہلے زمین میں کون سی مسجد بنائی گئی؟

" **قال المسجد الحرام قال قلت ثم ایّ ؟ قال ثم المسجد الاقصی قلت کم بینھما ؟ قال اربعون سنة فاینما ادرکتک الصلوۃ فصل فھو مسجد** "

آپ نے فرمایا مسجد حرام، انہوں نے پھر پوچھا اس کے بعد تو آپ نے فرمایا مسجد اقصیٰ، یہ کہتے ہیں، میں نے پھر پوچھا ان دونوں میں کتنا فاصلہ ہے؟ تو آپ نے فرمایا چالیس سال، پھر آپ نے فرمایا جہاں بھی تمہیں نماز کا وقت آجائے وہاں ہی نماز ادا کر لیا کرو وہی مسجد ہے۔

اس حدیث پاک سے مراد سب سے پہلے انسانوں کی طرف سے تعمیر ہونے والی مسجد کے لئے آپ نے بیان فرمایا۔ کیونکہ آدم علیہ السلام کے دور میں تو جنتی یاقوت یا بیت المعمور کو بنیادوں پر رکھ دیا گیا تھا۔ اس کے بعد سب سے پہلے بننے والی مسجد حرام ہے۔ جو ابراہیم علیہ السلام نے تعمیر فرمائی۔ اور مسجد اقصیٰ سب سے پہلے حضرت اسحاق علیہ السلام نے تعمیر فرمائی۔ سلیمان علیہ السلام نے بہت دیر بعد اس کی نئی تعمیر کی۔

اس لئے چالیس سال کا وقفہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسحاق علیہ السلام کی تعمیروں کے درمیان ہے۔

﴿ وَعَهِدْنَا اِلٰى اِبْرَاهِيمَ وَ اِسْمٰعِيلَ اَنْ طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِينَ وَالْعٰكِفِينَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ﴾

اور ہم نے تاکید فرمائی ابراہیم اور اسماعیل کو کہ ستھرا کریں میرے گھر کو طواف کرنے والوں اور اعتکاف والوں اور رکوع کرنے والوں، سجدہ کرنے والوں کے لئے۔

وَعَهِدْنَا: " الزمنا هما ذلک ، وامرنا هما امرا ، وثقنا عليهما فيه " ہم نے لازم کیا ابراہیم اور اسماعیل پر اور ہم نے حکم دیا ان دونوں کو، اور پختہ وعدہ لیا ان دونوں سے اس کا، یعنی ان دونوں کو تاکید فرمائی۔" وقيل اوحينا "بعض حضرات نے یہ معنی بھی یہاں کیا کہ ہم نے وحی کی ابراہیم اور اسماعیل کی طرف۔ (کبیر)

مطلب تمام معانی کا ایک ہی ہے، کہ ہم نے بذریعہ وحی ان کو تاکیدی حکم دے کر ان پر لازم کر دیا۔

اَنْ طَهِّرَا بَيْتِيَ : (ستھرا رکھیں میرے گھر کو)

" فيجب ان يراد به التطهير من كل امر لايليق بالبيت "

حضرت ابراہیم علیہ السلام اور اسماعیل علیہ السلام کو رب تعالیٰ نے جو تاکیدی حکم فرمایا کہ میرے گھر کو پاک اور صاف ستھرا رکھو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر وہ چیز جو اللہ کے گھر کے لائق نہیں اس سے اللہ کے گھر کو پاک رکھو۔ جب بیت اللہ شریف کا مقام اور اس کا ارد گرد نماز ادا کرنے کے لئے ہے۔

" وجب تطهيره من الانجاس والاقذار" تو ضروری ہے کہ اسے نجاست اور ہر قسم کی گندگی سے پاک رکھا جائے یہی حکم ہر مسجد کا ہے تاکہ اللہ کے گھر کا تقدس قائم رہے۔

"واذا كان موضع العبادة والاخلاص لله تعالى وجب تطهيره من الشرک و عبادة غير الله تعالیٰ "

اور جب عبادت اور اخلاص اللہ تعالیٰ کے لئے ہے تو ضروری ہے کہ اللہ کے گھر کو شرک اور غیر اللہ کی عبادت سے پاک رکھا جائے۔ یعنی اللہ کا گھر ظاہری اور باطنی گندگی سے پاک ہو، نہ اس میں شرک ہو، اور نہ اس میں گندگی کے ڈھیر لگے ہوں، ہر قسم کے خس وخاشاک سے پاک رکھنا ضروری ہے (از کبیر)

" (اَنْ طَهِّرَا بَيْتِيَ) اى من الاوثان والرفث وقول الزور والرجس "

ہم نے ابراہیم اور اسماعیل کو تاکید فرمائی کہ میرے گھر کو بت پرستی اور بے حیائی، اور جھوٹے کلام اور نجاست سے پاک رکھنا۔

"قال مجاھد وعطاء و قتادة (اَنْ طَهِّرَا بَيْتِیَ) بلا اله الا الله من الشرک"

حضرت مجاہد اور عطاء اور قتادہ رحمہم اللہ فرماتے ہیں کہ رب تعالیٰ نے ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام کو جو اپنا گھر پاکیزہ رکھنے کا حکم دیا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ " لاالــہ الا اللہ " اس گھر میں پڑھ کر شرک سے پاک رکھو۔ (صابونی)

سبحان اللہ کیا خوب مسئلہ حل ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ کا ذکر اس کے گھر میں کرنے سے رب کا گھر پاک رہتا ہے، رب کے ذکر سے روکنے والے کیا شرک سے آلودہ ہی رکھنا چاہتے ہیں۔

آیئے معتبر تفاسیر کے بعد مودودی صاحب کے زہر آلود کلام کو بھی دیکھئے کہ اصل مقصد سے ہٹ کر وہ انبیاء کرام اور اولیاء کرام پر کیسے خفیہ تیر چلاتے ہیں۔

مودودی صاحب فرماتے ہیں: "پاک رکھنے سے مراد صرف یہی نہیں ہے کہ کوڑے کرکٹ سے اسے پاک رکھا جائے، خدا کے گھر کی اصل پاکی یہ ہے کہ اس میں خدا کے سوا کسی کا نام بلند نہ ہو۔ جس نے خانہ خدا کے سوا کسی دوسرے کو مالک، معبود۔ حاجت روا اور فریاد رس کی حیثیت سے پکارا، اس نے حقیقت میں اسے گندا کر دیا۔ (تفہیم)

راقم کی ﴿ اِيَّاکَ نَعْبُدُ وَاِيَّاکَ نَسْتَعِيْنُ ﴾ کی وضاحت میں ابحاث کو دیکھیں تو آپ کو پتہ چل جائے گا کہ مسلمان اہلسنت کس طرح انبیاء کرام اور اولیاء کرام کو حاجت روا اور فریاد رس مانتے ہیں۔

تیری اٹکے تو وکیلوں سے کرے استمداد
یا محمد سے بگڑتی ہے طبیعت تیری

اعتراض : بیت اللہ شریف کو پاک اور صاف ستھرا کرنے کا حکم دینے کا کیا مطلب ہے؟ کیا اس سے پہلے بیت اللہ شریف میں بت پرستی تھی یا وہاں گندگی ڈالی جاتی تھی۔

جواب : یہ کلام اس طرح ہے جیسا کہ کوئی شخص کنواں کھودنے لگے تو اسے کہا جائے۔ " ضیق فم الرکیة " کنویں کا منہ تنگ رکھنا اس کا مطلب یہ ہے کہ ابتدائی طور پر ہی منہ تنگ رکھنا، اس کا یہ مطلب

نہیں، کہ پہلے منہ کھلا رکھنا پھر تنگ کرنا۔

اسی طرح یہاں حکم دیا گیا کہ تم تعمیر کے وقت ہی اسے پاک اور صاف ستھرا بنانا، اعلان فرمانا کہ نوح علیہ السلام کی قوم کی طرح بت پرستی نہ کرنا، اور جیسے وہ عبادت خانوں میں بت رکھ دیتے تھے اے قوم تم ایسا نہ کرنا۔

اور ابراہیم علیہ السلام اور اسماعیل علیہ السلام کو آنے والے لوگوں کی تعلیم کیلئے حکم دیا گیا کہ تم بیت اللہ کو طہارت قلبی یعنی تقوی کے طور پر تعمیر کرنا۔ اللہ تعالیٰ کے انبیاء کرام کے افعال میں تقوی کے خلاف کا تصور تو ممکن ہی نہیں۔ البتہ بعد میں آنے والوں لوگوں کی تعلیم کیلئے ان حضرات کو یہ حکم دیا گیا۔
(ماخوذ از شیخ زادہ و کبیر)

لِلطَّآئِفِينَ وَالْعٰكِفِينَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ :

طواف کرنے والوں اور اعتکاف کرنے والوں اور رکوع و سجود کرنے والوں کے لئے۔

طواف کرنے والوں سے مراد وہ لوگ ہیں جو بیت اللہ شریف میں حج اور عمرہ کی غرض سے آتے ہیں اور طواف کرتے ہیں۔ یہ بھی خیال رہے کہ مکہ والے حضرات اکثر طور پر نمازوں کے اوقات میں طواف کرتے رہتے ہیں، اسلئے مراد مطلق طواف بھی ہوسکتا ہے۔ ضروری نہیں کہ حج اور عمرہ کا طواف ہی ہو۔

(اَلْعَاكِفِينَ) سے مراد مسجد حرام یا بیت اللہ شریف کے اندر اعتکاف کرنے والے لوگ ہیں۔ یہ خیال رہے کہ " عکف " ضرب اور نصر دونوں بابوں پر آتا رہتا ہے۔ معنی اس کا " لزم الشیٔ واقام علیه " کسی چیز کو لازم پکڑنا اور اس پر قائم رہنا ہے۔

(وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ) سے مراد وہاں نماز پڑھنے والے لوگ ہیں۔ (از کبیر بزیادۃ)

مسئلہ : "ان الطواف للغرباء افضل من الصلوٰة" باہر سے آنے والے لوگوں کے لئے طواف کرنا افضل ہے نماز سے۔ (کبیر)

وجہ اس کی واضح ہے کہ باہر سے آنے والوں کو روز روز آنا تو نصیب نہیں ہوتا۔ اس لئے وہ اس وقت کو غنیمت سمجھتے ہوئے جتنا ممکن ہوسکے طواف ہی کریں۔ شامی نے بھی یہی بیان کیا ہے جو راقم نے

نورالایضاح کے حاشیہ ذریعۃ النجاح میں بیان کیا ہے۔

مسئلہ : "تدل الآیۃ علی جواز الصلوٰۃ فی البیت فرضا کان او نفلا" آیۃ کریمہ سے یہ بھی واضح ہو رہا ہے کہ بیت اللہ شریف میں اعتکاف بیٹھنا جائز ہے۔ (کبیر)

مسئلہ : "تدل الآیۃ علی جواز الاعتکاف فی البیت" آیۃ کریمہ سے یہ بھی واضح ہو رہا ہے کہ بیت اللہ شریف میں نماز جائز ہے خواہ فرض ہو یا نفل۔ (کبیر)

"عن ابن عمر قال دخل رسول اللہ ﷺ ھو واسامۃ بن زید و بلال و عثمان بن طلحۃ الحجبی البیت فاغلقوا علیھم الباب فلما فتحوا کنت اول من ولج فلقیت بلالا فسألتہ ھل صلی فیہ رسول اللہ ﷺ قال نعم بین العمودین الیمانیین" (بخاری، مسلم)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ اور اسامہ بن زید اور بلال اور عثمان بن طلحہ حجبی رضی اللہ عنہم بیت اللہ شریف میں داخل ہوئے، دروازہ بند کر دیا گیا۔ جب ان حضرات نے دروازہ کھولا تو سب سے پہلے میں داخل ہوا، اور حضرت بلال کو ملا، ان سے پوچھا کیا رسول اللہ ﷺ نے بیت اللہ شریف کے اندر نماز پڑھی ہے؟ انہوں نے کہا ہاں آپ نے دو یمنی ستونوں کے درمیان نماز پڑھی۔ مسلم میں یہ الفاظ مبارکہ زائد ہیں۔

" جعل عمودین عن یسارہ و عمودا عن یمینہ و ثلاثۃ اعمدۃ وراءہ و کان البیت یومئذ علی ستۃ اعمدۃ"

ایک ستون آپ کے دائیں جانب تھا اور دو دوسری جانب اور تین آپ کے پیچھے تھے۔ اس وقت بیت اللہ شریف کے چھ ستون تھے۔

فائدہ :

" لما قال اللہ تعالیٰ ﴿اَنْ طَهِّرَا بَیْتِیَ﴾ دخل فیہ بالمعنی جمیع بیوتہ تعالی ، فیکون حکمھا حکمہ فی التطھیر والنظافۃ"

اسی آیۃ کریمہ سے یہ مسئلہ بھی سمجھ آ گیا کہ کعبہ شریف کی طرح ہی تمام مساجد کو پاک اور صاف ستھرا رکھنے کا حکم ہے۔ البتہ کعبہ شریف کا خصوصی حکم اس کی عظمت اور اس وقت دوسری مسجد کے نہ ہونے

کی وجہ سے تھا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے۔

﴿ فِيْ بُيُوْتٍ اَذِنَ اللّٰهُ اَنْ تُرْفَعَ وَيُذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ يُسَبِّحُ لَهٗ فِيْهَا بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ ☆﴾
(النور، آیۃ ۳۶)

ان گھروں میں جنہیں بلند کرنے کا اللہ نے حکم دیا ہے۔ اوران میں اس کا نام لیا جاتا ہے اللہ کی تسبیح کرتے ہیں ان میں صبح اور شام۔

☆ " وروی عن عمر بن الخطاب ﷺ انه سمع صوت رجل فی المسجد فقال ما هذا اتدری این انت "

حضرت عمر بن خطاب ﷺ نے ایک شخص کو زور زور سے مسجد میں چلاتے ہوئے سنا، تو آپ نے فرمایا، یہ کیا ہے؟ کیا تمہیں معلوم نہیں تم کہاں ہو۔ (قرطبی)

یعنی مسجد کا احترام ضروری ہے۔ مسجد میں شور و غل، اور دنیاوی باتوں میں بلا مقصد مشغول رہنا مسجد کے وقار کے منافی ہے۔

مسئلہ: ﴿ اَنْ طَهِّرَا بَيْتِيَ ﴾ سے ہی سمجھ آیا کہ مسجد میں کسی جنبی شخص کا داخل ہونا، یا حیض یا نفاس والی عورت کا مسجد میں داخل ہونا جائز نہیں۔ (از روح المعانی)

طواف کی اقسام:

طواف کی تین قسمیں ہیں۔ یہ آیۃ ان تمام قسموں کو شامل ہے۔

۱) فرض: یہ طواف زیارۃ ہے۔ رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿وَلْيَطَّوَّفُوْا بِالْبَيْتِ الْعَتِيْقِ﴾ (سب سے پہلے مکرم گھر کا طواف کرو) یہ طواف زیارۃ دس ذی الحج کو ہوتا ہے۔ البتہ گیارہ اور بارہ کو کرنے کی بھی اجازت ہے۔

۲) واجب: یہ طواف صدر ہے۔ جسے طواف الوداع بھی کہا جاتا ہے۔ یہ حج سے فارغ ہونے پر لوٹتے وقت کیا جاتا ہے۔ اس کا وجوب حدیث پاک سے ثابت ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا

" من حج البیت فلیکن آخر عهده بالبیت الطواف " جو شخص بیت اللہ شریف کا حج کرے اس کا آخری کام طواف ہو۔

۳) سنت اور مستحب: یہ طواف قدوم ہے، جو مکہ میں پہنچنے پر سب سے پہلے طواف کیا جاتا ہے۔ یہ سنت ہے واجب نہیں۔ مسنون اس لئے ہے کہ نبی کریم ﷺ نے یہ طواف کیا ہے۔

(احکام القرآن للجصاص)

مسئلہ: طواف زیارۃ کے قائم مقام کوئی چیز نہیں۔ جب تک طواف زیارۃ نہ کی جائے حاجی محرم ہی رہتا ہے۔ جب یہ طواف کرلے گا تو اس کی زوجہ اس کے لئے حلال ہوگی۔

طواف صدر رہ جائے تو اس کا قائم مقام دم ہے۔ یعنی جانور ذبح کر کے اس کا جبیرہ بنائے (بدل ادا کرے) طواف قدوم کی ترک سے اگرچہ سنت کی ترک تو لازم آتی ہے۔ لیکن دم وغیرہ لازم نہیں آتا۔ (احکام القرآن للجصاص)

مسئلہ: ہر طواف جس کے بعد سعی ہو اس میں رمل ہے پہلے تین چکروں میں، رمل کا مطلب یہ ہے کہ کندھے ہلا ہلا کر مجاہدوں کی طرح چلنا جس طرح میدان جنگ کی صفوں میں مجاہدین چلتے ہیں اور ہر وہ طواف جس کے بعد صفا اور مروہ کے درمیان سعی نہیں اس میں رمل نہیں۔

یعنی طواف قدوم (جو سب سے پہلے آتے ہوئے طواف کیا جاتا ہے) کے بعد چونکہ صفا اور مروہ کے درمیان سعی ہے۔ اس لئے اس میں پہلے تین چکروں میں سعی ہے۔

اگر دیر سے پہنچا طواف قدوم نہیں کرسکا۔ یا اس کے بعد سعی نہیں کرسکا تو اب سعی طواف زیارۃ کے بعد کرے گا۔ اور اسی کے پہلے تین چکروں میں رمل کرے گا۔ لیکن اگر طواف قدوم اور سعی پہلے کر چکا ہے تو صرف طواف قدوم والا رمل ہی ہوگا۔ بعد میں طواف زیارۃ اور طواف صدر میں رمل نہیں۔

عمرہ کے طواف میں رمل کرے گا۔ کیونکہ اس کے بعد صفا اور مروہ کے درمیان سعی ہے۔

☆ " روی ابن عمر ان النبی ﷺ رمل فی الثلاثة الاشواط من الحجر الی الحجر "

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ (طواف کے) پہلے تین چکروں میں حجر اسود سے حجر اسود تک رمل کیا۔

رمل کے سنت ہونے کی وجہ:

" انما کان ذلک سنة حین فعله النبی ﷺ مرائیا به للمشرکین اظهارا للتجلد والقوة فی عمرة القضاء لانهم قالوا قد اوهنتهم حمی یثرب فامرهم باظهار الجلد لئلا یطمع فیهم"

نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام جب عمرہ کی قضاء کے لئے تشریف لائے، تو مشرکین نے کہا کہ ان لوگوں کو تو یثرب کے بخار نے کمزور کر دیا ہے تو نبی کریم ﷺ نے رمل کیا اور صحابہ کرام کو بھی رمل کا حکم دیا تا کہ ان پر مسلمانوں کی بہادری اور قوت واضح ہو جائے۔ یہی وجہ ہے رمل کے سنت ہونے کی۔

(از احکام القرآن للجصاص)

﴿وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ قَالَ وَمَنْ كَفَرَ فَاُمَتِّعُهٗ قَلِيْلًا ثُمَّ اَضْطَرُّهٗۤ اِلٰى عَذَابِ النَّارِ ؕ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ﴾

۱) اور جب عرض کی ابراہیم نے کہ میرے رب اس شہر کو امان والا کر دے، اور اس کے رہنے والوں کو طرح طرح کے پھلوں سے روزی دے، جو ان میں اللہ اور پچھلے دن پر ایمان لائیں۔ فرمایا اور جو کافر ہو تھوڑا برتنے کو اسے بھی دوں گا، پھر اسے عذاب دوزخ کی طرف مجبور کر دوں گا، اور وہ بہت بری جگہ ہے پلٹنے کی۔

۲) اور (یاد کرو) جب کہا ابراہیم نے اے میرے رب کر دے اس جگہ کو شہر امن والا، اور روزی دے اس کے رہنے والوں کو پھلوں سے جو ایمان لائے ان میں سے اللہ پر اور آخرت کے دن پر، فرمایا جس نے کفر کیا تو میں فائدہ پہنچاؤں گا اسے تھوڑا، پھر میں اسے مجبور کر دوں گا آگ کے عذاب کی طرف، اور وہ بہت برا ٹھکانا۔ (آیت نمبر ۱۲۶)

ابراہیم علیہ السلام کی یہ دعاء اس وقت کی ہے جب آپ نے اپنی زوجہ حضرت ہاجرہ اور حضرت اسماعیل کو مکہ کی زمین میں چھوڑا جب وہاں کوئی شہر نہیں تھا، کوئی آبادی نہیں تھی، آپ کی اس دعاء کا

مطلب یہ تھا کہ اے اللہ اس غیر آباد جگہ کو امن والا شہر بنا دے۔

" فَکَأَنَّہٗ قَالَ ھٰھُنَا رَبِّ اجْعَلْ ھٰذَا الْوَادِی الْقَفْرَ بَلَدً ذَا اَمْنٍ وَ سَلَامَۃٍ " یعنی اس آیۃ کریمہ کا مطلب یہ ہے کہ اے میرے رب اس خالی، غیر آباد جگہ کو شہر بنا دے جو امن والا اور سلامتی والا ہو۔

" فیجوز ان یکون البلد ایضا داخلا تحت الطلب " اس معنی کے لحاظ پر دعاء میں شہر کی طلب پائی گئی ہے۔ یعنی ایک مطالبہ یہ تھا کہ اے اللہ اس جگہ کو شہر بنا دے، اور دوسرا مطالبہ یہ تھا کہ اے اللہ اسے امن اور سلامتی والا بنا دے۔

" وقال فی ھذہ السورۃ ﴿ رَبِّ اجْعَلْ ھٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا ﴾ ای اجعل ھذہ البقعۃ بلدا آمنا و ناسب ھذا لانہ قبل بناء الکعبۃ "

اور اس سورۃ میں " بلدا " کو نکرہ ذکر کیا گیا ہے کیونکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اے اللہ اس جگہ کو امن والا شہر بنا۔ چونکہ یہ دعاء کعبہ شریف کی تعمیر سے پہلے کی ہے۔

اور سورۃ ابراہیم میں ذکر ہے۔ ﴿ وَاِذْ قَالَ اِبْرٰھِیْمُ رَبِّ اجْعَلْ ھٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا ﴾ اس میں " البلد " معرفہ ذکر ہے کیونکہ یہ دعاء کعبہ شریف کی تعمیر کے بعد کی ہے جب وہاں لوگوں کی آبادی ہو چکی تھی، اور اسحاق علیہ السلام بھی پیدا ہو چکے تھے اور آپ چھوٹی عمر کے تھے۔

یہ بھی خیال رہے کہ حضرت اسحاق علیہ السلام عمر میں حضرت اسماعیل علیہ السلام سے تیرہ سال چھوٹے ہیں۔ (از ابن کثیر)

علامہ رازی رحمہ اللہ نے بھی اس آیۃ میں " بلدا " کو نکرہ اور سورۃ ابراہیم میں " البلد " معرفہ ذکر کرنے کی ایک وجہ یہی بیان کی، الفاظ کچھ ابن کثیر سے مختلف ہیں۔ عبارت ملاحظہ ہو۔

" ان الدعوۃ الاولی وقعت ولم یکن المکان قد جعل بلدا کانہ قال ، اجعل ھذا الوادیٔ بلدا آمنا لانہ تعالی حکی عنہ انہ قال ﴿ رَبَّنَا اِنِّیْ اَسْکَنْتُ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ بِوَادٍ غَیْرِ ذِیْ زَرْعٍ ﴾ فقال ھھنا اجعل ھذا الوادی بلدا آمنا ، والدعوۃ الثانیۃ وقعت وقد جعل بندا ، فکانہ قال اجعل ھذا المکان الذی صیرتہ بلدا ذا امن و سلامۃ " (کبیر)

اس آیۃ کریمہ میں جو دعاء کی گئی ہے یہ اس وقت تھی جب کہ وہاں کوئی شہر نہیں تھا۔ گویا کہ آپ

کی دعاء کا یہ مطلب ہے کے اے اللہ تعالیٰ اس وادی کو شہر بنا جس طرح آپ کی یہ دعاء ہے۔''اے ہمارے رب بے شک میں نے اپنی اولاد کو ایک وادی میں ٹھہرایا ہے جس میں کھیتی باڑی نہیں ہوتی۔

لیکن آپ کی دوسری دعاء جو سورۃ ابراہیم میں ہے، اس کا یہ مطلب ہے کہ اے اللہ اس جگہ کو تو نے شہر بنادیا ہے اب اسے امن اور سلامتی والا بنادے۔ یہ دعاء کعبہ شریف کی تعمیر اور مکہ کے آباد ہونے کے بعد کی ہے۔

تنبیہ : ابھی تک جو بحث کی گئی ہے، اسی کے مطابق راقم کا ترجمہ ہے جو دراصل علامہ کاظمی رحمہ اللہ کے ترجمہ سے منقول ہے۔

لیکن علامہ رازی رحمہ اللہ نے دوسری توجیہ یہ ذکر فرمائی۔

'' الثانی ان تکون الدعوتان وقعتا بعد ما صارا المکان بلدا فقولہ ﴿اِجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا﴾ تقدیرہ ، ﴿اِجْعَلْ هٰذَا الْبَلَد بَلَدًا اٰمِنًا﴾ (کبیر)

دوسری وجہ یہ ہے کہ ہوسکتا ہے دونوں دعائیں کعبہ شریف کی تعمیر کے بعد کی گئی ہوں۔ جب کہ وہاں شہر بن چکا تھا۔ اب اس آیۃ میں ﴿اِجْعَلْ هٰذا بَلَدًا اٰمِنًا﴾ کا مطلب یہ ہوگا، اے میرے رب کردے اس شہر کو امن والا، یہی ترجمہ اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کا ہے۔

راقم نے دونوں وجہ ذکر کردی ہیں، تاکہ طلباء کرام کو دونوں ذہن نشین ہوجائیں۔

آمِنًا : ابراہیم علیہ السلام نے دعاء فرمائی کہ اے اللہ اس جگہ کو امن والا شہر بنا۔ اس امن سے مراد کیا ہے؟ اس میں چند وجوہ ہیں۔ ایک یہ ہے کہ آپ کی دعاء کا مطلب یہ ہے کہ اے اللہ اس جگہ کو قحط اور خشک سالی سے امن میں رکھنا، کیونکہ میں اپنی اولاد کو بیابان جنگل میں چھوڑ کر جارہا ہوں۔ جہاں نہ تو کھیتی باڑی ہوتی ہے۔ اور نہ ہی کوئی مال مویشی پائے گئے ہیں۔

بظاہر اس پر اعتراض ہے کہ اگر ''امن'' کا یہی معنی مراد لیا جائے تو ابراہیم علیہ السلام کی دعاء میں تکرار ہوگا۔ کیونکہ اس کے بعد اس کے اہل کے لئے پھلوں کی روزی دینے کی دعاء فرمائی۔

تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس میں تکرار نہیں۔ '' فھو علیہ السلام بالسؤال الاول طلب

ازالة القحط و بالسؤال الثانی التوسعة العظیمة " کیونکہ آپ کی پہلی دعاء کا مطلب یہ ہے کہ اے اللہ اس مقام سے قحط کو دور رکھنا، اور دوسری دعاء کا مطلب ہے کہ اللہ اس مقام کے باشندوں کی روزی میں وسعت عظیمہ عطاء فرمانا۔

دوسری وجہ امن سے مراد کی یہ ہے۔

" والثانی انه الامن من الخسف والمسخ والزلازل والغارات والجنون والجذام والبرص ونحو ذلک من البلایا التی تحل بالبلد "

یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی امن کی دعاء کا یہ مطلب ہے کہ اے اللہ اس جگہ کو خسف و مسخ (زمین میں دھنسا دینا اور شکلوں کو تبدیل کر دینا) اور زلزلوں اور لوٹ مار اور جنون (پاگل پن) اور جذام (کوڑھ) اور برص (سفید داغ پڑنا) اور ہر قسم کی مصیبتوں کے واقع ہونے سے اس جگہ کو محفوظ رکھ۔

والثالث الامن من القتل وهو قولابی بکر الرازی حضرت ابوبکر رازی رحمہ اللہ کے ارشاد کے مطابق امتی کی دعا کا مطلب یہ ہے کہ اے اللہ اسے قتل سے امن والا بنا۔ (خیال رہے کہ حرم کے احکام پہلے بیان ہو چکے ہیں۔)

امام واحدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں۔

" یرید بلدا محرما لایصاد طیره ولا یقطع شجره ولایختلی خلاه "

کہ ابراہیم علیہ السلام کی دعاء کا یہ مطلب ہے۔ کہ اے اللہ اس جگہ کو شہر حرم بنا دے۔ اس کے پرندوں کا شکار نہ کیا جائے، اس کے درخت نہ کاٹے جائیں، اور اس کا (سبز) گھاس نہ کاٹا جائے، کیونکہ مکہ مکرمہ یعنی حرم کے شکار کے درپے ہونا، اور شکار کو بھگانا، اور شکار کو اذیت پہنچانا حرام ہے۔

" ومن قتل صید مکة فعلیه جزاؤه " جس شخص نے حرم کے شکار کو قتل کیا اس پر اس کا بدلہ لازم ہے۔ یعنی اس جانور کی قیمت صدقہ کرنا لازم ہے۔

خیال رہے کہ راقم کے نزدیک یہ تمام مطالب مجتمع ہیں۔ یعنی ابراہیم علیہ السلام نے ایک لفظ "آمنا" ذکر کر کے اتنی بڑی دعائیں فرما دیں۔

محمد بن مصلح الدین شیخ زادہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں، کہ میں نے متعدد تفاسیر کی کتب میں دیکھا ہے کہ

حرم کے جانور درندوں سے امن میں ہیں، قدرتی طور پر ان کو رب تعالیٰ کی طرف سے حفاظت حاصل ہے

" فان الاسد ربما یتبع الظبی خارج الحرم فیفر الظبی منه ویدخل الحرم فیرجع الاسد عنه ولایتبعه فی الحرم وان اجتمعا فیه لایهیج السبع علیه ولاینفر الصید منه حتی اذا خرجا من الحرم عدا السبع علیه "

بسا اوقات حرم کے باہر شیر پیچھا کرتا ہے ہرن کا، لیکن وہ ہرن جب بھاگ کر حرم میں پہنچ جائے، تو شیر پیچھے ہٹ جاتا ہے۔ اور حرم میں اس کے پیچھے نہیں دوڑتا، اور حرم میں اگر دونوں جمع بھی ہو جائیں تو شیر اس پر حملہ نہیں کرتا، ہاں اگر وہ حرم کی حدود سے باہر نکل جائے تو شیر اس پر حملہ کر دیتا ہے

(شیخ زادہ)

سبحان اللہ رب تعالیٰ کی قدرت کتنی عظیم ہے، اور مقام حرم کا کیا خوب مقام ہے، اسی سے یہ فائدہ بھی حاصل ہو گیا کہ جانور رب تعالیٰ کے حکم کو مانتے ہیں، تو اے انسان تو اشرف المخلوقات جب ہے تو تجھے زیادہ ہی رب تعالیٰ کے احکام کو ماننے کی طرف متوجہ ہونا چاہئے۔

فائدہ :

" فاجاب اللہ تعالٰی دعاء ابراهیم وجعله بلدا آمنا فما قصد جبار الاقصمه اللہ تعالی کما فعل باصحاب الفیل وغیرهم "

اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کی دعاء کو قبول فرمایا، اور اس جگہ کو امن والا شہر بنایا، جب بھی کسی جابر اور ظالم نے کعبہ شریف کو خراب کرنے کی کوشش کی تو رب تعالیٰ نے اسے ذلیل کیا اور برباد کیا، جیسا کہ اصحاب فیل (ہاتھی والے لوگ ابرھہ اور اس کے لشکر) وغیرہ کو تباہ و برباد کیا۔

اعتراض:

حجاج بن یوسف نے مکہ پر حملہ کیا، کعبہ شریف کو نقصان پہنچا، تو کس طرح کہا جا سکتا ہے کہ کعبہ کو جابروں سے محفوظ رکھا گیا ہے۔

جواب:

" لم یکن قصده بذلک مکة ولا اهلها ولا اخراب الکعبة وانما کان قصده خلع ابن الزبیر من الخلافة "

حجاج کا مقصد مکہ مکرمہ کو برباد کرنا، یا مکہ والے لوگوں کو تباہ کرنا، یا کعبہ شریف کو خراب کرنا نہ تھا، بلکہ اس کا مقصد حضرت عبداللہ بن زبیر کو خلافت سے معزول کرنا تھا۔ وہ مکہ میں تھے اس لئے حجاج کے حملہ سے کعبہ شریف کو نقصان ہوا۔ لیکن حجاج نے بعد میں کعبہ شریف کو تعمیر بھی کرا دیا۔ اگر حجاج کعبہ شریف کو نقصان پہنچانے کی غرض سے حملہ کراتا تو اسے بھی ایسی ہی ذلت کا سامنا کرنا پڑتا جیسا کہ ابرھہ اور اس کے لشکر کو کرنا پڑا۔ (از حازن)

وَارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ :

اور روزی دے اس کے رہنے والوں کو پھلوں سے جو ایمان لائے ان میں سے اللہ پر اور آخرت کے دن پر

جب یہ پہلے واضح کیا جاچکا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو یہ تو معلوم تھا کہ امامت یعنی منصب نبوت کے لائق ظالم، کافر نہیں ہوسکتے، لیکن آپ نے ﴿ وَمِنْ ذُرِّيَّتِىْ ﴾ کہہ کر رب تعالیٰ سے مطلقاً دعاء فرمادی کہ میری اولاد میں سے بھی بعض کو منصب نبوت عطاء فرمانا۔ اس دعاء میں آپ نے مومنوں کا ذکر نہیں فرمایا، کیونکہ آپ کی توجہ اس طرف نہیں تھی کہ میری اولاد میں کوئی ظالم بھی ہوں گے۔ رب تعالیٰ نے جب ﴿ لَايَنَالُ عَهْدِى الظّٰلِمِيْنَ ﴾ کہہ کر آپ کی توجہ دلادی کہ ''ظالموں کو میرا وعدہ حاصل نہیں ہوگا۔'' تو اب آپ کی توجہ اس طرف کامل تھی کہ میری اولاد میں کچھ ظالم کافر بھی ہوتے ہیں اس لئے آپ نے جب رزق کی دعاء کی تو صرف مومنوں کا ذکر کیا وجہ صرف یہ تھی کہ مومن کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ کافر کی خوشحالی کے لئے اور کافر کے نفع کی دعاء کرے۔

ورنہ کون نہیں جانتا کہ رب تعالیٰ مومنوں کو رزق دیتا ہے۔ اور کافروں کو بھی وہی رزق دیتا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی اس مسئلہ سے بخوبی واقف تھے۔ مطلب صرف یہ تھا کہ اے اللہ میں جانتا ہوں کہ تو نے کافروں کو بھی رزق دینا ہے لیکن میں تو دعاء صرف مومنوں کے لئے کروں گا۔

علامہ رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔

" واعلم انه تعالى لما علمه ان منهم قوما كفارا بقوله ﴿ لَايَنَالُ عَهْدِى الظّٰلِمِيْنَ ﴾ لاجرم خصص دعاء ه بالمؤمنين دون الكافرين " (کبیر)

جان لو کہ بے شک اللہ تعالیٰ نے جب آپ کو ﴿ **لَا يَنَالُ عَهْدِي الظّٰلِمِيْنَ** ﴾ کہہ کر اس صرف متوجہ کر دیا کہ آپ کی اولاد میں کافر بھی ہوں گے۔ تو یقیناً آپ نے دعا صرف مومنوں کے لئے کی، کافروں کے لئے نہیں کی۔

چونکہ رب تعالیٰ نے کافروں پر مہربانی کرنے اور ان پر غم کھانے سے ان الفاظ مبارکہ ﴿ فَلَا تَأْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴾ سے منع فرمایا ہے۔

"دعا لمؤمنيهم بالامن والخصب لان الكافر لايدعى له بذلك الا ترى ان قريشا لما طغت دعا عليها رسول الله ﷺ اللهم اشدد وطأتك على مضر واجعلها عليهم سنين كسني يوسف"
(البحر المحيط)

یعنی ابراہیم علیہ السلام نے اہل مکہ کے صرف مومنوں کے لئے امن اور خوشحالی کی دعاء کی، کیونکہ کافر کے لئے دعاء نہیں کی جاتی۔ البتہ کافر کے خلاف دعاء کی جا سکتی ہے جس طرح نبی کریم ﷺ نے قریش کے خلاف دعاء کی جب وہ دین حق کی زیادہ ہی مخالفت کرنے لگے اور سرکش ہو گئے، آپ نے رب کے حضور یہ عرض کیا۔

اے اللہ مضر قبیلہ پر اپنی گرفت سخت کر دے، اور ان کو اس طرح قحط سالی میں مبتلاء کر دے جیسا کہ یوسف علیہ السلام کے زمانہ کے لوگوں کو قحط سالی میں مبتلاء کیا تھا۔

قَالَ وَمَنْ كَفَرَ فَاُمَتِّعُهٗ قَلِيْلًا : فرمایا جس نے کفر کیا تو میں فائدہ پہنچاؤں گا اسے تھوڑا

یعنی رب تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کی دعاء کے بعد فرمایا کہ تم نے اپنی دعاء میں اگرچہ مومنوں کو خاص کیا ہے۔ اور حق بھی یہی تھا کہ مومنوں کے لئے ہی دعاء کی جائے، لیکن رزق اور پھل میں کافروں کو بھی عطا کر دوں گا، کیونکہ یعنی دنیاوی نفع ہے جو مومنوں اور کافروں سب کو میں پہنچاتا ہوں۔

نبوت اور رزق دنیا میں فرق:

منصب نبوت اور امامت فاسقوں کے لائق نہیں۔ کیونکہ امامت و نبوت کے لئے ضروری ہے کہ قوی عزم پایا جائے۔ اور مصائب و آلام پر بہت زیادہ صبر کیا جائے، تا کہ اللہ تعالیٰ کے اوامر و نواہی

لوگوں تک کامل طریقہ سے پہنچا دئے جائیں، دین کے کام میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کی کوئی فکر نہ کی جائے۔ کسی جابر و ظالم کے ظلم اور دبدبہ کی کوئی پرواہ نہ کی جائے۔

لیکن دنیا میں رزق کافر اور مومن، مطیع اور عاصی، صادق اور منافق سب کو رب تعالیٰ عطاء فرماتا ہے۔ اس میں کوئی قباحت نہیں۔ اصل دارومدار اس پر ہے۔ " فمن آمن فالجنة مسكنه و مثواه، ومن كفر فالنار مستقره ومأواه " جس شخص نے ایمان لایا جنت اس کا مقام ہے۔ اور جس نے کفر کیا اس کا ٹھکانا جہنم ہے۔ (کبیر)

قلیل نفع کا مطلب:

رب تعالیٰ کے اس ارشاد کا مطلب " کہ میں کافروں کو تھوڑا نفع پہنچاؤں گا " یہ ہے کہ ان کو نفع فقط دنیا میں ہی حاصل ہونا ہے۔ اخروی نفع سے وہ محروم ہوں گے۔

" فان الدنيا بكليتها قليل قال الله تعالى قل متاع الدنيا قليل " بے شک کسی انسان کو ساری دنیا کا مال و دولت دے دیا جائے تو پھر بھی وہ قلیل ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب پاک ﷺ کو فرمایا کہ آپ فرمادیں دنیا کا مال و نفع قلیل ہے۔

یہی وجہ ہے کہ رب تعالیٰ نے فرمایا کہ جو کفر کرے گا اسے میں تھوڑا نفع پہنچاؤں گا۔ حالانکہ بظاہر کافروں کے پاس دنیا کا مال و دولت کثیر ہوتا ہے کیونکہ وہ حرام اور حلال میں تمیز نہیں کرتے۔

" وان كانت كثيرة باضافة بعضها الى بعض فانها قليل باضافتها الى نعمة الآخرة "

اگرچہ کافروں کا مال کئی دوسرے لوگوں کی بنسبت زیادہ ہوتا ہے۔ لیکن وہ اخروی نعمتوں کے مقابل قلیل ہوتا ہے، وجہ اس کی یہ ہے۔ " كيف لا يقل فى الدنيا ما يتناهى بالاضافة الى ما يتناهى " کہ دنیا کا ختم ہونے والا مال یقیناً قلیل ہی ہے، کیونکہ اس کے مقابل اخروی نعمتیں ہیں جو نہ ختم ہونے والی ہیں۔ جو ختم نہ ہوں حقیقت میں وہی کثیر ہیں۔ (از بیضاوی و شیخ زادہ)

(امتعه قليلا) ایک مطلب اس کا یہ ہے۔ "امتعه بالرزق الى وقت مماته " کہ میں کافروں کو ان کی موت تک رزق دیتا رہوں گا۔ یعنی دنیاوی رزق دینے سے وہ کوئی مکرم نہیں بن جائیں گے۔

اور دوسرا مطلب یہ ہی۔ " امتعه بالبقاء فی الدنیا " میں ان کو دنیا میں زندگی عطاء کر کے ان کو دنیا میں باقی رکھ کر نفع پہنچاؤں گا۔

اور تیسرا مطلب یہ ہے۔

" وقال الحسن امتعه بالرزق والامن الی خروج محمد ﷺ فیقتله ان اقام علی کفره او یجلیه عنها "

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ میں ان کو رزق اور امن اس وقت تک عطاء کروں گا جب حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی تشریف آوری نہیں ہوتی۔ اب جب تشریف لے آئیں گے۔ تو جو لوگ کفر پر قائم رہیں یا ان کو قتل کر دیں گے یا ان کو جلاء وطن کر دیں گے۔

چونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعاء اہل مکہ کے لئے تھی، اس کے مقابل وہاں کے ہی کافروں کے متعلق ارشاد ہو رہا ہے۔

راقم کے نزدیک تمام مطالب جمع ہیں کہ رب تعالیٰ کے ارشاد کا مطلب ہے کہ میں مکہ کے کافروں کو دنیا کا رزق دوں گا۔ دنیا میں زندگی بھی دوں گا، ہاں میرے محبوب ﷺ آ کر ان کو یا تو قتل کر دیں گے، یا جلاء وطن کر دیں گے۔ یہ نفع بہت قلیل ہے۔ جس کی میرے نزدیک کوئی قدر و منزلت نہیں۔

"فتضمنت الآیة حظر قتل من لجأ الیه من وجهین احدهما قوله ﴿رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا﴾ مع وقوع الاستجابة له والثانی قوله ﴿ وَمَنْ كَفَرَ فَاُمَتِّعُهٗ قَلِيْلًا ﴾ لانه قد نفی قتله بذکر المتعة الی وقت الوفاة "

اس آیۂ کریمہ سے سمجھ آیا کہ جو شخص حرم شریف میں پناہ لے لے، اسے حرم میں قتل نہ کیا جائے، کیونکہ ایک تو ﴿رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا ﴾ اس پر دلالت کر رہا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے اس مقام کو امن والا شہر بنانے کی دعاء کی اور آپ کی دعاء کو قبول کر لیا گیا۔

اور دوسرا رب تعالیٰ کا ارشاد ﴿ وَمَنْ كَفَرَ فَاُمَتِّعُهٗ قَلِيْلًا ﴾ اس پر دلالت کر رہا ہے کہ میں موت تک ان کو نفع پہنچاؤں گا۔ جس سے واضح ہوا کہ باہر سے کوئی قتل کر کے آئے اور حرم میں پناہ لے تو اسے حرم میں قتل نہ کیا جائے۔ (احکام القرآن للجصاص)

ثُمَّ اَضْطَرُّهٗٓ اِلٰی عَذَابِ النَّارِ ؕ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ :

(پھر میں اسے مجبور کردوں گا آگ کے عذاب کی طرف اور وہ بہت برا ٹھکانا ہے)

یعنی دنیا میں کافر کو نفع پہنچانے کے بعد اسے جہنم کی آگ کی طرف مجبور کر کے بھیج دیا جائے گا "اضطرار" ضد ہے اختیار کی، اس کا حقیقی معنی یہ ہے کہ کسی شخص سے کسی فعل کا اس کے اختیار کے بغیر صادر ہونا جیسا کہ کسی کو چھت سے نیچے گرا دیا جائے اس کا چھت سے نیچے گرنا اسکے اختیار کے بغیر تھا۔

اور اس کا مجازی معنی یہ ہے کہ کام تو انسان اپنے اختیار سے کرے لیکن اس سے رکنے میں وہ مختار نہ رہے۔ جیسا کہ کوئی ایسا عارضہ در پیش آ جائے جو اسے مجبور کر دے، اور اس کے اختیار کو ختم کر دے، مثال کے طور پر ایک شخص بھوک کے اس درجہ پر پہنچ جائے کہ مجبور ہو کر مردہ جانور کا گوشت کھا لے۔

پہلے معنی پر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد گرامی دلالت کر رہا ہے۔ ﴿يَوْمَ يُدَعُّوْنَ اِلٰى نَارِ جَهَنَّمَ دَعًّا﴾ (طور، آیۃ ۱۳) جس دن جہنم کی طرف دھکا دے کر دھکیلا جائے گا۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی۔

﴿يَوْمَ يُسْحَبُوْنَ فِى النَّارِ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ ؕ ذُوْقُوْا مَسَّ سَقَرَ﴾ (القمر، آیة ۴۸)

جس دن آگ میں اپنے مونہوں پر گھسیٹے جائیں گے، اور فرمایا جائے گا چکھو دوزخ کی آنچ،

اور ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

﴿فَيُؤْخَذُ بِالنَّوَاصِىْ وَالْاَقْدَامِ﴾ (الرحمن آیة ۴۱)

تو ماتھا اور پاؤں پکڑ کر جہنم میں ڈالے جائیں گے۔

دوسرے معنی کو اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد گرامی سے تائید حاصل ہے۔

﴿وَسِيْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِلٰى جَهَنَّمَ زُمَرًا ؕ حَتّٰٓى اِذَا جَآءُوْهَا فُتِحَتْ اَبْوَابُهَا﴾ (الزمر، آیة ۷۱)

اور کافر جہنم کی طرف ہانکے جائیں گے گروہ گروہ، یہاں تک کہ جب وہاں پہنچیں گے اس کے دروازے کھولے جائیں گے۔

اور ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ ﴿وَاِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا﴾ (مریم آیۃ ۷۱) اور تم میں کوئی ایسا نہیں جس کا گذر دوزخ پر نہ ہو۔

اورارشاد باری تعالیٰ ہے۔ ﴿ اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ ؕ اَنْتُمْ لَهَا وَارِدُوْنَ ﴾ (الانبیاء، آیۃ ۹۸) بے شک تم اور اللہ کے سوا جنہیں تم پوجتے ہو سب جہنم کے ایندھن ہو تمہیں اس میں جانا ہے۔

تحقیق یہ ہے کہ کفار کے احوال قیامت کے دن آگ میں داخل کرنے کے لحاظ سے مختلف ہوں گے۔اس لئے آیات کریمہ میں ان کے مختلف حالات کو ذکر کر دیا گیا۔

" وان الاضطرار مجاز عن كون العذاب واقعا به وقوعا محققا حتى كأنه مربوط به "

اس آیۃ کریمہ میں " اضطره " کا مطلب یہ ہے کہ کافر کو عذاب یقینی طور پر دیا جائے گا، گویا کہ وہ عذاب اس کے ساتھ چمٹا ہوگا۔اسے جبری طور پر عذاب میں دھکیل دیا جائے گا۔اگر چہ وہ عذاب کو پسند نہیں کر رہا ہوگا۔ (از روح المعانی)

وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ: "ای و بئس المكان الذی يصير اليه الكافر وهو العذاب " یعنی وہ مکان بہت برا ہوگا جس کی طرف کافر کو پھیرا جائے گا۔وہ مکان ہی عذاب اور آگ والا ہوگا۔

اب مفہوم واضح ہوگیا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص کفر کرے گا، اسے میں تھوڑا نفع پہنچاؤں گا، یعنی دنیاء کی زندگی عطاء کر کے دنیا میں رزق دے کر اسے نفع پہنچاؤں گا۔لیکن یہ بھی اپنے حبیب ﷺ کی تشریف آوری تک پھر ایمان نہ لانے والوں کو دنیا میں قتل کر دیا جائے گا یا جلاء وطن کر دیا جائے گا۔پھر اس کے بعد ان کو مجبور کر کے جہنم کی آگ میں دھکیل دیا جائے گا۔یہی ان کا ہمیشہ کے لئے ٹھکانا ہوگا۔جو شدت عذاب کی وجہ سے ان کے لئے بہت برا ٹھکانا ہوگا۔ (از خازن)

گذشتہ سے پیوستہ:

" قال رسول الله ﷺ لو كانت الدنيا تعدل عند الله جناح بعوضة ما سقى كافرا منها شربة ماء " (رواه الترمذی وصححه)

نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ اگر دنیا اللہ تعالیٰ کے ہاں ایک مچھر کے پر کے برابر بھی ہوتی تو کسی کافر کو اللہ تعالیٰ پانی کا ایک گھونٹ بھی پینے کے لئے نہ دیتا۔

واضح ہوا کہ دنیا کا مال و دولت گھٹیا چیز کا نام ہے، جس کی قدر و منزلت رب تعالیٰ کے ہاں کچھ بھی نہیں۔ (از مظهری)

" ان الطائف کان من مدائن الشام باردن فلما دعا ابراهیم علیه السلام امر الله جبریل حتی اقتلعها من اصلها وادارها حول البیت سبعا ثم وضعها ههنا ومنها اکثر ثمرات مکة "

بے شک طائف کی زمین شام کے شہروں میں سے ایک شہر میں اردن کے علاقہ میں تھی (یہ آج کی شام اور اردن کی حد بندی مراد نہیں اس وقت اردن کا ہی علاقہ شام تھا) جب ابراہیم علیہ السلام نے دعاء فرمائی تو اللہ تعالیٰ نے جبرائیل کو حکم فرمایا، انہوں نے اس زمین کو وہاں سے اٹھایا، پھر کعبہ کے اردگرد سات چکر لگوائے، پھر اسے طائف میں رکھ دیا گیا۔ وہاں کی زمین اسی لئے بہت زرخیز ہے۔ اور مکہ شریف میں اکثر پھل اور سبزیاں وہاں سے ہی آتی ہیں۔ (از مظہری)

فائدہ جلیلہ :

ابراہیم علیہ السلام نے جب دعاء فرمائی کہ اے اللہ اس جگہ کو امن والا شہر بنا اور اس کے رہنے والوں کو پھلوں کی روزی دے۔ " فاستجاب الله تعالی له فصارت مکة یجبی الیها ثمرات کل شیٔ " تو اللہ تعالیٰ اللہ نے ان کی دعاء کو قبول فرمالیا، مکہ میں مختلف مقامات سے ہر قسم کے پھل اچھے سے اچھے، صاف ستھرے آجاتے ہیں۔ حج پر جانے والے حضرات آج تک حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعاء کی قبولیت کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کررہے ہیں۔ (ماخوذ از کبیر)

اللہ تعالیٰ نے حرم کے متعلق فرمایا ﴿یُجْبٰۤی اِلَیْهِ ثَمَرٰتُ كُلِّ شَیْءٍ﴾ جس کی طرف ہر چیز کے پھل لائے جاتے ہیں۔ یہ بھی خیال رہے کہ جس طرح " ثمرة " کا معنی پھل مشہور و معروف ہے، اسی طرح " ثمرة " مجازی طور پر یہ معنی بھی لیا جاتا ہے۔ " ویقال لکل نفع یصدر عن شیٔ ثمرته " ہر چیز سے جو نفع صادر ہوا سے " ثمرة " کہا جاتا ہے۔ (مفردات راغب)

اس معنی کے مطابق ابراہیم علیہ السلام کی دعاء کا یہ معنی بھی لینا بعید نہیں، کہ اللہ یہاں کے رہنے والوں کو ہر نفع مند چیز عطاء فرما۔ اگر دعاء کا یہ مطلب لیا جائے تو اس کی قبولیت کو جگمگاتا ہوئے آپ دیکھ سکتے ہیں کہ ہر نفع مند چیز مکہ مکرمہ میں وافر مقدار میں موجود ہے۔ جب حج کے دنوں میں کثیر لوگوں کے مجتمع ہونے کے باوجود کسی چیز کی کوئی کمی محسوس نہیں ہوتی، تو عام دنوں میں تو کمی کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

﴿وَاِذْ یَرْفَعُ اِبْرٰھِیْمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَیْتِ وَاِسْمٰعِیْلُ ؕ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ﴾ (آیت ۱۲۷)

۱) اور جب اٹھاتا تھا ابراہیم اس گھر کی نیویں اور اسماعیل، یہ کہتے ہوئے اے رب ہمارے ہم سے قبول فرما بے شک تو ہی سنتا جانتا۔

۲) اور (یاد کیجئے) جب اٹھاتے تھے ابراہیم بنیادیں کعبہ کی، اور اسماعیل (بھی) یہ کہتے ہوئے کہ) اے ہمارے رب قبول فرما ہم سے بے شک تو ہی بہت سننے والا، خوب جاننے والا ہے۔

اَلْقَوَاعِدَ : جمع ہے قاعدہ کی، " وھی اسّ البیت وقیل جدرة من البیت " قاعدہ کا معنی مکان کی بنیاد، اور مکان کی دیواروں کو بھی قاعدہ کہا جاتا ہے۔ (خازن)

" ویحتمل ان یراد بھا سافات البناء فان کل ساف قاعدة ما یوضع فوقه ویرفعھا بناؤھا "

اور یہ بھی احتمال ہے کہ قاعدہ کا معنی ردہ ہو، کیونکہ ایک ردے کے اوپر دوسرا ردہ رکھا جاتا ہے، جس سے بناء کو بلند کیا جاتا ہے۔ (بیضاوی)

وَاِذْ یَرْفَعُ : ماضی کی حکایت بیان کی گئی ہے۔ اسی وجہ سے معنی کیا گیا، "جب وہ اٹھاتے تھے"

اَلْبَیْتِ : پر الف لام عہد خارجی ہے، یعنی مراد بیت اللہ شریف ہے۔

اب مفہوم تقریباً واضح ہو گیا کہ یاد کرو اس وقت کو جب ابراہیم اور اسماعیل بیت اللہ شریف کی بنیادوں کو بلند کر رہے تھے۔

اعتراض : بنیاد تو اپنی جگہ پر رہتی ہے، بلند نہیں ہوتی، بنیاد کے بلند کرنے کا کیا مطلب ہے؟

جواب : "رفع الاساس ای البناء علیھا لانھا اذا بنی علیھا نقلت عن ھیئة الانخفاض الی ھیئة الارتفاع " بنیاد کے بلند کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اس پر عمارت قائم کرنا، اس لئے کہ جب بنیادوں پر عمارت تعمیر کی جاتی ہے تو وہ پستی سے بلندی کی طرف اٹھتی ہے۔ تو بناء کے

بلند کرنے کو بنیادوں کے بلند کرنے سے تعبیر کر دیا گیا۔

اور چونکہ قواعد کا معنی بعض حضرات نے دیواریں بھی کیا ہے، اس معنی کے لحاظ سے مطلب ہوگا۔ ''یاد کرو اس وقت کو جب ابرہیم اور اسماعیل دیواروں کو بلند کر رہے تھے۔

اور یہ بھی بیان کیا جا چکا ہے کہ قواعد کا معنی ردے بھی ہے۔ یعنی جب ابراہیم اور اسماعیل بنیادوں پر ردے لگا کر ان کو بلند کر رہے تھے۔ (از کبیر وخازن)

علمی نکتہ : " القواعد من البیت " کہا ہے، یرفع قواعد البیت "نہیں کہا، حالانکہ بظاہر یہ مختصر تھا معنی اس کا بھی یہی تھا۔ ''بیت اللہ کی دیواروں کو بلند کر رہے تھے۔''

اس کی وجہ یہ ہے کہ پہلے " القواعد " کو مبہم ذکر فرمایا کہ ابراہیم بنیادوں کو بلند کر رہے تھے۔ اس کے بعد من بیانیہ سے اس کی وضاحت فرمادی۔ " من البیت " وہ بنیادیں بیت اللہ کی تھیں۔

"وتبیینها بعد الابهام من تفخیم الشان ما لیس فی العبارة الاخری " ابہام کے بعد بیان کرنا بلندی شان پر دلالت کرتا ہے۔ جب کہ " قواعد البیت " میں یہ صورت نہیں پائی گئی۔ (کبیر)

وَاِسْمٰعِیْلُ : سریانی زبان میں " ایل " کا معنی ہے " اللہ "، مکمل لفظ کا معنی ہے۔ " اسمع یااللہ " اے اللہ سن، ابراہیم علیہ السلام نے ان الفاظ سے رب تعالیٰ کے حضور بچے کے لئے دعاء کی، بچے کی پیدائش کے بعد یہی نام بچے کا رکھ دیا گیا۔ (قرطبی)

اسماعیل علیہ السلام تعمیر میں کیسے شریک تھے؟

اس میں دو احتمال ہیں، بظاہر حقیقی معنی کے لحاظ پر دونوں ہی یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام مل کر دیواروں کی تعمیر کر رہے تھے، یعنی دونوں ہی معمار کا کام کر رہے تھے، چونکہ " اسمعیل " کا عطف ہے۔ " ابراهیم " پر، عطف فعل میں مشارکت کو چاہتا ہے۔ دوسرا احتمال یہ ہے کہ دونوں میں سے ایک تعمیر کر رہے تھے۔ اور دوسرے پتھر اور گارا دے رہے تھے۔

"وعلی الوجهین تصح اضافة الرفع الیهما " دونوں صورتوں میں بنیادوں کو بلند کرنے

کی نسبت دونوں حضرات کی طرف صحیح ہے اگر چہ پہلا معنی حقیقی ہے۔ دوسرا معنی مجازی ہے۔ (از کبیر)

لیکن خیال رہے کہ زیادہ شہور مجازی معنی ہی ہے کہ ابراہیم علیہ السلام دیواروں کی تعمیر کر رہے تھے۔ اور حضرت اسماعیل علیہ السلام آپ کو پتھر اور گارا دے رہے تھے۔

لیکن قاضی بیضاوی رحمہ اللہ نے ایک اور وجہ بھی بیان کی ہے۔ " **وقیل کانا یبنیان فی طرفین او علی التناوب** " کہ یہ احتمال بھی کہ ایک طرف کی دیوار ابراہیم علیہ السلام اور دوسری طرف کی دیوار اسماعیل علیہ السلام بنا رہے ہوں۔ لیکن یہ خیال رہے کہ یہ صورت اسی وقت صحیح ہو سکتی ہے کہ جب یہ کہا جائے کہ دونوں حضرات خود ہی پتھر اٹھا رہے تھے۔ اور خود ہی گارا لے رہے تھے اور ساتھ ساتھ تعمیر بھی کر رہے تھے۔ کیونکہ کعبہ شریف کی تعمیر میں کسی اور کا ذکر نہیں۔ اور ایک احتمال یہ ہے کہ باری باری پر تعمیر کر رہے ہوں۔ یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام تعمیر کر رہے تھے اور اسماعیل علیہ السلام پتھر اور گارا دے رہے تھے، اور کسی وقت اسماعیل علیہ السلام تعمیر کرتے اور ابراہیم علیہ السلام پتھر اور گارا دیتے۔

کعبہ شریف کی تعمیر:

کعبہ شریف کی تعمیر کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ " **الاکثرون من اھل الاخبار علی ان ھذا البیت کان موجودا قبل ابرھیم علیہ السلام علی ما روینا من الاحادیث فیہ** " (کبیر)

اکثر حضرات اس طرف ہیں کہ بیت اللہ شریف کی بنیادیں پہلے موجود تھیں، ان پر ہی ابراہیم علیہ السلام نے کعبہ شریف کو تعمیر کیا، جیسا کہ ہم نے احادیث سے ثابت کر دیا ہے۔

اعتراض: کئی حضرات نے ابراہیم علیہ السلام سے پہلے کعبہ شریف کی تعمیر کو ثابت نہیں کیا، بلکہ رد کیا ہے۔'' تو کس طرح کہا جا سکتا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام سے پہلے بھی کعبہ موجود تھا۔

جواب: یہ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام سے پہلے کعبہ شریف موجود مکان کی شکل میں نہیں تھا۔ کیونکہ آدم علیہ السلام کے زمانہ میں صرف بنیادوں کو قائم کیا گیا اور ان کے اوپر بیت المعمور کو یا جنتی یاقوت کے خیمہ کو اتار کر رکھ دیا گیا، جن حضرات نے انکار کیا انہوں نے بیت اللہ شریف کی موجودہ مکان کی شکل ابراہیم علیہ السلام سے پہلے ہونے کا انکار کیا ہے۔ لہٰذا راقم کو اختلاف نظر نہیں آتا۔

فائده جلیله:

" عن الزهری انهم بنوها حتی اذا بلغوا موضع الرکن اختصمت قریش فی الرکن ای القبائل تلی رفعه حتی شجر بینهم فقالوا تعالوا حتی نحکم اول من یطلع علینا من هذه السکة فاصطلحوا علی ذلک فاطلع الله علیهم رسول الله ﷺ فحکموه فامر بالرکن فوضع فی ثوب ثم امر سید کل قبیلة فاعطاه ناحیة من الثوب ثم ارتقی هو علی البناء فرفعوا الیه الرکن فاخذه من الثوب فوضعه فی مکانه " (شیخ زادہ)

کعبہ شریف کی تعمیر کی بحث میں جو پہلے بیان کیا گیا ہے کہ ایک مرتبہ قریش نے تعمیر کیا، اسی تعمیر میں زہری رحمہ اللہ نے بیان فرمایا کہ جب وہ حجر اسود کے مقام پر پہنچے تو قریش کا جھگڑا ہو گیا، ہر قبیلہ کے لوگ چاہتے تھے کہ ہمارا سردار اسے کعبہ شریف کی دیوار میں نصب کرے، بالآخران کا اس پر اتفاق ہو گیا کہ صبح جو شخص پہلے آئے گا اسے حکم (فیصل) بنالیں وہ جو فیصلہ کرے اس پر سب رضامند ہو جائیں۔

صبح سب سے پہلے آنے والے رسول اللہ ﷺ تھے، یہاں تک کہ ان لوگوں نے آپ کو فیصل مان لیا۔ آپ نے ایک کپڑا بچھایا جس کے اوپر حجر اسود کو رکھا، پھر ہر ایک قبیلہ کے سردار کو حکم دیا کہ تمام مل کر اس چادر کو اٹھاؤ، سب نے مل کر اٹھایا، آپ نے کپڑے سے پتھر اٹھا کر کعبہ شریف کی دیوار میں نصب کر دیا۔

سبحان اللہ کیا خوب حکمت عملی سے کام حضور ﷺ نے کیا کہ ان کو شدید نزاع اور شدید خطرہ سے بچالیا

غزالی دوران علامہ کاظمی رحمہ اللہ کی تفسیر سے اقتباس:

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ قریش نے جب کعبہ تعمیر کیا تو حضور ﷺ اور حضور کے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ کعبہ کے لئے پتھر اٹھا کر لارہے تھے کہ حضرت عباس نے حضور ﷺ سے کہا کہ آپ اپنی ازار شریف (چادر مبارک) اپنے مبارک کاندھے پر رکھ لیجئے، پتھر کی تکلیف سے آپ محفوظ رہیں گے، آپ نے حضرت عباس کا کہنا مان لیا۔ اسی وقت حضور ﷺ بے ہوش ہو گئے اور آپ کی مبارک آنکھیں آسمان کی طرف کھلی رہ گئیں۔ افاقہ ہوتے ہی حضور نے فرمایا، میری ازار، میری ازار، حضرت عباس نے فوراً ازار مبارک حضور پر باندھ دی۔ (بخاری جلد اول ص ۵۲، ۲۱۵، ۵۴۰)

سوال : یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ازار (چادر) کھول کر کاندھے پر رکھ لینا شرم وحیاء کے خلاف اور معیوب وقبیح ہے۔

حضرت عباس نے ایسا کام کرنے کے لئے حضور ﷺ سے کیوں کہا، اور حضور ﷺ نے ان کا کہنا کیسے مان لیا جب کہ حضور تو کنواری لڑکیوں سے بھی زیادہ حیادار تھے، اور معیوب وقبیح امور سے حضور ﷺ کو طبعاً نفرت تھی۔

جواب : اس کا جواب یہ ہے کہ یہ واقعہ حضور ﷺ کی ایسی نوعمری کے زمانہ میں پیش آیا جب اس عمر میں ایسا کرنا نہ حیاء کے خلاف سمجھا جاتا تھا نہ کسی کی نظر میں معیوب وقبیح تھا۔

اور بفحوائے "**عم الرجل صنو ابیه**" حضرت عباس حضور کے چچا ہونے کی وجہ سے بمنزلہ شفیق باپ کے تھے، جن کا کہنا نہ ماننا سعادت مندی کے خلاف تھا۔ حضور ﷺ طبعاً سعادت مند تھے، اس لئے ان کا کہنا مان لیا، لیکن ان کے کہنے پر عمل کرتے ہی حضور ﷺ بے ہوش ہو گئے، اور حضور ﷺ کی مبارک آنکھیں آسمان کی طرف کھلی رہ گئیں۔

افاقہ ہوتے ہی فرمایا "میری ازار، میری ازار"

حضرت عباس نے فوراً ازار مبارک باندھ دی، یہ حضور ﷺ کے کمال حیاء کا ظہور تھا، معلوم ہوا کہ یہ واقعہ حضور ﷺ کی طبعی سعادتمندی اور فطری حیاء کی دلیل ہے، کسی عیب یا قبح سے اس کا دور کا بھی تعلق نہیں۔

آپ کی عمر کتنی تھی؟ اس میں صحیح قول زہری رحمہ اللہ کا ملتا ہے کہ قریش کی بناء کعبہ کے وقت حضور ﷺ حد بلوغ کو نہ پہنچے تھے۔

امام زہری کا قول اس لئے راجح ہے کہ اس کی بناء پر حضور ﷺ کی طرف کسی عیب اور قبح کی نسبت نہیں ہوئی۔ اور نہ ہی حضور کے کمالِ حیاء کی نفی لازم آئی ہے۔ جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں

علامہ عینی نے بھی اسی قول کے تحت حسب ذیل کلام کر کے ہمارے موقف کی تائید فرمائی، وہ فرماتے ہیں۔

" ذکر ما فیہ من الفوائد منھا ان النبی ﷺ کان فی صغرہ محمیا عن القبائح والاخلاق الجاھلیة منزھا عن الرذائل والمعائب قبل النبوة و بعدھا ، ومنھا انه کان ﷺ جبله الله

تعالی علی احسن الاخلاق والحیاء الکامل حتی کان اشد حیاء من العذراء فی خدرھا فلذلک غشی علیه وما رأی بعد ذلک عریانا" (عمدۃ القاری جلد ۲ ص ۲ ۔ طبع مصر)

یعنی اس حدیث میں حسب ذیل فوائد پائے جاتے ہیں۔

۱) نبی کریم ﷺ اپنے بچپن میں سب قباحتوں اور اخلاق جاہلیت سے محفوظ تھے، نبوت سے پہلے اور نبوت کے بعد تمام رذائل اور معائب (عیوب) سے منزہ تھے۔

۲) اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کو احسن اخلاق اور حیاء کامل پر مخلوق فرمایا تھا، حتی کہ حضور ﷺ ان کنواری، لڑکیوں سے زیادہ حیادار تھے جو اپنے پردے کے اندر چھپی ہوئی ہوں، اس لئے چادر شریف اتارتے ہی حضور ﷺ پر بے ہوشی طاری ہوگئی، اس کے بعد حضور ﷺ کبھی عریاں نہ دیکھے گئے۔

تنبیہ:

اس وقت بھی حضور ﷺ کو عریاں دیکھے جانے کا یہ مفہوم نہیں کہ حضور ﷺ کی شرمگاہ مبارک پر کسی کی نظر پڑی ہو، کیونکہ قیامت کے دن " انکم محشورون حفاۃ عراۃ غرلا " کے متعلق ارشاد مصطفوی ہے کہ تمہارا حشر اس حال میں ہوگا کہ تمہارے پاؤں میں جوتا نہیں ہوگا۔ اور نہ ہی بدن پر کپڑا، نہ تم ختنہ شدہ ہوگے۔ لیکن کوئی کسی کی شرم گاہ کو نہیں دیکھ رہا ہوگا۔ (ماخوذ از التبیان للکاظمی)

راقم کا موقف:

اس مسئلہ میں آسان ہے کہ نبی کریم ﷺ کی قمیص مبارک پاؤں تک تھی، ابھی آپ بالغ نہیں تھے، پتھر اٹھانے میں تیز چلنے میں چادر رکاوٹ بن رہی تھی، حضرت عباس نے اتارنے کا حکم دیا، چچا کا حکم مان بھی لیا، لیکن حضور برداشت نہ کرسکے بے ہوش ہوگئے۔ آپ کو اسی وقت چادر بندھا دی گئی، لہٰذا جب قمیص پاؤں تک ہو، چادر اتارنے سے شرم گاہ کا ننگا ہونا نہیں پایا جاتا۔ واللہ اعلم بالصواب

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ط اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ:

یہ کہتے ہوئے اے ہمارے رب قبول فرما ہم سے بے شک تو ہی بہت سننے والا خوب جاننے والا ہے۔

علامہ بیضاوی رحمہ اللہ نے " هما يقولان " کے الفاظ محذوف نکالے ہیں، اور جملہ کو حال کہا ہے، جس کے مطابق وہی ترجمہ ہے جو بیان کر دیا گیا ہے۔

" تقبل " کی تفسیر میں متکلمین نے یہ ذکر کیا ہے کہ ہر عمل جسے اللہ تعالیٰ قبول کر لے تو عمل کرنے والے کو وہ ثواب عطاء فرماتا ہے اور اس سے راضی ہوتا ہے۔ اور جس عمل پر رب تعالیٰ کی طرف سے ثواب نہ دیا جائے، اور اس کی رضاء مندی نہ پائی جائے وہ مردود ہے۔

قبولیت اور ثواب و رضاء میں تلازم ہے، ذکر یہ ہے کہ "اے ہمارے رب قبول فرما ہم سے" اور مراد یہ ہے کہ اے ہمارے رب تو ہم سے راضی رہے، تو ہی ہمیں اس پر اجر عطاء فرما۔ دنیا کے لحاظ پر بندے کا کسی کو عطیہ دینا اور دوسرے کا وہ عطیہ قبول کر لینا تقبل کہلاتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ سے تقبل کی دعا کا یہی مطلب ہے کہ تو راضی ہو جا۔

عارفین حضرات کے نزدیک قبول اور تقبل میں فرق ہے۔ جب کوئی چیز اعلیٰ ہو اور اسے خوشی سے قبول کیا جائے تو اس کے لئے " قبول " کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ اور جب کسی چیز کو تکلف سے قبول کیا جائے، اس میں خوشی نہ پائی جائے تو اس کے لئے لفظ " تقبل " استعمال ہوتا ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام نے رب تعالیٰ کے حضور لفظ " تقبل " استعمال کیا ہے، جس سے اپنے عجز اور انکسار کا اعتراف کیا ہے۔ اپنے عمل کو مالک الملک کے سامنے پیش کرنے میں گھٹیا سمجھا۔

" وايضا فلم يكن المقصود اعطاء الثواب عليه "

اور اس پر ثواب عطاء کرنے کا قصد نہیں کیا۔

"لان كون الفعل واقعا موقع القبول من المخدوم الذ عند الخادم العاقل من اعطاء الثواب اليه"

اس لئے کہ عقل مند خادم اس میں زیادہ لذت محسوس کرتا ہے کہ میرا فعل میرے مخدوم (مالک) نے مجھ سے قبول کر لیا ہے۔ اسے یہ پرواہ نہیں ہوتی کہ اس پر کوئی اجر ملتا ہے یا نہیں۔ (از کبیر)

"عن وهيب بن الورد انه قرأ ﴿ وَإِذْ يَرْفَعُ إِبْرَاهِيمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَإِسْمَاعِيلُ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا﴾ ثم يبكى ويقول ياخليل الرحمٰن ترفع قوائم بيت الرحمٰن وانت مشفق

ان لایتقبل منک"

وہیب ابن ورد نے اس آیۃ کریمہ کو پڑھا، یعنی ﴿وَاِذْ یَرْفَعُ اِبْرٰھِیْمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَیْتِ وَاِسْمٰعِیْلُ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا﴾ پڑھا پھر آپ نے رونا شروع کر دیا۔ روتے ہوئے کہتے ہیں۔ اے اللہ کے خلیل تم رب تعالیٰ کے گھر کی بنیادوں کو بلند کر رہے تھے اور ڈر رہے تھے کہ ہو سکتا ہے یہ عمل قبول نہ ہو۔

یعنی کامل عجز و انکسار آپ میں پایا گیا، کیونکہ اگر عام دنیا دار ہوتا تو اپنے کام پر اتراتا کہ میں نے اللہ کا گھر بنایا، لیکن اللہ کا خلیل اللہ کا گھر بنا کر بھی سراپا عجز و انکسار بن کر رہا۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اپنے مخلصین مؤمنین بندوں کی شان میں بیان کیا ہے۔ " والذین یؤتون ما اتوا وقلوبهم وجلة " اور وہ جو دیتے ہیں جو کچھ دیں اور ان کے دل ڈر رہے ہیں۔

یعنی وہ اللہ کے حضور زکوۃ و صدقات اور اعمال صالحہ پیش کرتے ہیں، لیکن پھر بھی ان کے دل ڈر رہے ہوتے ہیں کہ کیا معلوم کہ یہ اللہ تعالیٰ کے حضور شرف قبولیت حاصل کرتے ہیں یا نہیں۔

(ابن کثیر)

اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ : آپ نے یہ دعاء کر کے رب کے حضور عرض کیا۔

"تسمع دعاء نا وتضرعنا و تعلم ما فی قلبنا من الاخلاص وترک الالتفات الی احد سواک "

اے اللہ تو ہماری دعاء اور عاجزی کو سنتا ہے، تو ہمارے دلوں کے اخلاص کو جانتا ہے۔ اور تو جانتا ہے کہ ہم تیرے سوا کسی اور کی طرف توجہ نہیں کرتے۔

اس دعاء میں ایک لطیف اشارہ:

اس سے پہلے عارفین کا قول نقل کیا جا چکا ہے کہ آپ نے رب تعالیٰ کے حضور "تقبل" کہہ کر اپنے عجز کا اعتراف کیا، اور اپنے عمل کو کمتر سمجھا۔

لیکن اس دعاء میں لطیف اشارہ یہ پایا گیا کہ ہمارے عجز کو کوئی جاہل حقیقت نہ سمجھ بیٹھے۔

"قولهما ﴿اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ﴾ یدل علی انه لم یقع منهما تقصیر بوجه ما فی اتیان المامور به بل بذلا فی ذلک غاية ما فی وسعهما فان المقصر المتساهل کیف

یتجاسر علی ان یقول باطلق لسان وارق جنان ﴿ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ ﴾ لدعائنا وتضرعنا ﴿ الْعَلِیْمُ ﴾ بما فی قصدنا وصبرنا فی اتباع امرک ودل ذلک علی ان القبول والرد الیه تعالی وانه لایجب علیه شیٔ"

حضرت ابراہیم واسماعیل علیہما السلام کا رب تعالیٰ کے حضور یہ عرض کرنا ﴿ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ﴾ یہ اس پر دلالت کررہا ہے کہ ان دونوں سے رب تعالیٰ کے حکم بجالانے میں کوئی کوتاہی نہیں ہوئی، بلکہ انہوں نے اپنی پوری کوشش صرف کردی، اس لئے کہ اگر کوئی شخص کوتاہی کرتا ہے سستی کرتا ہے وہ کیسے جسارت کرسکتا ہے کہ برملا طور پر یہ کہے، دل کی گہرائیوں سے یہ کہے کہ اے اللہ تو ہماری دعاؤں اور عاجزی کو خوب سننے والا ہے۔ اور تو ہمارے ارادہ کو جانتا ہے، تو جانتا ہے کہ ہم نے تیرے حکم کی اتباع میں صبر سے کام لیا ہے۔

اسی سے یہ مسئلہ بھی سمجھ آ گیا کہ کسی کا عمل قبول کرنا رب تعالیٰ پر لازم نہیں، البتہ چاہے تو قبول فرمائے۔ چاہے تو رد کرے۔ ہاں البتہ اللہ تعالیٰ اپنی وسیع رحمت کی وجہ سے کسی کے عمل کو ضائع نہیں فرماتا۔
(از شیخ زادہ)

اعتراض: ﴿ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ﴾ میں حصر پائی گئی ہے، جس کا معنی ہے کہ بیشک تو ہی سننے والا جاننے والا ہے۔ یہ حصر کس طرح درست ہے جب کہ مخلوق بھی سنتی اور جانتی ہے۔

جواب: "انه سبحانه لکماله فی هذه الصفة یکون کأنه هو المختص بها دون غیره"

اللہ تعالیٰ کو یہ صفات کامل طور پر کما حقہ حاصل ہیں، اس لئے کہ وہی حقیقت میں، ذاتی طور پر سننے والا جاننے والا ہے۔ اور مخلوق کو سننا اور جاننا رب تعالیٰ کی طرف سے ہی حاصل ہے۔ لہٰذا حصر درست ہے۔ (از کبیر)

☆☆☆

رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ (۱۲۸)

۱) اے رب ہمارے اور کر ہمیں تیرے حضور گردن رکھنے والا ، اور ہماری اولاد میں سے ایک امت تیری فرمانبردار اور ہمیں عبادت کے قاعدے بتا اور ہم پر اپنی رحمت سے رجوع فرما، بیشک تو ہی ہے بہت توبہ قبول کرنے والا مہربان۔

۲) اے ہمارے رب اور رکھ ہم دونوں کو فرمانبردار اپنا ، اور کر ہماری اولاد میں سے ایک امت کو فرمانبردار اپنا، اور دکھا ہمیں ہماری عبادت کے طریقے، اور رجوع فرما ہماری طرف، بے شک تو توبہ قبول کرنے والا رحم کرنے والا ہے۔

رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ : یہ ابراہیم علیہ السلام کی دوسری دعاء ہے۔ پہلی دعاء کا ذکر پہلی آیت میں ہو چکا ہے۔ اسی وجہ سے " واؤ " ذکر ہے۔

"مسلمین " یا تو لیا ہوا ہے۔ " اسلم وجهه " سے، جس کا معنی ہے، اخلاص، اس صورت میں معنی ہوگا۔ اے ہمارے رب اور ہم دونوں کو اپنا مخلص بنا۔

اور یا یہ لفظ ماخوذ ہے۔ "اسلم" سے لیکن اس کا معنی ہے۔ " استسلم "مطیع ہونا، فرمانبردار ہونا، گردن رکھنا یعنی گردن جھکانا، اس صورت میں معنی ہوگا۔ اے ہمارے رب اور بنا ہمیں اپنا فرمانبردار لیکن ان دونوں صورتوں میں مطلب یہ ہوگا۔ " والمراد طلب الزيادة في الاخلاص والاذعان " کہ اے ہمارے رب اور ہمیں خلوص اور اطاعت میں زیادہ مرتبہ عطاء فرما۔

اور ایک معنی یہ ہے۔ " والمراد الثبات عليه " اے ہمارے رب اور ہم دونوں کو اسلام اور اطاعت پر قائم و دائم رکھ۔

راقم نے اسی کے مطابق ترجمہ ذکر کیا ہے۔ "اور رکھ ہم دونوں کو اپنا فرمانبردار"

وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ : اور ہماری اولاد میں سے ایک امت کو اپنا فرمانبردار رکھ بظاہر طور پر یہاں یہ وہم ہے کہ اصحاب ہمت یعنی اولیاء کرام، بزرگان دین اور پھر خاص کر کے انبیاء کرام تو عام لوگوں کے لئے دعاء کرتے ہیں۔ صرف اولاد کے لئے دعاء نہیں کرتے، تو

حضرت ابراہیم اور اسماعیل علیہما السلام کا اولاد کے لئے دعاء کرنے کا کیا مطلب؟

تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس کی دو وجہ ہیں ایک یہ ہے کہ اولاد زیادہ حق رکھتی ہے کہ اس پر شفقت کی جائے، جیسا کہ رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿ وَاَنۡذِرۡ عَشِیۡرَتَکَ الۡاَقۡرَبِیۡنَ ﴾ (اے محبوب) آپ اپنے قبیلے والوں کو ڈرائیں۔ اور ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ ﴿ قُوۡا اَنۡفُسَکُمۡ وَاَهۡلِیۡکُمۡ نَارًا ﴾ (اے ایمان والو) تم اپنے آپ کو اور اپنی اہل کو آگ سے بچاؤ۔

دوسری وجہ اولاد کیلئے دعاء کرنے کی یہ ہے کہ اگرچہ بظاہر دعاء میں تخصیص ہے، لیکن درحقیقت دعاء میں عموم پایا گیا ہے۔ کیونکہ انبیاء کرام کی اولاد کی اصلاح سے دوسرے لوگوں کی اصلاح ہوتی ہے۔

" فکأنہما قالا واصلح عامة عبادک باصلاح بعض ذریتنا " گویا کہ ان دونوں ہستیوں نے رب تعالیٰ کے حضور عرض کیا کہ اے ہمارے رب ہماری بعض اولاد کو اپنی فرمانبرداری پر قائم رکھ کر عام لوگوں کی اصلاح فرما۔

بعض اولاد کے لئے دعاء کیوں؟

جب ان دونوں حضرات کو یہ علم حاصل ہوگیا کہ ہماری اولاد میں سے کوئی نیک لوگ ہوں گے، اور کوئی ظالم ہوں گے۔ اور جب یہ بھی ان کو معلوم تھا کہ دعاء ظالموں، کافروں کے لئے نہیں کی جاتی، اس لئے انہوں نے اپنی بعض اولاد کے لئے دعاء کی، ان کی دعاء کا مطلب ہی یہ ہے کہ اے اللہ ہماری اولاد میں سے جو لوگ مومن ہوں گے، ان کو ایمان پر قائم ودائم رکھ۔

اور ظالموں، جاہلوں کے لئے دعاء نہ کرنے کی یہ وجہ تھی تاکہ نظام دنیا قائم رہے۔ اس کی تفصیل کچھ اس طرح ہے۔

اللہ تعالیٰ کی حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ جہان افاضل اور اواسط اور اراذل سے خالی نہ رہے۔

" فالا فاضل هم اهل الله الذين اخلصوا انفسهم لله بالاقبال الكلى عليه "

افاضل وہ اللہ والے ہیں جو خالص اور کامل طور پر اپنے آپ کو رب تعالیٰ کی طرف متوجہ رکھیں

" والاواسط هم اهل الآخرة الذين يجتنبون المنكرات ويواظبون على الطاعات رغبة فى نيل المثوبات "

اور اواسط یعنی درمیانے لوگ وہ ہیں جن کی توجہ آخرت کی طرف ہوتی ہے۔ اور گناہوں سے

بچتے ہیں۔اور نیکیوں پر ہمیشہ قائم رہتے ہیں اور ثواب حاصل کرنے کی رغبت رکھتے ہیں۔

" والاراذل هم اهل الدنيا الذين يعلمون ظاهرا من الحياة وهم عن الآخرة هم غافلون جعلوا همتهم عمارة الدنيا وتهيئة اسبابها "

رذیل لوگ یعنی گھٹیا لوگ وہ ہیں جو صرف دنیا کی زندگی سے ہی تعلق رکھتے ہیں، اور آخرت سے وہ غافل رہتے ہیں وہ دنیا کو آباد کرنے اور اسی کے اسباب کی تیاری میں رہتے ہیں۔

دنیا کا آباد کرنا تین چیزوں پر ہے۔(۱) کھیتی باڑی اور شجر کاری (درخت لگانے) (۲) خاندانی رقابت اور طبیعت میں جوشیلا پن اور جنگ کرنا۔(۳) اشیاء کو ایک شہر سے دوسرے شہر کی طرف لانا۔

" ومن اكب على هذه الاشياء نسى الموت والبعث والحساب "

جو شخص ان چیزوں کی طرف ہی کامل متوجہ رہا، گویا کہ ان پر اوندھا ہو کر گر پڑا تو اسے موت بھول گئی، قیامت اور حساب کو وہ بھول گیا۔

اگر کسی شخص نے کامل طور پر فقط دنیا کو آباد کرنے کی کوشش کی، اور اپنے فکر کو صرف دنیاداری کی طرف ہی لگائے رکھا۔ "فهو متوغل فى الجهل والحماقة " وہ جہالت اور حماقت میں کامل طور گھر گیا۔

" ولهذا قيل لولا الحمقى لخربت الدنيا " اسی وجہ سے یہ بیان کیا گیا ہے کہ اگر بیوقوف نہ ہوتے تو دنیا خراب ہو جاتی۔واضح ہوا کہ آپ نے ظالموں کے لئے دعاء اسی لئے نہیں کی تا کہ نظام دنیا بھی آباد رہے اور جہنم کے لئے بھی مخلوق قائم رہے۔ (از بیضاوی و شیخ زادہ)

" وقيل اراد بالامة المسلمة امة محمد ﷺ "اور بعض حضرات نے بیان فرمایا کہ ابراہیم علیہ السلام نے جو دعاء امت مسلمہ کے لئے کی اس سے آپ کی مراد امت محمد مصطفیٰ ﷺ ہے۔ (ابوالسعود) تاہم راقم کے نزدیک تعمیم ہی بہتر ہے کہ آپ نے دعاء اپنی اولاد میں سے تمام مسلمانوں کے حق میں کی، خواہ وہ اس وقت موجود تھے، یا بعد میں آنے والے ہوں۔اس طرح آپ کی دعاء میں خود بخود امت محمد مصطفیٰ ﷺ بھی آ گئی۔

وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا : اس مقام میں " ارنا " یا تو رؤیۃ بصریۃ سے لیا ہوا ہے، باب افعال پر آنے کی وجہ سے متعدی بدو مفعول ہو گیا اس صورت میں معنی ہوگا ''اور ہمیں دکھا''

اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ " رؤية قلبية " سے ماخوذ ہو، لیکن معرفت کے معنی میں ہوگا۔اسی

لئے دو مفعول ہیں۔ اگر علم کے معنی میں ہو تو باب افعال پر آنے سے اس کے تین مفعول ہوتے ہیں۔
آیۂ کریمہ میں دو مفعول ہی ذکر ہیں۔ اس صورت میں معنی ہوگا اور ہمیں پہچان کرا، ہمیں بتا۔

اعتراض: ابن حاجب اور اس کے متبعین ابوحیان وغیرہ نے " رأی "کو " عرف " کے معنی میں استعمال کرنے سے انکار کیا ہے کہ اس کا کوئی ثبوت نہیں۔ تو معرفت کے معنی میں لینا کیسے صحیح ہے؟

جواب: علامہ زمخشری نے مفصل میں، اور راغب نے اپنی مفردات میں ذکر کیا ہے کہ " رؤية " بمعنی معرفت آتا رہتا ہے۔ " وهما من الثقات فلا عبرة بانكارهما " یہ دونوں علم نحو میں مضبوط مقام رکھتے ہیں۔ اس لئے اس کا انکار ممکن نہیں۔ (از روح المعانی)

مَنَاسِكَنَا : نسک کا معنی عبادت کرنا، عبادت کرنے والے کو " ناسک " کہا جاتا ہے۔

اور ذبح کرنے کو بھی " نسک " کہا جاتا ہے۔ اور ذبیحہ کو "نسیکہ" اور اسی طرح افعال حج کو "مناسک" کہا جاتا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا " خذوا عني مناسككم لعلي لاالقاكم بعد عامي هذا "، مجھ سے افعال حج کے طریقے حاصل کرلو، ہوسکتا ہے اس سال کے بعد میری ملاقات تم سے نہ ہو۔

اور وہ مقامات جہاں حج کے احکام ادا ہوتے ہیں ان کو بھی مناسک کہا جاتا ہے۔ اور کبھی فرق بھی کرلیا جاتا ہے کہ جب " منسک " کے سین پر فتحہ ہو تو معنی ہوگا "فعل حج" اور جب کسرہ ہو یعنی مسجد، مشرق اور مغرب کے وزن پر ہو تو معنی ہوگا "جگہ"

آیۂ کریمہ میں " مناسک " کا معنی ذبیحہ تو درست نہیں، البتہ حج کے احکام اور مقامات مراد ہوسکتے ہیں اور اگر عام عبادات مراد لے لی جائیں تو زیادہ بہتر ہے۔

اب ان الفاظ مبارکہ کے یہ معانی ہوگئے (۱) اور دکھا ہمیں احکام حج (۲) اور دکھا ہمیں مقامات حج۔ (۳) اور بتا ہمیں احکام حج۔ (۴) اور بتا ہمیں مقامات حج (۵) اور دکھا ہمیں عبادات کے طریقے۔ (۶) اور بتا ہمیں عبادت کے طریقے۔

اعلیٰ حضرت کا یہی آخری ترجمہ ہے جو آپ نے کبیر کے ان الفاظ سے لیا ہے۔
"علمنا كيف نعبدک واين نعبدک وبما ذا نتقرب اليک حتى نخدمک به كما يخدم العبد مولاه "

ہمیں بتا ہم تیری عبادت کیسے کریں۔ اور کہاں تیری عبادت کریں۔ اور کن چیزوں سے تیرا قرب حاصل کریں، یہاں تک کہ تیری خدمت ایسے کریں جیسے غلام اپنے مالک کی خدمت کرتا ہے۔ (از کبیر)

راقم کا ترجمہ خازن کی اس عبارت سے ماخوذ ہے۔ " فاجاب الله دعاء هما وبعث جبريل فاراهما المناسک " اللہ تعالیٰ نے ان دونوں حضرات کی دعاء کو قبول فرمالیا اور جبریل کو بھیجا، انہوں نے ان دونوں حضرات کو عبادات کے طور طریقے دکھادیئے۔ جب عرفات پر پہنچے تو پوچھا "عرفت يا ابراهيم " اے ابراہیم کیا تم نے پہچان لیا؟ ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا ہاں، فسمی ذلک الوقت عرفة والموضع عرفات "اس وقت کو عرفہ کہا گیا اور جگہ کو عرفات کہا گیا۔

(از خازن)

وَتُبْ عَلَيْنَا ۚ اِنَّکَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ : اور رجوع فرما ہماری طرف، بے شک تو توبہ قبول فرمانے والا، رحم کرنے والا ہے۔ انبیاء کرام رب تعالیٰ سے اپنے مدارج کی بلندی کی دعاء کرتے رہتے ہیں۔ اور جب وہ دنیاوی کاموں میں مشغول ہوں، اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ میں بظاہر کمی محسوس کریں تو وہ رب تعالیٰ کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ یہی ان کی توبہ ہوتی ہے۔ اور مالک الملک کا ان کی طرف کامل رحمت سے توجہ کرنا ان کی توبہ کو قبول کرنا ہوتا ہے۔

اسی وجہ سے اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ نے " وتب علينا " کا ترجمہ کیا ہے۔ "اور ہم پر اپنی رحمت سے رجوع فرما۔ ابراہیم علیہ السلام کے توبہ کرنے کا بھی یہی مطلب ہے۔

اور وجہ یہ بھی ہے۔

" والمعنى ﴿وَتُبْ﴾ على الظلمة من اولادنا حتى يرجعو الى طاعتک فيكون ظاهر الكلام الدعاء لانفسهما والمراد به ذريتهما "

کہ آپ دونوں حضرات کی دعاء اگرچہ بظاہر اپنے لئے تھی، لیکن حقیقت میں وہ دعاء اپنی اولاد میں سے ظالموں کے لئے تھی، اے اللہ جو لوگ ہماری اولاد میں سے ظالم ہوں گے ان کو توبہ کی توفیق عطاء فرمانا اور ان کی توبہ کو قبول فرمانا۔

اسی وجہ پر حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی قراءت تائید بھی کررہی ہے۔ " وقرأ ابن مسعود وارهم مناسكهم " جس کا مطلب ہی یہ ہے کہ اے اللہ ہماری اولاد کو عبادت کے طریقے دکھا، اس کے مناسب توبہ کی قبولیت کی دعاء بھی اولاد کے لئے ہوگی۔

(از روح المعانی)

فائده : توبہ کے مختلف مدارج ہیں، کیونکہ توبہ کرنے والوں کے مدارج مختلف ہیں۔

" توبة سائر المسلمين الندم والعزم على عدم العود وردا لمظالم اذا امكن ، ونية الرد اذا لم يمكن "

عام مسلمانوں کی توبہ یہ ہے کہ وہ گناہوں پر نادم ہو جائیں، اور آئندہ گناہ نہ کرنے کا پختہ ارادہ کرلیں۔ اور مظالم (یعنی ظلم سے حاصل کئے ہوئے منافع) واپس کرے جہاں تک ممکن ہو۔ اگر ممکن نہ ہو تو نیت کرلے کہ جب مجھے طاقت حاصل ہوگی، تو لوگوں کے حقوق میں ادا کروں گا۔

" وتوبة الخواص الرجوع عن المکروهات من خواطر السوء والفتور فی الاعمال والاتیان بالعبادة علی وجه غیر الکمال "

خواص کی توبہ یہ ہے کہ دل میں برے خیالات کے آنے کی وجہ سے جو مکروہ حالت پیدا ہوتی ہے وہ اس سے بھی توبہ کرتے ہیں اور اعمال میں ذرا بھر کمی محسوس کریں تو توبہ کرتے ہیں۔ اور عبادت کو کامل طریقہ سے نہ ادا کر سکنے پر بھی وہ توبہ کرتے ہیں۔

" وتوبة خواص الخواص لرفع الدرجات والترقی فی المقامات "

خواص الخواص کی توبہ درجات کی بلندی اور مقامات کی ترقی کے لئے ہوتی ہے۔ (از روح المعانی)

اسی بحث سے گمراہوں کا رد ہوگیا:

بعض لوگ قرآن پاک اور احادیث مبارکہ کے مطالب کو سمجھنے سے قاصر ہوتے ہیں۔ ظاہر الفاظ کو دیکھ کر ظاہری معانی سے خود بھی بھٹک جاتے ہیں۔ اور دوسروں کو بھی بھٹکاتے رہتے ہیں۔

اس آیۃ کریمہ میں بھی ان لوگوں نے ﴿ وَتُبْ عَلَيْنَا ﴾ سے گمراہی حاصل کی۔ اور یوں کہا۔

" ان التوبة لاتطلب من الله الا بعد تقدم الذنب فلو لا تقدم الذنب لم یکن لطلب التوبة وجه " (خازن)

بے شک توبہ اللہ سے اس وقت تک نہیں طلب کی جاتی جب تک پہلے گناہ نہ پائے جائیں، گناہوں کے بعد ہی توبہ کی جاتی ہے اگر گناہ نہ پائے جائیں تو توبہ کرنے کا مقصد ہی کیا ہے۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ انبیاء گنہگار ہوتے ہیں۔

اس کا جواب پہلے آچکا ہے کہ انبیاء کرام کی توبہ مدارج کی بلندی کے لئے ہوتی ہے۔ اور اپنی امت کے گنہگار لوگوں کے لئے ہوتی ہے۔ انبیاء کرام کو گنہگار کہنے والے خود بھی بھٹک جاتے ہیں اور دوسروں کو بھی گمراہ کرتے ہیں۔

راقم نے اسی پارہ کی چوتھے رکوع میں انبیاء کرام کے گناہوں سے پاک ہونے کا تذکرہ تفصیل سے کردیا ہے۔ وہاں دیکھا جائے۔

﴿رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولاً مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ ط اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ﴾ (آیت ۱۲۹)

۱) اے رب ہمارے اور بھیج ان میں ایک رسول انہیں میں سے کہ ان پر تیری آیتیں تلاوت فرمائے، اور انہیں تیری کتاب اور پختہ علم سکھائے، اور انہیں خوب ستھرا فرما دے اور بے شک تو ہی ہے غالب حکمت والا۔

۲) اے ہمارے رب، اور بھیج ان میں ایک رسول جو ان میں سے ہی ہو، تلاوت کرے ان پر تیری آیتیں، اور سکھائے ان کو کتاب اور حکمت، اور ان کو پاکیزہ کرے۔ بے شک تو ہی غالب، حکمت والا ہے۔

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولاً مِّنْهُمْ :

اے ہمارے رب، اور بھیج ان میں ایک رسول جو ان میں سے ہی ہو۔

ابراہیم علیہ السلام اور اسماعیل علیہ السلام کی یہ دعاء نبی کریم ﷺ کے حق میں قبول ہوئی۔ رب تعالیٰ نے دوسرے مقام پر ذکر فرمایا ﴿هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْاُمِّيِّينَ رَسُولاً﴾ (سورۃ جمعہ) وہ ذات جس نے امیین میں رسول بھیجا۔

اس آیت میں بھی رسول سے مراد حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ ہی ہیں۔

اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعاء کی قبولیت کا آپ کے الفاظ کے مطابق ہی رب تعالیٰ نے ذکر فرمایا، جس سے مراد بالاتفاق نبی کریم ﷺ ہیں۔

﴿لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ اِذْ بَعَثَ فِيهِمْ رَسُولاً مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوا مِنْ قَبْلُ لَفِي ضَلٰلٍ مُّبِينٍ﴾ (آل عمران ۱۶۴)

بے شک اللہ کا بڑا احسان ہوا مسلمانوں پر کہ ان میں انہیں میں سے ایک رسول بھیجا جو ان پر اس

کی آیتیں پڑھتا ہے اور انہیں پاک کرتا ہے اور انہیں کتاب وحکمت سکھاتا ہے، اور وہ ضرور اس سے پہلے کھلی گمراہی میں تھے۔

اس آیۃ کریمہ کی وضاحت تو اپنے مقام پر آئے گی۔ اتنا واضح ہو کہ رسول سے مراد اس آیۃ میں ''سید عالم خاتم الانبیاء محمد مصطفیٰ ﷺ'' ہیں۔ (خزائن العرفان)

اس کی تائید حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کی قراءت سے بھی ملتی ہے۔ ﴿وَابْعَثْ فِيهِمْ فِي آخِرِهِمْ رَسُولاً﴾ حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کی دعاء کا مطلب ہی یہ تھا کہ اے اللہ اس سرزمین حرم کے باشندوں کے لئے اپنے آخری رسول کو مبعوث فرما۔

اس قراءت کی تائید آثار سے ملتی ہے۔

" انه لما دعا ابراهيم قيل له قد استجيب لک وهو يكون في آخر الزمان "

اس لئے کہ جب ابراہیم علیہ السلام نے دعاء فرمائی تو آپ کو جواب دیا گیا کہ آپ کی دعاء کو قبول کرلیا گیا۔ وہ نبی جن کے لئے تم نے دعاء کی وہ آخر زمانہ میں تشریف لائیں گے (جن کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا)

اس مقام پر علامہ ابوحیان رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔ " ولا خلاف انه رسول الله محمد ﷺ "

اس میں کسی کا اختلاف نہیں کہ بے شک وہ اللہ کے رسول جن کے لئے ابراہیم واسماعیل علیہما السلام نے دعاء کی اس سے مراد حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ ہیں۔ (البحر المحيط)

" واما ان الرسول هو محمد ﷺ فيدل عليه وجوه' احدها اجماع المفسرين وهو حجة "

بے شک اس دعاء میں رسول سے مراد حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ ہیں، اس پر چند طرح کے دلائل پائے جاتے ہیں۔ ان میں ایک دلیل یہ ہے کہ اس پر مفسرین کرام کا اجماع ہے۔ جو بہت بڑی قوی دلیل ہے۔

" وثانيهما ان ابراهيم عليه السلام انما دعا بهذا الدعاء بمكة لذريته الذين يكونون بها وبما حولها ، ولم يبعث الله تعالى الى من بمكة وما حولها الا محمدا ﷺ "

ان میں سے دوسری دلیل یہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے یہ دعاء مکہ میں کی، اور یہ دعاء مکہ اور اس کے اردگرد رہنے والوں کے لئے تھی کہ اے اللہ'' ان میں رسول بھیج جو ان میں سے ہی ہو۔''

اللہ تعالیٰ نے مکہ والے لوگوں کے لئے اور اس کے اردگرد والے لوگوں کے لئے کوئی اور رسول سوائے حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے مبعوث فرمایا ہی نہیں۔

ان دلائل میں تیسری دلیل یہ ہے کہ خود نبی کریم ﷺ نے فرمایا" انا دعوة ابراهيم " میں ابراہیم کی دعاء ہوں۔یعنی میں ابراہیم علیہ السلام کی دعاء کا اثر ہوں، میں ان کا طلب کیا ہوا ہوں۔ (از کبیر)

حدیث اور اس کی وضاحت:

ابھی کبیر کے حوالہ سے حدیث شریف کا ایک جملہ نقل کیا۔ وہ حدیث مکمل اس طرح ہے۔

حضرت عرباض بن ساریہ سے روایت ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔

"انی عند الله مكتوب خاتم النبيين وان آدم لمنجدل فی طينته وسأخبر كم باوّل امری دعوة ابراهيم و بشارة عيسى و رؤيا امی التی رأت حين وضعتنی وقد خرج لها نور اضاء لها منها قصور الشام" (شرح السنة ، مسند احمد از ساخبر کم تا آخر ، مشکوۃ باب فضائل سید المرسلین ص ۵۱۳)

میں اللہ تعالیٰ کے ہاں اس وقت بھی خاتم النبیین لکھا ہوا تھا جب کہ آدم علیہ السلام ابھی کیچڑ میں تھے، یعنی آپ کا خمیر تیار کیا جا رہا تھا۔ میں تمہیں اپنے اول امور کی خبر دے رہا ہوں کہ میں ابراہیم کی دعاء ہوں، اور عیسیٰ کی بشارت ہوں، اور اپنی ماں کی رؤیا ہوں، جو آپ نے اس وقت دیکھا جب مجھے جنا کہ آپ سے ایک نور ظاہر ہوا جس سے شام کے محلات روشن ہو گئے۔

" دعوة ابراهيم " سے اسی دعاء کی طرف اشارہ ہے جس کا ذکر اس زیر بحث آیۃ کریمہ میں ہے، یعنی حضور ﷺ نے وضاحت فرما دی کہ ابراہیم علیہ السلام نے میرے آنے کی دعاء کی۔

" بشارة عيسى " سے مراد جو عیسیٰ علیہ السلام نے کہا، رب تعالیٰ نے اسے ان الفاظ مبارکہ سے ذکر فرمایا۔ ﴿ وَمُبَشِّرًا بِرَسُوْلٍ يَّاْتِيْ مِنْ بَعْدِي اسْمُهٗٓ اَحْمَدُ ﴾ آپ نے بشارت دی کہ میرے بعد ایک رسول تشریف لائیں گے جن کا نام احمد ہوگا۔

" رؤيا امی " سے مراد کیا خواب کا واقعہ ہے یا ظاہر طور پر دیکھنا مراد ہے؟ اس پر شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔

"ظاهر هذا الكلام ان رؤية نور اضاء به قصور الشام كانت فی المنام وقد جاء ت للاخبار

انہا کانت فی الیقظة و اما الذی فی المنام فھو انہا رأت انہ اتاھا آت فقال لھا شعرت انک قد حملت بسید ھذہ الامة و نبیھا فیبنغی ان یحمل الرؤیا علی الرؤیة بالعین واللہ اعلم "
(لمعات)

اگرچہ ظاہر طور پر تو سمجھ آتا ہے کہ آپ کی والدہ کا نور کو دیکھنا، جس سے شام کے محلات روشن ہوئے، خواب کا واقعہ ہو۔ لیکن احادیث میں یہی واقعہ جاگتے ہوئے درپیش آنے کا ذکر بھی ہے، خواب کا واقعہ اس طرح بیان کیا گیا ہے۔ کہ آپ کی والدہ نے خواب دیکھا کہ کوئی شخص میرے پاس آ کر مجھے کہہ رہا ہے کیا تمہیں معلوم ہے کہ تم اس امت کے سردار اور نبی حاملہ ہو چکی ہو، مناسب یہی ہے کہ اس حدیث میں رؤیا سے آنکھ سے دیکھنا جاگتے ہوئے مراد لیا جائے۔

راقم کے نزدیک اس حدیث میں خواب کا معنی لینا ہی حقیقت سے دوری کی علامت ہے۔ اس لئے کہ " حین وضعتنی " ظرف ہے۔ " رأت "کی (جس وقت میری والدہ نے مجھے جنا اس وقت دیکھا) پیدائش کے وقت خواب کا دیکھنا ناممکن ہے۔

اس حدیث میں ظاہری طور پر دیکھنا مراد لیا جائے تو یہ معنی ظاہری ترکیب کے بالکل مطابق ہے، خواب والا معنی لینا تکلفات اور تاویلات سے خالی نہیں۔

اصل میں بنیادی طور پر غلطی کی وجہ یہ ہے کہ " رؤیا " کا معنی خواب مشہور و معروف ہے۔ لیکن رؤیا کا معنی " الرؤیة بالعین " (آنکھ سے دیکھنا) کم مشہور ہے، اس لئے اس حدیث میں بھی محققین حضرات نے معنی خواب کر دیا ہے جسے راقم کے ذہن نے قبول نہیں کیا۔

ایک شبہ کا ازالہ:

ظاہر ترجمہ کرنے والوں نے اس حدیث سے بھی غلطی کھائی، وہ کہتے ہیں، کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا " انا دعوة ابراھیم " (میں ابراہیم کی دعاء ہوں) اس سے پتہ چلا کہ حضرت اسماعیل علی علیہ السلام کی دعاء قبول نہیں ہوئی، اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعاء قبول ہوئی۔

اس قول کا رد علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ یہ ان کا کہنا باطل ہے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے۔

" ولما کان اسمعیل علیہ السلام شریکا فی الدعوة کان رسول اللہ ﷺ دعوة اسمعیل ایضا الا انہ خص ابراھیم لشرافتہ و کونہ اصلا فی الدعاء "

جب حضرت اسماعیل علیہ السلام بھی دعاء میں شریک تھے تو نبی کریم ﷺ ان کی دعاء کا بھی اثر ہیں، البتہ صرف ابراہیم علیہ السلام کا ذکر ان کی بزرگی کے پیش نظر تھا، پھر وہ باپ ہونے کے لحاظ پر اصل بھی ہیں۔لہٰذا نبی کریم ﷺ نے بامحاورہ کلام فرمایا، کیونکہ عام طور پر محاورہ یہی ہے کہ کسی گھر کے افراد مل کر بھی کلام کریں، تو عام طور پر گھر کے سربراہ کا نام ہی ذکر ہوتا ہے۔کہ فلاں شخص نے یہ کام کیا۔

(ماخوذ از روح المعانی)

عجیب حکمت:

نماز میں درود شریف پڑھا جاتا ہے اس میں نبی کریم ﷺ کے اسم گرامی کے ساتھ ابراہیم علی علیہ السلام کا اسم گرامی ملا کر پڑھا جاتا ہے۔

" اللھم صل علی محمد وعلی آل محمد کما صلیت علی ابراھیم وعلی آل ابراھیم انک حمید مجید "اس میں کیا حکمت ہے؟

اس میں چند وجوہ پائی گئی ہیں:

۱) جب ابراہیم علیہ السلام نے حضرت محمد ﷺ کے لیے دعاء فرمائی، یعنی عرض کیا ﴿ ربنا وَابۡعَثۡ فِيۡهِمۡ رَسُوۡلًا مِّنۡهُمۡ يَتۡلُوۡا عَلَيۡهِمۡ اٰيٰتِكَ ﴾ (اے ہمارے رب اور بھیج ان میں رسول جو ان میں سے ہی ہو، ان پر تیری آیات کی تلاوت کرے) تو اب اللہ کے حبیب پر بھی لازم ہو گیا کہ وہ بھی حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کے لئے دعاء فرمائیں۔

" قضی اللہ تعالی عنه حقه بان اجری ذکره علی السنة امته الی یوم القیامة "

اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب کی طرف سے اپنے خلیل کا حق اس طرح ادا کر دیا کہ نبی کریم ﷺ کی امت کی زبانوں پر قیامت تک جاری فرما دیا۔

۲) حضرت ابراہیم علیہ السلام نے رب تعالیٰ کے حضور دعاء کی ﴿ وَاجۡعَلۡ لِّىۡ لِسَانَ صِدۡقٍ فِى الۡاٰخِرِيۡنَ ﴾ (الشعراء ۸۴) اور کر دے میرا اچھا ذکر آنے والوں میں۔

" یعنی ابق لی ثناء حسنا فی امة محمد ﷺ " یعنی آپ کی اس دعاء کا مطلب یہ ہے کہ آپ نے رب تعالیٰ کے حضور عرض کیا "میری طرف امت محمد مصطفیٰ ﷺ میں باقی رکھنا۔"

" فاجابه اللہ تعالی وقرن ذکره بذکر حبیبه ابقاء للثناء الحسن الیه فی امته "

تو اللہ تعالیٰ نے آپ کی دعاء کو قبول فرمالیا، آپ کے ذکر کو اپنے حبیب ﷺ کے ذکر کے ساتھ ملا لیا، تاکہ آپ کا اچھا ذکر نبی کریم ﷺ کی امت کی زبانوں پر تا قیامت باقی رہے۔

۳) حضرت ابراہیم علیہ السلام " اب الملة " ہیں۔ جس پر اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ﴿ مِلَّةَ اَبِيكُمْ اِبْرَاهِيمَ ﴾ دلالت کر رہا ہے۔ اور نبی کریم ﷺ " اب الرحمة " ہیں۔ رب تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ بِالْمُؤْمِنِينَ رَؤُفٌ رَّحِيمٌ ﴾ آپ مومنوں پر مہربان رحم کرنے والے ہیں۔

اور نبی کریم ﷺ نے فرمایا "انما انا لکم مثل الوالد " یعنی فی الرافة والرحمة " بیشک میں تمہارے لئے تمہارے باپ کی طرح ہوں۔ یعنی باپ کی طرح تم پر مہربان اور رحم کرنے والا ہوں " فلما وجب لکل واحد منهما حق الابوة من وجه قرن بین ذکرهما فی باب الثناء والصلوة "

جب دونوں حضرات یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام اور نبی کریم ﷺ کو امت پر مہربانی کی وجہ سے باپ ہونے کا حق حاصل ہے، تو اس وصف کے ظاہری اشتراک کی وجہ سے ان دونوں حضرات کے ذکر کو درود شریف میں ملا دیا۔

۴) حضرت ابراہیم علیہ السلام شریعت میں حج کا اعلان کرنے والے وصف سے متصف ہیں۔ رب تعالیٰ فرمایا ﴿ وَاَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ ﴾ اور لوگوں میں حج کی عام ندا کر دے۔ (الحج ۲۷)

اور نبی کریم ﷺ دین کی ندا دینے والے ہیں، رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿ رَبَّنَا اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِيًا يُّنَادِي لِلْاِيْمَانِ ﴾ اے ہمارے رب ہم نے ایک نداء فرمانے والے کو سنا جو ایمان کی نداء فرماتا ہے۔

(آل عمران ۹۳)

جب دونوں حضرات منادی ہونے کے وصف میں شریک ہیں۔ " فجمع الله تعالى بينهما فى الذكر الجميل " تو اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کو ذکر جمیل میں ایک جگہ جمع کر دیا۔

(ماخوذ از کبیر)

يَتْلُوا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ :

تلاوت کرے ان پر تیری آیات اور سکھائے ان کو کتاب وحکمت۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب اللہ تعالیٰ سے دعاء کی کہ اے ہمارے رب اور بھیج ان میں رسول جو ان سے ہی ہو، تو ساتھ ہی رب کے حضور اس رسول کی تین صفات کا بھی ذکر کیا۔

۱) ان پر تیری آیات تلاوت کرے، (۲) ان کو کتاب سکھائے۔ (۳) اور ان کو حکمت سکھائے

پہلی صفت ﴿ یَتۡلُوۡ عَلَیۡهِمۡ اٰیٰتِکَ ﴾ میں دو وجہ ہیں۔ ایک یہ کہ اس سے مراد " انها الفرقان الذی انزل علی محمد ﷺ " قرآن پاک ہے جو حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ پر نازل ہوا، اس وجہ سے کہ آپ جو قوم پر تلاوت فرماتے وہ قرآن پاک ہی تو ہے۔ لہٰذا یہی معنی لیا جائے۔

دوسری وجہ یہ ہے۔

"یجوز ان تکون الآیات هی الاعلام الدالة علی وجود الصانع وصفاته سبحانه وتعالی ومعنی تلاوته ایاها علیهم انه کان یذکرهم بها ویدعوهم الیها ویحملهم علی الایمان بها "

کہ آیات سے مراد وہ علامات ہوں جو وجود صانع (رب تعالیٰ کی خالق ذات کے وجود) اور اس کی صفات پر دلالت کریں اور تلاوت کا مطلب یہ ہو جائے کہ وہ ان کے ذریعے ان کو نصیحت کریں۔ اور ان لوگوں کو ان کی طرف آنے کی دعوت دیں اور ان کو ان علامات و آیات پر ایمان لانے پر برانگیختہ کریں۔ دوسری صفت حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے مطلوب رسول کی یہ بیان کی ﴿ وَیُعَلِّمُهُمُ الۡکِتٰبَ ﴾ (اور ان کو کتاب سکھائے) اور مراد اس سے یہ ہے کہ ان کو کتاب کی تلاوت کا حکم دیں اور ان کو کتاب کے معانی اور حقائق سکھائیں۔

تلاوت چند وجہ سے مطلوب ہے:

" منها بقاء لفظها علی السنة اهل التواتر فیبقی مصونا عن التحریف والتصحیف "

ان وجوہ میں سے ایک وجہ یہ ہے کہ قرآن پاک کے الفاظ کی لگاتار تلاوت ہوتی رہے، جب تواتر سے قرآن پاک کی تلاوت ہوتی رہے گی تو اس کے الفاظ مبارکہ میں کسی قسم کی تحریف نہیں ہو سکے گی۔ نہ الفاظ کو توڑ موڑ کر پیش کرنے کی کوئی جسارت کر سکے اور نہ ہی ان میں کوئی کمی اور زیادتی کر سکے۔

" ومنها ان یکون لفظه ونظمه معجزا لمحمد ﷺ " اور تلاوت کا یہ فائدہ ہے کہ اس سے پتہ چلتا ہے کہ قرآن پاک نبی کریم ﷺ کا معجزہ ہے۔

اگر معجزہ نہ ہوتا تو یہود ونصاری قرآن پاک میں تحریف کر چکے ہوتے، اس قرآن جیسا قرآن بنا چکے ہوتے، لیکن قیامت تک اپنے سر دھنتے رہیں، ان شاءاللہ دین اسلام کو نہیں مٹا سکیں گے۔ ایک وقت آئے گا جب یہودیوں کا یار، فریبی ومکار ذلیل ہو کر جائے گا۔

" و منها ان یکون فی تلاوته نوع عبادة و طاعة " تلاوت کرنے کا اور فائدہ یہ ہے کہ تلاوت کرنا عبادت ہے۔ اور تلاوت کرنا طاعت ہے۔ یقیناً عبادت وطاعت پر عظیم ثواب مرتب ہوتا ہے۔ لہٰذا تلاوت کرنا باعث اجر وثواب ہے۔

علامہ رازی رحمہ اللہ کے اسی قول سے جہلاء کا موقف مردود ہو گیا جو یہ کہتے ہیں کہ قرآن سمجھنے کے بغیر پڑھنا کوئی فائدہ نہیں دیتا۔ وہ دراصل لوگوں کو عبادت سے منع کر رہے ہیں یہود کے ہمنوا ہیں کہ قرآن کی تلاوت نہ ہو۔ تاکہ یہود کو موقع مل سکے وہ اپنی مرضی سے اس میں کچھ نئی سورتیں داخل کر سکیں۔ لیکن ان جہلاء کو معلوم نہیں کہ قرآن پاک کا محافظ رب تعالیٰ ہے۔ کوئی بندہ نہیں کہ وہ حفاظت سے عاجز آجائے۔

" ومنها ان تکون قراء ته فی الصلوات وسائر العبادات نوع عبادة " اور فائدہ یہ ہے کہ قرآن پاک کی تلاوت تمام نمازوں میں ہوتی ہے۔ اس لئے قرآن پاک کی تلاوت عبادت ہے یہاں تک جو حکم بیان کیا گیا ہے۔ اس کا تعلق تلاوت سے ہے۔ لیکن " ان الحکمة العظمی والمقصود الاشرف تعلیم ما فیه من الدلائل والاحکام " عظیم حکمت اور مقصود اشرف قرآن پاک میں جو دلائل اور احکام ہیں ان کی تعلیم دینا ہے۔ اسی لئے رب تعالیٰ نے قرآن پاک کا وصف ﴿ هُدًى وَّنُورٌ ﴾ ذکر فرمایا، کہ یہ ہدایت دینے والی کتاب ہے، اور نور بکھیرنے والی عظیم کتاب ہے۔

اسی وجہ سے اس زیر بحث آیہ کریمہ میں بھی رب تعالیٰ نے پہلے تلاوت کا ذکر فرمایا، پھر اس کے حقائق اور اسرار کی تعلیم کا ذکر فرماتے ہوئے۔ ﴿ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ ﴾ ذکر فرمایا۔

واضح ہوا کہ قرآن پاک کا صرف تلاوت کرنا عبادت باعث اجر وثواب ہے، ہاں البتہ اللہ تعالیٰ سمجھنے کی بھی توفیق عطاء فرمائے تو اور ہی زیادہ نفع مند ہے۔

فائدہ: حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعاء ﴿ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ ﴾ سے اور فائدہ یہ حاصل ہوا کہ

قرآن پاک کی سمجھ کامل اور کما حقہ اس وقت حاصل ہوسکتی ہے جب وہ نبی کریم ﷺ کی تعلیمات سے سمجھے، ورنہ کفار، مشرکین، منافقین، یہود و نصاریٰ عربی زبان کے ماہر تھے لیکن وہ قرآن پاک کو نہ سمجھ سکے، چونکہ فقط عربی زبان کی مہارت سے قرآن پاک سمجھ میں نہیں آسکتا، صحابہ کرام، تابعین اور تبع تابعین اور جلیل القدر مفسرین کرام (جن کی تفاسیر سے اقتباس لئے جارہے ہیں) نے قرآن پاک کو کما حقہ تعلیمات مصطفویہ کی روشنی سے ہی سمجھا۔

وَالْحِكْمَةَ : حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جس رسول کے بھیجنے کے لئے رب کے حضور عرض کیا، اس کی تیسری صفت کا بھی ساتھ ہی مطالبہ کیا "کہ وہ ان کو حکمت سکھائے۔"

حکمت کیا ہے؟

" واعلم ان الحكمة هي الاصابة في القول و العمل " قول اور عمل کا درست ہونا حکمت ہے۔

لہٰذا واضح ہوا کہ حکیم وہی ہوگا جس میں یہ دونوں چیزیں پائی جائیں گی، کہ اس کا قول اور اس کا عمل درست ہو۔ اگر کوئی ایک چیز درست نہیں ہوگی تو وہ حکیم نہیں ہوگا۔

☆ حکمت کا اور معنی ہے۔ "رد کرنا" (لوٹانا) جس طرح کہا جاتا ہے۔ " احكمت الشئ اى رددته " میں نے یہ چیز لوٹا دی۔ اس معنی کے لحاظ پر حکمت کو حکمت کہنے کی وجہ یہ ہے۔ "هی التی ترد عن الجهل و الخطأ " کہ یہ انسان کو جہالت اور خطأ سے پھیر دیتی ہے۔ لہٰذا اسی سے پتہ چلا کہ قول و فعل کے مطابق بھی وہی ہے، جو انسان کو جہالت اور خطاء سے پھیر دے۔ یعنی حکمت کا مطلب ہوا۔ " وضع كل شئ موضعه " ہر چیز کو اپنی اپنی جگہ میں رکھنا۔

☆ اور بعض فلاسفہ نے یہ معنی بیان کیا ہے۔ " الحكمة هى التشبه بالاله بقدر الطاقة البشرية " حکمت کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنی طاقت بشریہ کے مطابق جتنا ہوسکے اپنے آپ کو رب تعالیٰ کی صفات کا مظہر بنائے۔

☆ حضرت ابن وہب کہتے ہیں میں نے امام مالک رحمہ اللہ سے پوچھا اس آیۃ کریمہ میں حکمت سے مراد کیا ہے؟ آپ نے فرمایا" معرفة الدين و الفقه فيه و الاتباع له " دین کی معرفت، دین میں تفقہ حاصل کرنا اور دین کی تابعداری کرنا،

☆ امام شافعی رحمہ اللہ نے فرمایا" الحکمة سنة رسول الله ﷺ "حکمت رسول اللہ ﷺ کی سنت کو کہا گیا۔

☆ حکمت کا اور معنی یہ بیان کیا گیا ہے۔ " الحکمة هی الفصل بین الحق والباطل " حکمت اس چیز کو کہا جاتا ہے جو حق اور باطل میں فرق کرے۔

اب اس معنی کے لحاظ پر ابراہیم علیہ السلام کی دعاء کا یہ مطلب ہوگیا کہ" وہ ان کو تیری کتاب سکھائے جو تو نے اس ذات پر نازل کرنی ہے۔اور تیرے فیصلے اور احکام ان کو سکھائے۔

☆ ﴿ ویُعَلِّمُهُمُ الْکِتَابَ ﴾ ارادبه الآیات المحکمة ﴿ وَالْحِکْمَةَ ﴾ ارادبها الآیات المتشابهات "

یعنی آپ کی یہ دعاء کہ ان کو کتاب سکھائے ،اس سے مراد یہ ہے کہ کتاب میں جو آیات محکمات ہیں ان کی تعلیم دے،اور حکمت سے مراد آیات متشابہات ہیں۔کہ ان کو یہ بتائے کہ یہ آیات متشابہات ہیں ان کے درپے نہ ہو۔

☆ ﴿ ویُعَلِّمُهُمُ الْکِتَابَ ﴾ ای یعلمهم ما فیه من الاحکام ﴿ وَالْحِکْمَةَ ﴾ اراد بها انه یعلمهم حکمة تلک الشرائع وما فیها من وجوه المصالح والمنافع "

آپکا یہ عرض کرنا کہ" انکو کتاب سکھائے" اسکا مطلب یہ ہے کہ انکو احکام سکھائے۔اور حکمت کا مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں کو ان احکام شرعیہ میں موجود مصلحتوں اور منفعتوں کی تعلیم دے۔(از کبیر)

حکمت کے معانی جو بیان کئے گئے ہیں ان میں سے کچھ اور علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے بیان فرمائے۔

☆ " والحکمة مایزیل من القلوب وهج حب الدنیا " حکمت سے مراد وہ چیز ہے جو انسانوں کے دلوں میں دنیا کی محبت کی بھڑکتی آگ کو زائل کردے۔یعنی دنیا کی شدید محبت کو دلوں سے نکال دے۔

☆ " وقد یقال المراد به حقائق الکتاب و دقائقه وسائر ما اودع فیه " حکمت کا اور معنی یہ ہے، کتاب کے حقائق اور دقائق اور اس میں جو راز ودیعت ہیں۔

اب کتاب سکھانے کی دعاء کا یہ مطلب ہے کہ الفاظ سمجھائے۔اور الفاظ کے اداء کرنے کی کیفیت سمجھائے ،اور حکمت کی تعلیم دینے کا مطلب یہ ہے کہ اس میں جو راز ودیعت ہیں ان پر مطلع کرنا۔

☆ " وفسرھا بعضھم بما تکمل به النفوس من المعارف والاحکام " اورمطلب یہ ہے کہ وہ ان کو حکمت سکھائے ۔یعنی ان کو معرفت کی باتیں اوراحکام سکھائیں تا کہ ان کے نفوس کی تکمیل ہو سکے۔ (از روح المعانی)

خازن نے بھی حکمت کے کئی معانی ذکر کیے ہیں ۔جو کو کبیر جن اورروح المعانی سے نقل کر دیا گیا۔ اور یہ معنی بھی بیان کیا ہے۔

" وقیل کل کلمة وعظتک او دعتک الی مکرمة او نھتک عن قبیح فھی حکمة "

اور یہ بیان کیا گیا ہے کہ ہر وہ کلمہ جس میں نصیحت پائی جائے ، انسان کو عزت والے مقام پر پہنچائے اور قبیح کاموں سے روکے وہ حکمت ہے۔ (خازن)

اور کتاب سکھانے کا مطلب یہ ہے کہ ان کو ظاہری علوم عطاء کریں ،اور حکمت سکھانے کا مطلب یہ ہے کہ ان کو باطنی علوم سکھائیں جنکی وجہ سے وہ حج کے اسرار پر مطلع ہو سکیں اور نماز کی طرف کامل توجہ کر سکیں۔ (تفسیر الرحمن)

راقم کے نزدیک حکمت کے تمام معانی مجتمع ہیں ،ان میں کوئی تضاد نہیں۔

وَیُزَکِّیھِمْ : (اوران کو پاکیزہ کرے) حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جس رسول کے لئے دعاء فرمائی ،ان کے لئے اورعرض یہ کی کہ وہ ان کو پاکیزہ کریں۔

پاکیزہ کرنے کے معنی میں بھی وسعت پائی گئی ہے ۔ان کو پاکیزہ کرے شرک سے ،اوران کو پاکیزہ کرے بت پرستی سے اوران کو پاکیزہ کرے ہر نجس چیز سے ،اوران کو پاکیزہ کرے ہر رذیل کام سے ،ان کو پاکیزہ کرے ہر نقص سے۔

اور یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب نبی کریم ﷺ کی امت انبیاء کرام کے حق میں قیامت کے دن گواہی دے گی کہ انہوں نے تیرے احکام اپنی امتوں کو پہنچادئے تھے۔

جب کفار یہ کہیں گے کہ یہ تو بعد میں آئے ہیں یہ کیسے گواہی دے رہے ہیں ۔تو یہ کہیں گے ہمیں نبی کریم ﷺ نے بتایا ،تو نبی کریم ﷺ اپنی امت کی عدالت کی گواہی دیں گے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعاء کا یہی مطلب ہے کہ وہ رسول ان کا تزکیہ کریں ،ان کے عادل ہونے کی گواہی دیں۔

" ای یشهد لهم یوم القیامة بالعدالة اذا شهدوا للانبیاء بالبلاغ " (خازن)

پاکیزہ کرنے کی دعاء میں حکمت:

انسان کے کمال کا حال دو چیزوں پر منی ہے۔

" احدهما ان یعرف الحق لذاته "ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ حق کولذاتہ پہچانے۔

" والثانی ان یعرف الخیر لاجل العمل "

اور دوسری چیز یہ ہے کہ انسان نیکی کو پہچانے تا کہ اس پر عمل کر سکے۔

اگران دونوں چیزوں میں سے کسی ایک میں خلل واقع ہوتو وہ شخص رذیل کاموں اور نقائص سے پاک نہیں ہوسکتا۔ جب اللہ تعالیٰ کے حضور فضل وکمال والی صفات کی دعاء کی تو بعد میں یہ دعاء کی کہ وہ ان کو رذیل اور نقص والے کاموں سے پاک کریں۔ (از کبیر)

عقیدہ: حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دعاء فرمائی کہ وہ رسول ان کا تزکیہ فرمائیں، اس سے مراد یہ ہے کہ اے اللہ تو ان کو ان تصرفات کی قدرت بھی دینا کیونکہ رسولوں کو مکلفین کے باطن میں تصرف کی ذاتی طور پر قدرت حاصل نہیں۔ (از کبیر)

فائدہ: اتنا واضح ہوا کہ انسان کو ظاہری اور باطنی پاکیزگی اسی وقت حاصل ہوسکتی ہے، جب نبی کریم ﷺ کا اس میں وسیلہ اور واسطہ پایا جائے، آپ کے بغیر انسان کب مسلمان ہوسکتا تھا۔ یہ تو آپ کا ہی احسان عظیم ہے کہ انسان کو اسلام قبول کر کے شرف انسانیت حاصل ہو گیا۔

نبی کریم ﷺ کا پاکیزہ کرنا:

آپ نے وعد اور وعید، وعظ ونصیحت سے لوگوں کو پاکیزہ فرمایا، پھر بار بار ان کو ان چیزوں کی یاد دلاتے رہے۔ پھر نبی کریم ﷺ نے اپنے اخلاق کریمانہ اور اپنے اعمالِ صالحہ سے لوگوں کو پاک فرمایا کہ انہوں نے آپ کے نیک اعمال کو دیکھ کر وہی عمل کیے اور آپ کے اچھے اخلاق کی وجہ سے آپ کے قریب ہوئے۔ (از کبیر)

اَنَّکَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ: (بیشک تو ہی عزیز وحکیم ہے) حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب اپنی دعاؤں کو اللہ تعالیٰ کے ذکر (ربنا) سے شروع فرمایا تو ختم بھی اللہ کے ذکر سے فرمایا۔

" العزیز ھو القادر الذی لایغلب "

عزیز کا مطلب یہ ہے کہ وہ قادر ہے کوئی اس پر غالب نہیں۔

" والحکیم ھو العالم الذی لا یجھل شیئا " حکیم کا مطلب یہ ہے کہ وہ ہر چیز کو جاننے والا ہے کوئی چیز اس کے علم سے باہر نہیں۔ جب اللہ تعالیٰ عالم و قادر ہے تو اس کا ہر فعل درست ہے اور اس کے کام عبث اور سفاہت سے دور ہیں۔

اگر اللہ تعالیٰ کو یہ صفات علم وقدرت کی نہ حاصل ہوتیں تو دعاؤں کا قبول کرنا، رسول کا بھیجنا اور کتابوں کا نازل کرنا بھی ممکن نہ ہوتا۔

عزیز ہونا اللہ تعالیٰ کی صفات ذاتیہ سے ایک صفت ہے، جب اس کا قادر ہونا معلوم ہو گیا تو اس سے یہ خود بخود ثابت ہو گیا کہ وہ ذلت و رسوائی سے پاک ہے۔

" لانہ اذا کان منزھا عن الحاجات لم تلحقہ ذلۃ المحتاج " جب اللہ تعالیٰ حاجات سے پاک ہے تو اس ذات کو محتاج ہونے کی ذلت حاصل نہیں ہو سکتی۔

" ولا یجوز ان یمنع من مرادہ حتی یلحقہ اھتضام ، فھو عزیز لا محالۃ " اور یہ جائز نہیں کہ اس کو مراد سے روکا جائے کہ اسے اپنی مراد سے ناکام ہونے کی رسوائی لاحق ہو۔ لہٰذا وہ یقینی طور پر عزیز ہے۔

" الحکیم " بھی جب " علیم " ہونے کے معنی میں استعمال ہو تو یہ بھی صفات ذات سے ہے، یعنی اس کی ضد کی خود بخود نفی پائی جاتی ہے کہ وہ جہالت سے پاک ہے۔

فائدہ : اگر عزت سے مراد ' کمال عزت ' ہو۔ اور حکمت سے مراد ' افعال حکمت ' ہو، تو عزیز ہونا اور حکیم ہونا صفات فعل سے ہیں۔

صفات ذات اور صفات فعل میں فرق یہ ہے۔ صفات ذات ازلیہ ہیں اور صفات فعل اس طرح نہیں صفات ذات کی نقیضوں کا سچا آنا کسی وقت میں بھی ممکن نہیں، لیکن صفات فعل کو یہ کیفیت حاصل نہیں۔

صفات فعل امور نسبیہ سے ہیں جن کے تحقق میں اعتبار فاعل سے آثار کا صادر ہونا ہے۔ اور صفات ذات اسی طرح نہیں۔ (از کبیر)

﴿وَمَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرَاهِيْمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ ؕ وَلَقَدِ اصْطَفَيْنٰهُ فِي الدُّنْيَا وَاِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ﴾

۱) اور ابراہیم کے دین سے کون منہ پھیرے، سوا اس کے جو دل کا احمق ہے، اور بیشک ضرور ہم نے دنیا میں اسے چن لیا اور بیشک وہ آخرت میں ہمارے خاص قرب کی قابلیت والوں میں ہے۔

۲) اور کون ہے جو منہ پھیرے ابراہیم کے دین سے، سوائے اس کے جو دل کا احمق ہے۔ اور تحقیق ہم نے اسے چن لیا دنیا میں، اور بے شک وہ آخرت میں ہمارے خاص قرب کی قابلیت والوں میں ہے۔ (آیت نمبر ۱۳۰)

جب اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کو آزمانے اور ان کے کامیاب ہونے کا ذکر فرمایا، اور کعبہ شریف کی تعمیر، اور آپ کی دعاؤں اور آپ کا لوگوں کی بہتری حاصل کرنے پر حریص ہونے کا ذکر فرمادیا۔ تو اس کے بعد اس آیۃ کریمہ میں ان لوگوں پر تعجب کیا گیا جو ابراہیم علیہ السلام کے دین سے اعراض کرنے والے ہیں۔

شانِ نزول:

۱) حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ نے جب اسلام قبول کیا تو اس کے بعد انہوں نے اپنے بھائی کے دو بیٹوں سلمہ اور مہاجر کو بھی دعوت اسلام دی۔ اور ساتھ ہی یہ فرمایا کہ تمہیں معلوم ہے کہ بیشک اللہ تعالیٰ نے توارۃ میں فرمایا: " انی باعث من ولد اسمعیل نبیا اسمہ احمد فمن آمن بہ فقداھتدی ومن لم یومن بہ فھو ملعون " کہ میں اسماعیل کی اولاد سے نبی بھیجنے والا ہوں جس کا نام احمد ہوگا۔ جس شخص نے آپ پر ایمان لایا وہ ہدایت پا گیا، اور جس نے ایمان قبول نہ کیا وہ ملعون ہے۔ سلمہ نے آپ کے اس ارشاد پر ایمان قبول کرلیا، اور مہاجر نے ایمان قبول کرنے سے انکار کردیا۔ تو اللہ تعالیٰ نے اس آیۃ کریمہ کو نازل کیا۔ (خازن)

۲) دوسری وجہ شان نزول کی یہ ہے کہ کفار نے جب اللہ تعالیٰ سے شریک ٹھہرانا، اور ابراہیم علیہ السلام

کے دین کی مخالفت کو ایجاد کرلیا، اور اپنے مذہب کا حصہ سمجھ لیا تو رب تعالیٰ نے ان کی مذمت میں اس آیہ کریمہ کو نازل کیا۔ (صابونی)

۳) تیسری وجہ شان نزول کی یہ ہے کہ حضرت قتادہ فرماتے ہیں، جب یہود ونصاریٰ نے ابراہیم علیہ السلام کے دین سے اعراض کیا، اور یہودیت ونصرانیت میں ان چیزوں کو ایجاد کیا جو اللہ تعالیٰ کا حکم نہیں تھا تو ان لوگوں کی مذمت میں اللہ تعالیٰ نے اس آیۃ کریمہ کو نازل کیا۔

راقم کے نزدیک تمام وجوہ کے بعد آیۃ کریمہ کا نزول ہوا جو سب وجوہ کا شان نزول ہے۔ ان میں اجتماع جائز ہے، کوئی تعارض نہیں۔

وَمَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرَاهِيْمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَه‘ :

اورکون ہے جو منہ پھیرے ابراہیم کے دین سے سوائے اس کے جو دل کا احمق ہے۔

یعنی ابراہیم علیہ السلام کے دین سے سوائے دل کے احمق کے کوئی اور اعراض نہیں کرسکتا۔

" مــن " استفہام انکاری کے لئے ہے، یعنی کون ہے جو اعراض کرے، مطلب یہ ہے کہ کوئی عقل مند اعراض نہیں کرسکتا۔ اور یا استفہام استبعادی ہے۔ یعنی ابراہیم علیہ السلام کے دین سے اعراض کرنا عقلمند شخص کے لئے تو عقلا بہت بعید ہے۔ (مظہری)

اور یا استفہام تعجب کے لئے ہے۔ یعنی ابراہیم علیہ السلام کے دین سے منہ پھیرنے والوں پر بہت تعجب ہے۔ (قرطبی)

" رغبة " کے بعد جب صلہ " الــی " آئے تو اس وقت اس کا معنی میلان کرنا ہوتا ہے۔ اسی طرح بعد میں " فی " آئے تو پھر بھی معنی یہی ہوتا ہے۔ جیسا کہ " انا الی الله راغبون " بیشک ہم اللہ کی طرف رغبت کرنے والے ہیں۔ اور کہا جاتا ہے " انی رغبت فی هذه المسئلة " بیشک میں اس مسئلہ میں رغبت رکھتا ہوں۔

اور جب اس کے بعد " عــن " آئے تو معنی ہوتا ہے "اعراض کرنا، نفرت کرنا، مکروہ سمجھنا۔ اس آیۃ کریمہ میں یہی معنی ہے یعنی "منہ پھیرنا" (مظہری)

﴿اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَه‘﴾ ای جعلها مهانة ذليلة " سوائے اس کے جس نے اپنے نفس کو ذلیل ورسوا کیا۔ " السفه " کا معنی خفت۔ کہا جاتا ہے۔ " زمام سفيه "خفیف باگ ڈوری۔

اس آیۂ کریمہ میں " سفه " متعدی استعمال ہے۔ " نفسه " مفعول ہے۔ نفس کا معنی جان، دل روح وغیرہ ہے۔ اعلیٰ حضرت نے اسکا معنی دل کیا ہے۔ اسی لئے ترجمہ کیا ہے۔ "جو دل کا احمق ہے۔"

ابن کیسان اور زجاج نے " سفه نفسه " کا معنی کیا ہے۔ " جهل نفسه " جس نے اپنے آپ کو نہ پہچانا۔ " من عبد غیر الله فقد جهل نفسه لانه لم یعرف الله خالقها " جس شخص نے غیر اللہ کی عبادت کی وہ اپنے آپ سے جاہل ہے۔ اس لئے کہ اس نے نہ پہچانا کہ اللہ اس کے نفس کا خالق ہے۔

عارف کامل حضرت یحییٰ بن معاذ متوفی ۲۵۸ھ کا مشہور مقولہ ہے۔ " من عرف نفسه فقد عرف ربه " یعنی جس نے اپنے آپ کو پہچان لیا اس نے اپنے رب کو پہچان لیا۔

اپنے آپ کو پہچاننے کا مطلب یہ ہے کہ اسے معلوم ہو کہ میں ممکن ہوں، اپنے وجود میں رب تعالیٰ کا محتاج ہوں وہی میرا خالق ہے، جب یہ اسے سمجھ آئے گی۔ تو اسے خود بخود سمجھ آ جائے گی کہ رب تعالیٰ واجب الوجود ہے، وہ کسی کا محتاج نہیں۔ وہ خالق ہے۔ وہ قیوم ہے، وہ نور مبین ہے۔

(از التبیان للکاظمی رحمه الله)

☆ روایات میں ہے کہ رب تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام کی طرف وحی کی اور ارشاد فرمایا۔

" اعرف نفسک واعرفنی فقال یا رب کیف اعرف نفسی و کیف اعرفک ، فاوحی الله الیه اعرف نفسک بالضعف والعجز والفناء واعرفنی بالقوة والقدرة والبقاء "

تم اپنے آپ کو پہچانو، اور مجھے پہچانو، آپ نے عرض کی اے میرے رب میں اپنے کو کیسے پہچانوں، اور تمہیں کیسے پہچانوں؟ رب تعالیٰ نے آپ کی طرف وحی کی تم اپنے آپ کو ضعف، عجز اور فنا سے پہچانو، اور مجھے قوت وقدرت وبقاء سے پہچانو۔ (از مظهری)

وَلَقَدِ اصْطَفَيْنَاهُ فِي الدُّنْيَا : (اور تحقیق ہم نے اس کو چن لیا دنیا میں)

یعنی ہم نے ابراہیم علیہ السلام کو رسالت کے لئے پسند کرلیا ہے۔ اور ان کو ہر قسم کے گناہوں کی میل کچیل سے پاک رکھا ہے۔ (قرطبی)

﴿ اِصْطَفَیْنَاهُ ﴾ ای اخترناه للرسالة والنبوة والخلة لعلمنا بانه صفوة العباد فی الدنیا "
ہم نے اسے پسند کرلیا ہے رسالت اور نبوت کے لئے اور خلیل بنانے کے لئے، کیونکہ ہمیں

معلوم ہے کہ بیشک آپ دنیا میں ہمارے بندوں میں سے برگزیدہ بندے ہیں۔ (شیخ زادہ)

وَاِنَّهٗ فِی الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِیْنَ :

اور بیشک وہ آخرت میں ہمارے خاص قرب کی قابلیت والوں میں ہے۔

یعنی جس شخص کو رب نے چن لیا اور وہ اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ بندوں میں سے ہے۔ جس کی نبوت اور خلت کی رب تعالیٰ نے شہادت دی ہے۔ وہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے خاص مقرب ہوں گے۔

" کان حقیقا بالاتباع له لایرغب عنه الا سفیه او متسفه اذل نفسه بالجهل والاعراض عن النظر "

لہٰذا حق یہ ہے کہ ان کی تابعداری کی جائے، ان کے دین سے کوئی اعراض نہیں کرتا سوائے اس کے جو بے وقوف ہے، یا اس نے اپنے آپ کو بے وقوف بنا رکھا ہے۔ جہالت اور نظر وفکر نہ کر کے اپنے آپ کو ذلیل کر لیا ہے۔ (بیضاوی)

تراجم کا تقابلی جائزہ:

﴿ وَاِنَّهٗ فِی الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِیْنَ ﴾

ترجمہ	مترجم
اور وہ آخرت میں نیکوں میں ہے۔	محمود الحسن صاحب
اور آخرت میں نیک ہے۔	شاہ عبدالقادر صاحب
اور وہ آخرت میں بڑے لائق لوگوں میں شمار کیے جاتے ہیں	اشرف علی صاحب
اور بے شک وہ آخرت میں ہمارے خاص قرب کی قابلیت والوں میں ہیں۔	اعلیٰحضرت مولانا احمد رضا خانؒ

یہ تو واضح ہو چکا ہے کہ یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر ہے۔ تراجم میں فرق یہ ہے۔ کہ صرف نیکوں میں ہونا حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شان کو واضح نہیں کرتا، اس لئے کہ نیک تو غیر انبیاء بھی ہوں گے۔ حالانکہ مقام انبیاء اور غیر انبیاء میں بہت بڑا فرق ہے۔

لیکن اعلیٰ حضرت کا ترجمہ اس مقصد کو شامل ہے کیونکہ آپ نے "خاص قرب کی قابلیت والوں میں ہے۔" ترجمہ کیا ہے جس سے واضح ہو گیا خاص قرب کی قابلیت صرف انبیاء کرام کو ہی حاصل ہوگی عام نیکوں کو وہ مقام حاصل نہیں ہوگا۔

لہٰذا صحیح مقصد اعلیٰ حضرت کے ترجمہ سے ہی حاصل ہوا۔ اسی پر جلالین کی عبارت دیکھیں۔
صالحین کی تفسیر آپ نے ان الفاظ سے کی " الذین لهم الدجات العلى " کہ وہ لوگ جن کو بلند درجات حاصل ہوں گے آپ ان ہی میں ہوں گے۔
اسی طرح شیخ زادہ بر بیضاوی میں ہے۔
" قيل المراد بالصالحين الانبياء عليهم الصلوة والسلام لقوله تعالى ومن ذريته داود وسليمان وايوب (الى قوله) كل من الصالحين . (وان ابراهيم عليه السلام دعا ربه وقوله "والحقنى بالصالحين " (اى الانبياء الماضين فاجاب الله دعوته و بين انه معهم فى الجنة)
یہاں بھی مقصد یہ بیان کیا گیا ہے کہ صالحین سے مراد انبیاء ہیں، کیونکہ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے۔ آپ کی اولاد میں سے داؤد اور سلیمان اور ایوب، یوسف، موسیٰ، ہارون زکریا، یحیٰ، عیسیٰ، الیاس علیہم السلام تمام ہی صالحین سے ہیں۔ اور ابراہیم علیہ السلام نے اپنے رب سے دعاء کی کہ اے میرے رب مجھے صالحین سے، یعنی پہلے انبیاء سے لاحق فرما، رب تعالیٰ نے آپ کی اس دعاء کو قبول فرمایا، اور آپ کو بتایا کہ تم جنت میں ان کے ساتھ ہو گے۔
اس آیۃ کریمہ میں اسی خبر کا بیان ہے کہ آپ آخرت میں انبیاء کے ساتھ ہی ہوں گے، جو خاص قرب کی قابلیت والے ہیں۔ (تسكين الجنان)
﴿ وَاِنَّه فِی الْاٰخِرَةِ لَمِنَ ﴾ الانبياء ﴿ الصّٰلِحِیْنَ ﴾ فى مراتب القرب "
بیشک وہ آخرت میں انبیاء کرام کے ساتھ ہوں گے جو خاص قرب کے مراتب والے ہوں گے
(مظهری)

تنبیہ : نبی کریم ﷺ کی شریعت پہلی تمام شریعتوں کے لئے ناسخ ہے۔ ابراہیم علیہ السلام کے دین کی پیروی کا کیا مطلب؟ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب ابراہیم علیہ السلام نے نبی کریم ﷺ کی تشریف آوری کے لئے دعاء کی، تو جن لوگوں نے نبی کریم ﷺ پر ایمان لایا وہ ملت ابراہیمی کے متبع ہوئے۔ جنہوں نے ایمان نہ لایا وہ ملت ابراہیمی سے اعراض کرنے والے ہوئے۔
مزید تفصیل ان شاء اللہ ﴿فَاتَّبِعُوْا مِلَّةَ اِبْرٰهِیْمَ حَنِیْفًا﴾ کے تحت آئے گی۔

﴿اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗ اَسْلِمْ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ﴾ (۱۳۱)

۱) جب اس سے اس کے رب نے فرمایا گردن رکھ، عرض کی میں نے گردن رکھی اس کے لئے جو رب ہے سارے جہانوں کا۔

۲) یاد کرو جب کہا ان کو ان کے رب نے کہا تمام امور میرے سپرد کردو، آپ نے کہا میں نے تمام امور سپرد کردئے اس کے لئے جو تمام جہانوں کا رب ہے۔

﴿اَسْلِمْ﴾ یعنی نفسک الی اللہ عزوجل و فوض امورک الیہ " (مظہری)

اپنے آپ کو رب تعالیٰ کے سپرد کردو اور اپنے تمام امور اسی کے سپرد کردو۔

اللہ تعالیٰ کے تمام قضاء وقدر کے تسلیم کرنے کو بھی اسلام کہا جاتا ہے، یہی معنی اس آیۃ کریمہ میں معتبر ہے۔ (از مفردات راغب)

تنبیہ: اسلم ، کا ایک معنی اسلام لانا بھی ہے۔ لیکن وہ معنی یہاں اس لئے ممکن نہیں کہ انبیاء کرام تو پیدا ہی اسلام اور توحید پر ہوتے ہیں۔ ہاں البتہ یہ معنی مراد لینا ممکن ہے۔

" استقم علی الاسلام و اثبت علیہ " اسلام پر قائم رہو اور اسی پر ثابت رہو۔ (خازن)

قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ : آپ نے کہا میں نے تمام امور سپرد کردئے اس لئے جو تمام جہانوں کا رب ہے۔

اور مطلب یہ بھی ہے کہ میں نے طاعت کی وجہ سے خضوع کیا، اور اپنی عبادت خالص مخلوق کے مالک اور مدبر اور خالق کے لئے ہے۔ (خازن)

اپنے آپ کو ابراہیم علیہ السلام نے رب تعالیٰ کے سپرد یہاں تک کردیا کہ جب آپ کو باندھ کر منجنیق کے ذریعے نمرود کی آگ میں ڈال دیا گیا، تو آپ کے پاس جبرئیل آئے انہوں نے کہا۔ " ھل لک حاجۃ " کیا تمہیں کوئی حاجت ہے؟

تو آپ نے فرمایا " اما الیک فلا " مجھے تم سے تو کوئی حاجت نہیں۔

جبرائیل نے کہا " فاسئل ربک " آپ اپنے رب سے ہی سوال کرلو، آپ نے فرمایا

''حسبی من سوالی علمه بحالی'' جب وہ میرے حال کو جانتا ہے تو اس کا علم ہی مجھے کافی ہے، سوال کی ضرورت نہیں۔

''فجعل اللہ تعالی ببرکة تفویض اموره الی اللہ تعالی حظیرة النار روضة ولم یحترق منه الا وثاقه''

جب آپ نے اپنے تمام امور اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دیئے تو اس کی برکت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے آگ کے گڑھے کو باغ بنا دیا، آپ کو ذرا بھر کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔ صرف جس رسی سے آپ کو باندھا گیا تھا وہی جلی۔ (مظہری)

آیۃ کریمہ کا مطلب واضح ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حکم دیا کہ آپ اپنے تمام معاملات میرے سپرد کر دو۔

اور میری طاعت پر قائم رہو، تو آپ نے اپنے تمام معاملات رب تعالیٰ کے سپرد کر دیئے۔

﴿وَوَصّٰى بِهَا اِبْرٰهٖمُ بَنِيْهِ وَيَعْقُوْبُ ؕ يٰبَنِيَّ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى لَكُمُ الدِّيْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ﴾ (آیت ۱۳۲)

۱) اور اسی دین کی وصیت کی ابراہیم نے اپنے بیٹوں کو اور یعقوب نے کہ اے میرے بیٹو، بے شک اللہ نے یہ دین تمہارے لئے چن لیا تو نہ مرنا مگر مسلمان۔

۲) اور وصیت کی اسی ملت (دین) کی ابراہیم نے اپنے بیٹوں کو اور یعقوب نے (بھی) کہ اے میرے بیٹو بے شک اللہ نے چن لیا ہے تمہارے لئے یہ دین، پس تم ہرگز نہ مرنا مگر اس حال میں کہ تم مسلمان ہو۔

یعنی ابراہیم علیہ السلام نے اپنے بیٹوں کو وصیت کی، اور یعقوب علیہ السلام نے بھی اپنے بیٹوں کو وصیت کی کہ بیشک اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے دین اسلام کو پسند کر لیا ہے۔ اس لئے تم اسی پر قائم رہنا یہاں تک کہ تمہاری موت اسلام پر آئے، اور تم خالص مومن بن کر رہنا، اور اپنے تمام امور اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دینا۔

وَصّٰی: توصیۃ سے لیا ہوا ہے، جس کا معنی ہے۔ ''اچھے کام اور قربت والے کام کی کسی کو نصیحت کرنا۔

یہ بھی خیال رہے کہ وصیت کا مشہور مطلب یہ ہے کہ موت کے بعد کسی کام کے جاری کرنے کے متعلق کہا جائے۔ لیکن کبھی فقط نصیحت کرنے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔

وصیۃ کا معنی اصل میں " وصلۃ " (ملنا، ملانا) ہے۔ جس طرح کہا جاتا ہے " وصّاہ " وہ فلاں سے متصل ہوا۔ اور'' فصّاہ " کا معنی ہے " فصلہ "جدا کرنا۔

وصیت میں بھی وصیت کرنے والا اپنی وصیت کو اس سے ملاتا ہے جسے وصیت کی جائے۔

بِهَا: ضمیر یا تو " ملۃ " کی طرف لوٹ رہی ہے۔ اور یا ﴿اَسۡلَمۡتُ لِرَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ﴾ کی طرف لوٹ رہی ہے۔ (از مظہری)

بَنِیۡهِ : (اپنے بیٹوں کو) ابراہیم علیہ السلام کے چار بیٹے تھے، اسماعیل علیہ السلام، اسحاق علیہ السلام، اور مدین اور مدان، بعض نے کہا ہے کہ آپ کے آٹھ بیٹے تھے۔ واللہ اعلم۔ (بیضاوی)

وَيَعْقُوْبَ : اس کا عطف ہے " ابراھیم " پر۔ " ای وصی ھو ایضا بھا بنیہ " یعنی یعقوب علیہ السلام نے بھی اپنے بیٹوں کو وہی وصیت کی جو آپ کے جد امجد ابراہیم علیہ السلام نے اپنے بیٹوں کو وصیت کی تھی۔

اِنَّ اللّٰهَ اصۡطَفٰى لَـكُمُ الدِّيۡنَ : بے شک اللہ نے چن لیا تمہارے لئے دین۔

دین سے مراد دین اسلام ہے۔ "الذی ھو صفوۃ الادیان" جو تمام دینوں سے برگزیدہ دین ہے۔

علامہ بیضاوی رحمہ اللہ نے " الدین " کے بعد " دین الاسلام " کے الفاظ ذکر فرمائے ہیں۔

اس پر شیخ زادہ نے لکھا کہ اشارہ ہے اس طرف کہ " الدین " پر الف لام عہد خارجی ہے، اور معہود وہ دین ابراہیم علیہ السلام ہے۔ وہ دین اسلام ہے۔ کیونکہ الف لام جنسی ہو تو مراد جنس دین ہوگا۔ حالانکہ تمام دین برگزیدہ نہیں دینوں میں شان کے لحاظ سے اسی طرح فرق ہے، جیسا کہ انبیاء کرام میں شان کے لحاظ سے فرق ہے کہ بعض کو بعض پر فضیلت حاصل ہے۔

تنبیہ :

" فما وقع من تخصیص دین الاسلام بدین نبینا ﷺ لیس قصرا حقیقیا بل الاضافة الی دین الیھود والنصاری وسائر اھل الشرک والضلال "

دین اسلام کی تخصیص جو ہمارے نبی کریم ﷺ کے دین کے ساتھ ہے اس میں قصر حقیقی نہیں، بلکہ قصر اضافی ہے۔ یعنی اس سے مراد یہ ہے کہ یہودی اور نصرانی دین اور مشرکوں کا دین، اسلام نہیں (شیخ زادہ)

فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ : پس ہرگز نہ مرنا مگر تم اس حال میں کہ تم مسلمان ہو۔

اگر چہ بظاہر اسلام کے خلاف حال میں مرنے سے نہی پائی گئی ہے۔ لیکن ظاہری معنی لینا درست نہیں۔ اس لئے کہ موت انسان کے اختیار میں نہیں کہ جب تک وہ اسلام نہ لائے اس پر موت ہی نہ آئے۔ یہ تو ممکن نہیں۔

البتہ مقصود یہ ہے کہ تمہاری موت کے وقت تم حالت اسلام سے دور نہ ہو۔ چونکہ اسلام قبول کرنا یا نہ کرنا انسان کی طاقت میں ہے۔ (از بیضاوی)

فائدہ : اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا " وامر ابراھیم بنیہ " کہ ابراہیم نے اپنے بیٹوں کو حکم دیا۔ بلکہ یہ فرمایا، ﴿ وَوَصّٰى بِهَا اِبْرٰهِیْمُ بَنِیْهِ ﴾ ابراہیم نے اس کی اپنے بیٹوں کو وصیت کی، اس کی وجہ یہ ہے کہ وصیت بنسبت امر کے زیادہ مؤکد ہے، کیونکہ وصیت کا زیادہ طور پر تعلق موت کے خوف کے وقت سے ہے۔

" وفی ذلک الوقت یکون احتیاط الانسان لدینہ اشدوا تم " اس وقت میں انسان دین کے معاملات میں بہت زیادہ اور کامل طور پر احتیاط سے کام لیتا ہے۔

جب یہ معلوم ہوگیا تو یہ بھی خود بخود واضح ہو جاتا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے اس وصیت میں بہت زیادہ اہتمام سے کام لیا۔ " کان القوم الی قبولہ اقرب " اسی وجہ سے آپ کی قوم نے بھی اسے جلدی ہی قبول کرلیا۔

اور وجہ یہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے اپنے بیٹوں کو خاص کر کے وصیت کی، اور یہ بھی واضح ہے کہ

انسان اپنی اولاد سے جتنی زیادہ شفقت کرتا ہے اتنی کسی اور سے نہیں کرتا، آپ نے جب اپنی اولاد کو آخری عمر میں یہ وصیت کی۔ " علمنا ان اهتمامه بذلک کان اشد من اهتمامه بغیره "تو معلوم ہو گیا کہ آپ نے اس وصیت میں بہت زیادہ اہتمام کیا اتنا اہتمام اور لوگوں کو وصیت کرنے میں نہ ہوتا۔

اور وجہ یہ ہے کہ آپ نے وصیت اپنے تمام بیٹوں کو کی کسی کو وصیت میں خاص نہیں کیا۔ " وذلک ایضا یدل علی شدة الاهتمام " یہ بھی اس پر دلالت کر رہا ہے کہ آپ نے اپنی وصیت شدید اہتمام کیا۔ اور وجہ اس میں یہ ہے کہ آپ نے وصیت مطلق کی جو کسی زمان پر معین اور مکان معین سے مقید نہیں" وذلک ایضا یدل علی شدة الاهتمام " اور یہ بھی دلالت کرتا ہے کہ آپ نے اس میں شدید اہتمام کیا اور وجہ یہ ہے کہ آپ نے اس وصیت کے ساتھ کوئی اور وصیت نہیں ملائی تو اس سے بھی پتہ چلا کہ آپ نے اس معاملہ میں شدید اہتمام کیا۔

جب یہ معلوم ہو گیا کہ ابراہیم علیہ السلام کو رب تعالیٰ نے بہت زیادہ فضیلت عطاء فرمائی، اور حسن طریقت اور کمال سیرت آپ کو عطاء کی گئی۔ پھر آپ نے وصیت میں شدید اہتمام فرمایا، اور وصیت بھی دین پر قائم رہنے کی جو عظیم نصیحت ہے۔ ان وجوہ کے پیش نظر ہی آپ نے اپنے بیٹوں کو خاص کیا۔

" والا فمعلوم من حال ابراهیم علیه السلام انه کان یدعو الکل ابدا الی الاسلام والدین "

ورنہ یہ معلوم ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے ہمیشہ دین اسلام کی دعوت سب لوگوں کو دی، یعنی بیٹوں کو وصیت کرنے سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ آپ کی دعوت الی الحق گھر تک محدود تھی۔ (از کبیر)

☆☆☆

﴿اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ حَضَرَ يَعْقُوْبَ الْمَوْتُ ۙ اِذْ قَالَ لِبَنِيْهِ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ ۢ بَعْدِيْ ؕ قَالُوْا نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَاِلٰهَ اٰبَآئِكَ اِبْرٰهٖمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ وَ اِسْحٰقَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚۖ وَّنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ﴾ (آیت ۱۳۳)

۱) بلکہ تم خود موجود تھے جب یعقوب کو موت آئی جب کہ اس نے اپنے بیٹوں سے فرمایا میرے بعد کس کی پوجا کرو گے بولے ہم پوجیں گے اسے جو خدا ہے آپ کا اور آپ کے آباء ابراہیم و اسماعیل و اسحاق کا ایک خدا اور ہم اسکے حضور گردن رکھے ہیں۔

۲) کیا تم حاضر تھے؟ جب آئی یعقوب کو موت، جب آپ نے کہا اپنے بیٹوں کو، تم کس کی عبادت کرو گے میرے بعد؟ انہوں نے کہا ہم عبادت کریں گے تمہارے معبود کی، اور تمہارے آباء ابراہیم اور اسماعیل اور اسحاق کے معبود کی، ایک معبود کی، اور ہم اسی کے فرمانبردار ہیں۔

شانِ نزول:

یہ آیۃ کریمہ یہود کے باطل دعوی کے رد میں نازل ہوئی، انہوں نے نبی کریم ﷺ کو کہا کہ جب حضرت یعقوب فوت ہونے لگے تو انہوں نے اپنے بیٹوں کو یہودیت کی وصیت کی، رب تعالیٰ نے ان کی تکذیب فرمائی۔ اور یہود کو اس آیۃ میں خطاب کیا گیا، جس کا مطلب یہ ہے۔ " انکم لم تحضروا ذلک فلا تدعوا علی انبیائی ورسلی الا باطیل وتنسبوهم الی الیهودیة " کہ تم تو حضرت یعقوب کی موت کے وقت حاضر ہی نہیں تھے۔ لہٰذا تم میرے انبیاء اور رسل کی طرف باطل دعوے منسوب نہ کرو، اور نہ ہی ان کو یہودیت کی طرف منسوب کرو۔

رب تعالیٰ نے اپنے خلیل کو اور ان کے بیٹوں کو اور بیٹوں کے بیٹوں کو دین اسلام پر قائم رکھا، انہوں نے بھی اپنے بیٹوں کو دین اسلام کی ہی وصیت کی۔ (خازن)

اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ حَضَرَ يَعْقُوْبَ الْمَوْتُ : اس مقام میں "ام منقطعة و معنى الهمزة فِيْهَا الانكارى ما كنتم حاضرين اذ حضر يعقوب الموت " ام منقطعہ ہے، اور ہمزہ استفہام کے معنی میں ہے۔ اور استفہام بھی انکاری ہے، کیا تم حاضر تھے؟ یعنی تم تو اس وقت حاضر ہی نہیں تھے جب یعقوب پر موت آئی، تمہیں کیا معلوم کہ آپ نے بیٹوں کو کیا کہا تم ان پر یہ دعویٰ کیوں کرتے ہو کہ انہوں نے اپنے بیٹوں کو یہودیت کی وصیت کی۔ (راقم کا ترجمہ اسی کے مطابق ہے)

" او متصلة بمحذوف تقديره اكنتم غائبين ام كنتم شهداء " یا " ام " متصل ہو، اور اس کا تعلق محذوف سے ہو، تو اس صورت میں معنی یہ ہوگا، کیا تم غائب تھے یا تم حاضر تھے، جب یعقوب نے اپنے بیٹوں کو اپنی موت کے وقت وصیت کی۔

"وقيل الخطاب للمؤمنين والمعنىٰ ما شهدتم ذلك وانما علمتموه بالوحى "

ایک قول یہ ہے کہ یہ خطاب مومنوں کو ہے اور معنی یہ ہے کہ تم اس وقت حاضر نہیں تھے، تمہیں تو علم وحی کے ذریعے حاصل ہوا۔ (بیضاوی)

" ولك ان تجعل الاستفهام للتقرير اى كانت اوائلكم حاضرين حين وصى بنيه عليه السلام بالاسلام والتوحيد وانتم عالمون بذلك فمالكم تدعون عليه خلاف ما تعلمون "

جائز ہے کہ " ام " ہمزہ استفہام کے معنی میں ہو، اور استفہام تقریری ہو، اور معنی یہ ہو کہ تمہارے پہلے کچھ لوگ حاضر تھے جب یعقوب علیہ السلام نے اپنے بیٹوں کو اسلام اور توحید کی وصیت کی اور تمہیں بھی اس کا علم ہے تم اپنے علم کے خلاف ان پر دعویٰ کیوں کرتے ہو۔ (روح المعانی)

اعلیٰ حضرت کا ترجمہ روح المعانی کے اسی قول کے مطابق ہے۔

" شهداء " جمع ہے " شهيد " کی، یا " شاهد " کی، معنی اس کا حاضر ہونا۔

مَاتَعْبُدُوْنَ مِنْۢ بَعْدِيْ : اى اىّ شئ تعبدونه بعد موتى " تم کس چیز کی میرے بعد عبادت کرو گے۔

خیال رہے کہ بظاہر استفہام ہے (سوالیہ فقرہ ہے) لیکن یہ استفہام حقیقی نہیں، بلکہ غرض ان کو توحید اور اسلام پر قائم رہنے کے لئے برانگیختہ کرنا مقصود تھا۔

قَالُوْا نَعْبُدُ اِلٰـهَکَ وَاِلٰـهَ اٰبَآءِ کَ اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِیْلَ وَاِسْحٰقَ اِلٰهًا وَّاحِدًا :

انہوں نے کہا ہم ایک ہی معبود کی عبادت کریں گے جو تمہارا بھی معبود ہے اور تمہارے آباؤاجداد یعنی ابراہیم اور اسماعیل اور اسحاق علیہم السلام کا بھی معبود ہے۔

" الـه " کہ اضافت متعدد کی طرف کر کے اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے وجود اور الوہیت پر اتفاق ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر پہلے کیا کیونکہ وہ آپ کے جدامجد تھے، بزرگی اور عمر کے لحاظ سے ان کا ہی پہلے ذکر کرنا مناسب تھا۔ پھر اسماعیل علیہ السلام کا ذکر اسحاق علیہ السلام سے پہلے کیا " لکونه اسن منه " کیونکہ وہ عمر میں اسحاق علیہ السلام سے چودہ سال بڑے ہیں۔

اور حضرت یعقوب علیہ السلام کا اپنے چچا (تایا) حضرت اسماعیل علیہ السلام کو اپنے آباء میں شامل کرنا " تغليبا للاكثر على الاقل " تغلیب کے طور پر تھا، کہ اکثر واقل پر غالب سمجھا۔

لیکن سب سے عظیم وجہ یہ تھی " لانه شبه لعم بالاب " کہ چچا باپ کے مشابہ ہوتا ہے، کیونکہ دونوں ہی ایک دھاگہ کے موتی ہوتے ہیں۔ یعنی دونوں بھائی ایک باپ یا ایک ماں یا ایک ہی باپ اور ماں کی اولاد ہوتے ہیں۔

بخاری اور مسلم نے رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ذکر فرمایا " عم الرجل صنو ابيه " انسان کا چچا اس کے باپ کے مشابہ ہے۔ یہی وجہ اس لئے بھی مناسب ہے کہ ایک لفظ میں حقیقت ومجاز کا اجتماع لازم نہیں آئے گا۔

اور اسی قول کو ابن ابی شیبہ کی روایت سے تائید بھی ملتی ہے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا " احفظونى فى العباس فانه بقية آبائى " عباس کی میری وجہ سے حفاظت کرو کیونکہ وہ میرے بقیہ آباء سے ہے

اِلٰهًا وَّاحِدًا : یہ بدل ہے " الـه آباء ک " سے، مبدل منہ چونکہ معرفہ ہے، اور بدل نکرہ ہے، اسی وجہ سے اس کے ساتھ صفت کو ذکر کیا تا کہ اس میں تخصیص آجائے۔

وَّنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ : " اى مذعنون مقرون بالعبودية وقيل خاضعون منقادون مستسلمون لنهيه وامره قولا وعقدا وقيل داخلون فى الاسلام ثابتون عليه "

اس مقام میں مسلمون کے کئی معانی ہیں، مطالب تقریباً سب کے قریب ہی ہیں۔

۱) ہم اس کی عبودیت پر یقین رکھتے ہیں۔ اور اسی کا اقرار کرتے ہیں۔
۲) ہم اسی کے سامنے اظہار عجز کرتے ہیں۔ (۳) ہم اسی کے فرمانبردار ہیں۔
(۴) ہم اسی کے اوامر و نواہی کو قولاً اور عقیدۃً تسلیم کرتے ہیں۔
(۵) اور ہم اسلام میں داخل ہیں اسی پر قائم رہیں گے۔ (از روح المعانی)

اعتراض: تم نے ﴿اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ﴾ میں "ام" کو استفہام انکاری بنایا ہے، حالانکہ استفہام انکاری "انما یتوجہ علی کلام باطل" تو باطل کلام کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ جب حضرت یعقوب علیہ السلام کے کلام کی حکایت بیان ہو رہی ہے تو وہ کلام تو حق ہے، باطل نہیں تو استفہام انکاری کیسے؟

جواب: "الاستفهام علی سبیل الانکار متعلق بمجرد ادعائهم الحضور عند وفاته فهذا هو الذی انکره اللہ تعالیٰ"

استفہام انکاری کا تعلق انکے اس دعوی سے ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے بیٹوں کو یہودیت کی وصیت فرمائی یعنی انکے اس دعوی کا مطلب یہ تھا کہ وہ اس وقت موجود تھے، رب تعالیٰ نے اس کا رد فرمایا، کہ تم موجود نہیں تھے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کے کلام میں انکار نہیں پایا گیا۔ (از کبیر)

اعتراض: "ما" غیر ذوی العقول کے لئے آتا ہے، اس کا اطلاق معبود حقیقی پر ﴿مَا تَعْبُدُوْنَ﴾ میں کیسے صحیح ہے؟

جواب اوّل: "ما" عام ہے ہر چیز میں، اس لئے معنی یہ ہے "ای شئ تعبدون" تم کس چیز کی عبادت کرو گے۔

جواب دوم: جب کسی چیز کی حد یا رسم (تعریف) کا سوال ہو تو "ما" سے ہوتا ہے۔ اس وقت ذوی العقول کیلئے بھی "ما" استعمال ہوتا ہے۔ جیسا کہ کہا جائے۔ "ما الانسان" انسان کیا ہے؟ (از کبیر)

آیۃ کریمہ سے حاصل ہونے والے مسائل:

۱) اصول دین میں تقلید نہیں، ورنہ حضرت یعقوب علیہ السلام اپنے بیٹوں سے سوال نہ کرتے

بلکہ یہ سمجھے کہ وہ میرے مقلد ہی ہوں گے۔

علامہ رازی رحمہ اللہ جہاں بھی تقلید کی نفی کرتے ہیں، وہاں اصول دین میں تقلید کی نفی کرتے ہیں۔ یہی ہمارا بھی عقیدہ ہے۔

۲) آیۃ اس پر دلالت کرتی ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنی اولاد کو ایمان لانے کی ترغیب دی اور نبی کریم ﷺ کی اتباع کا حکم دیا، اور آپ کی مخالفت کرنے سے منع فرمایا۔ کیونکہ ایمان پر ثابت رہنے کی تلقین کا یہی تقاضا ہے کہ جب نبی کریم ﷺ تشریف لائیں تو ان پر ایمان لانا ورنہ تم ایمان پر ثابت نہیں رہ سکو گے۔

۳) اولاد پر شفقت اور ان کی اچھی تربیت (تاکہ وہ عذاب سے بچ سکیں۔ اور اعلیٰ قسم کی اخروی کامیابی حاصل کر سکیں، اور دنیاوی زندگی اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے حکم کے مطابق گذار سکیں) سنت انبیائے کرام ہے۔

۴) انبیاء کرام کی اولاد سے شفقت فقط دین کے لئے تھی، ان کی بلند ہمتیں فقط دینی کاموں میں مصروف رہتی تھیں۔ (ماخوذ از کبیر)

﴿تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۖ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُم مَّا كَسَبْتُمْ ۖ وَلَا تُسْأَلُونَ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ﴾ (آیت ۱۳۴)

۱) یہ ایک امت ہے کہ گذر چکی، ان کے لئے ہے جو انہوں نے کمایا اور تمہارے لئے ہے جو تم کماؤ اور ان کے کاموں کی تم سے پرسش نہ ہوگی۔

۲) وہ ایک جماعت ہے جو گذر چکی ہے۔ اس کے لئے وہ ہے جو اس نے کسب کیا، اور تمہارے لئے وہ ہے جو تم نے کسب کیا۔ اور تم سے سوال نہیں کیا جائے گا اس کے متعلق جو وہ عمل کرتے رہے۔

اس آیۃ کریمہ میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام اور یعقوب علیہ السلام اور ان کی اولاد ایک جماعت تھی جو دنیا سے چلے گئے، ان کے اعمال ان کے لئے اور تمہارے اعمال تمہارے لئے ہیں،

تم سے ان کے اعمال کے متعلق سوال نہیں کیا جائے گا۔ کہ وہ کیا عمل کرتے رہے۔ بلکہ ہر ایک سے اس کے اپنے اعمال کے متعلق سوال ہوگا۔

شانِ نزول:

جب یہود نے کہا کہ ہمارے آباء واجداد حضرت ابراہیم اور حضرت اسحاق اور حضرت یعقوب علیہم السلام ہیں، ہمارا نسب ان بزرگ ہستیوں کی طرف پہنچتا ہے۔

" فلا جرم ننتفع بصلاحهم و منزلتهم عند الله تعالٰی قالوا ذلک مفتخرین باوائلهم "

لہٰذا یقیناً ان کی نیکیوں اور اللہ کے ہاں ان کے مرتبے کا فائدہ ہمیں بھی حاصل ہوگا۔ انہوں نے اپنے پہلے آباء واجداد پر فخر کرتے ہوئے یہ کہا، تو اللہ تعالیٰ نے ان کے رد میں یہ آیۃ کریمہ نازل فرمائی (از شیخ زادہ)

تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ: تلک، کا اشارہ ہے ابراہیم اور یعقوب اور ان کے بیٹوں کی طرف ہے، جن کا ذکر پہلی آیت میں ہو چکا ہے۔

" امة " کا اصل معنی ہے مقصود، اَمّ " کا معنی قصد کرنا، جماعت کو امت اس لئے کہا جاتا ہے کہ مختلف فرقے جمع ہونے کا قصد کرتے ہیں۔ (بیضاوی)

" قد خلت " ای مضت ، نعت لامة ، اس مقام میں قد خلت نعت ہے امت کی، جس کا معنی ہے۔ "گذر گئی"

لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ: اس جماعت کے لئے وہ جو اس نے کیا اور تمہارے لئے وہ ہے جو تم نے کیا۔ " وحاصله ان احدا لاینفعه کسب غیره " حاصل کلام یہ ہے کہ کسی شخص کو دوسرے کے عمل کا کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوگا کہ اس کا عمل اس کا عمل بن جائے، جہاں تک ایصال ثواب کا مسئلہ ہے وہ راقم نے پہلے رکوع میں تفصیلی طور پر ذکر کر دیا ہے۔

☆ " قال رسول الله ﷺ یاصفية عمة محمد ، یا فاطمة بنت محمد ائتونی یوم القیامة باعمالکم لانسابکم فانی لا اغنی عنکم من الله شیئاً "

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اے صفیہ محمد کی پھوپھی، اے فاطمہ محمد کی بیٹی قیامت کے دن اپنے

اعمال لانا اپنا نسب نہ لانا، میں اللہ تعالیٰ سے کسی چیز کیبارے میں بے پرواہ نہیں کرسکوں گا۔

اس حدیث شریف میں وعید پائی گئی ہے، ڈرایا گیا ہے کہ اعمال کو چھوڑ کر صرف نسب پر بھروسہ نہ کرنا، ورنہ عمل بھی نیک ہوں اور نسب بھی اعلیٰ ہو تو یقیناً وہ نسب فائدہ دے گا۔ راقم کی کتاب تذکرۃ الانبیاء کا مطالعہ کریں۔

☆ " وقال علیہ الصلوۃ والسلام من ابطأبہ عملہ لم یسرع بہ نسبہ "

نبی کریم ﷺ نے فرمایا جس نے عمل میں دیر کی اسے نسب جلدی کوئی فائدہ نہیں دے گا۔

☆ " قال علیہ الصلوۃ والسلام یا بنی ھاشم لا یاتینی الناس باعمالھم وتاتونی بانسابکم "

نبی کریم ﷺ نے فرمایا اے بنی ہاشم ایسا نہ ہو کہ لوگ میرے پاس اپنے اعمال لائیں اور تم اپنے نسب لے کر آجاؤ۔

وَلَاتُسْأَلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ :

اور تم سے نہیں سوال کیا جائے گا اس چیز سے جو وہ عمل کرتے رہے۔

﴿ وَلَاتُؤَاخَذُوْنَ بِسَيِّاٰتِهِمْ كَمَا لَاتُثَابُوْنَ بِحَسَنَاتِهِمْ ﴾

یعنی تم سے ان کے گناہوں کے متعلق سوال نہیں کیا جائے گا، جیسا کہ ان کی نیکیوں کا تمہیں ثواب حاصل نہیں ہوگا۔

اس آیۂ کریمہ سے یہود کے دونوں دعووں کو رد کر دیا گیا، ایک ان کا دعوی یہ تھا کہ ہم جو عمل بھی کرتے رہیں، ہمیں کوئی نقصان نہیں، ہمیں اپنے آباء واجداد کی نیکیاں نفع دیں گے، ہماری بخشش ہوجائیگی دوسرا ان کا دعوی یہ تھا کہ ہمیں عذاب نہیں ہوگا، ہاں البتہ اتنے دن عذاب ہوگا جتنے دن (چالیس دن) ہمارے آباء واجداد نے بچھڑے کی پوجا کی تھی۔

اس آیۂ کریمہ سے واضح کر دیا کہ آباء واجداد کی نیکیوں کی وجہ سے اپنے دل سے خوف نکال دینا اور گناہوں پر دلیر ہوجانا اور نیکی کا کوئی کام نہ کرنا، اور پھر یہ کہنا کہ ہمیں تو صرف اتنے دن عذاب ہوگا۔

جتنے دن ہمارے آباء واجداد کا گناہ تھا یہ سب تمہارے لغویات ہیں۔ (بیہودہ کلام ہے)۔

(ماخوذ از بیضاوی و شیخ زادہ)

خیال رہے کہ معتزلہ اور ان کے ہمنوا لوگوں کو یہود و نصاریٰ کے حق میں نازل ہونے والی آیات اور کفار و مشرکین کے حق میں نازل ہونے والی آیات کا مسلمانوں پر چسپاں کرنا بہت خوب آتا ہے۔ تاہم اپنی عاقبت ہی خراب کر رہے ہیں۔

﴿ وَقَالُوْا كُوْنُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى تَهْتَدُوْا ؕ قُلْ بَلْ مِلَّةَ اِبْرٰهٖمَ حَنِيْفًا ؕ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴾ (آیت ۱۳۵)

۱) اور کتابی بولے یہودی یا نصرانی ہو جاؤ راہ پاؤ گے، تم فرماؤ بلکہ ہم تو ابراہیم کا دین لیتے ہیں، جو ہر باطل سے جدا تھے اور مشرکوں سے نہ تھے۔

۲) اور (اہل کتاب نے) کہا یہودی یا نصرانی ہو جاؤ ہدایت پا جاؤ گے۔ تم فرماؤ، بلکہ ہم تو ابراہیم کے دین پر ہیں، جو ہر باطل سے جدا (ہو کر حق پر قائم) تھے، اور مشرکوں سے نہیں تھے۔

شانِ نزول:

۱) یہود نے مومنوں کو کہا "کونوا ھودا تھتدوا" تم یہودی ہو جاؤ تو ہدایت پا جاؤ گے۔ اور نصاریٰ نے کہا "کونوا نصاری تھتدوا" تم نصرانی ہو جاؤ تو ہدایت پا جاؤ گے۔ رب تعالیٰ نے ان کے رد میں اس آیۂ کریمہ کو نازل کیا۔

۲) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ یہود کے رئیس کعب بن اشرف اور مالک بن صیف اور وہب بن یہودا، اور ابو یاسر بن اخطب اور نجران کے نصاریٰ کے متعلق یہ آیۂ کریمہ نازل ہوئی، جب کہ انہوں نے مومنوں سے دین کے متعلق جھگڑا کیا، ان میں سے ہر فرقہ اپنے آپ کو حق راہ پر چلنے والا سمجھ رہا تھا اور دوسرے کو باطل۔

یہودی کہہ رہے تھے ہمارے نبی موسیٰ افضل الانبیاء ہیں، اور ہماری کتاب توراۃ افضل الکتب

ہے (تمام کتابوں سے افضل ہے) اور ہمارا دین تمام دینوں سے افضل ہے۔ اور انہوں نے عیسیٰ علی علیہ السلام اور انجیل اور نبی کریم ﷺ اور قرآن پاک سے کفر کیا۔

اور نصاریٰ نے کہا ہمارے نبی عیسیٰ افضل الانبیاء ہیں، اور ہماری کتاب انجیل تمام کتابوں سے افضل ہے اور ہمارا دین تمام دینوں سے افضل ہے۔ اور انہوں نے موسیٰ علیہ السلام اور نبی کریم ﷺ اور توراۃ اور قرآن پاک سے کفر کیا۔

وہ دونوں فریق مومنوں کو کہہ رہے تھے "کونوا علی دیننا فلا دین الا ذلک" تم ہمارے دین پر آ جاؤ کیونکہ اس دین کے بغیر کوئی اور دین سچا نہیں، تو ان لوگوں کے رد میں یہ آیۃ کریمہ نازل ہوئی۔

۳) ابن اسحاق اور ابن جریر وغیرھما نے ذکر فرمایا کہ ایک مرتبہ عبداللہ بن صوریا اعور نے نبی کریم ﷺ کو کہا۔

" ماالھدی الا ما نحن علیه فاتبعنا یا محمد تھتد وقالت النصاری مثل ذلک فانزل اللہ تعالی فیھم الآیة"

نہیں ہدایت سوائے ہمارے راستہ کے، اس لئے اے محمد تم بھی ہماری تابعداری کرلو تو ہدایت پا جاؤ گے، اور نصاریٰ نے بھی اسی طرح کی گفتگو کی تو اللہ تعالیٰ نے اس آیۃ کریمہ کو نازل کیا۔

مطلب واضح ہے کہ یہ تمام وجوہ پہلے واقع ہوئیں تو آیۃ کریمہ کا نزول بعد میں ہوا، اس لئے تمام ہی شان نزول ہیں۔

قُلْ بَلْ مِلَّةَ اِبْرَاهِیْمَ : "قل" خطاب ہے نبی کریم ﷺ کو، یعنی آپ ان لوگوں کا رد کرتے ہوئے ان سے فرما دیں، ان کے سامنے واضح طور پر حق بیان کر دیں، اور ان کی راہنمائی کریں، ان کو دوٹوک الفاظ میں یہ کہہ دو۔

" لانکون کما تقولون ﴿بَلْ﴾ تکون ﴿مِلَّةَ اِبْرَاهِیْمَ﴾ ای اھل ملته او ﴿بَلْ﴾ نتبع ملة ابراھیم"

کہ ہم تمہارے کہنے پر یہودیت و نصرانیت کو کبھی اختیار نہیں کر سکتے، بلکہ ہم تو دین ابراہیمی والے ہیں۔ ہم تو ابراہیم علیہ السلام کے دین کی تابعداری کرتے ہیں۔

حَنِیۡفًا : "ای مستقیما او مائلا عن الباطل الی الحق" وہ ابراہیم علیہ السلام جو دین مستقیم پر قائم ہیں۔ باطل سے ہٹ کر حق دین پر قائم ہیں۔

تنبیہ : حنیف کا معنی مستقیم ہے۔ لنگڑے شخص کو نیک شگونی کے طور پر کہا جاتا ہے "احنف" اللہ کرے کہ یہ درست ہو جائے، جیسا کہ لدیغ (سانپ بچھو کا ڈسا ہوا) کو "سلیم" کہا جاتا ہے اور "مھلکه" (ھلاکت کے قرب) کو مفازۃ (کامیاب) نیک شگونی کے طور پر کہا جاتا ہے۔

اور حنیف کا معنی ہوتا ہے پھرنا، ہٹنا، اس معنی کے لحاظ سے مطلب یہ ہوگا کہ ابراہیم علیہ السلام یہودیت و نصرانیت سے ہٹ کر دین اسلام کی طرف مائل تھے۔

فائدہ : حنیفیة" سے مراد بیت اللہ شریف کا حج کرنا، اور حق کی تابعداری کرنا، اور ابراہیم علیہ السلام کا شرائع اسلام کی تابعداری کرنا، اور عمل میں اخلاص۔

یعنی ان تمام معانی کے لحاظ سے حضرت ابراہیم علیہ السلام حنیف تھے۔ اور یہ بھی خیال رہے کہ "حنیفا" پر نصب اس لئے ہے کہ یہ "ابراھیم" سے حال واقع ہے۔ (از کبیر)

وَمَا کَانَ مِنَ الۡمُشۡرِکِیۡنَ : (اور وہ نہیں تھے مشرکوں سے)

اس میں یہود و نصاریٰ اور مشرکین کا رد پایا گیا ہے۔ وہ تمام حضرت ابراہیم علیہ السلام کی فضیلت کے معترف تھے لیکن یہود نے حضرت عزیر علیہ السلام کو خدا کا بیٹا کہا، اور نصاریٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا کہا اور مشرکین نے بت پرستی کی۔

رب تعالیٰ نے گویا کہ ان کا رد کیا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام تو مشرک نہیں تھے، تم ان کی فضیلت کا اعتراف کرنے کے باوجود مشرک کیوں ہو۔ (از کبیر)

☆☆☆

﴿قُولُوٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنۡزِلَ اِلَيۡنَا وَمَا اُنۡزِلَ اِلٰٓى اِبۡرٰهٖمَ وَاِسۡمٰعِيۡلَ وَاِسۡحٰقَ وَيَعۡقُوۡبَ وَالۡاَسۡبَاطِ وَمَآ اُوۡتِىَ مُوۡسٰى وَعِيۡسٰى وَمَآ اُوۡتِىَ النَّبِيُّوۡنَ مِنۡ رَّبِّهِمۡۚ لَا نُفَرِّقُ بَيۡنَ اَحَدٍ مِّنۡهُمۡۖ وَنَحۡنُ لَهٗ مُسۡلِمُوۡنَ﴾ (آیت ۱۳۶)

۱) یوں کہو کہ ہم ایمان لائے اللہ پر اور اس پر جو ہماری طرف اترا اور جو اتارا گیا ابراہیم واسماعیل واسحاق ویعقوب اوران کی اولاد پراور جوعطاء کیے گئے موسیٰ وعیسیٰ اور جوعطاء کیے گئے باقی انبیاء اپنے رب کے پاس سے، ہم ان میں کسی پر ایمان میں فرق نہیں کرتے اور ہم اللہ کے حضور گردن رکھے ہیں۔

۲) کہو ہم ایمان لائے اللہ پر، اوراس پر جو اتارا گیا ہماری طرف، اور جو اتارا گیا ابراہیم اور اسماعیل اور اسحاق اور یعقوب اوران کی اولاد پر، اور جو عطاء کیے گئے موسیٰ اور عیسیٰ اور جو عطاء کیے گئے باقی انبیاء اپنے رب کی طرف سے، ہم فرق نہیں کرتے ان میں کسی پر ایمان میں، اور ہم اسی کے فرمانبردار ہیں۔

پہلی آیۃ کریمہ میں خطاب نبی کریم ﷺ کو تھا، اوراس آیۃ کریمہ میں خطاب آپ کی امت کو ہے۔ اسی طرح پہلی آیۃ میں یہود ونصاریٰ کو جدلی جواب دیا گیا اوراس آیۃ میں ان کو تحقیقی جواب دیا گیا ہے۔ (کبیر)

شانِ نزول:

☆ "عن ابی ہریرۃ ﷺ قال کان اھل الکتاب یقرءون التوراۃ بالعبرانیۃ ویفسرونھا بالعربیۃ لاھل الاسلام فقال رسول اللہ ﷺ لاتصدقوا اھل الکتاب ولاتکذبوھم و ﴿قُولُوٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنۡزِلَ﴾ الخ ." رواہ البخاری "

حضرت ابوہریرہ ﷜ فرماتے ہیں اہل کتاب توراۃ عبرانی زبان میں پڑھتے تھے اور اس کی عربی زبان میں مسلمانوں کے سامنے تفسیر بیان کرتے ، رسول اللہ ﷺ نے مؤمنین کو کہا تم ان کی نہ تصدیق کرو اور نہ تکذیب ، اور کہو ہمارا ایمان ہے اللہ پر اور جو اس نے نازل فرمایا الخ ۔ اس وقت یہ آیۃ کریمہ نازل ہوئی ۔ (قرطبی)

۲) یہود و نصاری نے مومنین کو جب کہا ﴿ كُوْنُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى ﴾ تو رب تعالیٰ نے ان کے رد میں اس آیۃ کریمہ کو نازل فرمایا ، پہلی آیۃ کریمہ میں ان کو جواب نبی کریم ﷺ کے ذریعے دیا گیا ، اور اس آیۃ کریمہ میں ان کو جواب مومنین کے ذریعے دیا ۔

یعنی مومنوں کو کہا گیا کہ تم ان کو صاف صاف بتا دو کہ ہم تو اللہ تعالیٰ پر اور قرآن پاک پر ایمان رکھتے ہیں ، ہم تو ان صحیفوں پر ایمان رکھتے ہیں جو ابراہیم علیہ السلام پر نازل کئے گئے اور ان پر ہی ان کی اولاد یعنی حضرت اسماعیل اور حضرت اسحاق اور حضرت یعقوب علیہم السلام اور ان کی اولاد عمل پیرا رہے ۔ اور ہم تو ایمان توراۃ و انجیل پر رکھتے ہیں ۔ اور دوسرے انبیاء کرام پر جو صحیفے نازل ہوئے ہمارا تو ان پر ایمان ہے ۔ ہم تمام انبیاء پر ایمان رکھتے ہیں ، ایسا نہیں کہ بعض انبیاء کو تو نبی تسلیم کریں اور بعض پر ایمان ہی نہ رکھیں ، ہم تو اللہ تعالیٰ کے ہی فرمانبردار ہیں ۔

عقیدہ : اگر کوئی شخص کسی نبی کے نام سے بے خبر ہے تو اس سے پوچھا جائے کہ فلاں شخص نبی تھا یا نہیں تھا ۔ تو یہ جواب ہاں یا نہ سے نہ دے ، کیونکہ اسے تو اس شخص کے نبی ہونے یا نہ ہونے کا علم نہیں ۔ بلکہ یہ جواب اسی آیۃ کے مطابق دے کہ اللہ تعالیٰ کے جتنے نبی ہیں میں تمام کو نبی مانتا ہوں میرا ان پر ایمان ہے ۔

جس کے متعلق تم پوچھ رہے ہو مجھے تو اسکے نبی ہونے یا نہ ہونے کا علم نہیں ۔ اگر وہ اللہ کا نبی ہے تو یقینی طور پر میرا اس پر ایمان ہے ۔ (ماخوذ از قرطبی)

قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا : اللہ تعالیٰ نے اپنے مومن بندوں کی راہنمائی کی کہ تم کہو ہم اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتے ہیں اور اس چیز پر ایمان رکھتے ہیں جو ہم پر نازل کیا گیا ، اس سے مراد قرآن پاک ہے ۔

ہماری طرف نازل کرنے کا مقصد یہ ہے کہ ہمارے عمل کرنے کے لئے جو کتاب ہم پر ہمارے نبی کریم ﷺ پر نازل ہوئی، ہمارا اس پر تفصیلی ایمان ہے۔ ہم اس کے تمام احکام پر عمل کرنے کے لئے ایمان رکھتے ہیں۔

لیکن باقی انبیاء کرام پر نازل ہونے والی کتب اور صحیفوں پر ہمارا اجمالی ایمان ہے، کہ وہ اللہ کی کتابیں، ان پر تفصیلی ایمان نہ ہونے کی وجہ واضح ہے کہ پہلی شریعتیں منسوخ ہو چکی ہیں۔ (از صابونی)

وَمَا أُنزِلَ إِلَىٰ إِبْرَاهِيمَ الخ: "وہ عشر صحف انزلت علی ابراهیم فتعبدبها هو وبنوه واحفاده ولذا نسب انزالها الیهم کما نسب انزال القرآن الینا بمتابعة محمد ﷺ"

حضرت ابراہیم علیہ السلام پر دس صحیفے نازل کئے گئے، ان کے مطابق ہی آپ نے اور آپ کے بیٹوں اور پوتوں نے عمل کیا، اور عبادت کی، تو نازل کرنے کی نسبت حضرت اسماعیل اور حضرت اسحاق اور حضرت یعقوب علیہم السلام اور ان کی اولاد کی طرف کر دی حالانکہ اور حضرات پر صحیفے نازل نہیں، صرف ابراہیم علیہ السلام پر نازل کئے گئے۔

یہ ایسے ہی ہے جیسا کہ قرآن پاک ہمارے عمل اور ہماری عبادت کے لئے نازل نبی کریم ﷺ پر کیا گیا اور منسوب ہماری طرف بھی کر دیا گیا۔

وَالْأَسْبَاطِ : جمع ہے سبط کی، جیسے حمل کی جمع احمال ہے۔ مراد اس سے بنی اسرائیل کی جماعتیں جیسا کہ عرب کی جماعتوں کو قبائل اور عجم کی جماعتوں کو شعوب کہا جاتا ہے۔

حضرت یعقوب علیہ السلام کے بارہ بیٹے تھے وہ تمام حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسحاق علیہ السلام کے اسباط ہی تھے، کیونکہ پوتے اور نواسے پر بھی سبط بولا جاتا ہے۔ اسی وجہ سے حضرت امام حسن اور حضرت امام حسین رضی اللہ عنہما کو "سبطا رسول اللہ ﷺ" کہا گیا ہے۔

سبط چونکہ زیادہ شاخوں والے درخت کو بھی کہا جاتا ہے، اس لئے یعقوب علیہ السلام کی اولاد کو کثرت کی وجہ سے اسباط کہا گیا ہے۔

﴿ وَمَا أُوتِيَ مُوسَىٰ وَعِيسَىٰ ﴾ (اور جو عطا کئے گئے موسیٰ اور عیسیٰ) یعنی ہمارا ایمان توراۃ اور انجیل پر ہے۔ ان دونوں کتابوں کو علیحدہ ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ اہل کتاب نے ان میں تحریف کر

دی تھی، کئی چیزوں کو نکال دیا اور کئی کو اس میں شامل کر لیا اور دعویٰ یہ کیا کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے۔تو مومنوں سے کہا گیا کہ تم کہو ہمارا ایمان اس چیز پر جو موسیٰ علیہ السلام کو عطاء کی گئی۔یعنی ہمارا ایمان توارۃ پر ہے۔اور ہمارا اس چیز پر ہے جو عیسیٰ علیہ السلام کو عطاء کی گئی یعنی انجیل پر ہمارا ایمان ہے۔

اس سے یہ واضح کر دیا کہ ہمارا ایمان اصل کتب پر ہے نہ کہ تحریف کی ہوئیں پر۔اور ان پر ایمان بھی اجمالی ہے تفصیلی ایمان صرف قرآن پاک پر ہے۔

وَمَا اُوْتِیَ النَّبِیُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ : (اور جو باقی انبیاء دیے گئے اپنے رب کی طرف سے)

اس سے مراد صحیفے بھی ہیں اور " مایشمل ذلک والمعجزات " انبیاء کرام کے معجزات اور احکام ان کو جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطاء کئے گئے ہیں، ان سب پر ہمارا ایمان ہے۔" وهو تعميم بعد التخصيص كيلا يخرج من الاعان احد من الانبياء " پہلے خاص انبیاء کرام کا ذکر کر کے پھر مجموعی طور پر تمام انبیاء کرام کا ذکر کر دیا کہ اے مومنوں تم یہ کہو کہ ہمارا ایمان باقی تمام انبیاء کرام کے احکام، ان کے معجزات ان کے صحائف پر ہے، کہ تمام انبیاء کرام کو رب تعالیٰ کی طرف سے جو کچھ عطاء کیا گیا اس پر ہمارا ایمان ہے، تاکہ کوئی ایک نبی بھی ایمان سے خارج نہ ہو سکے۔

(از روح المعانی)

لَانُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ : ہم ان میں کسی پر ایمان میں فرق نہیں کرتے۔

" ای كما فرق اهل الكتاب فآمنوا ببعض وكفروا ببعض بل نؤمن بهم جميعا "

ہم ان میں سے کسی ایک میں اس طرح فرق نہیں کرتے جیسا کہ اہل کتاب نے کہا ہے۔بعض پر ایمان لائے اور بعض پر ایمان نہ لا کر کفر کیا بلکہ ہم تمام پر ایمان رکھتے ہیں۔ (روح المعانی)

"فنومن ببعض ونكفر ببعض كاليهود والنصارى " یعنی ہم ان میں ایسا فرق نہیں کرتے کہ بعض پر ایمان لائیں اور بعض سے کفر کریں جیسا کہ یہود اور نصاریٰ کرتے تھے (بعض پر ایمان لاتے تھے اور بعض سے کفر۔ (جلالین)

" ای لانومن ببعض ونكفر ببعض كما فعلت اليهود والنصارى "

یعنی ہم ایسا نہیں کرتے کہ بعض انبیاء پر ایمان نہ لائیں اور کفر کریں، جیسا کہ یہود و نصاریٰ نے کیا۔ (مدارک)

☆ لَا نُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ "میں دو وجہ ہیں ایک یہ ہے۔" انا لانؤمن ببعض و نکفر ببعض " ہم انبیاء کرام میں اس طرح کا کوئی فرق نہیں کرتے کہ بعض پر ایمان لائیں اور بعض پر ایمان نہ لائیں اور ان سے کفر کریں۔

اور اس میں دوسری وجہ یہ ہے۔

" لانقول ، انهم متفرقون فی اصول الدیانات بل هم مجتمعون علی الاصول التی هی الاسلام کما قال الله تعالیٰ " (شرع لکم من الدین ما وصی به نوحا والذی اوحینا الیک وما وصینا به ابراهیم و موسیٰ وعیسی ان اقیموا الدین ولا تتفرقوا فیه) (الشوری ۱۳)

تمہارے لئے دین کی وہ راہ ڈالی جس کا حکم اس نے نوح کو دیا اور جو ہم نے تمہاری طرف وحی کی اور جس کا حکم ہم نے ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ کو دیا کہ دین پر قائم رہو اور اس میں پھوٹ نہ ڈالو۔ (از کبیر)

☆ " عن ابی هریرة قال قال رسول الله ﷺ انا اولی الناس بعیسی بن مریم فی الاولی والآخرة الانبیاء اخوة من علات وامهاتهم شتی و دینهم واحد ولیس بیننا نبیٌّ "
(بخاری و مسلم)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیشک لوگوں میں سے میں عیسیٰ بن مریم کے زیادہ قریب ہوں دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی ، انبیاء کرام علاتی بھائی ہیں (باپ شریکے) اور ان کی مائیں مختلف ہیں ۔ اور ان کا دین ایک ہے ۔ اور ہمارے (میرے اور عیسیٰ علیہ السلام کے) درمیان کوئی اور نبی نہیں۔

وضاحت حدیث: نبی کریم ﷺ کا یہ فرمانا" الانبیاء اخوة من علات وامهاتهم شتی و دینهم واحد "

اس کا مطلب یہ ہے کہ تمام انبیاء کرام کی اصل ایک ہے کیونکہ تمام کی طرف اللہ تعالیٰ کی جانب سے وحی آتی ہے۔ اور ان کی استعداد مختلف ہے۔ استعدادات کے مختلف ہونے کو اور شرائع کے فروع میں اختلاف کی وجہ سے تشبیہ دی گئی کہ مائیں مختلف ہیں۔

اصول دین سب کے ایک ہیں، اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات پر ایمان لانا، مبدأ و معاد (ابتداء تخلیق اور قیامت) پر ایمان لانا اور اللہ تعالیٰ کے اوامر ونواہی پر ایمان لانے میں سب برابر ہیں۔

اس لحاظ پر ان کو علاتی بھائی ہونے سے تشبیہ دی گئی۔ (از مظہری)

تراجم کا فرق: اس بحث کے بعد دیکھیں اعلیٰ حضرت کا ترجمہ مقصد کو سمجھانے میں کتنا واضح اور قریب ہے۔

﴿ لانفرق بين احد منهم ﴾

ترجمہ	مترجم
☆ نہیں جدائی ڈالتے ہم درمیان کسی ان میں سے۔	(شاہ رفیع الدین صاحب
☆ ہم فرق نہیں کرتے ایک میں ان سب سے۔	شاہ عبدالقادر صاحب)
☆ ہم ان پیغمبروں میں سے کسی میں کچھ فرق نہیں کرتے۔	(عبدالماجد صاحب)
☆ ہم فرق نہیں کرتے سب میں سے	(محمود الحسن)
☆ ہم ان میں سے کسی ایک میں بھی تفریق نہیں کرتے۔	(اشرف علی صاحب
☆ ہم ان کے درمیان کوئی تفریق نہیں کرتے۔	(مودودی صاحب
☆ ہم ان میں کسی پر ایمان میں فرق نہیں کرتے۔	اعلحضرت مولانا احمد رضا خان بریلوی

اس آیۃ کریمہ کی جو وضاحت ذکر کر دی گئی، اس سے واضح ہو گیا کہ اتنا کہنا کافی نہیں کہ ''ہم ان میں فرق نہیں کرتے'' کیونکہ ہم مدارج اور مراتب کا فرق تو کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کو افضل الانبیاء اور قرآن پاک کو افضل الکتب مانتے ہیں۔

لہٰذا یہاں ضروری ہے کہ ترجمہ سے ہی یہ واضح ہو جائے کہ ہم کون سا فرق نہیں کرتے، وہ یہی ہے کہ ہم ایسا فرق نہیں کرتے کہ بعض انبیاء پر ایمان ہو اور بعض سے کفر، اسی طرح بعض آسمانی کتب کو تسلیم کیا جائے اور بعض کا انکار۔

اب اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کو ایک نظر پھر دیکھیں (ہم ان میں کسی پر ایمان میں فرق نہیں کرتے) تو واضح ہو جائے کہ کتنا خوب اور کتنا عظیم ترجمہ ہے۔

وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ : (اور ہم اسی کے فرمانبردار ہیں)

" ای خاضعون لله تعالی بالطاعة "یعنی ہم طاعت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے سامنے عجز کا اظہار کرنے والے ہیں۔

" مذعنو ن بالعبو دیة "، ہم اللہ تعالیٰ کی عبودیت پر یقین رکھتے ہیں۔

" منقادون لامرہ ونهیه " ہم اس کے اوامرونواہی کوتسلیم کرنے والے ہیں، یعنی ہم اسی کے فرمانبردار ہیں۔ (روح المعانی)

(**فائدہ** : ﴿ وَنَحۡنُ لَهٗ مُسۡلِمُوۡنَ ﴾ سے یہ فائدہ حاصل ہوا کہ " ان اسلامنا لاجل طاعة الله لا لاجل الهوی "

بے شک ہمارا اسلام صرف اللہ تعالیٰ کی طاعت کی وجہ سے ہے، اس میں ہماری خواہشات کا کوئی دخل نہیں۔

یہی وجہ ہے کہ معجزات کے ظاہر ہونے پر ایمان واجب تھا، کیونکہ انکار جن لوگوں نے کیا ان کی خواہشات کا اس میں دخل تھا۔ (ماخوذ از کبیر)

﴿فَاِنۡ اٰمَنُوۡا بِمِثۡلِ مَاۤ اٰمَنۡتُمۡ بِهٖ فَقَدِ اهۡتَدَوۡا ۚ وَاِنۡ تَوَلَّوۡا فَاِنَّمَا هُمۡ فِىۡ شِقَاقٍ ۚ فَسَيَكۡفِيۡكَهُمُ اللّٰهُ ۚ وَهُوَ السَّمِيۡعُ الۡعَلِيۡمُ ﴾

۱) پھر اگر وہ بھی یوں ہی ایمان لائے جیسا تم لائے جب تو وہ ہدایت پا گئے اور اگر منہ پھیریں تو وہ نری ضد میں ہیں تو اے محبوب عنقریب اللہ ان کی طرف سے تمہیں کفایت کرے گا۔ (آیت نمبر ۱۳۷)

۲) پس اگر وہ ایمان لائیں جیسا تم نے ایمان لایا اس کے ساتھ تو وہ ہدایت پا گئے۔ اور وہ منہ پھیریں تو بیشک وہ صرف مخالفت میں ہیں۔ تو عنقریب کافی ہوگا آپ کو ان کی طرف سے اللہ، اور وہ بہت خوب سننے والا اور خوب جاننے والا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے جب پہلی آیۃ کریمہ میں دین کا واضح طریقہ بیان کر دیا تو اس آیۃ میں گویا کہ یہ بیان کیا جا رہا ہے انسان کو چاہئے کہ جب کسی ذات کی نبوت پر دلائل قائم ہو جائیں تو اس کی نبوت کو تسلیم کر لیا جائے، اس کی مخالفت نہ کی جائے۔

مختصر مفہوم : اس آیۃ کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے مومنوں کو ارشاد فرمایا کہ جس نے

اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور نبی کریم ﷺ کی نبوت اور تمام عقائد صحیحہ پر خلوص نیت سے ایمان لایا اگر اہل کتاب نے بھی اسی طرح ایمان لایا تو وہ ہدایت پا جائیں گے، اگر انہوں نے اس طرح ایمان نہ لایا، بلکہ ضد اور مخالفت پر قائم رہے تو نبی کریم ﷺ کا کچھ نقصان نہیں کر سکیں گے، اپنے آپ کو ہی نقصان پہنچائیں گے، کیونکہ رب تعالیٰ نبی کریم ﷺ کو ان کی طرف سے کافی ہے اور وہ خوب سننے اور جاننے والا ہے۔

اعتراض : مومنین کا ایمان جب اللہ تعالیٰ پر اور نبی کریم ﷺ پر اور قرآن پاک پر ہے، تو یہود و نصاریٰ ان کے مثل پر کیسے ایمان لائیں گے جب کہ رب تعالیٰ اور اس کے رسول اور قرآن کی مثل کوئی چیز نہیں۔

جواب : یہاں یہ مراد نہیں کہ وہ ان چیزوں پر ایمان لائیں جو ان کے مثل ہوں جن پر ایمان والوں نے ایمان لایا۔ بلکہ مراد یہ ہے کہ اے ایمان والو تم نے قرآن پاک پر ایمان لایا، اس میں کسی قسم کی تحریف نہیں کی، اگر وہ بھی توراۃ پر اسی طرح ایمان لاتے اس میں تحریف نہ کرتے تو یقیناً ان کو قرآن پر بھی ایمان لانا ضروری ہو جاتا جو ان کی نجات اور ہدایت کا ذریعہ بن جاتا۔

یعنی یہاں مثلیت ایمان اور تصدیق میں ہے، ان چیزوں میں مثلیت بیان کرنا مقصود نہیں جن پر ایمان لانا ہے۔

اسی وجہ سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے " لاتقولوا فان آمنوا بمثل ما آمنتم به فليس لله مثل " تم یہ نہ کہو کہ "اگر وہ ایمان لے آئیں اس چیز پر جو مثل ہو اس چیز کے جس پر تم نے ایمان لایا" اس لئے کہ رب تعالیٰ کے مثل کوئی چیز نہیں۔

" ولكن قولوا فان آمنوا بالذى آمنتم به " لیکن یہ کہو کہ "اگر وہ ایمان لائیں اس ذات پر جس پر تم نے ایمان لایا"

البتہ ان کا ایمان تمہارے ایمان کی طرح خلوص پر مبنی ہو تو وہ ہدایت پا جائیں گے۔

ضمناً اس سے ایک اور مسئلہ حل ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ کی مثل کوئی چیز نہیں، اگر مثل کوئی چیز ہوتی تو اس پر ایمان لانے سے بھی ہدایت حاصل ہوتی، اس لئے ضروری ہے کہ وہ ذات باری تعالیٰ پر ہی مومنین کی طرح خلوص اعتقاد سے ایمان لائیں تا کہ ان کو ہدایت حاصل ہو جائے۔ (ماخوذ از کبیر)

فائدہ : " فالمراد فقد عملوا بما هدوا اليه و قبلوه " آیۃ کریمہ کا مطلب یہ ہے کہ وہ عمل کریں جس کی ان کو ہدایت کی گئی ہے، اور اسی عمل کو خلوص سے قبول کریں۔

" ومن هذا حاله يكون وليا لله داخلا في اهل رضوانه " اور اسی سے یہ بھی واضح ہوگیا کہ وہ شخص اللہ کا ولی ہوگا جس کو اللہ تعالیٰ کی رضاء حاصل ہوگی ، یہ بہت ہی واضح بات ہے کہ رب تعالیٰ کی رضامندی کے لئے عمل کرنا رب تعالیٰ کی رضامندی کے حصول کا سبب ہے۔

(از کبیر)

وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا هُمْ فِي شِقَاقٍ : اگر وہ منہ پھیریں تو بیشک وہ صرف مخالفت میں ہیں

" شقاق " ماخوذ ہے " شق " سے۔ گویا کہ ایک شخص دوسرے کی عداوت کی وجہ سے اس کی شق (طرف) سے دوسری شق اختیار کرلے۔

مسلمانوں کی جماعت جب بکھر جائے ، ایک دوسرے سے علیحدہ علیحدہ ہوجائیں۔ تو اس وقت کہا جاتا ہے۔ " وقد شق عصا المسلمين " مسلمانوں کا عصا ٹوٹ گیا۔

اسی طرح لفظ " محادة " اس معنی میں استعمال ہوتا کہ وہ اس حد (طرف) میں ہے، اور دوسرا اس حد میں، اسی طرح " تعادى " کا معنی ایک دوسرے سے دشمنی کرنا۔

اسی طرح " مجانبة " کا مطلب ہے ایک شخص ایک جانب میں ہو اور دوسرا دوسری جانب میں ہوجائے۔ " شقاق " کے متعلق بعض حضرات نے بیان کیا ہے کہ یہ لفظ "مشقة" سے ماخوذ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہر شخص اپنے حریف کو مشقت میں ڈالنے کی کوشش میں ہو اور ایذاء (تکلیف) پہنچانے کی فکر میں ہو۔

ن الفاظ مبار[illegible] کا مطلب واضح ہوگیا کہ اگر وہ ایمان والوں کی طرح خلوص قلب سے ایمان لانا چھوڑ دیں تو وہ مناف[illegible] (مخا[illegible] ولازم پکڑیں گے۔ حالانکہ عقلمند آدمی کا یہ کام نہیں کہ وہ کسی کی مخالفت کی وجہ سے حق چھوڑ دے۔

جب انہوں نے مخالفت کو لازم پکڑ ہی لیا تو ہمیں معلوم ہوگیا" ليس غرضهم طلب الدين

والانقیاد للحق وانما غرضهم المنازعة واظهار العداوة " کہ بے شک ان کی غرض دین کو طلب کرنا اور حق کی فرمانبرداری نہیں، بلکہ ان کی غرض صرف جھگڑا کرنا اور دشمنی کا اظہار کرنا ہے۔

" فَإِنَّمَا هُمْ فِي شِقَاقٍ " میں مفسرین کے مختلف اقوال ہیں، سب کا مطالب یہی ہے (کہ اگر وہ منہ پھیرلیں) تو وہ صرف مخالفت اور خالص ضد کی وجہ سے اعراض کرنے والے ہوں گے۔

ایک معنی لیا گیا ہے۔مخالفت، اور معنی لیا گیا ہے'' گمراہی'' اور معنی لیا گیا ہے۔'' منازعت و محاربت'' (لڑائی جھگڑا) اور معنی لیا گیا ہے'' عداوت'' سب کا مطلب وہی ہے جو بیان کردیا گیا ہے۔

فَسَيَكْفِيكَهُمُ اللَّهُ : تو عنقریب کافی ہوگا آپ کو ان کی طرف سے اللہ۔

رب تعالیٰ کے اس ارشاد گرمی میں نبی کریم ﷺ اور مومنین کو تسلی دی گئی، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ جب کسی کا محافظ ہوگا تو اسے وثوق حاصل ہوگا۔

" قال المتکلمون هذا اخبار عن الغیب فیکون معجزا دالا علی صدقه " متکلمین حضرات نے بیان فرمایا ہے کہ یہ غیبی خبر ہے جو نبی کریم ﷺ کی صداقت پر دلالت کرنے والا آپ کا معجزہ ہے۔

غیبی خبر اس لئے ہے کہ آپ نے رب تعالیٰ کی عطاء سے یہ خبر دی کہ رب تعالیٰ آپ کی کفایت کرے گا، آپ کو یہود و نصاریٰ کے شر سے محفوظ رکھے گا۔ اور ان کے خلاف آپ کی امداد فرمائے گا۔

تو ایسا ہی ہوا کہ مسلمان ان پر غالب آگئے، ان کے شہروں کو فتح کرلیا، ان کے مال اپنے قبضہ میں لے لئے۔

مسلمانوں کے ہاتھوں وہ ذلیل ہوئے، خراج اور جزیہ ان کو ادا کرنا لازم ہوا۔ وہ اپنے آپ کو مسلمانوں کے ہاتھوں سے چھڑانے پر قادر نہ ہوئے۔

اس خبر کو نبی کریم ﷺ کا معجزہ قرار دیا گیا کہ آپ نے تفصیل بیان فرمادی وہ حرف بحرف حق ثابت ہوئی۔

"لان المتخرص لا یصیب فی مثل ذلک علی التفصیل " کیونکہ تخمینے سے بات

کرنے والا بھی اس قسم کی تفصیل نہیں بیان کرسکتا۔

تسکین الجنان سے اقتباس: راقم نے تراجم کے تقابلی جائزہ میں ﴿فَسَيَكْفِيكَهُمُ اللّٰهُ﴾ کو بھی ذکر کیا ہے اس پر بھی ایک نظر کرتے چلے جائیں۔

﴿فَسَيَكْفِيكَهُمُ اللّٰهُ﴾

☆ تو تمہاری طرف سے عنقریب ہی نمٹ لیں گے۔	(اشرف علی صاحب
☆ سواب کفایت ہے تیری طرف سے ان کو اللہ۔	(شاہ عبدالقادر صاحب)
☆ سواب کافی ہے تیری طرف سے اللہ۔	(محمود الحسن صاحب
☆ سواب اللہ آپ کی طرف سے ان کے مقابلہ میں ہے۔	(عبدالماجد صاحب)
☆ تو اے محبوب عنقریب اللہ ان کی طرف سے تمہیں کفایت کرے گا۔	(اعلیٰحضرت مولانا احمد رضا خان بریلوی)

یہاں لفظ "اللہ" فاعل ہے۔ اور "ک" ضمیر، اور "ھم" ضمیر مفعول ہیں۔

بظاہر دونوں معنوں کو عقل تسلیم کرتی ہے کہ یہ مطلب ہو کہ اللہ تعالیٰ نبی کریم ﷺ کی طرف سے ان کو کافی ہو یعنی عذاب دے۔

یا یہ معنی ہو کہ اللہ ان کی طرف سے نبی کریم ﷺ کو کافی ہو کہ وہ آپ کو کوئی تکلیف نہ پہنچا سکیں، بلکہ خود ہی گرفت میں آجائیں۔

اعلیٰ حضرت کا ترجمہ تفاسیر کے عین مطابق ہے۔ مدارک میں ہے۔ "ضمان من اللہ لاظھار رسولہ علیھم قد انجز وعدہ بقتل بعضھم و اجلاء بعض" یعنی اللہ تعالیٰ نے ذمہ داری اٹھائی ہے کہ نبی کریم ﷺ کو غالب کرے گا۔

ان پر یعنی اللہ ان کی طرف سے تمہیں کفایت کرے گا، اسی وعدہ کو اللہ نے اس طرح پورا فرمایا کہ بعض ان میں سے قتل ہو گئے، اور بعض جلاء وطن۔

ایسے ہی جلالین میں "یا محمد شقاقھم" سے تفسیر کی گئی، جس کا مطلب ہے کہ اے نبی کریم آپ کو اللہ کافی ہے ان کی مخالفت کے باوجود کیونکہ "شقاق" کا ترجمہ خود مفسر رحمہ اللہ نے پہلے

خلاف" کر دیا ہے۔اس آیۃ کریمہ کے اختتام پر بھی جلالین میں مدارک کے مطابق ہی عبارت ہے۔"

وقد کفاہ اللہ ایاھم بقتل قریظۃ ونفی النضیر وضرب الجزیۃ علیھم "

اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کی ان کی طرف سے کفایت کی تو قریظہ قتل ہو گئے، اور نضیر جلا وطن ہوئے، اور ان پر جزیہ مقرر ہوا، شیخ زادہ حاشیہ بیضاوی میں بھی اسی قسم کا مضمون ہے۔

" فسیکفی اللہ ایاک امر الیھود والنصاری بحفظک من شوء مھم ونصرک علیھم "

یعنی اللہ تعالیٰ آپ کی یہود ونصاری کی طرف سے کفایت کرے گا، ان کے ناپاک ارادوں کو ختم کر کے آپ کی حفاظت فرمائے گا اور آپ کو ان پر غالب فرمائے گا۔

تفاسیر کے بیان کے بعد اعلیٰ حضرت کے ترجمہ پر نظر کریں تو آپ کی وسعت علمیت کا اعتراف کرنے کے بغیر کوئی چارہ کار نہیں رہے گا۔ (تسکین الجنان فی محاسن کنز الایمان ص ۴۹، ۵۰)

وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ : اور وہ خوب سننے والا، خوب جاننے والا ہے۔

نبی کریم ﷺ سے امداد کرنے کا جو وعدہ فرمایا گیا، ان الفاظ مبارکہ سے اس کی تائید کی گئی۔

کہ جو تم دعاء کرو وہ اسے خوب سننے والا ہے۔ جو تمہاری نیت میں اظہار دین ہے۔ اللہ تعالیٰ اسے خوب جاننے والا ہے تمہاری دعا تمہارے اعمال اور دین کے اظہار دین ہے اللہ تعالیٰ اسے خوب جاننے والا ہے۔ تمہاری دعا تمہارے اعمال اور دین کے اظہار کے لئے کوشش کو قبول کرنے والا ہے۔ اور تمہیں مراد تک پہنچانے والا ہے۔

اور ایک احتمال یہ ہے کہ ان الفاظ مبارکہ میں کافروں کے لئے وعید پائی گئی ہے۔ کہ کافر لوگ جو ظاہر کرتے ہیں رب تعالیٰ اسے خوب سننے والا ہے۔ اور جسے وہ چھپاتے ہیں، جس میں کوئی بھلائی نہیں اسے وہ خوب جاننے والا ہے۔

اور یہ بھی خیال رہے کہ اسی میں پہلے وعدہ کی تاکید بھی موجود ہے۔

" فان وعید الکفرۃ وعد للمؤمنین "

اس لئے کہ کافروں کے لئے جب وعید پائی جائے یعنی ان کو عذاب سے ڈرایا جائے تو اس میں

مومنوں کے لئے نجات اور رحمت اور نعمتوں کا وعدہ بھی پایا جاتا ہے۔ (از روح المعانی)

تنبیہ: انسان جتنا اللہ تعالیٰ کا مقرب ہوتا ہے اتنے ہی اس پر امتحان زیادہ آتے ہیں، اس لئے تکالیف نبی کریم ﷺ پر بہت آئی ہیں۔ تاہم اس آیۃ کریمہ اور دوسری کئی آیات کریمہ میں رب تعالیٰ نے آپ سے امداد کا جو وعدہ فرمایا، اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ پر کوئی غالب نہ آ سکے گا۔ یعنی آپ کو کوئی قتل نہیں کر سکے گا۔ دوسری تکالیف کا آنا اس وعدہ کے مخالف نہیں، بلکہ مدارج کی بلندی کی علامت ہے۔

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے خون کا پہلا قطرہ:

رب تعالیٰ کے اس ارشاد گرامی ﴿فَسَيَكْفِيكَهُمُ اللهُ﴾ پر گرا، یعنی آپ قرآن پاک کی تلاوت فرما رہے تھے جب آپ پر حملہ کیا گیا، اور آپ کے خون کا پہلا قطرہ قرآن پاک پر واقع ہوا۔ آپ کی شہادت کی خبر نبی کریم ﷺ نے پہلے سے ہی دے رکھی تھی۔

طلباء کرام قرطبی کے یہ الفاظ یاد کرلیں۔ " وهذا الحرف ﴿فَسَيَكْفِيكَهُمُ اللهُ﴾ هو الذی وقع علیه دم عثمان حین قتل باخبار النبی ﷺ ایاه بذلک "

حق گوئی کی درخشاں مثال:

ابودلامہ ایک مرتبہ مسلمانوں کے حاکم منصور کے پاس گیا، دیکھا کہ " وعلیه قلنسوة طویلة ودرّاعه (جبة مشقوقة المقدم) مکتوب بین کتفیها ﴿فَسَيَكْفِيكَهُمُ اللهُ وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ﴾ وسیف معلق فی وسطه "

اس نے ایک لمبی ٹوپی پہنی ہوئی ہے۔ اور ایک جبہ آگے سے کھلا پہنا ہوا ہے، جس کے کندھے کے مقام پر اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ﴿فَسَيَكْفِيكَهُمُ اللهُ وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ﴾ لکھا ہوا ہے اور درمیان میں تلوار لٹکی ہوئی ہے۔

منصور نے ابودلامہ سے پوچھا تمہارا کیا حال ہے؟ ابودلامہ نے کہا اے امیر المؤمنین آپ کو بشارت ہو، اس نے پوچھا کس طرح کی بشارت؟ ابودلامہ نے کہا۔

" ماظنک برجل وجهه فی وسطه وسیفه فی استه وقد نبذ کتاب اللہ وراء ظهره "

اس شخص کے متعلق تمہارا کیا خیال جس کا چہرا وسط میں ہو، تلوار پیچھے، اور اللہ کی کتاب کو اس نے پیٹھ کے پیچھے ڈال دیا ہو۔

اشارہ تھا کہ تمہاری وردی پر آیۃ کریمہ کا پیچھے لکھنا، اور تلوار کو درمیان میں لٹکانا سب غلط ہیں۔ منصور نے اپنی تمام فوج کو اسی قسم کی وردی کا حکم دے رکھا تھا، لیکن ابودلامہ کے کہنے پر، حق بات بتانے پر اس نے اپنا فیصلہ واپس لے لیا، اور وردی کا ڈیزائن تبدیل کرنے کا حکم دے دیا۔ (از قرطبی)

تنبیہ : ایمان وہی معتبر ہوگا جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ نے بیان فرمایا ہے۔ اللہ تعالیٰ وحدہ لاشریک لہ' ہے۔ تمام انبیاء کرام اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ ہیں، گناہوں سے پاک ہیں۔ نبی کریم ﷺ خاتم الانبیاء ہیں۔

اگر کوئی شخص کسی نبی کو خدا کہے یا خدا کی مثل کہے یا خدا کا بیٹا کہے وہ بے ایمان ہے۔ رب تعالیٰ کا شریک ماننا کفر و شرک ہے، اور وہ شخص بے ایمان ہے۔

انبیاء کرام کو اپنے جیسا سمجھنے والا بھی ایمان سے خارج ہے۔ اور نبی کریم ﷺ کو آخری نبی نہ ماننا بھی کفر ہے۔ یہ سب لوگ ﴿ وَاِنْ تَوَلَّوْا ﴾ میں آتے ہیں، کیونکہ یہ ایمان سے پھر جانے والے ہیں۔

﴿صِبْغَةَ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً وَّنَحْنُ لَهٗ عٰبِدُوْنَ ﴾

۱) ہم نے اللہ کی رینی لی، اور اللہ سے بہتر کسی کی رینی اور ہم اسی کو پوجتے ہیں۔

۲) اللہ کا رنگ، اور کس شخص کا رنگ بہتر ہے اللہ کے رنگ سے، اور ہم اسی کی عبادت کرنے والے ہیں۔ (آیت نمبر ۱۳۸)

شانِ نزول:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے کہ نصرانیوں کا جب کوئی بچہ پیدا ہوتا تو وہ اسے ساتویں دن زرد رنگ سے رنگتے، اس پانی کو وہ معمودیہ کہتے تھے۔ (آجکل اردو میں اسے بتسمہ کہا جاتا ہے) ان

کے رنگنے کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ جس طرح ختنہ پاکیزگی کا سبب ہے۔ یہ رنگ بھی اسے تمام آلائشوں سے پاک کر دیتا ہے۔ "فاذا فعلوا ذلک قالوا الآن صار نصرانیا حقا" جب وہ رنگ سے رنگتے تو کہتے کہ اب یہ پکا نصرانی بن گیا ہے۔

رب تعالیٰ نے ان کے رد میں اس آیۃ کریمہ کو نازل کیا۔ ﴿صِبْغَةَ اللّٰهِ﴾ کا مطلب یہ ہے۔

﴿صِبْغَةَ اللّٰهِ﴾ احسن صبغة وهی الاسلام" یعنی اللہ تعالیٰ کا رنگ تمام رنگوں سے اچھا ہے کہ تم اسلام قبول کرلو اسلام کو مجازی طور پر رنگ سے تعبیر کر دیا کہ جس طرح رنگ ظاہر ہوتا ہے اسی طرح دیندار شخص پر اعمال صالحہ اور علامات دین کا ظہور ہوتا ہے۔ (از قرطبی)

اسی طرح یہودی اپنے بیٹوں کو رنگتے اور کہتے ہم نے اسے یہودیت کا رنگ چڑھا دیا۔ اور نصرانی اپنے بیٹوں کو رنگ کر کہتے ہم نے اسے نصرانیت کے رنگ میں رنگ دیا۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان کے رد میں اس آیۃ کریمہ کو نازل فرمایا۔ (قرطبی)

صِبْغَةَ اللّٰهِ : پر نصب اس وجہ سے ہے کہ اس کا عطف ﴿اٰمَنَّا﴾ پر ہے۔ اب مطلب یہ ہوگا "قولوا صبغة الله" تم کہو ہم اللہ کے رنگ (یعنی دین اسلام) سے رنگے ہوئے ہیں۔

یا نصب ہے "اغراء" کے طور پر کہ تم یہ ظاہری رنگ سے اپنے بچوں کو رنگتے ہو یہ بیکار ہے، دین اسلام کو قبول کر کے اللہ تعالیٰ کے تقرب کا رنگ حاصل کرو۔

وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً : میں استفہام انکاری ہے کہ اللہ تعالیٰ کے رنگ سے بہتر کوئی اور رنگ نہیں۔

وَّنَحْنُ لَهٗ عٰبِدُوْنَ: اور ہم اسی کی عبادت کرنے والے ہیں۔ ہم اسی کی وحدانیت کے قائل ہیں ہم اسی کے مطیع ہیں۔ ہم ملت ابراہیمی کی تابعداری کرنے والے ہیں۔ ہم اسی ذات کے سامنے اپنے آپ کو عاجز تصور کرتے ہیں ہمیں حضرت ابرہیم علیہ السلام کے دین کی تابعداری میں سکون حاصل ہے۔
(از روح المعانی)

فائدہ جلیلہ : صوفیاء کرام اولیاء عظام رنگ چڑھانے کے بیان کو خوب انداز میں بیان کر کے خوب رنگ چڑھاتے ہیں۔

حضرت مفتی احمد یار خان رحمہ اللہ بیان فرماتے ہیں۔

رنگ کیلئے چند چیزیں چاہئیں، رنگ بنانے والا، رنگ جمانے والا، رنگ قبول کرنے والا، دین اسلام رنگ ہے جو کارخانہء قدرت میں تیار ہوا، رب نے تیار کیا، حضور ﷺ نے وہ رنگ جمایا، مسلمانوں کے دل و دماغ اور ظاہر و باطن نے قبول کیا، اور عبادت اور ریاضت نے اس میں جلا دی اور پالش کی۔

اللہ کا رنگ پہلے بندوں کے دل پر چڑھتا ہے۔ اور پھر اس کا اثر ہر ادا پر ظاہر ہوتا ہے، اور یہ میخانہ طیبہ سے بٹتا ہے، اسی رنگ نے نہ معلوم کسے کسے کیا کیا کر دیا۔

مولانا رومی رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔

رنگہائے نیک از خمّ صفا است　　　رنگ زشتاں از سیاہ آب جفا است

صبغۃ اللہ نام آں رنگ لطیف　　　لعنۃ اللہ بوئے آں رنگ کثیف

اچھے رنگ صاف مٹکے سے حاصل ہوتے ہیں　　　برے رنگ جفا کے سیاہ پانی سے حاصل ہوتے ہیں

اسی لطیف رنگ کا نام صبغۃ اللہ ہے　　　،　　　کثیف رنگ کی بو کا نام لعنۃ اللہ ہے

بعض روایات سے معلوم ہوتا ہی کہ حضور کی صحبت پاک سے بعض حضرات کے ظاہری رنگ بھی بدل گئے۔ کالے تھے گورے ہو گئے، حبشی تھے رومی ہو گئے۔

حکایت: مثنوی شریف میں ہے کہ ایک جنگل میں لشکر اسلام پیاسا تھا، کسی کافر کا غلام پانی کے مشکیزے اونٹ پر لادے ہوئے اپنے مولیٰ کے پاس جا رہا تھا۔

نبی کریم ﷺ کے حکم سے اسے روک کر اس کے مشکیزوں سے سارے لشکر کو پانی پلا دیا گیا، اور لشکر کے مشکیزے بھر دیئے گئے، لیکن غلام کا پانی اتنا ہی رہا۔ حضور علیہ السلام نے اس کالے غلام کو سینہ سے لگا کر فرمایا کہ جا۔

اللہ جانے اسے ایک آن (لمحہ) میں کیا دے دیا وہ نہایت حسین وجمیل خوبصورت جوان ہو گیا۔ جب وہ اپنے مولیٰ کے پاس پہنچا تو وہ اسے نہ پہچان سکا اور کہنے لگا تو کون ہے؟ اور میرا غلام کہاں گیا؟ وہ بولا کہ میں ہی تیرا غلام ہوں۔ مولیٰ نے کہا وہ کالا تو گورا وہ حبشی تو رومی۔ اس نے جواب دیا۔

صدر را دیدم و بدرے گشتہ ام | صاحب فضلے و قدرے گشتہ ام
صبغۃ اللہ ہست رنگ خم او | بشتہا یک رنگ گردد اندر او

یعنی میں تھا تو حبشی ہی مگر کچھ دیر صدر نبوت کے پاس بیٹھ کر بدر (چودھویں کا چاند) بن گیا، اور میری عزت وقدر بڑھ گئی۔ اس کے پاس اللہ کے رنگ کی ایک ماٹ تھی، جس میں غوطہ دے کر رنگ برنگوں کو یک رنگ بنا تا تھا، اور بے رنگوں کو رنگ برنگا، اس ماٹ کے رنگ سے کوئی صدیق بن گیا، کوئی فاروق، کوئی ذوالنورین، کوئی حیدر کرار۔

اس غلام کے طفیل اللہ ہم پر بھی وہ رنگ چڑھادے، جو ذریعہ بخشش بن جائے۔ (نعیمی)

﴿قُلْ اَتُحَآجُّوْنَنَا فِی اللّٰهِ وَهُوَ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ ۚ وَلَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ ۚ وَنَحْنُ لَهٗ مُخْلِصُوْنَ﴾ (آیت ۱۳۹)

۱) تم فرماؤ کیا اللہ کے بارے میں جھگڑتے ہو، حالانکہ وہ ہمارا بھی مالک اور تمہارا بھی اور ہماری کرنی ہمارے ساتھ اور تمہاری کرنی تمہارے ساتھ اور ہم نرے اسکے ہیں۔

۲) تم فرماؤ کیا تم جھگڑا کرتے ہو ہمارے ساتھ اللہ کے بارے میں، حالانکہ وہی ہمارا رب ہے اور تمہارا رب ہے اور ہمارے لئے ہمارے عمل ہیں، اور تمہارے لئے تمہارے عمل ہیں، اور ہم اسی کے لئے مخلص ہیں۔

شانِ نزول:

۱) نبی کریم ﷺ کی نبوت کو اہل کتاب نے تسلیم نہ کیا بلکہ حسد سے جل گئے، اور کہنے لگے۔ "الانبیاء کلهم منا فلو کنت نبیا لکنت منا فنزلت" کہ تمام انبیاء کرام ہم میں سے تشریف لائے یعنی تمام انبیاء کرام حضرت اسحاق علیہ السلام کی اولاد سے آئے، لیکن تم اسماعیل علیہ السلام کی اولاد سے آئے ہو، لہٰذا تم نبی نہیں ہو سکتے اگر تم نبی ہوتے تو تم بھی اسحاق علیہ السلام کی اولاد سے ہوتے۔

انکی اس حجت بازی اور جاننے کے باوجود انکار کرنے پر رب تعالیٰ نے اس آیۃ کریمہ کو نازل فرمایا۔

۲) یہود ونصاریٰ یہ دعوی کرتے تھے کہ دین حق یہودیت اور نصرانیت ہے۔ اور ہمیں ہی جنت میں داخل کرنے کی لئے خاص کیا گیا ہے اور ہدایت پر صرف ہم ہی ہیں۔

تو یہ آیۃ کریمہ نازل ہوئی کہ صرف تمہارا دعوی تو کافی نہیں اگر اللہ نے فرمایا ہوتا کہ جنت کا حقدار صرف میں نے ان لوگوں کو بنایا ہے۔ اور حق راہ پر صرف یہی ہیں۔ تو کسی حد تک تمہارا دعوی سچا ہوسکتا تھا، لیکن یہاں تو معاملہ الٹ ہے۔ تمہاری شریعتیں منسوخ ہوچکی ہیں۔ اب تو صرف نبی کریم ﷺ کی شریعت کی تابعداری کی جاسکتی ہے۔ اس کی تابعداری حق راہ ہے۔ (از روح المعانی)

﴿قُلْ اَتُحَآجُّوْنَنَا فِي اللّٰهِ وَهُوَ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ ۚ وَلَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ﴾

فرمادیجئے کیا تم جھگڑا کرتے ہو ہمارے ساتھ اللہ کے بارے میں حالانکہ وہی ہمارا رب ہے اور تمہارا رب ہے، اور ہمارے عمل ہمارے لئے ہیں اور تمہارے عمل تمہارے لئے ہیں۔

" فمع نی الآیة قل لهم یا محمد " قل " سے خطاب نبی کریم ﷺ کو ہے کہ تم فرمادو اے محمد کیا تم دعوی کرتے ہو کہ تم اللہ کی اولاد ہو! کیا تم دعوی کرتے ہو کہ تم اللہ کے محبوب ہو! کیا تم دعوی کرتے ہو کہ تم پہلے دین پر قائم ہو، تمہارے یہ دعوے کہ حق پر تم ہی ہو سب باطل ہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ ہمارا بھی رب ہے اور تمہارا بھی رب ہے۔ اسی نے اسحاق علیہ السلام کی اولاد سے نبی بنائے، اسی نے حضرت محمد ﷺ کو اسماعیل علیہ السلام کی اولاد سے نبی بنایا، اسی نے نبی کریم ﷺ کی امت کو تمام امتوں سے افضل بنایا۔

لہٰذا تمہیں ہمارے ساتھ جھگڑا کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ اگر تمہیں کوئی طاقت ہے تو رب تعالیٰ سے پوچھ لو کہ اے اللہ تو نے حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کو اسماعیل علیہ السلام کی اولاد سے ہونے کے باوجود نبی کیوں بنایا۔ اور رب تعالیٰ سے یہ پوچھ لو کہ ہمارے ہوتے ہوئے حضرت محمد ﷺ کی امت کا مرتبہ بلند کیوں کیا، لیکن افسوس تمہیں معلوم نہیں کہ وہ " هو یفعل مایرید " (وہ جو ارادہ کرتا ہے وہی کرتا ہے) ذات ہے۔ (ماخوذ از قرطبی)

وَنَحۡنُ لَهٗ مُخۡلِصُوۡنَ : (اور ہم اسی کے مخلص ہیں) یعنی ہم صرف اللہ تعالیٰ کی عبادت خلوص سے کرتے ہیں، ہم کسی اور کو معبود ہی نہیں مانتے، جب کسی کو معبود ہی نہیں مانتے تو کسی اور کی عبادت کرنے یا کسی اور کی عبادت کرنے میں خلوص رکھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اسی سے یہود ونصاریٰ کا رد بھی ہوگیا" **ولم تخلصوا انتم فیکف تدعون ما نحن اولی بہ منکم** " کہ تم رب تعالیٰ کی عبادت میں خلوص تو رکھتے نہیں، عزیر علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا مانتے ہو۔ پھر تمہارا یہ دعویٰ کیسے صحیح ہے کہ تم ہم سے بہتر ہو، اور اللہ کے محبوب ہو، ہم تم سے بہتر نہیں ہو سکتے، تمہارے یہ سب دعوے باطل ہیں۔

" **والا خلاص حقیقته تصفیه الفعل عن ملاحظة المخلوقین** " اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے کوئی کام کرنا جس میں مخلوق کو دکھانا مقصود نہ ہو، خالق کی مرضی کے خلاف مخلوق کو راضی کرنا مقصود نہ ہو، اسی کو اخلاص کہا جاتا ہے۔

نبی کریم ﷺ نے فرمایا" **یا ایها الناس اخلصوا اعمالکم لله تعالی فان الله تعالیٰ لا یقبل الا ما خلص له** " اے لوگو اپنے اعمال صرف اللہ تعالیٰ کی رضا مندی کے لئے خلوص سے کرو، بے شک اللہ تعالیٰ ان کو اعمال قبول نہیں فرماتا جن میں خلوص نہ پایا جائے۔

ایک اور روایت میں ذکر ہے کہ نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں۔

" **سألت جبریل عن الاخلاص ما هو ؟ فقال سألت رب العزة عنه فقال سر من اسراری استودعته قلب من احببته من عبادی** "

میں نے جبریل سے اخلاص کے متعلق پوچھا کہ اخلاص کیا ہے؟ انہوں نے کہا میں نے رب تعالیٰ سے اخلاص کے متعلق پوچھا تو رب تعالیٰ نے فرمایا وہ میرے رازوں میں سے ایک راز ہے، اپنے بندوں میں سے جسے میں پسند کرتا ہوں اس کے دل میں وہ راز ودیعت (امانت) رکھتا ہوں۔

حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔

" **الاخلاص ان لاتشرک فی دینه ولاترائی احدا فی عمله** "

اخلاص یہ ہے کہ رب تعالیٰ کے دین میں اس کا کوئی شریک نہ ٹھہرایا جائے اور اپنے اعمال کسی کو نہ دکھاؤ۔

حضرت فضیل رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔

" ترک العمل من اجل الناس ریاء اوالعمل من اجل الناس شرک والاخلاص ان یعافیک اللہ تعالی منهما "

عمل کو لوگوں کے لئے ریاء کاری کے طور پر چھوڑنا، یا کوئی کام لوگوں کے لئے کرنا شرک ہے۔ اوران دونوں سے رب تمہیں بچائے تو یہ اخلاص ہے۔یعنی صرف لوگوں کے دکھلاوے کیلئے برے اعمال سے بچنا اور اچھے اعمال کرنا شرک ہے، کیونکہ رب تعالیٰ کے اوامر ونواہی میں لوگوں کی رضامندی یا ان کی ناراضگی کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔اخلاص تو یہ ہے کہ ہر کام میں صرف رب تعالیٰ کی رضاء پائی جاتے۔

حضرت حذیفہ مرعشی کہتے ہیں۔

" ان تستوی افعال العبد فی الباطن والظاهر " اخلاص یہ ہے کہ انسان کے ظاہری اور باطنی عمل ایک جیسے ہوں۔یعنی جس طرح ظاہر عمل میں خلوص ہو اسی طرح باطن میں بھی خلوص ہو۔

سہل نے کہا " هو الافلاس و معناه احتقار العمل وهو معنی قول رویم ، ارتفاع عملک عن الرؤیة "

کہ اخلاص درحقیقت افلاس ہے،یعنی انسان اپنے اعمال کو کم سمجھے،اوراپنے آپ کو اعمال کی کمی کی وجہ سے مفلس سمجھے۔یہی معنی رویم کے قول کا ہے کہ اخلاص یہ ہے کہ تمہارے اعمال دکھائی کم دیں، لیکن حقیقت میں وہ زیادہ ہوں، بلند مرتبہ رکھتے ہوں۔

اخلاص کے مقابل ریاء ہے۔سلیمان دارانی بیان فرماتے ہیں کہ ریاء کی تین علامتیں ہیں۔

" الکسل عندالعبادة فی الوحدة ، والنشاط فی الکثرة ، وحب الثناء علی العمل "

جب اکیلے عبادت کرے تو سستی سے کام لے،اور جب بہت لوگوں کے سامنے عبادت کرے تو چستی دکھائے،اور یہ خواہش رکھے کہ لوگ میرے اعمال کی تعریف کریں۔

(ماخوذ از قرطبی و روح المعانی)

عظمت قرآن : جہاں آیۃ کریمہ کی ابتداء میں ﴿ قُولُوْا اٰمَنَّا بِاللّٰہِ ﴾ الخ، کہا ہے، اس آیۃ کے اختتام میں ﴿ وَنَحْنُ لَہٗ مُسْلِمُوْنَ ﴾ ذکر کیا ہے۔ یعنی رب تعالیٰ کی طرف سے گویا کہا گیا ہے کہ تم کہو، ہم اللہ پر ایمان رکھتے ہیں، اور جو انبیاء کرام پر نازل ہوا اس پر ایمان رکھتے ہیں، اور ہم رب تعالیٰ کے فرمانبردار ہیں۔ اسی کے اوامر ونواہی کو تسلیم کرنے والے اور اسی کے سامنے گردن جھکانے والے ہیں۔

اور جہاں ﴿ صِبْغَۃَ اللّٰہِ ﴾ کہا ہے۔ وہاں، ﴿ وَنَحْنُ لَہٗ عٰبِدُوْنَ ﴾ ذکر فرمایا ہے، کہ ہم نے تو اللہ کے دین کے رنگ میں اپنے آپ کو رنگ لیا ہے۔ اس رنگ سے بہتر اور کوئی رنگ نہیں اور ہم اللہ تعالیٰ کی ہی عبادت کرنے والے ہیں یعنی جہاں کوئی لفظ مناسب ہوا اسی مقام پر اسے رکھا۔

اور اس آیۃ کریمہ میں ذکر فرمایا ﴿ وَھُوَ رَبُّنَا وَرَبُّکُمْ ﴾ اور وہ ہمارا رب ہے اور تمہارا رب ہے۔

اور فرمایا ﴿ وَلَنَا اَعْمَالُنَا وَلَکُمْ اَعْمَالُکُمْ ﴾ اور ہمارے عمل ہمارے لئے ہیں اور تمہارے عمل تمہارے لئے ہیں۔

یعنی کوئی شخص یہ دعوی نہ کرے کہ رب تعالیٰ کی رحمت میرے لئے ہی خاص ہے۔ رب تعالیٰ جسے چاہے اپنی رحمت سے نواز دے بلکہ اے یہود ونصاری ہمارے اعمال رب تعالیٰ کے اوامر ونواہی کے مطابق ہیں۔ جو اعمال صالحہ اور اعمال حسنہ ہیں، لیکن تمہارے اعمال رب تعالیٰ کے حکم کے خلاف ہیں، اس لئے وہ ہمیں ہمارے اچھے اعمال کے مطابق اپنی رحمت سے اجر عظیم عطا فرمائے گا، اور تمہیں تمہارے اعمال کے مطابق عذاب دے گا۔

اور اس کی وجہ اس لئے بھی واضح ہے کہ ﴿ وَنَحْنُ لَہٗ مُخْلِصُوْنَ ﴾ ہم اس کے لئے مخلص ہیں۔
(از روح المعانی)

قرآن پاک کی یہی عظمت اور یہی اعجاز ہے، اسی لئے کوئی شخص قرآن پاک کی مثل کوئی نہ لا سکا۔

☆☆☆

﴿اَمْ تَقُوْلُوْنَ اِنَّ اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِیْلَ وَاِسْحٰقَ وَیَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطَ كَانُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰی ؕ قُلْ ءَاَنْتُمْ اَعْلَمُ اَمِ اللّٰهُ ؕ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهٗ مِنَ اللّٰهِ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ﴾ (آیت ۱۴۰)

۱) بلکہ تم یوں کہتے ہو کہ ابراہیم و اسماعیل و اسحاق و یعقوب اور ان کے بیٹے یہودی یا نصرانی تھے، تم فرماؤ کیا تمہیں۔ علم زیادہ ہے یا اللہ کو اور اس سے بڑھ کر ظالم کون جس کے پاس اللہ کی طرف کی گواہی ہو وہ اسے چھپائے اور خدا تمہارے کوتکوں سے بے خبر نہیں۔

۲) کیا تم کہتے ہو کہ بیشک ابراہیم اور اسماعیل اور اسحاق اور یعقوب اور ان کے بیٹے یہودی تھے یا نصرانی (اے محبوب) تم فرمادو کیا تم زیادہ جانتے ہو یا اللہ، اور اس سے بڑا ظالم کون ہے جو چھپاتا ہے اس گواہی کو جو اس کے پاس ہے اللہ کی طرف سے اور نہیں ہے اللہ غافل اس چیز سے جو تم عمل کرتے ہو۔

شانِ نزول:

یہود نے کہا حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل اور حضرت اسحاق اور حضرت یعقوب اور ان کے بیٹے یہودی تھے۔ اور نصرانیوں نے کہا یہ سب نصرانی تھے۔ یہ یہود و نصاریٰ اپنے دعویٰ میں جھوٹے تھے، کیونکہ " انما حدثت الیهودیة و النصرانیة بعدهم " یہودیت اور نصرانیت تو ان کے بعد ایجاد ہوئی۔

﴿وَقَالَتِ الْیَهُوْدُ عُزَیْرُ نِ ابْنُ اللّٰهِ وَقَالَتِ النَّصٰرَی الْمَسِیْحُ ابْنُ اللّٰهِ﴾ (التوبة ۳۰)

اور یہودی بولے عزیر اللہ کا بیٹا ہے، اور نصرانی بولے مسیح اللہ کا بیٹا ہے۔

یہ ان کی من گھڑت یہودیت اور نصرانیت تھی، جو بعد کی ایجاد تھی، جس سے ان بزرگ ہستیوں کو دور کا بھی واسطہ نہیں تھا۔ اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

﴿ ماکان ابراھیم یھودیا ولا نصرانیا ولکن کان حنیفا مسلما وما کان من المشرکین ﴾ (آل عمران ٦٧)

ابراہیم نہ یہودی تھے اور نہ نصرانی بلکہ ہر باطل سے جدا مسلمان تھے، اور مشرکوں سے نہ تھے۔

اور رب تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَمَآ اُنْزِلَتِ التَّوْرٰةُ وَالْاِنْجِیْلُ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِهٖ ﴾ (آل عمران ٦٥) توراۃ اور انجیل نہ اتری مگر ان کے بعد۔

تو اللہ تعالیٰ نے یہود و نصاریٰ کے باطل دعوی کو رد کرنے کے لئے اس آیۃ کریمہ کو نازل کیا کہ اے محبوب آپ ان سے فرمادو کیا تم زیادہ علم رکھتے ہو یا کہ اللہ تعالیٰ۔

جب اللہ تعالیٰ فرمارہا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نہ یہودی تھے نہ نصرانی تھے۔ تو یقیناً اسی ذات کبریاء کا فرمان سچا ہے تم جھوٹے ہو۔ ام تقولون ، میں اَم متصلہ ہے اور ہمزہ استفہام کا ہم معنی ہے اور استفہام انکار کے لئے ہے اس صورت میں معنی ہوگا کیا تم کہتے ہو۔ یعنی تمہیں نہیں کہنا چاہئے۔ (راقم کا ترجمہ اس کے مطابق ہے) یا ام منقطعہ ہو یعنی بل کے معنی میں ہو اس صورت میں معنی ہوگا بلکہ تم کہتے ہو۔ (اعلیٰ حضرت کا ترجمہ اس کے مطابق ہے) (از خازن و روح المعانی)

استفہام انکاری سے غرض زجر و توبیخ ہے:

نبی کریم ﷺ کی نبوت جب کثیر اور عظیم معجزات سے ثابت ہے اور آپ نے یہود و نصاریٰ کے جھوٹے ہونے کی خبر دی " فثبت لا محالة کذبھم " تو جب اصدق الصادقین نے ان کے جھوٹے ہونے کی خبر دی تو ان کا جھوٹا ہونا یقیناً ثابت ہوگیا۔

اور توراۃ و انجیل نے بھی خبر دی کہ " ان الانبیاء علی التوحید والحنیفیة " انبیاء کرام توحید اور دین حنیف پر قائم تھے۔ توراۃ و انجیل کی اس خبر سے بھی ان کا جھوٹا ہونا ثابت ہوگیا۔

توراۃ اور انجیل جب نازل ہی ان انبیاء کرام کے بعد ہوئیں، تو ان کا یہودی اور نصرانی ہونا کیسے ثابت ہوسکتا ہے؟ جبکہ یہودیت اور نصرانیت کی موجودہ صورت تو توراۃ اور انجیل کی تحریف کے بعد ہوئی۔

اور ان لوگوں کا دعوی بغیر دلیل کے تھا۔ لہٰذا "وبخهم الله علی ذلک بهذه الوجوه" ان وجوہ کے پیش نظر اللہ تعالیٰ نے ان کو توبیخ (ڈانٹ، ڈپٹ) کی اسی وجہ سے استفہام انکاری ذکر کیا جس سے غرض ان کو زجر و توبیخ کرنا تھا۔ (از کبیر)

قُلْ ءَ اَنْتُمْ اَعْلَمُ اَمِ اللّٰهُ : "فمعناه ان الله اعلم وخبره' اصدق" مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ زیادہ جانتا ہے اور اس کی خبر سچی ہے۔ اس نے توراۃ اور انجیل میں ذکر فرما دیا اور قرآن پاک میں ذکر فرمایا نبی کریم ﷺ کے ذریعے ان کو بتا دیا" انهم كانوا مسلمين مبرئين عن اليهودية والنصرانية " کہ بے شک یہ انبیاء کرام رب تعالیٰ کے مطیع و فرمانبردار تھے۔ اسلام پر قائم تھے۔ رب تعالیٰ کی وحدانیت کو تسلیم کرنے والے تھے۔ یہودیت اور نصرانیت سے پاک تھے۔ (از کبیر)

﴿ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَه' مِنَ اللّٰهِ ﴾ یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے جس شخص کے پاس گواہی ہو۔ وہ اسے چھپادے تو اس سے بڑھ کر اور کوئی شخص ظالم نہیں ہوسکتا۔

یعنی اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کا اللہ تعالیٰ کی توحید اور دین حنیف پر قائم رہنے، اور یہودیت اور نصرانیت سے بری ہونے کی خبر دی، رب تعالیٰ کی اس شہادت کو چھپانے والے اہل کتاب بہت بڑے ظالم ہیں۔ " اومنا لو كتمنا هذه الشهادة " اگر بالفرض ہم بھی اس شہادت کو چھپائیں تو ہم سے بھی بڑھ کر کوئی شخص ظالم نہیں ہو سکے گا۔

یعنی اللہ تعالیٰ کے حکم کی عدولی کرنے والا ہر شخص ظالم ہے خواہ اہل کتاب سے ہو، یا مؤمنین سے ہو۔ " وفيه تعريض بكتمانهم شهادة الله لمحمد ﷺ بالنبوة فی كتبهم "

اس میں اشارۃً یہ بھی بتا دیا کہ اہل کتاب اس لئے بھی بہت بڑے ظالم تھے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی کتب میں نبی کریم ﷺ کی نبوت کو بیان فرمایا، اور آپ کے اوصاف بیان فرمائے، لیکن ان ظالموں نے مالک الملک کی اس شہادت کو بھی چھپا دیا۔ (از بیضاوی)

وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ : اور نہیں ہے اللہ غافل اس سے جو تم عمل کرتے ہو۔

اس میں کامل طور پر وعید پائی گئی ہے۔ کیونکہ جس شخص کو یہ معلوم ہو کہ اللہ تعالیٰ ہر ظاہر اور ہر چھپی ہوئی چیز کو جانتا ہے۔ اس پر کوئی چیز مخفی نہیں، اور اس نے ہر کام پر جزا دینی ہے۔

" ان خیرا فخیر وان شرا فشر " اگر اچھا عمل ہوا تو اچھی جزا عطاء فرمائے گا۔ اور اگر برا عمل ہوا تو اس کے مطابق عذاب عطاء کرے گا۔

جب یہ کسی کو علم ہو جائے تو وہ ایک آنکھ جھپکنے کے برابر بھی اللہ تعالیٰ کے خوف سے اپنے آپ کو دور نہیں کر سکتا۔ جب ہم دنیا میں دیکھتے ہیں کہ بادشاہ کی طرف سے جو لوگ کسی کام پر مقرر ہوں جب انہیں معلوم ہوا کہ بادشاہ ہمیں دیکھ رہا ہے تو وہ حکم بجالانے میں کوتاہی نہیں کرتے، انکے دل میں ہر وقت خوف طاری رہتا ہے۔ تو یقیناً انسان کو اگر عقل حاصل ہو تو وہ اللہ تعالیٰ کے خوف سے بے خوف نہیں ہو سکتا۔

(از کبیر)

﴿تِلْکَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۚ لَهَا مَا کَسَبَتْ وَلَکُمْ مَا کَسَبْتُمْ ۚ وَلَا تُسْئَلُوْنَ عَمَّا کَانُوْا يَعْمَلُوْنَ﴾ (آیت ۱۴۱)

۱) وہ ایک گروہ ہے کہ گذر گیا، ان کے لئے ان کی کمائی اور تمہارے لئے تمہاری کمائی اور ان کے کاموں کی تم سے پرسش نہیں ہوگی۔

۲) وہ ایک گروہ ہے جو گذر گیا، ان کے لئے جو انہوں نے کسب کیا، اور تمہارے لئے جو تم نے کسب کیا، اور تم سے نہیں پوچھا جائے گا، جو وہ عمل کرتے ہیں۔

" تِلْکَ " کا اشارہ، حضرت ابراہیم علیہ السلام اور اس کے بعد مذکور آپ کے بیٹوں کی طرف ہے، یعنی حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل اور حضرت اسحاق علیہم السلام اور حضرت یعقوب علیہ السلام اور ان کے بیٹے دنیا سے تشریف لے گئے ہیں ان کے اعمال کی جزاء ان کو حاصل ہوگی، اور تمہارے اعمال کی جزاء تم کو حاصل ہوگی، تم سے ان کی اعمال کے متعلق سوال نہیں کیا جائے گا۔

یعنی ہر انسان کو اس کے اعمال کی جزا دی جائے گی، قیامت کے دن ہر انسان سے اس کے

اعمال کے متعلق سوال کیا جائے گا۔ کسی دوسرے کے اعمال کے متعلق سوال نہیں ہوگا۔

اس آیۃ کریمہ میں یہود کے لئے وعظ بھی ہے اور زجر بھی ہے اور ہر اس شخص کو نصیحت اور زجر ہے جو خود کوئی نیکی کے عمل نہ کرے اور یہ کہے مجھے نماز اور روزہ کی کوئی ضرورت نہیں، بلکہ مجھے ایمان کی بھی ضرورت نہیں، کیونکہ میرے آباء واجداد بہت بڑی فضیلت کے مالک تھے، ان کے نیک اعمال کی وجہ سے مجھے بخش دیا جائے گا اور مجھے عذاب نہیں دیا جائے گا۔

ایسے لوگ جو صرف اپنے آباء کے اعمال پر بھروسہ کرتے ہوئے جان بوجھ کر فرائض کے تارک ہوتے ہیں، اور حرمات کے مرتکب ہوتے ہیں ان کو سمجھایا گیا ہے۔" **لاتتکلوا علی فضل الآباء فکل یؤخذ بعمله** "اپنے آباء کی فضیلت پر بھروسہ نہ کرو، ہر شخص کو اس کے اعمال کے مطابق مؤاخذہ ہوگا۔

یہ آیۃ کریمہ قریب ہی پہلے گزر چکی ہے، لیکن جب حجت کے مقامات مختلف ہوں، مجادلہ مختلف ہو تو دلائل کو دوبارہ ذکر کرنے میں تاکید پائی جاتی ہے۔ اور نصیحت کو دوبارہ ذکر کرنا مفید اور مستحسن ہوتا ہے۔

خصوصاً یہود کو پھر سے متنبہ کیا گیا، کہ نبی کریم ﷺ پر ایمان نہ لا کر اس گھمنڈ میں نہ رہو کہ ہمارے آباء واجداد انبیاء کرام تھے جو بڑی فضیلت والے تھے وہ ہمیں رب سے بخشوالیں گے۔

یہ دعوی تمہارا غلط ہے مصطفی کریم ﷺ سے پھرنے والے کو کسی نبی کے دامن میں پناہ نہیں ملے گی۔

(ماخوذ از خازن بزیادۃ)

اور احتمال یہ بھی ہے کہ آیۃ کریمہ میں مضمون کے لحاظ پر تکرار نہ ہو، بلکہ پہلی آیۃ میں خطاب یہود کو ہوا اور اس میں خطاب ہمیں ہو کہ ہمیں ان کی اقتداء سے ڈرایا گیا ہو۔

اور ایک احتمال یہ ہے کہ پہلی آیۃ میں "امۃ "مراد انبیاء کرام ہوں، اور اس آیۃ میں مراد یہود کے اسلاف ہوں کہ انہوں نے "حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے بیٹوں کو یہودی کہا تھا"، یعنی انہوں نے کہا کہ وہ ہمارے طریقہ پر تھے تو رب تعالیٰ نے فرمایا کہ وہ یہود کے اسلاف گزر گئے ان کے اعمال ان کے لئے تھے اور اے موجودہ یہود یو تمہارے عمل تمہارے لئے ہیں، تم ایمان لے آؤ، اپنے آباء واجداد کی طرح کجروی (ٹیڑھی چال) اختیار نہ کرو۔ (از روح المعانی)

تنبیہ: قرآن وحدیث سے واضح ہو چکا ہے کہ کسی کو دوسرے کے عمل میں سے حصہ نہیں دیا جائے گا، ہاں یہ بات ممکن ہے کہ ایک کے عمل سے دوسرے کو فائدہ یا نقصان پہنچ جائے، جیسا کہ قرآن مجید میں ہے۔

﴿ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِاِيْمَانٍ اَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَمَآ اَلَتْنٰهُمْ مِّنْ عَمَلِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ ﴾

اور وہ لوگ جو ایمان لائے اور ان کی اولاد نے ایمان میں ان کی پیروی کی ان کی اولاد کو ہم ان کے ساتھ تو ملا دیں گے اور ان کے عمل میں سے کوئی کمی بھی نہیں کریں گے۔

مذکورہ آیۃ میں ایمان والوں کے عمل سے ان کی مؤمن اولاد کو فائدہ پہنچنے کا بیان ہے۔

نیز ﴿ وَمَا اَلَتْنَاهُمْ مِّنْ عَمَلِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ ﴾ (اور ان کے عمل میں کوئی کمی نہیں کریں گے) سے یہ بات واضح ہوگئی کہ مؤمن اولاد اپنے والدین کے عمل میں حصہ دار نہیں ہوگی ہاں اسے ان کے عمل کا فائدہ ضرور پہنچے گا۔

حدیث مبارک ہے۔

" قال رسول الله ﷺ من سن فی الاسلام سنة حسنة فله اجرها واجر من عمل بها من بعده من غير ان ينقص من اجورهم شئ ومن سن فی الاسلام سنة سيئة كان عليه وزرها ووزر من عمل بها من بعده من غير ان ينقص من اوزارهم شئ "

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس شخص نے اسلام میں کوئی اچھا طریقہ نکالا اسے اس کا اجر ملے گا، اور اس شخص کا اجر بھی اسے ملے گا جس نے بعد میں اس پر عمل کیا بغیر اس کے کہ دوسرے شخص کے اجر میں کمی کی جائے۔ اور جس نے اسلام میں کوئی برا طریقہ نکالا تو اس پر اس کا گناہ ہوگا اور اس شخص کا گناہ بھی اسے ملے گا جس نے بعد میں وہ برا کام کیا، ہاں دوسرے شخص کے گناہ میں کچھ کمی نہ آئے گی۔

اس حدیث مبارک میں بھی کسی کے عمل سے دوسرے کو فائدہ یا نقصان پہنچنے کا ذکر ہے۔ یہ نہیں کہ کوئی شخص کسی کے عمل میں سے حصہ پائے گا۔

(وما علينا الا البلاغ المبين)

(از تبیان للعلامہ السید احمد سعید کاظمی رحمہ اللہ کثیرۃ)